ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱) شمارہ (۱)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

اپریل سنہ ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ چھ روپے [illegible] ۸ ر

ممالک غیر سے نو روپے ۱۲ ر

"فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

منظومات

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بہ حرفے میتواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

نقشِ اوّل

دنیا میں جہاں جہاں بھی اوس کی بوندیں پائی جاتی ہیں، اگر وہ سب کی سب مل کر اس بات کا ایکا کرلیں کہ آفتاب کی حرارت میں جذب ہوکر ہم اپنے کو فنا نہ ہونے دیں گے ——— تو سورج کی ایک دھندلی سی کرن اپنی پہلی نمود میں ان کے اس دعوے کو باطل کرسکتی ہے۔ شبنم کی فطرت میں جب تک نرمی، زود آمیزی اور دوسرے میں جذب ہوجانے کی کمزوری موجود ہے اُسوقت تک اُسے توفیقِ بقا اور سعادتِ دوام نصیب نہیں ہوسکتی، بالکل اسی طرح وہ انسان بھی حفظِ خودی کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتے "جو ہر بلند آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں، ہر ابھرنے والی طاقت جن کو جذب کرسکتی ہے اور ہر طوفان میں کسی مزاحمت کے بغیر جو تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں" ۔

اس کمزور اور منفعل ذہنیت کے لوگ دنیا کی ہوا کے ساتھی، زمانہ ساز اور وقت کے غلام ہوتے ہیں اُن کے پیشِ نظر کوئی نصب العین اور مقصدِ حیات نہیں ہوتا، اگر حسنِ اتفاق سے زمانہ میں نیکی اور سچائی کا چلن ہے تو وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اگر برائی اور حق ناشناسی کا دَور دَورہ ہے تو جس جوش و سرگرمی کے ساتھ وہ حق و صداقت کے ہمنوا تھے اُسی طرح وہ باطل سے پیمانِ وفا باندھ لیتے ہیں، اس انداز کے آدمیوں کو نہ سچائی سے محبت ہوتی ہے اور نہ برائی سے نفرت! وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ بازارِ معیشت میں کس جنس کی مانگ ہے، دنیا میں آندھیاں چلیں تو خزاں دیدہ پتیوں کی طرح وہ اُڑنے لگیں، آندھیوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو تو گھاس کے تنکوں کی مانند زمیں بوس ہوجائیں ——— اُن کا ٹھہرنا اور چلنا زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، خود ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی، دشت کا ہر بگولا اُن کا امیرِ کارواں بن جاتا ہے اور ہر موجِ سراب کے آگے ان کی تشنہ لبی سر جھکا دیتی ہے۔

اگر یہ ——— حقیقت ہے

[illegible]ن و شعور پر اثر انداز ہوسکتا ہے، لٹریچر کے ذریعہ فکر و نظر بدلے جاسکتے ہیں اور ادبی افکار کی پرچھائیوں سے زندگی کا [illegible]

ہے تو پھر ہم فاران کے ذریعہ یہی خدمت انجام دینا اور یہی فرض ادا کرنا چاہتے ہیں، ہماری تمنا ہے کہ انسانوں میں کھرے کھوٹے اور اچھے بُرے کی پرکھ اور خوب و ناخوب کی تمیز پیدا ہو، لوگ اس چیز سے متاثر ہونا چھوڑ دیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے، بلکہ یہ دیکھیں اور سمجھیں کہ دنیا کو جانا کس طرف چاہیئے؛ اگر دنیا غلط راستہ پر پڑ گئی ہے تو اپنی جد و جہد سے وہ اسے صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کریں اور اس گمراہی میں ایک قدم بھی غلط کاروں کے اس قافلہ کا ساتھ نہ دیں ——— دنیا کی اس آوارگی میں رفاقت نہ کرنے پر یقیناً طعنے سُننے پڑیں گے کہ تم "رجعت پسند" ہو زمانہ کے تقاضوں سے یکسر ناآشنا، انقلابی داعیوں سے بے خبر، پرانی روایتوں کے پرستار اور نئی حرکت اور جدید اضطرابِ زندگی کے دشمن ——— تو راہِ حق کے چلنے والوں میں جواب دینے کی یہ جرأت ہونی چاہیئے ——— کہ اگر تمہارے کان کے پردوں سے سچی بات سننے کی صلاحیت نہیں چھین لی گئی ہے تو سُنو! صرف آگے بڑھنا اور دوڑتے چلے جانا "ترقی و انقلاب" نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جس راستہ پر یہ مشق خرام ہو رہا ہے وہ راہِ استقامت بھی ہے یا نہیں ——— ہم تمہاری تیزروی کو دیکھ کر دھوکا نہیں کھا سکتے، ٹیڑھے راستہ اور غلط راہ میں آگے بڑھنا ترقی نہیں تنزل، بلندی نہیں پستی، زندگی نہیں موت اور انقلاب نہیں بربادی ہے۔

"فاران" شعر و ادب کے ذریعہ فکر و شعور کو اسی انداز پر متاثر کرنا بلکہ ڈھالنا چاہتا ہے" فاران کا ادب زندگی کی ترجمانی کریگا مگر کس زندگی کی؟ خداشناس اور حق نگر زندگی کی، جس زندگی میں معیشت اور اخلاق ساتھ ساتھ چلیں، جہاں ظاہر کے ساتھ باطن کا بھی سنوار ہو سکے، جہاں خیالات میں توازن، افکار میں سلجھاؤ، تصورات میں پاکیزگی نظر میں بلندی اور دل میں حق گوئی کا جذبہ اور انسانوں کے ساتھ دردمندی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

صدائے حق

ہمیں اس کا پوری طرح احساس ہے کہ باطل کے اس انقلابی نقار خانہ میں ہم طوطی کی بولی بول رہے ہیں۔ ہماری آواز اس ہنگامۂ شور و ہستی میں بہت دھیمی اور کمزور ہے ——— مگر حق گوئی کی تاریخ ہماری ہمت بندھاتی ہے اور ماضی ہمارے کان میں اذان سی دیتا ہے کہ شروع شروع میں اسلام کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ابوجہل اور ابولہب کی للکاروں نے اُسے اُونچا ہونے دیا اور طائف میں چھوکروں کی آوازوں میں وہ دب سی گئی مگر وہ حق کی آواز تھی، کسی کے روکے نہ رُکی۔ بدر و حُنین میں دشمنوں کی تلواروں کی جھنکار بھی اُسے دبا نہ سکی یہاں تک کہ اُس آواز نے قیصر و کسریٰ کے جبروت کے نقاروں کو بیکار کر دیا اور آج تک اس صدائے حق کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

ہمیں معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ بازار میں کس قسم کے ادب کی مانگ ہے۔ لوگ کیا سُننا، پڑھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں؟ بک اسٹالوں اور کتاب گھروں میں اہلِ ذوق کی نگاہیں کیا چیز ڈھونڈتی ہیں؟ عوام ہی نہیں خواص تک کی تنہائیاں کس انداز کے لٹریچر سے دل بہلانا چاہتی ہیں؟ ——— عوام کی پسندیدہ روش کے برخلاف اقدام بظاہر دانش مندی کے خلاف ہے اور تجارتی نقطۂ نگاہ سے تو سو فیصد نقصان دہ! مگر ہم نے جان کر یہ خطرہ مول لیا ہے، ہم نے اس وادی کو پھولوں کی سیج نہیں پرخار سمجھ کر ہی قدم بڑھایا ہے، ہم جانتے ہیں کہ جس عزم کو لیکر ہم اُٹھے ہیں اُس راہ میں قدم قدم پر مشکلوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہوگا، طرح طرح کی ناخوشگواریاں سامنے آئیں گی یہاں تک ہمارے پاؤں ٹوٹ تو سکتے ہیں مگر راہِ استقامت سے ہٹ نہیں سکتے۔

ہمارا ادب

"فاران" سنجیدہ اور باوقار ادب کا مُرقع ہو گا مگر اُس میں پڑھنے والوں کو شگفتگی اور دلچسپی بھی

ملے گی۔ اہلِ نظر اور اربابِ ذوق کے ادبی وجدان کی پذیرائی، تواضع اور مدارات کے لئے "فاران" میں غزلیں، بہار آفریں نظمیں، ادبی تنقیدیں اور سبق آموز افسانے شائع ہونگے، زبان کے سدھار اور اُس کی بنیادی خصوصیات کے تحفظ و بقا کا بھی خیال رکھا جائیگا ـــ

فردوسی نے مشورہ دیا تھا:۔

ازیں پنج شیں روے رغبت متاب　　　شب و شاہد و شہد و شمع و شراب

ہم رنگ و بُو اور نغمگی سے "فاران" کے پڑھنے والوں کو محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس انداز سے:۔

آشنایانِ رہ عشق دریں بحرِ عمیق
غرق گشتند و نہ گشتند بآب آلودہ

یقیناً شعر و نغمگی سے طبیعت کو کیف اور دل کو نشاط ملتا ہے۔ مگر اس کیف و نشاط کو جہاں "آلودگی" چھونے لگتی ہے، بس اُسی مقام سے بگاڑ شروع ہوجاتا ہے اور شعریت، نغمگی اور رنگینی مصیبت بن جاتی ہے ـــ ہم "فاران" کو رنگین تو بنائیں گے مگر آلودہ دامن نہ ہونے دیں گے۔

نادان دوست

اردو زبان ہماری دہری دہری مصیبتوں کا شکار ہے، ایک مصیبت تو یہ ہے کہ ایک گروہ اسے مٹانے پر تلا بیٹھا ہے بلکہ مٹا رہا ہے اور دوسری قیامت وہ اہلِ قلم اردو کی جان پر توڑ رہے ہیں ـــ جو اس رواں، بیساختہ اور شگفتہ زبان کو نامانوس ترکیبوں، بے ربط لفظوں اور مہمل محاوروں کے ذریعہ کھردرا اور ناہموار بنا رہے ہیں ـــ یہ دوسری مصیبت، پہلی مصیبت سے کم خطرناک نہیں ہے۔ دانا دشمن سے نادان دوست بہت زیادہ مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔

اردو زبان مخالفتوں کے طوفان میں اب تک صرف اپنی شیرینی، ہم آہنگی، ربط و توازن، اظہار بیان کی خوبی اور اندازِ نگارش کی سادگی و پرکاری کے سہارے زندہ اور قایم ہے ـــ مگر اُس کی ان بنیادی خصوصیتوں اور مرکزی خوبیوں کو "ترقی و انقلاب" کے نام پر مسخ کیا جارہا ہے، ایسی ایسی بے سروپا اور بے معنی نظمیں اُردو ادب میں آرہی ہیں جو اردو زبان کے مزاج سے دور کی مناسبت بھی نہیں رکھتیں، اس بے جوڑ لفظی گورکھ دھندے اور ان مہمل تک بندیوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ـــ یہ رمزیت ہے، اشاریت ہے، شاعر کی شدتِ احساس کی ترجمانی ہے، اردو ادب میں یہ ایک نیا تجربہ ہے، دنیا کی ہر چیز بدل رہی ہے۔ شعر و ادب کی قدروں اور ہیئتوں کو بھی بدل جانا چاہیے ـــ اور یہ بھی کہ جب رسم و روایت اور رجعت و قدامت کے پردے چاک ہو جائیں گے اُس وقت جاکر ہمارے افکار کی گہرائی اور تخیل کی بلندی تک دماغ پہنچ سکیں گے۔

یہ دعوے ظاہری طور پر جتنے شاندار ہیں اتنے ہی کھوکھلے، بے جان اور ہلکے ہیں، ان میں افادیت ہے اور نہ حُسن و توازن! ادب میں یہ گمراہی، لاقانونیت اور بے راہ روی عام ہوتی جارہی ہے، فکر و خیال کا سلجھاؤ جو شعر و ادب کا سب سے بڑا حسن ہے آج بہت کمیاب ہے، الجھنوں، ژولیدہ بیانیوں اور بے ربطیوں کو فروغ ہو رہا ہے۔

اور وہ اس لیے کہ لوگ شعر و ادب میں فکر و کاوش اور تحقیق و جستجو سے گھبراتے ہیں۔

"فاران" زبان و ادب کی قدیم مفید قدروں کی حفاظت کرے گا۔ جدت کے پاکیزہ عنصر کو آگے بڑھائیگا اور مستقبل کے لیے تعمیر کا فرض انجام دیگا۔ فاران کے مضامین میں جو شیخ لگمگر بے راہ روی نہ ہوگی۔ جدت کے عناصر ہوں گے مگر بے ربطی نہ پائی جائے گی، ترقی و انقلاب کے آثار ہوں گے لیکن ان آثار کو تعمیر میں صرف کیا جائیگا۔

"فاران" کے فیصلے یک رخے اور جانبدارانہ ہرگز نہ ہوں گے، ہم قصر و ایوان کی سیاہ کاریوں کو جہاں بے نقاب کریں گے وہاں جھونپڑوں کی خرمستیوں سے نگاہِ احتساب نہ چرائیں گے، اس لیے کہ :-

وہی گناہ سے رغبت وہی خدا سے فرار
کہ سب میں ایک ہی انداز ہر امیر و غریب

خدا کی مخلوق بھوک اور افلاس سے بڑھکر بد اخلاقی، بے عملی، اور سیاہکاریوں کی ماری ہوئی ہے، ذہنوں میں معصیت پروردہ آزادی، الحاد زدہ انقلاب، لاقانونیت اور انار کی پرورش پا رہی ہے، لوگ اخلاقی بندھنوں کو توڑ کر زندگی کو بیکراں بنانا چاہتے ہیں، زندگی کی صالح قدروں سے ترقی و انقلاب کے نام پر یہ گریز ایک مستقل مسلک کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے، ان تصورات کو ابھارنے اور ان پرچھائیوں کو حقیقت بنانے میں لٹریچر کا بھی ہاتھ کام کر رہا ہے۔

ہم "فاران" کے واسطہ سے ایک ایسا ادب دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جو زندگی کی توانائیوں کو ابھار سکے جس میں ظاہر کے بناؤ کے ساتھ باطن کا سنوار بھی موجود ہو اور جس کے ذریعہ مسائل حیات کے جانچنے اور پرکھنے کی قابلِ اعتماد صلاحیت پیدا ہو سکے۔

ہمارے عزائم بلند ہی نہیں دشوار تر بھی ہیں، ہم اپنے ہاتھوں میں نازک آبگینے لے کر پہاڑوں سے ٹکرانے کے لیے چلے ہیں اور ہم پچ مولوں کو شاہباز سے لڑا دینا چاہتے ہیں ـــــ لیکن تائیدِ ایزدی نے ہمارا ساتھ دیا تو دنیا دیکھ لیگی۔ آج کی دھیمی آواز مستقبل کا سب سے زیادہ پر شور نعرہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ضربِ کلیمی شعر و ادب کے تمام فرعونوں کی خدائی کو ختم کر دے گی۔

ماہر القادری
۱۵ مارچ ۱۹۴۹ء

محمد اسد لیوپولڈ

تلاشِ حق

مشاہدۂ فکر و نظر، نفسیاتی تجربہ اور گہرے مطالعہ نے
ایک مغربی مفکر کی زندگی کو بدل دیا

انسانیت کسی زمانے میں بھی ذہنی طور پر اتنی پریشان اور اتنی مضطرب نہیں رہی جتنی آجکل ہمارے زمانے میں ہے، یہی نہیں کہ ہمارے سامنے آج ایسے ایسے بیشمار مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو بالکل جدید طرز پر حل ہونے کے متقاضی ہیں بلکہ ہمارا زاویۂ نگاہ بھی پہلے کی نسبت بہت مختلف ہوگیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں معاشرہ بنیادی تبدیلیوں کے مراحل سے گذرتا رہتا ہے۔ اگرچہ ان تبدیلیوں کی رفتار ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے لیکن ہر جگہ ہم ایک ایسی زبردست ابھرتی ہوئی طاقت کی کارفرمائی کا مشاہدہ کریں گے جو نہ توڑ کا جانتی ہے نہ تذبذب کی اجازت دیتی ہے۔

عالمِ اسلام بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے، یہاں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ قدیم رسم و رواج اور پرانے تصورات آہستہ آہستہ غائب ہوتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ نئی نئی شکلیں نمودار ہورہی ہیں، اب دیکھئے یہ تبدیلیاں کہاں جاکر دم لیتی ہیں؟ کس گہرائی تک ان کا اثر پہنچتا ہے؟ اور اسلام کے تمدنی نظام و پیام کی عمارت میں یہ کس حد تک موزوں ثابت ہوسکتی ہیں؟

یہ اور اس قسم کے بہت سارے مسائل ہیں جن سے آج دورِ حاضر کے مسلمان دوچار نظر آتے ہیں مگر ان سب مسائل پر تبصرہ کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے میں نے فقط ایک ہی مسئلہ کا انتخاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ "مغربی تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیئے" اس عنوان کی وسعت اور الجھاؤ کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے بعض بنیادی پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ سنتِ نبویؐ کی روشنی میں نظر ڈالیں، لیکن یہ موضوع بھی ایسا ہے جس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں لہٰذا میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک سرسری خاکہ پیش کروں، مجھے یقین ہے کہ یہ سرسری خاکہ دوسروں کے لیے اس اہم ترین مسئلہ پر مزید غور و فکر کی تحریک کا باعث ہوگا۔

اب سنئے خود میرے متعلق، ــــ میں کچھ اپنے بارے میں بھی عرض کردینا مناسب سمجھتا ہوں، کیونکہ مسلمانوں سے جب کوئی نومسلم گفتگو کررہا ہو تو انھیں یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ آخر اس شخص نے اسلام کس طرح اور کیوں قبول کیا؟ سنہ ۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا جب میں نے اپنے وطن آسٹریا سے رختِ سفر باندھا اور یورپ کے بعض ممتاز اخباروں کی طرف سے

بحیثیت نامہ نگار "خصوصی" افریقہ اور ایشیا کی سیر و سیاحت کرتا رہا۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد سے میری زندگی کا تقریباً سارا حصہ مشرق کے اسلامی ممالک ہی میں بسر ہوا۔ شروع شروع میں تو وہاں کی قوموں کے ساتھ میری دلچسپی ایک غیر ملکی سیاح کی طرح محض خارجی تھی، لیکن وہیں ایک ایسا نظام معاشرت اور نظریۂ حیات بھی میرے مشاہدے میں آیا جو یورپ کے نظام معاشرت و نظریۂ حیات سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ ایسا نظام معاشرت و نظریۂ حیات جو پہلی ہی نظر میں یورپ کے سطحی اور میکانکی طرز کے بالمقابل زیادہ سکون بخش، زیادہ ہم آہنگ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زیادہ انسانیت نواز اور فطرت کا ترجمان ہے۔ مجھے اس سے ایک لگاؤ پیدا ہو گیا۔ پھر اس لگاؤ نے مجھے رفتہ رفتہ ان اسباب کی تلاش کی طرف مائل کر دیا جن کی بدولت دونوں نظریوں میں اس قدر تضاد تھا، اسلامی تعلیمات کے مطالعے کا شوق یہیں سے شروع ہوا۔ ابتدا میں یہ شوق اتنا شدید نہ تھا کہ مجھے آغوش اسلام میں کھینچ لیتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے ترقی پذیر و انسانیت نواز معاشرے کا منظر دکھا دیا جس میں اندرونی تصادم و خلفشار کم سے کم اور حقیقی برادرانہ احساسات زیادہ سے زیادہ موجود ہیں۔ حالانکہ موجودہ عہد کے مسلمانوں کی زندگی کو دیکھئے تو وہ اسلامی تعلیمات کے پیش کردہ مثالی امکانات سے بعید تر دکھائی دیتی ہے کیونکہ اسلام میں جو روح ترقی اور حرکت و برکت ہے وہ عہد حاضر کے مسلمانوں میں جمود و سکون بن کر رہ گئی ہے یعنی وہ تمام وسعتِ قلب، فیاضی اور وہ جذبۂ ایثار و قربانی جو کبھی اسلامیان عالم کا طرۂ امتیاز تھا، اب مسخ ہو کر تنگ نظری اور سہل انگاری میں تبدیل ہو گیا ہے۔

غور و فکر کے بعد

اپنی اس دریافت کی ترغیب اور "ماضی و حال" کے کھلے تضاد سے حیران ہو کر میں نے اور زیادہ گہرائی میں اترنے کی کوشش کی، یعنی میں نے یوں سوچنا شروع کر دیا گویا میں خود اسلام کے حلقے میں داخل ہو چکا ہوں، یہ ایک خالص ذہنی تجربہ تھا مگر اس تجربے نے تھوڑی ہی مدت میں میری تلاش و جستجو کا صحیح جواب پیش کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دراصل مسلمانوں کے سماجی اور تمدنی زوال کا واحد سبب صرف یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روح کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔ اسلام تو اب بھی موجود ہے مگر آج کا اسلام جسدِ بے روح ہے اور وہی عناصر جو کبھی عالم اسلام کی طاقت و استحکام کا باعث تھے اب اس کی کمزوری و پژمردگی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی تعمیر چونکہ آغاز ہی سے فقط مذہبی بنیاد پر ہوئی ہے اس لئے جب بنیاد کمزور ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ تمدن کی عمارت بھی کمزور ہو گئی!

جوں جوں یہ حقیقت ذہن نشین ہوتی گئی کہ اسلام کی تعلیمات کتنی مستحکم اور غیر معمولی طور پر کس قدر عملی ہیں، اسی قدر میری یہ فکر اور گہری ہوتی گئی کہ مسلمانوں نے اسلامی نظام حیات کو اپنی روزمرہ کی زندگی سے اس طرح کیوں خارج کر دیا۔ یقین کیجئے صحرائے لیبیا سے پامیر تک اور باسفورس سے بحیرۂ عرب تک کے تمام ممالک کے مسلم مفکرین سے بار بار تبادلۂ خیال کیا اور یہ مسئلہ میرے ذہن و فکر پر کچھ اس طرح چھا گیا کہ بالآخر عالم اسلام کے ساتھ میری دوسری قسم کی ذہنی دلچسپیاں اس کے حجم میں گم ہو کر رہ گئیں اور میری تلاش و جستجو پوری طاقت کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ باوجود غیر مسلم ہونے کے مسلمانوں کے ساتھ میری گفتگو کا رخ ایسا ہو گیا گویا ان کی لاپروائی اور تساہل کے خلاف تحفظ اسلام کی علمبرداری میرے ہی سپرد ہو۔ یہ باطنی تبدیلی بالکل غیر محسوس قسم کی تھی۔ مگر ایک دن سنہ ۱۹۲۶ء کی خزاں میں جب افغانستان کے پہاڑی علاقہ میں میری گفتگو وہاں کے

صوبے کے ایک نوجوان گورنر سے ہوئی اور باتوں باتوں میں اس نے یہ کہا کہ "آپ تو مسلمان ہی ہیں، کیا آپ کو نہیں معلوم" تو میرے دل پر اس جملہ کا بڑا گہرا اثر ہوا اور میں خاموش ہو گیا۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں جب میں دوبارہ یورپ واپس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے اس رجحان کا منطقی نتیجہ قبولِ اسلام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں میں مسلمان ہوا۔ اُس وقت سے آج تک بارہا مجھ سے یہ سوال کیا جاتا رہا ہے کہ "آپ نے اسلام کیوں قبول کیا" "وہ کون سی ایسی خاص دلکشی تھی جس نے آپ کا دل موہ لیا"؟ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس اب تک اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہے۔ مجھے اسلام کی کسی خاص تعلیم نے نہیں، بلکہ اخلاقیات اور حیاتِ انسانی کے اس پورے حیرت ناک نظام اور ہم آہنگی و توازن کے اس ناقابلِ بیان شاہکار نے بحیثیت مجموعی مجھے اپنی طرف کھینچا اور میرا دل موہ لیا۔ میں آج بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ اس پورے نظامِ اسلامی میں کس چیز نے مجھ پر زیادہ اثر کیا اور کس چیز نے کم۔ مجھے تو اسلام کی پوری عمارت ایسی معلوم ہوتی ہے جو فنِ تعمیر کا ایک ایسا نادر نمونہ ہو جس کے تمام حصے اور تمام اجزا کامل ہم آہنگی اور موزونیت کے ساتھ ایک دوسرے کی تکمیل کے ضامن ہیں۔ نہ کوئی چیز ایسی ہے جس کو فاضل کہا جا سکے نہ کسی چیز کی کمی پائی جاتی ہے۔ بلفظِ دیگر وہ اپنی تعمیر و تشکیل ترتیب و توازن اور قرار و استحکام کے اعتبار سے قطعی مکمل ہے اور غالباً اسی احساس نے کہ اسلامی تعلیمات و احکام میں سے ہر تعلیم موزوں اور ہر حکم برمحل ہے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا۔ اگرچہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا ہو لیکن میرے لیے ان کا تجزیہ کرنا بہت دشوار ہے۔ مختصر یہ کہ یہ معاملہ محبت اور پسند کا تھا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ محبت مجموعہ ہوتی ہے بہت سی مختلف کیفیات کا مثلاً ہماری تمنائیں اور خلوت گزینیاں، ہمارے عزائم اور کمیابیاں، ہماری طاقتیں اور کمزوریاں۔ سو میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، اسلام نے میرے کاشانۂ دل پر چھاپہ مارا اور یہ چھاپہ مار پھر نکلا نہیں بلکہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

اس وقت سے آج تک میں نے اپنی استطاعت اور امکان بھر پوری کوشش کی کہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم و فہم اور بصیرت مجھے حاصل ہو۔ میں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا، احادیثِ نبوی کو پڑھا۔ اسلام کی زبان، تاریخ کی ورق گردانی کی حتی کہ وہ بے شمار کتابیں بھی دیکھ ڈالیں جو اسلام کی حمایت میں یا مخالفت میں لکھی گئی ہیں۔ میں نے پانچ سال سے زائد عرصہ نجد و حجاز میں اور زیادہ تر مدینۂ منورہ میں بسر کیا تاکہ اس حقیقی ماحول میں رہ کر خود بھی کچھ تجربہ کر سکوں جہاں سے محمدِ عربی نے دنیا کو پیغامِ حق سنایا تھا۔ حجاز چونکہ اسلامیانِ عالم کا اجتماعی مرکز ہے، اس لیے وہاں رہ کر مجھے ان مختلف مذہبی معاشرتی نظریات کے باہمی موازنہ کا بھی موقعہ میسر آیا جو عہدِ حاضر کی دنیائے اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس مطالعہ اور تحقیق و جستجو اور غور و فکر کی بدولت اب مجھے یہ ایقانِ کامل حاصل ہو چکا ہے کہ روحانی اور معاشرتی مظہر کی حیثیت سے اسلام موجودہ مسلمانوں کی کمزوریوں پستیوں اور نقائص کے باوجود اب بھی دنیائے انسانیت کے لیے ایسی عظیم ترین طاقت ہے جو عمل و حرکت اور ترقی سے معمور ہے، چنانچہ اب میری ساری توجہات اور ساری دلچسپیاں احیائے اسلام کے واحد مقصد پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور یہ مختصر نوشتہ اسی مقصدِ عظیم کے سلسلہ میں ایک حقیری خدمت ہے۔ یہ تحریر ان لوگوں کے لیے نہیں لکھی گئی جن کا یہ عقیدہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے بے شمار لوازم میں اور انہی میں ایک اسلام بھی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جن کے پہلو میں اب بھی اس آگ کی کوئی چنگاری باقی ہے جس کی بدولت صحابۂ رسول کے دل روشن تھے۔ وہی آگ جس نے کبھی اسلام کو ایک عظیم الشان سماجی نظام اور تہذیب و ثقافت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اور جس کے کارناموں کی سارے عالم میں دھوم مچی ہوئی تھی۔

{اسلام ایٹ دی کراس روڈس
سید علی اکبر قاصد کا ترجمہ}

عبدالقدوس ہاشمی

جدّہ سے ریاض تک

جون ۱۹۳۸ء میں مجھے چار دن کے لیے جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کی قیام گاہ یعنی شہر ریاض میں جانا پڑا۔ ۱۲۔ جون سے ۱۶ جون تک ریاض میں رہا۔ میرے طویل سفرنامے سے یہ ایک دن کی ڈائری ہے جو پیش ہے ۔

جدہ سے روانگی

۸ بجے صبح کو مطار (ہوائی اڈا) پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج ہوائی جہاز کی روانگی یقینی نہیں ۔گرم وتند ہواؤں کی وجہ سے فضا ہوائی سفر کے لئے بہت زیادہ ناسازگار ہے۔ جدہ اور ریاض کے درمیان کا تمام علاقہ زیادہ تر سنگستانی وریگستانی ہے اور گرمیوں میں گرم ہواؤں کے طوفان سے یہ علاقہ بعض اوقات طیارہ رانی کے قابل نہیں رہتا۔

میرے ساتھ دو رفقاء سفر اور ہیں، عرب کی بادسموم سے ہمارا یہ پہلا تعارف ہے۔اس لیئے ہم گرم ہواؤں سے بہت پریشان ہیں دس بارہ دن پہلے قاہرہ سے مدینہ منورہ اور وہاں سے جدہ آتے ہوئے ہمیں کچھ اس قسم کی کیفیت سے واسطہ پڑا تو تھا، مگر آج کی ہواؤں کے مقابلہ میں اُنھیں بادسموم نہیں بادنسیم کا نام مل سکے گا - آج تو ابھی سے جب کہ صبح کے آٹھ ہی بجے ہیں ریگ کا طوفان اُٹھ رہا ہے۔

ہم مطار میں بیٹھے رہے۔کئی بار شربت پیے ۔تقریبًا پونے نو بجے جناب خیرالدین صاحب زرکلی نائب وزیر خارجہ اور صرف دو ہی تین منٹ کے بعد شہر جدہ کے امیرالبلد تشریف لے آئے - خیرالدین زرکلی ایک شامی عالم ہیں۔اُنکی کتاب "قاموس الاعلام" تذکرہ مشاہیر اسلام پر بڑی مشہور کتاب ہے - میں نے اس کتاب سے معجم المصنفین کے مسودات کی ترتیب میں استفادہ کیا ہے، کوئی پچاس پچپن سال کی عمر ہوگی، چھوٹی خشخشی آدھی کچی آدھی پکی داڑھی گورا رنگ ، نازک سے خط وخال، دبلے پتلے سے آدمی ہیں - نجد وحجاز کا عام لباس ، جلبیہ ، مشلح اور سیاہ عقال پہنے ہیں۔ آج کل سلطان ابن سعود کے نائب وزیر خارجہ ہیں، اور اپنی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود ادبی ذوق اور علمی مشاغل کو اب تک قایم رکھے ہوئے ہیں ان سے میری ملاقات کوئی آٹھ دن ہوئے پہلی بار یہیں جدّہ میں ہوئی تھی - اُنھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے مجھے بعض بہت ہی عمدہ اور نادر کتابیں دکھائیں۔خصوصاً ایک مطبوعہ کتاب ضخیم دو جلدوں میں مجھے دکھائی جو کسی معاصر عالم نے حاجی خلیفہ چلپی المتوفی ۱۰۶۷ء کی شہرۂ آفاق کتاب "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون"

پر ذیل و تکملہ کے طور پر لکھی ہے۔ یہ کتاب بڑی اچھی ہے اور قابلِ قدر علمی خدمت قرار دی جا سکتی ہے۔ طالب علمانہ ذوق کے اشتراک نے زرکلی صاحب کو مجھ سے قریب تر کر دیا اور پہلی بار ملنے کے بعد وہ ہوٹل میں بھی مجھ سے ملاقات بازدید کے لیے آئے تھے اور اس کے بعد پھر ملاقات ہوئی۔

امیر البلد یہ سرکاری عہدہ ہے، کوئی انتخابی منصب نہیں، حکومت مقامی، اس کے انتخابات اور اس کے صدر کا منتخب ہونا یہ سب اس علاقہ میں غیر معروف اور نامانوس ہیں۔ نجد و حجاز یعنی حکومت عربیہ سعودیہ کے ہر شہر میں ایک امیر البلد ہوتا ہے اور ہر قریہ میں ایک امیر القریہ۔ انھیں حکومت نامزد کرتی ہے کہیں کہیں انھیں میونسپلٹی کے چیرمین، سٹی مجسٹریٹ، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، کلکٹر اور سلطان کے نائب۔ سب کی خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔ شاید عدالتی اختیارات کے علاوہ باقی سارے ہی اختیارات اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ لیکن جدہ کا امیر البلد ان میں سے بہت سے اختیارات سے محروم ہے۔ کیونکہ جدہ دار السلطنۃ یعنی مکہ سے بہت قریب ہے، متعدد سرکاری دفاتر یہاں موجود ہیں اور اکثر محکموں کے اعلیٰ عہدیداروں کا یہ شہر مستقر ہے۔

تقریباً دس بجے خدا خدا کرکے یہ فیصلہ ہوا کہ جہاز روانہ ہوگا، اور سوا دس بجے ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ سعودی فضائی بیڑے کا "ڈکوٹا" جہاز ہے، جس میں ۲۴ مسافروں کی جگہ ہے۔ لیکن اس وقت صرف گیارہ مسافر ہیں۔ ایک عرب ہوا باز جہاز چلا رہا ہے، جہاز کے دوسرے ملازمین بھی سارے ہی نوجوان عرب ہیں۔

جدہ سے ریاض (نجد) کا فاصلہ تقریباً پانچ سو میل ہے۔ تمام راستہ جلی ہوئی بے آب و گیاہ مٹی رنگ کی پہاڑیوں اور ہولناک ریگستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں کہیں بیس بیس پچیس پچیس میل کے فاصلہ پر پہاڑوں کے دامن میں دو چار جھونپڑیاں اور کہیں کہیں کمبلوں کے خیمے نظر آ جاتے ہیں۔ نیم اور ببول کے درخت بڑے سخت جان ہیں جو خشک سے خشک مقامات میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہاں تو پچاس پچاس میل تک نیم اور ببول بھی نظر نہیں آتے۔ بڑی تیز اور نہایت گرم ہوا چل رہی ہے۔ لیکن ابھی ریگ کا طوفان شروع نہیں ہوا ہے اس لیے ہوائی جہاز سے ہم اکثر دوربین کے ذریعہ زمین دکھائی دیتی ہے۔ ہواؤں کے تھپیڑے اتنے شدید ہیں کہ ہوائی جہاز بڑی مشکل سے اپنی رفتار کو سنبھال پاتا ہے کبھی سیکڑوں گز نیچے اور کبھی سیکڑوں گز اوپر، اسی طرح کبھی دائیں بائیں مڑ جاتا ہے۔ مسافروں کو دوران سر اور متلی کی شکایت ہے، لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ صرف آج ہی یہ حال نہیں بلکہ اس موسم میں یہاں یہی کیفیت رہتی ہے اور کبھی کبھی تو ہفتوں تک ہواؤں کا زور اتنا رہتا ہے کہ جہاز پرواز ہی نہیں کر سکتا۔

پاکستانی وقت سے تقریباً تین بجے دن اور عربی وقت سے تقریباً ۹ بجے یعنی گرمی اور لو کے شباب میں ہمارا طیارہ ساڑھے چار گھنٹوں کے ہچکولوں کے بعد ریاض کے مطار پر پہنچا، عرب طیارہ باز نے واقعی کمال مہارت سے کام لیا، اس قدر خطرناک سفر اور اس درمیانی کے ساتھ تو بے ہوا، ہولناک اتنے سخت جھکولوں میں جب کہ اتنا بڑا ہوائی جہاز ایک تنکے کی طرح بے بس تھا، اور ریگ کے طوفان میں جب کہ ہوائی اڈہ دوربین سے بھی پوری طرح صاف نظر نہ آتا تھا، ہوائی جہاز کو صحیح سلامت زمین پر لے آنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

جہاز کا دروازہ کھلا اور ہم باہر آئے۔ گرمی کے مارے بدن جلا جا رہا تھا، جہاز سے نیچے اترتے ہی سفید اونی عبا اور سیاسی رنگ کا کوفیہ اوڑھے ہوئے ایک بزرگ آئے۔ بہت گورے چٹے، میانہ قد، چوڑی سفید داڑھی، چہرے سے

آگئی ہیں، جو نصب ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ امریکی انجینیروں اور امریکی کاریگروں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ بازار اچھا خاصا ہے۔ اور ضرورت کی تقریباً ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہ چیزیں امریکی ساخت کی ہیں۔ اور اس طرح امریکہ والے جو رقم پٹرول پر حق شاہی کے نام سے ظہران میں دیتے ہیں وہ اپنی مصنوعات کی منہ مانگی قیمت کی شکل میں گویا واپس وصول کر لیتے ہیں۔

پانی اس شہر میں کنووں سے پیا جاتا ہے۔ یہاں کا پانی خوش ذائقہ اور صحت بخش ہے۔ ریاض کے قرب وجوار میں کھیتی باڑی کا نام نشان نہیں ہے۔ سبزی، ترکاری، اور غلہ اس شہر کو خرج نامی ایک مقام سے ملتا ہے جہاں کچھ دنوں سے سلطان معظم نے امریکی ماہرین کی نگرانی میں کاشتکاری شروع کر دی ہے۔ خرج ریاض سے کوئی چالیس پچاس میل پر واقع ہے۔

شہر ریاض ملک کے دوسرے حصوں سے بذریعہ تار، ٹیلیفون ملحق ہے۔ ایک ریلوے لائن مملکت سعودیہ عربیہ کے بندرگاہ ظہران سے ملنا شروع ہوئی ہے۔ بندرگاہ ظہران خلیج فارس پر واقع ہے۔ ایک غیر تعمیر شدہ بندرگاہ ہے۔ یہیں امریکی پٹرولیم کمپنی کا کاروبار ہے اور ان ہی کی مساعی سے یہ ریلوے لائن بھی بن رہی ہے۔ باقی رہی سڑک تو نہ یہاں ہے اور نہ حجاز میں پتھریلے اونٹنی کے پیچھے راستے ہیں۔ پرانے کاروانوں کے بجائے اب امریکی ساخت کی موٹریں اور لاریاں دوڑتی پھرتی ہیں۔

تعلیم تعلیم محض ابتدائی اور وسطانی حد تک ہے اور سرکاری طور پر اس کا مفت انتظام ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے پوری مملکت میں کوئی درسگاہ نہیں، نہ پرانی قسم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے اور نہ نئی قسم کی، نہ فنی تعلیم کے لئے اور نہ غیر فنی کیلئے اعلیٰ تعلیم کیلئے طلباء کو سرکاری خرچ سے مصر بھیجا جاتا ہے۔ سنا ہے کہ آج کل بھی تقریباً دو سو طلباء مصر میں زیر تعلیم ہیں۔

پیشہ کے اعتبار سے یہاں کچھ لوگ تو تجارت پیشہ ہیں۔ باقی سارے کے سارے ملازم ہیں۔ کشوری کم اور فوجی سپاہی زیادہ، زراعت پیشہ آبادی شہر ریاض کے قرب وجوار میں کہیں نہیں۔ نجد کے دیہات دو چار جھونپڑوں، یا دو تین خیموں کا مجموعہ ہوتے ہیں، ان میں جو لوگ رہتے ہیں۔ وہ دنبے، بھیڑ، بکریاں اور اونٹ پالتے ہیں۔ عرب کے مشہور زمانہ گھوڑے بھی علاقہ نجد ہی میں ہوتے ہیں، ان کے نسب نامے اب تک محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ نجدی گھوڑوں سے اچھے گھوڑے کہیں اور نہیں پائے جاتے۔ پہلے لوگ یہاں سے گھوڑے بڑی بڑی قیمتیں دے کر لے جاتے تھے۔ لیکن اب مشینی سواریوں نے ان کی اہمیت کو کم کر دیا اور دوسری طرف حکومت نے بھی ان کا باہر لیجانا ممنوع قرار دے رکھا ہے۔

پانی اس علاقہ میں بالکل نہیں برستا۔ سال دو سال میں کبھی کبھار چھینٹیں پڑ جاتی ہیں۔ اور بس! **نجد کے بادیہ نشین** بات کے دھنی، مہمان نواز، قول کے سچے اور حقیقی معنوں میں وفادار ہوتے ہیں۔ مذہب ان کی سرشت میں داخل ہے۔ عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ باہر نکلتی تو ہیں۔ مگر برقعوں میں۔ آپ سارے شہر میں گھوم آئیے۔ ایک بھی زنانہ چہرہ آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

امن امن پوری مملکت عربیہ سعودیہ میں ایسا ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں اور کہیں نہیں، سڑک پر قیمتی چیز گر جائے مگر کوئی اٹھا لینے کی جرأت نہیں کر سکتا، ایک اکیلی عورت سونا اچھالتی ہوئی جدھر چاہے چلی جائے کوئی اس کو چھیڑ نہیں سکتا۔ پولیس کے روزنامچے کئی کئی ماہ تک کسی شکایت سے خالی رہتے ہیں اور فوجداری عدالت میں بھی اکثر پورے سال میں ایک یا دو مقدمے آتے ہیں۔ یہاں کی عدالتوں میں وکلاء سرے سے پائے ہی نہیں جاتے۔

فوجداری و دیوانی دونوں شعبوں میں اسلامی قوانین رائج ہیں۔ حنبلی فقہ پر عملدرآمد ہے۔ ان ہی قوانین کا فیض ہے کہ امن کے معاملہ میں صحرائے نجد کو پیرس کے مجازی پارکوں اور لندن و نیو یارک کی سر بفلک عمارتوں پر فضیلت حاصل ہے وہاں تمدن و حضارت کی روشنی میں جرائم پرورش پاتے ہیں اور یہاں بدویت کے دھندلکے میں زندگیاں برائیوں سے دور ہیں۔

ریاض کا عروج

جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کے عروج کے ساتھ ریاض کا عروج شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ دس ہزار کی آبادی کا ایک قصبہ تھا، جہاں بیٹھ کر خاندان ابن رشید نجد کے ایک بڑے حصہ پر حکمرانی کرتا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سلطان ابن سعود نے خاندان ابن رشید پر فتح پائی، اس کے کچھ دنوں بعد جب سلطان نے شریف حسین کے خلاف فوج کشی کر کے حجاز پر بھی قبضہ کر لیا اُس وقت ریاض کا ذکر اخباروں میں آنے لگا، اور دنیا اس قصبہ سے بادشاہ کی قیام گاہ ہونے کی حیثیت سے واقف ہوئی۔ اور اب دو تین سال سے اس قصبہ میں کچھ ترقی کے آثار شروع ہوئے۔ ابھی تو اس کا مطار (ہوائی اڈہ) بس صرف ایک میدان اور دو خیموں پر مشتمل ہے۔ جہاں سے جدہ اور ظہران کے مابین خدمۃ ہوائی گذرتا ہے اور روزانہ ایک ڈکوٹا جاتا اور ایک آتا ہے۔

قصر شاہی

عصر کی نماز سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک فوجی افسر نے آکر اطلاع دی کہ سلطان معظم ملاقات کے لیے طلب فرماتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی متعدد فرمانرواؤں اور بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں اور ہر دربار کے کچھ رسمی آداب ہوتے ہیں، اس لیے میں نے جناب ناظم صاحب مہمان خانہ سے شاہی دربار کے آداب پوچھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں کوئی آداب و رسوم نہیں ہوتے، اچھا اطمینان ہوا، ورنہ بادشاہوں کے درباران رسوم و آداب کی وجہ سے بھلے آدمیوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ساتھ موٹر میں، میرے دونوں رفقائے سفر کے علاوہ جناب رشدی صاحب سکریٹری امور خارجہ بھی تھے۔ میں نے اثنائے راہ میں ان سے بھی درباری آداب کے متعلق سوال کیا، تو انھوں نے مسکرا کر کہا، درباری آداب تو بس یہ ہیں کہ صرف اتنا خیال رکھنا کہ سلطان تم سے بہت بڑی عمر کے اور بزرگ آدمی ہیں اس سے زیادہ کچھ اور آداب یہاں نہیں ہوتے۔

مہمان خانہ سے قصر شاہی کچھ بہت زیادہ دور نہیں چند منٹوں میں موٹر کار قصر شاہی کے دروازہ پر پہنچ گئی۔ قصر کے گرد مشین گنوں اور بکتر بند گاڑیوں کا پہرہ تھا۔ اس کے علاوہ سیکڑوں سپاہی ادھر اُدھر رائفلیں لیے ٹہل رہے تھے۔ نجدی سپاہیوں کو دیکھ کر بہ یک نظر جو اثر مرتب ہو سکتا تھا وہ یہ کہ انھیں جدید اسلحہ تو مل گئے ہیں، مگر ابھی انھیں ایسے اسلحہ سے قریب ہی میں واسطہ پڑا ہے۔ جرأت، وفاداری اور فوجی اسپرٹ کی ان سپاہیوں میں کمی نہ تھی مگر فوجی تربیت کی کمی صریحاً محسوس ہوتی تھی۔

قصر شاہی اگرچہ بادشاہوں کے ایوانوں کی طرح فن تعمیر کا شاہکار نہ تھا۔ مگر بہت وسیع ضرور تھا، اور کچی مٹی کی یہ تعمیر جدید تعمیر ہونے کے باوجود قدیم طرز تعمیر کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ قصر کے اندر مختلف دروازوں اور مسقف راستوں سے گذرتی ہوئی موٹر ایک بہت بڑے عالیشان دروازے پر ٹھہری۔ یہاں سلطان کے چیف ایڈیکانگ جناب جنرل جودت بے نے استقبال کیا، جنرل جودت بے ایک ترکی نژاد افسر ہیں۔ بارعب و دیدہ، سرد و گرم چشیدہ خوش مزاج، آزمودہ کار وضع قطع چال ڈھال اور دل و دماغ

تمام اعتبارات سے ایک مسلمان سپاہی — ہم ان کے ساتھ ایک طویل برآمدے سے گزرے جس میں بہترین قالین بچھے ہوئے تھے۔ اس برآمدے میں جابجا دس دس مسلح آدمیوں کی جماعت ملتی رہی۔ ہم ان کے سلاموں کے جواب دیتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ یہاں سلطان معظم کے نجی سکریٹری نے استقبال کیا۔ ہم اس کمرے میں کوئی دس بارہ منٹ بیٹھے، اس کے بعد جنرل جودت نے جو ہمیں یہاں چھوڑ کر غالباً اجازت باریابی حاصل کرنے چلے گئے تھے واپس آکر ہمیں ساتھ لیا۔ اور بالائی منزل پر آئے۔ اس منزل پر بھی کئی طویل برآمدوں سے گزرنا پڑا جن میں جگہ جگہ دس دس مسلح سپاہیوں کی جماعتیں ملتی رہیں۔ آخر میں ایک وسیع اور عظیم الشان ہال میں پہنچے۔ اس ہال میں سنجدی قالین اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اور عربی وضع کے طاقچی کمروں کی طرح دیوار سے ملحق چاروں طرف نشست کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ چبوترے پر گدے۔ اور قالین پڑے ہوئے تھے۔ یہ تھی جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کی نشست گاہ! دس بارہ آدمی جن میں سلطان کے بڑے شہزادے اور سلطنت کے ولی عہد امیر سعود بھی تھے، اس وقت یہاں موجود تھے۔ سلطان معظم اس کمرے کے ایک کونے میں اس طرح تشریف فرما تھے کہ اوروں سے ان کا امتیاز مشکل تھا۔ بادشاہ نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ نہایت خندہ پیشانی اور بہ غایت محبت و مہربانی سلام و مصافحہ ہوا۔ اپنی نشست سے ملحق نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، اور میں اپنے دونوں رفقاء کا تعارف کرانے کے بعد بیٹھ گیا۔ پہلے قہوہ اور پھر چائے آئی۔

سب سے پہلے جناب رشدی صاحب نے عرض کیا کہ یہ عربی بولتے ہیں، اس لئے ترجمان کی ضرورت نہیں۔ سلطان نے فرمایا بہت اچھا ہے کہ ہم ان کی اور یہ ہماری بولی سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد سلطان نے گفتگو شروع کی، اور ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ علمی، دینی، اور بین الاقوامی امور موضوع سخن رہے۔ میں نے نجد و حجاز میں قیام امن اور آبپاشی کیلئے انہیں مبارکباد پیش کی اور مسلمانان عالم کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔ اور بعض ضروری امور کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ ان میں سے بعض کی طرف سلطان اور ان کی حکومت متوجہ ہے اور باقی امور کی طرف بھی وہ بہت جلد ہی توجہ فرمانا چاہتے ہیں۔

سلطان کو دیکھ کر

سلطان کی عمر ۶۰، ۷۰ سال کی ہوگی، بھاری بھر کم بدن، بہت ہی بلند و بالا قد، ڈاڑھی مونچھوں پر سیاہ خضاب، ایک آنکھ میں پھولی ہے، موٹے تالوں کی اور بڑی موٹی کمانیوں کی عینک لگاتے ہیں، رنگ سانولا سرخی مائل، موٹا اور سپاہیانہ ناک نقشہ، بہت حلیم، آہستہ اور باوقار انداز میں ایک ایک لفظ تول کر نہایت فصیح عربی گفتگو کرتے ہیں، لباس بہت ہی سادہ بلکہ بڑی حد تک معمولی، سفید جلابیہ، اس پر بھورے رنگ کی اونی عبا، سر پر سرخ چارخانہ کی سوتی کوفیہ اور سیاہ عقال، بیٹھتے ہیں تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے مشبک کئے رہتے ہیں۔

سلطان سے گفتگو کرتے ہوئے یہ ہرگز محسوس نہیں ہوا کہ کسی بادشاہ سے گفتگو کر رہا ہوں۔ وہ اس قدر محبت و شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں کہ جیسے کوئی بڑا بوڑھا اپنے گھر کے کم عمر نوجوان سے گفتگو کر رہا ہو، سلطان عبادت گذار اور دیندار آدمی ہیں، گفتگو کے دوران میں کثرت سے قرآن حکیم کی آیتیں اور احادیث نبوی پڑھتے جاتے ہیں۔ دنیا کی تازہ ترین اور وسیع معلومات رکھتے ہیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف طبائع کے انسانوں کو قابو میں رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت سلطان کو عطا کی ہے۔ اس سوا [illegible]

سلطان ابن سعود کی دینداری، مذہبی شغف اور [illegible] اپنی جگہ مسلم مگر ان کے صحیح مناقب ہیں وہ خلافت علی منہاج النبوت کا [illegible] دیکھا جاتا ہے۔ [illegible] (مدیر)

ہیں جس کے وہ فرماں روا ہیں تقریباً دو کروڑ ایسے انسانوں کی آبادی ہے جو بے قاعدگی، بدنظمی اور خونریزی کے لیے ایک مدت سے ضرب المثل رہے ہیں، اور خود شاہی خانوادے کے ارکان اور ماتحت امراء جن کا مزاج ہی تسلط، بغاوت اور سرداری کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ الحمدللہ کہ سلطان کی گرفت کے ذریعہ خداوند تعالیٰ نے ان سب کو امن پسند، مطیع اور فرماں بردار بنا رکھا ہے اور ذرائع رسل و رسائل کی اس کمی کے باوجود انہیں اس طرح قابو میں کر لیا گیا ہے کہ آج دنیا کا کوئی ملک امن عامّہ اور قانون کے احترام میں ان کی سلطنت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مغرب کے قریب ہم قصر شاہی سے مہمان خانہ میں واپس آئے اور رات کو مہمان خانہ کی تیسری منزل پر چاندنی میں آرام کیا۔ ریگستانی علاقوں کی راتیں عموماً خوشگوار اور خنک ہوتی ہیں، یا یوں سمجھئے کہ قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار نہ شد۔ دن کی گرمی کے بعد رات بڑی خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ رات اتنی اچھی تھی کہ شاید انہی راتوں کی امید میں مجنوں (قیس) نے نجد کے صحراؤں کی خاک چھانی ہو، ایسی خنک، خوشگوار اور سہانی رات کی تنہائی بھی ایک "ہنگامۂ عشرت" سے کم نہیں۔

اس کے بعد تین دن شہر ریاض میں قیام رہا، جس میں ولی عہد، اعیانِ حکومت اور امراء کی ملاقاتوں کے علاوہ کوہستان و ریگستان کی سیر و سیاحت بھی شامل تھی، نجد کے دوسرے مقامات پر بھی جانا ہوا — اس تفصیل کو کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں، انشاء اللہ خاطر میسر ہوا تو کچھ اور بھی لکھیں گے۔

اگرچہ دل نہ خنک بہر چہ از نظر گذرد
خوشا! روانی عمرے کہ در سفر گذرد

ہر واقعہ دل و دماغ کی لوح پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے، ان میں سے کچھ نقش امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ جاتے ہیں، کچھ دھندلے پڑ جاتے ہیں اور بعض جوں کے توں باقی رہتے ہیں —— میرا یہ سفر بھی اسی قسم کے نقوش کی یادگار ہے، مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کون سا نقش ہمیشہ باقی رہیگا؟ ابھی تو یہ ساری کی ساری لکیریں تازگی آمیز ہیں۔

تنہائی میں جب ہر طرف سے فرصت ملجاتی ہے تو اس سفر کا ایک ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے ایکا ایکی آ کھڑا ہوتا ہے ایوانِ شاہی سے لیکر نخلستان کے جھونپڑوں تک ہر چیز تصورات کے پردے پر نمایاں ہو کر بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ کلیّہ سے جُزئیہ اور اجمال سے تفصیل پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ کھجوروں کی ڈالیاں، ناہموار راستے، پتھریلے موڑ، اور اونٹوں کے پیروں کے نشان تک مصوّر ہو جاتے ہیں۔

نجد و حجاز کا سفر ختم ہو گیا مگر زندگی کا سفر جاری ہے (اور نہ جانے کب تک جاری رہیگا، چاہے دنیا کے اور سفر ناکام ہو جائیں مگر یہ زندگی کا سفر خدا کرے کامیاب ہو جائے کہ اس کے اختتام پر ہی منزلِ مقصود آئے گی۔

امتیاز علی خاں عرشی رامپوری

اُردُو شاعری پر غالب کا اثر

بڑا شاعر اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ پہلے پہل اُس کا ساتھ نہیں دیتا، اور لوگ اُس کے کلام کو ٹکسال باہر اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ یہ بیچارہ سوچتا ہے: کہیں سچ مچ میرے شعر بکواس تو نہیں؟ ذوقِ سلیم ڈھارس بندھاتا ہے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ خود زمانہ کی نادانی اور بدمذاقی ہے۔ اس سوچ بچار سے حریف فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ھنر کو زیادہ تیز اور زہریلا بنا لیتے ہیں۔ اب شاعر بھی نہیں چوکتا اور ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ آخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ زبان سے اقرار کیے بغیر دونوں فریق کچھ باتیں مان اور کچھ منوا لیتے ہیں۔ بڑے شاعر کی اثر اندازی اور اثر پذیری کا یہ پہلا قدم ہے اسی پر اس کی آیندہ شہرت و مقبولیت اور بقا کی عمارت کا انحصار بھی ہوتا ہے۔

میرزا غالب بھی بڑے شاعر تھے۔ اُن کے سامنے بھی وہی آیا جو ہر بڑے شاعر کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ اُن کے حریفوں کو بھی نہ اُن کی خیال آرائیاں پسند تھیں، نہ ان کی لفظی تراش خراش بھاتی تھیں۔ کوئی ان سے پوچھتا "حضرت آپ کے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال   پھر دوا جتنی ہے اُس بھینس کے انڈے میں ڈال"

کوئی بر سر مشاعرہ پڑھ دیتا

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

میرزا صاحب سوچتے:-

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل   سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل،
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش   گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل،

کبھی حسرت سے محفل پر نظر ڈال کر فرماتے:-

بیاورید گر اینجا بود زباں دانے   غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

اسپر بھی حریف ترس نہ کھاتے، تو پکار اُٹھتے:-

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سچی بات تو یہ ہے کہ اس کش مکش میں میرزا صاحب کے حریف بھی غلطی پر نہ تھے۔ میرزا صاحب زندہ ہوتے اور اس قسم کے اشعار فرماتے:-   اب عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

تو آج بھی ہم سب مل کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور باادب عرض کرتے کہ حضرت

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانئے   ہے نظم و نثرِ دل کی سربسر غلط

پھر کیا میرزا صاحب ہی نے اپنی مشکل پسند طبیعت سے یہ سند حاصل کی تھی، چنانچہ ایک صاحب کو لکھا ہے :-

"قبلہ، ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کی طرز پر ریختہ لکھتا تھا، پندرہ برس کی عمر سے
پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو
اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کئے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دئیے"

یہاں اس بات کا کھلا اقرار ہے کہ جو یہاں سے بار بار ٹوکے گئے پر انھیں بھی خیال آیا کہ اپنے کلام کو پرکھیں، اس کے لیے پہلے کسوٹی کی ضرورت تھی، جو ظہوری، نظیری، عرفی وغیرہ کے کلام میں ہاتھ آگئی، میرزا صاحب نے اس پر اپنے طلسمی اشعار کس کر دیکھے تو ان کی حقیقت کھُلی جس کے نتیجہ میں اُنھیں اردو اشعار کے بڑے حصّے سے دست بردار ہونا پڑا۔

آپ کہیں گے: "یہ تو میرزا صاحب کی ہار ہے" میں عرض کروں گا: "ہرگز نہیں" میرزا صاحب نے صرف میدان چھوڑا تھا، ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری سے بالکل ہاتھ کبھی نہیں اُٹھایا، ہاں، ایرانی مسالے سے ایٹم بم بنانے میں زیادہ وقت صرف کیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد اس میدان میں واپس آئے، تو ان کے پاس اس قسم کے بے بدل ہتھیار تھے :-

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے	کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل	اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے	پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب	کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس عرصے میں میرزا صاحب کے حریف بھی اپنے کمزور پہلوؤں کی بڑی حد تک اصلاح کر چکے تھے۔ اب جو میرزا صاحب نے میدانِ اردو میں قدم رکھا، تو ان کے ڈرسے "قفس کی تیلیاں، اور تارِ قفس کی تیلیاں" سامنے نہ لائی گئیں اور نہ زنجیر و کمر کالی گئی، بلکہ مومن، آزردہ جیسے پختہ کاروں کے پرے ان نئے قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر سامنے آئے :-

مومن :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک	شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں	اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

آزردہ :-

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے	یہ کم نگاہیاں تری، بزمِ شراب میں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں	اِک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کامل اس فرقۂ زہاد میں اُٹھا نہ کوئی	کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

یہ تھا وہ اثر جو غالب نے اپنے زمانے کی شاعری پر ڈالا اور قبول کیا۔ اگر ان کے اور دلی کے حلقۂ ادب کے درمیان

اتنی کشش نہ ہوتی تو یقین ہے کہ شعر میں وہ گہرائی اور گیرائی کبھی نظر نہ آتی جو دہلی اسکول کی جان ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد دلّی اور لکھنؤ کی بساط الٹی تو اُن کے ادبی پروانے رامپور کی روشن شمع کے اردگرد جمع ہو گئے۔ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ، میرزا صاحب کے شاگرد تھے اور دربار میں انھیں کا طوطی بول رہا تھا۔ ناممکن ہے کہ یہ سب پروانے سرکار کے مذاق کی رعایت نہ کرتے ہوں۔ نواب خلد آشیاں، جن کا عہد رامپور کے ادبی عروج کا آخری نقطہ تھا، امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ لیکن اس عرصے میں دہلی و لکھنؤ کے ٹکراؤ سے ایک نیا رنگ پیدا ہو چلا تھا، جس کی تکمیل خود ان کے زمانے میں ہوئی۔ درباری شاعروں کے لئے ضروری تھا کہ آقا کی پسندیدگی کی خاطر کسی نہ کسی حد تک وہی رنگ اختیار کریں۔ ان رامپوری حضرات میں سے داغؔ و امیرؔ نے جگت استاد کی حیثیت اختیار کی اور اس طرح میرزا صاحب کی سادہ پرکاری قدرے شوخ ہو کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

ادھر یہ صورت درپیش تھی، اُدھر انگریزی علاقوں میں زندگی کے پل پل نت نیا رنگ بدل رہے تھے۔ وہاں کے باشندے محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے لئے "مقاماتِ آہ و فغاں" اور بھی ہیں کوئی غیبی آواز ان سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھی:۔

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے | قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

حسنِ اتفاق کہ اس آواز پر حالیؔ اور آزادؔ آگے بڑھے جن میں ایک خود غالبؔ کے شاگرد تھے اور دوسرے گو ان کے حریف ذوقؔ کے نام لیوا تھے۔ مگر تھے بڑے دانا اور دیدہ ور۔ ان دونوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور اپنے خونِ جگر سے اس پودے کو سینچ کر نئی پود کے حوالے کر دیا۔ حالی اور آزاد کا زمانہ دب کر سمجھوتا کرنے کا تھا، اس بنا پر ان کے مسائلِ گفتگو بھی محدود تھے، انھیں مشاہدۂ حق کے ذکر میں "بادہ و ساغر" کی ضرورت نہ تھی اور دشنہ و خنجر کے بغیر بھی ان کا کام چل جاتا تھا۔ یہ نئی پود کچھ ایسی باتیں بھی کہنا چاہتی تھی جو ان بزرگوں کے نزدیک "ناگفتہ" تھیں، اور اس لئے ان سے زیادہ گہری فکر، پُرزور الفاظ اور حقائق نگر وسیع طرزِ بیان کی محتاج تھی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جس عمدگی کے ساتھ غالبؔ نے نظر ڈالی تھی، اس نے ان نئے شاعروں کو غالب کے کلام کے گہرے مطالعے کی طرف متوجہ کیا۔ یہاں اظہارِ خیال کے لئے انھیں نئی تشبیہیں، انوکھے استعارے، اور شگفتہ ترکیبیں ہاتھ آئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک ہی بات کو غالب نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے، اور ہر جگہ طرزِ ادا میں بڑی پرلطف جدت ہے۔ مثلاً کبھی کہتا ہے:۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک | میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کبھی اسی مضمون کو یوں باندھتا ہے:۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیئے ذوقِ معاصی بھی | بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو۔

اور کبھی اس انداز سے ادا کرتا ہے:۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد | مجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا! نہ مانگ

اور کبھی اس صورت سے نظم کرتا ہے:۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ آتشِ خاموش، گلبانگِ تسلی، موجِ نگاہ، خود داریِ ساحل، شہپرِ رنگ، جوادِ بستگاہ

لطف تلمیحات جنت نگاہ اور فردوسِ گوش۔ جیسی ہلکی پھلکی ترکیبوں میں کتنا لطف اور کس درجہ وسعت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نئے اہلِ ادب نے اپنی نظم و نثر دونوں میں غالب کی پیروی کی اور آزاد و نیاز اور چکبست واقبال جیسے باکمال نظم و نثر لکھنے والے پیدا ہو گئے۔

آج کل کی سیاسی دنیا کے ساتھ ادبی دنیا نے بھی نئی کروٹ بدلی ہے، اور نئے ادیبوں کے سامنے کچھ اور نئی باتیں آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اس گروہ کے مسائل کیا ہیں اور کیسے ہیں، اس بحث سے ہمیں اس وقت سروکار نہیں۔ جو بات یہاں ظاہر کرنی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک پرواز کا تعلق ہے ان سب کے یہاں معمولی طبعی فرق کے ساتھ غالب کے انداز بیان کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

بہتر یہ ہوگا کہ اپنے مقصد کو واضح کرنے کے لیے غالب کے چند شاگردوں اور دو چار ہم رنگ شاعروں کے کچھ شعر آپ کے سامنے پیش کروں:-

عارف:- سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھا تھا کہیں — چھیڑنا تھا تو کوئی شکوہ بے جا کرتا

تسنیم:- کام دو پاؤں کا اک سر سے نکلتا ہے کبھی — ہو سکے تو رہ کوئے جاناں ہم سے

سالک:- افزوں ہے ترکِ عشق سے اندوہِ ترکِ عشق — پرہیز کر کے ہم ہوئے بیمار، دیکھنا
تھی شکیبائی علاجِ اضطراب — چارۂ رنجِ شکیبائی نہیں
ہے خضر خوش کہ نام رہے اور نشاں نہ ہو — ہم کو نصیب زندگیِ جاوداں نہ ہو

ناظم:- اے نوا سنج "انا الحق" ترا دعویٰ سچ ہے — لیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا
شرمندہ ہوئے پہ کہیں ضد اور نہ بڑھ جائے — عہد اس کا اُسے یاد دلانا نہیں اچھا
شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم — پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم
میں نے پھونکا بھی تو کیا تم نے تماشا دیکھا — گھر کو اپنے ہے جنہیں آگ لگاتے جانا
کھلے کیا دل، در و دیوار کے آثار باقی ہیں — ہوا ہر چند گھر ویراں پہ صحرا پھر بھی صحرا ہے

شیفتہ:- کہا کل میں نے ملے سرمایۂ ناز — تلوّن سے بھی تم کو مدعا کیا؟
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں؟ — کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا؟
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں؟ — کبھی الطافِ جرأت آزما کیا؟
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا — کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں "خطا کیا"؟
کبھی اس دشمنی پہ بہرہ سکیں — پئے ہم جلوہ ہائے دلربا کیا؟

یہ سب طول اُس نے سُن کر بے تکلف — جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا:
"ابھی تک مہرباں واقف نہیں تم — کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا؟"

حالی:- تم کو ہزار شرم سہی ہم کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو — شاکی نہیں محل ستمِ روزگار کا
ہنستے ہیں اُس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں ہیں ہم
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

اقبال:- منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت — اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر — کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے
رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو — کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق — سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

فانی:- اللہ رے بے نیازیٔ آدابِ التفات — دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو — غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر
شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں — بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ظرفِ ویرانہ بقدرِ وسعتِ وحشت نہیں — لاؤ ہر ذرّے میں پیدا وسعتِ صحرا کریں
زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں — پھرتا ہوں دھجیوں کو گریباں کئے ہوئے

وحشت:- بجز خونِ تمنا کیا نتیجہ ہے تمنا کا — بغیر از برقِ خرمن اور کیا حاصل ہو خرمن سے
چکبست: زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ ان شعروں کو سن کر آپ نے کیا رائے قائم کی۔ مگر میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے پردے سے غالب کی یہ آواز سنائی دے رہی ہے

کیوں صاحبو! میں نہ کہتا تھا ع — قدرِ شعرِ من بگیتی بعدِ من خواہد شدن

مرزا سلیم بیگ

تحریریں ـــــ فنِ شناخت کے آئینہ میں!

رسم الخط کی نزاکتیں، جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں

دنیا کا چاہے کوئی فن اور علم کیوں نہ ہو اُس سے واقفیت اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے متعلقہ فن کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس سے ایک تو علم کے حصول میں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا نہیں پڑتا دوسرے علم کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے۔ فنِ شناخت تحریرات کا علم حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ان تحریروں کے رسم الخط اور نشستِ حروف کے سمجھنے اور ان پر غور کرنے کے لیے خصوصیاتِ تحریر کا کافی مواد نہاں خانۂ ذہن و فکر میں موجود ہو اور ان تحریروں کے حسن و قبح کا بھی تجربہ ہو۔

ماہرینِ فنِ شناخت تحریرات (Hand-writing Experts) نے دو اصلی اور مصنوعی تحریروں کے مقابلے اور امتحان کو آسان بنانے اور اصولی قرار دینے کے لیے تحریر کو الفاظ میں، اور الفاظ کو حروف میں اور حروف کو اجزاء میں تقسیم کر دیا ہے ہر حرف کے کئی اجزاء قرار دیکر ان کے نام تجویز کر دیئے ہیں۔ ان اجزاء کے نام یاد رکھنا مشکل کام نہیں کیونکہ یہ نام حرف کے جز کی مانند سی شکل کے مشابہ ہوتے ہیں اور نام جز کی شکل کو ذہن میں لے آتے ہیں۔ چونکہ اس علم کی یہ بنیاد ہے اس لیئے ان کو سمجھ لینا اور تحریر یا دستخط کے امتحان کے وقت ان سے کام لینا امتحان کی وقت کو آسان کر دیتا ہے۔ حروف کے اجزاء کیا ہیں؟ ان کو سمجھانے کے لیے بطور تمثیل لفظ "فاران" کو لیجئے اس لفظ میں "ف" "ر" "الف" کے علاوہ سب حروف سیدھے سچے ہیں۔ پہلا حرف "ف" ہے۔ اس کے شروع گول دائرے کو (EYE) اور اس گول دائرے کے بعد جس حصّہ نے شروع تک سیدھا حصہ کو آرک (ARK) اور آخر تک کے حصہ کو کشش (STORKE) اور بالکل آخر میں جو ایک نوشہ اوپر کو اٹھ جاتا ہے اُس کو (TICK) کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر زبان کی تحریریں اور دستخطوں کو تقسیم کرکے تجزیہ اور امتحان کیا جاسکتا ہے۔

نقطے - اعراب - مرکز کم و بیش ہر زبان کی تحریروں میں ہوتے ہیں۔ اردو - فارسی اور عربی میں ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں میں گو بالالتزام پابندی نہیں کی جاتی۔ مگر پھر بھی بہت کچھ نقطے اور مرکز لازمی ہوتے ہیں۔ ورنہ مرکز تو لفظ پڑھا نہیں جاتا یا وہ کچھ اور معنے پیدا کر دیتا ہے۔ ان تینوں زبانوں کے رسم الخط شکستہ۔ نستعلیق اور نسخ ہوتے ہیں۔ شکستہ وہ رسم الخط ہے جو عام طور پر ہاتھ سے لکھنے میں کام آتا ہے نستعلیق مطبوعات کے لیے، اور نسخ عربی

اور سندھی تحریروں کے لئے [illegible] ... [illegible]
شکستہ اور بعض کامل نستعلیق ہوتے ہیں

ماہرین نفسیات کا فیصلہ ہے کہ بعض عواطف و میلانات انسانوں کو ورثہ میں ملتے ہیں، بالکل اسی طرح تحریروں کی ساخت کشش نوک پلک اور ہیئت ترکیبی پر بھی ملکی خصوصیات اور موروثی عادتیں اثر انداز ہوتی ہیں، عربی اور سندھی تحریریں رسم الخط کے اعتبار سے ہوتی تو شکستہ ہیں مگر صورتِ الفاظ اور نشستوں کی وجہ سے یہ شناخت ہو سکتی ہے کہ یہ تحریر کسی عرب کی ہے یا وہ تحریر کسی سندھی کی ہے۔ آپ ذرا دقتِ نظر سے کام لیں تو تحریروں میں ملکی شہری یا خاندانی خصوصیات معلوم ہو سکتی ہیں۔ مشکل صرف یہ ہوتی ہے کہ آپ کے ذہن میں ہر ملک یا ہر شہر کی خصوصیات محفوظ نہیں ہوتیں اس لیے عام طور پر امتیاز یا شناخت میں طبیعت کو الجھن پیدا ہوتی ہے اور دماغ غور و فکر کرنے سے کتراتے ہیں

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ شہری اور ملکی خصوصیات جو تحریروں میں نمایاں ہوتی ہیں وہ آپ کے ذہن میں نہیں ہیں حالانکہ آپ انکو روزو یکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی خط اردو تحریر کا لکھنؤ سے آیا ہوا ہو تو اسے سامنے رکھ لیجئے اور پھر دہلی، پنجاب یا حیدرآباد دکن کے کسی اردو خط کی تحریر سے مقابلہ کیجئے، دیکھئے کہ ان دونوں تحریروں میں شکستہ اردو کس طرح لکھی ہوئی ہے۔ ان دونوں تحریروں میں حروف کی کرسی اور نشستوں کا کیا طریقہ ہے۔ گنجان تحریر کون سی ہے اور فصل حروف و فصل سطور کے لحاظ سے کون سی تحریر کشادہ ہے۔ اب پھر مختلف اشخاص کے مختلف وقت میں لکھے ہوئے خطوط مقابلے میں لاتے جائیے اور ان کی خصوصیات پر غور کرتے جائیے۔ دو چار، دس پانچ تحریروں کا مقابلہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے اور یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ لکھنؤ کی تحریریں گنجان ہیں اور لکھنؤ کی شکستہ تحریروں میں حروف کی بناوٹ دوسرے صوبوں کی اردو تحریروں سے ذرا مختلف ہے۔ یہ سب تحریریں شکستہ اردو ہی ہوتی ہیں مگر شہری یا یوں کہئیے کہ وطنی خصوصیات ان میں ضرور پائی جاتی ہیں۔

اب فرض کر لیجئے کہ لکھنؤ کی کسی اردو تحریر میں کسی دلی والے نے جعل کیا ہے۔ اس جعل میں آپ کو حروف کی بناوٹ کے ساتھ وطنی خصوصیت بھی معلوم ہو گی۔ جعل کرنے والے کی ذہنی قابلیت کا بھی اندازہ ہو گا۔ اور جعل ساز کی اس حالت کا اندازہ بھی (اگر ممکن ہوا) آپ لگا سکیں گے کہ جعل کس گھبراہٹ میں کیا گیا ہے یا جعل ساز کے ہاتھ میں قدرتی لرزہ تھا۔ جعل کسی دباؤ کی وجہ سے ہوا ہے یا سکون و اطمینان سے جعل بنایا گیا ہے۔ اردو تحریریں چونکہ مختصر اور آسان شوشوں کی بناوٹ سے دوسرے اور تیسرے حرف کو ایک لفظ لکھنے کے لیے معمولی گردشِ قلم سے بنائی جاتی ہیں۔ اس لیے تحریر میں ایک حرف کا جعل بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ "مشغول" کو لیجئے یہ لفظ عربی کا ہے اردو میں مادری زبان کی طرح استعمال ہوتا ہے، اس کی آوازیں تو دو ہیں ایک "مش" دوسری "غول" مگر پانچ حروف کے مجموعہ سے یہ ایک لفظ بنا ہے۔ نہایت آسان اور مختصر شوشوں کی باہمی آمیزش سے نہایت کم وقت میں نہایت اختصار کے ساتھ بڑا خوبصورت لفظ پیدا ہو گیا۔ نہ تو قلم پر کہیں زور پڑا ہے نہ کوئی بیلی کشش پیدا ہوئی اور نہ لکھنے میں زحمت ہوئی جگہ بھی کم لی اور مختصر نویسی کی اعلیٰ شان پیدا ہو گئی، اردو تحریر اپنی دوسری ہمجولی زبانوں کی تحریروں کے مقابلہ میں آنکھوں کو زیادہ بھلی اور خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ یہی دیدہ زیبی اور جاذبِ نگاہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

اردو رسم الخط کی خوبیاں | اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کے دائرے خوبصورت، کشش دلکش حسین۔ اعراب اور

نقطے وضعدار ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں دوسری بہت سی زبانوں کے الفاظ بعینہٖ یا بہ تبدیل تلفظ شریک ہو گئے ہیں جیسا کہ
دنیا کی اور زبانوں میں بھی "دخیل" الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مگر اردو بخط نستعلیق لکھی جائے یا بطرز شکستہ وہ نہایت مختصر ہوتی
ہے۔ جگہ کم لیتی ہے اور اپنے تحریری حسن کو قایم رکھتی ہے۔ اور یا یوں کہئے کہ خط نستعلیق میں مختصر لکھنے کی اتنی گنجائش ہے
کہ اگر اسکو تھوڑی سی مشق کے بعد حروف کو ملا کر لکھنے کی عادت کر لی جائے تو بڑی حد تک وہ مختصر نویسی کا کام بھی دے سکتی ہے۔
میں یہ مبالغہ آمیز دعوی نہیں کر سکتا کہ اردو تحریر اپنی جگہ ایک شارٹ ہینڈ رائٹر کا مقابلہ کرے گی۔ مگر ذمہ داری کے ساتھ اپنے ذاتی
تجربہ کی بنا پر یہ ضرور کہوں گا کہ اردو کا زود نویس بڑی حد تک اس کمی کو یا یوں سمجھئے کہ اس ضرورت کو پورا کرے گا۔

نسخ اور نستعلیق کیا بلحاظ مختصر نویسی اور کیا بلحاظ طرز نویسی یعنی رسم الخط اور دائروں کی خوبصورتی کی وجہ سے نہایت شاندار
ہیں۔ علاوہ ان دونوں خطوں میں ایک حرف کو دوسرے سے ملا دینے کی تمام قابلیتیں موجود ہیں۔ خوشنما خط اور پختہ قلم منشی الفاظ کو اس
خوبی اور خوبصورتی سے حروف کے موزوں جوڑوں کے ساتھ ملاتا چلا جاتا ہے جس سے آنکھوں میں روشنی سی آتی ہے اور پڑھنے میں
لذت محسوس ہوتی ہے۔ خط نسخ میں لکھے ہوئے کتبے اور طغرے آپ بار بار شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور لفظوں کی صورت
ان کی معنویت سے کم اثر انداز نہیں ہوتی۔

ایک نو آموز طالب علم کا خط کچا اور بدنما ہوتا ہے کیونکہ اُسے لکھنے کی پوری مشق نہیں ہوتی۔ وہ نہ تو حروف کو حروف سے ملانا
جانتا ہے نہ اُس کے قلم کی گرفت اور بار و دست ہوتا ہے۔ یہ صرف مادری زبان ہی کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کے طالب علم کے لئے
ضروری ہے کہ وہ مسلسل مشق کے بعد تحریر پر عبور حاصل کرے۔ مشق و مہارت کے بغیر کسی زبان کے رسم الخط میں شان پختگی اور حسن قلم پیدا
نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشق سے تحریر میں پختگی اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض لوگ اپنی فطری
گھبراہٹ، تلون اور نفسی کشمکش کے سبب مشق کے باوجود خوش قلم نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لکھنے والوں کی تحریر تو
خوشنما ہوتی ہے مگر لفظ ٹھیک طور پر پڑھے نہیں جاتے اس کے برخلاف بعض اشخاص کی لکھائی ذرا بھی خوبصورت نہیں ہوتی لیکن ایک
ایک لفظ کسی دقت کے بغیر پڑھا جا سکتا ہے، پہلی تحریر کو "تکلیف دہ حسن" اور دوسری تحریر کو ہم کار آمد بدصورتی کہہ سکتے ہیں۔

جس طرح کسی نو آموز طالب علم کی تحریر کچی بدخط اور بدنما ہوتی ہے۔ اسی طرح کم تعلیم یافتہ اشخاص وغیرہ کا زیادہ تر لوگ جن کو لکھنے
کا شاذ ہی اتفاق ہوتا ہے بدخط ہوتے ہیں — اور نہ صرف بدخط بلکہ ناقص التحریر۔ ایسے اشخاص کی تحریر میں جعل اور اصل کا امتیاز
مشکل ہو جاتا ہے، تجربہ اور مشاہدہ ہی یہاں کام دیتا ہے۔ فنی واقفیت کے ساتھ اگر تجربہ و مشاہدہ بھی ہو تو اصل و جعل کا پتہ
لگایا جا سکتا ہے۔ آدمیوں کی پیشانیوں اور چہروں کی طرح تحریروں کو دیکھ کر بھی لکھنے والے کی ذہنی کشمکش اور نفسی کیفیات
کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

عورتیں جو رسم الخط کی مشق کر چکی ہوتی ہیں ان کی تحریریں نہایت دلاویز و خوبصورت ہوتی ہیں۔ نمود حسن کا جذبہ عورت
میں مرد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے خواتین مردوں کے مقابلے میں زیادہ بناؤ سنوار کے ساتھ لکھتی ہیں۔ بعض لوگ اس
کوشش کو بناوٹ سے تعبیر کرتے ہیں مگر ہمارے خیال میں یہ ظہور خودی اور نمود حسن ہے ——— عام طور پر عورتوں کا خط
کچا ہوتا ہے، دائرے اور کششیں ٹیڑھی ہوتی ہیں، مشترکہ حروف پورے نمایاں نہیں ہوتے اور حرفوں کی ساخت سے فطری کمزوری سی ظاہر ہونے لگتی ہے

ہے۔میری نظر میں ایسی پردہ نشین خواتین بھی ہیں جن کی اردو تحریروں کو پڑھ کر خط نستعلیق کی خوبیاں ذہن و دماغ پر اثر کیے بغیر نہیں رہتیں، خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ممتاز رفیع بیگم اردو خطاطی میں اپنے ہمعصر مرد خوشنویسوں کا تنہا جواب تھیں، ان کے خط میں مرصع سطریں سطح قرطاس پر بیچ بیچ موتی کی لڑیاں معلوم ہوتی تھیں ۔

تحریری خصوصیات

کسی زبان کا رسم الخط ہو اور کسی قسم کی تحریر ہو - ہر شخص جو کچھ بھی لکھتا ہے یا جس زبان میں بھی اسکو لکھنے پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے وہ اپنی حد تک اپنی روش تحریر کا پابند ہو جاتا ہے - قلم پکڑنے قلم پر زور دینے اور حروف والفاظ کو بنانے اور جوڑنے کا ایک طریقہ پختہ ہو جاتا ہے یعنی اپنی تحریری خصوصیات کو وہ بمشکل بدل سکتا ہے - اگر جعل سازی کی نیت سے وہ اپنے دستخط یا تحریر کو بدلے یا بدلنے کی سعی لاحاصل کرے تب بھی تمام و کمال خصوصیات کو وہ بدل نہیں سکتا - اپنی مشق شدہ یا مستقل طرز تحریر کو وہ بدلنے یا چھپانے کی کوشش کریگا تو ممکن ہے کہ وہ دو چار خصوصیات کو بدل دے مگر یقیناً بدلی ہوئی تحریروں میں فطری خصوصیات زیادہ باقی رہیں گی اور خود تحریر کنندہ بھی اُن پر پوری توجہ نہ دے سکے گا - ہر شخص خود بھی اپنی تحریر کی نازک اور باریک خصوصیات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتا - یہ کمزوری جعل سازی میں جاکر نمایاں ہو جاتی ہے اور تجربہ، مشاہدہ، اندازے، فن کی مہارت اور واقفیت کی بنا پر ماہر فن شناخت اصلی اور نقلی تحریر میں امتیاز پیدا کر لیتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تحریر کنندہ نے اپنی تحریر یا دستخط کو بدلا ہے - یا کسی دوسرے شخص کے دستخط اور تحریر کی نقل کر کے جعل بنایا ہے، بعض چابک دست جعل ساز مشق کے بعد کسی شخص کی طرز تحریر کو بادی النظر میں اپنا بھی لیتے ہیں مگر ایسا شاذ ہی ہوتا ہے - کسی شخص کے خط کی تمام و مکمل خصوصیات کی ہو بہو نقل، تقلید اور چربہ قریب قریب محال ہے، بعض بناوٹ اور جعل سازیاں بہت کچھ فریب آمیز اور اصل کے مطابق ہو جاتی ہیں پھر بھی نقل "فانس اصل" (Pore original) نہیں بن سکتی - کسی حقیقت نگر شاعر نے کتنے پتے کی بات کہی ہے :-

اصل ہے کچھ اور ہی شے، نقل ہے کچھ اور چیز

آپ آخر آپ ہیں تصویر پھر تصویر ہے ٭

تحریروں کے فن شناخت (فراست التحریر) میں بعض اوقات فن کے علاوہ علمی تجربہ کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اور علمی معلومات کی مدد سے مسئلہ کی نازک اور پیچیدہ گرہیں واکرنی پڑتی ہیں - اس تجربہ اور کوشش میں ماہر فن کو جتنی زیادہ زحمت ہوتی ہے اس سے زیادہ لطف آتا ہے ۔ جس طرح چور اور ڈاکو پولیس والوں کے دشمن ہوتے ہیں - اسی طرح جعل ساز فن شناخت تحریر کے ماہروں (EXPERTS) سے بیر رکھتے ہیں ۔

محمد جمیل بہیم (بیروت)

جاہلیتِ عرب کے افق پر

> صنفِ نازک کی ذہانت نے شعر و ادب کی بزم کو سنوارا خطابت کے معرکے سر کئے، جذبات کے چقماق سے آگ پیدا کی اور آنسوؤں اور آہوں کو شعر کا قالب عطا کیا۔

دورِ جاہلیت میں شاعری کو قبولِ عام حاصل تھا۔ اس میں صنفِ نازک اور جنسِ قوی دونوں برابر تھے۔ شعر انھیں ورثہ میں ملتا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ شیرِ مادر کے ساتھ ان کے حلق میں اترتا تھا، عورتیں اقوال حفظ روایات اور نقد شعر میں غیر معمولی مہارت بہم پہنچاتی تھیں، صرف ابو نواس ساتھ شاعرات کے اشعار کا راوی تھا، قدیم عربوں میں لکھنے کا رواج بہت ہی کم تھا، حافظہ اُن کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا، اس لئے عرب کے دورِ جاہلیت کی شعر کہنے والی خواتین کے اشعار ہی نہیں، بعض کے تو نام تک صفحہ ہستی سے محو ہو گئے۔

جاہلیت کی شاعرات میں خنساء سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بلکہ بشار بن برد کے خیال میں تو اس کا درجہ مردوں سے بھی بلند تھا۔ ایک دفعہ بشار نے کہا "ہر عورت کے شعر میں کچھ نہ کچھ نقص ہوتا ہے" اس سے کہا گیا "کیا خنسا بھی ان میں شامل ہے؟" بشار نے جواب دیا "وہ تو مردوں سے فائق ہے۔ خنساء نجد کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئی تھی، جاہلیت میں وہ اپنے بھائی معاویہ اور صخر کے درد ناک اور اثر انگیز مرثیہ کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ اس کو ایمان لانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی عہدِ اسلام میں بھی وہ شاعری اور خدا کے راستہ میں قربانی کے سبب مشہور ہوئی۔

نابغہ ذبیانی کا ہم عصر شعراء میں خاص درجہ تھا، جب وہ عکاظ کے میدان میں آتا تو اس کے لئے چرمی خیمہ نصب کیا جاتا اور دوسرے شعراء اس کے سامنے اپنے اشعار پڑھتے ــــــ ایک سال سب سے پہلے اعشیٰ پھر حسان اور پھر خنساء نے اشعار پڑھے۔ نابغہ خنساء کے اشعار سن کر دنگ رہ گیا اور بولا۔

"اگر یہ اندھا (اعشیٰ) تجھ سے پہلے اپنے شعر نہ سناتا تو میں تجھے اس سال تمام شعراء پر ترجیح دیتا"

اس سال کے شاعروں میں حسان بن ثابت بھی تھے یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو گئے ــ اور کہا "اے نابغہ! میں تجھ سے اور خنساء دونوں سے بہتر شاعر ہوں" نابغہ نے جواب دیا "یہ حقیقت کے خلاف ہے" پھر اس نے خنساء کی طرف متوجہ ہو کر کہا

"خنساء! سن رہی ہے۔ حسان کیا کہہ رہا ہے"

خنساء نے حسان سے دو بدو کہا:-

جس قصیدے کو تو نے فخریہ پڑھا ہے، اس میں بہترین شعر کونسا ہے؟ حسان نے جوش میں آکر یہ شعر پڑھا:-

لنا الجفنات الغر یلمعن فی الضحیٰ ٭ واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

عرب میں بیجا نہ تھا۔ اس کے علاوہ عورتوں میں مردوں کے اوصاف بیان کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف اُم معبد سے بہتر کوئی مرد کیوں نہ بیان کر سکا؟ آپ نے جواب دیا۔

• عورتیں مردوں کا وصف اپنے خیالات کی بنا پر بیان کرتی ہیں اس لئے کہ وہ مردوں کو اپنے صفات کے آئینہ میں جلوہ گر پاتی ہیں ———

فنِ تاریخ

تاریخ کا شمار بھی انھیں علوم میں تھا جن میں عورتیں مردوں کی شریک تھیں کیونکہ تاریخ کا اطلاق اس زمانہ میں عرب کے اخبار، ان کی معرکہ آرائیوں اور قدیم قوموں کے مجمل حالات کی معرفت پر تھا، یہ جس زمانہ کا ذکر ہے اُس زمانہ میں آجکل کی طرح کتابیں نہ تھیں، اس لئے تاریخ کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں بلکہ سننے سے تھا، چونکہ صنفِ نازک میں فطرتاً حفظِ اخبار و نقلِ روایات کی قوی استعداد ہوتی ہے، اس لئے جاہلی عورتوں کی اس فن میں شہرت بعید از قیاس نہیں ——— اس لحاظ سے اور بھی کہ اہلِ عرب کی تاریخ ان کے اشعار میں ملتی ہے اور ان میں شعروں کے یاد کرنے کا بہت رواج تھا۔

مختصر یہ کہ جاہلیت میں مرد کے عقلی وادبی مدارج میں عورت کا بھی حصہ تھا کیونکہ بدوی طریقِ حیات میں کشمکش اور خود غرضی کی آمیزش نہ تھی، متمدن یافتہ عورتوں کے مقابلہ میں جاہلی عورتوں کو صنفِ قوی کے علم و معارف کے حصول میں زیادہ آسانیاں اور سہولتیں تھیں۔

بقیہ قوموں کی طرح عورت زمانۂ جاہلیت میں خانگی معاملات کی تنہا کارپرداز تھی، اس لئے گھر کی چار دیواری میں اس کا اثر مرد سے زیادہ تھا، مرد و عورت میں حقیقتاً عقلی مساوات نہ تھی بلکہ مرد کے وسیع طریقِ حیات اور اس کی کشمکش نے مردوں کے طبقہ میں فکر و ادب کی روح پھونک دی تھی، لیکن گھر کی ملکہ بھی ان صفات سے محروم نہ رہی ——— سخاوت، شجاعت، اخلاق اور غیرت میں بھی عرب کے دورِ جاہلیت کی عورت مرد کے اوصاف میں شریک نظر آتی ہے۔

(حکیم اسرار احمد کریوی نے ترجمہ کیا)

میکش اکبرآبادی

انسانِ کامل

یہ جہاں بھی تو ہے اسکی آخری منزل بھی تو
بانیِ محفل بھی تو ہے خاتمِ محفل بھی تو

بوئے گل کا ہے تعلق برگِ گل سے جس طرح
میری دنیا سے علیحدہ بھی ہے تو شامل بھی تو

تجھ سے ظاہر کی تجلی تجھ سے باطن کا ثبوت
شاہدِ محمل نشیں بھی تو ہے اور محمل بھی تو

آسمانوں پر ترا جلوہ زمیں پر تیرا نور
پرتوِ معبود بھی تو بندۂ کامل بھی تو

تو نظر میں ہو تو موجِ بحر کیا طوفان کیا
قعرِ دریا میں بھی تو ہی ہے سرِ ساحل بھی تو

تو کمالِ حسن و خوبی تو مآلِ عاشقی
شمعِ محفل بھی ہے تو پروانۂ محفل بھی تو

تیرا میکش تیرا ساقی تیری محفل تیرا جام
حاصلِ مستی بھی تو ہے مستیٔ حاصل بھی تو

سلیم احمد

ضمیر نے آواز دی

خون دے کر ہی ہوا کرتی ہیں قومیں سرخ رو
ہے رخِ اقوام کا غازہ شہیدوں کا لہو

آج تک ہے اس خضابِ بے تکلف کا سرور
پھر ذرا کہنا کہ عہ بے شک ظالم و جاہل ہے تو

آہ اے انسانِ سادہ یہ ورق بھی دیکھنا
سرخیٔ افسانۂ تہذیب ہے کس کا لہو

موت کیا ہے دم میں بجھ جانا چراغِ عشق کا
زندگی کیا ہے تب و تابِ شرارِ آرزو

شورشِ جذبات سے محروم ہیں رندوں کے دل
ہے بطورِ رسم میخانوں میں شورِ ہاؤ ہو

ہائے ساقی مری جانب نگاہِ التفات
آرزوئیں ہیں فسردہ اور طبیعت بے نمو

عہ آیہ کریمہ [illegible] کی طرف اشارہ

بات نہیں کیونکہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شعران کا عام مذاق تھا اور شاعری ان کے روز مرہ میں داخل ہو چکی تھی۔

عورتوں کی شاعری کی حدود مرثیہ سے آگے نہ تھیں، کیونکہ ہم اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ مردان پر حاوی تھے۔ اور وہ مرثیہ نوحہ اور گریہ وزاری کو عورتوں کے فضایل میں شمار کرتے تھے۔ وہ ان امور کے اسقدر شائق تھے۔ کہ مردوں کی شہرت اور اُس کا نام بلند کرنے کے لئے ماہر نوحہ گر عورتوں کو اجرت پر بلاتے تھے۔

اہل عرب لڑکیوں کو مرثیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ زندگی ہی میں امتحان کے طور پر اپنی لڑکیوں سے مرثیے کہلواتے تھے، عبدالمطلب نے ایسا کیا تھا، انھوں نے اپنی بیٹیوں اُمیمہ، برہ اور عاتکہ سے فرمائش کی کہ تم سب مجھے مردہ تصور کر کے اپنے شعر سناؤ۔ ہر لڑکی نے باری باری اپنے مرثیے پڑھے جو عبدالمطلب کی زندگی ہی میں مشہور ہو گئے۔

تاہم عورتوں کے ملکہ شعر کا انحصار بالکل مرثیہ ہی پر نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ مدح رجز۔ فخر اور ہجو کی طرف بھی مائل ہوتی تھیں ہاں[1]۔ عاشقانہ شاعری، تعریف حسن اور ولولہ انگیز شعر کا موزوں کرنا اُن کے لئے جائز نہ تھا ——— مختصر یہ کہ عورتوں کا حصہ مرثیہ کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں کمتر تھا۔ لیکن باوجود اس کے ان میں شعر وشاعری کا عام ذوق تھا۔ بعض تو اس مرتبے پر پہنچ گئیں کہ مستند شعراء احترام کرتے اور بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ شعراء مختلف فیہ امور میں ان کو حکم (Judge) بناتے

امرء القیس اور اس کے ہم عصر علقمہ میں ایک مرتبہ "انانیت" کی بحث آپڑی۔ دونوں نے امرء القیس کی شریک حیات ام جندب کو حکم ٹھرایا اس نے دونوں کو گھوڑے کے وصف پر ایک وزن اور ایک قافیہ میں شعر کہنے کے لئے کہا امرءالقیس نے وہ قصیدہ منظم کیا جس کا مطلع یہ ہے ؎

خلیلی مرابی علی ام جندب ‌ ‌ ‌ ‌ لنقضی لبا نات الفواد المعذاب

اے میرے دونوں دوستو! اُم جندب کے میرے ستم رسیدہ دل کی آرزوئیں پوری کرنے کو کہو۔

امرء القیس نے گویا اس مطلع سے اپنی زوجہ پر قلبی روابط کا اثر ڈالنا چاہا۔ اظہار محبت اور مدح خوانی شروع کر دی جو عورتوں کو فریب میں لانے کے لئے آسان اور موثر ذرائع ہیں۔ لیکن حق کی تاثیر۔ ام جندب پر غالب رہی اس نے قلبی عواطف اور رشتہ ازدواجی کا کچھ خیال نہ کیا۔ جب اس نے علقمہ کا قصیدہ سنا، جس کا مطلع یہ ہے ؎

ذھبت من الھجران فی کل مذھب ‌ } ہجر کی وجہ سے میں سرگرداں و پریشان رہا اور اس تعلق و اشتیاق کے
ولم یک حقا کل ہذا التجنب ‌ } تمام تقاضے درست نہ تھے۔

تو اس نے اپنا فیصلہ علقمہ ہی کے حق میں دیا اور اس کو دلیل سے ثابت کر دیا۔

---

[1] عرب کا دورِ جاہلیت برائیوں کے لئے مشہور ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس پستی اور گراوٹ کی حالت میں بھی عرب کی ادیب و شاعر عورتیں عشق و ہوس کے اظہار سے گریز کرتی تھیں ——— اور ہمارے اس روشن، مہذب اور ترقی یافتہ زمانہ میں شعر و افسانہ کی دنیا عورتوں کے جن بے باک نغموں سے گونج رہی ہے اُن کو سن کر غیرت پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔ آہ! ترقی کا یہ طلسم فریب ——— "مدیر"

اسی قصیدے میں امراء القیس نے ایک شعر کہا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے
کوڑے سے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے، پھر سے تیزروی کرتا ہو ڈانٹنے سے گردن اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔
اور علقمہ نے کہا ۔
لگام کے اشارے سے اس نے آگے جانے والے گھوڑوں کو پالیا، وہ سبک اور تیز رو ہوا کی طرح ایک دم میں گزر جاتا ہے۔

امراء القیس کی بیوی اُم جندب نے کہا کہ امراء القیس نے اپنے گھوڑے کی تیزی کو کوڑے کے اثر سے نمایاں کیا اور علقمہ کا گھوڑا آگے والے گھوڑوں کو صرف لگام کے اشارے سے پکڑ لیتا ہے ــــ اس فیصلہ نے امراء القیس کو آگ بگولا کر دیا اور وہ ام جندب کو طلاق دینے سے نہ رک سکا، ام جندب کی جرأت اور حق گوئی کا علقمہ پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ اس نے ام جندب سے شادی کر کے طلاق کی تلافی کر دی، اس واقعہ کے بعد سے اُس کا نام "علقمۃ الفحل" یعنی جوانمرد علقمہ ہو گیا اس سے ترشح ہوتا ہے کہ جاہلیت کے مرد اگرچہ عورتوں کو حقیر ہی سمجھتے تھے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ متمدن جدید میں بھی مشاہیر شعراء کا عورتوں کو حکم بنانا کبھی سننے میں نہیں آیا ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں مبالغہ نہیں ہے۔

جس طرح جاہلیت کی عورتوں میں شعر و شاعری کا رواج تھا۔ اسی طرح وہ فصیح و

فصاحت و خطابت

بلیغ کلام کی دلدادہ تھیں ــــ جاہلیت میں عورتوں کے فرائض محدود تھے، انہوں نے وسعت میں مرد کی طرح تخیل اور حسن کلام کی طرف توجہ کی فصاحت و بلاغت میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا، اصحاب تالیف و تصنیف نے اُن کی فصاحت و بلاغت پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔

جاہلی عورتوں کا ایک بڑا گروہ خطابت سے متصف تھا، اگر خطباء کا ذکر کیا جائے تو جنس لطیف کو بھولنا نہ چاہئے۔ اور انہیں کیونکر نظر انداز کیا جائے جبکہ اُن میں ہند بنت الخس معروف بہ "زرقا" اور جمعہ بنت حابس جیسی فصیح البیان عورتیں موجود ہوں، یہ دونوں عرب کے مشہور بازارِ سخن عکاظ اور ذوالمجنہ وغیرہ میں شریک ہوتی تھیں۔ عرب کے خطیب ذوانا قس بن ساعدہ اور قلمس کنانی کی طرح عام مجمع میں تقریریں کرتی تھیں عرب کے قبیلے ان کے اقوال کو قصائد و امثال کی طرح یاد رکھتے تھے۔

ہند سے پوچھا گیا کہ تیرے خیال میں بہترین مرد کون ہے۔ اُس نے جواب دیا "بردبار"۔ جہان نواز لوگ اُس کے گھر آئیں اور وہ کسی کے گھر نہ جائے"۔ پھر اس سے کہا گیا۔ بدترین مرد تیرے نزدیک کون ہے؟ کہا۔ تنگ ظرف کاہل الوجود، بچا کھچا کھانا کھائے اور جھوٹا پانی پیئے، کپڑے میلے رکھے، خوفزدہ ہو کر سوئے۔ دعوت میں پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔ پھر پوچھا گیا۔ کون چیز سب سے بہتر ہے؟ بولی عزت و رفعت کی سطح پر نہ جھکنے والا نشان کہا گیا۔ شریف ترین عرب کون ہیں؟ کہا اونچے خیمے نصب کرنے والے صحرا نورد جو ہمیشہ سفر میں رہیں! لوگوں نے سوال کیا سب سے برا آدمی کون ہے۔ جواب دیا جس سے مجھے کوئی ضرورت درپیش ہو۔

ہند نے اپنے نسوانی ضمیر کے لحاظ سے اچھے اور بُرے مرد کا بہترین خاکہ کھینچا ہے۔ لہٰذا اُس کے اعجاز کا شہرہ

خنساء نے شعر سنتے ہی کہا ۔

"حسان! تمہارا فخر رخصت ہوگیا، تم نے اس ایک شعر میں آٹھ جگہ ٹھوکر کھائی۔" پھر اس نے تمام غلطیاں بیان کئے اور حسان کو ساکت ہی کرکے چھوڑا۔ خنساء کے بہترین وصف نگار خود اس کے اشعار ہیں ۔

خنساء کی طرح طرفہ کی علاتی بہن خرنق بھی مشہور شاعرہ تھی اور اس نے بہت سے شعر بھائی اور خاوند کے غم میں مرثیہ کے انداز پر کہے ہیں مگر ہم تک اس کے پچاس سے کچھ اوپر شعر پہنچے ——— جساس شیبانی کی بہن جلیلہ بنت مرہ بھی آتش نوا شاعرہ تھی اور اس کے بھائی جساس نے اس کے شوہر کو قتل کرڈالا تھا، غم نے اس کے پرجوش شاعرانہ احساس میں روح پھونک دی اور اس نے بہت ہی درد انگیز اور پراثر مرثیے موزوں کئے، پہلا مرثیہ اس نے اس وقت کہا جب وہ بزم ماتم سے واپس ہورہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کی نند یعنی کلیب کی بہن طنزیہ کہتی تھی بلا ٹل گئی، ناکام آرزو سے چھٹکارا ملا۔ افسوس کہ اس کلیب نے دھوکہ پر دھوکا کھایا ۔

جلیلہ نے قنوطیہ لہجہ میں اشعار کہے، اس نے شعروں میں اپنے بھائی کے کردار کی کمزوری ظاہر کی اور اپنے دل پر اس کے اثرات بیان کئے ۔ پھر وہ اپنے خاوند کے سچے، فطری اور حقیقی مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئی اس کا مرثیہ متاخرین کے مرثیہ کی طرح نہ تھا، جو معمولی گمنام شخص کا مرثیہ کہتے ہوئے، سننے والوں کے دل میں یہ بات اتار دینے کی کوشش کرتے تھے کہ آسمان کے فرشتے، فضا کے طیور، پانی کی مچھلیاں غم میں شریک تھیں اس کی موت نے سخاوت کی ٹانگ توڑ دی، شجاعت کا جنازہ نکال دیا۔ اور جن کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ دیا ۔ جلیلہ نے ان مبالغہ آمیز باتوں کے برخلاف اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ سے اس غم کو بیان کیا جس سے وہ فطری طور پر متاثر ہوئی ——— اس کا گھر ویران ہوگیا، انتقام لینے کی اس میں قدرت نہ تھی اس وجہ سے اس کے غم کی آگ بجھ نہ سکی، وہ دل کے ہی شعلے شعر کے قالب میں ڈھل گئے ——— کہا اور کس قدر دردانگیزی کیسے کہا ———

میں اس قتیل کے سوگ میں ہوں جس کی وجہ سے زمانے نے میرے گھر کی چھت گرا دی، وہ گھر گر گیا جس میں اس سے رازونیاز کی باتیں کرتی تھی، آہ! گھر کے بنانے والے ہی نے گھر تباہ کردیا ۔

——— کلیب کی موت نے مجھے غم دیئے۔ بہت سے مجھ پر پڑ چکے اور کچھ آگے چل کر برداشت کرنے پڑیں گے ۔

——— جو دن سر چکا ہے، وہ اس کے برابر نہیں جو آنے والے ایک ہی دن کے گریہ کا منتظر ہے ۔

——— کاش کہ وہ دن ہوتا اور لوگ اس کے قطرے میری رگ کے لہو میں پیوست کر دیتے ۔ اسی طرح جلیلہ نے اشعار کے ذریعہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیئے اور اس کا شمار اپنے زمانہ کی مشہور شاعرات میں ہوا۔ جب ہم اپنے شاعروں کو اسلوب مرثیہ کی تجدید اور مرنے والے کے حقیقی اوصاف بیان کرنے پر اقتصار کی تلقین کرتے ہیں۔ تو ہم انھیں مغرب کی جدید روش کی تقلید کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ ان میں اس کی رغبت پیدا کرتے ہیں کہ قدیم عربوں کی اقتدا کرو جنکی بلاغت مسلم الثبوت ہے

جن عورتوں کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی فصیح و بلیغ شعر کہنے والی خواتین ذکر کئے جانے کے قابل ہیں مگر افسوس ہے کہ اس کی گنجائش نہیں ہے ——— لیکن ہم انھیں بالکل نظرانداز بھی کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے ان کی انتہائی مختصر سیرت اور منتخب خصوصیات لکھتے ہیں ۔

آمنہ بنت عتیبہ - کم گو عورت تھی لیکن اس کے اشعار بلیغ ہیں، اپنے باپ کے مرثیہ کے سبب مشہور ہوئی۔

امامہ بنت ذی الاصبع عدوانی - مشہور شاعرہ تھی، راہ چلتے اس پر انگلیاں اٹھتیں

ام السلام - شعر و ادب کی صف اول میں تھی، اس کے اشعار سلیس ہوتے تھے۔ اس کا مرثیہ اپنے لڑکے کی موت پر بہت خوب ہے۔

اُمیہ ام تابط شرا - نہایت ہی فصیح اللسان شاعرہ تھی اس کے اکثر اشعار اپنے لڑکے تابط شرا کے مرثیہ میں ہیں۔ دو شعر یہ ہیں — جوان کے لئے موت کمین گاہ میں چھپی رہتی ہے — اے میرے بیٹے! انسان کی ساری خوبیاں تجھ میں تھیں

حبیبہ بنت عبد العزی العوراء - شاعرہ بھی تھی۔ اور نہایت فیاض اور کشادہ دست بھی تھی۔ بھینگے پن کے سبب "عوراء" کہلائی۔

جنوب بنت عمرو ذی الکلب الہذلی - فصیح شاعرہ اور ادیبہ تھی، اس نے اپنے بھائی کی مدح میں خوب خوب شعر کہے ہیں

جب افق گرد آلود ہو جائے اور شمالی ہوا چلے اور ......

دودھ پلانے والی عورتیں بچوں کو چھوڑ دیں، بارش کا نشان نظر نہ آئے۔ اسی صورت میں مہمان اور فاقہ کش سمجھتے ہیں کہ تو ہی ابر باراں ہے۔ اور تو ہی قوم کا فریاد رس ہے۔

— تو نے بہت سے معرکے سر کئے۔ سرکش اور سخت دشمن کو رسیوں سے جکڑا، تو نے بڑی دولت جمع کی، بہت سی لڑائیاں لڑا، ضعیف اور بے آسرا عاجزوں کو کھانا کھلایا —

میلہ بنت عمرو الہذلیہ - اپنی قوم کی فصیح شاعرہ تھی، اس نے اپنے بھائی کے بہت سے مرثیے لکھے ہیں —

ہم دونوں ایک درخت کی دو شاخیں تھے۔ ہماری نشو و نما بہترین اور اچھے وقت میں ہوئی جب کہ اگ کر ٹہنیاں بڑھ گئیں، سایہ خوشگوار ہو گیا۔ اور پھل آنے کا انتظار رہنے لگا۔ گردش زمانہ نے ہم میں سے ایک کو فنا کر دیا اور زمانہ کسی چیز کو نہیں چھوڑتا۔ ہم رات کو ستاروں کی طرح تھے، ہمارے درمیان ایک نورانی چاند تھا۔ افسوس کہ وہ غائب ہو گیا۔

فاطمہ بنت احجم - اس کے اشعار حکمت آمیز ہوتے تھے۔ اہل عرب اس کے مرثیوں کو ضرب الامثال کی طرح ذکر کرتے تھے۔

کبشہ بنت معدیکرب الزبیدی - اچھے شعر کہتی تھی۔ اس کے شعروں پر حماست کا رنگ زیادہ تھا۔

لیلیٰ بنت نمیرہ - اس کے شعر نسیم صبح سے زیادہ فرحت بخش ہوتے تھے۔ یہ وہی لیلیٰ ہے جس نے عرب اور فارس کے درمیان آتش جنگ مشتعل کر دی۔ ۲۸۳ء میں ریاض شاعری کی یہ چہکتی ہوئی بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

ہنیدہ بنت ضمضم - یہ عرب کی ان شاعرات میں تھی جو لڑائیوں میں شریک ہوتی اور مردوں کو جنگ و جدل پر ابھارتی۔ اپنے بھائی بہرام کی مدح میں کہتی ہے —

اس کی زبان حکومت کی کشمکش اور فیصلہ کن جنگ کے دوران میں فریقین کو شمشیر پر آمادہ کر دیتی —

ہند بنت عتبہ القرشیہ - ادیبہ اور فصیح شاعرہ تھی، کفار قریش کو اسلام کے خلاف اکساتی، آخر میں اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر فاروق کا دور خلافت تھا جب کہ سنہ ۱۴ ہجری میں اس نے وفات پائی۔

یہ بعض جاہلی مشہور عورتوں کے نام ہیں۔ ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں، اس عہد کی کل شاعرات کی تفصیل ہمارے بس کی

شفیق صدیقی جونپوری

فکر و نظر

حجازِ ملت کا خاص مرکز ہے منزلِ رہگذر نہیں ہے
تصوّر اپنا ہے کائناتی وطن بحدِ حضر نہیں ہے

ابھی گذر جائیں گے یہ جھونکے چمن پہ کوئی اثر نہیں ہے
زمیں کانٹوں سے پاک ہوگی ہمیں آندھی کا ڈر نہیں ہے

خبر نہیں میرِ کارواں کو ذرا پکارے تو ساربان کو
کہ سُست رَو ہو رہا ہے ناقہ تو کیوں حُدی تیز تر نہیں ہے

ذرا شہیدوں کی پاک روحیں اُٹھ کے درسِ حیات دیدیں
کہ عہدِ حاضر کے جینے والوں میں زندگی کا اثر نہیں ہے

اگر امیرِ عرب کو پاتا صبا قدم چوم کر یہ کہنا
کہ آج بھی قوم تیز رَو ہے مگر کوئی راہبر نہیں ہے

شکوک میں تھیں جو التجائیں حرم سے آنے لگیں صدائیں
دعا تو اپنی جگہ دعا ہے مگر زباں میں اثر نہیں ہے

قدم قدم پر ہیں سجدہ گاہیں تو چپہ چپہ پہ خانقاہیں
تمام گونجی تھیں جس سے راہیں وہی اذانِ سحر نہیں ہے

خدا سے فریاد کرنے جاتی ہیں مریمؑ و فاطمہؑ کی روحیں
کہ آج آدم کی بیٹیوں میں کوئی بھی اُم البشر نہیں ہے

شفیق کوئی جدید اُمت ظہور کرنے کو ہے زمیں پر
کہ آج تہذیبِ ہاشمی پر حجازیوں کی نظر نہیں ہے

حیرت بدایونی

بہار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

مرادِ دلِ لالہ زار آ رہی ہے — نویدِ سکون و قرار آ رہی ہے
تمنائے ہر دلفگار آ رہی ہے — عروسِ ارم در کنار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

بہ تغییرِ رنگِ دیار آ رہی ہے — بہ تجدیدِ لیل و نہار آ رہی ہے
بہ تحریرِ نقش و نگار آ رہی ہے — بہ نیرنگیِ روزگار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

بہ ہر ساغرِ زرنگار آ رہی ہے — بہ ہر جرعۂ خوشگوار آ رہی ہے
بہ ہر مستیٔ مے گسار آ رہی ہے — بہ ہر لغزشِ بادہ خوار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

خرد سوز و حکمت شکار آ رہی ہے — علی الرغمِ ہر ہوشیار آ رہی ہے
بہ سامانِ زنجیر و دار آ رہی ہے — جنوں خیز و دیوانہ وار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

سرِ قلۂ کوہسار آ رہی ہے — تہِ دامنِ آبشار آ رہی ہے
لبِ ساحلِ رودبار آ رہی ہے — سوئے تختۂ مرغزار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

بہ بیخ و بن و شاخسار آ رہی ہے — بہ نخل و گل و برگ و بار آ رہی ہے
بہ ریحان و نسرین و نار آ رہی ہے — بہ گلدستہ ہائے ہزار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

بہ قطراتِ شب زندہ دار آ رہی ہے — بہ رشحاتِ گوہر نثار آ رہی ہے
بہ ذراتِ انجم شرار آ رہی ہے — بہ نغماتِ پیغامِ یار آ رہی ہے

بہار آ رہی ہے بہار آ رہی ہے

ادیب سہارنپوری

دو غزلیں

دل کا یہ تقاضا کہ وہ جلدی سے گزر جائیں
آنکھوں کی تمنا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں

خوش ہیں کہ ستمگر انھیں کہتا ہے زمانہ
لیکن یہ غضب ہے کوئی پوچھے تو مکر جائیں

یہ جوشِ بہاراں یہ گھٹائیں یہ ہوائیں
دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں

راہیں ہی بدلتی ہیں نہ راہوں کے خم و پیچ
ہم لاکھ غمِ دوریٔ منزل سے گذر جائیں

غضب کی تیز گامی ہے شبابِ فتنہ ساماں میں
یہاں آکر تو لگ جاتے ہیں پر عمرِ گریزاں میں

کہاں دل کی نزاکت اور کہاں ہنگامۂ ہستی
یہ تم نے کیا کیا الجھا دیا خوابِ پریشاں میں

ہمیں اب آہ کر کے کیا کریں گے اور کیا ہوگا
نہ جانے کتنی آہیں دفن ہیں دیوارِ زنداں میں

سمجھ کر راز جن اشکوں کو اکثر پی گئیں آنکھیں
وہی ٹوٹے ہوئے موتی تو چبھتے ہیں رگِ جاں میں

نہ بدلی عشق نے اپنی ادا کوئی ادیب اب تک
ہزاروں انقلاب آیا کئے تاریخِ انساں میں

نہال سیوہاروی

"برگ و گل"

منزلِ شوق میں ایسا بھی مقام آتا ہے
ذرہ کو مہرِ درخشاں کا سلام آتا ہے

عشق اپنی ہی حدوں میں نہایت غیور تھا
اک دور تھا کہ شمع سے پروانہ دور تھا

مرے بغیر کہاں ان کی گرمیٔ محفل
بطورِ خاص بلایا گیا فغاں کے لیے

زمینِ کوچۂ جاناں سے آرہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

تری حکمتوں کی خبر کہاں جو ہو پردہ درِ دلِ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظرِ گلستاں نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

میں نامراد کو نسی جانب قدم اٹھاؤں
تم خود پکار دو کہ ملو گے کہاں مجھے

یہ کسی سے سن لیا جب کہ وہ جانِ رنگ و بو ہیں
انھیں اک خرابِ الفت نے چمن چمن پکارا

کتنے آثارِ پر آشوب نظر سے گذرے
ہم بھی اس عالمِ ہستی میں کدھر سے گذرے

یوں بھی دیکھا ہے کبھی ان کو بر افگندہ نقاب
جیسے اک عالمِ فردوس نظر سے گذرے

آج کچھ لوگ وہاں جمع تھے با چشمِ پُر آب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

شاداں اندوری

فردوسِ خیال

بیچ میں حائل رہے ہر چند پردے ساز کے
پھر بھی دل تک آگئے شعلے تری آواز کے

انکشافِ راز کے قابل نہ ضبطِ راز کے
دل کو یہ کیا ہوگیا صدقے نگاہِ ناز کے

دل سے جب پیدا ہوئے نغمے شکستِ ساز کے
چونک اٹھے پہچاننے والے تری آواز کے

غم کا طوفاں رُخ بدل سکتا ہے رُک سکتا نہیں
ضبط کرنا تھا کہ آنسو بن گئے آواز کے!

ڈھونڈتا ہوں میں قفس میں وسعتیں اُن کے لیے
جن پروں کو کام آنا چاہیے پرواز کے،

عشق اس نیرنگیٔ احساس کا قائل نہیں
اس جگہ پر فرق مٹ جاتے ہیں سوز و ساز کے

میرا اندازِ فغاں اچھی طرح پہچان لو
چند نغمے بھی سنو گے تم اسی انداز کے

ابتدائے شوق شاداں انتہائے شوق تھی
لطف یاد آتے رہے انجام تک آغاز کے

باسط بھوپالی

جنتِ افکار

ترے نثار یہ کیا کیفیات ہیں دل کی
ضرور تاً بھی کبھی مسکرا نہیں سکتے

بہارِ کوثر و تسنیم کچھ سہی لیکن
تری نگاہ کے انداز آ نہیں سکتے

ہمارا حال نہ سنئے کہ ہم زمانے کو
رُلا تو سکتے ہیں لیکن ہنسا نہیں سکتے

وہ نامرادِ محبت میں نہ ہوں باسطؔ
بغیر مرگ جو تسکین پا نہیں سکتے

ماہرالقادری

مشورے

ان میں تلوار کی تیزی بھی ہے — آبگینوں کی نزاکت پہ نہ جا

قول اور فعل کے آہنگ کو دیکھ — ظاہری جوشِ عقیدت پہ نہ جا

حسنِ کردار ہے معیارِ شرف — خاندانوں کی شرافت پہ نہ جا

کتنے سینوں میں دہکتے ہیں شرار — صرف چہروں کی بشاشت پہ نہ جا

حق و باطل کی کشاکش کو سمجھ — جنگِ سرمایہ و محنت پہ نہ جا

جھوٹ پُرپیچ ہوا کرتے ہیں — شوخیٔ رمز و اشارت پہ نہ جا

دیکھ اس زہر کا تریاق نہیں — لبِ بیگوں کی حلاوت پہ نہ جا

ہوں جو دنیا کی ہوا کے ساتھی — ایسے لوگوں کی رفاقت پہ نہ جا

ڈھونڈھ اللہ کے قانون کی روح — اہلِ ایماں کی حکومت پہ نہ جا

ایک دنیا ہے گناہوں کی مریض — صرف اجسام کی صحت پہ نہ جا۔

حسنِ معنیٰ پہ نگاہِ تنقید!
میرے لفظوں کی لطافت پہ نہ جا

قوتِ وحیات کے پجاری

یہ منکرانِ خدا، بندگانِ نان و شکم — نہ ان کے پاس محبت نہ ان کے پاس یقیں
یہ انقلاب کے نعرے مہیب اندھیرے میں — خرد کی شمعیں بھی تاریکیاں مٹا نہ سکیں

خدا کے سامنے جھکنے سے جن کو عار آئے
صنم کدے میں ہوس نے جھکا دی ہے جبیں

فیشن زدہ دوست

یہ بار بار کی زحمت بہ شوق سگرٹ کا — دھوئیں کے پیچ ہی زنجیر پا نہ بن جائیں
جبین و زلف کی آرائشیں درست مگر — مجھے یہ ڈر ہے یہی بت خدا نہ بن جائیں

بکھرے ہوئے پھول (میرے وہ شعر جو غزل نہ بن سکے۔ ماہر)

اک دھوم مچی ہے کہ وہ گزریں گے اِدھر سے — ایسے میں کہیں چُوک نہ ہو جائے نظر سے
شکستِ شیشۂ دل غور سے سُن — صدائے بازگشت آئے نہ آئے
کون دیتا ساتھ اُن کی گرمیٔ رفتار کا — گردشِ ایام تھوڑی دور چل کر رہ گئی
عارض کی جو چھوٹ پڑ رہی ہے — ہے شام کے وقت دوپہر سی
ایک انگڑائی کا طوفاں تھا جسے روک دیا — مجھ سے خود بھول ہوئی میں نے تمہیں ٹوک دیا

۱؎ جو خدا کو چھوڑ کر قوت و حیات کے نام کی جے پکارتے ہیں۔

ماہر القادری

کرفیو کی رات میں

وہ مزدوروں کا ہمدرد تھا —— "وہ" کون ؟ یہ "وہ" تو نہیں ہے جس کے بارے میں غالب نے کہا ہے۔ کہ

> وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
> کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یا یہ اس قسم کا "وہ" ہے جو سپنے دیس کی شریف اور بے زبان بیویوں کا شوہر ہوا کرتا ہے --- نہیں ان میں سے کوئی ایک بھی "وہ" نہیں ہے، اس اشارہ کا مشارٌالیہ اور اس ضمیر کا مرجع ایک جوان آدمی ہے، ماں باپ نے اس کا نام کلیم اللہ رکھا تھا کالج میں پہنچتے پہنچتے کلیم رہ گیا اور وہاں کی سوسائٹی کے لوگ اسے کلیمی کہہ کر پکارنے لگے۔

کلیمی بچپن میں دیدہ زیب اور نوجوانی میں خوش منظر تھا، مگر اس نئے ماحول میں آکر خیال کے ساتھ چہرہ بھی بدل سا گیا، باطن بدلتا ہے تو ظاہر بھی بدل جاتا ہے، دریا کی تہ میں اضطراب ہوتا ہے تو سطح آب بھی بے چین ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی —— یہ فطرت ہے، قانونِ حیات اور دستورِ زندگی ہے!

کلیمی کا خد و خال اور ناک نقشہ تو وہی تھا جو اب سے پہلے تھا، مگر تیوروں میں خشونت آگئی تھی، ماتھے پر کرخت قسم کی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں جو غور کرتے وقت اور زیادہ بھیانک ہو جاتیں، بہت کم ہنستا، لیکن جب ہنسی آتی تو پچکے ہوئے رخساروں کے گڑھے اور گہرے ہو جاتے —— اس کنوئیں کی طرح جس میں پانی کم اور مٹی زیادہ ہوتی ہے —— لانبے اور اُلجھے ہوئے بال جن کے گچھے کن پٹیوں کے ابھار پر بکھرے رہتے اور قمیص آدھے آدھے رخسار کو چھپائے رکھیں —— شاید مظلوموں اور غربت زدوں کا غم کلیمی کے چہرے سے نمایاں ہو رہا تھا، ایک جان کروڑوں انسانوں کے غموں کو خاموشی کے ساتھ برداشت بھی تو نہ کر سکتی تھی!

— خیالی تمنائیں سمندر کے جھاگوں اور صابن کے بلبلوں کی طرح ہیں، میں خیال کا نہیں عمل کا قائل ہوں۔ کم سوچنا اور زیادہ کام کرنا میرا مسلک ہے، کارخانے کے مالک کے جھوٹے اور خوش آیند وعدوں سے ہم مطمئن نہیں ہو سکتے ——

کلیمی نے اپنی پارٹی کے ایک جلسہ میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر کہا۔

مگر مزدوروں کے مطلب سے تو ایک کرکے سب کے سب مان ہی گئے، اب ہم کیا۔ —— —— دوسرے آدمی کی

بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کلیمی جھٹ سے بیچ میں بول پڑا۔

— بڑے نادان نکلے تم شنکر! میں تو تمہیں بہت سمجھدار سمجھتا تھا، ہم جس معاشی نظام کو لیکر اُٹھے ہیں اُس کا بول بالا اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دنیا کا یہ نظام ٹوٹ نہ جائے۔ ہمارا کام ہی یہ ہے اور ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ بے اطمینانی بے اعتمادی اور فتنہ و بغاوت کی فضا پیدا کر دیں، مزدوروں اور کسانوں اور ضرورت مندوں سے ہر مطالبہ کے پورا ہونے کے بعد ایک نیا مطالبہ پیش کرتے رہیں —— یہاں تک کہ حکومت اور عوام میں شدید کشمکش کی نوبت آجائے —— اور پھر سرخ جھنڈا فضا میں اڑنے لگے، کیا سمجھے، مسٹر شنکر ——— کلیمی نے ادھر بات ختم کی اور اُدھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایک دوسرے آدمی نے ٹیلیفون کا آلہ اٹھایا اور "ہاں! ہاں! کلیمی یہاں موجود ہیں" کہتے ہوئے رسیور کلیمی کو پکڑا دیا۔

کلیمی نے ٹیلیفون پر کہا:۔

— جی ہاں! ضرور! ۳۰ تاریخ کو آپ کے یہاں میں حاضر ہو جاؤں گا

— آپ یہاں پارٹی آفس میں گاڑی نہ بھیجیں، مجھے اُس دن آپ کے جلسہ سے پہلے ایک اور جلسہ میں بھی جانا ہے، وہاں سے سیدھا آپ کے یہاں آجاؤں گا۔

— شکریہ کی کیا بات ہے، تقریر تو ہمارا پیشہ سا بن گیا ہے۔

— جی کیا کہا مولوی برکت علی صاحب! یہ کون بزرگ ہیں، میں ان سے واقف نہیں ہوں۔ خیر! آپ نشاطِ خاطر رکھیں وہ میری تقریر سے ناراض نہیں ہونگے!

پارٹی کے دفتر میں تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، کچھ کارکنوں نے اپنی تازہ کارگذاریوں سے ذمہ دار افراد کو مطلع کیا، ان کارگزاریوں کے خلاصے یہ:۔

— محکمہ ڈاک کے کلرکوں میں الٹی میٹم دینے کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے۔ پہلی تاریخ پر تنخواہیں وصول ہو جانے کا بس ذرا انتظار ہے۔

— ریلوے کے مزدوروں کو اس بات کے لئے تیار کر لیا ہے کہ حکومت کے تشدد کا جواب اب کی بار شدید مزاحمت کے ساتھ دیں، مزدوروں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے، ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ اس کشمکش اور جدوجہد میں شریک ہونا "جہاد" ہے۔

— کئی اخباروں میں کل صبح سویرے اس قسم کے مضامین ضرور چھپ جائیں گے کہ ہماری جمہوری حکومت سرمایہ داری اور فاسزم کا ایک خوبصورت فریب ہے۔

— جیتنا نہ کے کارکنوں سے یارانہ گانٹھ کر ضروری کاغذ کامریڈ نسیم کو پہنچا دیے گئے۔

دنیا میں جو تغیر سرشت واقع ہوئی ہے اُس نے پارے کو مزاج اور بجلی کی فطرت پائی ہے، کوئی ہنگامہ منتشر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محفلیں اُکھڑنے کے لیے ہی جمتی ہیں اور بچھڑنے کی خاطر لوگوں کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوتا ہے —— آج کا جلسہ بھی برخاست ہو کر رہا۔ سورج کی چھاؤں میں اجلاس شروع ہوا اور شام کے دھندلکے میں کارروائی اختتام کو پہونچی،

غور و فکر اور بحث و تمحیص اور طویل گفتگو اور مذاکروں کے سبب بگ خشک سے گئے تھے، اور جلی سگرٹیں اس تکان کی گواہی دے رہی تھیں، طبیعت بے کیف ہو تو سگرٹیں کیا شراب کے پیالے بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

کلیمی تیسرے دن دوپہر کے بعد ایک ادبی جلسہ میں پہنچا، لوگ اس کی آمد کے انتظار میں تھے وہ جیسے ہی ہال میں داخل ہوا، تالیاں بجنے لگیں، کسی کسی کے منہ سے "زندہ باد" بھی نکل گیا، کلیمی اس جلسہ کا صدر تھا، سب کی نگاہیں اسی پر تھیں، آج اس نے بھورے رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا، سفید پاجامہ، ڈاڑھی اور مونچھیں قرینے کے ساتھ بنی ہوئیں ——— اُسے آج عورتوں اور مردوں کے ایک مخلوط جلسہ کی صدارت بھی تو کرنی تھی!

ایک نوجوان لڑکی نے اسٹیج پر آکر قومی ترانہ گایا، آواز میں غضب کی شیرینی بھی تھی سوز و درد بھی تھا، جوانی اور خوبصورتی نے اس شراب کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا، سننے ہاروں اور دیکھنے والوں کے سامنے اب قوم نہیں حسن و جوانی مجسم کھڑے تھے، احساس ملت کو ہوس نے دبا لیا تھا، کلیمی کی نگاہیں بھی نظارے سے غافل نہ تھیں ——— مگر احتیاط کے ساتھ! آنکھ بچاتے میں دیکھ لیا، کچھ سوچتے سوچتے ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی، آنکھیں ایسے موقعوں پر چور دروازے نکال لیا کرتی ہیں۔

لڑکی کی نغمہ سنجی کے بعد کلیمی نے صدارتی خطبہ پڑھنا شروع کیا، اس کے ہاتھ میں کئی ورق تھے جو جگہ جگہ سے مڑے ہوئے اور کٹے ہوئے تھے، وہ ایک فقرہ کاغذ کو دیکھ کر پڑھتا اور کئی منٹ تک اس کی زبانی تشریح کرتا، اس نے آخر میں کہا:-

اخلاق، روحانیت اور فلسفۂ خودی کی عظمت اپنی جگہ مسلم! مگر بھوکا تو بس روٹی چاہتا ہے، اخلاق کی قدریں بدل سکتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں لیکن بھوک کے تقاضے نہیں بدلتے، ہم ادب کو گہرا نہیں اُتھلا بنانا چاہتے ہیں جو خیالی دنیا سے دور اور عملی زندگی سے قریب ہو، سرمایہ داری اور سامراج نے شعر و ادب کی دارو جو ہمیں پلائی تھی اُس کا نشہ اب ہمارے لٹریچر کی رگ رگ سے اُتر جانا چاہیئے۔

کلیمی تقریر کر کے بیٹھا تو کئی منٹ تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا، اس کے رخسارے اس تحسین آمیز شور کے اثر سے سرخ ہو گئے۔ پچکے ہوئے گالوں میں ابھار سا پیدا ہونے لگا اور اس کے گلے میں پڑے ہوئے گجروں کی کلیاں چٹکنے سی لگیں ——— اس کے بعد وہ سیدھا مذہبی جلسہ گاہ میں پہنچا، ایک خوش الحان نوجوان حمد و منقبت جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا اور جلسہ کا پنڈال نعرۂ تکبیر اور زمزمۂ صلوٰۃ و سلام سے گونج رہا تھا، کلیمی کو والنٹیر اسٹیج کے قریب لے گئے، یہاں گاؤ تکیوں کے سہارے ایرانی قالینوں پر عمامہ بسر اور جبہ و قبا در بر واعظ اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، کلیمی قالین کے ایک کونے پر ذرا بھنچ کر بیٹھ گیا، جگہ کم تھی اور لوگ زیادہ تھے، ہر کوئی قالینوں سے قریب ہونا چاہتا تھا، ایک مولوی صاحب نے مثنوی مولانا روم خوب لہک لہک کر پڑھی اور پھر زبان فیض ترجمان سے اس کا ترجمہ بھی فرمایا۔ شعر تھا:-

دید موسیٰ یک شبانے را براہ ——— زاری نالید و میگفت یا الٰہ

اس کا ترجمہ بیان کیا گیا:-

دیکھا موسیٰ نے ایک چرواہے کو بیچ راستے کے جو زار و قطار روتا اور یا اللہ کہتا تھا، اس ترجمے کی تشریح اور زیادہ سلیس اور بامحاورہ تھی، سننے والے اُکتا کر پہلو بدل رہے تھے، کسی کالج کا جلسہ ہوتا تو اب تک

ہوٹنگ[1] شروع ہوگئی ہوتی، خدا خدا کر کے مولوی صاحب نے اپنا وعظ ختم کیا اور لفظوں کی یہ سنگ باری رکی، اس کے بعد کلیمی تقریر کرنے کیلئے کھڑا ہوا اور بنایت قرینہ کے ساتھ بولا، اس نے آخر میں کہا:۔

— بھوکا آدمی اطمینان کے ساتھ خدا کی عبادت بھی نہیں کرسکتا، آسمانی کتابوں میں خدا کا نام بھی آیا ہے اور رزق کا بھی جابجا ذکر ہے، انبیا سرمایہ داری کی لعنت مٹانے کے لئے دنیا میں آئے تھے یہ ان کا مشن تھا۔ ہمیں بھی اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔

کلیمی کی تقریر پوری دلچسپی کے ساتھ سُنی گئی لوگ کلیمی کے ماتھے کی سلوٹوں کو داغ سجدہ سمجھ کر خوش ہورہے تھے، جب کلیمی تقریر کرکے بیٹھا تو ایک شخص نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ چوم لیا، واعظوں اور عالموں کے تیور یہ منظر دیکھ کر عتاب آلود ہوگئے کہ ہمارے سرمایۂ عقیدت کا بے محل صرف ہورہا ہے۔

؎ گہر اندختی از ما نثار دیگراں کردی

کلیمی اپنی پارٹی کے آفس میں رات کے آٹھ بجے آیا، لوگ کھانا کھا رہے تھے، کلیمی کو دیکھ کر سب ہنسنے لگے، ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا:۔

— خوب تقریر کی آج تو قبلہ و کعبہ مولانا کلیمی صاحب! اے جزاک اللہ!

دوسرا آدمی بولا:۔

— فی الدارین خیرا۔

کلیمی نے کہا:

مجھے بددعا نہ دو، بُری فال منہ سے نہ نکالو، مجھے "خیر دارین" نہیں شراب کا ایک پیالہ چاہیئے" بہت دیر سے جماہیاں سی آرہی ہیں۔

شراب آن کی آن میں آگئی ——— دیسی شراب جس پر ولائتی لیبل لگا ہوا تھا کلیمی کے ساتھ دو تین اور دوست بھی بادہ پیمائی میں شریک ہوگئے، جام چلنے لگے، مزدوروں کی زبوں حالی کا غم اس طرح غلط ہورہا تھا، سرمایہ داری کا دفتر بے معنی غرق مئے ناب کیا جارہا تھا ———

— دنیا پوچھتی ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟ ——— ایک نوجوان نے بوتل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

— بادشاہوں کو تخت سے اور خدا کو عرش سے اتارنا ——— دوسرے نے سگرٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

— خوب کہا! زندہ باد! اسٹالن گراڈ میں قبر بنے تمہاری، کارل مارکس کی طرح شہرت اور عظمت نصیب ہو تمہیں! ——— ——— تیسرا شرابی بولا

— دوستو! مجھے سب سے زیادہ تکلیف خدا کا نام لیتے ہوئے ہوتی ہے، مگر اس بیوقوف اور جاہل دنیا کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے چند دن تک اس نام کی اذیت گوارا کرنی ہوگی، زندگی کی ترقی اور مادے کی توانائیوں کی راہ میں

---

[1] Hooting

یہ نام اور اس کے متعلقہ توجہات سنگ گراں ہیں ——— کلیمی کی بات ادھر ختم ہوئی اور ادھر ایک دُبلا پتلا جوان آدمی بلند آواز سے گانے لگا۔

گھٹا چھائی ہے ہر موج ہوا گلبار ہے ساقی　　اُٹھا ساغر کہ دُنیا ہوش سے بیزار ہے ساقی

رگ و پے میں ابھی پوری طرح توانائی بھی نہ آئی تھی، آنکھوں کے ڈورے گلابی بھی نہ ہونے پائے تھے۔ بوتل ایک چوتھائی بھی خالی نہ ہوئی تھی، شراب کے نشے میں ابھی مردانگی کی قوت نہ آئی تھی کہ اتنے میں گلی سے شور کی آواز آنے لگی، جیسے کہیں فساد ہو گیا، شور تدریجاً بڑھتا ہی چلا گیا، آدمیوں کے ساتھ ٹینے بھی بھونکنے لگے، یوں تو انسان اشرف المخلوقات ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ آواز کی بلندی اور فضا پر چھا جانے کا جہاں تک تعلق ہے تو ایک کتا تین آدمیوں کے برابر ہوتا ہے، یہ ریاضی کا مفروضہ نہیں واقعہ ہے۔

سڑک پر بلڑ ہو رہا تھا لاٹھیوں، اینٹوں، سوڈا واٹر کی بوتلوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، پولیس کی سیٹیاں اس شور میں گم ہو ہو کر رہ گئیں، سپاہیوں کے ہونٹ بھی تھرتھرا رہے تھے، بلوے میں آدمی دیوانے ہو جاتے ہیں معناً کرنیولے کی اینٹ سپاہی اور راہ گیر میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔

کلیمی اور اس کے دوست بالاخانہ کے برآمدے سے یہ خونیں مناظر دیکھ رہے تھے، یہ فرقہ وارانہ فساد تھا، ایک قوم دوسری قوم کی دشمن تھی، لاٹھیوں اور اینٹوں سے گزر کر چھرے چاقو اور تلوار کی نوبت آ گئی تھی، کوئی کوئی شخص کسی ستون یا دیوار کی آڑ لے کر بندوق کے فیر بھی کر رہا تھا، شہدے اور آوارہ گرد اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے، دکانیں لوٹی جا رہی تھیں، کوئی شکر کی بوری کندھے پر لاد کر چل دیا، کسی کے ہاتھوں میں پان کی ڈھولی اور چھالیہ کی رکابی تھی، کوئی سگرٹ کے بنڈل اور چار کی پڑیاں کرتے کے دامن میں بھرے ہوئے جا رہا تھا، کسی کے پاس جوتوں کے ڈبے تھے اور کسی کے رومال میں نوٹوں کی گڈیاں! زخمی خاک و خون میں لوٹ رہے تھے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر کچھ لوگ لوٹی ہوئی جلیبیاں اور قلاقند کھا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مسلح پولیس لاری میں بیٹھ کر آئی، پولیس کو آتا دیکھ کر بلوائیوں کی کائی سی پھٹنے لگی، چلتے ہوئے ہاتھ رک سے گئے، جس کا جدھر منہ اٹھ گیا بھاگنے لگا، ہر کوئی فرار و گریز کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ پولیس کے افسر نے کرفیو آرڈر کا اعلان کیا۔ بہلاک ہیر پہلے سے بھی زیادہ بھگدڑ مچ گئی — قانون توڑنے والے سنگینوں، رائفلوں اور کارتوسوں کی پیٹیاں دیکھ کر قانون کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے —

کلیمی اپنے دوستوں کے ساتھ جس پارٹی آفس میں بیٹھا تھا اس کی سیڑھیوں پر نیچے سے آنیوالوں کی چہل سنائی دی، سب زینے کی طرف دیکھنے لگے ——— آفس کے صحن میں تین آدمی سہمے ہوئے انداز میں آ کر کھڑے ہو گئے، ایک نوجوان لڑکا، بوڑھی عورت اور جوان لڑکی، کلیمی تیزی کے ساتھ ان کے پاس آیا، بڑھیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس کے آنسو کسی طرح تھمتے ہی نہ تھے، لڑکی بھی رو رہی تھی اور لڑکے کی ہچکی بندھی ہوئی سب ہی اپنی تباہی کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں —

کلیمی اور اس کے ساتھیوں کے تسلی دلانے پر بڑھیا نے کہا:۔

— ہم سب گھر والے کشن گنج کے روئی کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ کام کرکے ہم گھر کو لوٹ رہے تھے کہ بڑیا کے نکڑ پر لالہ کی پیاؤ کے پاس جھگڑا ہو گیا، ہم وہاں سے بھاگ کر سبزی منڈی کی طرف آئے تو ان بچوں کے باپ کے سر پر کسی موذی پاپی نے لاٹھی ماری، وہ زمین پر تیورا کر گر پڑے، ہم نے انھیں اٹھانا چاہا تو لوگوں کے ریلے میں ہم ان سے دور ہو گئے، اتنے میں پولیس نے حکم سنا دیا کہ کوئی اپنے گھر سے باہر نکلا تو گولی ماردی جائیگی۔ ہم رات کی رات آپ بابو لوگوں کے مکان میں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ ایشور کے لئے ہم پر مہربانی کیجئے۔

کلیمی نے بڑھیا کی ڈھارس بندھائی کہ ہم لوگوں نے تو مزدوروں کی خدمت کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا ہے، تم یہاں شانتی سے آرام کرو، صبح ہونے پر جب کرفیو کھلے گا تو تمہارے زخمی شوہر کا پتہ لگائیں گے، دھیرج رکھو تمہارا آدمی ہسپتال میں آرام سے ہوگا، اس کی مرہم پٹی ہو رہی ہوگی۔

کمرے میں آنے کے بعد کلیمی کی نگاہ نوجوان لڑکی پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا، اس قدر خوف و غم اور گھبراہٹ کے عالم میں بھی اس کے چہرے پر بلا کی چھبن اور شگفتگی تھی، ہوسناک نگاہ نے غمزدہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی اوٹ سے شباب کی سرمستی کو جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔

لائبریری سے ملا ہوا دفتری کا چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں دو ٹوٹی کرسیاں اور لکڑی کا ایک اسٹول رکھا تھا، کاغذوں کی کترن چٹائی پر بکھری تھی، لئی کی ہانڈی اسٹول کے پاس اوندھی پڑی ہوئی تھی اور دروازے کے کواڑ پر میلی تولیہ لٹک رہی تھی، بس یہی سامان اس کمرے کی کائنات تھی۔ ان پناہ گیروں کے آرام کرنے کے لیے یہی کمرہ دیا گیا۔

نیا مکان، اجنبی لوگ، کرفیو کی بھیانک رات، بڑھیا کی خوف کے مارے پلک بھی نہ جھپکتی تھی، جوان بیٹی ساتھ تھی، اس خوف نے فرشِ خاک کو اس کے لئے کانٹوں کا بستر بنا دیا تھا، طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تو وہ غمزدہ محسوس کرتی جیسے باہر کی کنواری لڑکی سے چھیڑ کر رہا ہے؛ ذرا ہوا آدمی سر تا بقدم وہم بن کر رہ جاتا ہے۔

بھوک اور افلاس کے نام پر پنپ ہوا بد اخلاق اور خدا ناشناس ماحول، اس فرصتِ رنگین کو پا کر بے چین ہو گیا۔ کلیمی اور اس کے ساتھیوں میں مشورے ہونے لگے، ایک دو آدمیوں نے دبی زبان سے مخالفت کی مگر اکثریت نے جذبات کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بہت سے منصوبے باندھے اور توڑے گئے، طرح طرح کی تدبیریں اور تجویزیں پیش ہوئیں اور رد کر دی گئیں، تیشۂ فرہاد اور قسمتِ پرویز کی ٹکر تھی ـــــــ بالآخر کلیمی اپنے ساتھی رمیش کو لے کر اس کمرے کی طرف چلا جہاں وہ غم نصیب بیٹھے ہوئے تھے!

کلیمی کا چہرہ یوں ہی بھیانک تھا۔ ہوسناک جذبات نے اسے بہت زیادہ ڈراونا بنا دیا تھا۔ چپٹے چپٹے دیدے، اوندھے اور بے مروت تیور، قزاقوں اور جلادوں جیسی چال، ڈاکو کے دل میں پھر تھوڑا بہت خدا کا ڈر ہوتا ہے اور یہاں تو اس تصور کو مدت ہوئے دیس نکالا مل چکا تھا، کلیمی کے ہاتھ میں رومال تھا اور رمیش کے پاس تولیہ تھی، دونوں دبے پاؤں دفتری کے کمرے کے دروازے پر جا کر رک گئے، سونے والوں کے سانسوں کی آوازیں آ رہی تھیں، کلیمی نے رومال کو اپنے اندازے کے مطابق با

کی گرفت میں پایا اور کمرے میں پیچ کر رڈکی کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا ۔ رمیش نے بروقت مدد کی مگر لڑکی زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگی ، بڑھیا پوری قوت سے ساتھ چیخی ۔ چور کے پاؤں کتنے ہوتے ہیں ؟ کلیمی اور رمیش کمرے سے باہر نکل رہے تھے کہ سپاہی نے آواز پرکان سے گولی چلادی ، کلیمی کے ماتھے پر بھرپور گولی لگی اور وہ آن کی آن میں بس ذرا یوں ہی سا تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا ۔

——— برآمدے میں ایک اشتہار لٹک رہا تھا جس کا عنوان تھا :-

" مزدوروں کے لئے ہم اپنا خون بہا دیں گے "

یہ عبارت کلیمی کے خون سے سرخ ہو گئی ۔

دوسرے دن شام کو اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی :-

——— مزدوروں کا غمخوار رہنما شہید ہو گیا ۔

——— کلیمی نے جان دے کر سرمایہ داری کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ۔

کلیمی کے جنازہ کا شہر میں جلوس نکلا ، " انقلاب زندہ باد " کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی اور بڑھیا تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کو دیکھ رہی تھی ——— اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ، شکر و مسرت کے ملے جلے آنسو ! دیکھنے والے سمجھے کہ بڑھیا مزدوروں کے رہنما کی موت پر آنسو بہا رہی ہے !

کاش بڑھیا کے آنسو بول سکتے ! مگر وہ بولتے بھی تو " انقلاب زندہ باد " کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں انکی دھیمی اور کمزور آواز سنی نہ جا سکتی ——— !

؟

مسکراہٹ بھی ایک افسانہ ہے اور آنسو بھی ایک کہانی ہے ——— تمہیں ان میں سے کون سی کہانی پسند ہے ——— ایک افسانہ نگار نے اپنے عقیدت مندوں سے دریافت کیا ۔

——— مسکراہٹ ! ——— بہت سے لوگ ایک ساتھ بول پڑے ، اور اس جواب پر افسانہ نگار بے اختیار رو دیا ———

اس کو
دنیا کا مختصر اور بہترین افسانہ بتایا جاتا ہے

رُوحِ انتخاب

یہ دَور جس سے ہم گذر رہے ہیں، لذتوں اور چٹخاروں کا دَور ہے ہر شخص لذتوں میں ڈوبنا، ورچٹخاروں میں گم ہوجانا چاہتا ہے، ہوسناکیاں منظرِ عام پر آ آ کر رقص کر رہی ہیں، اور جہاں کہیں قانون کے احتساب کا خوف ہے وہاں اُنھوں نے بہت سے چور دروازے نکال لیے ہیں، انسانی معاشرت پُوری کی پُوری انہی آلودگیوں کا شکار ہے۔ یہاں تک کہ ادب و دانش پر بھی ان تصورات کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں ــــــ لوگ کتابیں پڑھتے ہیں مگر صرف دل بہلانے اور وقت گذارنے کے لیے۔ مطالعے کے اس ذوقِ تفریح نے فکر و نظر کو عیش پسند اور آسانیوں کا خوگر بنا دیا ہے۔ گہرائیاں پایاب اور بلندیاں پست ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

کتابوں کی کثرت مگر علم کم ـــ خوشی کی خبر اور نہ عرفانِ غم

لکھنے والے سستی شہرت کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں، کام سے زیادہ نام کی فکر ہے، نام و نمود کا جذبہ اور مشہور ہوجانے کا یہ شوق عوام کی بدمذاقی کے ساتھ پوری پوری رعایت برت رہا ہے بلکہ اُس کے لیے گنجائش پیدا کر رہا ہے، زمانہ ستیز فطرتیں گنی چُنی ہیں زیادہ تر زمانہ ساز اور ابن الوقت ہی نظر آتے ہیں، چھاپہ خانے ترقی پر ہیں، بک اسٹالوں کی کثرت اور کتابوں کی بہتات ہے، حسین جلدیں، خوبصورت مرقعے، دیدہ زیب کتابت و طباعت بعض بعض سرورق پر تو مانی و بہزاد کی نقاشی اور فنکاری کا گمان ہوتا ہے مگر ان میں بہت کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ہم "ادب" کہہ سکتے ہیں عام طور پر "ادب" کے نام پر "بے ادبی" کو فروغ ہو رہا ہے۔

اگر یہ درست اور صحیح ہے کہ علم کی غایت شعور و فکر کی تربیت، سیرت و کردار کی تہذیب، زندگی کا سدھار اور فطری صلاحیتوں کو سیدھے راستے پر لگا دینا ہے تو ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس "ترقی زدہ دنیا" کا لٹریچر مقصدِ علم سے بغاوت کر رہا ہے۔ یہ علم و ادب کے صحیفے نہیں بولتی ہوئی جہالتیں ہیں ـ ناواقفیت، بے خبری، کم نظری اور پست خیالی نے علم و آگہی کی بناوٹی چادریں اوڑھ لی ہیں، فکر و نظر کی بے راہ روی نئے نئے بت تراش رہی ہے ـــ اور بہت سوں سے تو ٹھیک طرح بت گری بھی نہیں آتی اُن کے پاس تیشے تو ہیں مگر چابکدستی اور نزاکت آفرینی نہیں ہے۔

حقائق و معارف سے بیگانگی اور غایتِ علم سے لوگوں کا بے نیازانہ برتاؤ حقیقت میں انسانی معاشرے کا بہت بڑا حُزنیہ ہے، ہم سب اُس دورِ جہالت کا مذاق اُڑاتے ہیں جب آدمی لکھنا پڑھنا جانتا نہ تھا کاش! ہمیں معلوم ہوتا کہ ہماری لکھائی اور پڑھائی میں صورت و آواز تو ہے مگر علم نہیں ہے۔ آنے والی دنیا ہمارے ان "ادبی شاہکاروں" پر ہنسے گی کہ کچھ لوگوں نے علم کے

نام پرجہالت کی تصویریں بنا دی ہیں۔

ہم جن اگلے لوگوں کو جاہل کہتے ہیں اُس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ بیچارے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے بلکہ اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے شعور و فکر تربیت نا یافتہ تھے۔ ان کی زندگیاں تہذیب کے سانچے میں ڈھلی نہ تھیں، نیکی اور بدی کی ٹھیک ٹھیک پرکھ ان میں موجود نہ تھی، حیوانوں کی طرح وہ بغیر ذمہ داری بے مہرے اور اخلاقی ضابطوں سے نا آشنا تھے ــــ لیکن آج یہی تمام برائیاں اگر ہم میں بھی موجود ہیں تو علم و تہذیب کا دعویٰ ہمیں کسی طرح زیب نہیں دیتا، ہم نفس کی خطرناک خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ ہم نے خود اپنے نفس کی کمزوریوں کو زمانہ کی رفتار اور وقت کا تقاضا سمجھ رکھا ہے اور اُسی کی لے میں لے ملائے چلے جا رہے ہیں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں علم کی سنجیدگی ہے وہاں تنہائی، بیکسی، کس مپرسی اور بے توجہی ہے اور جس جگہ "تہابت کے چٹخارے" ہیں اُس جگہ شوق، التفات، مجرمٹ اور انجمن آرائیاں ہیں، عوام کیا خواص تک علمی مباحث سے کتراتے اور جی چراتے ہیں، تحقیق اور دقت آفرینی کی طرف لوگوں کا میلان بہت ہی کم ہے، سطحِ آب کے بلبلوں سے کھیل کر لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے گرداب کی تہ میں اُتر کر دیکھ لیا ہے اُس کی بوندوں سے لب تر کر کے مغالطۂ تشنگی کو فریبِ سیرابی دیا جاتا ہے اور خاک کے ذروں کو چھو کر لوگ سمجھتے ہیں کہ دوشِ آفتاب پر کمند ڈال دی۔

"فاران" اردو داں طبقہ میں علم و ادب کا سنجیدہ، پاکیزہ اور بلند ذوق پیدا کرنا چاہتا ہے، اور علمی ذوق کی تجدید و احیاء اور اُس کے اُجاگر کرنے کے لیے ہم نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ ہر شمارے میں علمی اور ادبی مضامین کے اقتباسات شائع کئے جائیں تاکہ لوگوں میں علم کی پاکیزگی اور بلندی کا شعور پیدا ہو اور جن میں اس قسم کا شعور اور صلاحیت موجود ہے اُن کے آئینۂ ادراک کی صیقل ہوتی رہے۔

کتابیں سب پڑھتے ہیں مگر کتاب کی روح کو فکر و نظر کی مُٹھی میں بند کرنا ہر کسی سے نہیں آتا، کتاب کے انتہائی اہم مقامات سے لوگ سرسری گزر جاتے ہیں ــــ مطالعہ خود ایک فن ہے جو بہت کچھ محنت، توجہ، غور و فکر اور فرصت چاہتا ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے پیشِ نظر ہم مشاہیر اور اہلِ نظر کے مضامین سے اس قسم کے اقتباسات اور خلاصے پیش کریں گے جن میں زندگی کے لیے کوئی درس اور پیام ہو۔ یہ اقتباسات ادب اور انشاء کے اعتبار سے بھی دلچسپ، بلند اور معیاری ہوں گے، نئے لکھنے والوں کو ان ادبی شہ پاروں کے پڑھنے سے بہت کچھ فائدہ ہوگا وہ محسوس کریں گے کہ خیال اور اظہار (Idea and Expression) میں کس انداز کا ربط ہونا چاہیے اور لفظوں کو ٹھیک طور پر برتنے سے تحریر کس قدر مناسب، دلکش اور وزنی ہو جاتی ہے۔

مضامین کی اس تلخیص اور انتخاب میں علمی و ادبی تحقیق کی گنجائش بھی پیدا کی جائے گی، اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے تراجم بھی اسی انداز پر پیش ہوں گے۔ یہ کام بہت محنت، فرصت اور دقتِ نظر چاہتا ہے، اگر اربابِ نظر اور اہلِ ذوق نے ہماری مدد کی تو یہ سلسلہ بہت وسیع اور مفید تر ہو سکتا ہے۔

رومیؒ و آوازِ پیمبر معجزاست

مولانا جلال الدین رومیؒ کو کون نہیں جانتا، ان کی مثنوی :-

ع ہست قرآں در زبانِ پہلوی

فارسی زبان کی مشہور ترین کتاب ہے، مولانا روم نے مثنوی لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے نہیں کہی، ان کے پیشِ نظر ایک مقصد تھا

یعنی اخلاق و پاکیزگی کا درس، جسے "تزکیۂ نفس" کہا جاتا ہے۔ مولانا روم کی نگاہِ دور رس یہ ہے اخلاق زندگی سے انسانی سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے حکایتوں، مثالوں، تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعہ بار بار اسی پیام کو دہرایا ہے، اُن کا مرکزی نصوہ "ایمان اور عملِ صالح" ہے۔ اور ان کے سازِ شاعری کے ہر پردے سے بس یہی ایک نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

مولانا روم نے نبوت کی تصدیق، خصوصیات اور اُس کے ماننے والوں کے جذبِ ایمانی اور ذوقِ فطرت پر اپنی مثنوی میں ایک باب لکھا ہے، ان ابیات میں نہایت ہی دل نشین تشبیہیں اور نادر تمثیلیں پیش کی ہیں، فرماتے ہیں:۔

— کسی پیاسے آدمی سے تم یہ کہو میاں جاؤ، پیالہ میں پانی ہے، جا کر پی لو تو پیاسا تم سے کیا یہ کہے گا کہ اپنے اس دعوے پر پہلے دلیل لاؤ، جب تم اس کا ثبوت دیدو گے کہ واقعی پیالہ میں پانی ہے تو اُسوقت پانی سے لب تر کروں گا۔

— اسی طرح جب ماں اپنے دودھ پیتے بچہ کو بلا کر کہتی ہے کہ میں تیری ماں ہوں؟ تو کیا بچہ اپنی ماں سے یہ کہتا ہے کہ پہلے تم یہ ثابت کردو کہ تم میری ماں ہو، جب میں تمہارا دودھ پیوں گا۔

— بالکل یہی حال اُس شخص کا ہوتا ہے کہ جس کے دل میں ذوقِ صداقت اور لذتِ حق شناسی ہوتی ہے، وہ کسی دلیل اور معجزہ کے بغیر نبی کا چہرہ دیکھ کر اور اُس کی آواز سُن کر ایمان لے آتا ہے۔

در دلِ ہر اُمتی کز حق مزہ ست — روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است

یہاں تک کہ:۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ اُمت در دروں سجدہ کنند

جب پیغمبر باہر سے آواز دیتا ہے تو اُمت کی روح اندر ہی اندر سجدہ کرتی ہے۔

یہی وہ دانائے رازِ پیرِ روم ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کس دردمندی اور خلوص کے ساتھ کہا ہے:۔

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے — وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

میدانِ بدر میں حق و باطل کی معرکہ آرائی

شبلی نعمانی جتنے مستند مورخ تھے اُس سے زیادہ شگفتہ قلم مضمون نگار تھے، اُن کی تحریریں ادب و انشاء کا بہترین نمونہ ہیں، شبلی بلند پایہ شاعر اور بہترین ناقد بھی تھے، یہی شاعرانہ ذوق نثر میں آکر "سحرِ حلال" بن گیا ہے، اس نصف صدی میں اردو زبان پر جلد جلد بہت سے انقلاب آئے ہیں مگر شبلی کی کتابوں کی مانگ کم نہیں ہوئی، تحریر و نگارش کا وہ ایک معیار قایم کر گئے ہیں جو ایک مدت دراز تک بعد کے آنیوالوں کو چراغ دکھاتا رہے گا۔

غزوۂ احد کا سماں شبلی نے اس انداز میں کھینچا ہے:۔

— قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے اُنھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن اُمیّہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیراندازوں کے دستے الگ تھے، جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو کوتل گھوڑے رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے عورتیں دف بجا کر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کشتگان بدر کا ماتم اور انتقام کا رجز تھا۔ ہند ابو سفیان کی بیوی آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے:

"ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے
اور اگر تم نے پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے"

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ میدان میں آ کر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو میں ابو عامر ہوں"۔ انصار نے کہا "ہاں! او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، خدا تیری آرزو پوری نہ لائے"۔ قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے؟ کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے"۔ (یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا کہتے ہیں) علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں"۔ یہ کہہ کر تلوار ماری، اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بیٹے عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا:

نیزہ بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے
یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا "میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں"۔ اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور ابو دجانہؓ فوجوں کے دل میں گھس گئے اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں۔ ابو دجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا "کون اس کا حق ادا کرتا ہے"۔ اس سعادت کے لئے دفعتاً بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر ابو دجانہ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو مغرور کر دیا، سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے"۔ ابو دجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

روایت و درایت کے دو مختلف نظریے

یورپ کے اصول تنقیدِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقید میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں

دیکھا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اُس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اُس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق ممکن ہے نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق، واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور بخصوص محدثین اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفترِ تحقیقات میں درج ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان ناقابلِ اعتناء ہے ـــ ـــ

(شبلی نعمانی، سیرۃ النبی حصہ اول)

یورپ کی معاشرت میں بگاڑ کس طرح پیدا ہوا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دورِ حاضر کے بہت بڑے اسلامی مفکر ہیں، شگفتگی، روانی، بیباکی اور سادگی و پُرکاری کے ساتھ ان کی تحریروں میں استدلال کی بے پناہ قوت ہوتی ہے نازک سے نازک مسئلہ، وہ اس قدر سلجھا کر بیان کرتے ہیں کہ بحث کا کوئی گوشہ تشنہ اور ادھورا نہیں رہنے پاتا، ابوالاعلیٰ مودودی کے مضامین دلچسپ ہی نہیں، نہایت اثر انگیز بھی ہوتے ہیں، اسلامی فکر کے اندر "پردہ عقلیت" (RATIONALISM) کے امیرِ کارواں ہیں۔

"پردہ" ان کی بہت مشہور اور معرکہ آرا کتاب ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:-

ـــ ایک امریکن رسالہ میں ان اسباب کو جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"وہ تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث ہماری دنیا پر چھاگئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں، ایک فحش لٹریچر جو جنگِ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرتِ اشاعت میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ دوسرے متحرک تصویریں جو شہوانی جذبات کو نہ صرف بھڑکاتی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ تیسرے عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس اور اکثر اوقات ان کی برہنگی اور سگرٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و امتیاز سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، یہ تینوں چیزیں ہمارے یہاں بڑھتی چلی جارہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرت کا زوال اور آخر کار کامل تباہی ہے، اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہوگی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اُتار چکی ہے"

یہ تین اسباب جو تمدن و معاشرت کی پوری فضا پر چھائے ہوئے ہیں ہر اُس مرد اور جوان عورت کے جذبات میں ایک دائمی تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے جسم میں تھوڑا سا بھی گرم خون موجود ہے۔

ذوقِ جمال پر اجتماعی فلاح قربان نہیں کیا جاسکتا؟

ـــ کہا جاتا ہے کہ جن چیزوں کو تم شہوانی محرکات قرار دیکر تمدن کے دائرے سے خارج کرنا چاہتے ہو وہ تو سب

آرٹ اور ذوقِ جمال کی جان ہیں، انھیں نکال دیجئے تو انسانی زندگی میں لطافت کا چشمہ ہی سوکھ کر رہ جائیگا۔ لہٰذا انھیں فن کی حفاظت اور معاشرت کی اصلاح جو کچھ بھی کرنی ہے اسطرح کیجئے کہ فنونِ لطیفہ اور جمالیت کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ہم بھی ان حضرات سے متفق ہیں کہ آرٹ اور ذوقِ جمال واقعی قیمتی چیزیں ہیں، جن کی حفاظت ضرور ہونی چاہیئے مگر سوسائٹی کی زندگی اور اجتماعی فلاح ان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ اس لئے کسی آرٹ اور کسی ذوق پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ اور جمالیت کو اگر بدولت بجھنا ہے تو اپنے نشوونما کا دوسرا راستہ ڈھونڈیں جس میں وہ اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں، جو آرٹ اور ذوقِ جمال زندگی کے بجائے ہلاکت اور فلاح کے بجائے فساد کی طرف لے جانے والا ہو اسے جماعت کے دائرے میں ہرگز پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔"

یہ کوئی ہمارا انفرادی خانہ زاد نظریہ نہیں بلکہ یہی عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ تمام دنیا اس کو اصولاً تسلیم کرتی ہے اور اسی پر ہر جگہ عمل بھی ہو رہا ہے۔ جیب کترنے کا فن اگرچہ ایک لطیف ترین فن ہے اور ہاتھ کی صفائی کا اس سے بہتر کمال شاید ہی کہیں پایا جاتا ہو مگر کوئی اس کے پھولنے پھلنے کا روادار نہیں، یہ اصول بجائے خود مسلم ہے کہ جماعت کی زندگی اس کا امن، اس کی فلاح و بہبود ہر فنِ لطیف اور ہر ذوقِ جمال و کمال سے زیادہ قیمتی ہے اور کسی آرٹ پر اُسے قربان نہیں کیا جا سکتا

احتیاطی تدابیر عین فطرت ہیں

— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لئے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندی لگانا دراصل ان کے اخلاق اور ان کی سیرت پر حملہ ہے، اس سے یہ پایا جاتا ہے گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتماد ہے نہ مردوں پر۔۔۔ بات بڑی معقول ہے مگر اسی طرزِ استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کر لیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس بات پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے، ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے .... اس طرزِ استدلال سے تو آپ ہر آن چور، خائن اور مشتبہ چال چلن کے آدمی قرار دیئے جاتے ہیں، مگر آپ کی عزتِ نفس کو ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگتی پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی معاملہ میں آپ کے احساسات اتنے نازک ہو گئے ہیں!؟

فتنۂ نگاہ

نفس کا سب سے بڑا چور نگاہ ہے، اس لئے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اسی کی گرفت کرتے ہیں، قرآن کہتا ہے :—

"اے نبی! مومن مردوں سے کہدو کہ اپنی نگاہوں کو غیر عورتوں کی دید سے باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے اور اے نبی! مومن عورتوں سے بھی کہدو کہ اپنی

نگاہوں کو (غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے :-

آدمی زادے تیرے لیے پہلی نظر کی اجازت ہے مگر خبردار دوسری نظر نہ ڈالنا۔

حضرت علیؓ سے فرمایا :—

"اے علیؓ! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو، پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری نظر نہیں، حضرت جابرؓ نے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں۔ فرمایا فوراً نظر پھیر لو۔

اسی فتنہ نظر کا ایک تماشا نسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اس کا حسن دیکھا جائے۔ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی، دل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمائش حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرائش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں، قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع اصطلاح "تبرج جاہلیہ" استعمال کی ہے، ہر وہ زینت اور ہر وہ آرائش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذت نظر بننا ہو تبرج جاہلیت کی تعریف میں آجاتی ہے۔ اگر برقع بھی اسی غرض کے لیے خوبصورت اور خوشرنگ انتخاب کیا جائے کہ نگاہیں اس سے لذت یاب ہوں تو یہ بھی تبرج جاہلیت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کا تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے اس کو خود ہی اپنے دل کا حساب لینا چاہئے کہ اس میں کہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے؟ اگر ہے تو وہ اس حکم خداوندی کی مخاطب ہے کہ "ولا تبرجن تبرج الجاھلیہ"، جو آرائش ہر بری نیت سے پاک ہو وہ اسلام کی آرائش ہے اور جس میں ذرہ برابر بھی بری نیت شامل ہو وہ جاہلیت کی آرائش ہے"

نفس کے خوبصورت دھوکے

شیطان نفس کا ایک دوسرا خطرناک ایجنٹ زبان ہے کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعہ سے پیدا ہوتے اور پھیلتے رہتے ہیں، مرد اور عورت بات کر رہے ہیں، کوئی برا جذبہ نمایاں نہیں ہے، مگر دل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت بھیجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے، قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے :-

" اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں (بدنیتی کی) بیماری ہوگی وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کرے گا، بات کرو تو سیدھے سادے طریقے سے کرو — (الاحزاب)

— فتنہ زبان کے اور بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبے میں دل کا یہی ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے —

عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیت بیان کرے، عورت اور مرد دونوں کو اس سے

منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے لوگوں سے بیان کریں کیونکہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔

بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متاثر کیا جاسکتا ہے اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے اور اسلام اس کی بھی ممانعت کرتا ہے:۔

"اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے (یعنی جو زیور اندر پہنے ہوئے ہیں) اس کا حال معلوم ہو (النور)

— خوشبو بھی ان قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفس شریر کا پیغام دوسرے نفس شریر تک پہنچاتے ہیں یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے جس کو دوسرے تو خفیف ہی سمجھتے ہیں مگر اسلامی حیا اتنی حساس ہے کہ اس کی طبع نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"جو عورت عطر لگاکر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے" (ترمذی)

لفظوں کی پرکھ اور انکا صحیح استعمال

غالب ساحر بھی تھے اور بے مثل نثر نگار بھی، ان خوبیوں کے ساتھ فن و زبان کی نزاکتوں پر بھی اُن کی نظر تھی — اور نہ صرف نظر بلکہ بصیرت حاصل تھی، اپنے دوستوں، شاگردوں، اور ہم عصروں کو جو خطوط غالب نے لکھے ہیں اُن میں لفظی تحقیق کی بڑی مفید بحثیں آگئی ہیں۔ منشی ہیرا سنگھ کو خط لکھتے ہیں:۔

— بھائی لبِ ساحل کی سند پر یہ شعر ہے طالب آملی کا:—

مدتے آں گدائے خونیں دل بود تنجا لہ، لبِ ساحل

لبِ بام، لبِ فرش، لبِ گور، لبِ چاہ، لبِ دریا، لبِ ساحل یعنی کنارے کے مستعمل ہے اہل ایران لبِ بام اس مقام کو کہتے ہیں کہ جہاں ایک قدم آگے بڑھائیے تو دھم سے انگنائی میں آرہیے۔ لبِ دریا سے جہاں سے قدم بڑھائیے تو پانی میں جائیے، لبِ ساحل وہ ہوا جہاں سے آگے بڑھے تو دریا میں گرے، لبِ دریا سے پاؤں پانی پر رکھا جاتا ہے جیسا نہانے کے واسطے، اور لبِ ساحل سے دریا میں کودتے ہیں جیسے سلطان جی کی باؤلی میں لبِ بام سے تیراک کودتے ہیں — ....

منشی میاں داد خاں سیاح کے نام ایک خط ہے:۔

صاحب! وہم اور چیز ہے اور احتیاط اور چیز ہے، کارپردازانِ ڈاک میرے خطوط کے ٹکٹ کبھی نہ دبائیں گے اور میرے خطوط کبھی تلف نہ ہوں گے — آدھ آنہ کی جگہ دوست کا ایک آنہ کیوں کھوؤں ..... بھائی اچھال الف دیتا ہے میرے کلیجے میں ایک تیر لگتا ہے —

منشی ہرگوپال تفتہ کے موسومہ خطوں کے اقتباسات:۔

"تم جس کو تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں، قیاس دوڑاتے ہو وہ قیاس کہیں مطابق واقع

ہوتا ہے کہس علامت ! عرفی کہتا ہے :-

؎ روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا، ناشتا اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو، ہندی اُس کی نہار منہ، ہم لکھتے ہو ؎

عجب ناشتہ فرستادی، یعنی غذا نے صبح جیساکہ ہندی میں مشہور ہے۔ تم نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں .....

— اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلّم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکلتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا لکھ دیا۔ نظامی وسعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم مانیں، ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں؛ گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے، یہ جھگڑے قصّے جانے دو ..... ارغنوں کو بعض مضیم میں نے ہوتے لکھ دراصل ارغنوں بغین مفتوح اور مخفف اس کا ارغن اور مبدل منہ ارگن ہے .....

— نیم نگاہ، و نیم نگاہ و نیم ناز، یہ روزمرّہ اہل زبان ہے نیم بمعنی اندک و رنہ گناہ کا آدھا، اور نگاہ کی ادھواڑ[1] اور ناز آدھا یہ جہلات میں ہے۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا!

— کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں، صرف بحر، ردیف، اور قافیہ دیکھ لیا...

.... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

— فارسی میں مبدا فیاض[2] سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر (اردوئے معلیٰ)

---

[1] زمانہ حال کے روزمرّہ میں آدھے کو ادھواڑ نہیں کہتے۔ م

[2] کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے یہاں فیاض کا محل ہے۔

ہماری نظر میں

"فاران" نقد و نظر کے اُس اُفق سے طلوع ہوتا ہے، جہاں شخصیتوں اور شہرتوں کے آفتاب غروب ہو جاتے ہیں، اسکی تنقیدیں سچی اور بے لاگ اور تبصرے غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں ـــ جو لوگ اپنی شخصیت اور ذاتی تعلقات کو درمیان میں لا کر ہم سے کسی جھکاؤ کی توقع رکھتے ہیں، اُنہیں مایوس ہو جانا چاہیے۔

آئینہ چہروں کے حقیقی خد و خال ظاہر کرنے میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتا

آخری رات

ایم اسلم نے لکھا اور دار البلاغ (محمد نگر میور روڈ لاہور) نے شائع کیا حجم ۴۴۴ صفحات، دیدہ زیب کتابت و طباعت، باتصویر گرد پوش، خوبصورت جلد قیمت چار روپے۔

جناب ایم اسلم اردو زبان کے مشہور ناول نویس ہیں، اُن کی تصانیف کے قبول عام کا یہ عالم ہے کہ کتاب چھپ کر بازار میں اِدھر آئی اور اُدھر ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ اسلم صاحب کی نئی نئی کتابوں کا لوگوں کو انتظار رہتا ہے، دار البلاغ لاہور نے میاں اسلم کی تصانیف کو اپنا موضوع اشاعت بنالیا ہے ـــ

ایم اسلم نے شروع میں رنگین افسانے اور ذرا شوخ قسم کی آپ بیتیاں لکھی تھیں مگر اب ان کا قلم اصلاحِ معاشرت کیلئے وقف ہو کر رہ گیا ہے۔ "آخری رات" بھی ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مغرب زدہ تمدن اور بداخلاق تہذیب پہ طنز کی گئی ہے، مصنف کا مرکزی خیال اخلاقی، مذہبی ملکہ اسلامی ہے، دار البلاغ کے ڈائرکٹر جناب بدر السلام صاحب فروغی نے اوراقِ تعارف میں لکھا ہے :ـــ

"عورت کے تمام مساعی کے لیے اصلی میدان گھر ہے، اُس کے قلب و ذہن اور حسن و جمال کی تمام عنایات اس لیے ہیں کہ گھروں کی تیرگی میں اُس سے روشنی پیدا ہو، یہ ذوقِ کاشانہ بنے، شمعِ انجمن نہ ہو، تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہے کہ جب کبھی جنسِ لطیف نے دہلیز سے قدم باہر رکھا ہے، مرد کے مصائب میں اضافہ ہی ہوا.........."

پبلشر کا یہ عقیدہ مصنف کی تحریر میں ہر جگہ جھلکتا ہے، مصنف مغربی انداز کے کالجوں، کلب گھروں، سینما ہالوں اور نام و نمود کے سیمیائی مناظر سے بہت بیزار ہے اُس کی نگاہ میں عورت کی بڑائی، اخلاق، پاکیزگی اور غیرت و حیا میں ہے۔ عورت عصمت و اخلاق کی حدود توڑ کر چاہے سوسائٹی کی دنیا کا آفتاب کیوں نہ بن جائے مگر اس کی خود اپنی دنیا تیرہ و تاریک

ہو جاتی ہے، عورت کی بلندی تماشا میں نہیں "حجاب" میں ہے!

ناول کے ابتدائی صفحے کاٹے کے تو ہیں مگر ان میں آورد پائی جاتی ہے، کتاب میں روانی اور آمد کا رنگ چودہ صفحہ کے بعد پیدا ہوتا ہے، مکالمے دلچسپ ہیں اور کہیں کہیں نفسیات سچ مچ مجسم ہوگئی ہے — مگر جہاں مصنف نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہے وہاں خیال کے ساتھ زبان نبھ نہیں سکا، ایم اسلم کا طرزِ نگارش اسکر وائلڈ کی طرح بیانیہ ہے، رمزیت اور اشاریت کے فن سے وہ آشنا سے معلوم ہوتے ہیں، افسانہ اور ناول میں مکمل کر بات کہنے سے زیادہ اشاروں اور کنایوں سے لطف پیدا ہوتا ہے اور یہ انداز بہت زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔

مصنف کے اس قسم کے جملے ادبی اعتبار سے بہت پرلطف ہیں:-

— زندگی کسی محکم نصب العین کے بغیر ہوا کے اس ٹھنڈے جھونکے کی طرح ہے جو کسی تپتے ہوئے عوارض سے گزر جائے (صفحہ ۶۸)

— یہ رنگینیاں تو میرے خونِ دل سے پیدا ہو رہی ہیں، یہ تو میرے اشکِ حسرت ہیں، ندامت کے آنسو ہیں جو کاغذ پر گرتے ہی حروف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں (صفحہ ۱۴۰)

— یہ کہہ کر زہرہ نے ثریا کا ہاتھ حامد کے ہاتھ میں دیدیا، جانے ان دو ہاتھوں کے ملاپ میں کیا کشش تھی کہ ثریا بے اختیار رونے لگی، حامد کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے (صفحہ ۲۴۱)

اظہار و بیان کی ان خوبیوں کے ساتھ زبان اور محاورہ کی متعدد غلطیاں اس ناول میں پائی جاتی ہیں، بسیار نویسی کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے، ایم اسلم صاحب اگر کمیت سے زیادہ کیفیت پر نگاہ رکھیں تو ان لغزشوں سے بڑی حد تک دامن بچایا جا سکتا ہے۔

— لوگوں نے میرا نام "رنگیلے پیا" ڈال رکھا تھا" (صفحہ ۱۰)

— جہاں دیکھو گھر کا سامان موقع بے موقع ٹھونسا رکھا ہوگا۔ (صفحہ ۲۶)

— جب خدا نے سب گناہ بخش دیئے ہیں تو حساب لینے کی کیا ضرورت ہے (صفحہ ۳۸)

زبان و بیان کی اس بھول چوک کے ساتھ کہیں کہیں اظہارِ خیال بہت گنجلک بھی ہو گیا ہے:-

— اس کے دل موہ لینے والے اثرات سے بچنے کے لئے میں اپنی کتھا احاطۂ تحریر میں لانے پر آمادہ ہوا ہوں (صفحہ ۳۵)

— آہٹ، گھبراہٹ، بناوٹ، کروٹ، سلوٹ، اس انداز کے تمام مشتقات بالاجماع مونث بولے جاتے ہیں مگر اسلم صاحب لکھتے ہیں۔

— میں نائٹ گون کے سلوٹ نکال رہی ہوں — (صفحہ ۴۴) سلوٹ کیسے پڑ گئے (صفحہ ۵۵)

صفحہ ۱۲۸ "پرقاز" کو "قاذ" لکھا ہے، خدا کرے یہ کتابت کی غلطی ہو۔

صفحہ ۱۷ کی آخری سطر ہے۔

— اجی واہ! کھائے گلگلے اور تیل سے پرہیز

حالانکہ ضرب المثل یوں ہے کہ "گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز"، ضرب المثال کے لفظوں میں رد و بدل کرنا

اصولِ زبان کے بدولت ہے، ہاں! کہیں کہیں ضرورتاً کسی خاص تاثر کے اظہار کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے جس کا یہاں محل نہیں ہے

— میں رات آپ کے الجھن دیکھ رہی تھی (صفحہ ۱۸) یہاں الجھن کی جگہ کروٹ کہنا چاہیے

— اور اب چونکہ وہ ایک نازک حالت میں سے گذر رہی تھی (صفحہ ۳۴) یہاں "میں" کا حشو و فوائد ہے۔

— زہرہ کا شوہر بہت بدقسمت، شان غنیمت کی ایسی عورت سے بن نہ آئی (۱۵۹) بن نہ آئی کا یہاں کوئی محل نہیں، لکھنا یوں چاہیے تھا کہ "جس کی ایسی عورت سے نبھ نہ سکی" یا ایسی عورت سے نباہ نہ ہو سکا، ستم صاحب نے کئی جگہ بن آنے کو بنا کے معنی میں لکھا ہے۔ جو ارباب ذوق کی نگاہ میں تکلیف دہ حد تک غلط ہے۔

— اور مجھے عادت ہے چوبیس گھنٹوں میں پانچ پیگ پینے کی، دو کھانے کے ساتھ، ایک رات کو اور دو ایک جب دل کراتے (صفحہ ۱۰۷) وجدان نے پھر خلش محسوس کی، "جب دل کراتے" طبع سلیم کے لیے کس قدر اذیت دہ ہے "جب دل چاہتا" ہونا چاہیے تھا۔

— اگلے روز ہمیں گارڈن پارٹی پر جانا تھا (صفحہ ۲۲۴) یہاں "پر" کا نہیں "میں" کا محل ہے۔

— ثریا نے جواب دیا دودھ پلانے والی باہر سے منگوائی ہے (صفحہ ۲۰۰) "بلوائی" کہنا چاہیے تھا آدمیوں کو بلایا اور بلوایا جاتا ہے منگایا نہیں جاتا —

— یہ ابھی جو ہم پر لستار جھری تھی (صفحہ ۲۴۴) لتاڑ کے بجائے پڑنا بولتے ہیں۔

— لیکن دلوں میں گرہ بیٹھ چکی تھی (صفحہ ۱۳) لکھنا یوں چاہیے تھا "لیکن دلوں میں گرہ پڑ چکی تھی"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آخری رات میں بیم ستم کا خلوص احساس جا بجا جھلکتا ہے، کہیں کہیں تو انھوں نے اپنے دل کی پھانسیں کاغذ پر نکال کر رکھ دی ہیں مگر بداخلاقی، بے پردگی اور فحاشی کا جو اہل قلم پرچار کر رہے ہیں ان کے جواب اور توڑ کے لیے "آخری رات" سے بہت زیادہ پُر زور، بلند خیال، شگفتہ اور نیک نیک کے اعتبار سے وزنی ناولوں، افسانوں کی ضرورت ہے۔

تحفۂ نو

مرتبہ محمود الحق، شائع کردہ اور نگ بک کلب، صدر کراچی، ضخامت ۹۶ صفحے طباعت و کتابت قابل قبول قیمت ڈیڑھ روپیہ —

جناب محمود خاں صاحب ایم۔اے دہلوی نے مختلف شاعروں اور مضمون نگاروں کے افکار جمع کر کے سلیقہ کے ساتھ شائع کیے ہیں اور اسطرح انھوں نے نئے سال (سنہ ۱۹۵۹ء) پر اردو داں دنیا کو ایک ہدیہ اور تحفہ دیا ہے۔ اس مجموعہ میں تازہ ترین نظمیں بھی ہیں اور مشاہیر شعراء کا انتخاب کلام بھی شامل ہے، مضامین اوسط درجے کے ہیں اور ان پر اویس احمد ادیب کا مقالہ "اردو زبان و ادب کی مجمل تاریخ" اس گلدستہ کا گل صد برگ ہے، اویس صاحب نے نہایت سلیقہ اور جامع ترتیب کے ساتھ اردو زبان کی تاریخ اپنے انداز میں بیان کی ہے۔

لائق مضمون نگار نے اس مضمون میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے مگر بعض باتیں محل نظر ہیں، جن کا ذکر اگر نہ کیا جائے تو تنقید، قصیدہ اور منقبت بن کر رہ جائے گی، مضمون نگار نے لکھا ہے:—

— اس طرح ان کے خیال کے مطابق سنسکرت شاکر کا ذریعہ، کی پہلی اردو تھی اور اردو سے مسلی دوسری اردو ..

"تحفۂ نو" کے مولف و مرتب محمود الساتق کا خود اپنا مضمون "نیا ادب" خاصہ شگفتہ اور سنجیدہ ہے۔ مضمون نگار نے جدید ادب کو سراہا بھی ہے اور اسکی کمزوریوں پر طنز بھی کی ہے۔ صفحہ ۱۶ پر ایک جملہ ہے "وہ زبان کی خوبیاں، روزمرہ اور محاورے طاق نسیاں کر دیے گئے"۔ میں سمجھتا ہوں کاتب سے یا خود مضمون نگار سے کوئی حرف چھوٹ گیا ہے ورنہ یہ جملہ موجودہ صورت میں بے معنی سا ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں :—

"فی زمانہ اظہار کے طریقے اور انداز بدل رہے ہیں، جمالیاتی قدروں میں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے" نئے ادیبوں کی بات سے اب تک تو یہی سن رہے تھے کہ اخلاقی قدروں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں "محمود صاحب کی زبانی پہلی بار یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ جمالیاتی قدریں بھی بدل سکتی ہیں بلکہ بدل رہی ہیں یعنی اب شاید لالہ و گل کے نظارے سے لوگوں کو وحشت ہوا کرے گی، قوس قزح کی رنگینیاں نگاہوں پر بار ہونگی اور نظارہ رعنائی کی جگہ بھدے پن، حسن و تناسب کے بجائے بدہیئتی کو پسند کرے گا ——— نئے پن اور انقلاب کی شاید اسی دن تکمیل ہوگی — !

تحفۂ نو کے مضمون نگار نے بھی اردو ادب کے جدید معماروں میں انہی شاعروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو اشتراکیت زدہ طبقہ کے نمائندے ہیں۔ کاش وہ ان حد بندیوں سے ہٹ کر دیا نتدارانہ شاعری پر طائرانہ ہی سہی نگاہ ڈالتے ——— تنقید نگاروں کے سلسلہ میں لکھا ہے :۔

"اختر حسین رائے پوری، وقار عظیم، احتشام حسین اور عزیز احمد نے خصوصاً ہمارے تنقیدی ادب میں اچھا خاصہ اضافہ کیا ہے ان کی تنقید کی بے تعصبی اور عالمانہ انداز نے بہت سے ادیبوں کو سختی سے ٹوکا ہے اور بہت سی خرابیاں جو ادب میں بے راہ روی کو عام کرنے میں ان لوگوں کا بڑا حصہ ہے ..."

حالانکہ احتشام حسین اور عزیز احمد مذہب سے نفرت کرتے ہیں اور ان ادیبوں اور شاعروں کا جو ان کے ہم مسلک نہیں ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کرتے اس لئے ان کی تنقیدوں میں جانبداری اور عصبیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے احتشام جیسے نقادوں نے فکر و خیال کی بے راہ روی پر احتساب نہیں کیا بلکہ طرح طرح سے ان کو سراہا ہے —

ماہر القادری کا مضمون "پاکستان کا ادب" اور زیادہ وضاحت چاہتا ہے، کہیں کہیں بات پورے طور پر کھلی نہیں تشنہ اور ادھوری رہ گئی "اردو کا مستقبل" البتہ جید کا مضمون ہے جو رئیس احمد جعفری نے خوب محسوس کر کے اور متاثر ہو کر لکھا ہے ——— "تحفۂ نو" مجموعی حیثیت سے مطالعہ کے قابل ہے اور اس کے بعض مضمونوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا —

جناح انسٹی ٹیوٹ آف کامرس کراچی

بمقام سندھ مسلم کالج، مقابل پرنس گارڈن

۵ جنوری سے کلاسیں باقاعدہ جاری ہو چکی ہیں

اوقات:۔ شام کے ۶ بجے سے ساڑھے ۸ بجے تک

گریجویٹس، انڈر گریجویٹس اور وہ طلبا جنہوں نے میٹرک پاس کیا، اکاؤنٹنسی، ٹائپنگ، انشورنس اور جنرل کامرس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل کئے جاتے ہیں

داخلہ کے لیے انسٹی ٹیوٹ ہذا کے جنرل سیکرٹری مسٹر اکمل منصوری سے شام ۳-۴ سے ۹-۳۰ تک دفتر میں اور اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ میں ملاقات کریں

احمد بی خان ایم ایس سی، بی اے، ایف بی آئی (لندن) پرنسپل

دفتر: عیسیٰ جی ابراہیم جی بلڈنگ بندر روڈ، کراچی

ہماری خصوصیات

جملہ اقسام کی تمباکوئی خوردنی

پاک زردہ نمبر ۲۲ پاک موتی نمبر ۱۲ مشکی ورقی نمبر ۲۲ تنبول شیریں نمبر ۲۲ اور تنبول مصالحہ نمبر ۲۲ ہیں جن کا تجربہ ہی مستقل خریدار بننے کی سفارش ہوگا

لکھنؤ ٹوبیکو ورکس

واٹرکورس روڈ۔ کراچی
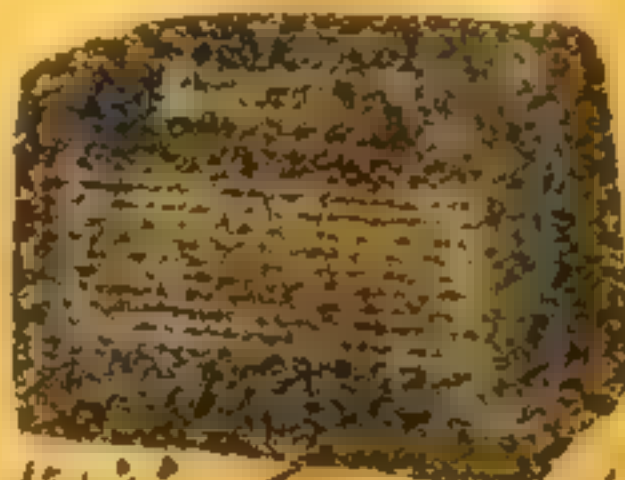
یونیورسل ماڈل MUS 21 جس پر بیشتر غیر ممالک کے اسٹیشن سنے جاسکتے ہیں

دنیا بھر کے اکثر ریڈیو بنانے والے جب ملارڈ کے والوز استعمال کرتے ہیں تو بلا شبہ ملارڈ کمپنی کا بنایا ہوا ریڈیو دنیا کا بہترین ریڈیو ہوگا۔ اگر یقین نہ آئے تو ہمارے ہاں آ کر تسلی کر لیجئے۔ یونیورسل۔ اے سی اور بیٹری کے مختلف ماڈل موجود ہیں۔

ہم پرانے سیٹ ایکسچینج میں لیتے ہیں۔ ریڈیو کی مرمت ماہرین کی زیر نگرانی سستے داموں میں کیجاتی ہے

ریڈیو الیکٹرک ہاؤس

فورٹ مینشن فریر روڈ کراچی ـــــ دیال سنگھ مینشن مال روڈ لاہور فون نمبر ۲۲۱۵ ـــــ صدر پشاور فون ۲۱۴

FAVRE-LEUBA
مشہور و معروف
کارخانہ کی بنی ہوئی
قابلِ اعتماد گھڑیاں

DAYLIGHT SOAP
Look!
--- at his "SNOW WHITE" turban. What a miracle does DAYLIGHT soap perform!
Basra
SOAP FACTORY • KARACHI •
NAPEX B/T

ELECTRIC
MOTORS

ENQUIRIES SOLICITED

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱) شمارہ (۲)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

مئی سنہ ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ چھ روپے — فی کاپی ۸/

ممالک غیر سے نو روپے — " ۱۲/

"فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

منظومات

نحمدہٗ ونصلی

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے

ہوس سینہ میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

اس تہذیب پرودہ اور تمدّن زدہ دُنیا میں ہوس نے چھپ چھپ کر تصویریں بنانی چھوڑ دی ہیں، کھلے خزانے دن دہاڑے بلکہ یوں کہیے کہ ڈنکے کی چوٹ ہوا و ہوس کے بُت تراش رہے ہیں۔ سیاہ کاریوں کے مجسمے معشیت کے چوراہوں پر نصب کیے جا رہے ہیں، اور ہر طلوع ہونے والی صبح اُن بُتان آذری میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور شام ہوتے ہوتے کچھ اور خاکے، ہیولے اور سراپا تیار ہو جاتے ہیں۔

ہوسناکیوں کے یہ بُت، مجسمے اور پیکر جب شعر و ادب کی زبان سے بولتے ہیں تو اُن کی اصطلاحیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں ——— مثلاً "ترقی پسند ادب" گویا اس سے پہلے کا ادب "رجعت پسند ادب" تھا، یا "صحت مند لٹریچر" یعنی "بیمار لٹریچر" کے مقابلہ میں یہ تندرست اور توانا ادب پیش کیا جا رہا ہے۔

کہنے کو تو یہ چند نئی اصطلاحیں اور جدید ترکیبیں ہیں۔ مگر حقیقت میں ان اصطلاحوں کی اوٹ سے جدّت پرستوں کی ذہنیت جھانک رہی ہے، ان سے پتہ چلتا ہے، اُن کے دماغ کے نئے سانچوں کا اور سراغ ملتا ہے اُن کی فکر و نظر کی جدید تشکیل کا! نئے پن کے اس بڑھتے ہوئے شوق نے اب ایک مرض کی صورت اختیار کر لی ہے جس نے شعر و ادب کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے اور جس کی وجہ سے لٹریچر کے حواسِ خمسہ میں اختلال پیدا ہوتا جا رہا ہے اقبال نے کس تمنا کے ساتھ کہا تھا ۔

ع ۔ گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ۔

مگر کچھ ایسے بے ڈھنگے ہاتھوں میں گیسوئے اردو آگیا ہے۔ جن کے پاس شانہ کی جگہ قینچیاں ہیں اور جو زبان و ادب کی زلفوں کو جہاں سے چاہتے ہیں تراش دیتے ہیں۔ یا پھر اس گیسوئے تابدار میں کچھ رنگے ہوئے دُم چھلے لگا کر یہ سمجھتے ہیں بلکہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے زلفوں کی وسعتوں میں اضافہ کر دیا۔ اُن کو ترقی دیدی۔ اور ——— جن بدذوق

و آداب سے پہلے قائم تھیں ان کو بہتر صورت دے کر بدل دیا۔

غزل

ترقی و انقلاب اور جدت و تخلیق کا یہ فتنہ لفظوں تک ہی محدود نہیں ہے، بیان اور زبان ہی کی جان پر یہ قیامت نہیں ٹوٹ رہی ہے بلکہ فکر و خیال کی رگوں میں بھی اس زہر کے انجکشن دیئے جا رہے ہیں۔ اور شعر و ادب کی جمی جمائی بساط کو اُلٹ کر بلکہ اُسے چاک کر کے نئے نقشے اور جدید مہرے بنانے کے سامان ہو رہے ہیں۔

اسی بدعت فکر نے اس نظریہ کو جنم دیا ہے کہ:—

"غزل سرمایہ دارانہ دور کی یادگار ہے"

ان لوگوں نے "سرمایہ داری" اور "شہنشاہیت" کے بہت سے لیبل بنا لئے ہیں، جس چیز پر چاہتے ہیں چسپاں کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی پرواز خیال کا یہی عالم رہا تو وہ وقت دور نہیں ہے جب ترقی و انقلاب کی بارگاہ سے منشور شائع ہوگا کہ "چاند تارے، کہکشاں، قوس قزح، بلبل و طاؤس اور گل و لالہ بھی دورِ سرمایہ داری کی پیداوار ہیں یہاں تک کہ خود انسان کو بھی سرمایہ و ملوکیت کی ضرورتوں نے پیدا کیا ہے۔

آپ کہیں گے کہ ان دعووں اور نظریوں پر دنیا ہنسے گی، اور اس قسم کی بے سر و پا باتوں کا مذاق اُڑایا جائیگا مگر میں عرض کرتا ہوں کہ جس طرح آج آپ ان لوگوں کی باتوں کو سن کر ابرو اور تبسم لب کے بغیر قبول کرتے چلے جا رہے ہیں تو کل بھی آپ سے کسی تنقید اور محاکمہ کی توقع رکھنا فضول ہے۔ آپ میں سے اچھا خاصا طبقہ کہیگا کہ نئی آواز شروع میں نامانوس ہی ہوا کرتی ہیں۔ ان سے وحشت کرنی ٹھیک نہیں، ہمیں اس جدید نظریہ کے پس منظر پر نگاہ کرنی چاہئے، ان لوگوں کی تنقیدوں میں خلوص اور شدتِ احساس پائی جاتی ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر زبان کھولنے کی ضرورت ہے، اس جماعت نے زندگی اور ادب کی قدروں کو پرکھ کر ہی یہ نئے نظریئے قائم کئے ہیں — سوچیئے کہ اس وقت کیا آپ بے باکی کے ساتھ مسکرا بھی سکیں گے؟ آپ کے ہونٹوں پر اگر مسکراہٹ آئی بھی تو جھینپے ہوئے انداز میں آئے گی کہ کہیں ہمارا بھی رجعت پسندوں اور قدامت پرستوں میں شمار نہ ہونے لگے۔

فحاشی اور عریاں نگاری

اسی گروہ نے فحاشی اور عریاں نگاری کو "آرٹ" کا نام دے رکھا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ ہم اس طرح سماج کی کمزوریوں کی عکاسی کر رہے ہیں۔ رستے ہوئے ناسوروں سے کریہ کا دامن ہٹا دینا فحاشی یا گندگی نہیں ہے، ہم جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اُسے جوں کا توں ظاہر اور بیان کرتے چلے جاتے ہیں یہ فطرت نگاری اور واقعات کی ترجمانی ہے۔ آئینہ خوب اور ناخوب ہر طرح کے چہروں کا عکس قبول کرتا ہے، ادب بھی ایک آئینہ ہے، اس کے روبرو جو چیز بھی آئے گی منعکس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

تو ادب کے ان آئینوں میں شہوانی خواہشیں پوری تابناکی کے ساتھ جگمگا رہی ہیں، کہیں "لحاف" کی سلوٹوں کی عکاسی ہے تو کسی میں "بو" کے پس منظر کی عکس ریزی! ہوسناک نظاروں سے لے کر اجسام کے لمس تک کے مراحل مصور ہو رہے ہیں۔ انگڑائی اور گدگدی تو اس منزل کا نقطۂ آغاز ہے وہاں تو "جنسیات" کے ایک ایک پردے کو چاک کیا جا رہا ہے تاکہ سماج اپنے کرتوتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکے۔

مگر سماج ان آئینوں کو دیکھ کر مطلق نہیں شرماتا۔ اس کی پیشانی پر عرقِ ندامت کی ایک بوند بھی نمایاں نہیں ہوتی معصیت آلودگیوں کی یہ چٹخارے دار ترجمانیاں سماج کی اور ہمت بڑھاتی ہیں۔ اس کی کمزوریوں کے حوصلے پست نہیں بلند ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذوقِ ہوس کو اور سہارا ملتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو دامن کی نجاست کو شراب یا پیشاب سے

دھو کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ نجاست دُور ہو گئی۔

مذہب پر حملہ

یہ طبقہ اچھی طرح جانتا ہے کہ تمام اخلاقی پستیوں کے باوجود اب بھی کچھ نہ کچھ لوگ اخلاقی پابندیوں اور روحانی بلندیوں پر ایمان رکھتے ہیں ——— تو اس تصور اور عقیدے کو کمزور اور ہلکا بنانے کے لئے ایک نظریہ تراشا گیا ہے جس کو ان لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ ہر زمانہ میں اخلاق کی قدریں بدلتی رہتی ہیں ——— یعنی ہو سکتا ہے کہ پچھلے زمانہ میں جو افعال غیر اخلاقی سمجھے جاتے ہوں اُن کو تغیرات اور انقلابات نے موجودہ زمانہ کے لئے جائز بلکہ ناگزیر بنا دیا ہو، اخلاق کی قدریں سرمدی و جاودانی نہیں ہوتیں وہ ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اخلاق کا سرچشمہ مذہب ہے اور مذہب نیکی اور بدی کے بنیادی تصورات کو غیر متغیر بتاتا ہے۔ نیکی ہر حالت میں نیکی رہے گی اور بدی کو ہر زمانہ میں بدی سمجھا جائے گا۔ اخلاقی تصورات کو انقلابات زمانہ چھو بھی نہیں سکتے تو اخلاقی قدروں کے نظریہ تغیر کی زد مذہب پر آ کر پڑتی ہے اور اس طرح خود مذہب کے ساتھ عقیدے کی وابستگی اور قلب و ضمیر کا ربط و استحکام معرض خطر میں پڑ جاتا ہے۔

آپ نے کیا سوچا

اوپر جو چند اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ اشارے اُس ادب کی خصوصیات ہیں جو ترقی و انقلاب کے نام سے ہمارے سامنے آچکا ہے۔ آ رہا ہے اور نہ جانے کب تک آتا رہے گا۔ اب آپ پہلے خود اپنے دل و نظر کا جائزہ لیجئے کہ آپ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کیا ہیں؟ اور کیا رہنا چاہتے ہیں؟ یہ نہ دیکھئے کہ زمانہ کس سمت جا رہا ہے اور دنیا کے آجکل کیا تقاضے ہیں، سوچنا یہ ہے کہ خود آپ کے کاروان حیات کی منزل کس سمت میں واقع ہے اور آپ کی روح کا کیا تقاضا ہے۔

اگر آپ کا ضمیر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ جن نظریوں کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ آپ کے معتقدات، افکار اور تصورات سے میل نہیں کھاتے اور اُن دونوں میں تضاد پایا جاتا ہے تو پھر "نئی آوازوں" کے سننے کی دھن اور نئے تجربوں کے انتظار کے شوق میں اپنے معتقدات اور نظریوں کو رسوا ہونے سے بچائیے، آپ کا فیصلہ دو ٹوک ہونا چاہئے یا تو اُن لوگوں کے خیالات کی ہمنوائی کیجئے یا پھر اُن سے قطعاً بیزاری اور دوری اختیار کیجئے "ڈبل گیم" (double game) کھیل کر آپ ہارے رہیں گے۔ نفسیات کے اس نازک مسئلہ کو یاد رکھئے کہ جو شخص اپنے اصول اور نصب العین کے مخالف نظریوں کو دلچسپی کے ساتھ سنتا ہے وہ رواداری اور وسعت نظر کے دھوکے میں آ کر خود اپنے اصول کو بے وزن بنا رہا ہے حمیت اور غیرت کی رگ بہت ہی نازک اور لطیف ہوتی ہے بار بار چھیڑنے سے یہ رگ بے حس ہو جاتی ہے۔

شعر و ادب کے چٹخارے یقیناً پُر لطف ہوتے ہیں کچھ نئی آوازیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں جدتوں اور تبدیلیوں کی طرف بھی طبیعت کھنچتی ہے۔ مگر ان لذتوں، رغبتوں اور دلچسپیوں پر اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ نصب العین کی عظمت بجائے خود ایک قسم کی لذت ہوتی ہے اور اس لذت پر کسی ہنگامی اور وقتی لذت کو غالب نہ ہونے دیا جائے کہ اسی نقطہ سے آدمی کی اخلاقی موت شروع ہو جاتی ہے

آپ کی ادبی دلچسپیاں اُن خرافات سے منہ موڑ لیں تو ترقی و انقلاب کے اُن دعویداروں کا لٹریچر یتیم ہو سکتا ہے آپ ہی کے ذوق کے سہارے اُن کا نام نہاد "عوامی ادب" پروان چڑھ رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کی بڑھوار رُک سکتی ہے۔ اُن کے دعووں کے طلسم ٹوٹ سکتے ہیں اور ان کی تحریک ناکامی کے غار میں دفن ہو سکتی ہے۔ شعر و ادب کے یہ تمام تصورات اپنے پیچھے سیاست و معیشت کا ایک منظم مسلک رکھتے ہیں۔ آپ اس قسم کے لٹریچر میں اگر تھوڑی سی بھی دلچسپی لیتے ہیں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ آپ اس مخصوص مسلک کو تقویت پہنچا رہے ہیں ———

—— حالانکہ وہی مسلک جب واضح طور پر آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ کی بھویں تن جاتی اور آپ کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے۔ یہ کیا قیامت ہے کہ وہ نظریے جو آپ کے معتقدات کے یکسر مخالف ہیں، جب شعر و ادب کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو آپ کی بیزاری اور ناخوشی کی لہر زم رو اور سست گام ہو جاتی ہے —— کیا آپ کھلے ہوئے خنجروں کے مقابلے میں احتیاط و مدافعت کے قائل ہیں اور آستینوں میں چھپے ہوئے دشمنوں سے بچنا اور محفوظ رہنا ضروری نہیں سمجھتے اور اب تو یہ آستینیں بھی کھلتی جا رہی ہیں۔

میں نے گمراہ کن "تنزل پسند ادب" جسے ترقی پسند ادب کا نام دے دیا گیا ہے، اس کے خلاف مسلسل آواز اٹھا کر بہت کچھ گالیاں کھائی ہیں، مگر میرا عزم ان گالیوں کو سن کر بے مزہ نہیں ہوا۔ دشنامیوں اور بہتانوں کی مجھ پر بوچھار ہوئی لیکن میرے حوصلوں میں کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی کہ اعلانِ حق میں میری ہمنوائی کوئی کرتا بھی ہے یا نہیں؟ سچائی کی یہ خاصیت ہے کہ اپنے ظہور اور اعلان کے لئے اپنے ہمنواؤں کی تائید کا انتظار نہیں کرتی۔ صداقت یکہ و تنہا بھی صداقت ہی رہتی ہے اور باطل اپنے مددگاروں اور ساتھیوں کے جھرمٹ میں بھی حق کا مقام حاصل نہیں کر سکتا، اجالے کی ایک دھندلی کرن، اندھیرے کی بے شمار راتوں پر بھاری ہوتی ہے۔

لوگ حق و باطل کو واقعات کی کامیابی اور ناکامی کے پیمانوں سے ناپ کر شدید غلطی اور خطرناک جہالت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس عالمِ اسباب میں ایسے واقعات اور حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو برائی کے پھلنے پھولنے اور باطل کے پنپنے میں سازگار ثابت ہوتے ہیں، حالات کی سازگاری کسی تحریک کی افادیت کا معیار نہیں بن سکتی، جبر و ستم نے سدا سازگار حالات ہی کے سہارے انسانیت کو روندا اور پامال کیا ہے۔ حالات کی یہ سازگاری ظالموں کے لئے قدرت کی طرف سے ڈھیل اور مہلت ہوتی ہے اور حق پرستوں کے لئے آزمائش! اس آزمائش میں وہی لوگ پورے اتر سکتے ہیں جو حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر ہمت نہ ہاریں، جو فتنوں کو بڑھتا اور ترقی کرتا دیکھ کر مرعوب نہ ہوں —— فرعون اور نمرود کے لئے دنیا کے حالات کس قدر سازگار اور موافق تھے، مگر یقینِ کلیمی اور ایمانِ براہیمی نے ان باطل پرستوں کے خلاف جس انداز میں جہاد کیا اس پر تاریخِ انسانیت آج تک فخر کرتی ہے۔

آج بھی باطل نے زمانہ کی موافق ہوا کے سہارے آتشِ نمرود بھڑکا دی ہے، ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جسے پڑھ کر اور سنا کر ابراہیم صفت لوگ پیدا ہوں جو آتشِ نمرود میں بے دھڑک کود پڑیں۔ آج دو قسم کے لٹریچر پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جسے پڑھ کر فرعون، نمرود اور ابو جہل پیدا ہوتے ہیں اور دوسرا وہ ادب جس کا مطالعہ دلوں میں جراتِ کلیمی، یقینِ براہیمی اور پیغامِ محمدی کا سوز و دوام پیدا کرتا ہے۔ آپ فیصلہ کیجئے کہ آپ کو کس انداز کا ادب پسند ہے اور آپ کیا بننا چاہتے ہیں؟ ——

دعوتِ اتحاد و عمل

ادب (Literature) علم ہی کے ناموں میں سے ایک نام ہے یا یوں سمجھئے کہ علم کی ایک شاخ ہے اور علم "جاننے" کو کہتے ہیں مگر یہ "جاننا" اور پہچاننا جاننے والے اور جانی ہوئی چیز کے درمیان گہرا ربط اور بہت قریب کا واسطہ رکھتا ہے۔ اس لئے حکماء اور اہلِ دانش نے کہا ہے کہ علم کی غایت "حصولِ خیر" ہے، جہاں نیکی ہے وہاں علم ہے اور جہاں برائی ہے وہاں جہالت ہے۔

آپ آگ سے جسم کو اس لئے بچاتے ہیں کہ آپ آگ کی ماہیت کا علم رکھتے ہیں، آپ اس چیز کو جانتے ہیں کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ جل جاتا ہے، یہی "علم" اور "جاننا" آگ کی برائی اور مضرت سے آپ کو بچاتا ہے۔ —— تو اگر کسی زبان کا ادب لوگوں کو برائیوں بداخلاقیوں سے بچانے کے بجائے ان کو برائیوں اور

معصیتوں پر اور ابھارتا ہو تو ہم پوری بصیرت کے ساتھ کہیں گے کہ اب ادب علم و آگہی کا دشمن اور رجعت پسند حیوانیت کا نمائندہ اور ترجمان ہے۔

علم و ادب کا وظیفہ (mission) اور کام ہی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ برائی کی مخالفت اور نیکی کی اشاعت ہو۔ جو ادب اس فریضہ کو انجام نہیں دیتا اور اس مقصد کو پورا نہیں کرتا وہ "توانا" نہیں "پاکیزہ" "صحت مند" نہیں، "طاقتور" "نہیں پست و کوتاہ ہمت" اور ترقی پسند نہیں۔ حقیقت میں تو تنزل پسند ادب ہے۔ اس قسم کے ادب کے خلاف جہاد انسانی معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہے!

باطل کے مورچے شروع شروع میں بہت مضبوط ہوتے ہیں آن کا ایک ایک فرد سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتا ہے اور اہل حق بکھرے ہوئے اور پراگندہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ حالت بہت دن تک قائم نہیں رہ سکتی۔ حق پرست جب اپنی پراگندگی کو محسوس کر لیتے ہیں تو وہ بھی پوری یکجہتی کے ساتھ متحدہ محاذ پر جمع ہو جاتے ہیں اور آن کے اکٹھا ہوتے ہی باطل کے پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ باطل کے لئے ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے اور ہار ماننے کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔

ضرورت ہے کہ خدا شناس ارباب قلم جہاں جہاں بھی ہیں منظم اور متحد ہو جائیں۔ سب یک جان ہو کر حق کا اعلان کریں۔ باطل پرستوں اور خاص طور سے منافقین ادب سے نہ تو کسی سمجھوتے کے لئے تیار ہوں اور نہ رواداری کے دھوکے میں آکر نرم پڑیں، زبان و قلم کو "اشداء علی الکفار" کی تفسیر بن جانا چاہئے۔

افسانہ سے لے کر تنقید تک ہر صنف کو نکھارنے اور آلودگیوں سے پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ ان تنزل پسندوں (نام نہاد ترقی پسند) نے شعر و ادب کے ہر شعبہ کو ناپاک اور پست بنا رکھا ہے۔ اور ان ناپاکیوں اور پستیوں پر اپنی شہرتوں کے قصر تعمیر کر لئے ہیں۔ اس کی اب تطہیر ہونی چاہئے۔

استعاروں اور کنایوں میں جھجک کر اور دب کر بات کہنے کا انداز اب ختم ہو جانا چاہئے۔ زبان آذری کو تیشۂ براہیمی ہی پاش پاش کرتا ہے۔ اور ضرب کلیمی ہی سے فرعونیت کا شیرازہ بکھرتا ہے۔ ابوجہل کی عظمت کی قسم کھانے والے شاعروں اور دریائے وادی کے کنارے "تیسرے ماسکو" کے ظہور کی تمنا کرنے والے ادیبوں کی شہرتوں کے کتابچوں پر سیاہی پھیر دینے کی ضرورت ہے آن کی شخصیتوں سے مرعوب نہ ہوجیئے۔ آپ ہی کے زبان و قلم نے ان کو شہرتیں اور تعارف کی بلندیاں عطا کی ہیں۔ اور آپ چاہیں تو شہرت و تعارف اور ادبی شناسائی کا یہ ماحول بدل سکتا ہے۔

ذرّے مل جل کر دشت و جبل کو ڈھانپ لیتے ہیں اور صحراؤں پر چھا جاتے ہیں۔ آپ یکجا ہو جائیں تو بہت سی پرچھائیاں اور کتنے دھندلکے آپ کے سایہ میں گم ہو سکتے ہیں۔

اپنی دنیا خود بنائیے، اپنے نصب العین اور پیام کی اشاعت کے لئے ایک اسلامی ادب دنیا کے سامنے پیش کیجئے جو آپ کے عقائد سے ہم آہنگ ہو، صرف ادبی چٹخاروں اور شوخیٔ فکر کی خاطر اس لٹریچر کو اپنے شوق و دلچسپی کا سہارا نہ دیجئے جس کی زد آپ کے نصب العین پر آکر پڑتی ہے۔

در جہاں بال و پر خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتواں با پر و بال دگراں (اقبال)

ماہر القادری
۷ اپریل سنہ ۴۹ء

ابو سعید بزمی ایم۔ اے

انقلاب زندہ باد!

مگر وہ انقلاب ـــ؟

> ... عمل کی معرکہ آرائیاں بول رہی ہیں۔ کاش! لوگ اسے سن سکیں!

آدم و حوا اور ان کی اولاد قابیل و ہابیل کی معاشرت کو انسانی زندگی کے اس ابتدائی دور کا پہلا نمونہ سمجھنا چاہئے۔ جب روئے زمین پر پہلی بار شہری و تمدنی تنظیم کا خاکہ شروع ہوا" اور انسان نے یہ سیکھنے کی کوشش کی کہ باہم مل کر رہنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے ـــــ اس لئے انسانی معاشرت کی ابتدا کا کھوج لگانے کے لئے اگر ہم یہ مان لیں کہ قابیل و ہابیل کا یہ دور سیاسی و معیشی زندگی کی بیماری کا پہلا دور تھا تو کوئی حرج نہیں۔ یعنی ہم یہ قرار دیتے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے تک انسانی زندگی معاشرت و تمدن کے آئین و ضوابط سے آزاد تھی۔ لیکن جب قابیل نے اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے ہابیل پر تشدد کیا اور اسے جان سے مار ڈالا، تو پہلی بار انسان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس قسم کی حرکتوں کو روکنے کے لئے کچھ تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں شروع شروع میں یہ تدبیریں بہت مختصر اور سادہ تھیں، مگر جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھتی گئی اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے ان تدبیروں کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سیاست و معیشت اور آئین و قانون کے نام سے ایک ایسا دفتر بے پایاں وجود میں آگیا، جس کی پیچیدگیوں اور باریکیوں نے بڑے بڑے اہل نظر اور ارباب فکر و دانش کو اُلجھا دیا ہے۔

ابن آدم کے تاریخ جرم کا پہلا دور قتل کے احساس سے شروع ہوتا ہے اور انسانی معاشرت میں سب سے پہلی پابندی بھی اسی کے خلاف عاید ہوتی ہے چنانچہ توریت میں (جسے ہم انسانی تاریخ کی سب سے پہلی اور مستند ترین کتاب سمجھنے پر مجبور ہیں) اس واقعہ کا ذکر کر کے خود یہ واقعہ قابیل کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

"اے خدا! میرے دامن کا داغ سزا سے کبھی نہیں دھل سکتا میں اب ہمیشہ ایک خانماں برباد آوارہ انسان کی طرح روئے زمین پر گھومتا پھروں گا۔ اور پھر یہ ہوگا کہ جو شخص بھی مجھے پائے گا قتل کر ڈالے گا۔"

(پیدائش۔ باب ۴۔ فقرہ ۱۴)

قابیل و ہابیل کے دور کے بعد انسانی آبادی بڑھنی شروع ہوئی اور ملی جلی مدنی زندگی نے نئی نئی پیچیدگیاں پیدا کر

معاشرت و معیشت کے قابیلی نظام ہائے حیات

ہابیل و قابیل کی باہمی چپقلش کے واقعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ آدم و حوا کی آفرینش کے بعد ہی سے دنیا میں سب سے بڑا سوال یہی ہابیلیت و قابیلیت کا سوال رہا ہے۔ ہر فلسفہ، ہر نظریۂ معاشرت، ہر نظامِ اخلاق اور ہر نظامِ مذہب اسی سوال کو حل کرنے کے لیے بنایا گیا۔ لیکن ابلیسیت نے جو منتر پڑھ کر پھونک دیا تھا اس نے صحیح حل تلاش کرنے اور پھر اس پر صحیح سیرت میں عمل کرنے سے قابیلی ذہنیت کو ہمیشہ باز رکھا۔ صحیح تعلیم دینے والوں کو یا تو راہ سے ہٹا دیا گیا۔ یا ان کی تعلیم کی تعبیر و تشریح اپنی مرضی کے مطابق کر لی گئی، نئے نئے اصول گھڑے گئے۔ جن میں یہ بتایا گیا کہ خدا نے انسانوں کو پیدائش ہی سے اونچا نیچا پیدا کیا ہے۔ اور کچھ کو نیچا بنایا ہے۔ ہندوستان میں آنے والے آریہ نسل کے فاتحوں نے تو غضب ہی کر دیا۔ یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ چند مٹھی بھر افراد جو برہمن کہلاتے ہیں، صرف وہی خدا کے چہیتے بلکہ شاید اس کے ہم پلہ ہیں گویا یہاں شدّاد اور فرعون کا مرتبہ برہمنوں کی ٹولی کو عطا ہوا۔ برہمن کے بعد شرف و بزرگی کا درجہ ان لوگوں کو دیا گیا جو برہمن کی اس برتری اور فوقیت کو قائم رکھنے کے لیے لڑتے بھڑتے رہیں یا یوں کہئے کہ جو لوگ لڑنے بھڑنے والے تھے ان کو بشوت دے کر ملا لیا گیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ برہمن تو روحانی اعتبار سے افضل ہیں۔ ان کے بعد جنگجو اور لڑاکو افراد اس دنیا میں سب سے بلند و ممتاز ہیں اور سلطنت و فرمانروائی انہی کا حق ہے۔ یہ لوگ چھتری کہلائے۔ چھتریوں کے بعد تیسرا منصب ان لوگوں کو عطا کیا گیا جن کے ہاتھ میں تجارت اور زراعت کی کنجیاں تھیں اور جو زمین کی پیداوار اور اس پیداوار کی تقسیم پر چھائے ہوئے تھے اور ان لوگوں کو ویش کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور حکم ہوا کہ تجارت و زراعت کی سلطانی صرف انہی کا ورثہ ہے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ اس ورثہ کو تقسیم کر سکے۔ بنیوں اور زمینداروں کی اس ٹولی کے بعد کی جو ان گنت مخلوق بچی اسے شودر اور اچھوت کا نام ملا۔ قابیلی دربار سے فرمان جاری ہوا کہ ہر شخص جو برہمن، چھتری یا ویش سے تعلق نہیں رکھتا وہ دنیا کی بدترین مخلوق ہے اور اس کا کام صرف یہ ہے کہ اونچی ذات والوں کی خدمت گزاری کرتا رہے۔ لیکن اسے یہ حق نہیں کہ وہ اپنے ان آقاؤں کے قریب سے گزرے، انہیں ہاتھ لگائے یا آنکھ ملا کر ان سے بات کرے۔ اس بدنصیب مخلوق کو یہ سمجھایا گیا کہ تم کو خدا نے میل کچیل سے پیدا کیا ہے اور تم نے پچھلے جنم میں جو گناہ کئے تھے اس کی پاداش میں تم کو یہ زندگی دی گئی ہے گویا غریبی ایک جرم قرار دیا گیا۔ اور وہ بھی ایسا جرم جو غریب بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور جس جرم کی سزا اپنی زندگی بھر اسے اس طرح بھگتنا پڑتی ہے کہ وہ دولت و ثروت اور طاقت و قوت کے دیوتاؤں کے پاس بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کی جگہ جوتیوں میں ہے یا ان غلاظتوں اور عفونتوں میں جو ان دیوتاؤں کے پاک و پلوتر جسم سے خارج ہوتی ہیں۔ اسے حق نہیں کہ گھی کھا سکے، گھی کا چراغ جلا سکے۔ چاندی سونے کا استعمال کر سکے۔ عام کنوؤں سے پانی بھر سکے، چشموں اور دریاؤں میں نہا سکے، یہی نہیں بلکہ وہ غریب اس قابل بھی نہیں کہ اپنے خالق کے آگے سرِ نیاز جھکا کر اپنے گناہوں پر دو آنسو بھی بہا سکے، اس لئے کہ قدغن ہے اور سخت قدغن ہے کہ خبردار کوئی شودر یا اچھوت مندر میں نہ گھسنے پائے، بت کو نہ دیکھنے پائے، منتر نہ پڑھنے پائے، وید اور شاستر کو پڑھنا تو در کنار سننے بھی نہ پائے اور اگر اتفاق سے سن پائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ کڑکڑاتا ہوا تیل اس کے کانوں میں انڈیل دیا جائے تاکہ وہ گنہگار کان جنھوں نے مقدس احکام کو سننے کا جرم کیا ہے! ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سننے کی قابلیت سے محروم ہو جائیں ——— اور یہ سب کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہابیلیت کبھی سر نہ اٹھا سکے اور قابیل کی چھوٹی سی ٹولی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی تمام لذتوں اور زمین کی ساری نعمتوں کی تنہا ٹھیکے دار بنی رہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو منو سمرتی)

قابیل کی ٹولی کا یہ عمل ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں جاری تھا۔ مصر میں فرعون کے خاندان اور قبطیوں کی اولاد کے علاوہ باقی ساری دنیا "اچھوت" تھی۔ بنی اسرائیل کی داستان مظلومیت کون نہیں جانتا؟ کہ ان کا کام صرف یہ تھا کہ بھوکے مریں اور اپنے چند مٹھی بھر آقاؤں کے آگے ہاتھ جوڑا کریں۔ اور اگر کبھی ان آقاؤں کی مرضی کے خلاف کچھ کر گزریں تو جوتوں اور ٹھوکروں کی ضربیں سہیں۔ یہی حال عراق اور بابل میں بھی تھا۔ جہاں نمرود و شداد نے چند قابیلوں کی مدد سے ساری انسانیت کو پامال کر رکھا تھا۔ بخت نصر نے فلسطین و شام کو برباد کر رکھا تھا۔ ایران جب کیکاؤسوں، کیقبادوں اور کیخسروؤں نے اسی قابیلی مذہب کو مختلف ناموں سے منوا کر رکھا تھا چین کے خاقان و فغفور بھی یہی کر رہے تھے۔ یونان میں ارسطو اور افلاطون جیسے حکیم گذرے جن کا نام آج بھی دنیا بڑی عزت سے لیتی ہے۔ مگر انھوں نے ہابیل کی فریاد کو سنا؟ نہیں، ان کا فلسفہ بھی قابیلی گروہ کا فلسفہ تھا اور اس فلسفے میں بھی ہابیل کی کوئی گنجائش نہ تھی، انھوں نے جمہوریت اور دستوریت کے نام سے بڑے لمبے چوڑے نظام بنائے اور بادشاہ کا منصب عوام کے سپرد کیا۔ مگر جانتے ہو کہ یہ عوام کون تھے؟ یہ عوام صرف قابیل[1] کی ٹولی کے چند افراد تھے۔ ہابیل[2] یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ انسانوں کی ایک وسیع تر آبادی کو صرف "خدمتگار" کا نام دیا گیا تھا۔ ان خدمتگاروں کا کام یہ تھا کہ وہ محنت و مزدوری کریں، کھیتی باڑی کریں، لوہا پیٹیں اور اوزار بنائیں۔ دھات پگھلائیں اور برتن تیار کریں۔ پتھر توڑیں اور مکانات کھڑے کریں لیکن حکومت و سرداری اور سلطنت و فرمانروائی میں انھیں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ کام صرف ان "آزاد" افراد کا تھا جو انسانوں کی اس لاتعداد آبادی کی محنت و مزدوری پر جیتے تھے گویا افلاطون کی جمہوریت اور ارسطو کی اشرافیت کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہابیل کام کریں اور قابیل اس کام سے فائدہ اٹھائیں اور حکومت کریں۔

یہی حال روما الکبریٰ کی اس جمہوریت کا تھا جسے دنیا میں سب سے پہلی یا سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت کس کے لئے تھی؟ صرف رومنوں کے لئے۔ ان رومنوں کے علاوہ باقی ساری خدائی "خدمتگار" تھی اور شہری حقوق یا عمرانی آزادی میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ یونانی جمہوریت کی طرح ان غریبوں کو بھی نہ تو ووٹ کا حق حاصل تھا، نہ حکومت کے نمائندے چننے کا اختیار تھا اور نہ کسی طرح سیاسیات و حکومت کے معاملات میں دخل دینے کا حق یہ رکھتے تھے۔ اور کیوں رکھتے؟ اگر ہابیلوں کو یہ حق دے دیا جاتا تو پھر قابیل کی ٹولی کے حقوق و منصب اور جاہ و اقتدار کی اجارہ داری کیسے باقی رہتی؟

ابلیس کا سب سے پہلا چیلنج

ذرا سوچو تو انسانی تخلیق کی غرض کیا تھی اور انسان نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ قدرت کا مقصد یہ تھا کہ انسانی کالبد کی یہ زندگی خدا کی تحمید و تقدیس کرے اور معرفت الٰہی کے منصب جلیل تک پہنچنے میں صرف ہو۔ انسان خدا کا فرمانبردار، شریف، نیک، خوش اخلاق اور حق عمل بندہ بن کر زندگی بسر کرے۔ لیکن ہوا یہ کہ ابلیسیت کے دام میں آکر کھانے پینے، رہنے سہنے کی چیزوں پر جھگڑے اٹھے اور انسانی خون خود انسانی ہاتھوں ہی سے پانی کی طرح بے دریغ بہایا جانے لگا۔ ابلیسیت نے انسانی تخلیق کے پہلے ہی دن یہ اعلان کیا تھا کہ وہ انسانوں کو بہکائے گا۔ "انھیں سیدھے راستے سے بھٹکائے گا۔ سامنے آکر انھیں گمراہ کرے گا۔ پیچھے سے چھپ کر انھیں ورغلائے گا، داہنی طرف سے ان پر حملہ کرے گا اور بائیں طرف سے ان پر یلغار بولے گا۔"

(سورۂ اعراف۔ رکوع اول)

---

[1] باطل پرست۔ حزب الشیطان [2] حق پرست حزب اللہ

قدرت نے اس دھمکی کے جواب میں کہا تھا کہ "جا اور جو کچھ تجھ سے ہو سکے اس سے دریغ نہ کر تیرے زہریلے منتر کو اتارنے اور تیرے مسموم اثرات کو دور کرنے کے لئے خود انسانوں ہی میں سے ہادی اور رہنما ہوں گے۔ جو پوری قوت اور شدت کے ساتھ ابلیسیت کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔" (سورۂ اعراف رکوع اوّل)

انبیا اور اولیا

چنانچہ یہی ہوا ادھر قابیل پر ابلیسیت نے افسوں پھونکا۔ اور ادھر انبیاؑ و اولیا، صوفیا و علما کی شکل میں اس افسوں کی زہرناکیوں کو دفع کرنے کے لئے پیدا ہونے لگے۔ ایک طرف قابیل کی ٹولی تھی، فرعون و ہامان تھے، شداد و نمرود تھے۔ قیصر و کسریٰ تھے، خاقان و فغفور تھے، یونان و روما کے فلسفی تھے۔ ہندوستان میں اونچ نیچ کا امتیاز پیدا کرنے والے منتر و وکیل تھے۔ اور دوسری طرف ہابیل کی حمایت میں انبیاؑ و اولیا کی صف تھی۔ گوتم بدھ تھا جس نے ذات پات اور اونچ نیچ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا، مہابیر جین تھا جس نے برہمنوں کی فرمانروائی کو اعلان جنگ دیا۔ کنفیوشس نے چین میں خاقان و فغفور کی سطوت کو جھنجھوڑا، مصر میں کلیم اللہ نے آگے بڑھ کر فرعون و ہامان کی شہ رگ پر ضرب شدید لگائی۔ فلسطین و شام میں روح اللہ نے رومیوں اور رومیوں سے ساز باز رکھنے والی ٹولیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایران میں زرتشت نے کیقبادوں اور کیکاؤسوں کے مقابلے کا اعلان کیا ——— غرض جس طرح ابلیسیت نے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف سے انسانی روح پر گھیرا ڈالا تھا۔ اسی طرح انبیا اور مصلحین کی ایک کثیر تعداد اس کے مقابلے کے لئے ہر گوشے اور ہر کونے سے نمودار ہونے لگی اور قابیلیت کے بنائے ہوئے جھوٹے اصولوں کا پردہ چاک کرنے لگی۔ لیکن ابلیسیت نے "شجر ممنوعہ" کی جس زہریلی لذت سے قابیلیت کو آشنا کر دیا تھا اس کا جو نشہ دماغ پر چڑھا دیا تھا۔ اور اس کے حصول کی جو طلب اس کے رگ و پے میں دوڑا دی تھی۔ وہ آسانی سے نکلنے والی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قابیلیت نے ہر اس تعلیم، ہر اس فلسفے اور ہر اس وعظ و تبلیغ کا مقابلہ کیا جو اس کے عیش و عشرت میں خلل ڈالنے والی تھی۔ اور جس سے عیش و آرام کی اس محل سرا کو نقصان پہنچتا تھا جس کی ہر ہر اینٹ کے نیچے غریب انسانوں کی لاشیں دفن تھیں۔ چنانچہ انبیا کو بے دریغ قتل کیا گیا، علما اور اولیا کو رسوا کیا گیا، کلیم اللہ کے خلاف جنگ کا طبل بجایا گیا، روح اللہ کے لئے سولی کے تختے تیار کر کے گوشت و پوست کو چیل اور کوؤں کی غذا بنا دینا تجویز کیا گیا ——— لیکن قابیلیت کے یہ حملے کامیاب نہ ہو سکے، قابیلیت نے دیکھا اور محسوس کیا کہ خدا کے نیک بندوں کے قتل سے ان کی آواز دبتی نہیں بلکہ اور ابھرتی ہے، موت ان کے پیام کو اور نئی زندگی عطا کر دیتی ہے اور دنیا ان کے سرفروشانہ حالات اور قربانی کو دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

قابیلیت کا دوسرا افسوں

یہ چیز قابیلیت کے لئے بڑی سخت تھی۔ وہ بے گناہوں کے خون سے اپنی تلوار رنگین کر سکتی تھی لیکن شہیدوں کے خون کے قطرے جو پیام دے رہے تھے اس کا بند کرنا ممکن نہ تھا ——— ؟ بارے ابلیسیت کے معلم نے ایک نیا افسوں بتا کر قابیلیت کی یہ مشکل بھی حل کر دی یعنی جن انبیاؑ، صلحا کی تعلیم کا مقابلہ ممکن نہ ہوا، ان کی تعلیم کو قبول کرنے اور ان کے آگے سر اطاعت جھکا دینے کا اعلان کیا جانے لگا لیکن اس طرح کہ ان کی تعلیمات کے مفہوم و منشا کو نہایت چالاکی سے بدل دیا گیا۔ الفاظ انبیا کے تھے مگر جو معنی ان کو قابیلیت پہنانا چاہتی تھی۔ پہنا دیتی تھی۔ دانش فروشوں کی ایک جماعت نے اس کام میں قابیلیت کا ساتھ دیا اور اب سیدھی اور سچی باتوں کے بالکل الٹے معنیٰ دنیا کو سمجھائے جانے لگے۔ روح اللہ نے پہاڑی پر کھڑے ہو کر جو وعظ کہا تھا اس میں رحم و درگذر کی تبلیغ تھی۔ اور قابیلیت کو تلوار اٹھانے اور انسانی خون بہانے سے روکا گیا تھا۔ مگر قابیلیت کے نقیبوں کی طرف سے اس کا مطلب یہ سمجھایا گیا کہ غریب انسانوں کو ہر ظلم خاموشی سے برداشت کر لینا چاہئے حتیٰ کہ اگر ان کے ایک گال پر کوئی تھپڑ مارے

تو دوسرا کان بھی ظالم کے تھپڑ کے لئے بڑھا دینا چاہئیے۔ غرض اسی طرح ہر اچھی تعلیم کو قابیلی رنگ دے دیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ دنیا کے دل و دماغ میں قابیل کا فلسفہ گھر کر گیا اور ہر مظلوم نے صبر و شکر کے ساتھ اپنی مظلومیت کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو خدا یا خدا کا اوتار سمجھا جانے لگا۔ اور اپنی بادشاہت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر شہر، ہر قصبے، ہر محلے اور ہر کانوں میں جو لوگ بادشاہ کے دست و بازو بنائے گئے انھیں بھی خدا کی غریب مخلوق نے یا تو حق بجانب سمجھا اور یا یہ خیال ——— کیا کہ یہ دنیا غریبوں کے لئے نہیں ہے، غریبوں کے لئے جو کچھ ہے مرنے کے بعد ہے۔ اس دنیا میں انھیں سب کچھ برداشت کرنا چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام کا یہی عقیدہ در اصل قابیلیت کی سب سے بڑی پشت پناہ ثابت ہوا، خدا کی غریب مخلوق کو یہ سمجھایا گیا کہ "وعدۂ فردا" کی امید میں آج کے مظالم کو برداشت کرو۔ تلوار اٹھانے کے بجائے انھیں صرف آنسو بہانا سکھایا گیا اور ظلم و بے انصافی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے کے بجائے اس پر صبر کرنے کی تلقین انھیں کی گئی۔ گویا اس طرح عوام کے ناخن و چنگال کی تیزی ختم کر دی گئی، ان کے دستِ بازو کی قوت سلب کر لی گئی، ان کے ہتھیاروں کو کند بنا دیا گیا۔ اور ان کی قوت و طاقت کو عضوِ معطل کر کے رکھ دیا گیا۔ اب وہ خود یہ سمجھنے لگے کہ بھوکوں مرنا، فاقے کرنا، مصیبتوں اور تکلیفوں کی زندگی گزارنا اور چند مٹھی بھر افراد کے عیش و آرام کے لئے خون پسینہ ایک کرنا ہی ان کا کام ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ خود تو رات بھر آسمان کی چھت کے نیچے سردی میں اکڑا کریں، لیکن قابیل کی ٹولی کی راحت کے لئے وہ قالین و کمخواب کے تھان تیار کیا کریں۔ ان کا کام ہی یہ ہے کہ سال بھر کی محنت سے گرمی، سردی اور بارش کی سختیاں جھیل کر کھیتوں میں جو کچھ پیدا کریں، اسے قابیل کی ٹولی کے آگے لا کر رکھ دیں تاکہ وہ ان سے کھیلے، ان میں نہائے، ان کی شراب بنائے اور پھر اس کے نشے میں چور ہو کر ان غریبوں ہی کے خون سے فوارے اڑانے لگے۔

صحیح اصولوں کی غلط تشریح

انبیاء و علماء مسلسل آ رہے تھے۔ لیکن وہ کہتے کچھ تھے اور ان کی تشریح کچھ کی جاتی تھی۔ انبیاء اس بات پر زور دیتے تھے کہ انسان کا اصلی مقصد کھانا، پینا اور کھانے پینے کی طرف دوڑنا نہیں ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی بلندی حاصل کر کے خدا شناسی اور خدا رسی کے درجے تک پہنچنا ہے۔ قابیلیت نے اس اصول کا مطلب عوام کو یہ سمجھایا کہ دنیا کی دولت کو چھوڑ کر اور زندگی سے منھ موڑ کر ایک کونے میں بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کیا کرو اور زندگی، صحت، قوت اور دولت صرف قابیلی گروہ کے لئے چھوڑ دو۔ چنانچہ ایک طرف تو عوام میں وہ عقیدہ پیدا ہوا جسے رہبانیت، ریاضت یا تپسیا اور گوشہ نشینی و عزلت گزینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان کے اخلاق میں عفو و درگزر، ضبط و تحمل اور صبر و استقلال وغیرہ کا مفہوم قابیلی گروہ کی اطاعت و غلامی قرار پایا۔ قابیلی گروہ کو اب اور کس چیز کی حاجت ہو سکتی تھی؟ فریقِ مخالف نے خود ہی اپنے ہتھیاروں سے نفرت کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ خود ہی کارزارِ حیات کے میدان سے منھ موڑ کر تنہائی کے گوشوں میں سر چھپا کر بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

آخری انقلاب

ان حالات میں ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جو قابیل کے تراشے ہوئے اصنام کو پارہ پارہ کر دے سعادت و فلاح اور زندگی کی راہ میں باطل نے جو دیواریں کھڑی کر دی ہیں، ریزہ ریزہ ہو جائیں ——— تاریخ گواہی دے رہی ہے اور چیخ چیخ کر گواہی دے رہی ہے کہ حضرت سیدنا محمد رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) اسی انقلاب کے داعی تھے جس کے لئے انسانیت صدیوں سے چشم براہ تھی۔

یہ انقلاب کیا تھا؟ ظلم و عدوان سے بغاوت، حق و صداقت کی تائید، ظالموں سے جنگ، مظلوموں کی حمایت ——— اور وہ سب کچھ جس کی زندگی کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ انقلاب فکر و نظر، قول و عمل، دل و نگاہ اور روح و ضمیر کا انقلاب تھا

بدکار اس کے طفیل انتہائی پاکباز اور نیکو کار بن گئے لیٹروں اور چوروں میں امانت اور دیانت کی عظمت پیدا ہوگئی اور اسی جذبۂ صداقت کے سہارے عرب کے چرواہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت آلٹ دئے۔

یہی انقلاب حقیقی اور آخری انقلاب تھا' جہاں جہاں اس انقلاب کی پرچھائیاں ہیں۔ وہاں زندگی اور انقلاب کی پرچھائیاں موجود ہے۔ اور جہاں اس انقلاب سے بیگانگی ہے اس جگہ جہالت و نادانی ہے اور حقیقی زندگی سے دوری ہے۔

دنیا میں صرف اسلام کا انقلاب ہی "زندہ باد" کے نعروں کا مستحق ہے' انسانیت کی تعمیر و فلاح کے لئے یہ آخری انقلاب تھا۔

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
جہاں کے واسطے اک آخری نظام آیا

بھوک اور افلاس کی ماری ہوئی مخلوق ہو یا بداخلاقی کی ستائی ہوئی دنیا اب ہر مظلوم' ستم رسیدہ اور مضطرب روح کو اسلام ہی کے سایہ میں امن و عافیت میسر آئے گی۔

اب تک دنیا میں جتنے بھی پیغمبر' رسول' رشی' منی' مصلحین اور ریفارمر آئے وہ سب کے سب اس آخری انقلاب کے نقیب اور منادی تھے۔ حضرت محمد رسول اللہ کی ذات گرامی پر بھلائیوں پر تکمیل ہوگئی۔ انسانیت کی فلاح کے لئے ابدی دستور نازل ہوا۔ اب انسانیت کی ترقی اسی دستور کے حدود اور اسی چراغ ہدایت کی روشنی میں ہوگی۔ جب بھی ان حدود کو توڑنے اور پھاندنے کی کوشش کی جائے گی انسانی معاشرت کے نظام میں ابتری پھیل کر رہے گی۔ اور طرح طرح کے فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اسلامی انقلاب اپنی فطرت اور سرشت کے اعتبار سے تعمیری ہے' پس جہاں جہاں بھی دنیا میں بگاڑ دکھائی دے اور فتنہ و فساد نظر آئے سمجھ لو کہ اصول اسلام سے ضرور انحراف ہوا ہے اسلام معیشت اور اخلاق میں توازن چاہتا ہے۔ جب تک انسانی معاشرے میں یہ توازن باقی ہے خرابیاں پیدا نہیں ہوسکتیں۔ مگر جہاں اس توازن میں اونچ نیچ ہوئی جان لو کہ فساد و تخریب کی داغ بیل پڑگئی ــــــــــــ کاش دنیا اس حقیقت پر غور کر سکتی!

ساری دنیا بہت ہی نازک اور قیامت آفریں دور سے گزر رہی ہے۔ قدم قدم پر انقلابوں اور ہنگاموں کی نئی نئی بولیاں سنائی دیتی ہیں' ملکوں کے جغرافیے ہی نہیں فکر و نظر تک کے زاویے بدل رہے ہیں۔ ایک عالم ذہنی انارکی میں مبتلا ہے' تصورات اور خیالات کے اسی انتشار نے نظام کائنات اور دستور روزگار کو پریشان و منتشر کرکے رکھ دیا ہے ــــــــــــ لہٰذا ذہین اور ہوشمند انسانوں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ "نئی آوازوں" کو خوب پرکھ کر دیکھیں کہ ان میں انسانیت کی سعادت و فلاح کا کتنا عنصر پایا جاتا ہے۔ دلوں میں تقابل اور موازنہ کرنے کی صلاحیت اور جرأت ہونی چاہئے۔

جبران خلیل جبران

فکر و عمل کے دو راہے پر

ایک فلسفی نے سڑک کے خاکروب سے کہا "مجھے تجھ پر بڑا ترس آتا ہے کہ تیرا ذریعہ معاش بہت پست اور گندہ ہے۔"
خاکروب نے جواب دیا "جناب کا بہت بہت شکریہ لیکن ذرا یہ تو فرمائیے کہ آپ کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔"
فلسفی نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔
"میں لوگوں کو انسانی فطرت کا درس دیتا ہوں اور اُن کے افعال و اعمال، رجحانات و میلانات پر انتقادی نظر ڈالتا ہوں۔
خاکروب ہنس پڑا، اور جھاڑو سنبھالتے ہوئے بولا "آہ! غریب فلسفی!! ہائے! بیچارہ فلسفی!!"

حق کا سننے والا، حق کے اظہار کرنے والے سے کچھ کم نہیں ہے۔

امیروں کا امیر وہ ہے، جو اپنا تخت درویشوں کے دلوں میں پاتا ہے۔

سخاوت یہ ہے کہ اپنی استطاعت سے زیادہ دو اور استغنا یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے کم لو۔

زیادہ امیدوں والا دراز زندگی کا مالک ہوتا ہے

جمال مشتاق دلوں میں زیادہ درخشاں ہے، بہ نسبت مشاہدہ کرنے والی آنکھوں کے

عہدِ ماضی میں غلام بادشاہوں کی خدمت پر فخر کیا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ مسکینوں کی خدمت کا دعویٰ کرتا ہے۔

فرشتے جانتے ہیں کہ بیشتر عملی لوگ، حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے خیالی لوگوں کی گاڑھی کمائی سے روٹی کھاتے ہیں۔

ذہانت اکثر و بیشتر ایک حجاب ہے ـــــــ اگر تم اُس کے چاک کرنے پر قادر ہو جاؤ تو وہاں تمہیں ایک ہیجان آفریں عبقریت نظر آئے گی۔ یا ایک پر فریب عیارت۔

ایک سمجھ دار آدمی مجھے فہم و فراست کا مالک سمجھتا ہے اور ایک بے وقوف مجھ کو بیوقوف قرار دیتا ہے لیکن مجھ کو جیسا معلوم ہوا کردہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

ہمارے دلوں کے راز صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں ـــــ جن کے اپنے دل رازوں سے لبریز ہیں۔

ہم اپنے لئے غم اور خوشیاں انتخاب کر لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ انھیں ایک طویل زمانہ تک آزمائیں

غم، دو باغوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔

جب تمہارا غم یا خوشی حد سے بڑھ جائے تو دنیا تمہاری نظر میں مقید ہو جائے گی۔

آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت

آج کا سب سے زیادہ تلخ غم کل کی خوشیوں کی یاد ہے۔

لوگ مجھ سے کہتے ہیں "یا اس عالم کی لذتوں کو پسند کرو، یا دوسرے عالم کی سلامتی کو!"
اور میں لوگوں سے کہتا ہوں۔
میں نے اس عالم کی لذتوں کو بھی پسند کیا ہے۔ اور اس عالم کی سلامتی کو بھی اس لئے کہ میں اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں کہ سب سے بڑا شاعر صرف ایک ہی قصیدہ لکھتا ہے جس کا وزن بھی کامل ہوتا ہے اور قافیے بھی سالم!"

ایمان دل کے صحرا میں ایک سرسبز و شاداب قطعۂ زمین ہے، جہاں شک کے قافلے نہیں پہونچ سکتے۔

کچھوے راستوں کو خرگوشوں سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

موسم بہار کے پھول جاڑے کے حسین خوابوں کی تعبیر ہیں۔ جو صبح کے وقت ملکوتی دسترخوان پر پیش کئے جاتے ہیں۔

جو آدمی جتنا زیادہ بولتا ہے، اتنا ہی کم سمجھتا ہے اور ایک خطیب اور دلال کے درمیان بہت بڑا فرق ہے

حاسد میری تعریف کرتے ہیں اور نہیں جانتے۔

تم ایک زمانہ تک اپنی ماں کی گہری نیند کا ایک جواب رہے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو تمہاری ولادت ہوئی۔

ہمارے بعض بچے معذرتوں کی مثال ہیں اور بعض گناہوں کی مثال

میں تمہیں ایک پہیلی سناتا ہوں۔
گہرا اور بلند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں ———
بہ نسبت اُس شے کے جو اُن دونوں کے درمیان ہے۔

جب تم اپنے عزیز کی محبت میں لذت محسوس کرنے لگے، تو تمہاری محبت کی فضیلت زائل ہو گئی۔

جب کبھی تم اپنے گھر کے دریچہ سے جھانکتے ہو تو رستہ چلنے والوں میں تمہیں اپنی داہنی جانب ایک راہبہ جاتی نظر آتی ہے
اور بائیں جانب ایک طوائف۔
اور تم اپنے بھولے پن، اپنے دل کی پاکیزگی کی بنا پر اپنے دل میں کہتے ہو:-
"یہ عورت کتنی شریف اور وہ عورت کتنی بری ہے!"
لیکن اگر تم آنکھیں بند کر لو اور ذرا دیر کان لگا کر سنو!
تو فضا میں ایک آواز گونجتی محسوس ہو گی۔ جو خود تمہاری زبان سے کہہ رہی ہو گی۔
"خدایا! ایک مجھے نماز کی جانب بلاتی ہے اور دوسری رنج والم کی جانب، اور اُن دونوں میں سے ہر ایک کی روح میں
میری روح کے لئے سائبان موجود ہے!

ہر بڑے آدمی کے دو دل ہوتے ہیں۔ اندوہ والم محسوس کرنے والا دل اور رنج و فکر کرنے والا دل

ہر بند دروازہ کے پیچھے ایک سربستہ راز ہے۔ جس پر سات سات مہریں لگی ہوئی ہیں۔

تمہیں کیا اندیشہ ہے۔ جب کہ فکر تمہارے گھر کی مشرقی دیوار کا ایک نیا روشندان ہے!

جس کے ساتھ تم ہنسے ہو اُسے بھول سکتے ہو۔ لیکن جس کے ساتھ روئے ہو اُسے نہیں بھول سکتے۔

اگر تم بادل پر بیٹھ جاؤ تو تمہیں دو ملکوں کے درمیان حدِ فاصل اور دو کھیتوں کے درمیان سنگِ فاصل بالکل نظر نہ
آئے لیکن افسوس تو اسی کا ہے کہ تم بادل پر نہیں بیٹھ سکتے!

سات صدیاں ہوئیں ایک گہری وادی میں سے سات کبوتر اڑے اور فضا میں حلقہ بنا کر ایک سربلند کشیدہ
برف پوش پہاڑ کی چوٹی کا رُخ کیا۔
تو اُن سات آدمیوں میں سے، جو اُن کی اُڑان دیکھ رہے تھے، ایک آدمی نے کہا تھا۔

مجھے تو ساتویں کبوتر کے بازو پر ایک سیاہ نقطہ نظر آتا ہے۔"
آج اسی وادی میں لوگ بیان کرتے ہیں۔
"سات سیاہ کبوتر قدیم زمانہ میں پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی کی جانب اڑ گئے تھے۔"

موسمِ خریف میں، میں نے اپنے تمام غموں کو جمع کر کے اپنے باغ میں دفن کر دیا۔
جب موسمِ بہار آیا اور گرمی زمین سے شادی کرنے آئی، تو میرے باغ میں جو پھول کھلے وہ بے انتہا خوبصورت رنگین اور تمام دوسرے پھولوں سے مختلف تھے۔
میرے پڑوسی میرے پھولوں کو دیکھنے آئے اور سب نے مجھ سے کہا۔
"اب کی مرتبہ جو موسمِ خریف اور بیج ڈالنے کا وقت آئے تو تم ان پھولوں کے تھوڑے سے بیج ہمیں بھی دینا ہم بھی ان کو اپنے باغ میں بوئیں گے!"

بدبختی یہ ہے کہ میں اپنا خالی ہاتھ لوگوں کی جانب بڑھاؤں اور کوئی اس میں کچھ نہ رکھے۔ اور مایوسی یہ ہے — کہ میں اپنا بھرا ہوا ہاتھ لوگوں کی جانب بڑھاؤں اور کوئی اس میں سے کچھ نہ لے۔

آرٹ ایک قدم ہے، جو فطرت ابدیت کی طرف بڑھتی ہے۔

کہر کو مجسّم کر دینے کا نام فن کاری ہے!

بیشک وہ ہاتھ جو کانٹوں کے تاج بناتے ہیں، ان ہاتھوں سے بہتر ہیں جو کچھ نہیں کرتے!
ہمارے مقدس ترین آنسو وہ ہیں جو ہمارے گوشہ ہائے چشم کی راہ جانتے ہیں۔
ہر انسان، ہر اس بادشاہ اور ہر اس غلام کا فرزند ہے جو اس سے پہلے اس دنیا میں زندگی بسر کر سکتا تھا
پرستارِ حق وہ ہے جو عالمِ ذہنیات کو نظر انداز کر کے جہانِ کلیات ——— ناقابلِ تجربہ جہانِ کلیات —— سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔
لوگ مجھ سے کہتے ہیں "اگر تو خود کو پہچان لے" تو تمام آدمیوں کو پہچان لے گا۔"
اور میں ان سے کہتا ہوں "جب تک میں تمام لوگوں کو نہ پہچان لوں" خود کو نہیں پہچان سکتا!"
عالم اور شاعر کے سامنے ایک سبزہ زار ہے۔ عالم جب اس سے گزر جاتا ہے تو حکیم بن جاتا ہے

کل شام میں نے فلسفیوں کا ایک گروہ دیکھا۔
جو ٹوکریوں میں اپنے سر رکھے اشہر کے بازاروں میں آواز لگاتے پھر رہے تھے۔ "فلسفہ لو! فلسفہ!!"
آہ! یہ بچو کے فلسفی پیٹ پالنے کے لئے اپنے سروں کی تجارت کرتے ہیں۔
ایک عورت نے کہا —— جنگ کیسے مقدس نہیں ہے۔ میرا تو بیٹا اس میں مرا ہے۔
میں نے ایک مرتبہ زندگی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں۔ موت کو بولتے سنوں!"
زندگی نے اپنی آواز قدرے بلند کی اور کہا۔
"اس وقت تم موت کی آواز سن رہے ہو!"

(حبیب اشعر دہلوی نے ترجمہ کیا)

ضیا احمد ایم اے بدایونی

کلامِ مومن کا نفسیاتی مطالعہ

مشرق ہو یا مغرب جاہلیت کی تاریکی کا دور ہو یا علم کی روشنی کا زمانہ کوئی ملک اور کوئی دور حیات ایسا نہیں جس میں حقیقی ادب کو زندگی سے گہرا تعلق نہ رہا ہو۔ سچ پوچھئے تو ادب کا پودا جس کی جڑیں زندگی کی زمین میں دور تک نہ پھیلی ہوں ہرگز دیرپا اور مستحکم نہیں ہوتا۔[1] اجینٹ سن فوق الانسان ماہاسن قرار۔ جنہوں نے ادب کو تنقید (نقد) حیات کہا ہے۔ دوسرا ہم اسے تفسیر[2] حیات ٹھہراتے ہیں۔ غرض اس کے قائل ہیں کہ وہ زندگی کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس سے رشتہ رکھتا ہے اور اسی کی خاطر جیتا ہے۔ لیکن جب ہم ادب کو زندگی کی تفسیر یا تعبیر قرار دیتے ہیں۔ تو ہماری کیا مراد ہوتی ہے ظاہر ہے کہ انسان روح اور جسم کے امتزاج کا نام ہے۔ اس لئے کبھی اس کے افکار ذہنی کا رخ باطن کے حقائق کی طرف ہوتا ہے اور کبھی ظاہر کے مناظر کی جانب یہی حال ایک فن کار یا ادیب کا ہے۔ کبھی وہ اپنے اندرون کی طرف متوجہ ہوتا اور اپنے افکار و جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنے سے نکل کر بیرونی دنیا میں پہونچ جاتا اور خارجی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے۔ بہر حال اس کا رشتہ زندگی سے برابر استوار رہتا ہے خواہ وہ وقتی اور شخصی زندگی ہو یا عالم انسانی کی حیات سے متعلق ہو یا عالم مظاہر کی زندگی اس کا موضوع ہو۔ اس کے برخلاف جس ادب میں محض خیال آرائیاں اور لفظی چٹخارے ہوتے ہیں۔ اسے صحیح اور پائیدار ادب نہیں کہہ سکتے ـــ زندگی کی ترجمانی محسوسات اور واردات کی عکاسی ہی حقیقی ادب کی بنیاد ہے۔ جب عرب کا شاعر سموال بن عادیا کہتا ہے :۔

[3] وما اخمدت نار لنا دون طارق ــــ ولا ذمّنا فی النازلین نزیل

تو کیا ہمارے سامنے عربوں کی زندگی کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا۔ کیا ہم شاعری کی رہنمائی میں اس کے ماحول میں نہیں پہنچ جاتے اور کیا زندگی کے بارے میں اس کا حسن نظریہ ہم پر آشکار نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب ہم فرخی کے مرثیہ میں پڑھتے ہیں۔

خیز شاہا کہ رسولان شہان آمدہ اند ــــ ہدیہ ہا بہر تو آوردہ فراوان و نثار

تو کیا محمود غزنوی کی عظمت۔ دوسرے سلاطین کی اس سے عقیدت اور شاعر کے دلی تاثرات کی کیفیت بیک وقت ہم پر آئینہ نہیں ہو جاتی جو کچھ ادب کے بارے میں کہا گیا۔ وہ تقریباً تمام تر شعر پر بھی صادق آتا ہے۔ شعر کی تعریف جو کچھ بھی قرار دی جائے۔ یہ بہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ جذبات اور تخیل کی مدد سے زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ جو موزوں الفاظ میں کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ترجمانی کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے۔ جب کہ وہ شاعر کے شخصی تجربات خوبصورت سانچے میں ڈھل جائیں۔ کارلائل نے کیا خوب کہا ہے کہ ادب (اس میں شعر بھی شامل ہے) وہ طلسم کا ہوتا ہے حقیقی آواز اور صدائے بازگشت کبھی بعض ادیب جو محسوس کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں اور بعض محض نقالی سے اڑتے ہیں

---

[1] جب چاند زمین اپنے اوپر سے اکھاڑ پھینکا۔ اس کو کچھ ٹھہراؤ تو ہے ہی نہیں۔ قرآن مجید۔ [2] مبادی مطالعہ ادب۔ از بڈسن۔ [3] کبھی ہماری آگ رات کے آنے جانے والے مسافر سے پہلے نہیں بجھائی گئی اور نہ مہمانوں میں سے کسی نے کبھی ہمیں برا کہا (حماسہ)

شعر و ادب میں بہر حال شاعر و ادیب کے ذاتی رجحانات اور شخصی واردات کی کار فرمائی ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے شعر و ادب کے مطالعہ کرنے والے کا فرض ہے کہ شعر سمجھنے کے لیے وہ خود شاعر کی طرف متوجہ ہو۔ اس کی سیرت سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کرے۔ اس کے افکار و جذبات کی تہہ میں اتر کر اس کی شخصیت سے واقعی رابطہ پیدا کرے۔ سچ پوچھئے تو یہی مناسبت ہمیں ضرورت ہے۔ اخلاق ہی ہر افادہ اور استفادہ کی روح ہے۔ جس کے بغیر کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اگر کوئی استاد سے اور مرید کو مرشد سے مناسبت کے بغیر کوئی فیض نہیں پہنچتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شیخ [illegible] خود پر نا پسند فرماتے تھے۔ ایک روز ان کی خدمت میں کوئی شخص بیعت کی نیت سے حاضر ہوا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے خانقاہ کے حوض کو دیکھ کر کہا۔ کہ ہمارے شہر کی مسجد کا حوض تو اس سے بہت بڑا ہے۔ شیخ نے فرمایا اچھا اسے ناپو۔ اور جب وطن جاؤ تو وہاں کے حوض کو بھی ناپنا۔ اور مجھے بتانا۔ مرید نے تعمیل حکم کی اور واپسی پر عرض کیا کہ ہمارا حوض اس سے ایک بالشت بڑا ہے۔ شیخ نے ارشاد کیا۔ جو ایک بالشت بڑا ہو اسے بہت بڑا نہیں کہتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمہیں مجھ سے مناسبت نہیں۔ اور اس بناء پر مجھ سے حصول فیض دشوار ہے۔

ہمارے ملک کے ایک مشہور شیخ وقت ہیں جن کی وفات کو ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے تربیت کے لئے مناسبت کو اولین شرط قرار دیتے۔ اور اس کے بغیر کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے

غرض شعر کو سمجھنے کے لیے مناسبت ناگزیر ہے۔ اس کے لئے ہمارا فرض ہوگا کہ خود شاعر۔ اس کی شخصیت۔ اس کے نظریۂ زندگی اس کے [illegible] اور اسلوب کے ماخذ۔ اس کے پیش رو اور معاصر اور اس کے گرد و پیش کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ ان آثار و عمل کا تجزیہ کریں۔ جن سے وہ متاثر ہوا اس کے عمل اور رد عمل کی تفتیش کے بعد کوئی رائے قائم کریں۔ یہ طریق کار وقت طلب ہی ہیں۔ وقت طلب تو لیکن اس کے بغیر کوئی مفید ممکن نہیں۔

اب ہم چاہتے ہیں۔ کہ دہلی کے مامور شاعر مومن کے کلام کو اس روشنی میں دیکھیں۔ یعنی شاعر کے ماحول اور شخصیت پر نظر ڈالیں اور مختصراً بتائیں کہ مختلف اثرات نے ان کی شخصیت کو اور شخصیت نے ان کی شاعری کو کس طرح متاثر کیا۔

اس کے لئے ہمیں پہلے تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے عام حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ دلی اس دور کی تہذیب سیاست اور معاشرت کا مرکز تھی

حالات۔ تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی کا نصف اول سیاسی اعتبار سے نہایت پر آشوب تھا۔ حکومت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھڑک کر بجھنے والا تھا۔ ملک کا بڑا حصہ انگریزوں کے زیر نگیں تھا تاہم دکن سے دلی تک مرہٹے اور پنجاب میں سکھ برسر اقتدار تھے۔ مرکزی حکومت کا بندھن ٹوٹنے سے نظام عدالت کی بندھی ہوئی جبار و بکھر گئی۔ ٹھگ تو ہیں ابھر رہی تھیں۔ پنڈارے ابھرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں اور اس کے برخلاف حاکم قوم روز بروز پستی اور ابتری کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ملت اسلامیہ کے سامنے کوئی مقصد تھا نہ رہنمائی کے لئے کوئی قائد۔ ان ہی حالات کی درستی کی غرض سے حضرت سید احمد بریلوی کی قیادت میں وہ تحریک جہاد وجود میں آئی جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

تحریک جہاد

یہ زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ اور مذہبی پستی کا زمانہ تھا۔ شرک و بدعت کا زور عیش و تفریح کی گرم بازاری۔ رذیل اور شریف۔ عالم اور جاہل سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے قصر و ایوان سے لے کر جھونپڑوں تک شامت اعمال کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ خانقاہوں اور علمی خانوادوں کا رنگ بھی بگڑ چکا تھا۔ مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر چند درد مند اور حساس افراد کو جوش آیا۔ دہلی کے نامور خاندان ولی اللہی کے ایک

نامور فرد مولوی محمد اسمٰعیل نے اسی خاندان کے ایک فیض یافتہ بزرگ حضرت سید احمد رائے بریلی کی امارت و قیادت میں پُر جوش اور حوصلہ مند اہل ایمان کو ساتھ لے کر علم اصلاح و جہاد بلند کر دیا۔

یہ ایک اصلاحی تحریک بھی اور انقلابی پروگرام بھی! عزم یہ تھا کہ مسلمانوں میں مذہب کے نام پر جو مشرکانہ بدعات رواج پا گئی ہیں ان کا قلع قمع کیا جائے اور پنجاب میں مسلمانوں کو اغیار کے مظالم سے نجات دلانے کی سعی کی جائے، لیکن افسوس ہے کہ بعض امراء کے نفاق اور کچھ امور اصلاحی میں شدت کے باعث اس انقلابی تحریک کو ۱۸۳۱ء کو ختم ہو جانا پڑا ــــ اس تحریک کی ناکامی اسلامیان ہند کی تاریخ کا بہت بڑا حادثہ ہے۔

یہ واقعہ کتنا عجیب تر ہے کہ ان ناخوشگوار اور پراگندہ حالات کے باوجود علمی و ذہنی اعتبار سے اسلامی معاشرت کی حالت دلی اور قرب و جوار میں اطمینان بخش ہی نہیں شاندار تھی۔ خیر آباد، بلگرام، امروہہ، بدایوں، رام پور، گوپامئو، اور بھوپال ہی پر موقوف نہیں، اکثر شہر اور قصبے علم و فضل کا مرکز اور درس و تدریس کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

دلی کا خانوادۂ فضل و کمال جس کے سرپرست شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز تھے اور فرنگی محل کا خاندان جس کی سرداری مولانا عبدالحکیم کے سپرد تھی، عرب و عجم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے تلامذہ اور متوسلین کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔

آثار الصنادید کے حوالہ سے اس دور کے چند مشاہیر کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں جن کے کارنامے اگر قوم نے بھلا دئے تو یہ بہت بڑی بد توفیقی ہوگی:-

صلحاء اور فقرا:- شاہ غلام علی، شاہ ابو سعید، شاہ محمد آفاق، مولانا فخر الدین، شاہ غلام نصیر الدین، خواجہ محمد نصیر۔

علماء:- شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولوی مخصوص اللہ، مولوی محمد اسمٰعیل، مولوی محمد اسحٰق، مولوی محمد یعقوب، مولوی صدر الدین خاں، مولوی رشید الدین خاں، نواب قطب الدین خاں، مولوی عبدالخالق، میاں نذیر حسین، مولوی مملوک علی، مولوی فضل امام، مولوی فضل حق۔

اطباء:- حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم غلام حسن خاں

مومن کی سیرت!

علم و فضل کی اس ارزانی میں شعر و ادب کی بھی بہتات تھی۔ حکومت کے گلکدے میں خزاں کا دور دورہ تھا، مگر گلزارِ سخن میں بہار آئی ہوئی تھی۔ میر اور سودا اور ان کے بعد ان کے تلامذہ اور دیگر اساتذہ کے نغموں سے فضا گونج رہی تھی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت دلی فضل و کمال میں قرطبہ و بغداد کی ہمسری کر رہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ غرض یہ تھا وہ ماحول جس میں مومن ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں کا شمار دلی کے معزز شرفا میں تھا۔ ان کو شاہ عبدالعزیز سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ وہ شاہ صاحب کو لے آئے اور انہوں نے ہی محمد مومن نام رکھا۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو شاہ صاحب کے بھائی شاہ عبدالقادر سے عربی کی تحصیل کی اور اس کے بعد اپنے باپ اور چچا سے طب سیکھی۔ ذہن و حافظہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ ذہانت میں وہ مولوی محمد اسمٰعیل اور خواجہ محمد نصیر کے سوا کسی کو اپنا ہمسر نہ جانتے تھے۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ لڑکپن میں شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے اور گھر آکر تمام مطالب زبانی سنا دیتے۔ علوم متداولہ کے علاوہ نجوم، رمل، ریاضی، شطرنج اور موسیقی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر سے فطری ذوق تھا، مگر شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ ان کی شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی جس سے اولاد میں ایک بیٹا، ایک بیٹی یادگار رہے۔ مومن ایک خوبرو اور جامہ زیب انسان تھے

اور عرضِ ماندہ و بود امیرانہ تھا۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ آغازِ شباب میں جو عمل بے راہ روی رہی ہو مگر انہوں نے جلد ہی حضرت سید احمد صاحب (اور بقول صاحب سوانح احمدی سید صاحب کے خلیفہ مولوی ولایت علی عظیم آبادی) سے بیعت کرلی اور آخر وقت تک جادۂ شریعت پر ثابت قدم رہے۔ طبیعت میں خوش مزاجی، خودداری اور نازک مزاجی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ مولوی محمد اسمٰعیل کے ہم جلیسہ اور عقیدے میں ان کے ہم نوا یعنی عمل بالحدیث کے قائل تھے۔ آخر ۱۲۶۸ھ میں اتفاقاً کوٹھے سے گر کر ۵۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

مومن کی متعلقہ شخصیت دو رجحانات کا اندازہ کرسکتا ہے۔ اس کے نظروں میں کچھ انتہائی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایک خوشحال اور ترقی پذیر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ذہن اور حافظہ بے نظیر پایا تھا۔ مزاج میں رنگینی اور لطافت۔ خودداری اور نفاست بدرجۂ اتم تھی۔ یہ سب عناصر مل کر ان کا رنگ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف شاہ عبدالعزیز کا فیضان۔ شاہ عبدالقادر کی تعلیم پرور دہ خاندان سے قرابت، مولوی محمد اسمٰعیل شہید کی صحبت، اور شاہ سید احمد کی بیعت یہ وہ محرکات تھے۔ جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

ان دو متضاد قسم کے عناصر کا نتیجہ غالباً یہ ہوا کہ ہمارے شاعر کو مدتوں ایک مستقل ذہنی کشمکش سے دوچار رہنا پڑا۔

یہاں بیٹھے رو دے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   ؛   کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔

اگرچہ آخر میں مذہبی اثرات دوسرے رجحانات پر غالب آئے تاہم ان کی شاعری میں اس کشمکش کی جھلک کچھ نہ کچھ ہر زمانہ میں باقی رہی۔ جو ان کے خلوص کی دلیل ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ اچھے ادب اور اچھے شعر کے لئے کامل خلوص اولین شرط ہے۔ ادیب کا خلوص اپنی ذات کے ساتھ۔ اپنے تجربات اور اپنے مشاہدات کے ساتھ۔ درحقیقت یہی خلوص یا صدق جذبات شعر کی جان ہے شاعر کے خیال و فکر میں ندرت کا ہونا بھی ایک بڑی چیز ہے مگر ندرت جتنا کہ خلوص اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن اگر حسن اتفاق سے ندرت بھی خلوص کے ساتھ مل جائے تو کیا کہنا

ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کے یہاں دونوں کا لطیف امتزاج ہے۔

ذکرِ شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ	مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے	مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا
مومن یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں مگر	دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا
لیکن میں ہے مومن وہ کافر صنم	بس اب پاسبانیٔ دیں ہو چکی۔!
خدا کی بے نیازی ہائے مومن	ہم ایمان لائے تھے نازِ بتاں سے

ان اشعار کو محض اس نظر سے نہ دیکھئے کہ وہ غزل میں مقطع کا خاص اہتمام کرتے ہیں، اور مومن، کافر، خدا، اور صنم کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں، بلکہ یہ بھی پیش نظر رکھئے کہ یہ اسی کشمکش اور خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ جس کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ مقطع پر منحصر نہیں اور اشعار میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔

کس صنم کو چھیڑ دیا واعظ	لے خدا تجھ سے انتقام میرا
سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی	اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا!
بے اعتبار ہو گئے ہم ترکِ عشق سے	از بس کہ پاسِ وعدہ و پیماں نہیں رہا

کس کام کے ہیں یہ جو کسی سے رہا نہ کام — سر ہے مگر غرور کا ساماں نہیں رہا

تغزل یوں تو مومن کو تمام اصنافِ سخن پر استادانہ قدرت ہے۔ لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے اور غزل میں بھی وہ مضامین تغزل کے دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ دوسری اصناف (قصیدہ، مثنوی وغیرہ) میں بھی تغزل کا انداز غالب ہے۔ اسی بنا پر بعض نقاد کہتے ہیں کہ ان کی دنیا محدود ہے۔ یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہی وصف ان کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔ اگر مراد یہ ہے کہ ان کے تجربات و احساسات میں شخصیت ہے کلیت نہیں، ان میں عام انسانی حقائق کی جگہ غالب کے برخلاف ذاتی عنصر نمایاں ہے

تو ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن اگر یہ مقصد ہے کہ وہ فلسفہ، اخلاق و تصوف کی بجائے عشق و محبت کے ترانے گاتے ہیں تو یہ شاعری کے مذہب میں کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو انہوں نے دوسرے اصناف کی فرسودگی سے اجتناب کر کے غزل کو اس کے اصل موضوع (سخن با معشوق) کا پابند کر دیا۔

ہر چہ بجز عشق گوید مر استاد — فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

بلکہ یہ ان کا کمال ہے کہ ایسے تنگ موضوع میں، اپنے تخیل کے زور سے تصورات کی وہ وسعتیں پیدا کر دیں جو انہیں کی فکر بارسا کار کا حصہ تھیں۔ دراصل یہ اعتراض چنداں وقیع نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ شاعر نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں خیال کی ندرت اور اسلوب کی لطافت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی زندگی اور شعر میں ہم آہنگی بھی ہے۔ ہماری رائے میں اس خصوص میں مومن کو سرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب یہ ناقدین یہ اعتراض کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک واقعی شاعر شعر کہنے سے پہلے یہ کبھی سوچتے نہیں بیٹھتا کہ کون مباحث غزل میں داخل کرے اور کس انداز کے مباحث کو خارج کرے۔ وہ کسی محبت کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس کے سوا دوسرے کو اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی اس کی طبیعت[1] آشنائے روایت کی تذکرہ خاصہ ہے۔ جب وہ اپنے حقیقی جذبات کو چھپائے گا، کلام میں ... اور بناوٹ پیدا ہو جائے گی۔ مستعد جذبات، شاعری کی جان اور اس کا جوہر ہیں۔

جب عرب کا شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

عـ۲ ذکرتک والخطی یخطر بیننا — وقد نہلت منا المثقفۃ السمر

یا بے خودیٔ شوق میں چلا اٹھتا ہے

عـ۳ عجبت لمسراہا وانی تخلصت — الی وباب السجن دونی مغلق

تو در حقیقت یہ کیفیتیں اس پر گذری ہوتی ہیں۔ عشاق کا رقیبوں سے کشت و خون کرنا، زندان کے مصائب جھیلنا، معشوقہ کے قبیلہ کا پانی اور بہار کی طرح کسی دوسری جگہ خیمے منتقل کر لینا بدویوں کی زندگی کے عام واقعات ہیں۔ اسی طرح جب مومن اپنے عشق کے جذبات و واردات بیان کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ بیتی سنا رہے ہیں

مثلاً چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے — اس واسطے جو چاہے کریں کچھ نہیں کہتا!

عـ۱ اردو شاعری پر ایک نظر۔ از کلیم الدین احمد

عـ۲ اے محبوبہ میں نے تجھے اس وقت یاد کیا جب کہ برچھیاں ہمارے درمیان لرز رہی تھیں اور گندم گوں نیزے ہمارا خون پی چکے تھے

عـ۳ مجھے اس کی آمد پر حیرت ہے کہ جب میرے زندان کا دروازہ بند تھا، تو وہ مجھ تک کیوں کر پہونچ گئی۔

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا　　　تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے !

یہ اب کوئی معشوق وفاجو نہ ملے اب　　　جو ان کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس　　　ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے !

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے　　　وہ کرتے ہیں اب جو کہ کیا تھا نہ کریں گے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی !

ان کے یہاں پردہ نشیں کا کثرت سے مذکور ہونا بھی اسی راز نہاں کی پردہ دری کر رہا ہے۔ عام شعرا کے یہاں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں مگر حقیقی آواز اور صدائے بازگشت میں کیا نسبت۔ یہ ضرور ہے کہ مومن کے یہاں خصوصاً ابتدائی کلام میں (جب کہ وہ رنگ ناسخ کی طرف مائل تھے) اور کہیں کہیں بعد میں شاید عام مذاق کے اثر سے رسمی اور غیر حقیقی جذبات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ لیکن یہاں کا اصل رنگ نہیں کاش بلکہ ایسے مستند ذرائع دستیاب ہوتے۔ جن کی مدد سے ہم ان کے تمام کلام کو ترتیب زمانی کے ساتھ مدون کر سکتے اور اس طرح یقین سے جا سکتے کہ کس عہد تک کون کلام دوسروں سے متاثر ہوا اور کس عہد سے انہوں نے اپنی طرز خاص ایجاد کی۔

ملہ　ہاں تو ذکر یہ تھا کہ مومن کی شاعری میں جنسی آوارگی شان پائی جاتی ہے۔ چند مثالیں اور ملاحظہ کیجئے۔ عشق بعد میں جا کر بوالہوسی کا پہلو نمایاں ہوا اور مومن کا عشق کچھ اسی قسم کا تھا، یہ واقعات بھی پیش آ جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق کی خاطر رقیب کی مدارات بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس مضمون کا پیرایہ بیان دیکھئے۔

ملہ اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا !

دل کی دھڑکن کا سبب فرط تعلق بھی ہو سکتا ہے اور جوش مسرت بھی الگ ہیں :-

کیا تجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں　　　دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

رقیب اور ناصح کا تذکرہ ان کے یہاں جس تکرار اور انفرادیت کے ساتھ آتا ہے اس سے صاف ان کی روداد محبت کی غمازی ہوتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم　　　حرف ناصح برا نہیں ہوتا

یعنی میں ناصح کی باتوں کو برا سمجھتا تھا مگر ذکر اغیار ان سے بڑھ کر دل خراش ہے۔ اب ذکر اغیار کے مقابل ناصح کی باتوں کی مجھے قدر ہوئی کہ وہ اس قدر برا نہ تھا۔ ناصح کی تعریف کا ایک نیا پہلو ملاحظہ فرمائیے۔

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث　　　ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

مراد یہ ہے کہ میں نے ناحق ناصح سے اب تک پرہیز کیا۔ اس لئے کہ دوران نصیحت میں ذکر دوست آتا ہے اور ذکر دوست سے وابستگی کس کو نہ ہوگی

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو میرا تصور تم کو لا کر میرے پیش نظر کر دیتا ہے۔ یہ شعر اس قدر مطابق فطرت اور بلیغ ہے کہ بقول خواجہ حالی

ملہ : شرح دیوان مومن مرتبہ ضیا احمد۔ مطبوعہ رشانی پریس الہ آباد۔ ملہ یادگار غالب۔ مصنفہ حالی

مرزا غالب کہا کرتے تھے۔ کہ کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیدیتا۔ اس سے ایک طرف مومن کی ژرف نگاہی اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ تو دوسری طرف غالب کی نکتہ شناسی اور منصف مزاجی ظاہر ہوتی ہے۔

سنا ہے کہ کوئی درویش تنہا عالم استغراق میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک مرد فضول بھی ادھر آ نکلے اور دخل در معقولات کا تو مرض تھا ہی۔ پوچھ بیٹھے۔ شاہ صاحب آپ کا اکیلے بیٹھے بیٹھے دل نہیں گھبراتا۔ جواب دیا میاں میں اکیلا کب تھا۔ ہاں تم آئے تو اکیلا ہو گیا۔ سچ ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک شعر میں نہایت نیچرل انداز میں محبوب کو ظلم سے روکتے ہیں

دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ فکر جور ترک کرنے میں میرا ہی نہیں، تمہارا بھی فائدہ ہے مگر یہ ٹکڑا (میں بھی ذرا آرام لوں) قصداً اس لئے مقدم رکھا گیا ہے کہ محبوب کو بدگمانی نہ ہو۔ دوسری جگہ اس سے ملتا ہوا مضمون ہے۔ لیکن اس کا پیرایہ اسقدر نیچرل نہیں

ہر جا جوشش تپش ہے تو تڑپ لیکن
چارہ سازوں میں ذرا دم لی ذرا آ جائے

وہ اپنے مطلب کو پیچ سے بیان کرتے اور اس طرح پیش کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ سمجھے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کو میں مکر شاعرانہ سے تعبیر کرتا ہوں۔ اور اس میں وہ تمام اردو شعراء میں منفرد ہیں۔ مثلاً

نہ جو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل
کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے

یعنی ناصح تمہیں بے وفا بتاتا ہے۔ اور میں اس کی تکذیب کرتا ہوں۔ خدا کے لئے کہیں تم بے وفائی نہ کرنا کہ اس کا قول سچ ہو جائے۔ اور مجھے اس کے قائل ہونا پڑے۔

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہیئے دل اپنے راز داں کے لئے

مراد یہ ہے۔ کہ نرم دل شخص میرا حال سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ سخت دل صرف تم ہو یا رقیب ہے۔ اگر تم نہیں سنتے تو رقیب سے کہوں گا۔

کہا ہے غیر نے تم سے مرا حال
کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی!

تمہاری اداؤں کی بے باکی صاف کہہ رہی ہے۔ کہ میرا حال تمہیں غیر (دشمن) کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ اگر تم کسی صحیح ذریعہ سے سنتے۔ تو اس قدر دیدہ دلیری سے کام نہ لیتے۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں۔ ادنیٰ جستجو سے سینکڑوں اشعار مل سکتے ہیں۔ جن سے ہمارے دعوے کی تصدیق ممکن ہے۔ یہاں ایک شبہ کا دور کرنا ضروری ہے۔ جب ہم اچھے شعر کے لئے صداقت کی شرط لگاتے ہیں۔ تو ہمارا مقصود سادہ اور سپاٹ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا۔ ورنہ ؎

دندان تو جملہ در دہانند
چشمان تو زیر ابروانند

کو بھی شعر ماننا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ شعری حقیقت اور سائنٹفک حقیقت میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ شعر میں حقیقت اس زاویہ سے بیان کی جاتی ہے جس سے شاعر کا ذہن اسے محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سائنس کا نصب العین حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ایک کا نقطۂ نظر موضوعی۔ داخلی اور جذباتی ہے دوسرے کا معروضی۔ خارجی اور عقلی۔ ایک تخلیق کا ضامن ہے۔ دوسرا اضافۂ معلومات کا۔ اگرچہ زندگی کی تفسیر دونوں کا موضوع رہی ہے۔ اوپر مومن کی طرز خاص کا ضمنی حوالہ گذرا یہ طرز خاص یا اسلوب منفرد (جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں)، ان کی مخصوص شخصیت اور انفرادیت کا مظہر ہے۔ اسلوب کی

؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ شرح مومن مرتبہ [illegible]

اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ادیب یا شاعر کی شخصیت کا پرتو اور اس کی انفرادیت کا اشاریہ ہوتا ہے۔ Style is the man ایک ناقد کا قول ہے کہ جو شخص واقعی کسی تجربہ کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس کے واسطے شخصی انداز بیان بھی تلاش کر لیتا ہے۔ پوپ نے کہا ہے کہ اسلوب خیال کا لباس ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بقول مڈلٹن مرے خیال کا لباس نہیں۔ بلکہ جلد ہے۔ ایک بڑے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس کا خیال یا اسلوب دونوں اچھوتے ہوں۔ مومن کے اسلوب میں ان کی ندرتِ ادا اور مکرِ شاعرانہ، شوخی اور طنز نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند مثالیں اوپر گذری ہیں اور کچھ اور پیش کی جاتی ہیں

ندرتِ ادا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں　　کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

محفل میں میرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ　　بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو!

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

چمن میں کوئی اس کو سے نہ آیا　　گئی برباد سب منت صبا کی

مکرِ شاعرانہ

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　آزار ہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

گر ذکر وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے　　گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے!

تاب کم ظرف کو کہاں، تم نے　　دشمنی کی مدد سے چاہ نہ کی

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں　　عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

شوخی

ہم چارہ گر کو یونہی پہنائیں گے بیڑیاں　　قابو میں اپنے گر وہ پری زاد آگیا!

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں　　سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب تھا

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق　　ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے　　اتنا ہی تو بیاں محبت ناصح کا اثر ہے

طنز

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ　　یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

غیر عیادت سے برا مانتے　　قتل کیا آن کے اچھا کیا!

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کار عشق　　کیا ناصح شفیق نے مژدہ سنا دیا

کر علاج جوشش وحشت چارہ گر　　لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پر　　یار ہے وہ مجھ تماشائی نہیں

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے!

وقت اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے اشعار مذکورہ میں خیال کی نزاکت کے ساتھ جو بیان کی لطافت ہے۔ اس کی وضاحت کیا کی جائے۔ کہا جاتا ہے [illegible] کہ مومن کی نازک خیالی اور ندرتِ اسلوب مسلم مگر یہ صحیح شاعری نہیں۔ کیونکہ اول الذکر تاثیر سے مہجور ہے اور آخر الذکر تصنع سے معمور۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اعتراضوں کی نسبت بھی لگے ہاتھوں دو جملے عرض کر دیے جائیں۔

[illegible]۔ مبادیٔ مطالعہ ادب۔ ۱۹۰۔ شرح مذکورہ [illegible] اردو شاعری پر ایک نظر۔

تجزیہ وتخیل

اولاً۔ ان کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر خیال حسب معمول جذبات اور تخیل کے امتزاج کا نتیجہ ہے دوسرے الفاظ میں انہوں نے واردات محبت کی جو ترجمانی کی ہے اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ جنہیں ان کی تخیل نے اپنا رنگ بھر دیا ہے۔ یا یوں کہیئے اپنے جذباتی تجربات کو انہوں نے اپنی تخیل کی رنگین عینک سے دیکھا ہے۔ جذبات کی اصلیت وصداقت کی بحث اوپر گذری۔ رہی تخیل۔ یہ دراصل قوت اختراع کا نام ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ اگر شعر میں تخیل کی شیشہ گری ہو تو وہ چیستاں بن کر رہ جائے گا۔ ہمیں تسلیم ہے کہ مومن کے ہاں تخیل کے اعتدال کے ساتھ اس کی بے اعتدالی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ وہ ناسخ کے پیرو تھے۔ اعتدال کی مثالیں عرض کی گئیں۔ بے اعتدالی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

بن ترے اے شعلہ رو آتش کدہ تن ہوگیا	شمع قد پر میری پروانہ برہمن ہوگیا
تھی کیں میں غارت بوس دہن ہنگام خواب	شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہوگیا
ہوں غضب سے اس کے سرگرم فغاں شعلہ زن	جل گیا ہی احتراق زہرہ کی تاثیر سے
طوطیاں سیکھیں کہاں سے نالۂ رشک آزمی	ہو نہ زیب پشت آئینہ تری تصویر سے

ان اشعار سے دماغ کو تو شاید حظ ملے۔ دل کو لذت نہیں ملتی۔ لیکن یہ ادبی ناانصافی ہوگی کہ سب کو ایک لکڑی سے ہانکا جائے

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ ان کے جذبات واحساسات اصلی اور واقعی سہی۔ مگر انداز بیان اس قدر پیچدار اور تکلف آمیز کیوں ہے اس دورنگی کی آخر کیا وجہ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص خوشی یا غم کے کسی حقیقی اصلی احساس سے متاثر ہو۔ اور اس کو ادا کرنے کے لئے غیر حقیقی پرپیچ اسلوب تلاش کرے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ ان کی منفرد شخصیت ہے جو کبھی روش عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی۔ حتی کہ ان امور میں وہ مرزا غالب سے بھی (جو خود ایک زبردست انفرادی ذہنیت رکھتے تھے) سبقت لے گئے ہیں۔ مومن ایک یا نابغہ تھے اور نابغہ مخصوص فوق العادہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر انہوں نے اپنے مطالب کو ادا کرنے کے لئے ایک نیا اور غیر متعارف پیرایہ ایجاد کیا تو کیا تعجب ہے۔ اس کے علاوہ سب جانتے ہیں کہ ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ مجازی بھی وہ جس سے ہوس پرستی اور کوچہ گردی کی بو آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں برشتگی۔ اور نامرادی وارفتگی۔ اور خود فراموشی کا کیا کام۔ وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے۔ کہ تھوڑے سے تھوڑے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ عجب نہیں کہ اسی داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو تصنع آمیز اور پیچدار باتوں کا خوگر بنا دیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے سودا کی نسبت کہا ہے کہ وہ مصنوعی خیالات کو اصلی کر دکھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مومن اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وللناس فی مایعشقون مذاہب۔ اگر جستجو کی جائے۔ تو مختلف زبانوں کے ادب میں ایسے شعراء مل جائیں گے جو جذبات وحسیات کے خلوص کے باوجود تصنع آمیز اسلوب کے مالک ہیں۔ انگلستان کے [۳] میں اور ایران کے شعراء میں خاقانی بڑی حد تک اوصاف بالا کے مصداق ہیں۔ انگریزی کے مشہور ناقد ومصنف ایلیٹ نے اس موقعہ پر کتنی باریک بات کہی ہے

It is a fidelity to thought and feeling. Some

[۱] شعر العجم جلد چہارم [۲] کاشف الحقائق از امداد امام اثر [۳] منتخب مقالات از ایلیٹ [۴] دیکھو قصائد جیسے۔ نیز مقالہ راقم بر خاقانی شروانی (علیگڑھ میگزین)

poets only think; others also feel their thoughts, — their thought is their experience (Selected-Essay)

مومن کی شخصیت اور اس شخصیت کے وسیلے سے شاعری پر اثر ڈالنے والے خارجی محرکات کا تذکرہ ضمناً ہو چکا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ محرکات مذکورہ پر کس قدر تفصیلی بحث کی جائے۔ جس کو قصداً سہولت کی غرض سے مؤخر کر دیا گیا تھا۔ مومن کی سیرت کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ چند ہو جیسے یہ ضروری ہے کہ ایسی حساس شخصیت اپنے ماحول کا غائر نگاہ سے جائزہ لے۔ اور حالات موجودہ پر قانع نہ ہو۔ چنانچہ جب انہوں نے ہوش سنبھالا ہوگا۔ اور اپنے گرد و پیش ایک عام سیاسی خلفشار اور مذہبی انتشار کی کیفیت دیکھی ہوگی۔ تو موجودہ صورت حال کو تا امکان بدلنے کی سعی کا جذبہ دل میں پیدا ہوا ہوگا۔ ایسی جذبہ کا مظاہرہ ان کا اس عہد کی دعوت جہاد و اصلاح میں شرکت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو اس تحریک میں عملاً شریک ہونیکا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن قلباً وہ ہمیشہ اس کے حامی و مؤید رہے۔

مذہبی جھلکیاں یہی نہیں بلکہ اس وقت سے ان کا زاویہ نظر ہی بدل گیا جس سے ان کا کلام بہت زیادہ متاثر ہے۔ دینی اور عملی رنگ تو ان پر پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ سیاسی اور اصلاحی اثرات نے اس کو اور بھی تیز کر دیا دیوان غزلیات کو کھولتے ہی۔ پہلی غزل میں حمد و نعت کے بعد یہ شعر نظر آتے ہیں

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو
دل صد پارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا

نہ رکھو بیگانہ مہر امام وقت و سنت
کہ انکار آشنائے کفر ہے اس کی امامت کا

وہ بر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی
ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا!

مقطعوں میں یہ اشارات عام ہیں

غنچہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایمان میں آتی ہے بہار

مومن تم اور عشق بتاں اے پیر و مرشد غضب ہے
یہ ذکر اور منھ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

چل کے کعبہ میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

ہم اور یہ وحشت تپش دل کے سبب سے
مومن میرے سینے پہ رہے ہے ید فنا ہاتھ

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مومن نہ سہی بوسہ یا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

حسن انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مسلمان مرجائے

ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے اگر اے مومن موجود خدا ہوتا!

یہ ملحوظ رہے کہ ان کی غزلیات میں تصوف کی سرشاریاں نہیں ملتیں۔ کیوں کہ وہ اس شغل کا اکمال طریق کتاب و سنت کے منافی سمجھتے ہیں۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف بھی لامحالہ اسی زاویہ نظر سے متاثر ہوئی ہیں۔ قصائد[۲۳] میں یہ التزام صرف ان ہی کے یہاں ملتا ہے۔ کہ ترتیب وار حمد۔ نعت۔ اور منقبت خلفائے اربعہ میں جوش عقیدت کے دریا بہائے ہیں اور حسن ادا کے موتی لٹائے ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسرے فرقوں کے مسلک پر بیجا طعن کرتے گئے ہیں۔ جو ایک مبلغ شاعر کے لئے زیبا

---

[۲۳] ۔ حضرت سید احمد رائے بریلوی۔ [۲۴] ۔ قصائد مومن مرتبہ راقم مطبوعہ الناظر پریس۔ لکھنؤ۔

نہیں۔ وہ خود مسلک کے لحاظ سے غیر مقلد ہیں۔ اور ممکن ہے کہ یہ ان کی تقلید ناپذیر طبیعت کا اثر ہو۔ انہوں نے اہل دنیا کی مدح میں صلے کی حصول کی خواہش سے کچھ نہیں لکھا۔ قطعات و رباعیات میں بھی متعدد مقامات پر مذہبی عقاید اور فرقہ وارانہ مطاعن نظر آتے ہیں۔ رہیں۔ مثنویات وان میں چند عشقیہ ہیں۔ باقی حمد۔ نعت۔ مناجات اور جہاد کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آخرالذکر مثنویوں کے چند شعر ہم بطور نمونہ پیش کئے دیتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر ارباب ذوق خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔

حمد

وہ عالم کہ معلوم ہر بات اسے — نیاز سخن بے اشارات اسے

وہ قادر کہ گر چاہے اس کا کرم — مٹادے مرے دل سے عشق صنم

وہ ناصر کہ گر اس کی امداد ہو — خیال سے مری بیخ برباد ہو!

وہ حافظ کہ آتش سے خس کو بچائے — تپ عشق سے بوالہوس کو بچائے

نعت

محمد سزائے ستائش گری — بدیع آفریں جس کی پیغمبری

وہ اُمّی و لے نقشبند علوم — کلام اس کے سب دل پسند علوم

عجب بات ہے اس کی نام خدا — کہ جیسے سخن میں کلام خدا

یہ تابش میں انجم کا پایہ نہیں — کہ ان کے ہے ظل۔ اس کے سایہ نہیں

جہاد

پلا مجھکو ساقی شراب طہور — کہ اعضا شکن ہے خمار فجور

کوئی جرعہ دے ہیں فرا جام کا — کہ آجائے لب تشنہ اسلام کا

بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبر کو جاری کروں

نہ کیوں کہ ہوں اس کام میں ناشکیب — ظہور امام زماں ہے قریب

اردو پر موقوف نہیں۔ فارسی کلام میں بھی یہی رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ چنانچہ فارسی قصائد میں بھی مومن نے اپنے قلم کو اہل دولت کی مدح سے آلودہ نہیں کیا۔ چار قصیدے تو نعت شریف میں ہیں۔ اور دو اپنے امام شاہ سید احمد رائے بریلوی کی منقبت میں۔ جن سے جوش اعتقاد کے چشمے ابلے پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کے جذبۂ حریت قومی اور غیرت طبعی کی وہ شان نظر آتی ہے جس کو دیکھ کر منکر کیلئے ایمان لانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایک قصیدے کے چند شعر جو عرفی کی زمین میں کہا گیا ہے پڑھ کر ان کی طبع غیور و حساس کی داد دیجئے۔ دیکھنا ہندوستان میں برطانوی اثر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر وہ کس طرح بے چین ہو گئے ہیں۔ اور رسول مقبول سے کس طرح فریاد کرتے ہیں

ایں میو یاں ملب رسا مدند — جان من و جان آفرینش

نکشود گرہ ز کار و فرسود — ناخن کہ بجان آفرینش

تا چند بہ خواب ناز باشی — فارغ زفغان آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست — لے فتنہ نشان آفرینش

دوسرے فارسی اصناف کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ نعوذ قطعات میں ایسے اشارے بکثرت ہیں۔ جس زمانہ میں یہ سطور سپرد قلم ہو رہی تھیں۔ ایک نکتہ شناس دوست سے ایک روز سلسلۂ گفتگو چھڑ گیا۔ کہنے لگے یہ مستبعد ہے کہ ایک خوق العادہ فعال

ملـٰ مقالہ ماتم مطبوعہ الناظر لکھنؤ

ذہنیت اس قدر مشتعل ہو کہ ہر خارجی اثر قبول کرے۔ راقم نے عرض کی کہ ([illegible]) کی یہ تعریف نہیں کہ گرد و پیش کے واقعات سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ ماحول سے متاثر ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ خاص و عام سب پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک ان تاثرات کو اپنی شخصیت کے رنگ میں رنگ لیتا ہے اور دوسرا اس سیلاب کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

راہ مجنونی دو فرہادم آمد در پیش ⁂ رفتم ایں راہ و لیکن نہ چو ایشاں رفتم

اس مختصر سے مقالہ میں کلام مومن کے تمام پہلو نمایاں کرنا ممکن تھا نہ ضروری۔ مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ ان کی زندگی اور ان کی شاعری میں کامل ہم آہنگی رہی ہے۔ اور جب تک ہمارے لئے زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی باقی ہے۔ مومن کی شاعری اور اس کے لطف کی دلآویزی کم نہیں ہو سکتی ہے۔

[حکیم مومن خاں نے غزل کے میدان میں لالہ و گل اگائے ہیں، اُن کی غزلوں میں "سخن بہ محبوب" کی پوری شان پائی جاتی ہے۔ اُن کا مزاج شاید لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھا۔ اس لئے ان کے کلام میں محبت کے چٹخارے رچ گئے ہیں ——— مومن کی شاعری سُنی سنائی اور رٹی رٹائی نہیں معلوم ہوتی، یہ ذاتی تجربے، مشاہدے، واردات اور آپ بیتی ہے جو شعر کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔

یہ سب کچھ ہے ——— مگر جہاں کہیں اُنھوں نے عشقِ ہوسناک کا کھل کر اظہار کیا ہے وہ ادب و اخلاق کی نگاہ میں استحسان و ستائش کا مستحق نہیں ہے۔ فاضل مضمون نگار نے ہوس آمیز جذبات کی اس ترجمانی کو "خلوص" سے تعبیر کیا ہے لیکن اگر ہوس بُری چیز ہے تو اُس کا "خلوص" بھی مستحسن نہیں ہو سکتا۔

رنگینی، شوخی اور پُرکاری شاعری کی جان ہے، سپاٹ شعر بالکل بے مزہ ہوتے ہیں۔ شاعر لطفِ بیان ہی کے سہارے طلسم کھڑا کرتا ہے۔ مگر ذرا سی بے احتیاطی سے یہ رنگینی اخلاق کے حدود سے گزر جاتی ہے۔

تبسّمِ زیرِ لب، تبسّم، ہنسی اور بازاری قہقہوں میں کچھ قدریں مشترک بھی ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُن میں نفسیاتی طور پر اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ایک ہی جذبہ جو پہلے مستحسن تر تھا، شدتِ اظہار کے سبب مستحسن رہ گیا اور پھر مذموم بن گیا ——— یہی حال شعر و ادب میں جذبات کے اظہار کا ہے۔ لفظوں ہی سے جامہ زیبی اور برہنگی دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

کاش! مومن خاں کے روئے تغزل پر "خلوصِ ہوسناکی" کی چھائیاں نہ ہوتیں ——— مگر مومن کے اس انداز کے شعروں کو موجودہ دور کے عریاں اور فحش "آرٹ" پر ہرگز قیاس نہ کرنا چاہئے۔

اگلے شاعروں سے جہاں کہیں اس قسم کی بھول چوک ہوئی ہے اُسے نہ تو دو اُنھوں نے اور نہ ان کے معاصرین اور دوسرے ناقدین نے "آرٹ" کا نام دیا۔ بُرائی اور گم کردہ راہی کو ([illegible]) کا لقب تو "ترقی زدگانِ دورِ حاضر" نے عنایت فرمایا ہے۔ اگر مومن زندہ ہوتے اور اُن کو توجہ دلائی جاتی تو شاید اپنے ان ہوس آمیز اشعار پر خود شرما جاتے۔]

[ماہر القادری]

علی اختر

کارل مارکس کیوں بھٹکا؟

حقیقت شعر کے آئینہ میں! سچائیاں نغمہ کی زبان سے!
تاریخ نظم کا لباس پہن کر! واقعات دل و نگاہ کے اُفق پر

آج سے تیرہ صدی پہلے ہوا جو انقلاب
جس کی رَو میں ہو گئے روشن خودی کے آفتاب

جس نے دولت کی خداوندی کو باطل کردیا
کشتیٔ مزدور کا رُخ سوئے ساحل کردیا

جس نے آئینِ غلامی پر لگائی تھی وہ ضرب
ہوگئی سر ایک ہی جنبش میں یہ صدیوں کی حرب

مسکرائے پھول، لہرائے چمن کلیاں کھلیں
زندگی کو سرمدی رعنائیاں جس سے ملیں

جس نے چھیڑا محفلِ ہستی میں وہ سازِ یقیں
زندگی جس کی لطافت آج تک بھولی نہیں

جو غریبی کے لئے تھا کامرانی کا پیام
نوعِ انساں کو پلائے جس نے آزادی کے جام

جس نے ڈھالے تازہ تر سانچوں میں آئینِ کہن
پھول کیا کانٹوں کو بھی سمجھائے اسرارِ چمن

جس نے انسانی تصور کو کیا اتنا بلند
خاک کی پتلی نے پھینکی عرشِ یزداں پر کمند

جس نے سمجھائے حیات و شادمانی کے اصول
خاک سے جس نے کھلائے سرمدی عشرت کے پھول

جس قدر دنیا میں اس کے بعد آئے انقلاب
تھے اسی طوفان کی ہلکی سی موجِ اضطراب

انقلابِ روس بھی جس نے کھنگالے شہر و دشت
تھا اسی پیغامِ فطرت کی صدائے بازگشت

فرق یہ ہے۔ تھا وہ تعمیرِ مکمل کا نظام
انقلابِ روس کے اجزا مگر ہیں ناتمام

اس کے سازوں میں نوائے سرمدی کا جوش تھا
اور یہاں انساں شرابِ موت سے مدہوش تھا

دے رہا تھا وہ بھی دنیا کو مساواتی اصول
اور اس کو بھی نہیں دولت کی سرداری قبول

شعری بھوپالی

غزل

اشک بنکر آنکھ میں ہے، درد بن کر دل میں ہے
وہ کبھی محمل کے باہر ہے، کبھی محمل میں ہے

اب کوئی ارمان باقی ہے، نہ حسرت دل میں ہے
عشق اپنی زندگی کی آخری منزل میں ہے

جستجو نے گمرہی تک تو مجھے پہنچا دیا
غالباً اتنی ہی دوری اور ابھی منزل میں ہے

دو جہاں کا غم ملے، پھر بھی تہی دامن رہے
کم سے کم اتنی تو گنجائش ہمارے دل میں ہے

اپنی جانب کھینچتی ہے عقل، عشق اپنی طرف
اک مسلسل معرکہ طوفان اور ساحل میں ہے

گردشِ پیہم کار ہے، یہ گردشِ لیل و نہار
کل جہاں تھی آج بھی دنیا اسی منزل میں ہے

ایک میری ہی محبت کا نہیں کوئی جواب
ورنہ ہونے کو تو ہر جلوہ تری محفل میں ہے

رنج و راحت سب کو ٹھکراتا ہوا چلتا ہوں میں
دو جہاں قدموں میں ہیں جب سے محبت دل میں ہے

مجھ پر الزامِ محبت، آن پہ الزامِ ستم
تجھ کو کیا معلوم ناصح کون کس مشکل میں ہے

حسن بھی افسردہ محبت بھی اداس
یہ نہیں معلوم شعری کون کس منزل میں ہے

وہ بھی آیا تھا ہمیں بیدار کرنے کے لئے　　اور یہ بھی سطح کو ہموار کرنے کے لئے
وہ بھی تھا پیغامِ آزادی غلاموں کے لئے　　اور یہ بھی جام بر بکف تشنہ کاموں کے لئے
وہ بھی تھا آئینِ آسائش غریبوں کے لئے　　اور یہ بھی رازِ عشرت بدنصیبوں کے لئے
وہ بھی سرمائے کا دشمن تھا بہ قدرِ احتیاج　　اور یہ بھی ہے حریفِ نخوتِ اورنگ و تاج

لیکن اس میں اور کچھ تھا نوعِ انساں کا مقام
اس میں اک بازیچۂ فطرت ہی ہستی کا نظام

وہ بھی وقفِ علم و دانش تھا مگر اتنا نہیں　　دانش بیدار بھی پروردۂ حسنِ یقیں
اس میں درسِ عزمِ محکم اس کی جنبش مستقل　　یہ اسیرِ آب و گِل وہ حکمرانِ آب و گِل
صنعتی تعمیر کی ہیئات پر اس کی بنا　　زندگی اور روح کی تعمیر اس کا مدعا
اس کی نظریں مرکزِ آویزشِ سود و زیاں　　اور نبضِ فطرتِ انساں پہ اس کی انگلیاں

اس کے نغمے ساز کے تاروں میں اب تک رقصاں
اس کے جلوے بے حجابی حدود و بیکراں

مارکس اُن سانچوں کا طالب تھا جو ہوں بار بہار　　جن میں ڈھل کر پھول بن جائے حیاتِ روزگار
مدتوں سے نذرِ بربادی تھا جو قومی نظام　　سلطنت کے جبر تھے اور جبر کے مارے غلام
سلطنت کے ساتھ مذہب کے غلط آئین تھے　　دہر میں جتنے معاصی ہیں وہ ان کا دین تھے
ان اصولوں سے بغاوت اس کا قومی فرض تھی　　جن کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی زندگی
اس کو اپنی قوم کے دستور سے تھا اختلاف　　اس کا نعرہ تھا یہاں ذہنی غلامی کے خلاف
کاش ہوتا مارکس ان اسرار سے آگاہ بھی　　سرمدی تعمیر ہستی کی ہے اور اک راہ بھی
اک عرب بھی آچکا ہے اس بساطِ خاک پر　　جس کی خاکِ پا کے ذرے بن گئے شمس و قمر
شست رو موجوں کو بخشا جس نے عزمِ قلزم　　جس نے چن چن کر نکالے گیسوئے دوراں کے خم
جس نے کھولے نوعِ انسانی پر اسرارِ حیات　　صبح سے جس نے ملا دی عرصۂ ہستی کی رات
اک نظر میں جس نے ذرے کو بنایا آفتاب　　جس نے توڑے بندہ و آقا کے بے معنی حجاب
عقل کو اتنی ترقی دی کہ عرفاں کر دیا　　عظمتِ شخصی کے اجزا کو پریشاں کر دیا

کاش! آئینِ محمدؐ کو بناتا رہنما
مارکس پھر راہِ ترقی میں بھٹک سکتا نہ تھا

واقف سیتاپوری

پھول اور ستارے

کوئی افسردہ کوئی چاک گریباں آیا
دل ہویا پھول ازل ہی سے پریشاں آیا

دل ملے رسوا محبت ہو گئی
گل کھلے آوارہ نکہت ہو گئی

چمن میں بادلِ ناخواستہ ہے بلبل
اسی کا نام محبت ہے آشیانے کی

وہ تو کہیے نگہِ شوق کو روکا میں نے
ابھی ٹوٹا تھا طلسم آپ کی انگڑائی کا

فرض ہے سوزِ محبت کا چھپانا ورنہ
ہم سوادِ شبِ ہجراں کو بدل سکتے ہیں

آپ کے دشت نوردوں کے یہ افسانے ہیں
راہ تاروں کو بتاتے ہیں جو دیوانے ہیں

نہ کہیے برق اسیروں کے دل کی آگ ہے یہ
لگی قفس میں بجھی جا کے آشیانے میں

کھوئے ہوئے ہیں پھر بھی وہی خضرِ راہ ہیں
دیوانگانِ عشق کو دیوانہ کیا کہیں

پوچھتے ہیں نگاہ کی تاثیر
کہہ کے بجلی گرائی جاتی ہے

کیا کہیں گے سن کے آخر اپنے دل میں اہلِ حشر
آپ فرماتے ہیں افسانہ سنانے کے لئے

دیکھنے والے سے چھپ سکتے نہ تھے انداز و ناز
جتنے بت خانوں میں دیکھا ایک ہی تصویر تھی

خیال و خواب کا افسانہ کہنے آیا ہوں
میں خود ہی اپنے کو دیوانہ کہنے آیا ہوں

چلو چلو درِ میخانہ بند ہوتا ہے
ابھی ہے دیر، میں پیمانہ کہنے آیا ہوں

عاصم جے پوری

رنگین مُشاہدہ

سنتے ہیں وہ جب مجھ سے محبت کی کہانی
دیتے ہیں اُمیدوں کو زلیخا کی جوانی

ملتی ہیں نگاہیں تو اُتر جاتے ہیں دل میں
ممنونِ تلفظ نہیں ہوتے جو معانی

وہ ہیں متبسّم تو ہے مستی کا یہ عالم
ہر شے متّرنم ہے کہ "ما اعظم شانی"

دزدیدہ نظر ہے کہ تقاضا "ارنی" کا
اندازِ تبسّم ہے کہ تفسیر "ترانی"

وہ لوحِ جبیں پر اثرِ نازشِ پنہاں
اُڑ رنگ میں بے تابیِ اندیشۂ مانی

وہ ضبطِ تبسّم کا اثر اُن کے لبوں پر
وہ موجِ گُلِ تر کی رگِ گل میں روانی

جس وقت پلٹتی ہے نظر اُن کے نظر سے
ہوتی ہیں وہ باتیں نہیں ہوتیں جو زبانی

سبزہ ہو لبِ آب ہو وہ ہوں مرے نزدیک
دیکھے کوئی اُس وقت طبیعت کی روانی

وہ ہیں نظر افروز تو عاصم کی نظر میں
ہر چیز دل آویز ہے ہر رُت ہی سہانی

تین تبسّم ایک آنسو

ہے پاس رازِ عشق مگر اس کا کیا علاج
آنکھیں ہیں انبساطِ تمنّا لئے ہوئے

چھلکا رہے ہیں جب سے وہ دل میں گلابیاں
موجِ نفس ہے نکہتِ صہبا لئے ہوئے

چھائی ہوئی ہیں کون و مکاں پر اُداسیاں
آ جائیے صراحی و مینا لئے ہوئے

جز چشمِ ترا دا نہ ہوا حرفِ آرزو
وہ بھی تری نظر کا سہارا لئے ہوئے

پیمانے

کیف بھوپالی

اللہ! وہ اُن کا عزمِ سفر سینہ میں ابھی تک دھڑکن ہے
آنکھوں میں ابھی تک تاریکی، کانوں میں ابھی تک سن سن ہے

یہ خواب کی دنیا کیا کہیے، موہوم امیدوں کی جنت
رہنے کو نہیں اک ڈالی بھی کہنے کو ہمارا گلشن ہے

اے اہلِ نظر! اے دل والو! میں کونسی بندش نرم کروں
اک ہاتھ میں دونوں عالم ہیں اک ہاتھ میں اُن کا دامن ہے

نگاہِ ناز جو دیکھی جھکی جھکی میں نے
نہ ماننے کی بھی ہر بات مان لی میں نے

سنی جو پاؤں کی آہٹ تو جام پھینک دیا
نظر ملی تو صراحی بھی توڑ دی میں نے

دہائی دے کے مغنی کا ہاتھ روک دیا
اک آہ کھینچ کے مضراب چھین لی میں نے

بڑھے وہ دامنِ رنگیں سے پونچھنے آنسو
جب آستین بھی اپنی نچوڑ لی میں نے

اتنی سی خطا پر کہ انھیں پیار سے دیکھا
آنکھوں کو تصور کی سزا دے کے گئے ہیں

اللہ انھیں نیند مبارک ہو جو مجھ کو
راتوں کو تڑپنے کا مزا دے کے گئے ہیں

جنگل کی طرح رات، پہاڑوں کی طرح دن
کیا کیا مری ہستی سے سوا دے کے گئے ہیں

پھر کیوں یہ مجھے موت کے آتے ہیں پسینے
جب کیفؔ وہ دامن کی ہوا دے کے گئے ہیں

مظہر صابری

حقائق

مجاہدوں پہ بہر گام رحمتوں کا درود
نمازِ صوفی و ملا فقط قیام و قعود

یہ سحر کاری و اندازِ ساحری تا کے
دلیلِ آمدِ موسیٰؑ ہے سامری کی نمود

مجھے ہے معرکہ درپیش، مجھ کو ہیں درکار
بہادروں کے عساکر، مجاہدوں کے جنود؟

ہے روحِ دہر کو پھر ایک بت شکن کی تلاش
بتوں کے لب پہ ہے پھر نعرۂ انا المعبود

فقیر کے لئے نانِ شعیر بھی نایاب
غنی کے واسطے صہبائے ناب بھی موجود

الجھ نہ پیچ و خمِ رہگزارِ منزل میں
قدم بڑھا کہ ہے نزدیک منزلِ مقصود

راحت مولائی مرادآبادی

دو شعر

زندگی موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے
صبح کا وقت ہے اور شام ہوئی جاتی ہے

دل کسی طور محبت میں بہلتا ہی نہیں
کوششِ حسن بھی ناکام ہوئی جاتی ہے

(وہ مصرعے جو خود مستقل شعر ہیں)

ع آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں (احسان دانش)

ع دل سلامت ہے تو مشکل مری آساں کیوں ہو (صابر دہلوی)

ع جتنی صبحیں ہو چکی ہیں آج سب کی شام ہے (جادو بدایونی)

ع زیب دیتا ہے ہمیں دشمن ایماں ہونا (ملک حبیب احمد)

ماہر القادری

مزدور سے!

تجھ کو کچھ لوگ ملیں گے جو کہیں گے تجھ سے
آ ادھر آ کہ ترے غم کا مداوا کر دیں

تیری قسمت کے ستاروں کو تجلی دے کر
تیری راتوں میں اُجالا ہی اُجالا کر دیں

تیری کشتی ہے بہت روز سے طوفانوں میں
اس کو ہم عشرتِ ساحل سے شناسا کر دیں

ہم کہ مستقبلِ عالم پہ نظر رکھتے ہیں
ہم اگر چاہیں تو امروز کو فردا کر دیں

روس سے بھوک کی ہم لیکے دوا آئے ہیں
اے مریضو! ادھر آؤ تمہیں اچھا کر دیں

ان کی باتوں میں نہ آنا کہ بہ نامِ تریاق
زہر کے جام مریضوں کو پلا دیتے ہیں

ان کی دُنیا ہے فقط نفس کی خواہش کا ظہور
یہ تو انسان کو حیوان بنا دیتے ہیں

ڈال کر ذہن میں کچھ مبہم و دلچسپ شکوک
کفر و الحاد کے رستے پہ لگا دیتے ہیں

ان کی محفل میں نہ ایمان ملے گا نہ یقین
ان چراغوں کو تو پہلے ہی بجھا دیتے ہیں

صرف روٹی کے مسائل کو نمایاں کر کے
چشمِ انساں سے حقیقت کو چھپا دیتے ہیں

اُن کا وجدان ہے بیمار تو مدقوق ضمیر
خوب و ناخوب کی تمیز مٹا دیتے ہیں

قدرِ اخلاق بدلتے ہیں کبھی قدرِ جمال
زندگانی کو فقط کھیل بنا دیتے ہیں

یہی وہ لوگ ہیں جو سُرخ سویرے کیلئے
خونِ مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں

ماہر القادری

کاش

میاں بیوی میں بحث نہیں تکرار ہو رہی تھی ـــــــــ بات چیت، پھر دلیلیں اس کے بعد نوک جھونک یہاں تک کہ طنز و تعریض اس دوراہہ پر پہونچ گئی جہاں سے تیزی و تلخی اور جنگ و جدال کے راستے پھٹتے ہیں، بات میں بات نکلتی آرہی تھی اور ترشروئی اور گرم گفتاری کا پارہ تدریجاً بڑھ رہا تھا ـــــــــ یہ شوہر اور بیوی تھے، شریکِ زندگی، پورے تیس سال سے ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی! مسکراہٹوں ہی میں نہیں آنسوؤں میں بھی انھوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا ـــــــــ مگر آج کچھ ایسا رنگ پیدا ہو چلا تھا کہ گر ما گرمی کا یہی عالم رہا تو تیس سال کے تعلقات کچے دھاگے کی طرح آن کی آن میں ٹوٹ جائیں گے، دونوں کے تیور روکھے اور خشونت آلود ہو گئے تھے۔

قاضی جی کے ماتھے پر پسینہ آ آجاتا، وہ برابر یہی کہہ رہے تھے کہ میں جوان بیٹی کو غیر مرد کے آگے قیامت تک بے پردہ نہ ہونے دوں گا ہاں! ہاں! مجھے فریدہ کا حرف شناس بلکہ جاہل رہنا منظور ہے مگر بے غیرتی کسی قیمت پر گوارا نہیں! دنیا میں تھوڑی سی نمود اور آسائش کے لئے میں اپنی بیٹی کی آخرت برباد کرنا نہیں چاہتا، تعلیم کی وہ تمام اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں چولھے میں جھونک دینے کے قابل ہیں۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے عورت کو شرم و حیا کے حدود سے گزرنا پڑے، مذہبی حمیت اور خاندانی شرافت میری غیرت کو ہوکا دے کر کہہ رہی ہیں کہ دیکھنا! شیطان کے دھوکے بڑے خوشنما ہوتے ہیں، کہیں تو اُن کے دھوکے میں آکر اپنی آبرو نہ گنوا دینا۔

قاضی جی کی بیوی شوہر کی ہر بات کی کاٹ کر رہی تھی، وہ اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ فریدہ کو گائے بیل کی طرح بے زبان اور جاہل نہیں دیا جائے گا، "اپنے زمانے کی باتیں اس نئی دنیا میں نہیں چل سکتیں، اگلے زمین آسمان ہی نہیں رہے "پچھلے حالات ہی بدل گئے جہالت کا اندھیرا جا رہا اب علم کے اُجالے کا دور دورہ ہے، عورتیں اُس اُجالے سے محروم نہیں رہ سکتیں، آخر یہ بڑے بڑے آدمی جن کی لڑکیاں غیر مردوں سے تعلیم حاصل کرتی ہیں کیا سب کے سب بے غیرت اور بے حیا ہیں، بس ساری غیرت اور خودداری تمہارے ہی حصہ میں آگئی ہے (قاضی جی کے چہرے کا رنگ غصہ کے مارے اور گلنار ہو گیا) آدمی کو سوچ سمجھ کر کوئی بات منہ سے نکالنی چاہیئے ـــــــــ اور یہ بھی کہا گیا کہ تعلیم یافتہ لڑکی کو اچھا بر مل جاتا ہے، ہمارے پڑوس میں شیخ جی بیچارے کی کیا اوقات ہے، بہت سے بہت سو روپیہ مہینہ کی آمدنی ہوگی مگر اُن کی لڑکی کا انٹرنس پاس ہوتے ہی ایک ڈپٹی کلکٹر کے ساتھ بیاہ ہو گیا، میں کہہ رہی ہوں کہ فریدہ کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں میری رائے چلے گی، میں اس کی ماں ہوں، تم اپنے بیٹوں کی خبر لو اُن کی کسی بات میں اگر میں بولوں تو جو چور کا حال سو میرا حال!

اُس دن کی گفتگو انتہائی تلخی اور ترشروئی پر ختم ہوئی۔ دونوں اپنی بات سے ایک انچ ہٹنے کے لئے تیار نہ تھے، دلیلوں کی جگہ طنز و تشنیع نے لے لی یہاں تک کہ ایک دوسرے کے خاندان پر حملے ہونے لگے ـــــــــ بڑے بوڑھوں کی کمزوریوں کی یہ ریسرچ ایک ہنگامہ بن جاتی بلکہ بن گئی تھی، وہ تو یہ کہئے محلہ کی عورتیں ایکا ایکی ملنے کے لئے آگئیں اور اُن کی آمد نے اس لڑائی کو ملتوی کر دیا۔

کئی دن تک اسی مسئلہ پر بحث ہوتی رہی ــــــــ قاضی جی کی بیوی نے جب دیکھا کہ بڑے صاحب کسی طرح نرم پڑتے دکھائی نہیں دیتے تو اس نے ایک اور پینترا بدلا ــــــــ کہنے لگی میرے مہر کا پندرہ ہزار روپیہ سیدھے ہاتھ سے میرے حوالہ کر دو، میں اپنی بچی کو لے کر اپنے بھائی کے یہاں جاتی ہوں، چھوٹے بچوں کو تم سنبھالنا، مجھ سے یہ روز روز کا جھینکنا نہیں دیکھا جاتا، تم بے فکری سے اپنے گھر میں شرم و غیرت کے دئے جلایا کرنا۔

بیوی کے اس الٹی میٹم نے قاضی جی کے حواس باختہ کر دئے، بنا بنایا گھر ہی بگڑا جا رہا تھا، بیوی اپنی بات پر جمی ہوئی تھی، قاضی جی کی خشمگیں نگاہیں بیوی کے ماتھے کی ایک سلوٹ کو بھی ہموار نہ کر سکیں، عزیز و اقارب نے بھی سمجھایا کہ حضرت! گھر میں پوری احتیاط اور نگرانی کے ساتھ اگر گھنٹہ دو گھنٹہ کوئی ماسٹر آپ کی لڑکی کو پڑھا دیا کرے تو اس میں غیرت پر آنچ آنے کی کیا بات ہے؟ ــــــــ قاضی جی کو ہتھیار ڈال دینے پڑے، تریاہٹ کی جیت ہوئی، مرد کی ضد ہار گئی، بیچارے قاضی جی نے فولادی عزم رکھنے کے باوجود گردن ڈال دی، مصلحتوں اور نزاکتوں کی خندقوں کو پھاند جانے کی ان میں ہمت نہ تھی، قاضی جی کے لئے یہ زہر کا گھونٹ تھا جو انھیں پینا پڑا، ان کی مرضی کے خلاف سب کچھ ہوا، بیوی نے دھمکیوں کی سنگین دکھا کر غریب شوہر کو راضی کیا، یہ رضامندی جبر و تشدد کی رضامندی تھی، زبان خاموش تھی مگر دل چیخ رہا تھا۔

جوانی میں ہر صورت بھلی لگتی ہے اور فریدہ تو دید و زیب اور خوش منظر بھی تھی اور شباب نے ان فتنوں کو اور قیامت بنا دیا وہ بات کرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے سچ مچ کلیاں چٹک رہی ہیں اور اس کی مسکراہٹ ــــــــ گویا بجلیوں کی شوخیوں کا جوہر نکال کر قدرت نے اس کے ہونٹوں پر جما دیا تھا، قد موزوں پر ہر قسم کا لباس پھا دیتا ــــ دوشیزگی اس کے لئے دعائیں کرتی کہ:ــ

خدا کرے یہ نگاہِ جہاں سے دور رہے
کہ اس زمانہ میں ہے عصمت نظر نایاب

وہ پہلے پہل جب ماسٹر صاحب کے سامنے آئی تو فرط غیرت سے اس کی پیشانی پسینہ میں ڈوب گئی، اس کی آنکھیں حیا کے مارے زمین میں گڑی جاتی تھیں، اس کے پاؤں بار احساس سے بوجھل ہو گئے، کئی دن تک یہی حالت رہی، دبا دبا لہجہ، بھنچی بھنچی آواز، جھکی جھکی نگاہیں ــــــــ برسات میں کوئی پرندہ بھی اتنا سمٹ کر اور بھنچ کر نہ بیٹھتا ہوگا۔

ماسٹر صاحب نے بھی چند دن خوب احتیاط برتی، فریدہ کو بات بات میں "بیٹی" کہہ کر پکارتے، سنجیدگی کا یہ عالم جیسے ان کے لبوں نے آج تک مسکراہٹ کی صورت نہیں دیکھی، خشک اور روکھی سوکھی باتیں ــــــــ گھر کے لوگوں کو پورا اطمینان ہو گیا کہ ماسٹر صاحب سیدھے سادے اور نیک آدمی ہیں، ان پر اعتماد نہ کرنا خود اپنے نفس کی چوری اور ضمیر کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔

نگرانی کی باگیں ڈھیلی کر دی گئیں، احتیاط کے بند کھول دئے گئے، احتساب کی کمندیں سمیٹ کر رکھ دی گئیں ــــــــ ماسٹر صاحب نے فریب کامیابی پر قہقہہ لگایا، خوشی کا قہقہہ جس میں آواز کم اور پھیلاؤ زیادہ تھا، پہلا تیر ہی نشانہ پر ٹھیک بیٹھا ــــــــ کامیاب آغاز، فاتحانہ اقدام! کامیابیوں کی داغ بیل پڑ گئی، خوش آیند مسرتوں کی نیو رکھ دی گئی!

شرم و حیا کی شدت قرب نامحرم کے فتنہ کا کب تک مقابلہ کرتی، جھکی ہوئی نگاہیں اٹھنے لگیں، خموش لبوں کو گویائی چھونے لگی ــــ تبسم آمیز گویائی! مگر ابھی یہ مسکراہٹ جذبہ سے خالی تھی، اس شراب میں ابھی سکر پیدا نہیں ہوا تھا، جذبات کا ساز کسی چھیڑ کے انتظار میں تھا۔

ماسٹر صاحب کی باتیں شروع شروع میں خشک اور بے مزہ تھیں مگر اب بہت ہی دلچسپ اور لچھے دار ہو گئیں، فریدہ باتوں کے جھنکاروں میں دلچسپی لیتی، ماسٹر صاحب جان جان کر گفتگو میں ظرافت اور مزاح کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ماسٹر صاحب تجربہ کار،

جہاندیدہ اور پرانے گھاگ تھے، اُن کی عمر ابھی "غزالوں" کی گلہ بانی میں گزری تھی، وہ پورے احتیاط کے ساتھ ایک ایک انچ آگے بڑھ رہے تھے، باتیں مسکراہٹوں سے اور مسکراہٹیں قہقہوں سے بدلیں، یہانتک کہ چھیڑ چھاڑ کا رنگ پیدا ہوگیا۔

ایک دن انگریزی نظموں کی کتاب کا سبق ہو رہا تھا، ایک شعر آیا جس کا مفہوم یہ تھا "جب میں گھٹاؤں اور دھوئیں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی محبوبہ کی زلفوں کے پیچ یاد آتے ہیں۔" ماسٹر صاحب نے اس شعر پر فریدہ کے بالوں کو انتہائی پرشوق نگاہوں سے دیکھا جذبات اُن کی آنکھوں میں جھوم رہے تھے، فریدہ محسوس کرکے بے اختیار مسکرا دی اس مسکراہٹ میں احساسِ تحسینِ حسن بھی شامل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب سبق پڑھا کر چلے گئے، فریدہ اپنے کمرے میں آئی اور بار بار آئینہ دیکھنے لگی، ماسٹر صاحب کی شوق آمیز نگاہیں آئینہ کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں، دوسرے دن جب ماسٹر صاحب سے سبق پڑھنے کے لئے نیچے کے کمرے میں گئی تو اُس کے بالوں میں کئی پیچ اور متعدد حلقے نظر آرہے تھے، ماسٹر صاحب کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلنے لگا کہ زلفوں کی یہ نرم و نازک کمندیں میرے بامِ شوق پر ڈالنے کے لئے تیار کی گئی ہیں اور کنواں خود پیاسے کی طرف بھاگا چلا آرہا ہے، ہوس نے مسکرا کر انگڑائی لی اور جذبات کو جمائیاں سی آنے لگیں۔

حجاب و بیگانگی کی دیواریں نیچی ہوتی چلی جارہی تھیں، دوشیزگی جس کی گھٹی میں شرم و غیرت پڑی ہوتی ہے، بے باکی اور بے تکلفی کی طرف مائل تھی سر کا دوپٹہ اکثر ڈھلکا رہتا، ذرا ماسٹر صاحب نے کوئی ہنسی مذاق کی بات کہی اور فریدہ کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگی، یہاں تک کہ:-

فرطِ شرم و غیرت سے جو کبھی نہ اٹھتی تھیں آج اُن نگاہوں سے زینتیں ہیں محفل کی

ماسٹر صاحب پڑھانے کے لئے آتے تو اُن کی چپل سنتے ہی فریدہ تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آتی، جلدی سے کتابیں اور کاپیاں اٹھاتی اور آن کی آن میں ماسٹر صاحب کے پاس پہونچ جاتی، گھر والے خوش تھے کہ فریدہ کو پڑھائی سے غیر معمولی دلچسپی ہے یہی شوق رفتار میں تیزی پیدا کر دیتا ہے ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ فریدہ ذہین تھی، لکھنے پڑھنے کا بھی اُسے شوق تھا ذہین طالب علم عام طور پر کام چور ہوتے ہیں مگر فریدہ ذہانت کے ساتھ ساتھ محنتی بھی تھی، نوشت و خواند کے معاملہ میں انتہائی فرض شناس! اُس کا بس چلتا تو چوبیسوں گھنٹے پڑھنے لکھنے میں صرف کر دیتی! لیکن ماسٹر صاحب کے آتے ہی فریدہ کا مضطرب ہو جانا شوقِ تعلیم سے زیادہ اُس کے دلی جذبات کا پتہ دیتا تھا۔ دو طرح کی دلچسپیاں آپس میں مل جل گئی تھیں، دو قسم کے شوق ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے ——— اسی شوق اور محنت کی بدولت اُس نے بہت ہی کم مدت میں پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔

پڑھائی کا زیادہ حصہ شعروں کی تشریح میں صرف ہوتا، عاشقانہ اشعار اس لطف کو دوبالا اور اس شراب کو دو آتشہ بنا دیتے، کوئی اخلاقی شعر آجاتا تو ماسٹر صاحب اُس سے بہت جلد گزر جاتے مگر محبت آمیز بلکہ یوں کہئے کہ ہوسناک شعروں کی تشریح کرتے وقت ماسٹر صاحب کی زبان گویائی کا فوارہ بن جاتی جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتی، فریدہ کے کانوں میں ان باتوں سے رس پڑتا، سامعہ اس لچھے دار تفسیر میں لطف محسوس کرنے لگا۔

دو ڈھائی گھنٹہ کی یہ انجمن آرائی اپنا اثر چھوڑ جاتی، فریدہ کے بے چین جذبات نچلے کس طرح رہتے، ادھوری لذت اور ناتمام لطف چاہتا تھا کہ یہ لے کسی طرح ٹوٹنے نہ پائے ——— قریبی رشتہ داروں کے نوجوان لڑکے جب اُس کے یہاں آتے تو فریدہ اُن سے انتہائی گھل مل کر باتیں کرتی، ریاضی اور جغرافیہ کے ذکر میں بھی دلچسپی کی راہیں نکل آتیں، نگاہوں اور باتوں کا فتنہ پوری طرح پاؤں پھیلا رہا تھا ہوس بڑھاوے دے رہی تھی کہ جوانی میں آدمی کو کچھ نہ کچھ تو رنگین ہونا چاہئے، خشک اور بے مزہ جوانی سے تو خودکشی اچھی! شروع شروع میں ضمیر نے سختی کے ساتھ ٹوکا کہ نادان لڑکی! یہ کیا کر رہی ہے، نفس کے دھوکے بہت ہی پرپیچ اور باریک ہوتے ہیں! خدا کے لئے اپنے کو اس

گراوٹ سے بچا ـــــــ مگر نفس کہتا کہ جوانی کو شوق و دلچسپی کے ان ہنگاموں سے خالی نہ ہونا چاہیئے، اب رہا گناہ و ثواب کا معاملہ تو ابھی ساری عمر پڑی ہے، توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا، بڑے ہوکر توبہ کر لینا، اور مجھے تو اس دنیا میں سبھی پاپی اور گنہگار نظر آتے ہیں، اچھوتا کون ہے، کسی کا صرف دامن تر ہے اور کوئی سر سے پاؤں تک ڈوبا ہوا! تھوڑی بہت اونچ نیچ ہر کسی سے ہو جاتی ہے، شباب کے تقاضوں کو ٹھکرا دینے کا یہ مطلب ہے کہ زندگی کا پہلے اٹھان ہی میں گلا گھونٹ دیا۔

ٹوکے جانے پر

جاڑے کی رت بیت چکی تھی، گرمی منزلِ آغاز میں تھی، صبح و شام خوشگوار اور راتیں خنک ہوتی تھیں، مگر دوپہر میں اچھی خاصی گرمی ہو جاتی ـــــ اسی موسم کی ایک دوپہر میں ماسٹر صاحب فریدہ کو پڑھانے کے لئے آئے، بہت دور سے آنا پڑا، تیز دھوپ اور اس پر سائیکل چلانے کی محنت، انھوں نے گھر میں قدم رکھتے ہی پانی مانگا، فریدہ نے پانی کا گلاس لاکر دیا" ماسٹر صاحب غٹ غٹ پانی پی رہے تھے، فریدہ اُن کے سامنے حیا کانہ انداز میں کھڑی تھی، ماسٹر صاحب نے پانی پی کر گلاس پکڑایا، سخت انگلیاں نرم پوروں سے مس ہوئیں، فریدہ مسکرانے لگی، ماسٹر صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی، اتنے میں فریدہ کے بڑے بھائی اس کمرے میں آگئے۔ انھوں نے دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر یہ بھی محسوس کیا کہ اُن کے آتے ہی دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں نے یکبارگی دم سا توڑ دیا ـــــ نادان سے نادان آدمی بھی اس نزاکت کو سمجھ سکتا تھا، فریدہ کے بھائی کے تیوروں سے ناخوشی برسنے لگی، ان کے سیدھے ہاتھ کی مٹھی آپ ہی آپ بھینچ کر رہ گئی۔

ماسٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد انھوں نے فریدہ کو ٹوکا اور اس بات کا ذکر نکالا تو اس لڑکی نے وہ فیل مچائے کہ خدا کی پناہ! وہ دن بھر روتی رہی، پل بھر کے لئے بھی آنسو نہ تھمے، آنکھیں روتے روتے لال ہو گئیں۔ کوئی بے گناہ اور معصوم بھی اتنا اثر نہیں لے سکتا ـــــ حیلہ سازی اور ہوسناکی کا ڈرامہ کامیابی پر ختم ہوا اور گھر کے لوگوں نے اُلٹا اُس کے بھائی کو ڈانٹا کہ جوان اور معصوم لڑکی پر تمھیں اس قسم کا شبہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" باپ اور بیٹی اور بھائی بہن بھی بات کرتے اور چیز پکڑاتے میں مسکرا دیا کرتے ہیں، بھائی نے جب تک معافی نہ چاہ لی اُس وقت تک فریدہ کی ناخوشی کا پارہ ایک ڈگری بھی نیچے نہ اترا ـــــ بناوٹ اپنی "جے" آپ ہی پکارنے لگی!

اُس روز سے گھر باہر کے لوگ فریدہ کو کسی بات پر ٹوکتے ہوئے ڈرنے لگے کہ ہم نے کچھ کہہ دیا تو اُسی دن کی طرح قیامت نازل ہو جائے گی، نامحرم مگر رشتہ دار نوجوانوں سے فریدہ اب زیادہ بے تکلفی کے ساتھ ملتی جلتی، یہاں تک کہ تنہائی میں چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی، گھر والے پندرہ سال کی جوان اور خوبصورت لڑکی کو ابھی نادان، بھولی بھالی اور معصوم ہی سمجھ رہے تھے، یہ خوش فہمی حجابِ اکبر بنی ہوئی تھی ـــــ اور فریدہ ہر نگاہِ ہوسناک اور چشمِ تماشا کو اپنی بارگاہِ حسن میں قصیدہ خواں سمجھتی، لوگوں کے شوق و توجہ کے ساتھ دیکھنے سے وہ خوش ہوتی کہ میرے حسن میں بلا کی کشش اور قیامت کی جاذبیت بلکہ مقناطیسیت پائی جاتی ہے، یہ جذبہ اُسے ہر مرد کے سامنے لے آتا، نظر بازی کا یہ شوق فراواں ہوتا جا رہا تھا۔

فریدہ کے باپ قاضی جی کورٹ آف واڈرز کے محکمہ میں منیجر تھے۔ قاضی جی بات کے سچے، معاملہ کے کھرے اور اصول کے پکے تھے، ایک انگریز کلکٹر سے اُن کی ان بن ہو گئی، بات ذرا سی تھی ـــــ یعنی یہ کہ صاحب بہادر قاضی جی کے علاقہ میں قاز کا شکار کھیلنے کے لئے آئے، اتفاق کی بات کہ متواتر تین دن تک وہاں کی جھیل میں ایک قاز بھی نظر نہ آئی۔ بس اس پر صاحب بہادر بگڑ گئے کہ منیجر صاحب (قاضی جی) نے مجھے غلط اطلاع کیوں دی کہ یہاں قازیں بکثرت ہیں۔ جانور بگڑ جائیں تو انھیں سنبھالا جا سکتا ہے مگر ان صاحب بہادروں کے عتاب بے سبب اور رنجش بے وجہ کا دور کرنا کسی کالے آدمی کے بس کا روگ نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ قاضی جی کو دوسرے ضلع میں

تبادلہ کرا کے جانا پڑا۔ وہ غریب ایسا نہ کرتے تو نقصان اٹھاتے، قاضی جی بہت دن سے اس ضلع میں تھے، یہاں اُن کا گھر سا ہو گیا تھا، عزیز رشتہ دار بھی اُن کے سہارے روزگار سے لگے تھے، قاضی جی کو یہاں سے جانا شاق گذر رہا تھا وہ دل ہی دل میں جھنجلا رہے تھے کہ ان نامراد قازوں نے مجھے گھر سے بے گھر کیا، جن دنوں میں صاحب بہادر شکار کھیلنے کے لئے آئے تھے اگر یہ قازیں ذرا نام و نمود کے لئے اُدھر سے گذر بھی جاتیں تو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

فریدہ نے وہاں سے جاتے ہوئے کوئی خاص دل گرفتگی محسوس نہیں کی، نہ اُسے ماسٹر صاحب سے عشق تھا اور نہ کسی اور سے محبت تھی، لذتِ نفس نے شوق و دلچسپی کی انجمن سجا رکھی تھی سو اُس کے بارے میں فریدہ کو پورا اطمینان تھا کہ اُس کے حسن و شباب کی بدولت یہ انجمن ہر جگہ جم سکتی ہے۔ شمع جہاں بھی روشن ہوگی، پروانے ہجوم کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔

میکہ سے سسرال تک

قاضی جی بہت ہی ملنسار، متواضع اور نیک طبیعت تھے، چند ہی دن میں بالکل نئی جگہ کے لوگوں سے اُن کی کافی جان پہچان ہو گئی، عہدیداروں سے بھی ربط بڑھنے لگا اور شہر کے معززین بھی قاضی جی سے شناسا ہو گئے ——— اور کوئی کوئی دوست بھی بن گیا لوگ کہا کرتے تھے کہ قاضی جی کی آنکھ میں موہنی ہے جو دیکھتا ہے بس رام ہو جاتا ہے!

فریدہ کی تعلیم کا مسئلہ اب گھر والوں کے پیشِ نظر تھا۔ قاضی جی، شہر کے سامنے فریدہ کے بے پردہ ہو کر تعلیم حاصل کرنے ہی کے خلاف تھے، کالج کے نام سے تو وہ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے، مگر اب فریدہ پہلی جیسی فریدہ نہ تھی، اُس میں آزادی اور بے باکی کے جذبات پیدا ہو چلے تھے، وہ کہا کرتی تھی کہ میں اپنی دُنیا اپنی قوتِ بازو اور فکر و نظر کے سہارے بنانا چاہتی ہوں، مجھ سے زیادہ بہتر کوئی بھی میرے مستقبل کی بہتری کے لئے نہیں سوچ سکتا۔

کالج میں داخلہ کے قریب قریب سب لوگ خلاف تھے مگر فریدہ کے سامنے سب کی دلیلیں اور ناخوشیاں دھری کی دھری رہ گئیں، کالج کی زندگی کی کوئی ذرا سی بھی برائی کرتا تو وہ رو دیتی، غصہ ہو جانا، آنسو بھر لانا اور رو دینا فریدہ کا آزمایا اور بارہا کا تجربہ کیا ہوا حربہ تھا، یہ کبھی خالی نہ گیا۔

فریدہ کی بات رد نہ کی جا سکی، اُس کی ضد پوری ہو کر رہی، سب لوگ اپنا سا منہ لیکر رہ گئے، بہت ہی قریب کی ایک دو عزیز عورتوں کو فریدہ نے اپنا ہمنوا بھی بنا لیا تھا یہ اُس کی وکالت کرتیں ——— فریدہ کالج میں داخل ہوئی، مدت کا ارمان پورا ہوا، برسوں کی اُمید بر آئی، اُس کے شوق کا یہ عالم تھا کہ جیسے وہ کالج میں نہیں جنت فردوس اور بہشت بریں میں جا رہی ہے، کالج کے در و دیوار دیکھ کر وہ خوش ہوتی کہ زندگی تو آج کے دن سے شروع ہوئی ہے۔ اب سے پہلے کی زندگی تو ایک طرح کی قید تھی، یہاں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی وہ تمنائی تھی، خوبصورتی اور ذہانت کی بدولت فریدہ کو کالج کی سوسائٹی نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

کالج کا ماحول فریدہ کی افتادِ طبع سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا، تعلیم کے اس میدان میں شوق و دلچسپی لذت اور چٹخاروں کی بہت سی پگڈنڈیاں پہلے سے بنی بنائی موجود تھیں اور کچھ راستے بنتے اور بگڑتے رہتے تھے، ماسٹر صاحب نے جذبات کی جس آتشِ خاموش کو ہوا دی تھی وہ یہاں خوب خوب بھڑکی۔

زمانہ چھلاوے کی طرح ہے کہ آنکھ جھپکی اور کہیں سے کہیں پہونچ گیا چار سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی مگر وقت کی تیز رفتاری نے اس مسافت کو پلک مارتے طے کر لیا، فریدہ نے بی۔ اے کے امتحان میں بدرجہ اعلیٰ کامیابی حاصل کی، جس نے سُنا قاضی جی کو مبارکباد دی، قاضی جی بیٹی کی تعریفیں سُن کر خوش تو ہوتے مگر اندر سے دل بند بند سا رہتا۔ اس مسرت میں ایک اُلجھن بھی شامل تھی۔

زبیدہ کی شادی کے بہت دن سے پیام آ رہے تھے، مگر قاضی جی نے یہ کہہ کر سب کو جواب دیدیا کہ بی۔ اے سے پہلے ہم اس مسئلہ پر بات چیت کرنا بھی نہیں چاہتے۔ لڑکی کی ابھی ایسی عمر ہی کیا ہے، پوری طرح اُس میں سمجھ تو آ جائے کہ وہ گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے، نادان اور کمسن بچیاں بیاہے جانے کے بعد گڑیا ہی رہتی ہیں ـــــ یہ الفاظ ادا تو ہوئے قاضی جی کی زبان سے مگر یہ اُن کی بیوی کے بتلائے ہوئے بلکہ تصنیف کئے ہوئے الفاظ تھے۔

یوں آنے کو تو زبیدہ کے لئے کتنے ہی پیام آئے مگر اُس کے گھر والوں نے صرف ایک رشتہ کو پسند کیا، یہ بنک کے ایک منیجر کا پیام تھا، لڑکے کی عمر پچیس۲۵ سال سے بھی کم تھی، طرفین میں گفتگو ہوئی، چند شرطوں پر کچھ بحث بھی رہی، دونوں جانب کے لوگ اس کوشش میں تھے کہ ہماری بات اونچی رہے چاہے دوسرے کی بات نیچی ہو جائے، ہر آدمی زندگی میں یا تو بیوپار کرتا ہے یا پھر جوا کھیلتا ہے۔

بالآخر شادی کی بات طے ہو گئی، تاریخ مقرر ہوئی، یہاں تک کہ بارات آ گئی، پُر تکلف دعوتیں اور دلچسپ محفلیں رہیں ـــــ اس کے بعد بدا (وداع) جدائی مفارقت! اسی دن کے لئے لڑکی کو پالتے ہیں کہ اپنی آنکھوں کا نور دوسرے کے گھر کا اُجالا بنے۔

زبیدہ میکے سے شام کے دُھندلکے میں رخصت ہوئی، گھر میں ایک کہرام سا بپا تھا۔ چھوٹے بڑے سب رو رہے تھے، قاضی جی کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل آنسو بہا رہا تھا، زبیدہ بھی بہت زیادہ متاثر تھی، آنکھوں کا سرمہ آنسوؤں میں حل ہو کر رخساروں پر جم سا گیا تھا، یہ غم تو ہر لڑکی کی قسمت میں لکھا ہے اس سے نہ شاہزادی بچ سکتی ہے اور نہ فقیرزادی۔

ساحل اور طوفان

زبیدہ بھاری جہیز لے کر سسرال میں پہونچی، مسکراہٹوں اور شادمانیوں نے اس کا استقبال کیا، محلہ بھر میں چرچے ہونے لگے کہ شیخ کرامت علی کے گھرانے میں چاند جیسی بہو آئی ہے، لکھی پڑھی، سلیقہ مند، خوش مزاج اور قدرے سنجیدہ بھی!

زبیدہ کا شوہر ظفر آزاد خیال تھا، مغربیت اُس کے مزاج اور طبیعت میں رچ گئی تھی، کوٹ پتلون میں ہر وقت کسا بندھا رہتا، اور سگرٹ تو اُس خدا کے بندے کے ہونٹوں سے شاید ہی کبھی جدا ہوتی تھی، بس ہر وقت کش لگا لگا کر دھوئیں کے پیچ بنائے جاتا، دوست احباب اُسے "انجن" کہہ کر پکارتے تھے۔

شادی کے چند دن بعد ظفر نے زبیدہ سے کہا کہ میں تمہارے اس پردے وردے کا قائل نہیں ہوں، شکر اور اناج کے بورے کی طرح برقعہ میں پھنسا ہوا بدن مجھے ایک قسم کا مذاق معلوم ہوتا ہے، تہ کر کے رکھ دو اس سیاہ کفنی کو! اور .... ! زبیدہ نے ظفر کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ میں تو آپ کا حکم ماننا اپنا فرض سمجھتی ہوں مگر آپ کے گھر کے لوگ کیا کہیں گے؟ آپ پر انگشت نمائی ہوگی، مجھ سے زیادہ آپ پر انگلیاں اٹھیں گی کہ شوہر کی مرضی نہ ہوتی تو بھلا بیوی کیا بے پردہ ہو سکتی تھی۔

ظفر نے اس پر فرمائشی قہقہہ لگایا، اور زبیدہ کا ہاتھ تھام کر بولا، ان قدامت پرستوں اور رجعت پسندوں کو بکنے دو، قافلہ گزرا چلا جاتا ہے اور کتے بھونکتے رہتے ہیں، بے وقوفوں اور جاہلوں کی انگشت نمائی سے اہل دانش اور صاحبان فہم کو متاثر نہ ہونا چاہیئے، کہاں کہاں ساتھ دو گی تم اُن لوگوں کی جہالتوں کا! یہ تو انسانوں کی مسکراہٹوں پر پہرے بٹھا دینا چاہتے ہیں ان کے نزدیک تو آدمی کو لھو کے بیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

زبیدہ نے نہایت خوشی کے ساتھ شوہر کے اس بے حجابی کے مشورے پر "لبیک" کہا، چند دن میں وہ سوسائٹی سے بھی متعارف ہو گئی، کلب گھر، تھیٹر ہال، سینما ہاؤس، ہوٹل اور پارک اُس کی جولاں گاہ بن گئے، خوبصورت اور تعلیم یافتہ عورت کو ہر محفل میں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ ہر کوئی اُس سے قریب اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا، پارٹیوں میں اُسے خاص طور پر بلایا جاتا ـــــ

بیوی کو رونق انجمن دیکھ کر ظفر کا سر غرور سے اونچا ہو جاتا کہ میری بیوی کو اس قدر مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ بڑے بڑوں کی آنکھیں اس کے لئے فرش راہ ہو جاتی ہیں۔

اور فریدہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے شیک ہینڈ کے جھٹکوں کو طویل بنا دیتے۔ اور فریدہ لوگوں کے اس جذبہ کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ کی گرفت کو اور سخت کر دیتی۔ الغرض پروان چڑھ رہی تھیں اور جنسی رشتے شاخ در شاخ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ نہ ہوتا تو حیرت کی بات تھی۔ دریا میں کود کر کوئی سوکھا کیسے رہ سکتا ہے۔ ڈوبے گا نہیں تو بھیگ ضرور جائے گا۔

ظفر کی چھوٹی بہن ناہید بھی بھاوج کے ساتھ رہتی تھی۔ ناہید غیر معمولی خوبصورت لڑکی تھی۔ فریدہ کے مقابلہ میں اس کا رنگ تو پھیکا تھا مگر ناک نقشہ کی موزونیت میں وہ اس سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ جب ظفر کی شادی ہوئی ہے تو وہ کمسن تھی۔ دس گیارہ سال کی لگ بھگ اور اب تین سال کی مدت میں وہ خوب جوان ہو گئی جس محفل میں ناہید شریک ہوتی نگاہوں کا رخ اس کی طرف ہو جاتا۔ فریدہ بھی اس کو اچھی طرح محسوس کرتی تھی کہ اس کل کی چھوکری نے میرے شیدائیوں کی بہت بڑی تعداد چھین لی مگر اس کی جھنجھلاہٹ سے رنگ روپ، جوانی اور بچپن تو نہیں بدل سکتا تھا —— ہر آدمی کی ہر خواہش پوری ہو جایا کرے تو نظام کائنات ہی درہم برہم ہو جائے۔

فریدہ کا کالج کا ساتھی جمشید یہاں کی پولیس سوسائٹی میں افسر ہو کر آ گیا تھا۔ جمشید نے ناہید سے بہت کچھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مگر ناکامی پر شوق بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ جمشید کی ہونک میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو گئی تھی جسے زمانہ حال کی اصطلاح میں " Love " کہتے ہیں۔

ظفر دورے پر گیا ہوا تھا۔ جمشید موقعہ پا کر اس کے یہاں پہونچ گیا۔ فریدہ باغیچہ کی روشوں پر گھوم رہی تھی۔ باغ والی میل کے پیڑ کے نیچے کافی دور پر کے گملوں میں کھاد بھر رہا تھا۔ جمشید کو تنہائی بھی اتفاق سے مل گئی۔ جمشید تیزی کے ساتھ باغیچہ میں پہونچا۔ دونوں طرف سے آداب و سلام ہوا اور رسمی مزاج پرسی! فریدہ نے کہا چلو! بنگلہ میں چلیں وہاں اطمینان سے بیٹھیں گے۔ جمشید اس پر بولا کہ ہریالی پھولوں اور درختوں کے جھرمٹ کو چھوڑ کر کہیں جانے کو میرا تو دل نہیں چاہتا۔ بند کروں میں اتنا دلکش منظر کہاں ملے گا۔ تھوڑی دیر یہیں کیوں نہ بیٹھیں! اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جمشید نے کالج کی زندگی کا ذکر چھیڑا۔ فریدہ نے ٹالنا چاہا۔ وہ جھینپ سی گئی۔ پرانی چوٹوں کو پھر سے ابھارنا وہ نہیں چاہتی تھی اور اب اس کی دلچسپیاں بھی اپنا رخ بدل چکی تھیں۔

جمشید نے بات کرتے کرتے ماتھے کا پسینہ پونچھنے کے لئے جیب سے رومال نکالا اور ایسا کرنے میں ایک کاغذ جیب سے نکل کر گھاس پر گر پڑا۔ فریدہ کی گرے ہوئے کاغذ پر جو نظر پڑی، تو اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس نے جھک کر کاغذ کو اٹھانا چاہا مگر اس کے ہاتھ جھکنے بھی نہ پائے تھے کہ جمشید نے تیزی سے بڑھ کر کاغذ اپنی گرفت میں لے لیا۔

یہ ایک فوٹو تھا —— کالج کی زندگی کی یادگار! جمشید اور فریدہ سرو کے درخت کے پاس ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ فریدہ نے جمشید کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جمشید اس کی طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مرقع آپ ہی آپ بول رہا تھا کہ "ہم دونوں یہ ہیں"؟ جاہل سے جاہل آدمی بھی اس تصویر کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ سکتا تھا۔ تصویر کے ذریعہ اظہار لفظوں سے زیادہ واضح اور مکمل تر ہوتا ہے۔

فریدہ نے جمشید کا ہاتھ تھام کر کہا کہ یہ تصویر مجھے دیدو۔ جمشید نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ذرا تیز لہجہ میں بولا واہ! تصویر تمہیں دے کر میں اپنے پانسو روپیہ کا نقصان کر لوں! پانسو روپیہ کیسے؟ فریدہ نے پوچھا —— ایک انگریزی رسالہ کی طرف سے مجھے اس کی تصویر کی اشاعت پر پانچ سو روپیہ کا معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ جمشید نے جواب دیا۔ تو یہ معاوضہ میں بھی دے سکتی ہوں، فریدہ نے

ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا ...... مگر ... جمشید نے ایک لفظ کہہ کر زور سے قہقہہ لگایا، فریدہ یہ ہم نے معاوضۂ دلجوئی کا جو ذکر کیا تو۔ یہ مذاق تھا۔ میں تو اس تصویر کو چھپوا کر رہوں گا یہ میرے شوق اور پسند کا معاملہ ہے۔

— مگر! تمہارے شوق کے پیچھے میری دنیا تو تباہ ہو جائے گی، کیا تم نے اگلے تعلقات اور مروت وہمدردی کو بالکل بھلا دیا؟" مجھے رسوا کر کے آخر تمہیں کیا مل جائے گا، یہ تم مجھ سے کس دن کا انتقام لے رہے ہو جمشید؟ —— فریدہ نے بہت دلگیر ہو کر کہا — اگلے تعلقات کی یاد نہ دلاؤ فریدہ! وہ بہت بیچیدہ باتیں ہیں ایک ذکر نکلے گا تو بیسیوں نزاکتیں پیدا ہو جائیں گی، میں صاف صاف کہتا ہوں آج دو ٹوک بات کہنے کے لئے آیا ہوں، میری بات کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں "ہاں" یا "نہیں" معذرت، مجبوری اور اس قسم کی باتیں میں سننا ہی نہیں چاہتا اور ...... (فریدہ نے جھٹ سے بیچ میں بول کر کہا، بھئی؛ جلدی کہو آخر کہنا کیا چاہتے ہو) اس پر جمشید گلاب کی ڈالی سے پھول توڑتے ہوئے بولا، میں پھول چاہتا ہوں پھول!

— اس باغیچے کے گلاب کے تمام پھول تمہاری نذر ہیں، تم کہو تو ہر روز صبح سویرے تازے پھول تمہارے یہاں بھجوا دیا کروں —— فریدہ نے جواب دیا —— مگر یہ تو بے جان پھول ہیں، شاخ سے ٹوٹے اور بہت سے بہت ایک رات میں مرجھا گئے، ان میں جذبات اور احساس کہاں ہے؟ جمشید تنکا کی گرہ چھوتے ہوئے بولا —— آج تو تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو، اتنے سنجیدہ مذاق بلکہ دور از قیاس مزاح سے اذیت ہوتی ہے جمشید! —— فریدہ نے کہا۔

اور میں چھ مہینہ سے شدید اذیت میں مبتلا ہوں، راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے، دل کے ہاتھوں کوئی اتنا بھی مجبور نہ ہو جائے، جمشید کے منھ سے ان جملوں کے بعد بیساختہ "ناہید" نکل گیا —— ناہید .... ناہید! فریدہ نے رک رک کر کہا، ہاں! ہاں! ناہید تمہارے شوہر مسٹر ظفر کی چھوٹی بہن ناہید جس کے لئے میں پورے چھ ماہ سے تباہ ہوں، چھ مہینہ سے جن کے ایک سوا تین سے کچھ اوپر دن ہوتے ہیں، اس آگ نے، مجھے پھونک دیا ہے، اب ضبط نہیں ہو سکتا۔

بات طول پکڑ گئی خوب بحث ہوتی رہی۔ فریدہ نے لجاجت اور عاجزی برتی مگر جمشید نے نرمی کا جواب اور زیادہ ترشی دکھائی سے دیا، جمشید اپنی بات پر جما ہوا تھا، فریدہ نے کہا کہ مجھے ایک دو دن کی مہلت دو، معاملہ بہت نازک اور دشوار ہے میں سوچ کر جواب دوں گی، جمشید وہاں سے بے نیازانہ انداز میں رخصت ہوا چلتے وقت بس یوں ہی سا اشارہ کیا اور یہ جا وہ جا۔

فریدہ کی رات اسی الجھن میں کٹی، تدبیروں کے بہت سے محل ذہن وخیال نے بنائے اور خود ہی ڈھا دئیے، معاملہ کی کوئی چول ہی سیدھی نہ بیٹھتی تھی سوچتے سوچتے اس کا دماغ تھک گیا اسی عالم میں نیند آگئی خواب میں اس نے دیکھا کہ جمشید تصویر دکھا کر کہہ رہا ہے کہ ناہید کو مجھ سے بے تکلف کرانے کا بندوبست کرو نہیں تو یہ تصویر جو تمہارا قتل نامہ ہے، اخباروں میں شائع کر دی جائے گی، خوب دھوپ پھیل چکی تھی، فریدہ کی آنکھ کھلی تو اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

تیسرے دن جمشید سے فریدہ نے وعدہ کر لیا، ہاں بھرلی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تمہارے کہنے سے باہر نہیں ہوں اور اپنے وعدے کے ثبوت میں اسی دن فریدہ نے ناہید اور جمشید کا تعارف کرا دیا وہ اس سے پہلے ایک دوسرے کو جانتے تھے مگر آج کا "انٹروڈکشن" جان پہچان کی رسمی حدود سے بہت آگے تھا، فریدہ ان دونوں کو کمرے میں بٹھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر چلی گئی،

ہوس کم ظرف، بے صبر، جلد باز اور پیٹ کی ہلکی بھی ہوتی ہے۔ جمشید نے اپنے ایک دوست سے اس اپنی اسکیم کا ذکر کر دیا، اور بہت سی باتیں اپنی طرف سے اور نمک مرچ لگا کر بیان کر دیں یعنی اس دن ناہید کے ساتھ اس نے چائے پی تھی اور واجبی سی گفتگو ہوئی تھی مگر جمشید نے اپنے دوست سے کہا کہ میں تو اب تک بڑے اندھیرے میں تھا، ناہید تو خود مجھ سے متاثر ہے ارے صاحب!

کیا بتاؤں اُس نے کس کس شوق و دلچسپی کے ساتھ میری پذیرائی اور مدارات کی ہے۔

جمشید کا دوست افضل بھی آج کل کے یار آشناؤں کی طرح خود غرض اور مطلبی تھا، ہوٹلوں، کلب گھروں اور پارکوں کی دوستی بس دکھاوے ہی کی ہوتی ہے جس کا رنگ ایک ہی شوب میں اُتر جاتا ہے، افضل خود فریدہ کا زخم خوردہ تھا، جلسوں اور پارٹیوں میں فریدہ نے اُس سے کبھی توجہ کے ساتھ بات تک نہیں کی حالانکہ وہی فریدہ دوسروں سے چھیڑ چھیڑ کر گفتگو کرتی، ایک عصرانہ (ایٹ ہوم) میں تو افضل کو فریدہ نے جھڑک دیا کہ جان پہچان اور صاحب سلامت کو بے تکلفی نہیں کہتے۔

افضل فریدہ سے انتقام لینا چاہتا تھا ——— اُس کی رکھائی، بے پروائی اور عدم توجہی کا! ظفر کے دورے سے واپس آتے ہی افضل نے سارا کچا چٹھا بیان کر دیا، واقعات کی پوشیدہ طور پر چھان بین ہوئی تو تصویر کے دونوں رُخ ایک ایک جھائیں مہین سے مہین لکیر کے ساتھ واضح ہو گئے، ظفر غصہ کے مارے بے تاب ہو گیا، اُس کی بہن کی آبرو کا مسئلہ تھا، غیرت کی رگ تلملا اٹھی فریدہ کی پچھلی زندگی بھی اس سلسلے میں سامنے آ گئی، اُس نے بہت کچھ سوچا کہ کرنا کیا چاہیئے؟ کئی بار پستول ہاتھ میں لے کر رکھ دیا، عواقب سامنے آنے تو ارادہ میں نرمی آ جاتی، وہ اس فکر میں تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!

آدمی سوچنے اور کرنے پر آئے تو کیا نہیں ہو سکتا، جو انسان ہواؤں میں فولاد کو اُڑا سکتا ہے جس کی کوششوں کی بدولت جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے گزر جاتے ہیں ——— وہ سب کچھ کر سکتا ہے، تدبیر ذہن میں آ گئی، ظفر نے بیوی سے کہا کہ دفتری کام کرتے کرتے دماغ تھک گیا ہے چلو بمبئی چند دن کے لئے چلیں، وہاں تھوڑے دن رہ کر سیر سپاٹا کریں گے، فریدہ کی تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں، اُس نے تیزی کے ساتھ تیاریاں شروع کر دیں، محکمہ سے رخصت کی منظوری آنے پر دونوں میاں بیوی بمبئی روانہ ہو گئے، ناجیہ کو اُس کے ماموں کے پاس بھیج دیا۔

ظفر پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ شوق و مدارات کے ساتھ فریدہ سے پیش آتا، فریدہ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ میرے شوہر کے التفات میں بہت زیادہ گرمی پیدا ہو گئی ہے ——— مگر اس مسرت میں غیر شعوری طور پر دل گرفتگی بھی پائی جاتی تھی جیسے کوئی اُس کے کان میں چپکے چپکے کچھ کہہ رہا ہے، کہنے والے کے بول سمجھ میں نہ آتے تھے لیکن آواز کسی آنے والے خطرے کا پتہ دیتی تھی!

دو دن وہ اِدھر اُدھر کی سیر کرتے رہے، فریدہ نے بمبئی کے ہر نظارے میں جی بھر کے دلچسپی لی، بناؤ سنوار کی یہاں اُس نے انتہا کر دی ——— چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا بھی تو ہے! ظفر کے یہ دو دن سولی پر کٹے، کسی نظارے اور تفریح میں اُس کا جی نہ لگتا تھا، بیوی سے وہ باتیں کرتا، مسکراتا، ہنسی مذاق کی نوبت بھی آ جاتی مگر یہ سب بے دلی اور بناوٹ کی باتیں تھیں، سیر کے بہانے اُس نے سمندر کے ساحلی مقامات کا اچھی طرح جائزہ لیا، باندرے کے قریب ایک جگہ منتخب بھی کر لی، سمندر یہاں گہرا تھا اور اکثر تنہائی بھی رہتی تھی۔

ایک دن شام کے دُھندلکے میں ظفر بیوی کو لے کر روانہ ہوا۔ فریدہ کی زندگی کی یہ آخری شام تھی، در و دیوار اُسے "الوداع" کہہ رہے تھے مگر وہ اس خاموش بولی جانی اور سکوت آمیز پیام کو سُن نہ سکتی تھی، ظفر آج خاموش خاموش سا تھا، فریدہ نے کئی بار ٹوکا کہ آپ آج گم صم سے کیوں ہیں، کچھ کہئے، ہنسئے بولئے، کوئی شعر ہی سنائیے، ظفر کے منہ سے بے اختیار یہ شعر نکل گیا۔

> ختم ہم کے کہہ رہی ہیں دم نزع ہچکیاں
> کس کس کو بھولنا ہے ذرا یاد تو کرو

ظفر نے شعر سنانے کو تو سنا دیا مگر پھر خود ہی پہلو بدل کر بولا، بعض وقت اچھا خاصہ آدمی حماقت کر بیٹھتا ہے، مجھے دیکھو کہ اس کیف پرور ماحول میں کتنا غم انگیز شعر تمہیں سنا دیا، فریدہ نے اس پر کہا نہیں شعر بہت خوب ہے خوشی اور تفریح کے ہجوم میں تو غم و الم کے شعر اور مزہ دیتے ہیں سمندر سے کچھ دور چوراہے پر دونوں اتر پڑے ٹیکسی والے کا کرایہ چکا دیا گیا، ساحل پر آج زیادہ بھیڑ نہ تھی، شیواجی پارک میں

قومی جلسہ تھا اور اُسی دن صنعتی نمائش بھی تھی پبلک کا اُنھیں دونوں طرف آنا جانا رہا، دونوں میاں بیوی سمندر کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں پیڑوں کے بے ترتیب جھنڈ تھے، یہاں، اکا دکا آدمی دکھائی دیتا تھا، اس طرف کی سڑک بھی ناہموار سی تھی، جگہ جگہ گڈھے پڑے ہوئے تھے، فریدہ نے کہا ——— ظفر! یہ تم آجالے، آبادی اور لوگوں کی چہل پہل کو چھوڑ کر یہاں مرگھٹ میں کہاں چلے آئے؟ مجھے تو بڑی وحشت محسوس ہو رہی ہے، میرا دل نہ جانے کیوں آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا ہے ———

ظفر نے جواب دیا، فریدہ! سمندر کے نظارے کا لطف تنہائی میں آتا ہے، ہنگامہ میں تفریح کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے، یہاں کی تاریکی میں فطرت لپٹی لپٹائی ہمارے سامنے کھڑی ہے اور وہاں بجلی کے قمقموں سے پیدا کی ہوئی بناوٹی روشنی میں " nature " کی اور چنچلتی باقی نہیں رہتی۔

سمندر کی موجیں کنارے سے آ آکر ٹکرا رہی تھیں، اندھیرے اور تنہائی میں یہ شور بہت زیادہ بھیانک بن گیا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سمندر اہلِ ساحل کو للکار رہا ہے کہ خبردار! کنارے پر کھڑے ہو کر اپنے کو محفوظ نہ سمجھنا میں چاہوں تو ایک ہی موج میں آسودگی ساحل کو زیر و زبر کر سکتا ہوں ——— آؤ! کنارے کی پتھریلی منڈیر پر چلیں، فریدہ! ظفر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ تمھیں آج کیا ہو گیا ہے؟ دیکھتے نہیں ہو سمندر کتنا پُر شور ہے، منڈیر پر چلنا بہت زیادہ خطرناک ہے، ذرا سی پاؤں کو لغزش اور آنکھوں سے چوک ہو گئی تو ...... (فریدہ کی بات کاٹ کر ظفر بول پڑا) تو یہی ہوگا کہ ہم میں سے کوئی ایک سمندر میں گر پڑے گا، موت سے اس قدر ڈرتی ہو تم فریدہ!

ظفر کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا، چہرہ ایکا ایکی بھیانک ہو گیا اُس نے فریدہ کو اٹھا کر منڈیر پر کھڑا کر دیا، موت یہاں سے بس ایک دو قدم کے فاصلہ پر تھی، فریدہ ڈر کے مارے ظفر کا ہاتھ نہ چھوڑتی تھی، جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، ظفر نے یکبارگی اچھل کر "سانپ" کہا، فریدہ کے پاؤں ڈگمگا گئے، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ظفر کے ایک جھٹکے میں وہ سمندر میں گر پڑی، ظفر نے فاتحانہ انداز میں سمندر کی موجوں کو دیکھا - وہ مسکرانے لگا - بھیانک مسکراہٹ، ڈراؤنے تیور، اُس کے ہاتھ خون میں نہیں موت میں رنگے ہوئے تھے۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی پہلی ٹرین سے ظفر بمبئی سے روانہ ہو گیا، ظفر کو ریل گاڑی لئے جا رہی تھی اور فریدہ کی لاش سمندر کے ریت میں پڑی ہوئی تھی، مچھلیوں اور جانوروں کی نچی ہوئی لاش! جس گلابی بدن کے عطر نے محفلوں کو مہکایا تھا آج اُس کے پاس سے لوگ گزرتے ہوئے ناک بند کر لیتے، دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ہمدردی سے زیادہ حقارت اور نفرت کی آمیزش تھی۔

تنقید!

افسانہ نگار نے ایک فسانہ مرتب کیا، مصوّر نے تصویر بنائی، بُت تراش نے ایک مجسمہ کو تشکیل دی اور شاعر نے ایک رنگین نظم کہی اور لوگ بے اختیار پکار اُٹھے "فنونِ لطیفہ" زندہ باد "فائن آرٹ" کی "جے" ایک مردِ قلندر کہیں سے پھرتا پھراتا اُدھر آ پہونچا، فن کاروں کی ان کوششوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھا :- ؎

جو اِن میں حکمتِ قرآں نہیں تو کچھ بھی نہیں

رُوحِ اِنتخاب

- دولھا اور دُولھنیں خاص طور سے پڑھیں!

عورتوں اور مردوں کے لئے ایک آئینہ جس میں وہ اپنے کردار کے خدو خال دیکھ سکتے ہیں ـــــ مضمون نہیں حقیقت کی چلتی پھرتی اور بولتی فلم جسے دل کے اسکرین پر پیش کیا گیا، تفریح اور دل بہلانے کی غرض سے نہیں، عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے!

مولانا عبدالماجد دریابادی اُردو زبان کے صاحب طرز مایہ ناز انشاپرداز ہیں، اُن کی تحریریں سادگی و پرکاری کا شاہکار ہوتی ہیں، اشاروں ہی اشاروں میں وہ پتہ کی باتیں کہہ جاتے ہیں، مغربی تہذیب پر طنز کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں، اُن کی طنز میں خلوص، حقیقت، سچائی، جذب باطن اور سوز یقین پایا جاتا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی کی تمام ادبی صلاحیتیں اور علمی توانائیاں اعلائے حق اور تفسیر صداقت کے لئے وقف ہیں، انھوں نے "مثنوی زہر عشق" پر دیباچہ لکھتے ہوئے بھی اس خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، حق کے اظہار میں وہ بے باک ہیں، اور اقبال کے اس شعر:—

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کی جیتی جاگتی تصویر اور زندہ مثال!

مولانائے موصوف نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو اپنی صاحبزادی کے عقدِ نکاح پر جو خطبہ دیا تھا، اُس کے اقتباسات سے "فاران" کو زینت دی جارہی ہے، یہ خطبہ ارشاد و ہدایت اور معاشرت و نفسیات کا نظر افروز صحیفہ ہے ـــــ کتنا نازک مقام ہے کہ ایک جہاندیدہ باپ اپنی جوان بیٹی کو شباب کا فلسفہ سمجھاتا ہے اور مقام حیرت ہے کہ حبابوں اور آبگینوں کے اس حریم غیرت سے وہ کامیابی اور سلامتی کے ساتھ گزر جاتا ہے، مولانا عبدالماجد نے خطبہ نہیں دیا، بیٹی اور داماد کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے، یہ خطبہ شخصی نہیں اجتماعی حیثیت رکھتا ہے، پورے انسانی معاشرے کے لئے اس میں فلاح و بصیرت کے محرکات اور داعیات موجود ہیں، اگر کسی کے دل میں شرم و غیرت اور قبولِ صداقت کی ذراسی بھی صلاحیت باقی ہے، تو اس خطبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ادب و انشا کے اعتبار سے بھی یہ مقالہ بلند ترین مقام کا مستحق ہے، خیالات میں سلجھاؤ اور اظہار بیان میں مرکزی تخیل سے ہم آہنگی اور ربط تام پایا جاتا ہے، فاضل مضمون نگار نے شعلہ و شبنم کو بیج مج یکجا کر دیا ہے، جملوں میں قیامت کی جاذبیت، توازن اور تناسب موجود ہے ـــــ اس خطبہ کے ہر کسی

تعارف کی ضرورت نہ تھی، اس کا ہر لفظ خود اپنا تعارف ہے، مگر میں کیا کروں، دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا، یہ جذبات بے اختیار قلم کے واسطہ سے کاغذ پر آگئے ——— (م۔ق)

بچہ پلا اور بڑھا اور جوان ہوا۔ اور جسے کل انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جا رہا تھا آج وہ اس قابل ہو گیا کہ چلے اور دوڑے اور خود ہی نہیں دوسروں کو بھی اپنے ساتھ چلائے، پڑھ لکھ کر ہوشیار ہو اور اس لائق کہ نہ صرف اپنی ذمہ داری اپنے سر لے بلکہ قول دے دوسروں کی کفالت کا، حفاظت کا، ذمہ داری کا، خبر گیری کا، سرپرستی کا ——— رخصت بچپن کی بے فکریاں اور ختم معصومیت کی فارغ البالیاں، اور جو کل تک گھر کی چہکتی مینا تھی، وہ مطالبہ کرنے لگی باپ سے اپنے حق کا۔ مطالبہ اپنی زبان سے نہیں جس پر اسلامی شرم و حیا کے قفل چڑھے ہوئے ہیں اور پردے مشرقی ادب و لحاظ کے پڑے ہوئے ہیں۔ مطالبہ اس کی زبان سے جو بڑوں اور چھوٹوں سب کی رہنمائی کے لئے آیا جس نے ایک ایک کو اس کا فرض یاد دلایا۔ ایک ایک کو اس کا حق جتلایا۔ تو وہ ارشاد کرتا ہے:۔

"النکاح سنتی"۔ نکاح تو میرا طریقہ ہے ـــ میرا لایا ہوا دین اور میرا پھیلایا ہوا آئین۔ حیات اجتماعی کی اصل بنیاد فرد نہیں خاندان ہے اور خاندان کی ترکیب کا عنصر حقیقی۔ یہی رشتہ ازدواج ہے۔ نہ ہو کہ اسے کوئی فضول اور لایعنی رسم سمجھ بیٹھو یا خواہ مخواہ کی قید۔ دنیا شروع سے بار بار غلط تجربہ کرتی آئی ہے اور آخر تک کرتی رہے گی۔ کوئی شرک اور ارواح پرستی کے جنگل میں پھنسا ہوا! تجرد و رہبانیت کی طرف لے جائیگا، کوئی الحاد و مادہ پرستی کی دلدل میں دھنسا ہوا Free Love اور حیوانیت کے رخ پر چلائے گا۔ دنیا کے ہاتھ میں صحیح قانون اپنے دیا آزیا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ سارے راستے ہیں جہل و نادانی کے، بد نظمی و فتنہ سامانی کے، اور صحیح راستہ صرف وہی ہے جماعت کے لئے اور فرد کے لئے، اور عورت کے لئے اور مرد کے لئے، صحت کے لئے اور عافیت کے لئے عصمت کے لئے اور عاقبت کے لئے جو میرا بنایا ہوا، میرا بتایا ہوا، میرا سمجھایا ہوا، میرا چلایا ہوا ہے۔

فمن رغب عن سنتی ـــ اس پر بھی جو بدنصیب میرا طریق چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا ہے اور حکیم حاذق کے مطب سے منہ موڑ کر چل دیتا ہے کسی عطائی اشتہاری۔ جاہل چرب زبان دوا فروش کا دامن پکڑتا ہے ———

فلیس منی ——— وہ جان لے اور سن رکھے کہ وہ میرا ہرگز نہیں۔ میں اس کی شامت اعمال سے بری، اب وہ جانے اور اس کی کج روی۔ باپ کی امانت کا زمانہ ختم ہوا جس موم کی پتلی کو بچپن سے آج تک آنکھ کی پتلی بنا کر رکھا۔ پالا، پڑھایا، لکھایا، سکھایا، کھلایا، برسوں جس سے دل نے سرور حاصل کیا اور آنکھوں نے نور۔ جب وہ خود اس لائق ہوئی کہ خدمت کر سکے اپنے ہنر اور سلیقہ کی شمع سے اندھیرے کو اجالا بنا دے تو حکم ملتا ہے کہ وداع کر دو اسے، منتقل کر دو امانت کو دوسرے کے ہاتھ میں۔ آج سے اس کی نئی زمین ہو گی اور نیا آسمان نئی زندگی اور نیا سامان!

آج سے کوئی ۵ ہزار سال قبل ایک باپ، بوڑھے باپ اور اللہ کے مقدس اور برگزیدہ بندہ کو حکم ملا تھا کہ ذبح کر ڈالو اپنے ہاتھ سے اپنے جگر پارے کو۔ لڑکے کو، دودھ پیتے بچے کو نہیں، اچھے پلے بڑھے، دوڑنے پھرنے والے باپ کا ہاتھ بٹانے والے بیٹے کو! اللہ اللہ! جہاں یہ معاملہ اپنے دوستوں، شیدائیوں کے ساتھ ہو، وہاں ہمہ شما کے گلہ کو کس شمار و قطار میں! الفت کے اس میدان میں جسم تو حسین ابن علیؓ اور ان کے رفقا کے خاک و خون میں تڑپتے ہیں اور شہادت گاہ امتحان میں سر عثمانؓ و علیؓ کے نذر ہوتے ہیں۔

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب　　ساز ترا زیر و بم حادثہ کربلا!

حکم اسی نوعیت کا گو اس سے بدرجہا کم ہے گا۔ سنتِ ابراہیمی کے ہر پیرو کو ملتا ہے کہ جس کسی کے لڑکی ہو آز مائش کی اسی راہ سے گذرے

اور کسی کے دس بیٹیاں ہوں تو دس بار اس امتحان میں پورا اترے اور ہمیں سے اس فخر آبائے نامدار اور ہم سب کے آقا و سردار کے مرتبہ پر ایک مزید روشنی پڑتی ہے جس کی شان میں ماکان محمد ابا احد من رجالکم آیا ہے۔ نفی ابوّت رجال کی ارشاد ہو رہی ہے ابوّت نساء کی نہیں۔ صاحبزادیوں کا باپ ہونا تو آپ کے لاتعداد فضائل و کمالات کے سلسلہ کی ایک اہم اور قیمتی کڑی ہے کیونکر ممکن تھا کہ قرآن مجید اس کی طرف اشارہ کئے بغیر رہتا۔ پاک پیمبرزادیاں ایک نہیں متعدد تھیں سب کو آپ نے بیاہا، رخصت کیا، دوسروں کو اپنے ہاتھوں سے سونپا۔ رقیہ بیاہ کر گئیں۔ اللہ کے پیارے کی پیاری فاطمہؓ زہرا کاشانۂ نبوت چھوڑ کر دوسروں کے گھر جا بسیں۔

اللہ اکبر! بندہ نواز کے ہاں بے حساب طریقے ہیں بندوں کے نوازنے کے اور بے شمار راستے ہیں بندوں کے سرفراز کرنے کے! ابراہیم خاک کے پتلے گوشت پوست کے بنے ہوئے بندے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) انھیں اپنا دوست کہہ کر پکارا اور خلیل کے لقب سے بڑھایا چڑھایا اللہ اللہ! کیا بندہ نوازیاں ہیں اور کیسی کیسی سرفرازیاں! جسے بڑھانا چاہیں یوں خاک سے پاک بنا دیتے ہیں۔ اور جسے اٹھانا چاہیں یوں فرش سے عرش پر پہنچا دیتے ہیں، اور پھر صلہ و انعام کو جب عام کرنے اور بخشش کو وقف دو جہاں کر دینے پر آئے، تو جو امتحان خلیلؑ کا ان کے ظرف و ہمت کی مناسبت سے لیا، اس کا ایک ہلکا سا خواب خلتِ ابراہیمی میں ہر بیٹی کے باپ کو دکھا دیا اس میں مناسبت مرتبہ خلت سے پیدا کرتے ہیں۔ مقصود تو خود ہی لطف و نوازش کرنی ہے اور خاکیوں کو شانِ کرم کی جھلک دکھانی ہے، اور اس کے لئے بہانے کیسے کیسے ہیں! ایک ہی وقت میں لطیف بھی اور گداز بھی، پُر درد بھی اور دلنواز بھی! ____ درد کی کسک نہ ہو تو وہ مجاہدہ ہی کیا اور جب مجاہدہ نہیں تو اس کا اجر ہی کیسا! بھوک کا احساس تو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ کھانے کا لطف آئے اور پیاس تو رکھی ہی اس لئے گئی ہے کہ پانی میں لذت ملے!

مبارکباد کا وقت وہ نہیں ہوتا جب امتحان کے کمرے میں لڑکوں کے ہاتھ میں پرچہ آتا ہے۔ مبارکباد اس وقت دی جاتی ہے جب کہ کامیابی کا گزٹ چھپ چکتا ہے۔ جہاز کا سفر کامیاب اس وقت نہیں کہا جا سکتا ہے جب ٹکٹ لے کر وہ درجہ میں داخل ہوتا ہے۔ کامیاب اس وقت کہا جائے گا جب وہ سارے درمیانی اسٹیشنوں سے گزرتا ہوا منزل مقصود تک بخیریت و عافیت پہنچ جائے اور یہی راز ہے اس کا کہ خطبہ نبوی جو ابھی آپ سن چکے ہیں تقویٰ الٰہی کی تکرار سے بھرا ہوا ہے اور اتقوا اللہ چار سطروں کے اندر چار بار آیا ہے۔ تو محفل کا نوشہ اور پس پردہ وہ لڑکی دونوں سن لیں کہ آج کی گھڑی عملی زندگی کے بڑے اور کڑے امتحان میں داخلہ کی ہے ایک عظیم الشان پر پیچ سفرِ حیات کے آغاز کی ہے۔ وقت نہیں ہے غفلت کے شادیانوں کا، موسم نہیں ہے مدہوشی کے ترانوں کا۔ یہ گھڑی ہے احساسِ ذمہ داری کی، پوری بیداری کی' اور یہی راز ہے اس کا کہ نکاح کا زمانہ معتبر بلوغ کے بعد ٹھیرایا ہے اور اقرار معتبر بالغ ہی کا مانا گیا ہے کہ خود بلوغ کے معنی ہی یہ ہیں کہ روح اور جسم اور قلب ایک عظیم الشان ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہو گئے۔

اچھی بیوی اور اچھی عورت وہ نہیں جو مردوں سے بے جھجک ملے اور میوزک ہال میں بے جھجک رقص کرے۔ بے شک فرنگ کے ذہنوں اور جاہلیت کی تہذیب نے معیار اسی کو ٹھیرایا ہے اور آج "سحر فرنگ" سے مرعوب "تجدد" اسی پر ریجھا ہوا ہے لیکن دنیا کے سب سے بڑے معلم کے لائے ہوئے دین فطرت اور پھیلائے ہوئے آئین حکومت میں گنجائش ان آزادیوں، بے باکیوں اور آوارگیوں کی کہاں، یہاں تو نکاح بجائے خود ایک "قید" ہے اور اپنے ساتھ بہت سی پابندیوں کو بڑھانے والا اور بہت سی پابندیوں کو لانے والا۔ بس سن لے مسلمان لڑکی کہ زمانہ بے فکری کا ختم ہوا، اور دور شروع ہوا نئی فکروں اور پابندیوں کا نئی قیدوں اور ذمہ داریوں کا۔ اب تک سہیلیوں کے ساتھ کھیلی بہنوں کے ساتھ ہنسی بولی، ہمجولیوں کے ساتھ جھولا جھولی، اب کل سے زندگی وقف ہو گی دوسروں کی خدمت کے لئے۔ نہ کھانا اپنے لئے ہو گا نہ ہنسنا اپنے لئے نہ اپنے وقت سونا نہ اپنے وقت جاگنا۔ خود بعد کو کھائے گی اور دوسروں کو پہلے کھلائے گی۔ بے شک پہنے گی اور اوڑھے گی مگر اس لئے کہ شوہر کو

بھلی لگے۔ اپنے کو سنوارے گی نکھارے گی مگر اس لئے کہ شوہر کی نظر میں جچے۔ راتوں پر راتیں جاگے گی ٹھس ٹھس کر کاٹے گی اس لئے کہ نئی نسل کو بڑھائے پھیلائے صحت و زندگی کی شاہراہ پر چلائے۔ دو مردوں کی سیرت کی تشکیل کرے۔ منزل بے شک کڑی ہے اور ذمہ داریاں سخت لیکن جو خوش نصیب اس کو نباہ لے گئی اور شوہر کا دل ہاتھ میں لئے دنیا سے اٹھی۔ بشارت ہے اس کے لئے دنیا کے سب سے بڑے راست باز کی زبان سے ارشاد ہے کہ اس کے اور جنت کے درمیان کوئی روک نہیں! ـــــ یہ آخری منزل نظر کے سامنے ہو اور یہ دستور العمل ہاتھ میں تو صحرائے ہستی کا ہر کانٹا انشاءاللہ پھول بن کر کھلے گا اور راہ کا ہر پتھر پانی ہو کر بہے گا۔

جی میں تھا کہ آج امانت کا جا بجائے امین کو دیتے وقت ذمہ داریوں کا نقش اس کے دل کی گہرائیوں میں بٹھایئے اور فرائض کی فہرست ایک ایک کر کے اُسے سنایئے، پر آہ کہ اس کی ہمت کہاں سے لائی جائے!

سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آخر ایک دن وہ بھی تو تھا کہ جو آج کی محفل میں باپ کی حیثیت سے ہے خود بزم میں نوشہ کی حیثیت سے تھا اور کسی اور کی امانت کو ذمہ داری کا احساس کئے بغیر اس ہلکے پھلکے دل کے ساتھ قبول کر رہا تھا کہ گویا ایجاب و قبول ایک کھیل تماشا ہے۔ انہ کان ظلوماً جہولا۔ ظلوم وجہول بیشک اپنے اصلی معنی میں۔

کنعان کے بزرگ دانا کا قصہ ہے کہ اپنے نور نظر یوسف کو بچانے کی کیسی کیسی کوششیں کر ڈالیں لیکن اور تو اور خود اپنے بیٹوں سے پیش نہ گئی! پھر ایک جگر کا ٹکڑا کھو ہی چکا تھا اور بیٹے کے غم میں بصارت تک کھو بیٹھے تھے کہ دوسرے لخت جگر بن یامین کی حفاظت کے لئے احتیاط کی بصیرت نے یہاں تک سمجھا دیا تھا کہ مصر کے شہر میں سب بیٹے داخل ہوں تو ایک ساتھ ایک دروازہ سے داخل نہ ہوں۔ پھر یہ ساری عقل کوشیاں اور مصلحت آزمائیاں کچھ بھی چلیں؟ کہاں بندۂ بے بس کی تجویز و تدبیر اور کہاں حکیم مطلق کی مشیت تکوین و تقدیر! لیکن دیکھئے گا عارفوں کے اس سردار کی زبان سے اس لمحہ بھی سچائی کس قیامت کی ادا ہوئی ہے۔ وما اغنی عنکم من اللہ من شیئ ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المومنون ـــ روتے جاتے ہیں۔ لرزتے جاتے ہیں اور زبان سے کہے جاتے ہیں کہ میری تجویزوں اور تدبیروں سے ہوتا کیا ہے۔ مجھ ناچیز کی کوئی احتیاط مشیت تکوینی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ ہو گا تو وہی جو میرا نہیں میرے پروردگار کا چاہا ہو گا، وہی حاکم ہیں، وہی مالک ہیں، وہی متصرف ہیں، تکیہ اور بھروسہ صرف انہی کی ذات پر ہے۔

گنہگار باپ کی معصوم لڑکی! تجھے اس حافظ برحق و ناصر مطلق کے سپرد کیا جس نے یوسف کی حفاظت کی کنوؤں کے اندھیروں میں اور بن یامین کی پردیس کے خطروں میں جب ایک بزرگ پیغمبر تک بے بس ہو چکے تھے! وہی تیرا محافظ رہے زندگی کی ہر مشکل میں، حیات کی ہر منزل میں، آج بھی صبح زندگی کی کرن پھوٹتے وقت اور کل بھی شام زندگی کی شفق پھولتے وقت! اس وقت بھی جبکہ تیرے سر پر ہاتھ رکھنے والے بڑے اور ان بڑوں کے بڑے زندہ و سلامت ہیں۔ اور اس وقت بھی جب کہ خود تیرا شمار ہو گھر کے بڑے بوڑھوں میں، گھرانے کی نانیوں اور دادیوں میں! اور لڑکپن کی شادابیوں کی جگہ لے چکیں لٹوں کی سفیدیاں اور چہرہ کی جھریاں اور آج کے دعاگو و دعاخواں خطبہ نویس کی ہڈیاں تک خاک ہو چکی ہوں!

مرد و عورت کی تفریق انسان ہی میں نہیں، نر و مادہ کے اختلاف و امتیاز سے تو حیوانات تک خالی نہیں بلکہ شاید نباتات بھی! اب اگر دونوں صنفیں ہر جہت سے یکساں ہیں تو قدرت کو آخر اس تقسیم و تفریق کی ضرورت ہی سرے سے کیا تھی؟ لیکن اگر بالکل ہی مختلف ہیں تو یہ دو صنفیں

ایک ہی نوع اور ایک ہی جنس کے اندر کیسے قرار پائیں؟ جاہلی تہذیبوں اور غیر فطری مذہبوں کو ٹھوکر یہیں آکر لگی ہے عقل کم اندیش آخر کہاں تک پہنچتی اور نفس کے کن کن دھوکوں سے بچتی! —— رہنمائی دین فطرت نے آکر کی کہ بحیثیت انسان دونوں بالکل ایک، حقوق بشری کے لحاظ سے دونوں میں سرمو فرق نہیں۔ بھوک، پیاس گرمی، سردی اور سختی، نرمی، رنج خوشی کا احساس اسکو بھی، چوٹ لگے گی تو اس کا جسم بھی دکھے گا اس کا بھی —— ان تمام حیثیتوں سے یکساں ہیں، آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں۔ اور اسی طرف اشارہ ہوتا ہے ادائے حقوق کے باب میں۔ ولھن مثل الذی علیھن۔ کلام کی بلاغت و معنویت پر غور ہو۔ ارشاد یہ نہیں ہو کہ دونوں کی صلاحیتیں ایک ہیں۔ دونوں کی قوتیں ایک ہیں۔ دونوں کی ساخت جسمانی یا ترکیب نفسی ایک ہے بلکہ صرف یہ کہ دونوں کے حقوق ایک دوسرے پر یکساں ہیں۔ حقوق کی بنا صنفوں کا امتیاز نہیں انسانیت کا اشتراک ہے۔ اور جہاں سے صنفیت کے حدود شروع ہوئے اور صنفوں کا مستقل وجود خود دلیل اس امر کی ہے کہ دونوں قوتیں الگ، صلاحیتیں مختلف اور دائرہ عمل علیحدہ۔ نظام صنفی جب نظام حیاتی کا ایک جزو غیر منفک۔ یعنی لازم ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں حیات ہے صنفیت بھی ہے اور جب ایک کا وجود دوسرے سے مستقل طور پر الگ ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اختلاف و امتیاز اثر انداز ہو رہا ہے نظام شعوری پر، نظام فکری پر، نظام حسی پر، نظام عضوی پر، نظام معاشرتی پر غرض ہر نظام بشری پر —— اور کارخانہ عالم میں دونوں کے حدود جداگانہ ہیں۔ یقیناً ایک دوسرے کے متمم و مکمل، معین و معاون لیکن بہرحال ایک دوسرے سے مختلف و متباین —— ٹیم میں جیت کی کوشش میں شریک سب ہوتے ہیں لیکن فیلڈ میں پوزیشن ہر کھلاڑی کی نہ ایک ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ مقام ہر کھیلنے والے کا اگر بازی میں جیتنا مقصود ہے تو متعین اور دوسروں سے الگ ہی ہوگا۔ اب اگر فٹ بال میں گول کیپر کہے کہ میں کیوں آخر سب کے پیچھے اپنی جگہ پر جا ٹھہرا رہوں در آنحالیکہ میرے ساتھی دوڑتے جھپٹتے آگے بڑھتے رہتے ہیں اور فارورڈ والے یہ کہنے لگیں کہ دوڑ کی ساری محنت ہمیں کیوں گوارا کریں درآنحالیکہ بیک والے پیچھے آرام سے کھڑے ہیں تو فرمائیے اس ٹیم کا کیا حشر ہو کر رہے گا!

اکثر تجربہ ہوتا ہے کہ آج عورت کے جو نادان دوست اس کے حجاب کو اس کی پستی اور غلامی پر بطور دلیل لا رہے ہیں اور اس کی خانہ داری کی زندگی کا مرقع اس بھیانک شکل میں پیش کر رہے ہیں کہ گویا وہ اس کے حق میں ایک عذاب ہے وہ ٹھیک اسی قسم کے انتشار ذہنی میں مبتلا ہیں دوسروں میں بھی۔ یہی انارکی پھیلا رہے ہیں اور زندگی کی وسیع بازی گاہ میں ٹیم کا دشمن خود ٹیم والوں کو بنا رہے ہیں!

ٹیم کے اندر یہ اعلیٰ و ادنیٰ کیسا اور معزز و حقیر کے کیا معنی! انتظامی ضروریات کے لئے افراد میں مرکزیت پیدا کرنے کے لئے تعطل ( ) دور کرنے کے لئے ٹیم کا ایک کپتان ہونا تو بہرحال و بہر صورت لازمی ہے۔ تو کیا ٹیم کے دوسرے کھلاڑی کپتان کے غلام ہوتے ہیں۔ ہماری شریعت نے اور (شریعت حکمت ہی کی اعلیٰ ترین صورت کا نام ہے) تو اس مرکزیت کی تائید کر رکھی ہے کہ پوراقافلہ نہیں کل دو مسلمان بھی اگر سفر میں ہوں تو ایک کو امیر سفر بنا دینا چاہئے! ہر شخص کی خانگی زندگی اپنی جگہ ایک ننھی منی سی سلطنت ہوتی ہے بجٹ کیوں کر تیار ہو، مہینہ یا سال کے آمد و خرچ میں توازن کیسے قائم رہے، خوراک کا کیا بندوبست ہو، بیماروں کے علاج کی کیا صورت ہو، لڑکوں کی تعلیم و تربیت کس راہ پر لگے وغیرہ —— یہ سارے امور جس طرح بڑے بڑے وزیران سلطنت کے سوچنے سمجھنے اور طے کرنے کے ہوتے ہیں اسی طرح وہ بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر سہی ہر میاں بیوی کے لئے قابل غور ہوتے ہیں۔ ان کے ایک جزو کا مالک و مختار مرد ہوتا ہے اور دوسرے کی کنجی بیوی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کما کر مرد لائے گا، کمائی کو سلیقہ کے ساتھ ٹھکانے عورت لگائے گی۔ زمین میں غلہ مرد بوئے گا، گوڑے گا، جوتے گا، ہل چلائے گا۔ عورت اس غلہ کو پھٹکے گی پیسے گی گوندھے گی، روٹی پکائے گی۔ مریض بچوں کو ڈاکٹر کے پاس باپ لے کر جائے گا، دوا ماں پلائے گی، ہاتھ پیر سہلائے گی۔ غرض جہاں تک اندر کی زندگی کا تعلق ہے عورت اپنی اس چھوٹی سی سلطنت کی رانی یا ملکہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اس کو یہی مرتبہ بخشا ہے اور اسی کو کسی کی زبان حکمت ترجمان سے یوں ادا کرایا ہے الدنیا کلھا متاع وخیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ (مشکوٰۃ کتاب النکاح فصل اول) اس دار ناپائیدار

میں بہترین جنس جو ہے وہ اچھی اور پاک بیوی ہے۔

اور پھر بیرونِ ٹیم کا کپتان سہی، جیسا کہ وللرجال علیھن درجۃ سے ظاہر ہے، اور گھر کی سلطنت کا افسر سہی جیسا کہ الرّجال قوامون علی النساء سے واضح ہے لیکن آدم زاد کی قوت جسمانی اور دور اندیشی کے مقابل میں آدم زادی کے پاس کم از کم ایک روشن پہلو مسلسل صبر و تحمل اور ایثار و جان سپاری کا ہے اور اس نے اس کا درجہ باپ سے کچھ اونچا ہی کر رکھا ہے۔ کون بشر ایسا ہے جسے سخت سے سخت مشقتوں کے باوجود مسلسل نَو نَو مہینے تک اس کی ماں اپنے بطن کے اندر رکھے ہوئے، بوجھل بنے ہوئے، چلتی پھرتی نہیں رہی ہے؟ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو برس تک اپنے جسم کا خون دودھ کی شکل میں نہیں پلایا ہے؟ دن اور رات کے چوبیسوں گھنٹوں میں ہر وقت کی دیکھ بھال، حفاظت و کفالت اپنے ذمہ نہیں رکھی ہے۔ حملتہ امہ وھنًا علی وھن وفصٰلہ فی عامین ــــ اور پھر ان سب سے کٹھن، دشوار تر اور اہم ترین کام نومولود کی سیرت سازی اور اس کی تربیت کی تشکیل اور تکمیل کس کے حصہ میں رہی ہے؟

غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا!

دنیا کی عمر جب سے قائم ہے، اس مشکل ترین اور نازک ترین ذمہ داری کو آج تک عورت ہی نے جھیلا، نباہا اور سنبھالا ہے۔ اور یہی راز ہے اس کا کہ جنت باپ کے نہیں ماں کے قدموں کے نیچے ارشاد ہوئی ہے۔

دو مسافر ہیں جو ایک لمبا سفر ایک اجنبی ملک کا شروع کرنے والے ہیں۔ ایک ان میں سے ٹائم ٹیبل اور گائیڈ بک خریدتا ہے۔ پرانے مسافروں سے مل کر مسافت کا، جغرافیہ کا، موسم کا، آب و ہوا کا، طرزِ معاشرت کا، ایک ایک چیز کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ کرایہ کیا پڑے گا، راستہ کون سا اختیار کرنا پڑے گا، زبان کی اجنبیت کیسے حل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز کام آنے والی جان لیتا ہے۔ دوسرے صاحب ہیں جو آغازِ سفر کے وقت کسی صاحبِ تجربہ سے مشورہ کرنا اپنے عزمِ آزادی سفر کی توہین سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں بس جب چاہوں گا، جس سمت چاہوں گا، جس سامان کے ساتھ، جس حال میں ہوں گا چل کھڑا ہوں گا دوسروں کی ہدایتوں کا سبق پڑھتے رہنا توہین میری آزادی ارادہ کی ـــ عورت کے نادان دوست جو آج نوجوان، کمسن، ناتجربہ کار لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان یہ پروپیگنڈہ کرنے اٹھے ہیں کہ جو جس سے چاہے بلا والدین کی وساطت و مشورت کے شادی رچائے ٹھیک اسی قسم کی آزادی کے مبلغ ہیں۔ ان خود پسندیدہ شادیوں کے جو نتیجے فرنگیوں اور فرنگنوں کے ملک میں نکل رہے ہیں، اور طلاق و تفریق کے جو جو فضیحتے وہاں کی عدالتوں کی مسلوں اور اخبارات کے صفوں کی رونق بنے رہتے ہیں ان کے مختصر اعادہ کے لئے محل ہیں گنجائش کہاں سے نکالی جائے؟

یہ حقیقت صرف شریعت اسلام نے پیشِ نظر رکھی ہے کہ نکاح نام ہے حتی الامکان عمر بھر کے لئے ایک معاہدہ کا۔ اور دن رات ہر وقت اور ہر قسم کے سابقہ کا، بچہ جس طرح ہمیشہ بچہ نہیں رہتا، محفل کا نوشہ ہمیشہ دولھا اور دولھن ہمیشہ نئی نویلی ہی نہیں رہتی۔ شادی کی رات بہرحال چند گھنٹوں کی عمر لے کر آئی ہے اور شادی کا دن بہرحال دن ہی بھر کا ہوتا ہے۔ ہر سن اور ہر دن نئے مسئلے سامنے لائے گا اور خود نوجوانی میں بھی ایک ہی قسم کے بیسیوں مختلف و متضاد جذبات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لازمی ہے کہ اپنی ذاتی پسند و انتخاب کے ساتھ اپنے مخلص ترین و تجربہ کار بزرگوں کے مشوروں کو شریک رکھا جائے۔ اور یہی حکمت ہے ہماری شریعت میں ولی کی اہمیت کی! آج جنھیں جوانی سے اترا ہوا اور پیری کی طرف جھکا ہوا دیکھا جا رہا ہے آخر وہ بھی نوجوان ہی رہ چکے ہیں اور نوعمری کے جذبات سے پوری طرح لذت آشنا و سرشار۔ ع

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی!

واقف اس کوچہ کے قدم قدم سے، آگاہ اس وادی کے ایک ایک پیچ و خم سے ــــ

معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی　　مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہگذر سے

دنیا کے سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے خطیب کا خطبۂ نکاح اصل عربی میں آپ نے دو مختلف ٹکڑوں میں سن لیا۔ اس کی تمہید میں جو کچھ ارشاد ہوا اس کی تشریح چند منٹ قبل آپ سن چکے تجدید ایمان کے اس درس کے بعد اللہ کے بندہ اور پیغمبر نے اپنا کلام چھوڑ کر اپنے خالق کا کلام کچھ مختصر سا سنا دیا اور چار آیتوں کی تلاوت تین متفرق مقامات سے کر دی۔ سارا زور تقویٰ الٰہی و خشیت پر۔ گویا نئی زندگی میں داخلہ کے وقت سب سے زیادہ زور و تاکید کی چیز یہی خوف خدا ہے۔ رسول اللہ صلعم دنیا کے لئے معلم ہو کر آئے تھے۔ مصلح ہو کر آئے تھے نعوذ باللہ کوئی فلسفی، کوئی شاعر کوئی رومان نویس نہ تھے۔ جانتے تھے کہ جس رشتہ میں دو ذی روح، صاحب ارادہ ہستیوں کا ساتھ اور ساتھ سال کے ۳۶۵ دنوں اور دن کے ۲۴ گھنٹوں کا ہے۔ لازمی ہے کہ ناگواریاں بھی پیش آئیں اور کبھی کبھی ناچاقیاں بھی، کبھی بے التفاتی کی سردمہریاں اپنا رنگ جمائیں گی کبھی غصہ و اشتعال کی گرماگرمیاں اپنا زور دکھائیں گی، کبھی دکھ کبھی سکھ، کبھی مایوسیاں، کبھی معذوریاں، کبھی بیماریوں کی دکھن، کبھی ناکامیوں کی چبھن۔ علاج ان سب چھوٹے اور بڑے امراض کا، ناخوشگواریوں کے سلسلہ دراز کا ازدواجی زندگی کے ہر نشیب و فراز کا، ایک اور صرف ایک ہے اور اسی کا نام ہے خوف خدا یا تقویٰ الٰہی۔ یہی ایک ایسی اکسیر کی پڑیا ہے جو ہر معصیت سے بچائے گی، ہر لغزش کے وقت آڑے آئے گی۔ یہی معنی و مفہوم ہیں ایجاب و قبول کے اور یہی حکمت ہے خطبۂ نبوی میں آیاتِ تقویٰ کے تکرار کی۔

خطبۂ نکاح کا خاتمہ اس قانونِ ربانی کی منادی پر ہوتا ہے کہ ومن یطع اللہ ورسولہ فقد فاز فوزاً عظیماً۔ اصلاح و فلاح کی راہ دکھانے والی روشنی تو صرف اللہ اور رسولؐ کے قانون شریعت میں ہے اور کامیابی تو اسی کا حصہ ہے جو اطاعت اس کامل ہدایت نامہ اور مکمل دستور العمل کی اختیار کرے، اپنی ہی جیسی محدود عقل و بینش رکھنے والوں کے نظریوں اور فلسفوں کی غلامی چھوڑ کر۔ اور کامیابی یا فوز عظیم بھی کیسی؟ مادی بھی اور روحانی بھی، اخروی بھی اور دنیاوی بھی، اشخاص و افراد کے لئے بھی اور اقوام و جماعت کے لئے بھی — اور اس ایک شاہراہ کے سوا ہر روش باطل اور راہرو کے حق میں سم قاتل۔ خواہ وہ راہ دکھلانے والا فرزند ہو ایران کا یا برٹرینڈرسل ہو انگلستان کا، یا جج لینڈسے ہو امریکہ ذی شان کا!

نکاح اسلام کی نظر میں معاہدہ ہے ایک طرف سے اطاعت کا، خدمت کا۔ دوسری طرف سے حفاظت کا، کفالت کا، اور دونوں طرف سے محبت کا، اخلاص کا، رفاقت کا۔ وجعل بینکم مودۃً ورحمۃً۔ ایک نسبتہً ضعیف و نازک مخلوق زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اپنے کو دوسرے کے سپرد کر رہی ہوں، دوسری نسبتہً قوی و صاحب اقتدار ہستی قول دے رہی ہے کہ میں دوسرے کی ذمہ داری کو قبول کر رہا ہوں۔ اور دونوں اپنے اس اقرار پر گواہ ٹھیرا رہے ہیں علاوہ ضابطہ کے ان دو عاقل و بالغ گواہوں کے جن کا تعلق صرف عالم شہادت کے ظواہر سے ہے، خود عالم الغیب والشہادۃ اور اس کی ساری غیبی و شہودی قوتوں کو۔ نہ ہو کہ عمر کے کسی مرحلہ میں، حیات منزلی کے کسی شعبہ میں، غفلت کے کسی لمحہ میں، نگاہ استقامت بھٹکے، قدم استقامت پھسلے، مرد جو گھر کا کپتان کہلاتا ہے قوام ہے باختیار ہے۔ قدرۃً خطاب بھی خطبہ بھر میں براہ راست مردہی سے ہے اور حجۃ الوداع کے مشہور و معروف خطبہ میں زبان نبوت نے مردوں سے خطاب کی صراحت کر دی ہے کہ اتقوا اللہ فی النساء — (اے مردو) اللہ سے ڈرتے رہو عورتوں کے حقوق کے باب میں۔ پرہیز کی ہدایت اسی کو کی جاتی ہے جس سے بد پرہیزی کا خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور اختیارات محدود اسی کے کئے جاتے ہیں جسے حکمرانی کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ حدیث کی ہر کتاب النکاح کے ماتحت ایک باب معشرۃ النساء کا یا مثل اس کے ملے گا۔ بیوی کے ساتھ حسن معاشرت، رفق و ملاطفت کی تفصیل و تاکید سے یہ بھرا ہوگا۔ یہ سب تفسیر ہے قرآنی وعاشروھن بالمعروف کی۔ رسول پاک کے ارشادات کان لگا کر سنیئے تو صاف یہ آوازیں سننے میں آئیں گی کہ بیوی کو اپنی ہی طرح کھلاؤ، پلاؤ

اپنی ہی سطح پر معاشرت و معیشت میں رکھو۔ اس کی دل شکنی کی بات زبان پر نہ لاؤ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی کا حق سارے برتاؤ میں پہچانو۔ یعنی جو معاملات بھی برتنے میں آئیں ان کا طریقہ بہتر سے بہتر رہے اور شستہ سے شستہ۔ نہ یہ کہ دیکھنے والے سمجھیں کہ کسی بھک منگی غریب کی جھولی میں خیرات کا ٹکڑا ڈالا جا رہا ہے ان کی اصلاح کی کوشش بھی ضرور کرو۔ لیکن اس میں بھی لحاظ ان کی نزاکت کا رکھو۔ کہ ان کو اتنا نہ جھکاؤ کہ ٹوٹ کر رہ جائے۔ اور تو اور مومن کے ایمان تک کا معیار یہ ارشاد ہوا ہے کہ ایمان کامل ترین اس کا ہے جو اپنے اہل کے حق میں اپنی عورتوں کے معاملہ میں نرم ہے۔

بچپن میں جب کسی کی شادی کا نام سننے میں آتا تو ذہن اپنے سامنے جلسہ اور دعوت کی تصویر لا کھڑی کرتا۔ بچپن کا یہ خواب نوجوانی تک قائم رہا، گو شکل بدل گئی نکاح کی حقیقت اور اہمیت اب بھی مخفی رہی، اور جھوٹے شاعر اور لباڑیے رومان نویس اصل حقائق کو مخفی سے مخفی تر بنانے گئے۔ پھر جب خیال اپنی شادی کا آنے لگا تو اس کے معنی چند تفریحوں اور چند دلچسپیوں تک محدود رہے۔ گویا ازدواجی زندگی عظیم الشان ومستقل بے نہایت ہیبتوں کے ساتھ سمٹ آئی تھی غفلت کے چند قہقہوں میں، عشرت کے چند زمزموں میں! گویا سفر کا آغاز نفس سفر اور اختتام سفر کے مترادف تھا! — آہ بچپن کی نادانیاں اور نوعمری کی خام خیالیاں! بات اتنی صاف، صریح، واضح، لیکن اس وقت سمجھ میں نہ آئی تھی، نہ آئی کہ اس ایک "آج" پر خدا معلوم کتنے "کل" آنے والے ہیں، نرم بھی اور گرم بھی اور اس ایک نام کی صبحیں طلوع ہونے والی ہیں، دلکش و رنگین بھی اور اداس و غمگین بھی۔ آنکھوں سے پردے رفتہ ہی رفتہ ہٹے اور سوالات پیچیدہ پیچیدہ اور سنجیدہ سے سنجیدہ ہر قسم کے چھڑے یہاں تک کہ نوجوانی کی برق پاشیاں رخصت ہوئیں اور پختہ عمر کی ٹھنڈی چاندنی چھٹکی اور ترجمانِ حقیقت، اقبالؔ کا شعر قال نہیں حال بنکر رہا۔

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو

میں حکایت غم عاشقی، تو حدیث ماتم دلبری!

قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے اس معلم و ہادی کے جس نے ایک مختصر سے خطبہ میں، راہ کی ان منزلوں کی طرف اشارہ کر دیا اور ہر مشکل کا حل نسخہ تقوائے الٰہی میں دے دیا۔ مردہ ہے جو ان سب موقعوں پر اپنی ذمہ داریوں کو، ذمہ داری کی گراں باریوں کو یاد رکھے! — جذبات کی تیز و تند آندھی یقیناً گزر جانے والی ہے اور اسے گزر ہی جانا چاہیے بغیر اس کے کہ گھروں میں آگ لگائے بغیر اس کے کہ ہرے بھرے گلشن کو جھلسا دے۔ لیکن طویل رفاقت و ہمدمی ہے جو باہمی مناسبت فریقین میں پیدا ہو جاتی ہے اور مناسبت تام آہستہ آہستہ موانست تام بن جاتی ہے اور اس انس و موانست اور محبت لطیف کی نسیم جانفزا کی ہلکی ہلکی جنبشیں زندگی کی آخری سانس تک میں لذت و حلاوت باقی رکھتی ہیں؎

طریق عشق و محبت اور ہوا و ہوس　　وہ راہبر کی ہدایت یہ رہگذر کا فریب

باپ کا سن جب، تنا آجائے کہ اولاد بالغ ہو کر شادی کے قابل ہو جائے تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہ وقت جو دور کبھی نہ تھا اب اور قریب ہے۔ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ اللہ کے برگزیدہ پیمبروں اور ہم بنی اسرائیلی قدر دانیوں کے نسبی بزرگوں کی سنت چلی آ رہی ہے کہ اس نہ ٹلنے والے وقت کا قرب محسوس ہو جائے تو وصیت کا کلمہ اپنی اولاد کو پہنچا دیا جائے۔ حاضرین بھی اس وصیت کو سن لیں اور گواہ رہیں کہ جس بزم کا آغاز تحمد شکر سے ہوا تھا اس کا اختتام انا للہ پر ہو رہا ہے۔ وصیت کچھ لانبی چوڑی نہیں، دونوں نبیوں کے پروردگار نے اپنے اسمٰعیلؑ آخری نبی کے واسطہ سے گنتی کے چند لفظوں میں ہم تک پہنچا دی ہے۔

ان اللہ اصطفٰی لکم الدین فلا تموتن الا و انتم مسلمون — الا العالمین اور اس کے فرشتے گواہ ہیں کہ اسلامی زندگی کی تکمیل

کے لئے تلاش جب رشتہ کی ہوئی تو کچھ اسی وصیت کی تعمیل میں قرعہ انتخاب خاندان کے اس نوجوان کے نام پر پڑا، جو ماشاء اللہ الا ّ وانتم مسلمون کی ایک حد تک زندہ تفسیر اسی بیسویں صدی کے ماحول میں ہے۔ دیہات کی نہیں، لکھنؤ کی فضا میں وہ پلا اور بڑھا۔ کالج اور یونیورسٹی کے درجے اسی فضا میں ایک ایک کر کے طے کئے۔ انٹرمیڈیٹ کیا، بی اے کیا، سیاسیات کا مضمون لے کر آنرز کیا، ایم اے کیا اور اب قریب ہے کہ قرون اولیٰ کی سیاسیات اسلامی پر ریسرچ کر کے انشاء اللہ ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرے۔

اس ساری مدت میں جواں سالی کی آٹھ آٹھ اور دس دس سال کی .... پھیلی ہوئی مدت میں اس سے اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ دیکھا جائے کہ وہ کے بار سینما گیا، کافی ہاؤس اور ایمبیسڈر اور ٹے فیر کے کتنے چکر لگائے؟ اپنی شامیں اور راتیں کن کن فیشن ایبل تفریح گاہوں، ہوٹلوں، تماشہ گاہوں میں گذاریں، کتنی بار سگرٹ سگار سے شوق کیا؟ کتنی لاٹریوں میں شرکت کی؟ —— بحمد اللہ خود ہی ان راہوں سے الگ نہیں رہا دوسروں کو بھی اپنے امکان بھر ان کوچوں کی سیر سے باز رکھا۔ اور مالک مولیٰ کے دربار میں یہ حق قائم کر لیا کہ شاید دوسروں کے حق میں شفاعت کی خدمت انجام دے سکے۔ جس حاکم و مالک نے معصوم بچوں تک کو (جو ابھی گناہ و ثواب کے معنی ہی سے آشنا نہیں) یہ حق دے رکھا ہے کہ اپنے گنہگار والدین کی سفارش کر سکیں کیا وہ ایک سعید و صالح نوجوان کو دنیا میں رہ کر اپنے کو تر دامنی سے محفوظ رکھنے والے کو اس حق سے محروم رکھے گا؟ کیا اسے اس کی اجازت نہ دے گا کہ وہ اپنے کسی بڑے خصوصاً اس بڑے کے حق میں جو اس کی تربیت دینے میں کچھ تھوڑا بہت شریک رہا ہے، احکم الحاکمین کی عدالت میں کوئی کلمہ خیر کہہ سکے؟ جو خود طاعت و حسنات سے تہی دامن ہو۔ کیا اس کے لئے یہ کمائی کچھ تھوڑی یا کم قیمت ہے؟ بہرحال انتخاب بندہ کا کام تھا۔ انتخاب کی لاج رکھنا بندہ نواز مالک و مختار کے ہاتھ میں ہے۔

یہ مبارک زمانہ ذی الحجہ کے عشرہ اول کا ہے۔ آج کی تاریخ میں حاجی اور زائر کس ذوق اور شوق سے اپنے پروردگار کے نام کی رٹ لگائے ہوں گے اور ہزار ہا ہزار بندے کیسی کیسی عبادتوں، طاعتوں، ریاضتوں میں لگے ہوں گے۔ بشارت ہو آپ سب لوگوں کو کہ اس بزم مناکحت میں شریک ہو کر آپ لوگ اس مبارک عشرہ میں اپنے اجر کو باطل اور اپنے وقت کو ضایع نہیں کر رہے ہیں —— نکاح شریعت اسلامی میں بجائے خود ایک عبادت ہے اور اس میں شریک ہونا اور اس کا شاہد بننا اپنی جگہ پر ایک طاعت!

درازنفسی بہت ہو چکی۔ اب وہ ساعت سعید آگئی جب اللہ کا ایک بندہ اور ایک بندی اللہ کا نام لے کر اسی کی شریعت کا واسطہ دیکر دو قالبوں کے باوجود ایک قلب ایک جان ہو کر رہیں اور جو میثم کا پیمان ہے وہ شریعت ہی کے بتائے ہوئے قانونی الفاظ میں امانت کے چارج لینے، اپنی ذمہ داری کے قبول کرنے کا اقرار اور اعلان کرے۔

(ایجاب و قبول کے الفاظ مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلی نے ادا کر دیئے) بارک اللہ لکم و بارک علیکم وجمع منکم فی خیر —— اے اللہ آج تیرے ایک ناتواں بندے اور ناتواں بندی کے درمیان تیرے ہی قانون کے ماتحت تیرے ہی حکم و ہدایت کے مطابق، تیری ہی رضا کے خاطر وہ رشتہ قائم ہوا ہے جو آدم و حوا سے لے کر اب تک تیرے بے شمار بندوں اور بندیوں کے درمیان قائم ہو چکا ہے۔ اے اللہ! ان سب کے طفیل میں ان دونوں کو بھی پورا اتار، ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھ۔ ان کے تقویٰ کو پاک کر دے! ان کے قلوب کو اپنی محبت و ذوق طاعت سے بھر دے! ان کی عاقبت کو سنوار دے! ان کی زندگیاں تیرے ہی نام کی برکت کا سہارا لیکر جوڑی جا رہی ہیں۔ اس سہارے کو قائم رکھ جب یہ تیری زمین پر رہیں، جب اس عالم سے اٹھیں اور جب دوبارہ تیرے حضور میں ہو پہنچیں! اپنی مرضی یہ دونو تیری رضی میں گم کر دیں تو ان کا ہو جا اور یہ تیرے ہو جائیں! اے اللہ ان کو اور ان کی نسل کو سارے فتنوں سے محفوظ کر دے خواہ عصر حاضر کے ہوں یا عصر مستقبل کے، خواہ وہ کیسے ہی خوشنما نقاب اپنے چہروں پر ڈال کر آئیں اور کیسے ہی نظر فریب

پردوں میں اپنے کو چھپائیں!

اے اللہ! ان کے نصیب پر سایہ ڈال دے اپنے خلیل ابراہیمؑ اور بی بی سارہؓ کا، اپنے خلیل ابراہیمؑ اور بی بی ہاجرہؓ کا، انھیں نقشِ قدم پر چلا، رسول اکرم محمد مصطفےٰ اور بی بی خدیجہؓ، رسول اکرم محمدؐ مصطفےٰ اور بی بی عائشہؓ کے! بادِ سموم کی ہر لپیٹ کو ان کے حق میں نسیمِ سحر کا جھونکا بنا دے۔ آتشِ نمرود کے ہر شعلہ میں ان کے لئے گلزارِ خلیل کے پھول کھلا دے۔ اپنے دین کی محبت ان کے دلوں میں جما دے، اپنے دین کی نصرت کا جذبہ ان کے اندر جگا دے! جب تک اس دنیا میں آباد رہیں اسلام کے ہتھیاروں سے اپنے جسم کو سجائے ہوئے اور جب تیرے حضور میں حاضر ہوں تو ایمان کا طغرا پیشانی پر لگائے ہوئے! جب بلاوا تیرے ہاں سے آئے تو ان کے دل تیرے دید کی آرزو لبھائے ہوئے ہوں اور ان کے چہرے تیرے شوق و اشتیاق کی چمک سے جگمگاتے ہوئے ہوں۔ دنیا غدار ہو جائے یہ محمدؐ کے وفادار رہیں۔ زمانہ اپنے قول سے پھر جائے یہ کلمہ توحید پر استوار رہیں! انھیں شرمندہ نہ کر، نہ ایک دوسرے سے نہ اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ سے! تیری رضیات کی جنت ان کے لئے ہو اور یہ تیری جنت کے لئے اپنے کھلے ہوئے چہروں کے ساتھ ہنستے ہوئے جلووں کے ساتھ، چمکتے ہوئے بشروں کے ساتھ، دمکتے ہوئے مکھڑوں کے ساتھ اور اپنے ساتھ آج کے سب دعاگوؤں کو لئے ہوئے!

علمائے دین سے

میرا دل چاہتا ہے۔ کہوں۔ کہ اے رسول کریمؐ کے تابعو اور اے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کے دعیو۔ یہ دین کے منبر کو چھوڑ کر دنیا پرستوں کی کاروں کے پیچھے دوڑنے میں تم کیوں اتنے بادپا ہو گئے ہو۔ کوئی غرض پرست ایسا نہیں رہا کہ جس نے اپنے اعمالِ قبیحہ کے جواز کے لئے تم میں سے کسی ایک کو دینِ قیم کا استہزا کرنے کے لئے مامور کر رکھا ہو۔ تم جو ابو حنیفہؒ کی پیروی میں سعادت سمجھتے ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو شاہوں کے درباروں میں جانا بھی حرام سمجھتے تھے۔ تم جو احمد بن حنبلؒ کے پیرو ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لئے برس ہا برس تک کوڑے کھا سکتے تھے۔ تم جو امام مالکؒ کے معترف ہو۔ جانتے ہو کہ وہ تو حق کے لئے سخت سے سخت اذیت سہہ سکتے تھے۔ تم نے تو امام شافعیؒ کی حق پرستی کا بھی پاس چھوڑ دیا۔ تم نے تو امام حسینؓ کے جذبۂ قربانی کو بھی رسوا اور رسوا کر دیا۔

میں تم سے کیا کہوں کہ تم نے ہر قدم پر اللہ اور اس کے نبیؐ کے احکام سنائے اور پھر ہر قدم پر انھیں احکام سے چشم پوشی کی۔ تم نے شاہوں کو للکارا۔ اور انھیں کے ہاتھوں بک گئے تم حق کی پشت پناہی کی اور اسے ہی پیٹھ دکھا گئے۔ جب بھی باطل نے مصالحت اور مکر و فریب کا ہاتھ تمہاری طرف بڑھایا تم نے ہمیشہ بصیرتِ مومن کو بالائے طاق رکھ دیا۔ بلخ بخارا اور سمرقند جہاں سے امام بخاریؒ جیسے بزرگانِ دین اٹھے اور جہاں صدیوں اسلام سربلند رہا۔ وہاں تم نے دہریوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں خود اپنے ہتھیار دئیے اور جب انھوں نے تمہاری ایک ایک گردن سے خون بہا دیا۔ اور تمہاری مسجدوں کے ہر مینار پر لکھ دیا کہ آج سے یہاں مذہب کا نام بلند نہ ہو گا۔ تو پھر تمہیں معلوم ہوا کہ تم نے اپنی ہی تلواروں سے اپنے گلے کاٹے تھے۔ تم نے ترکی میں ان لوگوں کو قوت دی جو اسلام سے بیزار تھے۔ اور جب انھوں نے وہ سب کچھ جو اسلام کا تھا اتار کر پھینک دیا۔ اور وہ سب کچھ جو مغرب کی دہریت کا تھا اوڑھ لیا۔ تو تب تمہیں ہوش آیا کہ تم نے غلطی سے اسلام ہی کا مورچہ اکھاڑ پھینکا تھا۔

(اسعد گیلانی)

ہماری نظر میں

ہم ناقد ہیں اس لئے نہ قصیدہ خواں ہیں اور نہ ہجو نگار، دیانت ہمارا شعار اور انصاف ہمارا مسلک ہے جو ارباب قلم تحسین و ستایش سننے کے خوگر ہیں، اُن کی تمناؤں کا "فاران" ساتھ نہیں دے سکتا، شخصیتوں کی بلندیوں اور پستیوں کی طرف ہم نہیں دیکھتے ہمارے سامنے نام نہیں کام ہوتا ہے اور اُسی کو دیکھ کر ہم فیصلہ دیتے ہیں، لبوں کی مسکراہٹیں اور پیشانیوں کی شکنیں ہماری تنقید پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

لمعات مولوی رضی احمد رضیؔ بدایونی کی غزلوں کا انتخاب —— جسے پروفیسر ضیا احمد ضیاؔ ایم۔ اے بدایونی نے مرتب کیا، ۱۴۴ صفحات، قیمت دو روپے، پتہ درج نہیں ہے، غالباً مولوی ضیا احمد صاحب بدایونیؔ پروفیسر فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی معرفت یہ مجموعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بدایوں کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے، اور شعر و سخن تو وہاں سبزے کی طرح اُگتے ہیں، بدایوں کی بہت سی شخصیتیں نظر عام پر نہ آسکیں، کچھ تو زمانہ نے قدر ناشناسی کا ثبوت دیا اور کچھ ان لوگوں نے بھی بے نیازی برتی —— ہرچند کہ عطر کی خوشبو عطار کے تعارف کی محتاج نہیں ہوتی مگر عطار کو عطر کے قرابوں سے دُکان تو سجانی پڑتی ہے، بوئے عطر بازار میں پھیلتی ہے تو اُس کی لپٹیں لوگوں سے اپنا تعارف کراتی ہیں کہ "ہم یہ ہیں ......!"

جناب رضیؔ بدایونی بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جو شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود مشہور نہ ہوسکے، اُن کے انتخاب "غزلیات" (لمعات) سے بھی گنتی کے لوگ ہی واقف ہوں گے، اور اب شعر و ادب کے اس انقلابی ہنگامے میں اُن کی آواز کو نشر بھی کیا جائے گا تو وہ پوری طرح سنی نہ جاسکے گی۔

لمعات کا تعارف حضرت جگر مرادآبادی نے لکھا ہے، رضیؔ بدایونی کے بارے میں رئیس المتغزلین کی رائے ہے کہ :-

"وہ خود نہایت بلند مذاق شعری رکھتے تھے، جذبات و خیالات کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ انداز بیان میں مکمل شعریت مذاقِ مرحوم کی خصوصیاتِ کلام ہیں، اُن کے کلام میں زندگی کی صداقتیں محسوس ہوتی ہیں ......"

اس انتخاب کی تقریب پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے، انھوں نے شاعر کی تعریف میں مبالغہ نہیں کیا شاعر کو اُس کا صحیح اور واقعی مقام دے کر یہاں تک لکھ دیا ہے :-

رضیؔ کا کوئی خاص نظریہ حیات نہیں ہے، اُن کی فکر میں کوئی نمایاں انفرادیت بھی نہیں ہے تاہم وہ ایک سنجیدہ اور حکیمانہ انداز رکھتے ہیں —— لیکن (تقریب کا آخری جملہ) ادبیت کی وجہ سے اُن کا کلام ہمیشہ لطف و انبساط کا باعث ہوگا۔

رضیؔ بدایونی کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ جناب ظفر ایاب حسین جامؔ بدایونی نے لکھے ہیں، یہ حالات تیرہ از معلومات ضرور ہیں مگر

پڑھنے والوں کو ان میں خاطر خواہ دلچسپی کے سامان نہیں مل سکتے، صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے۔ "اور انسپکٹروں کو ہنٹر سے پھٹکارنا پڑا" زبان ومحاورہ کے اعتبار سے یہ غلط ہے، ہنٹر سے مارا اور پیٹا جاتا ہے پھٹکارا نہیں جاتا۔

لمعات پر تبصرہ اور سیر حاصل تبصرہ جناب ضیاء احمد ایم۔ اے بدایونی کی تراوش خامہ کا شاہکار ہے، اس مضمون میں بہت سے ادبی اور فنی مباحث بھی آگئے ہیں، جو نہ صرف پڑھنے بلکہ یاد رکھنے کے قابل ہیں، تبصرہ کے مطالعہ سے رضی بدایونی کی سخن سنجی اور شعر فہمی کے بھی جوہر کھلتے ہیں، کلام مومن کے وہ اپنے دور میں بہت مستند اور قابل اعتماد شارح تھے، پروفیسر ضیاء احمد نے متعدد شاعروں کے کلام پر رضی بدایونی کی اصلاحیں بھی پیش کی ہیں، جن سے شاعر کی فنی استعداد اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں کا اظہار ہوتا ہے ——— مگر کہیں کہیں اُن کی اصلاحوں اور مشوروں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے مثلاً:-

پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایم۔ اے کے اس شعر:-

آہ! اے تازہ اسیر کشمکش گاہِ حیات　　آہ! اے نو وارد بزم بساطِ کائنات

کے دوسرے مصرعہ کو رضی بدایونی نے اس طرح بدلا:-

آہ! اے نو وارد کہنہ رباطِ کائنات

"رباط" کا لفظ "بساط" کے مقابلہ میں اُردو داں طبقہ کے لئے غریب ہے، اور "کہنہ" کے ساتھ مل کر تو مصرعہ کی نغمگی ہی جاتی رہی ———

پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا تبصرہ یقیناً قابل قدر ہے مگر چونکہ رضی بدایونی اُن کے بڑے بھائی تھے اس لئے عبارت میں بعض مقامات پر برادرانہ محبت بلکہ عقیدت بھی غیر شعوری طور پر شامل ہو گئی ہے، میں اس انداز کی اونچ نیچ کو "معصوم" کہا کرتا ہوں۔ رضی بدایونی مرحوم کے انتخابات غزلیات (لمعات) سے چند اشعار اپنی پسند کے چُن کر اہل ذوق کی بارگاہِ نقد و نظر میں پیش کئے جاتے ہیں:-

نہ سوچا پہلے انجام محبت یہ خبر کیا تھی　　نگاہِ اولیں کو ہے نگاہِ واپسیں ہونا

جلوہ دکھا کے حضرت موسیٰ کو چھپ گئے　　کیا اور کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

پھنسی ہے ورطۂ اُمید و بیم میں کشتی　　میں نامراد نہ گرداب کا نہ ساحل کا

رحمت ہے ہر افتاد رہِ سعی طلب میں　　ٹھوکر کوئی لگتی ہے تو بڑھتا ہے قدم اور

در توبہ ہے اگر بند تو ہو اے واعظ!　　غم نہیں ہے کہ کھلا ہے درِ میخانہ ہنوز

صبر کی ہوتی ہے عاشق کو شبِ غم تاکید　　آپ اُس بات کو کہتے ہیں جو امکاں میں نہیں

حیاتِ رفتہ یہ کرتا ہے تبصرہ مجھ کو　　شباب کاش! پلٹ آئے رات بھر کے لئے

عقل حیرت میں ہے اندیشہ تگ و تاز میں ہے کائناتِ دو جہاں رازمیں تھی راز میں ہے

اک نرا عشق کہ پنہاں ہے مگر رسوا ہے اک نرا حُسن کہ عریاں ہے مگر راز میں ہے

دل ذرہ اور وسعتِ کونین اُس میں گم اشک ایک قطرہ اور سمندر لئے ہوئے

رقصِ ابلیس انقلاب ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستان ——— ایم۔ اسلم کے قلم سے! خوبصورت جلد، کتابت و طباعت دیدہ زیب، ضخامت ۳۰۴ صفحے، قیمت چار روپیہ ——— ملنے کا پتہ۔ دارالبلاغ۔ اقبال روڈ لاہور

۱۹۴۷ء ہندوستان اور پاکستان کے لئے انتہائی المناک سال تھا، دیکھتے دیکھتے اچھے خاصے متمدن آدمی درندے بن گئے جیسے یہ سدا سے ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے ہیں، انسانیت چیخ رہی تھی، دہائی دے رہی تھی، فریاد کر رہی تھی مگر اس شورِ قتل و غارت گری میں انسانیت کی چیخیں دب کر رہ گئیں، ایران، روما، بغداد اور فرانس کے انقلابوں کا حال ہم تاریخوں میں پڑھ کر سرسری گزر جاتے تھے مگر خود پر جب انقلاب کے پہاڑ ٹوٹے تو محسوس ہوا کہ انقلاب اسے کہتے ہیں! مشہور افسانہ نگار ایم، اسلم نے انھیں روح فرسا حوادث اور خونین واقعات کو ناول کے پیرایہ میں لکھا ہے۔

افسانوی ٹیکنک خیالی افسانوں اور تخیلی ناولوں میں پیدا کی جاتی ہے، افسانہ نگار اپنی تخیل کے زور سے خاکے بناتا اور ان میں رنگ بھرتا ہے مگر جب واقعات افسانہ اور ناول کے روپ میں آتے ہیں تو تخیل کی شوخیاں پابند ہو جاتی ہیں، کتاب کہنے کو تو ناول ہے لیکن اس میں ڈائری اور روزنامچے، کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

"رقصِ ابلیس" ایک ایسا نام ہے جس سے نشاط و سرخوشی کا اظہار ہوتا ہے لیکن یہ کتاب تو انسانیت کا مرثیہ اور آدمیت کا نوحہ ہے، ہاں! ہاں! ۱۹۴۷ء میں ابلیس نے رقص کیا تھا، مگر کہاں؟ تڑپتی ہوئی لاشوں، جلتے ہوئے مکانوں اور روندی ہوئی عصمتوں پر! مصنف نے جب اس کتاب کو لکھا ہے تو معلوم ہوتا ہے اُس کے دل کا خون اُنگلیوں میں کھنچ کر آ گیا تھا، بعض حصے بہت زیادہ درد ناک ہیں، اسلم صاحب نے دل کی چیخوں کو لفظوں میں بند کر دیا ہے، کہیں کہیں ان خونین حادثات کا " CLIMAX " بہت زیادہ درد انگیز ہے۔ مصنف کی طبیعت کا جھکاؤ فطرتاً مظلوم تر فرقہ کی طرف ہے مگر اس کے قلم نے غیر مسلموں کے ایثار، رحمدلی اور عالی ظرفی کو بھی سراہا ہے۔

اسلم صاحب نے اس ناول میں بھی لفظ و بیان کی بہت سی غلطیاں کی ہیں لکھتے ہیں۔ "بوم کی گھناؤنی آواز سنائی دینے لگتی" صفحہ ۵۲ بوم کی آواز ڈراؤنی ہوتی ہے گھناؤنی ہرگز نہیں ہوتی ——— اور چند نمونے:-

غلطیاں	اصلاحی اشارے
لیکن اس سے مستقل طور پر ہم پر اس کی تاڑ رہے گی (صفحہ ۱)	تاڑ پڑنا بولتے ہیں۔
ہوا میٹھی میٹھی لوری دے رہی تھی یہ تو معلوم نہیں کہ کیا وقت تھا لیکن اِدھر اُدھر سے مرغ کی ککڑوں کوں سے یہ اندازہ	"ککڑوں کوں" طنز اور مزاح کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جس کا یہاں کوئی قرینہ نہیں!

لگا ناشکل نہ تھا (صفحہ ۱۱۷)

— وہ علمائے دین جو مساجد میں امامت کرواتے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۵) — "کرواتے ہیں" وجدان پر سخت گراں گزرتا ہے، اسلم صاحب نے متعدد جگہ یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

— عباس سے بہت اچھے الفاظ سے تعارف کروایا (صفحہ ۱۹۹) — بہت اچھے الفاظ" میں تعارف کرایا" ہونا چاہیئے۔

— مجھے ذرا درد ہو رہا ہے (صفحہ ۲۰۹) — میرے ذرا درد ہو رہا ہے، یا مجھے ذرا درد محسوس ہو رہا ہے۔

— بڑے بڑے ہیکڑ بازوں اور سرکشوں کو مطیع و فرماں بردار بنایا (صفحہ ۲۵۰) — صرف ہیکڑ کہنا کافی تھا، ہیکڑ باز بالکل غلط اور روز مرہ کے خلاف ہے۔

— دہلی میں میرا ہوٹل تھا — تقسیم کے بعد اکثر مسلمان اپنا کاروبار بند کر کے کراچی جانے لگے (صفحہ ۲۵۲) — یہ غلط ہے، تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مسلمانوں کے ذہن میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ انھیں وطن چھوڑنا پڑے گا، ستمبر ۴۷ء کے فسادات کے بعد انھیں دہلی چھوڑنی پڑی۔

— "عورتوں کی چیخ و پکار" محبوب آہی نے کہا (صفحہ ۲۷۰) — متعدد جگہ "چیخ و پکار" واؤ عطف کے ساتھ لکھا ملتا ہے جو غلط ہے صرف چیخ پکار لکھنا کافی تھا۔

— محبوب محبت سے اُس کے ماتھے پر گیلا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "ہوش کرو نا! مجھے پہچانا نہیں! (صفحہ — ۲۹۱) — ہوش کرو نا! نہ مسموع ہے اور نہ مقبول!

اسلم صاحب کی نئی کتابوں کے جو مسودے چھپنے کے لئے تیار ہیں، اُن پر انھیں نگاہ تنقید ڈال کر، زبان و بیان کی غلطیاں دور کر دینی چاہئیں، اس قسم کی غلطیاں اُن کے یہاں دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے ———— جناب ایم، اسلم نے اس کتاب کے ہر باب کے شروع میں اشعار درج کئے ہیں، جن میں بعض اشعار بے مزہ اور سطحی ہیں اُردو نثر میں موزوں اور برمحل اشعار برتنے کا سلیقہ تو بس ابوالکلام آزاد ہی کا حصہ ہے۔

ان کوتاہیوں کے باوجود "رقص ابلیس" میں دلچسپی پائی جاتی ہے ———— اور سوز و درد بھی! اسلم نے اپنے دل کی چبھن لفظوں میں سمو دی ہے، جہاں یہ احساس شدید ہو گیا ہے —— وہاں!

ضبط کرنا تھا کہ آنسو بن گئے آواز کے

سلسبیل | ماہنامہ سلسبیل (خاص نمبر)، مدیر آباد شاہ پوری، قیمت ڈیڑھ روپیہ، رسالہ کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ، مقام اشاعت، ہڈالی، ضلع شاہ پور، مغربی پنجاب!

جناب آباد شاہ پوری کی ادارت میں ہڈالی جیسے غیر معروف اور نام کے اعتبار سے غیر شاعرانہ مقام سے ماہنامہ "سلسبیل" اپنی، قیادی خصوصیات کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، ہمارے سامنے اُس کا خاص نمبر ہے، جسے فاضل مدیر نے بڑے سلیقہ، کاوش اور خلوص یقین کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

سلسبیل کا ادب اسلامی ادب ہے، اُس کے لکھنے والوں نے اسی مقدس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اپنے افکار قلم بند کئے ہیں۔ ایسا رسالہ جو خالص اسلامی انداز پر معاشرت میں انقلاب چاہتا ہو جس میں ذوقِ ہوس پرور دہ کے لئے سامانِ نشاط بھلا کہاں مل سکتا ہے، ہاں!

ارباب یقین، وراہلِ ایمان کے وجدان کی پذیرائی کے لئے اس میں بلند پایہ علمی مقالے اور دلچسپ افسانے بھی ہیں اور سوز و درد میں ڈوبی ہوئی نظمیں بھی ملتی ہیں۔

مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا شاہکار مقالہ "ہیگل اور مارکس کے تاریخی نظریات اور اسلام" بار بار پڑھے جانے کے قابل ہے، وہ نوجوان جو کمیونزم اور مادیت کی رو میں بہنے کے لئے تیار کھڑے ہیں، اُن کو اس مضمون میں عقلی استدلال کے سایہ میں بصیرت بھی ملے گی اور رہنمائی بھی ملے گی اور صاحبِ فکر مضمون نگار نے نہایت دل نشین انداز میں ثابت کیا ہے کہ ہیگل اور مارکس نے صرف اٹکل سے ایک نظام دنیا کے سامنے پیش کیا جو زیادہ کھلا اور غیر فطری ہے، حقیقی نظامِ زندگی وہی ہے جو وحی الٰہی کے ذریعہ انبیائے کرام نے انسانیت کو دیا۔

ابو علیہ نے سگمنڈ فرائڈ کے مشہور اور بدنام نظریہ "لاشعور" پر طنز نہیں فلسفیانہ تنقید کی ہے، "مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ فرائڈ کے فکر و شعور پر حیوانیت کا بھوت سوار تھا جس نے سب کو بھی گمراہ کیا اور اس کی اتباع میں جو ادب ہمارے سامنے آرہا ہے وہ بھی گمراہی پھیلا رہا ہے ——— یہ مضمون "فلاں صفحہ پر دیکھو" کے چکر میں آکر کتابت کے لحاظ سے غیر مسلسل ہو گیا ہے۔

عبدالحمید بی۔ اے، ظفر سحق انصاری، اور بشیر احمد ارشد کے مضامین بھی اپنی جگہ کافی وزنی ہیں، "نظمیں اور افسانے روشِ عام سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں، ان میں بھی اسلامی روح زبانِ حال سے بول رہی ہے، ہلتبیل کے لکھنے والوں نے دنیا کو بتایا ہے کہ سنجیدگی اور اخلاق و پاکیزگی کی حدود میں رہ کر بھی دلچسپیوں اور شگفتگیوں کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔

انور عظمی کی نظم "قیدِ تنہائی" کا ایک مصرعہ ہے :-

جاتے جاتے یہ صدف بھی برملا کہتی گئی

صدف بالاجماع مذکر ہے ——————— یعقوب قاہر کی نظم " وہ لیڈر کون ہوتے ہیں ؟ رسالہ کے معیار سے فروتر ہے، اُس میں اس انداز کے مصرعے بھی ہیں :———

جو اپنی معصیت کوشی میں ماہ و سال کر ڈالیں

"ماہ و سال کر ڈالنا" مہمل سی بات ہے، شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ لیڈر جو اپنی معصیت کوشی میں ماہ و سال گزار دیں۔

ماصی ضیائی کے افسانہ "اونچی محرابیں" میں، ایک جملہ ہے " اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے اپنے اوپر مارشل لا کی مصیبت مول لے لی " اس میں "اپنے اوپر" وجدان کو کھٹکتا ہے اپنے سر مصیبت مول لے لی۔ لکھنا چاہیئے تھا ——— بعض افسانوں میں افسانویت سے زیادہ واعظانہ رنگ غالب آگیا ہے۔

جناب آباد شاہ پوری شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنا کامیاب شمارہ شایع فرما کر ادب ہی کی نہیں انسانیت کی بروقت خدمت انجام دی ہے، ضرورت ہے کہ خدا شناس ادیب اور شاعر یک جہتی اور تعاون و ہم آہنگی کے ساتھ حقیقی ترقی پسند ادب مسلسل پیش کرتے رہیں تاکہ "تنزل پسندوں" (نام نہاد ترقی پسندوں) کی جھوٹی شہرتوں کے پرچم سرنگوں ہو جائیں، اور عوام کے شعور و ادب کی اخلاق و پاکیزگی کی بنیادوں پر تعمیر ہو سکے۔

Bathe Every Day
The Cleaner Way
LIFEMAN
Medicated
TOILET SOAP

قوم کی فوجی تربیت کا پہلا سبق...... نشانہ بازی

ان ایام میں جب کہ چڑیوں اور پرندوں کا شکار انڈے دینے اور بچے سینے کی بنا پر بند ہو جاتا ہے شکاریوں کے لئے نشانہ بازی کے مواقع مسدود ہو جاتے ہیں اور بندوقوں کو ناکارہ سمجھ کر بکسوں میں بند کر دیتے ہیں ——— تو یہ

ٹریپس ——— اور اس کے ——— کلے پی جن

تجربہ کار شکاریوں کی تفریح طبع اور نوآموز شکاریوں کے لئے مصنوعی پرندوں کو اڑا کر ان پر نشانہ بازی کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ آج ہی ان کو منگا کر پاکستان کی نئی قوم کو صحیح نشانہ بازی کا موقع بہم پہنچانے کے لئے اپنے **گھر یا کلب** میں نصب کرائیے ——— **تاکہ** پاکستانی نونہال نشانہ بازی کی صحیح مشق کر کے قوم کے قابل فخر سپاہی اور جانباز مجاہد بن سکیں۔

آئی۔سی۔آئی
ٹریپس
قیمت ایکسو اسی روپے RS 180/=

ایل کا ئی نگ
کلے پی جن
(ایکسو پچیس کا بکس)
قیمت استر روپے RS 70/=
علاوہ سیلز ٹیکس

بھی
ٹریپس
اور ان کے ـ کلے پی جن
بہ تعداد کثیر اسٹاک میں موجود ہیں! اور
ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کثیر تعداد میں موجود ہے

خان بہادر حاجی وجیہہ الدین ٹرسٹ!

(آرمس اینڈ ایمونیشن ایمپوریم) ——— الیکٹرک ہاؤس ——— الفنسٹن سٹریٹ ——— کراچی ——— صدر

تار کا پتہ "CARTRIDGES"

عسکری تعمیر کا پہلا قدم ہے...... نشانہ بازی

Regd No. S. 1262

زیادہ روشنی

اور

مفت

جی ای سی

جی ای سی لیمپ زیادہ اور صاف روشنی دیتے ہیں، لیکن اس کا خرچ دوسرے لیمپ سے زیادہ نہیں ہوتا -

دیرپائی اور تیز روشنی کیلئے جی ای سی لیمپ استعمال کرکے خود فرق دیکھئے

تجارتی معلومات کے لیئے

جی ای سی الکٹرک کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس ۴۵ کراچی

ماہنامہ
فاران
ماہرالقادری

جلد (۱)   شمارہ ۵ (۳)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

جون سنہ ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ : چھ روپے   فی کاپی ۸/

" ممالک غیر سے   نو روپے   " ۱۲/

"فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی ع ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

نقشِ اوّل

بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

دنیا کی وہ مشہور زبانیں جو عوام کی زبان کہی جاتی ہیں اور جن کی علمی اور ادبی حیثیت بھی مسلّم ہے، دورِ زمانی کے اعتبار سے بہت قدیم ہیں تاریخ کے اُفق پر ابھی دھندلکا چھایا ہوا تھا کہ ان زبانوں کے ماہ و نجوم انتہائے عالم میں روشنی بکھیر رہے تھے، بعض زبانوں پر صدیاں نہیں بلکہ کئی کئی ہزار سال گزرے ہیں جب کہیں جاکر یہ زبانیں تکمیل و اتمام کی منزل تک پہونچی ہیں ——— مگر ہماری اُردو زبان کا حال سب سے مختلف ہے، اس زبان کی ترقی اور نشو و نما حقیقت میں علم و ادب کا زندہ معجزہ ہے، جو بچہ ابھی ابھی گھٹنیوں چل رہا تھا اور جس کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گیا، اُردو کی جوانی میں صحت مندی اور توانائیاں گھل مل گئی ہیں، یہ شباب جانے کے لئے نہیں رہنے کے لئے آیا ہے، فطری اور جاندار زبانیں بوڑھی نہیں ہوا کرتیں۔

اُردو کا پودا لالۂ صحرا کی طرح بڑھا اور پروان چڑھا، ہزاروں سال میں جو انقلابات کسی زبان پر گزرنے چاہئیں، اُردو پر وہ چند صدیوں میں گزر گئے، شکست و ریخت، تشکیل و تعمیر، اور اضافہ و ترقی کی ہر منزل میں اُردو کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں، اس آئینہ پر بار بار صیقل ہوئی اور یہ "کوہِ نور" نہ جانے کتنی بار تراشا گیا۔

ولی دکھنی کے زمانہ کی زبان کھردری تھی، میر کے دور میں زبان کی یہ ناہمواری جاتی رہی، فکر و خیال کے اعتبار سے بھی شاعری بلند ہو گئی ——— اور پھر غالب نے اس کو بلند تر بنا دیا، غالب کی نظم اور نثر کا انداز اُردو زبان کی ترقی کی روحانی ہی نہیں جسمانی معراج بھی تھی ——— اور پھر غالب سے تقریباً نصف صدی بعد اقبال نے تو اس راہ کے ایک ایک ذرہ کو تاب دے کر ستاروں سے ملا دیا۔

آرائشِ محفل، فسانۂ عجائب، طلسم ہوش رُبا اور سروشِ سخن جیسے ناولوں کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کی "مرآۃ العروس" اور "توبۃ النصوح" منظرِ عام پر آئیں جو ترقی کی شاہراہ پر آج بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جن شخصیتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اُن سب نے اُردو زبان میں اضافے کئے ہیں اور ادب کو ترقی دی ہے ——— مگر ان بزرگوں نے اور ان کے عقیدت مندوں اور تحسین کرنے والوں نے یہ کہا کہ یہی لوگ "ترقی پسند" ہیں اور ان کے علاوہ جتنے شاعر اور ادیب گزرے ہیں یا موجود ہیں وہ رجعت پسند اور قدامت پرست ہیں۔

کمیونزم کے سایہ میں

آج سے تقریباً پندرہ سال قبل اُردو زبان میں چند ادیبوں اور شاعروں نے اپنے لئے "ترقی پسند" کا لقب تجویز کیا جس دن ان آوارگانِ ادب نے "ترقی پسندی" کا نعرہ بلند کیا ہے وہ دن اُردو زبان کے لئے سب سے زیادہ منحوس دن تھا، اُسی تاریخ سے اُردو میں "گروہ بندی" اور پارٹی بازی کا تصور پیدا ہو گیا، جدت اور قدامت، ترقی اور رجعت کے نام پر دو ٹولیاں بنادی گئیں یا یوں سمجھئے کہ ان ترقی کے دعویداروں کے جو ہم خیال نہ تھے وہ اس دعوے اور اعلان کے بعد آپ ہی آپ "اچھوت" اور "پست قوم" بن کر رہ گئے۔

"ترقی پسندی" کا یہ نعرہ خوب سوچ سمجھ اور ٹھوک بجا کر بلند کیا گیا، یہ صرف ادبی اور علمی تحریک نہ تھی، اس دعوے کی تہ میں مخصوص سیاسی نظریہ کارفرما تھا ——— اور وہ بلاشبہ "اشتراکی" نظریہ تھا، جو اربابِ نظر ہر "رنگِ لباس" میں "اندازِ قد" کو پہچان سکتے تھے، انھوں نے ترقی کے ان دعویداروں کی نبضیں چھو کر اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ نام نہاد "ترقی پسندی" اُردو ادب میں کمیونزم کی گروہ بندی اپنے ساتھ لا رہی ہے اور ہماری زبان اور لٹریچر کی وحدت اس طرح پراگندہ ہو جائے گی ——— مگر اُس وقت نئے نئے "مرغانِ رشتہ برپا" کو مانوس بنانے کے لئے کانوں پر ہاتھ دھر دھر کے جواب دیا گیا۔ کہ ہماری تحریک تو عوامی تحریک ہے "کمیونزم" کا اس سے کیا واسطہ! اس میں تو اُردو زبان کا ہر بہی خواہ اور خدمت گزار شوق سے حصہ لے سکتا ہے..

دوسری طرف ملک کے اچھے خاصے ذہین طبقے نے تنقید کرنے والوں کا مذاق اڑایا کہ یہ لوگ "ترقی پسند ادب" پر تہمت جوڑ رہے ہیں، اور یہ ان کے توہمات کی پرچھائیاں ہیں جو حقیقت بن بن کر سامنے آ رہی ہیں، نیا ادب اور ترقی پسند لٹریچر معاشرت کے جمود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا ہے، اس بیداری پر چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیئے۔

مگر ابھی ان لفظوں کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی کہ پاکی داماں اور بناوٹ کے حجابات آپ ہی آپ چہروں سے ہٹ گئے، دل کا چور زیادہ دن تک چھپایا جا سکا، انقلاب کی ایک ہی رگڑ میں پیتل کی انگوٹھی سے سونے کا ملمع اُتر گیا ——— وہ لوگ جو ظہورِ انقلاب کے منتظر تھے حالات کا رنگ دیکھ کر پکار رہے ہیں کہ:۔

"زمانہ آگیا ہے، جبکہ ہر ترقی پسند ادیب اور شاعر کو اشتراکیت کا پرچار کرنا چاہیئے۔ ...."

استعاروں اور کنایوں کے حجاب بھی ٹوٹتے جا رہے ہیں، ان لوگوں کی نظموں، افسانوں اور مقالوں میں وضاحت کے ساتھ "کمیونزم" کی حمایت کی جا رہی ہے، جرأتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور طرزِ گفتار سنگین ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دھوپ سے زیادہ روشن اور چمکیلی دلیلوں کی موجودگی میں اگر کوئی شخص آج بھی احمقوں کی جنت میں رہ کر یہ کہتا ہے کہ نام نہاد "ترقی پسند ادب" کو کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو کہنے والا یا تو پاگل اور مخبوط الحواس ہے یا پھر اُس کی نیت میں کھوٹ ہے کہ وہ جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکے میں رکھنا اور گمراہی میں پھنسا دینا چاہتا ہے۔

اُردو ادب میں اس "اشتراکی تحریک" کے حامی اور چلانے والے ایک تو وہ اشخاص ہیں جو اپنے کو کمیونسٹ کہتے ہیں اور دوسرا گروہ نیم کمیونسٹوں کا ہے، جو ذاتی مصلحتوں کے سبب کھل کر میدان میں نہیں آئے، ان کی آوازیں ابھی دبی دبی اور لہجے بھنچے بھنچے ہیں مگر ان دبی آوازوں میں ان کا دل شامل ہے، نیم کمیونسٹ جہاں تک معتقدات اور نظریوں کا تعلق ہے صد فی صدی اشتراکی اور روس

زندہ ہیں مگر عملی دوڑ میں اپنے بھائی بندوں سے البتہ پیچھے ہیں لیکن ان کے کاروانِ حیات کی منزلِ مقصود وہی ہے جو کمیونسٹوں کی ہے۔
منافقوں کا یہ گروہ بہت زیادہ خطرناک اور مضرت رساں ہے، یہ مارِ آستین اور بغلی گھونسے اور چھپے ہوئے خنجر ہیں جو سازگاریِ حالات کے منتظر ہیں، حالات کا پانسہ جس دن ان لوگوں کے موافق آ کر پڑے گا بس اُسی دن ان کی منافقین کمل کر میدان میں آ جائیں گا، ایسے "پتوں" پر تکیہ کرنا بہت بڑی نادانی ہے جو آشیانہ کے قریب آگ کی گرمی پاتے ہی ہوا دینے لگیں ——— تاریخِ انقلاب کا ہر خونچکاں ورق شاہد ہے کہ گھر کے بھیدیوں ہی نے سدا لنکا ڈھائی ہے اور باہر کی بجلیوں کے مقابلہ میں گھر کے چراغوں نے گھر کے جلانے اور تباہ کرنے میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

تنگ نظری | طنز کی جاتی تھی کہ یہ مذہبی لوگ بڑے ہی تنگ نظر، کم نگاہ اور متعصب ہوتے ہیں ان کے یہاں فرقہ پرستیاں اور دھڑے بندیاں ہیں ——— مگر واقعات چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ان نام نہاد ترقی پسندوں نے تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دئے ——— آپ کو شاید معلوم ہوگا اور اگر معلوم نہیں ہے تو اب آگاہ ہو جائیے کہ ان کمیونسٹ ادیبوں نے اپنے ہم خیال رسالوں کو ہدایتیں دی ہیں بلکہ ناموں کی فہرستیں بھیجی ہیں کہ فلاں فلاں شاعر اور ادیب چونکہ ہمارے ہم خیال نہیں ہیں اس لئے اُن کی بلند سے بلند چیز بھی نہ چھاپی جائے، اور کسی عنوان سے اُن کا نام اور ذکر نہ آنے پائے ——— سنا آپ نے یہی وہ ترقی اور انقلاب کے علمبردار ہیں جو عصبیتوں فرقہ بندیوں اور تنگ نظریوں کے خلاف جہاد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور جن کا کہنا یہ ہے کہ ہم ذاتیات اور شخصیات سے بلند ہو کر عام انسانیت کے ترجمان اور نمائندے بلکہ اُن کے بہی خواہ ہیں۔
اسقفوں، بطریقوں، پادریوں، پنڈتوں، پروہتوں اور مولویوں پر طنز کرنے والے یہ نام نہاد ترقی پسند تنگ نظری اور عصبیت میں ان سے کوسوں آگے نکل گئے، ان کی فرقہ پرستی کلیساؤں اور خانقاہوں سے بہت زیادہ تنگ و تاریک ہے۔
ان سب نے آپس میں سمجھوتا، ایکا اور معاہدہ کر لیا ہے، ایک ادیب دوسرے ادیب پر نئے نئے عنوان بدل کر مضمون لکھتا اور اسے سراہتا ہے، پروپیگنڈے کے ڈھنگ اور مشہور ہو جانے کے طریقے انھیں خوب آتے ہیں، اس طرح انھوں نے لٹریچر کو بڑی حد تک اپنے قبضہ میں کر لیا ہے، اور یہ "لے" بڑھتی اور یہ سلسلہ دراز ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔
اس گمراہ کن ادب کے فروغ کی ذمہ داری سے وہ ادیب اور شاعر اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے جو اپنی ہر دلعزیزی پر آنچ آ جانے کے ڈر سے خاموش بیٹھے ہوئے "تباہیِ نشیمن" اور "بربادیِ آشیانہ" کا یہ منظر دیکھتے رہے، اس ذہنیت کے افراد نے دونوں طرف کے لوگوں کا بھلا بن کر رہنے کی کوشش کی، اُن کا طرزِ عمل یہ رہا کہ ؎

باغباں بھی خوش رہے، راضی رہے صیاد بھی

مگر صیاد نے خود ان کے پر کتر ڈالے اور اب یہ اُڑنا چاہتے ہیں مگر نہیں اُڑ سکتے۔
ایک جماعت اُن نادانوں اور سادہ لوحوں کی ہے جو ان کمیونسٹوں کی تحریک کی روح عمل ہی کو نہ سمجھ سکی، وہ لوگ تو اس خیال میں مگن رہے کہ جدت و ترقی کے یہ دعویدار کسی نہ کسی عنوان سے اُردو ادب کی تو خدمت کر رہے ہیں پھر ان کی باتوں کا ماننا اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے، چلتی گاڑی میں ہم روڑا کاہے کو اٹکائیں، اگر یہ تحریک جاندار نہیں ہے تو زمانہ اسے خود ہی موت کے گھاٹ اتار دے گا دنیا کے ہر ادب میں نئے تجربے ہوتے ہی رہتے ہیں، اُردو ادب میں بھی "ترقی پسندی" کے نام پر ایک تجربہ ہو رہا ہے۔ ہمیں اس کے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے ——— اس روش نے نام نہاد "ترقی پسند ادب" کی غیر شعوری طور پر حوصلہ افزائی کی، یہ لوگ تجربوں کے ظہورِ نتائج کا انتظار ہی کرتے رہے اور کمیونسٹوں نے شعر و ادب کی فضا کو مسموم بنا دیا۔

اب یہ غلط اندیشیاں، خام خیالیاں اور خوش فہمیاں ختم ہو جانی چاہئیں، جو لوگ "کمیونزم" کی قدروں پر ایمان نہیں رکھتے اُن کو کمیونسٹ لٹریچر میں بھی دلچسپی نہ لینی چاہئیے، ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے کہ اس انداز کے ادب سے بیزاری کا اعلان کیا جائے ـــــ اور صرف زبانی اعلان نہیں بلکہ عمل و حرکت سے اس اعلان کی تائید کرنے کی ضرورت ہے۔

مشورے

پانی بھی بہت سے بہت کمر تک آیا ہے، سر سے اونچا نہیں ہوا، ان گمراہیوں کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے، مرض یقیناً مزمن اور تشویشناک ہے مگر لاعلاج نہیں ہے ـــــ ان کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کا جواب اُنہی کے ہتھیاروں سے دیا جائے تو فتنہ کا بیخ و بن ہی میں استیصال ہو سکتا ہے۔ مگر ارباب فکر و نظر کی غفلت اگر یوں ہی ڈھیل دیتی رہی تو آج کے ننھے بچے مستقبل کے اژدہے ثابت ہوں گے، اور اُس وقت اس کاٹے کا منتر اور اس زہر کا تریاق ملنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

ہم ذیل میں ان خطوط کی نشان دہی کرتے ہیں جن پر ہمارے کاروانِ ادب اور قافلۂ صحافت کو گامزن ہونا چاہئیے۔

(۱) سنجیدہ، باوقار، صالح اور تعمیر پسند ادب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ـــــ خاص طور پر، خلاقی افسانوں اور ناولوں کو عام کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتابیں اخلاقی درس و ہدایت کے باوجود بہت زیادہ شگفتہ اور دلچسپ بھی ہونی چاہئیں، سنجیدگی خشک ہی نہیں دلچسپ بھی ہو سکتی ہے۔

(۲) تنقید نگار خاص طور سے اُن ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں کے کارناموں کو منظر عام پر لائیں جو "تعمیر پسند ادب" کے حامی اور مؤید ہیں، نام نہاد ترقی پسندوں کے پروپگنڈے نے جن شاعروں اور ادیبوں سے ذہنوں کو مرعوب کر رکھا ہے اس مرعوبیت کو اب گمنامی کے غار میں دفن کر دینے کی ضرورت ہے، کسی جھجک اور شرمساری کے بغیر اعلان کرنا چاہئیے کہ صالح ادب اور انسانی معاشرے کے لئے مفید لٹریچر کے نمائندے وہ نہیں ہیں جن کی شہرت کے ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔

یہ تنقیدیں محض طنز آمیز ہی نہ ہوں، علمی، عقلی اور نفسیاتی حقائق و شواہد کی روشنی میں ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ کس انداز کا ادب انسانی سوسائٹی کے لئے مفید ہو سکتا ہے ـــــ زندگی کیا ہے اور اُس کے فطری تقاضے کیا ہوتے ہیں؟

(۳) کتابیں چھاپنے والے اداروں اور پبلشروں سے صاف صاف کہہ دینا چاہئیے کہ تم پر بھی دوسروں کی طرح معاشرت کی پابندیاں اور ذمہ داریاں لازم آتی ہیں، محض جلب منفعت اور ذاتی مفاد کی خاطر اب یہ برداشت نہیں کیا جا سکتا کہ تم گمراہ کن ادب چھاپ چھاپ کر اپنی تجوریاں بھرتے رہو اور تمہیں عوام کے ذہن و شعور کی فکر و تربیت سے کوئی سروکار ہی نہ ہو ـــــ تم چند آدمیوں کے نفع اور تجارتی فلاح کی خاطر کروڑوں انسانوں کے کردار و سیرت کی گمراہی برداشت نہیں کی جا سکتی، اس دورنگی کو ختم ہو جانا چاہئیے کہ ایک پبلشر کے یہاں قرآن شریف چھپتا ہے اور اُسی کے ہاتھوں ان افسانوں اور نظموں کی اشاعت بھی ہوتی ہے جن میں خدا اور مذہب پر طنز کی جاتی ہے اور بد اخلاقی کا پرچار ہوتا ہے۔

پبلشنگ "ہاؤس" کتاب خانے، مطابع اور صحافتی ادارے علم کے چشموں کے دہانے اور ادب کے دریاؤں کی گزرگاہیں ہیں، معاشرے کی صحت قائم رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ ان دہانوں اور راستوں سے گندے اور عفونت آمیز پانی کی ایک بوند بھی نہ بہنے پائے ـــــ پس جس جس دہانہ سے کثیف پانی جاری ہے، اُسے جس طرح بنے بند کر دینا چاہئیے، یہ کام ہو گیا تو پھر ہر طرف کوثر و سلسبیل کی شفاف موجیں نظر آئیں گی اور قوم کے شعور و فکر کی صحت بگڑنے نہ پائے گی ـــــ اگر آپ کا ضمیر مطمئن ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ٹھیک اور درست ہے تو پھر خدا کا نام لے کر میدانِ عمل میں آجائیے، صرف سوچتے رہنے سے کام نہ چلے گا، زمانہ بے عمل مفکرین کا ساتھ نہیں دیا کرتا، حرکت و عمل ہی سے قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں اور فعل و قوت ہی سے طوفانوں کے رُخ پھیرے جاتے ہیں ـــــ باطل جب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اتنی مستعدی دکھا رہا ہے تو "حق"

سلیم احمد

تنقیدِ حیات

"ادب تفسیرِ حیات ہے"
"ادب تنقیدِ حیات ہے"

سوال یہ ہے کہ حیات کیا ہے .... ؟

ممکن ہے فلسفہ یا سائنس میں زندگی کو کسی متحرکہ و متغیر قوت سے تعبیر کیا گیا ہو۔ لیکن عام انسانی ذہن اس قوت کا مجرد تصور نہیں کر سکتا اس لئے ہمیں مجبوراً فلسفیانہ موشگافیوں کو چھوڑ کر ایک ایسے پیکر کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس کی وساطت سے زندگی کی قوت کا ادراک کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ پیکر صرف — انسانی معاشرہ — ہو سکتا ہے۔ کم از کم ادب میں زندگی سے یہی مراد لی جاتی ہے یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب تفسیر و تنقیدِ حیات ہے تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ ادب معاشرہ کی تفسیر و تنقید ہے، اور زندگی کے ارتقائی عمل میں اس کا ممد و معاون ہے۔

لیکن — ادب کی تفسیر و تنقیدِ حیات کے مفہوم کا یہ تعین جو بظاہر بہت سادہ اور الجھنوں سے خالی نظر آتا ہے سیکڑوں پیچیدگیوں اور دشکلوں کو پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ معاشرتی ارتقاء کے تصورات میں اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف کچھ ایسا نہیں ہے جس کے لئے دلیلیں اور مثالیں ڈھونڈنی پڑیں۔ اسلام اور اشتراکیت ہی کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ اسلام معاشرے کی ارتقاء کا جو تصور کرتا ہے اور اس ارتقاء کی بنیاد جن اصولوں پر رکھتا ہے وہ اس تصور اور ان اصولوں سے مختلف ہیں جو اشتراکیت پیش کرتی ہے۔ اسلام اشتراکیت کی مادی تعبیر تاریخ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور اشتراکیت، اسلام کے مابعد الطبیعی نظام اور اس کی بنیاد پر وضع کئے ہوئے اصولوں اور تصورات کو قبول نہیں کر سکتی۔ اس صورت میں لازم ہے کہ دونوں کی زندگی کی تنقید اور اس کے ارتقائی عمل کی توجیہ میں بھی اختلاف ہو — سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب زندگی کی تنقید کس نقطۂ نظر سے کرے؟ معاشرے کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے کن اصولوں کو پیش کرے؟ انسان کے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے اور انسانی فطرت کے روحانی و مادی تقاضوں کی حد بندی کے لئے کن تصورات کو پیش نظر رکھے — یہ ایک اہم اور بنیادی سوال ہے جو ادب برائے زندگی کے نظریہ کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سوال کے ساتھ ہی ساتھ میرے ذہن میں مناظرہ اور بحث و جدل کی وہ تمام روایتیں تازہ ہو جاتی ہیں جو اب تک ایسے سوالوں سے پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اور میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں کہ یا تو "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کو تسلیم نہ کروں۔ یا خود ادب کے تصورِ زندگی کی تلاش شروع کر دوں اور انسانی زندگی کی انھیں اقدار کو پیش نظر رکھوں جو ادب میں ملتی ہیں۔ زندگی کے داخلی و خارجی عمل کو سمجھنے، انسان کے مادی و روحانی تقاضوں کے ادراک اور انسانیت کے اعلیٰ تصوراتی پہلوؤں کا احساس کرنے کے لئے ادب سے باہر نہ جاؤں! — میرے نزدیک ادب کی تنقیدِ حیات کسی خارجی نظریۂ زندگی کی دریوزہ گری کی محتاج نہیں ہے۔ ادب انسانی محسوسات و جذبات کا ترجمان ہے اور اس کی یہ ترجمانی بجائے خود زندگی کی تنقید ہے — یہ اجمال تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ معاشرہ کے وجود میں آنے کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ انسانی فطرت کچھ مخصوص مادی و روحانی تقاضے رکھتی ہے اور چونکہ ان میں سے بعض اہم تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک فرد بالذات کافی نہیں ہے (مثلاً جنسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ایک اور وجود کی ضرورت ہوتی ہے) اس لئے انسان بحیثیت فرد کے مجبور ہے کہ دوسروں سے اپنے تعلقات قائم کرے۔ ان تعلقات کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ فرد اپنی ذات پر چند پابندیوں کو قبول کرے۔ تاکہ اس کی اپنی ضرورتیں، دوسروں کی ضرورتوں سے، اس کے ارادات دوسروں کے مطالبات سے، اس کے اپنے تقاضے دوسروں کے تقاضوں سے نہ ٹکرائیں۔ یہی پابندیاں اور حدبندیاں ہیں جن کی بنیادوں پر انسانی تعلقات ایک مخصوص نہج پر قائم ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح معاشرہ کا خارجی پیکر تیار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس خارجی پیکر کی تشکیل صرف انسان کے مادی تقاضوں اور مادی ضرورتوں کے جبر پر ہوتی ہے، اس لئے اسے مجبوراً چند تصورات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تاکہ یہ تصورات، زندگی کے خارجی عمل کی سختیوں اور فرد و جماعت کی کشمکش کی شدت کو گوارا بنانے کے لئے ایسے سانچے تیار کریں جن میں انسانی جذبات ڈھل سکیں اور زندگی کے خارجی عوامل کے ہر چھوٹے بڑے ذہنی و جذباتی ردعمل پر انسان کو بار بار یہ سوچنا پڑے کہ اسے کن حدود میں رہنا ہے۔ اپنے عزائم، اپنی خواہشات اپنے تقاضوں کو پورا کرنے میں کن پابندیوں کا لحاظ رکھنا ہے۔

ان تصورات کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں چند اور تصورات کی پیدائش بھی ضروری ہوتی ہے، یہ تصورات، انسانی زندگی کا ایک معیار مقرر کرتے ہیں جس کی بلندیاں لامتناہی ہوتی ہیں۔ اس کے سامنے بلندیوں کے نت نئے مقامات، رفعت کی نت نئی منزلیں اور ممکنات کی نئی دنیائیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کی سعی و طلب کو ختم نہیں ہونے دیتے۔ تاکہ انسانی زندگی، جمود، یکسانیت اور یک رنگی کا شکار نہ ہو جائے۔ یہیں تصورات سے ایک معاشرت کے تہذیبی اور کلچری شعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور معاشرہ کی مخصوص فضا میں انسانیت کی کرن پھوٹتی ہے —— یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب آفاق گیری اور ابدیت کے ان عناصر کو حاصل کرتا ہے جن کی جوت زندگی کے ہر دور پر پڑتی ہے۔ یہیں سے وہ اس توانائی کو پاتا ہے جس کی مدد سے وہ ہر عہد میں زندہ رہتا ہے، نہ صرف زندہ رہتا ہے بلکہ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اسی مقام پر پہنچ کر ادب میں اتنے پہلو، اتنی گہرائیاں، اتنی بلندیاں پیدا ہوتی ہیں کہ زندگی کے ہر دور میں انسانی ذہن و فکر ان کی نئی نئی تاویلیں، نئی نئی تفسیریں پیش کرتا ہے اور اس کی تازگی و شگفتگی پژمردہ نہیں ہونے پاتی۔

لیکن جب کسی معاشرہ میں ذہنی و جذباتی سانچے ٹوٹنے لگتے ہیں جب معاشرہ کے خارجی عمل میں ناقابل برداشت سختی و تقشف پیدا ہو جاتا ہے۔ جب رسوم و روایات اپنی لچک کھو بیٹھتی ہیں۔ جب انسانی جذبات و تصورات کے وہ سوتے خشک ہو جاتے ہیں، جہاں سے زندگی نئے برگ و بار حاصل کرتی ہے۔ جب عام انسانی ضروریات پوری نہیں ہوتیں معاشرے کا خارجی پیکر ٹوٹنے لگتا ہے۔ انسانی تعلقات کے ٹکے بندھے اصول شکست ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی میں ایک عام بحران پھیل جاتا ہے —— اس وقت انسان انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اپنی داخلی و خارجی زندگی کا جائزہ لیتا ہے، اپنی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے نئی پابندیاں نئے فرائض نئے اصول تراشتا ہے، ذہنی و جذباتی سانچے تیار کرنے والے ان تصورات میں جو اپنی قوت سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں نئی روح پھونکتا ہے، اور انسانی ذہن و جذبات پر ان کی گرفت کو مضبوط کرتا ہے۔ تخریب و تعمیر کے اس عمل میں ذہنی و عملی لحاظ سے حوصلہ مند لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانیت کے ارتقا کو اتنا نقصان کوئی اور چیز نہیں پہنچا سکتی جتنے یہ اُتھلے اور سطحی انقلابی، جو ماضی کے اعلیٰ انسانی تصورات اور حال کی ضروریات کو ہم آہنگ نہ کر سکیں اور معاشرہ کے خارجی پیکر کی تخریب میں اپنے تیشہ کی ضرب ان اقدار پر بھی لگا دیں جن کو انسان نے ہزارہا سال کی محنت و مشقت کے بعد حاصل کیا ہے۔ جو خارجی اصولوں کے ٹوٹنے، اور انسانیت کے اعلیٰ تصورات کی گرفت کو ذہن انسان پر سست ہوتے دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھیں کہ معاشرہ کے خارجی پیکر کے ساتھ ساتھ یہ تصورات بھی فرسودہ ہو چکے ہیں اور جدید معاشرہ کی تشکیل کے لئے جدید تصورات کی ضرورت ہے —— وہ قوم

جو اس دور میں اپنے تمدنی تہذیبی، اور ذہنی سرمایہ کو نظر انداز کر دیتی ہے، بالکل کھوکھلی، سطحی، اور بے روح رہ جاتی ہے۔ زندگی کے اس تخریبی و تعمیری عمل میں ادب کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔

ادب کیا ہے؟

ادب زندگی کے تمام داخلی و خارجی پہلوؤں کا ترجمان ہے ادب کا کام ہی یہ ہے کہ وہ انسانی تقاضوں میں بلندی اور عمق پیدا کرے، انسانی عزائم کو ابھارنے، انسانی محسوسات و جذبات کو نکھارنے اور سنوارنے میں مصروف رہے لیکن جیسے ہی کسی معاشرے میں کوئی سختی اور تقشف پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی انسانی زندگی کا کوئی فطری تقاضہ پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ادب میں ایک انقباض، ایک گھٹن، ایک اکتاہٹ، ایک بے قراری ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ قدم قدم پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ اگر ادب صرف اتنا کام ہی انجام دیتا تو بھی اس کی اہمیت میں فرق نہ آتا، لیکن وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کرتا ہے۔ دنیا بھر کے عظیم ادب میں اپنے عہد کے انفرادی و اجتماعی مسائل، عام آدمیوں کے دکھ سکھ، فرد و جماعت کی کشمکش و مفاہمت، اور ماحول و معاشرت کی جھلکیاں دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ زندگی کی آنے والی تیاری، اور انسانیت کی ابدی اقدار کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حقیقت و تخیل کے اسی امتزاج سے ادب کا وہ عمل شروع ہوتا ہے جسے ہم ادب کی تنقید حیات کہتے ہیں۔

ادب کی یہ تنقید کسی مخصوص نظریۂ حیات کے تحت نہیں ہوتی۔ اس کی حیثیت بہت بڑی حد تک داخلی ہوتی ہے، ادب کا تعلق انسانی محسوسات و جذبات سے ہے، ایک مخصوص عہد کے سیاسی و معاشی حالات، معاشرتی روابط اور انسانی تعلقات کا مخصوص خارجی نظام، انسانی زندگی کے داخلی پہلو پر جو اثرات ڈالتا ہے۔ ماحول کے خارجی عمل سے انسانی محسوسات و جذبات میں جو ردِ عمل مرتب ہوتا ہے۔ وہی ایک معاشرہ کی کامیابی یا ناکامی کا معیار ہوتا ہے۔ ادب میں، اتنی اہمیت خارجی عمل کی نہیں ہوتی جتنی اس سے مرتب ہونے والے اثرات کی ہوتی ہے۔ ادب کا موضوع انسانی محسوسات و جذبات ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ادب میں خارجی عناصر کی موجودگی کا منکر ہوں بلکہ یہ کہ میرے نزدیک اگر ادب خارجی واقعات و عوامل کا تذکرہ کرتا ہے تو محض اس لئے کہ اس کے تانے بانے سے انسان کی فکری و جذباتی کیفیات کے اظہار کے لئے زمین تیار کرے۔ درخت سے سیب کے گرنے میں ادب کے لئے کوئی معنویت نہیں ہے ہاں اس کے نتیجے کے طور پر نیوٹن کے ذہن و فکر پر جو اثر مرتب ہوا اس کا بیان ادب کے موضوعات میں شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ اثر اپنی پیدائش میں، ایک خارجی عمل کا محتاج ہے، اس لئے ادب میں بھی خارجی عمل کا تذکرہ ناگزیر ہوتا ہے۔ کسی ادب میں اس داخلیت کے بغیر عام انسانی معنویت نہیں پیدا ہو سکتی۔ کیوں کہ خارجی عوامل تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر فرد یا ہر معاشرہ یکساں ماحول رکھتا ہو۔ لیکن ماحول کے ردِ عمل کے اثرات میں آفاق گیر بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک فرد پاؤں میں کانٹا چبھنے سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ دوسرا شخص محبوب کی جدائی یا بے وفائی سے غمگین ہوتا ہے، ایک تیسرے شخص کو یہی تکلیف اور غم مال و دولت سے محروم ہو جانے پر محسوس ہوتا ہے۔ دیکھئے جہاں تک تکلیف کے احساس کا تعلق ہے، تینوں افراد میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ حالانکہ وہ خارجی عوامل جن سے یہ تکلیف پیدا ہوئی ہے مختلف ہیں۔ ہرچند ادب میں خارجی عوامل اور ان کے اثرات دونوں کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن وہ چیز جس سے ہم متاثر ہوتے ہیں دراصل ہمارے احساس سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان تمام خارجی عوامل میں سے ہمارے ساتھ کوئی ایک بات بھی پیش نہ آئی ہو۔ لیکن اس کے باوجود ہم اس سے اثر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پر وہ کیفیت گذری ہے جس کا بیان ادب میں موجود ہے نہ کہ وہ خارجی عمل جس سے اس کیفیت کی پیدائش ہوئی ہے، اور جب ادب میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ایک فرد کے احساس و جذبات سے بلند ہو کر عام انسانی محسوسات و جذبات کی ترجمانی کرنے لگتا ہے۔ اور پھر احساس و جذبات صرف انفعالی تو ہوتے نہیں ہیں ان میں ایک فعال قوت بھی ہوتی ہے۔

زندگی کے خارجی عوامل کا داخلی ردِ عمل جب وجدان میں گھل مل جاتا ہے۔ اور اس کی گہرائیوں میں صدیوں کی تربیت یافتہ تہذیب و تمدن کی روایت کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے تو ایک نئی قوت، ایک نئی زندگی لے کر دوبارہ جنم پاتا ہے۔ اور احساس کے اس دوبارہ جنم لینے ہی سے

عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس تخلیق کی ذمہ داری شاعر یا ادیب کی شخصیت پر ہونے کے باوجود، بہت بڑی حد تک اس کے کلچری شعور پر ہوتی ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر صرف اپنے احساس، صرف اپنے جذبات اور صرف اپنے تجربات کے بل بوتے پر عظیم ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ فراق نے کیا خوب کہا ہے کہ "محبت میں ذاتی دکھ سکھ کو تخیل کی کیمیا سے عظمت اور قدریں ملتی ہیں۔ اور تخیل بھی انفرادی نہیں بلکہ کسی بلند قومی کلچر کی تخیل۔ کلچر کے یہ نازک مقامات وہاں ہیں۔ جہاں شاعری بیک وقت "آپ بیتی" اور "جگ بیتی" ہوتے ہوئے ان دونوں منزلوں سے گذر جاتی ہے"۔۔۔۔ ہاں! اسی "آپ بیتی" اور "جگ بیتی" سے گذر کر عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے، اس ادب کی تخلیق جس کی آواز میں زندگی کی آواز سنائی دے۔ جس میں حیات کی لامتناہی بلندیاں اور اتھاہ گہرائیاں سموئی ہوئی ہوں! ورنہ کسی مخصوص عہد کے سیاسی تصورات، انفرادی احساسات و جذبات اور چند سیاسی نظریوں اور کلیوں کے بیان سے خواہ اس میں اسلوب کی کتنی ہی نزاکتیں اور بیان کی کتنی ہی لطافتیں کیوں نہ موجود ہوں، عظیم ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔

ادب ایک زندہ حقیقت ہے!

احساسات و جذبات اور وجدان و تخیل کی انھیں منزلوں سے گذر کر ادب اس قابل ہوتا ہے کہ زندگی کی گذرگاہ میں چراغ جلائے۔ ادب کے جلائے ہوئے یہ چراغ ایک عہد کے بعد بجھ نہیں جاتے ان کی جوت ہر عہد پر پڑتی ہے۔ ان کی روشنی میں ہم ایک مخصوص عہد کے معاشرتی رجحانات اور سیاسی و معاشی حالات کا پتہ ہی نہیں چلاتے کچھ اور بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر ادب سے اس "کچھ اور" کو نکال دیا جائے تو ادب، ادب نہیں رہتا "ہڑپا" اور "موہن جودارو" بن جاتا ہے۔ اور ہڑپا اور موہن جودارو سے خواہ ہم دراوڑوں کے عہد کی تہذیب کا پتہ لگا لیں لیکن آج کی زندگی کے لئے ان میں کچھ نہیں ہے۔ ادب "آثار قدیمہ" نہیں ہوتا۔ وہ ایک زندہ حقیقت ہوتا ہے۔ ہم میر و غالب کو اس لئے نہیں پڑھتے کہ ان کے عہد کے معاشرتی اصولوں اور سیاسی و معاشی روابط کا پتہ لگائیں بلکہ اس لئے کہ آج بھی ان میں اتنی قوت اور توانائی اور اتنی گہرائی ہے کہ وہ ہماری محسوساتی۔ جذباتی زندگی کا ساتھ دیتے ہیں۔ نہ صرف ساتھ دیتے ہیں بلکہ اُن کی فعال قوت کو متحرک بھی کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں اس مطالعے سے ان کے عہد کی معاشرتی حالت کا پتہ بھی چل جاتا ہے لیکن اگر ہم نے ادب سے صرف یہی حاصل کیا تو اس کی مثال نیوٹن کے الفاظ میں اس بچہ کی ہوگی جو سمندر کی گہرائیوں میں ملنے والے موتیوں سے بے خبر ساحل کے سنگ ریزوں ہی سے کھیلتا رہے۔

اگر ادب کی اہمیت صرف یہی سمجھی جائے کہ وہ اپنے عہد کی سیاسی و معاشی حالت یا معاشی روابط کی عکاسی کرتا ہے۔ تو شاید اخباروں کی اہمیت ادب سے زیادہ ہی ثابت ہوگی۔ ادب کی تاریخی اہمیت تسلیم، لیکن ادب کا کام صرف تاریخ مرتب کرنے میں مدد دینا نہیں ہے۔ رامائن اور مہابھارت سے قدیم ہندوستان کی تاریخ مرتب کی گئی ہے لیکن رامائن اور مہابھارت کی اہمیت صرف اتنی نہیں ہے۔ ان میں انسانی محسوسات و جذبات، انسانی تعلقات، اپنی تمام چھوٹی بڑی کمزوریوں کے باوجود انسان کی عظمت، اور اپنے تمام دکھوں، تکلیفوں، برائیوں اور آلودگیوں کے باوصف زندگی کی طہارت اور کائنات کے حسن و جمال کا جو احساس پایا جاتا ہے وہ اس کی تاریخی اہمیت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ادب میں صرف تاریخی حقائق اور سیاسی و معاشی حالات کا جائزہ لینے والے، اور اس جائزہ کو ادب کا "حکیمانہ مطالعہ" سمجھنے والے اس اہمیت کا احساس نہیں کر سکتے ـــ اسی احساس کی کمی سے اختر حسین رائے پوری کو رامائن میں صرف ایک ایسے لڑکے کی داستان ملتی ہے، جو اپنے "زن مرید" باپ کی خواہش پوری کرنے میں بے کار مصیبتیں جھیلتا رہا۔ وہ رامائن کے عہد کی جاگیردارانہ اقدار کو تو دیکھ سکتے ہیں، جن کی رو سے اولاد باپ کی ملکیت متصور ہوتا تھا! اور آج کے زمانہ سے اس عہد کا موازنہ کرکے یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ "اخلاقی اقدار" اضافی ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ کی توقع عبث ہے۔ اسی احساس کے فقدان کے سبب، احتشام حسین کو اردو ادب کا کلچر جاگیردارانہ معلوم ہوتا ہے، انھیں "قدیم اردو شاعری میں ترقی کی قدریں نہیں ملتیں"۔ وہ اس ادب میں، اس کے اپنے عہد کی مصوری تو دیکھ سکتے ہیں، اور اس عہد کی مخصوص ترقی پسندی کو بھی ڈھونڈھ سکتے ہیں لیکن

اس کی آفاق گیری کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور اس میں اختر حسین رائے پوری اور احتشام حسین کا کوئی قصور نہیں ہے، انھوں نے جن اقدار کو پیش نظر رکھ کر (بزعم خود) ادب کا "حکیمانہ مطالعہ" کیا ہے وہ انھیں صرف یہی کچھ دے سکتا تھا۔ کیوں کہ "ادب" کی اہمیت کو ترقی پسندی کی کسی اصطلاح سے نہیں سمجھا جا سکتا ـــــ وہ اس سے مطمئن ہیں یہ ان کے ظرف کی بات ہے، ادب بھی، زندگی کی طرح اپنا بادہ قدح خوار کا ظرف دیکھ کر ہی دیتا ہے!۔ اگر میں یا آپ اس سے مطمئن نہ بھی ہوں تب بھی طنز و تعریض کا کوئی جواز نہیں پیدا ہوتا ـــــ ہاں ان کی ادبی اقدار پر ایک ناقدانہ نظر ضرور ڈالی جا سکتی ہے۔

ترقی پسند تنقید نے جن ادبی اقدار کا تعین کیا ہے، ان سب پر کچھ کہنے کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے، اس لئے میں صرف اس قدر کا ذکر کروں گا جس کا تعلق اس مقالے کے موضوع سے ہے یعنی ادب کی تنقیدِ حیات ـــــ احتشام حسین نے ایک جگہ ترقی پسندی کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ترقی پسندی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جسے معاشی یا معاشرتی تبدیلیوں کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے" (ترقی پسندی کی روایت نیا دور صفحہ ۱۰۲)۔ اپنی ایک اور تصنیف روایت اور بغاوت کے صفحہ ۲۳ پر ارشاد فرماتے ہیں۔ "تاریخی تقاضوں کے بڑھتے اور گھٹتے اثرات اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ترقی پسندی کی شکلیں بھی مختلف ہوں گی" آگے چل کر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں "جو کل جدید تھا وہ آج قدیم ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو کل کے نقطۂ نظر سے ترقی پسند تھا وہ آج کے لحاظ سے ترقی پسند نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں ہوم رول کا تقاضہ ترقی پسندی کا تقاضا تھا آج مکمل آزادی کے مطالبہ کے مقابلے میں یہ مطالبہ ترقی پسند نہیں ہے (صفحہ ۲۸ روایت اور بغاوت)۔ اختر انصاری اپنی تصنیف افادی ادب میں احتشام حسین سے ایک قدم آگے بڑھ کر فتویٰ صادر کرتے ہیں کہ "کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ اس ادبی کارنامے کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت ہوئی ہے یا نہیں"۔

ان اقتباسات کو پیش نظر رکھنے سے غالباً ایک بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان "حکیمانہ شعور" رکھنے والے نقادانِ کرام کے نزدیک ادب کی تنقید زندگی کے کسی مخصوص نظریہ کے تحت ہوتی ہے۔ ہر عہد کا ادب شعوری یا لاشعوری طور پر چند مخصوص معاشی و معاشرتی روابط اور سماجی اصولوں کی تبلیغ (یا تردید) کرتا ہے۔ اور چوں کہ معاشی و معاشرتی روابط اور سماجی اصول زندگی کے ارتقائی عمل میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اس لئے ایک مخصوص عہد کے ادب میں اپنے دور کے لحاظ سے ترقی پسندی پائی جاتی ہے لیکن جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے تو وہ ترقی پسندی بھی تاریخی تقاضوں کے گھٹتے بڑھتے اثرات اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے تبدیل ہو جاتی ہے اگر کوئی ادب ایک مخصوص عہد کے سماجی اصولوں کو دوسرے عہد میں پیش کرتا ہے تو وہ رجعت پسند ہوتا ہے کیوں کہ اس کا رخ ماضی کی طرف ہوتا ہے۔ مخصوص ادوار کی ترقی پسندی کی مثال احتشام حسین کے الفاظ میں چکبست کی "ہوم رول" والی شاعری ہے۔ جو اپنے عہد میں ترقی پسند تھی۔ لیکن مکمل آزادی کے مطالبہ کے سامنے غیر ترقی پسند ہے ـــــ اور "رجعت پسند" ادب کی مثال اختر حسین رائے پوری کے نزدیک اقبال کی شاعری ہے جو آج، بیسویں صدی میں اب سے تیرہ سو سال پیشتر کے تمدن کو بروئے کار لانے کے خواب دیکھتی ہے۔

ادب کی تنقید حیات کا یہ تصور (جیسا کہ میں نے مضمون کی ابتدائی سطروں میں عرض کیا تھا) کئی مشکلوں اور پیچیدگیوں کو پیدا کرتا ہے ایک بات تو یہی ہے کہ ادب کی تنقید حیات کو کسی خارجی نظریۂ حیات کے تابع بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب بہت سے نظریوں عقیدوں، اور ازموں (ISM) میں بٹ جائے۔ اور ادب کا اس طرح خانوں میں تقسیم ہو جانا ادب کے لئے غالباً نیک فال نہیں ہے مزید براں سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہوتی ہے کہ عہد بعہد اور دور بدور بدلنے والی ترقی پسندی کو تسلیم کرنے کا مفہوم بالآخر یہی نکلتا ہے۔ کہ ایک عہد کا ادب دوسرے عہد میں آثار قدیمہ میں شامل ہو جاتا ہے مثلاً میر کے کلام سے ہم ان کے عہد کے معاشرتی روابط کی شکست، عام بے اطمینانی، مایوسی اور زندگی سے بے زاری کا احساس کرتے ہیں، اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کے عہد کے معاشی و مادی حالات غیر اطمینان بخش تھے جاگیردارانہ نظامِ زندگی

درہم برہم ہو رہا تھا۔ ہر طرف ایک انتشار اور تزلزل پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اگر بات صرف اتنی ہی ہو تو ہمیں ادب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تاریخ کیوں نہ پڑھیں؟ جس میں کم از کم ادب سے زیادہ صحیح واقعات کا علم ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم میر کو اس لئے نہیں پڑھتے کہ ان کے عہد کی معاشرتی حالت کا پتہ لگاتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کے کلام میں ہمارے محسوسات وجذبات کے لئے ایک اپیل ہے اور یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ میر نے عام انسانی تحقیقات کا جو معیار پیش کیا ہے حُسن وعشق کی جس کائنات کی تخلیق کی ہے عام انسانی اخلاقی اقدار کا جو تعین کیا ہے۔ کیا وہ آج کے لحاظ سے غیر ترقی پسند ہیں؟ ــــ ترقی پسند نظریہ ادب، ارتقا، تاریخی جدلیت، طبقاتی کشمکش اور اسی قسم کی اور دو چار مرعوب کن اصطلاحوں کی وجہ سے یوں تو بہت وسیع نظر آتا ہے لیکن ذرا اس "طبقاتی کشمکش اور سیاسی ومعاشی حالت" کے "بلیک ہول" سے باہر نکل کر دیکھئے تو یہ ترقی پسندی ایک حقیر سی چیز معلوم ہونے لگتی ہے! جیسے چشمیت کے "ہوم رول" اور مکمل آزادی سے مطالبے میں ترقی پسندی کا بدنما ثابت ہو گیا۔ لیکن ذرا غور سے پہلے تو ایسی ترقی پسندی کی ایک مثال ہی پیش کر دیجئے۔ بات در اصل یہ ہے کہ اس ترقی پسندی کی نادل تشریح پر تشریح اور توضیح پر توضیح کئے جائیے وہ سیاسی، معاشی اقدار سے بلند نہیں ہو سکتی اس لئے اس سوال پر ہم پہونچ کر ترقی پسند نقاد بغلیں جھانکنے لگتے ہیں ــــ انہیں قدیم اردو ادب میں سیاسی ومعاشی تبدیلی کی کوئی واضح شعوری کوشش نظر نہیں آتی اور طبقاتی کشمکش کا تدریجی شعور دکھائی نہیں دیتا۔ زندگی کے خارجی پہلو اور معاشی ومعاشرتی، روابط کی مفصل عکاسی نہیں ملتی اور جس ادب میں یہ سب کچھ نہ ہو ترقی پسند اس کی تعریف میں کیا کہہ سکتے ہیں! ....

اسی لئے انہیں قدیم اردو ادب میں جاگیردارانہ نظام کی "جھلکیاں" ملتی ہیں، ذہنی عیاشی اور "تفریح" ملتی ہے "پسپا داخلیت" اور سطحی خارجیت" ملتی ہے اور وہ قدیم ادب کے متعلق صرف یہ کہہ کر اس کے حق سے سبک دوش ہو جاتے ہیں کہ وہ "زندگی کا مفسّر" اور اپنے عہد کے لحاظ سے ترقی پسند تھا"!

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسند نظریۂ ادب نے جس اقدار کا تعین کیا ہے اور ان کو جانچنے کے جو پیمانے بنائے ہیں ادب کی بلندی پرکھنے کے جو معیار مقرر کئے ہیں، ان میں وجدان وتخیل اور محسوسات وجذبات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں گیا ہے اور انسانی محسوسات وجذبات کی اہمیت سمجھے بغیر (صرف سیاسی ومعاشی اقدار کے سہارے) ادب کو نہیں سمجھا جا سکتا خصوصاً قدیم اردو شاعری کو ــــ اردو شاعری میں داخلیت ضرور ہے لیکن یہ "پسپا" داخلیت "نہیں ہے اس میں بڑی توانائی، بڑی جان بڑی طاقت اور بڑا حسن ہے۔ اس میں صرف جاگیردارانہ کلچر کی جھلکیاں نہیں ہیں عام انسانی محسوسات وجذبات کی ترجمانی بھی ہے اور یہ محسوسات وجذبات صرف انفعالی نہیں ہیں ان میں بڑی فعالیت ہے، زندہ رہنے، زندگی کو بہتر بنانے، زندگی کے حسن وقوت میں اضافہ کرنے کی بڑی زبردست خواہش ہے، اور صرف خواہش ہی نہیں ہے زندگی کے حسن وقوت کا ایک معیار بھی ہے۔ اردو شاعری زندگی کی مصور ہی نہیں نقاد بھی ہے، لیکن اس تنقید کو دیکھنے کے لئے انسانی محسوسات وجذبات کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا۔ انسانی تہذیب وتمدن اور کلچر کے ان نازک مقامات تک پہونچنا پڑے گا۔ جہاں سیاسی ومعاشی نظریات کے گڈولنوں کے سہارے نہیں پہونچا جا سکتا قدیم اردو شاعری صرف اپنے مخصوص دور کے لحاظ سے ترقی پسند نہیں ہے بلکہ آج بھی اتنی ہی ترقی پسند ہے جتنی اپنے عہد میں تھی لیکن اس ترقی پسندی کو سمجھنے کے لئے ذہن بہشت بھی ہم "ہوم رول کے بدلے" اور "یہ جنگ ہے جنگِ آزادی" والی ترقی پسندی سے بلند ہو کر زندگی کی ان اقدار کو سمجھنا پڑے گا جو ولی کے عہد سے لے کر آج تک ــــ ہاں آج ۸ جنوری ۱۹۳۹ء تک تبدیل نہیں ہوئی ہیں ــــ!

الیاس عشقی جے پوری (ایم۔اے)
نے براہِ راست انگریزی سے ترجمہ کیا

"دیاسلائی"

آپ روزانہ استعمال کرتے ہیں مگر اس کی تاریخ سے ناواقف ہیں!

ایک صدی پہلے تک لوگ اپنے پائپ چقماق سے روشن کرتے تھے۔ مگر ہم جب سگرٹ جلاتے ہیں تو یہی خیال ہوتا ہے کہ انسان ابتدائے آفرینش سے آج تک دیاسلائی سے اسی طرح کام لیتا رہا ہے۔ ہم دیاسلائی کے استعمال کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ چقماق کے لوہے اور پتھر کا خیال بھی عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔

ہم عام طور پر دیاسلائی سے آج اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ آگ پیدا کرنے کے قدیم طریقے کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہو گیا ہے بلکہ ہم یہ اندازہ بھی مشکل ہی سے لگا سکتے ہیں کہ دیاسلائی کی ایجاد نے ہماری روزانہ کی ضروریات میں کس حد تک آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

پہلے معمولی قسم کے لوگوں نے آسانی سے آگ پیدا کرنے کے طریقوں پر غور کیا اور اس کے بعد یہ شغل عام طور پر خبطی قسم کے کیمیا سازوں کی پراگندہ کوششوں تک محدود رہا۔ دیاسلائی کی ایجاد کی ابتدائی کوششوں کے نتائج خطرناک بھی ثابت ہوئے۔ موجودہ دیاسلائی کی ابتدائی اور بنیادی ایجاد فرانس میں ہوئی جس میں کیمیائی ترکیب سے کچھ لکڑی کی تیلیاں تیار کی جاتی تھیں اور آگ جلانے کے لئے انھیں سلفرک ایسڈ (Sulphuric Acid) میں ڈبونا پڑتا تھا۔ اس طرح لوگوں کو کچھ تیلیاں اور ایسڈ کی ایک بوتل ہر وقت اپنے ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔ سلفرک ایسڈ کی اس ایجاد میں جب اور ترقی ہوئی تو لکڑی کی تیلی کے کنارے پر کانچ کی ایک نازک سی نلی میں سلفرک ایسڈ رکھا جانے لگا۔ اس نلی کو توڑنے سے ایسڈ کیمیاوی ترکیب سے تیار کی ہوئی لکڑی کو اپنے اثر سے روشن کر دیتا تھا۔ اس طریقہ میں قدیم وضع کی دیاسلائیوں کے مقابلہ میں صرف انگلیوں ہی کے جلنے کا امکان تھا۔

انھیں ایجادوں کی ایک ذرا ستھری اور ترقی یافتہ شکل کانگریو (Congreve) تھی جس سے موجودہ دیاسلائی پیدا ہوئی ہے یہ محض اتفاق ہی سے وجود میں آئی تھی۔ اسٹاکٹن اون ٹیز (Stockton-on-Tees) کے ایک کیمیا ساز جون واکر (John Walker) نے دیاسلائی کو آسانی سے روشن کرنے کا طریقہ دریافت کرنے میں اپنا کافی وقت برباد کیا تھا۔ ایک سلفر سے تیار کی ہوئی کچھ تیلیاں اس کے کمرے کے فرش پر گر گئیں اور بے خبری کے عالم میں وہ اس کے پاؤں کے نیچے آ گئیں۔ ان کا زمین سے رگڑنا تھا کہ دفعتہً آگ کے شعلے پیدا ہوئے اس واقعہ سے اس کی توجہ ایک نئے طریق کار کی طرف منعطف ہو گئی اور آخر کار اس کی وجہ سے عہد حاضر کی ایک مفید ایجاد ممکن ہوئی۔

(خود آگ کی دریافت کا قصہ بھی اس سے کچھ کم دلچسپ نہیں طہورث دیوسار کے خاندان کے ایک فرد نے پہاڑی علاقہ میں شکار کھیلتے ہوئے

ایک جانور کو پتھر سے مارا جانور بچ کر نکل گیا اور پتھر سامنے کے پہاڑی سلسلہ میں کسی پتھر سے ٹکرایا جس سے آگ کا شعلہ بلند ہوا اور وہاں جمع ہونے والے خس وخاشاک میں آگ لگ گئی اس طرح آگ دریافت ہوئی چنانچہ قدیم ایران میں اسی خوشی میں "جشن" منایا جاتا تھا۔ جو اب بھی ہمارے ادب میں بطور تلمیح کے استعمال ہوتا ہے فردوسی نے شاہنامہ میں اسے نظم بھی کیا ہے ۔ مترجم)

اس دریافت کے بعد واکر نے دیاسلائی کی تجارت شروع کردی اور یہ فرکشن (Friction) دیاسلائیاں وہ ایک شلنگ میں چوراسی کے حساب سے فروخت کرنے لگا۔ لیکن اس قیمت نے اس کا استعمال مالدار طبقہ تک ہی محدود کر دیا۔ اور قدرتی طور پر وہ عوام کی دسترس سے باہر رہی۔ اس دیاسلائی کا رواج اس وجہ سے بھی عام نہ ہو سکا کہ اس قدر گراں ہونے کے بعد بھی ان کا ہر مرتبہ روشن ہونا ضروری نہ تھا اور بعض تو ان میں سے قطعی بیکار ثابت ہوتی تھیں ۔

چونکہ واکر نے اس ایجاد کا حق محفوظ نہیں کرایا تھا اس لئے دوسرے کیمیاساز اس کو ترقی دینے کی کوشش کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۳ء میں کینرر (Cannerer) نامی ایک جرمن نے فاسفورس (Phosphorus) کی دیاسلائی کا ایک کارخانہ کھولا۔ نئی دیاسلائی جو "ریگمال" (Sand paper) پر رگڑنے سے جلتی تھی سویڈن کے ایک باشندے سینڈسٹروم (Sand strom) کی دریافت ہے۔ مگر اس دیاسلائی کے فروخت کرنے میں اسے اول اول بہت دقت ہوئی کیونکہ لوگوں کو ہر وقت ریگمال اپنے ساتھ رکھنے کا طریقہ پسند نہ تھا۔ اس دقت کا ازالہ اس نے ان کے لئے ایک بکس بنا کر دیا جس کے اندر ریگمال لگا ہوتا تھا۔ اور اس طرح دوسری دیاسلائیوں سے آسان ہونے کی بنا پر یہ ان سے سبقت لے گئی۔ یہاں تک کہ دنیا کی تجارت میں اس کے لئے بڑا میدان نکل آیا۔

ابتدا میں دیاسلائی بنانے والوں نے اُن کے لئے یونانی اور رومی اصنام کی روایات میں سے نام تلاش کئے چنانچہ پرومیتھین (Promethean) اور لیوسیفر (Lucifer) اسی قسم کے نام ہیں جو اب بھی بعض دیہاتوں میں سنائی دے جاتے ہیں۔ ویسٹا (Vesta) مارکی دیاسلائی بھی اسی قسم کی ہے یہ نام ایک رومی دیوی سے مستعار لیا گیا ہے جس سے روم کی دوشیزہ لڑکیوں کو خاص عقیدت تھی اور جس کے مندر میں کبھی آگ نہیں بجھائی جاتی تھی ۔

دیاسلائی کے ذریعہ سے محفوظ طریقہ میں آگ جلانے کی یہ ترکیب جلد ہی دنیا کے تمام ممالک میں مقبول اور عام ہو گئی اور ہر جگہ اس کے کارخانے قائم ہو گئے۔ دیاسلائی جس قدر ضروری چیز ہے تجارت میں اسی قدر اُس کو ترقی ہوئی۔ لیکن اس عظیم الشان صنعت کو ناعاقبت اندیش تاجروں نے کم اجرت پر کام کرنے اور بھوکے مرنے والے مزدوروں کے ہاتھوں میں سونپ کر تباہ کر دیا ۔

بڑے بڑے کارخانے بدانتظام حکام اور بے پروا مزدوروں کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں جن میں آئے دن معمولی حادثات سے لیکر خطرناک قسم کی آتشزدگی کے واقعات تک رونما ہوتے رہتے ہیں ۔

سب سے زیادہ خطرناک وہ بیماری ہے جو ان کارخانوں میں عام طور پر پیدا ہو جاتی تھی جسے فاسفورس نیکروسس (Phosphorus Nacrosis) اور "فوسی جاء" (Phossy jaw) کہتے ہیں۔ یہ فاسفورس کی بو سے پیدا ہو جاتی ہے جو سانس کے ساتھ مزدوروں کے منہ میں داخل ہو کر ان کے جبڑوں پر مہلک اثر ڈالتی ہے۔ طرح طرح کی احتیاط اور طریق کار کی ترقی یافتہ حالت کے باوجود اس بیماری نے ہزاروں انسانوں کی تندرستی پر بہت خراب اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء میں انجمن اقوام (League of Nations) کا ایک خاص اجلاس دیاسلائی کے کارخانوں میں پیدا ہونے والی بیماریوں کی روک تھام کے متعلق غور کرنے کے لئے بلایا گیا۔ غرض یہ کہ آسانی کے ساتھ محفوظ طریقہ سے آگ پیدا کرنے کی مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسانوں کو بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی ہے ۔

اس زمانہ لکڑی کی تیلیاں بنانے کا دشوار کام ہاتھ ہی سے کیا جاتا تھا اس کے بعد مشینیں ایجاد ہوئیں سنہ ۱۹۰۰ء میں سب سے پہلے دیاسلائی کا باقاعدہ اور جدید قسم کا کارخانہ قائم کیا گیا جس سے یہ صنعت بہت ترقی کر گئی۔ سرمایہ داروں نے جب ان حالات کا مطالعہ کیا تو دیاسلائی کی برآمد کے لئے دو ایک کمپنیاں اعلیٰ پیمانہ پر قائم کی گئیں۔ مگر سنہ ۱۹۲۰ء تک یہ طریق کار اتنا مفید ثابت نہ ہو سکا جتنا اُسے سمجھا جاتا تھا۔

ہر وقت کے استعمال کی چیز ہونے کی وجہ سے دیاسلائی کی مانگ برابر بڑھتی گئی اس طرح قدرتی طور پر یہ صنعت ترقی کرتی رہی۔

آج یہاں (غالباً انگلستان میں) دیاسلائی پر ۵۰۰۰۰۰ پونڈ صرف ہو رہے ہیں اور تقریباً ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ دیاسلائیاں خرچ ہوتی ہیں۔

گذشتہ سو برس میں دیاسلائی نے ہماری زندگی سے حیرت انگیز وابستگی پیدا کر لی ہے لیکن اس کے باوجود اکثر لوگ اپنی زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی دیاسلائی کی حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ اور جان واکر کا نام تو (جو اس کا موجد ہے) ہزار انسانوں میں سے شاید ایک نے بھی نہ سنا ہوگا اور عوام کو تو غالباً یہ سن کر بھی تعجب ہوگا کہ انگلستان میں دیاسلائیوں کے مختلف لیبل جمع کرنے کے لئے ایک انجمن (British Society of Match box label-Collectors) قائم ہے اور تمام دنیا میں اسی قسم کے کلب اور انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔

دنیا میں اس وقت دیاسلائی کی تقریباً ایک لاکھ مختلف قسمیں ہیں۔ (ترجمہ)

دیاسلائی کے بننے کا حال اور اُس کے بنانے والے کا نام جان کر آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا، اور اس اضافہ سے آپنے یقیناً ذہنی خوشی اور قلبی مسرت محسوس کی، اس سلسلہ کو اور آگے بڑھائیے دیاسلائی کو جان واکر نے بنایا، مگر وہ جس مادے سے بنی ہے اُسے کس نے پیدا کیا، اسی انداز پر کائنات کے ابداع و تخلیق پر غور کرتے جائیے —— یہ بات تو بہر حال متحقق ہے کہ دنیا میں چیزیں آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو جایا کرتیں، کوئی ان کو بناتا اور پیدا کرتا ہے، یہ عقیدے کی بات نہیں، مشاہدات اور تجربات کا یہی فیصلہ ہے عقل عمومی کی یہی رائے ہے۔

جب ایک ذراسی سوئی، چھوٹی سی دیاسلائی اور ایک کچا دھاگا آپ ہی آپ نہیں بن جاتا، اُسے کوئی بناتا ہے تو وجود میں آتا ہے۔ پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنی بڑی دنیا جو اپنے اندر غیر معمولی تنظیم اور ترتیب رکھتی ہے آپ ہی آپ پیدا ہو گئی ہو۔

سائنس تحقیق و اکتشاف کی اس منزل پر پہنچ کر "نامعلوم قوت" کہتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس لوٹ جاتی ہے۔ مگر مذہب اس حقیقت کو مبہم نہیں رہنے دیتا وہ صاف صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کائنات کی خالق ہے، سائنس کی یہی "قوتِ نامعلوم" فلسفہ کی "علۃ العلل" Final cause ہے۔

یہ کتنی بڑی محرومی اور بد توفیقی ہے کہ آلپین اور دیاسلائی کے بنانے والوں کے نام تو لوگوں کو معلوم ہوں مگر دنیا کے خالق کے نام پر "قوتِ نامعلوم" کا حجاب ڈال دیا جائے (م - ق)

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی

لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

عبدالقدوس ہاشمی

اردو زبان اور رسم الخط

کارزارِ حیات میں وہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جو دشواریوں سے گھبرا کر آسانیوں کو اس انداز سے تلاش کرتے ہیں کہ حقیقتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔

لاطینی رسم الخط

پاکستان یا ہندوستان میں جب "لاطینی رسم الخط" کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے انگریزی زبان اور دوسری بہت سی یوروپی زبانوں کا موجودہ رسم الخط مراد ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقتاً لاطینی خط اس درجہ تک پہنچنے میں بہت سی اصلاحات کی منزلوں سے گزر چکا ہے، کہتے ہیں کہ روما کے گرد و نواح میں کبھی کوئی قبیلہ لیٹن نامی آباد تھا۔ لاطینی زبان اور لاطینی خط اصل میں اسی قبیلہ کی زبان اور اسی کا خط تھا، آج جن زبانوں کے لئے یہ خط مستعمل ہے۔ اُن میں حروف کی آوازوں کی تعیین یکساں نہیں ہے، مثلاً حرف H. انگریزی زبان ھ کی آواز دیتا ہے، اور اطالوی میں خ کی، اسی طرح حرف V. انگریزی میں و کی آواز دیتا ہے اور جرمن میں ف کی، اور اسی قسم کے سیکڑوں اختلافات آواز کی تعیین میں موجود ہیں، اس لئے لاطینی رسم الخط پر غور کرتے وقت دو ہی صورتیں سامنے آتی ہیں، پہلی صورت یہ کہ آپ کسی ایک زبان کی موجودہ تعیین کو قبول کریں، مثلاً انگریزی زبان کی اس سلسلہ میں پیروی کی جائے، دوسری صورت یہ کہ آپ ان نقوش کی آوازیں خود ہی متعین کر لیں۔ ان میں سے کوئی صورت آسان نہیں ہے۔

کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ دنیا میں کوئی رسم الخط اتنا مکمل موجود نہیں ہے، جتنا کہ آج ہمارا دل چاہتا ہے، کچھ نہ کچھ عیب اور دشواریاں سب ہی زبانوں میں اور اُن کے خطوط میں موجود ہیں، مثال کے طور پر انگریزی کی زبان کو لیجئے، بے قاعدگی، اور آوازوں کے ادا کرنے کی انتہائی غیر قیاسی صورتوں کے علاوہ جو دوادل[عہ] یعنی جوف دہن سے ادا ہونے والی آوازوں کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، خود حروف صحیحہ کی آوازوں کا یہ حال ہے کہ ش کی آواز انگریزی زبان میں بکثرت پائی جاتی ہے لیکن اس کے ادا کرنے کے لئے کوئی حرف موجود نہیں، کہیں اسے S H کے مرکب سے ادا کرتے ہیں، مثلاً SHE کہیں اسے TIO تین حروف کے مرکب سے ادا کرتے ہیں مثلاً STATION، اور کہیں اسے SSION چار حرفی مرکب سے ادا کرتے ہیں، مثلاً COMMISSION، اسی طرح چ کی آواز کثرت سے موجود ہے لیکن نہ اس کے لئے کوئی قاعدہ ہے، اور نہ کوئی حرف، کہیں TURE لکھ کر چ پڑھتے ہیں مثلاً MIXTURE اور کہیں CH لکھ کر چ کی آواز پیدا کرتے ہیں، مثلاً WATCH، کبھی یہی CH کبھی "ک" کے ساتھ ملی ہوئی قدرے "ھ" کی آواز دیتا ہے، جیسے HEADACH۔

انگریزی زبان اور اس کے حروف میں جو خامیاں ہیں، اُن کی فہرست تیار کرنا مقصود نہیں، ورنہ دنیا میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ تقریباً تین سو حروف جو رائج ہیں، شاید یہ زبان اور اس کے حروف بہت سی دوسری زبانوں سے زیادہ مہمل اور غیر علمی ثابت ہوں گے، خصوصاً حروف

عہ۔ VOWEL

علت یعنی "وول"[علہ] کی آوازوں کے سلسلہ میں تو یہ حروف اتنے ناقص ہیں کہ کوئی شکل ہی سے ان حروف کی صحیح آوازیں ادا کرنے کا دعویٰ کر سکے گا۔ ایک انگریزی زبان ہی نہیں دنیا کے تمام رسم خطوں کا تقریباً یہی حال ہے کوئی پوری طرح مکمل نہیں، سب میں نقص موجود ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ اس لئے یہ دلیل حقیقۃً کوئی وزن نہیں رکھتی کہ اُردو کے موجودہ خط یعنی ا۔ ب۔ ت۔ ٹ۔ میں چونکہ بعض نقائص ہیں' اس لئے انھیں چھوڑ کر دوسرا خط اختیار کر لیا جائے، آپ جو خط اختیار کریں گے، وہ اس سے زیادہ ناقص ہوگا، کامل کی اُمید نہ رکھیے، اور کم از کم اتنا تو کیجئے کہ مطلوبہ رسم الخط سے موجودہ رسم الخط کا مقابلہ کر کے دیکھیئے اس تقابلی مطالعہ کے بعد آپ پر حقیقت حال واضح ہو جائے گی اور آپ مان لیں گے کہ یہ خانہ ساز مرکب (اُردو رسم الخط) غیروں کے بنائے ہوئے تیر اب سے زیادہ تیز اور کارآمد ہے۔

اس سلسلہ میں ترکی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کئے جانے کا حادثہ بڑی شد ومد سے پیش کیا جاتا ہے، لیکن پیش کرنے والے اکثر ناواقف ہوتے ہیں کہ ترکی زبان جب عربی خطوط میں لکھی جاتی تھی، اس وقت بھی وہاں کے بہت سے لوگ لاطینی رسم الخط میں نجی خط وکتابت کرتے تھے، اور یہ ایک مانوس خط تھا کیونکہ تمدنی اثرات کی وجہ سے ترکی کے لئے عربی خط جب اختیار کیا گیا تھا تو اس وقت بھی یہ زبان آرمینین خط یعنی اے، بی، سی، ڈی والے حروف میں لکھی جاتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ مرحوم مصطفےٰ کمال کی اس بے جا ضد سے ترکی زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا' پروپیگنڈے پر نہ جائیے، اس انقلاب سے آسانی کی بجائے بہت سی دقتیں پیدا ہو گئیں جن پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا ہے۔

تقابلی مطالعہ

بہر حال یہ باتیں اگر غیر متعلق نہیں تو کم از کم تقابلی مطالعہ کے لئے بہت ضروری بھی نہیں ہیں، اصل سوال جو در پیش ہے وہ یہ کہ اُردو زبان کے لئے لاطینی خط اختیار کر لیا جائے یا نہیں ــــ کسی رسم الخط کی افادیت کو سامنے رکھ کر اسے متعدد پہلوؤں سے دیکھنا چاہیئے۔ مثلاً (۱) تعلیمی ضروریات (۲) روزانہ خط وکتابت کی سہولت (۳) طباعتی آسانیاں اور (۴) بین الممالک تعلقات کی اہمیت ــــ ممکن ہے کوئی صاحب نکر کسی اور پہلو کو بھی ضروری سمجھیں مگر میں انہی چار پہلوؤں اور دو گوشوں کو سامنے رکھ کر اختصار کے ساتھ اس پر روشنی ڈالتا ہوں۔

(۱) تعلیمی ضرورت

تعلیمی ضرورت کے اعتبار سے کسی رسم الخط میں حسب ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں' (۱) اس کا سیکھنا سکھانا آسان ہو، حروف کی شکلیں آسان ہوں، الجھی ہوئی نہ ہوں، حروف آوازوں کا ساتھ دے سکتے ہوں، بے آواز حروف، یا بے حروف آواز نہ ہو، مفرد اور مرکب دونوں شکلوں میں حروف اپنی اصلی شکلیں قائم رکھتے ہوں تاکہ بچوں کو ان کی شناخت میں دقت نہ ہو، حروف کی تعداد کم ہو تاکہ جلدی سے یاد ہو سکیں، حروف کی شکلیں ایسی ہوں کہ شکلوں کے اعتبار سے اُن کے گروپ بنا کر بچوں کو یاد کرایا جا سکے۔

ان امور کو سامنے رکھ کر اب اُردو حروف اور لاطینی حروف دونوں پر غور کر لیجئے۔ اُردو حروف کا خذ یا تختی کے چار رخ یعنی ا ـــ / ⌒ میں صرف تین ابتدائی رخ پر لکھے جاتے ہیں، اور یہ اتنی آسان شکلیں ہیں کہ کسی ان پڑھ کو پنسل اور کاغذ دے دیجئے وہ بغیر کسی علم کے ایسی ہی لکیریں بنائے گا۔ اس کے برخلاف ذرا لاطینی حروف کی شکلوں پر غور کیجئے، Q، G، K، پھر انصاف سے کہیے کہ ق گ ک کے مقابلے میں یہ کتنی دشوار شکلیں ہیں؟ ذرا "ب" کی شکل کو دیکھیے اور B، B، b، G کی شکلوں سے مقابلہ فرمائیے۔

آواز اور حروف کے باہمی تعلق کے اعتبار سے تو شاید لاطینی رسم الخط آپ کے لئے ناقص ترین خط ثابت ہوگا، س۔ ص۔ ث اور اسی طرح ذ، ز، ظ، ض، کے فرق کو تو جانے دیجئے، ج، ڈ، د، ش، ت، خ کے لئے آپ غالباً نئے حروف وضع کریں گے اور اصل حروف کے علاوہ حروف علت کی آوازوں کے لئے متعدد نئے حروف وضع کرنے پڑیں گے۔ خود انگریزی زبان میں جو ف

[علہ] VOWEL

دہن سے ادا ہونے والی سولہ آوازیں ہیں، اور صرف پانچ حروف علت سے ادا کی جاتی ہیں، اور سچ یہ ہے کہ اس پر بھی ادا نہیں ہوتیں مثال کے طور پر حسب ذیل الفاظ میں حرف U کی آواز پر غور کیجئے۔

BURN ، TUBE ، BUT ، PUT

غرض یہ کہ لاطینی حروف میں بہت سے حروف بے آواز ہیں، اور انگریزی زبان میں بہت سی آوازیں بغیر حروف کے موجود ہیں، تعلیمی مقصد کے لئے یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے جس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں بچوں کو پڑھانے کا تجربہ ہو، میں اور شاید میری طرح آپ بھی صحیح اندازہ نہیں کر سکیں گے۔

اردو حروف کی یہ خصوصیت ہے کہ مرکب میں حروف کی اصلی شکل قائم رہتی ہے، اور صرف وہ لکیر کم ہو جاتی ہے جو تکملہ کے طور پر مفرد لکھتے ہوئے لگا دی جاتی ہے، مثلاً شجاعت، اس میں ش کی اصلی شکل جیم کی اصلی شکل اور ع کی اصلی شکل موجود ہے، لیکن لاطینی حروف میں یہ خوبی نہیں صرف D اور d دو بالکل مختلف حروف معلوم ہوتے ہیں، ان میں مشترک کچھ بھی نہیں جس سے بچے انھیں پہچان سکیں۔

حروف کی تعداد کے اعتبار سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ لاطینی خط اختیار کرنے میں آسانی ہو جائے گی، لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔

اردو حروف بشمول پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ، جملہ ۳۴ حروف ہوتے ہیں جنھیں سہولتِ یادداشت کے لئے سات گروپ میں تقسیم کر دیا گیا ہے، مثلاً ب کے گروپ میں چھ حروف ہیں،

اگر لاطینی حروف اختیار کئے گئے تو موجودہ ۲۶ حروف میں سے C اور X جو ہمارے کام کے نہیں غالباً نکال دیے جائیں گے، باقی رہے ۲۴ حروف، ان میں ت، ٹ ج، خ، ڈ، ش، غ کے لئے سات حروف کا اضافہ کیا جائے گا، اس طرح حروف کی تعداد ۳۱ ہوگی۔ ان میں سے ہر ایک کی دو شکلیں ہوں گی، بڑے حروف یعنی کیپٹل لیٹرس اور چھوٹے حروف یعنی اسمال لیٹرس، اس طرح یہ تعداد ۶۲ ہو جائے گی اور چونکہ کتابی حروف سے تحریری حروف بالکل جداگانہ ہوتے ہیں، اس لئے بچوں کو ۱۲۴ شکلیں مفرد حروف کی یاد کرانی ہوں گی۔ کیا تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ کوئی آسان کام ہے؟ اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

اس کے برخلاف اردو حروف میں ۸ حروف کبھی کسی دوسرے حرف سے نہیں ملتے، مثلاً و مفرد یا مرکب ہر صورت میں اپنی پوری شکل قائم رکھتا ہے۔ باقی ۲۶ حروف کی صرف دو شکلیں ہو سکتی ہیں، (۱) جب وہ مفرد ہوں (۲) جب کسی لفظ میں مرکب ہوں، اگرچہ مرکب شکل میں بھی جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، ان حروف کی اصلی شکلیں قائم رہتی ہیں، لیکن اگر انھیں علیحدہ بھی فرض کر لیا جائے پھر بھی ۲۶ × ۲ = ۵۲ + ۸ = ۶۰ جملہ ساٹھ نقوش بچوں کو یاد کرنے پڑتے ہیں۔

لاطینی حروف کی شکلیں بھی ایسی نہیں ہیں کہ اردو حروف کی طرح ان کے گروپ بنائے جا سکیں، بعض ریڈروں میں ایسی کوششیں کی گئی ہیں، اور قطعی ناکامی ہو چکی ہے۔

تعلیمی اعتبار سے اردو حروف پر جو سب سے بڑا اعتراض ہو سکتا ہے وہ حرکات کی عدم موجودگی ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ ایک نوعمر بچے کے لئے مُلک، مِلک، اور مَلَک میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح ضرور ہونی چاہیئے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ لاطینی حروف اختیار کر لینے سے یہ دقت ختم ہو جائے گی، جوفِ دہن سے ادا ہونے والی آوازیں جن کے لئے زبر، زیر، پیش ہوتے ہیں، اردو میں صرف پانچ ہی نہیں جو لاطینی حروف کے پانچ واولز سے ادا ہو جائیں گی، اردو میں (۱۵) آوازیں جوفِ دہن سے ادا ہوتی ہیں، ان کے لئے لاطینی کے پانچ حروف علت کافی نہ ہوں گے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص کسی زبان سے واقف نہ ہو، اس زبان میں

لکھی ہوئی کسی تحریر کو صرف نقوش واصوات کے تعلق سے صحیح پڑھ نہیں سکتا، اس لئے ان بچوں کے لئے جو اردو بولتے ہیں، حرکات کو سماعی طور پر درست کر لینا ہی وہ آسان ترین طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ صحیح لکھنے اور صحیح پڑھنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔

روزانہ کی ضروریات

تمدن کی روزانہ ضروریات کے لئے لاطینی حروف کی بہ نسبت اردو کے موجودہ حروف نہ صرف زیادہ آسان، اور زیادہ مفید ہیں، بلکہ یہ ایک قسم کی مختصر نویسی بھی ہے جس کے ذریعہ آپ بہت جلد، کم محنت سے اور کم کاغذ صرف کر کے اپنا کام پورا کر لیتے ہیں۔ میں خود اور میرے بہت سے ایسے دوست ہیں جو اردو مختصر نویسی سے ناواقف ہونے کے باوجود بڑی آسانی کے ساتھ تقریریں لکھتے رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کوئی تیز سے تیز لکھنے والا مختصر نویسی کی امداد کے بغیر کسی مقرر کی پوری تقریر نہیں لکھ سکتا۔ مثال کے لئے لفظ کراچی کو لیجئے، اور دیکھئے کہ (کراچی) لکھنے میں ہاتھ اور قلم کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے، زیادہ کاغذ صرف ہوتا ہے یا ( ) لکھنے میں۔

چونکہ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے سرکاری دفاتر میں انگریزی زبان اور انگریزی حروف رائج ہیں اس لئے ہمارا ایک بڑا طبقہ اپنی غیر سرکاری تحریروں میں بھی اسے استعمال کرنے کا عادی ہو گیا ہے، یا احساس کمتری نے اسے یہ سکھا رکھا ہے کہ انگریزی میں خط لکھنا، فیشن ایبل اور باعظمت آدمی ہونے کی دلیل ہے، اور یہی وہ طبقہ ہے جو نہایت یقین کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ ہمیں تو انگریزی لکھنے میں آسانی ہوتی ہے حالانکہ ان بے چاروں کو نہ انگریزی آتی ہے اور نہ اردو، نہ کبھی انھوں نے تقابلی مطالعہ کیا ہے، اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ اپنی عمر کے پچھلے بیس سال میں جس طرح وہ انگریزی لکھتا رہا ہے اور اس کے باوجود آج تک انگریزی الفاظ کا املا غلط لکھتا ہے اگر بیس دن بھی یہ لوگ اردو لکھتے رہتے تو اردو زبان کے لکھنے کی خاصی صلاحیت آجاتی۔

حکومت پاکستان اگر اپنا وعدہ وفا کرے۔ اور اس کے سارے محکمے اردو میں کام کرنے لگیں، تو دو تین سال کے اندر ہی معلوم ہو جائے گا کہ حقیقتاً لاطینی حروف کی ہمیں دفتر اور خارجہ کے بعض شعبوں کے سوا اور کہیں ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور ہمارے محرر حضرات اردو کے لکھنے میں کتنی آسانی محسوس کرتے ہیں۔

مسئلہ طباعت

اردو طباعت میں جو دقتیں نستعلیق حروف اور لیتھو کی طباعت کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں، ان کا الزام رسم الخط پر نہ ڈالئے، پھر اس میدان میں بھی اردو حروف لاطینی حروف سے کمتر ثابت نہ ہوں گے، بلکہ بعض اعتبار سے کہ یہ نئی حروف سے ا۔ ب۔ ت والے حروف بہتر ہی ثابت ہوں گے۔ میں ۱۹۴۰ء کے اواسط میں ایک خاصی طویل مدت کے لئے مصر گیا تھا۔ میں نے وہاں کے ترقی یافتہ مطابع دیکھے، اور یہ بھی دیکھا کہ ہمارے اخباروں سے دوگنی تقطیع پر ایک ایک لاکھ چھپنے والے روزنامے تصاویر سے مزین ہو کر دس، دس، بارہ بارہ صفحات میں دو دو رنگے اور سہ رنگے بلکہ چار رنگی چھپائی سے چند گھنٹوں میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہ جدید ترین مشینیں سطر بندی، اور طباعت کے لئے استعمال ہوتی ہیں، یہی ا۔ ب۔ ت والے حروف نہایت خوبصورت اور کئی کئی رنگوں میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اردو کے لئے بھی ہو سکتا ہے، لیکن کب؟ جب کہ آپ آہنی حروف اور نسخ خط اختیار کر لیں، نستعلیق حروف، ایران کی نفاست پسندی کی یادگار ہے۔ اور خود وہاں بھی متروک ہو چکا ہے، آپ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے، اور ٹائپ ان حروف کا بن نہیں سکتا، اب تک کی ساری کوششیں ناکامی پر ختم ہو چکی ہیں۔ اس لئے طباعت کی موجودہ دقتیں رسم الخط کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ آپ نے خود اپنی قدامت پسندی سے اپنے اوپر نازل کر لی ہیں۔

اگر آپ نسخ حروف میں طباعتی کام کرنے لگیں تو آپ دیکھیں گے کہ لاطینی حروف سے سستی اور بہتر مطبوعات آپ تیار کر سکیں گے لاطینی حروف میں اگر کوئی کتاب چھاپی جائے تو اردو حروف سے تقریباً ۵۰ فی صد زیادہ لاگت آتی ہے، مثال کے طور پر ایک خط بشیر کو لیجئے

اُردو کی طباعت میں اس لفظ کے چار ٹکڑے ہوتے ہیں | ب / شـ / یـ / ر | اور لاطینی حروف میں اس کے سات ٹکڑے ہوں گے۔

| B | A | S | H | E | E | R | اس کا مطلب یہ ہوا کہ سطر بندی کرنے والے کو ۷۵ فیصد کام زیادہ کرنا پڑا، ۷۵ فیصد کاغذ زیادہ صرف ہوا، ۷۵ فیصد حروف زیادہ لگے، ۷۵ فیصد روشنائی زیادہ صرف ہوئی

یہ اور اس قسم کی سینکڑوں عملی دقتیں لاطینی حروف اختیار کرتے ہی آپ پر نازل ہو جائیں گی، آپ خود سوچیں تو ساری دقتیں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ میں ایک مختصر سے مضمون میں ان تمام دقتوں اور دشواریوں کا جائزہ نہیں لے سکتا۔

بیرونی تعلقات

بیرونی تعلقات کے اعتبار سے لاطینی حروف کو یہ فخر یقیناً حاصل ہے کہ یورپ اور امریکہ میں مانوس و متداول حروف ہیں۔ لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں ہمیں صرف یورپ و امریکہ ہی سے تعلق رکھنا تو نہیں ہے، سب سے زیادہ ہمیں اپنے ہمسایہ ممالک سے تعلقات کو استوار تر کرنا ہے۔ اور ذرا غور تو فرمائیے کہ آپ کے ہمسایہ ممالک میں کہاں لاطینی رسم الخط رائج ہے، ایران، افغانستان، عرب، مصر، شام، لبنان، عراق، زنجبار، کویت، اذبیہ، کنایا اور افریقہ کے مختلف ممالک، کیا ان سب مقامات میں عربی رسم الخط رائج نہیں ہے؟ اور کیا عربی رسم الخط بعینہٖ اُردو رسم الخط نہیں ہے؟ دوسری طرف دیکھئے تو ہندوستان، چین، جاپان وغیرہ میں جن کے اپنے اپنے حروف ہیں۔ اور مشرق میں بھی جاوا، ملایا اور سماٹرا میں عربی رسم الخط رائج ہے۔

کیسی نادانی کی بات ہوگی کہ بیرونی تعلقات کا خیال کر کے وہی خط چھوڑ دیا جائے جو اس اعتبار سے سب سے زیادہ مفید ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اس قسم کی تجویزیں پیش کرتے ہیں وہ اچھی طرح غور نہیں کرتے، جب تک ہم غلام تھے ایسی باتیں کہنے سے نقصان بھی کم پہنچتا تھا، اور غلاموں کو ویسی ہی باتیں زیب بھی دیتی ہیں، لیکن اب جبکہ ہم بحمد اللہ ایک آزاد ملک کے آزاد باشندے ہیں ہمیں کافی غور و خوض کے بعد ایک منظم قدم اپنی بہتری کے لئے اُٹھانا چاہیے، پریشان خیالی عملی قوتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

اس عالمِ کون و فساد اور جہانِ حوادث میں آسانیوں کے ساتھ دشواریاں بھی لگی ہوئی ہیں، دشواریاں اور مشکلیں نہ ہوں تو آدمی کی زندگی غیر دلچسپ بلکہ جامد بن کر رہ جائے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ دشواریاں ہیں جن کی رگڑ پاکر انسان کی صلاحیتوں کے چقماق سے عمل کی آگ نکلتی ہے، آدمی آسانیاں چاہتا ہے مگر دشواریاں قدم قدم پر اُس کا ہاتھ تھام کر کہتی ہیں کہ زندگی کے ہنگامہ سے بھاگ کر آخر کہاں جاؤ گے۔

آسانیوں کی افادیت اور اُس کی گوناگوں لذتوں کے ہم منکر نہیں ہیں، تمدن اور معاشرت کا یہ بھی فرض ہے کہ دشواریوں کو آسان اور مشکلوں کو نرم بنا دیا جائے، آسانیوں اور سہولتوں کے ہوتے ہوئے خواہ مخواہ دشواریوں میں پڑنا بے دانشی اور پریشان خیالی کی دلیل ہے۔

اُردو رسم الخط میں بھی آسانیاں اور سہولتیں اسی حد تک قبول کی جا سکتی ہیں کہ اُردو زبان کی بنیادی اور امتیازی خصوصیات باقی رہیں اگر ان خصوصیات کی قربانی دینے کے بعد سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہوئیں تو یہ کوشش زبان و ادب کا بہت بڑا خونریزہ ہوگی۔

آواز کی طرح حرفوں کی صورت بھی زبان کی بنیاد ہے، اس کو بدل دیا تو پھر زبان کا فطری قالب ہی بدل گیا، اُردو زبان اپنے نادان دوستوں سے پناہ مانگتی ہے ———— (م۔ ق)

افضل صدیقی

اقبال کی شاعری میں ابدیت کا تصور

شاعری سے متعلق لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان مختلف النوع تعریفوں نے شعر کی صحیح تعریف کو ایک معمہ بنا دیا ہے۔ نہ سمجھنے کے قابل اور نہ سمجھانے کے ـــــ کوئی کہتا ہے کہ شعر منظوم کلام کا نام ہے۔ الفاظ کی برجستگی، تراکیب کی چستی، انداز بیان کی سادگی کو شعر کہتے ہیں۔ اگر ان ناقدانِ حق کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو لکھنؤ کے ایک چرب زبان اور شوخ پان بیچنے والے لونڈے کی گفتگو، فسانۂ عجائب کی مقفیٰ عبارت، شیخ ناسخ کے منظومات اور غالب کے الہاماتِ شعری میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ شعر علوِ تخیل کا نام ہے اگر یہ درست ہے تو روحانی شخصیتوں کے بعض ارشادات اور عاشقانِ تفتہ جگر کی دلدوز فریادیں شعر کہلانے کی مستحق ہیں۔ یہاں شعر اور جذبات واحساسات میں کچھ فرق نہیں رہتا، اس لئے نہ تو محض لفظی آرائشوں کا نام شاعری ہے اور نہ محض تخیل کی بے قید و بند بلند پروازیوں کو شعر کہتے ہیں، بلکہ سب چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ جب علوِ تخیل کے ساتھ دلکش اندازِ بیان شامل ہو جائے، جب الفاظ و معانی اپنی لطافت کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ جب دونوں کی آمیزش شراب و شیشہ کے وصال کی مانند ہو یعنی یہ بتانا ہی مشکل ہو کہ شراب شیشہ میں ہے یا شیشہ شراب میں، تو سمجھ لیجئے کہ شاعر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، شعر حسنِ صورت اور حسنِ معنی کے امتزاج کا نام ہے۔

اقبال کا کلام سمجھنے کے لئے صحتِ وجدان اور ذوقِ سلیم کے ساتھ ساتھ وسعتِ فکر و نظر کی شدید ضرورت ہے، جس شخص کا مطالعہ جتنا زیادہ وسیع ہے اتنا ہی اقبال کے کلام سے وہ زیادہ مستفید ہو سکتا ہے، اقبال نے شعروں میں الہیات، فلسفہ، عمرانیات اور تصوف و سیاست کے مسائل کی طرف بہت ہی نازک اشارے کئے ہیں، ان میں تاریخی تلمیحات بھی ہیں، کہیں اس نے حقائق کا فولاد پگھلا کر شعروں کو استوار کیا ہے اور کسی جگہ حبابوں میں شوخیٔ فکر بند کر دی ہے۔

اقبال کا بہت مشہور شعر ہے:۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں ۔۔۔ تو اقبال اس کو بتاتا مقامِ کبریا کیا ہے ؟

تو جس نے نطشے المانوی کی کتابیں نہیں پڑھیں وہ "مجذوبِ فرنگی" کی ترکیب سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ نطشے کو "مجذوب" کہہ کر اقبال نے اس کے افکار و تصورات پر درحقیقت ایک جامع تنقید کر دی۔

اقبال کی شاعری کا آغاز اردو زبان کے دوسرے شاعروں کی طرح غزل ہی سے ہوتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر جہاں استاد داغ کے آگے وہ زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے، اسی دور کی یادگار اس قسم کے شعر ہیں:۔

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا ۔۔۔ خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں ۔۔۔ یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

Conception of Eternity

وہ شخص جس نے اقبال کا صرف فلسفیانہ کلام پڑھا ہے ایسے اشعار سن کر کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ یہ شعر اقبال نے کہے ہوں گے قدرت کو اقبال سے کچھ اور ہی کام لینا تھا، چنانچہ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں رہی، شاعر کی وسعت تخیل تنگنائے غزل میں نہ سما سکی، اس نے دوسری اصنافِ سخن سے کام لیا، اور جب اس نے محسوس کیا کہ خیالات کی نازکی اور شدت زیادہ ہم آہنگ اظہار چاہتی ہے تو اس نے فارسی زبان میں شاعری شروع کر دی۔

طلوعِ صبح کا ذکر ہو یا شفقِ شام کا، کوہسار کا منظر ہو یا سبزہ زار کا، موسمِ بہار کا تذکرہ ہو یا خزاں کا، کشمکشِ زیست کا سوال ہو یا افسردگیِ مرگ کا۔ وہ اسے دیکھتا ہے اور اس میں یکسر محو ہو کر حقیقت کی تہ تک پہنچا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف منظر کشی میں زیادہ سعی نہیں کرتا، "موجِ دریا" "ستارہ" "بچہ اور شمع" اور خود اقبال کی۔ اور کار شیہ سوز و الم کے مقابلہ میں فلسفۂ غم زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کا طرزِ بیان ایسا ہے کہ فلسفہ کی خشکی رنگینی میں بدل جاتی ہے۔ اس کی دل آویزی اور بڑھ جاتی ہے اور یہی شاعر کا کمال فن ہے اپنی نظم "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" پھول سے خطاب کر کے اقبال کہتا ہے :-

مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہلِ نظر — مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مدعا نہ ہوا — کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے — فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان کی ہستی کا موت کے بعد خاتمہ نہیں ہو جاتا یہ تو محض عارضی انقطاع ہے، اس کے بعد انسان کو ابدی حیات حاصل ہوتی ہے جیسا کہ John Donne کا خیال ہے۔ موت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

For those whom you think'st thou dost
over — thou die not, Poor Death,
No yet canst thou kill me.

جن کو موت یہ سمجھتی ہے کہ مار دیا ہے۔ در اصل وہ مر نہیں سکتے اور اے موت! نہ تو انھیں مار سکتی ہے۔

One short sleep past
we wake eternally
And Death shall be no more,
Death thou shall die.

موت تو ایک دفعہ خواب ہے پھر ہمارے لیے ہمیشہ کی بیداری ہے۔ پھر ہم کبھی نہیں مریں گے —— اس کا عقیدہ ہے کہ موت کو بھی ایک دن مرنا ہے۔ اور یہ موت تو محض ایک مختصر سا خواب ہے۔ اس کی طرف میر نے بھی اشارہ کیا ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

زندگی کی اس ابدیت کا تصور اسی وقت تشکیل پا سکتا ہے جبکہ زندگی کو خوش اسلوبی سے بسر کیا جائے۔ اقبال ایک ایسی مثالی زندگی بسر کرنے کا پیغام دیتا ہے کہ اس سطحِ زمین پر انسان قدرتی مخلوقات میں قابلِ رشک مثال ثابت ہو۔

ابدیت کا تصور اقبال کے یہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کے ہر شعر میں ایک زندگی، ایک تڑپ ہے۔ وہ رواں، دواں، پیہم جواں زندگی بسر کرنے کا قائل ہے۔ یہی دوام ہے۔ یہی معراج حیات ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ پتھر سے لعل نکال لانے میں انسان کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے

وہ لعل کو وراثتاً پانے میں نہیں ہوتی، عالی حوصلہ ہے وہ انسان جو ایسی دولت کے حصول پر خوش نہ ہو بلکہ پشیمان ہو ؂

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی — کجا عیشے بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است

یقین آفرینی

اقبال کی شاعری تشکیک و نومیدی سے پاک ہے۔ وہ نہ خود مایوس ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو مایوس ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اُسے اپنے پیام کی قبولیت اور استواری پر کامل یقین ہے۔ اس کا تخیل اُس کے پیام کو طاقتِ پرواز اور اثر بخشتا ہے اس کی "جرأتِ رندانہ" کے ساتھ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" مومن کے لئے خصوصاً اور انسان کے لئے عموماً "پیغامِ بیداری" بن جاتی ہے۔

صحیح ہے کہ اقبال کی راہ میں بھی ایک ایسا مقام آیا تھا جب وہ "اُمیدواری" کے دور سے گزر رہا تھا، اقبال کو بھی سعید روحوں اور اربابِ باطن کی طرح "حقیقتِ منتظرہ" کے لئے مضطرب رہنا پڑا۔ اقبال کے ابتدائی دور میں ایک اضطراب تھا جس میں خیال نے ابھی مرکزیت اور پختگی حاصل نہ کی تھی ؂

نور کا طالب ہوں تاریکی سے گھبراتا ہوں میں — طفلکِ سیماب پا ہوں ظلمتِ ہستی ہوں میں
ہاں آشنائے لب نہ ہو رازِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اور جب وہ اس حجرۂ اعتکاف سے نکلے اُن کی دھیمی دھیمی صدائیں اور دبی دبی فریادیں ایک کھلے پیام کی گرج میں تبدیل ہو گئیں ؂

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اقبال کے کلام میں بھی وہی ابدیت ہے جو قرآن اور اسلام دیتا ہے۔ اقبال انسانی معاشرت کو سراسر قرآن اور احکامِ شریعت کے عین مطابق دیکھنا چاہتا ہے جیسے خود بھی ناز ہے کہ وہ رسولِ عربی کی تعلیم پر چل رہا ہے۔ اور اسی اصول کی تبلیغ کو اُس نے اپنی شاعری کا موضوع بنا لیا ہے۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اقبال کے یہاں خانقاہی صوفیوں کا سا مخلوط پیغام نہیں۔ میرے نزدیک تصوف، تہذیبِ نفسِ انسانی اور قوائے ملکیہ کے لئے بہت ناگزیر ہے لیکن وہ تصوف جو "نانِ شعیر" سے "قوتِ حیدری" پیدا کر دے۔ جس سے اویس قرنیؓ کا سا عشق، بوذرؓ کا سا فقر، سلمانؓ کا سا صدق، صدیقؓ کا سا ایثار اور جنیدؒ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ اقبال عمل کا مطالبہ کرتا ہے وہ سر پکڑ کر سوچنے کا عادی نہیں وہ حرکت کا پیامبر ہے۔ افسردگی اُسے چھو کر بھی نہیں گزری۔ وہ نہ خود روتا ہے۔ نہ دوسروں کو رلانا چاہتا ہے۔ اقبال نے افرادِ ملت کو ممکناتِ زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرانے کی اور اُن میں خود شناسی کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں — نہ پوچھو میری وسعت کو زمیں سے آسماں تک ہے

جب آرزوئیں پیدا ہو گئیں، اُمیدیں وابستہ ہو گئیں اور ناامیدی کا چھلاوا غائب ہو گیا تو حصولِ مدعا کے لئے فطری طور پر دل میں ایک تڑپ پیدا ہو گئی اب یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ کامیابی و فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے۔ آرزو بغیر عمل کے بیکار شے ہے عمل سے زندگی بنتی ہے مگر کیسی اور کس طرح۔ اس کے لئے مایوسی و نامرادی نہیں جرأت اور ہمت چاہیے

بدریا غلط و با موجش درآویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ہمارے کان تو پہلے اس قسم کی تعلیم سے آشنا تھے۔

بدریا در منافع بے شمار است وگر خواہی سلامت بر کنار است

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقبال میں جان ہے، جستجو ہے، خلاقی ہے۔ خونِ تازہ ہے اور سب سے بڑھ کر اسلام ہے۔ مسلمانوں کی افتادگی اور گوسفندی اُسے غمناک کرتی ہے۔ وہ انھیں اسلام کی صحیح روح سے ہم کنار دیکھنا چاہتا ہے، اور پیری مریدی کے اُس چکر سے نکالنا چاہتا ہے جس نے ایک مجہول قسم کے تصوف کی بنیاد ڈالی ہے جو مذہب کی روح کے منافی ہے۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد "ہمہ اوست" پر ہے۔ توحید مثبت ہے اور "ہمہ اوست" منفی۔

سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت

خودی ایک وحدت ہے جس کے گرد انسانی شخصیت گردش کرتی ہے، خودی کی قوتِ نمو انسان کو سکون و جمود سے بچائے رکھتی ہے جس سے رفتہ رفتہ اُس کی ہستی بے مایہ میں ایک شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال نے جہاں سکون و جمود کی مذمت کی ہے، سعیِ پیہم کی تبلیغ بھی کی ہے۔ اقبال کے مقاصد کی تخلیقی استعداد خالص روحانی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ تہذیب بغیر تہذیبِ نفس کے ممکن نہیں۔ یہی مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے۔

اقبال کی مقاصد آفرینی اور افلاطون کی "اعیانِ نامشہود" میں وہی صوفیوں کا سا بنیادی فرق ہے۔ افلاطون نے انسان کی انفرادی اکملیت کو قطعی فراموش کر دیا ہے۔ وہ عقلیت کا پرستار تھا اور عقل کو ہی مشعلِ راہ سمجھتا تھا۔ اقبال نے ان عقلی موشگافیوں اور دماغی ورزشوں سے ہٹا کر انسانیت کو جمود سے بچانے کے لئے مروضی حقائق ہی کو بطور مقاصد پیش کیا ہے۔ اُن کے ہاں "اعیانِ نامشہود" نہیں بلکہ "ہنگامۂ موجود" ہے۔ افلاطون کی طرف اشارہ ہے۔ ؎

فطرتش خوابیدہ و خوابے آفرید چشمِ ہوشِ او سرابے آفرید
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ "اعیانِ نامشہود" گشت

بھارت ورش کا مسئلہ تناسخ اور بدھ مت کا تصورِ روح اور نفس کشی کا وعظ جذبۂ عمل کو سرد کر دیتا ہے۔ اسلام نے انسان میں اتنی قوت پیدا کی ہے کہ وہ اپنے عمل سے حالات میں تغیر پیدا کر سکتا ہے، اپنی مرضی کے مطابق دنیا کو اپنے افکار کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک ابدیت کا تصور صرف فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ خودی سے وابستہ ہے۔ اسی بنا پر اس نے فرد کو اجتماعیت سے گریز کرنے کی تلقین نہیں کی۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ایک فرد کا احساسِ "انا" (Ego) زندہ و برقرار رہ سکتا ہے یہی وہ نازک مقام ہے جہاں اکثر و بیشتر دماغ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ تکمیلِ خودی کے ساتھ جذبۂ خود فراموشی کے ماتحت خود کو جماعت کے سپرد کر دینا ہی انسانی مفاد کے عین مطابق ہے۔ کانٹ، نطشے، اور برگساں کے خیالات میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت کے مابین کوئی تعلق پیدا کر کے ابدیت کا تصور قائم کر سکیں ــــ اہلِ مغرب ترقی کی منزلوں میں ہیں۔ ہر ایک ملک نے اپنی ضرورتوں کے مطابق حکومت کے لئے نیا نظام مرتب کیا۔ برطانیہ نے "جمہوریت" روس نے "اشتراکیت" اٹلی نے "فسطائیت" کے ملبوسات زیبِ تن کئے لیکن ان میں سے کوئی لباس بھی افرادِ جماعت کے قامت پر ٹھیک نہ آ سکا۔ دنیا ایک عرصہ سے بین الاقوامی مرکز قائم کرنے میں منہمک ہے مگر چونکہ دل وحدانیت کے نور سے روشن نہیں اسلئے یہ مقصد ابھی تک حاصل نہیں ہوا، اور نہ توحید کے بغیر حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلامی سیاست کا دار و مدار خدا کی وحدانیت پر ہے۔ اس تصور کے سبب فکر و عمل کا انتشار دور ہو جاتا ہے۔ اور حقوق و فرائض کی صحیح تمیز پیدا ہوتی ہے۔

ملتِ ما را اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم

پروفیسر عاصی ضیائی رام پوری

ادب میں خطوں اور ڈائریوں کی اہمیت

علمِ اخلاق اور نفسیات کے وہ چھپے ہوئے گوشے
جن کو شاید پہلی بار روشنی میں لایا گیا ـــــ

یقیناً آپ نقب زنوں کو کسی حال میں برداشت نہیں کر سکتے، کفن کھسوٹوں کو ہمیشہ قہر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیب کتروں پر آپ کا بس چلے تو اُن کے ہاتھ ہی نہیں، سر کاٹنے میں بھی تامل نہ کریں، لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہی آپ ہیں جو غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اشتیاق سے پڑھتے اور ان کے مؤلف کی محنت کو سراہتے ہیں، مولانا شبلی کی پرائیویٹ باتیں کھنگالنے والوں کو دیکھ کر آپ کی پیشانی پر ہلکی سی شکن بھی نہیں آتی، اور اقبال کے گھریلو اور نجی معاملات کو کھود کھود کر دریافت کرنے والوں کے لئے آپ دعائے خیر کیا کرتے ہیں؟ آپ اس کا جواب یہی دیں گے کہ بڑوں کی بات بڑی۔ انسان میں جتنی جتنی بڑائی آتی جاتی ہے، اُتنی ہی اس سے وابستہ چیزیں بھی بڑی بنتی جاتی ہیں۔ اگر مجنوں کو لیلیٰ ہی نہیں اس کے کتے سے بھی اُنس تھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر ہم بڑے آدمیوں کی ڈائریوں اور خطوں کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی زندگی اُن کی اپنی نہیں ہوتی۔ اُس کا ہر جز پبلک کی متاع ہے، عام لوگوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ع۔ محتسب را درونِ خانہ چہ کار ـــ لیکن عظیم شخصیتوں کا کوئی "درونِ خانہ" نہیں ہوتا۔ البتہ "محتسب" پوری قوم ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات پوری دنیا۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ دلیل کچھ وزنی نہیں۔ جہاں تک نظریے کا تعلق ہے، میں بھی آپ سے متفق ہوں، لیکن عملی دنیا میں، خصوصاً آجکل اس "تانک جھانک" کی کوئی معقول وجہ نہیں ملتی، ایک انسان اپنی فطری اور اکتسابی صلاحیتوں کے بل پر دنیا میں بلند ہوتا ہے وہ اپنے معاشرے سے بہت کچھ لیتا ہے اور اس سے زیادہ اُسے دیتا بھی ہے، اُس کی شخصیت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ سیکڑوں ہزاروں یہاں تک کہ لاکھوں، کروڑوں آنکھیں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں، اس کے ایک ایک فعل کا جائزہ لیتی ہیں، اس کے عمل کی تقلید کی کوشش کرتی ہیں، اُس کی پسند ناپسند کو اپنے لئے معیار بناتی ہیں، اور جب اس پر بھی سیری نہیں ہوتی تو اس کی ظاہری شخصیت کے پردول میں سوراخ کر کے اندر جھانکنا چاہتی ہیں، یہ سب کیوں؟ اس کا یہ جواب نہ صرف مجمل بلکہ مبہم بھی ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو پبلک کا ہے۔ تو آئیے ذرا سوچیں کہ اس اجمال کی تفصیل کیا ہے۔

کہتے ہیں انسان کی فطرت میں تجسس کا مادہ قدرتی ہے۔ اس کے دل کو ظاہر اور کھلی ہوئی چیزیں اتنی نہیں بھاتیں جتنی وہ چیزیں جو اس کے لئے نئی بھی ہوں اور پوشیدہ بھی۔ اسی جذبے نے وہم پرستی کو فروغ دیا اور اسی کو صحیح طور پر استعمال کرنے سے انسان نے بے حساب ترقی کی۔ اگر یہ جذبہ تجسس نہ ہوتا تو نہ آتش کدے اور بتخانے بنتے نہ رصدگاہیں اور کارخانے، تجسس میں ناکامی کا نام ضعیف الاعتقادی ہے

اور کامیابی کا انعام ہوائی جہاز اور ریڈیو۔ جب اس بات کو مدنظر رکھا جائے تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ لوگ کیوں غالب کے "زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں" درحقیقت انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ "اس کے دست و بازو کو" "نظر لگ جائے گی"، وہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ کیسا زخم ہے جو ہمارے نہیں لگا۔ ایک عام انسان کی زندگی کے واقعات عام بھی ہوتے ہیں اور بے شمار بھی، جنھیں جاننے کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت، مگر خاص انسان کی زندگی میں جو خصوصیت ہوتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس کے واقعات بھی خاص ہیں، ورنہ وہ بھی عام انسان ہوتا۔ یہی خصوصیت لوگوں کو چونکا دیتی اور اپنی طرف کھینچتی ہے، اور پھر اس خصوصیت کے سوتوں کی تلاش میں ان کی نظریں اس کے یہاں خانۂ دل کا جائزہ لینے لگتی ہیں، کس کس چیز پر کیا کیا عمل کرتی ہیں۔ کہاں پنکھا چلاتی ہیں، کہاں جو لھا گرم کرتی ہیں، اور یہ سب کچھ۔ رفتہ رفتہ بنا یا بگاڑ کی وجہ میں آگیا ——— انھی سوالات کا بنیادی تصور عظیم المرتبت شخصیتوں کی زندگیوں کی ریسرچ [illegible] کرتا ہے۔

یہ تو تھا عمومی جائزہ۔ اب خاص طور سے خطوں اور روزنامچوں کی طرف آئیے۔ کوئی انسان خدائی اوصاف میں شریک نہیں کہ اس کی ہستی میں کوئی نشیب و فراز نہ ہو، یا اس کے ادراک و ارادہ وغیرہ کی قوتوں میں شروع سے آخر تک یکسانی اور ہمواری ہو۔ اس کی شخصیت کا دل، وہ لبالب بھرے ہوئے بند تالاب کی طرح نہیں، دریا کی مانند ہوتا ہے جس میں لہریں بھی ابھرتی ہیں اور حباب بھی، جو کبھی خشک ہو کر تلی سے لگ جاتا ہے کبھی پھیل کر کناروں سے بھی پار نکل جاتا ہے۔ یہی حال ہر عالی کا بھی ہوتا ہے، لیکن جو چیز اسے جاذب توجہ بناتی ہے وہ یا تو اس وجود کا بہت ہی زیادہ ہوتا ہے یا کم سے کم ہونا، پہلے کی مثال آنشا میں ملتی ہے، اور دوسرے کی سرسید میں۔ انشا نے سیکڑوں [illegible] تضاد بھرے روپ بدلے، اور سرسید شدید مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود اپنی روش سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوئے۔ یہی دونوں انتہائیں ہیں جو انسان کو لوگوں کی نظریں وقیع بناتی ہیں، خواہ یہ وقعت اس کے احترام کو مستلزم ہو یا گالیوں سے وابستہ!

ظاہر ہے کہ بڑے لوگوں کا یہ خلوت خانہ شارعِ عام [illegible] نہیں ہوتا۔ یہاں وہ نسبتاً آسودگی کا سانس لینا چاہتے ہیں، دن بھر کے تھکے ہارے کسے بندھے سپاہی کی طرح کمر کھول کر آرام کرتے ہیں، اپنے بعض خاص ندیموں اور وابستوں کو بلا کر ان سے کچھ ہلکی پھلکی تفریحی گفتگو کرتے ہیں ——— یہی "پناہ گاہیں" ان کے خطوط اور روزنامچے ہیں۔ یہاں کبھی وہ شب خوابی کے لباس میں نظر آتے ہیں، کبھی تھکن دور کرنے کے لئے پاؤں دبواتے اور کبھی عجیب و غریب ورزشیں کرتے ——— پھر جس طرح آپ دوسروں کو اس اخلاقی ضابطے کا پابند سمجھتے ہیں کہ آپ کے گھر میں وہ بلا اطلاع نہ آئیں، اسی طرح کیا یہی پابندی آپ پر عائد نہیں ہوتی کہ ان حالتوں میں آپ اپنے عظامِ قوم کو ان کے حال پر چھوڑ دیں؟ مگر نہیں، بات اتنی سادہ نہیں ہے کہ اس کا ایک مختصر جواب دیا جا سکے۔ اس میں "محتسبوں" کی نیت کو بھی بڑا دخل ہے اور "ہدفِ احتساب" کی شخصیت کو بھی۔ اس لئے ان دونوں کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہے۔

شخصیت پرستی

جب قوم ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوتی ہے تو اس کے ہر دل عزیز اکابر بھی اخلاقی اوصاف میں بلند تر ہوتے ہیں کم از کم جن اخلاقی قدروں پر وہ قوم ایمان لاکر آگے بڑھتی ہے وہ ان اکابر میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ اس لئے قوم ان کی چھوٹی سے چھوٹی بات کی تقلید کرنا اپنا شعار بنا لیتی ہے، یہاں تک کہ ان جیسی نجی عادتیں اختیار کرنے کو بھی خوبی سمجھتی ہے۔ اگر ان کے ہونٹ اور پیشانی پر جو شکنیں پڑی ہوئی تھیں، لوگ کوشش کرتے تھے کہ ویسی ہی شکنیں اپنے ہونٹوں اور پیشانیوں پر بھی ڈال لیں، عرب شاعر نے سیاہ نقاب کی ایک بار تعریف کر دی تو سیاہ نقابیں مدینہ کی عورتوں کے فیشن میں داخل ہو گئیں۔ اسی طرح شاعر یا سیاسی لیڈر، اس کی ہر بات میں ریس کرنا لوگوں کی اسی محبت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو پالینا انتہائی فخر کی بات سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خطوں اور روزنامچوں کو پڑھ کر اس کی سی عادتیں ڈال لینا یا کم از کم اپنے دل کو اس سے قریب کر لینا محبت کا

لازمہ بن جاتا ہے۔ لیکن یہ مقصد دیر پا نہیں ہوتا۔ عوام کی شخصیت پرستی ( ) اس تقلید کا رُخ دوسری طرف موڑ دیتی ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ تقلید محض اس لئے ہونے لگتی ہے کہ لوگوں کے خیال میں اُن کے ہیرو کا بڑا بننا، انہی چھوٹی موٹی باتوں پر موقوف تھا، جن پر عمل کر کے وہ خود بھی ویسے ہی ہو جائیں گے۔ یہ خیال رفتہ رفتہ لوگوں کی عملی صلاحیتوں کو چھین کر ان کو انہی جزوی اور فروعی باتوں کی طرف لگا دیتا ہے، اور پھر ان کا سارا زور اسی پر صرف ہونے لگتا ہے کہ کون سا لباس پہنیں، کون سی غذا کھائیں، اور اپنے خطوں اور روزنامچوں وغیرہ میں کن الفاظ کا استعمال روا رکھیں ــــ پھر لوگ یہاں بھی بس نہیں کرتے۔ اب ان کی اخلاقی حالت اس قدر گر جاتی ہے کہ اپنی بداخلاقیوں کے جواز کے لئے اپنے بڑوں کی زندگی کی جامہ تلاشی لینے لگتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اُن کے بڑے ہمہ وقت بڑے نہیں بنے رہتے، کبھی نہ کبھی اُن سے بھی ایسی چوک ہو جاتی ہے جو عوام کے لئے حجت بن کر انھیں اور اخلاقی پستی میں ڈھکیل دے۔ یہی وہ چوک ہوتی ہے جس کی تلاش میں لوگ ان بڑے انسانوں کے خطوں اور روزنامچوں کو کھنگالتے ہیں اور انھیں برسرِ عام نمایاں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے بعض رہنماؤں اور عظیم المرتبت فن کاروں کے کارناموں میں اونچ نیچ بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے تو یہ لوگ اپنی گراوٹ اور کمزوریوں کے لیے اُس اونچ نیچ کو سند میں لاتے ہیں ــــ اور میرے خیال میں یہی اخلاقی زوال ہے جس کی انتہا اس پر ہوتی ہے کہ عوام کے لیڈروں کی زندگی کے شفاف اوراق پر ایسے دھبے روز بروز بڑھتے جائیں اور عوام کے لئے زینہ "تتبع ضلالت" ڈال دیں، جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ شیخ شیراز کے الفاظ میں ؎

بہ نیم بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

جس "سلطان" کی یہ حالت اور جن "لشکریوں" کا یہ انداز ہو آپ جان لیجئے کہ اب اُس قوم کے بُرے دن آ گئے ہیں، اور اس دردناک تباہی سے پہلے جتنے دن بھی گزر جائیں غنیمت ہیں۔ ورنہ اگر قوم کا اجتماعی شعور بیدار ہے تو وہ اپنے اکابر کی ان لغزشوں پر انھیں متنبہ کرتی، اور اگر یہ نہیں تو کم از کم خود ان لغزشوں سے بچنے کی کوشش کرتی۔

یہ تمیز کرنا کہ ہمارے بڑوں کی باتوں میں کون سی بات واقعی بڑا بنانے والی ہے اور کون سی محض بشری خطا ہے اعلیٰ درجے کی بصیرت چاہتا ہے جو عوام کو میسر نہیں۔ یہ صرف اونچے طبقے کے اہلِ نظر کا کام ہے کہ وہ ان دونوں میں فرق کر کے لوگوں کو جتاتے رہیں۔ پھر اس قوم کی بدنصیبی اور بے مائگی کی کوئی انتہا نہیں جس میں ایسے اہلِ نظر کا قحط ہو، یا اُن کی کوئی آواز نہ ہو۔ اس وقت تو اس کا حال اس ذلیل بوالہوس کا سا ہوگا جو کوشش کر کے کسی برقع کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کی لذتِ دیدار چرا لے یا کسی غسل خانے کی دیوار کے سوراخ پر آنکھیں جما دے تاکہ کسی کے حسنِ عریاں کی جھلک پا سکے۔

دوسری طرف یہ خطوط اور روزنامچے خود لکھنے والے سے زیادہ اُس معاشرے کا اخلاقی پیمانہ بھی ہوتے ہیں جس نے اُبھار کر اُسے بلند مقام پر کھڑا کر دیا۔ اگر اس شخص کی پبلک زندگی کچھ اور گھریلو زندگی کچھ اور ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ قوم نہایت ظاہر بیں اور نفاق پسند ہے جس میں ایسی دوعملی پالیسی کا انسان پھلتا پھولتا ہے۔ ورنہ اگر اس قسم کے رخنے اس کی نجی زندگی میں کم سے کم ہیں تو ان کو صرف بشری سہو کہا جا سکتا ہے، اور پھر سماج پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اُن سے سبق لے۔

بحیثیت مجموعی آپ اگر غور کریں تو قرآن کا یہ حکم انتہائی حکمت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ "لوگوں کی زندگیوں کا تجسس نہ کیا کرو"۔ تجسس کے بُرے نتیجے اوپر میں ظاہر کر چکا ہوں اور آپ سب کو بھی اس کا تجربہ ہوگا کہ ہمارے ادبی محققوں کے یہ کارنامے کہ بڑوں کی زندگیوں کو ہر طرح سے روشنی میں لایا جائے، اب تک انسانیت کے لئے مفید نہ ثابت ہو سکے۔ البتہ صرف ایک ہی ذات ستودہ صفات اس سے مستثنیٰ ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا گوشہ گوشہ ڈھونڈ کر لوگوں کے سامنے

لایا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ کسی عام انسان کی زندگی نہ تھی جس میں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موقع پر رخنے بھی نظر آتے ہوں۔ وہ ایک عظیم الشان نبی کی زندگی تھی جو ہر آن اور ہر حیثیت میں خدا کا نبی تھا اور جس کو انسانیت کو اس کی راہ پر استوار رکھنے اور چلانے کی ذمہ داری خدائے برتر نے لے رکھی تھی، اور اسی کی ہمہ وقت نگرانی نے آپ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ بنایا تھا۔

زندگیوں پر احتساب اور چیز ہے اور خوردبینیں لگا لگا کر سیرت و کردار کی دھندلی اور مہین لکیروں کا تلاش کرنا دوسری چیز ہے، یہی وہ دوراہہ ہے جہاں سے نیک نیتی اور بدنیتی کے راستے پھٹتے ہیں۔
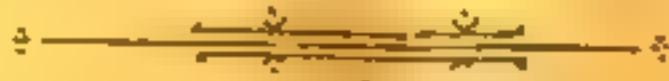
ایک خط

میں تمہیں آداب عرض کرتی ہوں اور نہ سلام لکھتی ہوں ــــ تم صرف دشناموں کے مستحق ہو! مگر کیا کروں خطوں کا گالیوں سے آغاز کرنے کا ادب وانشا میں دستور نہیں ہے، لوگ اپنے دشمنوں اور بدخواہوں کو بھی سلام و آداب لکھا کرتے ہیں۔

خفا ہو گئے! پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں! آئینہ دیکھو! تمہارے تیور کتنے غضبناک ہو رہے ہیں! تم ایسے میں مسکراؤ گے بھی تو تمہارا تبسم ایک طنز ہوگا میرے انداز خطاب پر!

تم میری اوٹوگراف بک پر کوئی نصیحت آمیز شعر بھی لکھ سکتے تھے مگر تم نے جان کر یہ مصرعہ لکھا۔

مری آنکھوں میں اب تک نقش ہیں تیرے تبسم کے

تم تو مصرعہ لکھ کر چلتے ہوئے مگر مجھے عجیب الجھن میں ڈال گئے ہائے! میرے معصوم جذبات کی پہلی نمود ــــ ہوس کے افق پر ایسی ایک چنگارہ شاخ در شاخ ہوتا چلا گیا اور اب ...... میں ــ نہ پوچھو کہ کہاں ہوں؟ اس تباہی کی ذمہ داری سے تم دامن نہیں چھڑا سکتے آگ تم نے لگائی ہوا اوروں نے دی ــــ میں جل گئی خاکستر ہو گئی میری زندگی اب راکھ کا ڈھیر ہے! کاش غیر مردوں سے اوٹوگراف لینے کی رسم ہی دنیا میں نہ پائی جاتی!

(ایک بدنصیب عورت)
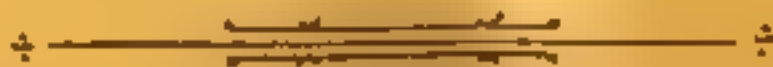
علم فراست کو عربوں نے علوم طبیعیہ میں شمار کیا ہے۔ جس کے وسیلے سے انسان کی ہیئتِ ظاہری، رنگ، شکل، اعضا وغیرہ کو دیکھ کر اخلاق باطنی اور صفاتِ روحانی، عادات واطوار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ گویا فراست، انسانی ہیئت اور خلقتِ انسانی کے ذریعے اخلاق اور طبیعت معلوم کرنے کا نام ہے۔

علمائے یورپ نے اس علم کو "فزیانومی" (FHYSiONOMY) نام دیا ہے۔ جس کے معنی قانون وقاعدۂ طبیعت کے ہیں۔ اور اس سے مراد انسانی ظاہری جسم اور بدن کو دیکھ کر اخلاق اور قوائے نفسانیہ کا معلوم کرنا ہے۔

علم فراست مدتوں پہلے وجود میں آیا ہے جس کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ سب سے پہلے "ہومر" شاعر یونانی نے حضرت مسیحؑ سے بہت پہلے اس علم کے قواعد مدون کئے ہیں۔ خصوصاً فراستِ الید (ساموزگ یا ہتھیلی کی لکیروں کا علم) عام کیا۔ اگرچہ بعض مورخین کو اس سے انکار ہے مگر "ہومر" کی فراست دانی کے سب معترف ہیں۔ اور یہ مانتے ہیں کہ "ہومر" علم الفراست کا ماہر تھا۔ چنانچہ "ہومر" نے "ترستیس" کی تعریف میں جو شعر کہے ہیں اُس کا ترجمہ "بستانی" نے ایلیڈ سے عربی میں کیا، ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہومر علم الفراست کا بہت بڑا ماہر تھا جس نے ترستیس کی شکل وصورت دیکھ کر اُس کے باطنی اخلاق کا پتہ لگالیا۔

بقراط نے حضرت مسیحؑ سے ساڑھے چار سو سال قبل علم الفراست کی طرف اپنی تصانیف میں اشارے کئے ہیں، اُس کا عقیدہ ہے کہ انسان کی اخلاقی حالت اور بیماریاں اُس کے چہرے اور جسم سے بآسانی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جالینوس اور اقلیدس مشہور یونانی حکیموں نے بھی علم الفراست سے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ یونانیوں کے علاوہ مصریوں نے بھی اس فن میں بڑا کمال حاصل کیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دے دی تھی۔

مشہور یہودی مورخ "یوسیفوس" نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب قیصر نے سکندر کی انگلیاں اور ہتھیلیاں دیکھیں تو اسے سکندر کی منافقت اور دورخی پالیسی کا پتہ چل گیا اور اس نے سکندر کی دلی حالت کا بھی اندازہ کر لیا۔

ارسطو نے جو مشہور یونانی حکیم تھا۔ علم الفراست پر ایک کتاب مرتب کی تھی جسے چھ فصلوں پر تقسیم کیا تھا۔ اور اُن تمام علامات کی تشریح کر دی تھی جس سے انسانی قوت، کمزوری، ہوشیاری، بیوقوفی، عقلمندی اور جہالت کا پتہ رنگ، شکل، بال، اعضاء، قامت، آواز، چال ڈھال، نشست وبرخاست، وغیرہ سے چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی تحقیق کیا تھا کہ انسانوں میں حیوانات کی خصوصیات بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ کس وضع کے انسان میں کس جانور کی کتنی خصوصیات ہوتی ہیں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

ارسطو کی کتاب فراست بہت مشہور ہوئی اور بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے کئے گئے۔ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس میدان میں اپنے اشہبِ قلم کو دوڑایا۔

عرب جاہلیت کے زمانے سے بعض فنون سے وابستگی رکھتے تھے، چنانچہ قیافہ، ریافہ، عیافہ کو انھوں نے فن بنالیا تھا۔ قیافہ، معرفتِ انسانی کا علم تھا جس کو وہ قیافۃ البشر کہتے تھے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ انسان کا چہرہ، جلد، ہیئت، اعضاء، ہاتھ پاؤں وغیرہ کو دیکھ کر انسان کے عادات و اطوار خاندان وغیرہ کی معلومات ہوتی تھیں۔

ریافہ:- یہ وہ فن تھا جس کے ذریعے زمین کے اندر کا پانی معلوم کیا جاتا تھا اور مٹی سونگھ کر گھانس کو دیکھ کر پانی کی موجودگی اور سطح زمین سے بھی اس علم کے ذریعے واقفیت حاصل ہوتی تھی۔

عیافہ:- یہ علم تھا جس کے ذریعے پنجے اور سُم یا سموں کے نشان زمین پر دیکھ کر جانور کی وضع ہیئت وغیرہ بتائی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ علم اختلاج (پھڑکان اعضاء) بھی تھا یعنی انسانی جسم کے بعض حصوں کے پھڑکنے سے بعض خاص خاص باتیں معلوم کی جاتی تھیں۔

فلسفہ اور طب اور ہیئت کی طرح یونان کے علم فراست کو بھی مسلمانوں نے ترقی دی اور مستقل کتابیں اس فن پر لکھیں چنانچہ مشہور طبیب رازی نے اس فن کو علم طب میں جگہ دی اور ارسطو کی کتاب فراست کا خلاصہ کر کے اس پر بہت سا اضافہ کیا۔ اسی طرح ابن سینا، ابن رشد، امام شافعی اور ابن عربی نے اپنی کتابوں میں اس فن کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ہندوستان بھی اس خصوص میں سب سے پیش پیش ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کے پاس ایک شاستر علم الفراست اور علم قیافہ کے متعلق موجود ہے۔

ہاتھ کی لکیروں کو تو مستقل علم بنالیا گیا ہے چنانچہ "چیرو" نے تو اس علم کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور اس فن میں وہ درجہ حاصل کیا جو ایک محقق اور مفکر ہی کے شایانِ شان ہے۔

اردو فارسی میں بعض ضرب المثل اور کہاوتیں ان قیافوں کے تجربوں کی نچوڑ ہیں۔ جو بہت مشہور ہیں مثلاً کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، ازرق چشم، کانے، بھینگے، اندھے، لنگڑے آدمیوں کے متعلق بیسیوں کہاوتیں ہیں جن میں واقعیت پائی جاتی ہے۔

حکایتیں

مسلمان مشاہیر کی فراست دانی کی حکایتوں سے تاریخ وسیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جعفر برمکی جو یحییٰ کا بیٹا اور ہارون الرشید کا وزیر تھا اپنے باپ کی طرح علم الفراست کا ماہر تھا۔ چنانچہ تاریخ میں یہ حکایت موجود ہے کہ جب ہارون رشید نے برامکہ کے استیصال کا ارادہ کیا اور منصوبے باندھنے لگا تو انہی دنوں جعفر بن یحییٰ جو نہایت حسین اور خوش منظر تھا۔ ایک روز خلیفہ کے ساتھ سواری میں خلیفہ سے آگے آگے چل رہا تھا کہ خلیفہ کی نظر جعفر کی گردن پر پڑی اور خلیفہ نے اس کے قتل کے بارے میں سوچنا شروع کیا، خلیفہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جعفر نے گردن پٹائی اور خلیفہ کی طرف دیکھ کر کہا یہ مروت سے دور ہے کہ جس گردن پر آپ نے ہزاروں بوسے دیئے ہیں اب اس پر تلوار لگائی جائے۔ خلیفہ ہارون رشید کو جعفر کی اس فراست پر بے انتہا حیرت ہوئی اور اس نے اِدھر اُدھر کی گفتگو کر کے ٹال دیا۔

امام شافعی بھی اس فن کے بڑے ماہر تھے چنانچہ ایک حکایت مشہور ہے کہ محمود بن سمار نے بیان کیا کہ میں اور امام شافعی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور نماز پڑھنے لگا۔ امام شافعی نے کہا کہ یہ شخص لوہار ہے اور میں نے کہا نہیں بڑھئی ہے جب اس نے نماز ختم کی تو ہم دونوں نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں پہلے لوہار تھا مگر اب بڑھئی کا کام کرتا ہوں۔

قاضی احمد قزوینی اپنی کتاب نگارستان میں یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ احمد بن حسن میمندی بچپن سے سلطان محمود کی خدمت میں رہتے اور ساتھ ساتھ پڑھتے تھے ایک روز دونوں مدرسہ سے نکل کر باغ پہنچے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے فراست کا ذکر شروع ہوا چونکہ احمد نے فراست کا دعویٰ کیا تھا اس لیے سلطان محمود نے ایک اجنبی کو اس طرف آتے دیکھ کر احمد سے کہا کہ بھئی! تمھیں فراست دانی کا بہت دعویٰ ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ یہ جو آدمی سامنے سے آرہا ہے اس کا کیا نام ہے! احمد نے فوراً کہا اُس کا نام احمد ہے اور یہ بڑھئی ہے سلطان محمود نے فوراً اُس شخص کو بلاکر دریافت کیا تو احمد نے جو کچھ کہا تھا صحیح نکلا۔ سلطان محمود نے تعجب کے ساتھ احمد سے پوچھا کہ تجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں تو اُس نے کہا کہ یہ باتیں بڑی آسان تھیں. کیونکہ جب آپ نے مجھے مخاطب کیا تو وہ ہماری طرف دیکھنے لگا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا بھی نام احمد ہے کیونکہ آپ کے مُنہ سے احمد نکلتے ہی وہ متوجہ ہوگیا تھا اور چونکہ وہ باغ کے بڑے بڑے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا اس لئے میں نے سمجھ لیا کہ وہ بڑھئی ہے۔

یہی نہیں کہ عرب کے علماء اور امراء اس فن کے ماہر تھے بلکہ بعض معمولی قبیلوں کی عورتیں بھی علم فراست میں طاق تھیں۔ چنانچہ ایام جاہلیت کی "کاہنہ" مشہور ہیں۔ عہد سعادت کے بعد بھی عرب کے قبیلوں میں ایسی قیافہ شناس عورتیں موجود تھیں۔ چنانچہ روضۃ الصفا کے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ جب اولاد عباس قریہ "حمیمہ" سے بھاگ کر کوفے کی طرف چلی. سفاح اُس کا بھائی منصور اور اُس کا چچا عبداللہ بن علی سب آگے جارہے تھے۔ جب وہ عراق کے ایک موضع میں پہنچے تو انھیں دیکھ کر ایک اعرابیہ نے دوسری عورت سے کہا کہ خدا کی قسم میں نے ایسے تین چہرے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جن میں سے ایک خارجی ہے اور دو خلیفہ۔ منصور نے یہ سُن کر اُس عورت سے پوچھا تو کہنے لگی اول خلافت اُس جوان کو ملے گی چنانچہ سفاح کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگی اس کے بعد تیری طرف منتقل ہوگی. اُس کے بعد عبداللہ بن علی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی یہ تجھ پر خروج کرے گا۔ چنانچہ یہ ہو کر رہا اور اعرابیہ کا ایک ایک لفظ صحیح نکلا۔

مجدالدین محمد الحسینی مجدی اپنی بے نظیر تالیف "زینت المجالس" میں لکھتے ہیں کہ فراست تین قسم کی ہوتی ہے —

طبیعی، غریزی، صنعی۔

طبیعی وہ ہے جو بڑی ریاضت کے بعد آدمی اپنی کدورت نفسانی کو زائل کرنے کے بعد خود حاصل کرتا ہے، غریزی اور صنعی وہ ہیں جو کسب اور نظر سے مشق و مہارست کے بعد حاصل ہوتی ہیں۔

اسی طرح ایک اور قصہ بو علی کے معالجہ کا بڑا دلچسپ اور عجیب و غریب ہے شیخ شہر گرگان میں تھے کہ وہاں کے حکمراں "قابوس وشمگیر" کے ایک عزیز کو ایک ایسی بیماری ہوگئی جس کے علاج سے سارے حکیم عاجز ہوگئے۔ شیخ گرگان تک پہنچ گئے تھے اور گرگان میں مطب کرتے تھے جہاں اُن کی خاصی شہرت ہوگئی تھی کسی نے قابوس کو بھی اطلاع دی کہ فلاں محلہ میں ایک نیا طبیب ٹھیرا ہوا ہے جو بڑا حاذق حکیم ہے چنانچہ قابوس نے حکم دیا کہ اُس طبیب کو بلاکر مریض کو دکھایا جائے۔ شیخ کو بلایا گیا اور شیخ نے بیمار کو دیکھا تو ایک نوجوان خوب رو کو بستر پر دراز پایا۔ نبض دیکھی تو کوئی مرض پایا نہیں گیا۔ چہرہ سوائے کمزوری کے کسی بیماری کا اظہار نہیں کررہا تھا شیخ کی فراست کا کیا کہنا نہایت اطمینان سے بیمار کے پاس بیٹھ گئے ایک ایسے شخص کو بلایا جو گرگان کے تمام محلوں سے واقف تھا بیمار کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُس شخص سے تمام محلوں کے نام گنوانے کو کہا ہر محلہ کا نام بیمار سنتا گیا مگر ایک خاص محلہ کا نام سُن کر بیمار کی نبض کی حرکت میں تیزی پیدا ہوگئی۔ شیخ نے اُس محلہ کے نام پر اُس شخص کو روک دیا اور کہا اب اس محلہ کی گلیاں گناؤ۔ اُس شخص نے ایک ایک کرکے گلیوں کے نام گنوانے شروع کیے ایک گلی کے نام پر نبض میں پھر وہی کیفیت پیدا ہوگئی جو پہلے پائی جاتی تھی یہاں بو علی رک گئے اور حکم دیا کہ اُس گلی کے مکانوں کے نام سنائے جائیں جب مکانات کے نام سُنائے جانے لگے تو ایک نام پر پھر اسی حرکت کا اعادہ ہوا

جہاں شیخ پھر رک گئے۔ اور حکم دیا کہ اس مکان کے رہنے والوں کے نام بتائے جائیں چنانچہ ایک ایسا شخص جو ان ناموں سے واقف تھا بلایا گیا، اور اس نے اس مکان کے رہنے والوں کے نام گنانے شروع کئے۔ ایک نام پر پھر وہی حرکت پیدا ہوئی، اور شیخ نے اس شخص کو وہیں روک دیا اور تیمار داروں سے کہا کہ یہ جوان فلاں محلہ کی فلاں لڑکی پر شیدا ہوا ہے اور ہوس عشق کی اس شدت نے ایسی حالت کر دی ہے یہ سن کر بیمار نے آنکھیں کھول دیں شیخ کو دیکھا اور اپنے منہ پر فرط غیرت سے چادر کھینچ لی جب تحقیق کی گئی تو شیخ نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف صحیح نکلا۔ قابوس کو بڑی حیرت ہوئی اور شیخ کو اپنے پاس بلا کر ملاقات کی۔ چونکہ سلطان یمین الدولہ نے شیخ کی تصویریں ہر جگہ بھجوائی تھیں اور خود قابوس کے پاس بھی شیخ کی تصویر آ چکی تھی اس لئے شیخ کو دیکھ کر قابوس نے پہچان لیا کہ یہ بوعلی سینا ہیں۔ اور پوچھا آپ بوعلی ہیں نا؟

شیخ نے کہا "ہاں میں بوعلی ہوں" قابوس تخت سے نیچے اتر آیا اور چند قدم آگے بڑھ کے شیخ کا استقبال کیا اور انھیں گلے سے لگایا۔

حدیث شریف میں فراستِ مومن کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، ایمان و یقین کی روشنی آدمی کو ذہین، ذکی، اور معاملہ فہم بنا دیتی ہے، "مرد مومن" کی فراست آدمی کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے باطن کو پہچان سکتی ہے، فراست اور "ڈپلومیسی" میں زمین آسمان کا فرق ہے، فراست سادہ بے ضرر اور پاکیزہ ہوتی ہے اور "ڈپلومیسی" میں نیت کی کھوٹ، دل کا فساد اور حیلہ جو طبیعت کی عیاری پائی جاتی ہے ـــــ حدیث میں مومن کی یہ تعریف بھی آئی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ ڈسا نہیں جا سکتا پہلے تجربہ اور پہلی ٹھوکر ہی میں اس کی فراست بیدار ہو جاتی ہے۔

علم الفراست کے جاننے والے باطن کی قوتوں کے منکر نہیں ہو سکتے، اس علم سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے باطنی قوی جب بیدار ہوتے ہیں تو پھر عقل سے ماوراء حقائق کا عرفان ہو جاتا ہے ـــــ انسان کی قوت کا سرچشمہ ظاہر نہیں، اس کا باطن ہے!

بکھرے ہوئے پھول

(طبعزاد)

چہروں کا فریب، باتوں کے فریب سے زیادہ خطرناک اور گہرا ہوتا ہے۔

کوئی قیافہ شناس ہوتا ہے اور کوئی ستارہ شناس! کاش! یہ سب "شناسا" کچھ نہ ہوتے صرف خدا شناس ہوتے

بہت سے چہروں پر "دھوکا" اور بہت سوں پر "نیکی" لکھا ہوتا ہے جلی حرفوں میں! مگر ہر کوئی اسے پڑھ نہیں سکتا۔

حیا چہرے کو سرخ اور ندامت زرد اور پھیکا کر دیتی ہے ـــ مگر توبہ اور ندامت گناہ کی زردی میں نکھار ہوتا ہے

بہت سی مسکراہٹوں میں دل گرفتگی اور بہت سے قہقہوں میں آہیں ملی جلی ہوتی ہیں۔

اگر ہر شخص اپنے کو خوبصورت نہ سمجھتا تو روزانہ لاکھوں آئینے ٹوٹ جایا کرتے۔

چہرہ باطن کا افسانہ ہے اور پیشانی اس کا عنوان اور رخسارے اس کی ذیلی سرخیاں (م ۔ ق)

بسملؔ سعیدی

اِنسان

اک کشمکشِ حال میں انساں ہے ابھی تک
کافر ہے ابھی تک نہ مسلماں ہے ابھی تک

گو، دیکھ چکا حُسن کا خورشیدِ ازل تاب
ذرات کے آئینوں سے حیراں ہے ابھی تک

گو، بزمِ تصوّر میں ہے اِک مشعلِ ایمان
بے سوزِ یقیں دل کا شبستاں ہے ابھی تک

اک قصر ہے خود حکمتِ معمارِ ازل کا
دیوانۂ بام و درِ ایواں ہے ابھی تک

اس کے لئے تھکی ہیں بہشتوں کی بہاریں
یہ خوگرِ بوئے گُل و ریحاں ہے ابھی تک

بیٹھا ہوا کب سے ہے سرِ کوثر آیات
افسوس کہ لب تشنۂ عرفاں ہے ابھی تک

حالانکہ خود اک حُسنِ ازل کی ہے تجلّی
ظلمات میں یہ چشمۂ حیواں ہے ابھی تک

اقوال کی دنیا میں ہے فردوس کا طالب
اعمال کی دُنیا سے گریزاں ہے ابھی تک

عصیاں کے خلاف اُترے ہیں انساں پہ صحیفے
انساں ہے کہ آلودۂ عصیاں ہے ابھی تک

اللہ کے امورِ "وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ"
سایہ میں حرم کے بھی یہ طوفاں ہے ابھی تک

شیطان پہ گر چل گیا "لاحول" کا قابو
انسان تو انسان کا شیطاں ہے ابھی تک

آباد ہے اِس نام سے ہر ذرّہ زمیں کا
دُنیا مگر انسان سے ویراں ہے ابھی تک

مفہومِ ازل اِس سے ہی خود گردشِ دوراں
کمبخت یہ سرگشتۂ دوراں ہے ابھی تک

ہر چند زمیں اس کا وطن ہے مگر اس کو
ہر صبحِ وطن شامِ غریباں ہے ابھی تک

فاش اِس کی نگاہوں پہ خدائی کے ہیں اسرار
خود اپنی نگاہوں سے بھی پنہاں ہے ابھی تک

برگِ گلِ رنگیں ہے سرِ دامنِ ہستی
اور تیغ برہنہ تہِ داماں ہے ابھی تک

جن خطروں سے انساں کو ڈرایا ہے خدا نے
اُن سب سے خطرناک خود انساں ہے ابھی تک

انسان کے ملبوس ہیں تہذیب و تمدّن
بسملؔ، مگر انسانیت عُریاں ہے ابھی تک

شعری بھوپالی

دو غزلیں

عضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

محبت کی قسم ان کے بھی دل میں یہ تمنا ہے
دوبارہ ہم سے اُن سے نامہ و پیغام ہو جائے

تصدق عظمتِ کونین اس مجنونِ غم پر جو
انھیں محفوظ رکھے اور خود بدنام ہو جائے

جو میرا دل نہ ہو شعری حریف انکی نگاہوں کا
تو دنیا بھر میں برپا انقلابِ عام ہو جائے

اسد بھوپالی

(۲)

حُسنِ گُل رنگِ شفق تابشِ انجم نہ رہے
اُن کے ہونٹوں پہ گھڑی بھر جو تبسم نہ رہے

آؤ اور آکے بس اک نغمۂ آخر سُن لو
کہیں ایسا نہ ہو نبضوں میں ترنم نہ رہے

مجھ کو دنیا سے غرض کیا مری دنیا تم ہو
جان دیدوں گا مرے ساتھ اگر تم نہ رہے

جانے کیا تھی قدمِ ناز کی ہلکی سی صدا
اِک اُجالا سا ہوا اور مہ و انجم نہ رہے

عشق کی راہ کٹھن ہے میں بھٹک جاؤں گا
اس سفر میں مرے ہمراہ اگر تم نہ رہے

(شعرائے بدایوں کے منتخب اشعار ـــــ جن میں سے بہت سوں کو آپ نہیں جانتے مگر اُن کے اشعار پڑھ کر اس شاعرانہ تعارف سے آپ کو مسرت ہوگی اور آپ کا ذوق اضافہ اور وسعت محسوس کرے گا۔)

مُصیبتِ شبِ ہجراں کبھی کٹی نہ کٹے — یہ رات بھر کے لئے رات عمر بھر کے لئے — ہلالی

سچ ہے شکلِ مکاں کو مکیں سے فروغ ہے — زنداں کو میں غریب ہوں زنداں کئے ہوئے — شاد

جمع احباب کئے ہیں کہ ذرا دل ٹھہرے — تم بھی آجاؤ تو محفل مری محفل ٹھہرے — عیش

حُسن اُن کا ہے ادا اُن کی ہے جلوہ اُن کا — پھیر لیں منہ وہ تو آئینے میں کیا رکھا ہے — 〃

پی لے بیمار تو مشکل نہ پئے تو مشکل — زہر کا نام ستمگر نے دوا رکھا ہے — 〃

میری اُن کی کوئی لڑائی ہے — اب چلا جاؤں اب صفائی ہے — 〃

چھپا کے رکھی ہے ظالم تری سناں کے لئے — رگِ حیات مجھے چاہیئے کہاں کے لئے — جامی

مجھ سے بگڑے تھے تو خط بھی مجھے بگڑا لکھا — حسنِ اخلاق نہ تھا حسنِ رقم بھی نہ رہا — امیر

تا ہجومِ آرزو میں گم نہ ہو جاؤں کہیں — گھیرے گھیرے پھرتی ہے میری پریشانی مجھے — 〃

کہیں پروانوں کا جمگھٹ کہیں شمعوں کا ہجوم — ایک ہی حسنِ ازل سوز کہیں ساز کہیں — جوہر

کیا ابھی ذوقِ معاصی سے کنارا کر لوں — شانِ رحمت تری توہین گوارا کر لوں — 〃

نیا آشیانہ بنا لینے والے — فلک پہ ابھی بجلیاں اور بھی ہیں — ارشدی

ڈھونڈ رہی تھیں آفتیں ایک بلا نصیب کو — گردشِ روزگار نے میرا پتہ بتا دیا — 〃

کبھی گذرا تھا گلشن سے جنوں میں کوئی دیوانہ — گلوں میں آج تک اک رسم ہے چاکِ گریباں کی — منور

یہ تو ممکن ہے کہ دل میں کہوں منہ پر نہ کہوں — یہ نہ ہوگا کہ ستمگر کو ستمگر نہ کہوں — قمر

اس سوچ میں بیٹھے ہیں اب کہئے تو کیا کہئے — روکا تو یہ کہہ کر تھا کچھ آپ سے کہنا ہے — 〃

جنہیں یقین ہے تو میرے گھر نہیں آتا — خدا کرے کہ وہ بیٹھے ہوں اور تو آئے — 〃

کھنچے رہتے ہو ہم سے اور عدو سے جھک کے ملتے ہو — چلو اچھے بھی دو کی تیر مارو گے کماں ہو کر — لُطف

مجھے ملال ہے لیکن تمہیں خیال نہیں — کہ لوگ کہتے ہیں آپس میں بول چال نہیں — 〃

چمن میں ایسا شگوفہ کسی نے چھوڑا ہے — کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں — 〃

شفیق صدیقی جون پوری

تمنّا

نہ صراحی نہ سبو اور نہ ساغر دینا — رند خطرے میں ہیں ساقی! مجھے خنجر دینا
صدقے اس خشک لبی کے کہ تری پیاس تو ہے — دینے والے مجھے شبنم نہ سمندر دینا
تھرتھراتے ہیں جہاں پاک فرشتوں کے قدم — تیرے جانباز نے سیکھا ہے وہاں سر دینا
میرے مالک! اگر احساس دیا ہے تو مجھے — علم و بارگہ و خیمہ و لشکر دینا

تاج پوشی اُسے زیبا ہے جسے آتا ہو
عدل و انصاف سے دامانِ زمیں بھر دینا

عاصی کرنالی

"حقائق"

یہ خواب یہ ظلمت کا فسوں یہ شبِ تاریک — جتنا بھی سمجھتا ہوں نظر ہوتی ہے باریک
رستے ہیں کئی عرش کئی فرش پڑیں گے — حالانکہ وہ منزل ہے رگِ جاں سے بھی نزدیک
ایسی بھی کوئی موج ہے دریا کی حدوں میں؟ — دے سکتی ہو طوفان کی بنضوں کو جو تحریک
قرآن کو اک غازیِ کردار سے پوچھو — مُلّا تو سمجھتا ہے فقط ہدیۂ تبریک
خوددار نہ ہو ذوق تو کچھ بھی نہیں ملتا — مانگی ترے جلووں سے نگاہوں نے بہت بھیک
چبھتے ہیں جو اربابِ تماشا کی نظر میں — سرمایۂ گلشن ہیں وہ کانٹے مرے نزدیک

جو شعر کہ تفسیرِ حقیقت نہیں ہوتا
عاصی میں سمجھتا ہوں کہ ہے فکر کی تضحیک

خزاں

"درسِ عمل"

کس شان سے ہے گرمِ سفر غازیِ خوددار — اک ہاتھ میں قرآن ہے اک ہاتھ میں تلوار
اللہ رے! یہ عزمِ جہانگیر و جہاندار — دریا ہوئے پایاب، ہٹے راہ سے کوہسار
انگڑائی ذرا لی ہے تو افلاک ہیں لرزاں — کیا ہو؟ کہیں ہو جائے مسلمان جو بیدار
تہذیبِ نوی قابلِ "امروز پرستی" — اور میری نگاہوں میں نہاں دوش کے اسرار
کچھ اور بھی ہے "رقصِ شبستاں" کے علاوہ — اے کاش! یہی جانتے اس دور کے فن کار

شاید کہ خزاں صبحِ بہاراں کی ہے آمد
وہ بھیگ چلی رات، وہ لہرائے سمن زار

سلیم احمد

شعلہ و شبنم

نظر کسی شے پہ کیا جمے گی کہ برق رفتار ہے زمانہ
رہی یہ گردش تو دیکھ لینا حقیقتیں بن گئیں فسانہ

حیاتِ باقی کے طالبو! جامِ عیش و عشرت کبھی نہ پینا
کہ آنکھ جھپکی اگر ذرا بھی فنا کو مل جائے گا بہانہ

مری نظر میں نہیں سماتی یہ آبِ جو اور اس کی شورش
کہ میری کشتی کو چاہیئے کوئی بحرِ ذخار و بے کرانہ

میں سجدہ تو لاکھ بار کر لوں خیال کچھ ہے تو صرف اتنا
کہ میرے سجدے کی تیرگی سے سیہ نہ پڑ جائے آستانہ

نہ شیخ ہی سے ہے مجھ کو مطلب نہ برہمن ہی سے کچھ غرض ہے
کہ ان کی راہوں سے بچ کے نکلی ہے میری راہِ قلندرانہ

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ نہ پائیں گے عرش والے
کہ آسماں سے زمیں کے اوپر نگاہ پڑتی ہے طائرانہ

نشاطِ وصل ہو یا ہجر کا غم
حیاتِ عشق کا حاصل نہیں ہے

یوں ہی رہ گام زن راہِ طلب میں
کہ قسمت میں تری منزل نہیں ہے

اگرچہ اب وہ میرے سامنے ہیں
رے غم کا بھی وہ عالم نہیں ہے

مگر یہ کون سی حالت ہے اے دل!
مری تنہائی ب بھی کم نہیں ہے

عبد الرؤف عروج

حقیقت و افسانہ

نہ چھیڑ بے سر و سامانیوں کے افسانے
اگر جنوں ہے سلامت ہزار ویرانے

نہ اب خرد نہ جنوں ہے نہ اب گماں نہ یقیں
یہ کس مقام پہ ہم آ گئے خدا جانے

نہ خضر ہی مرے کام آیا اور نہ اہلِ طریق
مجھے سنبھال لیا میری لغزشِ پا نے

فراقؔ گورکھپوری

ایک آئینہ اور چار جلوے

مٹتا بھی جا رہا ہوں، پورا بھی ہو رہا ہوں　　میں کس کی آرزو ہوں، میں کس کا مدعا ہوں
پڑتے ہی آنکھ تجھ پر جو یوں تڑپ اٹھا ہوں　　دیکھا ہو جیسے پہلے پہچان سا گیا ہوں

ہاں! اے فراقؔ یوں ہی کچھ جی میں آگئی تھی
یہ رازِ دل تھے جن کو باتوں میں کہہ گیا ہوں

سیفؔ ٹونکی

(۲)

یہ کس نگاہ سے دیکھا ارے غلط انداز!　　ابھی تو تھا مجھے دردِ جگر کا اندازہ
نمودِ رنگِ رخ و زلف ابھی حجاب میں ہے　　نقاب اٹھے تو ہو شام و سحر کا اندازہ

انقلاب آتے مگر تم نہ بدلتے مجھ سے　　دل کی دنیا کبھی برہم نہیں ہونے پاتی
مسکراتے ہوئے کیا دیکھ لیا ہے اُن کو　　اب خوشی ہے کہ ذرا کم نہیں ہونے پاتی
صورتِ حسن ہے کس درجہ لطافت انداز　　کوئی عالم ہو مجسم نہیں ہونے پاتی

دردؔ سعیدی

(۳)

ہے کون سکوتِ غم میں شامل　　یہ کس سے خطاب کر رہا ہوں
تم لاکھ رہے ہو دور مجھ سے　　میں تم سے قریب تر رہا ہوں
کل خوف نہ تھا خدا کا مجھ کو　　بندوں سے بھی آج ڈر رہا ہوں

آثمؔ اجمیری

(۴)

ہر دل میں اک شگفتگی آن کی نظر سے تھی　　یہ کچھ نہ کھل سکا وہ کدھر دیکھتے رہے
اہلِ چمن کے جذبۂ غیرت کو کیا ہوا　　لٹتے ہوئے بہار کا گھر دیکھتے رہے

ممکن نہیں کہ حشر میں میری زباں کھلے
آثمؔ مری طرف وہ اگر دیکھتے رہے

ماہرالقادری

اِشتراکیت

بے یقین و بے ضمیر و کم نگاہ
منکرِ اخلاق و آیاتِ الٰہ
عصمتِ کردار در راہش غبار
مذہب اورا "شکم" پروردگار
در مساداتِ جہاں مصروفِ کار
زاں مساواتیکہ فطرت شرمسار
آدمی را صرف "ماشینے" شمرد
درد خاں زائید و بر آتش بمرد
آتشیں سیلاب، لرزاں بر زمیں
فتنۂ دُنیا و ہم آشوب دیں

برکھارت

وہ برکھارت وہ ساون کا مہینہ
روانی پر گھٹاؤں کا سفینہ
ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے
ہرے پودے بھی پنکھا جھل رہے تھے
فضا میں تیرتے تھے ابر پارے
نم آلودہ ہواؤں کے سہارے
گھٹاؤں کا دھواں سا چھا رہا تھا
شفق کا رنگ اودا ہو گیا تھا
پپیہوں کی ملھاریں دل پر ملھاریں
کہیں بدمست موروں کی پکاریں
وہ پودوں کی بہت ہی نرم کونپل
ہوا میں اُڑ رہے تھے سبز آنچل
ترشح سے ہر اک شے دھل رہی تھی
زمیں کی اور رنگت کھل رہی تھی
ہرن آپس میں چہلیں کر رہے تھے
کلیلوں پر کلیلیں کر رہے تھے
ہرے پتوں پہ بوندیں پڑ رہی تھیں
زمرد پر ستارے جڑ رہی تھیں

ماتم شباب

(ایک حسین عورت خوابِ جوانی سے بیدار ہوجانے کے بعد)

کششِ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں
مستئِ نرگسِ بیمار کہاں سے لاؤں

حُسنِ رنگینیٔ افکار کہاں سے لاؤں
اب میں وہ نطقِ گہربار کہاں سے لاؤں

وقت نے چھین لیا ساقِ بلوریں سے گداز
اب میں وہ شوخیٔ رفتار کہاں سے لاؤں

اب نہ آنکھوں میں چمک اور نہ عارض میں دمک
آہ! وہ بارشِ انوار کہاں سے لاؤں

اب نہ باتیں مری دلچسپ نہ آواز میں لوچ
یعنی وہ نرمیٔ گفتار کہاں سے لاؤں

ہائے! وہ جوشِ جوانی وہ امنگوں کی بہار
اب میں وہ دولتِ بیدار کہاں سے لاؤں

آہ! وہ موجِ ہوس جس نے مجھے لُوٹ لیا
ہائے! وہ عصمتِ کردار کہاں سے لاؤں

دل میں گرمی نہ رہی شوق میں تیزی نہ رہی
شعلۂ آتشِ رخسار کہاں سے لاؤں

جس نے کچھ روز زمانہ میں خدائی کی ہے
آج وہ حُسن کا پندار کہاں سے لاؤں

وہ تبسّم کی جھلک ہے نہ وہ ابرو کی لچک
اب میں چلتی ہوئی تلوار کہاں سے لاؤں

چشمِ میگوں ہے کہ ویران نظر آتی ہے
حاصلِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں

نہ وہ شوخی نہ امنگیں نہ وہ اندازِ خرام
اب میں پازیب کی جھنکار کہاں سے لاؤں

امیر اور اُن کے ندیم

دوسروں کے منہ کی تعریفوں سے دل ہوتا ہے خوش
جب نہ ہو خود ذات پر اپنی کسی کو اعتماد

ہے امیروں کے یہاں اُن کے ندیموں کا یہ حال
جیسے سازندے طوائف کو دیا کرتے ہیں داد

غزل

منزلِ دوست نہیں رہگذرِ عام ابھی
سیر کرنے کو نہ آئیں سحر و شام ابھی

اسی رستہ سے گیا ہے بتِ خود کام ابھی
میں نے دیکھی تھی یہیں گردشِ ایام ابھی

عشق وارفتہ و بے تاب زمانہ بے ذوق
حُسن پر آنہ سکے گا کوئی الزام ابھی

صبح کے وقت کوئی مجھ سے ہوا تھا رخصت
گونجتا ہے مرے کانوں میں وہ کہرام ابھی

زینتِ منبر و محراب نظر آتے ہیں
فکرِ انساں کے تراشے ہوئے اصنام ابھی

دل کا اصرار کہ چل کوچۂ جاناں کی طرف
ہاں! اسی وقت ابھی ماہرِ بدنام ابھی

ڈاکٹر گیان چند ایم۔ اے ڈی فل

فسانۂ عجائب

اردو داستانوں میں فسانۂ عجائب کی حیثیت اور شہرت مسلّم ہے لیکن اردو ادب کے مورخ بھی اس کی تاریخی حیثیت سے ناواقف ہیں، بیلی نے اپنی انگریزی تاریخ اردو میں اتنا اشارہ کر دیا ہے کہ فسانۂ عجائب کی تاریخ معلوم نہیں۔ حامد حسین قادری نے داستانِ تاریخ اردو میں اس بحث کو چھیڑا لیکن حل کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔

فسانۂ عجائب کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۱۲۴۰ھ کے بعد لکھی گئی اور خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں ختم ہو چکی تھی۔ دونوں سرور کے بیانات ہیں۔ یہ خیال رہے کہ سنہ ۱۲۴۰ھ عیسوی سال سنہ ۱۸۲۴ء کے مطابق ہے۔ غازی الدین حیدر کا عہد حکومت سنہ ۲۷-۱۸۱۹ء ہے اور نصیر الدین حیدر کا سنہ ۳۷-۱۸۲۷ء ہے۔ اول ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دیباچہ کس وقت لکھا گیا۔ دیباچے کے آخری صفحے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ قصے کی تکمیل کے بعد لکھا گیا۔ شروع میں حمد و نعت اور والیِ ملک غازی الدین حیدر کی تعریف ہے پھر لکھنؤ کے بیانات کے بعد لکھتے ہیں "یہ فسانہ بہ عہدِ دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا اور تمام بہ عصر سلطان بن سلطان ابو النصیر نصیر الدین حیدر دام ملکہٗ ہوا" اس کے بعد نصیر الدین حیدر کی مدح میں قطعہ ہے۔ گویا دیباچے کا ابتدائی حصہ غازی الدین حیدر کی زندگی میں لکھا اور آخری حصہ نصیر الدین کے عہد میں اس ان میل کو اس طرح جوڑ دیا ہے کہ شناخت نہیں ہو سکتی کہ پہلا کس مقام تک ہے اور دوسرا کہاں شروع ہوتا ہے۔ یہ داستان کس طرح لکھی گئی، اس کی تشریح خود مصنف کی زبان سے سنئے۔ ایک دوست نے ان سے قصہ سننے کی فرمائش کی۔ "فقیر کو اسی دن سے ہمیشہ اس کا خیال رہتا تھا عدم فرصت سے نہ کہتا تھا۔ آخر الامر بہ مقتضائے عادت تلاشِ معاش کے حیلے میں فلکِ تفرقہ پرداز گردونِ عربدہ ساز نے صورتِ مفارقت دکھائی۔ مہاجرت استقبال کو آئی۔ ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنِ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بارہ سے چالیس تھے آنے کا اتفاق مجبور کر کے کانپور میں ہوا"

کانپور کے حکیم اسد علی کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ——— ایک روز ان سے بعد اظہار حالِ مکلف فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں سن کر فرمایا۔ بیکار مباش کچھ کیا کر۔

تیر نہیں بیر تم۔ کاہلی اللہ رہی   نام خدا ہو جوان۔ کچھ تو کیا چاہیئے

اس وقت یہ کلمہ توسنِ طبع کو تازیانہ ہوا۔

اس بیان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں سرور نے فسانۂ عجائب لکھنے کا ارادہ کیا۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں جلا وطن ہو کر کانپور جانا پڑا وہاں حکیم اسد علی کے مشورے سے فسانۂ عجائب لکھنا شروع کیا اور ختم بھی وہیں کر دیا۔ کس وقت! نصیر الدین حیدر کے عہد میں یعنی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں یا اس کے بعد قصہ کانپور ہی میں اختتام کو پہنچا جیسا کہ دیباچے کے اس فرد سے ظاہر ہے۔

الٰہی لکھنؤ بستا رہے دورِ قیامت تک   سرورِ دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا

یہاں تک تو سب کچھ سمجھ میں آتا ہے لیکن خاتمے میں جو تاریخیں درج کی ہیں ان سے ۱۲۴۰ھ نکلتا ہے۔ سرور کہتے ہیں۔

تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جس دم بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگِ دل کا

اس سے ۱۲۴۰ھ نکلتا ہے۔ یہی مدہوش کی تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ لیکن سرور کے استاد نوازش کی تاریخ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

بجستم سالِ تاریخش نوازش فلک ایں گلستانِ بے خزاں داد

"گلستانِ بے خزاں" سے ۱۲۳۱ کا عدد نکلتا ہے۔ کسی طرح کھینچ تان کی گنجائش نہیں۔ یقیناً یہ تاریخ غلط ہے۔ اب دیباچے میں سرور لکھ رہے ہیں کہ کتاب نصیر الدین حیدر کے عہد میں (۱۲۴۳–۱۲۵۳ھ / ۱۸۲۷–۱۸۳۷ء) تمام ہوئی اور خاتمے میں سب کے سب ۱۲۴۰ھ کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس الجھن کا کیا علاج۔ منظوم تاریخوں کے ہوتے میری مجال نہیں کہ انھیں کاتب کی غلطی یا دروغ بیانی پر محمول کر دوں۔ ان سب بیانوں کو مطابق کرنے کے لیے یہی کہنا پڑتا ہے کہ سرور ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں کانپور آئے۔ وہاں اسی سال قصہ لکھنا شروع کیا اور اسی سال ختم کر کے ۱۲۴۰ھ تاریخ کہہ دی۔ تین سال بعد نظر ثانی کر کے نصیر الدین حیدر کی خدمت میں کتاب روانہ کی۔ تاکہ لکھنؤ واپس آنے کی اجازت مل جائے۔ کتاب کے پیش کیے جانے کا ثبوت افسانۂ سرور کا پہلا خط ہے۔ کتاب روانہ کرتے وقت دیباچے میں نصیر الدین کی مدح اور یہ جملہ اضافہ کیا۔ یہ افسانہ تمام بہ عصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیر الدین حیدر ہوا۔ نظر ثانی کے بارے میں دیباچے کی آخری سطروں میں اشارہ ملتا ہے، بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ وقت طلب غیر مستعمل عربی و فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اسے دور کیا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس فسانۂ عجائب کا ۱۲۶۰ھ کا ایک ایڈیشن ملا جس میں اہل مطبع کی طرف سے تحریر ہے کہ یہ ایڈیشن سرور کے نسخے سے تیار کیا گیا ہے۔ اس پر سرور کی ۱۲۴۲ کی بنی ہوئی مہر ثبت ہے۔ بہ ظاہر یہ پہلا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں اس کے آخر میں بہت سی تاریخیں دی ہیں جن میں سے ایک پہلا مصرع یہ ہے۔ ع

چھپی پھر جانِ عالم لکھنؤ میں

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پہلے بھی شایع ہو چکی ہے اور اس کا نام ہیرو کے نام کے سبب جانِ عالم بھی تھا۔ بعد کی کئی منظوم تاریخوں میں بھی اس کا نام جانِ عالم دیا ہے۔ اس ایڈیشن میں زیادہ اہم جو حصہ ہے وہ خاتمے میں تقریباً دو صفحوں کی عبارت ہے جو سرور کے قلم سے ہے۔ یہ کسی اور ایڈیشن میں نہیں، اس میں سرور نے لکھا ہے کہ فسانۂ عجائب پہلے ہی لکھا جا چکا تھا لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی ۱۲۵۳ھ میں نصیر الدین حیدر کے انتقال پر محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے اور محرم ۱۲۵۴ھ میں کتاب پہلی بار شایع ہوئی۔ پہلا ایڈیشن ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء کا انڈیا آفس میں موجود ہے۔

گو اس کتاب کا قصہ طبع زاد ہے لیکن اس کی جزئیات مشہور داستانوں کے ڈھنگ پر ہیں اور دوسرے قصوں میں ملتی ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں رسالہ نگار میں کئی ماہ تک کچھ مضامین شائع ہوئے تھے بہ "عنوان فسانۂ عجائب کے اجزائے ترکیبی اور ہماری داستان گوئی" (از نقاد) ان میں ایسے ہی ماخذ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں بھی تین واقعوں کا ماخذ درج کرتا ہوں۔ فسانۂ عجائب کی ایک ضمنی حکایت تاجر زادہ ملک کی ہے۔ غالباً یہ سرور کی تصنیف نہیں۔ یہ مثنوی چندر بدن و مہیار سے بہت ملتی ہے وہاں بھی مہیار تاجر زادے کا جنازہ شہزادی چندر بدن کے محل کے نیچے رکھتا ہے۔ چندر بدن اس کی لاش کے پاس لیٹ کر مر جاتی ہے۔ دونوں کی لاشیں ایک دوسرے سے چمٹ جاتی ہیں اور دونوں کو ایک ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی دکھنی شاعر مقیمی کی تصنیف ہے۔

فسانۂ عجائب کا سب سے مشہور قصہ قالب کی تبدیلی ہے لیکن یہ قطعاً سرور کی اختراع نہیں۔ بالکل اسی طرح یہ دوسری جگہوں پر ملتا ہے۔ اس کی ابتدائی مثالیں سنسکرت میں ہیں۔ کتھا سرت ساگر میں ایک برہمن راجہ نند کے مرنے پر اس کے قالب میں چلا جاتا ہے اور

عرصے تک حکومت کرتا ہے بیتال پچیسی کی چوبیسویں کہانی بیں قالب تبدیل ہوتے ہیں۔ پروفیسر بلوم فیلڈ نے ۱۹۱۷ء میں ایک مضمون میں تبدیل قالب پر روشنی ڈالی ہے فسانۂ عجائب کی طرح کا قصہ راجہ مکند یا وکرم کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ راجہ ایک مردہ برہمن کے جسم میں داخل ہوتا ہے کہ ایک کبڑا راجہ کے بدن میں چلا جاتا ہے۔ چند روز میں حرکات و سکنات سے رانی کو اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک طوطے کو مار کر جعلی راجہ سے ضد کرتی ہے کہ اسے زندہ کرو۔ وہ اپنی روح طوطے کے بدن میں لے آتا ہے۔ راجہ جو پاس ہی پوشیدہ رہتا ہے اپنے قالب میں واپس چلا آتا ہے۔ ایسا ہی قصہ بلوم فیلڈ نے اپنی کتاب حکایات و سوانح پارس ناتھ (Life & Story of Paraswath) بہار دانش کے خاتمے میں لفظ بلفظ فسانۂ عجائب کی طرح قالبوں کی الٹ پھیر ہے۔ وہاں بھی وزیر دغا کرتا ہے اور اسی طرح اسے زک دی جاتی ہے۔ یقیناً یہی سرور کا ماخذ ہے۔ ایک مختصر مثنوی قصہ ہیرامن طوطا' میں بھی یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے اس کی جزئیات بھی فسانۂ عجائب سے ملتی ہیں۔ جان عالم بندر کے قالب میں شاہ یمن کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ پرانا قصہ ہے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں خداداد کے نام سے سوانگ کے طور پر کھیلا جاتا ہے۔

۱۸۲۵ء میں بھولا ناتھ فارغ نے فسانۂ عجائب کو نظم کیا۔ $\frac{۷۹}{۹۹}$ ۱۸ء ۱۲ھ میں مثنوی ترانۂ غریب کے نام سے شفاعت اللہ نے مرادآباد سے شائع کی۔ انیسویں صدی کے آخر میں سید ولایت علی فردوسی لکھنوی نے بھی نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکے۔ ہندی ترجمہ اپورو چترا از پنڈت رام رتن باجپئی متوطن دہتھر پور کا ۱۸۸۸ء میں نکلا۔ انگریزی میں چودھری رحم علی الہاشمی نے مختصر ترجمہ کیا تھا جو دسمبر ۱۹۳۴ء میں پانیر اخبار کی چند قسطوں میں نکلا۔ یہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا۔

فسانۂ عجائب کے مصنف (رجب علی سرور) نے اپنے تخیل کے زور سے بندر کو آدمی اور آدمی کو بندر بنا دیا ــــ مگر دورِ حاضر کی تہذیب' قالب کی تبدیلی کے بغیر بھی آدمی کو بندر اور کتا بنا دیتی ہے' ووٹوں کی نکٹائیوں' پتلونوں' کوٹوں اور بش شرٹوں پر نہ جایئے' ان لباسوں میں بہت سے بندر اور ریچھ چھپے ہوئے ہیں

تہذیب حاضر انسان کو حیوانیت کی طرف گھسیٹ گھسیٹ کرلئے جا رہی ہے ــــ اور افسوس تو اس پر آتا ہے کہ آدمی اس گراوٹ پہ الٹا فخر کرتا ہے چہرے اُجلے اور "فروغ مے" سے گلستاں ہیں مگر دل مسخ ہوتے چلے ہیں' زندگی میں سارا کھیل دل ہی کا ہے۔ یہ بگڑ گیا تو پوری زندگی بگڑ گئی۔

پوری سوسائٹی حیوانیت کا شکار ہے' آدمی انسانیت کی ایک ایک حد کو توڑ رہا ہے اور ہدایت و سعادت کی ہر آواز "انقلاب زندہ باد" کے پرشور نعروں سے دبی جا رہی ہے۔

دنیا تباہی کے اس گڑھے پر کھڑی ہے جس کے ایک طرف آگ ہے اور دوسری طرف سمندر! سعادت اس کے لئے مقدر ہے جو گرنے سے بچ گیا اور جس کے پائے استقامت کو کوئی چیز ڈگمگا نہیں سکی!

آدمی اپنے جسموں کے ساتھ زندہ ہیں مگر انسانیت دم توڑ رہی ہے' کاش! جسم مر جاتے لیکن انسانیت زندہ رہتی! زندگی اور موت کے ان جھکڑوں نے سوسائٹی کے سفینہ کو برگ خزاں دیدہ کی طرح بے بس بنا دیا۔

نصیر الدین دہلوی

زندگی کا موڑ

میں مسلسل سفر سے اُکتا گیا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے نڈھال ہو گیا تھا۔ سفر میں اگر منظر بدلتا رہے اور نظاروں کے تنوع کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے تو دل بستگی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں —— مگر یہاں مشکل یہ تھی کہ سفر طویل اور منظر یکساں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے ساتھ وہ حصۂ زمین بھی حرکت میں آگیا ہے جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا، یہاں تک کہ —

ہر شے نظر آتی ہے نظر آتی ہوئی سی

یہ چھٹا دن تھا اس جانکاہ سفر کا —— لیکن نظارے کی یک رنگی اور گرد و پیش کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، وہی ریت کا نہ ختم ہونے والا سمندر، وہی سورج کی جاں گداز تپش، وہی اونٹوں کی ٹیڑھی قطار، وہی اُن کی سست گامی، وہی نرم ہچکولے اور وہی گھنٹیوں کی غیر مرتب آواز جس میں معنی کم اور کرختگی زیادہ تھی —— میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ! یہ سفر کب تمام ہوگا، ریت کے ناہموار ٹیلوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں خشک ہو گئیں، اونٹوں کے بلبلانے کی آوازوں نے کان کے پردوں میں خراشیں سی ڈال دیں۔

میرے نابینا ہم سفر نے میری خموشی سے میرے سوچ اور فکر کا پتا لگا لیا، وہ نہایت اطمینان کے ساتھ بولا —— گھبراؤ نہیں! آج دن چھپتے چھپتے ہم وادیٔ نجران میں پہونچ جائیں گے —— اس پر میں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا:

شاید! ایسا ہو جائے۔ وادیٔ نجران! (یاس انگیز لہجہ میں) ع مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے۔

میرے اس جواب پر نابینا نے مجھ سے دریافت کیا —— "اچھا یہ تو بتایئے کہ بائیں طرف کچھ ٹیلے نظر آرہے ہیں کہ نہیں" میں نے بہت غور سے دیکھنے کے بعد کہا، جی! ٹیلے دکھائی دے رہے ہیں لیکن وہاں، جہاں زمین و آسمان مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور نگاہ اس حد سے پرے نہیں جا سکتی۔

"بس! تو شاید نہیں ضرور بلکہ یقینی طور پر ہم رات وادیٔ نجران میں بسر کریں گے، میں اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہوں، میں نے یہاں کے کنوؤں سے پانی بھرا ہے، میں نے یہاں کے درختوں کے سایہ میں آرام کیا ہے اور اس مقام کی صبح کی سفیدی اور شام کی سیاہی کو خوب پہچانتا ہوں، میری آنکھوں نے یہاں وہ سب کچھ دیکھا ہے جسے اب تم دیکھو گے ——" نابینا نے جواب دیا۔

ان باتوں کا مجھ پر بڑا اثر ہوا، میں نے اپنے سینہ کے اندر رحم و شفقت کی ایک لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس کی، مجھے خیال آیا کہ اگر میں تھوڑی دیر کے لئے اندھا ہو جاؤں —— اور میں نے آنکھیں بند بھی کر لی تھیں —— چمکیلی دھوپ کی جگہ سیاہی امنڈنے لگی، نہ سرخ و سفید باقی رہا اور نہ دھوپ چھاؤں، زندگی نے آن کی آن میں ایک بھیانک صورت اختیار کر لی —— میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے رفیقِ سفر سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں

اور چہرے پر پچھلے غموں اور گزرے ہوئے واقعات کی پرچھائیاں اُبھر آئی ہیں ـــــــ میں خاموش ہو گیا، میرے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مُہر سی لگ گئی۔

تھوڑی دیر یہی سکوت اور گو مگو کا عالم طاری رہا، میں چاہتا تھا کہ اپنے غم دیدہ ہم سفر کو کسی دوسری طرف متوجہ کر دوں تاکہ اُس کا ذہنی کرب کم ہو جائے ـــــــ بہت سے غم باتوں سے بھی غلط ہو جایا کرتے ہیں۔

ـــــ سفر وسیلۃ الظفر تو کم ہی ہوتا ہے، زیادہ تر عذاب سقر، یہ سب سے بڑی مصیبت ہے ـــــ میں نے کہا۔

ـــــ نہیں نہیں! دُنیا میں اس سے بڑی مصیبتیں بھی ہیں، اگر تم کسی سے محبت کرتے ہو تو، اُس کی جدائی اس سے بڑی مصیبت ہے، اگر تم مجاہد ہو تو جہاد میں کوتاہی اس سے بڑی مصیبت ہے اگر تم انسانوں کے غمخوار ہو اور حساس دل رکھتے ہو تو دل آزاری بہت بڑا عذاب ہے ـــــ نابینا نے جواب دیا۔

بہت دیر تک اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی، بات میں بات نکلتی آ رہی تھی، سلسلۂ کلام کافی طویل ہو گیا، نابینا کی اب پہلی سی حالت نہ رہی تھی، وہ ہشاش بشاش تھا، گفتگو نے اُس کے جذبات کا رُخ ہی بدل دیا ـــــ اب مجھ سے نہ رہا جا سکا آخر میں وہ بات پوچھ ہی بیٹھا جو اتنی دیر سے میرے دل میں کھٹک رہی تھی ـــــ آپ کی آنکھیں کیسے ضایع ہوئیں ـــــ میں نے رُک رُک کر دریافت کیا، "ضایع" کا لفظ مجھ سے بہت دیر میں ادا ہوا۔

ـــــ ضایع مت کہو، کام آئیں، اس وقت میری طبیعت میں انتشار سا ہے، بس ذرا شام ہونے دو، اُس وقت اس داستان کو سن لینا ـــــ نابینا نے جواب دیا اور میں "بہت اچھا" کہہ کر خاموش ہو گیا، سفر جاری تھا، وہی دھوپ کی شدت اور گرم ہواؤں کے تند و تیز بلکہ بے رحم تھپیڑے، منہ پر طمانچے لگ رہے تھے، اونٹ بھی ہانپ رہے تھے، ریت کے ان گنت ذرے سورج بن گئے تھے زمین و آسمان تپ رہے تھے۔

دوپہر ڈھلی، تیسرا پہر ہوا، یہاں تک کہ سورج دھندلانے لگا ـــــ شام ہونے کو تھی، دن کا مسافر رخت سفر باندھ رہا تھا ـــــ ٹیلے آنکھوں کے سامنے آ گئے، اور ان کے ساتھ کچی جھونپڑیاں، ٹیڑھی پگڈنڈیاں اور مرجھائے درخت بھی، کھجور کا کوئی پیڑ ہرا بھی تھا، شام کے دھندلکے میں ہم وادی نجران پہونچے سورج غروب ہو چکا تھا، لیلیٰ شب کی زلفیں بکھر رہی تھیں، اونٹ زمین پر اس انداز سے بیٹھے کہ اب کوئی دم میں لیٹنے والے ہیں، کجاوے اُتارے گئے خیمے نصب ہونے لگے، قافلے والے سستانے اور آرام کرنے کے سامان کر رہے تھے۔ کوئی ستو گھول کر پی رہا تھا اور کسی نے چولھے پر ہانڈی چڑھا دی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے نابینا رفیق سفر کو اُس کا وعدہ یاد دلایا، اُس نے میرے کہنے پر کچھ دیر تامل کیا جیسے اس کا حافظہ پچھلے واقعات کو ترتیب دے رہا ہے، پھر وہ بولا:ـ

"اچھا دوست! میری داستان سنو! میری جوانی کا رنگین زمانہ تھا، شباب کے افق سے جذبات کا گرم سورج طلوع ہو رہا تھا، دل سے نگاہ تک میں تمنا ہی تمنا اور شوق ہی شوق تھا، اسی طوفانی عہد میں ایک لڑکی سے مجھے محبت ہو گئی، شوق و محبت کو زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی دوشیزۂ صحرا سے میری شادی ہوئی اور ہم ایک دوسرے کے شریک حیات بن گئے، ہماری زندگی ہنسی خوشی کی زندگی تھی ـــــ لیکن اس قربت کے باوجود ہم ایک دوسرے سے بہت دور تھے، میری محبوب بیوی عفت و پاکبازی کی زندہ تصویر تھی، غیرت و خودداری، حیا کی پتلی اور شرم و حجاب کا پیکر! اور میں ـــــ (نابینا ایک سرد آہ بھرتا ہے) کیا کہوں مگر (ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے) جب کہنے پر آیا ہوں تو کوئی بات چھپاؤں گا نہیں، میرا ماضی ایک ایسی سیاہ چادر تھا جس میں سفیدی نام کو بھی نہ تھی، میری

اور اُس کی زندگی میں نمایاں تضاد تھا، لیکن اس تضاد کے باوجود میرا دل اُس عورت کے لئے وقف تھا، ذرا سی دیر کے لئے وہ نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی تو میں تنہائی محسوس کرتا، میری دُنیا اُس کے دم سے آباد تھی۔

ایک دن ہم دونوں سیاہ کمبل کے بنے ہوئے خیمے میں بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے کہ باتوں ہی باتوں میں اس غیرتِ صحرا نے مجھ سے کہا :۔

ایک بات کہتی ہوں، بلکہ پوچھتی ہوں، برا نہ ماننا ـــــ آپ اس لاابالی زندگی سے گھبرا نہیں جاتے، تلاشِ معاش ہی زندگی کا نصب العین نہیں ہے، دن بھر کمایا، شام کو گھر آگئے، کھایا پیا اور سو گئے، یہ ظاہری پُرلطف زندگی درحقیقت انتہائی بے لطف بلکہ بے روح زندگی ہے، ایسی زندگی تو چوپایوں کو بھی میسر ہے، انسان کی سربلندی اس میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے خالق اور معبود کی رضا اور حکم کے لئے وقف کردے، اور ہر طرف سے کٹ کر اور مڑ کر بس اُسی کا ہوجائے، اسی نقطہ سے حیوانیت اور انسانیت کے راستے الگ ہوجاتے ہیں ـــــ اور ـــــ میری بیوی کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ہوا کے جھونکے نے چراغ بجھادیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی کی باتوں کو میں نے اس کان سنا اور اُس کان اُڑا دیا، میرے شب و روز میں کوئی فرق نہ آیا، کئی مہینے اسی عالم میں گزر گئے، ـــــ مگر بیوی کی پُرخلوص نصیحت دل کی زمین میں ہدایت کا بیج ڈال چکی تھی" مجھے اس کا احساس نہ تھا۔

چند دن کے بعد میرے جوان بھائی کی موت کی خبر آئی، اس غمناک اطلاع نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا، میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا سیدھا بازو بیچ سے ٹوٹ گیا، بیوی نے میری آنکھوں کو اشک آلود دیکھ کر مجھ سے کہا ـــــ کچھ اپنی زندگی کی بھی فکر کیجئے۔ ایک دن آپ کو بھی خدا کے حضور جانا ہے" یہ جملے نشتر کی طرح میرے دل میں اُتر گئے، میں گہرے غم اور فکر میں ڈوب گیا، میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ میرے بھائی کے کفن پوش جسم کو حرکت ہوئی اور اس کے ہونٹوں نے بھی بیوی کی کہی ہوئی بات کی تائید کی۔

بس اُس دن سے میری زندگی میں نمایاں تبدیلی شروع ہوگئی میں نے اپنے خدا سے عہد کیا ایسا عہد جو ایک غلام اپنے آقا سے کیا کرتا ہے، میری کشتیٔ حیات ایک چٹان سے ٹکرائی جس نے کشتی کے رُخ ہی کو بدل دیا، اب میں وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پہلے تھا، میں نے اپنے اندر روشنی محسوس کی، خودآگہی بیدار ہوگئی اور حق شناسی کا احساس ہتھیلیوں سے آنکھیں مل کر اُٹھ کھڑا ہوا ـــــ میں اب زندگی کے اُس زنداں سے باہر آگیا تھا جس میں چوپائے محبوس رہا کرتے ہیں، مجھے روشنی کا مینارہ نظر آگیا تھا۔

ـــــ یا ابن عم! تھک تو نہیں گئے ـــــ نابینا نے مجھ سے دریافت کیا۔

ـــــ نہیں! بالکل نہیں! میں تو سراپا گوش ہوں، آپ کہے جائیے، ایسی حقیقت آمیز داستانیں روز روز سننے کو نہیں ملتیں ـــــ میں نے جواب دیا اور نابینا نے جہاں سے بات چھوڑی تھی، وہیں سے سلسلہ شروع کر دیا۔

میں ابھی تک اپنے ذہنی انقلاب سے مطمئن نہیں تھا، یہ تبدیلی ایک آتشیں امتحان چاہتی تھی، میرا دل بھنچا بھنچا سا رہتا ـــــ مگر اس کے لئے بھی غیب سے سامان ہوگیا، یعنی چند دن کے بعد معرکۂ حق و باطل پیش آگیا اور میں اس میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔

ـــــ میں جا رہا ہوں میں نے اپنی محبوب بیوی سے کہا۔

ـــــ کہاں! بیوی نے دریافت کیا۔

ـــــ دینِ حق کی حمایت میں باطل سے لڑنے کے لئے، میری زیادتیاں معاف کر دینا ـــــ میں نے جواب دیا

ـــــ اور آپ بھی ـــــ اُس نے کہا، (چہرہ شگفتہ تھا مگر آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے جھلملا رہے تھے)

—تم میرے بعد ———— میں کہتے کہتے رک گیا
—صبر اور دعا کروں گی ———— اُس نے ہچکی کے ساتھ جواب دیا۔
اور میں رخصت ہو گیا، زندگی کی متاعِ بے بہا میرے پیچھے تھی اور آخرت کی حیاتِ جاوداں میرے سامنے! میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا، کوئی چیز میرے توسن عزم کو روک نہ سکی ———— میرے عزیز! اس وادی کے ذرہ ذرہ کو میں پہچانتا ہوں، اس وادی میں ہم مصروف پیکار تھے کہ دشمن کے تیر میری آنکھوں میں پیوست ہو گئے، میری آنکھیں کام آگئیں کاش! میری جان بھی کام آسکتی!

میں نے ٹھنڈا سانس بھر کر گردن اُٹھائی، چراغ کی لو ٹمٹما رہی تھی رات بھیگ چکی تھی اور میرے رفیقِ سفر کے رخساروں پر آنسو بہ رہے تھے!

تاثرات

اپنے بچہ کی موت پر:-

میرا حسین اور معصوم بچہ تتلی کی تلاش میں بہت دور نکل گیا ——— سوادِ وطن بلکہ اُفقِ کائنات سے بھی دور! (ایک جاپانی شاعر)

نا اُمیدی کے بعد:-

میں نے سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کی تھی میں نے حبابوں کو ساکن بنانا چاہا تھا میں پرچھائیں کو پکڑنا چاہتا تھا میں اوس کی بوندوں سے کنوئیں بھرنے لگا ——— مگر! اس کوشش کا انجام! کاش میرے آنسو اور مسکراہٹ کا درمیانی وقفہ مجسم ہو سکتا۔

(فرانسیسی ادیب)

گورِ غریباں میں:-

اس قدر بھیانک سکوت ایک پتی کے ہلنے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی قہقہے لگانے والے اور اس قدر خاموش! ہائے! یہ خاموش دنیا جہاں نہ بولنے کا دستور ہے ——— مگر قبر کا ایک ایک ڈھیر بول رہا ہے زبانِ حال سے! سننے والے کان اور محسوس کرنے والے دل بھی تو ہوں ——— جس جسم کی لذت و آسائش کیلئے آدمی دوسروں کا گلا کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتا ——— اس کا انجام اسقدر عبرتناک!

موت کی پرچھائیاں ہیں اور سوادِ شام ہے
خاک کے کچھ ڈھیر ہیں باقی خدا کا نام ہے

غفلت کے پردے دل و نگاہ پر نہ پڑے ہوں تو گورِ غریباں کی ایک ایک ٹھیکری عبرت کا نہ بھولنے والا منظر پیش کرتی ہے! (ایک عربی مضمون نگار)

شام کے وقت

ڈوبنے والے سورج آنے والی صبح کو میری طرف سے مبارکباد دینا اور گزرنے والے دن کو پرسا۔

(ترکی مفکر)

ماہر القادری

تصادم

رات بہت جا چکی تھی، سویرا ہونے والا تھا، بادلوں نے نمودِ صبح کو روک رکھا تھا، مطلع ابر آلود نہ ہوتا تو سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا ہوتا، بوندا باندی بھی ہو رہی تھی، ابھی ترشح ہوتے ہوتے خوب موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں جیسے آسمان سے جا منیں برس رہی ہیں ہوا کے جھونکے کافی خنک تھے مگر سبک سیر نہ تھے، بارش کے قطروں نے انھیں بوجھل بنا دیا تھا۔

زمین خوب گیلی ہو گئی تھی، مکانوں کی منڈیروں سے پانی ٹپک رہا تھا اور درختوں کی ڈالیاں جھرنے بن گئی تھیں، سب سے زیادہ مشکل بے چارے کتوں کو تھی، جس سوکھی جگہ پناہ لینے کے لیے پہونچتے، دھتکارے جاتے اور کہیں کہیں دھتکار کے ساتھ دو چار ڈنڈے بھی کھانے پڑتے ــــــ کتوں کا نوشتۂ تقدیر ہی ٹیڑھے قلم سے لکھا گیا ہے۔

ریلوے جنکشن پر بڑی گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی، دو گاڑیاں جا چکی تھیں اور ڈاک گاڑی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی، مسافر آجا رہے تھے، ہر کوئی بوندوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا" کوئی چھتری لگائے ہوئے تھا، کسی نے تولیہ یا رومال سر پر ڈال رکھا تھا اور کسی نے اخبار کا سایہ کر لیا تھا مگر سب کی کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں، کسی کی ٹوپی بچ گئی تو کوٹ کا دامن بھیگ گیا، کسی کا کوٹ سلامت رہا تو پائجامہ یا پتلون نم آلود ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اور جوتے تو سبھی کے بھیگ گئے ــــ قدرت سے کون لڑ سکتا ہے!

انجن لگ چکا تھا، ڈاک گاڑی چھٹنے میں چند منٹ رہ گئے تھے اتنے میں ایک رکشا مسافر خانہ کے پاس آ کر رکی، رکشا والے نے رکشا سے ٹرنک اتار کر فرش پر رکھا اور مسافر عورت سے کرایہ لیکر روانہ ہو گیا۔

مسافر عورت، میلا برقعہ پہنے ہوئے تھی، جگہ جگہ پیوند اور تھگلیاں لگی ہوئی، برقعہ چہرے کی تو پردہ پوشی کر رہا تھا مگر عورت کے افلاس اور پریشان روزگاری کو بے نقاب کئے دے رہا تھا ــــ زبان ہی نہیں آدمی کا لباس بھی گویائی رکھتا ہے، "زبانِ حال" خاموش رہنا نہیں جانتی۔

ــ میں ڈاک گاڑی سے جاؤں گی، بھیا! مجھے گاڑی میں بٹھا دو ــــ بڑھیا نے قلی سے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔

ــ گاڑی بالکل تیار ہے، بہت سے بہت دو چار منٹ کی دیر ہو گی، مگر اس بھاری ٹرنک کے چڑھانے کا ایک روپیہ ہو گا قلی نے رکھائی سے جواب دیا۔

ــ پر میرے پاس تو کل ڈیڑھ روپیہ ہے، تمھیں ایک روپیہ دیدوں تو راستہ میں کھاؤں گی کیا، شام تک کا سفر ہے نظر دیر کا ــــ بڑھیا نے جواب میں کہا۔

ــ ریل میں سفر کرنے کے لئے گھر سے کُھم ڈیڑھ روپیہ لیکر چلی تھیں تم! واہ! اس احتیاط کے کیا کہنے! دوسرے قلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، یہ عورتوں کو دیکھ کر نرم پڑ جاتا ہے ــــ قلی کے جواب پر بڑھیا چپ ہو گئی مگر اس کے ماتھوں کی جھریاں تن گئیں، اس کا جس

چلتا تو قلی کا منہ کھسوٹ لیتی۔

بڑھیا سراپا لجاجت اور مجسم عتاب بنی کھڑی تھی متضاد جذبات کی یہ کشمکش عجیب و غریب ہوا کرتی ہے، اس نے ٹرنک اٹھانے کی کوشش کی مگر ایسا کرنے میں بے چاری گر پڑی ـــــــ قلیوں نے قہقہہ لگایا، اس قہقہہ کی گونج ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک موٹر وہاں آکر رکی اور قلیوں نے دوڑ کر اسے گھیر ہی تو لیا۔

کوٹ پتلون میں کسا بندھا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سگرٹ میں کش لگاتے ہوئے موٹر کار سے اترا، اور کلائی کی سنہری گھڑی دیکھنے لگا اس پر ایک بڈھا قلی جلدی سے بول پڑا، "حضور! گاڑی چھٹنے میں ابھی کافی دیر ہے، گارٹ (   ) صاحب کے برک میں ابھی تو سامان ہی چڑھایا جا رہا ہے۔

قلیوں نے سامان اٹھایا اور نہایت ادب اور تواضع کے ساتھ مسافر کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے، فرسٹ کلاس میں قلیوں نے سامان قرینہ کے ساتھ رکھا، ایک ایک چیز کو احتیاط بلکہ احترام کے ساتھ اتارتے چڑھاتے ـــــــ پھر وہ اجرت لینے کے انتظار میں کھڑے رہے، مسافر ایک دوسرے آدمی سے بات کرنے لگا۔ یہ گفتگو کسی خانگی واقعہ سے متعلق تھی۔

"مال گاڑی آنے کے سبب ڈاک گاڑی کو لائن کلیر نہ دیا جا سکا، ٹرین لیٹ ہو گئی ـــــــ مگر آخر ہوا کیا خان بہادر صاحب!" دوسرے مسافر نے دریافت کیا، "ارے صاحب! ہمارے کارندے کی بوڑھی ماں میرے پیروں پر گر کر بولی کہ میرے بیٹے کو آپ بحال کر دیجئے، ہم تو بھوکوں مر جائیں گے، میں نے بڑھیا کو پیروں سے ہٹاتے ہوئے کہا کہ چوروں اور امانت میں خیانت کرنے والوں کو میں اپنے یہاں نہیں رکھ سکتا ـــــــ وہ عورت میرے پاؤں ہلانے جلانے میں زمین پر گر گئی، اور ـــــــ اتنے میں گارڈ نے وسل دی، ہری جھنڈی ہلائی، اور انجن گارڈ صاحب کی شہ پاتے ہی چیخ پڑا، خان بہادر صاحب نے قلیوں کو اجرت نہیں انعام دیا، اور آن کی آن میں ریل روانہ ہو گئی، ٹرین کے جاتے ہی پلیٹ فارم سونا سونا ہو گیا، رونق اور چہل پہل تو آدمیوں کے دم سے ہے، ڈاک گاڑی اس ہنگامہ کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔

شام تک قلی جنکشن پر مزدوری کرتے رہے، دن چھپے سٹیشن سے روانہ ہوئے اور بڑے بازار کے چوراہہ کے پاس کی گلی میں مڑ کر ایک مکان میں گھس گئے ـــــــ یہ غریبوں اور پریشان حالوں کا شراب خانہ تھا یہاں دیسی شراب ملتی تھی، قیمت کم، نشہ زیادہ اور بدبو اس سے بہت زیادہ ـــ

قدیم وضع اور پرانی چال کی بوسیدہ سی عمارت، دیواریں پکی مگر فرش کچا تھا، ایک مستطیل نما بڑے سے کمرے میں لکڑی کی بنچیں اور سرکنڈے کے مونڈھے بچھے تھے، دو چار بید کی کرسیاں بھی تھیں مگر سب کی سب انقلاب دیدہ اور جنگ آزمودہ! کسی کا پیر غائب تو کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا ـــــــ"

زمانہ کے ستائے ہوؤں، قسمت کے ماروں اور افلاس و غربت کے دکھیاروں کا یہاں جمگھٹا تھا، یہ سب کے سب غم روزگار غلط کرنے کے لئے اس جگہ آئے تھے، شراب پیتے، ناچتے کودتے اور جھومتے جھامتے یہاں سے چلے جاتے یہ ان کا روزمرہ کا شغل تھا۔

ایک لنگڑا فقیر جو چوراہہ پر بھیک مانگا کرتا تھا اور جس کی یہ مخصوص صدا ـــــــ "بابا! جیسہ! ہاتھ کا میل، زندگی کا صدقہ، تیری جوڑی بنی رہے ـــــــ" دن بھر فضا میں گونجتی رہتی، اس خرابات میں موجود تھا، اندھے نے شراب کے دو جام چڑھائے اور سیر ہو گیا بلکہ یوں کہیے جھک گیا، عمر بھی تو کافی تھی اس مرد آزادی، شراب کو تو مرد افگن ہونا ہی چاہیے، جوانی میں اعصاب ایک حد تک اس کی کمر جھیل جاتے ہیں مگر جہاں یہ دور گزرا شراب کا نشہ بھوت کی طرح سوار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اب خود مرکب بن گیا۔

میخانہ کی باتیں

تانگہ والا:—— بھیا! آج تو خوب لہر بیٹھی، ایک نیا مسافر ریلوے اسٹیشن پر آکر اترا، میں وہیں گیٹ پر دیوار سے لگا ہوا کھڑا تھا۔

— کہاں جائیے گا حضور! میں نے دریافت کیا۔

— گھنٹہ گھر جانا ہے مجھے مسافر نے جواب دیا۔

— سرکار گھنٹہ گھر یہاں سے تین میل سے بھی کچھ زیادہ دور ہے۔ چار روپیہ ہوگا کرایہ وہاں تک کا —— میرے کہنے پر مسافر نے ہامی بھر لی، گھنٹہ گھر تو اسٹیشن سے تین چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھا میں اُس مسافر کو شہر میں گھماتا رہا اور دن کے ایک بجے کے قریب گھنٹہ گھر پہونچا کر کرایہ وصول کیا اور خوشی خوشی اپنے گھر چلا آیا۔

چپراسی:— آج صبح ڈپٹی صاحب سے اُن کے بنگلہ پر ملنے کے لئے ایک صاحب آئے اور کہنے لگے کہ ڈپٹی صاحب سے مجھے ایک ضروری کام کے لئے ملنا ہے، میں نے جواب دیا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے پھر کسی دن تشریف لائیے، اُس پر اُس نے پانچ روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ ڈپٹی صاحب کو جیسے بنے اطلاع کر دو، مجھے معلوم تھا کہ صاحب اس وقت قرآن شریف پڑھ رہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد میں نے اطلاع کی اور ڈپٹی صاحب نے کھٹ سے اُس آدمی کو بلا لیا۔

ایک شخص:—— (دوسرے آدمی سے بہت آہستہ بار بار در و دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے) دوست! یار خاں کا ہاتھ کبھی اوچھا اور ڈھیلا نہیں پڑتا، دو آدمیوں کی نمائش میں آج جیب کاٹی ہے میں نے! اور یہ دیکھو (اپنی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو نوٹوں کے سبب اُبھری ہوئی تھی)

ایک جوان آدمی:—— خدا کی قسم اپنی آنکھوں کو مبارکباد دے رہا ہوں اتنی حسین صورت دیکھی ہے آج میں نے! جوانی، خوبصورتی، بچپن، سر سے پیر تک قیامت ہی قیامت! اور اُس کی عمر پندرہ سولہ کے لگ بھگ! میں نے اُس کا پیچھا کیا، دو میل پیدل چلنا پڑا! تب کہیں جاکر اُس کا ٹھکانا ملا، میں نے سب کچھ پتا لگا لیا ہے، زیادہ نہیں چالیس پچاس روپیہ کا خرچ ہوگا اور پھر (چٹکی بجاتے ہوئے) تم یوں بات کرتے اور چٹکی بجاتے بر آئے گی، میرا نام ہے عاشق یار خاں! عشق تو بندے کی گھٹی میں پڑا ہے۔

غریبوں اور پریشان روزگاروں کے اس خرابات سے تھوڑی دور پر کلب گھر تھا —— جی ہاں! کلب گھر! امیروں کی عیش گاہ، سرمایہ داروں کی جنت نظارہ اور فردوسِ تفریح! ریشمین صوفے، ایرانی قالین، دیدہ زیب گلدان، قیمتی لباس، بس یوں سمجھو کہ ایک رات کے لئے آسمان سے جنت زمین پر اُتر آئی تھی، قمقموں کی برق سامانی کا یہ عالم کہ رات میں دن نکل رہا تھا۔

شراب کے بلوریں جاموں سے لیکر لب و رخسار کی سُرخی تک ہر نعمت اور لذت یہاں مہیا اور میسر تھی —— ان میں وہ تاجر بھی تھے جو دھوکا دے کر اور شاطرانہ چال چل کر اپنی تجارت کو ترقی دیتے ہیں، ایسے عہدیدار بھی تھے جن کی عیش کوشیاں "دستِ غیب" کی رہین منت ہیں، یہاں "قمار باز" بھی تھے مگر آپ اس نام سے انھیں پکار نہیں سکتے، یہ تہذیب حاضر کی شیشہ بازی یا یوں کہیے کہ کرامت ہے کہ

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں!

ان میں مہذب ڈاکو بھی تھے لیکن آپ کو ایسے توہین آمیز الفاظ نکالنے کا حق نہیں ہے، صرف دیکھتے رہیئے اور بس خاموش ہو جائیے۔

کلب گھر کی بزم عیش شباب پر تھی کہ کپڑے کی ایک دوکان سے شور اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے ہوا سے باتیں کرنے لگے، آگ پھیلتی جا رہی تھی، ہوائیں آج بہت تند و تیز چل رہی تھیں آگ کے شعلوں کو خوب خوب "لفٹ" مل رہی تھی، اندیشہ تھا کہ یہ آگ اگر پھیل گئی تو سارا محلہ، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔

کلب گھر کی جمی ہوئی محفلِ نشاط درہم برہم ہوگئی، شعلوں کی لپٹ دور دور تک محسوس کی جا رہی تھی، دیسی شراب خانہ کا جھگٹا بھی تتر بتر ہوگیا، کلب گھر اور شراب خانہ سے لوگ لڑکھڑاتے ہوئے نکلے ـــــ عیش و تفریح کی زندگی یوں بھی بہت تھوڑی ہوتی ہے، اور آج تو آتش زدگی کے اس حادثہ نے دیسی شراب خانے اور کلب گھر کی صحبتوں کو بہت پہلے برہم کر دیا، لذتوں کے ادھورے اور تفریح کے ناتمام رہ جانے پر بہت سے رنگین مزاج اور بے فکرے جی ہی جی میں آگ کے شعلوں پر غصہ کر رہے تھے بلکہ ملّاحیاں سنا رہے تھے۔

کلب گھر سے ایک میانہ قد کا آدمی جس کی کرنجی آنکھوں پر سفید عینک لگی تھی، موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوا اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی شراب کا نشہ اور امارت کا نشہ ـــــ دو دو نشے اس پر سوار تھے، دیسی شراب خانے سے بھی ایک شرابی نکل کر بڑی سڑک پر جا رہا تھا، میلا کرتا، پھٹی ہوئی دھوتی مگر سر کی ٹوپی بہت صاف تھی، اس کے پاؤں بہکے بہکے پڑ رہے تھے ہر قدم پر اُسے سہارے کی ضرورت تھی، ڈاک خانہ کے پاس موڑ پر راستہ کم چوڑا تھا اور سڑک کشادہ بھی ہوتی تو شرابی موٹر چلانے والے راستہ کی کشادگی اور تنگی کی پروا نہیں کیا کرتے انجن کے کھینے کے قریب موٹر کی شرابی سے ٹکر ہوئی "غریب شرابی چکرا کر زمین پر گر پڑا اس کے سر سے خون بہ رہا تھا اور کلب گھر کا رسیا اپنی موٹر کار کے کل پرزوں میں اُلجھا ہوا زخمی پڑا تھا ـــــ پھٹی دھوتی اور شفاف پتلون دونوں خون میں شرابور تھے۔

ـــــ امیری اور غریبی کا خوفناک تصادم ـــــ ایک آواز

نہیں یہ نہ کہو

"گناہ، گناہ سے ٹکرا گیا"

دوسری آواز آئی ـــــ اور کپڑے کی دوکان میں ابھی تک آگ لگ رہی تھی۔ (ختم)

تصادم کے بعد

زندگی میں قدم قدم پر تصادم کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کہیں گناہ کی گناہ سے ٹکر ہوتی ہے اور کسی جگہ بُرائی بھلائی سے ٹکراتی ہے، تصادم بہر حال ناگزیر ہے، زندگی کے ہر موڑ پر کچھ پیچ و خم آتے ہیں، احتیاط کے باوجود کسی نہ کسی راہگیر سے الجھنا ہی پڑتا ہے کوئی دامن بچا کر بھاگنا بھی چاہے تو اسے صحیح سلامت جانے کون دیتا ہے

زندگی کا لطف ہی "ستیز" اور "آویزش" میں ہے۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں

وہ آشیانہ نہ ہو جس کی گھات میں صیاد

سکون، غفلت اور جمود دل و نظر کی موت ہے، منزلِ حیات میں جو دم لینے کیلئے ٹھہر گیا قافلے سے دور ہو گیا نہ جانے کب تک اس کا سامعہ جرسِ کارواں کی آواز سے محروم رہے گا ـــ بہت سے لوگ "تصادم" کو اتفاقی حادثہ سمجھ کر گزر جاتے ہیں ان کے اندر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ـــ مگر فطرت شناس روحیں ہر ٹھوکر اور تصادم سے عبرت حاصل کرتی ہیں حیوان اور انسان کی زندگیوں میں بہت زیادہ مابہ الامتیاز "خصوصیت" یہی عبرت انگیزی ہے ـــ تاریخ ہمیں بتاتی ہے بلکہ ہمارے شانے ہلا ہلا کر کہتی ہے کہ "عبرت" نے جب چشمِ بصیرت کو وا کیا ہے تو بہت سی زندگیاں یکسر بدل گئی ہیں قاتل اور سفاک انتہائی خدا ترس اور چور، ڈاکو کمال درجہ کے راست باز بن گئے ـــ آپ بیتی کو جگ بیتی اگر ان کو پڑھ کر آپ نے سبق حاصل نہیں کیا تو آپ کی یہ بےحسی سوسائٹی پر بہت بڑا ظلم ہے ـــ کیا آپ "ظلم" کی نسبت اپنے ساتھ پسند کریں گے

اسے کیا کہیے گا

سرقہ، اخذ، ترقی، ترجمانی یا پھر شوخیٔ فکر کی معصوم نادانیاں
— جناب سید علی اکبر قاصد نے کئی چہروں کو بےنقاب کر دیا اور
"ضدی" کی مصنفہ[1] کے EXPOSE ہوجانے پر تو ہمیں خود ترس آتا ہے —
بیچاری "ترقی پسندوں" کی محبوب ناول نگار!

پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

یہ ہمیشہ بازارِ ادب بھی بلا کے ذہین اور آرٹسٹ ہیں "متاعِ غیر" کو اس طرح اڑاتے ہیں کہ لوگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی مگر علی اکبر قاصد جیسے دوچار نظرباز اور پیدا ہوگئے تو نہ جانے کس کس کی حقیقت مجاز ہو کر رہ جائے گی۔

اُردو میں ناول کی ویسے ہی کمی ہے۔ فنی اور معیاری لحاظ سے ہمارے یہاں اچھے ناولوں کا تو تقریباً فقدان ہے۔ شکر ہے کہ اس کمی کو شدت سے محسوس کیا جا چکا ہے اور کمی کو پوری کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ اس طرف چند سالوں کے عرصہ میں کئی ناول لکھے گئے مگر ان میں سے کسی میں بھی ناول کے ہمہ گیر صفات کا وجود نہیں بعض کتابیں کام کی سامنے ضرور آئیں مگر چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ وہ تخلیق نہ تھیں بلکہ ترجمہ، ماخوذ یا اس سے بھی بڑھ کر تھیں۔ امتیاز علی تاج نے ڈرامہ کے بعد ہلکے پھلکے مضامین اور انشائیے پر توجہ کی۔ "چچا چھکن" کچھ دنوں ہندوستان کے رسالوں کی زینت رہے۔ مگر یہ کارنامہ تاج کا تھا۔ بلکہ انگریزی کے مشہور مصنف جےکے جےروم کا مکمل چربہ تھا۔ آخر جب ان مضامین کا مجموعہ شائع ہونے لگا تو تاج صاحب نے مناسب سمجھا کہ دبی زبان سے کہیں "اصل مصنف" کا تذکرہ کر دینا خالی از مصلحت نہیں ہوگا۔

اسی دوران میں قاضی عبدالغفار کی "معرکۃ الآرا" تصانیف شائع ہوئیں۔ "لیلیٰ کے خطوط"، "مجنوں کی ڈائری" "اس نے کہا" نے قبولیت عام پائی۔ اس میں شک نہیں کہ "لیلیٰ کے خطوط" ان کتابوں میں سب سے اچھی کتاب تھی۔ الکزنڈر کو پرین محتاج تعارف نہیں "لیلیٰ کے خطوط" کی تازگی کوپرین کے گل تر سے لی گئی ہے، قاضی صاحب نے اپنے ناظرین کو اس راز سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے پوشیدہ ہی رہنے دیا۔ دوسری کتاب "مجنوں کی ڈائری" شائع ہوئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ایک طرف کوپرین، دوسری طرف قاضی صاحب کا اپنا رنگ نمایاں ہوگیا۔ "اس نے کہا" کی اشاعت نے قاضی صاحب کے ترجمہ کرنے اور اخذ کرنے یا اپنانے کی حسین صلاحیت کا شاندار ثبوت فراہم کیا۔ یہ کتاب بھی مشہور مصری مصنف "خلیل جبران" کی مرہونِ منت تھی جس سے قاضی صاحب "استفادہ" کر چکے ہیں اور جس کے بقول خود "خوشہ چینی" کر لیا

---

[1] مؤلفہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔

غرض اس طرح کی "رہون منت" کتابیں کئی نکل گئیں۔ یہ سلسلہ ختم نہ ہوا بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہمیں اس طرح کی چیزیں دستیاب ہوتی رہیں۔ اس سلسلہ کی تازہ کڑی عصمت چغتائی کا ناولٹ "ضدی" ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں "اجرہ" نامی ناول انگریزی میں ایک ترکی عورت نے لکھا تھا۔ مصنفہ کا اصل نام معلوم نہیں۔ فرضی نام "عدالت خانم" ہے۔ یہ ناول بہت پسند کیا گیا اور اکثر زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں کلکتہ میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے صدر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں تعلیم نسواں پر بحث کرتے ہوئے اجرہ کی بہت تعریفیں کیں اور ہر نوجوان شخص کو اس کے پڑھنے کی ہدایت کی۔ اس تعریف کا نتیجہ خاطر خواہ ثابت ہوا۔ "اجرہ" انگریزی سے براہ راست اردو میں ترجمہ کی گئی اور ۱۸۹۹ء میں بمطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی۔ آج ۴۳ برس کے بعد وہی کتاب بشکل "ضدی" آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "اجرہ" طربیہ ہے اور ضدی المیہ۔ ضدی میں اجرہ کے ترکی نام ہندوستانی ناموں سے بدل دئے گئے ہیں اور ماحول کو ہندوستانی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'ضدی' اجرہ کی وہ صورت ہے جس کی صرف شکل بگاڑ دی گئی ہو۔ جسم وہی ہے روح وہی ہے حتی کہ زیادہ تر زبان اور جملے تک وہی ہیں۔

"اجرہ" بہت حد تک ڈکنس کے ناولوں کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ پلاٹ سلجھا ہوا، سیرت نگاری صاف و صریح اور کردار اپنی جگہ ٹھوس اور اٹل ہیں۔ ناول میں عضویاتی ارتقا تمام موجود ہے ناول نگار اپنے مقصد کی روشنی میں آگے بڑھتا ہے وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر معاشرتی کی خامکاریوں پر اور انسانی جذبات پر مسلسل روشنی ڈالتا رہتا ہے۔ قصہ بہت ہی سکون سے آگے بڑھتا ہے اور عروج کے بعد تقابل عروج بھی بہت سہولت سے نمایاں ہوتا ہے۔ قصے کا تعلق ترکی کے بادشاہوں کے اعلیٰ خاندان سے ہے جو مقرب بارگاہ سلطانی ہے۔ ضدی میں بھی بالکل یہی چیز ہے۔ یہاں "پاشا" کے بدلے راجہ کا وجود کافی سمجھا گیا ہے۔

تقسیم کردار، اجرہ اور ضدی میں ایک ہی ہے۔ "اجرہ" میں "نصر اللہ پاشا" ہیں تو 'ضدی' میں راجہ صاحب اسی طرح خانم آفندی کے لئے 'ماتاجی'، ادہم بے کے لئے 'اودے'، ولیہ خانم کے لئے بھابھی، نافذ بے کے لیے پورن، صبیحہ خانم کے لئے کملا، بداروہ کے لئے چمکی اور اجرہ کے لیے "آشا" موجود ہیں۔ اس ترکی ناول میں قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اجرہ کی نانی پاشا خاندان کی آیا تھی، وہ مرنے لگی تو اس نے اپنی نواسی کو پاشا خاندان کے سپرد کیا۔ جب موت سے کچھ قبل نافذ بے (نصر اللہ پاشا کا لڑکا) جو باہر سے آئے تھے۔ اپنی آیا سے ملنے گئے تھے اور اس طرح اجرہ پاشا گھرانے میں آ گئی۔ ٹھیک یہی واقعہ 'ضدی' میں دہرایا گیا ہے۔ آشا کی نانی مرض موت میں مبتلا ہے پورن (راجہ کا چھوٹا لڑکا) اپنی آیا سے ملنے پہنچتا ہے۔ نانی مر جاتی ہے۔ نواسی راجہ صاحب کے یہاں آ جاتی ہے۔

مرض موت میں گرفتار آیا کو نافذ بے تسکین دیتے ہیں "ابھی تو تمہاری اتنی عمر ہوگی کہ میرے بچوں کو بھی کھلاؤ گی" ص ۳۔ "ضدی" میں پورن کہتا ہے "کیسی باتیں کرتی ہو اور تم تو کہتی تھیں کہ پورن کی بہو لاؤں گی، اس کا بچہ کھلاؤں گی" ص ۹۔

اجرہ پاشا کے یہاں آ گئی ہے۔ نافذ بے کی توجہ روز بروز اجرہ کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات بداروہ کو بہت ناگوار گذرتی ہے جو نافذ بے کی پہلے منظور نظر تھی۔ اب ضدی میں دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یہاں بھی بالکل وہی قصہ ہے۔ پورن کی توجہ آشا پر چمکی کو بہت ناگوار ہوتی ہے جو پورن کی پہلے مرکز نظر تھی۔ دیکھئے حسد بھی کیا چیز ہے۔ بداروہ غصہ اور جلن میں استری اجرہ کی طرف پھینکتی ہے جس سے اس کا سر بال بال بچ جاتا ہے (صفحہ ۳۵) ٹھیک یہی واقعہ ضدی میں بھی رونما ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ "اجرہ" میں استری تھی اور "ضدی" میں عصمت صاحبہ نے قینچی جیسے نازک ہتھیار کو پسند کیا۔ چمکی آشا کی طرف قینچی اس زور سے پھینکتی ہے کہ بال بال بچتی ہے (صفحہ ۲۳) نافذ پوچھتے ہیں "لگی تو نہیں" (صفحہ ۳۶) پورن پوچھتا ہے۔ "آشا تمہارے قینچی لگی تو نہیں" (صفحہ ۲۳)

اور کہانی اسی طرح آگے بڑھتی جاتی ہے۔ گھر میں سب جمع ہیں۔ نانذ بے ہیں، ادہم بے دلیہ خانم اور ان کا چھوٹا بچہ، ور باجرہ، غرض سبھی ہیں۔ یوسف نانذ بے کی گھڑی توڑ دیتا ہے ص ۱۱ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک یہی واقعہ "ضدی" میں بھی رونما ہوتا ہے۔ شنا پورن کا قلم توڑ دیتا ہے اور صحن میں سب جمع ہیں۔ وہ سارے کردار جو "باجرہ" میں جمع تھے یہاں بھی شاید تو اردو موجود ہیں ص ۳۹

اب آگے چلیے۔ شادی کی تقریب ہے۔ نانذ کا بیاہ عطیہ کے ساتھ ہو رہا ہے ایک حادثہ پیش آتا ہے۔ چھت گرتی ہے اور آگ لگ جاتی ہے۔ نانذ بے عطیہ کو گود میں لے کر بچانے کی غرض سے بھاگتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ باجرہ اندر ہی ہیں۔ جان جوکھوں میں ڈال کر باجرہ کو آگ کے سمندر سے باہر نکال لاتے ہیں (ص ۲۹) "ضدی" کی دنیا میں بھی یہی حادثہ (غالباً حادثتاً) پیش آتا ہے۔ پورن کی شادی کملا کی نند شانتا سے ہو رہی ہے کہ آگ لگ جاتی ہے۔ پورن شانتا کو لے کر بھاگتا ہے مگر وہ آشا کو وہاں دیکھ لیتا ہے۔ آشا کو گود میں لے کر شعلوں میں گھستا ہوا باہر آجاتا ہے (ص ۳۳)

کہانی کے اختتام میں فرق ہے۔ ایک طربیہ کو زبردستی المیہ بنا دیا گیا ہے۔ اور وہی پرانا پامال رنگ خاتمہ پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ ہم ٹریجک اختتام میں (جو ان کا اپنا اضافہ ہے) وہ دقیانوسیت سے الگ نہیں رہ سکیں۔ اختتام کے ردوبدل سے کتابیں تیار ہو جایا کرتی ہیں۔ طربیہ کو المیہ بنا دینے سے آدمی مصنف ہو جایا کرتا ہے۔ کسی غیر ملکی مصنف کی کتاب کو کسی کی "سرگذشت" کا رنگ دے کر درنیاز ادا کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سب کیوں۔ آخر کیوں؟ تعجب تو یہ ہے گناہ ان لوگوں سے سرزد ہوتا ہے جو خود بھی تخلیق کر سکتے ہیں۔ جو خلاق معمار اور آرٹسٹ ہیں۔ اور چغتائی صاحبہ نے تو "ضدی" میں کسی اچھی فنکاری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ نام ہی کو لے لیجئے۔ "ضدی" ایک محض بے جوڑ سا نام ہے مگر انھوں نے پوری ضد کے ساتھ اس نام کو نباہنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ آخر میں لکھتی ہیں "وہ اگر بگاڑ نہ دیا گیا ہوتا تو اتنی ضد اس اس میں کہاں سے آتی؟ ص ۲۱۳ پھر لکھتی ہیں "ضدی جڑیں وہی رہ گئیں" ص ۱۱ ۔ اور اس طرح وہ لفظ ضدی کا بار بار استعمال کر کے ناولٹ کے اس نام کو خواہ مخواہ ہی دماغ میں جمانا چاہتی ہیں۔ حالانکہ درحقیقت قصہ کو ضد سے کوئی لگاؤ نہیں۔ کہانی میں سماج پر تنقید ملتی ہے۔ محبت ایک ازلی شئے ہے مگر باجرہ نانذ کی یا آشا پورن کی اس لئے نہ ہو سکی کہ وہ عالی خاندان نہ تھی، امیر نہ تھی۔ اس کے پاس امارت نہ تھی تو صرف حسن اور سیرت کی جس کی ہمارے سماج میں کوئی قدر نہیں۔ پورن اور آشا کی موت سے سماج کے ظلم کا پتہ چلتا ہے۔ ہماری سوسائٹی کی لعنت نمایاں ہوتی ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ دونوں ہمارے ماحول یا سماج کے درآستاں پر بھینٹ چڑھے۔ ضد سے یہاں کیا واسطہ؟ کیا پورن ضدی تھا؟ اور اس ضد کی وجہ سے وہ اس انجام کو پہونچا؟ اگر وہ ضدی تھا جیسا کہ عصمت صاحبہ لکھتی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ محبت کوئی چیز نہیں اور یہ انجام صرف ضد کا نتیجہ تھا۔ اور اگر یہ ضد کا نتیجہ تھا تو پھر محبت کا یہ سارا کھیل کیوں؟

معاصر، بانکی پور پٹنہ،
اکتوبر ۴۳ء

رُوحِ اِنتخاب

اچھی باتیں اس کی مستحق ہیں کہ اُنھیں بار بار دُہرایا جائے سچائی کی آواز مسلسل بازگشت چاہتی ہے بھلائی سمٹنے کے لئے نہیں پھیلنے کے لئے دنیا میں آئی ہے نیکی کبھی نہ دبنے والا جوہر ہے جسے زبان اور عمل دونوں کے سہارے اُبھرتے رہنا چاہیئے صداقت ہرآن اظہار اور اعلان کا مُطالبہ کرتی ہے، سچائی کا فرض پھولوں کی سیج پر نہیں تلواروں کی دھاروں پہ ادا ہوتا ہے ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اُس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اسی "داستانِ حرم" کی ابتدا اور انتہا کے درمیان حق کی آواز بلند ہوتی ہے۔ جو کان سچی باتیں سُن کر چبھن محسوس کریں اُن کو بہرا ہوجانا چاہیئے اور جو زبان کلمۂ حق کہنے سے گریز کرے اُس کا گنگ ہوجانا اچھا —— ایک دل میں دو دو خوف نہیں سما سکتے یعنی خدا کا خوف بھی ہو اور بندوں کا ڈر بھی! شریف اور خود دار فطرت اس شرک کو گوارا نہیں کرسکتی۔

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الّا اللہ

زمامِ کار

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہوگی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے؟ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار کی باگیں جن کے ہاتھ میں ہوں۔ عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل، اور اخلاقی قدروں کی تعین جن کے اختیار میں ہو ان کی رہنمائی و فرمانروائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں، یہ بنا

و فرمانروا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا۔ بُرے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے بھلائیوں کو نشو و نما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا خیالات اور نظریات علوم و آداب سیاست و معیشت تہذیب و معاشرت اخلاق و معاملات عدل و قانون سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشو و نما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے۔ اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو اس طرف چلنے کے لئے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن اگر اس کی مخالف سمت میں کوئی چلنا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے دھکیل دیتا ہے اسی طرح اجتماعی نظام بھی، جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر و فسق کی راہوں پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لئے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انھیں بطور خود اس پر چلنے کے لیے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم و جان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں، اور اجتماعی زور ان کی مزاحمت کے باوجود انھیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹالے جاتی ہے۔ یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت ہو بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدۂ بینا انکار نہیں کرسکتا۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات و نظریات بدلے ہیں مذاق اور مزاج بدلے ہیں۔ سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے ہیں۔ تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیمانے بدلے ہیں۔ زندگی کے طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے ہیں۔ اور کونسی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اسی سرزمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ آپ اس کی وجہ کو اس کے سوا کچھ اور بتلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی اور رہنمائی و فرمانروائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا انھوں نے پورے ملک کے اخلاق۔ اذہان۔ نفسیات۔ معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو ان کی اپنی پسند کے مطابق تھا پھر جن طاقتوں نے اس تغیر کی مزاحمت کی ذرا ناپ کر دیکھیے کہ انھیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج ان کی اولاد وقت کی رو میں بہی چلی جا رہی ہے اور ان کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اُٹھ رہے ہیں جنھیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کن مسئلہ زمام کار کا مسئلہ ہے اور یہ اہمیت اس مسئلہ نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہی اہمیت رہی ہے "الناس علیٰ دین ملوکھم" بہت پرانا مقولہ ہے اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار ان کے علماء اور اُمرا کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ لیڈرشپ اور زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

(۱۹۴۵ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا)

اسلامی نظام کی خصوصیت

اسلامی نظام کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ کی ہر تحریک سے تھوڑی یا بہت مماثلت ضرور ملتی ہے مثلاً اسلام میں بہت سی چیزیں جمہوریت سے مشابہ ہیں اسلامی اخوت اور مساوات میں انتہائی جمہوری شان پائی جاتی ہے۔ اسلامی نظام حکومت اس معنی کر کے جمہوری ہے کہ اس کا صدر یعنی خلیفہ اپنی جماعت کا منتخب کردہ ہوتا ہے۔ جمہوریت

کی طرح اسلام نے بھی ہر شخص کو خلیفہ اور اس کے انتظام پر آزادانہ تنقید کا حق دیا ہے۔ اسی طرح اسلام کے بعض اصول اشتراکی تحریک سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے اشتراکیت کا ہم نوا ہے کہ دولت کے کھنچاؤ کو روکتا ہے۔ اور اُسے پھیلانا چاہتا ہے۔ اسی غرض سے اس نے زکوٰۃ فرض کی ہے۔ سود کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اپنے قوانین وراثت میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ دولت جہاں تک ممکن ہو ایک وسیع حلقہ میں تقسیم ہو۔ ایک نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام میں کسی حد تک آمریت کی شان بھی جلوہ گر ہے۔ اسلامی نظام کی حکومت میں خلیفہ اپنی مجلس شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں ہے۔ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ ضروری سمجھے تو مجلس کی اکثریت رائے کے خلاف بھی عمل کر سکتا ہے۔ اور یہ حق کسی مسلمان کو نہیں پہنچتا کہ وہ خلیفہ کے کسی جائز حکم سے محض اس لئے سرتابی کرے کہ یہ حکم مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کے مطابق نہیں ہے اس طرح تمدنی اور معاشرتی امور میں مسلمان قرآن و حدیث کے فیصلوں کا پابند ہے۔ جو بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے اس پر مسلمان کو آزادانہ غور و فکر کی اجازت نہیں ہے وہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن و حدیث کا یہ حکم غلط ہے البتہ اس حکم کی مصلحت پر ضرور غور کر سکتا ہے، آمری نظام کی طرح اسلام میں بھی عوام الناس کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ تمدنی معاشرتی امور و مسائل میں اکثریت کے فیصلہ پر چلیں اور اُن میں بطور خود جو رائے چاہیں قائم کریں۔

جمہوری نظام کے برخلاف اسلام نے انسانی فکر کو مطلقاً آزاد نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ اس کے لئے راہیں مقرر کر دی ہیں جن سے الگ ہو کر سوچنا اور فکر کرنا اسلام سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے اس کا یہ پہلو آمریت سے اچھا خاصہ مشابہ معلوم ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کی یہی خصوصیت ہے جس کے باعث مرعوب ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں نے ہر زمانہ میں اس کو عصری تحریکات کی قبا پہنانے کی کوشش کی اور کس حد تک کامیاب بھی رہے اُن کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ خود نظام متضاد عناصر کی وحدت و ترکیب پر قائم ہے جس کی وجہ سے دنیا کی ہر بڑی تحریک سے اس کی مشابہت کا ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہیگل جس چیز کو اضداد کا امتزاج کہتا ہے اسلام اس کا مکمل ترین نمونہ ہے تمام اعلیٰ قسمیں اس کے اندر موجود ہیں۔ سارے اضداد اس کی وحدت میں سموئے ہوئے ہیں جلد حقیقتیں اس کی وسیع آغوش میں جمع ہیں۔ اس لئے جب کوئی طاقتور تحریک نمودار ہوتی ہے تو اسلام سے اس کی مشابہت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکل آتا ہے۔ کیونکہ اُس نے تو پہلے ہی سے ہر ممکن تحریک کے صحیح عناصر اپنے اندر جمع کر رکھے ہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ اگرچہ اسلام ان سب تحریکوں سے تھوڑی بہت مماثلت ضرور رکھتا ہے لیکن وہ خود ان سب سے الگ اور مختلف ہے بلکہ ایک معنی کر کے ان سب کی ضد ہے کیونکہ اوّلاً تو ہر تحریک انسانی فطرت کے ایک پہلو کا اثبات کرتی ہے اور باقی تمام پہلوؤں کی نفی کر دیتی ہے۔ پھر وہ اثبات میں بھی اس قدر غلو سے کام لیتی ہے کہ خود اس پہلو کی نفی ہونے لگتی ہے جس کا اثبات کرنے کے لئے وہ تحریک اٹھی تھی ان میں سے ہر تحریک کا یہی حال ہے کہ وہ فطرت کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کر دیتی ہے حتیٰ کہ فکر انسانی پر وہ پہلو اس طرح چھا جاتا ہے کہ دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جمہوریت کو لیجیے کہ اس نے آزادی کے اصول کو اتنا اُبھارا کہ اصول انتشار (　　　) بالکل مٹ گیا افرادیت کا دور دورہ تھا ہر شخص اپنا الگ معیار فکر قائم کرنے لگا۔ ہر کہ ومہ اپنے لئے خود سند بن گیا تمدنی زندگی کے بنیادی اصول تک خود رائی کے شکار ہو گئے۔ اس غلو نے آمریت کا دوسرا غلبہ پیدا کیا جس نے اصول استناد کو اچھالا اور فکری اجتہاد کا دروازہ یک قلم بند کر دیا اشتراکیت نے بے قید سرمایہ داری کے مظالم پر احتجاج کیا تو شخصی ملکیت ہی کو سرے سے حرام قرار دے دیا غرض کہ سابق ادوار اور موجودہ زمانہ کی ہر بڑی تحریک کا یہی خاصہ رہا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظام میں فطرت کے کسی پہلو سے بھی اعراض نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ہر پہلو کو مناسب اہمیت دی گئی ہے۔ اور کسی تصور کو اس مقام سے آگے بڑھنے نہیں دیا ہے۔ جہاں سے اس کی نفی شروع ہو جائے۔ پھر یہ نظام مکمل وحدت یا کلیت ہے جس کا کوئی جز دوسرے جز سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس سے علیحدہ ہو کر کوئی جز اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ہر چیز کی قیمت

اور ہر پہلو کی صداقت اسی وقت تک قائم ہے، جب تک مجموعی کیفیت سے اس کا رشتہ استوار ہے۔ فرداً فرداً جز بھی صداقت و عملی حیثیت
اس لئے اسلامی نظام میں باہر سے کسی چیز کا پیوند نہیں لگایا جاسکتا جو لوگ اسلام کا ڈانڈا اشتراکیت جمہوریت یا آمریت یا کسی اور تجربے
سے ملانا چاہتے ہیں ان کی سب سے بڑی کوتاہ فہمی اور کم نظری یہ ہے کہ وہ اس کے اجزا کو کل سے علیحدہ کرکے دیکھنا چاہتے ہیں، درحقیقت
نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلامی نظام ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کا ہر جزو دوسرے اجزاء سے مربوط اور ہر پہلو دوسرے سے پیوستہ
ہے۔ جہاں یہ ربط و ہم آہنگی ختم ہوئی، ہر جزو بجائے خود بے قیمت ہوگیا، اسلامی جمہوریت اسی وقت تک اصل معنوں میں اسلامی جمہوریت
ہے، جب تک اس میں حریت کے صحیح عناصر موجود ہیں۔ اسلام کی اجتماعیت اپنا حسن عمل اسی وقت تک قائم رکھ سکتی ہے جب تک اس
حریت کے عناصر اس کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہوں اور ان میں سے کوئی جزو بھی اپنی اصلیت برقرار نہیں رکھ سکتا، جب تک اس کا رشتہ
اس وحدت کاملہ سے استوار نہ ہو۔

(از جناب مظہر الدین صدیقی)

مکہ کی لغوی اور تاریخی تحقیق

مکہ قدیم بابلی زبان کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے معنی گھر کے ہیں، اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی
جب بابل و کلدان کے قبیلے یہاں حکومت کرتے تھے، اور یہ اس کی ابتدائی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ اس شہر کی آبادی بھی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر
دلیل ہے۔ مکہ کا نام حضرت داؤد کی زبور میں سب سے پہلے ملتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے، یہاں یہ لحاظ
رہے کہ قدیم سامی زبان میں "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام "بعلبک" ہے
یعنی "بعل کا شہر" (بعل ایک دیوتا کا نام ہے) یہ مکہ کی آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت
یہی قرآن پاک میں آیا ہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ (آل عمران)　　پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکہ میں ہے۔

کعبہ کے لغوی معنی چوکھونٹے کے ہیں چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لئے کعبہ کے نام سے مشہور ہوا۔
یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰ سے ایک صدی پہلے گزرا ہے وہ
عرب کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"ثمودیوں اور سباء دین کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں"

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور یہاں
کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں خانہ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے۔ پروکوپیس مورخ
لکھتا ہے کہ سنہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیساریس نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے عذر
کیا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہوسکتے، کیونکہ اگر وہ چلے جائیں گے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کردے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا۔

"تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہیں
اور اس زمانے میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے ــــ ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسمٰعیل ہمیشہ سے اپنے مورث
اعلیٰ کو مانتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت

ہماری نظر میں

انقلاب نمبر، شاہکار لاہور

کتابی سائز، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت درج نہیں، ایڈیٹر: محمد آصف۔

جناب محمد آصف صاحب نے انقلاب نمبر بہت سلیقہ اور کاوش سے مرتب کیا ہے۔ خود ان کا مضمون "انسان اور انقلاب" پُر از معلومات ہے جسے اس نمبر کا دیباچہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں ایک ترکیب "سماجی اینٹھن" بُری طرح کھٹکتی ہے۔

یوسف ظفر کی نظم "آئینہ" کا ایک ٹکڑا ہے:-

؎ لرزتے ہوئے دل سکوں چاہتے ہیں، خدا ہے جو سنتا نہیں بیکسوں کی۔

خدا اور مذہب پر طنز کرنا "ترقی و انقلاب" کے مارے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کا مسلک بن گیا ہے، اپنی اس ذہنی پستی اور فکر و نظر کے دیوالیہ پن کا اظہار کر کے وہ سمجھتے ہیں کہ گویا انھوں نے بہت بڑا تیر مار دیا ——— اگر اسی کا نام انقلابی ادب ہے اور یہی ترقی پسندی ہے تو پھر انسانیت کی زبان سے اس انقلاب کے لئے "مردہ باد" کی چیخ نکل رہی ہے۔

سید قاسم نجیبی کا مقالہ "بالشویک انقلاب کدھر؟" لوئی فشر کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ خود روس میں حصولِ اقتدار کی وہی دست درازیاں پائی جاتی ہیں جن کے لئے انگلستان اور امریکہ بدنام ہیں۔ اسٹالن اور اس کی جماعت ہی ملک کے سیاہ و سپید کی مالک ہے اور شخصی زندگی جیسے "بیکراں" ہونا چاہئے تھا، اس کی بے رنگی کا یہ عالم ہے کہ روس کے عوام ریڈیو پر دوسرے ملکوں کی خبریں تک نہیں سن سکتے۔

اظہر امرتسری کا مضمون "ادریسیہ" ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے ——— پیرا کشن کی تاریخ انقلاب کا خلاصہ ہے ——— "ایٹم بم اور انقلاب" بھی کارآمد مضمون ہے، افسانے بھی خاصے دلچسپ ہیں لیکن نظمیں اور افسانے سیاسی اور تنقیدی مضامین کی برابری نہیں کرتے، عبادت بریلوی نے چند لفظ جوڑ دیئے ہیں جس کا عنوان "حسرت" ہے۔ یہ نظم کیا ہے شاعری کے ساتھ مذاق ہے، اس قسم کی نظمیں، اردو شاعری کی نغمگی، آہنگ اور سنجیدگی کو چیلنج دیتی ہیں ——— کاش ہمارا ادیب طبقہ حریت و انقلاب کے ان افسوسناک عواقب کو سوچ سکتا ——— مجموعی طور پر شاہکار کا انقلاب نمبر کامیاب ہے، اس کے پڑھنے سے یقیناً معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور اس زمانہ میں جب کہ دنیا تفریحی لٹریچر کی خوگر ہوتی چلی جا رہی ہے، ٹھوس، سنجیدہ اور علمی مضامین کا قرینہ کے ساتھ یکجا کر دینا زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت ہے۔

چراغ راہ

ماہنامہ چراغِ راہ، مالک و مسئول: غلام محمد، مرتب: نعیم صدیقی، چندہ سالانہ پانچ روپیہ، مقامِ اشاعت: ڈنیا بلڈنگ، رام باغ روڈ، کراچی نمبر ۱۔

یہ ماہنامہ اپنے نام کی مناسبت سے واقعی "چراغِ راہ" ہے، اس کے مقالے بلند پایہ ہی نہیں یقین افروز بھی ہوتے ہیں، اس کے افسانوں کی دلچسپی فکر و نظر کو سلامتی کی راہ دکھاتی ہے اور تنقیدیں دانش و آگہی کی شمعیں روشن کرتی ہیں، اسلامی مسائل سنجیدہ دلائل کی روشنی میں سے

عقلی لذائذ پیش کئے جاتے ہیں، نظم کا حصہ نثر کے مقابلہ میں نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

فروری سنہ ۴۹ء کے شمارے میں "باب استفسارات" کے تحت فاضل مرتب نے "لذیذ سادگی" پر پورے چار صفحے رقم فرمائے ہیں، بحث یہ تھی کہ "سادگی کو لذیذ کہنا ٹھیک نہیں" اشلاً ہم تو کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے شعروں میں مٹھاس پائی جاتی ہے مگر یوں نہیں کہیں گے کہ غالب کا فلاں شعر میٹھا ہے، اس کے لئے کوئی خاص قاعدہ زبان و قواعد میں مرتب نہیں ہے یہ صرف وجدان کا معاملہ ہے، صحت وجدان الفاظوں کے پرکھ کی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔

خود ادب میں ہم ترقی و اجتہاد کے منکر نہیں ہیں لیکن اجتہاد میں خود ایک خاص حسنِ تناسب پایا جاتا ہے اور قبولِ عام کی صلاحیت ہوتی ہے، نئے ادب میں غلط اور نامانوس ترکیبوں کی جو وبا پھیل گئی ہے، اسی کو آپ بھی ذریعہ اظہار بنانا چاہیں گے تو ہمیں مقصد کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ جناب نعیم صدیقی جیسے سنجیدہ اہل قلم کا دامن ان بحرانی لغزشوں سے پاک... رہے۔

یہ تنقید کتابت کے لئے دی جا رہی تھی کہ اخبارات کے ذریعہ یہ اطلاع ملی کہ "پریس سیفٹی ایکٹ" کے تحت "چراغ راہ" چھ مہینہ کے لئے بند کر دیا گیا، وہ حضرات جو خدا شناس ادب پڑھنے کے خوگر ہیں "چراغ راہ" کے اس التوا کو یقیناً محسوس کریں گے، "چراغ راہ" سے بہت سوں کو روشنی ملتی تھی، چھ ماہ تک اس روشنی سے محروم ہو جانا ادب و اخلاق کے ایک خزینہ سے کم نہیں! حکومت پاکستان کی خدمت میں جس کا نصب العین "اسلام" ہے یہ احتجاج نہیں بلکہ قلبِ مومن کی پکار، گذارش کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے کاش! یہ سنی جا سکے۔

پرچم پندرہ روزہ "پرچم" مدیر:- مظہر صدیقی، چندہ سالانہ آٹھ روپے، ملنے کا پتہ:- پوسٹ بکس نمبر ۴۴۴، کراچی۔

"پرچم" کا پہلا شمارہ حضرت سیماب اکبر آبادی کی ادارت میں پہلی جنوری سنہ ۴۹ء کو منظرِ عام پر آیا تھا، اس کے بعد ایک نمبر اور نکلا اور پھر یہ ہفت روزہ سے پندرہ روزہ ہو گیا، سرورق جو مختلف حکومتوں کے پرچموں سے مزین تھا بدل دیا گیا۔

حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی کی جگہ اُن کے صاحبزادے مظہر صدیقی مدیر مسئول قرار پائے اور جناب سیماب کو "پرچم ادب کے ناصب" یعنی نگراں و سرپرست کا منصبِ جلیلہ تفویض ہوا، نگراں اور مدیر کے علاوہ پانچ شاعر اور ادیب "پرچم" کی ادارت میں شامل ہیں۔

سرورق پر رسالہ "پرچم" کو "آفاقی و ہر جہتی ادب کا علمبردار" لکھا ہے "آفاقی ادب" سے غالباً عالمگیر ادب اور یونیورسل Universal لٹریچر مراد ہے، یہ ترکیب نامانوس سی ہے، "آفاقی کی جگہ آفاق گیر ہوتا تو اچھا تھا، اس طرح ترکیب کی غرابت دور ہو جاتی ــــ آفاقی آوارہ گرد اور مسافر کو کہتے ہیں اور فقہ کی اصطلاح میں جو لوگ اطراف و اکناف عالم سے مکہ مکرمہ میں حج کرنے کے لئے آتے ہیں اُن کو بھی ان کی مسافرانہ حیثیت کی بنا پر "آفاقی" کہا جاتا ہے۔

پرچم میں افسانوں، نظموں، غزلوں اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ فنی اور عروضی مباحث بھی ہوتے ہیں، نیاز فتحپوری کے "مالہ و ماعلیہ" کے جواب میں جناب سیماب کا "علیہ اعلیہ" دلچسپ بھی ہے اور وزنی و سنجیدہ بھی! ہم مولانا سیماب صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یہ تنقیدیں جب کتابی صورت اختیار کریں تو اس وقت ان پر تنقیدی نگاہ ڈال لیں تاکہ دامن نگارش میں کوئی سلوٹ باقی نہ رہے۔

۱۵ فروری کے شمارے میں جناب نہال سیوہاروی کا مقالہ "اردو شاعری سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک" بہت خوب ہے، نہال صاحب کا پہلا مضمون ہماری نگاہ سے گزرا ہے ان کی یہ صلاحیت ابھی تک سوئی ہوئی تھی، "پرچم" نے لہرا کر اسے چونکایا ــــ کاش! یہ ہمیشہ جاگتی رہے۔

"جواب واستفسار" کا شعبہ جناب صبا متھراوی کے سپرد ہے جس میں کام کی باتیں ہوتی ہیں ۱۵ فروری کے پرچم میں صبا صاحب نے "لغات کشوری" کا حوالہ دے کر اپنی تحقیق کو پست کر دیا لغاتِ کشوری کا فن لغت میں کوئی پایہ نہیں ہے اور اس کو سند و حوالہ میں پیش

نہیں کر سکتے۔

"پرچم" کے ارکانِ ادارہ اسے متنوع اور بلند بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ ابھی کتابت و طباعت کی شکلیں بھی پوری طرح دور نہیں ہوئیں، ہم اس رسالے کے مستقبل کو بہت شاندار دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ توقع ہے کہ مضامین کی بلندی و پستی کی ناہمواری بھی جاتی رہے گی ——— "پرچم" کے داخلی ارکان کو محسوس کرنا چاہیئے کہ انھوں نے "آفاق گیر ادب" کا دعویٰ کیا ہے، اس کے نباہنے کے لئے انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے! ——— ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ پرچم کے بعد کے شمارے مجموعی طور پر کامیاب ہیں اور یہ کاروانِ ادب ترقی کی جانب گامزن ہے۔

گرد و پیش

ماہنامہ "گرد و پیش" ترتیب دینے والے۔ جاوید پرویزی، احسان جعفری۔ انتخاب: نرمن ایم۔ اے اور تبسم کاظمی، چندہ سالانہ چھ روپے ملنے کا پتہ:- ۸۶ جے ام ۱ مرزا قلیچ بیگ روڈ، کراچی ۳۔

یہ ماہنامہ اس سال کے آغاز پر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ابتک دو شمارے منظرِ عام پر آئے ہیں سرورق: سادگی و پُرکاری پائی جاتی ہے، مضامین دلچسپ ہیں۔ نظموں کے انتخاب میں خاطر خواہ احتیاط نہیں برتی گئی۔ جہاں اس انداز کے:-

وہ کوئی اور ہے جو تجھ کو طوفاں سے بچائے گا
نرد کو اب پر ناخدا سے کھیل لینے دو

بلند اشعار ہیں، وہاں ایسے:-

کہنے لگیں یہ رعنا کہ کیوں تم خموش ہو
کیا شعر و شاعری سے ہے اب دل ہی بھر گیا

سطحی اور بھرتی کے اشعار بھی ملتے ہیں۔

ماہر القادری کی نظم "حسنِ معصوم" کا ایک شعر ہے:-

جھکی جھکی سی نگاہیں کہ نیم وا غنچے
رُکا رُکا سا تبسم کہ نا شگفتہ گلاب

اس میں آنکھ کی جگہ "نگاہ" استعمال کیا گیا ہے جو احتیاط کے خلاف ہے ——— ڈاکٹر عندلیب شادانی نے فارسی رباعیوں کے جو ترجمے کئے ہیں وہ بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں، اور مترجم رباعیوں کا یہ ایک صفحہ بہت سے اوراق پر بھاری ہے! ہم "گرد و پیش" کو ترقی و انقلاب کے نام پر جو گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن سے بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ ——— (م۔ق)

عثمانی پریس بھیم پورہ کراچی میں چھپا

اپیل دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین نے اپنی پینتیس سال کی زندگی میں جو مذہبی، علمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے اصحاب علم پوری طرح واقف ہیں اس نے اسلامیات کی ہر شاخ اور اُردو زبان و ادب پر محققانہ لٹریچر اور معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا، غیر مذہبی خالص علمی خدمات سے بھی اس کا دامن خالی نہیں ہے، اس کے کاموں کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے علمی اداروں اور وہاں کے علما و محققین تک نے کی۔ اس کی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے، اور اس نے اپنی تصانیف سے ملک میں سنجیدہ تالیف و تصنیف اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک معیار قائم اور اس کا مذاق پیدا کر دیا،

اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ اس کی مطبوعات ہیں، ان کی مانگ زیادہ تر پنجاب، حیدر آباد اور دلی میں تھی، اس لیے ہندوستان کی تقسیم اور پنجاب اور دلی کی تباہی اور حیدر آباد کے انقلاب کا اس کی تجارت پر بڑا اثر پڑا، گو اس کی کتابوں کی مقبولیت اور طلب اب بھی قائم ہے لیکن جب تک دونوں ملکوں کے درمیان رسل و رسائل کی دشواریاں دور نہ ہو جائیں، اس وقت تک ان کی پوری تکمیل نہیں ہو سکتی بعض علم دوست ریاستوں سے جو امداد ملتی ہے وہ بھی موجودہ ریاستی انقلاب میں نہیں کہا جا سکتا کب تک قائم رہ سکے گی، کاغذ کا قحط، دوسرے سامان طباعت و اشاعت کی گرانی اور ملک کے عام اقتصادی حالات کی ناسازگاری اس پر مستزاد ہے، ان حالات میں دار المصنفین کا کاروبار چلانا مشکل ہو رہا ہے۔

دوسری طرف ہندوستان کے انقلاب اور اس کے اثرات و نتائج نے دار المصنفین کے کاموں کو اور زیادہ ضروری بنا دیا ہے، اور اس پر نئی ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں، لاہور جو اُردو کا بڑا مرکز تھا، ہندوستان سے نکل گیا، ہندوستان میں انجمن ترقی اُردو ختم ہو گئی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا اُردو شعبہ توڑ دیا گیا، مکتبہ جامعہ ملیہ دلی کے ہنگامہ میں تباہ ہو گیا، حیدر آباد کے اُردو زبان اور اسلامیات کے ادارے چند دنوں کے مہمان ہیں، ایسی حالت میں جو ادارے باقی رہ گئے ہیں، انہی پر آئندہ اُردو زبان اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کا مدار رہ گیا ہے، اور ان کو ہر حالت میں قائم رکھنا ہے، اس لئے دار المصنفین ان شاء اللہ اپنا کام پورے استقلال سے جاری رکھے گا، بلکہ نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اس میں اور زیادہ وسعت دے گا۔

ابھی اس کے بہت سے پرانے کاموں سیرۃ النبیؐ، سلسلۂ تاریخ اسلام و تاریخ ہند کی تکمیل باقی ہے، اور نئے حالات نے بعض نئے کام پیدا کر دیئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب ہندی میں بھی اسلامی لٹریچر پیش کیا جائے، اور مسلمانوں کو اندرونی اور بیرونی غیر اسلامی اثرات اور تحریکوں سے بچانے کے لئے مضامین اور کتابیں لکھی جائیں، یہ دونوں کام دار المصنفین کے پیش نظر ہیں، لیکن ان سب کا دار و مدار سرمایہ پر ہے دار المصنفین تو ان شاء اللہ اپنا کام کرتا رہے گا لیکن دوسروں کے بھی کچھ فرائض ہیں،

دار المصنفین جب سے قائم ہوا ہے، الحمد للہ آج تک اس نے کبھی عام چندہ کی درخواست نہیں کی، اور اب بھی وہ اس وضع داری پر قائم ہے، ایک مرتبہ اس کو مالی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی تو اس کو بیس روپیہ سالانہ ممبری کی شکل میں قبول کیا تھا، اور اس کے معاوضہ میں رسالہ معارف اور اپنی سالانہ مطبوعات معاونین کی خدمت میں پیش کی تھیں، دار المصنفین کے بعض ہوا خواہوں کی رائے ہے کہ اس طریقہ کو پھر جاری کیا جائے، اور چونکہ بعض قدردان بلا معاوضہ مدد کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ممبری کی فیس بہ ترتیب تیس اور پچاس روپے سالانہ کر دی جائے، دونوں قسم کے ممبروں کی خدمت میں ممبری کی مدت تک رسالہ معارف اور سالانہ مطبوعات پیش کی جائیں گی۔ یا اس قیمت کی دوسری کتابیں جن کو وہ پسند کریں گے، دیجائیں گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ ممبری مستقل

اور دائمی ہو، بلکہ ایک دو سال کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔

اگر تیس روپے سالانہ کے پانچ ہزار ممبر بھی بن جائیں تو دار المصنفین کی موجودہ مشکلات بھی دور ہو جائیں گی اور پرانے کاموں کی تکمیل اور نئے کاموں کے شروع کرنے میں بھی مدد ملے گی، دار المصنفین کے قدر دانوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ تعداد آسانی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے، ہم کو یقین ہے کہ دار المصنفین کے ہمدرد و ہوا خواہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں ممبر سازی کی پوری کوشش فرمائیں گے، اور مطلوبہ تعداد بہت جلد پوری ہو جائے گی، یہ اردو زبان کے حامیوں اور اسلامی کلچر کے محافظوں کا بھی امتحان ہے کہ ان سے ان کی محبت کا دعویٰ محض زبانی ہے یا اس کے لیے وہ عملاً بھی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی (ناظم دار المصنفین) مسعود علی ندوی (منیجر دار المصنفین)

(۱۰ اپریل ۱۹۴۹ء)

کلامِ الٰہی کے کرشمے

شہنشاہوں کے سر ہمیشہ درویشوں کے دروازوں پر جھکے ہوئے رہتے ہیں دنیا کس قدر شکر گذار ہے۔ ان بزرگ ہستیوں کی جنھوں نے اپنی روحانی طاقت سے اور کلام الٰہی کی برکت سے مخلوقِ خدا کے ہر دکھ اور درد دور کئے اور آج تک ان بزرگوں کے دیئے ہوئے راز یعنی بے نظیر تعویذات اور بابرکت عملیات ہمارے خاندان میں راز سینہ کی طرح محفوظ رکھتے آئے ہیں۔ وہ تعویذات اور عملیات جن کی برکت سے ہر مرض اور دکھ درد دور ہو سکتا ہے۔ مثلاً بیماری کتنی بھی مہلک کیوں نہ ہو انشاءاللہ ایک بار مریض بستر مرگ سے ضرور اٹھ کھڑا ہو گا۔ بدبخت بے روزگار کیوں نہ ہو بے شک رزق اور روزی اور دولت کثیر اندازمیں آسانی سے پائے گا۔ اور ایسی دولت پائے گا کہ اس کی پشت بہ پشت بے حد دولت مند ہوتی رہے گی۔ شادی اور رشتہ داری اور دیگر خانگی۔ قانونی۔ تجارتی۔ جسمانی۔ لا اولادی۔ دشمنی۔ جادو۔ سحر یا کسی اور تکلیف میں گرفتار شدہ کے لئے ہمارا خاندانی طریقہ عمل اور نقشہ کا تعویذ انشاءاللہ تیر بہدف ثابت ہوگا آج بھی لاکھوں بڑے ہسپتالوں میں بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کے زیر نگرانی ہوتے ہوئے بھی تڑپ تڑپ کے جان دے دیتے ہیں۔ کتنے انسان بے گناہ قانون کی زد میں آکر زبردست وکیلوں اور بڑے سے بڑے عدالت گاہوں کے دروازوں پر چلا چلا کر اپنی دولت اور دنیا اور زندگی کا چین برباد کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی انصاف اور کامیابی انھیں حاصل نہیں ہوتی۔

جو قوم زندگی کی ہر مشکلات میں مادہ پرستی کو چھوڑ کر کلام الٰہی کی طاقت میں اپنا علاج ڈھونڈتی ہے۔ وہ مادہ پرستوں کی طرح سائنس کی ظاہری ایجاد کے پیچھے ناحق زندگی بھی کھوتی ہے

ہر تعویذ آیاتِ کلام الٰہی کا ہے۔ اس سے باہر کسی چیز کا اس میں دخل نہیں ہے۔ اور ہر ایماندار مسلمان کے لیے ایک تعویذ لاکھ لاکھ روپئے سے گراں قیمت ہے۔ یہ کوئی کلام الٰہی کا بیوپار نہیں ہے جس طرح دنیا والوں نے خدا کی ہر چیز کا بیوپار کر رکھا ہے۔ ہدیہ نذرانہ کسی حالت میں بھی عملیات کی قیمت نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ضرور صدق دل سے آئیں یا خط وکتابت کریں۔ آپ کا ہر راز راز رکھا جائے گا جواب کے لئے لفافہ ٹکٹ لگا ہوا مع پتہ بھیجیں۔

آپ کا خیر خواہ

سمو عامل روحانی ـــ سمولاج کراچی نمبر ۲

POWER COMMANDS INDUSTRY

OIL ENGINES
HORIZONTAL AND VERTICAL
NEW OR RECONDITIONED.

ELECTRIC MOTORS

Regd. No. S. 1262

Only Title Printed by the Jayyad Electric Press, Campbell Street, Karachi.

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱) شمارہ (۴)

ماہنامہ

"فاران"

مدیر

ماہر القادری

جولائی سنہ ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ چھ روپے فی کاپی ۸/

ممالک غیر سے نو روپے فی کاپی ۱۲/

"فاران" کیمبل اسٹریٹ
کراچی

(مکتبہ سالار [?])

نظم و ترتیب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

افلاطون نے اپنے مکان کے دروازے پر لکھ کر لٹکا دیا تھا کہ "جو شخص علم ہندسہ نہ جانتا ہو، وہ ہمارے یہاں نہ آئے"! بالکل اسی طرح جو آدمی ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح نہیں رکھتا اسے شعر و ادب کی محفل میں باریاب ہونے کا حق نہیں ہے، اس ذہنیت اور مذاق کا انسان ادب و شاعری کی بزم میں آکر اہلِ بزم پر نہ صرف بارِ خاطر بن جائے گا بلکہ اس کی "دخل در معقولات" سے علم و ادب کی فضا میں برہمی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے سوچنے اور اظہار کرنے کا طریقہ سب سے مختلف ہوگا، اس کی باتیں عام طور پر جب اربابِ محفل اور اہلِ ذوق کی سمجھ میں نہ آئیں گی تو وہ اپنی کمزوری کو چھپانے بلکہ اس کو (justify) کرنے کیلئے کہے گا کہ قدامت پرست اور رجعت پسند دماغ میری جدتِ فکر کو نہیں سمجھ سکتے، یہ "ترقی" کی شاہراہیں "جدت" کے راستے اور "انقلاب" کی منزلیں ہیں جن پر میرا توسنِ خیال گامزن ہے ——— بلکہ وہ دعویٰ کرے گا کہ میں "عوامی ادب" کا نقیب اور ترجمان ہوں حالانکہ "عوام" کے لئے اس کی بولی بہت زیادہ نامانوس اور اجنبی ہوگی۔ اور اس کی باتیں سُن کر عوام کا ذہن تشویش میں پڑ جائے گا۔

ایک ہوتا ہے بے وقوف اور کودن اور ایک ہوتا ہے "برخود غلط"! "بے وقوف اور غبی آدمی کو سمجھا بجھا کر سیدھے راستے پر لگایا جا سکتا ہے مگر "برخود غلط" انسان کی اصلاح بہت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب قریب ناممکن ہے، اس ذہنیت کے آدمی کے دل و دماغ میں کبھی پیدا ہو جاتی ہے جو کسی عنوان دُور نہیں ہو سکتی، مرض کا یہ وہ خطرناک درجہ ہے جب بیمار دوا پینے سے گریز اور بد پرہیزی کے لئے اصرار کرتا ہے ——— شعر و ادب کی دُنیا میں اس "برخود غلط اندیشی" کے نتائج زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں، آہنگ، نغمگی، توازن، ترتیب، سُلجھاؤ اور حسنِ بیان و اظہار ——— جو لٹریچر کی جان ہے ختم ہو جاتا ہے، ذوق و وجدان کی جگہ "انقلاب زندہ باد" کے پیمانوں سے شعر و ادب کی پیمائش ہوتی ہے، یہاں تک کہ زعفران کی پتیاں اور دھتورے کی ڈالیاں ایک ہی ترازو میں تولی جاتی ہیں۔

ادبی گمراہیوں کے نمونے

علم کی غایت بُرے بھلے کی پہچان اور کھرے کھوٹے کی تمیز ہے ——— اس لئے "عرفان و تمیز" کی یہ مشق دماغ میں سُلجھاؤ پیدا کر دیتی ہے، علم فکر و ذہن

کی اُلجھنیں دُور کرتا اور خیال کے اُلجھاؤ کو سلجھاتا ہے جس لٹریچر میں اُلجھنیں، پیچیدگی اور ژولیدہ بیانیاں ہوں وہ ناقص اور ادھورا ادب ہے، اس انداز کا ادب علم کی پیشانی کا نہایت بدنما داغ ہے جسے مٹا دینا چاہئے۔

دماغ میں سلجھاؤ clarity of mind اور طبیعت میں پاکیزگی نہ ہو تو خیالات میں فساد اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے، نفس کی خباثتیں شعر و ادب کے اسٹیج پر رقص کرتی ہوئی آتی ہیں یہاں تک کہ بزم شعر و ادب کا سارا ماحول ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے ——— اس ناپاک ذہنیت کے افراد کا رومان (Romance) حقیقی بھائی اور بہن کے مابین جذبات کی آنکھ مچولی کھیلتا ہے، پڑھئے اور ماتم کیجئے، اخلاق و انسانیت کی مرگ بے ہنگام پر۔ . . . ارشاد ہوتا ہے۔

"سعیدہ کی گوری اور نازک کلائیوں کو جب اُس کا بھائی سعید چھوتا تو سعیدہ کی آنکھوں کے ڈورے ایکا ایکی سُرخ ہو جاتے اور سعیدہ کے جذبات بھی جھومنے لگتے . . . . . . بھائی بہن کے رشتہ کو اب خون نہیں رومان جوڑے ہوا تھا"

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

یہ لٹریچر نہیں کتّوں، بندروں، ریچھوں اور سُوروں کے جذبات ہیں جو ترقی و انقلاب کی زبان سے بول رہے ہیں اور سیگمنڈ فرائڈ کی روح خوشی سے بے تاب ہو کر ناچ رہی ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے "سُرخ سویرا" اس کے چند ٹکڑے یہ ہیں:-

شفقِ سُرخ دھواں دھار ہوئی جاتی ہے۔
کچھ لکیروں میں ہے برناتی سی
لالۂ دشت کی رعنائی سی
جیسے ساون میں کوئی بیر بہوٹی رقصاں
رقص میں جوش ہے جس طرح سے طوفاں کا بہاؤ
کتنے موہوم سہارے سر ساحل ہیں کھڑے
جیسے مٹی کے گھڑے

اور ابھی
سُرخ سویرے کی دھنک باقی ہے
غنچوں کی چٹک باقی ہے
روحِ مزدور نے پھر لال دوپٹہ اوڑھا
خون ہی خون نظر آتا ہے
اور سرمایہ پرستی کے دھندلکے خاموش
جیسے اب صبح نہیں ہونے کی
شفقِ سُرخ طنابوں کے قریب آپہنچی
لشکر و خیمہ و خرگاہ جھلس جائیں گے
مگر اے دوست! ہتھوڑے کی نہ ضربات کو روک!

انہیں نغموں سے کرن پھوٹے گی

چھپکلی کیوں سرِ دیوار نظر آتی ہے

یہ بھی کیا محرمِ اسرار ہے آج

اس کی ٹانگوں کے خم و پیچ کو دیکھ!

اور اپنے پہ نظر ڈال کہ تو

اتنا مفلوج و اپاہج کیوں ہے!

یہ جدتِ فکر، شوخیٔ فطرت اور بدلتے ہوئے سماج کی ترجمانی بلکہ آوازہ ہے؟

ع
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مگر اس "ترقی و انقلاب" نے ایسے ایسے ذہین اور ہوشمند افراد پیدا کر دیئے ہیں جو بانگوں کی باتوں کو نہ صرف سمجھ لیتے ہیں بلکہ اُس پر پوری بصیرت اور ذمہ داری کے ساتھ عالمانہ انداز میں تنقید بھی فرماتے ہیں:۔

"شاعر کی یہ نظم زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی آئینہ دار ہے، بیابادہ سپید یہ ایک لطیف طنز ہے، اس کا پس منظر یک لخت بھیانک بھی ہے اور حسین بھی ہے! دل کی دھڑکنیں نغمے بنتے بنتے فریادیں تبدیل ہو گئیں، جذبات کا یہ استحالہ انقلاب کی اینٹھن کی صحت مند عکاسی ہے ـــــــ شاعر نے محسوسات اور جذبات کے درمیان سے ایک پگڈنڈی نکالی ہے جس کے کنارے جگہ جگہ سے کٹے ہوئے ہیں، شاعر کی آواز پر شور ہے جیسے زعفرِ گیندا بر گد کے درخت کی جڑوں سے آپ ہی آپ اُلجھ رہا ہو۔

اس قسم کی نظمیں اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، تغزل کے نازک شانے اور دُکھتے بازو اس بار کو نہیں سنبھال سکتے، کاش! سماج اپنے کفن کا پرچم بنا کر کارزارِ حیات میں آتا اور چیخوف کی زبان سے یہ کہہ سکتا۔

"موت کا گدھ زندگی کی لاش پر بس ایک بار منڈلاتا ہے"

چلتے چلاتے لگے ہاتھوں ایک نظم اور سنتے جایئے۔ نظم کا عنوان ہے "ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر" ارشاد ہوتا ہے:۔

کتنے راجاؤں کی سطوت آج زیرِ پائے ہے — کتنے مزدوروں کا مستقبل مجھے اکسائے ہے

فیل بے زنجیر کیا ہے اک بغاوت کا نشاں — دولتِ سرمایہ کی خود اُڑ رہی ہیں دھجیاں

اونچے اونچے آدمی بونے نظر آنے لگے — چیونٹیوں کے ولولے بھی ٹھوکریں کھانے لگے

بھوک اور افلاس کے سائے پریشاں ہو گئے — روٹیوں کے جتنے اجزا تھے نمایاں ہو گئے

خار و خس کی نبض میں ہیں ولولے دبکے ہوئے — خشک پتے بھی ہواؤں سے ہیں اب بہکے ہوئے

آسمانوں کا خدا سنتا اگر فریاد کو — عرض کرتا میں بھی ہر مظلوم کی روداد کو

آہ! مذہب کے عقائد کے کھلونوں کی بہار — جیسے بیوہ کی جوانی جیسے بنئے کا اُدھار

دور کی آواز کا مفہوم ہے ٹھہرا ہوا
صرف ہاتھی کے قدم کا نقش ہے ابھرا ہوا

حرفِ آخر

تنقید، افسانہ اور شعر و شاعری کے جس قدر نمونے[1] یہاں درج کئے گئے ہیں "ترقی و انقلاب" کے نام پر جو ادب پیش کیا جا رہا ہے وہ سارے کا سارا اسی انداز کا ہے ـــــ اُلجھے ہوئے خیالات، گم کردہ راہ فکر، پریشان دماغ، "ادب نہیں ادب کے ساتھ مذاق!" اس چڑیا گھر میں ہر پرندہ ایک جیسی بولی بولتا ہے "اس لنکا میں ہر کوئی باون ہاتھ کا ہے اور اس حمام میں سب کے سب برہنہ نظر آتے ہیں۔

یہ "ادب آوارگی" اور اُس پر دعوے یہ کہ ہم جدت کے خالق اور انقلاب و حریت کے پروردگار ہیں، ہم نے اردو زبان کو نیا اسلوب، نمود، جدید فکر عطا کی ـــــ یہ بیچارے قدامت پسند تو اندھیرے میں پڑے تھے ہم نے ان کو روشنی دی۔

یہ ہیں اردو لٹریچر کے نمائندے، "شعر و ادب کے ہیرو"، اور پروپیگنڈے کے ناقوس کی صدائے بازگشت! اُردو زبان بیچاری چیخ رہی ہے، فریاد کر رہی ہے کہ مجھے میرے نادان دوستوں سے بچاؤ۔ مگر لوگ ہیں کہ بُت بنے بیٹھے ہیں، اقدام کہاں مدافعت کرتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں، اگر اردو کے بہی خواہوں اور ہمدردوں کی یہ بے حسی اور خموشی کا یہی عالم باقی رہا تو "خبرِ بد" کے سننے کے لئے ابھی سے تیار رہنا چاہئے، جو بے غیرت اور بے حس قوموں کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

دوستو! میں چاہتا ہوں کہ اپنے دل کی آگ تمہارے سینوں میں بھر دوں اور میرے جذبات کی تڑپ تمہارے دلوں میں کسی طرح منتقل ہو جائے، کاش! میری تمنا پوری ہو سکتی! میں تمہیں خطرے سے آگاہ کر کے اپنے لئے خطرہ مول لے رہا ہوں، اہلِ باطل زبردست سازشی بھی ہوا کرتے ہیں ـــــ مگر مجھے اپنے خدا کی ذات پر بھروسہ ہے، اُس خدا کی ذات پر جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو پرندوں کی کنکریوں سے تباہ کرا دیا اور ارضِ حرم کے ایک ذرہ کو بھی گزند نہ پہونچ سکی۔

باطل کے خلاف آواز بلند کرنا گویا ایک آتشیں امتحان کو دعوت دینا ہے، خدا شناس گروہ نے حق پرستوں کے ساتھ سدا ظالمانہ برتاؤ کئے ہیں۔ لشکرِ فرعون، آتشِ نمرود، بدر و احد کے غزوے اور کربلا کا معرکہ حق و باطل کی اس آویزش کی بولتی ہوئی شہادتیں ہیں، سچائی کے راستہ میں مزاحمتوں اور رکاوٹوں سے بچنا محال ہے۔

تو ہم نے بھی دورِ حاضر کے سب سے بڑے فتنہ[2] کے خلاف آواز یہ جان کر بلند کی ہے کہ ہمیں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنی ہے، ہماری زبان کاٹی جا سکتی ہے مگر بند نہیں ہو سکتی۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

نعم المولیٰ و نعم النصیر

ماہر القادری
۲۵ جون ۴۹ء

---

[1] یہ نمونے ترقی زدہ ادب کے انداز پر اُسی کے مواد اور مسالے سے تیار کئے گئے ہیں ـ م

[2] کمیونزم

ڈاکٹر بشارت علی ایم اے، پی ایچ ڈی

جمہوریت تنقید کے آئینے میں

دُنیا کے لئے بہترین نظام صرف "اسلام" ہے

تا بکے در تہِ بالِ دگراں مے باشی
در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز

سیاست اور سیاسی نظاموں میں ایسی مستقل قوتیں موجود ہیں کہ جن کی بنا پر انہیں معاشرے کی حیات نامیہ کا ایک ایسا شعبہ قرار دیا جا سکتا ہے جو جداگانہ بھی ہے اور دوسرے معاشرتی مظاہر سے غیر منفک طور پر جڑا ہوا بھی ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر سیاست میں ان گنت معاشرتی مظاہر نہ صرف جھلکیاں دیتے نظر آتے ہیں بلکہ ان کا ظہور بار بار ہوتا ہے۔ سیاست کی نیرنگیوں اور تنوع کے باوجود ایک مستقل مقصد اور مستقل معاشرتی رجحان موجود ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کی اساس پر سیاست کے نظام میں ترتیب، نظم و ضبط کی کارفرما قوتیں تقسیم و حدبندی، منطقی صحت اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے وجود میں لانے والی اور حرکت دینے والی قوتوں کا دریافت کرنا سیاست کے صحیح مقتضیات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ سیاست اور آج کل کی سیاسی زندگی اس قدر پیچ در پیچ ہے کہ جو قوانین ان میں کارفرما ہیں وہ منطقی کلیوں کی شکل رکھتے ہیں اور اسلئے ان پر آسانی سے نظر نہیں پڑتی۔ سیاست کی اہمیت اور حقیقت اس کے بنیادی اصولوں کے مطالعہ ہی سے واضح ہو سکتی ہے، کسی تعریف پر خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو غور کرنے سے نہیں ہو سکتی، نئی شکلوں اور نئے وظائف کا اضافہ، پُرانی زندگی اور اصولوں کی قوت اور جد و جہد میں ترقی، مختلف اجزا کا زیادہ منظم اور بار بار ہونے والے اعمال کا دُ بھی واضح ہونا شعور اور حرکت سے خالی نہیں۔ سیاست کی صحیح لم یہ ہے کہ باوجود تنوع کے وہ مقررہ قوانین کے مطابق ہمیشہ متشکل ہوتی رہے۔ مقررہ قوانین کا انحصار اس نفسی عنصر پر ہے جس سے سیاست کی طبیعت اصلی کی امتیازی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ ضرورت محض یہ سمجھنے کی ہے کہ سیاست مختلف اعضا یا اجزا پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کے پابند ہیں۔ سیاست کا جسم اجتماعی اپنے نفسی عنصر کی بدولت محض ایک انفرادی جسم نامی نہیں بلکہ ایک مستقل نظام ہے۔ سیاست کی بھی نظام آسا کیفیت قوموں کے نفسی میلانات اور مزاج یا مقومات کی متابعت میں ایک جداگانہ شکل اور خصوصیات کی محتاج رہی ہے۔ ایک قوم کا نظام سیاست اور ہیئت حاکمیہ دوسرے سے لگا نہیں کھاتا اور قوم کی نفسی واجبات کی تکمیل کے لئے یہ عصبیت، امتیاز اور علاحدگی ضروری ہے ورنہ قوموں کا میل ملاپ، سیاسی اشکال کی ہیئت اور اداروں کی ہم آہنگی ان کے مشخصات کے مٹانے کا موجب ہو جائے گی۔ قوموں اور ان کے نظاموں کے باقی رکھنے کے لئے تفریق ضروری ہے اور سیاست ملّی کا صحیح اقتضا یہی ہے کہ اپنے مزاج، مشخصات، نظام اخلاق، کلچرل موثرات، اجتماعی ورثہ اور خود معاشرتی عوامل

کی بنا پر ایک مستقل انفرادی زندگی کے امکانات کو ختم نہ کیا جائے۔ ترقی کا مقصد حرکت اور تخصیصات کی عصبیت میں پوشیدہ ہے تو انفرادی اور مستقل زندگی کے امکانات کو بھی ہر وقت آگے بڑھانا چاہئے۔ یہ حقائق پیش نظر رہیں تو آپ سیاست کی ان اصطلاحوں کو جنہیں انفرادیت حق خود ارادیت، حکومت خود اختیاری، قوم، کلچر، نسل اور اجتماعی رُوح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، سمجھ سکتے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے آغاز سے بہت قبل اور موجودہ جنگ کے ختم ہونے کے باوجود آج تک قوموں کی داخلی، و خارجی سیاست میں الجھاؤ اور نت نئی مشکلیں پیدا ہو رہی ہیں، ان کے اسباب میں یہ سبب کیا کچھ کم ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے عمرانی اور نفسیاتی موثرات کو سمجھنا نہیں چاہتی اور قاطبتاً اس طرف مائل ہے کہ اپنے نظاموں کو دوسروں کے سر زبردستی منڈھ دے۔ سیاست کا یہی ایک طرفہ پہلو ہے کہ جس میں ہمارے عوام، خواص، سیاستدان، مدبر، مقنن، دستور ساز ادارے اور سب کے سب غیر شعوری یا شعوری طور پر ڈھلتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ حقیقی رشتے جن سے سیاست کے مختلف اجزا باہم مربوط ہیں غور کرنے پر نفسی و عمرانی ہی ثابت ہوں گے۔ سیاست کی تخلیق حرکت اور نمو کا خاص سبب بقول گراہم والس اور لاس ول متذکرہ نفسی و عمرانی خصوصیتیں ہیں جو اس میں مثل یک فرد کے پائی جاتی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی طرح سیاست متحدہ احساس، خیال اور ارادے سے بنتی ہے اور یہی اس کا سب سے زیادہ مستقل اور اہم عنصر ہے۔

مجرد سیاسی کتابوں کے پڑھنے سے بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔ ایک طرفہ مطالعہ بغیر سیاسی مظاہر پر استقصا کے ہمیشہ نارسی و بے بسی پر منتج ہوتا ہے۔ اسی کی وجہ سے یورپ کی سیاست ناکام رہی۔ ایک جنگ سے دوسری جنگ۔ جدل سے دوسرا جدل۔ ضد سے دوسری ضد۔ ایک نظام سے دوسرا نظام۔ طبقاتی جنگیں، انقلاب، نزاع غرض ہر قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی رہیں اور اس کے بدیہی امکانات ہیں کہ پیدا ہوتی رہیں گی۔ وہ مفکر جو صحیح درک و ادراک کے مالک ہیں انہیں اس کا احساس ہے چنانچہ عمرانیات کے ماہر پروفیسر مان ہائم نے اپنی تصانیف Diagnosis of our time اور Man & society in an Age of Re-construction میں انہیں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نفسیات میں ڈاکٹر ایور نے Psychology & Engrams میں نفسیات تحلیل میں فرائڈ نے Civilisation & its discontent میں اور کلچرل بیالوجی میں میلی نوسکی نے اپنی کتاب Sex & Repression in Savage Society میں مختلف نقاط نظر سے انہیں کا صراحت جائزہ لیا ہے۔

یورپ کے سیاسی، ذہنی، معاشرتی، معاشی اور کلچرل اقتدار اور دباؤ کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ عالم مشرق کے اکثر ممالک ہماری طرح سیاسی حیثیت سے آزاد ہیں لیکن سیاست سے ہٹ کر دوسرے امور میں یورپ کا اقتدار اب بھی باقی ہے۔ اسی دباؤ کی وجہ سے ہم فکری و اجتہادی حیثیت سے بیمار ہیں۔ یک صحت مند قوم اور اس کے نظامات، دوسری قوموں کو اسی انداز میں متاثر کر کے صحت و توانائی کا موجب بن جاتے ہیں لیکن یورپ جو خود بیمار ہے ان اثرات کو اسی رنگ میں ہم پر بھی عائد کر رہا ہے۔ پہلے ہی سے ہماری زندگی اخلاقی، جمالی اور مذہبی قدروں سے خالی ہو چکی ہے اس پر رعب، خوف، ذہنی پستی، اعصابی، نفسی، عضویاتی اور قلبی بیماریاں، یورپ کی بیماریوں کے دباؤ کے تحت جاں کاہی کا موجب بنی ہوتی ہیں۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے جب کسی قوم کی ہلاکت قریب ہوتی ہے تو اس کے قلب، سمع اور بصر پر مُہر لگا دی جاتی ہے کاش ہم اپنی اس حالت کو محسوس کر لیں۔

یورپ نے جو دوسری عالمی جنگ لڑی ہے اس کے نتیجے کے طور پر جسمانی کش مکش کا دور ختم ہو چکا۔ اب تیسری عالمی جنگ ذہنی مقابلے کے لئے دروازہ کھولدے گی۔ اسی کے لئے ہمیں تیاری کرنی ہے۔ نقالی، اور خالی خولی باتوں سے کام نہ چل سکے گا۔ ضرورت ہے کہ اپنی قوتوں کو اثباتی

(1) Graham walls; Human & nature & Politics

(2) H. D. Lasswell :- The Analysis of Political Behaviour — An emperical approach

حیثیت سے ایک جگہ جمع کیا جائے اور انہیں کی مشق و ممارست اور صحیح تطبیق سے معاشرتی و سیاسی زندگی کی تعمیر جدید کی جائے۔ اس کے یہ معنی یہ ہوں گے کہ ہم مجرد تقلید کی بجائے ایجابی و علیاتی حیثیت میں فکر و نظر کی صلاحیت پیدا کریں تاکہ صحیح بنیادوں پر زندگی کا تجزیہ کیا جاسکے۔ تجزیہ کا عمل اگر منطقیانہ ترتیب و سازگاری کا متقاضی ہے تو پھر موقع و محل کے صحیح احساس و عمل سے استقرا بھی ضروری ہے اور استخراج بھی۔ تیسری عالمی جنگ جس کا ہونا ضروری ہے بقائے اصلح کے قدیم افکار کو مٹا دے گی۔ اب جو دور آنے والا ہے وہ بقائے افضل کا دور ہوگا۔ اس کا اطلاق محض ان افراد اور قوموں پر نہ ہوگا جو جسمانی اور غیر ایجابی حیثیت میں ذہنی قوت میں بڑھی ہوئی ہوں بلکہ ان پر جو اتحاد عمل اور معاشرتی زندگی سے سازگاری کا بدرجہ اتم مادہ رکھتی ہوں تاکہ ان کا خصوصی مزاج، کلچر، مشخصات، روایات قومی، نظام اخلاق اور اجتماعی ورثے کی مناسبت سے اُن کی زندگی کے حیات افزا و حیات زا نقوش، نظامات و ادارات باقی رہ سکیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ سیاست میں معاشرتی، نفسیاتی اور سب سے بڑھ کر قوموں کے واجبات زندگی کے سارے امور پر غور کرنا چاہئے تقسیم و ترتیب سے کلیے مستنبط ہوتے ہیں لیکن سیاست کے گوناگوں مظاہر میں منطقی ترتیب پیدا کرنا اور اس ترتیب کو علمی بنیادوں پر قائم کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ سیاست کی صحیح عقدہ کشائی اسی جہد پیہم کی محتاج ہے۔

ملک معنی کس حدِ او را نہ بست — بے جہادِ پیہمے ناید بدست
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود — می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو — علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را — فطرتِ او در پذیرد سہل را
سہل را جستن دریں دیرِ کہن — ایں دلیل آں کہ جاں رفت از بدن

اقوام یورپ کے افکار سیاسیہ کی عمارت سہل انگاری ہی پر تیار ہوتی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ دوسری قوموں کے داعیات زندگی مقومات اور کلچرل احساسات کو پرکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہم صحیح معنوں میں بندہ افرنگ ہو کر ذوق نمو کو کھو رہے ہیں۔ بیماری اور خصوصاً نفسی، ذہنی و قلبی بیماری میں آپ بھی اسی طرح بیمار ہیں جس طرح یورپ۔ فرق اتنا ہے کہ یورپ کی بیماری خود اس کی پیدا کردہ ہے اور آپ کی بیماری یورپ کی بیماری کا پرتو ہے ـــ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

بیماریاں سب ہی خطرناک ہوتی ہیں لیکن قلبی و ذہنی بیماریاں ہبوط و موت کی نشانیاں ہیں عرصہ ہوا کہ المانوی مفکر اسپانلگر[1] نے انہیں کی طرف اپنی کتاب زوال مغرب میں اشارہ کیا تھا۔ معاشرتی و نفسی مظاہر کی روشنی میں سیاسیات کا مطالعہ تخمیناً ۲۰۔۲۵ سال سے شروع ہوا۔ اس عرصہ میں یورپ و امریکہ میں کئی معاشرتی و نفسی ادارے اسی مقصد کے لئے قائم ہوئے۔ اس کی مساعی سے کثیر لٹریچر انہیں مباحث سے متعلق شائع ہوا ہے[2] اس کا مطالعہ ارباب سیاست اور طلبائے سیاست کے لئے ضروری ہے تاکہ قوم کی نہضت جدیدہ میں کام لیا جا سکے سیاست میں سارے علوم اجتماعی بالخصوص اخلاقیات اور مذہب کو بے حد دخل ہے ان سے ہٹ کر سیاست، سیاستِ دیو بے زنجیر بن جاتی ہے۔ والاؔس نے اپنی کتاب تہذیب کے نفسی عناصر میں خوب کہا ہے: سیاسیات بمنزلہ سر کے ہے اور دوسرے علوم اعضائے تن کی طرح اس سے مربوط ہیں۔ سیاست میں مذہب و اخلاق جن کا فلسفہ کی زبان میں نظام اخلاق نام ہے اور علوم کے مقابل خصوصیت کے ساتھ کیوں دخیل ہیں؟ سیاست بھی قانون تقلید کی پابند ہے۔ معاودت۔ تضاد۔ اور تطابق کے عناصر عام معاشرتی مظاہر کی طرح اس میں بھی موجود ہیں اس لئے سیاست اور نظام اخلاق میں اگر تضاد واقع ہو تو مطابقت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ سیاست اپنے ماضی کی طرف عود کرتی ہے مقتضیات زمانہ کی متابعت میں رد و بدل تو ضروری ہے لیکن سیاست کا زمانی و مکانی سلسلہ منقطع ہونے نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ

1. Spengler.- Untergang des Abendland.
2. International Library of Sociology & Social Reconstruction [illegible]

ہر ملک اپنے دستورِ سیاسی اور ہیئتِ حاکمیہ میں تبدیلی کرتا نہیں رہتا جو صورتِ قدیم سے چلی آرہی ہے وہ ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ تضاد کی وجہ سے معاملات کا عمل ختم ہو جانے تو مطابقت کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال اسی وقت ممکن ہے جب کہ قوم کے مشخصات قومی کردار اور روایات کا خاتمہ ہو جائے یا کسی غالب قوم کی سرکردگی کی وجہ سے ذہنی یا جسمانی دباؤ کے مقابلے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے گمپلووکس نے "نسلوں کی جنگ" اور نوویکو نے انسانی معاشروں کی کش مکش میں انہیں امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ راس کے قول کے مطابق استحصال Exploitation کا یہ سلسلہ معاشرتی زندگی کے تمام مظاہر کا ایک خصوصی داعیہ ہے جس سے نجات ممکن نہیں زندگی اور وسعت و استحکام کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ قوم کا ذہنی انتساب اور خصوصی مزاج پراگندہ نہ ہونے پائے۔ سوسائٹی کی طرح وارڈ لسٹر کا قول درست ہے کہ سیاست کی بنیاد افراد کے نفسی اور اخلاقی عمل سے پڑتی ہے۔ مقومات کا استحکام ہو جاتے تو انہیں کا غلبہ لاشعور (حافظہ) تحت شعور (Subconscious mind) اور شعور کی ہر سطح میں موثر و نافذ العمل رہتا ہے اور بغیر کسی وقوف و ادراک کے عمل کے خود بخود قومی افراد کی سیرت، افکار و اعمال مقومات ہی کی متابعت میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ انہیں وجوہ کی بنا پر واٹسن عمل مبہم کو لاشعوری عمرانی ضبط کے نام سے یاد کرتا ہے۔ استقلال اور وسعت و استحکام کے لئے ناگزیر ضرورت ہے کہ مقومات کا عمل اور ملکۂ عمل ہر نسل میں منتقل ہوتا رہے اور موجودہ نسل مجبور ہے کہ وہ جبلتاً اس کے لئے ساعی ہو کہ بلا انقطاع سلسلہ ہوشیاری اور نفسِ ناطقہ جو خبیر و بصیر ہے وراثتاً آنے والے افراد کو ایک عطیۂ قومی کے طور پر ملتا رہے۔ اسی عمل کو عمرانیات کی اصطلاح میں بہتر ماحول کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ نسل کے افراد کی طرح آنے والی نسل کے افراد بھی ہر جہتی اعتبار سے بدیہ الوجود ہیں۔ ماحول کا اصطلاحی مفہوم مجرد مادی حول پر منحصر نہیں۔ اس میں ذہنی ماحول بھی بدرجۂ اتم شامل ہے عالمِ مشرق کی سیاست کی پراگندگی اور نت نئی صورتوں کی ایک موثر وجہ بہتر ماحول کا فقدان اور قومی مزاج اور ان کے عمل تسلسل کے انقطاع میں پوشیدہ ہے۔ سیاست ہے تو محسوسات کا علم لیکن علوم عمرانی اور خود معاشرتی مظاہر کے بار بار ظہور کی وجہ سے اس میں مجردات کا علم بن جانے کے رجحانات موثر دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری اہم یہ ہے کہ مظاہر ہی کے بار بار وجود و ظہور سے سیاست میں باقاعدگی یک اضطراری چیز ہے۔ ان اسباب کی بنا پر سیاست کی اصل ساخت، حرکت کا صحیح صحو اس کے وظائف اور اس کے باہمی علاقوں کا صحیح علم اور پھر اسباب و نتائج سے واقف ہونا اس لئے ضروری ہے کہ سیاسیات کے صحیح واجبات تک رسائی حاصل کی جا سکے تکرار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ سیاست یا سیاسی علم محض واقعات کے جاننے کا نہیں بلکہ اس کی صحیح ترتیب اور استعمال کا نام ہے جس کے لئے تجرید اور تعمیم لازمی ہے۔ یہاں اس کا خیال رہے کہ تغیر پذیر تجربی بنیاد پر کوئی باضابطہ علم جو علوم متعارفہ کی مفروضات اور قابلِ ثبوت قضیوں پر مبنی ہو، مدون نہیں کیا جا سکتا۔ مرحلۂ عمل کا یہ التزام بہت فرسا بھی ہے اور دقت طلب بھی قوم اور قومی سیاست کا محرم راز اور اس کے مزاجِ اصلی کے سمجھنے کے سوا بقا و صحیح ترقی ممکن نہیں جب تک کہ سیاست کے مختلف مظاہر میں ترتیب نہ قائم کی جائے۔

مذہب کا اثر سیاست پر

سیاست میں کوئی عمرانی اور نفسی فتور واقع نہ ہو تو اس کی نشو و نما ایک مستقل رفتار سے ہوتی ہے۔ مملکت کے محروسہ میں رہنے والی جماعتوں میں اتحاد ضروری ہے۔ مادی اغراض یا جلبِ منفعت کے لئے بھی اتحاد ممکن ہے لیکن یہ منفی اتحاد ہے۔ اتحاد کی حقیقی صورت یہ ہے کہ وہ جماعتیں جو ہم مزاج ہوں، ان میں تخالف کلی اور باہم مؤانست ہو۔ یہ صورتِ حال مشترک اخلاقی جذبات کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایک ہی ملک کی رہنے والی مختلف قوموں اور ان قوموں کے اندر مختلف شعوب و طبقات میں ایک کا دباؤ دوسرے پر پڑتا ہے۔ یہی اصل میں قومیت کی جان ہے۔ دباؤ سے بچنے کے وہی وسائل ناکام ہوتے ہیں تاوقتیکہ نفسی محرک قوتوں اور مشخصات کو کام میں نہ لایا جائے۔ مشخصات کے اسی عمل سے مخصوص معاشرہ اور مخصوص سیاست کی بنیاد پڑتی ہے، اور لوگ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے خصوصی مزاج کی حفاظت اور بجائے خود اپنے خصوصی واجبات زندگی کے لئے ایک مرکز خصوصی

(۱) International Institute of Psychological Studies (بقیہ حاشیہ صفحہ ۸)

(۲) Ward Lester : Psychic Factors of Civilization.

مرجع ہوں سیاست کے یہ عنصر آبادی اور فطرت خارجی Ecological factor کے اعتبار سے بڑے معرکۃ الآرا
مسائل ہیں۔ انہیں کی بنیاد پر قومی مملکتیں وجود میں آتی ہیں۔ سیاسی جماعت کی تشکیل جب پوری طرح ہو چکتی ہے تو اپنی بقا کے لئے وہ مناسب
سعی پر مجبور ہے۔ واقعی اگر وہ مضبوط و مستحد ہے تو فطرت کو مغلوب کر سکتی ہے لیکن بقول نخل یہ اصول کا نتاہ دل میں محفوظ رہے کہ قومیں
فطرت، نوامیس عقلی پر غالب نہیں غلبہ اور تقدم نوامیس عقلی کو ہے تو وارڈ لسٹر کا یہ دعویٰ کہ سیاست اور تہذیب کا انحصار عناصر نفسی پر ہے
اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت بن ہوا ہے۔ سیاسی عمل سیاسی اداروں کے مقابل مقدم و لازمی ہے اور یہی پروفیسر زمرن Zimmern
کا کہنا ہے اپنی دو مشہور کتابوں قومیت، خلقی موثرات اور قومیت و حکومت میں اس کا استدلال ہے کہ سیاسیات کی صحیح تشکیل اسی طرح ممکن
ہے کہ اس میں جذبات کے ساتھ ضبط نفس بھی موجود ہو۔ پروفیسر کوچ[2] کا قدم اور بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ اپنی کتاب سیاست[3] الاخلاق میں اس
بات کا متقاضی ہے کہ اخلاقی اور روحانیاتی جدوجہد کے ہم دوش مذہب تعلیم دے جس کی بنیاد وسعت پر مبنی ہو۔ بھی سیاست پر اثر انداز ہے
مذہب عقیدے کی سطح کو بلند کرتا ہے اور اسی سے یہ ممکن ہے کہ سیاسی عمل کو عقیدے کے غصر دیا جائے اس جہت میں مذہب سیاست کا گویا
ایک بہت بڑا تنظیمی عنصر قرار پاتا ہے۔ سیاسی تنظیم کی غایت یہ ہو کہ ذہن و دماغ فرد کے خصوصی مزاج کی حفاظت کی جائے اور ان کے خیالات میں اتحاد
اور زندگی کے نصب العین کو بلند کیا جائے یہاں اس چیز پر تاکید ضروری ہے کہ یہی علیم ہے سیاست کے اتحاد و استحکام کو باقی رکھ سکتا ہے
اور یہی ترقی کا ضامن بھی ہے۔ علم التعلیم کے ماتحت ہے۔ مگر اس کا مقصد حق کا دریافت کرنا ہے مگر اس کی آخری غرض یہ ہے کہ اپنے نتائج آئندہ
نسل تک پہونچائے تاکہ زندگی اور اصلاح کا عمل جاری رہے کوئی قوم ان حقائق سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو اس کی ترقی رک جاتی ہے اور تنزل
شروع ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے کہ یہی سے سیاست و علم کا متذکرہ عمل مسلمانوں کی زندگی سے محو ہو گیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر ہر جگہ پراگندگی
ہی پراگندگی چھائی ہوتی ہے۔ اسی صورت میں وحدت و حرکت کس طرح ممکن ہے سیاسی عمل کی جان اور علم یہی ہے کہ افراد سیاستہ [illegible]
وعمل کے اعتبار سے اتحاد ہو یہ عنصر بھی ہماری قوم میں مفقود ہیں [illegible] کہ سیاسی جدوجہد کی ہی وہ خاص قسم ہے کہ اس سے آگے قدم
بڑھایا جائے تو نفس اجتماعی [illegible] پیدا ہوتا ہے اسی تصور کے ذریعہ سیاست و معاشرت کی بہبود کے لئے [illegible] جذبات اور ارادے کی
ہم آہنگی ہوتی ہے ہیئت اجتماعی میں اہم تر اور برتر سیاست ہے اس کے اندر جسم اجتماعی کے تمام اعضا ایک خاص ترکیب سے باہم مربوط ہیں
سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترکیب اور ربط کی یہ اساس خارجی ہے یا داخلی۔ غور کیا جائے تو ایک واحد کی طرح صورت و معنی میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ
ان کی تہ میں ایک مشترک عنصر [illegible] ہے۔ وہ سیاست جو نظام خلق اور اجتماعی نصب العین ہی کی بنیاد پر صورت گری حاصل کر سکتی ہے ہیئت
و معنی کو متحد رکھ سکتی ہے۔ یہی ان میں مضبوط رابطے کا کام دیتی ہے یہیں سے قوموں اور ملکوں کی تفریق ہوتی ہے اور وہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں
محدود ہو جاتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے انگریز و جرمن [illegible] ایک ہی ہیں نسلیں اور قومیں تو مخلوط ہو سکتی ہیں لیکن ان کی
سیاست کسی حال میں بھی مخلوط نہیں ہو سکتی نزاع ان کا اہم وظیفہ ہے۔ توازن و سازگاری کی بس ایک صورت ہے کہ قوموں کے جداگانہ
قابل اتحاد مشخصات خصوصی کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے اپنے دائرہ عمل میں ان کے انفرادی حقوق کو تسلیم کر لیا جائے مصلحت کے اسی
طریقہ عمل سے بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں ورنہ نامرادی و ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے گی۔ ہیئت حاکمیہ کی خواہ کوئی صورت
کیوں نہ ہو لیکن اس کا وجود قوم و قوم کے مزاج اصل سے علیحدہ نہیں تو پھر آپ ہی ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے کہ اسلام اور اشتراکیت
اسلام اور مغربی طرز حکومت اور ان کا سیاسیہ کیسے ایک ہو سکتے ہیں؟ کہ بعض فروعات میں ان میں اور اسلام میں مماثلت ہو لیکن فروعات کی مماثلت

1. Prof Zimmern : Moral Prospects of [illegible]
2. Nationality and Government
3. Prof [illegible] Politics [illegible]

نفسیات[1]، عمرانیات[2] اور خود فلسفے[3] کو اس کا اعتراف ہے کہ بقائے روح کے عقیدے سے امید، قوت ایمان اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ انہیں کو اشپنگلر[4] [illegible] کمبال[5]۔ الٹن[6] [illegible] پارک[7]۔ ریوٹر[8]۔ ملی نوسکی[9]۔ لی الفرڈ[10]۔ ہرٹزلر[11] انسان کی ترقی کے نہایت قوی عناصر قرار دیتے ہیں۔ افراد کو اس کے ذریعہ ایک معین نصب العین حاصل ہوتا ہے تو ایک اعلیٰ اور برتر قوت کی اطاعت سے معاشرتی زندگی میں ترتیب و توازن اور نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔

معاشرے کی تعمیر کے مختلف اعمال میں اجتماع، تعامل اور تنظیم بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں کی تکمیل کے لئے سیاست اور سیاسی نظام کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اجتماع کا مدعا یہ ہے کہ اس نظم اجتماعی کی بنیاد استوار کی جائے کہ جس کی وجہ سے خیالات و احساسات میں اتحاد اور یک رنگی، شرکت پیدا ہوتا ہے۔ مذہب کے سوا تعامل کے پیدا کرنے میں جنگ اور قوت کو بے حد دخل ہے اس لئے سیاست کے فکر و عمل میں ان کو داخلی اور خارجی جہت میں مؤثر دیکھا جا سکتا ہے اس کی تردید ناممکن ہے اور اگر سیاست اپنے اس مؤثر کو کھو دے تو اس کا مغلوب ہو جانا ایک لازمی نتیجہ ہے رعب و غلبہ ہیبت کی وجہ سے جبن و نامردی، خوف اور بے ہمتی کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لئے ان بد اخلاقیوں کی بنیاد پر دوسری اور بد اخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں اور نتیجہ قوم اور اس کے سیاسی نظامات مٹ جاتے ہیں۔ انہیں اسباب کی بنا پر سیاست کی پہلی منزل ہی میں جنگ کی حربی قوتوں کو بے حد دخل ہے۔ دوسرے اور نظامہائے افکار کے مقابل سیاست کے ان داعیات پر اسلام کو بے حد اصرار ہے تا آنکہ اسلامی اعتقادات کے ارکان خمسہ میں ایک لازمی عنصر جہاد بھی ہے۔ اس کی تردید کو اسلام کفر قرار دیتا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ ہر فرد اس رکن کی تکمیل کو اپنا مقدم فریضہ حیات قرار دے دے مستقل نظم اجتماعی کے قرار واقعی قائم ہونے کے لئے افراد کی معاشرتی حیثیت کا متعین ہونا ضروری ہے اسلئے اسلامی سیاست کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انفرادی خواہشوں اور جبلتوں، شہوات جنسی، انتخاب جنسی، ہر دلعزیزی، دولت، صحت، علم، جمالی ذوق، اخلاقی احساسات اور دیگر امیال و عواطف میں ایک ممتاز حد قائم کر دی جائے تاکہ ہر موقع پر جبلی اجتماعی قوت انتخاب سے کام لیا جائے تحدیات کی ایک اور علم بھی ہے اور جو بجائے خود اسلامی سیاست کی جان ہے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ معاشرہ اپنی ذات کو محسوس کرے تاکہ اپنی راہ ارتقا کو خود معین کر سکے اسی کا نام جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے معاشرتی شعور ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں ان معاشرتی اور سیاسی قوتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرا دوں جن کا ذکر منصفاً اسمال[12] نے سوسائٹی کے مطالعہ کی تمہید میں کیا ہے۔ ہر جماعت میں نفسی قوتوں کی ایک وقت میں ایک معینہ مقدار ہوتی ہے اگر یہ قوت ایک طرف بڑھائی جائے تو اعتدال و توازن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کو دوسری طرف گھٹا یا بھی جائے، انفرادی نفسی اعمال اس قانون کی صحت کی توثیق کرنے میں اجتماعی نفس کے بارے میں اسکے صحیح ماننے میں علما کو اختلاف ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ معاشرتی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس کی روبلا شبہ ایک مدت تک ایک خاص رخ پر جاری رہتی ہے اور پھر جزر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس حد تک معاشرتی بقائے قوت اور استحالہ قوت کے قانون کے ماننے والے بالکل متفق ہیں۔ معاشرتی یا نفسی قوتیں کیوں ایک مرکز پر باقی نہیں رہتیں اور

1, Inge: Psycology of Faith 2, J. Wach The Sociology of Religion 3, R. Krishnan: Reign of Religion in Contemporary of Philosophy 4, Psychologie des Individuellen 5, Kimball Young: Personality and Problems of Adjustment. 6, Eliot 7, Park: Culture & Culture Trends 8, Reuter: Introduction to Sociology 9, Malinowsky: A Scientific Theory of Culture 10, Lee Alfred: Public opinion in Relation to Culture 11, Hertzler: Social Institutions 12, Small: Introduction to the Study of Society.

کن اسباب کی بنا پر جزر کا عمل شروع ہوتا ہے، یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کے جواب دینے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ عمرانی قوانین میں اجتماعی نصب العین، اجتماعی انتخاب، تقلید، ہمدردی، شعوری مشابہت، اضطراری عمل اجتماعی اور روایات کے قوانین کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو متذکرہ سوالات کا جواب نکل آتا ہے۔ سیاست اور معاشرت کی نفسی قوتوں کے ایک مرکز پر جمع ہونے کا اہم سبب یہ ہے کہ قوم کے تشخصات یا نفس ناطقہ بیدار ہے اور اسے اپنے نظام اخلاق، کلچر، روایات اور اجتماعی ورثے کا پورا پورا احساس ہے اور عملاً وہ زندگی میں موثر ہیں۔ ہوشیاری اور احساس کے اس عمل میں فتور پیدا ہو جائے تو جزر کا واقع ہونا ضروری ہے اور جب کلیۃً ان میں جمود و انقطاع واقع ہوتا ہے تو ان کا بٹ جانا بھی لازمی اور عین مطابق قانون فطرت ہے۔ قوتوں کا جزر آثار زوال ہے تو مٹنے کے معنی یہی ہیں کہ اب قوم کی ہلاکت قریبی ہے۔ عروج و زوال امم کا جو فلسفہ قرآن شریف میں پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں متذکرہ توضیح بے معنی نہیں رہتی۔ عروج کا قانون یہی ہے کہ اللہ کی رسی کو تھام لیا جائے واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا اور زوال یہی ہے کہ اس رسی کو چھوڑ دیا جائے۔ خدا اور مذہب سے بغاوت کے نتیجہ کے طور پر قوم بنی اسرائیل، ملکہ سبا، نوح، لوط، عاد و ثمود غرض یہ کہ وہ ساری قومیں مٹی ہیں جن کا کنایۃً اور صراحتاً ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ کی رسی کو عصر حاضر میں انہیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جن کا بار بار ذکر مقالہ ہذا میں کیا گیا ہے۔

مبحث بالا کی روشنی میں آپ سیاست، معاشرت، اقتصاد اور زندگی کے تمام دائروں میں قوانین پاس کر سکتے ہیں، اصلاحیں کی جا سکتی ہیں اور نظامہائے زندگی کی تشکیل جدید عمل میں لائی جا سکتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اگر یہ سب تدبیریں معاشرتی اور نفسی قوتوں کے علاوہ قوم کے مقومات، کلچر اور روایات کے خلاف ہوں گی تو ان کا بے کار ثابت ہونا لازمی ہے۔ یورپی نظاموں کے دلدادہ، جمہوریت و اشتراکیت کے پرستاروں کے علاوہ وہ لوگ جو کسی نظریے کو پیش نظر رکھ کر سیاست اور معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں، انہیں بہت جلد اس کا احساس ہو جائے گا کہ وہ معاشرتی و سیاسی ارتقا کی بنیادی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اصلاح کا عمل دائمی معاشرتی قوتوں اور قوانین کا پابند ہے جن قوانین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ زندگی اور زندگی کے عام نظاموں کی طرح سیاست و حکومت بھی روایات کے قانون کے ماتحت ہیں۔ یہ قانون ایک خاص اصول کے ماتحت ہے۔ روایات کا دباؤ اور تحکم اسی نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے عقیدے کا عنصر زیادہ اور تنقید کا عنصر کم ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی ملک، اس کے ادارے قوانین اور سیاست و حکومت سے خالی نہیں، انہیں کی بنا پر دنیا کے قوانین کا ایک جز لکھے ہوئے قوانین کے علاوہ بے لکھے قوانین پر مشتمل ہوتا ہے انہیں کو ڈائسی[1] اپنی کتاب دستور کے قانون میں کنونشن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ عملی سیاست بھی روایات سے خالی نہیں۔ جمہوریت کے باوجود انگلستان میں بادشاہ کا وجود، روس و جرمنی میں شاہی کے بدل آمریت کا احیا آپ خود غور فرمائیں کہ کن حقائق کی ترجمانی کرتا ہے؟ جمہوریت کی ناکامی کے باوجود انگلستان، امریکہ اور دیگر ممالک میں اس کا تسلسل کیا معنی رکھتا ہے؟ وائمر کنسٹی ٹیوشن اور جمہوری نظام کی جرمنی میں ناکامی کس چیز پر دلالت کرتی ہے؟ دنیا کی ہر قوم اپنی زندگی اور زندگی کے نظاموں میں روایات کے باقی رکھنے پر مصر ہے تو آپ کا ان پر تیشہ چلانا کیا اس سیل عرم کا پتہ نہیں دیتا جو قوم کو ڈبو دے گا۔ روایات ہی کے ذریعہ زمان و مکان کی عمرانی حقیقتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ آئین اسٹائن کے نظریہ اضافیت کی جان یہی مسئلہ ہے تو آپ یقیناً اس کی تردید نہ کر سکیں گے۔ زندگی کی تبدیلیاں نہ تو سادہ کہی جا سکتی ہیں اور نہ خالص۔ زندگی کا قدم جب آگے بڑھتا ہے تو راستے میں ایسی قوتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو بظاہر مخالف سمت لے جانا چاہتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کی قوت اور حرکت کا انحصار ماضی ہی کی قوتوں پر ہے۔ ان اسباب کی بنا پر علامہ اقبال کا یہ استدلال صحیح ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں میں قدامت کی قوتوں کے عمل اور ان کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

موج ادراک تسلسل زندگی است ۔ مے کشاں را شور قلقل زندگی است

1, Dicey: Law of the Constitution

یاد رکھئے کہ فلسفے کے یہ مسائل عملاً آج کی دنیا میں سائنس اور علوم عمرانی کے اہم مسائل ہیں تاکہ ایجابی و عملی صورتوں سے انہیں اسباب کی بناء پر بحث کرتا ہے۔ افراد کے عمل کے ماورا کوئی مافوق الافراد نفس موجود نہیں البتہ جماعت میں منفرد ذہنوں کے خیالات، جذبات اور احساسات کے اتحاد سے ایک نئی نفسی قوت پیدا ہوتی ہے اسی کو اجتماعی نفس اور سیاسیات میں رائے یا ارادۂ عامہ کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے سیاست اور معاشر کی ترتیب کو بدلا جا سکتا ہے اور یہ اقتضائے زمانہ اور حوادثات عالم کی مناسبت سے ضروری بھی ہے۔ معاشرہ یا نفس اجتماعی اگرچہ جزئیات کو افراد کے غیر شعوری اتحاد عمل پر چھوڑ دیتا ہے اور زندگی کے عام اصولوں سے سروکار رکھتا ہے تاکہ اپنی قوت کو اجتماعی تحریکوں کے رخ بدلنے میں صرف کیا جا سکے۔ یہ عمل غیر شعوری اتحاد عمل اجتماعی ورثہ اور مشخصات خصوصی کی شاندہی کرتا ہے تو رخ بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ تحریکیں قوم کے مزاج کے مغائر نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ جس کے تحت سیاست و حکومت بھی ہے ایک مستقل بالذات کل ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے وابستہ ہیں جو تبدیلیاں تہذیبی و ذہنی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کے لئے وقوع پذیر ہوتی ہیں ان کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے یہی نفس اجتماعی کا خاص وظیفہ ہے۔ اس کا اظہار احساسات، ارادہ اور رائے عامہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ یاد رکھئے کہ اس قسم کے سوال، جن کا تعلق ہی نفسیاتی قوت ہو جو افراد کو باہم مربوط و مشترک رکھ سکتی ہے، سلطنت عثمانیہ اور ہندوستان کو توڑ کر الگ الگ کر دیا تو اس کی نفسیاتی کیفیت و عمل پر اسلام نے ارتداد دیا ہے تو اس کی تصدیق کے لئے صداقت کا اور اس سے بڑھ کر یہ ثابت چاہئے کہ جدید علوم عمرانی اس مسئلہ و بنیادی خیال میں متفق اسنان ہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ احساسات اور صحیح علم سے کام لیں۔ علم سے مراد وہ علم نہیں جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ اس سے تسخیر کائنات تو ممکن ہے لیکن علامہ اقبال کے قول کے مطابق جب تک یہ دین کے ماتحت نہ ہو شر انگیز ہے۔ سوا علم حق تک رسائی وجدان سے ہے یہ علم شعور میں سما نہیں سکتا۔ اس کی بنیادیں روحانی و وجدانی ہیں اور یہی علم کی آخری منزل ہے۔ اسی کو علامہ موصوف نے عشق کے نام سے یاد کیا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانیت، تمدن، کلچر، دولت، نظامات غرض ہر گوشۂ زندگی، بجز و کل عشق ہی کے ذریعہ مبنی ہے جن لوگوں نے تمدن کی خدمت اور اس ذریعہ سے شہرت دوام حاصل کی ہے وہ حقیقت میں اپنے اپنے اقدار حیات اور نصب العین کے عاشق تھے، اور اسی وجہ سے عام طور پر مجنوں کے لقب سے مشہور ہوتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا مجنوں کی محتاج ہے ؎

قدم یہ ساقی مرد وشں کے بام دے مارا یہ بے خودی نے کیا کام ہوشیاروں کا

ہوشیاری کے بجائے عشق کی ضرورت ہے تو پھر زندگی کی زحمت و منفعت میں آپ کیوں ادھر ادھر سرگرداں پھریں۔ دوسرے نظاموں اور تحریکوں کی طرف نظر اٹھانا ذہنی پستی نہیں بلکہ عجز کے مترادف ہے سوال آمیز نگاہ آپ کو منزل مقصود تک نہ پہنچا سکے گی۔ آپ اپنی طرف اپنے نظاموں، کلچر، مشخصات خصوصی، اجتماعی ورثہ اور اپنے ماضی و سلف کی طرف دیکھئے۔ یہیں سے آپ کو اپنی جادۂ منزل نظر آئے گی۔

دلا نارائی پروانہ تا کے نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز طواف آتش بیگانہ تا کے

حال ہی کی وجہ سے اب تک ہم نے بہت سی لعنتیں برداشت کی ہیں وقت کا تقاضا ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ذہنی آزادی کی طرف بھی قدم بڑھایا جائے۔ آپ ذہنی حیثیت سے آزاد نہ ہو سکیں گے جب تک کہ سوال اور یورپ کے ذہنی دباؤ کے طوق کو اپنی گردن سے اتار نہ پھینکیں۔ وہی تو ہیں حقیقی معنوں میں آزاد کہی جا سکتی ہیں جو سیاسی اور ذہنی حیثیت سے آزاد ہوں۔ جب تک ذہن غلام ہے آپ سیاسی آزادی کے باوجود آزاد نہیں کہے جا سکتے۔ یورپ نے سب سے پہلے آزادی کی طرف جو قدم بڑھایا ہے اس کی ابتدا ذہنی غلامی کی جنگ سے شروع ہو رہی ہے۔ بکل[۲]

(۱) Burey: Reason in [illegible]
(۲) Buckle: History of Civilization

ہیکے[1] اور موجودہ زمانے کے مورخین نے جو کتابیں آزادی کے عنوان پر لکھی ہیں ان کے مطالعہ سے آپ خود یہ نتیجہ اخذ کر سکیں گے کہ یورپ کو اسپین اسی طرح نصیب ہوا کہ وہ سیاسی حیثیت سے آزاد ہونے سے پیشتر ذہنی حیثیت سے آزاد ہو چکا تھا۔ ہم اپنی قوم کی ذہنی غلامی اور تخریب کے خلاف نعرہ زنی کرتے ہیں۔

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست ۔۔۔ تجلیٔ دگرے در خور تقاضا نیست

غور کیجئے کہ آپ کی تحریکوں، خیالات، اداروں، نظاموں، انجمنوں غرض ہر قسم کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے جزو و کل میں کیوں افراتفری غالب ہے۔ آپ اس نکتہ کو بھلا چکے ہیں کہ آپ کی معاشرتی، سیاسی اور ذہنی حد، جس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز نظم و ضبط ہی ہے، وہ رو بہ سے مفقود ہے۔ آخر یہ صورت حال کس چیز کی غمازی کرتی ہے۔ غور کرنے پر غالباً آپ خود اس نتیجے پر پہنچ سکیں گے کہ اس کا سبب وہی یہی ہے کہ آپ کی انفرادی اور قومی زندگی کے رشتے اجتماعی ورثہ، کلچر، مقومات، اور نظام اخلاق سے منقطع ہو چکے ہیں۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن ۔۔۔ زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

مرگ فرد از خشکیٔ رود حیات ۔۔۔ مرگ قوم از ترک مقصود حیات

قوم اپنی روح و معنی کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتی جب تک کہ غائر نظر سے وہ اپنی تقدیری سوانح حیات اور اس کے ارتقائی منازل کا مطالعہ نہ کرے۔ اشپنگلر[2] وکروچے[3] کے سوا بعض مفکرین تاریخ اس پر متفق ہیں کہ تدریجی لیکن اجتماعی طور پر قوم اپنے متنوعہ ثقافتی روایات، نظاموں اور اجتماعات ہی کی قدر و قیمت اور ان کو نظر استحسان سے دیکھنے اور عمل کو اپنی زندگی میں موثر کرنے کے وحدت و جمعیت کا حاصل کر سکتی ہے یہی ایک متعین طریقہ ہے کہ جس کی روشنی میں ذہنی پختگی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر اقبال کی یہ تنبیہ قابل غور و عمل ہے۔

ہمہ گرہ از رشتۂ خود وا کند ۔۔۔ تا سر تار خودی پیدا کند

قوم چوں انفت بکار روزگار ۔۔۔ این شعور تازہ گردد پائیدار

سرگذشت او گر از یادش رود ۔۔۔ باز اندر نیستی گم می شود

سیاست و حکومت کا مدعا و منشا بغیر نصب العین کے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس نقص کی وجہ سے قوم کی جسمانی اور ذہنی قوت شل و بیکار ہو جاتی ہے افراد قوم کے اعمال میں تضاد و اتحاد عمل کا موجود نہ ہونا، ذہنی ہبوط و عصبیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ انقلابات، سیاسی شورشیں، معاشرتی احتجاج و مخصوص اصولوں کی تبلیغ مثلاً اشتراکیت، سیاسی و معاشرتی نصب العین کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن بجائے خود یہ کافی نہیں۔ باضابطہ طریقہ اور معینہ اصولوں کے مطابق معاشرہ و سیاست کے لئے اپنے مقاصد و نصب العین کا حاصل کرنا ممکن ہے ماحول کی قوتوں کے ساتھ اپنے ذہنی حالی مشخصات، اور نظام اخلاق سے کام لیا جائے تو معاشرہ و سیاست باقی رہ سکتے ہیں معاشرتی و سیاسی قوتوں کے ساتھ ان کے اجزاء میں توازن اسی ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے ربط و ہم آہنگی کے ساتھ قوت ہی نہیں بلکہ دوامی ترقی بھی نصیب ہو سکتی ہے۔ سیاست کو اپنی حالت کا شعور و علم حاصل رہے تو قانون حکومت، اخلاق، مذہب غرض زندگی کے سارے نظام کو وہ معیار قائم کر سکتی ہے۔ ہم انتشار و ذہنی عیاشی کے منتہائے کمال پر پہنچ گئے ہیں اس لئے حصول اقتدار و نصب العین کیلئے اب وقت نہیں کہ اس حالت کو باقی رکھا جائے۔ حکومت قائدین اور جملہ کارکنان قوم سے پرزور مطالبہ ہے کہ جبر سے اس نظم و ضبط کو قائم کیا جائے کہ جس کے ذریعہ ہم مجبور ہیں کہ اپنے مقومات اور نظام اخلاق کی طرف رجوع کریں۔ ان سب کے مقابل حکومت کی ذمہ داری وقیع بھی ہے اور اہم بھی۔ جامعہ، عدلیہ اور مقننہ کے ذریعہ وہ بہت اہم اور ٹھوس خدمات انجام دے سکتی ہے مثلاً

1. Lecky: History of European morals. 2. Spengler: Untergang des Abendland. 3. Croce: History in Evolution.

قانون ہی کے جزو پر غور کیجئے۔ یہ خود ایک حلقہ ہے اور جب ارادۂ اجتماعی یا نفس اجتماعی کی تائید سے اس کا نفاذ ہو جائے تو وہ بجائے خود نصب العین کا
کام دے سکتا ہے عمرانیات کا یہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ نفس اجتماعی کی قوت انتخاب جو معاشرتی حالات پیدا کرتی ہے، وہ انفرادی قوت انتخاب کو بڑی حد تک
مغلوب کر دیتی ہے اس کا ثبوت عصر حاضر کا فاسسطی اور اشتراکی نظام ہے فسطائیت سے ہٹ کر اطالیہ اور جرمنی میں جب محال تھا تو اشتراکیت کے
مقابل کسی اور خیال کا دل میں جگہ دینا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ہزاروں جانیں اس عصبیت کا شکار ہو چکی ہیں قتل و غارت، جلا وطنی،
تعزیر و عقوبت، جسمانی تعذیب جیل اور دریائے جبور شور کی سزائیں سیاست کا جزو بنی رہیں اور اب بھی روس کی حد تک بنی ہوئی ہیں اس ڈرامے کے
سین کا یہ اچٹتا خاکہ ہے، اس عصبیت جاہلیہ کے خلاف لاسکی نے لبرٹی ان دی ماڈرن اسٹیٹ Liberty in Modern State
ٹیلر نے دی اسٹراٹجی آف ٹیرر The Strategy of Terror اور ایگز ہڈلے اور ایج آف ان ریزن Age of Unreason
[illegible] میں نعرہ زنی کی ہے منجملہ ان گنت اشخاص اور کتابوں کے یہ چند نام پیش کئے گئے ہیں ڈاکٹر اسٹیکل Stekel جو
ویانا کا عالمی ماہر نفسیات تحلیل ہے اس نے نفسیات کی رو سے آمروں یا ڈکٹیٹروں کی ظالمانہ ذہنیت کا جائزہ لیا ہے اور جو بے پناہ سیلاب ظلم
اٹھتا ہے اس کی تشریح کی ہے۔ مولہ بالا کتابوں کے سوا ہم استدعا کریں گے کہ ارباب علم و فکر وکلی کی ون ورلڈ، سمنر Sumner کی
ٹائم فار ڈیسیشن Time for decision اور گنتھر Gunther کی ان سائڈ یورپ Inside Europe
ضرور پڑھیں۔

مغرب کی ناکام سیاست

اب غور کرنا ہے کہ کیا یورپی نظامہائے سیاسیہ بالخصوص ڈیموکراسی اور کمیونزم ہمارے حسب حال ہو سکتے ہیں؟ کیا اس کے امکانات ہیں کہ کلی طور پر نہیں تو جزواً انکی روشنی
میں ہمارے نظام سیاسی و معاشرتی کی تشکیل ہو سکتی ہے؟ من حیث الکل کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ جزواً جزواً بھی یورپی نظام ہمارے
خصوصی داعیات زندگی کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ ہمارے مقومات اجتماعی ورثہ اور کلچر کی روح و رفتار کے اعتبار سے متضاد
و مخالف واقع ہوئے ہیں جسم و روح، سیاست و مذہب، مادہ، وجدان اور علم و عشق کی وحدت کے بجائے یہ نظام خواہ ان کے اشکال و شیون
مختلف ہی کیوں نہ ہوں دوئی کے نظریے پر قائم ہیں اس لئے کج فطرتی، بدگوہری، بت پرستی، بت فروشی، بت گری، بر ہنگی ان کے خمیر میں داخل ہیں
اور یہ انسانیت کے لئے حجاب اکبر بنے ہوئے ہیں:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

عمومیت خود یورپ میں ناکام ہو چکی ہے۔ لاسکی نے Democracy in Crisis زمرن نے Democracy
اور لاک نے Limits of pure democracy میں اسی ناکامی کا نوحہ کیا ہے۔ ڈب، کول، ہیرن شا، برنارڈ شا،
ہرنی بارنس، برگس، بارکر و بیسیوں امریکن و برطانوی مفکر جمہوریت و عمومیت کے مقابل متبادل نظام پیش کرتے ہوئے اس کی آئندہ کامیابی سے
متعلق شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً جرمنی، اٹلی اور دیگر ممالک میں ڈیموکریسی کے مقابل جو نظام وجود میں آئے وہ نتیجہ تھے ڈیموکریسی کی ناکامی
کا۔ یورپی تہذیب و معاشرت میں جو چیزیں اصول زندگی کے طور پر داخل ہیں وہ سیاست میں بھی غالب ہیں۔ مکر و فریب۔ استحصال۔ خوف
کین و دروغ، کینہ، نفس، تلبیسات، عناد و انتقام و کراہت کے سوا یورپ کے یہ دو مشہور نظام فطرت انسانی کے خلاف ہیں۔ انہیں اسباب

کی بنا پر جدید دور کے مفکرین سے بہت پہلے ڈیموکریسی کے نامقصد ہونے کے متعلق جیمس مل اور اس سے پہلے تین [illegible] نے بھی اظہار کیا تھا۔ آخرالذکر کی رائے تھی کہ یہ نظام ناکام ہوگا۔ اقبال اور فن کارِ اعظم ان حقیقتوں سے واقف تھے اسی لئے انہوں نے بارہا اس کا اعلان کیا کہ عمومیت یا جمہوریت عالم مشرق کے لئے موزوں نہیں۔ جمہوریت کا اقتدار ایک بڑا دھوکا ہے عوام بحیثیت اجتماعی کردار کے ماتحت ہوتے ہیں حکومت کرنا تو رہا ایک طرف عمومی مسائل اور سیاست کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ ایک مستقل ہی فرد یا صرف چند افراد شخص واحد کے ماتحت ہوتے ہیں مثلاً کہیں جمہوریت کا کہیں وجود نہیں۔ پانی کے ان گنت بڑے سے بڑے دائرے جس طرح پھیلتے چھوٹے دائرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جمہوری حکومتوں کے جملہ ادارے ایک شخص واحد کے حکم کی بجا آوری میں فنا ہو کر رہ گئے ہیں جملہ عہدیداران اور عہدے دار ایک شخص کی قیادت میں ضم ہیں یہ شخص واحد متعلقہ شعبہ کا وزیر ہے جو کابینہ کا رکن ہوتا ہے۔ کابینہ کے جملہ ارکان بالآخر ایک شخص یعنی وزیر اعظم کی شخصیت میں گم سم ہو کر رہ جاتے ہیں اس کی رائے اور پالیسی سے انحراف کیا جائے تو وزیر کو مستعفی ہونا پڑتا ہے مقننہ عوام کی آواز کہا جاتا ہے لیکن مختلف سیاسی جماعتیں اپنے مقامی قائدین کی تابع ہوتی ہیں اور یہ قائدین آخر میں ایک مرکزی قائد کی شخصیت میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے طور پر کچھ کہہ نہیں سکتے تاوقتیکہ لیڈر اس کی اجازت نہ دے۔ جذب و فنا کا یہ عمل جب منتہائے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر مقننہ میں بھی حکومت اور حکومت کا غالب شخص یعنی وزیر اعظم ہی بھرا نظر آتا ہے ذہن پر کیا موقوف ہے حکومت کی مشینری کا بھی عالم ہے اس کے فیصلہ جات میں ہاتھوں کی کثرت کو دیکھا جاتا ہے عقل و ذہن تو پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اشخاص جو ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں وہ ابھرنے نہیں پاتے۔ ان کی عقل اور شخصیت بھی اجتماع اور اجتماعی کردار [illegible] کے ماتحت ہو کر رہ جاتی ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر آنسٹ کی نے گرامر آف پالٹکس میں عمومیت کے لئے [illegible] لازمی قرار دیا ہے کہ شخصیت کی تکمیل اور خودی کی آبیاری کرے۔

عمومیت یا جمہوریت کا تخیل کوئی نئی بات نہیں دنیا کی ہر قوم نے اس طرز فکر کو آزمایا ہے لیکن ہر بار جمہوریت مٹتی اور شخص واحد کی حکومت ابھرتی رہی عبرانی جمہوریہ کے مٹے ہوئے آثار پر یونانی کی جمہوریتیں وجود میں آئیں۔ یہ بھی مٹ گئیں تو رومی جمہوریتیں اور سب سے آخر یورپی جمہوریتیں وجود میں آئیں زندگی ہی میں جب وہ ایک شخص واحد کے عروج کا مظہر و آماجگاہ بن جاتی ہیں تو فنا پذیری کے بعد بھی اس کے نقوش اسی وحدت کو ابھارتے ہیں ارسطو نے افلاطون کی اسی عینیت پسندی کی وجہ سے سخت تنقید کی ہے اور جمہوریہ کو ایک بگڑا ہوا نظام قرار دیا ہے۔ ہندوستان بھی جمہوریت کی اس آزمائش میں کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ جمہوری حکومتیں قدیم دور میں یہاں وجود میں آئیں ان کا آخری درجہ نتیجہ ہوا اس سے ہر شخص واقف ہے عمومی حکومت جس میں ہر شخص بجائے خود مقتدر اعلیٰ سمجھا جاتا ہے خیالی چیز ہی نہیں بلکہ ذہنی عیاشی ہے۔ ارادہ عامہ، رائے عامہ، مساوات، آزادی اور عمومیت کی پیدا کردہ دیگر اصطلاحیں سب شعبدہ، زبانی بانسری بجانے کے درخت ہو کے موجود ہوگئے۔ رائے اور طرز عمل کے اختلافات کے علاوہ ہر شخص کی بات سننے اور ہر شخص کو حکومت میں حصہ دار بنانے کے واہمہ سے قوت عمل کا اسراف ہوتا ہے دوسرے اور نظام سیاسیہ کے مقابل قوت حیات کی کمی و سستی، سمجھ بوجھ کی کمی، ستھراپن اور کاہلی کو آپ عمومیت ہی میں زور آزما پائیں گے۔ آجر و اجیر، سرمایہ و مزدور، بیروزگاری اور دیگر معاشی، معاشرتی، نفسی خرابیاں بھی انہیں اسباب کی بنا پر عمومیت کے ہم رکاب ہیں۔ جمہوریت کی یہ خامیاں ایک جداگانہ موضوع بحث اور تشریح و وضاحت کے لئے ایک کتاب کی محتاج ہیں اس لئے علوم عمرانی بالخصوص عمرانیات، نفسیات اور سیاست کے مفکرین کی رائے کو جس کا خلاصہ مارشل نے پیش کیا ہے پیش کرتے ہوئے بحث کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ ملیک مارہ پارک کنڈنگر کی آرا کو جو بڑی اہم ہیں یہاں پیش کیا جاتا لیکن بنظر طوالت و صبر طلبی ان کو بھی ختم کر کے صرف ایک پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں نظام حکومت کے لحاظ سے دیکھئے تو ایک روشن خیال شخص واحد کی حکومت سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے اور اسی میں قوت عمل کی سب سے زیادہ کفایت ہوتی ہے۔ وہ جو تجویز کرتی ہے مفاد عامہ کو مدنظر رکھ کر

کرتی ہے اور اسے اپنے ارادے اور اختیار سے اس طرح عمل میں لاتی ہے کہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔

فتنۂ اشتراکیت

عمومیت کے مقابل اشتراکیت کی صداقت کا انحصار صرف اس کیفیت پر ہے کہ جس میں ایک شخص واحد کو غلبہ حاصل ہے اس کیفیت میں بھی پورے نظام سیاسی کی طرح بدیہی مقدمات، تجربات اور استقرا کے بجائے مجرد وہم و خیال اور فطرت انسانی کی تردید پر ساری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ یورپ کے عقلا اس کو مانتے ہیں کہ مقدمات، تجربات اور استقرا انسانی کی خصوصیات اور فطری تقاضے ہیں اس پر بھی ان سے صرف نظر کرنا بڑی ستم ظریفی ہے۔ اشتراکیت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ عمومیت۔ تاریخی سرگزشت کا تصور نہ ہوتے جدید اشتراکیت کے متعلق اگر یہ کہا جاتے کہ اس کے مفکرین بھی بنیادی حیثیت سے کبھی ایک نہیں رہے تو غلو پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ ضد و اختلاف اس کے بیخ و بن میں داخل ہے چنانچہ کارل مارکس کا معاصر لوئی بلان Louis Blanc خیالاً و عملاً مارکس کی تائید میں نہیں یہ ایک بدیہی بات ہے کہ وہی مطالبات کامیاب ہوسکتے ہیں جو انسان کی طبیعت و مزاج کے مناسب ہوں تو اشتراکیت نہیں چاہتی کہ ان کی تائید کی جائے سب سے بڑا ستم یہی ہے۔ عملی صورت گری کا وقت جنگ عظیم کے زمانے میں آیا تو فطرت انسانی کی تردید اور نظام فکر کے تناقضات ہی کی وجہ سے اس نظام نو سے مختلف و متضاد صورتیں پیدا ہوئیں۔ اشتمالیت، لاقانونیت Anarchism تہدیدیت Terrorism ٹریڈ یونینزم Trade Unionism گلڈ سوشلزم Guild Socialism سینڈیکالزم وغیرہ کے سوا عملاً بھی یہ تحریک دوسرے ممالک میں جاکر بالکل مختلف ہوگی۔ جرمن میں نازی اقتدار سے پیشتر Social Democracy اور بعد میں نیشنل سوشلزم، انگلستان کی لیبر پارٹی اور امریکہ کی کمیونسٹ تحریکیں اس کا ثبوت ہیں۔ روس کے اندر بھی فکر و عمل کے اختلافات ہمیشہ رہے تا آنکہ لینن، ٹراٹسکی کی مخالفتیں اور خود دستور کی تبدیلیاں اس کی شاہد ہیں کہ کمیونزم کا نظریہ پوری طرح عملی صورت اختیار نہیں کرسکا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے دستور کے مقابل سنہ ۱۹۲۳ء کے دستور میں جو تبدیلی کی گئی اس کے نتیجہ کے طور پر مذہب کو ایک شخصی معاملہ کے طور پر تسلیم کرلیا گیا اس کو مخالف مذہب اور الحاد کے پرچار کی بھی اجازت دی گئی۔ سنہ ۱۹۳۶ء کی تبدیلیوں میں اس کا لحاظ رکھا گیا کہ اجارہ داری کے بغیر متعلقین کی حفاظت کیلئے رقم کے پس انداز اور جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسری عالمی جنگ میں گرجے کھول دیے گئے، معاشرتی اور جنسی خرابیوں کی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ قانون اور اخلاق کے حدود میں شادی اور بچے پیدا کرنے کی اہمیت کو قومی نقطہ نظر سے لازمی قرار دیا گیا۔ بالشویک روس کے دستور کی قابل غور بات یہ ہے کہ تین سو کے لگ بھگ اقلیتوں کے حق خود ارادیت، کلچر، زبان، مذہب اور ان کے خصوصی مقومات اور داعیات زندگی کو تسلیم کرتے ہوئے داخلی حدود ہی میں نہیں خارجی معاملات میں بھی آزادی کو مان لیا گیا، اگرچہ یہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے تابع ہیں، صدا زراں، زمین فطرت انسانی میں داخل ہیں اس فطرت کو زور اور تشدد کے ذریعے دبایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان داعیات کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ پہلے کے مقابلہ میں اشتراکیت کے فکری و عملی نظام میں بہت بڑی تبدیلی ہوچکی ہے اور آئے دن اس کا قدم اور بھی سرعت کے ساتھ آگے بڑھتا جارہا ہے،

کارل مارکس نے جن تصورات کو پیش کیا تھا ان میں نمایاں تبدیلی لینن نے کی۔ ٹراٹسکی نے جو کتاب کمیونزم پر لکھی ہے اس میں اس کی صراحت موجود ہے لینن کے خاکوں کو اسٹالین نے بدلا۔ مرائس ہنڈس کی حالیہ کتاب ماوراء ایشیا سے آپ کو کس حد تک ان کا علم ہوسکے گا۔ تبدیلیوں کا یہ پیہم سلسلہ اس چیز کی نشاندہی کرتا ہے کہ کمیونزم کے اصول و فروع میں بنیادی غلطیاں موجود ہیں۔ یہ غلطیاں فروعی نہیں بلکہ اس قدر عظیم ہیں کہ ان سے فطرت انسانی کا بطلان ہوتا ہے انہیں اسباب کی بنا پر اکثر سیاست دان، عمرانی و نفسیاتی مفکر اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہیں تا آنکہ بنی ورم لکھتا ہے کہ اشتراکیت کا موجودہ نظریہ پورے طور سے عملی صورت کبھی اختیار نہیں کرے گا۔ کارل مارکس نے اپنے افکار کی عمارت ہیگل کے فلسفہ جدل پر قائم کی ہے یہ فلسفہ بجائے خود غلط اس وجہ سے ہے کہ ضد سے اگر دوسری ضد پیدا ہوتی ہے تو اس میں تخریبی قوتوں کے ساتھ تعمیری قوتوں کا بھی موجود ہونا ضروری ہوجاتا ہے۔ ضد سے ضد ہی کی تخلیق مان لیا جائے تو پھر انقلاب کا فلسفہ بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے کیونکہ مفکرین نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر انقلاب اور

اس کی خرابیوں سے افراد کے تعمیری موثرات ابھرتے ہیں۔ ہمارے ان خیالات کی تائید رابرٹ ہنٹر کی کتاب "انقلاب کیوں، کیسے اور کب" سے
ہوتی ہے۔ مارکس کا طبقاتی نظریہ بھی ہوائی قلعہ سے کچھ کم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنگ اور طبقاتی کش مکش معاش کا ایک اہم پہلو ہے لیکن بجائے خود
یہ سب کچھ نہیں۔ بسا اوقات معاشرے میں ممکن ہے کہ معاش ہی ایک اہم وظیفہ قرار پائے لیکن اس کی نوعیت بھی فرضیہ سے کچھ زیادہ نہیں۔ حقیقی وجود
متحرک معاشرے ہی کا ہے اس لئے ممکن نہیں کہ ایک مظہر کو دوسرے مظاہر سے جدا کر کے غیر معمولی اہمیت دے دی جائے۔ مجموعی حیثیت سے معاشی زندگی
ایک وحدت ہے گو اس کے بہت سے الگ الگ حصے اور متعدد اغراض و مقاصد مل جل کر معاشرے کے تحفظ کا کام دیتے ہیں۔ مجموعی وحدت کے
قطع نظر یہ الگ الگ حصے بھی سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور دیگر مظاہر معاشرتی سے غیر منفک طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ ان حقائق کو کارل مارکس
دیکھ نہ سکا۔ اس نے معاشی نظریہ کی غلط تعبیر اپنی کتاب سرمایہ میں پیش کی ہے۔ اس کش مکش میں علم و قابلیت سے زیادہ کارل مارکس کے جذبات اس کی
ذہنیت پر غالب ہوتے ہیں۔ جلاوطنی، افلاس اور دیگر آلام و مصائب کی وجہ سے وہ سرمایہ اور دولت کا اپنے طور پر جو تجربہ رکھتا ہے اس
سے نفرت و کراہت کے جذبات کے رُخ کو اس نے سرمایہ داروں کی طرف پھیر دیا ہے۔ اپنے جذبات کو چھپانے کے لئے اس نے نظریہ کی صورت
دی ہے۔ پروفیسر سلگمن نے اپنی کتاب تاریخ کی توضیح میں انہیں وجوہ کے تحت تنقید کی ہے۔

مزدور و سرمایہ دار کی کش مکش اور ہڑتالیں بھی ذہن و فکر کے خود تراشیدہ اصنام ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ زندگی کے معیار کو بلند دیکھنا چاہتے ہیں
یہ بھی صحیح ہے کہ وہ آرام و عیش کے متقاضی ہیں لیکن دولت کی مساوی تقسیم، لوٹ، ظلم اور جبر کے علاوہ مذہب کے دشمن نہیں۔ عام آبادی کے
مقابل مزدور طبقہ مذہب سے کبھی علاحدہ نہیں رہا۔ اور نہ رہنا چاہتا ہے۔ خدا اور مذہب ان کے رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ تحریص اور لیڈروں
کے اثرات کی وجہ سے بعض بے اعتدالیاں ان سے ہوتی ہیں لیکن روح کا کرب انہیں بہت جلد ان سے متنفر کر دیتا ہے اور ان کی ضمیر کی خلش
کو اتنا ابھار دیتا ہے کہ وہ اپنے کئے پر پچھتانے لگتے ہیں۔

نفسیات کے بین الاقوامی ماہر پروفیسر انسپر انگر، شار موٹے بیولا اور دیگر عمرانی محققین کے تحقیقاتی بیانات سے ان مفروضات کا ثبوت
نہیں ملتا جو عرف عام میں مشہور ہیں۔ یہ سب مزدور لیڈروں کی خیالی باتیں ہیں۔ ایم بروس اور جان اسٹوارٹ نے جو کتاب مزدوروں کی نمائندگی و
قیادت کے نام سے شائع کی ہے اس سے امور متذکرہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ مزدوروں کے رجحان سے ہڑتال کے مسئلہ کا بھی نفسیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہڑتال
کے خواہشمند مزدور نہیں بلکہ اس کے داعی لیڈر ہوتے ہیں۔ انہیں اسباب کی بنا پر اکثر ہڑتالیں ناکام ہوتی ہیں۔ خود ہندوستان میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۴ء
تک جو ہڑتالیں ہوئیں ۲۱۲ کے منجملہ ۵۶ کامیاب ہو سکیں۔ ان میں کی آدھی بھی نصف حد تک کامیاب رہیں۔ غالباً آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ
نفسی و اعصابی بیماریوں کے قطع، معاشرتی مراتب بھی مزدوروں میں عام آبادی سے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ مذہبی و اخلاقی جمود، ذہنی و قلبی
ضعف، زنا اور دیگر حرام کاریاں، شراب خوری اور دیگر منشیات کی کثرت، غیر شادی شدہ زندگی اور پیدائش اولاد سے گریز یا شادی کر کے
عورتوں کو چھوڑ دینے کی عام عادتیں اور طلاق وغیرہم کا ان میں وجود نہیں۔ ڈی ہمفرے، بیٹ ای تھل، اے۔ ای میبل۔ ایل۔ ایل۔ جان۔

1, Robart Hunter : Revolution: why, How + when.
2, Karl marks : Das kapital 3, Prof Seligman : Historical Interpretation 4, M. Bruce + John stewart :- man who lead labour 5, Humphrey : Sociology + Social Re-search 6, Bert Eldel : women workers in Their Family Environment 7, A.E. Mabel : Social Disorganisation 8, L.L. John : Future of Labour.

آر۔ ای۔ مانٹ گامری[1]۔ اے۔ رےنلڈس[2] روزن فارب[3] اور دیگر محققین نے جنہوں نے اپنا موضوع مزدور کو قرار دے دیا ہے محولہ امور کی تصدیق کرتے ہیں۔ عورتوں کے مقابل مرد زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔ خودکشی کا ایک سبب معاشی بھی ہے لیکن یہ امر موجب حیرت ہے کہ عام انسانوں کے مقابل مزدوروں میں خودکشی کا رواج نہیں۔ معدودے چند خودکشیوں کے جو اعداد و شمار شائع ہوتے ہیں ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اسباب معاشی نہ تھے وہ مزدور جو خودکشی پر مجبور ہوتے ہیں، اس کا سبب اخلاقی یا شخصی حالات تھے یعنی کہ خانگی جھگڑے یا بے عزتی کا خیال۔

فکر و نظر کے سوا تطبیق عمل میں جو غلطیاں یورپ اور بالخصوص روس کے عمرانی معاشی اور سیاسی نظام میں پائی جاتی ہیں ان کی وجہ سے اعصابی اور نفسی خرابیوں کے قطع نظر سخت قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ پروفیسر اشپنگلر کا دعویٰ ہے کہ کوئی شخص بغیر خدا کے رہ نہیں سکتا "تا آنکہ دہریہ بھی نفی کے پیرایہ میں خدا کے وجود کا اقرار کرتا ہے" دوسرے اور بنیادی امور سے تعرض کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روس کے معاشرتی زندگی میں فتور کا اصل سبب مذہب سے انحراف میں پوشیدہ ہے۔ زنا، معکوس شہوت، جنسی خلاف فطری، مساحقت، جرائم کے بچوں کی کثرت، اسقاط حمل، ضبط تولید، رحم کا انقطاع، طلاق، مفارقت، آزمائشی شادیاں، سوزاک و آتشک سب ہی کی بھرمار ہے انگلستان میں جب قانونی ممانعت کے باوجود ساٹھ ہزار سے زیادہ فی سال ناجائز ولادت پیدا ہوتی ہے تو آپ غور فرمائیے کہ قانوناً جس کی ممانعت نہ ہو اس ملک کا کیا حال ہوگا۔ روس میں ۱۹۳۶ء میں ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے مرد و عورت کو اجازت دی تھی کہ اگر کوئی نوجوان اسکو چاہے تو بے چون و چرا وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔ تنہا ۱۹۳۶ء تک ناجائز اولاد کا جو تخمینہ لگایا گیا ہے وہ دو ملین سے کہیں زیادہ ہے۔

یورپ کے اور ممالک کے مقابل اسقاط حمل کی رفتار بھی روس میں ہمیشہ تیز رہی اور اب بھی تیز ہے چنانچہ ڈاکٹر ملر (Muller) نے جو کتاب جنگ حالیہ کے اختتام کے بعد شائع کی ہے اس سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ جنسی بیماریوں میں آتشک و سوزاک روس کے عام مرض ہیں آبادی کی بہت بڑی اکثریت ان کا شکار ہے اور انہیں کی وجہ سے ہر سال کئی بچے دوسرے ملکوں کے مقابل روس میں زیادہ مرتے ہیں ان حالات کے تحت آبادی کا گھٹنا لازمی تھا اور اسی لئے شادی کے اور طریقوں کو روک کر مستقل بنیادوں پر شادی کرنے اور زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی ترغیبیں دلائی گئی۔ غیر شادی شدہ لوگوں پر ٹیکس لگا دیا گیا، تو کثرت سے بچے پیدا کرنے والے خاندانوں کے لئے انعامات و وظائف مقرر کئے گئے

۱۹۳۳ء میں جے ای میکفرلین اپنی کتاب "دی کیس فار پولی گامی" "The case for polygamy" میں لکھتا ہے "ہم صرف اپنی عورتوں کو کسبی بنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جہاں جہاں ہم عیسیٰ مسیح کا پیغام لے جاتے ہیں ہم اس کے ساتھ اپنا معاشرتی نظام بھی لے جاتے ہیں اور غیر مسیحیوں کو آمادہ کرنے میں کہ وہ بھی ہماری طرح اپنی عورتوں کو بازاروں میں ڈھکیل دیں تاکہ وہ بھی ہماری عورتوں کی طرح بے ننگ و نام زنان بازاری بن جائیں۔

یہ کیفیت ان ممالک سے متعلق ہے جو عیسائیت کے پیرو اور حامی ہیں اب آپ ہی غور فرمائیے کہ اس ملک کا کیا حال ہوگا جہاں مذہب کو، دین اور خدا کو تمام فتنوں کی جڑ قرار دیا جائے (نعوذ باللہ) جنسی معاملات میں ہر طرح جو آزادی حاصل ہے اسی کے نتیجے کے طور پر نوجوانوں اور شہوت پرستوں میں اشتراکیت مقبول ہے معقول طبقہ کے قطع نظر جیالا بھی جو پختہ مزاج ہیں وہ دل سے اس کے قائل نہیں۔ معاشی مسئلہ ایک ضمنی مسئلہ ہے اصل چیز وہ بے قید زندگی ہے جو مذہب سے بے تعلق ہونے اور عورت پر ہر طرح آسانی سے قابو پانے کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ دعویٰ کہ روس میں اس کو عام مقبولیت حاصل ہے بے محل و لایعنی ہے۔ جبر و تشدد کو ختم کر کے اگر افراد کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کی مقبولیت و عدم مقبولیت کا پتہ چل سکتا ہے۔ اشتراکیت کا سیلاب جن جن ممالک میں امنڈ آیا ہے اس کے بڑھانے میں آپ باشعور اور پختہ مغز اشخاص (خواہ

1. R. E. Montgomery: The Economics of Labour 2. Reynolds: Labour & National Defence 3. J. Rosenfarb: The National Labour Policy

وہ عامی ہوں یا خواص، کی بجائے گرم خون نوجوانوں کو گرم جوان دیکھیں گے۔ روس کی عمارت انہیں کی گرمجوشی سے بنی اور انہیں کو آگے بڑھا کر ایک عالمی تحریک کا رنگ دیا جا رہا ہے اس کی طغیانیوں کے دھارے کو سخت و شدید بنانے کے لئے فوجی طاقت اور ہر قسم کے جبر و تشدد کو مدعو کیا گیا ہے۔ خوف و دہشت کی وجہ سے جب عقلا ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں تو جہلا و عوام سے آپ صحیح فکر و عمل کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں؟ خوف کے جذبات کو نازی ازم اور فسطائیت میں کام میں لایا گیا تو اس کا مظہر آپ کو روس میں نظر آئے گا۔ لاکی ڈگتھر کے سوا ای۔ ایس بوگارڈس۔ ایف۔ ایم۔ ریڈ۔ پی جے ڈبلو۔ پی گارس اور دیگر امریکی و یورپی مفکرین نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصیت کے ساتھ خوف اور سیاست کے عنوان سے سیاست کی نفسیات پر لیسول نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے یہ قیاسات نہیں عملی و ثبوتی حقیقتیں ہیں جن کی تردید نہیں کی جا سکتی عوام و جہلا تو رہے ایک طرف انسانی فطرت کو جذبات ہی کے ذریعہ بھڑکایا جا سکتا ہے اس لئے تشدد کے ساتھ آپ جذبات کی لغویتوں کو بھی ان تحریکوں میں مرتسم دیکھیں گے جن کا [illegible] کی روٹی کے سوال سے جو طوفان اور بے تمیزیاں اٹھتی ہیں وہ اور دوسرے امور سے پیدا کردہ ہیجان کے مقابل تیز و تند ہوتی ہیں۔ یہ مسئلہ اجتماعی کردار (Collective behaviour) میں بڑی اہمیت کا مالک ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی اسٹرائک کا تجربہ بڑی دلچسپ ہے۔ افراد کا آپس کا عمل و ردّ عمل، نفسیاتی بے چینیاں، اشتعال پذیری، اشتعال انگیز افعال، جذبات و احساسات کی بے راہ روی، لاعقلیت و جنون، بے مقصد اٹھک بیٹھک، گردش، زد و کوب، خوں آشامیاں اور بے جا خود نمائی و تجنز اس کی کنہ و کیفیت میں داخل ہیں یہ مسائل دلچسپ بھی ہیں اور تشریح کے محتاج بھی۔ وقت کے سوا تشریح کو ملحوظ رکھا جائے تو جداگانہ سلسلہ خطبات و کتاب کے محتاج ہوں گے اسلئے یہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جو اصحاب تحریک ہذا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کی رہبری کے لئے کارل مان ہائم کی کتاب آئیڈیالوجی اینڈ اٹوپیا (Idealogy + Utopia) چارلس میکے (Charls Mackay) کی Extra-ordinary Popular Delusions + the madness of crowds میکڈوگال کی Hoaxes سورل جارجس (Sorel Georges) کی Reflections on Violence لی بری La Pierre کی Collective behaviour اور ینگ کمبال کی Social Psychology کو مشتے از خروارے اس موضوع کی ان گنت کتابوں میں سے پیش کیا جاتا ہے

بہترین نظام

دنیا میں جو سیاسی و عمرانی تحریکیں اٹھی ہیں ان میں موجودہ اصطلاحوں کے تحت ایک تحریک اسلام کی بھی ہے جس کے متعلق شبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ ہماری زندگی کے ساتھ عملاً منطبق ہو سکتی ہے یا نہیں۔ شبہ کے کئی اسباب ہیں ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ سوچنے والے دماغوں کو اسلامی نظام سے وہ ہمدردی نہیں جو ہمدردی یورپی نظاموں سے ہے اسلئے سیاست میں یورپی جمہوریت اور اقتصادی مسائل میں ہماری نظریں اشتراکیت کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری نظر میں اسلامی نظام سب سے بہتر قرار پائے لیکن دوسروں کو اس ایقان کا پابند بنانا بس کی بات نہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور استدعا کریں گے کہ دوسری اور تحریکوں کے ساتھ اسلامی تحریک کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ آپ یہ محسوس فرما سکیں کہ یک عرصہ تک یہ نظام عملاً نافذ رہا اور اسی کے ذریعہ زندگی کی بہت سی الجھنوں

1, E. S. Bogardus: Leaders and Leader Ship.

2, E. M. Rowe: Leaders, Dreamers + Rebels.

3, P. J. W. Pigors: Leader Ship or Dominance.

4, Lasswell: Psychopathology of Politics.

…قلع قمع کیا گیا۔ اسی مجلس میں کئی صاحبوں نے تنقید کی ہے کہ اسلامی نظام کی صورت گری میں غذا فرو گذاشتیں ہوئی ہیں۔ یہ اعتراض بعض صورتوں میں محل نظر ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی نظام میں بھی اصولی اور بنیادی حیثیت سے وہی غلطیاں موجود ہیں جو عصر حاضر کے نظاموں میں موجود ہیں کسی نظام کے صحت کے دو ہی معیار ہیں ایک تو یہ کہ وہ فطرت انسانی کی تردید نہ کرے دوسرے یہ کہ اصولاً اس میں کوئی لغزش نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ عمل و تطبیق میں غلطی ہو۔ یہ یکسر اجتہادی غلطی ہے نہ کہ اصول و مبادیات کی۔ اس دور میں سب سے زیادہ اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مضبوط و کامل ایقان پیدا کیا جائے تاکہ خلوص و جذبے، قدر و اعتقادات اور آئیڈیل کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔ بے اعتنائی اور شکوک و شبہات نے ان تک رسائی محالات سے ہے۔ اسلامی آئیڈیل کے رستے کی نقطہ نظر سے اگر موجودہ حالات اور مسائل کی روشنی میں تشریح و تطبیق کی جاتے تو علامہ اقبال کی طرح ہمارا بھی یہ ایقان ہے کہ اسلام ہی کے ذریعہ وہ قوی حیوات و وسائل حاصل ہو سکتے ہیں کہ جن کی متابعت میں جدید پیچ پرداز اور عمرانی زندگی کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ جن اقدار اور علائق کو آج کا انسان حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ بدرجہ احسن اسلام ہی کے ذریعہ پورے ہو سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ اسلامی نظام کی صورت گری میں کیوں شک و شبہ کو جگہ دی جائے جب کہ ارباب فکر و نظر اس نکتہ سے واقف ہیں کہ موجودہ زمانے کی یورپ والی سائنس کی تہذیب اسلامی نظام ہی کے بنیادوں پر اٹھی ہے۔ غور کیجئے کہ موجودہ سائنس کا کہاں نام و نشان ہوتا اگر بقول بیرف ([illegible]) اس کو عرب منصہ شہود پر نہ لاتے اگر صحت کا لحاظ ہوتا تو قدر و عمل میں غلطی نہ پیدا ہوتی جن میں یورپ مبتلا ہے۔ علم و عمل کے نتائج میں محرک ہونے کے بجائے اگر اس کی طاقتوں کو ماؤف کر دے اور زندگی کی حقیقتوں سے گریز کرے تو اس کا امکان ہی باقی نہیں رہتا کہ وہ صحیح شخصیت کی تکمیل کا موجب بن سکے شخصیت کی تکمیل ہی انسانی زندگی کا منتہائے مقصود ہے ؎

نے خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں — یہی شہکار ہے اس کے ہنر کا

سیاست و معاشرت کا کمال یہ ہے کہ وہ نمونہ بن جائے ایک طرف تو افراد سماج کے لئے نمونہ ہوں تو سماج بھی بطور خود افراد کے لئے مثالی بنی رہے نمونہ و مثال کی انتہائی قدر بقول پروفیسر ہاکنگ (Hocking) شخصیت ہی کی تکمیل میں پوشیدہ ہے۔ اسلام اسی نظام کو چاہتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ عناصر کے طبعی خواص، اشیا کے نوعی تقاضے اور مابعد الطبیعاتی قوتیں سب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انہیں کی آمیزش سے معاشرتی زندگی اور انسانی مزاج ترکیب پاتا ہے انہیں وجوہ کی بنا پر اسلام بقائے اصلح کی جگہ بقائے انفع کا قائل ہے کارگاہ فیضان و جمال میں صرف وہ چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو یہ خیال اگر آپ کے پیش نظر رہے تو آپ غور فرما سکتے ہیں کہ کیوں اسلامی تحریک ایک عالمگیر تحریک بنی ہوتی ہے اور کن اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر کے ناموں سے مخاطب کیا گیا ہے آپ غالباً اس کی تردید نہ فرمائیں گے کہ ہر نوع کی استعداد اور صلاحیت خاص قسم کے اثرات چاہتی ہے اور بہرحال اس کے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں تاکہ اس کی صفتیں اور مزاج درست رہے۔ یہی چیز اسلامی عمرانی عمل کی جان ہے اور اسی کی اساس پر دیگر مظاہر اجتماعی کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی حاجتیں طبعی اور جسمانی نہیں بلکہ وہ اپنے اندر ایسی خواہشات بھی پاتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے عقلی و وجدانی نظریات تحریک کا کام دیتے ہیں ان تحریکوں اور نظریوں کو قائم کرنے کا کام ہر انسان انجام نہیں دے سکتا اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت چند برگزیدہ شخصیتوں کو حاصل ہوتی ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں جن کی وضاحت شاہ ولی اللہ نے کی ہے ایک تو وہ جو رائے کلی اور مصلحت کلیہ کو ادراک و فہم اور عقل و شعور کی استدلالی قوتوں سے معلوم کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کی قوت ملکیہ اتنی زبردست ہوتی ہے کہ ان کا ذہن ایسی بات کی طرف پہونچنے ہی نہیں پاتا جو رائے کلی اور خیر مطلق کے خلاف ہو۔ پہلی قسم کے لوگ دوسری قسم کے لوگوں کے تابع ہیں۔ اس لئے قرآن شریف میں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر

لے فقہ کے [illegible] مسائل کی طرف اشارہ ہے۔ م

منکر کی تاکید کی گئی ہے احادیث نبوی میں انہیں مصالح کے تحت حضورؐ نے اپنی اور کتاب و عترت کی پیروی کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسلامی سیاست وحکومت کا معیار یہ ہے کہ ہر شخص خلافت، صداقت اور تدبر خود کی خود مدعی نہیں کرسکتا اس لئے یہ کام ایک مخصوص جماعت انجام دے جاتی تک ان لوگوں کی تقلید پر فطرتاً مجبور رہیں۔ اسلامی جمہوریت اس کی قائل ہے کہ حکومت کا حق ایک صالح فرد اور جماعت ہی کو ہے البتہ عوام کو یہ فطری حق ہے کہ وہ اگر راہ صواب سے ہٹ جائیں تو اس کی منع کریں۔ اطاعت کی شرط بھی یہی ہے اور اگر استقامت سے گریز کیا جائے تو بغاوت بھی نہیں حاکم کو معزول وعلیحدہ کیا جاسکتا ہے پڑتال اور بغاوت کا حق آج کے دور کی سیاست کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے لیکن جو اپجی کیفیت اسلامی نظام سیاست میں موجود ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ جمہور کو اسلامی نظام نے جو حقوق دیئے ہیں غور دیا ہے کہ کیا آج کا دور کسی طرح بھی ان کا مقابلہ کرسکتا ہے آج کے زمانے میں عوام کا حق صرف اس میں مرکوز ہے کہ وہ رائے دیں اور اپنے حاکموں کو منتخب کریں۔ اس کے بعد حکام آزاد ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت قانون کی مقرر کردہ مدت سے قبل انہیں ہٹا نہیں سکتی۔ پروفیسر لاسکی کو اسی کی شکایت ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اور سیاست دانوں نے بھی یہی رونا رویا ہے اسٹوارٹ کی "جمہوریت دباؤ میں"[1] اور جی جارج کی "ڈیموکریسی کی نبض"[2] کو مثالاً پیش کیا جاسکتا ہے اس مسئلہ کو یہیں چھوڑ کر اگر عوام کے حق انتخاب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی وہ آزاد اور اپنی مرضی کے تابع نہیں۔ یہاں بھی خاص ترغیبات کے تحت وہ کام کرتے نظر آتے ہیں۔ پریس، رائے عامہ اور لیڈروں کے اثر و نفوذ کو اس عمل میں آپ متحرک پائیں گے۔ لاسکی، براکس اور پروفیسر ڈلسی کے علاوہ جان ڈیوی بڑے مزے لے لے کر اپنی کتاب ... اور ان کے مسائل میں حق انتخاب کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اس مبحث کو مارشل فیلڈ کی کتاب Freedom is more than world کے اختتامی جملوں پر ختم کردیا جاتا ہے۔

> ڈیموکریسی کی بقا ضبط پر منحصر ہے لیکن یہ ضبط داخلی اور خود کا عائد کردہ ہو تاکہ ہم اپنے مقاصد کے لئے متفق ہوسکیں۔
> جن کا تصفیہ اجتماعی طور پر کیا گیا ہے یہ ضبط بہرحال خارجی نہ ہو جو کسی شخص یا جماعت کی طرف سے عائد کیا جائے۔

اس نظام معاشی کو مبنی بر عدل کہا جاسکتا ہے جو ان دو چیزوں کا حامل ہو:۔

(۱) آمدنی کے حصول میں اس کا لحاظ رکھا جائے کہ وہ عدل اور مساوات کے منافی نہ ہو۔ وہ مال حاصل نہ کیا جائے جو فرد کی قوت برداشت سے باہر ہو اور مطالبہ وہی کیا جائے جس کی واقعی ضرورت ہے۔

(۲) تقسیم پیداوار میں حکومت اور معاشرے کے تمام مصالح کے لحاظ اہمیت کے مطابق رکھا گیا ہو۔

سب سے پہلے اسلام نے سود کو حرام قطعی قرار دیا جو آج بھی فکر و عمل کی ساری جولانیوں کے باوجود یورپ اور خود روس کے نظام بنکنگ اور تجارت کا جزو لاینفک بنا ہوا ہے اس کا ثبوت خود وہ کتابیں ہیں جو روس کے مالیاتی نظام پر لکھی گئی ہیں۔ غور کیجئے کہ سود کے ذریعہ خون چوسا جائے اور پھر مساوات کی تعلیم کیا معنی رکھتی ہے اسلامی نظام معاشی کے سلسلہ میں تشریح کی بجائے ہم ان کے موارد مالیہ کا ذکر کرتے ہیں

(۱) زکوٰۃ
(۲) قابل کاشت زمین کا ٹیکس
(۳) جزیہ
(۴) عشور
(۵) خمس غنائم (۶) ترکہ۔

1- C. Stuart: Democracy under Pressure.
2- G. George: The Pulse of Democracy.

ان کا مدعا دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنا ہے تو دوسری غرض تالیف افراد و ترقیٔ مصالح ہے۔ جملہ ادوار کو چھوڑ کر اگر آج زکوٰۃ ہی کے نظام کو نافذ کیا جاتے تو ہماری معاشی زندگی کی بہت سی پیچیدگیاں دور ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ترکہ کی مد بھی شامل کر لی جائے، تو تقسیم دولت کے داعیات تمام و کمال پورے ہو سکتے ہیں۔ مال غنیمت کے سوا اور ترکہ مال کا مدعا بھی اسلام میں یہی متعین ہے کہ مصلحت عامّہ کے لئے ان کو وقف کر دیا جائے۔ جو شخص ذرائع آمدنی سے محروم ہو اور جس کے نفقہ کا کوئی انتظام نہ ہو اس کی کفالت بیت المال ہی سے کی جاتی ہے۔ علامہ عبدالوہاب اپنی کتاب "السیاسۃ الشرعیہ" میں لکھتے ہیں :-

> غرض دولت اسلامیہ کے موارد مالیہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلہ میں جو نصوص وارد ہیں یا کبار صحابہ نے جو اجتہادات کئے ہیں یا مشورہ سے فیصلے کئے ہیں۔ وہ سب مصالح عامہ کے پیش نظر کئے گئے ہیں تاکہ ایک طرف نظام حکومت استوار رہے دوسری طرف لوگوں کی جان و مال کو امن رہے، اور تیسری طرف ذرائع نفقہ وکسب کا دروازہ نہ ٹوٹے۔ غرض وحدت اجتماعیہ تعاون، تضامن، مصالح عامہ اور قواعد عدل کی کہیں بھی خلاف ورزی نہیں کی گئی ہے۔

محاصل کی ادائی سے بلاشبہ، افراد اپنے مال کے ایک حصہ کے فائدہ سے محروم ہو جاتے ہیں لیکن اس حرمان کے صلہ میں انہیں جان و مال کی امان ملتی ہے۔ یہ حرمان نہ ہو تو معاشرے اور مصلح عامہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اب آپ ہی غور کیجئے کہ ساری ملکیت منقولہ، غیر منقولہ کے غصب کرنے سے کس حد تک عدل و مساوات، اور اعتدال کے واجبات پورے ہوتے ہیں۔ حکومت دولت تو لے سکتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ نہ ہو اور یہ کہ یہ حصول ایک نظام کے ماتحت ہو تاکہ ہر شخص یہ جان لے کہ اس پر کیا واجب ہے کس طرح ادا کیا جائے گا اور کب اس کی ادائی ہوگی۔ بنا بریں معاشی نظام اسی وقت مکمل و بامعنی کہا جا سکتا ہے جب کہ اس میں افراد کے مصالح کی مراعات کا لحاظ رکھا جائے۔ غور کیجئے کہ اسلامی نظام معاشی میں افراد کے مصالح کے سوا انسانی فطرت کا کس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے۔ زکوٰۃ بھی اسی مال پر واجب ہے جو نامی ہے۔ اصل سرمایہ میں سے نہیں بلکہ راس المال کے نفع میں سے زکوٰۃ کی ادائی کا رسم بھی تعبیر ہے انسانی فطرت کی۔ اجازت دیجئے کہ علامہ عبدالوہاب کی کتاب کا ایک اقتباس یہاں پیش کروں :-

> اسلام کے محاصل میں عدل اور شرائط اقتصاد بھی پورے طور پر ملحوظ رکھے گئے ہیں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی فتوحات کے جہاں اور اسباب ہیں وہاں ایک سبب محاصل اور ٹیکس کے سلسلے میں ان کا عدل، رفق اور مساوات بھی ہے اور جن ممالک کو انہوں نے فتح کیا وہاں ان کے پاؤں جمنے میں بھی اس خصوصیت سے انہیں بہت مدد ملی کیونکہ فارس اور روم کے ناقابل برداشت محاصل کے بوجھ سے تنگ آ گئے تھے ان پر ایسے محاصل عائد کر دیئے گئے تھے جن کا بوجھ ان سے اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ انصاف اس دور میں مفقود تھا۔ زمیندار کے ساتھ انصاف ہوتا تھا نہ کسان کے ساتھ۔ زکوٰۃ فرض ہے اور ان ستونوں میں سے ہے جن پر اسلام مبنی ہے جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے وہ چار ہیں :-
>
> (۱) نقد (۲) سونا چاندی (۳) مال تجارت (۴) سوائم اور ارض عشریہ۔ شرائط ضروریہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ وہ نامی ہو دوسری یہ کہ مال زکوٰۃ پر کامل ایک سال گزر چکا ہو۔ تیسری یہ کہ مالک کی حاجات اصلیہ سے فاضل ہو تاکہ زکوٰۃ کی ادائی میں صاحب مال کو غیر معمولی تکلیف نہ پہنچے۔ اس پر زکوٰۃ مفروضہ کی دو قسموں یعنی مفرد و نسبی سے اور بھی سہولت کا خیال رکھا گیا ہے ترکہ میں بھی سہولتوں کا مدعا مصالح انسانی کا لحاظ ہے۔ اگر کوئی وارث نہ ہو تو سارا مال بیت المال کا حصہ ہے خمس اس مال پر لیا جاتا ہے جس کا کوئی وارث اصحاب فروض، عصبہ ذوی الارحام میں سے نہ ہو یا جس کا وارث زن و شو میں سے کسی ایک کے سوا کوئی نہ ہو۔ صدقات کے مختلف حصص ہیں فقراء و مساکین، عاملین، مولفۃ القلوب، غلاموں، قرض داروں، مسافروں اور

اسد ملتانی

جوش کی رُباعیاں

ہمایوں کے جوبلی نمبر میں جوش ملیح آبادی کی چھ رباعیاں نظر سے گزری تھیں۔ آج کل شاعری کے بازار میں بعموم جس قسم کے مال کی نمائش کی جارہی ہے اور جس معیار سے اُسے پرکھا جاتا ہے اس کے پیش نظر میں نے ان رباعیوں کو بھی حسب معمول درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا لیکن مارچ ۱۹۴۷ء کے نگار میں "مالہ وما علیہ" کے زیر عنوان جہاں وقتاً فوقتاً اشعار پر تنقیدیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان رباعیوں کی تعریف پڑھ کر تعجب ہوا جناب نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ یہی پانچ رباعیاں "بہت پاکیزہ" ہیں۔ پاکیزگی اور عمدگی کی منزل تو بعد میں آتی ہے سب سے پہلے انہیں کم از کم لفظی و معنوی اسقام سے پاک ہونا چاہئے۔ یہ رباعیاں تو اس ابتدائی شرط کو بھی پورا نہیں کرتیں۔

رباعی کی جان اس کا مرکزی مضمون ہوتا ہے جس میں ندرت، لطافت اور زور کا ہونا ضروری ہے۔ پھر اس خاص مضمون کو ادا کرنے میں چاروں مصرعے اس طرح باہم پیوست ہونے چاہئیں کہ زورِ بیان تدریجی طور پر بڑھتا ہو چوتھے مصرع میں انتہا کو پہنچ جائے۔ اگر اس ترتیب و تدریج میں ذرا بھی فرق پڑ جائے تو رباعی اپنے مقام سے گر جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ زیر نظر رباعیاں اس معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں

(۱) اچھی نہیں اے ندیم اتنی تعجیل ‏ نارِ نمرود میں ہے گلزارِ خلیل
ہو جائیں گی جب فسردہ لاکھوں راتیں ‏ تب پھیلے گا نسیمِ قطرۂ صبحِ جمیل

پہلے مصرع میں تعجیل سے اس لئے روکا گیا ہے کہ صبح جمیل بہت دیر میں ظہور پذیر ہونے والی چیز ہے لیکن دوسرے مصرع میں جو مثال دی گئی ہے وہ تیسرے اور چوتھے مصرع کے برعکس تعجیل کی تائید میں ہے۔ نارِ نمرود کو تو گلزارِ خلیل بننے میں کچھ دیر نہ لگی تھی!

علاوہ ازیں رباعی کا مرکزی مضمون رات کے دن ہونے پر مبنی ہے لیکن نار کے گلزار میں تبدیل ہو جانے کو اس سے کوئی ظاہری مشابہت نہیں (اس سلسلے میں غالب کا مصرع "صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا" توجہ طلب ہے) غرضیکہ دوسرا مصرع ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے رباعی کے مضمون سے بے تعلق ہے۔

تیسرے مصرع میں کہنے کو تو "لاکھوں راتیں" کہہ دیا گیا ہے لیکن یہ خیال نہیں کیا گیا کہ لاکھوں راتوں کا وجود لاکھوں صبحوں کے بغیر کیونکر تصور میں آسکتا ہے۔ اگر لاکھوں راتوں میں ہر رات کے بعد ایک دن موجود ہے تو پھر لاکھ راتوں کے فسردہ ہونے کا انتظار کیسا اور اگر راتیں بلا فصل فرض کی گئی ہیں تو پھر سب کو صرف ایک طویل رات کیوں نہ سمجھا جائے اور لاکھوں کا عدد کیوں استعمال کیا جائے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ہر رات کے بعد جو صبح ہوگی وہ تو معمولی ہوگی اور لاکھ شبانہ روز کے بعد ایک "صبح جمیل" کا ظہور ہوگا تو رباعی میں اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔ اس صورت میں مصرع یوں ہونا چاہیے تھا ع "ہو جائیں گی جب فسردہ لاکھوں صبحیں"۔

ان سب خامیوں کے بعد جب تمام رُباعی کے مرکزی مضمون پر نظر ڈالی جائے تو بنیادی خیال وہی نکلتا ہے جسے علامہ اقبالؒ نے صرف ایک مصرع میں نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کر دیا ہے ع کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

(۲) غاروں کو جو ذرات عمل سے پاٹے — وہ صاحبِ اوج خاک کیونکر چھانٹے

قدرت کا ازل سے ہے یہ حکم ناطق — جو شخص پسینہ بوئے دریا کاٹے

قوافی میں ثقالت کے علاوہ تکلف صاف نمایاں ہے۔ غاروں کو ذرّات سے پاٹنے والے کے لئے "صاحب اوج" ہونے کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ غاروں یا ذرات دونوں کا تعلق پستی سے ہے حتیٰ کہ چوتھے مصرع میں بھی "دریا کاٹنے" کا اظہار ہے نہ کہ کسی ایسی بلندی کا جسے "اوج" سے کوئی مناسبت ہو۔

آخری مصرع اقبال کے اس شعر کے دوسرے مصرع کا نہایت بھونڈا چربہ ہے ؎

اقبال ذور کلام آزموذ — مصرعے کارید و شمشیرے درود

بھونڈا اس لئے کہ "لہو بونے" میں تو خیر قطروں کے دانہ نما ہونے کی صورت موجود ہے لیکن دریا کے کاٹنے کا کوئی بھی قرینہ نہیں۔ محاورہ کے لحاظ سے دریا کاٹنے کا مطلب دریا کے کنارے کو کاٹ کر اس سے پانی کی نکاسی اور طرف رواں کرنا تو ہوسکتا ہے مگر فصل کے طور پر دریا کاٹنے کو کوئی لفظی یا معنوی مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلے میں "شمشیرے درود" کی موزونیت قابل توجہ ہے کہ شمشیر درو سے کتنی مکمل مطابقت رکھتی ہے۔

(۳) بڑھتا ہوں کبھی کبھی ٹھہر جاتا ہوں — جیتا ہوں کبھی اور کبھی مر جاتا ہوں

گر پڑتا ہوں ذرّات سے ٹھوکر کھا کر — اور گاہ پہاڑوں سے گذر جاتا ہوں

جس طرح پہلے اور دوسرے مصرع میں دو دو دفعہ "کبھی" کے استعمال سے توازن قائم رکھا گیا ہے، اسی طرح تیسرے اور چوتھے مصرعے میں توازن کے لئے چوتھے کی طرح تیسرے میں بھی "گاہ" کا ہونا ضروری تھا۔

کبھی ذرّات سے ٹھوکر کھا کر گر پڑنا اور کبھی پہاڑوں سے گذر جانا تو واقعی ایک قابل تعجب تقابل ہے لیکن کبھی بڑھنے اور کبھی ٹھہر جانے یا کبھی جینے اور کبھی مرنے میں محض بیانِ حال ہے کوئی اچنبھے کی بات ہرگز نہیں لہٰذا معنوی طور پر پہلے دو مصرعے پچھلے دو مصرعوں کے ساتھ کوئی حقیقی پیوستگی نہیں رکھتے۔

ترتیب کے لحاظ سے دوسرے مصرع کا مضمون آخری منزل کا درجہ رکھتا ہے پہلی منزل یہ کہ کبھی بڑھتا ہوں کبھی ٹھہر جاتا ہوں دوسری منزل یہ کہ کبھی گر پڑتا ہوں اور کبھی پہاڑوں سے گذر جاتا ہوں اور آخری منزل یہ کہ کبھی جیتا ہوں اور کبھی مر جاتا ہوں۔ جب دوسرے مصرع میں "مر جانے" کی نوبت آگئی تو پھر ٹھوکر کھا کر گر پڑنے یا پہاڑوں سے گذر جانے کا موقع ہی کہاں رہا۔ غرضیکہ رباعی کے مصرعوں میں معنوی ترتیب و تدریج نہ ہونے کا اصولی عیب موجود ہے۔

ان سب باتوں کے بعد جب رباعی کے مضمون کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کو شیخ سعدی اس شعر میں ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

اور علامہ اقبال فارسی کے شعر ؎

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

اور اردو کے شعر ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود — گاہ الجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

میں نہایت خوش اسلوبی سے باندھ چکے ہیں۔

(۴) جب تک کہ یہ آسمان تھا مرکزِ دید — غائب تاروں سے تھی فقط گفت و شنید

سمجھا ہوں زمین جب ہے مفہوم ترا ذرّوں سے آکار ہا ہوں لاکھوں خورشید

آسمان غیر محدود وسعت کا نام ہے اور مرکز ایک نقطہ یا محدود مقام ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آسمان کو "مرکز دید" کہنا محلِ نظر ہے۔ دوسرے مصرع میں "فقط" غلط جگہ استعمال ہوا ہے غالباً مقصود تو یہ ہے کہ "فقط غائب تاروں سے گفت و شنید تھی" لیکن کہا یہ گیا ہے کہ "غائب تاروں سے فقط گفت و شنید تھی" کچھ اور نہ تھا۔

رباعی ذرّوں سے خورشید اُگانے، کا مضمون سو دہ معنوی لحاظ سے اقبال کے مصرع ع "مصرعے کار ید و شمشیرِ درود" ہی کا اُلٹ پھیر ہے یعنی ع ذرّہ کار ید و خورشید درود۔ اور لفظی طور پر ذہن فوراً ع "ہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں "خورشید اُگانا" بھی کوئی خوش آیند ترکیب نہیں ہے۔

(۵) ہر سانس میں کیا ٹیس ہے، تند غشی سینے میں کھٹک رہی ہے ہیرے کی کنی
مابین کشاکش یقین و تشکیک اللہ ری خیالات کی عضا شکنی

چوتھا مصرع بجائے خود اچھا ہے اور خیالات کی عضا شکنی کا مضمون واقعی ندرت کا حامل ہے لیکن پہلے دو مصرعے اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب "اعضا شکنی" خیالات کی ہے تو کیا سانس اور سینے سے بھی مراد خیالات کے سانس اور سینے ہے یا کہ صاحب خیالات کے سانس اور سینے سے؟ اگر صاحب خیالات کے سانس اور سینے سے مراد ہو تو خیر اس کی عضا شکنی کے علاوہ سانس میں ٹیس اور سینے میں کھٹک کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن خیالات کا سانس اور سینہ مقصود ہے تو پھر اعضا شکنی اور سانس کی ٹیس یا سینے کی کھٹک میں کوئی باہمی تعلق باقی نہیں رہتا۔

تیسرے مصرع میں "مابین" کا محلِ استعمال بالکل غلط ہے۔ "مابین" سے دو چیزوں کے درمیان کا اظہار ہوتا ہے۔ "کشاکش مابین یقین و تشکیک" تو ہو سکتی ہے لیکن "مابین کشاکش" کا کوئی مفہوم نہیں۔ مقصد تو ہے "کشاکش مابین یقین و تشکیک کے دوران میں" لیکن لکھ دیا گیا ہے "مابین کشاکش یقین و تشکیک" کچھ اور نہیں تو "ہنگامِ کشاکش یقین و تشکیک" کر دیا جاتا اس طرح "مابین کشاکش" کی خامی دور ہو جاتی۔[1]

(۶) میں دیکھ سکوں ذرا یہ تماشا تا دیر پردے کو گرا بسعد کدورت سیر
لیلا کے تخیل کی انگوٹھی سے بھی کم اے بے خبر! یہی ہے آفاق گھیر

اس رباعی کی خامیاں تو جناب نیاز نے نمایاں کر دیں۔ میں صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ دیدہ بینی کا پردہ ہٹا کر دیکھا جائے تو بنیادی مضمون وہی نکلتا ہے جنہیں علامہ اقبال ان الفاظ میں ادا کر چکے ہیں ؎

زانجم تا بہ انجم صد جہاں بود خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من کرانِ بیکراں در من نہاں بود

ان چند تنقیدی اشاروں سے جو میں کی ان رباعیوں کی ادبی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ اغلاط سے قطع نظر کوئی نیا مضمون پیش کیا گیا ہے اور نہ پرانے مضمون کسی بہتر انداز میں ادا ہوئے ہیں۔ اصنافِ سخن میں رباعی کو سب سے مشکل سمجھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا پختگی کمال کو پہنچ کر اس صنف میں طبع آزمائی کی جرأت کرتے ہیں اور پھر ان میں بہت کم حضرات اچھی رباعی کہنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جوش کی جنس جذباتی رباعیاں خاصی ہیں لیکن حکیمانہ رباعی کے لئے وہ طبعاً معذور معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں حالی، اکبر اور اقبال سے قطع نظر امجد حیدرآبادی اور اصغر مراد آبادی مرحوم کے سوا بحیثیت مجموعی کسی شاعر کی معیاری رباعیاں کم ہی دیکھنے میں آئی ہیں ؛

---

[1] یہاں "اور" کا "اگر" بن جانا بہت زیادہ کھٹکتا ہے۔ "یہ" کو حذف کر دیا جائے تو یہ سقم دور ہو جائے گا۔ ادارہ

مارگریٹ لستھروپ لا

چہرے اور خیالات

ظاہر اور باطن کا جمالیاتی ربط

" HUGH WALPOLE " کہتا ہے کہ " اصل شے زندگی نہیں بلکہ وہ حوصلہ اور وہ عزائم ہیں جن کو اس زندگی میں آدمی پیدا کرتا ہے ۔ ہم اس قول میں یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ " اور انہی کے مطابق ایک چہرہ بنتا اور بگڑتا ہے "

آخری تجربہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی میں فیصلہ کن عامل انسان کا صرف باطن ہے نہ تو مادی عزّ وجاہ کو وہ مرتبہ حاصل ہے نہ انسانی روابط و تعلقات کی کامرانی کو وہ مقام نصیب ہے

" حُسن فقط جلد کی گہرائیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ حُسن خودُ ایک مستقل گہرائی ہے "

ہمارے کالج کی طالبات کا بیسواں سالانہ اجتماع جب ہوا اور تمام نئی اور پُرانی لڑکیاں اکٹھی ہوئیں تو ہیں کیا بتاؤں کیسے عجیب وغریب انکشافات ہمارے سامنے آئے اور ہمارے دلوں پر کیسی کیسی شدید چوٹیں پڑیں' ہماری سہیلیوں کو بڑی حیرت تھی اور وہ بار بار ایک دوسرے سے پوچھتی تھیں کہ : " بھئی ! یہاں تو سب کی سب بدلی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ایک ایک کے رنگ روپ میں انقلاب سا آگیا ہے' پہلے جو بھولی سی لڑکیاں تھیں ، وہ بدشکل عورتیں بن کر رہ گئی ہیں اور جن کی معمولی شکل وصورت تھی' وہ دیدہ زیب اور خوش منظر ہوگئیں یہ کیا وحشت ہے ، آخر یہ کیسا انقلاب ہے ؟ "

کالج کے زمانے میں ہم تمام لڑکیاں جو تقریباً ہم عمر اور نوجوان تھیں ، کم وبیش سب ایک ہی انداز کی تھیں' نازک اندام ، چھریرا بدن ، ہاکی کے میدان میں ہوتیں تو بجلی کی طرح ، دھر اُدھر بھاگتی پھرتیں' تجربہ گاہ میں جانا ہوتا تو ان کی نہ تھکنے والی آنکھیں نہایت ذوق وشوق کے ساتھ خوردبین پر جمی ہوتیں ؛ رخساروں میں صحت مندی کی سرخیاں جھلکتی رہتیں' چہرہ اور بدن زیادہ فربہ اور توانا نہ تھا مگر خوشنمائی پائی جاتی تھی ـــــ لیکن اب جب کہ ہم سب پورے شباب پر ہیں اور جوانی اب پختہ ہوچکی ہے نارسیدہ نہیں رہی' ہر ایک میں ایکا ایکی تبدیلیاں واقع ہوگئیں ! ہم میں کسی نے اپنی دلچسپیوں کے لئے شاہراہِ عمل خود ہی منتخب کرلی ہے اور کوئی قدرے مانوس قسم کے ساتھی اور رفیق کی زندگی اور اس کی نفسیات کے مطالعہ میں ڈوبی ہوئی ہے ـــــ غرض ہر ایک لڑکی پوری جرأت کے ساتھ زمان ومکان کے اس وسیع خلا میں آنکھ بند کئے ہوئے اُن چہروں کی تلاش میں سرگرم ہے جواب سے پہلے آشنا رہ چکے ہیں ـــــ پھر بھی پوری طرح کوئی بھی کامیاب نہیں ، سب کی کوششیں ادھوری اور ناتمام سی ہیں۔

ہم لوگ جب کھانے کی میز پر بیٹھے جہاں وہ ہم سبق سہیلیاں جن میں زیادہ قریبی تعلقات رہ چکے ہیں سب ایک طرف جمع ہوگئیں تو ان پُراسرار تبدیلیوں اور اس حیرت انگیز انقلاب پر باقاعدہ بحث شروع ہوگئی —— یعنی یہ کہ اس بیس برس کی مدت میں نے ہم سب کو کیا سے کیا بنا دیا —؟

سوسین کالج کے زمانے میں ہم سب کی بڑی محبوب سہیلی تھی، اس نے بڑے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں کہا، بھئی! میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے؟ اتنی سی بات تو میں یقیناً سمجھ سکتی ہوں کہ جو لڑکی آغاز شباب میں بھرے بھرے بدن کی خوبصورت جیالا دہ رہی ہو وہ گر ضرورت سے زیادہ پھول کر کُپا ہو جائے، اور اس کی جسامت بیالیس سال کی عمر والیوں سے بھی کچھ آگے نکل جائے تو اس کے پہچاننے میں دشواری کچھ نہ کچھ ضرور ہوگی — —— لیکن مجھے دیکھو! مجھے آخر کیا ہوا ہے؟ میں آج بھی پہلے کی طرح ۱۲ نمبر کی پوشاکیں خریدتی ہوں، اور میرا شوہر کہتا ہے کہ تم تو مجھے ویسی ہی نظر آتی ہو جیسی شادی کے دن تھیں، لیکن آج صبح مجھ پر سنسر لگی۔ میبل، ایلیس، اور روز شیل کے ناموں سے مجھے پکارا گیا، چوٹیں کی گئیں، فقرے چست کئے گئے، آخر یہ کیا مذاق ہے؟ تمہیں کچھ کیا میں بد مذاق ہوں، اور ان لوگوں سے خوش مذاقی چھین لی گئی ہے۔

یہ باتیں سُن کر مشہور ماہر نفسیات "جینٹ" نے سوسین کے شانے پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی، اس کا رُخ میری طرف کو تھا، میں نے سوسین کے سکڑے ہوئے لبوں اور نیلی آنکھوں کو غور سے دیکھا، اُس کی آنکھوں میں جذبات کی گرمی نہ رہی تھی، سرد آنکھیں س غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدے نے مجھے جینٹ کے اُن تیوروں کا ذرا پتا بتا دیا جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ زمانہ ان پریشان حالیوں کی بساط ہی اُلٹ دے اور غم کیوں کے یہ نقاب اُٹھ جائیں —— —— میں نے اپنی انگلی سے خاص طور پر اشارہ کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

جی نہیں —— جینٹ نے بڑی صفائی کے ساتھ میری تردید کی اور پورے اعتماد کے ساتھ مجھے یقین دلانے کے انداز میں کہا تم نے غلط اندازہ لگایا اتنی آسانی سے چھٹکارا نہیں مل سکتا —————— سنو! زمانہ ایسی نقاب کسی کو بھی عطا نہیں کرتا جس میں ان چیزوں اور اُن کیفیتوں کو بھی چھپایا جا سکتا ہو جو انسان کے باطن میں پیدا ہو رہی ہوں۔ ہمیں صرف ہڈیاں دی گئی تھیں (یہ ہڈیاں جن پر ہمارا جسم مشتمل ہے، جب ہم تم اور یہ سب پیاری پیاری حسین تعلیم یافتہ لڑکیاں تھیں تو سب کے جسم کے ڈھانچے وراثت کے طور پر تفویض ہوئے تھے۔ جب بیس سال کی عمر شروع ہوئی تو ہمارا بدن بننے لگا، اور تب سے ہم سب اپنے اپنے چہروں اور مکھڑوں کو ایک خاص انداز سے خود ڈھال رہے ہیں۔ — —— جو کچھ ہم سوچتے رہتے ہیں یا کہتے رہتے ہیں یا کرتے رہتے ہیں، انہی کے زیر اثر اور انہی کے مطابق ہمارے چہرے بنتے اور بگڑتے رہے ہیں —— اور اب ایسے بن گئے ہیں جیسے کہ اس وقت تمہاری نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

" اچھائی یا بُرائی کی وجہ سے؟ " میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میری نظریں اس لمبی میز پر جم کر رہ گئیں جس کے گرد ہم سب بیٹھے تھے۔

" بالکل ٹھیک! " پگ نے میری تائید کی۔ پگ کالج کے زمانہ میں میرے ساتھ ہی ایک کمرے میں رہتی تھی اور اب وہ ایک مقبول نقاش اور مصور کی حیثیت سے مشہور ہے، "بوڑھا چہرہ" اس نے کہنا شروع کیا، زیادہ لوگوں کو یا کم از کم کسی بُت تراش یا مصور کو تو فریب نہیں دے سکتا کیونکہ چہروں ہی پر انسان کی داستانِ زندگی لکھی ہوتی ہے، انسانی زندگی کی کہانیاں اور سوانح عمریاں نقش و نگار اور تصویروں میں نہیں ہوتیں۔ یہی سبب ہے کہ فن کار ہمیشہ جھریاں پڑے ہوئے چہروں کو زیادہ نکھارنے اور اجاگر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

" تو گویا تمہارے نزدیک گدراتے ہوئے پھلوں کے مقابلے میں پکے ہوئے پھلوں کی خوشبو اور ذائقہ کو ترجیح ہے " جینٹ نے پگ

کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "سچ تو یہی بات ہے" ، پک نے بینیٹ کو جواب دیا ، " وہمبر ایڈ " کی " بوڑھی عورت " والی تقریب تمہیں یاد نہیں شاید ! کیا عمر تھی اس کی ، ۲۸ کے لگ بھگ ہو گی ! اور کیا تم اوڈین والی طوائف کو بھول گئیں ؟ وہ عمر رسیدہ عورت تنی بنی سنوری رہتی تھی ———— جی ہاں کسی ہالرگ یا ڈویزر (مانی و بہزاد) کا موئے قلم ان دونوں سوکھی ہوئی بڑھیا عورتوں کی زندگی کی ویسی زندہ اور دلکش مصوری نہیں کر سکتا ، جیسی مصوری خود ان دونوں کے چہرے پیش کرتے ہیں ۔

. . . . یہیں تک بات پہونچی تھی کہ بیتے ہوئے نشاط انگیز دنوں کا ذکر آتے ہی انگوری شربت سے بھرے ہوئے جام گردش میں آگئے اور یہ محفل ختم اور صحبت برہم ہوگئی ، لیکن اس رات میرا بہت ہی عجیب حال رہا تھکی ماندی اور افکار و تصورات کے بوجھ سے دبی ہوئی جب میں اپنے بستر پر آکر گری ہوں تو میرے ساتھ خوشنما چہروں کا ایک سمندر موجزن تھا ، تلخ کامیوں کے آئینہ دار اور امتدادِ زمانہ کے شکار چہرے اور وہ چہرے بھی جو ساحرانہ انداز کے اثر سے حسین تر ہو گئے تھے ، آخر میرا پریشان اور مضطرب تصور " اینتی پی " کی تصویر پر جا رکا اینتی کا شوہر کارپوریشن کا ایک ممتاز وکیل تھا ، ہماری کلاس " بلیٹین بورڈ " کی دیوار پر اُس کی تصویر آویزاں تھی ، جس میں اینتی اپنے بنگلہ کے حوض کے پاس کھڑی تھی ۔ دوسری تصویر " ہارس شو جمپ " کے وقت کی تھی مگر اس کے باوجود اینتی کے جبین و رخسار پر پڑی ہوئی اور بے ترتیب شکنیں نمایاں تھیں اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پیاسی ہیں اور آسودگی سے کوسوں دور ہیں ، میرا شبہ قوی ہوگیا کہ عورت باطنی خوشگواریوں اور حقیقی خوبیوں سے محروم ہے ، بدقسمتی سے " اینتی " ہزاروں امیر یا غریب ذہین و غبی عورتوں میں یک خاص " ٹائپ " کی عورت تھی ۔

اس تقابل نے مجھے مضبوط جسم والی " مرانڈہ بی " کو یاد دلا دیا ۔ یعنی ہماری سابق " کورکنٹل " جس کا موجودہ انداز بے نیازی میں ڈوبا ہوا تھا کہ بال اگر بکھرے ہیں تو بکھرے ہی سہی ، طبیعت اگر موزوں نہیں ہے تو نہ سہی ، جسم پر چھوٹی سی اسکرٹ تھی ، دلفریبیوں اور کشش سے قطعی عاری ، کسان عورتوں کی طرح ——— میرانڈہ کی کلاس بلیٹین میں کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں کہیں وہ ستور کا شکار کرتی نظر آتی ، کہیں گیہوں صاف کرتی دکھائی دی اور اس کے ایک چھوڑ پانچ پانچ بچے بھی ہشاش بشاش ، دریا کے پکنک میں مگن نظر آتے ، ایسا محسوس ہوا جیسے میرانڈہ کو اپنے طبقہ کی خصوصیات میں سے کوئی خاص راز معلوم ہوگیا ہے ، شاید وہ نہایت ہی خوش ، بہت ہی مسرور ، بے فکر اور بے پروا تھی ، اور یہ سب کچھ اس کے باوجود تھا کہ اُس کی مالی حالت درست نہیں تھی اور دولت مند اینتی کے برخلاف اسے شروع ہی سے جسمانی محنت و مشقت کے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا ۔ ——— ۔ میں غنودگی کے عالم میں انہی تصورات کے جھولے میں جھولتی رہی ۔

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ حُسن و جمال کا دار و مدار ، انسان کی اندرونی کیفیات اور قلبی واردات پر ہے ، لیکن پھر بھی کوئی شخص گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے ظواہر اور چہرے مُہرے پر تنقید کی جائے ، ریڈیو سننے والوں میں سے ہر عورت مرد سے یہی مطالبہ کر رہی ہے کہ اس کے جسم کی جلد ساٹن کی طرح نرم اور چمکدار ہو جائے اور دوسری طرف بے شمار کارخانے ہیں جو دعوے پر دعوے کر رہے ہیں کہ اُن کی بنائی چیزیں (کریم ، پوڈر ، لوشن وغیرہ) اس مطالبہ کی تکمیل کر دیں گی ، ماقبل تاریخ سے آج تک دونوں صنفیں مرد بھی اور عورتیں بھی ، خود آرائی اور زیبائش کی الجھنوں میں گرفتار رہی ہیں ، بننے سنورنے کا شوق فراواں انہیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں رہا ہے ، قدیم قبائلی مصوری و نقاشی ، گانے بجانے اور جسم کے مختلف حصوں کے گودے جانے کے شوقین تھے ، انجیل میں بھی عورتوں کے اس شوق (گودنے) کا تذکرہ موجود ہے ———— جو آج کل اتنی ترقی پا گیا ہے کہ اب گھر کی " مستقل ضروریات " میں داخل سمجھا جاتا ہے ، عہدِ وکٹوریہ کی عورتیں خود تو آرام طلب تھیں مگر محنت و مشقت کی زندگی بسر کرنے والی گوالنوں کے گلاب جیسے تر و تازہ چہروں پر انہیں بڑا رشک آتا تھا ، لہٰذا اُنہوں نے اپنے چہروں پر غازے اور پوڈر تھوپنے کی ضرورت محسوس کی ۔

ذہنی کیفیات

ایک طرف تو کارخانے ہیں جن میں چہروں کی خوشنمائی اور دیدہ زیبی بڑھانے کی چیزیں تیار ہوتی ہیں اور دوسری

طرف بار بار آزمایا ہوا ایک اور نسخہ ہے جو اس ظاہری لیپا پوتی سے بہت زیادہ مفید اور مؤثر ہے، خوش قسمتی سے اس نسخۂ حسن و جمال میں کسی قسم کی الجھن، شک اور تذبذب بھی نہیں پایا جاتا، اس کے لئے کسی خاص تہذیب و ثقافت اور معاشرت کے اتباع کی ضرورت ہے اور نہ قیمتی مشقوں اور سخت جسمانی ورزشوں کی حاجت! اگر واقعی آپ اپنے کو خوش منظر اور خوش رو بنانا چاہتے ہیں تو اپنی کیفیات ذہنی پر قابو حاصل کیجئے اور نہیں اس رخ پر لگائیے جس کی بدولت فطرت کی مشین نہایت خوبصورتی اور ستھرے پن کے ساتھ چل سکے۔

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اپنے باطن پر صداقت کی انتہائی تیز اور طاقتور روشنی ڈالئے۔ خود اپنا مطالعہ کیجئے، برے خیالات اور مکروہ تصورات پر احتساب کیجئے اور پھر اس بات کی بھی سعی جاری رکھئے کہ باطن کے جتنے اچھے اور فطری امکانات عمل ہیں وہ سب ختم ہو جائیں اور الجھنے والی تمام متضاد طاقتیں یکسر ختم ہو جائیں اور ہمیشہ کے لئے ختم ہوں! غبیوں کے چہرے آپ نے دیکھے ہیں؟ خواہ ان کی بغاوت روزمرہ کی ناقابل تبدیل ضرورت کے خلاف ہو، مخالف پڑوسیوں کے خلاف ہو یا دنیا کے افسوسناک ماحول کے خلاف ہو، یہ ہر حال شدید قسم کی ذہنی دعملی باغیانہ مصروفیتیں ان کے چہروں کو بہت تھوڑی مدت میں میدان جنگ کا نمونہ بنا سکتی ہیں بلکہ بنا دیتی ہیں۔

ردو قدح، حسد اور نفرت وحقارت (جو سب کی سب خوف کی شاخیں اور پیداوار ہیں) چہروں کو ایسی کیفیات کا مظہر بنا دیتی ہیں کہ دیکھنے والوں سے یہ بات نہیں چھپ سکتی کہ آپ کا ذہن کس رخ پر کام کر رہا ہے —— دوسری طرف قناعت پسندی، اطمینان قلبی اور ہر حال میں خوش و خرم رہنا اور اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں کے لئے استعمال کرنا یہ وہ صفات ہیں جن کی بدولت آپ کے چہرے اور بشرے میں وہ حیرتناک تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں کی جو جھریاں مٹانے اور مصنوعی چمک دمک پیدا کرنے والی دوائیں، یا حجاموں کے یہاں کے لوشن اور وہ تمام مصنوعات جن سے بازار پٹے پڑے ہیں مل جل کر بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں پیدا کر سکتے۔

جو لوگ مشرق کے پراسرار معیار روحانیت کے منکر ہیں یا حقائق کو جھٹلاتے ہیں وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سن و سال کے ساتھ جسمانی رنگ و پے (Colour) میں تبدیلیاں نہیں ہوتیں، بالوں کی اور جلد کی ساخت قطعی طور پر بدلتی رہتی ہے اور اپنے اپنے وقت پر اعصاب، رگ پٹھے اور اعضائے جسمانی بھی تبدیلیوں کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں کسی قدیم انداز کے خاندان کی تصویروں اور جدید گھرانے کی تصویروں پر ایک نظر ڈال لیجئے تو ان حقائق کا بآسانی ثبوت مل جائے گا، معقول اور متوازن نقطۂ نظر رکھنے والوں کے لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ فطرت بڑی مہربان ہے۔ یہ سب کچھ وہ اس انداز اور سلیقہ کے ساتھ آہستہ آہستہ کر گزرتی ہے کہ عورت مرد آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بھی اس خرابی اور ابتری کو نہیں دیکھ پاتے۔ بہرکیف کوئی اس حقیقت کو بیان کر سکتا ہو یا نہ کر سکتا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر محسوس کرنے والا اپنی باطنی برقی لہروں کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے، جن کی بدولت ہر قسم کی ظاہری تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں

Psychosomatic طرز علاج[1] نے حال ہی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذہنی کیفیات ناقابل تردید طور پر دوران خون کو متاثر کرتی ہیں، بلکہ جسمانی غدود کے اعمال و وظائف FUNCTION اور اعضاء و جوارح بھی ان سے متاثر ہوتے رہتے ہیں، غصہ کے بارے میں یہ بات بہت پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ اس کی وجہ سے اعصاب کمزور ہونے لگتے ہیں اور تحلیل تک ہو جاتے ہیں جس کی بدولت نظام جسمانی میں ابتری پیدا ہو سکتی ہے۔ نیز لیا ایک اچھے خاصے جسم کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ سکتا ہے، خوف کی وجہ سے احساسات میں ہیجان برپا ہونے لگے تو طرح طرح کے امراض پیدا ہو سکتے ہیں، اخبارات میں ہر روز اموات کی خبریں شائع ہوتی ہیں جن کی وجہ عموماً غم یا دہشت ہی بتائی جاتی ہے یا زیادہ مناسب لفظوں میں یوں کہئے کہ غیر متوقع ناکامیوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز آکر ذہنی فکر کی جو رفتار قائم ہو جاتی ہے اسی کی بدولت یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

[1] علاج بالخیال۔

پاکیزہ تصورات چہرے کو حسین بناتے ہیں

اسباب و علل اور اثر و نفوذ کے ان قوانین کو سمجھ جانے کے بعد ہر ایک دانش مند کا یہی فیصلہ ہوگا کہ نہایت غور و احتیاط کے ساتھ اپنے ذہنی انداز و عادات پر نظر ڈالے اور یہ معلوم کرے کہ کون کون سی ناہمواریاں اور خامیاں ایسی ہیں جن کے دُور کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

چند سال گزرے میری ایک عزیز سہیلی اس قسم کی ناہمواریوں اور خامیوں کی ایک فہرست لے کر میرے پاس پہونچی، یہ فہرست اُس نے بڑی سچائی اور خلوص کے ساتھ مرتب کی تھی، کسی قسم کی لگی لپٹی نہ رہنے دی، جو کچھ کہا ٹھیک کہا

(۱) کیا مجھ میں خاص طور پر احساسِ کمتری کے سبب حسب ذیل باتیں پیدا ہوگئی ہیں:-

(الف) خواہ مخواہ نکتہ چینی کی عادت

(ب) حسد کا مادہ

(۲) کیا میرے اندر بدخوئی اور نفرت کی پرورش ہو رہی ہے:-

(الف) افراد سے (ب) قوموں سے (ج) نسلوں سے۔

(۳) کیا میں ذاتی اختلافات، بحث و مباحثہ، دلیل بازی، اور ہنگاموں کو نظر انداز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اگر ایسا ہے تو کیوں؟

(۴) کیا میں نے عفو و درگزر کی صلاحیت کھو دی ہے، دوسروں کی غلطیوں پر بھی اور اپنی لغزشوں پر بھی! اگر ایسا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟

(۵) کیا میں خود اپنے آپ پر غصہ یا رنج کرتے رہنے کی عادت میں گرفتار ہوں؟

(۶) کیا میں اپنی ندامتوں اور خجالتوں کی ——— تدفی اور حُسنِ عمل کے ذریعہ ان کو دُور کرنے کی بجائے ——— ان کو یوں ہی احتساب کے بغیر چھوڑ دوں؟

(۷) کیا میں نے اپنے بچے کھچے احساساتِ شگفتگی اور جذباتِ تفریح و مزاح کو بھی کھو دیا ہے اور زندگی کی مسرتوں اور دلچسپیوں سے دستبردار ہو چکی ہوں اگر ایسا ہے تو کیوں؟

میری سہیلی نے یہ فہرست میرے حوالے کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے ان تمام سوالوں اور نکتوں پر جس قدر میرے امکان میں تھا نہایت ایمانداری سے غور کیا ہے، میں چاہتی ہوں کہ ان پر آپ بھی مزید غور و فکر کیجئے، ازراہِ کرم کسی حقیقت کو چھوڑیئے گا نہیں، میں واقعی پوری سنجیدگی سے یہ چاہتی ہوں کہ جو چیز نکال دی جانی چاہئے اسے سچ مچ نکال ڈالوں "

میں نہیں سمجھتی کہ چند برسوں کے بعد میری یہ سہیلی پہلے کی نسبت زیادہ تندرست، زیادہ مسرور اور مادی اعتبار سے بھی زیادہ کامیاب ہوئی ہے تو اس کو اتفاق پر محمول کیا جاتے ——— جی نہیں! بلکہ اس نے جب ہمت و جرأت سے کام لے کر اپنے تمام ناپسندیدہ تصورات و خیالات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تب ہی سے اس کے اندر تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔

سارا نظامِ جسمانی ذہن و فکر ہی کے اشارے پر نئے سے نئے انداز پر عمل کرتا ہے، دھیرے دھیرے سہی مگر سب کچھ واقعی طور پر ہو کر رہتا ہے صحت مندو رواں خون کی آزاد روانی رخساروں کو غیرتِ گلاب بنا دیتی ہے، خیالات کی پژمردگی اور افکار کی پستی کی بدولت جو ہونٹ مرجھا کر رہ جاتے ہیں ان میں تر و تازگی از سرِ نو آجاتی ہے اور وہ پھول کی پنکھڑیوں کی طرح شاداب و رنگین ہو جاتے ہیں۔

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

پاکیزہ تصورات اور نیک خیالات کی بدولت لبوں کی مخصوص سنجیدگی اور گداز زندہ ہوجاتا ہے گیسوؤں میں بھی وہ تمام فطری خوبیاں لوٹ آتی ہیں جو طبعاً ان کا مقصود اور مطلوب ہیں، (اور جن کا تذکرہ ریڈیو پر مشتہرین ادویہ کرتے رہتے ہیں) اور چہرہ ان تروتازہ اور شگفتہ افراد میں ایسی عجیب و غریب برقی لہریں پیدا ہوجاتی ہیں کہ جب ان سے ملو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شعاع سی ان کی طرف سے نکل کر قلب و روح کو پوری طاقت کے ساتھ متاثر کئے دے رہی ہے۔

ان کیفیات اور ان تبدیلیوں کا وزن واقعی محسوس کیا جاچکا ہے، اور اب متعدد یونیورسٹیوں کی نفسیاتِ جدیدہ کے درجوں میں ان کا باقاعدہ مظاہرہ اور مشاہدہ بھی کرایا جارہا ہے، چالیس پچاس طلبہ کی ایک جماعت کے سامنے کسی اجنبی کو لاکر کھڑا کردیا جاتا ہے جس کے بعد ہر ایک طالب علم لکھتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اجنبی کو دیکھ کر شاہدہ و وجدان کے کیا کیا تاثرات اس کے ذہن نے قبول کئے ——— وہ ان کی تفصیل پیش کرتا ہے اور ان کے اظہار کا طریقہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا چہرہ خواہ وہ جب بھی سے اور جس جگہ اور جس حالت میں ملے خاموشی کے ساتھ یہ صاف بتادیتا ہے کہ اس کے باطن میں کس قسم کا کردار اور کس قسم کی فطرت موجود ہے البتہ شرط یہ ہے کہ خود دیکھنے والا بھی حساس ہو۔

مختصر یہ کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ جب تک باطنی بنیادیں اچھی نہ ہوں گی ظاہری شکل و صورت اور چہرے اور بشرے میں حسن و جمال پیدا نہ ہوگا (اور جو ہوگا بھی تو بہت جلد فنا ہوجائے گا) اس لئے اندر کی آرائش کو چھوڑ کر باہر کی لیپا پوتی بالکل بے سود ہے عمدہ قسم کا قیمتی ہیٹ جو غیر مطمئن اور دل گرفتہ چہرے کے اوپر سایہ کئے ہوئے ہو، وہ اس بے اطمینانی اور بے کیفی کی تحریروں کو اور زیادہ اجاگر کرنے میں مددگار ہوتا ہے جو چہرے پر نمایاں ہوں ——— نہایت ہی عمدہ سلی ہوئی پوشاک اُترے ہوئے مرجھائے ہوئے اور شکن آلود چہرے یا ہوشیار آنکھوں کی طرف سے کسی کی توجہ نہیں موڑ سکتی۔

الفاظ و بیان کی روانی و اثر سے بھی زیادہ طاقت ور انداز میں ایک چہرہ سنہری سچائی کا اعلان کردیتا ہے، بس ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم واقعی کون سا اثر اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور فیصلہ کرلینے کے بعد اُسی کے مطابق ——— اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ——— ہمیں عمل شروع کرنا چاہئے۔

سچ کہا تھا ہماری ماہر نفسیات سہیلی جینٹ نے کہ "ہمیں ابتداءً صرف گوشت پوست ملتا ہے لیکن بیس سال کی مدت میں ہم اپنے چہرے کی ساخت کی صحیح تشکیل کرتے ہیں ———"

(حسن مثنیٰ ندوی نے ترجمہ کیا)

الیاس عشقی (جے پوری) ایم۔ اے

اذانِ بتکدہ

جناب الیاس عشقی جے پوری نے گوئٹے کے فاؤسٹ کے انداز پر ایک منظوم ڈرامہ لکھا ہے۔ جس کے چند غیر مطبوعہ اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں یہ کتاب ہماری قومی زندگی کی دلچسپ تاریخ ہے، جس میں عبرت ہی نہیں، جوش و صداقت، درد عرفان و آگہی بھی شامل ہے۔

دیباچہ

چھان کر سارے جہاں کے بحر و بر تیرے لئے
ڈھونڈ کر چھوڑی ہے میں نے رہگذر تیرے لئے

مدتوں کھیلا خزف ریزوں سے تیرے واسطے
جب کہیں لایا ہوں یہ لعل و گہر تیرے لئے

بحر کر دوں تاکہ اسرارِ زمیں سے باخبر
آسمانوں پر کیا ہیں نے سفر تیرے لئے

ڈانٹے کہتا ہے!

ہے وہ چنگاری غنیمت جو کسی کو پھونک دے
شعلہ بن کر جو نہ بھڑکے وہ شرر بیکار ہے

سونے والوں کو جو اک پیغام بیداری نہ دے
کتنی ہی پُرکیف ہو ایسی سحر بیکار ہے

ہو اگر اپنے لئے تو ہر خزف ہے بے بہا
جو نصیب دشمناں ہو وہ گہر بیکار ہے

ضامنِ تعمیر ہونا چاہئے ہر انقلاب
ورنہ پھر یہ جذبۂ ہنگامہ گر بیکار ہے

روحِ بابر نے آواز دی

وہ مسلماں جن کے سر میں ہو نہ سودائے جہاد
کام آسکتا ہے ان کے جامۂ احرام کیا

ؔ اس منزل میں علامہ اقبال شاعر کے خضر راہ ہیں۔ م

آج جُھک جاتے ہیں جوہر مصلحت کے سامنے
ان کے قدموں پہ جُھکے گی گردشِ ایام کیا
ہائے وہ ملت! جو اک فولاد کی دیوار تھی
بن گئے افراد اس کے آج کُل اندام کیا

سلطان ٹیپو شہید کا پیغام

کاش مومن پھر وہ جذبہ وہ نظر پیدا کرے
جس میں سودائے شہادت ہو وہ سر پیدا کرے
کاش اس کو راس آجائے فضائے روزگار
یہ مولا بانہ کے سے بال و پَر پیدا کرے

منزلِ اول

(پرواز)

میں نے یہ دیکھا کہ میں بے بس ہوں اور معذور ہوں
مجھ کو جنبش بھی ہے مشکل اس قدر مجبور ہوں
ایک نامعلوم طاقت بے نمود و بے نشاں
مجھ کو تیزی سے لئے جاتی ہے سوئے آسماں
رہ گئے پیچھے شہاپریں، ثریا، کہکشاں
یوں ستارے اُڑ رہے تھے جیسے گردِ کارواں
دُور ہوتی جا رہی تھی کائناتِ چون وچند
ہو رہا تھا میں ستاروں کے جہاں سے بھی بلند
رفتہ رفتہ کچھ اندھیرا کم نظر آنے لگا
دُور سے پھر اک نیا عالم نظر آنے لگا
یہ نئی دُنیا نظر آتی تھی نامانوس سی
اُٹھ رہی تھی ایک موجِ عشرتِ محسوس سی
آئی پھر کانوں میں دھیمی دھیمی گانے کی صدا
گونج اُٹھی کانوں میں اس قدسی ترانے کی صدا

فرشتوں کا گیت

"عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقشِ گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیِ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیِ نیام ابھی"

(اقبال)

شفیق صدیقی جونپوری

سوزِ ناتمام

بے خود رہے ہزار برس انجمن ابھی
جاتا نہیں سرورِ شرابِ کہن ابھی

لے جا نہ گھر کی سمت ہوائے وطن ابھی
باقی ہے کچھ مزاج میں دیوانہ پن ابھی

ابرِ بہار لاکھ برستا رہے مگر
نم ہو گی آنسوؤں سے زمینِ چمن ابھی

بجھنے کو شمعِ خسرو پرویز ہے مگر
ہے انقلاب منتظرِ کوہ کن ابھی

کچھ پھول کھل گئے ہیں تو خوش ہو نہ باغباں
تقدیر اس بہار پہ ہے خندہ زن ابھی

اے ہمرہانِ قافلہ منزل سے ہوشیار
شب خوں کے انتظار میں ہیں راہزن ابھی

تہذیب شرمسار ہے اخلاق سرنگوں
باقی ہے حرّیت کی جبیں پر شکن ابھی

ہر چند آفتاب نمودار ہو چکا
تھرّا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی

بجلی کے قمقمے بھی ہیں شمع و چراغ بھی
محرومِ روشنی ہے مگر انجمن ابھی

کہتا ہے بے خبر کہ ترقی پسند ہوں
اور اشتراکیت میں وہی ماؤ من ابھی

دُنیا پہونچ رہی ہے کہاں سے کہاں شفیقؔ
تم ہو شریکِ محفلِ شعر و سخن ابھی

بسملؔ سعیدی

سنا ہے ایک جہاں اس جہاں سے پہلے تھا
عجب جہاں تھا اگر آسماں سے پہلے تھا

اگرچہ سجدے ہیں ممنونِ آستاں، لیکن
مذاقِ سجدہ مگر آستاں سے پہلے تھا

نہ شوقِ رہزنیِ دل نہ ذوقِ غارتِ جاں
عجب طریق مرے کارواں سے پہلے تھا

بہار تھی نہ خزاں برق تھی نہ تھا صیّاد
چمن نہ تھا جو مرے آشیاں سے پہلے تھا

اسی جہان کو انکار تھا قیامت کا
یہی جہان جو اک نوجواں سے پہلے تھا

نہ ہے وہ بزم کہ ہوتا ہے روز یہ محسوس
کہ جیسے کوئی تعلق یہاں سے پہلے تھا

ہنوز دل میں اسی شدّومد سے ہے بسملؔ
وہ حوصلہ جو مجھے امتحاں سے پہلے تھا

بہت ہوں گے کسی کا حُسنِ کامل دیکھنے والے
مگر ہوں گے نہ میرا عالمِ دل دیکھنے والے

نہ وہ منکر خُدا کے ہیں نہ جنّت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے

کبھی پوچھ اپنے غم سے میرے دل کے ذوق کا عالم
دو عالم کی خوشی دے کر مرا دل دیکھنے والے

نگاہیں کس جگہ سے کیا نتیجہ اخذ کرتی ہیں
کہ مجھ کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے

محبت اک وہ بے سمت و جہت عالم ہے جس میں ہیں
تجھے ہر سمت سے اپنے مقابل دیکھنے والے

تری محفل میں آبیٹھے تھے بزمِ خُلد سے اُٹھ کر
کہاں جائیں گے اُٹھ کر تیری محفل دیکھنے والے

نہ جانے مطمحِ ذوقِ نظر رکھتے ہیں کیا بسملؔ
کسی کو ماورائے حدِّ منزل دیکھنے والے

بادۂ ہر رنگ

شوق کھنڈوی

شمع خاموش چپ ہیں پروانے — رات کیا جلوہ گاہ میں گزری
تیرا غم منتقل سہارا تھا — ورنہ کیا کیا نہ راہ میں گزری

خرد کی مصلحتیں عشق کو قبول نہیں — نہ دل میں زہر ہلاہل، زباں شکر آمیز

تبسم کہہ گیا وہ بات پوری — جواب تک تھی نگاہوں میں ادھوری

وہ کیا کیا کر گئے دشوار منزل — تمہارے ساتھ دو اک گام چل کے

خمار دہلوی

چمن کی فکر نہ اندیشۂ بہار مجھے — قفس کی خیر قفس ہی ہے سازگار مجھے
مجھے یہ فکر کہ دیکھوں بقید ہوش انہیں — انہیں یہ ضد کہ نہ ہونے دیں ہوشیار مجھے
وہ بے قرار نگاہوں کا مل کے جھک جانا — تمام عمر رہے گا یہی خمار مجھے

شب فراق کراہیں نہیں کہ آہ نہیں — تباہ ہو کے بھی دنیا مری تباہ نہیں
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ مہر و ماہ یہ پھول — تمہارے جلوۂ رنگیں کی گرد راہ نہیں

ناطق گلاوٹھوی

روح افسردہ ہے، سونی ہے مری بزم حیات — لب خاموش کی زینت ہے ترا نام ابھی

مدہوش گوالیاری

یہ بھی نہ جا سکے گی اگر وہ نہ آئیں گے — دامن پکڑ لیا ہے شب انتظار کا

حفیظ جونپوری

محبت ایک مجبوری ہے ورنہ! — مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں ہے

تعشق لکھنوی

دن کاٹتا ہوں خنجر ابرو کی یاد سے — کشتیِ عمر بہتی ہے تیغوں کی دھار[1] پر

[1] آورد و تکلف سے شعر کی اور بیجنلٹی جاتی رہتی ہے مگر اس انداز کا تکلف کبھی کبھی لطف دے جاتا ہے۔

فردوسِ خیال

شعری بھوپالی

تری پُرکیف نظروں کا جو عالم یاد آتا ہے
نگاہیں تیرتی رہتی ہیں اور دل ڈوب جاتا ہے

وفائے حُسن کا افسانہ جب کوئی سُناتا ہے
مجھے اپنی تباہی کا زمانہ یاد آتا ہے

بھلا میں اور عزمِ جراءتِ الفت ارے توبہ
تمہیں نے ابتدا کی تھی جہاں تک یاد آتا ہے

نہ دو تم طعنِ ناکامی کسی بربادِ الفت کو
جو دل سے کھیلتا ہے جان پر بھی کھیل جاتا ہے

بظاہر جب تغافل ہے تو در پردہ عنایت کیوں
ارے او بھولنے والے! مجھے کیوں یاد آتا ہے

نہ تڑپ سکے نہ ٹھہر سکے نہ فغانِ درد سُنا سکے
اسے زندگی کا بھی حق نہیں ہے جو بارِ غم نہ اُٹھا سکے

ترے اعتماد و خیال پر مری زندگی کا مدار تھا
مجھے انقلاب کے حادثے نہ بنا سکے نہ مٹا سکے

وہ جو داغ تم نے عطا کیا اسے ہم نے دل میں چھپا لیا
جو چراغ تم نے جلا دیا اسے ہم کبھی نہ بجھا سکے

مجھے شوقِ دید تو لے چلا مگر آہ یہ نہ سمجھ سکا
وہ نقاب کیسے اُٹھائے گا جو نگاہ بھی نہ اُٹھا سکے

افسوں بھوپالی

جب سے وہ چشمِ التفات نہیں
رُوح میں گرمیٔ حیات نہیں

جو اشاروں پہ تیرے جیتے ہوں
ان کو مرنا بھی کوئی بات نہیں

جانتے وہ بھی ہیں کہ اُن کے بغیر
زندگی موت ہے حیات نہیں

موت کیا مانگیے کہ اے افسوں
زندگی سے کہیں نجات نہیں

دو شعر

(جو نواب سعادت علی خاں مرحوم والیٔ ٹونک سے منسوب کیے جاتے ہیں)

ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں
یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں

اُنہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں
مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

ماہر القادری

یہ دُنیا.....؟

شاعر جگ بیتی بھی بیان کرتا ہے اور آپ بیتی بھی! مگر آپ بیتی میں سوز و اثر کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے آپ بیتی بیان کی ہے ذاتی واردات شعر کے سانچے میں ڈھل کر "آتشِ گویا" بن گئے ہیں یہ چیخیں ہیں جو مسلسل صدائے بازگشت چاہتی ہیں۔ یہی وہ نوائے خونیں ہے جس کا ضبط کرنا شاعر کے بس کی بات نہیں!

کس قدر فتنہ ساز ہے دُنیا ۔۔۔ کتنی سفلہ نواز ہے دنیا
کتنے دوزخ ہیں بند سینوں میں ۔۔۔ کتنے دشنے ہیں آستینوں میں
کھیتیاں نیکیوں کی جلتی ہیں ۔۔۔ سازشیں پھولتی ہیں پھلتی ہیں
کینہ سازی ہنسی کے پردے میں ۔۔۔ دشمنی دوستی کے پردے میں
میٹھی باتیں نہیں اداکاری[1] ۔۔۔ سر سے پا تک فقط ریا کاری
جھوٹ، لالچ، غرض ہے سازش ہے ۔۔۔ زندگی کیا ہے اِک نمائش ہے
عاجزی ہے کبھی، کبھی ہے غرور ۔۔۔ ہر قدم پر منافقت کا ظہور
قہقہے زہر میں بجھے نشتر ۔۔۔ دِل ہے فولاد، نرم ہیں تیور

کوئی بھی آدمی ہو بر سرِ کار ۔۔۔ کہہ دیا اُس کو اپنا رشتہ دار
شیخیاں رُعب ڈالنے کے لئے ۔۔۔ پستیوں کو اُچھالنے کے لئے
اس دو رنگی کی بھی کوئی حد ہے ۔۔۔ کبھی دھمکی، کبھی خوشامد ہے

زہر پیمانۂ شرافت میں ۔۔۔ اژدہے آدمی کی صورت میں
ظُلم کے جال مکر کے پھندے ۔۔۔ لوبھ کے اور کپٹ کے ہیں دھندے

---

[1] acting

دَور کالوں کا ہے نہ گوروں کا
ہے زمانہ شریف چوروں کا

پست جذبات جب اُبھرتے ہیں
لوگ مُحسن کُشی بھی کرتے ہیں

کتنے شیطان آدمی بن کر
ہر قدم پر اُٹھا رہے ہیں شر

اک طرف بے غرض مروّت ہے
اک طرف چال ہے سیاست ہے

اِس طرف پھُول اُس طرف پتّھر
اُس طرف آگ، اِس طرف کوثر

اُس طرف زہر، اِدھر ہے آبِ حیات
خشک سالی وہاں، یہاں برسات

داغِ دل کے چھپاؤں گا کب تک
غم میں بھی مسکراؤں گا کب تک

اے خُدا منتقم ہے تیری ذات
اس کشاکش سے کب ملے گی نجات

اپنے حاسدوں سے

خواہ بوجہل کا ہو دَور کہ عہدِ فرعون
حق و باطل کا ہمیشہ سے رہا ہے ٹکراؤ

منزلِ حق میں ہر اک جَور گوارا ہے مجھے
چاہے دشنام کے ہوں زخم کہ تلوار کے گھاؤ

میرا سرمایۂ عزّت ہے نثارِ اسلام
مجھکو بدنام کرو شوق سے تہمت بھی لگاؤ

میں اِدھر عزمِ براہیمؑ کو محکم کرلوں
تم اُدھر آتشِ نمرود کو پیہم بھڑکاؤ[1]

خورد بینوں سے نہ دیکھو مرے دامن کو ابھی
پہلے تم اپنی جبینوں کی سیاہی تو مٹاؤ

غمِ مزدُور کا مظلوم سہارا لیکر
مے کدوں میں مے گلرنگ کے ساغر چھلکاؤ

آہ! وہ ذہن جو صورت گرِ افکار نہ ہو
ہائے وُہ فکر! کہ جس فکر کا حاصل اُلجھاؤ

صرف نعروں سے نہ مرعوب کرو دُنیا کو
تم اگر قول کے سچے ہو دلیلیں بھی تو لاؤ

میں کسی خوف سے خاموش نہیں رہ سکتا
ظُلمتِ شام کو مَیں صبح نہیں کہہ سکتا

---

[1] "چھڑکاؤ" بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ م

ماہر القادری

تیزاب

"قاتل" "قاتل"..... جی ہاں! "قاتل"

سادگی پر اُس کے مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

شہر کی فضا میں "قاتل" کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ سینما کے لونڈے رنگ برنگ کے کپڑے پہنے اشتہار بانٹتے ہوئے آوازیں لگا رہے تھے۔

"قاتل آگیا! قاتل! جس نے نہ دیکھا وہ زندگی بھر پچھتائے گا!"

شہر کے ایک ایک کوچہ اور گلی گلی میں "قاتل فلم" کی پبلسٹی ہو رہی تھی اور در و دیوار پر اسی کھیل کے جہازی پوسٹر لگے تھے۔ بستی کی بستی "قاتل" نظر آتی تھی ــــ اخباروں کے صفحات "قاتل" کی کافرادا ہیروین کی تصویروں سے مزین تھے، اخباروں میں لکھا تھا ــــ جلی سرخیوں کے ساتھ ــــ

"حسن نے انگڑائی لی، عشق مسکرایا اور جذبات جھومنے لگے۔ کہاں؟

"قاتل فلم" میں جس کا ہر سین جنتِ نگاہ اور جس کا ہر نغمہ سچ مچ فردوسِ گوش ہے۔ (روزنامہ کاروان)

سندر پروڈکشن کی گرانقدر پیشکش۔

"قاتل"

حسن و شباب کا اجتماع، بہار و نغمہ کی یکجائی اور.........

مجھ کو ڈر ہے کہیں لٹ جائیں نہ قاتل قاتل (ہفتہ آواز آزاد)

"قاتل نے تمام فلموں کے ریکارڈ توڑ دئے۔

"فردوس سینما" میں شائقین کا بے پناہ ہجوم۔

دو درجن دوشیزاؤں کا نیم عریاں رقص۔ (سہ روزہ ویرتا)

اخباروں اور فلمی پرچوں نے "قاتل" کو خوب خوب سراہا ــــ اُن کے بعض دلچسپ اقتباسات۔

"قاتل فلم" کے خالق مسٹر نوگی ستائش و تحسین کے مستحق ہیں، ایسی کامیاب تصویر کئی سال سے اسکرین پر نہیں آئی۔

"قاتل" میں مس دل آرا کی اداکاری اپنی معراج پر ہے، اس کی شوخ اداؤں نے فتنے جگائے ہیں، قیامت کو بیدار کیا ہے، دل آرا کی ایکٹنگ دیکھ کر جذبات میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔

"قاتل" اس سال کی سب سے اچھی فلم ہے، صدا بندی سے لیکر عکاسی تک ہر چیز اپنی جگہ بے مثال اور ناقابل مقابلہ! مکالمے سادگی و پرکاری کا صحیفہ، گانے شعر و نغمہ کی جنت، گانوں کی دھن دلکش! ہر اداکار کا کام اپنی جگہ

قابل دید ہے خاص طور سے جشن نوروز پر حسین لڑکیوں کا رقص تو لوح جذبات پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

سندر پروڈکشن نے "قاتل" جیسی شاہکار فلم بنا کر اپنی شہرت اور عزت کو لازوال بنا دیا۔ نفسیات کے ماہر ہدایت کار توفیق کے کمال کا یہ فلم بولتا ہوا ثبوت ہے۔ "قاتل" دیکھنے والوں کو برسوں یاد رہے گا۔

"پوری صحافت" "قاتل" کو اچھال رہی تھی۔ اس کی بارگاہ میں قصیدے پیش کر رہی تھی۔ تین روپیہ انچ کا لالچ اشتہاروں اور تنقیدوں کی زبان سے بول رہا تھا۔ "قاتل" کی پبلسٹی کی رہی سہی کسر ریڈیو نے پوری کر دی۔ ہر پروگرام میں قاتل کے ریکارڈ بجائے جاتے ——— یہ عوام کی پسند کے گانے تھے۔ پبلک کی آواز کا ریڈیو کے محکمہ کو بہر حال احترام کرنا پڑتا ہے ——— اور وہ گانے!

سندر جوبن سنسار رہا ہے، آنکھیں مدھ برسائیں۔

جوانی کا صدقہ ادھر دیکھ لینا

مست گھٹائیں مست ادائیں مست ہے سب سنسار

مری بالی عمریا بیتی جائے ——— سجن کب آؤ گے!

ہر گھر میں "قاتل" کے چرچے تھے۔ ہوٹلوں میں اسی کا ذکر تھا، سرکاری دفتروں تک میں "قاتل" پر مذاکرہ ہوتا ——— اور تو اور ایک مولوی صاحب نے اپنے وعظ میں قاتل فلم کا یہ شعر —

یاد کرتی ہیں تمہیں برسات کی تنہائیاں

اب تو آجاؤ کہ آنے کا زمانہ آگیا

خوب لہک لہک کر گایا اور سامعین بے ساختہ درود و سلام پڑھنے لگے۔

میر کوثر حسین کا گھرانا جو پرانی وضع اور خاندانی روایات کے لئے سارے شہر میں مشہور تھا "قاتل" کے طوفانی پروپگنڈے کی زد سے نہ بچ سکا۔ ذرا سا کوئلہ دہکتا ہے تو اپنے آس پاس کی زمین کو گرم کر دیتا ہے ——— اور یہاں تو پبلسٹی کے آتش لدے چھکڑے کے چھکڑے کر دئے گئے تھے۔ کوئی بھاگتا اور بچنا بھی چاہتا تو بھاگتے بھاگتے ایک آدھ لپٹ تو دامن کو چھو ہی لیتی۔

پاس پڑوس کی عورتوں نے "قاتل فلم" کی میر صاحب کے یہاں آ آکر وہ وہ تعریفیں کیں کہ میر صاحب کے گھر کی عورتوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایک کھوسٹ بڑھیا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جس نے "قاتل" فلم نہ دیکھی اس نے دنیا میں کچھ نہ دیکھا ——— آتش شوق بھڑک اٹھی، شرم و غیرت کی مہر کو ٹوٹ جانا پڑا۔ میر صاحب کی بیوی نے اصرار کیا کہ ہم نے آج تک سینما کی صورت نہیں دیکھی مگر اس تصویر کو ضرور دیکھیں گے، سارے شہر کی عورتیں اس فلم کی تعریفیں کر رہی ہیں اب رہا شرم و غیرت کا معاملہ تو ہمارے علاوہ کیا ساری دنیا بے شرم اور بے غیرت ہو گئی ہے، شرم و حیا کی پاسبانی در رکھوالی بس ایک ہمارے ہی گھرانے کے حصہ میں آئی ہے ——— اکبر صاحب کے گھر کے لوگ کتنے مذہبی اور پردے کے پابند ہیں ان کی بہن جو تین حج کر چکی ہیں اور ہر وقت تسبیح پڑھتی رہتی ہیں اس فلم کو کئی بار دیکھ کر آئی ہیں۔

میر کوثر حسین بھی بیچارے نرم پڑ گئے، سارا گھر ایک طرف تھا اور وہ اکیلے ایک طرف تھے۔ شوق و دلچسپی کا یہ نیا طوفان ان کے روکے رک بھی تو نہ سکتا تھا، امنگوں کی آندھیاں نصیحتوں سے نہیں تھما کرتیں ——— وہ خاموش ہو گئے، سادہ لبی ہونٹوں پر مہر سکوت تھی مگر ماتھا ناخوشی کی سلوٹوں سے بہت زیادہ گھمبیر ہو گیا تھا، عورتوں کی دلچسپی نے

میر صاحب کے خشم آلود تیوروں کی طرف دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور جو دیکھا بھی تو دیکھتے ہوئے ان دیکھا کر دیا۔

میر صاحب کے بھانجے بھتیجے اور خود اُن کا لڑکا فلموں سے دلچسپی رکھتا تھا، مگر میر صاحب کے ڈر سے اُن کا یہ جذبۂ شوق دبا دبا رہتا، رات کو آئے فلم دیکھ کر اور میر صاحب کے پوچھنے پر کوئی اور بہانہ تراش دیا، اب جو میر صاحب کے سکوت کو "نیم رضا" سمجھ کر گھر کی عورتیں سینما ہاؤس جانے کی تیاریاں کرنے لگیں تو جوان لڑکے خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئے ——— میر صاحب کی ناخوشی جو اس راہ میں اب تک سنگِ گراں بنی ہوئی تھی دور ہو رہی تھی، رکاوٹیں بندشیں اور پابندیاں ڈھیلی ہونے اور ہٹ جانے پر ہر کوئی خوش ہوتا ہے۔

میر صاحب کے گھر کی عورتیں سینما ہاؤس پہونچیں، آج اتوار کا دن تھا، سینما ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، تل رکھنے کی جگہ نہ تھی، تماشا گاہ کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر تو تیز مزاجوں کی ریل پیل آپا دھاپی؛ اور دھینگا مشتی کا یہ عالم تھا کہ بہت سے آدمی اُچک کر دوسروں کے کاندھوں پر چڑھ گئے، پولس گالیاں دے رہی تھی، ڈنڈے برسا رہی تھی مگر ان عاشقانِ جانباز کا شوق کسی طرح کم نہ ہوتا تھا بلکہ سپاہیوں کا ہر ڈنڈا سمندِ شوق کے لئے تازیانہ کا کام دے رہا تھا ——— ان میں بہت زیادہ تعداد اُن مزدوروں، قلیوں، چپراسیوں، رکشا اور تانگہ چلانے والوں کی تھی جو میلے اور پھٹے کپڑے پہنے گھومتے نظر آتے ہیں اور اپنے بچوں کے لئے افلاس و غربت کے سبب پڑھائی کا انتظام نہیں کر سکتے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی بہت سی راتیں فاقے اور نیم فاقے کی حالت میں بسر ہوتی ہیں ——— مگر یہ شوق کی فراوانی اور ہوس کی دلچسپی کا مسئلہ تھا اس جگہ ہر کوئی بے بس ہو جاتا ہے۔

میر صاحب کی بیوی اپنے ساتھ تین عورتوں اور دو بچوں کو لیکر زنانہ درجہ میں داخل ہوئیں، اُن کی جوان لڑکی فردوسی بھی اُن کے ساتھ تھی، فردوسی ایک خوبصورت اور صحت مند لڑکی تھی تیکھا نقشہ، خوش منظر، رنگ خوب کھلتا ہوا ہنس مکھ چہرہ اور نرم و ملائم تیور، اس کے ماتھے پر البتہ ایک نشان تھا، بچپن میں چوٹ لگ گئی تھی جو اپنی یادگار چھوڑ گئی ——— انمٹ یادگار جسے جراح کے مرہم اور ڈاکٹروں کے لوشن بھی نہ مٹا سکے، یہ داغ کسی بدصورت چہرہ پر ہوتا تو اور بُرا دکھائی دیتا مگر فردوسی کی لوحِ جبیں کو اس نشان نے —

؎ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کا نمونہ بنا دیا تھا فردوسی بہت شرمیلی لڑکی تھی ——— شریف کنواری لڑکیاں یوں بھی شرمیلی ہوا کرتی ہیں اور میر صاحب کے گھرانے کے ماحول نے فردوسی کی شرم و حیا پر اور نقاب ڈال دئے تھے۔ ابھی کھیل شروع ہونے میں دیر تھی، ریکارڈ بج رہے تھے، فضا میں سگریٹ کا دھواں سیاہ ابر پاروں کی طرح تیر رہا تھا اور قہقہوں کی گونج نے سینما ہال کو ہنگامۂ تفریح بنا دیا تھا، زنانہ درجہ میں پردے کا انتظام تھا مگر یہ پردہ! ——— بہت سی عورتیں پردے کی گرہیں نکال نکال کر مردانہ نشستوں کی طرف جھانک رہی تھیں ان میں زیادہ تعداد اُن عورتوں کی تھی جو خوب بن سنور کر آئی تھیں، زلف و گیسو کے پیچ سے لیکر ہونٹوں کی سرخی اور ناخنوں کی لالی تک ہر چیز مرتب بلکہ دیدہ زیب! آرائش دید و مظاہرہ اور داد و ستائش چاہتی تھی اور خود حسن کا جذبہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہا کرتا ہے جو پُر شوق نظروں کو دیکھ کر چپ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔

نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے سے خوب گھُل گھُل کر باتیں کر رہی تھیں ——— اُن کی باتیں:—

مجھے تو بہن! دلیپ کمار کی ایکٹنگ پسند ہے "ساتھی" فلم میں ٹینس کھیلتے ہوئے وہ کتنا خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔

میرا پسندیدہ [illegible] تو ظفر ہے۔ اُس کی اداکاری میں بلا کی جاذبیت اور قیامت کی دلکشی پائی جاتی ہے:

تو پھر ظفر سے تمہاری ملاقات کا انتظام کرایا جائے (ایک لڑکی مسکراتے ہوئے) ــــ دوسری لڑکی اس پر فوراً بولی اس طنز سے خود تمہارے دل کا چور بھی جھانک رہا ہے (لڑکیاں ایک ساتھ قہقہہ لگاتی ہیں) !

میر صاحب کی بیوی اس ماحول کو دیکھ کر گھٹن محسوس کر رہی تھی' سینما دیکھنے کا شوق غالب نہ ہوتا تو وہ اپنے بچوں کو لیکر اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتی' فردوسی کو بھی لڑکیوں کی یہ بے باکیاں ناگوار تھیں' اُس کے ماتھے پر فرط غیرت سے پسینہ آ گیا وہ طائر سربازدہ کی طرح سکڑی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی' ایسی باتیں اُس نے اب سے پہلے سنی ہی نہ تھیں۔

"ٹن' ٹن' ٹن ــــ" یہ پہلی گھنٹی تھی لوگ اپنی نشستوں پر جم کر بیٹھ گئے' کچھ وقفہ کے بعد دوسری گھنٹی بجی اور پردۂ سیمیں پر تصویریں حرکت کرنے لگیں' ہال میں جو ہنگامہ برپا تھا اس پر ایکا ایکی سکوت طاری ہو گیا ــــ موت کی خاموشی! نہیں! سکوتِ عیش' خامشیٔ شوق . . . جہاں نگاہیں زبان کا کام دیتی ہیں اور آدمی تمام تر نظارے میں ڈوب جاتا ہے۔

فلم کا ابتدائی حصہ سنجیدہ اور وزن خشک سا تھا' شریفوں کی گھریلو زندگی کا ماحول رنگین نہیں ہوا کرتا مگر یہ سنجیدگی تدریجاً رنگینی میں تبدیل ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ایک ایسا سین آ گیا جس میں ہیرو اور ہیروین نہایت بے تکلفی کے ساتھ جھولا جھول رہے تھے' اور اُس کے ساتھ یہ گانا ۔

سہ جوانی کو جھولا جھولا دے بالم!

اس پرمستزاد چھیڑ چھاڑ' چٹخارے دار فقرے' دونوں کی نگاہوں میں پُر شوق جذبات جھوم رہے تھے' بناوٹ سچ مچ اصلیت بن گئی تھی' ہیرو نے جب ہیروین کے شانوں میں گدگدی کی ہے تو مردانہ درجہ سے آواز آئی۔

"پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے"

زنانہ درجہ میں خاموشی طاری تھی' سب چپ چاپ تھے مگر انگلیاں چٹ چٹ بول رہی تھیں' سانسوں سے گرم نفسے سے نکل رہے تھے' انگڑائی پہ انگڑائیاں لی جا رہی تھیں ــــ فردوسی کے سینہ میں بھی دل اور دل میں گرم و جوان جذبات تھے' اُس نے انگڑائی نہیں لی' انگلیاں نہیں چٹخائیں لیکن دل نے لذت ضرور محسوس کی آنکھوں نے تمنا کی کہ یہ سین کاش! دہرایا جا سکتا ــــ یہ اس معصوم لڑکی کے جذبات کی پہلی نمود تھی جو فطرتاً ہلکی اور دبی دبی سی تھی ــــ ضمیر نے فوراً ٹوکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پندرہ سال کی تربیت کا رنگ سینما کے بس ایک ہی منظر میں پھیکا ہوا جا رہا ہے' فردوسی نے سر سے ڈھلکا ہوا دوپٹہ سنبھالا دل کی دھڑکن کو تھامنے اور روکنے کی کوشش کی مگر اس کوشش کے درمیان ہی میں ایک اور سین آنکھوں کے سامنے آ گیا یہ نظارہ پہلے منظر سے زیادہ رنگین تھا ــــ دریا کا کنارہ' ہیروین نہا رہی تھی اور ہیرو درختوں کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد چھیڑ چھاڑ اور خوش فعلیاں ــــ فردوسی کا شوق نظارہ پھر ڈانواڈول ہو گیا' ضمیر نے اب کی بار چٹکی لی تو جذبات نے اس کسک کو دبا دیا ہوس ضمیر کیساتھ اسی قسم کی جنگ لڑا کرتی ہے۔

وقفہ (INTERVEL) ہوا' تصویریں غائب ہو گئیں' دھندلکا جاتا رہا۔ قمقمے روشن کر دئے گئے' سارے ہال میں اُجالا پھیل گیا' نظارے میں ڈوبے ہوئے لوگ چونکے جیسے کوئی گہری نیند سے یکایک جاگ اُٹھے سینما ہال پھر ہنگامۂ قیامت بن گیا' تالیاں' سیٹیاں' قہقہے اور چائے سگریٹ والوں کی آوازیں!

زنانہ درجہ کے قریب مرد آ کر کھڑے ہو گئے' یہ اُن کے رشتہ دار تھے' محرم بھی اور نامحرم بھی!! اپنے بال بچوں

اور متعلقہ عورتوں کی خبر لینے آئے تھے، نگراں میں کچھ نوجوان نظر باز اور شوقین مزاج بھی تھے جو اپنی کسی عزیز عورت سے بات کرتے ہوئے دوسری عورتوں کو بھی کن انکھیوں سے دیکھتے جاتے تھے ـــــ اور کسی کسی چلمن کے قریب دبی دبی آواز سے رومان آفریں بات چیت بھی ہو رہی تھی، کوئی کوئی لڑکی گیلری میں بھی آگئی تھی ـــــ

"جی! کھیل ختم ہونے کے بعد بس زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں آپ کے ساتھ رہ سکتی ہوں، کالج کے ڈرامہ والے دن، گھر دیر سے پہونچی تو میرے بڑے بھائی نے زمین آسمان سر پر اٹھا لئے وہ تو اماں جان آڑے آگئیں ورنہ بھائی جان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔

"میں تمہاری گلی کے نکڑ پر موٹر کا ہارن بجاؤں گا ـــــ مسلسل تین بار، دیر نہ ہونی چاہئے اور ذرا ہمت کی بھی ضرورت ہے، بس بیڑا پار ہے" "جی" (آنکھیں نیچی ہوگئیں، شرم کے مارے نہیں! اللطف والذت کے اثر سے! اور پلکوں کے اس جھکاؤ سے "اقرار" کا اظہار بھی ہو رہا تھا کہ میں تم جیسے قدردان چاہنے والے کے کہے سے باہر نہیں ہوں)

"کہو رضیہ! کھیل پسند آیا (لڑکی مسکراتی ہے) ارے! تم شرما رہی ہو، یاد ہے ندی کے کنارے کا وہ منظر... بس اسی کو فلم میں دہرا دیا گیا، ہماری تنہائیاں بھی منظر عام پر آگئیں۔

آپ...... آپ، آہستہ... آہستہ... گفتگو .... یہ (ایک بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کان لگائے ..... ہوئے ہیں ...... (ایک لڑکی نے ایک ایک لفظ کو رک رک کر اور ٹکڑے کر کرکے کہا .....)

گھنٹی بجی، وقفہ ختم ہوا، لوگ پھر ایک ہی مرکز پر سمٹ آئے، چلتی ہوئی زبانیں ایکا ایکی رک گئیں، اسکرین پر تصویریں حرکت کرنے لگیں، حرکت ہی نہیں آواز بھی اپنا کام کر رہی تھی ـــــ "تہذیب حاضر کا "معجزہ" تصویروں میں جان ڈال دی گئی، کاغذ اور لکیروں کو گویا بنا دیا گیا، اس سے زیادہ سستی تفریح اور کیا ہو سکتی ہے، روپیہ دو روپیہ میں آدمی کا دل بہل جائے اور غم غلط ہو جائے، یہ "کرامت" نہیں تو اور کیا ہے۔

کھیل کا آخری حصہ غمگین تھا مگر یہ ٹریجڈی بھی رنگینیوں اور چٹخاروں سے خالی نہ تھی، ایک سین میں دکھایا گیا کہ ایک بیوی اپنے شوہر کے انتظار میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے اور اس کے فوراً بعد کا سین یہ تھا کہ اس کا شوہر کلب گھر میں مزے اڑا رہا ہے، دور خراب، حسینوں کا جھرمٹ، نیم عریاں لباس، رقص و نغمہ اور چھیڑ چھاڑ بھی! بعض تماشائی تو اس منظر کو دیکھ کر اچھل اچھل پڑے ـــــ پورا کھیل عیش و غم کی اس دھوپ چھاؤں سے مرتب ہوا تھا، غم کی دھوپ کچھ یوں ہی سی، اور عشرت کی چھاؤں بہت زیادہ تھی، افسانہ نگار نے نصیحت اور اصلاح کا بھی ایک پہلو اس میں رکھا تھا ـــــ لیکن عیش و تفریح کے نقار خانہ میں اصلاح و موعظت کی اس کمزور آواز کو پوری طرح سنا نہ جا سکا، سینما ہالوں میں لوگ پند و نصیحت کی باتیں سننے کے لئے نہیں مسرت حاصل کرنے اور دل بہلانے کے لئے آتے ہیں، تفریح اور نصیحت، اچھا۔ے اور عبرت ایک انمل بے جوڑ سی بات ہے جیسے کوئی آگ سے بجھانے کا اور پانی سے جلانے کا کام لینے کی کوشش کرے۔

کھیل ختم ہوا لوگ سینما ہال سے تیزی کے ساتھ نکلے، عورتوں نے اپنے برقعے سنبھالے، پردہ خواتین مردوں سے پہلے گیلری میں آگئیں ـــــ تماشا، تماشائی، تماشا گاہ! ہوس اور جذبات کا "تصوف" اپنا کام کر رہا تھا، یہ لذت و ہوس کی THEOSOPHY تھی جہاں "وحدت الوجود" کی جگہ "وحدتِ جذبات" نے لے لی تھی سب کا قریب قریب ایک ہی جیسا عالم تھا۔

میر صاحب کی بیوی بچوں کو لیکر گھر آئیں، اور گھر آکر کھیل کی خوب خوب تعریفیں کیں، وہ بڑھیا سفید چونڈے پر ہاتھ پھیر کر بولی :۔

ان کرسٹانوں نے سینما کیا بنایا ہے بس یوں سمجھو کہ جادو کا طلسم کھڑا کر دیا ہے، ارے صاحب! تصویروں میں سچ مچ جان ڈال دی ہے، اسی عقل کی بدولت تو یہ لوگ دنیا پر حکومت کر رہے ہیں، اور سارا جہان ان کی مٹھی میں ہے۔

فردوسی خاموش تھی مگر جذبات بول رہے تھے، دوشیزگی کی غیرت نے زبان پر مہر لگا دی تھی۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت فردوسی جیسی تھی سینما سے واپس ہو کر بالکل ویسی نہ رہی، آدمی گوشت پوست کا نہیں، خیال و جذبات کا نام ہے یہ بدل جائیں تو سمجھو کہ آدمی بدل گیا ــــــ وہ اب سینما ہال میں نہیں اپنے گھر پر تھی مگر دل انھیں تصویروں میں پڑا تھا اور کانوں میں سینما کے گیت گونج رہے تھے۔

فردوسی کے جذبات کی یہ ہل چل رفتہ رفتہ دھیمی پڑتی گئی، رات کی تنہائی میں فلم کا ایک آدھ سین کبھی کبھار تھوڑا سا بے چین کر دیتا مگر یہ بے چینی سی دھ اور قریب قریب معصوم تھی یہ نقش دھندلے ہو گئے اور مٹنے کے قریب ہی تھے کہ ایک نئی فلم کے نظارے نے ان لکیروں کو پھر سے ابھار دیا، پہلے یہ نقوش سادہ و بے رنگ تھے اب کی بار ان میں رنگ بھر گیا ــــــ اور یہ سلسلہ چلتا ہی چلا گیا۔

آغازِ ہوس فردوسی اپنے چہرے کو بار بار آئینہ میں دیکھتی اور اس کی نگاہیں کچھ کمی سی محسوس کرتیں ــــــ کمی حسن و ادا کی ستائش کرنے والی نگاہوں کی آئینہ کی بے جان حکایت سے اُس کی سیری نہ ہوتی تھی، نگاہیں اپنے جواب میں آئینہ کے جوہر نہیں نگاہیں چاہتی تھیں ــــــ فلمی نظارے نگاہوں کو اتنا بھی نہ سکھاتے تو فلمی صنعت کی کون قدر کرتا۔

شہر میں ایک کھیل آیا تھا جس کا نام تھا "جوالا" اس کھیل میں ہیرو اور ہیروین کے معاشقہ کا آغاز اس طرح ہوتا تھا کہ ہیروین اپنے ایک رشتہ دار نوجوان سے ایک عاشقانہ شعر کا مطلب پوچھتی ہے، بس اُسی دن سے پریم کی داغ بیل پڑ جاتی ہے اور اسی بنیاد پر واقعات کی دیواریں اٹھنے لگتی ہیں۔

فردوسی کے بہت سے رشتہ دار نوجوانوں کا اُس کے یہاں آنا جانا رہتا تھا مگر وہ اُن سے دور ہی دور رہتی، کبھی کسی سے بات چیت کر لی، کوئی ذکر کل آیا تو وہ بھی بیچ میں بول اٹھی ــــــ مگر اب وہ جان کر اور محسوس کر کے اُن سے باتیں کرتی۔

توفیق فردوسی کے ماموں کا قریبی عزیز تھا، اُس کا مکان فردوسی کے محلہ ہی میں تھا، توفیق خوش طبع، شوخ مزاج اور قبول صورت نوجوان تھا، کھیل کود سے اُس کو بہت زیادہ دلچسپی تھی، کالج میں مذہبی تعصب اور قومی جانبداری کا چلن نہ ہوتا تو اپنی ٹیم کا وہ کپتان ہو جاتا، اسی شوق کی بدولت ایف۔ اے کے امتحان میں وہ مسلسل تین سال ناکام رہا۔

میر صاحب کے یہاں توفیق پہلے تو کبھی کبھار آتا تھا، ایک دن آیا اور چھ سات دن کا ناغہ کر دیا مگر اب فردوسی کی بدلی ہوئی روش کو دیکھ کر وہ بار بار بلکہ جلد جلد آتا، توفیق کے جلد جلد آنے اور فردوسی کے گھل مل کر بات چیت کرنے کو دونوں اچھی طرح سمجھ رہے تھے مگر ابھی دلچسپی لفظوں تک محدود تھی ــــــ بہت بڑھے تو ایک آدھ مسکراہٹ سے جی خوش کر لیا، دوشیزگی ابھی تک عصمت و عفت کے حدود کو پھاند بھی تو نہیں سکتی۔

مگر ایک دن کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی واردات ۔ ۔ ۔ :-

توفیق بھائی! ایک شعر کا مطلب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، شعر پورے طور پر سمجھ میں نہیں آیا ـــــ فردوسی نے دریافت کیا۔

میں اور شعر کا مطلب! میرا مذاق اڑا رہی ہو فردوسی! اسے کہتے ہیں آجکل کی اصطلاح میں "[illegible]" یعنی کسی آدمی کو بیوقوف بنانا ـــــ توفیق نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ارے صاحب! آپ تو بڑا دیدہ ہنستے ہیں، اپنی تعریف کا یہ بھی اچھا طریقہ ہے

ہاں! وہ شعر یہ ہے۔

ہو چکی بیمارِ اُلفت کو تسلی ہو چکی
ایک وہ دیدہ و نظر وہ بھی غلط انداز ہے

بہت خوب! تمہارے حسنِ انتخاب کی داد نہ دینا خود اپنی جگہ ظلم ہے، تو اس کا مطلب (فردوسی کی ماں کمرے میں داخل ہوتی ہے، اور توفیق گفتگو کا موضوع بدل دیتا ہے ـــــ بڑھیا کے جاتے ہی پھر اس گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

توفیق تو بس دوسری طرف سے ایک آدھ اشارے کی! ہ دیکھ رہا تھا کھل کر اقدام کرتے ہوئے وہ جھجکتا تھا اب فردوسی جو ایک آدھ قدم بڑھی تو یہ توفیق گردن سرک کر قریب آ گیا، وہ تجربہ کار تھا ـــــ کالج کا مشہور کھلنڈرا! فردوسی نے سینما کی تصویروں سے کچھ شوخ باتیں سیکھی تھیں اور توفیق کی نگاہوں میں بہت سے تجربے غلطاں تھے اس کی ہوس جہاندیدہ اور آزمودہ کار تھی ـــــ اندھے جذبات، ہوشیار ہوس نے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے یہ لے بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جذبات اب طویل فرصتوں اور لمبی تنہائیوں کو ڈھونڈنے لگے ـــــ مگر میر صاحب کے گھر میں رہ کر یہ تمنا کہاں پوری ہو سکتی تھی، ہوس کو بہ جال اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکالنی ضروری تھی توفیق اور فردوسی میں مشورہ ہوا! اسکیم بنائی گئی ـــــ فرار کی اسکیم، بھاگ چلیں، بھاگ۔ چلنا چاہتے ہیں، بھاگنا ہی پڑے گا ـــــ اور بدنامی جو ہو گی! ـــــ محبت میں بدنامی تو ہوا ہی کرتی ہے ـــــ اور خاندان کی عزت و غیرت! ـــــ یہ سب پرانے اور فرسودہ تصورات ہیں عشق و محبت کو اس رسمی عزت اور بناوٹی غیرت سے سدا کا بیر ہے ـــــ دنیا والے کیا کہیں گے! ـــــ دنیا والے نیکوں اور پارساؤں کو کہنے اور تہمت جوڑنے سے کب چھوڑتے ہیں، لوگوں کے کہنے کے ڈر سے کیا ہم اپنی محبت کو پروان پڑھنے سے روک دیں، کچھ دن اس واقعہ کا ذکر رہے گا، پھر لوگ بھول جائیں گے۔

ہوسناکی نے آن کی آن میں پوری اسکیم تیار کر دی، اب چلیں، کس طرح چلیں؟ کس کس بات کی احتیاط ضروری ہے!ـــــ دونوں بھاگ نکلے، کس نے کس کو بھگایا؟ اس کا تصفیہ مشکل تھا، دونوں اس گناہ میں برابر کے شریک تھے، دونوں میں سے ایک کی بھی مرضی نہ ہوتی تو اس کی نوبت ہی کیوں آتی ـــــ عشق و محبت کے نام پر "فرار" طرفین کی خوشی کا سودا ہے، دو دل راضی ہوتے ہیں تو یہ حادثہ ظہور میں آتا ہے۔

فردوسی اور توفیق دو تین شہروں میں ٹھیرتے ٹھیراتے کلکتہ پہونچے، ان کے گھر والوں میں سے کسی نے بھی نہ تعاقب کیا

اور نہ جستجو کی، کلکتہ میں جاکر توفیق ایک فرم میں ملازم ہوگیا۔ دونوں مفرور۔۔۔۔ اب میاں بیوی بن گئے تھے۔۔۔۔ ہل جل کر رہنے لگے۔ توفیق نے دلدہی میں کمی نہ کی اور فردوسی کا سلوک بھی نیاز مندانہ رہا، مگر تعلقات کی یہ گاڑی بہت دن تک ایک ہی لیک پر نہ چل سکی، بنیاد کی پہلی اینٹ ہی اتفاق سے ٹیڑھی تھی، عمارت کو کج، خمیدہ اور ٹیڑھا ہونا ہی چاہیئے تھا۔

کلکتہ تھا۔۔۔۔ برطانوی حکومت کا دوسرا بڑا شہر، لندن کے بعد اسی کا نمبر تھا۔ رنگیلا، اور گناہوں کی یہاں کمی نہ تھی۔۔۔۔ آدمی بھی تو چالیس لاکھ سے کچھ اوپر تھے، آبادی کے تناسب سے گناہ کم او زیادہ ہوا کرتے ہیں۔۔۔۔ حکومت مردم شماری کرتی ہے مگر "گناہ شماری" نہیں کرتی اور پولس کی جرائم کی فہرستیں اکثر ناتمام اور ادھوری ہوتی ہیں۔

توفیق کی اسی کمپنی کے ایک کلرک سے بہت گہری دوستی ہوگئی یہاں تک کہ گھروں میں آنا جانا ہوگیا۔۔۔۔ سرفراز، توفیق کا دوست، ان لوگوں میں تھا جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ۔۔۔۔

بد نہ گفتہ نقش نگرو دبہ سالہا معلوم

اس دوستی میں فردوسی کی خوبصورتی اور جوانی بھی شریک تھی۔۔۔۔ مگر توفیق کو گمان تھا، ہر آدمی دہوکا کھا سکتا ہے، توفیق کو بھی اس کا شکار ہونا پڑا، سرفراز نے پہلے توفیق کا اعتماد حاصل کیا، اس کے دل میں یہ بات اتار دی کہ سرفراز کردار کے اعتبار سے فرشتہ ہے۔

سرفراز اپنے دوست توفیق کے گھر ایسے اوقات میں آتا جبکہ توفیق وہاں نہ ہوتا، فردوسی نے اس کی طرف ذرا سا بھی التفات نہیں کیا مگر۔ لمبی لمبی تنہائیاں۔۔۔۔ اچھوتی اور بے اثر کیسے رہ سکتی تھیں، بیگانگی اور عدم التفات کے بند تھوڑے بہت ڈھیلے ہونے لگے مگر ابھی کچھ یوں ہی سا آغاز تھا، فردوسی ہوس پرست سرفراز کی ہر کمند شوق کو واپس پھینک رہی تھی، سرفراز کے اس آنے جانے کو خود توفیق بھی محسوس کرنے لگا، مگر کھل کر کہنے کی اس میں جرات بھی نہ تھی!

ایک دن توفیق شام کو گھر آیا تو نوکرانی نے کہا! مالکن چھوٹے بابوجی (سرفراز) کے ساتھ سینما دیکھنے گئی ہیں، توفیق کی غیرت کو دھکا سا لگا، وہ زور زور سے انگلیاں چٹخانے لگا اور ماتھے پر سلوٹیں بننے بگڑنے لگیں جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے، پھر وہ باہر گیا اور ایک بوتل لیکر واپس ہوا

اسے اتفاق کہئے یا سرفراز کی فراست اور موقعہ شناسی کہ وہ فردوسی کو گلی کے موڑ پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔

کہاں تشریف لے گئی تھیں، بیگم صاحبہ!۔۔۔۔ توفیق نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

سینما دیکھنے کے لئے! بڑا پُر لطف کھیل آیا ہے، کل ہم دونوں چلیں گے، اتنی اچھی تصویر کبھی اتفاق سے آجاتی ہے۔۔۔۔ فردوسی نے جواب دیا۔

اور اپنے دوست سرفراز کو کہاں چھوڑ آئیں۔۔۔۔ توفیق نے پوچھا

کیا کہہ رہے ہو تم! میرے دوست کیوں ہونے لگے وہ اور۔۔۔۔ فردوسی کی بات کاٹتے ہوئے توفیق بولا۔۔۔۔ سینما دشمنوں کے ساتھ نہیں دوستوں اور آشناؤں کے ساتھ جایا جاتا ہے، جو لڑکی اپنے ماں باپ کی عزت آبرو کو خاک میں ملاکر غیر مرد کے ساتھ بھاگ سکتی ہے وہ شوہر کی آبرو کو بھی ماچس دکھا سکتی ہے، بے وفا کہیں کی!

اور اس کے بعد توفیق نے ایک شیشی فردوسی کے چہرے پر پھینک دی، فردوسی نے چیخ ماری، وہ زمین پر لوٹنے لگی۔ اس کی چیخیں بہت ہی دردناک اور طاقتور تھیں قریب ہی پولس کی چوکی بھی پاس پڑوس کے لوگوں کے ساتھ ہی پولس کے سپاہی

بھی آ نہ سکے۔

نوکرانی سے پوچھ گچھ کے بعد توفیق گرفتار کرلیا گیا، توفیق نے بھاگنے کی کوشش ہی نہیں کی [illegible] تھا کہ خود ہیں تڑپتا دیکھ کر اپنے جذبۂ انتقام کو وہ تسکین دینا چاہتا تھا مگر پولیس نے اس تمنا کو پورا نہ ہونے دیا، یہ خواہش [illegible] رہ گئی۔

اس کے بعد ——— حوالات ——— عدالت کا کٹہرا، ثبوت، انصاف کی طرح بحث ——— اور پھر فیصلہ ———

دو سال قید بامشقت کی سزا سیشن کورٹ میں اپیل ہوتی تو سزا میں تخفیف ہو جاتی کیونکہ [illegible] زیادہ [illegible] تھا ——— لیکن اپیل کون کرتا، اس کی ہمدرد فردوسی ہی ہو سکتی تھی سو وہ اسی خونخوار اقدام کی بدولت ہسپتال میں پڑی تھی، تیزاب نے اس کی ایک آنکھ کو بیکار کر دیا تھا اور چہرے کی کھال [illegible] کیا سارے نقشہ ہی کو بدل دیا تھا

فردوسی ہسپتال سے جب ہو کر باہر آئی تو وہ پہچانی نہ جاتی تھی، کہاں وہ خوش جمالی اور دیدہ زیبی کہ نگاہیں بار بار دیکھنے کی خواہش کریں اور اب بدصورتی اور بدہیئتی کا یہ عالم کہ اس کا چہرہ سراپا نفرت اور مجسم بیزاری بن گیا تھا ——— وہ قریب قریب اندھی ہو گئی تھی، ایک آنکھ بالکل بیکار تھی اور دوسری بھی کانی سے زیادہ متاثر تھی ——— اس کی جوانی تو اب سے چار سال پہلے دوشیزگی کے زمانہ ہی میں فلموں نے اُچک لی تھی، آغاز سے انجام کو ربط ہی تو ہوا کرتا ہے۔

فردوسی اب ایک زندہ لاش تھی، بہت ادھ [illegible] کی ہوئی لاش ——— [illegible] فلمی [illegible] ہوں کا مزاج [illegible] رہنا!

روحِ انتخاب

غزوہ موتہ کے بعد شام کے ایک قافلہ نے آکر خبر دی کہ رومیوں نے شام میں بڑا بھاری لشکر جمع کیا ہے، جس میں لخم، جذام اور غسان کے تمام قبائل شامل ہیں، وہ عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مناسب خیال فرمایا کہ اس فوج کی مدافعت عرب کی سرزمین میں داخل ہونے سے پہلے کرلی جائے تاکہ ملک کے اندرونی امن میں خلل واقع نہ ہو اس بنا پر حضورؐ نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا، چند دنوں میں تیس ہزار پروانے شمع نبوت کے گرد جمع ہو گئے۔

تبوک پہونچ کر حضرت نے صحابۂ کرام کو مخاطب فرمایا:-

ہر ایک کلام سے خدا کی کتاب سچائی میں بڑھ کر ہے، سب سے بڑھ کر مضبوط کڑا تقویٰ کا کلمہ ہے، سب ملتوں سے بہتر ملت حضرت ابراہیمؑ کی ملت ہے، سب سے بہتر طریقہ محمدؐ کا طریقہ ہے، اللہ کے ذکر کو سب باتوں پر شرف حاصل ہے، سب بیانوں سے بہتر یہ قرآن ہے، بہترین کام اولوالعزمی کے کام ہیں، اور بدعات بدترین چیزیں ہیں۔

انبیا کی روش تمام روشوں سے اچھی ہے، سب سے بہتر شہیدوں کی موت ہے، ہدایت کے بعد گمراہی سب سے بڑھ کر اندھاپن ہے، بہترین کام وہ ہیں جو مفید ہوں، بہترین روش وہ ہے جس کی پیروی ہو سکے۔ بدترین کوری دل کا نابینا ہو جانا ہے، بلند ہاتھ (دینے والا) پست (لینے والے ہاتھ) ہاتھ سے اچھا ہے۔ تھوڑا اور کفایت کرنے والا مال غفلت میں ڈالنے والی مالداری سے اچھا ہے

بدترین عذر وہ ہے جو بحالت نزع کیا جائے۔ قیامت کی ندامت سب سے بدتر ہے بعض لوگ جمعہ پڑھنے آتے ہیں مگر ان کے دل پیچھے لگے رہتے ہیں ـــــ اور بعض لوگ بہت کم کم خدا کا ذکر کرتے ہیں، جھوٹی زبان سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے، نفس کی فارغ البالی بہترین فارغ البالی ہے، بہترین توشہ تقویٰ ہے، خدا سے ڈرتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے، یقینی بات خوب دل نشین ہوتی ہے۔ شک پیدا کرنا کفر کی علامت ہے، مردے پر نوحہ کرنا جاہلیت کی یادگار ہے خیانت کرنا جہنم کا سامان تیار کرنا ہے، شراب سے بدمست ہونا آگ میں جلنا ہے، والشعر من ابلیس (بیہودہ، شعر گوئی شیطانی کام ہے) شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے، یتیم کا مال کھانا بدترین روزی ہے، سعادت مند دوسروں سے عبرت پکڑتا ہے، بدبخت ماں کے پیٹ میں ہی بدبخت ہوتا ہے، ہر شخص کو چار ہاتھ زمین (قبر) میں جانا ہے کام کا انجام دیکھا جائے عمل کا مدار انجام پر ہے، ہر آنے والی چیز قریب ہے، مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر کی علامت ہے، مومن کی غیبت کرنا اللہ کی معصیت ہے، مومن کا مال اس کی جان کے برابر محترم ہے جو لوگوں کی عیب پوشی کرتا ہے، خدا اس کی عیب پوشی کرتا ہے، جو معافی دیتا ہے خدا اس کو معاف کرتا ہے، جو غصہ پی جاتا ہے خدا اس کو اجر دیتا ہے، جو نقصان پر صبر کرتا ہے خدا اس کو عوض دیتا ہے۔

جو لوگوں کے عیوب پھیلاتا ہے خدا اس کو رسوا کرتا ہے، صبر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ دُگنا اجر دیتا ہے، نافرمان کو خدا عذاب دیتا ہے۔

ف: مترجم نے تو بیہودہ کے معنی [illegible] کیا۔

مستقبل کے فتنے

عبدالرحمٰن بن عبد رب الکعبہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں مسجد حرام میں آیا کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص خانہ کعبہ کے سایہ میں لوگوں کے جھرمٹ میں تشریف فرما ہیں میں بھی آکر بیٹھ گیا' حضرت عبداللہ نے فرمایا' ایک مرتبہ کسی سفر میں ہم حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ تھے ایک پڑاؤ پر اتر کر ہم قیام وطعام کے انتظام میں مشغول ہو گئے' کوئی خیمہ نصب کر رہا تھا کوئی اپنی سواری کے لئے آب ودانہ کا انتظام کر رہا تھا کہ اتنے میں منادی نے ندا کی لوگو! نماز کے لئے جمع ہو جاؤ آواز سن کر ہم سب چلے آئے' پھر حضور نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

مجھ سے پہلے بھی ہر پیغمبر پر لازم تھا کہ وہ اپنی امت کو بھلائی کی تعلیم دے اور برائی کرنے سے ڈرائے اور میری امت کے ابتدا میں آرام و عافیت ہے اور آخری حصہ میں فتنے آنے والے ہیں' ہر پچھلا فتنہ پہلے کی نسبت زیادہ سخت ہوگا جب ایک فتنہ آئے گا تو مومن کہیں گے کہ یہ فتنہ ہم کو ہلاک کر دے گا اور دوسرا فتنہ آجائے گا تو مومن اس کو آخری فتنہ سمجھ لیں گے پس جو یہ چاہے کہ دوزخ سے بچ کر جنت میں داخل ہو جائے وہ ہر وقت اپنے ایمان پر مصر رہے اور لوگوں سے وہی سلوک کرے جس کی ان سے توقع رکھتا ہے جس نے ایک امام کی بیعت کر لی اس نے جان ومال اس امام کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں حتی الوسع اس کی متابعت کرے اگر کوئی دوسرا اس کے مقابلہ پر نکل کر بغاوت کرے تو سب مل کر اس کی گردن مار دو۔

جماعت کا ساتھ دو

ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے سفر شام کے دوران میں مقام جابیہ پر صحابہؓ کے سامنے تقریر فرمائی لوگو! آج میں تمہارے سامنے وہی بات کہنے کیلئے کھڑا ہوا ہوں جو ایک موقعہ پر حضور نے تقریر کرتے ہوئے فرمائی تھی۔ سنو۔

میں اپنے صحابہؓ کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں پھر ان کے بارے میں جو ان کے بعد ہوں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے جانشین ہوں گے ان کے بعد جھوٹ عام ہو جائے گا آدمی بغیر کسی تقاضے کے حلف اٹھائے گا اور بغیر مطالبہ کے گواہیاں دے گا کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہا نہ رہے ورنہ ان میں تیسرا شیطان ہوگا۔

جماعت کا ساتھ دو' افتراق سے بچو' شیطان تنہا آدمی کا ساتھی ہوتا ہے دو آدمیوں سے وہ کچھ ہی دور رہتا ہے جس کو جنت کی وسعت پسند ہو وہ جماعت کا ساتھ دے' جس کو نیکی سے خوشی اور برائی سے غم پہونچتا ہو وہی مسلمان ہے۔

حدود اللہ کی نگہداشت

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے عجیب تماشا کیا' چند گھروں میں چلی گئی اور ان کے دوستوں اور واقف کاروں کا نام لیکر زیورات سمیٹ لائی' پھر ان کو بیچ کھایا' پکڑی گئی اور آنحضرتؐ کے سامنے پیش کی گئی' اس عورت کے رشتہ داروں نے حضرت اسامہؓ بن زید سے سفارش کے لئے کہا جب اسامہؓ نے حضور سے ذکر کیا تو آپ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا اور فرمایا:۔

"تم میرے سامنے حد شرعی کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟

حضرت اسامہؓ نے ندامت کے ساتھ عرض کیا۔

یا رسول اللہ! میرے لئے خدا سے معافی مانگ لیجئے۔

پھر اسی شام کو آپ نے تقریر فرمائی جس میں حمد وثنا کے بعد فرمایا۔

پچھلی امتیں اس لئے بھی ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کر لیتا تو اس پر حد جاری کر دیتے خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی

سرو۔ ناجائز امور میں اس کی متابعت کرو اور نہ جائز میں اس کی کہنا مانو (حدیث شریف)

چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹا جائے گا۔

نمازِ استسقاء حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ لوگوں نے حضورؐ کے سامنے خشک سالی کی شکایت کی آپ نے ان کیلئے ایک تاریخ مقرر فرمائی اس دن عیدگاہ میں منبر تشریف رکھا گیا اور سب لوگ وہاں پہونچ گئے چاشت کے وقت آپ نکلے اور منبر پر رونق افروز ہوکر خدا کی تعریف کی پھر فرمایا۔

تم لوگوں نے خشک سالی کی شکایت کی ہے اور یہ کہ امسال وقت پر بارش نہیں ہوئی۔ بیسے موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے تم کو دعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہاری دعا سُنے گا۔

سب تعریف خدا کی ہے جو مخلوق کا پالنے والا رحمٰن ورحیم ہے قیامت کے دن کا مالک ہے۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے الٰہی! تو ہی خداوند ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو غنی ہے اور ہم محتاج ہیں ہم پر رحمت کی بارش نازل فرما اور اُسے ہمارے لئے قوت اور روزی کا وسیلہ قرار دے۔

پھر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اتنے اوپر کو اٹھائے کہ بغلوں کی سپیدی نظر آنے لگی پھر لوگوں کی طرف پیٹھ پھیر کر تحویل ردا[1] کی پھر لوگوں کی طرف منہ کیا، منبر سے اترے اور دو رکعت نماز پڑھائی اتنے میں بادل آیا گرجا چمکا اور خدا کے حکم سے برسا، ابھی آپ مسجد تک نہیں پہونچے تھے کہ نالوں سے پانی بہہ نکلا جب آپ نے لوگوں کو تیز تیز گھروں کی طرف جاتے دیکھا تو انسانی فطرت پر مسکرادئے اور فرمایا۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور میں اُس کا بندہ اور رسول ہوں!۔ (خطبات نبوی)

حضور سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کے ارشادات گرامی آپ کے سامنے آچکے ہیں اسی مقدس پیغام کی تفسیر اور ترجمانی کی توفیق خدا کے ایک نیک بندے اور رسولؐ کے فرمانبردار اُمتی (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) کو نصیب ہوئی ہے، سعادت اس کے لئے جو حق بات کو گرہ باندھ لے۔

فتنہ کی جڑ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے۔ مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوچکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ نہیں سکتا گویا اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو اگر اللہ کو نہ مانے گا تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے آلہہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔

غور سے دیکھئے۔ کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس POLITICAL BUREAU کے ارکان باشندگانِ روس کے ارباب و آلہہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین ان کا رب الارباب نہیں؟ روس کا کونسا گاؤں اور کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اس خدائے روسیاں کی تصویر موجود نہیں؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے[2] اس میں

---

[1] نمازِ استسقاء میں دو رکعت [illegible] مسنون ہے اس کو تحویل ردا کہتے ہیں
[2] خیال رہے کہ یہ مقالہ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔

سویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں۔ گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر سے واقف ہو جائیں۔ تب ان کو دین بالشویکی میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو خواہ وہ جماعت COMMUNITY کی نمائندگی کر رہا ہو کروڑوں انسانوں کے دماغوں اور ان کی روحوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اس کی شخصیت کا جبروت اور اس کی کبریائی ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے؟ اسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے۔ یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت اور نمرودیت اور زاریت و قیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اٹلی کو دیکھئے۔ وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الہوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ۔ جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ اکبر۔ انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب و آلہہ بنے ہوئے ہیں۔

غرض آپ جدھر نظر ڈالیں گے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور کہیں ایک ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرِي کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو ڈکٹیٹر بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشوونما کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قال اللہ عزوجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاءھم الشیاطین فاجتالتھم من دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم۔

(حدیث قدسی)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آگھیرا، انہیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کیلئے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے، یہ اس کی ترقی میں اصلی رکاوٹ ہے، یہ وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، غرض مختصراً اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے، قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اسی

سلہ ۱۹۳۹ء میں یہ مقالہ ٹاؤن ہال کالیجیٹ مسلم برادرہڈ کے جلسہ میں پڑھا گیا۔

روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لئے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ (اسلام کا نظریۂ سیاسی)

مغربی تعلیم کی تباہ کاری:

۱۸۵۹ء میں ڈاروِن کی کتاب "اصل الانواع" شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈاروِن کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریہ ارتقاء کی تائید میں پیش کئے تھے، کمزور اور محتاج ثبوت تھے۔ اس کے سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں۔ اہل حکمت اس وقت بھی اس نظریے سے مطمئن نہ تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا وکیل ہکسلے (HUXLEY) بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا۔ مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈاروینیت کو قبول کر لیا گیا، اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلے کے طور پر اسے استعمال کیا گیا، کیونکہ اس نظریے نے اہل حکمت کے زعم باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا حالانکہ دراصل ایک دعویٰ لیا تھا جو محتاج ثبوت تھا کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبعی قوت کے بغیر خود بخود طبعی قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ اہل مذہب نے اس نظریے کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسے میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹن نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی اور آخر کار اہل مذہب سائنٹفک دہریت سے اس قدر مرعوب ہونے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈاروِن نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اس کو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی۔ حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے انکار کا، الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس نے آخر کار بالشویزم اور فاشزم کو پھیلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ تھا۔ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کیلئے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے تھے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انہوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انہوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں سب سے پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور وہاں سرے سے اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ اسلام کا پورا نظام تہذیب وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور وہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ اسلام میں آخرت کا اعتقاد پورے نظام اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور وہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اسلام میں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں

وہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصولِ تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے، رسولِ خدا شارحِ قانون اور انسان صرف متبعِ قانون۔ مگر وہاں خدا کو وضعِ قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں۔ لیجسلیچر واضعِ قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمحِ نظر حکومتِ الٰہی ہے اور مغرب کا مطمحِ نظر حکومتِ قومی۔ اسلام کا رُخ بین الاقوامیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود قومیت۔ معاشیات میں اسلام اکلِ حلال اور زکوٰۃ و صدقہ اور تحریمِ سود پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظامِ معاشی ہی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیشِ نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیشِ نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں بھی اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملے میں مغرب کے راستے سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدودِ زن و مرد، تعددِ ازدواج، قوانینِ نکاح و طلاق، ضبطِ ولادت، حقوقِ ذوی الارحام، حقوقِ زوجین، اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات ہیں جن میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور بغیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیرِ اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انہوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلے میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسرِ غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا ہو مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدہ سے نہیں ہو سکتی۔ (ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۳۴ء)

ان کو ضرور پڑھئے

ماہنامہ "سلسبیل" آبار شاہ پوری اور عاصی ضیائی ایم۔ اے کی ممتاز ادارت میں "خوشاب" (مغربی پنجاب) سے شائع ہوتا ہے، اس کے مضامین اسلامی ادب کے حامل اور تعمیری رجحانات کے نقیب ہوتے ہیں ـــــ فحاشی اور گمراہ کن ادب کے خلاف "سلسبیل" اعلانِ جہاد ہے۔

ہفت روزہ "غالب" (میکلوڈ روڈ کراچی) (ایڈیٹر جناب رئیس امروہوی) اپنے سیاسی مضامین، علمی مقالوں اور پاکیزہ نظموں اور افسانوں کیلئے مشہور ہے، یہ ایک آئینہ ہے جس میں آپ بیک وقت ہندوستان و پاکستان کے سیاسی حالات کی جھلک دیکھ سکتے ہیں ـــــ قیمت فی کاپی چار آنہ۔

ماہنامہ گرداب (راولپنڈی) ـ مدیر قمر جالندھری بی۔ اے، ۲۰ جولائی کو نہایت شاندار "استقلال نمبر" پیش کر رہا ہے، گرداب کا "استقلال نمبر" بہترین مضامین، افسانوں اور نظموں کا نظر افروز مرقع ہوگا ـــــ چندہ سالانہ پانچ روپیہ آٹھ آنے۔

ماہنامہ "ہم لوگ" (سرگودھا) ـــــ مدیر۔ الطاف مشہدی، ۲۰ جولائی کو خاص نمبر بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کر رہا ہے، ہندوستان اور پاکستان کے چوٹی کے فن کار اس میں حصہ لے رہے ہیں، حجم ۲۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

ماہنامہ "نشیمن" (یوسف اسٹریٹ، بندر روڈ کراچی) کا آزادی نمبر ضرور پڑھئے جس کے مضامین آپ کو پیام دیں گے اور آپ کی روحِ ادب جھوم جھوم جائے گی ـــــ قیمت ۱۱ر علاوہ محصول ڈاک، چندہ سالانہ چھ روپیہ آٹھ آنے۔

ہماری نظر میں

جو لوگ تنقید کو صحیفۂ نا قب سمجھتے ہیں اُن کی خوش فہمیوں کا "فاران" یک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتا، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری یہ روش بہت سوں کو ناخوش کردے گی مگر کسی کی ناجائز دلدہی اور غلط خوشی کے لئے ہم اپنی روش میں جھکاؤ پیدا نہ ہونے دیں گے۔

صبوحی سید ضیا جعفری کے قطعات اور رباعیوں کا مجموعہ ــــــ بزمِ انجمن ترقی اُردو پشاور نے ترتیب دیا۔ حجم ۱۲۰ صفحے خوبصورت جلد، طباعت وکتابت دیدہ زیب، قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ۔ ضیا منزل شیخ الاسلام گنج پشاور۔

جناب ضیا جعفری صوبہ سرحد کے مشہور شاعر ہیں ــــــ اور نہ صرف شاعر بلکہ اُردو کے مخلص اور پُرجوش خدمت گزار بھی، صوبہ سرحد میں اُردو کو جو اشاعت و قبول حاصل رہا ہے اُس میں ضیا جعفری کی کوششیں بھی شریک ہیں ــــــ "صبوحی" ضیا صاحب کے قطعات اور رباعیوں کا مجموعہ ہے، جس کا تعارف فارغ بخاری نے لکھا ہے۔

تعارف کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ اچھے شاعر زیادہ غور و فکر کے باعث عموماً مدقوق، مدبل اور بدصورت ہوتے ہیں"۔ ۔ ۔ نہ جانے تعارف نگار سے کس سادہ لوح نے یہ کہہ دیا ہے کہ اچھے شاعر بدصورت ہوتے ہیں اور غور و فکر کی شدت شاعر کے جسم کو مدقوق اور جسم کو بدہیئت بنا دیتی ہے ــــــ لوگوں کو خواہ مخواہ "جدت طرازی اور نئے پن" کا لپکا پڑ گیا ہے یہ نہیں سوچتے کہ اُن کی بات اہلِ نظر کے نزدیک قابلِ قبول ہوگی بھی یا نہیں، ہم تک اگلے شاعروں کے جو حلیے پہونچے ہیں اُن کی بنا پر پوری ذمہ داری کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب اور مومن بہترین شاعر ہونے کے باوجود انتہائی خوبصورت اور خوش منظر تھے۔

آخر میں لکھتے ہیں:۔

"ضیا ادبی دنیا میں اجنبی نہیں، سرحد کے گمنام ماحول میں رہنے کی وجہ سے اگرچہ وہ ہندوستان گیر شہرت ابھی تک حاصل نہ ہو سکی جو اُن کے شایانِ شان تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس پیراگراف کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔ ــ

ضیا کی شخصیت کسی تعریف کی محتاج نہیں دنیائے ادب کا بچہ بچہ اُن کے نام سے واقف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہی سانس میں اس تضاد بیانی کو آخر کیا سمجھا جائے، اس تعارف نے خود ضیا جعفری کی پوزیشن کو نازک بنا دیا۔

"تعارف" کے بعد دوسرا مضمون خود شاعر نے لکھا ہے، جس کا عنوان "گفتنی" ہے، آغازِ مضمون کی پانچویں سطر یہ ہے۔

"اگر ہم کسی صناع کے دل میں اُنس و محبت سے سما کر اُس کی روح کو بے نقاب کریں ۔ ۔ ۔ ۔" یہاں حرف جار "سے" کا غلط استعمال ہوا ہے، کہنا یوں چاہئے تھا کہ "اُنس و محبت کی راہ سے سما کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"!

اس کے بعد جناب ضیا جعفری نے شاعری کے متعلق ایسے نادرات پیش کئے ہیں جن کے بعض ٹکڑوں سے مجذوبانہ شان جھلکتی رہتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔
شاعر محسوسات و مشاہدات کی دنیا سے یک جنبشِ دل وجد و کیف تک ہو گیا یا اس نے تعلق و نسبت سے کبھی عالمِ ہوش اور عالمِ بے خودی میں متاثر ہوا آخر یہی نقوش موسیقی بن کر اس کے نغموں سے پھوٹ نکلے۔
نقوش کا موسیقی بن کر نغموں سے پھوٹ نکلنا جتنی عجیب بات ہے اس سے عجیب تر صفحہ ۱۷ کا یہ فقرہ ہے:۔ "جن کی روحیت نگاہ میغفروشانِ شاعری سے بیدار ہے" اس انداز کے متعدد جملے "گفتنی" میں ملتے ہیں جن کو پڑھ کر ضیا صاحب کی نثر نگاری کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔
تیسرا مقالہ "پیش لفظ" نذیر مرزا برلاس ایم۔اے کا لکھا ہوا ہے جو متذکرہ بالا دونوں مضمونوں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بہتر ہے مقالہ نگار نے اپنے خیال کا اظہار سلیقہ کے ساتھ کیا ہے مگر کہیں کہیں اُن کے قلم سے عجیب کاوش قسم کے جملے نکل گئے ہیں۔ صفحہ "۲۴" پر ضیا جعفری سے اپنی بچپن کی شناسائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
"میں انھیں تب سے اور ویسے ہی جانتا ہوں جب سے اور جیسے وہ خود کو جانتے ہیں وہ دنیا کی زندگی کے نشیب و فراز خوب دیکھے ہیں"
آخری جملہ کی اُردو کا نمونہ ہے جو اہلِ زبان کے نزدیک خلافِ روزمرہ ہے۔ صفحہ ۲۶ پر ایک جملہ یہ ہے:۔
"انہیں صرف تصوف کی چاشنی ہی نہیں بلکہ کئی مقامات سے عملی طور پر آشنا ہیں۔ اس انداز کے فقروں سے بلند سے بلند مضمون کا وزن ہلکا ہو جاتا ہے۔
ضیا جعفری کی رباعیاں شگفتہ اور رواں ہیں زبان پر بھی اُن کو قدرت حاصل ہے بعض مصرعوں میں جوشِ مستی کی خوشگوار فراوانی ہے اور کہیں کہیں شاعر کا جذبِ باطن بھی جھلکتا ہے مگر تصوف کا یہ شعلہ استعاروں اور کنایوں کے فانوس میں آکر کچھ دب سا گیا ہے موضوعِ تصوف پر معیاری رباعیاں حضرت ابوسعید ابوالخیر کی ہیں ضیا کو تصوف سے لگاؤ ہے تو خیام و حافظ کے بجائے حضرت ابوسعید کی تقلید کرنی تھی اس طرح تصوف کے واردات رندی و سرمستی بن کر نہ رہ جاتے۔
ضیا کی شگفتہ رباعیوں کے چند نمونے ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

اے زندہ دلوں کی شام آہستہ گزر		اے پرتوِ زلف و جام آہستہ گزر
ہاں! چھاؤں میں نغموں کی ذرا آہستہ گزر		اے جنتِ خوش خرام آہستہ گزر

اب تک مری راتیں ہیں بہار آلودہ		ماحول ابھی تک ہے نگار آلودہ
رقصیدہ ہے پہلو میں ابھی جلوۂ شب		آنکھیں ہیں صراحی کی خمار آلودہ

اُٹھنے کو فلک نقاب اک لمحہ ٹھہر		کھل جائیں گے خود حجاب اک لمحہ ٹھہر
اس رات کو کچھ اور سیہ ہونے دے		اُبھریں گے ہزار آفتاب اک لمحہ ٹھہر

یہ کاہکشاں یہ رقصِ انجم ساقی		یہ چاندنی راتوں کا تبسم ساقی

ہاں ہو تھوڑا کشتی مے کی جانب　　ہے نور کے دریا میں تلاطم ساقی

بعض رباعیوں میں جناب ضیاؔ سے بھول چوک بھی ہو گئی ہے، صفحہ ۴۰ پر رباعی کے آخری دو مصرع ہیں:۔

یہ عشق و جوانی کی ہوائیں توبہ
ہاں! ساز اُٹھا اور بڑھا خم ساقی

خم میکدے میں اپنی جگہ رکھا رہتا ہے وہ نہ بڑھایا جاتا ہے، اور نہ اُسے گردش میں لاتے ہیں، شاعر نے "پیمانہ" کی صفت "خم" کے ساتھ منسوب کر دی جو خلاف دستور واقعہ ہے۔ صفحہ ۵۱ پر پہلی رباعی کے تیسرے مصرع میں:۔

؎ ہے عارض رنگیں عرق آلود اُن کی

شاعر نے "عارض" کو مونث لکھا ہے جو قطعاً غلط ہے، عارض کسی اختلاف کے بغیر مذکر ہے ——— اسی رباعی کا آخری مصرع ہے:۔

؎ پیتے ہیں شراب آج گلاب آلودہ

یہ مصرع غالب کے اس شعر کا پرتو ہے:۔

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

اسی طرح صفحہ ۱۰۲ کی یہ رباعی:۔

جیکی سانسوں کا بج رہا ہے ستار　　فطرت مدھم سُروں میں گائے ملہار
ڈوبی ہوئی راگنی ہیں ہے پیڑ کل　　سنگیت کا روپ دھار کر آئی ہے بہار

فراقؔ گورکھپوری کی رباعیوں کی طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے۔

صفحہ ۱۰۰ پر دوسرے قطعہ کا پہلا مصرع ہے:۔

؎ راتیں بھی جواں چاند کا ساغر بھی جواں ہے

چاند کے ساغر کا جواں ہونا ایک بے جوڑ سی بات ہے، ساغروں، بوتلوں اور صراحیوں کو جوان اور بوڑھا نہیں کہا کرتے اِن کہنہ و نو کہہ سکتے ہیں!

ضیاؔ جعفری کو فارسی زبان پر خاصی قدرت حاصل ہے، صبوحی میں جو فارسی قصیدہ اور رباعیاں درج ہیں وہ شاعر کی فارسی دانی کا بولتا ہوا ثبوت ہیں۔ بہرحال "صبوحی" اہل ذوق کے پڑھنے کی چیز ہے، اور ہم ضیاؔ جعفری کے دوسرے مجموعے کے منتظر ہیں جو یقیناً "نقش ثانی" ہونے کے سبب بہتر ہوگا۔

تعمیر لکھنؤ نیم ماہی تعمیر، ادارۂ تحریر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبد السلام قدوائی ندوی ملنے کا پتہ:- ۳۸ امین آباد پارک ——— لکھنؤ۔

یہ نیم ماہی مجلہ کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرتا ہے اس کے گرانقدر مضامین پڑھ کر اسلامی بصیرت اور دینی فہم پیدا ہوتا ہے۔ "تعمیر" اپنے نام کی رعایت سے حقیقت میں تعمیری ادب کا نقیب اور ترجمان ہے۔

؎ جس طرح کہا خم ارنے پر لیے ہیں کر مستر خم ں ڈھ د، اگر اس معنی میں خم بڑھانا استعمال کیا گیا ہے تو بھی غلط ہے۔

اس کے مرتب کرنے والے ایک مقدس مقصد لیکر ادب و دانش کے میدان میں آئے ہیں اس لئے قدرتی طور پر طرزِ نگارش میں حق گوئی کی جرأت بھی پائی جاتی ہے ـــــ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مضامین خاص طور سے بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں علی میاں کی سیرت اور زندگی میں حضرت ابوذر غفاری کی زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے اسی چیز نے اُن کے مضامین میں سوز و اثر کے ساتھ جذب بھی پیدا کر دیا ہے ۔

کفر و الحاد کے اس طوفانی دور میں "تعمیر" جیسے رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ ہر دیندار کیلئے بہت ضروری ہے اللہ تعالیٰ "تعمیر" کے کارکنوں کو استقامت اور حق گوئی کی توفیقِ دوام عطا فرمائے ۔

الانصاف سہ روزہ الانصاف مدیر انوار علی خاں سوز معاونین حکیم محمد خالد اور اسلام الحق پریمی طباعت و کتابت انتہائی دیدہ زیب! چندہ سالانہ دس روپیہ، ششماہی پانچ روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر الانصاف ۲۲ چوک الٰہ آباد۔

یہ سہ روزہ اخبار زندگی اور سیاست کے مسائل کی خالص اسلامی انداز پر ترجمانی کرتا ہے اس کے شذرات سعادت و فلاح کی راہ دکھاتے ہیں اور اس کے "افتتاحیے" پڑھ کر اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ دنیا "احمد بن حنبل" جیسے مبلغینِ حق سے آج بھی خالی نہیں ہے "الانصاف" کے مرتب کرنے والوں کو خدا اور رسول کی خوشنودی مطلوب ہے، اظہارِ حق میں کسی دنیوی سطوت و جبروت کی وہ پروا نہیں کرتے "الانصاف" کا ہر مضمون مطالعہ کے قابل ہوتا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی "تفہیم القرآن" نے اس اخبار کو اور زیادہ وقیع بنا دیا ہے اللہ تعالیٰ "الانصاف" کی عمر میں درازی اور اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے ۔

فردوس ماہنامہ فردوس، ادارہ تحریر محمد خلیل خاں، حکیم حبیب اللہ خاں اور عبدالجمیل خاں پر مشتمل ہے، سالانہ چندہ تین روپیہ بارہ آنہ، ملنے کا پتہ۔ قائم گنج ضلع فرخ آباد (یو۔پی)۔

یہ رسالہ مسلمان گھرانوں کی اسلامی انداز پر اصلاح کی غرض سے منصۂ شہود پر آیا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہے، اس کے مقالے، افسانے، نظمیں اور تمثیلچے سب کے سب اسلامی طرز کے ہوتے ہیں، قرآنی سورتوں کی سیدھے سادے انداز میں تفسیر "فردوس" کی خاص چیز ہے جسے پڑھ کر بچوں میں قرآن کا ذوق اور فہم پیدا ہوتا ہے اس کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے مگر شروع سے آخر تک حق گوئی کی لے کہیں ٹوٹنے نہیں پاتی ۔

نظم کے حصہ کو اور بلند کرنے کی ضرورت ہے، اپریل ۱۹۴۹ء کے شمارے میں صفحہ ۵ پر جو نظم "یہ کام ہے تمہارا" شائع ہوئی ہے، اس کے یہ دو مصرع :-

ہر چیز بن گئی ہے تصویر پریشانی

اور

فردوس کی باتوں پہ گر تم عمل کروگے

بحر سے خارج ہیں، اسی شمارے کے صفحہ ۱۰ کے دوسرے کالم کا ایک جملہ ہے :-

"میاں! جی ٹھکانے پہ نہیں رہا ہے ۔

اور اس سے پہلے کا جملہ :-

"دیکھو گھوڑی پانی میں ڈوب گئی ہے"

بھی زبان اور روزمرہ کے اعتبار سے غلط ہیں ـــــ مگر کہیں کہیں اس قسم کی بھول چوک کے باوجود "فردوس" مسلمان گھرانوں میں پائے جانے کے قابل ہے۔ مسلمان گھرانوں کیلئے "فردوس" کی ہم پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

میرا رسالہ بچوں کا ماہنامہ "میرا رسالہ" ترتیب دینے والے اسلم فرخی اور شمس زبیری۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ۹۰۔ اسٹریٹ آرٹرم روڈ کراچی ۳۔

"میرا رسالہ" بچوں کا ماہنامہ ہے، جس کے مضامین بچوں کی نفسیات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ افسانے اس قدر سلیس گویا بچوں کی زبان میں ہیں۔ اس میں ہوتی ہیں کارٹون، دلچسپ لطیفے، تبسم نواز اور نظمیں اچھی بھلی۔ جون ۱۹۴۹ء کے شمارے میں جناب شمس زبیری صاحب کی نظم "بڑوں کی باتیں" رواں اور سادہ ہے۔ اس قسم کی اسلامی اور تاریخی نظموں کی اشاعت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ مئی ۱۹۴۹ء کے شمارے میں "محنت کے پھل" جس افسانہ کا عنوان ہے اس میں دو بھائیوں کے نام سالم اور غانم لکھے ہیں۔ "غانم" "بیگم" اور "بانو" مردوں کے نام ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اسی صفحہ پر ایک جملہ ہے:

"ہماری تو تقدیر ہی گندی ہے"۔

تقدیر کو گندہ کہنا روزمرہ کے خلاف ہے ـــــ اسی طرح جون ۱۹۴۹ء کے شمارے میں "ہمارا اعتبار اٹھ گیا بادشاہ" جس مضمون کا عنوان ہے اس میں "کانوں سنی" کو "کانوں کی سنی" کہا گیا ہے اور صفحہ ۵ پر "بھونچال" کو "بھونچکا" لکھا گیا ہے اگر یہ کاتب کی غلطی نہیں ہے تو اور زیادہ محل نظر ہے۔

"میرا رسالہ" مجموعی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہے اس کا ٹائٹل اس کے شاندار مستقبل کا آئینہ دار ہے اتنی کم قیمت میں اتنا اچھا رسالہ غنیمت ہی **غنیمت** ہے۔ ہم اس ماہنامہ کے لائق مولفوں سے گزارش کرتے ہیں کہ "میرا رسالہ" میں مذہب کی چاشنی ذرا اور تیز کر دی جائے تاکہ ہمارے بچوں کو مذہب سے خاص لگاؤ پیدا ہو جائے اور چٹخاروں ہی چٹخاروں میں اور باتوں ہی باتوں میں اسلام کی باتیں دل میں اتر جائیں۔

معمارانِ پاکستان (سلسلہ کتب)
کیا آپ کو معلوم ہے
(۱) اقبال کی خانگی زندگی کیا تھی؟ اقبال نے "ضربِ کلیم" کیوں لکھی تھی؟
(۲) قائدِ اعظم کا بچپن کس طرح گزرا؟ شیرو بابا نے قائدِ اعظم سے کیا کہا؟
(۳) الحاج خواجہ ناظم الدین "طلسم ہوشربا" کیوں پڑھتے تھے؟
(۴) غلام محمد کے پردادا کیو یقطا کے وزیر خزانہ تھے اور انہوں نے چور دل ست کیا کہا؟
(۵) کیا سردار نشتر شاعر ہیں اور اگر ہیں تو اُن کے کلام کا نمونہ؟
ان کتابوں میں ایسی بے شمار باتیں اور دلچسپ معلومات درج ہیں۔
(۱) اقبال ...... از چراغ حسن حسرت۔
(۲) قائدِ اعظم .... ایم رضی الدین۔
(۳) خواجہ ناظم الدین .... عرش تیموری۔
(۴) لیاقت علی خان .... محمد حنیف خاں
(۵) ظفر اللہ خاں .... رئیس احمد جعفری۔
(۶) غلام محمد . ایم خالد۔
(۷) سردار عبدالرب نشتر .. ایک اخبار نویس
پیشگی خریداری کے لئے .... پورے سٹ کی قیمت چھ روپیہ آٹھ آنہ
گرین پبلشرز
گرین ہاؤس
میکلوڈ روڈ کراچی
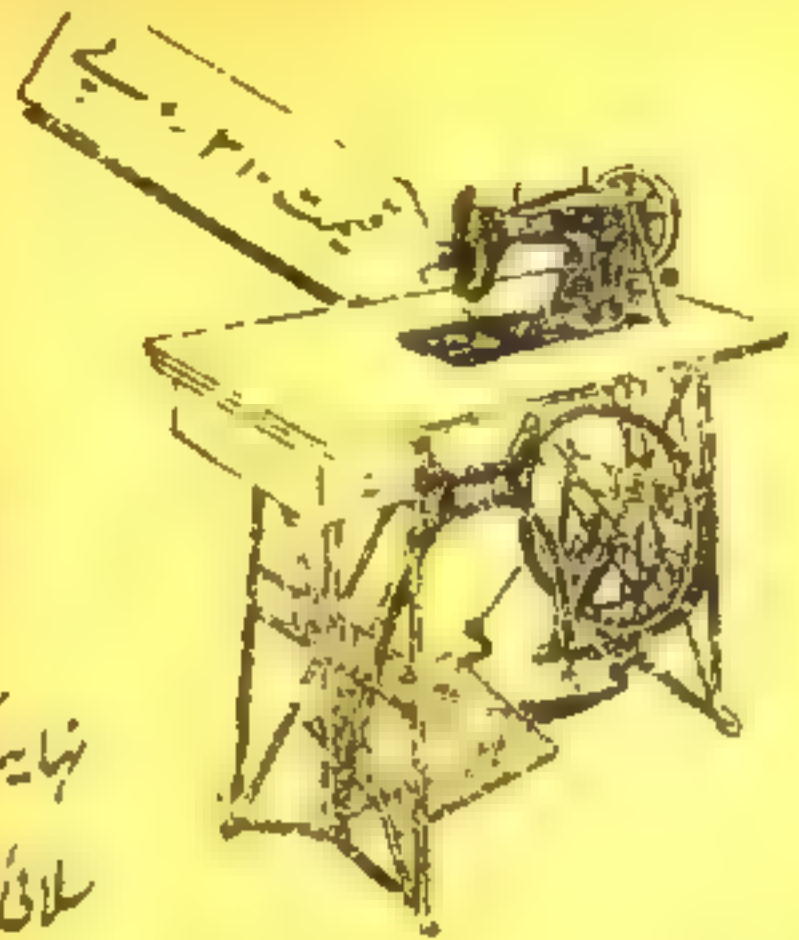
ہر قسم کی سوزن کاری مثلاً تربائی نجاف (HEMMING) دھاریاں (SEAMING) رفو کرنا (DARNING) جھالر بنانا (RUFFLING) پلیٹ ڈالنا (TUCKING) اور کشیدہ کاری نہایت آسانی اور خوبصورتی سے بناتی ہے اور محنت بچاتی ہے۔

واحد تقسیم کنندگان برائے پاکستان۔ ایس محمد رفیع اللہ والا

اللہ والا بلڈنگ بالمقابل ڈینسو ہال میری ویدر روڈ، کراچی

مطبوعہ عثمانی پریس بوہرہ پیر کراچی - پرنٹر پبلشر ماہر القادری۔

Regd. No. S. 1262

Only Title Printed at Jayyad Electric Press, Campbell Street, Karachi
Printer & Publisher Mahir-ul-Qadri.
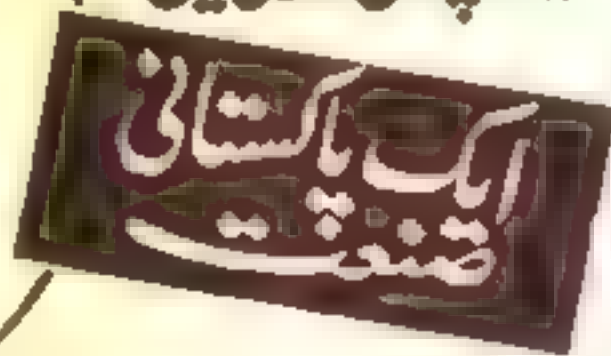
ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱) نمبر (۵)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

اگست ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ چھ روپے — فی کاپی ۸ر

ممالکِ غیر سے نو روپے — فی کاپی ۱۲ر

"فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

مکتبۂ سالار

نظم و ترتیب

صفحہ

منظومات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

ادراکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود
لختے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

انگریز چلا گیا ـــــــــ یہ اب سے دو سال کی بات ہے۔ اب ہم اپنی غلامی کی زنجیریں ایکا ایکی چھن سے ٹوٹ گئیں، ہم آزاد ہو گئے، قسمت کے خود مالک ہیں، ہمارا حال اور مستقبل خود ہمارے ہاتھ میں ہے، اور ہمارے سفینہ کی ناخدائی ہمارے سپرد ہو چکی ہے، پتواروں سے لے کر بادبان تک ہر چیز ہمارے قبضہ میں ہے۔

آزادی کا دن یقیناً بہت بڑی خوشی کا دن ہے۔ ایک ایک در و دیوار پر قومی پرچم لہراؤ اور ایک ایک شاخ کو کافوری شمعوں سے جگمگا دو ـــــــ مگر ٹھہرو ٹھہرو، جشنِ مسرت منانے سے قبل پوری دیانت داری اور کامل انصاف و صداقت کے ساتھ پہلے یہ سوچ لو کہ خوشیاں منانے اور مسرت کے شادیانے بجانے کے تم مستحق ہو بھی گئے ہو یا نہیں؟ ـــــ ـــــ ۔ آنسو ہر آنکھ سے نکل سکتے ہیں مگر مسکراہٹ ہر لب و رخسار پر نہیں کھیل سکتی، ہنسی سدا اپنا "استحقاق" چاہتی ہے ورنہ یوں ہنسنے کو ہزاروں آدمی کسی حق کے بغیر جھوٹی ہنسی ہنستے ہیں اور بہت سے لوگ قہقہے لگاتے ہیں حالاں کہ اُن کے دل روتے ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر افسردگی چھائی ہوتی ہے۔

تم اپنے اندر کو ٹٹولو، اپنے دل کا جائزہ لو، اپنے باطن پر احتساب کرو! بجلی کے ان قطار در قطار قمقموں سے مسرت کی ایک کرن بھی نہیں پھوٹ سکتی، اگر تمہارے دلوں کی دُنیا سچی مسرت کے اُجالے سے محروم ہے، یہ سربفلک جھنڈے خوشی کے جذبہ کو نہیں اُبھار سکتے اگر تمہارے باطن میں مسرت کی بلندی موجود نہیں ہے ـــــــــ دل اگر مسرور و مطمئن ہے تو پھر چاہے ایک چراغ بھی نہ جلے، ایک پرچم بھی نہ لہرائے مسرت کا ایک جشن بھی برپا نہ ہو، پھر بھی تمام فضا طرب و انبساط سے معمور نظر آئے گی، خاموش ہوائیں خوشی کے گیت گائیں گی، اور بے جان در و دیوار زبانِ حال سے تبریک و تہنیت پیش کریں گے ـــــــــ اور اگر قلب و ضمیر مضطرب، غمگین، مشوش اور غیر مطمئن ہیں تو پھر یہ بزمِ چراغاں

یہ جشنِ مسرت اور یہ ہنگامۂ طرب فلمی مناظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے،

تھی وہ بس اک سیمیا کی سی نمود
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اور حقائق و واقعات کی دنیا میں بازی گری اور شیشہ بازی سے تھوڑی دیر کے لئے دل تو بہل سکتا ہے مگر وہ حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی جو بنیاد ہوتی ہے قوموں کی تقدیرِ مستقبل کی! اور جس پر مدار ہوتا ہے انسانوں کی تعمیرِ حیات کا!

انگریز کے بعد

ہم سب نے مل جُل کر انگریزی سامراج کے خلاف جدوجہد کی' ہم میں سے شاید ایک شخص بھی غلامانہ زندگی سے خوش نہیں تھا جن میں جرأت تھی وہ کھُل کر عمل میدان میں آگئے جو کمزور تھے اُن کی ناخوشی اور بیزاری اُن کی دل کی دُنیا تک محدود رہی تمنا سب کی یہی تھی کہ جس طرح بنے انگریزی راج کا خاتمہ ہو جائے ———— ہم دورِ غلامی میں انگریز کو طعنے دیتے تھے طنز کرتے تھے، پھبتیاں کستے تھے کہ انگریزی راج میں دغابازی، رشوت ستانی، ناانصافی، استحصال بالجبر، اقربا نوازی، جانب داری، اور اسی طرح کی تمام "داریوں" اور "نوازیوں" کی گرم بازاری ہے ———— اور یہ بھی کہ انگریزی طرزِ تعلیم اس انداز کی ہے کہ اُس کے اثر سے ہمارے بچوں کی بیرتیں ہمارے قومی افکار کے سانچوں میں ڈھلنے کی بجائے گردوغبار ہو کر رہ جاتی ہیں ———— قدرت نے ہماری فریاد سُن لی' دراجابت کھٹ سے وا ہوا اور ہماری دعائیں قبول ہو گئیں اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم آزاد ہو گئے' اور آزادی کی اس مدت میں سات سو بیس صبحیں طلوع بھی ہو چکیں۔

اب ہمیں مقابلہ کرنا ہے اپنی غلامی اور آزادی کی دونوں زندگیوں کا! ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ جن لعنتوں کی زیاں کاریوں کو محسوس کر کے ہم نے غلامی کو آزادی سے بدلا تھا کیا وہ لعنتیں دُور ہو گئیں، کیا وہ بُرائیاں جاتی رہیں، اُن غلطیوں، حماقتوں اور سفاکیوں کا ازالہ ہو گیا؟ اس فیصلہ کے لئے کسی ریسرچ Re - Search کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس تصفیہ کے لئے کمیشنوں اور کمیٹیوں کا تقرر درکار ہے، واقعات خود اپنی زبان سے چیخ چیخ کر صورتِ حال بیان کر رہے ہیں ———— اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی سُنی کو اَن سُنی کر دے، کسی کی زبان پر کسی مصلحت کے سبب مُہرِ سکوت لگ جائے اور کوئی کوئی ایسا سفاک بھی ہو جو اپنے سازِ عیش کے نغموں کے پیمانے سے ان دردناک چیخوں کو ناپنے اور پہچاننے کی کوشش کرے مگر ہم ان میں سے کسی کی بھی ہم نوائی نہیں کر سکتے، جو سُنیں گے اُسے دوسروں تک بھی پہنچائیں گے اور جو دیکھیں گے اُسے ظاہر کر کے رہیں گے، یہ قوموں کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے یہاں ذرا سی بے اعتنائی اور معمولی سی بھول چوک سے تباہیوں کے زلزلے آسکتے ہیں، اور زوال و تخریب کی قیامتیں برپا ہو سکتی ہیں ———— اور ہو ہی نہیں سکتی، ایسا ہو چکا ہے۔

ہمیں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ جرائم میں پہلے کی بہ نسبت اضافہ ہو گیا ہے' رشوتیں اور چور بازاریاں اور بڑھ گئی ہیں، عدالتوں کا انصاف آج انگریز کے دور سے کم مہنگا نہیں پڑتا۔ "پبلک سیفٹی ایکٹ" کی وہی کم فرمائیاں ہیں اور اختیار و اقتدار کا اُسی فرنگی انداز پر استعمال ———— شراب خانوں میں آج بھی جام کھنک رہے ہیں اور فحش کاری کے[1] اڈے اس دورِ آزادی میں بھی پُررونق اور آباد ہیں، غریبوں اور تہی دستوں کے لئے آج بھی اللہ کی زمین تنگ ہے اور سرمایہ داروں کی عیش سامانیاں اب بھی شباب پر ہیں، حاکموں اور افسروں کی گردنِ ناز میں آج بھی خم نظر آتا ہے، چھوٹے دفتروں سے لے کر اونچے ایوانوں تک وہی فرنگی طمطراق دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا انداز بھی نہیں بدلا' وہی کلرک سازی کی مشینیں، ڈگریاں حاصل کرنے کے کارخانے اور وہی انگریزی تہذیب کی برتری کا احساس بلکہ نصابِ تعلیم کی زبان سے اقرار انگریز کے دورِ حکومت میں ہم کہتے تھے کہ انگریزی راج کے سہارے، اُس کی انسانیت سوز اور بے حیا تہذیب بھی پھیل رہی ہے ہم اپنی گھریلو زندگی کو اس سے متاثر نہ ہونے دیں گے ———— مگر اب انگریزی حکومت کے چلے جانے کے بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ جس تہذیب

[1] اس میں زنان بازاری کے مکانوں سے لیکر تمام تفریحی مقامات شامل ہیں جہاں غیر محرم عورتوں اور مردوں کا بے باکانہ اختلاط ہوتا ہے۔

کو "انسانیت سوز" کہتے تھے اور زیادہ طاقت کے ساتھ اُبھر آئی، ہماری عورتیں بے باکی اور بے حجابی کی طرف ڈھلی جا رہی ہیں، عورتوں میں نمود حسن کا جذبہ ترقی کر رہا ہے، لب و رخسار کی آرائشیں اس لئے کی جاتی ہیں کہ پُرشوق نگاہوں سے خراج تحسین وصول کیا جائے۔ ہم سمجھتے تھے کہ فتنہ شاید نقابوں سے آگے بڑھنے نہ پائے گا مگر نقابیں اُٹھنے کے بعد اب یہ بے لباسی گردنوں سے بھی نیچے پہونچ چکی ہے اور بے غیرتی پاؤں پھیلاتی اور نیچے اُترتی ہی چلی جا رہی ہے۔ —— ہمارے شہر بیچ مچ پیرس اور لندن بنتے جا رہے ہیں اور ہماری اہلی زندگی عجیب نازک اور پریشان کُن دور سے گذر رہی ہے!

پاکستان اور ہندوستان دونوں کو ایک ہی دن منشورِ آزادی ملا تھا اور دونوں پر ایک ہی انداز کی غلامی مسلط تھی —— اور جن حقائق سے آئینہ سازی کی گئی ہیں، دونوں حکومتیں اُس آئینہ میں اپنے چہروں کو دیکھیں —— اور نہ صرف حکومتیں بلکہ عوام بھی!

ناانصافی اور بے دانشی ہوگی، اگر ساری ذمہ داری ہم حکومتوں کے سر ڈال دیں، ان تمام کوتاہیوں، بُرائیوں اور بداخلاقیوں کے ذمہ دار ہم بھی ہیں، انگریز کے عہد غلامی میں اگر ہم بُرائی کی طرف ایک دن میں ایک گز بڑھتے تھے تو آج میلوں کی رفتار سے بھاگے چلے جا رہے ہیں، ذاتی اغراض اور نفسانفسی نے ہم میں مروت کا احساس تک باقی نہیں رکھا۔ دوستیاں اور رشتہ داریاں صرف سود و زیاں اور اغراض کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہیں، ہم فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے

واقعہ یہ ہے کہ خود دار طبیعت کے لئے
ایک تنکے کا بھی احسان بہت بھاری ہے

اور اب "محسن کُشی" اور "عزیزداردشمنی" ہمارا مسلک بن گیا ہے، اخلاق کی کھیتیاں سُوکھ رہی ہیں، بھلائیوں کے باغیچے ویروہر جل رہے ہیں اور شرم وغیرت کی دیواریں نیچی ہوتی چلی جا رہی ہیں، فسق و فجور کی تمام گرم بازاریاں ہمارے دم سے ہیں اور معصیت کدوں کو ہماری شوقِ ہوس نے پُر رونق بنایا ہے، ہم نے اپنے شکر و شکایت" اور "تحسین و تنقید" کے طریقہ کو ذرہ برابر نہیں بدلا، ہم حکومت سے احتجاج کرتے ہیں تو اُس کا بھی وہی انداز ہے جو انگریز کے زمانہ میں تھا —— نعرے، ستیاگرہ اور ہڑتالیں! اور شکر و تحسین پر آتے ہیں تو حکام کی چوکھٹوں پر جبیں سائیاں ہیں، قصیدوں کی تشبیب کے طرز پر سپاسنامے ہیں، بے جا خوشامدیں ہیں اور نیازمندانہ توڑ جوڑ ہیں۔

وہی خود فروشی وہی جی حضوری!

انگریز کے زمانہ میں صرف چند پارٹیاں تھیں اور سیاسی جماعتیں زیادہ سے زیادہ دو ہی تھیں مسلم لیگ اور کانگرس! —— اور اب ایک ایک محلہ بلکہ ایک ایک گلی میں آپ کو پارٹیوں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے بورڈ نظر آئیں گے، ہم میں "عوام" کم اور لیڈرز یادہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر شخص خود کو منصبِ قیادت کا اہل بلکہ حقدار سمجھتا ہے۔

انجمن سازی نے عام انتشار پیدا کر دیا ہے وہ طاقتیں جن کو یکجا ہونا چاہئے تھا بکھر گئی ہیں، بیچارے عوام بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کا نہ دیں، ذہین طبقہ، سرمایہ داروں کی طرح اپنا اقتدار چاہتا ہے، یہی ہوسِ اقتدار خدمتِ ملک و ملت کا لباس پہن کر نہ جانے کس کس اسٹیج پر دکھائی دیتی ہے، صوبہ پرستی کی لعنت اب ضلع پرستی بلکہ قریہ پرستی تک پہونچ گئی ہے، غرض پرست افراد اس آگ کو اور ہوا دے رہے ہیں، وحدتیں پارہ پارہ ہوتی جا رہی ہیں اور ملک و ملت کی یکجہتی پر نہ جانے کتنی "پرستیوں" کی یہ یک وقت یلغار ہو رہی ہے۔

اسلامی نظام

پاکستان خدا اور اسلام کے نام پر بنا تھا اور اس مطالبہ پر بنا تھا کہ یہاں مسلمان اسلامی طرز فکر کے تحت زندگی بسر کریں گے اس مقدس جذبہ پر ہماری طرف سے درود و سلام! مگر ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اب تک کیا ہوا اور اس منزل میں کتنے قدم اُٹھے —— ہم جانتے ہیں کہ اس کے جواب میں "تبسم آمیز" معذرت پیش کی جائے گی —— کاش! اس

تبسم میں "ندامت" بھی شامل ہوتی! کہا جائے گا کہ ہم بہت سی داخلی اور خارجی مشکلات میں گھرے رہے، طرح طرح کی فتنہ سازیوں کا ہم اب تک مقابلہ کر رہے ہیں، پاکستان کی اسلامی طرز پر تعمیر کی فرصت ہی نہیں ملی —— لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں معیشت وسیاست اور تفریح و ذمہ داری کے اگر تمام کام ہوتے رہے تو اس سب سے ضروری اور اہم کام کو بھی ہوتا رہنا چاہیے تھا، یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ حکومت پاکستان کسی معجزے کے زور سے آن کی آن میں "خلافت راشدہ" کا نمونہ بن جائے گی —— ترقی و اصلاح کی فطری تدریج کے ہم منکر نہیں ہیں۔

ذہین اور غیرت مند افراد کو ذرا سی بات ہی بہت ہوتی ہے، ہم اس سلسلہ کو دراز کرنا نہیں چاہتے، ہمارا مفہوم اس سے زیادہ وضاحت بھی نہیں چاہتا، صرف اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو اگر کوئی قوت مستحکم بنا سکتی ہے تو اسلام اور صرف اسلام ہے، اسلامی اصول ہی پاکستان کی بنیادوں میں دوام و بقا کا سیسہ پگھلا کر ان کو مضبوط بنا سکتے ہیں —— بعض کم نظر اور ناواقف "اسلام" کا نام سن کر جبّہ و دستار اور ریش و تسبیح میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں بلکہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں —— کاش! انہیں معلوم ہوتا کہ اسلام مکمل ضابطۂ نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کا نام ہے، منبر و محراب سے لے کر کونسلوں اور پارلیمانوں کے در و بام تک ہر چیز کو اسلامی نظام محیط ہے اور دفاع (Defence) سے لے کر خارجی تعلقات تک ہر مسئلہ اسلامی نظام کا جزء ہے!

یہ نہ سمجھو! کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہر وقت اذانیں دی جائیں گی، دن رات سبحہ گردانی ہوگی، خلع اور طلاق کے مسائل پر چوبیس گھنٹے بحث ہوا کرے گی، اسلامی نظام قائم ہو جانے پر بیروزگاروں کو روزگار بھی ملے گا، بھوکوں ننگوں اور پریشان حالوں کی غمخواری بھی کی جائے گی، سفارتیں بھی قائم رہیں گی، غیر ملکی وفود کو بھی باریاب کیا جائے گا تمہارے (Deputation) بھی دوسرے ملکوں میں جائیں گے، تجارت کی گرم بازاری بھی ہوگی، ہوائی جہاز بھی پرواز کریں گے اور تمہارے کارخانوں میں توپیں اور گولے بھی بنتے رہیں گے، تمہاری فوج اب سے اور زیادہ جرار ہوگی —— مگر یہ سب کچھ اسلامی طرزِ فکر کے تحت ہوگا اور جس دن یہ ہو جائے گا بس وہی دن تمہاری تاریخ کا سب سے زیادہ روشن اور تابناک دن ہوگا، آزادی کا سورج ابھی پوری طرح چمک نہیں سکا، اس پر بدلیاں چھائی ہوئی ہیں —— اگرچہ صبح نمودار ہو چکی ہے —— یہ بدلیاں اور دھندلکے جس دن چھٹ گئے بس وہی صبح حقیقی جشنِ مسرت کی صبح ہوگی اور اُس دن آسمان سے تمہاری طرف رحمتوں کے پیام اور محبت کے سلام آئیں گے اور زمین پر بس تم ہی تم معزز اور غالب نظر آؤ گے، اس لئے کہ

أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۝

اس یومِ آزادی کے موقع پر ارضِ مقدس پاکستان کے ایک ایک ذرّہ کو بہترین تمناؤں کا پیام! غم اور خوشی کے ملے جُلے آنسوؤں کی نذر! اُن آنکھوں کا بھی سلام جو ملت کے غم میں راتوں کی تنہائی میں اپنے خدا کے حضور روتی ہیں، اور ان دعاؤں کا ہدیہ بھی جن کو شاعری کی زبان میں فغانِ نیم شبی بھی کہا جا سکتا ہے اور آہِ صبح گاہی بھی! —— اربابِ حکومت کی بارگاہ میں یہ گزارش کہ وہ جاہ و اقتدار کی بلندیوں سے نیچے کی طرف آئیں، عوام کی خدمت میں یہ عرض کہ وہ پستیوں سے اوپر کی طرف اُٹھیں اور پھر وہ دونوں "اسلام" کی سطح پر آکر:-

کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

کا نمونہ بن جائیں!

ماہر القادری
یکم اگست ۱۹۴۹ء

ملہ وہ ندامت جس کو حدیث شریف میں "توبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مولانا عبد الباری ندوی

حجابِ علم

کانٹ کا فلسفۂ علم و عمل

ہر کشف بر آں چہرہ حجابِ دگر ست | ہر جلوہ دریں راہ سرابِ دگر ست
از رفع حجاب خویش مغرور مشو | ایں رفع حجاب ہم حجابِ دگر ست

انسان کو علم و عقل کا تھوڑا بہت غرور کب نہیں رہا۔ البتہ ادھر کم و بیش تین سو سال یعنی بیکن کے زمانہ سے یورپ اور یورپ کی حاکمانہ ساحری کے اثر سے ساری دنیا کو جس طرح غرورِ عقل و علم نے مسحور کر رکھا ہے، ماضی کی معلوم تاریخ میں اس کی مثال قطعاً نا معدوم ہے۔ لیکن "ہر فرعونے را موسیٰ"۔ خود اس فرعون کے گھر (یورپ) اور عقل ہی کی راہ سے عصائے موسوی کا جس طرح ظہور ہوا اس کی عجیب و نادر تفسیری "داستان"؎ کا مل گھر ہی کے ایک بھیدی "شاھد من اھلہ" کی زبان سے سُننے کے لائق ہے۔

بیکن نے سارے یورپ کو عقل و علم کا متوالا بنا دیا تھا۔ منطق و سائنس کا یہ عالم کہ ہر سوال کے جواب اور ہر مشکل کے حل کے لئے ان کو کافی سمجھا جانے لگا۔ عقل کے ساتھ اس عقیدت کی یادگار فلسفہ میں اسپنوزا کا نظام ہے۔ جس نے ساری کائنات کو منطق و ریاضی کی زنجیروں میں کس دینا چاہا اور یہ دعویٰ کر دیا کہ مابعد الطبیعات اور الٰہیات تک کے مسائل ہندسہ کی طرح بدیہی اصول و مسلمات سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔ ہابس نے بیکن کی اس عقل پرستی کو انتہائی مادہ پرستی اور الحاد تک پہونچا دیا۔ فرانس میں بے دینی فیشن بن گئی۔

سحر کا اثر کب تک! آخر کچھ آنکھیں کھل رہیں اور عقل جواب تک عدالت کی کُرسی پر تھی اس کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا کہ پہلے خود اپنے جج یا حَکَم ہونے کی اہلیت کو ثابت کرے اس کو کیا حق ہے کہ کروڑوں انسانوں کے ہزارہا سال کے عقائد کو اپنی منطق کے قیاسات سے برباد کرنا چاہتی ہے؟ کیا عقل خود خطا نہیں کرتی؟ کیا انسان کی دوسری چیزوں کی طرح یہ بھی نہایت درجہ محدود و مقید نہیں؟ غرض اب تک جو غیر مسئول حاکم تھا اب وہ اس کے حقِ حاکمیت کا سوال ہونے لگا۔ یعنی خود عقل پر جرح و تنقید کا وقت آ پہونچا۔

اس جرح و تنقید کا رستہ اگرچہ لاک، برکلے، اور ہیوم ہی نے کھول دیا تھا تاہم ان کے نتائج افکار بظاہر مذہب کے خلاف نظر آتے

؎ ول ڈیورنٹ نے داستانِ فلسفہ (اسٹوری آف فلاسفی) کے نام سے ایک اچھی دلچسپ کتاب لکھی ہے۔ معلومات بالا اسی سے مختصراً ماخوذ ہیں۔ بسلسلہ کانٹ از صـ ۲۶۶

تھے۔ جدید فلسفہ میں خود اس عقل کے متعلق شک وسوال پہلے پہل جان لاک نے پیدا کیا۔ جس کو اب تک فلسفہ کسی شک وشبہ کے بغیر یقین و اعتماد کے ساتھ استعمال کر رہا تھا، لیکن لاک نے ذہن کو ایک بالکل ہی لوحِ سادہ قرار دے کر یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ اس کی پونجی حواس کے فراہم کردہ مواد اور اسی مواد پر مبنی تصوّرات کے سوا کچھ نہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حواس چونکہ صرف مادی ہی اشیاء کا علم دیتے ہیں، اس لئے نہ ہم مادہ کے سوا کچھ جان سکتے ہیں اور نہ مادیت کے سوا کوئی فلسفہ قبول کیا جا سکتا ہے۔

برکلے نے ان ہی مقدمات کو اُلٹ کر بالکل مخالف یہ نتیجہ نکالا کہ جب سارا علم محض احساسات سے ماخوذ ہے تو کسی شئ کی نسبت جو کچھ بھی ہم جانتے ہیں وہ محض اپنے احساسات سے مستنبط تصوّرات کے سوا کچھ نہیں۔ بالفاظ دیگر ہر شئ نام ہے بس خاص خاص احساسات وادراکات کے مجموعہ کا۔ مثلاً تم جو کچھ کھاتے ہو وہ تمہارے لئے خود تمہارے ہی دیکھنے چھونے سونگھنے اور چکھنے وغیرہ کے خاص خاص مختلف احساسات کے علاوہ آخر اور کیا ہے۔ اگر یہ احساسات نہ ہوں تو تمہارے کھانے کی چیزوں کا تمہارے لئے پھر اور کیا وجود رہ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس کو ہم مادہ کہتے ہیں" دراصل ذہن ہی کے ادراکات اور یادداشتوں کی ایک صورت ہے۔ لہٰذا موجود صرف ذہن ہے، مادہ کا قطعاً کوئی وجود ہی نہیں۔

ہیوم نے اس منطق کو ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ جب ہم اپنے ادراکات وتصوّرات کے ماورا کچھ نہیں جانتے تو جس طرح ان کے ماورا مادہ نہیں موجود، اسی طرح ذہن کی حقیقت بھی ہمارے ان ادراکات وتصوّرات کی آمد ورفت یا ان کے تسلسل کے سوا کیا ہے؟ لہٰذا نہ مادہ نہ ذہن! غرض عقل وفلسفہ نے اپنے ہاتھوں اُٹھائی عمارت اپنے ہی ہاتھوں ڈھا دی۔ اور علم ویقین کی جگہ فقط شک وریب رہ گیا۔

ہیوم نے اس منطق سے خالی فلسفہ ومذہب کا نہیں بلکہ وجوبِ علت یا قانونِ فطرت کا انکار کر کے سائنس کا بھی قلع قمع کر دینا چاہا۔

کانٹ کو ایک طرف ہیوم کے ان سلبی وارتیابی نتائج نے ادعائیت سے چونکایا اور اس سوچ میں ڈال دیا کہ کیا علم ومذہب دونوں سے ہاتھ دھونے پڑے گا یا ان کے بچانے کی کوئی اور راہ ہے؟ دوسری طرف فرانس میں روسو الحاد ومادیت کا جن دلائل سے مقابلہ کر رہا تھا وہ کانٹ کے لئے نشانِ منزل بنے۔

برکلے اور ہیوم نے اگر کہا کہ عقل سے نہ مادہ ثابت ہوتا ہے نہ روح تو کہنے دو پہلے یہ تو ثابت کرو کہ عقل ہی حق وباطل کی آخری کسوٹی کیوں ہے؟ حالانکہ عقل کے بہتیرے نتائج ایسے ہیں جن سے ہمارا سارا وجود بغاوت کرتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے وجود اور اپنی فطرت کے سارے مطالبات کو منطق کی قربانگاہ پر چڑھا دیں، جو بعد کی پیداوار اور ہماری ذات وفطرت کا ایک کمزور ومشتبہ جز ہے! بلاشبہ عقل ہم کو روزمرہ کی کاروباری زندگی میں مدد دیتی ہے۔ لیکن یقین وعمل کے عظیم الشان بنیادی مسائل میں ہم منطق کی شکلوں سے زیادہ اپنی فطرت کے احساسات پر بھروسہ کرتے ہیں اگر عقل مذہب کے خلاف ہے تو یہ عقل ہی کا ایک اور نقص ہے۔ یہ ہے ماحصل روسو کی اس دلیل کا جس سے اس نے فرانس میں مادیت والحاد کا مقابلہ کیا۔

۱۷۴۹ء میں ڈیجون اکاڈمی نے ایک انعامی مضمون یہ مقرر کیا کہ" علوم وفنون کی ترقی نے اخلاق کو بنایا ہے یا بگاڑا؟" روسو کا جواب یہ تھا[۱] کہ ثقافت یا نام نہاد تہذیب خیر سے بہت زیادہ شر پیدا کرتی ہے، طباعت نے یورپ میں کیسا خوفناک انتشار پیدا کر دیا ہے۔ جہاں فلسفہ آیا اخلاقی صحت تباہ ہوئی۔ خود فلسفیوں کا قول ہے کہ جب سے اہل علم پیدا ہوئے دیانت دار آدمی مفقود ہو گئے۔ میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ فکری زندگی فطری زندگی کے خلاف ہے اور مفکر انسان دراصل مفسد حیوان ہے۔ عقل وذہانت کی زیادہ ترقی کو چھوڑ کر بہتر یہ ہے کہ دل اور محبت وشفقت کے جذبات کو ترقی دی جائے۔ تعلیم انسان کو اچھا آدمی نہیں صرف چالاک بناتی ہے۔ اور یہ چالاکی بھی بالعموم بد معاشی کے لئے ہوتی ہے۔ جبلت اور احساس عقل کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ مانا کہ عقل خدا وآخرت پر ایمان کے خلاف سہی، لیکن احساس وفطرت

؎ اور انعام روسو ہی کو ملا۔

تو سرا پا ایمان و یقین کے ہم نوا ہیں تو پھر ہم شک وارتیابیت کی دلدل میں پھنسنے کی جگہ اپنی جبلت اور احساس پر ہی کیوں نہ بھروسہ کریں؟
غرض اس طرح بر کلے اور ہیوم کے تصورات کو روسو کے احساسات یا جذبات کے ساتھ ملا کر ایک طرف مذہب کو عقل کی زد سے اور دوسری طرف سائنس کو ارتیابیت سے بچانا ہی جرمنی کے مشہور فلسفی امانوئل کانٹ کا اصل مدعا اور کارنامہ تھا۔ اس کا مقصود عقل کی توہین نہیں صرف تحدید ہے۔

کائنات اور انسان کے جن انتہائی مسائل کو ہم عقل سے حل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنی ماہیت ہی میں عقل گریز واقع ہوئے ہیں جن گرہوں کو ہم کھولنا چاہتے ہیں عقل ان کے ناخن ہی سے محروم ہے۔ جو دانت روٹی چبانے کے لئے ہیں اگر ان سے ہم لوہے کے چنے چبانے لگیں تو چنے تو جیسے کے تیسے بنے رہیں گے البتہ دانت ایک بھی سلامت نہ رہے گا۔ بلکہ کانٹ کے تنقیدی فلسفہ کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ ہستی کے جس رازِ غیب کو ہم فاش و بے حجاب کرنے کی فکر میں لگے ہیں خود یہ **فکر** و علم ہی اس کے چہرے کا حجاب اکبر ہے۔

قدیم تجربات کے بعد جدید فلسفہ ڈیکارٹ کی رہنمائی میں جس دانشمندانہ شک واحتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتا رہا وہ بھی اگرچہ ہستی کا بھید پانے میں اگلوں ہی کی طرح نامراد رہا، لیکن خود اپنا بھید کچھ نہ کچھ ضرور پا گیا۔ گو اپنے کو کھو کر ہی سہی ؎

اے اہل طلب کون سُنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اور اس میں شک نہیں کہ ہیوم ہی تک آتے آتے جدید فلسفہ میں بھی یہ **نایافت** پوری طرح بے نقاب ہو چکی ہے، لیکن اس **نایافت** و نارسائی کے قطعی اسباب کا پتہ لگانے اور نایافت تو خود ایک نہایت ہی نتیجہ خیز بلکہ انقلاب انگیز فلسفہ بنا دینے کا حق کانٹ نے ادا کیا جس کے بعد انیسویں صدی کے فلسفہ کی ساری رگوں میں کانٹ ہی کا خون دوڑتا رہا۔ اور گو منزل کی یافت نہ ہوئی گر نایافت کی "یافت" ضرور ہو گئی۔

علم اور تجربہ

کسی چیز کا جاننا اسی کا نام ہو سکتا ہے کہ وہ چیز اپنی جگہ جیسی ہو ویسا ہی ہم اس کو جان لیں۔ عام آدمی کے خیالات کو اگر ٹٹولو تو وہ بھی جاننا کے معنی یہی جانتا ہے اور اسی کو فلسفی اپنی اصطلاح میں علم اشیا **کماھی** (چیزوں کا جاننا جیسی کہ وہ ہیں) یا ماہیات اشیاء کا علم کہتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا یہ علم ہم کو حاصل ہے یا ہو سکتا ہے؟ کانٹ کا جواب یہ ہے کہ نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

اس جواب کو سمجھنے کے لئے اشیاء کی ماہیت کا سوال کرنے سے پہلے خود علم کی ماہیت کو سمجھنا ضروری ہے اس میں سب سے بڑی غلطی جو عوام و خواص کرتے ہیں یہ ہے کہ علم کی تشکیل و تعبیر کے دو اجزا میں ایک کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ساری تحقیق و توجہ معلوم پر صرف کر دی جاتی ہے حالانکہ معلوم کسی نہ کسی عالم کا معلوم ہوتا ہے اور جس کو علم کہا جاتا ہے اس میں معلوم کے ساتھ عالم کا شریک و دخیل ہونا ناگزیر ہوتا ہے علم ایک طرف اپنے اندر اگر معلوم کی کچھ چیزیں رکھتا ہے تو دوسری طرف عالم کی بھی کچھ چیزیں ضرور رکھتا ہو گا۔ کانٹ نے پہلی چیزوں کا نام مادۂ علم رکھا ہے اور دوسری کا صورت علم۔ اور اس کا اصل کارنامہ علم کی صورتوں ہی پر زور اور ان کی تحقیق ہے۔

اس سے پہلے دو مسلک تھے۔ ایک کا دعویٰ تھا کہ خود ہمارے ذہن یعنی ذاتِ عالِم کے اندر پہلے سے کچھ بھی نہیں موجود ہوتا اس کی حیثیت بالکل ایک سادہ و بے نقش لوح کی ہوتی ہے، جو اپنی خلقت کے ساتھ کچھ لے کر نہیں آتا، اس کے علم کا سارا سرمایہ دنیا میں آنے کے بعد تجربات کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ذہن کے سارے علمی نقش و نگار محض تجربہ کی گل کاریاں ہوتی ہیں۔ جدید فلسفہ میں اس مسلک کا علمبردار جان لاک کو قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے قائلین کو تجربہ کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے مسلک کا دعویٰ ہے کہ نہیں سب کچھ خود جاننے والے ذہن یا عالم

لے داستانِ فلسفہ صفحہ ۲۸۰

کی ذات و نفس کے اندر ہی روزِ پیدائش سے موجود ہوتا ہے۔ تجربہ سے کوئی نئی چیز حاصل نہیں ہوتی بس یاد پڑ جاتی ہے جیسا کہ قدیم فلسفہ میں سقراط کا خیال تھا اور جدید فلسفہ میں لائبنز اور اس کے اتباع کا دعویٰ ہے اس مسلک کو عقلیت اور اس کے قائلین کو عقلیہ کہا جاتا ہے۔

کانٹ نے انہیں دونوں پر تنقید سے اپنے **انتقادی** فلسفہ کی درمیانی راہ نکالی جس کا ماحصل یہ ہے کہ علم تو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی صورت پہلے ہی سے ذہن یا عقل میں خلقۃً موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا علم کی آفرینش دونوں کے امتزاج یا باہمی تعامل سے ہوتی ہے۔ تجربہ صرف غیر مربوط پراگندہ و منتشر مواد فراہم کرتا ہے، اور ربط و تعلق اس میں عقل کی صورت بخشی سے پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ "اگر تجربہ نہ ہوتا تو عقل اندھی ہوتی" لیکن اگر عقل نہ ہوتی تو تجربہ محض اٹکل بے جوڑ اجزاء کا نام ہوتا جن میں نہ کوئی ربط و تعلق ہوتا اور نہ یہ علم بن سکتے۔

علم غیر مربوط احساسات و تجربات یا تصورات کا نام نہیں، بلکہ علم نام ہے مربوط تصدیقات و قضایا کا۔ خالی کوئی تصور مثلاً انسان، زمین حرارت وغیرہ کوئی علم نہیں، صرف بے جوڑ احساسات ہیں۔ علم بننے کے لئے ایک تصور کا دوسرے کے ساتھ ارتباط ضروری ہے۔ زمین ایک سیارہ ہے حرارت اجسام کو پھیلاتی ہے، اور انسان ایک ذمہ دار ہستی ہے، اب جا کر علم بنا۔ لیکن صحیح معنیٰ میں ہر تصدیق بھی علم نہیں کیونکہ تصدیق بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تحلیلی جس میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ کسی تصور کی محض تحلیل ہوتی ہے جس سے کوئی نیا علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ تصدیق کہ زمین پھیلی ہوتی ہے یا ممتد ہے، اس میں نفس زمین کا جو تصور تھا "ممتد" کے اضافے سے ہم اس تصور میں کسی نئے علم کا اضافہ نہیں کرتے، کیونکہ امتداد یا پھیلاؤ تو خود زمین کے اصل تصور ہی میں داخل تھا، غیر ممتد زمین کا ہم سرے سے کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے۔ دوسری قسم ترکیبی تصدیقات و قضایا کی ہے۔ مثلاً زمین ایک سیارہ ہے، اس میں ہم نے نفس زمین کے تصور پر سیارہ ہونے کے بالکل ہی ایک نئے تصور کا اضافہ کر دیا، جو نہ خود زمین کے تصور میں داخل تھا، نہ اس سے ناقابل انفکاک تھا، اس لئے اس تصور تک پہنچنے، نفس زمین کے تصور پر اس کا اضافہ کرنے اور اس کے ساتھ جوڑنے میں سیکڑوں ہزاروں سال لگ گئے۔

"تحلیلی قضایا اپنے محمول کے ذریعہ موضوع پر کسی شی کا اضافہ نہیں کرتے، بلکہ محض موضوع کے اجزا کی تحلیل یا تفصیل کر دیتے ہیں جو اجمالاً پہلے ہی سے اس کے تصور میں موجود ہوتے ہیں۔ . . . . بخلاف اس کے ترکیبی قضایا سے موضوع کے تصور میں ایک ایسے محمول کا اضافہ ہوتا ہے، جو نہ اس میں پہلے سے شامل تھا، اور نہ تحلیل کے ذریعہ خود اس کے اندر سے نکالا جا سکتا تھا۔"[1]

غرض علم کا صحیح اطلاق صرف ترکیبی تصدیقات پر ہو سکتا ہے۔ مگر ہر ترکیبی تصدیق و قضیہ کا حکیمانہ (یا سائنسی) علم ہونا ضروری نہیں، حکیمانہ علم کے لئے موضوع اور محمول کے تعلق میں لزوم و وجوب یا ضرورت کا پایا جانا بھی شرط ہے، صرف عارضی و اتفاقی تعلق کافی نہیں۔ پانی گرم ہے، یہ ترکیبی قضیہ تو ہے مگر نہ اس پانی کا گرم ہونا پہلے لازمی و ضروری تھا، نہ آئندہ گرم باقی رہنا ضروری ہے۔ بخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے، کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے، یا حرارت اجسام میں پھیلاؤ پیدا کرتی ہے، تو یہ ایسا وجوبی حکم یا قضیہ ضروریہ ہے، جو ہمیشہ لزوماً صحیح رہتا ہے۔

اب بڑا سوال یہ ہے، کہ ایسے قضایا کو ہمیشہ اور ہر حال میں وجوبی و کلی سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے؟ کیا گذشتہ اور آئندہ کی تمام مثالیں تجربہ میں آ چکی ہیں؟ کیا ایسی صورت ممکن نہیں، کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن مل کر پانی نہ بنے یا حرارت جسم میں پھیلاؤ نہ پیدا کرے؟ ہیوم کا یہ دعویٰ کانٹ کو بالکل تسلیم ہے، کہ تجربہ چونکہ جزئی مثالوں کی ایک محدود تعداد سے آگے نہیں جا سکتا، اس لئے تجربہ کوئی مقدار بھی وجوب یا کلیت کا علم نہیں بخش سکتی۔ لیکن:۔

"ہماری فہم کو صرف تجربہ کی چار دیواری میں محدود و مقید ہرگز نہیں رکھا جا سکتا۔ تجربہ ہم کو صرف یہ بتلاتا ہے کہ کیا ہے نہ یہ کہ جو کچھ

[1] کالکنس صفحہ ۲۲۳ مسز مسائل فلسفہ The Persistent problem of Philosophy کے نام سے D. W. Calkins نے جو کتاب لکھی ہے، وہ بڑی محققانہ اور فلسفہ کے طلبا کے لئے قابلِ مطالعہ ہے خصوصاً کانٹ کی فہم کیلئے۔

کچھ ہے لزوماً یا وجوباً ایسا ہی ہونا چاہئے اور اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا تجربہ سے درحاصل کردہ کلی صداقت حاصل ہی نہیں ہوسکتی اور ہماری عقل جو خصوصیت سے کل علم ہی کے لئے بیقرار ہے، تجربی علم اس تجربی وجوب کی تشفی نہیں کرتا، بلکہ اس کو برانگیختہ کرتا ہے، لہذا کلی صداقتوں کو، جن کا نفس کلی ہونا ہی ان کے وجوب و ضرورت کو مستلزم ہے، لازماً تجربہ سے آزاد و بے نیاز یعنی بذاتِ خود بدیہی و یقینی ہونا چاہئے۔“ [1]

غرض ضرورت و وجوب کے حکیمانہ علم کو لازماً تجربہ کے بجائے عقل پر مبنی ہونا چاہئے، یعنی اس کے وجوب و کلیت کا منشا خود عقل یا ذہن کی ساخت میں اوّلی [2] و خلقی طور پر داخل ہونا چاہئے بالفاظ دیگر حکیمانہ علم کی کامل تعریف اب یہ ہوئی۔ کہ وہ نام ہے ”اوّلی ترکیبی تصدیق“ کا۔ ریاضیات [3]، طبعیات اور الٰہیات کے علوم ایسے ہی ترکیبی اوّلی تصدیقات پر اقتضاءً یا براہِ راست مشتمل ہوتے ہیں۔

عقلیت یا تصوریت کی خامی و کوتاہی یہ تھی، کہ وہ ترکیب علم کے عنصر یعنی تجربہ و احساس کا انکار کرتی ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتی ہے، کہ مادر زاد اندھا محض عقل سے رنگ و روشنی کا قطعاً کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف تجربیت یا احساسیت کا قصور و نقص یہ تھا، کہ عقلی یا حضوری و اوّلی عنصر کے انکار میں اس بات کو بھول جاتی ہے، کہ ایک بالکل احمق آدمی کے محض حواس خواہ وہ کتنے ہی قوی و تیز ہوں، اس کے دماغ میں حکیمانہ یا سائنسی علم قطعاً نہیں پیدا کر سکتے۔

کانٹ کا فلسفۂ انتقادیت [4] ان دونوں انتہاؤں کا نقطۂ اعتدال ہے، جو تصدیقات سازی یا تعمیر علم میں تجربہ اور عقل دونوں کی شرکت کو لابد جانتا ہے۔ عمارت نہ سوکھی اینٹوں سے کھڑی ہوسکتی ہے نہ بے اینٹوں کا خالی گارا ہوا میں لیسا جا سکتا ہے۔ اینٹ اور گارے دونوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے علم کی اینٹیں تجربہ فراہم کرتا ہے، اور عقل کا گارا ان کو جوڑ کر علم و حکمت کی سربفلک عمارتیں کھڑی کر دیتا ہے۔

اب دیکھو علم کے وہ صورت گر اجزا یا عناصر کیا ہیں، جن کو ذہن اپنی طرف سے علم کے مادہ یا ہیولیٰ پر چڑھا کر معلوم کو معلوم بناتا یا ہم کو علم بخشتا ہے۔

کانٹ نے ذہن کے تین حصے، بلکہ یوں کہو کہ عملِ ذہن کے تین مراتب قرار دیئے ہیں، حِس [5]، فہم [6]، اور عقل [7]، جس کی صورت گری سے چیزیں محسوس بنتی ہیں، پھر جب ان محسوسات پر فہم اپنی صورتوں کا اضافہ کرتی ہے، تو وہ مفہوم ہوتی ہیں اور سب سے آخر میں عقل مفہومات کو اپنی صورتوں کے قالب میں ڈھال کر ان کو معقول کا درجہ عطا کرتی ہے۔ ان میں ہر پہلا درجہ یا مرتبہ اپنے بعد والے کے لئے مواد کا کام دیتا ہے۔ حس فہم کے لئے مواد فراہم کرتی ہے اور فہم عقل کے لئے۔

حسیّت

سب سے مقدم حِس کا درجہ ہے، جس کو زیادہ اصطلاحی شان میں حسیت [8] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خود یہ حسیت بھی ذہن کا ایک فعل ہے، اس کی صورت گری کے لئے بھی ہیولیٰ یا خام مواد درکار ہے، جو ذہن کے باہر سے ملتا ہے اور جس کا مادہ وغیرہ جو چاہے نام رکھ لو مگر وہ بالذات قطعاً کوئی نامعلوم و ناقابل علم شئی ہے۔ اس ”نامعلوم شئی“ [9] پر حسیت اپنی طرف سے جو صورتیں چڑھا جاتی ہے وہ دو ہیں، زمان اور مکان۔ زمان حسِ باطن کی صورت ہے، اور مکان حسِ خارج کی۔ یہ زمان و مکان خود کہیں خارج میں نہیں پائے جاتے، بلکہ ہماری عقل و ذہن کے خلقی یا حضوری و اوّلی وجدانیات ہیں جو رنگ و بُو وغیرہ کی طرح حصولی یعنی تجربہ و احساس سے حاصل و مکسوب نہیں ہوتے۔ بلکہ پہلے ہی سے پیدائشی طور پر ذہن میں حاضر و موجود ہوتے ہیں۔ یہ مدرکات نہیں بلکہ ادراک کی صورتیں یا طریقے ہیں، یا آلاتِ ادراک ہیں، جو احساسات کو زمان و مکان

[1] داستان فلسفہ صفحہ ۱۹۰ بحوالہ تنقید عقل نظری Critique of pure reason جو کانٹ کے فلسفہ کی اہلی و اہم کتاب ہے۔

[2] اوّلی ترجمہ ہے A priori کا۔ [4] critical philosophy

[8] Sensibility [9] Something unknown unknowable

کے قالب میں ڈھالتے یا ان کی صورت کے مرتب کرتے ہیں۔

رنگ و بُو، آواز، مزہ وغیرہ احساسات منتشر و پراگندہ ہوتے ہیں۔ یہ افراد کے تابع ہوتے ہیں، ایک چیز کے متعلق مختلف افراد کے احساسات مختلف ہوتے ہیں نیز احساسات کے شعور میں ذہن بالکل منفعل ہوتا ہے، اور اس لئے یہ احساسات کسی نہ کسی طرح جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے، خود ہمارے شعور سے ماوراء کسی حقیقت کے آفریدہ ہوتے ہیں۔ ذہن و شعور سے ماوراء اس خارجی حقیقت کا دعویٰ ہی کانٹ کی وہ کمزوری ہے جس پر وہ غالب نہ آسکا۔

احساسات کے برخلاف زمان و مکان کا شعور کانٹ کے نزدیک انفعالی نہیں ہوتا، بلکہ اس شعور میں ہمارا ذہن فاعلی حیثیت رکھتا ہے ان کا کسی خارج از ذہن حقیقت سے حصول و اکتساب نہیں ہوتا، بلکہ خود ذہن ہی کے اندر کے حضوری و اوّلی حقائق ہیں ان کا غیر اکتسابی و حضوری ہونا اس سے ظاہر ہے کہ بچوں میں اکتساب و تجربہ کے نشو و نما سے پہلے ہی ان کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں، اور وہ خوشگوار چیزوں کی طرف لپکنے اور ناگوار چیزوں سے بدکتے ہیں، جس کے معنیٰ یہ ہیں، کہ مکان یا جگہ کا تصور ان کے اندر پیدائش ہی سے موجود ہوتا ہے، یہی زمان یا وقت یعنی قبلیت و بعدیت کا ادراک ہے، ہم اپنے خیال و تصور میں مافی الزمان و مافی المکان یا زمانی و مکانی اشیاء یعنی ان چیزوں سے جو زمان و مکان میں پائی جاتی ہیں، قطع نظر کر سکتے ہیں، لیکن خود زمان و مکان سے خیال و فکر کا خالی یا مجرد کر لینا ناممکن ہے۔ ہم یہ تو سوچ سکتے ہیں، کہ فلاں جگہ یا وقت میں کوئی چیز نہیں پائی جاتی، لیکن یہ کسی طرح نہیں سوچ سکتے کہ خود جگہ اور وقت موجود نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا جگہ اور وقت یا زمان و مکان کے تصورات خود ہمارے ذہن کے غیر منفک اوّلی و داخلی اجزا ہیں۔

ان کے اوّلی یا حضوری ہونے کا سب سے بڑا ثبوت علوم ریاضیہ سے ملتا ہے، حساب نام ہے علم زمان کا اور ہندسہ علم مکان کا۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ آفتاب کل مغرب سے طلوع ہو یا یہ ہو سکتا ہے کہ آگ لکڑی کو نہ جلائے، لیکن یہ ہم کسی طرح یقین نہیں کر سکتے کہ دو اور دو مل کر چار کے سوا کچھ اور ہو سکتے ہیں، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا، کہ دو اور دو کے چار ہونے یا مثلث کے تین زاویوں کے دو قائموں کے برابر ہونے کا علم ہم کو اس طرح تجربے سے حاصل ہوتا ہے، جس طرح مثلاً یہ علم کہ حرارت جسم کو پھیلاتی یا کونین ملیریا میں مفید ہوتی ہے۔ زمانہ کی ہر آن اپنے ماضی و مستقبل کے ساتھ وجوباً وابستہ ہوتی ہے، علیٰ ہٰذا مکانی علائق بھی وجوبی و کلی ہوتے ہیں، کسی دائرہ میں مرکز سے محیط تک کے تمام خطوط بلا استثناء و وجوباً مساوی ہوتے ہیں۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ زمان و مکان کا اسی طرح ادراک ہوتا ہے جس طرح زمانی و مکانی اشیا کا حالانکہ ذہن کے لئے خود زمان و مکان کا ادراک ویسا ہی ناممکن ہے، جیسا کہ آنکھ کے لئے خود اپنے کو دیکھنا۔ ہم مکان و زمان کے اندر جو چیزیں ہوتی ہیں ان کو دیکھ سکتے یا محسوس کر سکتے ہیں، لیکن خود مکان و زمان کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ کسی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔

زمان و مکان کو اس طرح اوّلی و حضوری کہنے سے کانٹ کا مدعا اصلاً ہیں ان کو بالکلیہ تصوری ہی ثابت کرنا اور اس امر کو قطعی باطل کرنا ہے، کہ شعور و ذہن سے ماوراء ان کا کوئی وجود ہے۔ مکان و زمان کا مسئلہ فلسفے کے لاینحل بلکہ ناقابل فہم مسائل میں رہا ہے، اور غور کرو تو اس کا بڑا سبب ان کے وجود کا خارج از ذہن یا شعور سے ماوراء فرض کرنا ہی رہا ہے، جس سے نہ صرف طرح طرح کے تناقضات میں پھنس جانا پڑتا ہے، بلکہ ان الفاظ کے کوئی معنیٰ ہی نہیں رہتے، ان کو متناہی بھی ماننا پڑتا ہے، اور نامتناہی بھی، ناقص بھی کامل بھی۔ ایک طرف ہر مکان کے آگے مکان کا ہر ماضی کے قبل ماضی کا اور ہر مستقبل کے بعد مستقبل کا تصور کرنا پڑتا ہے، تو دوسری طرف زمان و مکان کا مستقبل بالذات خارجی حقائق ہونا ان کے تعین و تحدید کو چاہتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ زمان و مکان گویا ایک قسم کے ظرف ہیں، جن میں مختلف موجودات بحیثیت مظروفات پائے جاتے ہیں، اور چونکہ

لہ اوّلی سے مراد کانٹ ذہن کی وہ کلی و وجوبی صداقت لیتا ہے، جو تجربہ کی محتاج نہ ہو، اور جس کے خلاف کے امکان کا تصور ہی نہ کیا جا سکتا ہو، نہ اس کی کلیت میں کسی استثنا کی گنجائش نکلتی ہو۔

ظرف کا وجود مظروفات کے تابع نہیں ہوتا، اس لئے کوئی زمانی و مکانی شی موجود ہو یا نہ ہو، لیکن زمان و مکان بہرحال موجود رہتے ہیں۔ مگر ذرا اپنے تخیل کی پوری طاقتِ پرواز سے کام لے کر ایسی جگہ کا تصور کرو، جس میں سرے سے کچھ نہ موجود ہو، نہ زمین نہ آسمان، نہ نور، نہ پتھر، تو پھر کیا عدمِ محض کے سوا جگہ یا مکان کا کوئی اور مصداق یا اس لفظ کے کوئی اور معنی تمہارے پاس رہ جاتے ہیں؟ اسی طرح زمان کو زمانیات یا اُن چیزوں سے الگ کر لینے کے بعد جو زمانے یا وقت میں پائی جاتی ہیں، خود وقت کا عدمِ محض کے سوا کوئی ایجابی مفہوم و مدلول تمہارے ذہن کی گرفت میں آتا ہے؟ قبلیت و بعدیت، جو زمان کے مفہوم کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، کیا گھڑی کی سوئیوں کی حرکت آفتاب کے طلوع و غروب، لیل و نہار کی آمد و رفت سے قطع نظر کرکے یا خود اپنے خیالات کے طلوع و غروب، لیل و نہار کی آمد و رفت سے قطع نظر کرکے یا خود اپنے خیالات کے تقدم و تاخر اور ان کے یکے بادیگرے آمد و رفت سے مجرد کرکے، زمان کے خارج میں پائے جانے کے کچھ بھی معنی سمجھ میں آتے یا آسکتے ہیں؟ تمام زمانیات و مکانیات سے خالی کرکے نرے یا مطلق زمان و مکان کے ذہن سے باہر مستقل بالذات وجود کا مفروضہ ہی تو سرچشمۂ تناقضات ہے، جس کی بدولت زمان کا متناہی ہونا سمجھ میں آتا ہے، نہ غیر متناہی ہونا، متناہیت پر بھی دلائل قائم ہیں اور نامتناہیت پر بھی۔ ایک طرف زمانی و مکانی اشیاء سے خالی نرا زمان و مکان محض سلبی و عدمی مفہوم معلوم ہوتا ہے، تو دوسری طرف طویل و عریض کل و جزء، زیادہ و کم وغیرہ کے وجودی و ایجابی احکام اس پر لگائے جاتے ہیں اس طرح خارجی زمان و مکان فلسفہ کی ایک ایسی پہیلی بن جاتا ہے جس کو آج تک کوئی بوجھ نہ سکا۔

تم زمان و مکان کی اس پہیلی کو بوجھنے میں اپنی عقل و فکر منطق و استدلال کا جتنا زور لگاؤ گے اتنا ہی محسوس کرو گے کہ ان کی خارجیت کے مفروضہ کی جگہ کانٹ کا ان حضوریت یا اُن کے محض ذہنی ہونے کا دعویٰ ہی زیادہ قابل قبول اور مشکلات سے کم دوچار ہے۔ سچ یہ ہے، کہ کانٹ اور اُس کے فلسفہ، انتقادیت کا سب سے عجیب فانی انکشاف یہی دعویٰ ہے۔

اب ذرا اس کے نتائج سنو!

جب زمان و مکان حسیت کی صورتیں ٹھہریں، یعنی ان کا وجود ذہن و عقل یا ادراک و احساس کرنے والی ذات سے ماوراء نہیں، تو ظاہر ہے کہ جن کو ہم خارج از ذہن اشیا سمجھتے ہیں وہ بذاتِ خود زمان و مکان میں نہیں پائی جاتیں بلکہ گویا حسیت کی آنکھوں پر ایک ایسی عینک چڑھی ہے، جس کے ایک تال کا رنگ زمان ہے اور ایک کا مکان ہے، لہٰذا جب ذہن کوئی چیز محسوس کرے گا تو وہ لازماً ان دو رنگوں یا کسی ایک رنگ میں رنگ جائے گی، اور ان رنگوں سے رنگے بغیر اپنی جگہ پر جو اصلی بے رنگ صورت ہے، اس کے دیکھنے یا جاننے کی کوئی تدبیر ہی نہیں۔ اگر کسی بچے کی آنکھوں پر پیدائش کے وقت بلکہ ماں کے پیٹ کے اندر ہی سرخ رنگ کی ایک ایسی عینک چڑھا دی جائے، جو کسی طرح مرتے دم تک نہ اتر سکے، تو اس کو ساری دنیا کی چیزیں سرخ ہی محسوس ہوں گی اور وہ ان کے اصلی رنگ کو کسی طرح بھی نہ دیکھ سکے گا، اسی طرح زمان و مکان کی اس پیدائشی عینک نے جو غیر منفک طور سے ہماری حسیت کی آنکھوں پر چڑھی ہے، ہمارے لئے اشیا کے کما ہی کا ادراک ناممکن بنا دیا ہے، مختصراً یوں کہو کہ جب خود زمان و مکان خارجی حقائق نہیں، تو خارجی اشیا بجائے خود تو زمان و مکان میں موجود نہیں لیکن حسیت چونکہ اشیا کو زمان و مکان ہی کی عینک سے دیکھ اور دکھلا سکتی ہے، اس لئے شی کا بذاتِ خود کا (جیسی کہ وہ بجائے خود زمان و مکان کے بغیر پائی جاتی ہے) کسی طرح ادراک ہی نہیں ہو سکتا اور فلسفہ چونکہ شی بذاتِ خود یا شی کما ہی کے علم ہی کا نام تھا۔ اس لئے فلسفہ باین معنی قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے۔

اب آپ نے ربط کلے اور مترجم کے دلائل کو سمجھ لیا ہے، جن کی رو سے صرف زمان و مکان کیا، ہمارے سارے احساسات و تجربات ہی تمام تر تصوری قرار پا جاتے ہیں، اس کے لئے زمان و مکان کے خالص تصوری و شعوری ہونے پر دلائل قائم کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کانٹ کی اصلی اہمیت یہ ہے، کہ زمان و مکان کے خالصۃً حضوری و تصوری حقائق قرار پا جانے کے بعد اشیا کا خارج از ذہن مستقل بالذات وجود مان بھی

لیا جاتے، تو بھی ان کا علم ہر حال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے، اور کانٹ کے فلسفہ کا یہی وہ اہم ترین نتیجہ ہے، جس نے فلسفہ ہی نہیں سائنس سے بھی ہمیشہ کے لئے یہ اقرار لے لیا، کہ انسان کا علم آثار و مظاہر سے آگے اعیان و حقائق یا اشیائی غیوب و اسرار تک سرے سے جا ہی نہیں سکتا، بلکہ فلسفہ و سائنس سے بھی یہ خیال آگے نکل کر، اب ہر اچھے پڑھے لکھے آدمی کے مسلمات میں داخل ہے۔

غیر فلسفہ داں، بلکہ ہر فلسفہ داں کے لئے بھی اس کا سمجھ میں آنا تو دشوار تھا، کہ ہمارے شعور یا ذہن سے خارج وہ واقعی موجود ہی نہیں، لیکن کانٹ کے نظریہ کو سمجھ لینے کے بعد آتنا عامی آدمی کو بھی سمجھایا جا سکتا ہے کہ کوئی چیز جیسی کہ وہ اپنی جگہ ہمارے ذہن و شعور سے باہر موجود ہے، اس کو ویسا ہی (کماہی) مان لینا، خود ذہن و شعور کی ساخت کی رو سے ناممکن ہے۔ یہی نتیجہ کانٹ کی "تنقید عقل نظری" کا سب سے قیمتی حاصل ہے۔

ہمارے علم کا پہلا قدم احساس و ادراک تھا۔ جس سے تصورات قائم ہوتے تھے، جب ان تصورات ہی میں ہم اشیاء کے کماہی کے تصور سے عاجز ہیں، تو پھر یہی تصورات تو ان تصدیقات کا مواد ہیں، جن سے علم بنتا ہے۔ لہٰذا حقائق اشیاء تک ہمارے علم کی رسائی کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہوجاتا ہے اور ہم چیزوں کو جیسی کہ وہ ہیں (کماہی) ویسا نہیں، بلکہ جیسی کہ وہ زمان و مکان کی عینک سے ہمارے لئے ظاہر ہوتی ہیں[1] ویسا جانتے ہیں یعنی ہمارا علم حقائق[2] اشیاء کے بجائے صرف ظواہر اشیاء تک محدود ہے۔ خود کانٹ کے الفاظ میں "یہ جاننا ہمارے لئے بالکل ناممکن ہے کہ ہمارے حواس میں داخل ہونے سے قطع نظر کر کے اشیاء بذات خود کیا ہو سکتی ہیں۔ ہم ان کے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ کس طریقہ سے ان کا ہم کو ادراک ہوتا ہے اور ادراک کا یہ طریقہ ظاہر ہے کہ خاص ہمارا یا انسانی طریقہ ہے، کسی دوسری مخلوق کا طریق ایسا ہی ہونا ضروری نہیں[3]"

حسیت اشیاء خارجی کو اپنی زمان و مکان کی صورتوں سے مصور کر کے جو مواد فراہم کرتی ہے، اسی کو فہم پھر اپنی صورتوں کے قالب میں ڈھال کر تصدیقات بناتی ہے۔ فہم کی اسی صورت گری کا نام تصدیقات سازی ہے، جس کے بغیر حسیت کا مواد انمل بے جوڑ غیر مربوط و پراگندہ ادراکات و تصورات کا محض ایک ڈھیر ہوتا ہے۔

فہم کی یہ صورتیں ہمارے پراگندہ تصورات میں ارتباط و انضباط پیدا کرنے کے وہی اصول و علائق ہیں، جن کو منطق میں مقولات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں کم و کیف اضافت و جہت کے مقولات زیادہ اصولی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان چار میں بھی اصل الاصول سب سے اہم اور سب کو محیط مقولہ اضافت ہے، کیونکہ ہر تصدیق اپنے تصورات کے مابین کسی نہ کسی تعلق نسبت یا اضافت ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ حسیت کی صورتوں کی طرح فہم کی یہ صورتیں یا مقولات بھی خالص تخصوصی ڈھلی ہیں، یعنی کہیں باہر سے فہم ان کو حاصل نہیں کرتی، بلکہ یہ خود فہم ہی کی فعلیت کا نام ہیں۔ اشیاء جو بذات خود نہیں معلوم کیا ہیں، ان پر جس طرح حسیت زمان و مکان کی صورتیں چڑھا کر ان کو محسوسات بناتی ہے، اسی طرح ان محسوسات پر فہم اپنی صورتوں کا اضافہ کر کے ان میں کم و کیف و علیت وغیرہ کے روابط پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اشیاء میں افعال و خواص تعداد مقدار وجوب و امکان وغیرہ جو کچھ پایا جاتا ہے، سب کی سب فہم کی صورتیں یا اس کے عطایا ہیں، یعنی وہ قوانین جو خود فہم اپنی طرف سے ان اشیاء پر عائد کرتی، جن کے تحت ان کو سمجھتی اور مرتب و منظم کرتی ہے اور جو در اصل خود اشیاء کے صفات و احوال نہیں، بلکہ محض ہمارے ذہن و فہم کے اصول تنظیم و ترتیب ہیں۔ یوں سمجھو کہ قوت فہم ایک قالب ہے، جس کے اندر مختلف وضع و ساخت کے بہت سے خانے ہیں۔ تجربے سے مواد یا مظاہر حسیہ کا جو ذخیرہ فراہم ہوتا ہے ان کو یہ قالب اپنے مختلف خانوں کی ساخت و وضع کے مطابق ڈھال لیتا ہے، انسانی ذہن موم کی ناک نہیں کہ خارجی تجربات اس کو جدھر چاہیں موڑ دیں یا جو نقش چاہیں اس پر بنا دیں اور جس صورت میں چاہیں اس کو ڈھال دیں، نہ ذہن محض کوئی انفعالی حقیقت ہے، نہ ذہنی احوال

[1] As they appear to us [2] As they are.

[3] داستان فلسفہ صفحہ ۲۹۶ بحوالہ کریٹک ص۳۳

کے سلسلہ یا مجموعہ کا محض کلی و تجریدی نام ہے، جیسا کہ ہیوم کا خیال تھا، بلکہ یہ خود ایک فاعلی ذات ہے، جو احساسات کو خود اپنے قالب میں ڈھال کر صورت گری کرتی ہے۔

غرض سارے مظاہر حسیہ یا عالم محسوسات پر خود ہماری یا ہمارے ذہن کے قوانین و اصول کی فرماں روائی ہے۔ عقل و فہم کائنات فطرت کی صرف عالم نہیں، خالق بھی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کانٹ جس کائنات کو فہم و ذہن کی مخلوق کہتا ہے، وہ مظاہر (فنا منا؎) کی کائنات ہے برکلے کی طرح نفس کائنات خارجی کے وجود کا وہ منکر نہیں، بلکہ اس کا مدعی ہے، کہ ان مظاہر و آثار سے ماورا مستقل بالذات اعیان یا حقائق کا بھی وجود ہے۔

فہم کی تمام صورتوں یا معقولات میں، سب سے اہم اور ہمہ گیر تعلیل (علت و معلول) کا علاقہ ہے۔ ہم اشیاء اور اپنے تمام معلومات کو علت و معلول کے ضروری و وجوبی رشتہ میں جکڑا پاتے ہیں، بظاہر کانٹ کا بھی وہی خیال معلوم ہوتا ہے، جو ہیوم کا تھا، کہ علت و معلولیت خود اشیا میں نہیں، بلاشبہ خود اشیا میں بذات خود کانٹ کے نزدیک بھی نہ کوئی شی علت ہے، نہ معلول، اور ہیوم سے اس امر میں وہ بالکل متفق ہے کہ ہم قطعیت کے ساتھ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے، کہ فلاں شی کی علت یا معلول فلاں شی ہے۔ لیکن یہ شعور ہم لزوماً رکھتے ہیں، کہ ہر شی کی کوئی نہ کوئی علت ہونی ضرور چاہیے۔ یہ لزوم وجوب کہاں سے آتا ہے؟ ہیوم کے نزدیک نہ یہ خود اشیا میں پایا جاتا ہے، نہ ہماری فہم و ذہن کی خلقی ساخت و فطرت میں داخل ہے، بلکہ محض تجربہ و تکرار کی بنا پر ہمارے ذہن میں خالی ایک انعطاف (رجحان) یا اس بات کی ایک عادت سی پیدا ہو جاتی ہے، کہ ایک کے احساس و خیال سے دوسرے کی طرف ذہن کا انتقال ہو جاتا، یا اس کی توقع پیدا ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے کانٹ کا کہنا یہ ہے کہ ہمارا ذہن تجربہ و تکرار سے قطع نظر کر کے بالذات اس بات کے فہم و شعور پر مضطر ہے، کہ ہر شی کی کوئی نہ کوئی علت ہو۔ تجربے کے تابع صرف یہ ہوتا ہے کہ کون شی کس شی کی علت یا معلول سمجھی جائے کانٹ کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "کانٹ کے نزدیک نفس علت و معلول کے لزوم و وجوب کا شعور خود ہی اس بات کی دلیل ہے، کہ یہ محض ہمارے ذہن و تصور یا شعور کا ایک واقعہ ہے، نہ کہ بذات خود اشیا کی کوئی صفت اور "ہم کو صرف اپنے تصورات ہی سے سروکار ہے"، باقی شعور و تصور سے ماورا حقائق یا اشیا بذات خود کا معاملہ ہمارے دائرہ علم سے قطعاً باہر ہے"۔

علت و معلول

ہیوم کے استدلال کا ماحصل یہ تھا، کہ چونکہ "علت و معلول" جداگانہ ایک دوسرے سے ممتاز تصورات ہیں، اسلئے دونوں میں سی وجوبی و ضروری وابستگی کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے اسکے علاوہ علت و معلول کے علم کی بنا پر تمام تر تجربہ ہے اور گذشتہ کا تجربہ آئندہ کی ایسی ضمانت نہیں دے سکتا، کہ اس کے خلاف ہو ہی نہ سکے۔ کانٹ کو بھی تسلیم ہے کہ علیت نفس شعور و تصور و ذہن سے ماورا بذات خود اشیا کے مابین کسی علاقہ و رابطہ کے علم کا نام نہیں، بلکہ محض ایک ذہنی و تصوری رابطہ ہے۔ مثلاً رگڑ یا حرکت کو حرارت کی علت قرار دینے کے معنی ہیوم اور کانٹ دونوں کے نزدیک صرف یہ ہیں، کہ حرکت و حرارت کے دو جداگانہ واقعات کو ہمارا ذہن ایک خاص طریقہ سے باہم جوڑ لیتا ہے۔ اہم اختلاف یہ ہے کہ ہیوم کے نزدیک یہ ذہنی ارتباط تجربہ کا پیدا کردہ محض ایک اکتسابی و اتفاقی عادتی امر ہے، اور کانٹ اس کو تجربہ کا پیدا کردہ نہیں، بلکہ خود ذہن و فکر کی خلقی ساخت میں داخل مانتا ہے۔

ہیوم کی رائے میں علیت کا ذہنی و تصوری ہونا ہی، اس کے وجوبی و ضروری ہونے کے منافی ہے، اور کانٹ کے برعکس علیت کے وجوب و ضرورت ہی سے اس کے ماخذ بہ ذہن و فہم ہونے کا نتیجہ نکالتا ہے۔ بالفاظ دیگر علیت کے ذہنی ہونے کے دونوں قائل ہیں۔ لیکن ہیوم اس کے ذہنی ہونے کو تسلیم کرا کے اس کے عدم وجوب پر استدلال کرتا ہے، اور کانٹ اس کے وجوب و ضرورت کو مسلم قرار دے کر اس کے ذہنی ہونے پر دلیل لاتا ہے۔

؎ Phenomena

کیونکہ خارجی و تجربی واقعات سے وجوب و کلیت کا اکتساب نہیں کیا جاسکتا (جیسا کہ خود ہیوم کا دعویٰ ہے) پھر بھی علت و معلول میں ہم وجوب و ضرورت کا ادراک کرتے ہیں، اس لئے لازماً یہ ایک ذہنی ہی حقیقت ٹھہرتی ہے۔ ہیوم کا یہ خیال بالکل درست ہے، کہ ہر واقعہ دوسرے سے منفک و جُدا ہوتا ہے، اور صرف ان کے یکے بعد دیگرے ظہور سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، کہ فلاں واقعہ سے خلاف دوسرا واقعہ یا نتیجہ لازماً ظاہر ہوگا۔ کانٹ کو بھی تسلیم ہے، کہ بے شک خاص واقعہ سے کسی دوسرے خاص واقعہ یا نتیجہ کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ دعویٰ یقیناً کیا جاسکتا ہے، کہ کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور ہوگا۔

ہیوم کو وجوب علیت کا انکار اس لئے تھا، کہ خاص خاص علل و معلولات کا علم صرف تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ کانٹ کو بھی اس سے انکار نہیں لیکن وہ خاص خاص علل و معلولات کے وجوب کا دعویٰ ہی کب کرتا ہے، وہ تو نفس علیت کے وجوب کا مدعی ہے، کہ جب کوئی واقعہ وقوع پذیر ہو، تو اس کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ہر حاضر کا کوئی نہ کوئی ماضی و مستقبل ہونا ہی چاہئے، اور یہی ماضی اس حاضر کی علت اور مستقبل اس کا معلول ہوگا۔ اور جیسا کہ ہیوم کی دلیل سے ظاہر ہے، کہ چونکہ جزئی تجربات کی کسی بڑی سے بڑی تعداد سے بھی کلی و اطلاقی وجوب و ضرورت کا اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے پھر کانٹ ہی کی یہ شق باقی رہ جاتی ہے، کہ وجوب و ضرورت خود ذات عالم یا ذہن و شعور کی ساخت میں داخل ہو، بلکہ اس کے نزدیک، تو "اگر علاقہ علت و معلول میں علی الاطلاق کلی و عالمگیر طور پر یکسانی پائی جاتی، تو ہمارے تجربات موجودہ تجربات کے برخلاف ہوتے یعنی ہم اس دُنیا کو ایک مربوط و مسلسل واقعات کی دُنیا کی حیثیت سے جان ہی نہ سکتے تھے"۔

لیکن یہ "علاقہ خود اشیا کی ذات میں داخل نہیں، اور اس لئے وہ ان اشیاء سے محض ادراک کے ذریعہ نہیں حاصل کیا جاسکتا۔۔۔۔

بخلاف اس کے یہ علاقہ یا ربط تمام تر فہم کا کارنامہ ہے"۔

ہیوم کی طرح وُلف کے خیالات اگرچہ بجائے خود کچھ زیادہ اہم نہیں، لیکن تاریخی لحاظ سے چونکہ کانٹ کا نظریہ ہیوم اور وُلف دونوں پر تنقید کا نتیجہ ہے اس لئے اتنا خیال رکھنا چاہئے، کہ جس طرح ایک طرف ہیوم، علت، و معلول وغیرہ کے علائق کو نہ خارجی اشیا و موجودات میں مانتا تھا، نہ خود ذہن کی ساخت و حقیقت میں داخل جانتا تھا، اسی طرح دوسری طرف وُلف عام خیال کے مطابق علیت وغیرہ کے تمام مقولات و روابط کو خود خارجی اشیاء میں اور اشیا کو خارجی وجود رکھنے والے زمان و مکان میں موجود مانتا تھا۔

"کانٹ مستقل بالذات یا ذہن و شعور سے خارج اشیاء کے وجود کا تو قائل ہے، لیکن وہ ان کو نہ صرف یہ کہ کسی خارجی وجود رکھنے والے زمان و مکان میں قطعاً موجود نہیں مانتا، بلکہ ان میں کسی اور طرح کے روابط و علائق کا بھی قطعاً کوئی وجود تسلیم نہیں کرتا، یعنی ان خارجی اشیا میں نہ بذات خود کوئی کمیت ہے، نہ کیفیت، نہ وحدت، نہ کثرت، نہ علیت نہ معلولیت، یہ سب کی سب خود ہمارے فکر و شعور کے محض ذہنی افعال، یا اس کی فعلیت و عمل کے طریقے اور صورتیں ہیں، لہٰذا ہم جس دُنیا یا اشیاء و واقعات جانتے ہیں وہ از سرتاپا خود ہمارے ذہن و تصور کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، بلکہ زیادہ برہنہ تعبیر میں "ہم اشیاء کو جانتے ہی اس لئے ہیں کہ ہم خود ہی ان کو پیدا کرتے ہیں"۔

تاہم اشیا کے ذہنی و تصوری ہونے کے معنی کانٹ کے نزدیک یہ ہرگز نہیں، کہ یہ خواب و خیال کا نام ہیں، بلکہ یہ وہی ٹھوس اور حقیقی اشیاء ہیں، جن کو ہم روزمرہ بیداری کے عالم میں شجر و حجر کتاب و میز وغیرہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کے تصوری و ذہنی ہونے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ وہ حقائق بالکل نہیں، جن کو "اشیا بذات خود" یا اشیاء کما ہی کہا جاتا ہے اور ہماری معلوم اشیا غیر حقیقی یا تصوری صرف اُن اشیا کے مقابلہ میں ہوتی ہیں، جو ہمارے شعور یا ذہن سے ماورا بذات خود خارج میں موجود ہیں۔

[1] کالکنس صفحہ ۲۱۹

حاصل یہ کہ کانٹ کی تنقید کی رُو سے جس طرح زمان و مکان کا اگرچہ خارجی کوئی وجود نہیں لیکن خود ذہن و عقل کی وہ حضوری و اوّلی یا غیر اکتسابی صورتیں ہیں، اُسی طرح فہم کے تمام مقولات خصوصاً علیّت بھی تجربہ سے بالکلیہ مستغنی و غیر اکتسابی ایک خالصۃً عقلی و حضوری یا اوّلی حقیقت ہے۔ یہی تو وجہ ہے، کہ اشیا میں بجائے خود کوئی علت و معلول ہو یا نہ ہو، لیکن عقل بہر حال اُن میں علیت کا رشتہ قائم ہی کر کے رہتی ہے، جن کو ہم اشیا یا فطرت کے قوانین خیال کرتے ہیں، وہ کانٹ کے نزدیک خود ہماری فہم کے قوانین ہیں "فہم خود ہی قوانین فطرت کا سرچشمہ ہے ...... سارے تجربی قوانین دراصل خالص قوانین فہم کے صرف خاص خاص تعینات ہیں" ۱؎

اور یہ کی بات جو بہت زیادہ یاد رکھنے کی ہے، یہ ہے کہ کانٹ جس کو "شی بذات خود" کہتا ہے، اور جس کے وجود کو ذہن و شعور سے خارج فرض کرتا ہے، اُس کا یہ فرض کرنا اگر صحیح بھی ہو، تو بھی اس کے نظریہ کی رُو سے جس طرح اس شیٔ بذات خود پر حسیت زمان و مکان کی صورتوں کا پردہ ڈال کر اس کو بذات خود نامعلوم و ناقابل علم بنا دیتی ہے، اسی طرح فہم حسیت کے اس پردے پر اپنے مقولات کمیت و کیفیت علیت و معلولیت وغیرہ کے اور بہت سے حجابات ڈال کر شی بذات "خود کے علم کو محجوب سے محجوب تر یا دُور سے دُور تر کر دیتی ہے یعنی جس کو ہم جتنا زیادہ علم یا جاننا کہتے ہیں" شی بذات خود" کے اعتبار سے وہ اتنا ہی زیادہ عدم علم یا جہل یا نہ جاننا ہوتا جاتا ہے۔ حسیت کے علم نے اگر صرف زمان و مکان کے حجاب سے "شی بذات خود" کے چہرے کو مستور کر دیا تھا، تو فہم کے علم نے اپنے طرح طرح کے مقولات کے مزید حجابات کی بدولت اس کو مستور سے مستور تر کر دیا

بر کشف براں چہرہ حجاب دگر ست		ہر گام دریں راہ سراب دگر ست

(یہ مقالہ اپنی جگہ فلسفہ کا نیم ربانی صحیفہ ہے، فاضل مقالہ نگار نے نہایت ہی نازک اور دقیق مسائل کو سادہ اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے اب رہیں فلسفہ کی اصطلاحات تو ان کا لانا لابد اور ناگزیر تھا۔ جس فن پر بھی گفتگو کی جائے گی، اُس کی فنی اصطلاحات کا ذکر کئے بغیر بات واضح نہیں ہو سکتی ——— اور ساتھ ہی ہر فن کی مخصوص زبان ہوا کرتی ہے۔

یہ مقالہ اور اس انداز کے دوسرے مضامین پڑھ کر وجدان اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ محض عقل کے زور سے زندگی اور کائنات کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ فلسفی اور اربابِ عقل ایک گتھی کو سلجھاتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی کچھ اور گتھیاں اور اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بات اُلجھی ہی چلی جاتی ہے، فلسفیانہ ذہن میں سدا شکوک و اوہام کے کانٹے کھٹکتے رہے ہیں اور جس مسئلہ پر جتنی زیادہ قیل و قال ہوئی ہے اتنی ہی پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں، اسی لئے فلسفیوں کے یہاں تضاد اور Contradiction پایا جاتا ہے۔

اسی دُنیائے اسباب اور عالم کون و فساد میں ایک مقدس جماعت انبیائے کرام کی ہے جس کے یہاں شروع سے آخر تک ایک ہی پیام پورے ربط و استحکام کے ساتھ ملتا ہے، وہاں یقین، ایمان، اور عزیمت کی روشنی نظر آتی ہے اور فکر و نظر کو تسکین و اطمینان حاصل ہوتا ہے جس علم کا مرکز وحی آلٰہی نہیں، وہاں ہر آن لغزشوں اور ٹھوکروں کا امکان ہے ——— جس نے اس راز کو سمجھ لیا اُس کو ہدایت کی توفیق حاصل ہوئی، اور اُس کی عقل گمراہی سے محفوظ ہو گئی) (م - ق)

فروگذاشت

جولائی کے شمارے میں صفحہ ۳۹ پر جناب مجاز دہلوی کے اشعار خمار دہلوی کے نام سے شائع ہو گئے۔ اگر "تجنیس خطی" کی صورت نہ ہوتی تو ہم اور زیادہ معذرت کرتے ——— ناظرین کرام تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

۱؎ دیکھو وارڈ کی A study of Kant ص ۸۵

ماہر القادری

آپ بھول تو نہیں گئے؟

تقسیم ہند کے بعد جو عظیم الشان انقلاب رونما ہوا اُس کے اثرات کی زد سے اُردو زبان بھی نہ بچ سکی، پاکستان میں مختلف خطوں اور علاقوں کے رہنے والوں کی یک جائی اور اجتماع کے سبب اُردو زبان کی ٹکسالی خصوصیت کو بھی کسی نہ کسی حد تک متاثر بلکہ بعض حالتوں میں شاید مجروح ہونا پڑے گا، اُردو زبان خالص اور بے میل نہ رہ سکے گی۔ اس میں وسعتیں پیدا ہوں گی، مگر ان وسعتوں کے لئے کچھ قربانیاں بھی دینا پڑیں گی۔

اس عبوری دَور میں میرؔ، انیسؔ، غالبؔ، حالیؔ، داغؔ اور اقبالؔ کی زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے کہ یہی معیاری، ذمہ دار اور عوام کی زبان ہے، اسی ضرورت کے تحت جن فقروں کو یہاں درج کیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں آپ سوچئے کہ اس دَور میں آنے کے بعد آپ نے یہ جملے خود کب سے نہیں بولے اور آپ کے کانوں نے کب سے نہیں سُنے؟ ——— اپنے بال بچوں اور گھر والوں میں اس انداز کے جملوں کو رواج دیجئے ——— دیکھنا! یہ چراغ کہیں بجھ نہ جائیں!

——— میرے بکس میں کورے خاصے کے چار پاجامے رکھے ہیں جن کی تہ بھی نہیں ٹوٹی۔

——— ارے صاحب! وہ میرا دوست نذیر! ... نہ پوچھئے! ...... میں نے اپنے قرضہ کا جو تقاضا کیا تو وہ مجھ سے فرنٹ ہو گیا۔

——— یہ ہمارے قاضی جی، اللہ میاں کی گلئے ہیں، کوئی ذرا ان کو بھرتے پہ رکھ دے پھر وہ ہر بات کے لئے تیار ہو سکتے ہیں

——— جی ہاں! وہ آپ کا بھیجا ہوا آدمی بس کی گانٹھ نکلا، پرلے درجے کا سازشی اور مفتنی جہاں سوتی نہ جاتی ہو، وہاں دھواں کر دے، ہتھیلی پر سرسوں وہ جما دے اور آسمان میں تھگلی وہ لگا دے، اللہ تعالیٰ ایسے حرفوں کے بنے ہوئے لوگوں کے سایہ سے بچائے۔

——— یہ لو سعیدہ! تمہارا دوپٹہ لیس ہو گیا، تمہاری امی نے گھو کر وبھی ٹانک دیئے اور بیل بھی لگا دی، بیاہ میں پہنو گی تو بس ساری عورتوں میں تم ہی تم نظر آؤ گی۔

——— ڈپٹی صاحب کے یہاں آج رات میلاد شریف ہے، مٹی کی مٹکوں میں تکیاں چھانی جا رہی ہیں، اور نوکر کورے سکوروں میں پانی بھر رہے ہیں، مولوی برکت اللہ کا وعظ ہوگا اور شیخان محلہ کے نعت خوانوں کی پالٹی (جماعت) نعت خوانی کرے گی، اگر بھیا، ان میں اُس اندھے کی آواز تو پھٹے بانس جیسی ہے، بے سُرا کہیں کا!

——— آج صبح سویرے ہمارے پڑوسی نے بڑے سے جنگی بادیئے میں دہی بھیجا، صاحب! وہ دہی، اُس کی مٹھاس اور سواد کیا بتاؤں! ملائی کی تہیں سی جمی تھیں، اب تک زبان چٹخارے لے رہی ہے۔

——— ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا، شیخ جی کے پاس دھرا ہی کیا ہے، بس خالی لفافہ ہی لفافہ اور باتیں ہی باتیں ہیں، بات کریں گے تو اس طمطراق کے ساتھ کہ جیسے یہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، شرافت ان کے گھر کی لونڈی ہے، اور مطلب کے وقت زمین کا گز بن جاتے ہیں، کمیٹی کے سکتر (Secretary) کی بھلا کیا اوقات ہے، ارے صاحب، بھنگیوں سے جو معاملہ آ کر پڑا تو دن میں کئی کئی پھیرے

کرتے تھے۔ سکتر کے مکان کے! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔

—— میں کوئی آٹے کا بنا ہوا نہیں ہوں، جو تم مجھے گھول کر پی جاؤ گے، یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا! بڑے آئے کہیں کے تیس مار خاں! میں راستی سے بات کر رہا ہوں اور میاں! میں کر خواہ مخواہ تیز ہوتے چلے جا رہے ہیں، مانا کہ اپنے گھر پر چیونٹی بھی شیر ہوتی ہے پر شرافت اور بھلمنساہٹ بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

—— خربوزہ ڈال کا آم پال کا —— یہ پرانی کہاوت ہے، ابکی بار لکھنؤ جانا ہو تو پال کے آم لانا مگر دو چار آموں سے کچھ نہ ہوگا اونٹ کے منہ میں زیرہ! میں نے تو ایک ایک جھلی آم ایک جگہ بیٹھ کر ختم کئے ہیں۔

—— ارے بچھن! تمہیں کیا ہوا، کیا بیمار رہے تھے، چہرے کی زردی تو دیکھو جیسے کسی نے ہلدی تھوپ دی، بھیا! میرا کہا مانو تراملی والے حکیم جی کو نبض دکھاؤ، ان کے ہاتھ میں شفا ہے، ان کے ہاتھ کی دی ہوئی پھانس تریاق کا حکم رکھتی ہے۔

—— وہ تو ساری تنخواہ پنجیا جوئے میں ہار گیا، جوئے کی ہار جیت سے پیاری ہوتی ہے، میں نے بہتیرا سمجھایا مگر اس کی قسمت میں دھکے لکھے تھے قسمت کے لکھے کو کون میٹ سکتا ہے، اب میاں جی! گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، یار دوستوں نے جن سے دانت کاٹی روٹی تھی، آنکھیں پھیر لیں، بُرے وقت میں کون کسی کا ہوتا ہے ——

—— یہ کوتوال کا منجھلا لونڈا، باپ کی حکومت کے برتے پر ہر کسی سے اٹک لڑائی مول لیتا ہے، کل وہ پھر ذرا سی بات پر ایک راہگیر سے گتھ گیا مگر اس پودنے سے آدمی نے اس اونٹ کو ایسی پٹخنی دی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا میاں کو!

—— میں نوٹ گن رہا تھا، یار! تم نے آن کر گھپلا ڈال دیا، جب آدمی تنہائی چاہتا ہے تو اس وقت کوئی نہ کوئی آدھمکتا ہے، بیسیوں بار کا تجربہ ہے میرا!

—— یہ تو وہی مثل ہوئی کہ آ بیل مجھے مار! میں نے تم سے یہی تو پوچھا تھا کہ تمہارے بڑے ابا کا کلکتہ سے کوئی تار وار تو نہیں آیا اور تم اسی سی بات پر بگڑ گئے! لڑنے کی دل میں ہے تو صاف کہہ دو، تم تو چھ رنگے کانٹے کی طرح لپٹے جاتے ہو۔

—— منشی جی (پوسٹ مین) سے، ہمارے کوئی چٹھی چپاتی تو کہیں سے نہیں آئی، پرسوں جو تم منی آرڈر کا روپیہ دے کر گئے تھے اس میں کے دو نوٹ بازار میں نہیں چلتے، ایک طرف سے تو دوائی ہوتے ہوتے رہ گئی وہ کہنے لگا کہ آج کل لوگ بہت ہیرا پھیری کر رہے ہیں اس ذرا سی زندگی میں نوٹوں کی ادلا بدلی کے دو چار کیس روزانہ ہو جاتے ہیں، انجان آدمیوں پر بھروسا کرنے کا دھرم نہیں رہا۔

—— وہ ہمارے محلہ کے نتھو ڈوم کا لڑکا تو صاحب! جادو کرتا ہے، بتاسوں اور تلواروں پر غضب ناچتا ہے، تلواروں کی دھاروں پر کوئی آدھ گھنٹہ ناچا رہا اور مجال ہے جو اس کے تلوے میں ذرا سی خراش بھی آئی ہو، پھر بتاسوں پر ناچا اور جب ناچ چکا تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بتاسے ثابت کے ثابت تھے —— جنگل میں مور ناچا کس نے جانا، گاؤں میں اس کی قدر کیا ہو سکتی ہے اگر کسی رجواڑے میں پہنچ گیا تو سن لینا! چھٹن ستارۂ ہند ہو گیا۔

—— پرچونی کی دکان سے ہمارے یہاں اُچاپت پر سودا سلف آتا ہے، مہینہ پیچھے حساب ہوتا ہے، ہم اپنے گھر میں کیسی ہی تنگی ترشی سے گزر کریں پر بنیئے کا اُدھار نہیں رہنے دیتے۔ اِدھر تنخواہ ملی اور اُدھر بھگتان کر دیا، آدمی کی آبرو موتی کی سی آب ہوتی ہے بھیا!

—— ٹھاکر جی پر جو ہمارے نیوتہ کے دس روپے چڑھاؤ ہیں، وہ جو اپنی بیٹی کا لگتے بیاہ کا کارج کر رہے ہیں اس میں بہت سے بہت دو روپیہ نیوتہ کے ہماری طرف سے دیئے جائیں گے، اس سے زیادہ ہم ایک دھیلا بھی نہ دیں گے۔

—— کل تک ایک ایک پیسہ کے لئے ہاتھ پھیلانے والے آج بڑھ بڑھ کے باتیں مارتے ہیں، اللہ تیری شان! چھاج بولا تو بولا چھلنی بھی بولی جس میں بہتر چھید۔

—— خدا کے بندے! اللہ سے ڈر، زندگی کا ایک پل کا بھی بھروسا نہیں اٹھو کرگی اور دم نکل گیا، دولت تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے، آدمی کو اپنی آخرت کی بھی تو فکر کرنی چاہیے، موت آتی ہے تو سارے ٹھاٹ باٹ بس دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، یہاں کا ایک تنکا بھی آدمی کے ساتھ نہیں جاتا —— بس عمل! قیامت کے دن رائی کے دانہ تک کا بھی حساب ہوگا، وہاں کوئی بات چھپ بھی نہیں سکتی، اُس دن کی شرمندگی سے بچنے کے لئے کچھ کرنا چاہیے، پاپ کی ناؤ میں کچھ بھی دم درود نہیں ہوتا ذرا ٹھیس لگی اور بتاسہ کی طرح بیٹھ گئی، ہاں! نیکی کو ٹھراؤ ہے، اس دُنیا میں بھی کامیابی اور اُس دُنیا میں بھی سُرخروئی!

—— ہمارے گاؤں کے نائی کے لڑکے کو شہر کی ہوا لگ گئی ہے، سوانگ کھیلنے والوں کی منڈلی میں نچکیا ہو گیا ہے، گاؤں میں آتے گا تو کناری دار دھوتی اور پھول دار جُوتیاں پہن کر اس ٹھتے کے ساتھ گھر سے نکلے گا جیسے گاؤں کے مقدم یہی ہیں —— کمین اور چھچھے کو مُنہ لگانا اچھا نہیں ہوتا، میں تو اس سے بات بھی نہیں کرتا۔

—— ارے صاحب! اس شیخ کے لونڈے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس آتے ہی میرے بھائی پر ہاتھ چھوڑ دیا، وہ تو لاٹھی اوچھی پڑی، نہیں تو بیچارے کا سر کھیل کھیل ہو جاتا۔

—— آج دنگل میں مزہ آگیا، پہلوانوں کے پہلے دو جوڑ تو برابر سرابر رہے، دونوں متھرا کے چوبے تھے گرتے ہی زمین جو پکڑی ہے تو اوپر والے پٹھے[1] پسینہ پسینہ ہو گئے مگر چت نہ کر سکے —— اور صاحب! تیسرے جوڑ میں میرٹھ کے پہلوان نے ہاتھ ملاتے ہی اپنے مخالف کو پچھاڑ دیا، اس کے بعد ایک اور جوڑ اکھاڑے میں اُترا، مگر وہ میل کی کُشتی تھی، میں تو پھر اپنے گھر چلا آیا۔

—— بدرپور کی پینٹھ میں ہمارے تایا کی ہمیانی کٹ گئی، سو سے کچھ اوپر روپے تھے اُس میں! پوری فصل کی کمائی گٹھ کٹا مار کر لے گیا، میلوں ٹھیلوں میں آدمی کو ہر دم چوکنا رہنا چاہیے، ذرا نگاہ چوکی اور مال دوسروں کا!

—— میرے پاس تو خدا کی قسم زہر کھانے کو پیسہ نہیں ہے، کل پرسوں دس روپیہ کا نوٹ بھُنایا تھا سو آج دوپہر ہوتے ہوتے ختم ہو گیا، روپیہ ہوتا تو کیا تمہاری جان سے پیارا تھا، دوستوں میں اپنا پرایا نہیں ہوتا پر اس مجبوری اور ان ہوتے کا کیا علاج!

—— (ایک خط) اس خط کے دیکھتے ہی چلے آؤ، روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں آن کر پیو، سب چھوٹے بڑے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں، ہو سکے تو دو تین پھول کے گلاس مول لیتے آنا تمہاری پائی پائی نبٹا دی جائے گی۔

—— وہ تقریر کیا کرتا ہے پھلجھڑیاں چھوڑتا ہے، کل رات اُس کے لطیفوں پر اہلِ جلسہ لوٹ لوٹ گئے اور پھر جو اُس نے پینترا بدلا ہے تو ہنسنے والوں کو رُلا دیا، سارا جلسہ اُس کی مُٹھی میں تھا، ایسے مقرر روز روز پیدا نہیں ہوتے، اُس کی آواز میں ایک خاص کھٹکا ہے، ابھی عمر ہی کیا ہے، اللہ نظرِ بد سے بچائے، پوری طرح مسیں بھی نہیں بھیگیں بڑے ہو کر نہ جانے کیا ہوگا، اللہ کی دین ہے اس میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے۔

---

[1] جوان پہلوان۔

الیاس عشقی جے پوری۔ ایم۔ اے

ہمارا ادب

رومانوی ادب، جدید ادب، ترقی پسند ادب، ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی، اور اس قسم کی آوازیں اردو ادب کے لئے زیادہ پرانی نہیں ہیں، یہ مطالبات، وقت کے تقاضوں سے زیادہ "فیشن پرستی" اور "تقلید" کے رہین منت ہیں۔

غلامی کی برکتوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز شے وہ طریق تعلیم ہے جس کے ذریعے سے ہماری نسلوں کو سو برس سے زیادہ مدت تک "قدیم مجسمہ" بننے کی توفیق عطا کی جاتی رہی ہے۔ بقول علامہ اقبال" کے یہ "منشک آمیز افیون" اپنے اثر میں بے پناہ ثابت ہوئی۔ سب سے بڑی کامیابی اس طریق تعلیم کی یہ تھی کہ اس نے قوموں کے قلب و دماغ میں مدت تک احساس غلامی ہی پیدا نہ ہونے دیا۔

اب ہمیں آزادی مل چکی ہے، مگر ابھی صرف ہمارے جسم آزاد ہوئے ہیں، دور غلامی کی تعلیم کے نقوش ہمارے دماغوں سے رفتہ رفتہ مٹیں گے ذہنی انتشار البتہ ابھی باقی ہے، ماضی کے دھندلکے ابھی تک ہماری فکر و نظر کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔

ہمارا موجودہ ادب جہاں تک بیرونی اثرات کا تعلق ہے ابھی تک ایک جبری دور ہی سے گزر رہا تھا کہ ایک حقیقی انقلاب رونما ہوا۔ ایک ایسا انقلاب جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی، جس نے سیاسیات کا تار و پود بکھیر دیا، جس نے قومیت اور اجتماعیت کے شیرازے کو منتشر اور معاشی اور معاشرتی نظام کے تانے بانے ایک ہی جھٹکے میں مکڑی کے جالے کی طرح ختم کر دیئے، اور جس طرح انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے بعد اس کے اثرات سے ان ممالک کے ادب میں بھی ایک انقلاب آیا اور آزادی کا احساس جو وہاں کے شعراء اور ادباء میں بیدار ہوا وہ ادبیات انقلاب کی روح رواں بن گیا، وہ اپنے ساتھ زندگی کی نئی قدریں، انسانیت کے نئے رجحانات، فکر کے لئے نئی وسعتیں، مطمع نظر کے نئے زاویئے، تصور و تخیل کے لئے آزاد اور رنگین فضائیں، لایا، اور ان نئے تقاضوں نے ادب میں زندگی کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا، ہمارے ادب میں بھی کچھ انقلابی اثرات ظاہر ہونے چاہئیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس انقلاب عظیم کا اثر اس برصغیر کے شعراء اور ادباء کے دل میں کس قسم کے احساسات کو بیدار کرتا ہے اگر ہمارے ملک کے باشندوں کے شعور نے انقلاب کی اس آنچ کو برداشت کر لیا تو وہ کندن ہو جائے گا، اور اگر وہ موم کی طرح تحلیل ہو گیا تو اندیشہ ہے کہ اس پر پھر ایک جمود کی کیفیت طاری ہو جائے، جس میں حالات کا رخ تو ہرگز ہی ہے کہ عوام کو یہ انقلاب ساز گار ہو گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر متحدہ ہندوستان میں کچھ اس زمانے کے حالات کے مطابق اور کچھ "فیشن" کے موافق اپنے افکار کو مختلف قسم کے سانچوں میں ڈھال رہے تھے جن میں سے بیشتر آدھی نیم مغربی اور نیم مشرقی ذہنیت، اوکھی نظر اور نرالے تصور کی طرح آدھے پرند اور آدھے چوپائے کی مثال تھے، حالات حاضرہ سے کسی قسم کے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ادبیات کی ایک نئی دنیا تعمیر ہو گی۔ ان حالات میں ہمارے ادباء اور شعراء پر جو اپنے اس نئے جہان کے معمار ہوں گے بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ انہیں اس بات کا احساس کرنا ہے کہ بنیاد کی پہلی اینٹ اگر ٹھیک نہ رکھی گئی تو "تا ثریا میرود دیوار کج" کے نتیجے سے ہمارا ادب بچ نہیں سکتا۔

جدید ادب میں وہ سب کچھ داخل ہے جو پہلے انقلاب (غدر ۱۸۵۷ء) کے بعد ظہور پذیر ہوا اور اگر غور سے دیکھا جائے تو حالی اور آزاد کی بنیادوں پر جس قسم کی عمارت تعمیر ہونی چاہئے تھی، جو دوسرے انقلاب سے پہلے پہلے اقبال اور ان کے بعض معاصرین کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اور جسے اب حصولِ آزادی کے بعد ہمیں اپنی نئی زندگی کے جدید مطالبات ورجحانات کے قابل بنانا ہے۔

ہمارا "رومانوی ادب" جس کے اعلےٰ نمونے اردو میں قدیم زمانہ ہی سے ملتے ہیں بہت وسیع ہے۔ لیکن جس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے یہ الفاظ برتے جاتے ہیں، ہمارے شعراء کے ذہن اس سے ہر زمانہ میں خالی رہتے ہیں اور باوجود انتہائی کوشش کے ہمارے جدید شعراء بھی اس قسم کے ادب میں وہ صداقت اور دلکشی پیدا نہیں کر سکے جو وہ چاہتے تھے کہ پیدا کریں۔ یہی مابہ الامتیاز ہے مغربی اور مشرقی رومانوی ادب میں!

اب رہا ادب اور زندگی کا سوال تو زندگی کو ادب سے اور ادب کو زندگی سے کسی صورت میں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ زندگی سے گریز وفرار ناممکن ہے۔ قدیم ادب میں جسے طنزاً "ادب برائے ادب" کہا جاتا ہے زندگی کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ترجمانی کی گئی ہے، جس کا جواب "ادب برائے زندگی" کے دعویدار اور ہر قدیم خصوصیت کو رجعت پسندی سے تعبیر کرنے والے آج بھی نہیں دے سکتے، اب یہ دوسری بات ہے کہ آجکل کے ادیب و شاعر ادب و زندگی کی ہم آہنگی کے بعد شاعری کو بعض خاص طبقوں اور چند مخصوص تقاضوں کی ترجمانی تک ہی محدود سمجھتے ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ رومانوی ادیب و شاعر ادب اور زندگی کے افادی پہلو کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے ادبیت اور شعریت ان کا امتیاز ہے۔ رومانیت کے دلدادہ حسین حقائق کی ترجمانی کے لئے زندگی کے ایسے غیر شعری اصول اور رجحانات کی پابندی نہیں کرتے جن سے وہ حقیقی ادب کو بالاتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری آرٹ ہے وہ حسین حقائق کا اظہار بھی لطیف پیرایۂ بیان کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں اور یہی ان کے آرٹ کی تکمیل ہے۔ چونکہ آرٹ خود اپنے اصول رکھتا ہے وہ عام زندگی کی سطحیت سے قریب آنے کے لئے آرٹ کی انتہائی بلندیوں سے اترنا نہیں چاہتے۔

"ترقی پسند ادب" نے اس فراریت کے خلاف احتجاج بلند بغاوت کی اور اسے فرسودگی سے تعبیر کیا انہیں قدیم ادب اور زندگی میں ہم آہنگی نظر نہیں آتی اور وہ کوشاں رہے کہ ادب اور زندگی میں کوئی واضح ربط پیدا کریں۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی کی وہی حقیقتیں جو تلخ کثیف اور غیر شاعرانہ ہیں ایک زندہ ادب کی اساس بن سکتی ہیں۔ ادب کا مقصد تنقید حیات ہے اور حقیقی ادب اپنے عہد کا مکمل ترجمان ہوتا ہے۔ ادب سوسائٹی کے منہ سے بولتی ہوئی تصویر ہے، وہ رازہائے زندگی کی ایک سلجھی ہوئی تفسیر اور خواب حاضر کی ایک ایسی تعبیر ہے جو مستقبل تک اثر انداز ہوتی ہے عہد حاضر کے ادیبوں میں سے بیشتر یہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ اگر ان کو یہ دھڑکنیں محسوس نہیں ہوتیں تو وہ اپنی یہ آرزو پوری کرنے کے لئے چاہتے ہیں کہ اسے اختلاجِ قلب میں مبتلا دیکھیں۔ وہ اہلِ ادب جو محض تخیل کی جنت الحمقاء میں حقائق زیست سے بے نیازی پر اپنے ادب کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے ہیں درحقیقت زندگی کے ہر مقصد سے دیدہ ودانستہ چشم پوشی کرتے رہے، اور اس کی حیثیت سوسائٹی کے لئے ایک "ہائی عیاشی" سے زیادہ نہیں۔

ترقی پسندوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے رومانیت پرستوں کو ایک فردوسِ ابلہان سے نکال کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کرایا اور گریز اور فرار سے باز رکھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان کے بلند پرواز اور گریز پا تخیل کو پروین و ثریا کی لاجوردی رفعتوں اور شفق کی رنگین فضاؤں سے گھسیٹ کر کارخانوں کے دم گھونٹنے والے دھوئیں، اسپتال کی غیر صحت مند آب وہوا اور خون پیپ کے کثیف اور گندے ماحول میں لے آیا ـــــ یہی ترقی پسند ادب کا سب سے نمایاں کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند ادیب و شاعر اپنے آپ کو سماج سے علیحدہ نہیں سمجھتے بلکہ وہی تجربات جو سماجی زندگی سے حاصل کرتے ہیں ایک موثر انداز میں اسی کی اصلاح کے لئے لوٹا دیتے ہیں وہ زندگی کی ہر ٹھوکر سے سبق لیتے ہیں اور دوسروں کو اس قسم کی ٹھوکروں سے بچانا چاہتے وہ ادبیات ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ زندگی کی کشمکش میں عوام کے ساتھ

شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کو سوسائٹی کے مفاد کے تابع سمجھتے اور ہمیشہ اسی اصول پر قناعت کے ساتھ کاربند رہتے ہیں۔

مگر ترقی پسند ادب خاص کر شاعری اور افسانہ نگاری کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ ادب میں افادیت کا پہلو ان کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس پر وہ ہر چیز کو قربان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بالآخر اس ناقابلِ تردید حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ادب کو ان کی اس خشک حقیقت نگاری اور بے معنی افادیت سے ایک شدید اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے قدیم ادب نے زندگی کے جس تقدس کو اپنے آرٹ کی صورت میں ظاہر کیا تھا ترقی پسندوں نے اسی کو کشمکش تخریب و تعمیر میں اس طرح گرفتار کر دیا کہ وہ آہوں اور آنسوؤں کی نذر ہو گیا اور اس پر طرّہ یہ کہ وہ تخریب اور تعمیر کے فرق کو بھی محسوس نہ کر سکے۔ اگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کوئی مقدس دیوی نہیں ہے جس کی پرستش کی جائے تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کھلونا بھی نہیں جس سے ترقی پسند کھیلتے رہے ہیں وہ رومان میں زندگی تلاش کریں یا زندگی میں رومان اور ادب اور زندگی کا ربط کسی حد تک ملحوظ کیوں نہ رکھیں بہرکیف ادب کو ادب کی تعریف میں ضرور آنا چاہئے۔

اس خیال سے جب ہم ترقی پسند ادب کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے اس قسم کے ادب کا ایک معتدبہ حصہ مسائلِ حاضرہ اور تشخصی اُلجھنوں کی ایک بے کیف اور غیر مسلسل روداد سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہر ادیب و شاعر کے نزدیک حقیقت نگاری کا انتہائی مقصد یہی ہے کہ بعض بے کیف اور بے ربط واقعات کو کسی نہ کسی طرح قلم بند کر دیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری یہ جدید ترین ادبی کاوشیں روحِ ادب و شعر سے محروم نظر آتی ہیں۔ بلکہ ان میں اس کا وجود چقماق سے پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ ہمیں بالآخر یہی سمجھنا پڑے گا کہ ہمارے ادیب و شاعر اخبار کے نامہ نگاروں سے زیادہ کچھ نہیں جن کا کام صرف تالیف واقعات یعنی "حقیقت نگاری" ہے۔ ایسی صورت میں صحافت اور ادب میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ ادب کا صحافت میں تبدیل ہو جانا اس کا عروج ہے یا زوال اس کا فیصلہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

درحقیقت آرٹ کا حسن شدت و نزاکتِ احساس اور تخیل کی بلند پروازی پر ہی موقوف ہے۔ اور فن فنکار کے تصوّر و احساس کا ہی ترجمان ہے جہاں تخیّل دھندلا پڑا فن کے نقوش مدھم ہونے لگے۔ اور جہاں شدتِ احساس کی کارفرمائی میں فرق آیا اس کے اثر میں بھی کمی محسوس ہونے لگے گی اس کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ روزانہ کے معمولی واقعات تو اس قسم کی حقیقت نگاری کے ذریعہ پیش کرنے میں جو اس کے مدعیوں کا مقصود ہے احساس و تخیل کی سحرکاریوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ادب میں آرٹ بالکل مفقود ہے یا اس کی یہ جہت بہت کمزور ہے، ادبیات میں اس قسم کی تحریکات آرٹ کے زوال کا پیش خیمہ ہیں۔ ترقی پسند ادب میں سطحی جذباتیت اور بے رنگ حقیقت نگاری کے کاندھوں پر شعر و ادب کا جنازہ نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جس قسم کا ادب پچھلے چار پانچ برس میں پیدا ہو کر فیشن پرستوں اور نیم سیاسی اثر کے حلقوں میں مقبول ہوا اسے سیاسی پروپیگنڈے سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ادب کی چاشنی سے سیاسی پروپیگنڈے کی تلخیوں کی قلبِ ماہیت کیسے ہو سکتی ہے البتہ اس کا معیار ادب کے لئے ساقط الاعتبار ہو جاتا ہے اور جس طرح اخبار کا سنسنی خیز مقالہ افتتاحیہ صرف ہنگامی اثر اور اہمیت رکھتا ہے اور دوسرے دن اس کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح اس نام نہاد ادب کی ہنگامہ آرائی وقتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جرائد و رسائل حشرات الارض کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور دس پانچ برس سے زیادہ عمر رکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں حقیقی اور اعلیٰ ادب زندۂ جاوید ہوتا ہے۔ لیکن اس ادب میں جسے ہم ترقی پسند کہتے ہیں، (جس کی خصوصیات پر ہم نازاں ہیں) بقا کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ادبِ عالیہ کی سب سے بڑی کسوٹی اس کی بقا ہے۔ ادب کی بقا کا دارومدار ہے موضوعات کی حقیقی اور مستقل دلچسپی پر اور اس کی حقیقت کے عالمگیر اثر اور اطلاق پر! ادب انسانیت کی خود نوشت سوانح عمری ہے اس میں ہر زمانے کے انسان کے حقیقی احساسات اور تأثرات اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلےٰ درجہ کے ادب میں چاہے وہ کسی قدر پرانا ہو فرسودگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ملٹن کی "بہشتِ گمشدہ" شکسپیئر کے ڈرامے، فردوسی کا شاہنامہ اور ہومر اور ورجل کے کارنامے آج تک

عالمِ ادب میں مقبول ہیں وہی ملٹن جس کی "فردوسِ گم شدہ" کو اتنا بلند مقام حاصل ہے کتنے لوگ جانتے ہیں کہ اس نے اپنے سیاسی رسائل کی تصنیف میں اپنی نظموں سے زیادہ محنت، وقت اور دماغی صلاحیتیں صرف کی ہیں اور کس قدر شاعرانہ قوت اور بصارت ضائع کی ہے!

عریاں ادب

جو چیز ترقی پسند ادب اور ادبِ صالح (یا غیر ترقی پسند اور رجعت پسند ادب جیسا کہ مدعیانِ ترقی کہتے ہیں) میں مابہ الامتیاز ہے وہ اول الذکر کا ذوقِ عریانی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر سے موجودہ زندگی اور ادب عریانی کی سمت جا رہے ہیں اسی عریانی کی ایک جہت کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

جنسی رسائل ہوں یا تصاویر کے مرقعے، مجسمے ہوں یا افسانے سراپا عریانی ہیں — عریانی ہی کا نام آرٹ ہے! — عریانیٔ اجسام، عریانیٔ تصویر، عریانیٔ گفتار، عریانیٔ خیال — یہی تو ہے ترقی پسند ادب کی کائنات؟ — اور غالباً اس کی غایت بھی؟!

تہذیبِ حاضر کا معجزہ اس سے بڑھ کر اور کیا کہ آرٹ کا رنگین طلسم ٹوٹ گیا شفق اور قوسِ قزح کی باصرہ نواز رنگینیاں (جن کا حسن یہی ہے کہ رنگوں کی وضاحت کے باوجود ان کے درمیان حدِ فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی) متعفن اخراجات میں تحلیل کر دی گئیں۔ افلاطون کے لطیف اور شریف جذبۂ محبت کی فلسفیانہ حقیقت کو فرائڈ کی گندی ذہنی جنسی نفسیات میں تبدیل کر دیا گیا۔ ترقی پسند ادیب کا دماغ لطافت سے اس قدر دور ہو گیا کہ اس کی نظر تالاب میں کھلے ہوئے خوبصورت اور جاذبِ توجہ کنول کے پھول سے سرسری طور پر گذر جائے گی اور فوراً اس کیچڑ یا دلدل میں جا پھنسے گی جس میں اس کی جڑیں لتھڑی ہوتی ہیں۔ وہ رنگ و بو سے خس و خاشاک اور پھولوں سے زیادہ کانٹوں کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ ادبِ قدیم میں ماہتاب کے گرد شاعرانہ خیالات نے ایک طلسمی حلقہ بنا دیا تھا ہمارے ادبا اور شعراء نے اسے منتشر کر دیا۔ اور اس کی روشن اور رومانی فضا کو غلاظت اور نجاست سے بھر دیا' خیال کی شوخی اور فکر کی رعنائی جاتی رہی، انداز بیان میں کرختگی آ گئی اور "ترقی و انقلاب" کے ان علمبرداروں نے فضائے شعر و ادب کو زہریلے اخراجات سے معمور کر دیا۔ کیونکہ یہی حقیقت پرستی ہے۔ اور اسی کی بنا پر صحیح المذاق ناقدین اسے "ادبِ کثیف"، یگانہ چنگیزی "ادبِ خبیث" اور ہمارے ایک کرم فرما "ادبِ جدود" کہتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا تجزیہ کرنے کے عادی ہیں وہ کسی حسین کا سراپا لکھنے سے زیادہ اس کے پوسٹ مارٹم میں دلچسپی لیتے ہیں، بقول اوسکر وائلڈ کے موجودہ زندگی کے نیم عریاں جسم پر کچھ چیتھڑے لٹک رہے تھے، موپاساں جیسے شوخ اور گستاخ حقیقت نگاروں کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں بھی نوچ کر پھینک دیا۔ یہ ہیں حقیقت نگار اور اس طرح دیکھتے ہیں وہ زندگی کو اپنے اصلی روپ میں حقیقی ادیب و شاعر کی نظر تمام پردوں سے گذر کر خارجی اور داخلی حقیقتوں تک پہنچ جاتی ہے لیکن یہ نام نہاد حقیقت نگار شاید زندگی کو ایسی ہی عینک سے دیکھتے ہیں جس کے اثر سے ہر شے عریاں اور بدنما نظر آتی ہے — بقول شخصے ان کا ادب زندگی کے بیمار مجروح اور جسم پر جونک کی طرح پل رہا ہے ترقی پسندوں کا قول ہے کہ زندگی کی تلخ اور گھناؤنی عریانیوں سے روگردانی بالکل ایسی ہے جیسے کوئی حبشی آئینہ سے اپنا منہ پھیر لے۔

لیکن درحقیقت عریاں پسندی اور عریاں نگاری نتیجہ ہے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی بڑھتی ہوئی نفسانی دلچسپی کا جسے وہ زندگی کے نفسیاتی رجحان سے تعبیر کر کے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نفسیاتی تجزیہ اب ادب میں ایک امتیازی مقام حاصل کر چکا ہے نظم، ناول، افسانہ جہاں دیکھیے اس تجزیہ کے اچھے اور برے سبھی قسم کے نمونے ملیں گے ان کی جزئیات نگاری تفصیل، باریکیوں بلکہ موشگافیوں تک پہنچ جاتی ہے ایسے مقامات پر بلاشبہ مصنف کی وسیع معلومات، درمشاہدۂ فطرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے مگر کیا ادب تحلیل نفسی تک ہی محدود ہے؟ اس قسم کی طرزِ نگارش سے ادب میں ایک بے کیف ثقالت کو جو موضوع میں دلچسپی نہ پیدا کر سکے ایسے نقائص پیدا کرتی ہے جسے مذاقِ سلیم ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ نفسیات اور ادبیات کے درمیان جو حدِ فاصل ہے وہ دونوں کے حدود اور اثرات کو ممیز کرتی ہے، اور یہ اسی کا تقاضہ ہے کہ ادب کو ادب ہونے کی وجہ سے نفسیات سے ممتاز رہنا چاہیے اور اسی ادبیات کے معیار کا تقاضہ ہے کہ ادب کو نفسیات کے اس بے جا غلبہ سے پاک اور اپنے دائرہ

ہیں آزاد رہنا چاہیے!

ترقی پسند ادب خاص طور پر غیر دلچسپ اور غیر موثر انفرادیت اور بے جا انانیت کا علمبردار ہے۔ اس قسم کے ادیبوں کا مقصد متداول اقوال اور مروجہ اعتقادات کے خلاف چاہے وہ کسی قدر محسوس و دلائل ہوں ذاتی و انفرادی رجحانات اور نظریات کا بے باکانہ اظہار ہے خواہ وہ کتنے ہی پست بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہوں۔ ترقی پسند ادیب و شاعر بلا مبالغہ کنوئیں کا مینڈک ہے جو اپنا "خام مواد" ذاتی واردات اور قلبی تاثرات ہی میں تلاش کرسکتا ہے اور جب وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اجتماعیات میں داخل ہوتا ہے تو اس شتر بے مہار کی مثال ہے جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں کھڑا ہو کر اپنی بلند قامتی پر فخر کرے۔ ادبا اور شعراء کے درمیان وہ ایک زاغ کوہستانی ہے جو مور کے پر لگا کر موروں کے جھنڈ میں شامل ہو جاتے اور مطمئن بھی ہو کہ کوئی اس کے فریب میں آجائے گا۔ ترقی پسند فن کار ذاتی مشاہدہ کو ادبی روایتوں پر ترجیح دے کر حاصل فن کے مستقل وجود سے منکر ہو جاتے ہیں معنوی اور صوری دونوں جہتوں میں اس ادب کا یہی حال ہے اگر ہر قید اور پابندی سے آزادی اور بغاوت کا نام ترقی ہے تو آج تک انسانوں کا یہ سب کیا دھرا بے سود ہے تو نین سلطنت اور آداب تہذیب و اخلاق سب کچھ لغو ہیں۔ البتہ نئی دو دوسروں سے مختلف انداز میں کوئی بات کہنے کی کوشش میں بعض عمدہ پیرایہ ہائے بیان چند اچھوتی تشبیہات اور نادر استعارات تک ان کی رسائی کبھی کبھی ہو جاتی ہے اور ان کا اگر کوئی انفرادی ڈھنگ جھلکتا ہے تو بس انہیں بعض ایسے ہی مقامات پر الفاظ کے بے رنگ آئینوں میں سے مصنف کی شخصیت نظر آجاتی ہے مگر وہ بھی حقیقت سے دور۔ کبھی اصل کے مقابلہ میں وہ چند زیادہ کبھی کم!

جن ٹیکنیک کے نئے نئے تجربے وہ کر رہے ہیں ان میں اپنی جگہ ایک انتشار ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے آرٹ کا کوئی واضح مطمح نظر اور ان کی کوششوں میں مرکزیت نہیں ہے۔ اب جہاں ہر شخص باغی اور مجتہد ہو وہاں "مرکزیت" کی تلاش تحصیلِ حاصل ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اس ٹیکنیک نے بہت سے ادبی اکتشافات کئے ہیں تازہ افکار اور نئے اسالیب سے انہیں آشنا کیا ہے۔ ترقی پسند ادب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ادب میں جدت طرازی اور جسارت اسی کی معرفت داخل ہوئی ہے۔ لیکن خود ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دعووں کی تہ میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ ترقی پسند ادب متحدہ اجتماعی نہیں بلکہ پراگندہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے حالانکہ کوشش اس کے خلاف کی گئی تھی! ادب کا انتقادی شعبہ اور طنزیہ پہلو کافی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ یہی ترقی پسندی کی سب سے روشن جہت ہے لیکن افسوس ہے کہ ترقی پسندی کے جراثیم کچھ انہیں میں سب سے کم نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی اجتماعی کوششوں میں مرکزیت نہیں ہے۔ تاہم ترقی پسندی کے بے ربط خیالات میں ظاہری ہمواری پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔

یکسانیِ تصور بظاہر کسی قدر اچھی چیز کیوں نہ ہو کورانہ تقلید نقالی سے آگے کی چیز نہیں ہے۔ پھر اس قسم کی یکسانی خیال ذہنی جمود ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نام نہاد ترقی پسند ادیب و شاعر زیادہ تر خارجیت میں ملتے جلتے ہیں اور داخلیت میں ایک دوسرے کے بالکل خلاف! ترقی پسندی کے حقیقی مفہوم کو تو شاید خود اعلیٰ درجہ کے ترقی پسند مصنفین اور شعراء بھی سمجھ اور سمجھا نہیں سکتے۔ اس باب میں کافی اختلاف ہے کہ آیا ہر ترقی پسند واقعی ترقی پسند بھی ہے یا نہیں؟

یہی وجہ ہے کہ خلوص، شدتِ احساس، تازگی اور اچھوتے پن سے جو ادب کے اجزائے ترکیبی کہے جا سکتے ہیں۔ ترقی پسند ادب بالکل تہی دامن ہے، اور اس میں خیالات کی وہ گوناگونی اور نظریوں کی وہ ہمہ گیری نہیں جو ایک تندرست اور صالح ادب کی ترقی اور بقا کی ضامن ہوا کرتی ہے اجتماعیت پر انفرادیت کی اسی فوقیت کی بنا پر جو سرمایہ و مزدور کے موضوع کے علاوہ عام طور پر نظر آتی ہے، ہمارے نام نہاد زعمائے ترقی پسند ادب جو اپنی دانست میں ادب کی اصلاح کر رہے ہیں۔ اپنی تخریبی سرگرمیوں ہی کو تعمیری پروگرام خیال کرتے ہیں۔ ترقی پسند لقین کی منزل سے کوسوں دور ہیں شک و شبہ ان کی فطرت ہے وہ زندگی کو بہکی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں عوام ان کی اس باغیانہ روش کو شدت سے

محسوس کر رہے ہیں، لیکن جب ہمارے ادیب خود اپنی منزل اور صحیح مقام سے واقف نہ ہوں تو عوام کا ذکر ہی کیا ہے۔ آرٹ اور زندگی کے ہر شعبہ میں بھی عجیب انقلاب آیا ہے کہ ہر اس چیز کے خلاف بغاوت کی جائے جو گذشتہ نظام حیات سے ذرا بھی تعلق رکھتی ہو۔ پرانی قدروں کے خلاف ایک عام شورش ہے اور فی زمانہ یہی ایک ادبی فیشن ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ امتداد زمانہ سے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی قدروں میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو گیا ہے، مگر اس قسم کی چھچھوری جذباتیت اور اوچھے سیاسی عزائم سے ادب کی روح لطیف کو صدمہ پہنچتا ہے۔ باغیانہ ادب قدیم ادب کے بلند اور رنگین قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا ہے لیکن کیا اسے مسمار کر کے یہ ایک مٹی کا گھروندا بھی بنا سکے گا۔ قدیم ادب کو اس کے نظر فریب دشت و جبل، سبزہ زار اور نخلستان سے محروم کر کے یہ ہمیں کیا دے گا، وہی بھوں اور کارخانوں کا دھواں، مزدوروں کی غلیظ جھونپڑیوں کا متعفن کیچڑ: اسے ابھی یہ کیچڑ اچھالنے ہی سے فرصت کہاں کہ وہ تعمیری کاموں میں مصروف ہو سکے۔ ترقی پسندوں کی تخریبی سرگرمیوں پر کسی طرح پردہ نہیں ڈالا جا سکتا اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ادب دنیا کے سامنے کوئی تعمیری نظام پیش نہیں کر سکا۔

وہ ادب جو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے پیدا ہوا جس کے اولین رہنما آزاد اور حالی تھے، اور جو اس وقت سے برابر ترقی کر رہا ہے جسے اپنے ارتقاء پر اعتماد ہونے کی وجہ سے ترقی کا دعویٰ نہیں وہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر تقاضے اور ہر اخلاقی سیاسی معاشی اور معاشرتی ضرورت کو پورا کرتا ہے، ہماری زندگی میں کیا ہے جس کی مکمل ترجمانی حالی، اکبر، اقبال، چکبست، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، میکش اکبرآبادی، روش صدیقی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، ماہر القادری اور حفیظ جالندھری وغیرہ کے کلام سے نہیں ہو جاتی ——— اور اس میں ترقی پسند ادب نے سوائے عریانی یا چند سیاسی نعروں کے کس چیز کا اضافہ کیا؟ نام نہاد ترقی پسند ادب میں کیا کچھ ہے جو اس سے بہتر طریقہ پر ہمارے ادب میں موجود نہیں۔ ترقی کے یہ نمائشی علمبردار باوجود کوشش کے ادب کو زندگی سے اتنا قریب نہیں لا سکے جتنا ہمارا صحیح اور صالح قسم کا ادب اس میں کامیابی حاصل کر چکا ہے ہمارا ادب زندگی کی تنقید اور ترجمانی میں دنیا کے کسی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔

اب ضرورت ہے کہ ہمارے بے راہرو ادیب اور شاعر ریگ زاروں میں شتر مرغ کی طرح اپنی گردن آسمان کی طرف بلند کر کے نخلستان کے خوابوں میں کھوئے نہ رہیں بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیں وہ کب تک پاکستان اور ہندوستان کی سرزمین پر رہ کر روس، امریکہ، فرانس اور انگلستان کے خواب دیکھتے رہیں گے اب وہ آزادی کے ماحول میں سانس لے رہے ہیں ان کے تنفس کو اب پہلے سے زیادہ صاف اور صحت مند ہونا چاہئے انہیں اپنی دنیا آپ تعمیر کرنی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ وہ اس کے زمین و آسمان دوسروں سے مستعار لیں۔ کیا جن لوگوں سے ہم اپنی حیات اور ادب کی تعمیر کیلئے ضروری اشیاء طلب کر رہے ہیں انہوں نے بھی ہماری طرح کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا تھا، اگر انہوں نے دوسروں سے کچھ اثرات قبول کئے تھے تو کس طرح ہمیں متمدن دنیا سے بھی سیکھنا چاہئے۔

اس وقت ہمیں خود اپنی ضرورت کو سمجھنا چاہئے ہمیں خود اپنی منزل کا تعین کرنا ہے، سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی ہر جہت میں، ادب زندگی سے کبھی الگ نہیں رہا کبھی الگ نہیں رہے گا حقیقی ادب کا زندگی سے علیحدہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے ادب کی منزل آخر کا تعین اب ہمارا فرض ہے ہمیں اپنی روایات اپنی معاشرت اپنی خصوصیت اور اپنے ادب کو ترقی دینا اور برقرار رکھنا ہے۔ اب ہمیں تقلید کا داغ اپنی پیشانی سے دھو ڈالنا پڑے گا۔ اسی میں ہماری زندگی ہماری فلاح اور ہمارے ادب کی بقا کا راز مضمر ہے۔

ہمارے ادب کیلئے یہی وہ نازک مقام ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر عہد کریں کہ وہ اجتماعیت میں فنا ہو کر شہد کی مکھی کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہیں جو باغ باغ سے پھولوں کا رس چوس کر اپنی انتہائی محنت کا حاصل چھتہ کی ملکہ کی نذر کر دیتی ہے یا مکڑی کی طرح زعم انفرادیت کے نشہ سے از خود رفتہ ہو کر اپنے گرد ایک لعاب دہن کا بے رنگ جال تان لینا ہی اپنا انتہائی کمال تصور کرتے ہیں جس میں وہ اصل اپنی نفسانیت اور بظاہر مفروضہ افادیت کے جال میں دوسروں کو الجھا سکیں یا بالآخر خود بھی اس میں الجھ کر رہ جائیں۔

ہماری سیاسی اور روحانی زندگی کی منزل مقصود متعین ہو چکی ہے، ہمارے ادب کو بھی اسی زندگی کا ترجمان اور ہم نوا ہونا چاہئے ادب اور زندگی

۵ مگر مجموعہ مراد اور امداد کے حکم میں آ کر جوش کی شاعری نسانی معاشرے کے لئے وبال بن گئی۔ م

مولانا عبد الماجد دریابادی

مجھ پہ کیا گزری؟

مُلک کے مشہور مزاحیہ نگار اور علیگڈھ کے استاد اردو رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے نے وسط ۱۹۴۶ء میں لکھا کہ اپنی زندگی کے تجربات کا خلاصہ ایک مقالہ کی شکل میں لکھ کر بھیج دو، دوسرے حضرات کے مقالوں کے ساتھ شائع کر دیا جائے گا۔ فرمائش کی تعمیل اسی وقت کر دی گئی تھی۔ پھر خدا معلوم کیا افتاد پڑی کہ وہ رسالہ تو شائع ہوا نہیں۔ اپنے اس مقالہ کی نقل پڑی ہوئی تھی۔ جی میں آیا کہ اس کو آپ[1] کے ناظرین تک پہنچا دیا جائے۔

(عبد الماجد).

رشید صاحب! آپ تو بڑے ظالم نکلے۔ میرا حال خود مجھی سے پوچھنے کی ٹھان لی! غالب کا شعر بھی آپ جیسے ادیب کو یاد نہ آیا۔

آتا ہے داغِ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ!

یہاں فردِ عمل میں بجز گنہ و حسرتِ گنہ کے اور ہے کیا؟ وہی داغِ حسرتِ دل کا شمار —— غالب کی سی مرقع شاعری میں نہیں، نثر عاری میں بیان واقعہ!

آپ فرماتے ہیں کہ زندگی کے نشیب و فراز کے نتائج لکھو۔ لیکن یہ بتایئے کہ جس غریب کی زندگی میں نشیب ہی نشیب ہو، وہ کیا کرے؟

انگریزی جنتری میں مارچ ۹۲ء تھا جب آنکھیں اس عالم آب و گِل میں کھلیں، اب ۱۹۴۶ء ہے۔ عمر کی ۵۴ منزلیں آناً فاناً بے تحاشا تیزی، برق رفتاری کے ساتھ طے ہو گئیں۔ عزیزوں، بزرگوں، دوستوں، ساتھیوں میں سے خدا جانے کتنوں نے ساتھ چھوڑ دیا، سبقت کر گئے اور دل پر نہ مٹنے والے داغ چھوڑ چھوڑ گئے۔ اپنی باری دیکھئے کب آ جائے۔

پیدائش خاصے خوشحال گھرانے میں ہوئی۔ چار پانسو ماہوار کی آمدنی آج سے ۵۰ سال قبل آج کے ۲ ½ ہزار کے برابر تھی۔ داتی کھلائی، نوکر چاکر، گھوڑا گاڑی، گاتے بھینس، مولوی اور ماسٹر، غرض سارے سامان رئیسانہ نہیں تو نیم رئیسانہ زندگی کے فراہم، مذہب اور دینداری کی دولت بھی گھر بیٹھے ملی۔ ماں تہجد گزار و شب بیدار، باپ حاکم عدالت ہونے کے باوجود حاجی و نمازی۔

[1] فاران۔

قرآن مجید ناظرہ کے ساتھ درس آمد نامہ، گلزار دبستاں، گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، یوسف زلیخا، اور کیمیائے سعادت کے جاری رہے۔ اور کچھ شُدبُد عربی بھی، کہ یہی اس وقت کے مسلمان شرفاء کی گھریلو تعلیم کا نصاب تھا ـــــ اللہ اکبر! اسے آج کے نصاب سے ملایا جائے! ـــــ اُردو کے ذوق صحیح کی بنیادیں قائم کر دینے کے لئے خدا بخشے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کی پانچ ریڈریں بالکل کافی تھیں۔ زبان صحیح و شستہ مضمون ایسے کہ ایک طرف اپنے مذہب سے محبت اور واقفیت دونوں بڑھیں اور دوسری طرف ہم وطن ہندو بزرگوں کی بھی محبت و وقعت دل میں رہے۔

عمر کا نواں سال تھا کہ داخلہ اسکول میں ہو گیا اور سولھواں سال تھا کہ ہائی اسکول (اُس وقت کے میٹرکولیشن) کی منزل پار ہو گئی۔ اسکول میں نہ پوچھئے کہ کیا دیکھا، کیا پایا۔ لڑکوں کی زبان سے بے تکلف وہ کلمے اور فقرے شروع ہی سے سننے میں آنے لگے جن کی بھنک تک کبھی گھر کی فضا میں کانوں میں نہیں پڑی تھی۔ ہر قسم کا فحش اور بھکڑ، جس کے لئے صحیح اصطلاح بجز "گندی گالیوں" کے اور کچھ نہیں۔ بعض ماسٹر تک اس رنگ میں آلودہ۔ یہ اسکولی زندگی کا "مذاق" تھا ـــــ یہ ہندوستان کی نئی نسل تیار ہو رہی تھی، آج سے ۴۰ - ۵۰ سال قبل۔ اور آج کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں!

بزرگوں کی دعا و توجہ کہئے یا خانگی ماحول کا اثر یا اور کچھ بہر حال اپنا مذاق طبیعت عام روش کے خلاف پڑھنے ہی لکھنے کی طرف زیادہ رہا۔ پڑھائی کا شوق اتنا غالب کہ الماریوں میں چُنی ہوئی ضخیم اور ثقیل کتابوں سے لے کر ردی میں پڑے ہوئے اشتہارات و اخبارات تک جو چیز بھی چھپی ہوئی سامنے آگئی بچ کر نہ جانے پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دماغ نے کم عمری ہی میں بہت کچھ سیکھ لیا، بہت کچھ جان لیا۔ اُستادوں کی مدد سے کم، کتابی نقوش کے ذریعہ زیادہ، عربی کا مضمون اس وقت نیا نیا اسکولوں میں داخل ہوا تھا۔ پہلے ایک شیعہ لکھنوی اُستاد اور پھر ایک سُنّی فرنگی محلی اُستاد کے حسن توجہ و شفقت نے عربی کی چاٹ لگا دی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں استعداد خاصی بڑھا دی۔ انگریزی کا چسکا بھی شروع ہی سے پڑ گیا تھا ـــ۔ اُردو میں پہلا مضمون عمر کے بارھویں سال ۱۹۰۴ء میں لکھا۔ اُس وقت کے مشہور روزنامہ اودھ اخبار (لکھنؤ) میں کسی فرضی نام سے شائع ہوا۔ تصنیف و تالیف کی داغ بیل بھی اسی سن سے پڑ گئی۔ اِدھر اُدھر کی کتابوں سے اقتباسات جمع کرنا اور کچھ گھٹا بڑھا کر انہیں اپنے نام سے یکجا کرنا۔

اسکول ہی کے زمانہ میں (عمر کا کوئی چودھواں سال ہوگا) شہر میں ایک تھیٹر کی کمپنی (سینما اس وقت کہاں تھے) کہیں سے بہتی بہاتی آگئی تھی۔ ہفتوں بلکہ مہینوں رہی۔ اسے خوب دیکھا بھالا۔ ایکٹروں سے دلچسپی پوری اور اپنے شوق سے لی۔ ایکٹرسوں سے بھی دلچسپی لی، مگر کچھ یوں ہی سی اور وہ بھی محض دوسروں کی دیکھا دیکھی۔ اتفاق سے اس وقت ایک ڈراما اپنے اسکول میں ہوا۔ اس میں نمایاں پارٹ ادا کرنے کو ملا۔ دوبارہ پھر اسکول میں تقسیم انعامات کے سلسلہ میں ایک ڈراما ہوا، اس میں بھی ایکٹ کیا۔ جلسہ کی صدارت انگریز ڈپٹی کمشنر نے کی اور شہر کے سب ہی معززین جمع تھے۔ اپنی ایکٹنگ کی خاصی داد ملی ـــــ یہ تھی سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کی فضا آج سے ۴۰ سال قبل بھی اور غافل و بے خبر مسلمان کو ذرہ برابر بھی اس کا احساس نہ تھا کہ اس کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کے آئین معاشرت کی پامالی کس طرح قدم قدم پر ہو رہی ہے۔

۱۹۰۸ء میں کالج میں قدم رکھا تو یہاں معاً سابقہ پھر کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی سے پڑا، عین اُستادانِ کالج کی سرپرستی میں قائم! میوزک کالج تو اب بنا ہے، بنیادیں اسی وقت کی پڑی ہوئی ہیں۔ کورس میں شکسپیر کے دو ڈرامے تھے۔ کالج میں نقش خوب خوب بٹھایا گیا اور خوب دل پر بیٹھا کہ ناٹک نویسی عیب نہیں ہنر ہے اور ایکٹری شرم کی نہیں فخر و عزت کی چیز ہے ـــــ کہاں وہ پُرانی وہ پرانی تعلیم کہ بھانڈ اور نقال حقیر ہے، ذلیل ہے، روپ بھرنا بازاریت ہے اور سوانگ رچنا ابتذال۔ اور کہاں یہ جدید ماحول کہ جارج ہنری لوئیس ادیب

وفلسفی ہوکر بیڈنگ کا ماہر تھا اور ہنری ارونگ نے ایکٹری ہی کے زور سے "نائٹ ہڈ" (سر کا خطاب) حاصل کیا! تحقیر و ضحکہ کے قابل تو صرف فسانۂ عجائب و بوستان خیال تھے نہ کہ اسٹیونس اور جارج ایلیٹ، ڈکنس اور جین آسٹن کے ناول جو کورس کی زینت تھے اور جن کی شرح وتفسیر، نقد و تبصرہ بڑے بڑے فاضلوں کے لئے باعث فخر تھا۔

کالج سے نکلے ہی تھے کہ مشہور رقاصہ مس ماڈ ایلن کی آمد کی دھوم مچی اور معاً ہندوستان کا انگریزی پریس اس شور سے گونجنے لگا کہ کالے کلوٹے، نیم مہذب ہندوستانیوں کے دیس میں Tango Dance (جنوبی امریکہ کا نیم برہنہ بلکہ تقریباً برہنہ ناچ) بے پردہ ہوکر ناچنا انہیں تہذیب فرنگ پر ہنسانا اور مغربی تہذیب کی بدنامی کرانا ہے۔ پائنیر اس وقت کا زبردست انگریزی ترجمان، بہت کچھ گرجا چمکا چلایا، لیکن تاجر قوم میں تجارت سیاست پر غالب رہی۔ مس صاحبہ لکھنؤ بڑے ٹھسے سے تشریف لائیں۔ جسم پر لباس شاید زری کے تاروں کا تھا، ساتر نہیں صرف نیم ساتر۔ رقص کی نہایت تیز گردش کے وقت وہ تار بھی سب ہوا میں اڑ اڑ کر ناچنے لگتے، اور جسم وہ ایک منٹ کے لئے یکسر مادر زاد رہ جاتا۔ گو رقاصہ کے فن کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ گردش کی حیرت انگیز تیزی کے باعث نظر سرے سے جمنے ہی نہ پاتی۔ ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، حالانکہ ٹکٹ اچھا خاصہ گراں تھا۔ مجمع میں لکھنؤ کے معززین، شرفاء سفید ریش ہی تھے یہ خان بہادر، وہ رائے بہادر، فلاں بیرسٹر، فلاں تعلقدار اور انہیں میں یہ کالج سے نکلا ہوا طالب علم بھی، جس نے لکھنؤ میں طالب علمی کی اتنی مدت گزار کر ایک بار بھی اپنے ہاں کے مشرقی ناچ رنگ کی محفل میں قدم نہیں رکھا تھا، بلکہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں کیا تھا ——— وہی تہذیب مغرب کی ساحری۔ اپنے ہاں کا ہر صغیرہ بھی کبیرہ۔ اور "صاحب" کے ہاں کا بڑا سا بڑا عیب بھی ہنر! اپنے ہاں کے ناچ مجرے میں جانا بد تہذیبی تھی، اس میں اپنی سبکی تھی اس "ٹنگو ڈانس" کے جلسہ میں جانے میں کیا عیب تھا، یہ عین آرٹ نوازی اور آرٹ کی سرپرستی تھی!

قدرت کا کھیل کہ چند ہی روز کے بعد اردو کے مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری اپنی تھیٹریکل کمپنی لے کر لکھنؤ آئے۔ آغا صاحب ادیب اور شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ ان سے خوب پینگ بڑھے اور تھیٹر دیکھنا تو چند ہفتوں کے لئے گویا معمولات میں داخل ہو گیا۔ مذہبی روک عمر کے اس ملحدانہ دور میں سرے سے کچھ تھی نہیں۔ بمبئی اور شملہ بھی جانا ہوا۔ بمبئی میں ہندوستانی اسٹیج کی خوب سیر رہی، اور شملہ میں ایک آدھ بار انگریزی ناٹک بھی دیکھے۔ انگریزی اخبارات میں ڈراموں پر مضمون بطور خاص کے لکھے اور اردو میں خود بھی ایک ڈرامہ گویا قلم برداشتہ لکھ ڈالا اور ایک فرضی نام سے چھپا۔ ——— یہ سب چیزیں مایۂ فخر و موجب افتخار ہی نظر آتی رہیں۔

زندگی کا ایک پہلو یہ تھا۔ دوسرا رخ یہ رہا کہ کتب بینی کی وسعت نے بچپن ہی میں مضمون نگار اور لڑکپن ہی میں مصنف بنا دیا۔ پہلی دو کتابیں ضخامت میں تو چھوٹی لیکن بہرحال سنجیدہ تاریخی اور علمی بحثوں پر "محمود غزنوی" اور "غذائے انسانی" کے نام سے جب وکیل ایجنسی امرتسر نے شائع کی تھیں تو عمر ۱۵، ۱۶ سال سے زائد نہ تھی۔ مولانا شبلی کے فیض صحبت نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ ۱۹۱۰ء سے قیام لکھنؤ میں مستقل رہنے لگا تھا۔ اُس وقت سے اکثر شامیں مولانا کے یہاں گزرنے لگیں۔ تعارف اس کے قبل ہی ہو چکا تھا۔ وقت کے مشہور رسالہ الناظر (لکھنؤ) ادیب (الہ آباد) وغیرہ میں مسلسل مضامین و مقالات بھی نکلنے لگے، بعض معقول معاوضہ پر۔ فلسفۂ جذبات کا پہلا ایڈیشن جب پریس میں گیا ہے تو عمر ۲۰، ۲۱ سال کی تھی، ہر سطر انگریزی میں مطالعہ کے انہماک کے بعد پرانی مشرقیت و مذہبیت کہاں تک ساتھ دے سکتی۔ فلسفہ اور سائنس کو چھوڑیئے، تاریخ و ادب یہاں تک کہ طب، غرض ہر متوقع و غیر متوقع موجہ سے گولہ باری مذہب اور عقائد پر شروع ہو گئی۔ ایمان کا چراغ ان تند و تیز جھکڑوں کے سامنے پہلے تو ٹمٹمایا اور پھر بجھ کر رہا۔ اور جو کل تک اسلام کا حلقہ بگوش تھا وہ آج دیکھتے ہی دیکھتے "ملحد" ہو گیا اور اسے فخر اپنے "ریشنلسٹ" (عقلی) اور "ایگناسٹک" (لاادری) کہلانے میں محسوس ہونے لگا ——— یہی وہ نکتہ ہے جو خالص مولوی قسم کے حضرات کی سمجھ میں نہیں آتا ——— الحاد و گمراہی ہمیشہ

ارادی خبثِ نفس ہی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ماحول بھی ایسا ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے کہ نیت ہزار معصومانہ سہی، قدم یقیناً پھسل کر رہتے ہیں اور اس میں چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، تاثر کی حد تک کسی کی قید نہیں۔

بھولا بھالا، نوعمر و کم تجربہ، مشرقی لڑکا جب کسی مشنری اور پادری کی کسی مناظرانہ یا تبلیغی کتاب میں نہیں (جسے وہ شروع ہی سے دشمن اور معاند سمجھ رہا ہے) بلکہ ایک "فاضل" "مستشرق و محقق" کے انسائیکلوپیڈیا یا مقالہ کو غایت عقیدت کیساتھ اور احترام و عظمت میں ڈوب کر پڑھے گا۔ اور اس میں یک بیک یہ تحریر اس کی نظر سے گذرے گی کہ مکّہ میں ناکام دعوت و تبلیغ کے بعد طائف کا تبلیغی سفر کسی فہم و دانش کی دلیل نہ تھی ــــ یا امراضِ عصبی و دماغی کی کتاب میں مرض صرع کے حالات و علامات کے ضمن میں اس کی نظر اچانک اس مثال پر پڑے گی کہ سائنس کی ترقی سے قبل دورۂ صرع کی فلاں فلاں علامتوں کو آثار روحی سمجھا گیا اور مصروع کو نبی تصور کیا گیا۔ تو خدارا فرمایئے کہ کتنے ناتجربہ کار نوجوان اپنے ہوش و حواس کا توازن قائم رکھنے اور اپنے ایمان و عقیدہ کو سلامت لے جانے پر قادر رہ پائیں گے؟

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ممکن کیونکر ہے کہ ماحول تمام تر لادینی، خدا فراموشی، آخرت فراموشی کا ہو اور دین و مذہب پر زد ذرا بھی نہ پڑنے پائے؟ ـــــــ بڑا سبق آپ بیتی سے تو یہی ملا کہ اپنے عقائد، اپنے اخلاق، اپنی شرافت کا اگر تحفظ مقصود ہے تو سرے سے ماحول مخالف سے بچا جائے۔ اور اگر اس پر قدرت حاصل نہیں تو پہلے اپنے اندر پختگی اتنی پیدا کر لی جائے کہ زہریلی فضا اپنا کام کرنے ہی نہ پائے۔ یہ تو اپنے صاحبِ تجربہ بزرگ ہی فرما گئے ہیں ؎

پیش ایں فولاد بے اسپر میا
کز بریدن تیغ را نبود حیا

اپنا عمل بحمدللہ آج اپنے گھر کے لڑکوں، عزیزوں قریبوں کے بچوں کے ساتھ یہی ہے کہ انہیں ایک خاص ترتیب و حکمت کے ساتھ قصداً ہر قسم کی کتابیں پڑھا کر، ہر طرح کے سوال و جواب ان سے کر کے، ہر ممکن خطرناک منزل سے انہیں اپنی نگرانی میں گزار دیا جائے، اور ان کی سیرت کو بڑے بڑے سیلابوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح مضبوط اور پختہ کر دیا جائے ـــــــ۔ علاج بالمثل کا مجرب طریقہ بھی آخر بڑے بڑے حاذقوں ہی کا نکالا ہوا ہے۔ اور مرض سے بچنے کے لئے اسی مرض کا ٹیکہ لے کر ہزاروں لاکھوں کی جان بچتے کس نے نہیں دیکھا ہے؟

انقلاب

واپسی بھی اسی راستہ سے ہوئی جس سے کہنا چاہیے کہ اصل سفر ہوا تھا۔ مِل اور اسپنسر، ڈارون، اور ہکسلے، اور ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن کی کتابیں چاٹتے چاٹتے کوئی ۱۰، ۱۱ سال ہو چکے تھے۔ یعنی ۱۶ سال کی عمر سے کوئی ۲۶، ۲۷ سال کے سِن تک کہ قدرت نے رسائی حکماء ہند، گوتم بدھ وسری کرشن جی وغیرہ کے ملفوظات و مقالات اور ان کے جدید شارحین مسز بسنٹ ڈاکٹر بھگوانداس، تلک، گاندھی جی، آربندو گھوش، ٹیگور، وغیرہ تک کرادی اور ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا۔ مادیت کا رعب جو دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، ہوا ہو گیا اور محسوس ہونے لگا کہ روحانیت کی کائنات مادیت کے گھروندے سے وزن و وسعت نورانیت ہر اعتبار سے کتنی بڑی ہوتی ہے۔ وہ خاص شرک آمیز اور کیسی ہی ضلیل اور اُلٹی پلٹی، الجھی ہوتی سہی، پھر بھی ملحدانہ مادیت کے مقابلہ میں یقیناً ایک روشنی و ہدایت ہی ہے اور یہیں یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ ہدایت کا ہر درجہ کاملوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ـــــ بہت سی منزلیں ناقصوں[1] کی رہنمائی میں بھی طے ہو سکتی ہیں۔

رشدِ حقیقی کے انتظامات کے صدقہ جایئے میں اسی زمانہ میں صحبت حضرت اکبر الٰہ آبادی کی میسر آنے لگی۔ شاعر سے بڑھ کر حکیم تھے تبلیغ براہ راست کبھی نہ کرتے اور مناظرہ کے تو قریب بھی نہ آتے۔ بس اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کچھ ایسے فقرے کہہ دیتے جو بیرے دل

[1] جس طرح نیم حکیم خطرہ جان ہوتا ہے اسی طرح ناقصوں کی رہنمائی میں بھی گمراہی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ہیں اُتر جاتے۔ ہندو تصوف سے اسلامی تصوّف کی طرف رُخ پھیر جانا کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ کرشن جی کی گیتا سے قدم خود بخود مثنوی مولانائے رومی کی طرف اُٹھ گئے۔ ۱۹۱۹ء کا آخر تھا جب کہ مثنوی کے پورے چھ دفتر' اعلیٰ نفیس کانپوری ایڈیشن والے ایک عزیز کی عنایت سے ہاتھ لگ گئے۔ ۴۰ برس ہوا چاہتے ہیں اور وہ مزا آج تک تازہ ہے۔ سمجھے سمجھائے بغیر بھی ایک ایک شعر تیر و نشتر کا کام کر جاتا۔ طبیعت وجد میں آ آجاتی اور دل بار بار پکار اُٹھتا کہ یہ کلام جھوٹے کا نہیں ہو سکتا۔ کتب بات مجدد سرہندی وغیرہ بھی اسی سلسلہ کی بعد کی کڑیاں ہیں ——— مولوی محمد علی صاحب لاہوری کا انگریزی ترجمۃ القرآن اور مولانا شبلی کی سیرۃ النبی بھی اسی سفر کے سنگ میل ہیں ——— اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے کہ ہدایت کاملین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

زندہ ہستیوں میں بڑا اثر مولانا محمد علیؒ (ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد) کا پڑا۔ ستمبر ۱۹۱۹ء سے جب وہ جیل سے چھوٹ کر آئے ان کے یوم وفات (۵ جنوری ۱۹۳۱ء) تک مراسلت' صحبت و رفاقت بہت زائد رہی۔ اپنے تجربہ میں اتنا سچا' اتنا بے خوف' اتنا بے لاگ مسلمان کوئی دوسرا دیکھنے میں نہیں آیا۔ عجب محبوب و دلکش شخصیت تھی! ؎

صد ہزاراں عید قربانت کنیم
اے ہلالِ ما خم ابروئے تو!

ان کی زندگی کے مطالعہ سے دو بڑے سبق حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ انسان اس دنیا میں رہ کر اس میں پڑ کر بھی سچ بول سکتا اور بیچارہ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر امن و عافیت مقصود ہے تو تصنع کو اپنی زندگی سے ترک کر دیا جائے۔ اور اپنا کوئی راز سرے سے رکھا ہی نہ جائے جس کے فاش ہو جانے اور جس سے رسوا ہونے کا دھڑکا ہر وقت لگا رہے ——— یہ دوسرا سبق پہلے سے بھی زیادہ اہم اور بڑے دور رس نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ کوئی ذرا اس پر عمل کر کے تو دیکھے۔

بخت رسا کی رسائی نے جولائی ۱۹۲۸ء سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہنچا دیا اور

"اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا!"

(علم و فضل' درویشی کی ساری حیثیتوں سے قطع نظر مولانا حکیم بھی بڑے زبردست گزرے ہیں۔ دُنیا کے معاملات' روزمرہ کے برتاؤ کے ایک ایک جزئیہ پر گہری حکیمانہ نظر رکھتے تھے۔ خاک کو اکسیر بنا دینے کے لئے ان کی صحبت کافی تھی۔ تعلقِ نیاز مندی کی مدت ۱۵ سال رہی۔ اس صحبت فیض سے چند سبق نمایاں طور پر حاصل ہوئے۔

(۱) خلق سے تعلقات کو بلا ضرورت بڑھاتے رہنا آخر خود وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ سکونِ خاطر و عافیت اگر مقصود ہے تو تعلقات کو خواہ مخواہ ہرگز نہ بڑھایا جائے۔ خصوصاً امراء و اغنیاء سے ——— یہ تھوڑی سی ہنسی بہت دیر تک رلائے گی۔

(۲) اعتدال و توازن بہت بڑی نعمت ہے۔ کھانے پینے میں' لباس و مکان میں' غرض ساری مادّی لذّات میں اس پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

(۳) اصل راحت و آسائش کے خیال کو ہر نمائشی رسم و رواج پر' ہر تکلف دستور پر' ہر ظاہر داری پر مقدم رکھا جائے' اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔

(۴) دوسروں کے معاملات میں بلا ضرورت پڑنے' ان میں دخل دینے' ان پر رائے زنی کرنے سے اپنی ہی پریشانیاں بڑھتی ہیں۔ مولانائے رومی کا ارشاد آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے ؎

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن
بر زمینِ دیگراں خانہ مکن

لالہ مُرلی دھر شاد دہلوی

تصویرِ احساس

پیامِ درد

دِلّی کے نہ تھے کُوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

سرزمین دلّی کی ایک ایک ٹھیکری خونیں انقلابات کی بولتی ہوئی تاریخ ہے، کوروں پانڈوں کی اندر پرستھ سے لے کر انگریزوں کی DELHI تک جن انقلابات سے ارضِ دلّی کو دو چار ہونا پڑا، وہ عبرت کے درد انگیز افسانے ہیں کوئی بھولنا چاہے تو بھی نہیں بھول سکتا۔

اب سے دو سال پہلے بھی دِلّی کو ٹریجڈی کا فرضِ ناگوار ادا کرنا پڑا، یہ داستان .... ! ع

نہ سُنا جائے گا تم سے یہ فسانہ ہرگز

اور کوئی دِل پر پتھر رکھ کر سُننے کے لئے تیار بھی ہو جائے تو کہنے والا اس کہانی کو پوری طرح دہرا بھی تو نہیں سکتا۔

اب کی بار دلّی کے تمدّن و تہذیب اور زبان تک پر اس انقلاب کی زد آ کر پڑی، جو درد مند دِل رکھتے تھے وہ چیخ اُٹھے کر ع

یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے

یہ مضمون بھی اسی غمگین آواز کی بازگشت ہے، نالہ و فریاد مُرتب نہیں ہوا کرتے چیخیں ساز کے زیر و بم کی طرح ہم آہنگ نہیں ہوتیں، اس مختصر سے مقالہ میں آپ فکر کی بلندی اور خیالات کی گہرائی تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجیے، یہ دیکھیے کہ لکھنے والے نے کس خلوص اور دردمندی کے ساتھ اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے، کہیں کہیں تو دِل کی چوٹیں

لفظوں کے قالب میں ڈھل گئی ہیں۔

اُردو زبان ہندوستان کی تمام قوموں کے میل ملاپ کی یادگار ہے، اس کی جان پر ان دنوں جو قیامت گزر رہی ہے اُس سے مسلمان ہی نہیں اہل ذوق ہندو بھی متاثر ہیں، جنابِ بدشاد دہلوی نے اپنے قلبی واردات کو جوں کا توں پیش کر دیا ہے، اس میں نرے جذبات ہی نہیں تاریخی حوالے بھی ہیں، اہلِ نظر ان لکیروں سے خاکے بنا سکتے ہیں۔—(م-ق)

میرے کرم فرما کنور مہندر سنگھ بیدی کا تقاضا ہے کہ یوم غالب کے سلسلہ میں جوان کی ایما اور کوششوں سے ۱۸ اور ۹ ر جون کو دلی میں منایا جارہا ہے میں بھی کچھ اپنے خیالات کا اظہار بصورت مقالہ نیز طرحی مشاعرے کیلئے غزل پیش کروں۔ کجا میں اور کجا یہ ادبی اجتماع یہ ان کی محبت ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان تاریخوں میں دلی میں میرا قیام نہ ہوگا۔ وہ اس بات پر مصر ہے کہ میں اپنا مضمون اور غزل انکو بھیجدوں تاکہ وہ اس موقعہ پر پڑھوائے جاسکیں۔ کنور صاحب کا ارشاد میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اچھا یا بُرا، اپنی استعداد کے موافق حاضر خدمت ہے۔

آہ وہ غالبؔ جس نے اُردو شاعری میں تہلکہ مچادیا جس نے اپنی محنت، ریاضت، کاوش اور بے تعصبی سے اُردو ادب میں چار چاند لگادیئے اس کی یادگار منانے کے لئے آج یہاں سب اکٹھے ہوئے ہیں۔ وہ غالبؔ جس کی شاعری پر ہر سخن فہم ہر ادیب ہر شاعر، ہر استاد اب تک ناز کرتا ہے وہ غالبؔ جس کی زندگی میں سن ستاون کا غدر ظہور پذیر ہوا جس کے تاثرات اس کی باقی ماندہ زندگی پر ہمیشہ قائم رہے آج بھی ہم کم وبیش اسی ماحول میں اس کی یادگار منا رہے ہیں۔ پچھلا انقلاب یعنی سن ستاون کا غدر جس بنا پر ظہور میں آیا، اور اس کے نوے برس بعد دوسرا انقلاب جس صورت میں رونما ہوا۔ یہ بھی ایک سبق آموز چیز ہے۔ پہلا انقلاب جہاں ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں زور آزمائی اور معرکہ آرائی کا نام ہے۔ وہاں ۱۹۴۷ء کا انقلاب ملک صوبہ اور بھائیوں کی تقسیم کا نام بن کر رہ گیا ہے۔ یوں تو دلی کے اوپر بارہا انقلاب کے بادل چھائے لیکن پروردگارِ عالم کی عنایت سے خاندانوں یا ماحول پر تفرقہ ڈالے بغیر چھٹ گئے۔ مگر اس دفعہ کے بادل کچھ اس طرح جھڑی لگا کر برسے کہ دلی کی تہذیب تمدن اخلاق، شرافت، وضعداری، حتیٰ کہ زبان تک کو بھی خس وخاشاک کی طرح بہا کرلے گئے۔

آہ وہ دلی جو ہندوستان کا دل ہے جو سارے جہان کی جان ہے۔ جو سابق فرمانروایانِ ہند کا دارالخلافہ رہی۔ اب بھی دارالسلطنت ہے جس کی ادائے دلربائی سب کو بھاتی جس کی چمن آرائیاں اور بہاریں جہاں دلکش اور قابل دید نہیں وہیں اس کی خزاں بھی قابل دید ہے(؟) آہ وہ دِلی جو علم وہنر کی گہوارہ تھی، جس کا سکہ ہندوستانی تہذیب پر بیٹھا ہوا تھا جس کی زبان ہندوستان کی مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ جس کے بچے بچے کی زبان سُننے کے لئے کان مشتاق رہتے تھے۔ جہاں کی زبان کے متعلق میر تقی میرؔ لکھنؤ کے سفر میں اپنے ہم سفر سے فرماتے ہیں کہ باتیں کرنے سے آپ کا تو دِل بہلتا ہے اور میری زبان خراب ہوتی ہے۔ آہ۔ وہ دِلی، جس کا ماحول کبھی اتنا پُرسکون اور جاذب تھا کہ والیِ دکن کی قدردانیوں سے بے نیاز ہوکر ذوقؔ مرحوم نے فرمایا تھا ؎

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دِلی کی گلیاں چھوڑ کر

دلی میں کوئی نہ کوئی ایسی دلکشی ضرور تھی کہ جو یہاں ایک دفعہ آگیا۔ وہ یہیں کا ہو رہا اس سلسلہ میں ہمارے کنور مہندر سنگھ صاحب زندہ مثال آپ حضرات کے سامنے موجود ہیں ؂

اب وہ دلّی نہ رہی، وہ دلّی والے نہ رہے، ماتم اس کا ہے کہ رہی سہی دلی مرحوم کی نشانی اردو زبان جو دلّی کی جان بھی اس کا نشان بھی ختم ہوتا نظر آرہا ہے وہ زبان جس کے نہ صرف مسلمان ہی حقدار ہو سکتے ہیں نہ ہندو ہی دعویدار ہو سکتے ہیں، وہ زبان جس کو اگر مسلمانوں نے خونِ دل پلایا تو ہندوؤں نے لختِ جگر کھلایا اور پروان چڑھایا۔ اگر مسلمانوں نے فارسی سے رشتہ توڑا اور اُردو کو اپنایا۔ تو ہندوؤں نے بھی اُردو سے ناتہ جوڑا اور گلزارِ ہندی کے شگفتہ پھولوں سے سجایا۔

کبھی ہندوؤں کو ان دشوار گو شعرا سے شکایت ہوتی تھی جو اُردو میں فارسی کے مشکل الفاظ اور دشوار ترکیبیں استعمال کرتے اور اسے بلاغت سمجھتے تھے، یہی غالبؔ مرحوم جن کا آج یوم غالب منایا جارہا ہے ان کے کلام بلاغت نظام کی شکایتیں ہوتی تھیں اور دشوار کلام سماعت پر بار محسوس ہوتا تھا یہاں تک کہ غالبؔ کو خود اپنی دشوار پسندی کو ترک کر کے سہل گوئی کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ آج اسی طرح آل انڈیا ریڈیو کے دلّی اسٹیشن کے ہر پروگرام میں ہندی کی چندی نکالی جاتی ہے اور اس کو عام فہم اور سہل بنانے کی بجائے ایسے ایسے مشکل اور من گھڑت الفاظ اور فقرے ٹھونسے جارہے ہیں۔ جن سے کم از کم دلّی والوں کی طبیعت پر گرانی محسوس ہوتی ہے۔ جن دلّی والوں کے لئے یا گرد و نواح کے لئے یہ پروگرام نشر کیا جاتا ہے اور جیسے پبلک کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ہندی زبان داں بھی آسانی سے نہیں سمجھ سکتے۔

کیا زمانے کی تبدیلی ہے کہ اُردو جو اقوام ہند کی مشترکہ زبان ہے اور فی الحقیقت تمام زبانوں کی ترجمان ہے۔ اسے بالائے طاق رکھ کر کہیں گوڑھ ہندی کو اپنایا جارہا ہے اور کہیں فارسی کو سنبھالا جارہا ہے۔ اسی مملکت اُردو کے تاجدار اور ملکِ سخن کے شہریار کی یاد کے مبارک موقعہ پر ہم سب یکجا ہوئے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ہم کو اس کے منانے کا کوئی حق بھی ہے، جبکہ ہم اس کے دکھائے ہوئے رستہ سے بچھڑ گئے یا اس کے مشن کو بھول گئے۔ یا جس اُردو کی اس نے خدمت کی اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر ہم نے اپنی کوششوں میں ڈھیل ڈال دی۔

اس بات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ فارسی میں شیرینی نہیں، ہندی میں رس نہیں۔ ان ہی دونوں زبانوں کی بہترین صفتوں کے ملاپ سے اُردو نے جنم لیا۔ ہندی کی تشبیہیں، استعارے اور فارسی کی ترکیبیں اور محاورے سب اپنی اپنی جگہ خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ہندی کی شاعری میں جہاں سورداس، تلسی داس، رہے داس، وغیرہ وغیرہ ہندو کوی جلوہ افروز تھے، وہیں رحیم، امیر خسرو وغیرہ بھی ان کے دوش بدوش عجیب شان سے ہندی کے علمبردار نظر آتے تھے، علیٰ ہٰذا القیاس اُردو کی محفل ادب میں مرزا غالبؔ کے ہم نشیں مرزا تفتہ، مظفرؔ، خواجہ آتشؔ کے بعد پنڈت نسیمؔ، ثاقبؔ و صفیؔ کے شریک بزم کیفیت حضرت بیخودؔ و نواب سائلؔ کے ہم صحبت پنڈت ساحرؔ، زارؔ، علامہ کیفیؔ وغیرہ یعنی ہندو مسلم شعرا کی یکجائی نے اُردو کی شان دلربائی کو دوبالا اور آسمان سخن اُردو کو چار چاند لگائے۔

صاف ظاہر ہے کہ گلستان فارسی اور بوستان ہندی کے اختلاط سے چمنستان اُردو کی نشو و نما ہوئی، اور جب اس باغِ جنت میں گلہائے رنگارنگ مہکے اور عندلیبانِ خوشنوا چہکے تو اس گلشن بے خار اور اس جنت کی بہار کو فارسی و ہندی کی کش مکش سے بوئے گل کی طرح اُڑانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک سچے ادیب کو نہ اُردو سے بغض ہو سکتا ہے نہ ہندی سے بَیر، لیکن سمجھدار آدمی اس زبان کو بہتر سمجھتا ہے جو اتنی عام فہم ہو کہ جس کو ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی سمجھ سکے اور یہ خوبی دلّی کی ٹکسالی زبان ہی میں مل سکتی ہے۔

خدا کرے، کہ آپ سب لوگوں کی مشترکہ محنت پھل لائے۔ آپ لوگ دلّی کی پرانی روایات کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اور آپ کی متفقہ کوشش سے اس باغ کی بہار سدا بہار بنی رہے۔ اور اس خم خانۂ ادب پر رحمتِ پروردگار رہے۔

سلہ غالب کی دشوار پسندی کی شکایت کرنے والوں میں مسلمان بھی شامل تھے۔ (م۔ق)

اِلہام

قابلؔ اجمیری

اس قوم کی تہذیب کا معلوم ہے انجام — جس قوم کی تہذیب میں داخل ہوں زن و جام
فقدانِ خودی ہو تو ہر اک سانس سزا ہے — عرفانِ خودی ہو تو ہر اک سانس ہے انعام
مشرق سے نمودار ہوئی سرخ سحر بھی — مزدور کی دنیا میں ابھی تک ہے مگر شام
جب رُوحِ عمل زہد میں باقی نہیں رہتی — ہوتا ہے کسی رندِ خراباتی پہ الہام
اک ایسے مسلماں کی ضرورت ہے کہ جس کا — آغاز بھی اسلام ہو انجام بھی اسلام
کافی ہے نفس کفر کو ایماں کی حرارت — ہو عزمِ براہیمؑ تو نصرت ہے بہر گام

قابلؔ مری آواز نہیں بانگِ درا ہے
سمجھے تو سہی ملتِ بیضا مرا پیغام

پیغام

نازشؔ پرتاب گڑھی

گلشن ترے قبضہ میں مگر خود تہی دامن — ساقی ہے مگر تجھ کو غمِ تشنہ لبی ہے
ہشیار ہوائے دوست! کمیونزم ہے ہشیار — ہے بوذری انداز مگر بولہبی ہے
مُنہ موڑے ہوئے جادۂ لیننؔ سے گزر جا — تو گامزنِ راہِ رسولِ عربی ہے
بجلی کے چراغوں سے ہے راتوں میں اُجالا — لیکن ابھی دنیا کو غمِ تیرہ شبی ہے

جو خرمنِ باطل کو ابھی پھونک کے رکھ دے
اب بھی ترے سینہ میں وہی آگ دبی ہے

محبت جھولیاں اپنے گلے میں ڈال سکتی ہے
مگر وابستۂ دامانِ دولت ہو نہیں سکتی
(بسملؔ سعیدی)

تین غزلیں

بسمل سعیدی

جو دکھائے اُن کا حسن کارفرما دیکھئے
صبحِ حسرت دیکھئے شامِ تمنا دیکھئے

دیکھ کر گلگشت اک مستِ خرامِ ناز کی
ساغرِ گل رنگ میں کیا موجِ صہبا دیکھئے

قدِ آدم ہو کے جیسے رہ گیا ہو آفتاب
اک سراپا حسن کا حسنِ سراپا دیکھئے

حسرتِ جلوہ بقدرِ حاصلِ نظارہ ہے
اُتنی ہی بڑھتی ہے حسرت اُن کو جتنا دیکھئے

دست و دامن میں نہ ہو جیسے کوئی وابستگی
میرے دستِ شوق سے دامن چھڑانا دیکھئے

کب سے اُلجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

ہوگا تمہارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

دُہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

بسملؔ حریمِ حسن میں ہیں کامیابِ شوق
جوشِ شباب و رنگِ رخِ آتشیں سے ہم

جب اہلِ عشق کا ہر حال عاشقانہ تھا
حدودِ عشق سے باہر غمِ زمانہ تھا

بھلا دیا ترے کانٹوں نے بھی چمن! ہم کو
ہمارا تیری بہاروں میں آشیانہ تھا

اب آنسوؤں نے حقیقت بیان کی اُس کی
جو قہقہوں کی زباں پر کبھی فسانہ تھا

قبولِ سجدہ پہ بھی وہ تو ہو سکا نہ ادا
جو ذوقِ سجدہ پہ اک فرضِ آستانہ تھا

وہی ہے فطرتِ عشق اور وہی سرشتِ حسن
وہی ہے آج زمانہ جو کل زمانہ تھا

پہنچ کے گنبدِ خضرا پہ بسملؔ اب سمجھا
مری جبیں کے تو لائق یہ آستانہ تھا

حسرت موہانی

سوز و ساز

ہونا پڑے جو آپ کے در سے جدا مجھے
دُنیا میں اس گھڑی کو نہ رکھے خدا مجھے

رکھئے نہ مجھ پہ ترکِ محبت کی تہمتیں
جس کا خیال تک بھی نہیں ہے روا مجھے

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز
التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

اک میں ہوں سو کیا میں ہوں محرومِ فراغت ہوں
اک دل ہے سو کیا دل ہے مجبورِ پریشانی

تری محفل سے ہم آئے مگر باحالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

ایک ہی بار ہوئی وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

ان کی نگہِ مست کے جلوے ہیں نظر میں
بھولے سے بھی ذکرِ مے و مینا نہیں آتا

حُسنِ بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دُشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے
اک ترے درد کو سینہ سے لگا رکھا ہے

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آ گئی تھی آج
سو کتنے شرمسار ہوتے بے کسی سے ہم

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

دِل کی ہوس مٹا تو دی، اُن کی جھلک دکھا تو دی
پھر یہ کہو کہ شوق کی "بارِ دگر" کو کیا کروں

ابھی دیکھی نہیں گستاخیاں جوشِ تمنا کی
تمہاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے

کچھ میرے حالِ زار کی ان کو خبر نہیں
کیا ہو جو اُن کے جا کے سُنا دوں مگر نہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

ادیبؔ سہارنپوری

نغمۂ محبت

دل میں اک صورتِ زیبا کے سما جانے سے
اب وہ نکھری ہوئی صبحیں، نہ سہانی راتیں
وہ خفا ہی رہیں لیکن متوجہ تو رہیں
ہم کو سمجھاتی ہے اُن تک نہیں جاتی دُنیا
روشنی بزم سے باہر تو نکل آتی ہے
لاکھ نظارے سہی فرصتِ نظارہ کسے

آج ہم اپنی نگاہوں میں ہیں بیگانے سے
بجھ گئے کتنے دیئے ان کے چلے جانے سے
مے سے رندوں کا تعلق ہے کہ پیمانے سے
کچھ تو ہوگا کہ جو ہم ہوگئے دیوانے سے
شمع کو بات نہیں کرتی ہے پروانے سے
ہم تو خود اپنی نگاہوں میں ہیں انجانے سے

اہلِ عشرت سے یہ غربت کا گلہ کیوں ہے ادیبؔ
رونقیں ملتی ہیں آبادی کو ویرانے سے

ماہرؔ القادری

سرودِ مستانہ

مجھے فریب نہ دے او نشاطِ مے خانہ
جہاں جنوں سے بھی ہے چشمکِ حریفانہ
نہ آرزوئے بہاراں نہ خوفِ دورِ خزاں
صنم کدوں کے پجاری ہیں مسجدوں کے امام

میں سُن رہا ہوں صدائے شکستِ پیمانہ
گزر رہا ہے اب اُن منزلوں سے دیوانہ
نہ جانے کس نے رکھی تھی بنائے ویرانہ
حرم کے بھیس میں ہے پھر فروغِ بت خانہ

گدازِ شمع سے واقف نہ سوزِ غم کی خبر
اُلجھ رہا ہے ابھی روشنی سے پروانہ
کوئی سُنے نہ سُنے میں سُنائے جاتا ہوں
مرا کلام ہے ماہرؔ سرودِ مستانہ

کوکب شادانی

مجھے بھول گئی!

کر کے خود پیار کا اقرار مجھے بھول گئی
ہائے اب کیوں نگہ یار مجھے بھول گئی

میں نے خوابیدہ قیامت کو کیا تھا بیدار
جب قیامت ہوئی بیدار مجھے بھول گئی

حسن کی گرمئ بازار کی بنیاد تھا میں
حسن کی گرمئ بازار مجھے بھول گئی

میرے دامن ہی سے کانٹوں نے الجھنا سیکھا
یک بیک کیوں خلشِ خار مجھے بھول گئی

ہر ادا حسن کی تھی میری پرستار کبھی
اب وہی میری پرستار مجھے بھول گئی

پہلے وہ چشمِ کرم میری طلبگار رہی تی
کر کے پھر اپنا طلبگار مجھے بھول گئی

باتوں باتوں میں یک شوخیٔ گفتار نے دل
لے کے دل شوخیٔ گفتار مجھے بھول گئی

کیا زمانے میں کسی اور کا شکوہ کوکبؔ
خود مری قسمتِ بیدار مجھے بھول گئی

بحرؔ الہ آبادی

میرے لئے

یاد ایامے کہ تھا جب تو کبھی میرے لئے
کس قدر پُرلطف تھی یہ زندگی میرے لئے

دم بخود ہیں آج تک عقل و خرد اپنی جگہ
دیکھ کر نیرنگِ کارِ عاشقی میرے لئے

ہر نفس میں وہ فروغِ یک جہانِ رنگ و بو
ہر نظر میں وہ چمن کی تازگی میرے لئے

لے اڑی موجِ نسیمِ صبح بزمِ ناز سے،
حسن و سرمستی، تبسم، نازکی میرے لئے

لالہ و گل کے حسیں نکھرے ہوئے اوراق پر
شبنم افشاں تھی چمن میں چاندنی میرے لئے

بحرؔ وہ کیا خوب دن تھے ابتدائے عشق کے
ہر نفس تھا جب پیامِ سرخوشی میرے لئے

چار جرعے

عاصم جے پوری

اب تو وہ بیداد گر بھی آہ پر آمادہ ہے
ہائے! کن مجبوریوں میں کوئی دُور اُفتادہ ہے

کچھ زیادہ کیجئے رنگینیٔ شانِ جمال
جوہرِ آئینۂ ہستی ابھی تک سادہ ہے

تم نہ سمجھو گے کہ تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھ لو
بادہ کیا جانے کہ آخر کیا سرورِ بادہ ہے

کھو نہ اے نازآفریں! میری نظر کا اعتبار
آکہ ہوتا ہے ترا ہر چیز پر دھوکا مجھے

حُسن کو رُسوا نہ کردیتی محبت کی تلاش
پردہ داری کے لئے ہونا پڑا رسوا مجھے

عشرت مرادآبادی

ہر سانس پیامِ بیداری ہوتا بھی ہے اور ہوتا بھی نہیں
انسان نے اپنی ہستی کو سمجھا بھی ہے اور سمجھا بھی نہیں

ہونٹوں پہ ہے مُہرِ خاموشی، آنکھوں میں ہیں غلطاں افسانے
بیمارِ محبت غم اپنا کہتا بھی ہے اور کہتا بھی نہیں

ہر چیز سے دل گھبراتا ہے، ہر شے پہ نظر رُک جاتی ہے
رنگین نظاروں کی دُنیا دھوکا بھی ہے اور دھوکا بھی نہیں

جب آہ اثر بن جاتی ہے جب درد دوا ہو جاتا ہے
وہ وقت محبت میں عشرتؔ آتا بھی ہے اور آتا بھی نہیں

افضل صدیقی

نگہِ شوق پردہ در بھی نہیں
اور خود حُسن جلوہ گر بھی نہیں

عالمِ آگاہ تھے جنوں پیشہ
اب تو اپنی اُنہیں خبر بھی نہیں

خیر ہو رہروانِ اُلفت کی!
منزلِ شوق پُرخطر بھی نہیں

باہمہ یاس و رنج محرومی
تجھ سے دیوانے بے خبر بھی نہیں

ہے کٹھن راہِ آرزو افضلؔ
اور پھر کوئی ہمسفر بھی نہیں

طرفہ قریشی

جو ہیں خضرِ طریقت رہبری کرتے ہیں چھپ چھپ کر
حبابِ سطحِ بن کر سامنے آیا نہیں کرتے

بہائے شمع کیوں آنسو پتنگوں کے تڑپنے پر
پرائے درد سے آنکھوں میں اشک آیا نہیں کرتے

تو اپیرائے سوزِ دل! گراں بارِ معانی ہو،
سُبک نغمے کبھی محفل کو گرمایا نہیں کرتے

تو اپنی قوتِ بازو سے خود فردوس پیدا کر
ستارے آسماں سے پھول برسایا نہیں کرتے

افسوںؔ بھوپالی

نشانِ منزل

اے دلِ طالب و شوق کی منزل سے گذر جا — حاصل سے گذر جا غمِ حاصل سے گذر جا

محدود مقامات، نہ کر فکر و نظر کو — مہر و مہ و انجم کی بھی محفل سے گذر جا

آغوشِ بلا ہی سہی آغوشِ تلاطم — ساحل کا سکوں موت ہے ساحل سے گذر جا

بنیاد نہ رکھ عشق کی اُمیدِ کرم پر — آغاز میں انجام کی مشکل سے گذر جا

تو خالقِ پروانہ ہے پروانہ نہیں ہے — منہ پھیر کے شمعِ سرِ محفل سے گذر جا

اک حسنِ سرِ پردہ کو آنکھوں سے لگا کر — ہر حسنِ پسِ پردۂ محمل سے گذر جا

آساں نہیں افسوںؔ تری ہستی کا مٹانا
اس وہم اس اندیشۂ باطل سے گذر جا

عالمؔ اکبرآبادی

گلہائے پریشاں

تری نگاہ کی بخشی ہوئی خلش معلوم — کہ عارضی بھی نہیں اور جاوداں بھی نہیں

ان نگاہوں سے جو شرما کے جھک جاتی ہیں — تو نے کیا کیا دیئے پیغام تجھے کیا معلوم

تجھ سے کہتا بھی نہیں ہوں میں کوئی بات کبھی — تجھ سے رہتا بھی نہیں میرا کوئی رازِ نہاں

گزر جاتی ہے جو دل پر چھپا لیتا ہوں دنیا سے — مگر تجھ سے تو یہ دردِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

زمانہ چیخ اٹھا تو نے کر دیا برباد — میں سوچتا ہی رہا تیرا نام لوں کہ نہ لوں

نظر اٹھا کے مجھے او نہ دیکھنے والے — کبھی حجاب بھی ٹوٹے گا بات بھی ہوگی؟

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں آخر اداس کیوں ہو — مفہوم کتنا مشکل، الفاظ کتنے سادہ

ناطقؔ لکھنوی — اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح ۔ میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

ماہر القادری

ایک بندوق
تین خون

وہ گرلس کالج کی پرنسپل تھی، اس کا پورا نام آدھی سطر میں لکھا جاتا تھا ——— مس گوہر تاج سلطانہ امۃ الزہرا عابدی قریشی سبزواری ——— ڈگریوں اور عہدے کے اضافہ کے ساتھ تو دو سطریں بھی کافی نہ ہوتی تھیں، لڑکیاں اُسے سلطانہ آپا کہہ کر پکارتی تھیں، اتنے لمبے چوڑے نام کا اس قدر مختصر ہو جانا اُسے ذرا بھی ناگوار نہ ہوتا ——— "سلطانہ" ——— کہنے کو ایک لفظ ہے مگر یہ اپنے اندر عظمت و وقار کی ایک دُنیا رکھتا ہے۔ وزن کمیت quantity میں نہیں کیفیت quality میں ہے، ہیرے کا ایک ریزہ ہزاروں کنکریوں پر بھاری ہوتا ہے۔ لاکھوں کانٹے ایک پھول کی برابری نہیں کر سکتے۔

سُلطانہ کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، کشیدہ قامت، گندمی رنگ، شربتی آنکھیں، ہنس مکھ چہرا، پیشانی البتہ کم چوڑی تھی، مگر اتنی کم چوڑی نہیں کہ اُسے کوتاہ پیشانی کہا جا سکے۔ مجموعی طور پر سُلطانہ خوبصورت تھی، بناؤ سنوار سے وہ اور دیدہ زیب بن جاتی، وہ تو پھر اچھے خاصے ناک نقشہ کی عورت تھی، بانس کی ککڑی پر تیل کا ذرا ہاتھ پھیر دینے سے رنگ رُوپ آجاتا ہے۔

سلطانہ کے بارے میں بہت سے قصے مشہور تھے ——— اسکی جوانی کے قصے! یہ کہ طالب علمی کے زمانہ میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا کہ اگر اُس کے رشتہ داروں کے اثرات نہ ہوتے تو کالج سے اس کا اخراج Rustication ہو جاتا، رسوخ، اثر، تعلقات اور دولت نے مل جل کر معاملہ کو دبا دیا ——— یہ بھی مشہور تھا کہ گریجویٹ ہونے کے بعد سلطانہ بمبئی میں کچھ دن جا کر رہی، وہ فلم ایکٹریس بننا چاہتی تھی، ایک کھیل میں تھوڑا بہت کام کرنے کو بھی مل گیا تھا مگر وہ کمپنی ہی ٹوٹ گئی اور یہ شوق ناتمام رہ گیا ——— کتنے ہی نوجوانوں سے اس کی "کورٹ شپ" بھی رہی مگر شادی ایک سے بھی نہیں ہو سکی ——— کیوں؟ یہ نہ پوچھیے، ہر بات کی تفصیل اور ہر بھید کا کھلنا مناسب نہیں ہوتا، بہت سے واقعات اگر نقاب ہی میں رہیں تو اچھا ہے ——— مگر آپ کے ماتھے پر سلوٹیں پڑنے لگیں میں محسوس کر رہا ہوں، آپ کا شوق دریافت کہہ رہا ہے کہ یہ کیسا افسانہ نگار ہے، جو کھُل کر بات نہیں کرتا، یا تو اس ذکر کو چھیڑنا ہی نہ تھا اور جب بات چھڑ گئی ہے تو اسے مُگمم اور مبہم نہ رہنا چاہیے۔

تو صاحبو سُنیے! ہونے والے میاں بیوی میں "قبل از مرگ واویلا" کی طرح "قبل از شادی یارانہ" Court-ship اس لئے ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ لیں، جانچ لیں اور اس بات کا اندازہ لگا لیں کہ شادی کے بعد ان میں نباہ بھی ہو سکے گا؟ پیسہ کی ہانڈی ٹھوک بجا کر مول لی جاتی ہے یہ تو ساری زندگی کا سودا ہوتا ہے اس "چٹ منگنی پٹ بیاہ" والی بات سے دو زندگیوں کو اکثر و بیشتر بے لُطفی اور بدمزگی کی دشوار گُزار منزل سے گُزرنا پڑتا ہے، بہت سے رشتے بے میل ہوتے ہیں ——— تو "سلطانہ" کی

جن جن لوگوں سے کورٹ شپ رہی '' ان میں سے کچھ تو خود پسند نہ آئے اور بعض نے سلطانہ کو اپنے لئے موزوں نہ سمجھا اور کوئی کوئی ایسا بھی شوقین مزاج نکلا کہ چند دن کی تفریح اور جنسی کھیل کے بعد دامن جھڑا کر چلتا بنا۔

کورٹ شپ کی تنہائیاں تہذیب کی نگاہ میں مقدس اور معصوم نہیں تو بے ضرر بہرحال ضرور ہوتی ہیں، اب رہی تھوڑی بہت اونچ نیچ تو اس دنیا میں اچھوتا کون رہتا ہے، باغوں کے پھول تک بھونروں اور تتلیوں کی دست برد بلکہ "لب برد" سے محفوظ نہیں رہتے ——— وہ دورِ تہذیب جس میں سیکڑوں من کا وزنی جہاز ہوا میں پتے کی طرح اڑتا ہے، اس کے اثرات سے آدمیوں کی زندگی کیسے بچ سکتی ہے ——— اخلاق و غیرت کی پرانی بساطیں اب تہ کر کے رکھ دی گئی ہیں ——— زندگی کو بے حد و بے کراں ہونا چاہئے دل کا بہلنا بھی زندگی کے لئے ضروری ہے ——— یہ "ازدواجی بندشیں" کا پابند کیوں ہو!

یہ تھی سلطانہ کی جوانی اور اس کا ماحول! ان جذبات اور تصورات کے ساتھ وہ انگلستان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے پہونچی، یہاں ہندوستان میں تھوڑی بہت قید و بند بھی تھی اور وہاں پوری آزادی ——— رقص خانوں سے لے کر درسگاہوں تک اسی ایک ہی انداز پر "آرٹ" کے نام پر ہر گناہ بھی نہ صرف جائز بلکہ مستحسن!

دو چیزیں آدمی کو برائی سے روکتی ہیں خدا کا خوف اور سوسائٹی میں بدنامی کا ڈر! خدا کا خوف اگر سلطانہ کے دل میں ہوتا تو وہ یہ زندگی ہی کیوں اختیار کرتی، تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم اور ڈگریوں کا وزن اور ان کی افادیت بجا اور درست ——— مگر عصمت و اخلاق کی ان میں سے کوئی چیز بھی قیمت نہیں ہو سکتی ——— اب رہا سوسائٹی کا ڈر تو انگلستان کا ماحول بد اخلاقی کو قدم قدم پر سہارا دے رہا تھا کوئی آدمی برائیوں سے بچنا بھی چاہے تو اسے بچنے کون دیتا ہے، "عیش و تفریح" جس سوسائٹی کا نصب العین ہو وہاں پاکبازی کا ذکر کرنا بھی حماقت سے کم نہیں!

سلطانہ ذہین اور محنتی تھی، تعلیمی مقابلہ میں وہ ہمیشہ سب سے آگے رہی، اور تین چار سال بعد جب انگلستان سے ہندوستان واپس ہوئی تو کئی ممتاز ڈگریاں اس کے بدولت بندھی تھیں، یہاں سب دوست عزیزوں نے اسے سراہا، خاندان کے لوگ فخر کرنے لگے کہ ہماری اقبال مند لڑکی انگلستان سے کامیاب ہو کر واپس ہوئی ہے، دعوتیں ہوئیں، پارٹیاں دی گئیں، فوٹو کھنچے، اخباروں میں تعریفیں چھپیں اور صرف تعریفیں ... بلکہ سلطانہ کی زندگی کے حالات بھی ——— اور ان حالات میں پیدائش کے سنہ سے لے کر انگلستان سے آنے تک کے ان واقعات کا ذکر تھا جن سے سلطانہ کی تعلیمی زندگی کے روشن پہلو اجاگر ہوتے تھے، اس کی اصل زندگی پر کسی نے ایک حرف بھی نہ لکھا ——— دھوکا، فریب، واقعات کی جان بوجھ کر تلبیس ——— یہی وہ صحافت ہے جو فاسقوں اور بدکاروں کو زندگی میں "اعلیٰ حضرت"، "مدظلہ العالی" "دامت برکاتہم" اور مرنے کے بعد "قدس سرہٗ" اور "اعلیٰ اللہ مقامہ" بنا دیتی ہے۔

سلطانہ کو شروع شروع میں گرلس کالج کی پروفیسری ملی، پھر وہ وائس پرنسپل ہوئی اور پرنسپل صاحبہ کی بیماری کے زمانہ میں وہ قائم مقام پرنسپل بھی ہو گئی اور توقع تھی اس عہدے پر اسے مستقل کر دیا جائے گا اسلئے کہ پرنسپل صاحبہ کی علالت طول پکڑتی جا رہی تھی اور ان کی واپسی کی کچھ یوں ہی سی امید تھی ——— برائے نام! نہ ہونے کے برابر۔

سلطانہ "مس" (Miss) تھی، عربی میں جسے "آنسہ" کہتے ہیں، یعنی وہ عورت جس کی شادی نہ ہوئی ہو چاہے دوشیزہ نہ ہو! تہذیب حاضر میں دوشیزگی اور کنوارپن بے معنی اصطلاحیں ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ سب فرسودہ تصورات اور قدیم نظریے ہیں! تو سلطانہ بھی تہذیب حاضر کی "مس" اور "آنسہ" تھی بن بیاہی عورت، جس کا کوئی شوہر تھا اور نہ باقاعدہ وہ کسی کی بیوی تھی، اس کی آنکھوں میں غلطاں تجربے نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے بلکہ غمازی کر رہے تھے مگر ہر کوئی آنکھوں کی بولی سمجھ بھی نہیں سکتا جو سمجھتے ہیں

وہ جان کر انجان بن جاتے ہیں اور جو اُس پر حرف گیری کرتے ہیں ان بیچاروں کو "مُلّا" "قدامت پرست" اور "رجعت پسند" کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ لفظ "miss" آخر تک ایک آہنی پردہ بنا رہتا ہے۔

سلطانہ گرلس کالج کی پرنسپل تھی، سات سو کے لگ بھگ تنخواہ، موٹر، بنگلہ، صوفے، گلدان، نوکر چاکر ——— سوسائٹی میں اس کی سب عزت کرتے تھے اور شہر کے معززین کی صف اول میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ان عزتوں، ڈگریوں اور تزک و احتشام کے ہوتے کس کی مجال تھی جو سلطانہ پر حرف گیری کر سکتا۔ اتنے حسین اور دبیز غلافوں میں کردار کے خط و خال نظر کہاں آسکتے ہیں، جس تہذیب میں عورتوں کے جسموں کی لچک، گداز، تناؤ اور تناسب پر انعام ملتے ہوں وہاں سیرت و کردار کی پاکبازی کے متعلق سوچنا اور اس کا ظاہر کرنا بیوقوف بنتا ہے ——— کتوں اور سوروں کے جنگلے میں بیچارے ہرنوں کو اچھوت بن کر رہنا پڑتا ہے۔

گرلس کالج میں

گرلس کالج ایک نیم سرکاری ادارہ تھا، حکومت سے سالانہ امداد ملتی تھی اور معزز شہریوں کی ایک کمیٹی اس کے نظم و نسق کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس کمیٹی کے صدر شہر کے ایک رئیس تھے ——— خان بہادر اور مجسٹریٹ بھی! خان بہادر صاحب "جی حضوریوں" میں سب سے پیش پیش تھے، کلکٹر صاحب کے بنگلہ کا طواف ان کا روزمرہ کا شغل بلکہ فرض تھا، حکام کے یہاں ڈالیاں، تحفے اور ہدیئے بھیجتے، اور ان ہدیوں اور تحفوں میں آم اور خربوزے کی ٹوکریوں سے لے کر چاندی کے سگرٹ کیس اور جڑاؤ عطردان تک شامل تھے، خان بہادر صاحب کو شہر میں کافی ہردلعزیزی حاصل تھی، کسی سینما اور تھیٹر ہال کا افتتاح ہوتا تو خان بہادر صاحب اس میں سب سے آگے ہوتے اور کسی دینی مدرسہ اور مسجد کی بنیاد رکھی جاتی تو اس میں بھی خان بہادر صاحب کے دستِ حق پرست (؟) کی برکت کو شامل کیا جاتا ——— ان کو بس شہرت اور نام و نمود کی ضرورت تھی یہ جنس گرانمایہ جہاں اور جس طرح بھی ملتی خان بہادر صاحب اس کے حاصل کرنے سے چوکتے نہ تھے!

شمیم خان بہادر صاحب کا اکلوتا لڑکا تھا، وجیہ، بلند و بالا قامت، ٹینس کا مشہور کھلاڑی! ایف، اے سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا مگر سوسائٹی کو کس طرح برتا جاتا ہے اس سے وہ خوب واقف تھا، علم حاصل کر کے بھی وہ کیا کرتا، بڑے بڑے قابل پروفیسر اور عالم فاضل تو خود اس کے باپ کی چوکھٹ کو آداب بجا لاتے تھے۔

خان بہادر صاحب کے یہاں سلطانہ کا اکثر آنا جانا رہتا، کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے وہ صدر بھی تھے! تمام ممبر اُن کی مٹھی میں تھے، کالج کے سیاہ و سپید کے تنہا مالک تھے، جس کو چاہتے نکالتے جس کو چاہتے رکھتے! کالج کی پروفیسر عورتیں اور دوسرے اہل عملہ خان بہادر صاحب کی چشم و ابرو کے اشاروں پہ چلتے ——— یہ روزی کا معاملہ تھا، یہاں آکر بڑے بڑوں کی خودی کو جھک جانا پڑتا ہے، پیٹ کے دوزخ پر عزت و شرافت کی بہت سی جنتیں نچھاور کر دی جاتی ہیں۔

سلطانہ ——— مس سلطانہ، جس کی پچھلی زندگی کی کچھ پرچھائیاں پیچھے دکھائی جا چکی ہیں، گرلس کالج کی ایک دو نہیں پانسو لڑکیوں کی زندگیوں کی معمار تھی، بلکہ یوں کہئے کہ پانسو کنواریوں کی سیرت و کردار کی نگرانی کی ذمہ دار تھی ——— ہائے! وہ نادان گڈریا جس نے بھیڑیئے کو اپنی بکریوں کی رکھوالی سونپ دی ہو!

سلطانہ کو سوسائٹی میں سب چاہتے تھے، پرنسپل بن جانے کے بعد وہ بہت کچھ محتاط ہو گئی تھی، ہر ایک سے بے تکلف نہ ہوتی اب سے پہلے وہ جس قدر زود آشنا اور بہت جلد گھل مل جانے اور بے تکلف ہو جانے والی تھی، اتنی ہی وہ اب کم آمیز اور دیر آشنا ہو گئی تھی، اپنے عہدے کی حفاظت اور منصب کا برقرار رکھنا بھی ضروری تھا ——— مگر اس احتیاط کی بندشیں ہر جگہ سخت نہ رہتیں، ضرورت کے وقت اُن کو ڈھیلا اور نرم بھی ہو جانا پڑتا۔

خان بہادر صاحب کے دم کے شمیم سے سلطانہ کی بہت گہری دوستی تھی، وہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھے، ہر اتوار اور ہر تعطیل میں کسی نہ کسی کے یہاں دعوت ضرور ہوتی، سلطانہ ہارمونیم بجاتی اور شمیم غزلیں اور گیت گاتا۔ ——— شمیم شہر کے سب سے بڑے رئیس کا نورِ نظر تھا اور سلطانہ گرلس کالج کی پرنسپل تھی، دونوں "بدنام" تھے، بیچارے "گوچہ گرد"، "انگلی اٹھا کر بھی اُن کا کچھ بگاڑ نہ سکتے" تھے، غریب کی سچائی کا مذاق اُڑایا جاتا ہے اور مالدار کے جھوٹ کو لوگ سراہتے ہیں ——— یہ دُنیا ہے! یہاں روپیہ پیسہ کی پُوجا ہوتی ہے نیکی اور شرافت کو کوئی نہیں پوچھتا، مال و دولت کے سہارے انسانوں کی عزتیں بلند ہوتی ہیں، پاکبازی گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے اور سیہ کاروں کو مسندوں اور کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے، تاریک ضمیروں اور سیاہ باطنوں کے قصر و ایوان بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہیں اور نیک سیرتوں اور اُجلے دِل والوں اور روشن ضمیروں کے گھروں میں مٹی کے دیئے بھی نصیب نہیں۔

شام کا وقت تھا، بادل ابھی ابھی برس کر کھُلا تھا، پرنالوں سے پانی بہہ رہا تھا اور درختوں کے پتے مینہ کی بوندوں سے بوجھل ہو رہے تھے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، سلطانہ اپنے بنگلہ کے برآمدے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی ——— مگر اس کی کتب بینی کے انداز میں آج پوری طرح جماؤ نہ تھا، اُکھڑا اُکھڑا سا کچھ دیر کتاب پڑھتی اور پھر پھاٹک کو دیکھنے لگتی، باغیچہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، اتنے میں جدید ترین ماڈل کی موٹر آکر رُکی اور ایک جوان آدمی 555 سگرٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لئے ہوئے موٹر سے اُترا۔

کہاں سے آرہے ہو شمیم! ماتھے کا پسینہ پونچھو، خیر تو ہے ——— سلطانہ نے شمیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

گرجا گھر کے پاس جو نالی ہے وہاں ایک ایکسیڈنٹ accident ہوتے ہوتے رہ گیا، موٹر کے دونوں پہیے کیچڑ میں پھنس گئے، دوسری طرف سے تیزی کے ساتھ لاری آرہی تھی، خدا نے خیر کی، نہیں تو شمیم کے کفن دفن کی تیاریاں ہو...... ر ...

شمیم کی بات سلطانہ کاٹ کر بولی :-

توبہ توبہ! تمہارے دشمنوں کے منہ میں خاک اور دوستوں کے مُنہ میں گھی شکر! بدفالی کی بات زبان سے نہ نکالو، وہ جو غالب نے کہا تھا :-

ع تا خدا باشد بہادر شاہ باد!

تو تمہیں بھی ایسی ہی زندگی ملے گی ——— زندگی میں حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں!

شمیم برآمدے کی آرام کرسی پر دراز ہو گیا، ڈبہ سے سگرٹ نکالی، دیا سلائی جلانے کی کوشش کی مگر ذرا سی لو نکل کر رہ گئی، دوسری دیا سلائی کا بھی یہی حشر ہوا، تیسری بیچ میں سے ٹوٹ گئی جو بچی جل تو گئی مگر سگرٹ کے قریب لاتے لاتے بجھ گئی، شمیم جھنجلا کر بولا۔

آج نہ جانے صبح سویرے کس کا مُنہ دیکھا ہے تمام کام اُلٹے ہو رہے ہیں، پٹنہ کو ایک دوست کے نام تار بھیجا، ملازم جب تار کی رسید لیکر واپس ہوا تو خیال آیا کہ تار میں پٹنہ کی جگہ مونگھیر لکھ دیا، انگز کوڈ انجینیر صاحب سے ایک نہایت ضروری کام سے ملنے کے لئے گیا، بنگلہ پر پہونچ کر پتہ چلا کہ تیز بارش کے سبب نہر کے پل ٹوٹنے کی اطلاع پاتے ہی صاحب موٹر میں بیٹھ کر ایکا ایکی روانہ ہو گئے، سہ پہر کو ایک نہایت ہی گہرے دوست سے باتوں باتوں میں بدمزگی ہو گئی، آموں کا ذکر تھا، وہ بولا کہ مجھے لنگڑا پسند ہے میں نے کہا مجھے دسہری مرغوب ہے، بس اسی بات پر بحث جو چھڑی ہے تو کافی گرما گرمی اور تیزی کی نوبت آگئی . . .

تم تو آج نہ جانے کیا بن گئے ہو شمیم! لو میں ہاتھوں سے ہوا کو روکتی ہوں، تم دیا سلائی جلاؤ ——— سلطانہ کے کہنے پر شمیم نے دیا سلائی جلائی، سلطانہ کے ہاتھوں کی اوٹ میں شمیم نے سگرٹ سلگائی، اور اس کے ہونٹوں سے دھواں نکلنے لگا۔

شمیم نے ذرا سی دیر میں سگرٹ ختم کر دی اور پھر اسی سگرٹ سے دوسری سگرٹ سُلگا کر دھوئیں کے پیچ ہوا میں بنانے لگا، دوسری

کے بعد تیسری سگرٹ کو دو دوا فشاں بنادیا اس پر سلطانہ نے مُسکرا کر کہا۔

شمیم! میں نے انگلستان میں سگرٹ کے بڑے بڑے شوقین دیکھے ہیں، مگر تم اُن سب کے اُستاد ہو، تمہارا بس چلے تو دن رات سگرٹ کا دھواں اُڑایا کرو، اتنا زیادہ سگرٹ پینا وہ زخیوں کی نشانی ہے، شاید ابھی سے آگ اور دھوئیں سے مانوس ہونے کی مشق کی جارہی ہے ———

شمیم اس پر ایک گہری سانس لے کر بولا :-

سلطانہ! سگرٹ سے غم غلط ہو جاتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے دُکھ درد سے چھٹکارا مل جاتا ہے، اور مس سلطانہ صاحبہ ......

اس ...... سے .... سلطانہ بیچ میں بول پڑی :-

یعنی تمہیں بھی کوئی غم ہو سکتا ہے! یہ میں کیا سُن رہی ہوں، اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، تمہارے یہاں کسی بات کی کمی نہیں ہے! اور لطف یہ کہ ریاست کا سارا انتظام خان بہادر صاحب کرتے ہیں، تمہیں کسی کام کاج سے کوئی مطلب ہی نہیں! جہاں چاہو موٹر اُڑائے پھرو اور جتنا روپیہ دل میں آئے خرچ کرو، اصلی بادشاہت تو اسی کا نام ہے، فکر و غم کے ساتھ دولت ملی تو کس کام کی!

اتنے میں ملازم چائے لے کر آگیا، دونوں نے پھل کھائے، چائے پی، سلطانہ نے کئی بار چھیڑ چھیڑ کر ہنسی کی باتیں کیں، مگر شمیم مبُت بنا بیٹھا رہا۔

آخر کچھ کہو تو سہی! شمیم! یہ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے، میں نے آج کی برابر فکر مند تمہیں کبھی نہیں دیکھا، کرسمس پر ٹینس کے فائل میں جو تم ہارے تھے اُس وقت بھی تم کو اتنا غم نہ تھا ——————— سلطانہ نے شمیم کو ٹھوکا دے کر کہا۔

میرے غم کا علاج تمہارے ہاتھ میں ہے، تم میرے دُکھ کی دوا کر سکتی ہو، — میری خوشی اور غم تمہاری چٹکی میں ہے، جس پلہ کو چاہے جھکا دو، جس کو چاہے اونچا کر دو ——— شمیم نے سگرٹ کا گُل جھاڑتے ہوئے کہا۔

آج تم کوئی بہت تیز سی شراب پی کر آئے ہو، جبھی تو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، تمہارے غم کا علاج اور میرے ہاتھ میں! خوب کہی تم نے! غریبوں کو کانٹوں میں کاہے کو گھسیٹتے ہو خان بہادر صاحب کے پرنس آف ویلز ——— سلطانہ نے جواب دیا۔

تو یوں کہو میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی کرنا نہیں چاہتی، تمہیں جینا ہو جیو، مرنا ہو مر جاؤ ——————— اور صاحب سچ بھی ہے :-

ع
غم بوجھ نہیں جو بانٹ لیجیے!

شمیم کے جواب پر سلطانہ کرسی گھسیٹ کر اس کے بالکل قریب آگئی اور کہنے لگی شمیم! یہ آج کیا پہیلیاں سی بوجھ رہے ہو، صاف صاف کہو، شمیم کے مُنہ سے جواب میں نکلا :-

" انیسہ ...... انیسہ .... انیسہ ...... "

سلطانہ نے چونک کر کہا :-

" انیسہ - کون انیسہ ؟ .... (پھر ذرا سوچ کر) ہمارے کالج کی لڑکی سے کیا تمہارا مطلب ہے .... "

شمیم نے جواب میں سر ہلایا، مُنہ سے کچھ نہ کہا مگر گردن کی جنبش اور تیوروں کے انداز نے سب کچھ کہہ دیا۔

تم انیسہ کو کس طرح جانتے ہو، تمہیں اُس کا کہاں سے پتہ لگ گیا، وہ تو ہمارے کالج کی سب سے زیادہ شرمیلی لڑکی ہے ——— سلطانہ نے رُک رُک کر کہا۔

عظمت النساء کو جانتی ہو (کیوں نہیں جانتی ——— سلطانہ نے جواب دیا) وہ میرے رشتہ کے ماموں کی لڑکی ہے'
اس نے انیسہ کے رنگ رُوپ اور حسن وجمال کی مجھ سے تعریف کی تھی' اسی عظمت نے ترکیب سے انیسہ کو دکھا بھی دیا' میں نے بس یوں
ہی سی جھلک دیکھی تھی اُس قلو پطرہ کی! بس اُس دن سے ہر سانس میں نشتر سا چبھتا ہوا محسوس ہوتا ہے' میں نے اُسے بہت کچھ بھلانے کی کوشش
کی' لیکن یہ کمبخت دِل ——— کسی طرح نہیں مانتا۔

ع بھلا رہا ہوں مگر یاد آئے جاتے ہیں

شمیم کے اظہار خیال پر سلطانہ نے خود ایک داستان چھیڑ دی، کہنے لگی:-

مجھے آج تک خبر نہ تھی کہ اس عظمت سے تمہاری قرابت داری ہے' صاحب! یہ لڑکی بھی حرفوں کی بنی ہے ——— شوخ و شنگ'
نظر باز' رنگین مزاج ——— کالج کی بدنامی کے ڈر سے کئی بار اس کا ہوتے ہوتے رہ گیا ہیں
نے خود معاملہ کو رفع دفع کر دیا' اسی عظمت کی دیکھا دیکھی کئی اور لڑکیاں بھی قریب قریب اس جیسی ہو گئیں' بُری بات کا آدمی کی طبیعت جلد
اثر قبول کرتی ہے' خربوزہ' خربوزے کو دیکھ کر رنگ بدلتا ہے' ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے (شمیم پھر ایک سگرٹ
سُلگاتا ہے .....)

کالج کی لڑکیاں اسکول کی لڑکیوں کی طرح نادان نہیں سیانی ہوتی ہیں' اس لئے اُن پر زیادہ کڑی نگرانی نہیں رکھی جاتی' چھوٹی موٹی
بے اعتدالیوں کو یوں بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر ضرورت سے زیادہ بے باکی اور آزادی سے خود کالج کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے ——— چھ سات
دن ہوتے یونیورسٹی ہال میں مدراس یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا لیکچر تھا' ہمارے یہاں کی لڑکیاں بھی تقریر سُننے کے لئے گئیں' ہال کے بالائی
حصہ میں زنانہ نشستوں کا انتظام تھا' مجھے رپورٹ ملی ہے کہ لیکچر کے دوران میں تین لڑکیاں اُوپر سے اُتر کر نیچے آئیں' دروازے کے قریب
سواری موجود تھی اُس میں بیٹھ کر باہر گئیں اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں گھوم پھر کر پھر وہیں آ گئیں' کالج کی ایک اُستانی اور دو مسلمانوں کا بھی
اس میں ہاتھ تھا اور عظمت النساء نے تو یہ اسکیم ہی بنائی تھی ——— ٹوکو تو مشکل ——— دھمکی دی جاتی ہے کہ ہم
لڑکیاں اسٹرائیک کر دیں گی' پرنسپل سے لے کر اُستانیوں تک کی زندگیوں کو بے نقاب کر دیا جائے گا ——— نہ ٹوکو تو بھی مشکل ———
سُننے والے نکتہ چینی کرتے ہیں کہ گرلس کالج میں بڑے سے بڑے واقعہ کو دبا دیا جاتا ہے۔ لڑکیوں کے اخلاق وہاں کی فضا میں پہونچ کر بگڑ جاتے
ہیں' ایک مقامی اخبار نے ذرا دبے لفظوں میں ایک بار لکھا تھا کہ ہمارے شہر کے گرلس کالج کی لڑکیاں نوے فی صد مرضِ محبت کی مریض ہیں ———
بات تو تھی مذاق کی' مگر صاحب! لکھنے والے نے غلط نہیں لکھا تھا' عشق بازی کی بیماری میں قریب قریب سبھی مبتلا ہیں' کوئی کم کوئی زیادہ!
کسی کی تگ و دو تاک جھانک اور خطوں کے آنے جانے تک محدود ہے اور کوئی ان تمام مرحلوں سے گزر چکی ہے' بعض لڑکیاں انیسہ جیسی
بھی ہیں' نیک سیرت اور خوش اعمال! مگر اس میں طوفان میں رہ کر سر دامن کا بھی تر نہ ہونا "معجزے" سے کم نہیں ——— اور ———

سُلطانہ کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ اتنے میں ایک موٹر سائیکل پھٹ پھٹ کرتی ہوئی سیڑھیوں کے پاس آ کر رُکی اور
ایک ادھیڑ عمر کا آدمی برآمدے میں آ گیا' علیک سلیک ہوئی' وہ اپنی لڑکی کے داخلہ کے سلسلہ میں پرنسپل صاحب کے پاس آیا تھا' بات ذرا
سی تھی مگر اُس نووارد نے ایک داستان چھیڑ دی' ایران توران کی باتیں کرنے لگا ——— شمیم نے خود بھی محسوس کیا کہ سلطانہ
پر آج پاکبازی اور نیک چلنی کا دورہ پڑ رہا ہے' انیسہ کا معاملہ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھنا چاہیے' اسلئے وہ وہاں سے چلا آیا۔

سُلطانہ سے شمیم کی بے تکلفی تھی' بے تکلفی نہ بھی ہوتی تو پرنسپل کے عہدے پر مستقل ہو جانے کا مسئلہ بھی کم اہم
نہ تھا' وعدہ کیا گیا کہ تمام اُمیدواروں کے مقابلہ میں تم کو ترجیح دی جائے گی' انتظامیہ کمیٹی کے ممبروں کو

ہموار کر لیا جاتے گا اور اصل فیصلہ تو خان بہادر صاحب کے ہاتھ میں ہے، وہ جو چاہیں گے وہی ہو گا، ان کی مرضی کے سامنے کسی مہر کی کچھ چل نہیں سکتی ـــــ یہ بہت بڑا لالچ تھا ـــــ اُس کے بعد سلطانہ کے یہاں ہدیوں اور تحفوں کی بھرمار کی گئی، جیسی جیسی وہ اس سلسلہ میں کارگزاری کر رہی تھی، ویسی انداز پر شمیم سے نوازا جاتا، سلطانہ کے ڈرائنگ روم میں نہایت دیدہ زیب ایرانی قالین بھی آگیا، پرانی الماریاں بھی بدل دی گئیں ـــــ سلطانہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ شمیم میں ترقی بھی ہو جائے گی خان بہادر صاحب کے اثرات کی بدولت معاملہ بڑھنے نہ پائے گا۔

سلطانہ کالج کی پرنسپل تھی ہر لڑکی اُس کی چشم کرم کی منتظر رہتی، انیسہ پر جو اُس کی توجہ ہوئی تو وہ بیچاری بھولی بھالی لڑکی خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی، دفتر کے بعد اب کبھی کبھار بنگلہ پر بھی اُسے بلایا جانے لگا، ان تہہ دیوں میں شمیم کا ذکر ضرور آتا، سلطانہ تجربہ کار تھی اور اس منزل کے ایک ایک پیچ و خم سے آگاہ! اُس نے کوئی ناگوار اور انیسہ کی خلاف طبیعت بات ظہور میں ہی نہ آنے دی، اُس معصوم لڑکی کو وہ ایک ایک انچ دھیرے دھیرے دلچسپیوں کی منزل کی طرف لے جا رہی تھی ـــــ نئے آدمی کو شروع شروع میں ایک آدھ گھونٹ سے زیادہ شراب نہیں پلائی جاتی اور وہ بھی اس انداز سے کہ ذراسی شراب اور بہت سا پانی ـــــ یہ نفسیات کی نزاکتیں ہیں، ہر کوئی ان سے واقف نہیں ہوتا، اس کے لئے تجربہ درکار ہے، اناڑی شکاری کی بے صبری اور گھبراہٹ سے پھنسا ہوا شکار جال سے نکل جاتا ہے۔

اب یہاں تک ہو گیا کہ ایک کمرے میں سلطانہ اور انیسہ دونوں بیٹھی ہیں اور دوسرے کمرے میں شمیم موجود ہے، سلطانہ اندر سے کہتی ہے کہ یہ انیسہ آپ کو آداب کہہ رہی ہیں، شمیم جواب دیتا ہے کہ میرا بھی ایک عدد آداب کہہ دیجئے، مگر صاحب! سلام و آداب کی یہ نمائندگی آخر کب تک ہوتی رہے گی، کہنے والا دو بول اپنے منہ سے بھی تو کہہ سکتا ہے، آواز کا پردہ تو کہیں سُننے میں نہیں آیا، مگر ہم اس قابل کہاں ہیں، جاہل جو ٹھہرے! ـــــ یہ نوک جھونک بڑھ رہی تھی، انیسہ ان واقعات کا گھر والوں سے ذکر کر دیتی تو یہ لے بڑھنے نہ پاتی! اُس نے ان باتوں کو چھپایا ـــــ اور یہ نفس کی پہلی چوری تھی جس نے دوسرے کی ہمت بڑھائی اور آئندہ کی دلچسپیوں کیلئے زمین ہموار کر دی، ایسے معاملات میں اخفائے راز ہی سب سے بڑی معصیت ہے، یہ شیطان کی پہلی جیت ہوتی ہے۔

انیسہ نیک لڑکی تھی، اس کا گھریلو ماحول بھی سیدھا سادا تھا، جسے تہذیب کی اصطلاح میں "قدامت پرست" کہہ سکتے ہیں، وہ تنہائی میں ان باتوں پر غور کرتی تو اس کا ضمیر چٹکی لیتا کہ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں، پرنسپل صاحبہ کی یہ نوازش بے سبب کوئی نہ کوئی گہرا مفہوم ضرور رکھتی ہے! مگر اس کے ساتھ ہی رومیو جولیٹ کے معاشقے، قلوپطرہ کے حسن و ہوس کی داستان، مشہور شاعر شیلی کی عشق بازیوں کے افسانے، اپنے نقوش کو اُبھار اُبھار کر ضمیر کی اس تنبیہ کو بے اثر بنا دیتے ـــــ اور پھر سلطانہ اُس سے جب ملتی یہی تذکرہ رہتا کہ یورپ میں عورتوں کو آزادی مل جانے سے معاشرت اس طرح ترقی کر رہی ہے، جذبات کو بیڑیاں پہنا کر رکھنا کونسی انسانیت ہے مرد جو چاہیں کریں اور عورت کی انگلی کا ذرا سا پور ابھی بے نقاب ہو جائے تو آفت آجاتی ہے کہ یہ بے غیرتی ہے، بداخلاقی ہے! مردوں کا یہ ظلم زیادہ دن تک گوارا نہیں کیا جا سکتا ـــــ بے حیائی یقیناً بُری چیز ہے مگر بات چیت کی تفریح اور ذرا دیر کے لئے دل بہلانے کے سامان ہو جائیں تو اس میں کیا بُرائی ہے ـــــ پرنسپل صاحبہ کی یہ نصیحتیں ضمیر کی آواز کو اُبھرنے ہی نہ دیتیں، بُرائی کانوں کی راہ سے بار بار ہی تھی۔

ع آدمی فربہ شود از راہِ گوش

مگر یہاں گوشت پوست نہیں جذبات توانا ہو رہے تھے۔ اس شراب دوشیدہ میں کچھ کچھ نشہ پیدا ہو چلا تھا، ہوس کی "نبیذ" "خمر" بننے کے قریب تھی۔

انیسہ کا شمیم سے آمنا سامنا بھی ہوگیا ——— اور ہو کیا گیا کرا دیا گیا، اَن پڑھ کٹنیاں آسمان میں تھگلی لگا دیتی ہیں اور یہاں تو پڑھی لکھی کٹنی درمیانی واسطہ بنی ہوئی تھی، جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا، ذہین اور تعلیم یافتہ جب بدمعاشی پر اُترتا ہے تو اس کی ذہانت فریب و معصیت میں جدتیں پیدا کرتی اور نئی نئی راہیں نکالتی ہے، جاہل چور، گرہ کٹ جو بیٹ اُٹھائی گیرے کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتا۔

انیسہ کا سلطانہ کے یہاں بار بار جانا گھر والوں میں اس کے بڑے بھائی نذیر کو سب سے زیادہ کھٹکنے لگا، نذیر بھی اسی زمانہ کا نوجوان تھا، وہ فطرتاً شریف اور پاکباز تھا مگر سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی اسے تھوڑی بہت خبر تو ضرور تھی، پھر بہن کی عصمت و ناموس کا معاملہ تھا وہ ہر بات کو اور زیادہ غور و فکر کی نگاہوں سے دیکھنے لگا، انیسہ کے بارے میں تو اسے کچھ معلوم نہ ہوسکا، لیکن سلطانہ کی بہت سی باتیں اس کے علم میں آگئیں ——— ظاہر ہے کہ ایسی عورت کی ہم نشینی، میل ملاپ، ربط ضبط اور آنا جانا کسی خطرے اور علت سے خالی نہ تھا، کالج میں اور بھی تو لڑکیاں تھیں، آخر انیسہ میں کون سے لعل ٹنکے تھے اور پھر کالجوں کی پروفیسر عورتوں اور خود پرنسپل صاحبہ کا طالبات سے اس قدر بے تکلف ہونا بھی ٹھیک نہ تھا ——— اس قسم کے اندیشے نذیر کے ذہن میں آتے تھے، انیسہ کی غیر معمولی خوبصورتی بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتی کہ یہی چیز دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی ——— قیمتی چیز کو دیکھ کر ہر کسی کا دل للچانے لگتا ہے، بیش بہا زیور معمولی چیزوں کے مقابلہ میں اور زیادہ حفاظت سے رکھے جاتے ہیں، اسی اصول کے تحت معمولی شکل و صورت کی لڑکیوں کے مقابلہ میں حسین اور خوش منظر لڑکیوں پر اور زیادہ نگرانی رکھنے کی ضرورت ہے۔

معاملہ بہت ہی نازک تھا، انیسہ سے کھُل کر کہنا بھی مناسب نہ تھا ——— صرف شبہ کی بنا پر شدت نہیں برتی جا سکتی، اگرچہ محتاط اور دُور اندیش لوگ اس شدت کو بھی جائز سمجھتے ہیں، اس نے ایک دن باتوں باتوں میں انیسہ سے کہہ دیا کہ پرنسپل صاحبہ کے یہاں تمہیں اتنی جلد جلد جانے کی کیا ضرورت ہے، کوئی بات پوچھنی ہو تو میں موجود ہوں، ہمارے گھر میں ہر طرح کی کتابیں، شرحیں، ڈکشنریاں اور Digests موجود ہیں اُن سے ضرورت کے وقت مدد لی جا سکتی ہے۔

نذیر کو یقین تھا کہ انیسہ کے لئے آج کے وہ فقرے بہت کچھ ہیں، اب وہ وہاں جانے کا نام بھی نہ لے گی ——— مگر انیسہ اب بدل چکی تھی، چھ مہینہ ہی میں پرنسپل صاحبہ کی عنایتوں نے اسے کافی شوخ بنا دیا تھا بلکہ اس کے خوابیدہ جذبات کو چونکا دیا تھا۔ بھائی کے یہ جملے اسے خود بہت گراں محسوس ہوتے، اس کی دلچسپیوں کی گرم جوشیاں ایکا ایکی سرد پڑ گئیں، دو ہفتہ تک وہ ضبط کرتی رہی مگر آغوشِ تمنّا کی تنہائی نے اُکسایا کہ اس طرح کب تک جذبات کا دم گھٹتا رہے گا، اس بے کیف زندگی نے تو دن رات پہاڑ بنا دیئے جو کسی طرح کٹنے کا نام نہیں لیتے۔

نذیر ایک دن صبح سویرے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے گیا تھا شکار سے واپسی شام سے پہلے تو ہوتی ہی نہ تھی، کبھی کبھی تو کئی کئی دن ہو جاتے، شمیم کا بلاوا پرنسپل صاحبہ کی وساطت سے کئی بار آچکا تھا، دوالی کی چھٹیاں تھیں، چھٹیوں میں یوں بھی باہر آنے جانے کو دل چاہتا ہے، انیسہ نے اپنی ماں سے کہا کہ پرنسپل صاحبہ نے یاد فرمایا ہے کوئی ضروری کام ہے، میں بہت جلد واپس آجاؤں گی۔ بس گئی اور آئی، انیسہ کی والدہ خاموشی کے ساتھ نہانے کے لئے چلی گئیں، انیسہ نے سوچا کہ وہاں سے آکر امی جان سے کہہ دوں گی کہ بھائی جان سے میرے پرنسپل صاحبہ کے ہاں جانے کا ذکر نہ کیا جائے۔ وہ میری بات ضرور مان لیں گی میری ذرا سی ناخوشی بھی انہیں گوارا نہیں ہوتی ——— ماں کے غسل خانہ سے نہا کر باہر آنے کا وہ انتظار کرتی تو دیر ہو جاتی۔

شمیم نہایت بے تابی کے ساتھ سلطانہ کے بنگلہ میں انیسہ کا انتظار کر رہا تھا، بار بار انگلیاں چٹخاتا اور جمائیاں لیتا اتنے میں انیسہ آن پہنچی، شمیم نے آگے بڑھ کر پیشوائی کی، سلطانہ کا ملازم وہاں نہ ہوتا تو شاید وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا، اس کے ہاتھ ادھر کو اٹھ کر رُک گئے، شمیم نے کہا کہ چلو! موٹر میں بیٹھو، سلطانہ بھی تیار ہیں، آج جنگل میں پک نک رہے گی، تھوڑی دیر سیر سپاٹا! انیسہ بولی کہ

نذیر بھائی واڈ مجھے کھائے جاتا ہے انہوں نے دیکھ لیا تو بس قیامت ہی آجائے گی، شمیم نے جواب دیا" نذیر تو ڈپٹی صاحب کے لڑکوں کے ساتھ یہاں کوئی پندرہ بیس میل پر ہرن کا شکار کھیلنے گیا ہے، ہرن کے شکار میں میلوں پیدل پھرنا پڑتا ہے وہ لوگ شام سے پہلے کیا واپس ہوں گے، انیسہ خاموش ہوگئی، یعنی یہ کہ میں تیار ہوں، سلطانہ بھی اونچی ایڑی کا جوتہ پہنے کھٹاو کھٹ کرتی آئی اور تینوں موٹر میں بیٹھ کر چل دیئے۔

شہر کی حدود جب تک رہیں شمیم موٹر چلاتا رہا اور یہ دونوں پردے میں پیچھے کی نشست پر بیٹھی رہیں، شہر کے باہر پردے نکال دیئے گئے، انیسہ سامنے آگئی اور ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگیں،

انجان لوگ تم دونوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ میاں بیوی ہوا خوری کر رہے ہیں ——— سلطانہ نے کہا

میاں بیوی تو بڑی غیر دلچسپ سی بات ہے، اس میں ملّاپن کی بو آتی ہے، یوں کہو محبوب و محب بیٹھے ہیں، دو محبت کرنے والی روحیں یکجا ہیں، چاند اور چکور کا ساتھ ہے، گل و بلبل کی یکجائی ہے ——————— شمیم نے انیسہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ہونی بات ہو کر رہتی ہے، کوئی تدبیر اور احتیاط اسے ٹال نہیں سکتی، واقعات کا روکنا کسی کے بس کی بات نہیں، چاہے جتنے جتن کیوں نہ کیجئے قسمت میں جو لکھا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، وہ انسان جو چاند کے غاروں تک کا کھوج لگا سکتا ہے نہیں جانتا کہ کل کیا ہونے والا ہے رصدگاہیں موسم کا حال بتا سکتی ہیں، مگر زندگی کے آنے والے حادثات معلوم کرنے کا آلہ اب تک وجود میں نہیں آیا۔

جس علاقہ میں نذیر اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے کیلئے گیا تھا وہاں اتفاق سے کوئی بہت بڑا فوجی افسر شکار کھیلنے کے لئے آدھمکا، بڑے بڑے راستوں پر پولیس کا انتظام تھا، کسی بندوقچی کو ادھر جانے نہ دیتے، انگریز کی شکارگاہ میں کالے آدمیوں کو پاؤں دھرنے کی بھی اجازت نہیں مل سکتی، سب لوگ لوٹ آتے، ایک کارتوس بھی کام نہ آسکا، ایک دوست نے کہا بھی کہ دوستو! اتنے ڈرتے کیوں ہو، انگریز افسر نے اس علاقہ کو اپنے لئے کوئی محفوظ نہیں کرا لیا، یہ سب رعب ڈالنے کی باتیں ہیں، قانونی طور پر ہمیں شکار کھیلنے سے کوئی روک نہیں سکتا، سب نے کہا کہ بھیا! جنگ کا زمانہ ہے، آرڈیننسوں کی حکومت ہے، قانون کو کون پوچھتا ہے فوجی افسر نے جھوٹی بھی لگادی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے!

نذیر اپنے دوستوں کے ہمراہ شہر کو واپس ہوگیا، دو موٹریں تھیں ——— خاکی لباس، بندوقیں، کارتوسوں کی پیٹیاں، پانی کی چھاگلیں ناشتے دان اور تھرماس بھی، نذیر اپنی کار چلا رہا تھا، آج کی ناکامی بلکہ پسپائی سے سب ملول تھے، دل کے ارمان دل میں رہ گئے ———

راستہ کا سنگِ میل بتا رہا تھا کہ شہر اس مقام سے چار میل رہ گیا ہے، یہاں اینٹوں کا بھٹہ تھا اور دھرم شالہ کے باغ میں پیاؤ تھی، راہگیر دھرم شالہ کے چبوترے پر ستاتے اور پانی پیتے، چنے مرمرے، گڑ کے سیو، مونگ پھلیاں اور بیڑی یہاں ملتی تھیں، مفت نہیں مول، اور جنگل میں ان چیزوں کا مول ملنا بھی نعمت سے کم نہ تھا۔

ادھر سے نذیر کی موٹر جا رہی تھی اور ادھر شہر کی سمت سے شمیم آرہا تھا، نذیر کی بہن انیسہ اس کے قریب نشست پر زانو سے زانو ملائے بیٹھی تھی، پیچھے کی سیٹ پر سلطانہ تھی، خوب گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں، دھرم شالہ کے پاس کپاس کی گاڑیاں کھڑی تھیں، شمیم کی موٹر کو رک جانا پڑا، نذیر نے بہن کو دیکھا تو پہلی بار اسے یقین نہیں آیا وہ سمجھا کہ آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، کبھی کبھی تصور فریب بھی دے دیا کرتا ہے مگر اس غلط اندیشی اور خوش فہمی کے لئے گنجائش کہاں تھی، آنکھوں دیکھی بات کو کس طرح جھٹلایا جاسکتا تھا۔

نذیر کی آنکھوں میں لہو اتر آیا، چہرہ ایکا ایکی بھیانک بن گیا، غیرت نے جذبات میں شتابہ لگا دیا، کسی دلیل اور استفسار کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ کچھ باز پرس کرتا تو یہ بزدلی کی بات تھی ——— بندوق اس کے پاس دھری تھی، کارتوسوں کی پیٹی اس کے گلے میں حائل

تھی، ہر جس کی جیب میں بھی کچھ کارتوس پڑے تھے ——— بندوق کے فیر کی مسلسل آوازیں ——— تڑ، تڑ، تڑا......، نتیجۃً سلطانہ اور شمیم گولی کھا کر تڑپنے لگے، شیر مارنے کے کارتوسوں کا آدمی کیا مقابلہ کرتے، زخمیوں نے اُف بھی نہ کی، اور کی بھی ہو تو اُن کے منہ دہانے سے وہاں کان لگاتے کون بیٹھا تھا، موٹر کار میں خون ہی خون نظر آتا تھا ——— اور تین لاشیں......!

موٹر پر فیر کرچکنے کے بعد، نذیر نے بندوق کی نال موڑ کر اپنی چھاتی پر رکھی تو اس کے ساتھی نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کہنے لگا۔

"حرام موت نہ مرو نذیر! تمہاری غیرت اپنا فرض ادا کرچکی"

جنگل میں سناٹا طاری تھا، سب دم بخود تھے، آدمی تو آدمی پرند سہمے جارہے تھے، تین لاشوں کا لہو مل جل کر بہ رہا تھا ——— پتلون، شلوار اور ساری لہو میں رنگ کر ٹوٹل کی طرح لال ہوگئے تھے، اور موت کا فرشتہ اپنا کام کرکے جاچکا تھا۔

مضمون نگار صاحبان سے

ہر رسالہ اور اخبار کی اپنی خاص پالیسی ہوتی ہے اور معیار بھی! جو حضرات اپنی محبت اور مہربانی سے "فاران" کی قلمی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے "فاران" کو پڑھ کر اس کے معیار اور مقاصد کا اندازہ فرمالیں، مضامین کے انتخاب میں ہم کسی تعلق، دوستی اور شہرت کا لحاظ نہیں کرتے، کسی کی دلدہی کے لئے "فاران" کا معیار بھی پست نہیں کیا جاسکتا، اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ خود ہماری طرف سے اپنے مقصد اور معیار کے خلاف بغاوت ہوگی۔

یہ بھی ہوسکتا ہے (اور ایسا ہو بھی چکا ہے) کہ کسی صاحب سے ہم فرمائش اور اصرار کرکے مضمون طلب کریں اور وہ مضمون ہمارے انتخاب میں نہ آسکے، کسی بڑے سے بڑے مضمون نگار کا ہر مضمون شاہکار نہیں ہوسکتا، کبھی پست چیزیں بھی قلم سے نکل جاتی ہیں ——— مضامین میں اضافہ و ترمیم کا بھی ہم کو حق حاصل ہے۔

نظم و نثر کے جن مضامین کی اشاعت "فاران" میں ہوسکتی ہے، اس کے بارے میں دفتر سے عام طور پر اطلاع دیدی جاتی ہے مگر ہر مضمون قریبی اشاعت میں شریک نہیں ہوسکتا۔ افادیت اور اہمیت کے علاوہ مضامین پہونچنے کی اولیت اور تقدیم کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے ——— تو اس خصوص میں مضمون نگار اور شعرا صاحبان صبر و ضبط سے کام لیں اور انتظار کی زحمت سے گھبرا کر اپنے مضامین کہیں اور چھپنے کے لئے ہرگز نہ بھیجیں ——— مطبوعہ مضامین (نظم و نثر) سے ہمیں معاف رکھا جائے اور اس اذیت سے ہمیں بچایا جائے۔

اہلِ علم اور اربابِ ادب عالی ظرف اور بلند نگاہ ہوتے ہیں، صرف اس لئے کہ اُن کے مضامین کسی رسالہ کے انتخاب میں نہ آسکے ——— وہ ناراض نہیں ہوا کرتے، اس قسم کی خفگی "طفلانہ" ہوتی ہے، شاعروں اور انشا پردازوں کو چاہے وہ کتنے ہی کم شہور اور نو مشق کیوں نہ ہوں، اخلاق و سنجیدگی کے بلند مقام پر ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ گزارش ہے، درخواست ہے اور ایک فرض شناس دل کی دردمندانہ اپیل! ان ذمہ داریوں کا خیال رکھتے ہوئے ہمیں قلم و انشا کا تعاون حاصل ہوگا تو اس کیلئے ہم کو مجسم سپاس و تشکر پایا جائے گا۔

مخلص نیاز کیش:- مدیر "فاران"

رُوحِ انتخاب

گاہے گاہے باز خواں ۔۔۔!

حکمت کے موتی

میں نے دریا کے کنارے ایک پارسا کو دیکھا کہ بیچارے کے جسم پر چیتے کے پنجے کا زخم ہے جو کسی دوا دارو سے اچھا نہیں ہوپاتا، اس غریب پر ایک مدت اسی تکلیف میں گزر گئی مگر اس حال میں وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتا، لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بھئی! یہ شکر بھیجنے کا کیا محل ہے، پارسا نے جواب دیا شکر اس بات کا کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوں کسی معصیت میں مبتلا نہیں ہوں۔

—— ایک بادشاہ نے ایک پاکباز شخص سے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ کیا کبھی ہماری یاد بھی آتی ہے؟ پارسا نے جواب دیا۔ ہاں! اُس وقت جب کہ میں خدا کو بھول جاتا ہوں۔

—— ایک بادشاہ کے یہاں ایک زاہد کی دعوت ہوئی، زاہد نے شاہی دسترخوان پر اپنی روزمرّہ کی خوراک سے بہت کم کھانا کھایا اور جب نماز کا وقت ہوا، تو معمول سے زیادہ دیر تک نماز پڑھی، قصرِ شاہی سے گھر لوٹ کر زاہد نے کھانا مانگا، اس کے لڑکے نے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ قبلہ آپ تو بادشاہ کی دعوت میں تشریف لے گئے تھے کیا وہاں کھانا نہیں کھایا، زاہد نے جواب دیا:۔

"درنظرِ ایشاں چیزے نخوردم کہ بکار آید"

لڑکے نے جواب دیا:۔

"نماز را ہم باز گرداں کہ چیزے نکردہ کہ بکار آید"

—— کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نوشیرواں بادشاہ کیلئے شکارگاہ میں ایک شکار کے کباب بنائے جارہے تھے، اتفاق کی بات کہ نمک موجود نہ تھا، بادشاہ نے غلام کو گاؤں کی طرف دوڑایا اور اس سے کہا کہ دیکھنا! نمک مفت نہ لینا، قیمت دے کر حاصل کرنا، تاکہ یہ بری رسم نہ پڑجائے، اور گاؤں برباد نہ ہوجائے، لوگوں نے نوشیرواں کی خدمت میں عرض کیا کہ ذرا سے نمک سے کیا نقصان ہوجائے گا، بادشاہ نے جواب دیا کہ شروع شروع میں ظلم اس دُنیا میں بہت تھوڑا تھا، جو آتا گیا اس پر اضافہ کرتا گیا —— اور اب اس انتہا تک پہنچ گیا۔

اگر زباغِ رعیت ملک خورد سیبے — بر آورند غلامانِ او درخت از بیخ
بہ پنج بیضہ کہ سلطاں ستم روا دارد — زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

—— ایک مولوی صاحب کی لڑکی بہت زیادہ بدصورت تھی، مولوی صاحب نے بھاری جہیز دینے کا لالچ دیا، مگر کوئی خدا کا بندہ اُس

لڑکی کے ساتھ بیاہ کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر مولوی نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک اندھے کے ساتھ کر دیا۔ اتفاق کی بات اُنہی دنوں میں سرآندیپ کا ایک مشہور طبیب اُس شہر میں آگیا۔ یہ طبیب آنکھوں کا علاج کیا کرتا تھا، لوگوں نے مولوی سے کہا کہ اپنے داماد کی آنکھوں کا علاج کیوں نہیں کراتے، مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اگر اُس کی آنکھیں بینا ہو گئیں تو مجھے خوف ہے کہ وہ میری لڑکی کو کھٹ سے طلاق دے دیگا۔

—— ہارون رشید کا ایک بیٹا غصہ کے مارے لال بھبوکا بنا ہوا باپ کے پاس آکر فریادی ہوا کہ فلاں سپاہی کے چھوکرے نے مجھے ماں کی گالی دی ہے، خلیفہ نے اہلِ دربار سے پوچھا کہ جو کوئی ایسی گستاخی کرے۔ اس کی سزا کیا ہے، درباریوں میں سے ایک نے کہا کہ اُس کی گردن اُڑا دینی چاہیئے، دوسرا بولا' اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور کسی نے تاوان اور جرمانہ کی بھی رائے دی —— خلیفہ نے بیٹے سے کہا..... دیکھو بیٹا! شانِ کرم تو یہ ہے کہ تم اُسے معاف کر دو۔ اگر یہ نہ کر سکو تو تم بھی اسے ماں کی گالی دے لو...... مگر دیکھنا! انتقام حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے ورنہ پھر تمہاری طرف سے ظلم کا ارتکاب ہوگا اور دوسری طرف سے فریاد و دعویٰ! (گلستانِ سعدی)

سامری کون تھا؟

"سامری" کے اس الوکھے قریب نے ایک محقق کے لئے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ یہ شخص اسرائیلی تھا یا کون؟ اور یہ "سامری" اس کا نام ہے یا لقب؟

نجار کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر جرائد میں عیسائیوں نے یہ سوال اُٹھایا ہوا ہے کہ سامری "سامرہ" کی جانب منسوب ہے اور سامرہ شہر اُس وقت تک آباد نہیں ہوا تھا لہٰذا قرآن کے اس واقعہ میں سامری کے ذکر کے کیا معنی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "سامری" سامرہ شہر کی جانب منسوب نہیں ہے اور نہ منسوب ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ شہر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود نہ تھا بلکہ بہت زمانہ کے بعد عالمِ وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ شامر کی جانب منسوب ہے اور یہ عبرانی لفظ ہے، یہ جب عربی میں منتقل ہوا تو "ش" س کے ساتھ تبدیل ہو کر "سامر" ہو گیا، خود عبرانی بولنے والی دو شاخیں سبطِ افرائیم اور سبطِ یہوذا میں سے افرائیمی "س" بولتے ہیں اور یہوذا "ش"! چنانچہ عبرانی میں "شومیر" بولا جاتا ہے اور "شمر" کے معنی حرس (حفاظت) کے ہیں لہٰذا شومیر یا شامر یا سامر کے معنی حارس (محافظ) کے ہیں اور اسی کی نسبت سے "سامری" بولا جاتا ہے۔ (قصص القرآن حصہ دوم مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

ہندی کے مسلمان شاعر

ملک محمد جائسی ہندی کے ایک ممتاز مثنوی نگار ہیں، تاریخ ولادت اور تاریخ وفات تحقیق سے نہیں کہی جا سکتی، آپ جائس ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ امیٹھی کے راجہ نے ازراہِ قدر دانی اپنے پاس بلا لیا تھا اور وہیں انتقال فرمایا۔

آپ کی مشہور مثنوی پدماوت میں راجہ رتن سین اور پدماوتی کے عشق کی کہانی منظوم ہے۔ یہ مثنوی سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں تصنیف ہوئی اس میں جائس کے نواح کی دیہاتی زبان کا عنصر غالب ہے۔

ہندی شعروں کا ترجمہ ہے۔

—— راجہ راج پاٹ چھوڑ کر فقیر کی طرح یوں خالی ہاتھ جا رہا ہے جس طرح ایک ہارا ہوا جواری یکبارگی ہاتھ جھاڑ کر اُٹھتا ہے —— جب تک رُوح تھی یہ جسم رتن کہلاتا تھا اب اس کے بغیر ایک کوڑی کے مول کا نہیں۔

راجہ رتن سین کی پہلی رانی ناگ متی اپنے شوہر کی فرقت میں اس طرح اظہارِ جذبات کرتی ہے:-

اے بھونرے اور کوے! میرا پیام میرے ساجن سے جا کر کہہ دے کہ وہ تیری فرقت میں جل کر مرگئی، اور اس کے دھوئیں سے ہمارا رنگ کالا ہو گیا ہے۔

—— بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے مشہور درباری عبدالرحیم خان خاناں سے کون واقف نہیں، فارسی کے بے مثل شاعر ہونے کے علاوہ آپ ہندی کے ایک سربرآوردہ شاعر گزرے ہیں۔ سنہ ۱۶۱۰ بکرمی میں پیدا ہوئے سنہ ۱۶۸۲ بکرمی میں وفات پائی۔ آپ کے متعلق سخاوت اور اہلِ ہنر کے نوازنے کے بہت سے قصے مشہور ہیں، مشہور فارسی غزل گو نظیری اور ہندی کے جہاکوی گنگ آپ ہی کے دامن دولت سے وابستہ تھے —————— کہتے ہیں :-

درخت خود پھل نہیں کھاتے اور تالاب اپنا پانی آپ نہیں پیتے، اے رحیم! نیک بندے اپنا زر و مال دوسروں پر صرف کرتے ہیں۔

—— اے رحمٰن! آنکھ سے ڈھلک کر آنسو دل کا دکھ ظاہر کر دیتے ہیں، جسے تم گھر سے نکال دو گے وہ تمہارے بھیدوں کو دنیا پر کیوں نہ ظاہر کرے گا۔

—— اے رحیم! بُروں کی صحبت میں رہ کر دوش کیوں نہ لگے، کلال کے ہاتھ میں دودھ بھی ہو تو سب اسے شراب کہیں گے۔

—— عثمان کا وطن غازی پور اور والد کا نام شیخ حسن ہے، جہانگیر کا زمانہ پایا، کاشی نگری پر جارنی سبھالے آپ کی ایک مثنوی شائع کی ہے جس کا نام چترآولی ہے اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۲۲ھ ہے —————— فرماتے ہیں :-

—— محبوب کی نگاہیں دزدیدہ نگاہی کے تیروں سے رشتۂ حیات توڑ دیتی ہیں۔ لیکن لبِ لعلیں کی مسیحا نفس باتیں امرت پلا کر دوبارہ زندگی بخش دیتی ہیں۔

(اردو زبان کا یہ مشہور مصرعہ اسی دوہے کی صدائے بازگشت ہے :-

ع آنکھ سے مارا لبِ نازک سے زندہ کر دیا)

—— محبوب کے رُخِ زیبا کا خال مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ جانو کہ بھونرا کھلتے ہوئے کنول کی بلائیں لے رہا ہے۔

آخر میں خاندانِ مغلیہ کی آخری یادگار ابو ظفر محمد سراج الدین کا بھی ایک ہندی شعر سُن لیجیے :-

نین کھلے کچھ اور ہی دیکھوں، مُوندوں تو کچھ اور ہی اور

کوئی واکو سانچ نہ جانے، دیکھی بات کہوں جا سے

(عرش ملسیانی)

ہماری نظر میں

خاص نمبر "افکار"

نگراں :- حکیم سید قمر الحسن، ترتیب دینے والے :- صہبا اور رشدی
زرِ سالانہ چھ روپئے، اس خاص نمبر کی قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ حجم ۱۵۲ صفحات
ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "افکار" بھوپال

بھوپال کے مشہور ماہنامہ "افکار" نے کتابت و طباعت کی دیدہ زیبی اور مضامین کے تنوع کے ساتھ خاص نمبر پیش کیا ہے، خاص نمبر کا آغاز "اشاریہ" سے ہوتا ہے جس میں افکار کے ادارے نے سب سے پہلے اُن ترقی پسند مصنفین کی گرفتاری اور قید و بند پر احتجاج کیا ہے جو حکومت ہند کے معتوب ہیں ——— کسی کی مصیبت اور پریشانی کسی شریف آدمی کے لئے وجہ مسرت نہیں ہو سکتی ——— مگر ہم اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جن شاعروں اور ادیبوں کے افکار نے نام گنوائے ہیں وہ سب کے سب کمیونسٹ ہیں اور پاکستان ہو یا ہندوستان، یہاں کی حکومتیں کمیونزم کی (Underground) کوششوں کو برداشت نہیں کر سکتیں بالکل اسی طرح، جس طرح سوویٹ روس میں کمیونزم کے علاوہ کسی اور سیاسی نظریہ کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جا سکتی ——— ادب کمیونزم کا پہلا محاذ ہے یہاں تک کہ اس محاذ کا ڈانڈا آگ اور خون کی تباہیوں سے جا کر مل جاتا ہے، یہ توہمات نہیں، مشاہدات اور واقعات ہیں

ایک ہنگامہ کے عنوان سے صفیہ اختر صاحبہ نے "کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال" کی روداد قلمبند کی ہے، یہ روداد بہت مفصل اور طویل ہونے کے باوجود دلچسپ اور لطف انگیز ہے، اس کے آغاز کی منظر کشی کیا ہے۔ بہاریہ قصیدہ کی تشبیب ہے۔

کانفرنس اور مشاعرے کے اہتمام و آرائش کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے :-

" منٹو ہال کے عالی شان ستون، نقشین محرابیں، بلند و مرصع چھتیں بذاتِ خود بڑی پر کشش ہیں، آج سجاوٹ نے ہال میں زندگی کی لہر سی دوڑا دی تھی، استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کے سینوں پہ سجے ہوئے خوش رنگ نشان اُن کے دل کی دھڑکن کی غمازی کر رہے تھے موٹریں آ آ کر رکیں اور دیکھتے دیکھتے ہال بھر گیا، .... مشاعرے کی رات کی سی رونق منٹو ہال میں اس سے پیشتر دیکھی ہی نہ گئی اسٹیج پھولوں سے سجایا گیا تھا، اجلی چاندنی، گاؤ تکیے اور قالین .... "

اور اس واجد علی شاہی بزم میں مزدوروں کی تباہ حالی کے مرثیے پڑھے گئے، مزدوروں کے ان عیش پسند دردمندوں کے لئے سب مل کر "زندہ باد" کا نعرہ لگاؤ کہ "ترقی" و "انقلاب" نے کیسی کیسی آسانیاں بلکہ دلچسپیاں بہم پہنچا دی ہیں، اس اہتمام کے ساتھ کہیں اور جلسہ یا مشاعرہ ہوتا تو انقلاب کی بارگاہ سے منشور شائع ہوتا کہ یہ فسطائیت ہے، سرمایہ داری اور امپیریلزم کے آثار ہیں! اور یہ تو ان حامیانِ مزدور اور دشمنانِ سرمایہ و دولت کی جلوتوں کا حال ہے جہاں عوام کے احتساب کا بھی خیال رہتا ہے ——— اُن کی خلوتیں نہ جانے کس کس انداز سے سنواری اور مہکائی جاتی ہوں گی۔

یہی وہ لوگ ہیں جو سرخ سویرے کے لئے
خونِ مزدور شرابوں میں ملا دیتے ہیں، (ماہر)

اس روداد منظوم کا ٹیپ کا بند تو سنئے :-

"شہر بھر کی خواتین کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا، صنفِ لطیف میں شاعری کی اس درجہ پُوچھ "حُسن آیا تھا خود منانے کو" ــــــ اور حُسن جب اقدام کرتا ہے اور کسی روٹھے کو منانے آتا ہے تو ناز و انداز اور آرائش و زیبائی سے پوری طرح لیس ہو کر آتا ہے ــــــ مگر اس مشاعرے میں جہاں مزدور کے غم میں سب لوگ تڑپ رہے تھے، صنف نازک کی گردنوں کے خم، زُلفوں کے پیچ اور لب و رخسار کی سُرخیوں کی طرف کسی نے کاہیکو دیکھا ہوگا ــــــ مگر یہ ہم کیا کہہ رہے ہیں "سیگمنڈ فرائڈ" کی اُمّت اگر ایسے رنگین مواقع پر چوک جاتے تو پھر "نفسیاتی تحلیل" اور "جنسی بھوک" بیچاری کس کا سہارا ڈھونڈے انہی کی محفلوں میں تو اسے پوری طرح سہارا ملتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کے اندازِ شعر خوانی کا مضمون نگار خاتون نے لطف لے لے کر ذکر کیا ہے، لکھتی ہیں :-

اُن (جوش) کی کشش کا راز وہی ہے جو ایک بے خبر معصوم بچے کی کشش کا ہوتا ہے، بچہ اپنی ذات سے زیادہ کسی میں مبتلا نہیں ہوتا، پھر بھی لوگ خود بخود اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ شاعر انقلاب ؟ کی جاذبیت، کشش اور ہر شخصیت اپنی جگہ مسلم مگر اس کی معصومیت" کا بے محل ذکر کر کے مضمون نگار خاتون نے لوگوں کی توجہات کو خواہ مخواہ چونکا دیا، اس صفائی کے پیش کرنے کی یہاں ضرورت کیا تھی ؟

ع در حریم تو کہ ..... از کجا شنید

اس کے بعد "افکار" کے زیر تنقید خاص نمبر کا حصہ نظم شروع ہوتا ہے ــــــ جوش ملیح آبادی کی نظم "رشوت خوار دل کی اپیل" خاصی طویل ہے جس میں انہوں نے اپنا رنگ چھوڑ کر عوامی زبان میں نظیر اکبر آبادی بننے کی کوشش کی ہے، کہیں کہیں مصرعے بہت بلند ہیں اور کہیں انتہائی پست! بعض جگہ بھرتی کے لفظوں نے شعر کی معنویت کو بُری طرح مجروح کر دیا ہے، کہتے ہیں

ع علتِ رشوت کو اس دُنیا سے رخصت کیجئے

یہاں لفظ "علت" کتنا بے محل استعمال ہوا ہے ــــــ کیا یہ وہی جوش ملیح آبادی ہیں جو کبھی لفظوں کے نگینے جڑا کرتے تھے اور اب ....

ع ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

معلوم ہوتا ہے کہ اس "ہل اور ہتھوڑے" کے چکر میں آکر انتہائی پختہ مشق شاعر تک کا واک ہو جاتا ہے اور جن شاعروں اور ادیبوں کے وجدان و شعور کی اسی فضا میں آنکھ کھلتی ہے، ان کی ناہمواری کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا ــــــ ہم نے فارسی زبان کے اشتراکی شاعر لاہوتی کا کلیات پڑھا ہے اور اس کے کرخت لفظ دل میں نہیں آنکھوں میں چبھتے ہیں۔

جوش صاحب کی نظم کے دوسرے بند کی ٹیپ ہے :-

ے ملک بھر کو قید کر دے کس کے بس کی بات ہے
خیر سے سب ہیں کوئی دو چار دس کی بات ہے

اس کے بعد اسد ملتانی کی غزل کا وہ مشہور مطلع سُنئے جو معروف شاعروں کی محفلوں میں بار ہا دہرایا گیا ہے :-

ے رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

جوش نے اپنی ایک دوسری نظم "شاندار دعوے" میں قرآن پاک کی اس آیت[1] پر شدید طنز کی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس دعوے کو جھٹلایا ہے، مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے مگر کہنے والے کی زبان کس طرح پکڑی جائے ــــــ جس طبقہ کے ذہین افراد

[1] وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۔

کی یہ ذہنیت ہے اُس کے عوام کے ہاتھ میں اگر خدانخواستہ اقتدار آگیا تو پھر "مذہب" کے ساتھ جو سلوک ہوگا اس کا اندازہ آج بھی کیا جا سکتا ہے؟

سردار جعفری کی نظم "نیا آفتاب" اقبال کے ساقی نامہ کے شعروں سے شروع ہوتی ہے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے

اقبال کے تین شعروں کے بعد سردار جعفری کی نظم کا آغاز ہوتا ہے اور شاعر نے سچ مچ اقبال کی لے میں لے ملا دی ہے، نظم کا آخر تک ایک ہی آہنگ ہے مگر آخر میں :-

درندے جو دشمن تھے انسان کے
جو پھوڑے تھے طاعون و سرطان کے

کہہ کر شاعر ایکا ایکی بلندی سے پستی کی طرف ڈھلک پڑا ——— اس قسم کے "لفظ" "ترقی پسندوں کا "ٹریڈ مارک" ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی نظم "وقت کی دوڑ" کا پہلا شعر ہے :-

وقت کا ساتھ نہ دو گے تو اُجڑ جاؤ گے
راستہ چھوڑ کے نکلو گے تو گڑ جاؤ گے

"اُجڑ جانے سے" اگر تباہ و برباد ہونا مُراد لے کر مصرعہ اولیٰ کی چُول کسی طرح سیدھی بٹھالی جائے ۔ لیکن اس "گڑ جاؤ گے" کی اُخر کیا توجیہ کی جائے گی، جس نے سارے شعر کو مہمل بنا دیا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر، اس "صنعتِ اہمال" میں پہلے سے زیادہ کامیاب (؟) ہے :-

وقت کا سیل جو اِس طرح رواں رہتا ہے
جو کناروں کو پکارے وہ کہاں رہتا ہے

مصرعہ ثانی ذہنی اُلجھاؤ کا بولتا ہوا ثبوت ہے، ہم نے اس گتھی کو سلجھانے کی طرح طرح سے کوشش کی، مگر ناکام رہے ———

تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہے :- ؏

نبضِ ہستی میں لہُو بن کے لپکتے جاؤ

ان "قدامت پرستوں" اور "لکیر کے فقیروں" نے سبزے کے ساتھ "لپکنے" کی صفت کو ضروری قرار دے دیا تھا ——— تنگ نظر کہیں کے! یہ "ترقی و انقلاب" کا دور ہے اب خون "لپکا" کرے گا، چڑیاں دہاڑیں گی اور بھیڑیئے ممیایا کریں گے۔

مجروح سلطان پوری کی شاعری جوان ہو ہی رہی تھی کہ وہ بیچارہ کمیونزم کا شکار ہوگیا اور اس کی شاعری سوز و طلن سے محروم ہوگئی، تغزل کی بچی کھچی رُوح سے وہ اب تک کام لے رہا ہے ——— مگر کب تک؟ "افکار" میں اُس کی غزل "پروپیگنڈائی غزل" ہے، جس کی تان "ارضِ ماسکو" پر آکر ٹوٹتی ہے ——— ——— ایک شعر ہے :-

زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار
رُخِ نگار کی ضو سے فروغِ بام کریں

"فروغِ بام کرنا" غلط اور روزمرّہ کے خلاف ہے۔ "فروغ دینا" "فروغ پانا" اور "فروغ ہونا" بولتے ہیں۔

عرشی بھوپالی پر بھی "ترقی پسندی" کی پرچھائیں پڑی ہے اس لئے اُس کی غزل میں دوسرے "ترقی زدہ" شاعروں کی طرح

"رمزیت" کے نام پر اُلجھاؤ اور اہمال نہیں ہے ——— مگر اس شعر میں

قدم قدم پہ ہے در کار جہدِ فکر و عمل
یہ زندگی ہے صدائے شکستِ جام نہیں

نام نہاد "ترقی پسند ادب" کی آب و ہوا سرایت کئے بغیر نہ رہ سکی ——— زندگی اور "صدائے شکستِ جام" میں آخر ربط کیا ہے؟ شاعر کا مفہوم لفظوں سے واضح نہیں ہوتا، جناب جگر مراد آبادی نے "یہ ترکیب" انتہائی برمحل استعمال کی تھی :-

کیوں عیش و طرب کے متوالے تکلیف توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

کاش! اسی آواز کی بازگشت سنائی دی جاسکتی۔

"نثار پرویز کی غزل کا یہ شعر بہت خوب ہے :-

نظر آتی ہو جب منزل کے آگے اور بھی منزل
تو ہر منزل کو گردِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

سرِوش عسکری طباطبائی کی غزل کامیاب ترین غزل ہے، ان کی صحت فکر کی داد دینی چاہیے کہ اس طوفانِ بے راہ روی اور آشوب ہوا و ہوس میں بھی وہ تغزل کی بلندی سے پورے یقین کامل احساس کے ساتھ پیام دیتے ہیں :-

ہزار شکر ہوس پیشگی کی دُنیا میں
امینِ عصمتِ عہدِ شباب ہیں ہم لوگ

بھوپال میں مشاعرہ ہو، غزلوں اور نظموں کا مجموعہ چھپے ——— اور اس میں شعری بھوپالی جیسے نغز گو شاعر کا ذکر تک نہ آئے حیرت بھی اور افسوس بھی! مگر وہ شعری جو ماسکو کے بجائے مدینہ کو سلام کرتا ہو اُس غریب کی اس محفل میں باریابی کس طرح ہو سکتی ہے ——— یہ زمانہ کی آندھی ہے آج زور پر ہے کل اُتر جائے گی، لیکن تمہاری یہ "جانب داریاں" "دھڑے بندیاں اور خویش نوازیاں" "مستقبل کے مورخ کے قلم کو اظہارِ حق سے نہ روک سکیں گی" "افضار" کو لوگ بھول جائیں گے مگر شعری کو نہ بھلایا جاسکے گا۔

ترقی پسندوں کی کانفرنس کی اس رُوداد میں مضمون نگار خاتون نے افسانوں والی نشست کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"شاہ میر راہی کے "اُلجھے بال" ایشیائی محبوبوں کی زُلف کا کام کر کے، اُستادِ فن کرشن اور عصمت کا دل اُلجھا کر لے گئے۔"

شاہ میر کو مبارک باد۔ . . . اور شاہد لطیف . . . . کو "پُرسا"!

اس انجمن میں علامہ سید سلیمان ندوی کو دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ارض القرآن اور سیرۃ النبیؐ کا مصنف یہاں کہاں؟ اس لئے کہ :-

ع روح را صحبتِ ناجنس عذاب است الیم

مگر ہماری حیرت مسرت بلکہ فخر و ناز سے بدل گئی جبکہ ہم نے یہ دیکھا کہ "ترقی زدوں" کے اسٹیج پر آکر بھی اس بوڑھے قلمکار نے جوانوں سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ اظہارِ حق سے کام لیا۔ فرماتے ہیں :-

نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی زبان اور قلم کو آگ کے بھڑکانے میں نہیں بلکہ اس کے بجھانے میں

کام میں لائیں، آپ اپنے میٹھے بول اور سُریلے گیتوں سے غم سے بھرے ہوئے دلوں کو تسکین کا پیام دیجئے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیئے اور محبت کی گھلاوٹ سے نفرت کی تلخی کو دُور کر دیجئے، چین اور برما میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اُس سے ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔

"میری قلمی خدمت کو نصف صدی گزر چکی ہے سنہ ۱۹۰۱ء میں مخزن سے میری قلمی خدمت کا آغاز ہوا تھا، یہ مخزن نئے ادیبوں اور نئے شاعروں کے جذبات اور ولولوں کو لے کر نکلا تھا لیکن آج وہ سارے ادیب اور شاعر پُرانے ہو چکے ——————

—————— اور اب نئے ترقی پسندوں اور شاعروں کی دُنیا ہے،

لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پُرانا بننا ہوگا اور تمہارا ترقی پسند ادب بھی پُرانا ہو چکا ہوگا، اس لئے نیا اور پُرانا ہونا تو کوئی خاص بڑائی کی بات نہیں، نہ ہر پُرانی چیز غلط ہے اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے اس غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اُس کی افادیت ہے، مولانا رومؒ اور سعدیؒ وحافظؒ کا کلام اب بھی زندہ ہے، مہابھارت اور رامائن پُرانے نہ ہوں گے۔ . . . . صرف محفل کی گرمی کے لئے مزدور، کھیت، کسان، دہقان، جھونپڑی کا تذکرہ نہ ہو ورنہ یہی کہا جائے گا کہ جس طرح اگلے شعراء گل و بلبل سے اپنا مطلب ادا کرتے تھے، اسی طرح آج دہقان کھیت اور مزدور سے مقصد کو ادا کیا جا رہا ہے، حقیقت نہ وہاں تھی نہ یہاں!". . . .

"فن اور فن کار" کے لکھنے والے کوئی صاحب حنیف فوق ہیں! پورا مضمون "آرٹ، تخلیق، تحلیل، رومانی سرشاریت، ارتعاش خیزی . . . . . . " انداز کی ترکیبوں کے ہجوم میں گھر کر بیگانۂ معنی و مفہوم ہو گیا، ارشاد ہوتا ہے:۔

آرٹ کا ضمیر انسان کے لطیف ترجمانی احساسات کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اور اس اجمالی احساس نے انسان کو زندگی کی وسعتوں کا ادراک بخشا ہے، اس میں شک نہیں کہ "حکایتِ گل" اور "حدیثِ بہار" ہماری مادی زندگی ہی کا نفسیاتی عکس ہیں، پھر بھی لالہ و گل اور بادہ و ساغر کے پردے میں ہم اپنی جذباتی کیفیت کو اس سیالانہ ہم آہنگی سے پیش کر سکتے ہیں کہ دوسروں کے ذہن میں بھی وہی متلاطم ترنم بیدار ہو جاتے . . . . "

کیا یہی وہ تنقید کی بے ربطی ہے جس پر "ترقی پسند ادب" ناز کرتا ہے۔

ع برعکس نہند نام زنگی کافور

ایسے نادان دوستوں سے اُردو زبان پناہ مانگتی ہے۔ ع بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

افسانوں میں "کرشن چندر" کا افسانہ "مہالکشمی کا پل" بہت کامیاب ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے اور شروع سے آخر تک ہر حصہ مربوط اور ہم آہنگ! —— شاہ میر راہی کا پہلا افسانہ (اُلجھے ہوئے بال) ہماری نگاہ سے گزرا، جو فن افسانہ نگاری کے نقطۂ نگاہ سے بلند مقام کا مستحق ہے۔

"افکار" کا خاص نمبر پڑھ کر یہ حقیقت چڑھتی ہوئی دھوپ کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ "ترقی پسند ادب" صرف "کمیونسٹ ادب" کا نام ہے —— جو لوگ آج بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ "ترقی پسند ادب" کو کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں[1]۔

[1] مولانا نے جس خطرے کی طرف اشارہ کیا ہے اُس کو ہندوستان میں لانے کے لئے تو یہ ساری جدوجہد ہی کی جا رہی ہے، اسی "افکار" کے خاص نمبر میں "خمارِ دوام"، جس نظم کا عنوان ہے، اُس کا ایک حصہ یہ ہے:۔

وہ شمع جو دلِ لینن میں جھلملاتی تھی
وہ آج سرحدِ برما کو جگمگاتی ہے

ماہنامہ "ہادی"

ماہنامہ "ہادی" مدیر مسئول :- انعام الٰہی عثمانی + ادارۂ تحریر :- سید محبوب رضوی، سید محمد ازہر شاہ قیصر کاشمیری، اور صاحبزادہ محمد سالم قاسمی، ضخامت ۴۸ صفحات، مقام اشاعت دیوبند، ضلع سہارنپور۔

دیوبند کا نام آتے ہی نگاہ کے سامنے علم و دانش کا دریا لہرانے لگتا ہے، اسی علمی سرزمین سے ماہنامہ ہادی کو زندگی ملی ہے ——— دیوبند کا پرچہ ظاہر ہے کہ خالص علمی اور مذہبی ہی ہو سکتا ہے "ہادی" کے مضامین میں نام کی مناسبت سے ہدایت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ادارۂ "ہادی" نے کوشش کی ہے کہ "ہادی" کا ایک بھی مضمون اپنے موضوع سے ہٹا ہوا نہ ہو، اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہے۔

"مولانا محمد قاسم نانوتوی" جس مضمون کا عنوان ہے وہ پُر از معلومات ضرور ہے مگر حضرت قاسم العلوم والخیرات کی شخصیت پر اس سے زیادہ مفصل جامع اور شگفتہ مضامین کی ضرورت ہے، اور اس کام کے لئے مولانا قاری محمد طیب صاحب بہت موزوں ہیں۔

جناب مولانا حسین احمد مدنی کے علمی تبحر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مولانا مدنی اردو کے اچھے انشاپرداز نہیں ہیں، صاحب موصوف کا مضمون "اسلام کی عالمگیر خصوصیات" معلومات کے، عتبار سے قابل قدر ہے، خیالات بھی پاکیزہ ہیں مگر اسلوب نگارش سپاٹ اور غیر دلچسپ ہے، صفحہ ۱۲ "اُن کو اپنے پیارے اوطان میں ٹہرنا اور اپنی زندگانی کی خدمتیں کرنی وبالِ جان ہو گئیں" ——— اس جملہ میں اردو لفظ "پیارے" کے بعد ہی "اوطان" پر اچھی کر نگاہ ٹھوکر کھاتی ہے اور "زندگانی کی خدمتیں کرنی" تو روزمرہ کے خلاف ہے اور یہ ترکیب ہی نامانوس ہے۔

اسی صفحہ پر مولانا تحریر فرماتے ہیں "حقیقی اصلاح کے وجوب نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ اطرافِ عالم میں سچی روشنی کی مشعلیں لے کر پھیل پڑیں" "وجوب" یہاں بُری طرح کھٹکتا ہے اور "روشنی کی مشعلیں لیکر پھیل پڑنا" اور زیادہ محلِ نظر ہے۔ "پھیل پڑنا" حملہ کرنے کے معنیٰ میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے جس کا یہاں محل نہیں، بجائے "پڑنے" کے "جائیں" لکھنا چاہیے تھا "مشعلیں لیکر (اطرافِ عالم میں) پھیل جائیں ..."

صفحہ ۱۵ پر ایک جملہ ہے "انہوں نے نہایت روشن پوزیشن پیش کیا ہے"، لفظ "پوزیشن" تو عام طور پر مونث بولا جاتا ہے اور پھر اس کا روشن ہونا اور اس کا پیش کرنا" اس سے زیادہ عجیب تر ہے۔

ماہنامہ ہادی کی پالیسی اور اُس کے ترتیب دینے والوں کے حُسنِ نیت کا ہمیں اعتراف ہے مگر ان دنوں اسلام کی تبلیغ کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے "ترجمان القرآن" مولوی منظور محمد نعمانی کے "الفرقان" اور "تعمیر" اور "صدق" جیسے رسالوں اور اخباروں کے انداز پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

"گنجِ شائگاں" کے عنوان سے احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے، قرآن اور حدیث کو نظم کرنے کی کوشش پوری نیک نیتی کے باوجود مستحسن نہیں ہے ——— شاعری "زیبِ داستان" کے لئے حقیقت اور واقعیت کی سادگی پر "اضافہ" چاہتی ہے قرآن اور حدیث کے الفاظ میں اضافہ و ترمیم ہو نہیں سکتی، اس لئے منظوم ترجمے پھیکے اور بے اثر بن کر رہ جاتے ہیں۔

رسالہ "ہادی" سے ہم نیک توقعات رکھتے ہیں اور اُس کی زندگی اور بقا کیلئے دعا کرتے ہیں ——— نظموں کا سلسلہ خاص طور پر ترقی کا محتاج ہے مجموعی طور پر ماہنامہ "ہادی" کامیاب ہے۔

مغربی پاکستان کا

مشہور و معروف — سب سے پرانا — سب سے بڑا

لائلپور کاٹن ملز۔ لائلپور

(کا)

تیار شدہ — عمدہ — وضعدار — اور — پائیدار — کپڑا

صوبہ پنجاب مغربی

کے بڑے بڑے شہروں مثلاً لاہور (انار کلی اور کرشنا نگر) گوجرانوالہ۔ شیخوپورہ۔ لائلپور۔ ملتان۔ منٹگمری۔ سیالکوٹ جھنگ۔ گجرات۔ جہلم۔ راولپنڈی۔ کیمبلپور۔ سرگودھا۔ بہاولپور۔ میانوالی۔

میں

دہلی کلاتھ مل اسٹورز سے حکومت کے منظور شدہ سستے نرخوں پر مل سکتا ہے اس کے علاوہ کپڑے کے تاجروں کو دہلی کلاتھ مل ڈپو کے تھوک ڈیپارٹمنٹ سے بھی بآسانی مل سکتا ہے۔

اس کی معلومات } پی۔ ایم۔ او۔ صاحب لائلپور کاٹن ملز

سے حاصل کی جا سکتی ہیں

مطبع عثمانی بھیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری
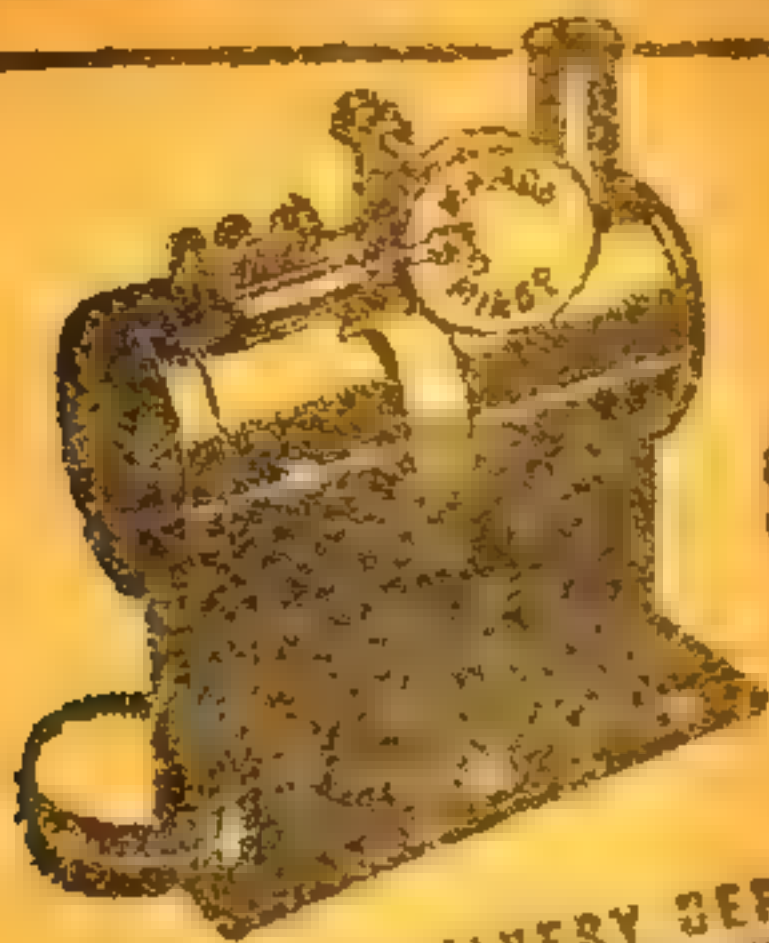
POWER COMMANDS INDUSTRY
MODEL STEAM ENGINES & BOILERS
MACHINERY DEPARTMENT
SUNGREEN & Co. LTD.
KARACHI
OIL ENGINES
HORIZONTAL AND VERTICAL
NEW OR RECONDITIONED
ELECTRIC MOTORS
ENQUIRIES SOLICITED

پاکستانی صنعت کے شاہکار
لائن برانڈ شوز
REGD
خالص چمڑے اور عمدہ میٹریل سے پاکستان میں تیار کئے جاتے ہیں
تمام پاکستان میں ایک قیمت پر فروخت ہوتے ہیں

Regd. No. 1262

Only Title Printed at Lion Art Press Frere Road Karachi
Printer and Publisher Mahir-ul Qadri

فاران
ماہر القادری

ماهنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

ستمبر ۱۹۴۹ء

جلد (۱) نمبر (۶)

کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

حصہ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

آپ بازار سے کھانے پینے کی چیزیں جب خریدتے ہیں یا ملازم کے ذریعہ منگواتے ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز گھر کے اندر نہ آنے پائے جو کسی قسم کی مضرِ صحت اور تندرستی کے لئے نقصان رساں ہو، آپ بے مزہ ترکاری کھا سکتے ہیں —— بلکہ کھاتے رہتے ہیں، اس لئے کہ گھروں میں ہر روز اور ہر وقت خوش ذائقہ کھانا نہیں پکتا —— مگر انتہائی لذیذ اور چٹخارے دار ترکاری اور سالن جس کے متعلق یہ شبہ ہو جائے کہ اس کے کھانے سے صحت بگڑ جائے گی، آپ کھانے سے انکار کر دیں گے، بیماری (وبا) کے زمانہ میں جب محکمہ طب و صحت کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ پھلوں میں مضرِ صحت جراثیم سرایت کر گئے ہیں تو آپ خربوزے اور آم کی ایک قاش بھی کھانے سے گریز کرتے ہیں۔

جسم اور صحت کے بارے میں آپ کی یہ احتیاط یقیناً مستحسن اور خردمندی کے عین مطابق ہے، غیر صحت مند اور مضر اشیاء سے پرہیز کرنا ہی چاہئے، جو ایسا نہیں کرتا وہ نادان اور جاہل ہے —— —— بلکہ خود اپنا دشمن!

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر گھر میں روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے، یہ نہ کوئی راز ہے اور نہ ایسا مسئلہ ہے جو کسی غور و فکر کا محتاج ہو، سیدھی سادی بات، الجھاوے سے پاک اور منطق و فلسفہ کی دقت آفرینیوں اور موشگافیوں سے بلند! دنیا میں شاید ایک زبان بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی، شہر کے متمدن افراد سے لے کر گاؤں کے اجڈ گنواروں تک، ہر شخص کی اس بارے میں ایک اور صرف ایک ہی رائے ہوگی، دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

جب آپ کھانے پینے کی چیزوں کے لانے، خریدنے، اور استعمال کرنے میں اس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں —— تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جسم کی طرح فکر و نظر اور ذہن و خیال کا بھی مزاج اور صحت ہوتی ہے۔ ناقص جنس، خراب ترکاریاں اور غیر صحت بخش ماکولات و مشروبات جس طرح جسم کے لئے مضر ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح غیر صالح ادب ذہن و فکر کی صحت کو بگاڑ دیتا ہے اور زندگی کے

باطن کو روگ لگ جاتا ہے، کھانے پینے کی بعض چیزوں میں جس طرح سمیت ہوتی ہے، بالکل اسی کی مانند "لٹریچر" بھی زہریلا ہوتا ہے جس کے اثر سے انسان کی باطنی روح بیمار ہو جاتی ہے اور زہر قاتل ہو تو ہلاک بھی ہو جاتی ہے ——— اس لئے خردمندی اور دانائی کا یہی تقاضا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرح، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کے بارے میں بھی آپ کو یقیناً احتیاط برتنی چاہئے، آپ غلہ کو جب خوب چھان پھٹک کر استعمال کرتے ہیں تو کتابوں اور رسالوں کے انتخاب میں بھی آپ کی قوتِ نقد و نظر کو نقاد اور "Keen" ہونا چاہیئے۔

ظاہر اور باطن

"ظاہر" اور "باطن" کے ذکر پر غالباً کہا جائے گا کہ لیجئے! یہ تصوف اور ویدانت کی بحث چھڑ گئی، یہ تو مسئلہ کو اُلجھاوے میں ڈالنے کی باتیں ہیں ——— مگر اعتراض کرنے سے پہلے مسئلہ کو سمجھ لینا ضروری ہے، ارباب نظر کی نگاہ میں پھبتیوں اور طنزوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور کسی بات کو اچھی طرح سوچے سمجھے بغیر اجتہاد سے اعتراض جڑ دینا بھی عقلمندوں کا شیوہ نہیں ——— ان لوگوں کو شرمندگی اور ندامت کی جراحتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو غور و فکر کے بغیر اعتراض اور انگشت نمائی کے خوگر ہوتے ہیں، سُنئے اور سمجھئے ——— پوری توجہ اور کامل ذمہ داری کے ساتھ!

کوئی شخص نہ تو آپ کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھتا ہے اور نہ آپ کے جسم کو چھوتا ہے ——— وہ آپ کو صرف گالی دیتا ہے گالی کے سنتے ہی آپ آگ بگولا ہو جاتے ہیں اور جتنی زیادہ سخت اور شرمناک گالی ہے اُسی کے اندازے کے مطابق آپ کی خفگی بھی شدید ہوتی ہے، اس سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ اس ظاہری جسم کے علاوہ بھی آدمی کے اندر اس قسم کی باطنی قوتیں موجود ہیں جو کاہش دل، بالیدگی مسرت و غم اور انقباض و کشادگی محسوس کرتی ہیں ——— اور دوسری بات یہ کہ لفظوں میں بھی اثر ہوتا ہے، جس طرح آہستہ آہستہ تلوے سہلانے سے گدگدی اور لطف اور چٹکی لینے سے جسم اذیت محسوس کرتا ہے اسی طرح "لفظ" بھی جذبات، خیالات اور تصورات میں گدگدی کرتے اور چٹکی لیتے ہیں۔

جسم کی مادی قدروں کے ہم منکر نہیں ہیں، مگر اسی جسم کے اندر ایسی قوتیں بھی موجود ہیں جو مادے سے ربط رکھنے کے باوجود مادے سے بلند ہوتی ہیں، فکر، خیال، تصور، فہم و خرد کو آپ آخر کیا کہیں گے؟ کیا گوشت پوست، لہو اور ہڈیوں کی طرح ان پر قیاس کیا جائے گا ——— تو ہم نے "ظاہر" اور "باطن" کی جو تفریق کی تھی وہ ایک مسلّم حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تربیت

اور یہ نہ صرف کہا بلکہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ "لفظوں" سے آدمی کے باطنی احساسات خوشگوار اور ناخوشگوار اثرات قبول کرتے ہیں ——— اور شعر و ادب نام ہی "لفظوں" کے مجموعے کا ہے، لفظوں ہی کے واسطہ سے خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں، لفظ نہ ہوتے تو خیالات نہاں خانہ قلب و دماغ میں دھرے کے دھرے رہ جاتے، اشاروں (gestures) سے تھوڑی بہت مطلب برآری ہو سکتی تھی مگر یہ اشارے ضرورتوں کی بوقلمونیوں کا کہاں تک ساتھ دیتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "لٹریچر" یقیناً انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، صالح اور پاکیزہ ادب کے اثرات مفید اور غیر صالح لٹریچر کے اثرات مضر ہوتے ہیں ——— اس لئے جو شخص اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے جس طرح صحت بخش غذا فراہم کرتا ہے، اسی طرح اُسے مفید، صالح، پاکیزہ اور تعمیری ادب کا بھی انتخاب کرنا چاہیئے۔

ہر شخص پر قدرتی اور فطری طور پر اپنی اور اپنے متعلقین کی حفاظت، پرورش اور تربیت لازم بلکہ فرض ہے، اگر کوئی کھا پی کر اور کھلا پلا کر اور زندگی کی ضروریات بہم پہنچا کے یہ سمجھتا ہے کہ اپنے فرض سے وہ سبکدوش ہو گیا ——— تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے، جسم کی طرح باطن اور رُوح بھی غذا چاہتی ہے، اور قوائے جسمانی کی پرورش کے ساتھ فکر و خیال کی بھی تربیت ضروری ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ صالح اور غیر صالح ادب کی تمیز کس طرح ہو؟ اس کا معیار آخر کیا ہے؟ اس کا جواب خود آپ کا ضمیر دے سکتا ہے بشرطیکہ آپ ضمیر کی آواز سن سکیں، اچھائیاں اور بُرائیاں سب کو معلوم ہیں، چوری، جھوٹ، دغا بازی، رشوت خواری، اور بدکاری کو سب بُرا سمجھتے ہیں اور نیکی، پاکبازی، حق گوئی اور دیانت و امانت کو قدر و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ——— اس پر دھیان دیجئے کہ آپ کا نفس کس چیز میں لذت محسوس کرتا ہے یہ دیکھئے کہ آپ کے ضمیر اور باطن کا فیصلہ کیا ہے۔

دو عورتیں آپ کے سامنے سے گزرتی ہیں۔ ایک نہایت بے باکی کے ساتھ راہگیروں کو گھورتی ہوئی جا رہی ہے اور دوسری کی نگاہیں شرم سے جھکی ہوئی ہیں، آپ کا نفس چاہے اُس حسنِ بے باک کی اداے حسن فروشی میں ہی لطف لے رہا ہو مگر آپ کا ضمیر یقیناً شرمیلی عورت کا احترام کرے گا اور آپ کا دل اس حیا شعار خاتون کے لئے عزت کے احساسات سے معمور ہو جائے گا، زندگی کے تمام شعبوں میں ضمیر و باطن خوب و ناخوب اور صواب و خطا کی تفریق کرتے رہتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اس آواز پر کان نہ دھرے اور نفس کی لذتوں میں گم ہو کر رہ جائے۔

آپ کے سامنے دو آدمی آتے ہیں ایک نہایت ہی مشہور اور دلیر ڈاکو ہے اور دوسرا فوج کا گمنام سپاہی! آپ کا ضمیر کسی تامل اور غور و فکر کے بغیر یقیناً ڈاکو سے نفرت اور سپاہی کی عزت کرے گا، چنگیز اور ہلاکو، نوشیرواں اور حاتم طائی سے کم شہرت نہیں رکھتے مگر آپ کے دل میں اُن دونوں کے لئے ذرا سی بھی گنجائش نہیں ہے بلکہ آپ اُن سے نفرت کرتے ہیں اور ما بعد الذکر سے ایک طرح کی عقیدت رکھتے ہیں۔

صالح اور غیر صالح ادب کا آخری معیار "سچائی" ہے! وہ ادب صالح اور مفید ہے جس کے پڑھنے سے آدمی میں شریفانہ جذبات پیدا ہوں سیرت و کردار کی پاکبازی کی بنیادوں پر تعمیر ہو، جو آدمی کو نیک بناتا اور نیکی کی راہ سجھاتا ہو ——— اور جس لٹریچر کو پڑھ کر نفس ہوس کار کو سہارا ملتا ہو، جس کے مطالعہ سے سفلی جذبات کی تخلیق ہوتی ہو، فکر و نگاہ کی عصمت و پاکیزگی پر جن کا بُرا اثر پڑتا ہو، وہ "غیر صالح" ادب ہے چاہے اس پر "ترقی" "انقلاب" "سماجی اصلاح" اور "نفسیاتی تحلیل" کے کتنے ہی ٹھپّے کیوں نہ لگے ہوں۔

ادب کا مقصد اور اس کی غایت ہی فکر و خیال کی تہذیب، زندگی کی تربیت اور اعمال و افعال کا سُدھار ہے، اب رہے ادبی چٹخارے تو وہ اسی حد تک گوارا کئے جاسکتے ہیں جس حد تک اس تفریح کا انسانی کردار کوئی بُرا اثر قبول نہیں کرتا! بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں لوٹ کر آ گئی ہے ——— اگر کسی انتہائی ذائقہ دار کھانے میں آپ کو شبہ ہو جائے کہ اس میں زہر کی ایک رتی بھی ملی ہوئی ہے تو آپ اُس ذائقہ اور لذت سے یقیناً دست کش ہو جائیں گے، یہ آپ کی زندگی کا سوال ہے، کوئی ذائقہ جان کا بدل نہیں ہو سکتا، بالکل اسی طرح غیر معمولی دلچسپ اور پُر لطف لٹریچر بھی اسی سلوک کا مستحق ہے اگرچہ اس میں بُرائی اور گمراہی کے کم سے کم عناصر شامل ہوں، دل کے بہلاوے کے لئے قلب و ضمیر کی موت گوارا نہیں کی جاسکتی، اس تجارت میں خسارہ ہی خسارہ ہے، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے کی

"دلِ زندہ" کے بغیر جو لوگ جیتے ہیں وہ چلتی پھرتی لاشیں اور بولتے ہوئے ڈھانچوں کی مانند ہیں، جن کے بوجھ سے زمین پناہ مانگتی ہے ——— اصل میں زندگی دردمندی، غمگساری، ایثار، حسنِ اخلاق اور پاکبازی کی زندگی ہے، یہ نہیں! تو پھر زندگی کہاں؟ یوں جینے کو حشرات الارض بھی جیتے ہیں مگر یہ زندگی کیا ہے ایک طرح کی موت ہے۔

مثالیں رجب علی بیگ سرور کا "فسانۂ عجائب" اور ڈپٹی نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" دونوں قصہ کہانی کی کتابیں ہیں، زبان و بیان کے اعتبار سے دونوں کتابوں کا پایہ بلند ہے، مگر اخلاق و پاکیزگی کے لحاظ سے دونوں کو ایک درجہ ہرگز نہیں دیا جاسکتا، پڑھنے والا "فسانۂ عجائب" کے مقابلہ میں "توبۃ النصوح" کے مطالعہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے گا۔

غالب کا ایک شعر یہ بھی ہے :-

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور اسی غالب نے یہ شعر بھی کہا ہے :-

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ان دونوں شعروں میں پہلا شعر یقیناً بلند ہے، اور بلندی سے میری مُراد زبان و بیان کے علاوہ شعر کا بنیادی تصوّر اور مرکزی خیال بھی ہے، پہلے شعر میں پاکیزگی کی جو رُوح کارفرما ہے دوسرا شعر اس سے عاری ہے۔

ایک شخص اپنے کسی سفر کے حالات سُناتا ہے اُس میں ضمناً باغ و بہار اور لطف و تفریح کی باتیں بھی آجاتی ہیں اور دوسرا آدمی اپنی کسی خلوت کی تفصیل انتہائی بے باکی کے ساتھ بیان کرتا ہے، آپ کا ضمیر آپ کے استفسار کے بغیر ہی حکم لگا دے گا کہ پہلا آدمی سنجیدہ اور محتاط ہے اور دوسرا بے حیا اور بے باک ہے۔

ایک بات اور یاد رکھئے، افادیت اور بلندی نیکی اور سچائی میں ہے، چاہے وہ کتنی ہی سادہ اور سپاٹ کیوں نہ ہو، بُرائی بلند اور مفید ہو ہی نہیں سکتی خواہ وہ کسی قدر رنگین اور جاذبِ فکر و نظر کیوں نہ ہو، چوروں، اُٹھائی گیروں، جیب کتروں اور دغا بازوں کے آرٹ کو کوئی شخص عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ——— اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں نے اپنی کم فہمی کے سبب غلط چیزوں کو "آرٹ" کا نام دے رکھا ہے، حالانکہ حُسن " Art " کی فطرت میں داخل ہے اور بُرائی حسین ہو ہی نہیں سکتی۔

بُرائیاں اور اچھائیاں آپ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، نیکی اور بدی کے پرکھنے کی استعداد خود قدرت نے انسان کے اندر پیدا کر دی ہے، سعادت و گمرہی کی راہیں بتادی گئی ہیں ——— بس اسی معیار اور کسوٹی پر لٹریچر کو بھی کس کر دیکھئے، جو ادب اس معیار پر پورا نہ اُترے اُس سے اپنی ذات کے علاوہ، اپنے متعلقین اور دوستوں کو بھی بچائیے، اگر آپ اس ذمہ داری کے بجا لانے میں تساہل برتیں گے تو خدا کے یہاں بھی اس کے جواب دہ ہوں گے اور انسانی معاشرہ کے ساتھ بھی آپ کا یہ سلوک ظالمانہ ہوگا۔

پہلے اپنے گھروں کی الماریوں، درازوں، میزوں، اور ٹرنکوں کا جائزہ لیجئے، اور کاغذ کے ایک ایک ورق کو دیکھئے کہ بداخلاق اور غیر صالح ادب تو کہیں آپ کے یہاں بار نہیں پا گیا، کتابوں اور رسالوں کا " Disinfection " تطہیر سب سے پہلے ضروری ہے، کتابوں کے وہ اوراق جو غیر صالح ادب کے حامل ہیں، کھٹملوں، مچھروں، اور متعفن ہواؤں سے بہت زیادہ مُضر ہوتے ہیں، صوفوں، الماریوں، کرسیوں، قالینوں، چادروں اور پردوں کی صفائی پر نہ جائیے، اور اس ظاہری پاکیزگی اور اُجلے پن کو دیکھ کر مطمئن نہ ہو جائیے ——— اصل صفائی تو دل کی صفائی اور حقیقی پاکیزگی سیرت و کردار کی پاکیزگی ہے، دل کے آئینے جب تک زنگ آلود رہیں گے اور اُجلے نہ ہوں گے اس وقت تک ظاہری آرائش اور صفائی سے کچھ نہ ہوگا۔

کاغذ اور قلم جنہیں اصلاح و تربیت کا سب سے زیادہ گراں قدر فرض انجام دینا تھا، آج وہی فساد، تخریب اور بگاڑ کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال ہو رہے ہیں، ادیبوں اور شاعروں نے ادب کو ذریعہ تجارت بنا رکھا ہے اور یہ اس تاجر کی طرح ہیں جو ایک ہی وقت میں آبِ زم زم کی شیشی اور شراب کی بوتل فروخت کرتا ہے، یہ لوگ تو اُس چیز کو دیکھتے ہیں کہ زمانہ کا رُخ کدھر ہے! بازار میں جس قسم کے ادب

کی بھی مانگ ہوتی ہے یہ حضرات اُسی انداز پر کتابیں لکھ لکھ کر پبلک کے سامنے لاتے ہیں، اور مقصد ہوتا ہے طلب شہرت اور جلبِ منفعت ——

ادبی گمراہیاں

لوگوں کو نہیں معلوم اور اگر معلوم ہے تو ان واقعات سے گریز اور چشم پوشی بہت بڑی بے غیرتی ہے۔ —— کہ بد اخلاق ادب لڑکیوں اور لڑکوں کی خلوتوں اور تنہائیوں کو کس قدر بے چین بنا دیتا ہے، "بے چین" کا لفظ میں نے انتہائی نرم استعمال کیا ہے، شباب کی بے چین تنہائیاں اور بے تاب خلوتیں بڑی ہنگامہ خیز ہوتی ہیں، خیال سے لے کر جذبات تک ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے، اور تلاطم اور طوفان کی خاصیت ہے کہ وہ حد بندیوں کا پابند ہو کر نہیں رہتا —— اس خصوص میں بس اتنا ہی اشارہ کافی ہے، ہر بات کھول کر نہیں کہی جاتی، اجمال، ابہام، رمزیت اور اشاریت سے ایسے ہی موقعوں پر کام لیا جاتا ہے۔

سوسائٹی کے اخلاق بگاڑنے میں آج سب سے بڑا ہاتھ اسی "لٹریچر" کا ہے، ہمارا سارا ادب (Romanec) بن کر رہ گیا ہے عریاں ناول، رنگین و شوخ افسانے اور فحش نظموں کے مجموعے ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں، ادھر کتاب پریس سے نکلی اور اُدھر ختم ہو گئی لوگ "گناہ کی راتوں" "جوانی کی صبحوں" اور "محبت کی شاموں" کی تلاش میں رہتے ہیں۔

اُردو زبان میں چند سالوں سے فلمی لٹریچر کا اضافہ ہو گیا ہے، اور یہ سلسلہ دراز تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جو رسالے فلمی نہیں ہیں وہ بھی فلمی ذکر واذکار کی سعادت سے محروم رہنا نہیں چاہتے، اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ہاتھ دھو لینے کی کوشش کرتا ہے —— آپ کے سامنے جب کسی فوجی افسر کی بہادری، کسی عالم کے علم و فضل اور کسی آرٹسٹ کے کمال کا ذکر کیا جاتا ہے، تو آپ قدرتی طور پر اُس سے متاثر ہوتے ہیں، اور دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ کاش! ہم بھی ایسے ہوتے یا ہو جاتے —— تو فلمی لٹریچر پڑھ کر بھی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے آرٹ کی عظمت دل میں گھر کرتی ہے اور فکر و خیال میں یہ بات جم جاتی ہے کہ "اداکاری" ایک شریف فن ہے، نوجوان جب اپنی صحبتوں میں ذکر کرتے ہیں کہ فلاں ایکٹر یا ایکٹرس کو ایک کھیل میں اتنے ہزار روپیہ معاوضہ ملا تو سُننے والوں کے مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔

ہمارے لٹریچر کے دو رُخ ہیں (۱) یا تو وہ خدا ناشناس ہے یا پھر (۲) عیش و عشرت کا علمبردار ہے۔ عام طور پر ان دونوں خطوں پر کاروانِ ادب گامزن ہے، کوئی خدا کا بندہ ان لغویتوں سے دامن بچانا چاہتا ہے تو لوگ ٹوکتے اور ہنسی اُڑاتے ہیں کہ اس نئی دُنیا میں پُرانی باتیں اب نہیں چل سکتیں، عقلمند وہ ہے جو زمانے کی ہوا کا ساتھ دیتا ہے، وقت کے دھارے کو روکنا ناممکن ہے، دُنیا پچھلی منزلوں سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔

آپ جس حکومت میں رہتے ہیں اُس کے قانون کا عام طور پر آپ احترام کرتے ہیں اور اُس کو نہیں توڑتے، اس لئے کہ آپ کو یقین ہے، کہ قانون شکنی کی پاداش میں آپ دھر لئے جائیں گے، اور حکومت کے احتساب کا پنجہ آپ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا —— جس طرح حکومت کے وجُود کا آپ کو یقین ہے اسی طرح خدا کے وجُود کا بھی کامل یقین ہو جائے تو پھر آپ اُن حدود کے توڑنے سے بھی ضرور گریز کریں جن کو خدا نے مقرر کر دیا ہے، ساری خرابی اسی بات نے تو پیدا کر دی ہے کہ خدا کا خوف دلوں میں نہیں رہا، اس بے خوفی نے فکر و نظر اور قول و عمل کو کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، ہوسناکیوں اور لذّت پرستیوں کی طرف پوری انسانی معاشرت ڈھل جا رہی ہے، شعر و ادب بھی اس بے راہروی کی لَے میں لَے ملا رہے ہیں، اور وہ اس لئے کہ زمانہ کا ساتھ دینے میں منفعت، ہر دلعزیزی، شہرت اور ہر طرح کی لذتیں ملتی ہیں، طوفان کے بہاؤ پر چلنا بہت آسان ہے مگر اُس کے خلاف جانے میں مشکلیں، دقتیں، اور خطرے ہیں، عیش پسند اور خدا ناشناس ماحول اپنے جیسا لٹریچر چاہتا ہے اسی لئے آج اُسی ادب کی مانگ ہے جس میں انسانوں کے ذوقِ ہوس کو سہارا ملتا ہو۔

اِنتخاب

اس مضمون کے مخاطب وہ افراد ہیں جن میں غیرت و حیا کی گرمی اس سرد مہری کے دَور میں بھی باقی ہے، جو لوگ غیرت

کے حدود توڑ چکے ہیں اور شرم و حیا کے آبگینے جن کے ہاتھوں چکنا چور ہو چکے ہیں، اُن سے ہم مایوس ہیں اور وہ یقیناً ہم سے بیزار ہیں۔

پس غیرت مند، شریف اور خود دار انسانوں سے ہم گزارش کرتے ہیں کہ اگر اپنے متعلقین اور وابستگان کو آپ بُرائیوں سے بچانا چاہتے ہیں تو گھر کے حدود میں کوئی ایسی کتاب نہ آنے دیجئے، جو دل و دماغ کو بُرائی کی طرف لے جاتی ہو، صالح لٹریچر کو تلاش کر کے گھر میں لائیے، اچھی اور مفید کتابوں سے کتب خانے اور بک ڈپو خالی نہیں ہیں، لوگ خزف ریزوں اور کنکریوں کے ڈھیر سے موتی چن کر نکال لیتے ہیں، آپ اچھی کتابوں کی تلاش سے جی چراتے ہیں۔ آدمی کوشش کرنے پہ آئے تو اس دُنیا میں کیا نہیں ہو سکتا، اور کیا نہیں مل سکتا۔

ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ فسق و فجور اس دور میں وبائے عام کی طرح پھیل رہے ہیں ——— لیکن اس وبا کی جتنے گھر، جتنے خاندان اور جتنی بستیاں بھی بچی رہیں گی، اُنہی کی زندگی آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہوگی، اور مستقبل کا مورخ ان کے وجود پر فخر کرے گا۔

جو بات آغاز میں کہی گئی تھی وہ اختتام پر دُہرائی جاتی ہے ——— کہ کھانے پینے کی چیزوں کی طرح لٹریچر کے انتخاب میں بھی "ناقص" اور "صالح" کا لحاظ رکھئے، یہ بہت بڑی بھلائی ہے جو آپ اپنے متعلقین کے ساتھ کر سکتے ہیں، منزل کی تنہائی سے نہ گھبرائیے دو چار گام چل کر تو دیکھئے کہ کتنے ہم سفر آپ کو ملتے ہیں! گلہ میں سب کی سب بھیڑیں سیاہ نہیں ہوتیں، غیرت و حیا کے نشان ابھی دُنیا میں باقی ہیں، نیکی کی جنس مٹی نہیں ہے، اور حیا سوتو گئی ہے مگر فنا نہیں ہوئی، دُنیا حق پرستوں سے خالی نہیں ہے، لٹیروں کے ہجوم کو دیکھ کر یہ نہ سمجھئے کہ ہر شخص بٹ مار اور قزاق ہے، آپ حق پر ہیں تو تنہائی کے باوجود آپ خود اپنی جگہ ایک "محفل" ہیں۔

آپ کے قافلۂ حیات کے خطوط اب یہ ہونے چاہئیں:-

(۱) صالح معاشرہ (۲) صالح زندگی اور (۳) صالح ادب

یہی آپ کی منزل ہے، یہی آپ کا سنگِ میل ہے اور یہی آپ کا نشانِ راہ ہے! بھٹکے ہوؤں سے رہنمائی کی ہرگز اُمید نہ رکھئے چاہے ان کے سروں پر ایک لاکھ کارل مارکس اور ایک کروڑ لینن سایہ گُستر کیوں نہ ہوں ——— آپ اپنا خود ایک مستقل وجود رکھتے ہیں اور وجود کے ساتھ ہی فکر و نظر بھی اور بصیرت و حکمت بھی!

جو زندگی خدا شناسی اور اخلاق سے عاری ہے وہ زندگی نہیں موت ہے، اور جس لٹریچر میں پاکیزگی نہیں وہ ادب نہیں ادب کے ساتھ "بے ادبی" ہے۔ سچی زندگی اور حقیقی ادب کے تقاضے "صالح" ہی ہوا کرتے ہیں۔ جو زندگی اور اس کا ترجمان "لٹریچر" ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے، ان کی پرچھائیں سے بھی بچنے کی کوشش کیجیے۔

ماہر القادری

یکم ستمبر ۱۹۴۹ء

امتیاز علی خاں عرشی رامپوری

میرزا غالبؔ کی تعلیم
تحقیق و اجتہاد کے دوراہہ پر

ہرمزد ——— عبد الصمد ——— غالبؔ کی شوخیٔ فکر کی بنائی ہوئی خیالی تصویر! ——— اربابِ فکر و نظر کی توجہ کو چونکا دینے والی تحقیق! ——— قیاس اور حقیقت کی آئینہ سازی! ——— درایت اور روایت کی شیشہ گری! ———

میرزا غالبؔ کی تعلیم، دوسرے بہت سے انقلاب آفرین اساتذہ کی طرح، پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی تھی، جہاں تک عربی کا تعلق ہے ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں خود انہیں نے تحریر فرمایا ہے کہ [1]

" شخص استعدادِ مرا پیرایۂ نازشِ فضلی و تشریفِ وجودِ مرا سرمایۂ برازشِ کمالی نیست۔ نہ ترانۂ صرف اشتقاقم برلب است، و نہ زمزمۂ سلب و ایجابم بزبان۔ نہ خونِ صُراحَم بگردن ست و نہ نعشِ قاموسم بردوش "

۱۲۶۲ھ میں تفتہ کو لکھا ہے [2]

" میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں، بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں "

تقریباً اسی زمانے میں عربی تعلیم کی تحدید کرتے ہوئے فرماتے ہیں [3]

" میں نے ایامِ دبستان نشینی میں، شرح مایۂ عامل تک پڑھا، بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا "

فارسی فارسی کی تحصیل کے بارے میں تفتہ کے مولہ بالا خط میں لکھتے ہیں :-

" فارسی میں مبداءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح

[1] کلیات نثر فارسی : ۵۵ [2] خطوطِ غالب : ۱/۸۳ [3] غالب : ۱۸

جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر"

عبدالفیاض نے جس توسط سے یہ دستگاہ عطا کی تھی، اس کا ذکر 'قاطع برہان' کی تالیف تک میرزا صاحب کے یہاں نہیں پایا جاتا، حتیٰ کہ کلکتے کے ادبی ہنگامے میں بھی اس کا حوالہ نہیں۔ جو سب سے پہلے اور سب سے ضروری محل تھا۔

ہرمزد پہلی بار ۱۸۶۲ء میں "قاطع برہان" کے اندر میرزا صاحب نے ایک ایرانی اُستاد کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں [1]

" شت ہرمزد نام پارسی نژاد فرزانہ بود از تخمہ ساسانیاں۔ پس از گرد آوردنِ فراوانِ دانش، کیش اسلام گزیدہ وخود را عبدالصمد نامیدہ، درسال یکہزار و دو بست و بست و شش (۱۲۲۶) ہجری بطریق سیاحت بہ ہند آمدہ و بہ اکبرآباد کہ بیکرپرزرفتن وخرد آموختنِ من ہم دراں شہر جستہ بہر بودہ است، دو سال بہ کلبۂ احزانِ من آسودہ است، ومن آئینِ معنی آفرینی وکیشِ یگانہ بینی ازوی فراگرفتہ ام۔ بر نہادِ وی آفرین باد، و بہ روانِ وی آباد!"

اس گرامی استاد کی تعلیم سے استفادے کے متعلق فرماتے ہیں کہ [2]

" اگر فرزانہ ـــــ عبدالصمد راہ نمودی، نامہ نگار نیز یکی از گمرہاں بودی، نہ خود راہِ راست پیمودی ونہ دیگراں را آگہی افزودی "

عبدالصمد کی استعدادِ علمی کے بارے میں لکھتے ہیں [3]

"فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر وسخن کا ذوق فطری وطبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسانِ پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق وفلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد وصوفی صافی تھا، میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت اور غوامضِ فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبانِ دری سے پیوندِ ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا، حقیقت اس زبان کی دلنشیں وخاطر نشان ہو گئی۔"

مفتی محمد عباس لکھنوی کو "قاطعِ برہان" کا ایک نسخہ تحفے میں بھیجنے کے بعد تحریر کیا ہے [4]

" علم وہنر سے عاری ہوں، لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔ مبداءِ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبتِ ازلی وسرمدی لایا ہوں، مطابق اہلِ پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں ــــــ مناسبت خداداد، تربیتِ اُستاد، حُسن وقبحِ ترکیب پہچاننے لگا، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔"

۱۸۶۶ء میں نواب خلد آشیاں کی خدمت میں عرض کیا ہے [5]

" بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اس سے حقائق ودقائق زبانِ پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے "

۱۸۶۷ء میں "تیغِ تیز" میں عبدالصمد کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں [6]

" بعد ایک مدت کے جب میں دِلّی آرہا اور مولوی فضلِ حق مغفور سے بعدِ ملاقات ربط بڑھا، ایک روز بحسب اتفاق

[1] قاطع برہان: ۷ [2] ایضاً ۸ [3] غالب: ۱۸ [4] اردوئے معلّیٰ: ۱۸ [5] مکاتیب غالب: ۸۲
[6] تیغ تیز: ۱۲

"ہرمز" کا ذکر درمیان آگیا ، اور اُس کے ذکر کے آنے کی تقریب معنی صمد اور ارونذ کے اتحاد کی شرح "

نامۂ غالب (مصنفہ ۱۸۶۸ء) میں ارشاد فرماتے ہیں ۔ [1]

" زباں دانی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے ۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھکو خدا نے دیا ہے مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے "

ان بیانوں سے بظاہر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ میرزا صاحب کو زبان فارسی سے طبعی مناسبت اور فطری لگاؤ تھا حسنِ اتفاق سے ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں جب کہ میرزا صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی ، ایک ایرانی نومسلم آگرے میں وارد ہوا اور دو برس تک میرزا صاحب کے مکان پر ٹھیرا اس مدت میں میرزا صاحب نے اُس سے خالص آمیختہ بہ عربی فارسی کے حقائق و دقائق کی تحصیل اور کمالِ مشق سے اس امر خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل کرلیا ، اور طبعی ذوق کا سونا استاد کی تعلیم کی آنچ پاکر کندن ہوگیا ۔

لیکن حقیقت میں یہ شخصیت سراسر افسانہ تھی ، میرزا کے ایک شاگرد حکیم ن ۔ م رضا خان دہلوی نے پروفیسر شہباز کے اس استفسار پر کہ غالب میاں نصیر کے شاگرد ہیں یا نہیں لکھا ہے : [2]

" بابت میرزا غالب و نصیر کے جو دریافت فرمایا ہے ۔ اس کی مطلق اصلیت نہیں ، صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اُردو ، یہ جو مرزا صاحب ہرمز ثم عبدالصمد کو اپنا استاد کہتے ہیں ، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا ، خارج میں نہ تھا ، چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب دہلی میں آئے ۔ پھر یہیں رہے ، اس زمانے میں دہلی میں شاہ نصیر کا بہت شہرہ تھا بلکہ مرزا صاحب نے اپنا کلام نصیر تک کو تو دکھایا نہیں "

مرزا اس راز کی طلسم کشائی کرتے ہوئے فرماتے تھے : [3]

" مجھکو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ۔ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے ۔ چونکہ مجھکو لوگ " بے استادا " کہتے تھے اُن کا مُنہ بند کرنے کو ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے "

خواجہ حالی مرحوم نے میرزا صاحب کے بیانات کے تضاد کو اس تاویل سے دُور کیا ہے کہ چونکہ اُنہیں ملا عبدالصمد کی صحبت صرف دو سال میسر ہوئی اور وہ بھی بالکل آغازِ شباب میں ، اس لئے اس تعلیم کا عدم و وجود برابر ہے اور میرزا صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ مجھے مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ۔ [4]

لیکن خواجہ صاحب کا یہ خیال خود میرزا صاحب کے اعتراف اور اصرار سے رد ہوجاتا ہے ، کیونکہ وہ اپنے ہر تحریری بیان میں اس پر زور دیتے ہیں کہ انہوں نے فارسی دانی میں جو کچھ سربلندی حاصل کی ہے ، وہ نتیجہ ہے اس ارسطوی زماں اور افلاطونِ عصر اُستاد کی دو سالہ تعلیم و تربیت کا چنانچہ ان کے یہ الفاظ اس پر بالتصریح دلالت کرتے ہیں کہ :۔

" فارسی زبان کا ملکہ مجھکو خدا نے دیا ہے ، مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے "

قرائن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے یہ شخصیت خود پیدا کی ہے ، اولاً اس لئے کہ ۱۸۲۹ء میں کلکتے کے ہنگامۂ ادب نے پہلی بار اس حقیقت کے اظہار کا موقع مہیا کیا تھا ۔ کیونکہ وہاں براہِ راست میرزا صاحب کی زبان دانی پر اعتراض ہوا تھا جس کا جواب میرزا صاحب کی طرف سے یہی ہونا چاہئے تھا کہ پہلے معترض کو میری سی طبیعت اور ملا عبدالصمد جیسا استاد پیدا کرنا چاہئے ، اس کے بعد حقِ اعتراض حاصل ہوسکتا ہے ۔ لیکن انہوں نے نظم و نثر دونوں میں کنایۃً بھی عبدالصمد کا نام نہیں لیا ۔ بلکہ ہر جگہ اپنے مطالعے ہی کو بلاتے برتری قرار دیا ۔

[1] عود : ۱۴۶ [2] زندگانی بے نظیر : ۲۰۰ [3] یادگار غالب : ۱۴ (طبع اول) [4] یادگار غالب : ۱۴

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "قاطع برہان" میں اس اظہار کی کیا وجہ ہے۔ اس کے متعلق میری حقیر رائے یہ ہے کہ میرزا صاحب نے ہندوستان کی جامد علمی فضا میں پہلی بار ایک مسلم الثبوت لغت کی غلطیاں آشکار کی تھیں، اس لئے انہوں نے اپنے پچھلے تجربے کی بنا پر جو کلکتے میں ۲۸، ۳۰ برس اُدھر حاصل ہوا تھا، یہ چاہا کہ الفاظ کی غیر مانوس تشریح و تفسیر کی تقویت کے لئے کسی اہلِ زبان کا حوالہ دیا جائے، تاکہ اس طرح ہندیوں کی زبان پر مہرِ سکوت لگ سکے۔ بدقسمتی سے اُس وقت تک کسی اہلِ زبان کا لغت ہندوستان میں مروّج نہ تھا۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ ایک فاضل اہلِ زبان شخصیت فرض کر لی جائے اور اس کے حوالے سے جامد دماغوں کو اپنی صحیح تنقید کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے۔ چونکہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان میرزا صاحب کی آگرے کی ابتدائی گمنام زندگی پر شہور وسنین کے ۴۶ پردے پڑ چکے تھے، اس بنا پر اب یہ خطرہ بھی باقی نہ رہا تھا کہ کوئی شخص مذکورہ شخصیت کے وجود کی واقعاتی تردید کر سکے گا۔ ان حالات میں میرزا صاحب نے ملا عبد الصمد پیدا کیا اور جب آخر ایام میں اس مُلا کی ضرورت باقی نہ رہی، تو صاف لفظوں میں قرار کر لیا کہ "بے استادی" کے تکلیف وہ اعتراض سے بچنے کی خاطر یہ بت تراشا گیا تھا، ورنہ اس کی حقیقت کرشمۂ تخیل سے زیادہ نہیں ہے۔

وسعت مطالعہ میرزا صاحب کی فارسی دانی کا درجہ خود اُن کی نظر میں اتنا بلند تھا کہ انہوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک موقع پر کہا ہے کہ:- [1]

" میں فارسی کا محقق ہوں "

دوسرے موقع پر ۱۸۶۲ء میں تفتہ سے خطاب کر کے فرمایا ہے:- [2]

" مرتا ہوں۔ مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہل زبان خواہند یافت"، مگر میں بانی کلام اہل زبان نہیں ؟ "

بعد ازاں اپنے رتبے اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے درجے کے فرق کو سمجھاتے ہیں:-

" سنو میاں! میرے ہم وطن، یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں . . . . . فارسی کی میزان، یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد و للہ الشکر "

میرزا صاحب کے اس ادعا کی پُشت پر اُن کا اساتذہ کے کلام کا وسیع اور گہرا مطالعہ کام کر رہا ہے، جو ان کے فارسی سے والہانہ ذوق و دلچسپی رکھنے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:- [3]

" نظم و نثرِ فارسی کا عاشق الاوایل ہوں، ہندوستاں میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں "

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں مرزا صاحب بہت سے دوسرے ہندوستانی ادیبوں پر فوقیت رکھتے ہیں کہ انہوں نے فارسی کے خداداد ذوق پر استادوں کے کلام کے مطالعے سے جلا پیدا کی اور اُردو زبان کے معاملے میں تو یہ کہہ کر بحث کو ختم کر دیا کہ [3]

" اس امر کے مالک اور اہلِ زبان ہم ہیں، اور یہ ہم صیغۂ متکلم مع الغیر ہے، یعنی ہم اور تم اور مجموعۂ شرفا اور شرفائے دہلی و لکھنؤ ایسے دس آدمیوں کا اتفاق سند ہے، زیادہ جھگڑا بے فائدہ "

مگر فارسی کے بارے میں یہ اعتراف کیا کہ:-

" لغت فارسی ہو، روزمرّہ فارسی ہو، تو اہلِ زبان کے کلام سے سند کریں "

چنانچہ میرزا صاحب مستند اہلِ زبان استادوں کی پیروی پر فخر کرتے اور ہمیشہ انہیں کے کلام سے استناد کو پسند کرتے تھے، اور اس میں گزشتہ استادوں کی قید نہ تھی، بلکہ جو اہل زبان ان کے ہمعصر تھے، ان سے استناد کو بھی موجب ننگ نہیں جانتے تھے۔ مولانا

[1] اردوئے معلّٰی: ۱۰۲ [2] خطوط غالب: ۱، ۸۳ [3] اردوئے معلّٰی: ۲۰۴ و ۴۰۵؛ [4] خطوط ۱، ۱۸۳

علی اکبر شیرازی کے متعلق نور الحسن خاں کو ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

"غزلی از فکرہای تازہ ہم دریں ورق می نگارم، واز شما بدین تفقد امید دارم کہ ویژہ بہرایں کار بدان والاگہر بپیوندید۔ وغزل را پیشِ باریافتگانِ بزم والا پیش برخوانید، وعرضہ دارید کہ ـــ ہندوستانی بدین ہنجار در پارسی زبان سخن می سراید۔ اگر آنچہ می گوید درخورِ آفرین است دستوری تادیگر از کلک وورق کام ستان وبخیالِ نغز گفتاری شادمان باشد، ورنہ دور باشی، تا بعد ازیں گردِ ایں آرزو نگردد وبہرزہ خونِ جگر نخورد۔" (کلیات نثر فارسی : ۱۱۲)

ظاہر ہے کہ ایسا شخص اساتذہ کے کلام میں کوئی ترکیب نہ پاتا تو اُس کی صحت میں شک وشبہ کا اظہار کیوں نہ کرتا۔ اور اس کے برخلاف اُس کا سرِ تسلیم خم کیوں نہ ہوجاتا مگر ہندوستانیوں میں امیر خسرو کے علاوہ کسی کو نہ مانتے تھے۔ سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- [۱]

"حضرت کو یہ معلوم رہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب، کلیم واسیر وحزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا، اس کو نظم ونثر میں نہیں لکھتا، جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کا ان کا حال کیا گزارش کروں؟ ایک ان میں صاحب "برہان قاطع" ہے، آج کل ان دنوں میں "برہانِ قاطع" کو دیکھ رہا ہوں، اور اُس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں، اگر زیست باقی ہے، تو ان کو جمع کرکے اس نسخے کا نام "قاطع برہان" رکھوں گا۔"

مرزا تفتہ کو تحریر کرتے ہیں :- [۲]

"اہلِ ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا، نظامی وسعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اسے مانیں، ہندیوں کو کیوں کر مسلّم الثبوت جانیں؟"

بیخبر کو لکھا ہے :- [۳]

"فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی۔ پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کرسکتا، جانبِ غلطی میرے نزدیک راجح ہے۔ آپ جب تک کلامِ اہل زبان میں نہ دیکھ لیں، اس کو جائز نہ جانیے گا، مگر کلام سعدی ونظامی وحزیں اور اُن کے امثال ونظائر کا معتمد علیہ ہے، نہ آرزو، اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

ایک اور خط میں پھر سرور کو لکھا ہے : [۴]

"غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرتِ امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلّم الثبوت نہیں ہوا، خسرو، کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے، یا بچشم نظامی گنجوی وہمطرحِ سعدی شیرازی ہے۔"

خیر، فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے، کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے، دیکھو، عبد القادر بدایونی کیا لکھتا ہے "زہی سیاہی قایلش" آرزو، فقیر اور رشید اور بہار وغیرہم انہیں میں آگئے، ناصر علی اور بیدل، اور غنیمت ان کی فارسی کیا، ہر ایک کا کلام بنظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟"

حسرت، اور مکیں، اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، ان حضرات میں عالمِ علومِ عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں، فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟"

[۱] خطوط : ۱۸۳۰۱ [۲] اردوئے معلی : ۳۵۹ وخطوط : ۱۰۰۲ [۳] عود : ۱۳۲ [۴] ایضاً : ۱۳۲

فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پڑی قیاس دہائی عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ، وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، مُنہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے۔ فارسی وہ کیا جانیں، قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ!"

قدر بلگرامی سے فرماتے ہیں :- [1]

"صاحب بندہ، تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل کے بچے کا، بچے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام ہے۔"

راہِ سخن کے غول

ان ہندی شاعروں اور ادیبوں کا نام میرزا صاحب نے "راہِ سخن کے غول" رکھا تھا۔ خلیفہ شاہ محمد، مادھو رام غنیمت اور قتیل کی طرف اشارہ کر کے نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو لکھا ہے :

"یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے، یہ فارسی کو کیا جانیں! ہاں، طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے"

ہرزہ مشتاب و پئی جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

ان کی رائے میں فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل اصول "مناسبتِ طبیعت اور تتبع کلامِ اہلِ زبان ہے"، "اساتذہ کے کلام میں اگر توغل رہے تو ہزارہا بات نئی معلوم ہوتی ہے [2] اور انسان کی نظر میں واقعی ادبی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔"

سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :- [3]

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلامِ اہلِ زبان، لیکن نہ اشعارِ قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان، کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہئے، اور کسی تعریف کے شایانِ شان نہیں ہیں، نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک۔ ہاں، الفاظِ فرسودہ عامیانہ، جو اطفالِ دبستان جانتے ہیں، اور جو مقصدی نثر میں درج کرتے ہیں۔

جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال نظائر کا کلام بالاستیفا دیکھا جائے، اور ان کی ترکیب سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے، تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"

نواب علی بہادر مسند نشینِ باندہ (بوندیل کھنڈ) کو اصلاحِ اشعار کے سلسلے میں از راہِ نصیحت لکھا ہے :- [4]

"اگر پژوہشِ ایں راز، و محرمی پردۂ ایں ساز آرزو دارند، از ریختہ گویان گفتارِ میر و میرزا، واز زمزمۂ پارسی گویاں کلامِ صائب و عرفی و نظیری و حزیں در نظر داشتہ باشند، نہ نظر و اشتی کہ سوادِ ورق از دیدہ بدل نیاید، بلکہ ہمہ کوشش در آں رود کہ جوہرِ لفظ را بشناسند، و فروغِ معنی را بنگرند، و سرہ را از ناسرہ جدا کنند۔"

بیدلانہ فارسی

چونکہ میرزا صاحب اساتذہ کی پیروی پر زور دیتے تھے، اس لئے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس اتباع میں تقلیدِ محض کا رنگ جھلکتا ہوگا۔ لیکن واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ وہ غلطی میں کسی کی پیروی کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :- [5]

[1] خطوط : ۱/ ۱۷۹ [2] اردوئے معلیٰ : ۲۹۹ [3] عود : ۱۳۱ [4] عود : ۸ [5] کلیات نثر فارسی : ۲۳۲ [6] اردوئے معلیٰ (لاہوری ایڈیشن) ۲۷۳۔

"غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے"

دوسرے خط میں فرماتے ہیں :- [1]

"حزیں تو آدمی تھا یہ مصرع اگر جبرئیل کا ہو، تو اس کو سند نہ جانو، اس کی پیروی نہ کرو"

اب آپ غور کیجئے کہ جو شخص جمہور اور مستند اساتذۂ ایرانی کی تقلید بھی عامیانہ اور کورانہ طریق پر نہ کرتا ہو، "بیدلانہ فارسی" کو کس طرح قبول کر سکتا ہے، اور کوئی تعجب کا مقام نہیں اگر اس نے کہا ہے :- [2]

"کیستم من کہ تا ابد بزیم، لاحول ولا قوۃ، یہ مصرع میرا نہیں ہے۔" تا ابد بزیم" یہ فارسی "لالہ قتیل" کی ہے۔"

ہمارے فاضل دوست مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رامپوری اُردو زبان کے اُن چند اہلِ قلم اور اربابِ نظر میں سے ایک ہیں جو "غالب" پر (authority) سمجھے جاتے ہیں ——— اربابِ خبر اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں، کہ دربارِ رام پور سے مرزا غالب کے بہت گہرے روابط رہے ہیں، غالب کی خود نوشتہ اصلاحیں اور خطوط وغیرہ رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہیں۔

جناب عرشی رام پور کے رہنے والے ہیں اور بہت دنوں سے رام پور کے سرکاری کتبخانہ کے ناظم ہیں، اس لئے "غالب" پر اُن کی رائے خاص وقعت رکھتی ہے کہ انہوں نے غالب کے مخطوطات، ملفوظات، اور تذکروں کی "ریسرچ" پر کافی محنت کی ہے اور اُن کی خداداد ذہانت اور ادبی صلاحیت کو "غالب" پر کام کرنے کی سہولتیں بھی میسّر آئی ہیں۔

اس مقالہ میں فاضل مضمون نگار نے ایک عجیب دلچسپ بحث کا آغاز کیا ہے، یہ مضمون اس موضوع پر "حرفِ آخر" کی حیثیت نہیں رکھتا کہ اُس پر کچھ کہا ہی نہ جا سکے، اگر اربابِ ذوق نے سنجیدگی کے ساتھ اس مبحث پر گفتگو کی، تو یہ سلسلہ جتنا دراز ہوگا اُسی قدر دلچسپ اور شاید کارآمد ثابت ہوگا۔

مرزا غالب بھی عجب پُرلطف آدمی ہیں کہ ایک طرف ہرمزد ——— عبدالصمد کو اپنا اُستاد بتاتے ہیں، اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ میں 'بے استادا' نہ کہلاؤں اسلئے یہ نام فرضی طور پر گھڑ لیا تھا، [3]

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اور یہ بھی [3] جو تم سے شہر میں دو چار ہوں تو کیونکر (م-ق)

---

[1] اردوئے معلّٰی (لاہوری ایڈیشن) ۲۷۹ [2] خطوط: ۱، ۸۲ [3] خطوط ۱، ۱۱۷

محمد جمیل بیہم (بیروت)

ترجمہ: حکیم اسرار احمد کریوی

تلخیص: ادارۂ فاران

عورت کو قوموں اور مذہبوں نے کیا سمجھا اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا

اور

پھر عورت کو کس نے مظلومیت کے پنجہ سے چھڑا کر اُس کی ذلّت کو عزّت و احترام سے بدل دیا، اور اسکی شخصیّت کو پہچانا۔

بابلی اور اشوری عورت

دو آبہ دجلہ اور فرات میں کسی زمانہ میں ایک قوم تھی جس کا تمدن قدیم انتہائی عروج پر تھا، یہ قوم گزشتہ صدی تک صفحۂ دہر سے بالکل معدوم تھی، لیکن زمانہ کی طویل خاموشی کے بعد، ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں اور ٹیلوں سے ایسی چیزیں نکلی ہیں، جن کے واسطے سے تین ہزار سال کے مسلسل سکوت کے بعد یہ قومیں اپنے تمدّن کی کہانیاں سُنانے کے لئے زندہ ہوگئی ہیں، آثارِ قدیمہ کے اکتشافات بھی کتنے کار آمد ہوتے ہیں، ان کی بدولت تاریخ کی گم شدہ کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔

اشور کا دار السلطنت دجلہ کے کنارے نینوی میں تھا۔ اور کلدآن کا بیت الحکمت دریائے فرات کے ساحل پر بابل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ بابلی اور اشوری دونوں قوموں کا تمدن دوش بدوش تھا۔ سنہ ۱۳۱۰ قبل مسیح میں اشوریوں نے بابل پر قبضہ کر لیا، ان کی حکومت سنہ ۶۲۵ ق، م تک قائم رہی، اُس کے بعد مادیین یعنی پیروانِ زردشت نے ان ممالک کو فتح کرکے اپنے اثر و اقتدار کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

فنیقیوں کی طرح اشوریوں نے بھی اپنے قاہر و طاقتور خدا کی رفیقہ حیات تلاش کرلی جسے وہ "استار" کہتے تھے، خدا کے ساتھ بیوی کا بھی مقدس ہوگئی، یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے اپنی آنکھوں سے ایسے میلے دیکھے ہیں جن میں فنیقی عورتوں کی طرح اشوری عورتیں اپنی معبودہ "استارہ" کے خوش کرنے کے لئے اپنی عصمت ہر کس و ناکس کے حوالے کر دیتی تھیں۔

بابلیوں اور اشوریوں کا مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں مناسب اور موزوں لڑکوں سے کردیں، بلکہ شادی کی قابل کنواری لڑکیوں کے لئے ضروری تھا، کہ ہر سال ایک مقام پر جمع ہوں، جہاں انہیں مذہبی پیشوا اس شرط پر نیلام کرتا تھا کہ

کہ وہ خریدنے والوں کی بیویاں ہوں گی، جب میاں بیوی میں کھٹ پٹ ہو جاتی تو لڑکی کے سرپرست کو علیحدگی سے قبل ساری قیمت شوہر کو ادا کرنی پڑتی۔

زندگی میں ایک بار ہر عورت کو عصمت فروشی کے لئے خالقہ حسن وجمال "میلتیا" کے مجسمہ پر جانا ضروری تھا، معبد میں عورتیں صف باندھ کر بٹھادی جاتیں، درمیان میں ایک راستہ ہوتا، جہاں ایک اجنبی مرد برکت حاصل کرنے کے لئے گزرتا اگر اُس کو کوئی عورت اچھی معلوم ہوتی تو وہ اس کے آگے چاندی کا ایک ٹکڑا پھینک کر کہتا — "میں تجھے "میلتیا" تک پہونچنے کا وسیلہ بناتا ہوں" اس طریقہ سے اس کی نذر خواہ حقیر ہی کیوں نہ ہو قبول کر لی جاتی اور اُس عورت کو اُس مرد کے ساتھ اختلاط کے لمحے گزارنے پڑتے۔

ایران قدیم میں عورت کا درجہ

روسلر (Rosler.) کا قول ہے کہ زمانہ قدیم میں ایرانیوں کا مذہبی اعتقاد اعلیٰ اُن کے شرعی ارکان ومراسم تھے، لیکن تیرھویں صدی قبل مسیح میں اہل ایران اشور اور بابل کے محکوم ہوتے تو انہوں نے اشوریوں اور بابلیوں کے بعض اعتقادات اور خیالات کو اختیار کرلیا کیونکہ رعایا بادشاہ کی پیرو ہوتی ہے، کلدانیوں کی تقلید میں وہ آگ اور ستاروں کی طرف جھکے اہل پارس میں مادیت اور ثنویت کی ابتدا بیسویں صدی قبل مسیح میں زردشت نے کی!

سقراط کا ممتاز شاگرد زینوفن (.Xanophon) جس نے فارس کے علوم وفنون پر روشنی ڈالی ہے اس نے ایک لفظ بھی ایران کی لڑکیوں کی تربیت کے بارے میں نہیں لکھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایران قدیم کی معاشرت میں عورت کا کوئی قابلِ ذکر مقام نہ تھا — ایرانِ قدیم کی عورت مرد کے بااختیار ہاتھوں میں ایک گیند سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، وہ اس کو سزائے موت بھی دیا کرتا تھا۔

بھارت ورش میں

ویدک آریہ عورت مذہبی مراسم بجالانے سے محروم تھی، عبادت گاہوں پر قربانی کرنے اور نذر چڑھانے کی عورتوں کو اجازت نہ تھی — منو کی شریعت کی رُو سے بیوی کے مرجانے کے بعد مرد تو شادی کرسکتا تھا مگر بیوہ عورت چاہے آغازِ شباب ہی میں وہ بیوہ کیوں نہ ہو گئی ہو، پھیرے جی شادی نہ کرسکتی تھی۔ وہ جنم دُکھیا کہلانے کے لئے دنیا میں زندہ رہ جاتی، سہاگنیں اس کی پرچھائیں سے اپنے آپ کو بچاتیں۔ ہاں! اُسے ستی ہوجانے کی البتہ اجازت تھی — اور یہ بھی:-

(۱) عورت ایک بے حقیقت وجود ہے

(۲) کسی معاملہ میں عورت کو شہادت دینے کا حق حاصل نہیں۔

(۳) اس کا سارا مال واسباب خاوند کی ملکیت ہے۔

(۴) بچہ جننے کے بعد وہ اور اس کے ساتھ رہنے والے دس دن تک اپوتر (ناپاک) ہوجاتے ہیں۔

(۵) عورت مرد کی محض ایک کنیز ہے

(۶) اپنے شوہر کے ساتھ عورت ایک دسترخوان پر کھانا نہیں کھاسکتی

(۷) عورت، خاوند کا نام زبان سے نہیں لے سکتی۔

جاپانی عورت

جاپان کے عہدِ قدیم میں ایک عورت "اماتراسو" گزری ہے، جسے جاپانی "سورج کی دیوی" کہتے ہیں، اس عورت کے طفیل جاپان میں تنظیم قومی کی بنیاد پڑی، جاپان کے تخت حکومت پر ایک دو نہیں سولہ عورتیں مختلف زمانوں میں متمکن ہوتیں، ان میں "سوئیکو تنو" نے بہت نام پیدا کیا، جاپان کی تاریخ اس ملکہ کے وجود پر ناز کرتی ہے —

جاپان کی دوسری مشاہیر عورتیں :-

(۲،۱) جنکو خوا اور ماساکو، سیاست میں۔ (۳) انو نو کوماسی شاعری میں۔ (۴) مورساکی شکیبو فسانہ نگاری میں۔ (۵) شنی شتاغون، فنِ تاریخ میں مشہور ہوئیں اور (۶) ہنواگو نے جرأت و دلیری میں شہرت حاصل کی، یہ عورت اپنے زمانہ کی شہزادی کہلاتی تھی، ——— اس کے باوجود اہل جاپان کے مذہب میں بیوی اور لڑکی کا بیچنا جائز تھا یہاں تک کہ ۱۸۷۲ء تک یہ طریقہ جاری رہا، جاپانی مرد اپنی خواہشوں کے مطابق عورت پر ہر طرح کا تصرف کرتے تھے، عورت بالکل بے بس تھی، اہل جاپان عورت کو دنیوی مال و اسباب سے زیادہ اہمیت اور وقعت نہ دیتے تھے۔

چینی عورت

چین کے اخلاقی مذہب کے بانی کنفوشس کے اقوال سے خانگی امور میں عورت کی ذلت کافی سے زیادہ مترشح ہوتی ہے ——— کنفی کی شریعت نے مرد کو سو سے تین سو عورتوں تک نکاح کا حق عطا کیا، مورخین نے لکھا ہے کہ خاندان "یو" کے آخری ظالم وسفاک شہنشاہ "کن" کے شاہی محل میں تین ہزار عورتیں تھیں۔

قدیم چین میں شوہر کے مرنے کے بعد عورت کو وراثت نہ ملتی تھی، اسی طرح لڑکی باپ کے مال سے کچھ نہیں پاتی تھی اُن کے مذہب نے قانونی سزاؤں میں بھی مرد و عورت کا امتیاز ملحوظ رکھا تھا۔

شہنشاہ ہوتی کی ایک ہم عصر خاتون بان سوری مال نے اپنے زمانہ میں عورت کی خانگی زندگی پر روشنی ڈالی ہے:۔

"ہمارا شمار انسانوں کی سب سے آخری قطار میں ہے، انسانی دنیا میں سب سے کمزور ہمیں ہیں، جو کم حیثیت سے کم حیثیت کام ہوتا ہے وہ ہمارا حصہ ہے، جب لڑکی خاوند کے گھر منتقل ہو جاتی ہے تو وہ اپنا تمام مال، شخصیت غرضکہ ہر چیز کھو دیتی ہے زوجہ بقول "من جسم شو" گھر میں سایہ اور صدائے گنبد کی طرح رہتی ہے، سایہ کی وہی صورت ہے جو جسم کی، اور گنبد سے وہی آواز آتی ہے جو پہلے نکالی گئی ہے، اور جس طرح عورت پر دوسروں کی فرماں برداری لازم ہے، اسی طرح اُس کو کسی پر حکم چلانے کا اختیار نہیں ..... "

فنیقیا میں

کوہ لبنان کا وہ سلسلہ جو عکہ سے بابِ اس تک پھیلا ہوا ہے فنیقیہ کہلاتا ہے اس کے باشندے کنعانی تھے اور ان کی حکومت چودہویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے، قدیم اور مشہور ترین شہروں میں صیدا، صور، جبیل، طرابلس اور بیروت تھے۔

فنیقی ایجاد و اختراع، تجارت اور سفارت میں مشہور ہوئے، ارغوانی رنگ، کانچ اور حروف تہجی کی ایجاد انہیں سے منسوب ہے ——— فنیقی نیچر کی پرستش کرتے تھے، جس کا مظہر بعل نامی بُت تھا، آگ کے خدا کا نام "مولوخ" تھا، اور محافظ کائنات "ملکرت" کہلاتا تھا، اور اُس کی ملکہ "عشتروت" (زہرہ) اُلوہیت میں اس کی شریک تھی۔

آگسٹ روسٹر نے لکھا ہے کہ عورتوں کا مرتبہ فنیقی قوم میں بہتر نہ تھا، دیوتاؤں اور دیویوں کے آستانوں پر انسانی جان کی قربانی کا عام رواج تھا، پرہیزگار لوگ جب اپنے خداؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنے جسم کے ٹکڑے کاٹ کر ڈالتے تو اُن کی دیکھا دیکھی ہماری بیبیاں بھی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے پھول سے بچوں کو ڈال دیتیں۔

یہودیت اور نصرانیت

اسرائیلیوں کے خیال میں عورت فطرتاً ناپاک تھی، بیواؤں کو وراثت سے محروم کر دیا جاتا، عورت صنفِ نازک ہونے کے سبب کوئی چیز ہی نہ تھی، وہ بیچ ڈالی جاتی، قید ہوتی، عورت کا رجحان اور ارادہ کسی صورت میں قابلِ لحاظ نہ تھا، شریعت اسرائیلیہ میں والدین اپنے بچوں کو کمایہ پر دے سکتے تھے، اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو غلاموں کی طرح بازار میں بیچ ڈالتے۔

پولس نے تیوتاوس کو ایک خط میں لکھا ہے :-

" لیکن میں عورت کو پڑھنے لکھنے اور مرد پر مسلط ہونے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسے خاموش رہنا چاہیے، کیونکہ پہلے آدمؑ پیدا کئے گئے، پھر حوا، آدمؑ نہیں بہکے اور عورت بہک گئی اس لئے وہ محکوم ٹھہری ...... "

مسیحیت نے مذہبی امور میں بھی مساوات کا خیال نہ کیا، اس نے عورت کو مذہبی اقتدار حاصل کرنے، یہاں تک کہ کنیسہ میں بولنے تک کی اجازت نہ دی ——

" پنی عورتوں کو کنیسوں میں خاموش رکھو، کیونکہ انہیں بولنے کا حق نہیں، جو کچھ پیشوا کہے، انہیں ماننا ضروری ہے اگر وہ کچھ جاننا چاہیں تو انہیں گھر میں اپنے خاوندوں سے پوچھنا چاہیے، کیونکہ عورتوں کے لئے یہ بُرا ہے کہ کنیسہ میں بولیں "

(رسالہ پولس)

مسیحی فلسفیوں نے عورت کی یہ تعریف کی ہے —— عورت منحوس اور بدبخت ہے، اس کی اصل افعی سے ہے، انہوں نے عورت کا نام منبع الشر خطاؤں کی بنیاد، قبر کا سوراخ، جہنم کا دروازہ اور بدبختی کا انجام رکھا —— ترتولین نے ببانگ دہل کہہ دیا :-

" اے عورت ! تجھ پر لازم ہے کہ ہمیشہ ماتمی لباس اور کافوری شمعوں میں گرفتار رہے، نظروں کے سامنے نہ آ مگر خطاوار غمگین اور آنسوؤں میں غرق ہو کر ...... "

یونان میں

مشہور فلسفی ارسطو لکھتا ہے :-

" اسپارٹا میں علوم و فنون کے مدارس عام ہیں جہاں لڑکے حسبِ استعداد تعلیم حاصل کرتے ہیں اور لڑکیاں بالکل ناکارہ رہ جاتی ہیں، اس جنگجو قوم میں وہ ذلیل زندگی بسر کرتی ہیں ...... "

یونان میں بھائیوں کے ہوتے ہوئے بہنوں کو باپ کے مال و اسباب سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا —— یونانیوں کی نظر میں عورت ایک ناکارہ مخلوق تھی اور حصول فضائل اور اکتسابِ علم و کمال کی استعداد ہی اس میں نہ تھی ——

اہلِ ایتھنز کا بھی بعض قوموں کی طرح یہی عقیدہ تھا :-

" عورتیں دُنیوی مال و اسباب کی مانند ہیں ان کی پیدائش ہی مَرد کے استعمال کے لئے ہوئی ہے "

رُومی عورت

یونانی عورتوں کی طرح رومی عورت بھی زمانہ قدیم میں بے وقعت سمجھی جاتی تھی، بیوہ کے عقدِ ثانی کی ممانعت تھی باپ کو لڑکی کی مرضی کے خلاف اُس کی شادی کرنے کا صرف حق ہی نہ تھا بلکہ شادی کے بعد بھی اس کی سرپرستی زائل نہ ہوتی تھی، بیٹی کے پیمانِ نکاح کو باپ ہر وقت توڑ سکتا تھا، وہ لڑکی کو اس کے پیارے خاوند اور چہیتے بچوں سے چھڑا سکتا تھا؟

اہلِ عرب

جاہلیتِ عرب میں شوہر کے مرجانے پر عورت کو اس کے ترکہ میں کوئی حصہ نہ ملتا، عربوں کے خیال میں عورت صرف مرد کی لذّت کے لئے پیدا کی گئی —————— عورت کی حقارت نمایاں کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اہلِ عرب لڑکیوں کی ولادت کے سبب غصہ کے مارے کباب کی طرح کروٹیں بدلنے لگتے۔ وہ شرم کی وجہ سے لڑکیوں کی ولادت پوشیدہ رکھتے، گویا انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے یا عار کے مرتکب ہوئے ہیں، لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر اہلِ عربؔ کے چہروں پر سیاہی آجاتی، زندہ لڑکیوں کو وہ زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے

لہ قرآن شریف میں اس کی تصریح موجود ہے !

عورت کی زندگی کے تین دَور

لڑکی ———

مردوں کے خیال میں عورت جس قدر ذلیل تھی، اسی اعتبار سے لڑکیوں کی پیدائش سے ان کا تنفر بڑھ گیا، لڑکیوں کی ولادت سے اُن کی یہ کراہت فطری ہو گئی جس کا انہوں نے اپنے اعتقادات پر رنگ چڑھایا۔

اسرائیلی شریعت پر نظر ڈالنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد عورت کی میعاد پاکیزگی کا تعین قابل لحاظ ہے لڑکی جننے والی کو لڑکا جننے والی سے دوگنی مدت تک دائرہ نجاست میں رہنا پڑتا تھا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ طبعاً لڑکی اور لڑکے کی پیدائش میں آخر کیا فرق ہے؟ کہ جس کا لحاظ مدتِ پاکیزگی میں کیا گیا، یہ محض زور بازو کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے انسانی اعتقادات پر مسلط ہو کر جنسی تفریق کی بنا ڈالی۔

صرف یہودی ہی اس وہم میں گرفتار نہ تھے، بھارت ورش کے ہندو بھی لڑکوں کی پیدائش پر خاص اہتمام کرتے، اُن کا خیال تھا کہ لڑکے ہی ان کے لئے نروان (نجات) کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ لڑکے ہی ان کے لئے پرارتھنا کرنے والے اور اُن کی جانب سے قربانی دینے والے تھے، عورت ان فرائض کے بجالانے سے قاصر تھی، —— ۔۔یہی حال اہلِ چین کا تھا، وہ لڑکیوں کو مفلسی کے خوف سے اکثر و بیشتر مار ڈالتے تھے۔

یورپ کے قدیم باشندے بھی اس اثر سے محفوظ نہ تھے، اہلِ ایتھنز (Athens) لڑکے کی پیدائش کا اظہار مسرت کے ساتھ اعلان کرتے، دروازے پر زیتونی شمعیں جلاتے، اسپارٹا میں جس کے دس لڑکیاں پیدا ہوتیں تو وہ ان میں سے سات لڑکیوں کو قتل کر کے ان معصوم جانوں کا نام و نشان ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیتا۔

سرزمین رُوم کے قدیم مہذب شرفا بھی یونانیوں سے کچھ بہتر نہ تھے۔ اکثر مواقع پر مغرور و متکبر رُومی اپنے نوزائیدہ بچہ سے منہ پھیر لیتا، صرف اس لئے کہ اس بچہ کا تعلق صنفِ نازک سے تھا۔—— ۔۔۔ —— قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے یہاں صرف لوئی یازدہم شہنشاہِ فرانس کی مثال کافی ہوگی جو اپنی لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر جوشِ غضب اور شدت رنج و تعب میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

جاہلیت کی عرب قومیں تو لڑکی کی پیدائش کو اور زیادہ قابلِ ہتک سمجھتی تھیں، قرآن کریم میں اُن کا اس طرح ذکر آیا ہے

"جب کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تو غم و غصہ میں اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا، اس بُری خبر کو قوم سے چھپاتا، آیا ذلت کے ساتھ اُسے زندہ رہنے دے یا زندہ درگور کر دے، ان کا رویہ کس قدر بُرا ہے"۔

اسلام کو یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی، اسلام نے اس کے روکنے میں بہت سختی کی، حکم ہوا :-

"اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل مت کرو، ہم اُنہیں اور تمہیں بھی رزق دیتے ہیں، ان کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے ۔۔۔۔۔"

اسی طرح صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں سے رفق و محبت کا سلوک کرنے کے لئے حسب ذیل ارشادات کی تلقین فرمائی :-

"جس شخص کے لڑکی پیدا ہوتی اور اُس نے اُس کی اچھی تربیت کی' اچھا کھلایا پہنایا، خدا نے جو نعمتیں اُسے دی تھیں اُس نے لڑکی کو اُن نعمتوں سے آرام دیا تو دوزخ اُس کے دائیں بائیں رہ جائے گی اور وہ جنّت میں چلا جائے گا —— لڑکیوں کو بارِ خاطر خیال نہ کرو، کیونکہ وہ ہمدرد' خیر خواہ' تمہاری پرورش کرنے والی اور تمہارے مصائب میں غم کے آنسو بہانے والی ہیں جس کے دو لڑکیاں تھیں، وراس نے زندگی تک ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تو وہ گویا جنت میں داخل ہو گیا —— جس کے تین لڑکیاں یا تین بہنیں تھیں اور اُس نے اُن کے مصائب اور اذیتوں پر صبر کیا تو اللہ تعالیٰ اُن لڑکیوں کی وجہ سے اُسے جنت میں داخل کرے گا۔"

لڑکیوں کی تالیفِ قلوب اور اُن کا مرتبہ بڑھانے کے لئے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن پر خاص مہربانی فرمائی۔ بلکہ لڑکوں پر تحفوں اور ہدیوں میں ایک گُنا فضیلت دی، حضورؐ سے مروی ہے، کہ جو شخص کسی بازار میں گیا۔ اور کوئی چیز خرید کر گھر لے گیا اور اُسے لڑکوں کو دے کر لڑکیوں کو دیا، اللہ نے اس پر نظر کی، اور جس پر خدا نے نظر ڈالی' اُسے وہ عذاب نہ دے گا —— اور یہ بھی فرمایا۔

"جو شخص بازار سے کوئی اچھی چیز گھر لے گیا —— تو وہ لڑکوں سے پہلے لڑکیوں پر نظر کرے، جس نے صنفِ لطیف کو خوش کیا' تو گویا وہ خدا کے خوف سے رویا اور جو خدا کے خوف سے رویا تو اللہ نے اُس کے بدن کو دوزخ پر حرام کر دیا"

غرض کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسوانی اصلاح کے بارے میں اس قدر منقول ہے کہ پڑھنے والا قریب یہی سمجھے گا کہ اسلام نے لڑکیوں کو لڑکوں پر فضیلت دی لیکن یہ محض حکمت و رغبت پر محمول تھا، تاکہ افراطِ عامہ کی اصلاح ہو جائے، اور جنسی مساوات کا راستہ صاف ہو۔

بیوی ——

قدیم قوموں میں بیوی خاوند کی رفیقۂ حیات اور اُس کی معاشی اور گھریلو زندگی کا سببِ تکمیل نہ تھی، بلکہ اُس کی حیثیت ایک خادمہ سے زیادہ نہ سمجھی جاتی تھی —— اسلام نے اس غیر منصفانہ طریقہ کی اصلاح کی، خصوصاً ذاتی ملکیت، وراثت اور شہادت وغیرہ کے احکام میں صنفِ نازک کے ساتھ رعایت کی، کثرتِ ازدواج اور طلاق کے امور میں اُس کا لحاظ رکھا، اسلام نے بیوی کے ساتھ نرمی اور رواداری کی تلقین کی۔

مصر جو نسوانی حسنِ معاملت کے بارے میں مشہور ہے وہاں بھی عورت مرد کے جبر و قہرمانیت کے دبدبے سے باہر نہ تھی، قدیم مقابر کے نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا لحاظ صرف ازدواجی تعلقات کی بنا پر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مورخین کا بیان ہے کہ بوقورس کے زمانہ سے لے کر دارپوس اول کے عہدِ حکومت تک عورت کا شمار مرد کے مال اسباب میں تھا۔

برہمنوں کی شریعت میں عورت کا کیا درجہ تھا، اس کا عکس "منو" کے اس خیال میں نظر آ سکتا ہے —— کہ عورت کسی حال میں بھی خاوند کی حکومت سے آزاد نہیں ہو سکتی چاہے وہ بیچ ڈالی جائے، خواہ اس سے جدا ہو جائے۔

پیروانِ برہمت نے اس قدر افراط سے کام لیا کہ بیوہ عورتوں کو جبراً آگ میں جلا کر اُن کے شوہروں سے ملا دیتے تھے، چین کے نبی کنفیوشس کا عورت کے بارے میں رویہ بھارت ورش کے منو سے ملتا جلتا تھا، اگر خاوند بے اولاد مر جاتا تو عورت کی عنانِ اختیار ساس سسر کے ہاتھ میں دے دی جاتی، وہی جہاں چاہتے اُسے بیاہ دیتے۔ اس بے چاری کو لب کُشائی تک کی اجازت نہ تھی۔

یورپ کے باشندے بھی اُسے محض کنیز ہی سمجھتے تھے، جرمنی خاوند کو بیوی کے فروخت کرنے کا حق حاصل تھا وہ اُسے مہمانوں کی گرم بستری کے لئے پیش کر سکتا تھا اور مرتے وقت جسے چاہتا دے جاتا۔

خیر بابرہ کو تو ہم اُن کی جہالت کی وجہ سے معذور بھی سمجھ سکتے ہیں، مگر یونان جس کے تمدن کی داستانیں، قصائے عالم میں مشہور ہیں، اس کا یہ عمل تھا کہ یونان میں عورت کا شمار مرد کے مالِ غنیمت میں ہوتا تھا۔ خاوند کو بیوی پر ایسے حقوق حاصل تھے کہ وہ مرتے وقت اسے کسی غیر مرد کے سپرد کر جاتا تھا جو اُس کے اعمال و افعال کا محتاج عام تھا۔

روم قیصر اور دیوکلیشن (۲۸۴ — ۳۰۵) کے زمانہ تک اسی روش پر رہا۔ عورت سے مہد سے لحد تک (from cradle to grave) مرد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی رہی۔ غرضکہ جب متمدن قوموں کا یہ حال تھا تو اہلِ عرب کا زوجہ کی طرف حقارت کی نگاہ سے دیکھنا کوئی عجیب بات نہ تھا۔

اسلام نے عورت کے بارے میں تمام مظالم کا خاتمہ کر کے بیویوں کی قدر بڑھائی، اُن کے حقوق مقرر کئے، خاوند کے بعد بیویوں کو حقِ وراثت سے محروم کرنے کی مخالفت میں اسلام نے حکم دیا۔

"اے ایمان والو! تمہیں زیبا نہیں کہ عورتوں کو حقِ وراثت کراہت کے ساتھ دو۔"

اسی طرح اسلام نے ظالمانہ اور غیر منصفانہ جنسی امتیاز کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ مرد و عورت کا وجود ایک ہی ہے:-

"لوگو! خدا سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی ذات سے پیدا کیا اور اس میں جوڑے بنائے، مرد و عورت کا وجود پھیلایا۔"

قرآن کریم تصریح کرتا ہے:-

"خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے نفوس ہی سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ اُن سے تمہاری خاطر جمع ہو، اُس نے تمہارے درمیان محبت و الفت پیدا کی، اس میں سمجھدار قوم کے لئے بہت نشانیاں ہیں۔"

قرآن کریم میں عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے — "انہیں (عورتوں کو) اچھی طرح رکھو۔۔۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"تم میں بہترین وہی ہے کہ جس کا سلوک عورتوں کے ساتھ بہتر ہے اور میں اپنی عورتوں کے بارے میں تم سے بہتر ہوں" — "مکمل ایمان اسی کا ہے جس کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ نرم اور اخلاق خوشگوار ہے۔" — "عورتوں کی عزت بزرگ ہی کرتا ہے اور صرف کمینہ اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔" — "دو کمزوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو" — (یعنی) "عورت اور غلام کے معاملہ میں!"

"جو شخص اپنی بیوی کی بد خلقی پر صبر کرے خدا اُسے جناب ایوب علیہ السلام کا اجر دیتا ہے —" "اور جو عورت اپنے خاوند کی بد خلقی پر صبر کرتی ہے، خدا اُسے آسیہ زوجہ فرعون کا بدلہ دیتا ہے —"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کے ساتھ اتنی شفقت برتی کہ حضور نے اس کا ذکر تین وصیتوں میں کیا، آپ کی زبان جب تک حرکت میں رہی آپ اسی کا ذکر کرتے رہے۔ ارشاد ہوا:-

"نماز! نماز! اپنے غلاموں کو اُن کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دینا، عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، وہ تمہاری مددگار ہیں، تم نے خدا کی امانت میں ان کا ہاتھ پکڑا، اور خدا کا نام لے کر تم نے ان کو اپنے لئے جائز کیا۔"

ماں

اقوامِ عالم کے علوم و عقائد کی تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کی حیثیت "برتن" سے زیادہ نہ تھی اور مرد اولاد کا مصدر اور اُن کے وجود کی اصل تھا۔

برہمنوں کی شریعت کا فرمان اگرچہ یہی ہے "اپنے باپ اور ماں کی عزت کرو" لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس کا اضافہ کیا کہ تنہا باپ کی عزت و تکریم تیرے لئے آسمانی دروازوں کو کھولے گی۔" بدھ مت کا بھی یہی حال تھا، یونان وروم میں اگرچہ ماں بننے کے ساتھ ہی عورت غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتی تھی، لیکن دونوں جگہ احترام واکرام میں باپ کا ذکر ماں سے پہلے تھا یہودیوں کے علاوہ ایرانی اور جاہلیت کے عرب بھی اسی راستہ پر تھے، بنی اسرائیل بھی باپ کو ماں پر ترجیح دیتے تھے۔ اسلام نے عورت کی حالت سدھارتے ہوئے اس خصوص میں قدیم قوموں کے اعتقادات کی مخالفت بھی کی، اگرچہ اسلام نے والدین کے ساتھ یکساں حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی، لیکن اس نے خاص مواقع پر ماں کو مقدم کیا، ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بولا "اے رسولِ خدا! کون سی ذات میرے حسنِ سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے...." حضورؐ نے اس پر ارشاد فرمایا "تیری ماں" اس آدمی نے کہا "پھر کون؟" آپ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے پھر کہا "پھر کون؟" حضورؐ نے ارشاد کیا "تیری ماں" چوتھی بار اس کے پوچھنے پر حضور نے ارشاد فرمایا "تیرا باپ!"

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے "ماں" کے بارے میں اچھی وصیتیں کیں، اور اسے اکثر مواقع پر مقدم رکھا۔

"ماں، باپ، بہن، بھائی کے ساتھ بھلائی کرو، اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ ان کی قرابت کے اعتبار سے سلوک کرو!"

"ماں کا احسان بیٹے پر (باپ سے) دوگنا ہے" —— "ماں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے" دریافت کیا گیا —— "اے پیغمبرِ خدا!" یہ کیوں"؟ ارشاد ہوا "ماں، باپ سے زیادہ رحم والی ہوتی ہے اور رحیم کی دعا بے اثر نہیں رہتی ——"

اسلام نے جس طرح لڑکی، بہن، بیوی، اور ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی، اسی طرح اس نے خالہ کا بھی خیال رکھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص نے آکر عرض کیا:-

"میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" ——

آپ نے فرمایا "کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟" ——

اس نے کہا —— "نہیں"

آپ نے پھر دریافت فرمایا "کیا تمہاری کوئی خالہ ہے؟" —— کہا —— "ہاں"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اچھا اس کے ساتھ احسان کرو"

غرض اسلام نے عورت کے ہر دورِ حیات میں اس کے ساتھ رحمت و شفقت کی تلقین کی - اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نسوانی اصلاح کی انتہا کر دی

سلیم احمد

اِف ادی ت

ادب میں

یوں تو خیر آپ مجھ پر گڑے مُردے اکھیڑنے کی پھبتی بھی کس سکتے ہیں، اور میں اس پھبتی کو خندہ پیشانی سے قبول بھی کرلوں گا، لیکن اب اس کو کیا جائے کہ تنقید کی بُنیاد اسی گڑے مُردے اکھیڑنے کے فعل پر ہے۔ پیش آمدہ مسائل پر فوری طور پر جو تنقید کی جاتی ہے اس میں عموماً عقلیت کا جز کم ہوتا ہے۔ خواہ وہ بظاہر کتنی ہی عقلی کیوں نہ معلوم ہو ــــ وجہ ظاہر ہے، کسی مسئلہ کے حُسن و قبح کو پرکھنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ مسئلہ بالکل مکمل طور پر سامنے آجائے۔ جب تک مسئلہ پوری طرح سامنے نہیں آتا، اس کی خوبی یا بُرائی کے متعلق کچھ کہنا ہی قطعی غیر عقلی فعل ہے ــــ زندگی کے بحرانی دَور میں کوئی بات قطعیت سے کہنی ناممکن ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے اور دراصل فوری تنقید اندازہ ہی ہوتی ہے، جس میں صحت اور غلطی کا امکان یکساں ہوتا ہے، اس لئے بحرانی دَور کے ختم ہوجانے کے بعد سخت ضروری ہوجاتا ہے۔ کہ اپنے قائم کردہ اندازہ کو سختی سے پرکھا جائے اور جہاں تک ہوسکے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی جانچ پڑتال کی جائے ــــ لیکن یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس میں پیچ در پیچ مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے سب سے پہلا اور غالباً سب سے سخت مقابلہ تو اپنے ذہن اور نفس ہی سے پڑتا ہے۔ ایک اندازہ قائم کرنے اور دوسروں پر اظہار کر دینے کے بعد خود اپنے اندازہ پر ــــ اپنے ذہن پر عمل جراحی کرنا، دراصل بڑے دِل گُردے کا کام ہے۔ دوسرا سخت مقابلہ' ماحول سے ہوتا ہے، عام طور پر لوگ سہل انکاری، یا قوتِ فکر کے انحطاط کی وجہ سے کسی ایک اندازے پر بہت جلد ایمان لے آتے ہیں، کسی جمے جمائے "سماجی نظام، اور پھندے' فکری ماحول میں ایسا ہونا اتنا زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔ لیکن بحرانی دور میں کسی روایت کا قائم ہوجانا شدید مُضر ثابت ہوتا ہے۔ یہ لفظ روایت دراصل میں غلط استعمال کرگیا، روایت تو بہت جاندار چیز ہوتی ہے، اور اس کی تخلیق میں صدیوں کے تربیت یافتہ تہذیبی اور کلچری شعور کی ضرورت ہوتی ہے، بحرانی دَور تو خیر کیا، کسی نومولود تہذیب میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ اس کی تخلیق کی ذمہ داری اپنے سر لے سکے، کسی مربوط، منضبط اور جاندار سماج میں بھی تصورات و رجحانات کی ایک مخصوص شکل اختیار کرنے اور جذباتی و عملی سانچوں کے تیار ہونے میں ایک عمر صَرف ہوتی ہے۔ اور یہ مخصوص رجحانات اور مخصوص سانچے جہاں عام آدمیوں کو ذہنی، نفسی اور عملی زندگی بسر کرنے میں آسانیاں پہونچاتے ہیں۔ وہاں ایک قوم کے تہذیبی شعور اور زندگی کے عظیم آدرشوں کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ بحرانی دَور میں کسی فکری سانچے کا قائم ہوجانا، دراصل انتہائی ذہنی انحطاط کی علامت ہوتا ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ افراد اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو کھو چکے ہیں، اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ نظری و عملی مسائل پر غور و فکر کرسکیں اور بعد میں اپنے اندازوں کی اقدار کو ناپ تول سکیں، ــــ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے ہمارے یہاں جو ادبی رجحانات داخل ہوئے، اور جو ادبی تحریکیں شروع ہوئیں ان کے

متعلق یہ تو بغیر کسی شرط کے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اُردو ادب کو بہت کچھ دیا، لیکن اس اعتراف کے بعد بھی اس بُنیادی ضرورت کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ——

اس طول طویل تمہید کا میرے موضوع سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے کم از کم مجھے ایک فائدہ ضرور حاصل ہوا ہے یہ کہ میں نے اپنے فعل کا جواز تلاش کر لیا ہے۔ چنانچہ آج میں "جدید نظریۂ ادب کی ایک "اصلاح" —— افادی ادب کے متعلق اظہارِ خیال کی جرأت کرتا ہوں۔

افادیت کیا ہے؟ —— اور جب ہم ادب میں افادیت کی تلاش کرتے ہیں تو اس کا مقصود کیا ہوتا ہے؟ —— یہ سوال تو بعد میں اُٹھائے جا سکتے ہیں۔ پہلے تو میں صرف اس مسئلہ پر نگاہ ڈالتا ہوں کہ ہمارے جدید نقادوں نے اس "اصطلاح" کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے؟ —— قدیم اُردو ادب پر ایک عامیانہ اعتراض یہ تھا کہ اس میں گل و بلبل کے قصوں اور حسن و عشق کی حکایتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے —— اس عامیانہ اعتراض سے جس چیز کا اظہار ہوتا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ معترضین کو ادب کا کوئی علم نہیں ہے۔ نہ تو وہ ادب میں تشبیہ و استعارہ کی اہمیت سے واقف ہیں نہ ادبی اسالیب سے —— اور اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد، اس اعتراض کی سرے سے کوئی وقعت ہی نہیں رہتی ہے، لیکن مسئلہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے، اس لئے کہ اس اعتراض سے بہت ملتی جلتی باتیں، ہمارے بعض ایسے مقتدر اہلِ علم و ادب نے کہی ہیں، جن کے متعلق کم از کم اس کا تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ادبی اسالیب سے ناواقف ہیں اور یہ بات، بہت دُور تک پہونچتی ہے، فی الحال تو وہ ملتی جلتی باتیں ملاحظہ فرمایئے۔

مجنوں گورکھپوری صاحب نے قدیم اُردو شاعری کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے انہوں نے اسلوب کی نزاکتوں اور لطافتوں پر سر بھی دُھنا ہے، یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ غزل کا شعر سن کر منہ سے بے اختیار "آہ" یا "واہ" نکل جاتی ہے، لیکن ان کا اعتراض یہ ہے کہ "اردو شاعری نے ہمیں بجز اس 'آہ' اور 'واہ' کے اور کچھ نہیں دیا" —— جناب اختر حسین رائے پوری تو بالکل ہی شمشیر برہنہ ہیں، انہیں قدیم اُردو شاعری میں ذہنی عیاشی کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ —— احتشام حسین صاحب کا خیال ہے کہ اردو شاعری کا تعلق درباروں سے رہا ہے، اس لئے اس میں عوامی آواز، نہیں سنائی دیتی —— اور ہمارے 'اقبال پرست' نقادانِ ادب کا تو متفقہ فیصلہ ہی یہی ہے کہ

ع جامش از زہر اجل سرمایہ دار

دیکھئے وہی ایک اعتراض کہ قدیم اردو شاعری غیر افادی ہے، کس کس طرح دُہرایا گیا ہے —— ظاہر ہے کہ اس اعتراض کو ٹالا نہیں جا سکتا —— غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس اعتراض کی تہ میں افادیت کا کون سا تصور کار فرما ہے؟

افادیت کیا ہے؟

عام زندگی میں جب ہم کسی چیز کے متعلق "مفید اور کار آمد" کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے یہ چیز ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہماری مادی ضرورتوں میں کار آمد ہے —— "فرد" کے نقطۂ نظر سے الگ ہو کر اگر اُسے قومی زندگی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو 'مفید اور کار آمد' چیزوں کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ قوم کی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں، —— اور اجتماعی ضرورت کا مفہوم ہمارے یہاں سیاسی مسائل لئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم غلام ہیں، چنانچہ ہماری قوم کی اولین ضرورت اس ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنا ہے، اور یہ نجات ہم صرف سیاست کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہمارے یہاں جب ادب میں بھی 'افادیت' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم صرف یہ ہوتا ہے کہ "وہ ادب جو ہمارے سیاسی مسائل کی ترجمانی کرتا ہو، جو ہماری قوم کی سیاسی جدوجہد کا آئینہ دار ہو" —— آج ہم آزاد ضرور ہو چکے ہیں لیکن شاید ہمارے ذہنوں کی فضا ابھی تک نہیں بدلی ہے، اور ہم اپنی قوم کو ابھی تک غلام ہی سمجھتے ہیں، اسی لئے میں نے جان کر

" احساس " ہی کا لفظ استعمال کیا ہے ، کہ اگر ' احساس ' بدل گیا ہوتا اور ہم نے ذہنی لحاظ سے بھی آزادی کی حقیقت کو تسلیم کر لیا ہوتا ، تو شاید ' افادیت ' کے اس مفہوم میں کچھ وسعت پیدا ہو جاتی ، بہر حال کہنے کا مقصود یہ ہے کہ جب ہمارے ان بزرگوں نے ادب میں ' افادیت ' کا لفظ استعمال کیا " تو اس سے مُراد " سیاسی افادیت " ہی لی ـــــ اور افادیت ' کا یہ تصوّر ' ایک روایت کی حیثیت اختیار کر گیا ، اور آزادی کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ۔ یہ روایتی جمود ' ایک قوم کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے ۔ لیکن ہمارے بزرگ اس آئندہ خطرہ کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے تھے ، چنانچہ ان کی تحریروں میں اس قسم کا کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا ، جس سے یہ پتہ چل جائے کہ افادیت کا یہ تصور محض ' جمہوری دَور کے لئے ہے ـــــ انہوں نے اس تصور کو ادبی قدر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ، اور اس کی بنیاد پر قدیم ادب کے متعلق بھی فتوے صادر کر دیئے ـــــ ان فتووں نے شدید گمراہی پھیلائی ، اس گمراہی کو ہم آج بھی ادب میں بالکل واشگاف طریقہ پر دکھلا سکتے ہیں ۔

آج کے بین الاقوامی حالات کو دیکھتے ہوئے میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ سیاست بہت اہم چیز ہے ـــــ لیکن اس اعتراف کے بعد بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ زندگی ۔ سیاست نہیں ہے ۔ زندگی کی اور اقدار بھی ہیں ، اور وہ اتنی وسیع و عمیق ہیں کہ سیاست اُن کے سامنے ایک ' چہ بچہ ' سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔ ـــــ ہماری زندگی میں سیاست نے جو اہمیت حاصل کر لی ہے ، اس کے متعلق یہ تو تسلیم ہے کہ جب کوئی قوم ' ایسے دَور سے گذرتی ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے ، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں یہ دَور بہت جلد گذر جاتا ہے ، اور اگر کوئی قوم اس حالت سے جلدی نہیں نکل پاتی تو اور کچھ ہو یا نہ ہو ، ذہنی ، جذباتی ، اور رُوحانی اعتبار سے بالکل جذامی ہو جاتی ہے ، اور جس قوم کی یہ حالت ہو جائے اُسے کوئی سیاست بھی تباہی سے نہیں بچا سکتی (بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُسے تباہ ہی ہونا چاہئے ،) پانی کہیں میسّر نہ آتا ہو تو مجبوراً جان بچانے کے لئے ' چہ بچہ ' کا پانی بھی پیا جا سکتا ہے لیکن ' چہ بچہ ' کا پانی مستقل طور پر پیتے رہنے سے ہزاروں ایسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں جن کا علاج صرف موت کرتی ہے ۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر ضروری ہو جاتا ہے کہ جلد از جلد زمین کھودی جائے ، اور تازہ اور صاف پانی کے کنویں تیار کئے جائیں ـــــ دراصل ادیب اور شاعر کا کام بھی صاف اور تازہ پانی کے کنویں کھودنے کا ہے ـــــ یوں تو ہر دَور میں ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے ، لیکن بالخصوص ایسے زمانہ میں ان کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے ـــــ ظاہر ہے کہ ادیب اور شاعر کی یہ ذمہ داریاں ، بہت کڑی ہیں ، اتنی کڑی کہ اس سے بچنے کے لئے بقول مارسل پروست لوگ قومی جنگوں میں شریک ہو کر جان دے دینے کو اس سے زیادہ آسان سمجھتے ہیں ۔

غلامی کے عہد میں افادیت کا جو سیاسی تصور قائم ہوا ، اس کی جو کچھ بھی وجہ جواز پیش کی جاتی ہیں اُسے تو تسلیم کر لوں گا ، لیکن آج حالات بدل چکے ہیں ، آج قوم کے سامنے کسی قوم کے سیاسی غلبہ سے نجات حاصل کرنے کا مسئلہ نہیں ہے ، بلکہ قومی تعمیر کا مسئلہ ہے ۔ اس مسئلہ کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے ، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری قومی زندگی میں دور آگیا ہے کہ ہماری نظر سے زندگی کی تمام تہذیبی ، کلچری اور رُوحانی اقدار اوجھل ہو گئی ہیں ۔ ہمارا ذہن سطحی اور ہمارا شعور اتھلا ہو گیا ہے ، ہمارے جذبات میں کوئی گہرائی باقی نہیں رہی ہے ، ہمارا جوش دودھ کے اُبال کی طرح اٹھتا ہے اور اسی طرح بیٹھ جاتا ہے ، ہم میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے کہ ہم سوچ سمجھ کر ، ٹھنڈے دل سے : کوئی آہستہ رو ، لیکن دیرپا کام انجام دے سکیں ـــــ ہمارے لیڈروں کا یہ عالم ہے کہ قومی زندگی کی عمارت کی بنیادوں میں اگر انہیں کوئی کجی ، کوئی رخنہ ، کوئی دراڑ نظر آتی ہے ، تو اُسے دُور کرنے کے بجائے اس پر جلدی سے مٹی کا پلاسٹر چڑھا دیتے ہیں ۔ اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فی الحال کام چل جائے گا ۔ گویا دو لفظوں میں ہماری قوم کی تمام کوششیں " کام چلاؤ " ہیں

Care Taker ؎

جس طرح بنے یہ وقت کاٹ دو، آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا ـــ ہم اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ہماری قوم زندگی کی نئی راہوں پر چل نکلی ہے، ہمارے پاس تصورات ہیں، معتقدات ہیں اور نصب العین ہے، ہماری ایک منزل ہے، اور ہمیں وہیں پہونچنا ہے لیکن عملی حالت یہ ہے کہ اول تو ہم حرکت ہی نہیں کر رہے ہیں اور اگر کر رہے ہیں تو کولھو کے بیل کی طرح جو اپنی دانست میں سیکڑوں میل طے کر لیتا ہے لیکن صبح کو جہاں سے چلا ہوتا ہے شام کو وہیں ہوتا ہے ـــ ظاہر ہے کہ یہ حالات مایوس کن حد تک ناخوشگوار ہیں ـــ ان کا دیر تک قائم رہنا سخت خطرناک ہے آدمی سڑک پر چلنے میں ذرا دماغی حیثیت سے غیر حاضر ہو جائے تو کار یا بس سے ٹکرا جانا عین ممکن ہے، آخر قومی زندگی میں کوئی قوم اپنے ذہن اور فکر سے الگ ہو کر کیسے چل سکتی ہے؟ ـــ چنانچہ ان حالات میں، ہمارے ادیب کا اولین و آخریں فرض یہ تھا کہ قوم کے سامنے، اس کے تصورات اس کے آدرش، اس کی تہذیب، اس کے کلچر کو واضح طور پر پیش کرتے ـــ انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کی طرف توجہ دلاتے۔ اس کی ذہنی، جذباتی، اور رُوحانی تربیت کرتے، اور اس طرح قوم کے سامنے اس کی اپنی شخصیت رکھ دیتے ـــ قوم ایسی شخصیت کو سمجھ لیتی، اور اپنے آپ کو پالیتی تو خود بخود زندگی کی نئی راہیں اس پر وا اور کُشاد ہو جاتیں ـــ لیکن ہمارے شاعر و ادیب جنہیں قوم کی ذہنی زندگی کا معمار کہا جاتا ہے، خود ذہنی حیثیت سے قلاش ہیں، انہوں نے بھی سیاسی لیڈروں کی طرح چند فقرے سیکھ لئے ہیں اور ان کی مدد سے وہ اپنے ذہنی افلاس کو چھپانا چاہتے ہیں، ان کے سامنے نہ تو قوم کی تاریخ ہے، نہ تہذیب، نہ کلچر، نہ انہیں زمانے کے حالیہ تقاضوں کا علم ہے نہ ماضی سے واقفیت، مستقبل کا اندازہ لگانا تو خیر پھر دور کی بات ہے ـــ ظاہر ہے کہ اس حالت میں افادیت کا صحیح تصور ہمارے سامنے صرف سیاسی افادیت کی صورت میں آتا ہے اور ہم اسی ادب کو افادی ادب سمجھتے ہیں جس میں دو چار جگہ انقلاب، عمل، خودی، نئی سحر، نیا انسان، بڑھے چلو، شمشیر و سناں، اور تلوار اٹھا، قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہوں ـــ چلئے مان لیا کہ قوم نے آپ کے کہے سے تلوار اٹھا بھی لی، مگر صرف تلوار اٹھانے میں بنفسہٖ کوئی زندگی اور بلندی نہیں ہے۔ تلوار اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تلوار اُٹھائی کس لئے گئی ہے۔ قرآن جہاد کے جواز کا فیصلہ دیتا ہے تو ان الفاظ میں کہ اگر یہ لوگ تلوار نہ اٹھاتے تو عیسائیوں کا کوئی گرجا، یہودیوں کا کوئی صومعہ، صابیوں کی کوئی عبادت گاہ محفوظ نہ رہتی ـــ ورنہ یوں تو ابو جہل نے بھی تلوار اُٹھائی تھی، اسلام سراسر عمل و کردار کا مذہب سہی، لیکن اس سے پہلے وہ ذہنی اور روحانی تربیت پر کتنا زور دیتا ہے وہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی "اعملوا" کا لفظ آیا ہے اس کے پہلے "اٰمنوا" اور آخر میں "الصّٰلحٰت" کی شرط بھی لگا دی گئی ہے، صرف عمل جس میں ایمان و یقین کی کارفرمائی نہ ہو۔ اسلام کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اسلام عمل و کردار کی حدود مقرر کرتا ہے۔ اس حقیقت پر نظر نہ رکھی جائے تو علیؓ، خالدؓ اور ابو عبیدہؓ ـــ اور چنگیز، ہلاکو، اور تیمور لنگ میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر صرف تلوار اُٹھانا ہی عزم و عمل کا مقصود ہے تو پھر کون سی بات ہے جس سے اسلام کے ان عظیم، جلیل القدر، اور بے مثال ناموروں اور ظلم و تشدد، بہیمیت و بربریت کے ان پتلوں میں امتیاز کیا جا سکے، کیا یہ وہی چیز نہیں، جسے اسلام کی اصطلاح میں "ایمان" اور ادب کی زبان میں ذہنی کلچر اور تہذیبی شعور کہتے ہیں ـــ حضرت علیؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب وہ ایک کافر کو زیر کر چکے تو اس نے آپ کے مُنہ پر تھوک دیا، آپ اسے چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور اس کے اس سوال پر کہ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا، آپ نے جو جواب دیا وہ ذہنی تربیت کی انتہائی معراج ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لئے تجھے قتل کرنا چاہتا تھا، اب تیری اس حرکت سے مجھے غصہ آ گیا تھا اور اگر میں تجھے قتل کرتا تو وہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوتا، کیونکہ اس میں میرا نفس بھی شریک ہو گیا تھا ـــ اس جواب میں کتنی تہیں ہیں، کتنے پہلو ہیں، کتنی معنویت ہے ـــ کوئی شبہ نہیں کہ علیؓ جیسی شخصیت کی تعمیر میں عرصہ لگتا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زندگی کی حفاظت، چنگیز بن کر

بھی ہوسکتی ہے اور یہ نسبتاً بہت آسان ہے، 'علویت' بہت مشکل سے پیدا ہوتی ہے، 'چنگیزیت' دیکھتے دیکھتے عالم وجود میں آجاتی ہے۔ لیکن اسلام اور خود انسانیت کے نزدیک 'علویت' محبوب ہے، اسلام کہتا ہے، اس کی کوئی پروا نہ کرو، کہ تم 'علویت' کی تعمیر و تشکیل کے درمیان ہی مارے جاؤ کہ اسی کا نام شہادت ہے ــــــــ مختصر یہ کہ "تلوار اُٹھا" قسم کے افادی ادب کی افادیت بہت چھوٹی سی چیز ہے، اور صرف اسی قسم کے ادب کو افادی سمجھنا، اس سے بھی زیادہ حقیر رجحان ہے، اس وسیع لفظ کو اتنا محدود کر دینا سطحیت کی دلیل ہے، اور یہ سطحیت نہ صرف ادب بلکہ ہماری قوم کی زندگی کے لئے بھی فالِ بد ہے ــــــــ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے، کہ ان کی ذمہ داری اس سے کہیں زیادہ ہے کہ چندہ وصول کرنے والے جلسوں میں 'تلوار اٹھا'، 'تلوار اٹھا'، قسم کی نظمیں پڑھ دیں، یا کسی اخبار میں طنزیہ اشعار چھپوا دیں۔ اگر وہ نعرہ بازی کا کام دوسروں کے لئے چھوڑ دیں تو یہ خود ان کے اور ان کی قوم کے حق میں اچھا ہی ہوگا انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قوم کے ذہن کو چھین کر اس کے ہاتھ میں تلوار دے دینے میں اتنی ہی افادیت ہے، جتنی کسی بچے کو کھیلنے کے لئے چاقو دے دیتے ہیں۔

غلط تنقیدیں

ہمارا قدیم شعری سرمایہ ہماری قوم کا ذہن ہے، اس کی صدیوں کی جدوجہد کا حاصل ہے۔ اس شاعری میں ہمارا کلچر، ہماری تہذیب، ہمارے تصورات ہمارے اخلاق اور ہماری زندگی کے تعمیری عزائم محفوظ ہیں، یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ جنہیں کوئی قوم چھوڑ سکے اور چھوڑنے کے بعد زندہ رہ سکے، ــــ افادیت کے معنی صرف سیاسی افادیت کے نہیں ہیں، اس کا مفہوم، انسانی ذہنی، نفسی، روحانی اور جذباتی زندگی کی تربیت پر بھی حاوی ہے، اس کی حدود میں تزکیۂ نفس اور تہذیبِ شعور کا نام بھی آجاتا ہے۔ انسانی زندگی کے چھوٹے بڑے غموں اور خوشیوں کو آرٹسٹی اور تصوراتی رنگ میں پیش کرنے کو بھی افادیت کہتے ہیں، اور ان چیزوں کے متعلق بغیر کسی خوفِ تردید کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اردو ادب میں بھی اسی حد تک موجود ہیں، جیسی دنیا کے کسی اور ادب میں ــــ رہ گیا ان نقادانِ ادب، کا فیصلہ سو اختر حسین رائے پوری کا اردو شاعری کا مطالعہ بہت محدود ہے، ان کی کتاب "ادب اور انقلاب" پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گو انہوں نے اس کے چھپانے کی پوری کوشش کی ہے، ان کے نظریاتی اور خود تراشیدہ فارمولوں سے قطع نظر انہوں نے اردو شاعری پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی حدود بی، اے، کے طالب علم کی معلومات سے زیادہ وسیع نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے ایک مخصوص نظریہ ادب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موٹی موٹی رائیں دے دی ہیں اور قدم قدم پر ستلہ کی روح میں اُتر کر اُسے سمجھنے اور سمجھانے سے گریز کیا ہے ــــ اور کرتے بھی کیا؟..... لیکن سوال یہ ہے کہ اردو شاعری پر کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھے میر کا ایک جملہ یاد آتا ہے کہ "بھئی ریختہ کہنا کیا ضرور ہے؟ اپنی فارسی وارسی میں کہہ لیا کرو" اور میں اسے اختر حسین رائے پوری کے لئے دُہرائے دیتا ہوں کہ "بھئی! اردو شاعری پر کچھ کہنا کیا ضرور تھا، اپنے بنگالی، سنسکرت اور روسی و مسی ادب پر کہہ سُن کر الگ ہوتے" ــــ اور وہ جو احتشام حسین صاحب ہیں، سو ان کا نظریاتی تعصب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ جو ایک چیز ہوتی ہے، جسے 'اُپج' کہتے ہیں وہ ہر ایک شخص کا حصہ تو ہوتی نہیں ــــ علی جواد زیدی نے ان کی ایک نظم کا جواب لکھتے ہوئے کہا تھا ؎

اے فکر کے میدان کے مفروضہ شہیدو
کچھ مُنہ کا ملکنا ہی تفکر تو نہیں ہے

احتشام صاحب کی نظمیں میں نے نہیں پڑھی ہیں، لیکن یہ شعر اُن کے تنقیدی مضامین پر بالکل صادق آتا ہے، ان کے مضامین پڑھتے آپ کو ایک سنجیدگی کا احساس ضرور ہوگا۔ لیکن یہ سنجیدگی اس چیز سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی، جسے تفکر کہتے ہیں، ان کی نظر

ادب، اس کی ماہیت، اُس کے متفرقات اور مطالبات سے بہت سطحی ہے، وہ زندگی (اُردو ادب) کو بنے بنائے پیمانوں سے ناپنا چاہتے ہیں، زندگی کی گہرائیوں میں اُٹھنے والے طوفانوں کا اندازہ وہ چند گھڑے گھڑائے فارمولوں کی مدد سے کرنا چاہتے ہیں، وہ انسانی ذہن کی پیچیدگیوں، انسانی جذبات کی رنگا رنگیوں اور انسانی تصورات کی پہنائیوں کو اپنے نظریاتی سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں، زندگی، تاریخ، ارتقا، تہذیب، کلچر اور زندگی کے اَن گنت اور بے شمار پہلوؤں کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ان کے پاس صرف ایک اصطلاح ہے (اور وہ بھی مستعار) معاشی اور طبقاتی کشمکش ـــــــ لیکن زندگی اتنی اُتھلی نہیں ہے، اُسے فارمولوں، پیمانوں اور اصطلاحوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ انہوں نے زندگی کو کوزہ میں بند کرنا چاہا ہے، زندگی نے بھی اپنے موتی ان سے چھپا لئے ہیں اور ساحل کے ریزے اور گھونگے ان کے حوالے کر دیئے ہیں، ان کا نظریۂ ادب اگر زندگی سے کوئی تعلق رکھتا ہے، تو انہی خزف ریزوں اور خس و خاشاک کی حد تک ـــ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کا تصورِ افادیت اور کیا ہو سکتا ہے، انسانی زندگی کے ہزار ہا سالہ تجربوں کو جھٹلانے سے زندگی کا کچھ نہیں بگڑتا، قومیں اپنے ہی کو مٹا لیا کرتی ہیں، آج تک انسان کے ذہن میں جو جمالیاتی شعور پیدا ہوا ہے، آج تک انسان کی رُوح گہرائیوں سے آشنا ہوئی ہے، آج تک انسان کے جذبات میں جو نکھار آیا ہے، اس کے بیان کو گل و بلبل کے افسانے حُسن و عشق کے قصے، یا سرمایہ دارانہ دَور کی پیداوار کہہ کر ناک بھوں چڑھانے سے کچھ نہیں ہوتا، شمشیر و سناں کی اہمیت تسلیم، لیکن "بشنو از نے حکایت می کند" کو جھٹلانا بھی کوئی بچّوں کا کھیل نہیں ہے، البتہ مجتبٰی گورکھپوری ضرور ایک ایسے نقاد ہیں، جن کی میرے دل میں بہت وقعت ہے، ان کی ذہنی صلاحیتیں بہت قوی ہیں، اور ان کا اُردو شاعری کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے اور اکثر ان کی رائے بہت وقیع ہوتی ہے، وہ اُردو شاعری کے مزاج کو بھی خوب پہچانتے ہیں، اس لئے وہ کلیم الدین احمد کی جیسی مضحکہ خیز باتوں سے بالکل صاف بچ نکلے ہیں ان کی اکثر تنقیدیں، ان کے اپنے تاثرات ہیں جنہیں انہوں نے عقلی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، لیکن اب اس کا کیا علاج کہ آدمی اپنی شخصیت کو بھول کر 'ریکارڈ' بن جانا پسند کرے، 'ادب اور زندگی' میں وہ محض ایک نقال ہیں۔ دراصل یہ کتاب ان کی ترقی پسندی کا اعلان نامہ اور اقراری دستاویز ہے اور کوشش یہ کی ہے کہ مارکسی نقادانِ ادب کی زبان سے انہوں نے جو کچھ سُنا ہے اُسے جوں کا توں دُہرا دیں اور بس! جہاں تک ان کی اس کوشش کا تعلق ہے، وہ کامیاب ہیں، لیکن ان کی نام نہاد، مارکسی رائیں قطعی گمراہ کن ہیں ـــ معاف کیجئے، شاید میرا لہجہ کچھ ضرورت سے زیادہ پُر جوش ہو گیا ہے، اور اس جوش میں میں اصل موضوع سے دُور چلا گیا ہوں، ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ افادی ادب کا صرف سیاسی مفہوم نہیں ہے، چنانچہ افادی اَدب صرف اسی ادب کو نہیں کہتے، جس میں کوئی سیاسی نعرہ ہو، نہ یہ "مجاہدین صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!" کی حمایت ہی میں محدود ہے، اور نہ صرف کسی 'سُرخ سویرے' کے طلوع ہونے کی اطلاع دینے کا پابند ہے، افادی ادب صرف وہ بھی نہیں ہے، جسے اقبال پرست[1] نقادانِ ادب پیغامی شاعری کہتے ہیں، خواہ وہ 'پیغامِ خودی' ہی کیوں نہ ہو، بلکہ ہر وہ ادب جس میں انسانی زندگی کے حُسن و قوت میں اضافہ کرنے والی کوئی بات موجود ہو ـــ اور اتنی بات اور کچھ دوں کہ انسانی زندگی کے حسن و قوت میں اضافہ، صرف اشتراکی نظام قائم کرنے کے تصور سے نہیں ہوتا، نہ صرف خودی کے پیغام سے کام چلتا ہے۔ اگر پھول کی ایک پژمردہ پنکھڑی بھی شاعر کے احساس میں تھرتھری پیدا

[1] مگر مقالہ نگار نے اسلامی اور قرآنی نقطۂ نگاہ سے ایمان اور عمل کے جس ربط کا ذکر کیا ہے، اور تہذیب شعور مع تزکیۂ نفس کی جس اہمیت پر روشنی ڈالی ہے ـــ اس کا صحیح مصداق اقبالؔ کا کلام اور پیام ہے، اقبالؔ کی "شاعری" میں اُردو ادب کا قدیم سرمایہ بھی ہیں ملتا ہے! اور اس کے یہاں جمالیاتی ذوق بھی پایا جاتا ہے۔ اور اقبالؔ کا 'پیامِ خودی' تو ادب میں "افادیت" کی معراج ہے ـــــــ (م)

کردیتی ہے، اور وہ اس کا اظہار کردینے میں کامیاب ہوجاتا ہے، اگر انگلی میں پھانس کے چبھ جانے کی تکلیف سے شاعر کو کائنات کے دُکھ سُکھ کا احساس ہوجاتا ہے، اور وہ اس احساس کے فطری اسلوب کو بھی پالیتا ہے۔ اگر محبوب کی ایک نگاہِ غلط انداز سے حاصل ہونے والے سکون سے شاعر کو عالم انفس و عالم آفاق کی اس چہل پہل، گہما گہمی، حرکت و اضطراب کی تہہ میں ایک سکونِ بے کراں کی کارفرمائی کا ادراک ہوجاتا ہے۔ اور وہ اس ادراک کو آفاقی انداز میں بیان بھی کردیتا ہے تو مجھے بغیر کسی خوفِ تردید کے کہنے دیجئے کہ اس پژمردہ پنکھڑی، اس حقیر سی پھانس، اس نگاہِ غلط انداز کا بیان بھی اپنے اندر، اتنی ہی افادیت رکھتا ہے، جتنی کسی بڑے سے بڑے پیغام میں ہوسکتی ہے۔

چند مثالوں کی روشنی میں

میرؔ کا ایک بہت مشہور شعر ہے:-

جو اے میرؔ تو یوں ہی روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

کیا یہ محض شعر ہے؟ ہوسکتا ہے کہ کسی کے نزدیک اس میں محض عشقیہ رونے دھونے کا ذکر ہو، لیکن مجھے اس میں اتنی گہری انسانی معنویت نظر آتی ہے کہ جس کا جواب بڑی سے بڑی شاعری، انقلابی شاعری بھی نہیں دے سکتی، اپنے غم کو اتنا حقیر سمجھنا، اور وہ بھی اس غم کو جس نے اسے ہلا دیا ہے، اُسے راتوں کو اس وقت اُٹھ اُٹھ کر رونے پر مجبور کر دیا ہے، جب سارا عالم سوتا ہے۔ میرؔ کے علاوہ اور کس کے بس کی بات ہے، غضب خدا کا اُسے خیال آتا ہے تو ہمسائے کے سونے کا، اور اپنا غم، جس نے اُسے رونے پر مجبور کردیا ہے، وہ کچھ بھی نہیں! ہم اپنے دُکھ سُکھ کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، ہم خوش ہوں تو دُنیا بھی خوش نظر آتی ہے، رنجیدہ ہوں تو کائنات اُداس دکھائی دیتی ہے، جوشؔ صاحب کی ایک نظم کی ہیروئین سمندر میں گر جاتی ہے، لیکن بچالی جاتی ہے۔ جوشؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دُھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

کیوں؟ کیا اس لئے کہ وہ جوشؔ کی اپنی محبوبہ ہے، یا کم از کم جوشؔ نے اُسے اس قابل سمجھا ہے کہ اپنی نظم کا موضوع بنائے۔ لیکن یہ انداز تو نہ حقیقت سے ہم آہنگ ہے، نہ اس میں کوئی بلند انسانی معنویت ہے، کیا یہ شعر اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک صرف ہمارے دُکھ سُکھ ہی سب سے بڑی چیز ہوتے ہیں، اتنی بڑی چیز کہ ان کا اثر ہمارے نزدیک کائنات پر پڑتا ہے ع

حشر کے دن تک دُھواں اُٹھتا بطونِ خاک سے

اس کے مقابلہ میں ایک بار پھر میرؔ کا شعر پڑھیئے، کیا اس میں حقیقت اور ایک بلند اخلاق کا امتزاج نہیں ملتا ہے۔ کیا میرؔ یہ کہتا ہوا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ "مجھی حشر کے دن تک بطونِ خاک سے کیا دھواں اُٹھے گا" ہمسایہ تک کو ہمارے غم کی خبر نہیں ہے۔ اور وہ آرام سے سو رہا ہے۔" ہمسایہ کے خیال سے اُسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ "میں زور سے رو رہا ہوں، اور اس سے ہمسایہ کی نیند میں خلل پڑنے کا امکان ہے اس لئے مجھے رونا نہیں چاہیئے" ——

آخر میں اس شاعری کا نمونہ بھی دیکھتے چلئے جس پر غیر افادی ہونے کا الزام ہے:-

ہوگا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

رات تو ساری کٹی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

سرسری اس جہان سے گزرے | ورنہ ہر جا، جہانِ دیگر تھا
وجہِ بیگانگی نہیں معلوم | تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

اور صرف ایک شعر اور

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا | اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

کیا کوچۂ 'دلدار' یہاں کائنات کے مترادف نہیں ہے؟ میرؔ کے اس شعر پر آسیؔ غازی پوری کا ایک شعر اور یاد آیا ؎

عشق کہتا ہے دو عالم سے جدا ہو جاؤ
حُسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

فراقؔ بھی اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

عشق میں رُوٹھ کر دو عالم سے
لاکھ عالم ملے جدھر بھی گئے

میرؔ کے علاوہ اور دوسرے شعرا کے چند شعر اور سُنئے :-

راہ میں تیری شب و روز بسر کرتا ہوں | وُہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے | ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں | لگا کے آگ جسے قافلہ روانہ ہوا
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو | ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا | درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی | پرستش برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا | نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ہے

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

کیا ذوقؔ کے کلام سے بھی مثالیں پیش کروں، اس نے تو اتنے اخلاقی اصول نظم کئے ہیں، کہ محض اس کے کلام سے ایک اخلاقی دستور العمل تیار ہو سکتا ہے، یہ تمام اشعار میں نے قلم برداشتہ بغیر سوچے ہوئے لکھ دیئے ہیں اور اگر خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو کچھ نہیں تو، دس ہزار اشعار، قدیم اردو سرمائے سے ایسے پیش کر سکتا ہوں جن میں تزکیۂ نفس، تہذیب شعور، تربیت جذبات اور اصلاحِ فکر کا اتنا سامان موجود ہے جو انسان کو انسان بنا سکتا ہے، ایسا انسان جو واقعی اس قابل ہو کہ اقبالؔ کے الفاظ میں خدا سے کہے ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ادارہ

کیا آپ کو معلوم ہے؟

کہ

— حضرت امام حسین علیہ السلام کا قاتل شمر ذی الجوشن نہیں سنان تھا۔

— منصور حلاج کا نام حسین تھا اور اس کے دادا کا نام منصور تھا۔

— اورنگ زیب عالمگیر فارسی میں شعر کہتے تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔

— حسن بریلوی کی غزل کا بہت مشہور مطلع ہے :-

حُسن جب مقتل کی جانب تیغ بڑاں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجُولاں لے چلا

عام طور پر لوگ " پابجولاں " کے " ج " کو بالفتح پڑھتے ہیں، حالاں کہ یہاں " جُولاں " ضم کے ساتھ ہے، مصرعہ ثانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عشق اپنے مجرموں کو دوڑاتا ہوا لے چلا، اس صورت میں اسم حالیہ کے ساتھ یہ ترکیب ہی غلط ہو جائے گی، شاعر یہ کہتا ہے کہ عشق اپنے مجرموں کے پیروں میں بیڑیاں (جُولاں) ڈال کر لے چلا!

— فارسی کا بہت مشہور شعر ہے :-

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز بہ باز

مگر بازوں کو ساتھ ساتھ اُڑتے کبھی نہیں دیکھا گیا، ہاں! " قازوں " کے پرے البتہ اُڑتے ہیں، کیا عجب ہے کہ شاعر نے " قاز با قاز " کہا ہو۔

— ملتان میں حضرت شمس سبزواری کے مزار کو لوگ حضرت شمس تبریز کا مزار سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے، حضرت شمس تبریز کا ہندوستان آنا ہی ثابت نہیں۔

— مصوری کی بات نکلتی ہے تو مانی و بہزاد کا ذکر ضرور آتا ہے — مگر یہ مانی جس کو عام طور پر دُنیا مصوّر کی حیثیت سے جانتی ہے، ایران میں ایک مذہب کا بانی تھا، جو زردشت اور مزدک کی طرح پیشوا کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی شریعت اور فلسفہ کے ماننے والے " مانوتیین " کہلاتے ہیں، پارسیوں کا ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ ان دنوں مانی کے فلسفہ، فکر و نظر میں خاص دلچسپی لے رہا ہے۔

— یروشلم کی ایک پہاڑی کا نام صیہون ہے، یہودیوں نے فلسطین کو اپنا وطن بنانے کی جو تحریک شروع کی اس کا نام بھی " صیہونیت " رکھا۔

تبصرہ

شفیق صدیقی جونپوری

ہمیں غیروں کی ہر اک بات ہے عین الیقیں اب تک
عجب گندم نمائی جو فروشی کا زمانہ ہے
شکایت تھی کہ دُنیا سے موحد اُٹھتے ہوجاتے ہیں
مٹا دیتا تھا ظلمت شام کی مہتاب کا جلوہ
مری پستی مقامِ سدرۃ و طوبےٰ بھلا بیٹھی
مگر ایجاد حاضر نے بڑھا دیں مشکلیں اِتنی
وہ دِن نزدیک ہے پلٹے گی پیچھے کی طرف دُنیا
صنم خانوں کی وسعت ہو رہی ہے آج ناکافی
لیا مخدومیِ اہلِ نظر نے انتقام آخر

نگاہ و فکر میں وسعت کی گنجائش نہیں اب تو
صداقت بھی نظر آتی ہے محتاجِ یقیں اب تو
خدایا کوئی ملحد بھی نظر آتا نہیں اب تو
سحر کی تیرگی میں گم ہے خود مہر مبیں اب تو
نصیبِ دشمناں ہے منزلِ رُوح الامیں اب تو
کہ یاد آ جائے گا دُنیا کو عہدِ اوّلیں اب تو
مسافت ختم ہے منزل نظر آتی نہیں اب تو
سرِ بازار پھرتے ہیں مثالِ نازنیں اب تو
کہ خود پردے سے گھبراتا ہے ہر محمل نشیں اب تو

شفیق اب کس لئے ڈھونڈے نظر سلمیٰ و عذرا کو
بنے ہیں نوجوانانِ وطن خود مہ جبیں اب تو

ترقی پسند ادیب سے

عبدالکریم ثمر

تری نگاہ کی معراج اجرِیں پرچم
ترا خیال فقط جنسیات کی تحلیل
نہ تجھ کو خوفِ خدا ہے نہ احترامِ رسولؐ
ہے ماسکو ترے فکر و خیال کا مرکز

لوائے ملتِ بیضا مگر ہے سبز لباس
ترا فسانہ "مزدور" بھیڑیے کا لباس"
نہ دل میں حُبِّ وطن ہے نہ قوم کا احساس
نگاہ بندۂ مومن مگر ہے سدرہ شناس

مرے لوائے رَجز کے رہینِ منت ہیں
خدنگ و تیغ و سناں شعر و خامہ و قرطاس

آئینۂ حیرت

حیرت شملوی

یوں تو خیال جس کا جہاں تک پہنچ سکے
لیکن محال ہے کہ وہاں تک پہنچ سکے

سب کی طرف ہو، اور کسی کی طرف نہ ہو
ایسی نظر کو کوئی کہاں تک پہنچ سکے

سوجھی نہ وقت ہی پہ کوئی بات کام کی
ترکش سے تیر ہی نہ کماں تک پہنچ سکے

ہو جوشِ خونِ دل کا تو شاید ہو باریاب
ویسے تو کون پیرِ مغاں تک پہنچ سکے

عالم میں ایک شورِ قیامت بپا تو ہے
شاید کسی کے گوشِ گراں تک پہنچ سکے

بربادیٔ چمن کی حکایت نہ پوچھئے
دو پھول بھی نہ اب کے خزاں تک پہنچ سکے

حدیثِ تمنّا

منظر صدیقی اکبر آبادی

آ اے بہار پھر مری دُنیا لئے ہوئے
مدّت ہوئی چمن میں بسیرا لئے ہوئے

دل میں صنم کدہ ہے، نظر میں درِ حرم
کعبے میں معتکف ہوں کلیسا لئے ہوئے

کیوں اے نصیب کیا ہے یہی حاصلِ حیات
دُنیا سے جاؤں حسرتِ دُنیا لئے ہوئے

ٹھوکریں دل ہے، نیچی نگاہوں میں زندگی
یہ تم کہاں چلے مری دُنیا لئے ہوئے

اے اہلِ حشر میری مصیبت کا سدِّ باب
اُٹھا ہوں اپنے دل کا جنازا لئے ہوئے

کیا اب بھی اس جہان کی وسعت پہ بار ہوں
بیٹھا ہوں اپنا گوشۂ تنہا لئے ہوئے

منظر بساطِ دہر پہ افسانہ ساز ہوں
ہر وقت اک حدیثِ تمنّا لئے ہوئے

تجلّیاتِ اختر

ڈاکٹر اختر (کھنڈوہ) (ہندوستان میں آخری غزل)

چارہ گری سے آپ کی زخمِ جگر نہ بھر سکے
آپ سے کچھ نہ ہو سکا آپ تو کچھ نہ کر سکے

ان کے لئے ہے آج تک دیدۂ موج آب آب
بحرِ الم میں ڈوب کر جو نہ کبھی اُبھر سکے

اپنی حیات و موت تھی ان کے کرم پہ منحصر
اپنی خوشی نہ جی سکے اپنی خوشی نہ مر سکے

شاعرِ خوش مزاج بھی مردِ خدا پرست بھی
اخترِ حق پسند کی قدر نہ لوگ کر سکے

بادہ ہائے ناب

ناخدائے سخن نوحؔ ناروی

اُن کو ہے اگر سامنے آنے میں تامّل — مجھ کو بھی نہیں حسرتِ دیدار کچھ ایسی
باطن میں کھٹکنے کے لئے تیر سے بڑھ کر — ظاہر میں نہیں ہے نگہِ یار کچھ ایسی

باسط بھوپالی

یہ راہِ محبت راہ وہ ہے جس راہ کے قابل کوئی نہیں — غارت گرِ منزل ہر ذرہ صورت گرِ منزل کوئی نہیں
وہ سامنے اور ہم تشنہ نظر اس فرق کے دو ہی پہلو ہیں — یا پردے نظر کے حائل ہیں یا پردہ حائل کوئی نہیں

اثر زبیری لکھنوی

مری تسکین کا ساماں بہم ہونے نہیں دیتے — دیئے جاتے ہیں طعنے درد کم ہونے نہیں دیتے
اس اندازِ جفا پر کیا انہیں الزام دے کوئی — رُلاتے ہیں مگر آنکھوں کو نم ہونے نہیں دیتے
گئے وہ ناخدا جو عین طوفانِ حوادث میں — سفینہ کو غریقِ موجِ غم ہونے نہیں دیتے

صبا اکبر آبادی

مرحلہ سامنے دیکھا جو بیابانوں کا — چیخ اُٹھے ہوش کہ اب کام ہے دیوانوں کا
دفعتاً آ ہی گیا خشکیٔ ساحل کا خیال — دل نے چاہا تھا کہ رُخ پھیر دے طوفانوں کا

سید حرمت الاکرام

غمِ اُلفت تو اِک بہانہ تھا — راس آتی نہ زندگی یوں بھی
کون الزام دے زمانے کو — اپنی قسمت خراب تھی یوں بھی

امتیازِ غم و مسرت کیا
یوں بھی کٹتی ہے زندگی یوں بھی

سوز و ساز

اصغر نثار قریشی

ترا جمال شریکِ بہار ہے کہ نہیں
فضا میں کیفِ گلوں پر نکھار ہے کہ نہیں؟

نفس نفس میں کوئی شعلہ بار ہے کہ نہیں
نظر سے دِل کی تڑپ آشکار ہے کہ نہیں؟

پلا کے مست نگاہوں سے اہلِ محفل کو
وہ پوچھتے ہیں کوئی ہوشیار ہے کہ نہیں؟

قفس سے سوئے چمن آ رہے ہیں دیوانے
فضا بقدرِ جنوں سازگار ہے کہ نہیں؟

وہ آ رہے ہیں سحر کی لطافتیں لے کر
کوئی خراب شبِ انتظار ہے کہ نہیں؟

بہار پر نہ سہی اے خدائے سرو و سمن!
ہمیں خزاں پہ بھی کچھ اختیار ہے کہ نہیں؟

بجا کہ آپ کے لاکھوں ہیں جاں نثار مگر
کسی شمار میں اصغر نثار ہے کہ نہیں

ضرورت ہے!

طرفہ قریشی

یہ مانا پھر بسائے جائیں گے دُنیا کے ویرانے
مگر اس کے لئے تو اک زمانے کی ضرورت ہے

جمالِ شاہدِ فطرت کو عریاں دیکھنے والو!
حجاب اپنی نگاہوں سے اُٹھانے کی ضرورت ہے

یہ دُنیا خود فریبی کا سبق دیتی ہے انساں کو
یہاں ہر چیز سے دامن بچانے کی ضرورت ہے

ارادے

سوز اورنگ آبادی

جہاں بہ فیضِ عمل آدمی ہے قسمت گر
اُسی مقام پہ انساں کو لا کے چھوڑوں گا

قبا قبا کو میں غنچوں کی چاک کر دوں گا
کلی کلی کو چمن میں ہنسا کے چھوڑوں گا

مری نظر میں ہیں بدر و حنین کے منظر
خدا کی راہ میں مرنا سکھا کے چھوڑوں گا

جذبات

صابر دہلوی

کچھ اس ادا سے آج وہ محفل میں آگئے
ہر اک پکار اُٹھا کہ مرے دل میں آگئے
دیکھا جو غور سے تو وہ دل کے قریب تھے
ہم کیوں فریب دُوریٔ منزل میں آگئے
میں نے یہ کب کہا تھا کہ تشریف لائیے
اپنی خوشی سے آپ مرے دل میں آگئے
مجھ کو تو صرف آپ ہی کی یاد سے تھا کام
کیوں حادثاتِ دہر مقابل میں آگئے

بلا سجدوں کے قابل ہے کوئی آستاں اب تک
جبینِ شوق ہے دیر و حرم کے درمیاں اب تک
نشیمن کیا، نشیمن کا نشاں تک بھی نہیں باقی
مگر لہرائے جاتی ہیں وہیں پر بجلیاں اب تک
نہ موجیں ہیں نہ طوفاں ہے نہ دریا ہے نہ ساحل ہے
بہے جاتی ہے لیکن کشتیٔ عمرِ رواں اب تک

کیفیات

سراج الدین ظفرؔ

پردۂ روئے دوست اُٹھا شوق کو بے پناہ کر
زہد بھی جھوم جھوم اُٹھے ایسا کوئی گناہ کر
اے دلِ بے قرارِ دید! ہے کوئی آج رُو برُو
کچھ تو ثبوتِ شوق دے واہ نہیں تو آہ کر
دی ہے سروش نے جو آج آمدِ دوست کی نوید
عرش سے کہکشاں اُتار اور اُسے فرشِ راہ کر

واردات

عاصم جے پوری

باغ سے کام نہ صحرا سے سروکار مجھے
دیکھتا ہوں جو دکھائے نگہِ یار مجھے
ہیں رہا دوست کی بیگانہ وشی سے بے تاب
اُس نے ساغر نہ دیا جان کے سرشار مجھے
برگِ گل میری نگاہوں میں کھٹکتے ہیں کبھی
کبھی ہوتی ہے گوارا خلشِ خار مجھے

ایک شعر

حسرت ترمذی

اسیری کی شکایت کرنے والا
اسیرِ آشیاں ہے اور کیا ہے؟

فکر و نظر

ناصر مالیگانوی

وہ کیا جانیں کسی غربت زدہ کے دل کی مجبوری
جلا کرتی ہے ایوانوں میں جن کے شمعِ کافوری

فقط "حُسنِ عمل" تک ہی حدودِ سعیِ انساں ہے
سرشتِ آدمِ خاکی نہ مختاری نہ مجبوری

بقدرِ ذوقِ نظارہ عیاں بھی ہے نہاں بھی ہے
کوئی دیکھے ذرا "حُسنِ ازل" کی شانِ مستوری

مآلِ مغربی تہذیب کتنا رُوح فرسا ہے
کمالِ ارتقا نکلا فقط سینوں کی بے نوری

جو سرمستِ ازل ہیں بے پیے سرشار ہیں ساقی!
اُنہیں کیا احتیاجِ ساغرِ صہبائے انگوری

غریبوں کے لہو سے دامنِ امید ہو رنگیں
یہی آئینِ سلطانی، یہی دستورِ فغفوری

"اسی" کا "سنگِ در" بس کعبۂ مقصودِ عالم ہے
ضیاء پاتے ہیں جس کی بزم سے سب خاکی و نوری

مختار ادیبی مالیگانوی

آج بھی قیدِ تعین سے نکل سکتے ہو تم
اپنی قسمت اپنے ہاتھوں سے بدل سکتے ہو تم

عزم محکم چاہیئے جوشِ فراواں چاہیئے
پاؤں سے اپنے پہاڑوں کو مسل سکتے ہو تم

ڈوبنے والے سفینوں کا ہے اتنا ہی خیال
بس کناروں سے کفِ افسوس مل سکتے ہو تم

وقت چونکاتا ہے یہ کہہ کہہ کے اے اہلِ وطن
اب بھی کچھ بگڑا نہیں اب بھی سنبھل سکتے ہو تم

کاروانِ زندگی میں آج بھی بڑھتے ہوئے
آنے والی آفتوں کا سر کچل سکتے ہو تم

پہلے طاقت بازوؤں میں اپنے تم پیدا کرو
پھر زمانہ کی فضاؤں کو بدل سکتے ہو تم

ماہر القادری

ستارے

وہ آدمی ہی نہیں جو خدا شناس نہیں
یہ تجربہ ہے خرد کا فقط قیاس نہیں
کسی کا خوف نہیں اور کسی کی آس نہیں
مری نگاہ گزارش نہیں سپاس نہیں
ترے خیالِ شگفتہ کی زندگی ہو دراز
ہجوم غم ہے طبیعت مگر اداس نہیں

اسی اک کشمکش پر ہے مدارِ ہستیٔ عالم
اُدھر ٹوٹا حباب اور اس طرف اک موج ابھر آئی

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو
کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی
میں زباں سے کیوں کہوں کچھ، مری خامشی ہے سب کچھ
مری ہر نظر گزارش مرا ہر نفس پیامی

مرے دل کی دھڑکنوں سے وہ قریب ہو رہے ہیں
مرے شوق کو مبارک شبِ ہجر کی درازی

فکرِ غم، آرزوئے راحت ہے
یہ محبت نہیں تجارت ہے
اس نے غم دے کے مجھ سے فرمایا
یہ مری آخری عنایت ہے

لذتِ ذوقِ وفا سے فطرتاً محروم ہے
حُسن کہتے ہیں جسے ظالم نہیں مظلوم ہے

موجوں کی کوئی خطا نہیں ہے
خود میں نے ڈبو دیا سفینہ

نظر آتا ہے کیوں ذروں میں عکسِ خطِ پیشانی
ابھی کچھ فاصلہ شاید جبیں سے آستاں تک ہے
کوئی بچھڑے ہوؤں کی بات بھی سنتا نہیں ماہر
جرس کی مہربانی کارواں سے کارواں تک ہے

جائزہ

یہ کیا ہو رہا ہے؟

قوم کی قوم ہی آسودۂ غفلت ہے ابھی
کیا کسی اور تباہی کی ضرورت ہے ابھی

سنگ و آہن کے بھی سینوں میں شرر جاگ اٹھے
چشمِ انساں ہے کہ محرومِ بصیرت ہے ابھی

قصر و ایواں کی بہاروں کا وہی عالم ہے
جھونپڑوں کی وہی اُجڑی ہوئی حالت ہے ابھی

خواہ دفتر کے ہوں ایواں کہ تصوف کا حصیں
وہی حلوے وہی مانڈے وہی رشوت ہے ابھی

یہ بھی اک مصلحتِ وقت کا ہے لطف و کرم
شیخ کے سر پہ جو دستارِ فضیلت ہے ابھی

وہی شاہانہ تجمل، وہی محلوں کا شکوہ
وہی جلوت، وہی خلوت، وہی نخوت ہے ابھی

لب پہ وہ مُہرِ خموشی کہ الٰہی توبہ!
دِل کا یہ حال کہ لبریزِ شکایت ہے ابھی

وہی قبروں کی پرستش وہی عرسوں کی بہار
شرک من جملۂ ارکانِ عبادت ہے ابھی

وہی قانونِ فرنگی، وہی دستورِ عمل
وہی خود ساختہ آئینِ سیاست ہے ابھی

ہم نے مانا کہ ہیں آزاد زمینوں کے حدود
نگہ و دِل پہ تو غیروں کی حکومت ہے ابھی

آنکھ پھر منتظرِ صُبحِ قیادت ہے ابھی
ایک فارُوقؓ کی دُنیا کو ضرورت ہے ابھی

ماہر القادری

ماہرؔ القادری

بھکارن

کالے بادل فضا میں تیر رہے تھے، بادلوں کا کوئی کوئی ٹکڑا بھورا اور مٹیالا بھی تھا، اور کسی کسی ابر پارے کے کنارے پر اودے رنگ کی گوٹ سی لگی ہوئی تھی، کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کئی کئی رنگ کے بادل ایک دوسرے میں مل کر گڈمڈ ہو جاتے! فضا میں آنکھ مچولی سی ہو رہی تھی، ایک بادل نے دوسرے ابر پارے کو چھوا، تیسرے بادل کا ٹکڑا تیزی کے ساتھ جاگ پھوٹا اور پھر اُس کے تعاقب میں چوتھا ٹکڑا ابر روانہ ہو گیا، شوخی اور خوش فعلی شاید کائنات کی ایک ایک چیز میں سمو دی گئی ہے۔

یہ برسات کی شام تھی، سہانی اور کیف انگیز شام! خنک ہواؤں کے دم سے یہ انجمن بہار پر تھی، گھٹن ہوتی تو یہ سہانا پن ہی کا ہوتا، برسات کی رُت کا حبس بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے —— ہوائیں زیادہ تیز اور طوفانی قسم کی ہوتیں تو بھی سارا مزہ کرکرا ہو جاتا، لطف انتہا اور شدت میں نہیں اعتدال اور توازن میں ہے —— قدرت آج زمین والوں اور دن سے زیادہ مہربان تھی، ساری فضا اور پورا ماحول خوشگوار بن گیا تھا، دلوں میں آپ ہی آپ اُمنگیں اُمڈ رہی تھیں اور سنجیدہ آدمیوں تک کی طبیعتیں گنگنانے پر مجبور تھیں، بوڑھے ہاتھوں کی سوکھی ہوئی جھریوں میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور جوان تو یہ محسوس کر رہے تھے جیسے یہ سارا ہنگامۂ عیش و نشاط اُن کے جذبات کی پذیرائی کے لئے گرم ہوا ہے۔

ظہیر سیر کے لئے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا، دل دنگاہ بار بار تقاضا کر رہے تھے کہ اس تنہائی میں ہمارا تو دم گھٹا جا رہا ہے چلو باہر چلو، سہانی شام کا لطف اٹھاؤ، یہاں گھر میں مُردے کی طرح کب تک پڑے رہو گے، جوانی ہنگامہ چاہتی ہے —— سیفٹی ریزر اُس کے ہاتھ میں تھا اور گالوں کے بال کھُرچے جا رہے تھے، اس کے آزمودہ کار ہاتھوں نے آن کی آن میں رخساروں کو مرمریں سِل کی طرح صاف و شفاف بنا دیا، جیسے وہ ماں کے پیٹ سے مادہ رو پیدا ہوا ہے، ڈاڑھی اور مونچھیں اُس کے نکلی ہی نہیں، اُس نے تولیہ سے کنپٹی اور گردن پر لگے ہوئے صابن کے جھاگوں کو پونچھا، سگرٹ سلگائی اور گنگنانے لگا، بول صاف سُنائی نہ دیتے تھے، مگر لبوں کی خمیدگی، بھوؤں کا تناؤ، نتھنوں کی پھڑک اور آنکھوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی طرب انگیز چیز گنگنا رہا ہے، دھن بھی اچھی تھی، اُس کی آواز تدریجاً بلند ہوتی گئی، گنگناہٹ ترنم میں تبدیل ہونے لگی، آدھی سگرٹ ختم کرنے کے بعد جب اُس نے ہاتھ کو جھٹکا دیا ہے تو اس کی زبان سے یہ بول سُنائی دیئے:-

ع سُونی پڑی ہے سیج، سنوریا آ جاؤ

ٹھنڈی ہوائیں ان میٹھے بولوں کو لے اُڑیں اور سگرٹ کے دھوئیں کے پیچ بھی شاید اُن کے ساتھ لپٹے چلے گئے، پھر وہ ہاتھ منہ دھونے کے لئے غسل خانہ میں چلا گیا، سگرٹ کا آخری حصہ اب بھی اُس کی اُنگلیوں میں تھا۔

ظہیر کا کمرہ —— دیواروں پر کیلنڈر اور تصویریں آویزاں تھیں، روس کے فولادی انسان (اسٹالن) سے لے کر نرم و نازک سی شبنم ایکٹرس تک کی تصویر وہاں موجود تھی، ایک مرقع میں ایک غریب بھکاری جس کے بدن کی ایک ایک ہڈی

اُبھری ہوئی تھی ایک سرمایہ دار سے لجاجت کے ساتھ بھیک مانگ رہا تھا اور اس پر یہ عبارت جلی حرفوں میں لکھی تھی :-

ہمیں اس ظلم کا انتقام لینا ہے

اس مرقع کے بالکل قریب ہی ایک فلمی تصویر لگی تھی، جس میں ایک حسین اور نوخیز لڑکی ایک نوجوان کو شراب پلا رہی تھی ـــــ الماریوں اور میزوں پر کتابیں بکھری پڑی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والے نے کسی ایک کتاب کو بھی پورا نہیں پڑھا پلنگ کی چادر سپید تھی مگر تکیوں کے غلافوں پر تیل کے دھبے لگے تھے، تکیوں کے آس پاس سر کے بال اس کثرت سے بکھرے پڑے تھے کہ اگر سونے والے کے سر سے اسی اوسط کے ساتھ بال گرتے اور ٹوٹتے رہے، تو شاید اس سال کے ختم ہوتے ہوتے وہ بالکل گنجا ہو جائے گا۔

سنگھار میز پر پاوڈر، کریم، تیل کی شیشیاں اور عطر کا ایک کنٹر بھی دھرا تھا، کنگھے ایک دو نہیں چار پانچ تھے، دو ثابت اور باقی کے دندانے ٹوٹے ہوئے ـــــ اس میز کے اوپر دیوار کی کھونٹی میں ایک کتبہ آویزاں تھا ـــــ جس کی عبارت :-

تمہاری مسرتوں اور اسباب عیش میں غریبوں کا بھی حصہ ہونا چاہیے! پانچ دروازوں میں سے بس دو پر ضرور پردے تھے، باقی ننگے اور مکین کی ناانصافی کے شکوہ سنج۔

ایک الماری میں دوا کی شیشیاں، چائے کی پیالیاں اور اسی انداز کی دوسری چیزیں رکھی تھیں اور ان کی برابر کی بوتل پر

"White Horse Whisky"

کا لیبل لگا تھا مگر اس میں دیسی شراب یا یوں کہئے کہ اپنے وطن کی "بنت عنب" بند تھی۔

چار کرسیاں دیدہ زیب مگر آرام کرسیوں کا بید جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا، صوفہ کی اسپرنگ اتنی ڈھیلی کہ اس پر بیٹھ کر آدمی دھرتی ماتا کے چرنوں کی اور جھکتا چلا جاتا، دو مونڈھے بالکل نئے چرڑے دار بھی! اور تیسرے کے سرکنڈے باہر نکلے ہوئے ـــــ اس کمرے کے سامان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مالک بہت زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہنا چاہتا ہے مگر آمدنی کے محدود وسائل اس تمنا کو کسی طرح پورا نہیں ہونے دیتے، اس کی آرزوئیں کشادہ دستی اور آسودہ حالی کی راہ دیکھ رہی ہیں، جس دن پیسہ ہاتھ میں آگیا بس اسی دن اس کمرے کی تقدیر بھی چمک جائے گی۔

سیر کے لئے

ظہیر مکان سے روانہ ہوا، شکاری کی طرح جال، بندوق، چاقو، اور ضروری چیزیں ساتھ لے کر ـــــ اس کے اسباب صید افگنی؟ ـــــ یہی ـــــ سفید لباس، عینک، کلائی کی گھڑی، نازک چھڑی، بالوں کے چھلے، رخساروں کی چکناہٹ اور چلنے کا انداز بھی ـــــ کچھ نسائیت، کچھ مردانہ پن! نہ جانے کہاں کس چیز کی ضرورت پیش آجائے تجربہ کار شکاری تیتروں اور مرغابیوں سے لے کر شیر تک کے شکار کے لئے کارتوس اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

"گلی کے موڑ پر ظہیر پہونچا ہی تھا کہ سامنے کے ریسٹورنٹ سے آواز آئی ...... "ظہیر صاحب، ظہیر صاحب ......؟

ظہیر کی چال دھیمی پڑ گئی اور تیسری آواز پر وہ ٹھہر گیا، اور ادھر ادھر دیکھنے لگا، سامنے سے دو نوجوان آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

"پہچانا آپ نے مجھ کو!" ـــــ ایک نوجوان نے کہا۔

"جی .... آپ ..... آپ ..... میں نے" (ظہیر کی بات کاٹ کر دوسرا نوجوان بول اٹھا ......)

"میں آپ کی "پارٹی" کے صدر مسٹر نوازی کے چھوٹے بھائی کا سالا ہوں اور یہ بینی بابو میرے دوست ہیں"

پرسوں مزدوروں کے جلسہ میں آپ کی تقریر ہم نے سنی تھی .... (قدرے شرما کر، لجاجت کے ساتھ)

یہاں فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے باتیں کرنا مناسب نہیں، چلئے چائے خانہ میں تھوڑی دیر بیٹھیں گے، آپ سے

باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے ؟"

ظہیر ان کے کہنے پر چائے خانہ کی طرف بس چل ہی تو پڑا، محبت اور خلوص کی التجاؤں کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہوا کرتا اور پھر یہاں عقیدت کا پائے سخن بھی درمیان آ گیا تھا ——— لیکن ان سب سے بڑھ کر عوام سے ربط قائم کرنے کا جذبہ شریک کار تھا، عقیدتوں اور دعوتوں کے عجُو کے تو یہ مولوی اور ملاّ نے ہوتے ہیں ——— ندیدے اور دُنیا پرست کہیں کے! مزدوروں کے لیڈروں کی شرابوں میں بھی غیر مزدور ملا ہوتا ہے۔

تینوں چائے خانہ میں جا کر بیٹھ گئے، میزبانوں کے آرڈر دینے پر ملازم چائے لے کر آ گیا بلکہ حاضر ہو گیا! اور اس کے ساتھ پیسٹری کی پلیٹ بھی۔

صاحب! اس دن کی آپ کی تقریر اب تک کانوں میں گونج رہی ہے آپ کے اس جُملے کو کہ "مزدوروں اور غریبوں کی مسرّتوں کے لئے پہلے ہمیں اپنی مسرّتیں قربان کرنی ہوں گی" دسیوں دوستوں کے سامنے دُہرا چکا ہوں، آپ جیسے شعلہ بار مقرر دو چار اور پیدا ہو گئے تو بنکوں، کوٹھیوں اور کارخانوں میں ایک دن آگ لگی ہوگی (ظہیر اپنی تعریف سُن کر مُسکراتے مُسکراتے رہ گیا مگر ہونٹ متبسّم نہ تھے تو کیا تھا چہرہ مُسکرا رہا تھا) اور ہاں! ظہیر صاحب! اس دن آپ (معاف فرمائیے) کچھ عجیب بنے ہوئے تھے۔ گرد آلود بال، میلے کپڑے، ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے، اگر کوئی آپ کو نہ جانتا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی مزدور تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا ہے ——— لیکن آج آپ بالکل بدلے ہوئے ہیں، سر سے پیر تک قرینہ اور سلیقہ کی تصویر (ظہیر کے شاداب چہرے میں کچھ پشیمانی سی جھلکنے لگی، دل کا چور جب پکڑا جاتا ہے تو ہر آدمی جھینپ جاتا ہے)

ظہیر نے اس پر اپنے اور اپنی جماعت کے کارناموں کی داستان سُنانی شروع کی کہ ہم لوگ غریبوں اور مزدوروں کے لئے یہ کر رہے ہیں، وہ کر رہے ہیں، ہماری قربانیاں رائگاں نہیں جا سکتیں آج نہیں تو کل ہماری بات سُنی جائے گی، ہم نے زار کی شہنشاہیت کا تختہ اُلٹا ہے، اور چین کے جاگیرداری نظام کو تہ و بالا کیا ہے، مشرق و مغرب کے ہر گوشہ میں ہم انقلاب کی بارود بچھا چکے ہیں، بس ذرا شتابہ لگانے کی دیر ہے، اور اس کے لئے ہم مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

چائے پی کر تینوں چائے خانہ سے اُٹھ کر باہر آئے، ظہیر کے میزبان دونوں نوجوان اپنی سائیکلوں پر سوار ہو کر چلے گئے اور ظہیر دو تین گلیوں سے گزر کر چوراہہ پر آ گیا، چوراہہ کے نکڑ پر پان والے کی دُکان تھی، دو کان سے چند قدم کے فاصلہ پر بس اسٹینڈ تھا، جہاں مسافروں کے اشارہ کرنے پر بسیں رُکتی تھیں۔

ظہیر تفریح اور سیر سپاٹے کے لئے گھر سے نکلا تھا، کسی خاص مقام کی سیر اس کے پیشِ نظر نہ تھی، آنکھیں سینکنے اور دل بہلانے کے جہاں اسباب مہیا ہو جائیں، بس وہی اس کی منزلِ مقصود تھی ——— چاہے وہ کشادہ پارک ہو یا کوئی ناہموار اور تنگ گلی!

بُرقعہ میں

ظہیر نے دیکھا کہ ایک برقعہ پوش خاتون بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ہے ——— اُس کا برقعہ انتہائی دیدہ زیب اور جاذب نظر تھا، قمیص کا ریشم بھی جھلاجھل چمک کر رہا تھا، سفید ساٹن کی شلوار اس پر مستزاد! اور پھولدار جوتا اور قیامت! ——— ظہیر رُک گیا، رُک جانا پڑا، جس غرض کے لئے وہ گھر سے نکلا تھا، اُس کی تکمیل کے اسباب نگاہوں کے سامنے تھے، زیادہ تلاش اور تگ و دو کی ضرورت ہی نہ تھی، اتنے میں بس آ گئی، برقعہ پوش خاتون کے ساتھ، ظہیر بھی بس پر سوار ہو گیا، اور زنانہ نشست کے بالکل قریب بیٹھا تاکہ نظارے میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکے ——— پچھلے تجربوں کی مدد سے ایک رنگین خاکہ بھی اُس کے ذہن و خیال نے تیار کر لیا تھا، ہوس ایسے موقعوں پر بڑی شوخ اور جدّت طراز بن جایا کرتی ہے۔

عورت بھی ظہیر کی اس توجہ اور شیفتگی کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی، اس قدر شوخ اور دیدہ زیب لباس اسی لیے پہنا گیا تھا کہ لوگ دیکھیں اور شوق و توجہ کے ساتھ دیکھیں، عورت نے دونوں ہاتھ برقعہ سے باہر نکال دیئے، گوری کلائیاں، نازک انگلیاں، ناخنوں پر سرخی کی تہ جمی ہوئی کلائی کی گھڑی انتہائی خوشنما ——— ظہیر بے قابو سا ہو کر انگلیاں چٹخانے لگا، تنہائی ہوتی تو دست درازی کر بیٹھتا، وہ سمجھ رہا تھا کہ عورت نے میرے دکھانے کے لئے جان کر ہاتھوں کو بے نقاب کیا ہے، جس کے ہاتھ اتنے حسین ہیں اس کا چہرہ کیا ہوگا؟ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

آتش شوق ہر لمحہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی، نگاہیں التجا کر رہی تھیں کہ خاتون! جہاں اتنا کرم کیا ہے وہاں ذرا سی مہربانی اور ہو جائے ——— بس چہرے کی ایک جھلک! اس سے زیادہ اور کچھ تمنا نہیں ہے، شوقِ دیدار کا دم لبوں پر آ گیا ہے، پورا چہرہ نہیں تو ایک آدھ رخسار ہی سرِ دست بے نقاب ہو جائے، ساقی مے خانہ ہو کر تشنہ کام کو اس قدر ترسانا ٹھیک نہیں!

مگر عورت کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ چہرے کی نقاب کسی طرح سرکنے اور اٹھنے نہ پاتی تھی، ریشمیں ملبوس میں ہاتھوں کے سوا باقی پورا جسم چھپا ہوا تھا، ظہیر اور کسی طرف دیکھتا ہی نہ تھا، نگاہیں نظارے میں ڈوبی ہوئی تھیں، ہوس کسی طرح مایوس ہی نہ ہو لے دیتی تھی، وہ بڑھاوے دے رہی تھی، کہ جس عورت نے دکھانے اور رجھانے کے لئے ہاتھوں کو باہر نکال رکھا ہے وہ چہرے کو زیادہ دیر تک زیر نقاب نہ رکھ سکے گی، اجنبی عورت ایکا ایکی بے تکلف نہیں ہوا کرتی، نگاہوں کی نگاہوں سے یہ پہلی شناسائی ہے، حسن غیور بھی ہوتا ہے یہ کیا کہ کسی نے ذرا توجہ سے دیکھا اور کھٹ سے بند نقاب وا ہو گیا، حسن کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں، مزہ تو اسی میں ہے کہ حسن اجتناب اور احتیاط برتے اور محبت اقدام کرے، ——— ایک طرف سے گریز اور فرار ہو اور دوسری جانب سے تعاقب!

موٹر بس رکتی اور ٹھہرتی جا رہی تھی، مسافر چڑھ اور اتر رہے تھے، اتنے میں کنڈکٹر نے گھنٹی بجا کر آواز دی "ناولٹی سینما" "برقعہ پوش عورت نے اترنے کے لئے برقعہ سنبھالا اور ظہیر بھی تیار ہو بیٹھا، بس رکی اور مسافر اترنے چڑھنے لگے، کنڈکٹر چلا رہا کہ پہلے سواریوں کو اتر لینے دو، مگر نیچے کھڑے ہوئے لوگ بھلا کہیں ماننے والے تھے، دھکم دھکا شروع ہو گئی، کوئی بس کا ڈنڈا پکڑے لٹکا ہوا ہے، کوئی چلا رہا ہے "ارے بھائیو! میری اچکن کا دامن تمہارے جوتوں تلے آ گیا، خدا کے لئے مجھے اترنے دو، کوئی مضبوط جسم کا آدمی دھکے دیتا اور ہجوم کو چیرتا ہوا بس کے اندر آ دھمکا اور فاتحانہ انداز میں دوسروں کو دیکھنے لگا کہ کامیابی اور زندگی چاہتے تو اپنے اندر قوت پیدا کرو ——— ورنہ ع

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس خود غرض دنیا میں التجاؤں سے کام نہیں چلتا، یہاں قوت اور طاقت کے زور پر کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔

برقعہ پوش خاتون بیچاری اس ہجوم اور آپا دھاپی میں گھبرا گئی، اس نے پائدان سے نیچے زمین پر پیر رکھا تو برقعہ ٹانگوں میں الجھ گیا، وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی، بدن کے بچاؤ کے لئے اس نے زمین پر دونوں ہاتھ ٹیک دیئے اور اس حالت میں چہرے سے نقاب سرک گئی، ظہیر کی پر شوق نگاہوں نے دیکھا ——— بھینگی آنکھیں اور چھوٹی بھی! کوتاہ پیشانی، بیٹھی ہوئی ناک اور ٹھوڑی پر زخم کا گہرا سا نشان ——— مایوسی اور خلاف توقع مایوسی، شوق و توجہ کی ساری بساط ہی الٹ گئی، کہاں دلچسپی کا وہ انداز کہ نگاہیں اس عرصہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی برقعہ کے طواف سے غافل نہ ہوتیں اور اب بیزاری اور نفرت کا یہ عالم کہ وہ بیچاری زمین سے اٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ظہیر وہاں سے تیزی کے ساتھ چل پڑا، کیا سوچ رہا تھا کیا ہو گیا، کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا

لباس کی دیدہ زیبی اور انگلیوں کی خوشنمائی نے جس شوق کو شہ دی تھی، وہ چہرے سے نقاب اُٹھ جانے کے بعد مجروح ہو کر رہ گیا، ساری کی ساری محنت ہی اکارت گئی ——— ظہیر کی آنکھوں نے جنت کا خواب دیکھا تھا مگر اُس کی تعبیر اتنی بھیانک اور مایوس کُن نکلی۔

توارُد

ناولٹی سینما سے تھوڑی دُور پر ظہیر کے دوست محمود کا مکان تھا، وہ محمود کے یہاں چلا گیا، سلام و دعا کے بعد مزاج پرسی ہوئی، کچھ طنز و تعریض بھی! دوستوں میں نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے۔

کہئے! مزدوروں کا غم غلط کرنے کے لئے آج کتنی شراب نوش جان فرمائی کامریڈ ظہیر اینڈ کو نے ——— محمود نے ہنستے ہوئے کہا

شراب تو بھائی! اب جا کر پینی پڑے گی اس بدمزگی، کوفت اور ناکامی کو شراب ہی دُور کر سکتی ہے، لاحول ولاقوۃ! لعنت تیرے کی! ارے صاحب یہ آج کل کا لباس بھی کتنا فریب کار ہوتا ہے ——— ظہیر کے جواب پر محمود نے دریافت کیا خیر تو ہے کیا ہوا؟ کہاں سے آرہے ہو، چہرہ اُترا اُترا سا کیوں ہے، تم تو کہتے تھے کہ ہم وہ ہیں کہ توپوں کی گرج میں بھی دیکھ لینا کہ مُسکراتے ہی رہیں گے اور آج تو چہرے پر بُری طرح ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں۔

ظہیر نے اس پر پوری داستان سُنادی، آدمی تھا چرب زبان بلکہ ہزار داستان ایک ایک جزیئہ کو باغ و بہار بنا کر بیان کیا، محمود نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور کچھ سوچنے سا لگا جیسے وہ کوئی بات کہنا بھی چاہتا ہے اور کوئی چیز کہنے سے روک بھی رہی ہے ——— مگر ظہیر کے اصرار نے اس سکوت و گویائی کی کشمکش کو زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے دیا۔

محمود بولا بھائی! عجیب اتفاق بلکہ توارُد ہے کہ میں نے بھی آج ایک ایسا ہی منظر دیکھا ہے مگر ارادہ، خیال، نیت اور واقعہ کا انجام بالکل مختلف ہے، تم مجھے "ملّا" "قدامت پرست" اور "پرانی لکیر کا فقیر" کہا کرتے ہو، تو بھائی! ہم ملّا مولوی قسم کے آدمی پرائی بہو بیٹیوں کی بھی عزت اور ناموس کا انتہائی لحاظ رکھتے ہیں (اصل واقعہ بیان کرو، تم نے تو اپنی پارسائی کی داستان چھیڑ دی، ہاں! بھائی! ہم مانتے ہیں کہ تم فرشتے ہو اور ہم شیطان ہیں ——— ظہیر بیچ میں بول پڑا)

اچھا سُنو! یہ جو ہمارے سامنے دو منزلہ مکان ہے، اس میں ایک بڑے صاحب رہتے ہیں، اُن کا نام تو ہے عظمت حسین مگر لوگ انہیں چودھری صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ ظہیر! تم شاید اس واقعہ کو سُن کر ہنس دو گے کہ چودھری صاحب کے یہاں چھ سات برس کی بچی تک پردہ کرتی ہے، ان کے گھر کی عورتیں کسی خاص ضرورت سے باہر نکلتی ہیں ——— مگر کس طرح؟ لجائی اور شرمائی ہوئی، پھٹا پُرانا بُرقعہ، میلی چادر، اُن کا لباس اور وضع قطع دیکھ کر ہوسناک نگاہوں اور تماش بین آنکھوں کو ذرا سا بھی سہارا نہیں مل سکتا۔

ہاں! تو آج میں اپنی بڑی بہن کو لے کر زنانہ ہسپتال گیا تھا، اُن کی آنکھوں میں سخت تکلیف ہے، لیڈی ڈاکٹر سے آنکھوں کا معائنہ کرانا تھا، ہماری فٹن کے ساتھ ہی چودھری صاحب کے گھر کی عورتیں تانگے میں روانہ ہوئیں، ہسپتال کے دروازے پر سواریوں کا ہجوم تھا، لوگ آجا رہے تھے، فٹن، تانگے موٹروں اور رکشاؤں کا تانتا لگا تھا۔ اتوار کے دن ہسپتال میں یہی عالم رہتا ہے، چودھری صاحب کے گھر کی عورتیں جو تانگے سے اُترنے لگیں تو تانگے کا گھوڑا اونٹ گاڑی کو دیکھ کر بھڑک گیا، دو عورتیں اُتر چکی تھیں تیسری عورت جس کا برقعہ انتہائی سادہ بلکہ ملگجا سا تھا اُتر رہی تھی کہ تانگے کو جنبش ہوئی اور وہ بیچاری فرش خاک پر گر پڑی اور گرنے میں اس کے چہرے سے نقاب اُٹھ گئی، بس یوں سمجھو کہ بدلی سے آفتاب ایکا ایکی نکل آیا، اللہ اکبر! غالبؔ نے کہا تھا ؎

چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اور یہاں شراب کے بغیر ہی چہرے کے فروغ کا وہ عالم کہ میری جگہ تم ہوتے تو نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھتے،

لاؤ تمہاری آنکھیں چوم لوں ـــــ ظہیر نے بات کاٹ کر کہا، اور بھائی ایمپر ..... محمود کی بات ادھوری ہی تھی کہ بیٹھک کے دروازے پر جو سڑک سے بالکل قریب تھا ایک بوڑھے بھکاری نے صدا لگائی .....

" مائی باپ! پیسہ! کئی دن کا بھوکا ہوں، تمہارے بچّوں کی خیر!"

فقیر اتنا ناتوان اور سکڑ ورجھا کہ پھونک مارو تو اُڑ جاتے، بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے، محمود نے چار پیسے اس کے ہاتھ میں چپکے سے پکڑا دیئے فقیر دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، ظہیر نے اس پر کہا:-

محمود! تم تو یار بڑے ہی سادہ لوح ہو، یہ آج کل کے فقیر بھیک مانگ کر چرس اور گانجا پیتے ہیں، کسی کسی کو تو زنان بازاری کے کوٹھوں پر بھی دیکھا گیا ہے ـــــ تم نے اس فقیر کے حلیئے کو غور سے نہیں دیکھا، چرس اور گانجے کا یہ اثر ہے کہ بیٹ جی اور شاہ صاحب قبلہ پنجر بن کر رہ گئے ہیں (اور وہ آپ کی محبوب شراب، بادہ ناب، صہبائے ارغوانی بنت عنب ..... ! اُس کے بارے میں کیا کہیے گا؟ ـــــ محمود کے اس طنز پر ظہیر نے بناوٹی جماہی لی، اتنے میں اندر سے چھوکرا دوڑا ہوا آیا کہ بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں محمود زنانخانہ میں چلا گیا)

بازار، ندی اور عدالت

ظہیر کمرے میں تنہا رہ گیا، اُس نے سگرٹ سلگائی اور آرام کرسی پر لیٹ کر پیر پھیلا دیئے، قریب کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی، اس نے کتاب اٹھالی، کتاب کا نام تھا:- " اخلاق اور زندگی " ـــــ ظہیر کے تیور مکدر سے ہوگئے ابروؤں پر بل ڈال کر آپ ہی آپ بولا:-

" یہ اخلاق زندگی کی راہِ ترقی میں سنگِ گراں بن کر رہ گیا ہے، لوگ ابھی تک ہوائی محلوں اور خیالی جنتوں سے باہر نہیں نکلے ـ مگر سُرخ انقلاب ..... !" ـــــ اتنے میں ایک جوان عورت :-

ع　مجھے بھیک دو گے تو احسان ہو گا

گاتی ہوئی دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی، اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، صحت مند جسم، موزوں ناک نقشہ، سانولی رنگت چہرے پر چھبن بلا کی تھی، بھکارن کے ساتھ ایک اندھی عورت بھی تھی، جو کبھی کبھی اُس لڑکی کی لے میں لے ملا دیتی،

ظہیر نے لڑکی کو گھور کر دیکھا، لڑکی نے بھی جواب میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، ظہیر نے اٹھنی جیب سے نکال کر لڑکی کے ہاتھ میں پکڑا دی ـــــ مگر کس طرح؟ اُس کے پورے لڑکی کے ہاتھوں سے پوری طرح مس ہوتے، آٹھ آنہ میں اتنی جوان لذت مہنگی نہ تھی، لڑکی اپنی اندھی ماں کو لے کر چل دی، اتنے میں محمود اندر سے آگیا، ظہیر اُس کے آتے ہی اُٹھ بیٹھا، محمود نے کہا بھئی! کہاں جاتے ہو چائے بن رہی ہے، چائے پی کر جانا، ظہیر نے کہا، مجھے بہت ضروری کام ہے، بہت بڑا ہرج ہو جائے گا، آج کی چائے تم پر اُدھار رہی، کام نہ ہوتا تو میں ابھی جاتا ہی کیوں، نظریہ کے اختلاف کے باوجود تمہارے بارے میں کہنا ہی پڑتا ہے کہ

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

ظہیر بہت تیزی کے ساتھ روانہ ہوا، رات ہو چکی تھی، چراغ جل چکے تھے، سڑک پر راہگیروں کی خاصی بھیڑ تھی ان میں تماشائی بھی تھے اور کام والے بھی! کئی سو قدم تک لڑکی نظر نہ آئی، ظہیر دل ہی دل میں پچھتانے لگا کہ مجھ نادان سے کیا بھول ہوگئی، محمود کے کمرے کو کھلا چھوڑ کر لڑکی کا پیچھا کرنا تھا، ایسے تر و تازہ شکار روز روز نہیں ملا کرتے ـ

سینما کے قریب گلی کی نکڑ پر پہنچ کر لڑکی اُسے دکھائی دی، تو اس کی جان میں جان آتی، اور ملال خوشی سے بدل گیا،

لڑکی نے ظہیر کی طرف دیکھا اور مسکرا دی، ظہیر کی آنکھوں میں جذبات یکبارگی سمٹ کر آگئے، ذرا سی دیر کی شناسائی کچھ سے کچھ بنی جارہی تھی، ——— ظہیر نے پنواڑی سے پان کا بیڑہ مول لیا، اور دکان کے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر فاتحانہ انداز میں مسکرایا کہ مجھ میں بلا کی پھبن اور قیامت کا مردانہ حسن پایا جاتا ہے' بالکل انجانی لڑکی پہلی نگاہ میں ہی گرویدہ ہوگئی ——— اتنی کو وہ بھول گیا کہ اس چہرہ شاہی سکہ کی کرامت بھی اپنا کام کر رہی تھی، خود فریبی ایسے موقعوں پر حقیقتوں کو چھپا دیا کرتی ہے۔

آنکھوں نے آنکھوں سے بہت کچھ کہہ دیا مگر:- ؎

سینکڑوں مفہوم رکھتی ہے وہ چشمِ التفات
دیکھنے والوں کو دھوکے میں نہ آنا چاہیئے

اس لئے ہوس زبانی قول وقرار کے واسطے سے پورا اطمینان چاہتی ہے، نگاہ کو جھٹلایا جاسکتا ہے مگر زبان دے کر پھر جانا مشکل ہے چشم و ابرو کے اشاروں کی بڑی آسانی سے سو تاویلیں ہوسکتی ہیں لیکن زبان سے کہی ہوئی بات کی تاویل دشوار ہے۔

موقعہ مل گیا، خود بخود نہیں نکالنا اور تلاش کرنا پڑا، اندھی بڑھیا پیاؤ پر پانی پینے لگی، اور مندر کی سیڑھیوں کے پاس ظہیر اور بھکارن لڑکی کی باتیں ہوگئیں۔

ظہیر گھر پہونچا تو خوشی کا نشہ اُس پر چھایا ہوا تھا، جسے شراب پی کر دو آتشہ بنایا گیا، پھر اُس نے ریلوے مزدوروں کی ہڑتال کی اسکیم کا خاکہ تیار کیا، دماغ آج خوب حاضر تھا، ذرا سی دیر میں خاکہ تیار ہوگیا، دل کی شگفتگی نے خیالات میں "آمد" کا رنگ پیدا کر دیا، اگر وہ شاعر ہوتا تو آج ایسی عجیب وغریب نظم کہتا کہ سننے والے جھوم جاتے۔

اس کے بعد کئی شام میں آئیں اور چلی گئیں' بازار میں لڑکی کا آمنا سامنا بھی ہوا' کسی دن بس خالی نظارہ بازی، کسی دن بات چیت بھی! اس کی اندھی ماں لڑکی کی اُنگلی ایک منٹ کے لئے نہ چھوڑتی تھی، راہگیر بھی اس راہ میں حائل تھے، مگر ہوس کو بہرحال اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ضروری تھا، یہ افسانہ ناتمام کیسے رہ سکتا تھا۔

پھر کیا ہوا؟ ہوسناکی نے کیا کیا گُل کھلائے؟ اُن پر کیا گزری؟ اس کی تفصیل اور اتے پتے کے لئے اس اشتہار کی سرخیاں دیکھیئے جو کامریڈ ظہیر کی پارٹی کی طرف سے شائع ہوکر شہر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا تھا ———

"سامراجی ہتھکنڈے ——— سرمایہ داری کی سازش"

"کامریڈ ظہیر گرفتار کرلئے گئے"

"پبلک کو حکومت کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہونا چاہیئے"

عدالت کا کمرہ ہے، مجسٹریٹ ڈاہس کرسی پر پورے طمطراق کے ساتھ بیٹھا ہے، پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں، ظہیر اور وہی بھیک مانگنے والی لڑکی دونوں ملزموں کے کٹہرے میں ایستادہ ہیں، تماشائیوں کا بہت ہجوم ہے،

مجسٹریٹ۔ (لڑکی سے) جب ملزم (ظہیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) نے دریا کے کنارے تمہاری ماں کو دھکا دے کر پانی میں گرایا ہے تو تم نے چیخ مار کر کچھ کہا تھا؟

لڑکی۔ ——— جی! میں نے کہا تھا کہ ایشور کے لئے ایسا نہ کرو، میری ماں کو ندی میں نہ گراؤ۔

مجسٹریٹ۔ انہوں (ظہیر کی طرف پنسل کی نوک سے اشارہ کرتے ہوئے) نے پھر کیا جواب دیا۔؟

لڑکی۔ یہ بولے کہ یہ بڑھیا ہمارے راستہ میں روڑا بنی ہوئی ہے اس کو ہٹا دینا چاہئے، پھر ہم میاں بیوی کے سمان (مانند)

جیون گجاریں (گزاریں) گے!

مجسٹریٹ ۔ تو تم نے اپنی ماں کو بچایا نہیں

لڑکی ۔ اِن بابوجی کا چہرہ اُس سمے (وقت) بڑا ڈراونا ہو رہا تھا، ہیں بیچ میں آتی تو یہ میری ماں کی طرح مجھے بھی دریا میں دھکا دے کر گرا دیتے ۔

مجسٹریٹ ۔ وہاں تم، تمہاری ماں اور ان کے سوا کوئی اور نہ تھا ۔

لڑکی ۔ جی! دریا تھا، جامن اور برگد کے پیڑ تھے اور مجھے یاد پڑتا ہے، کئی بگلے بھی کنارے پر بیٹھے تھے ۔ (مجسٹریٹ مسکراتا ہے)

مجسٹریٹ ۔ (تشدد لہجہ میں) میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم تینوں کے سوا کوئی آدمی تو وہاں نہیں تھا؟

لڑکی ۔ نہیں اور کوئی آدمی وہاں نہ تھا، ہجور!

مجسٹریٹ ۔ تمہاری ماں تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی!

لڑکی ۔ جی! . . . اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر گرنے لگے فرطِ غم سے وہ کانپنے لگی، روتے روتے ہچکی بندھ گئی، عدالت کے کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا، مجسٹریٹ سوال پوچھتے پوچھتے رک گیا، لڑکی کی چیخیں اونچی ہوتی جارہی تھیں جن میں بلندی کے ساتھ پھیلاؤ بھی تھا ۔

اور ——————————— ظہیر

سوچ میں ڈوبا ہوا تھا ——————— لڑکی کے بیان کو اسے جھٹلانا بھی تو تھا ———— !

خریدار صاحبان پرچہ نہ پہونچنے کے سلسلہ میں محکمہ ڈاک کو متوجہ فرمائیں اس سلسلہ میں ہر خط کا فرداً فرداً جواب دینا ہمارے لئے ناممکن ہے ۔ "مینیجر فاران"

رُوحِ انتخاب

> ہم صرف ایک ہاتھ سے دینِ حق کی عمارت قائم نہیں کر سکتے۔ اس میں دوسرے ہاتھ یعنی عورت کا تعاون ضروری ہے

اسلامی حکومت میں عورتوں کو محض گڑیا بنا کر نہیں رکھا جائے گا، جیسا کہ بعض ناواقف کا گمان ہے، بلکہ اُسے زیادہ سے زیادہ ترقی کا موقع دیا جائے گا، بہر حال یہ ضرور سمجھ لیجیے کہ ہم عورت کو عورت ہی رکھ کر عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں، اسے مرد بنانا نہیں چاہتے ——— !

عورت کے بگڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام نسل کی ذہنی، اخلاقی حالت مسموم ہو جاتی ہے۔ کوئی ماں اپنے بچہ کے منہ میں صرف دُودھ ہی نہیں ڈالتی، بلکہ اس کے ساتھ اپنے اخلاق کی رُوح بھی اُس کی رگ رگ کے اندر اُتارتی ہے، اگر اس کے اندر روحِ دین کمزور ہے، اخلاقِ انسانی اور حِس ایمانی مُردہ ہے، تو اس سے زیادہ زہریلے جراثیم بچے میں سرایت کر جاتیں گے جتنے ایک دِق ماں کا دُودھ پینے سے ایک بچہ کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔

صحیح اسلامی تربیت کا اصلی سرچشمہ اور بہترین ذریعہ ہماری مائیں ہیں، جب تک ہماری مائیں حضرت اسماءؓ کے نمونہ کی تقلید نہ کریں گی کس طرح عبد اللہ بن زبیرؓ جیسے جانباز پیدا ہو سکیں گے؟ جب تک وہ راہِ حق میں سولی پر چڑھ جانے والے بیٹے کو دیکھ کر یہ نہ کہیں کہ اچھا ابھی مرکب سے یہ سوار اُترا نہیں! اس وقت تک دار و رسن کا کھیل کھیلنے والے فرزند کن کی کوکھوں سے جنم لیں گے؟ انہیں محترم خاتون سے جب کہ یہ اپنی بینائی کھو چکی تھیں، بیٹے نے آکر آزمائش کے طور پر پوچھا "ماں میں اپنے آپکو دشمنوں کے حوالے کر دوں یا معافی مانگ لوں!" انہوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے آپ کو پکڑا اور بدن کو چھو کر پوچھا کہ "یہ کیا پہن رکھا ہے؟" انہوں نے عرض کیا "زرہ"۔ فرمایا "راہِ حق کے مجاہدوں کو اس قسم کے پردوں کی ضرورت نہیں، اسے اتار دو اور راہِ حق میں سینہ سپر ہو کر لڑو کہ کل کو تمہارے دشمنوں کو تم پر ہنسنے کا موقع نہ ملے"

ہم صرف ایک ہاتھ سے دینِ حق کی عمارت قائم نہیں کر سکتے، اس میں دوسرے ہاتھ یعنی عورت کا تعاون ضروری ہے۔ ہماری نسلوں کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہے۔ ماں کی چھاتی کے ایک ایک قطرۂ شیر کے ساتھ بچہ جذبات و حسیات اور اخلاق بھی اپنے اندر جذب کرتا ہے، اور اس کی ایک ایک ادائے عمل کے طریقے سیکھتا ہے، ماں اگر مومنہ مسلمہ ہے تو بچے بھی مومن و مسلم، ماں اگر رُوحِ ایمان و اسلام سے خالی ہے تو بچے بھی اسی طرح ایمان و اسلام سے محروم ہوں گے۔ ہم اپنی نسلوں کی تمام اثرات سے حفاظت کر بھی لیں تو یہ بالکل ناممکن ہے کہ ماؤں کے نیک و بد اثرات سے ان کو بچا سکیں۔

مردوں کی خرابی کے اثرات بھی مہلک ہیں، مگر ان کی خرابی سے ممکن ہے کہ بچنے کی شکلیں پیدا ہو جائیں۔ لیکن عورتوں کے بگاڑ کے خراب نتائج سے بچنا ناممکن ہے ان کی پیدا کی ہوئی خرابی جڑ کی خرابی ہے، شاخوں اور تنوں کی خرابی نہیں ہے، اس کا علاج ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے اُن پر ذمہ داری بہت سخت ہے۔ یہ جو بیماریاں بچوں کو پلا دیں گی کوئی ماہر سے ماہر طبیب بھی ان کا علاج نہیں کر سکتا۔ جو درخت اپنی نشوونما کے ابتدائی دور ہی میں آفت رسیدہ ہو جائے، پھر اس کا تناور درخت ہونا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پس عورتوں کا فرض ہے کہ آج ہم دین کو تازہ کرنے کا جو عزم لے کر اُٹھے ہیں اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ ہم ان کی شرکتِ عمل کے سخت محتاج ہیں۔

ہماری اصلی دولت عورتوں ہی کے پاس ہے نسلیں انہیں کی تحویل میں ہیں۔ ان کا بٹھایا ہوا نقش قبر تک گھر جینے کے باوجود نہیں چھٹتا خواہ وہ نقش باطل بٹھائیں یا نقش حق۔ وہ چاہیں تو ان کے فیض تربیت سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہماری تاریخ کو از سر نو درخشن کر دیں اور چاہیں تو اسی طرح کے لوگوں کو جنم دیں جیسا کہ آج کل کے مسلمان ہیں۔ خیال تو کیجئے کبھی گنتی کے چند نفوس تھے۔ لیکن زمین ان کے وجود سے تھرا اٹھی تھی۔ لیکن آج مردم شماری کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے۔ مگر صفحۂ گیتی کو خبر تک نہیں کہ کوئی اس کی پُشت پر ہے۔ ہمیں خود بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ہم موجود ہیں۔ اگر عورتیں حضرت اسماءؓ کے نمونہ پر چلیں گی تب ہی ان فرزندانِ اسلام کو پیدا کر سکیں گی جن کی موجودگی زمین کو محسوس ہوگی اور وہ پکار کر کہے گی کہ اس کے سینہ پر کوئی اللہ کے راستے کا سوار ہے۔ اگر انہوں نے یہ روش اختیار نہ کی تو دُنیا یونہی پیدا ہوتی اور مرتی رہے گی مگر وہ لوگ پیدا نہ ہوں گے جن سے اسلام کا بول بالا ہو۔

ماؤ! بہنو! بیٹیو! آج اس دنیا میں کروڑوں انسان ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر جس دُنیا کو ہم دنیائے اسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس کا حال بالکل چڑیا گھر کا سا ہے، جس طرح چڑیا گھر میں قسم قسم کا جانور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والا موجود ہوتا ہے اور مختلف قسم کے جانوروں میں کوئی چیز اس کے سوا مشترک نہیں ہوتی کہ سب ایک چڑیا گھر میں رہتے ہیں تقریباً ایسا ہی حال مسلمانوں کی دُنیا کا بھی ہے کہ اس میں طرح طرح کے آدمی جمع ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جنہیں خدا کے وجود میں شک ہے! ایسے بھی ہیں جن کو وحی و رسالت میں شبہ ہے، ایسے بھی ہیں جو آخرت کے منکر ہیں اور یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں کبھی اس زندگی کا حساب بھی پیش کرنا ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بھلائی اور بُرائی کی اس تمیز سے انکار کرتے ہیں جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے اور جانوروں کی طرح غافل زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی نگاہ میں اسلام کا سکھایا ہوا طریق زندگی صحیح نہیں ہے اور جنہوں نے دنیا کے دوسرے طریقوں میں سے اپنی خواہشات کے مطابق کوئی طریقہ پسند کر رکھا ہے — یہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ سب لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان کہلائے جانے پر مُصر ہیں اور وہ تمام حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں جو مسلمانوں کی سوسائٹی میں ایک مسلمان ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مجموعے میں بہت کم لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو فی الواقع اُس معنی میں مسلمان ہوں جس معنی میں اسلام کسی شخص کو مسلمان کہتا ہے۔

آخر یہ صورت حالات کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہماری مسلمان دُنیا زیادہ تر نسلی مسلمانوں پر مشتمل ہے جو صرف اس وجہ سے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا مسلمان تھے، اور اتفاق سے یہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے۔ آپ اگر سنجیدگی سے غور کریں گی تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ انسان کو پیدائش سے نسب مل سکتا ہے، نسلیت مل سکتی ہے، وطنیت مل سکتی ہے، لیکن کسی شخص کو محض پیدائش سے اسلام نہیں مل سکتا، آدمی پیدائشی طور پر جاٹ ہو سکتا ہے، راجپوت ہو سکتا ہے۔ انگریز اور جرمن ہو سکتا ہے، لیکن ماں کے پیٹ اور باپ کے نطفے سے آدمی کو دین نہیں مل سکتا۔ دین تو صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ آدمی جان بُوجھ کر اسے پسند کرے، اور اپنے ارادے سے اُس کو اختیار کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ نسلی مسلمان ہیں اور

محض باپ دادا کے گھر پیدا ہونے سے انہیں اسلام سے نسبت حاصل ہو گئی ہے، اُن کے پاس مسلمانوں کے سے نام تو ہیں، لیکن وہ صفت ان میں مفقود ہے جس کا نام اسلام ہے ان کے سامنے وہ طریق زندگی ہے ہی نہیں جو اسلام نے ان کے لئے تجویز کیا ہے انہوں نے نہ کبھی اسے جاننے کی کوشش کی، نہ اسے اپنے لئے پسند کیا، اور نہ اس پر چلنے کا ارادہ کیا۔ حالانکہ اسلام کی جو حقیقت ہے، وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا و بمحمد رسولا و بالاسلام دینا

یعنی "ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو راضی ہو گیا اس پر کہ اللہ ہی اس کا رب ہو، اسلام ہی اس کا طریق زندگی ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے رہنما ہوں۔"

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص نے سوچ سمجھ کر اسلام کو برضا و رغبت قبول نہیں کیا وہ اسلام اور ایمان کے مزے تک سے ناآشنا ہے اس نے دین کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔

مسلمان ہونے کے معنی

مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک آدمی پورے شعور کے ساتھ یہ فیصلہ کرے کہ دنیا میں خدائی، پروردگاری، آقائی کے جتنے مدعی پائے جاتے ہیں ان سب میں سے صرف ایک رب العالمین ہی کی بندگی اسے کرنی ہے۔ جن طاقتوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آدمی ان کی مرضی کی پیروی کرے۔ ان کے احکام کی اطاعت کرے اور اپنی شخصیت کو ان کے حوالے کر دے، ان سب میں سے صرف ایک اللہ ہی کی ہستی ایسی ہے جس کے آگے سر اطاعت اسے جُھکا دینا ہے اور وہی ہے جس کی مرضی اسے ڈھونڈنی ہے۔ پھر مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں کے درمیان آدمی یہ فیصلہ کر لے کہ اسے صرف وہی ایک طریق زندگی پسند ہے جس کو اسلام نے پیش کیا ہے، دوسرے طریقوں کو ترجیح دینا تو درکنار ان کی طرف کوئی رغبت اور لگاوٹ بھی اس کے دل میں نہ ہو۔ اس کو دل سے اسلام ہی کا طریقہ مرغوب اور پسندیدہ ہو۔ پھر مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں انسان کی رہنمائی و رہبری کے جتنے مدعی گزرے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں ان سب کے درمیان ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو آدمی اپنی رہنمائی کے لئے چُن لے اور فیصلہ کر لے کہ اسے بس آپ ہی کے بنائے ہوئے راستے پر چلنا ہے۔

اس طرح جب کوئی شخص اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما تسلیم کر لے تب کہیں وہ مسلمان ہوتا ہے۔ اور جس نے اس طرح اسلام قبول کیا ہو، اس کا کام یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو اللہ کی مرضی اور اسلام کے قانون اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تابع کر دے۔ پھر اس کے لئے چون و چرا کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ پھر اسے یہ کہنے کا حق نہیں رہتا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں یہ حکم دیا ہے اور اگرچہ محمد صلعم نے اس میں یہ رہنمائی کی ہے اور اگرچہ قرآن اس بارے میں یہ فیصلہ دیتا ہے مگر میری رائے اس سے متفق نہیں ہے اور میں چلوں گا اپنی ہی رائے پر، یا دُنیا کا چلتا ہوا طریقہ اس کے خلاف ہے اور مجھے پیروی اسی طریقہ کی کرنی ہے جو دُنیا میں چل رہا ہو، یہ رویہ جس شخص کا ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ حقیقت میں ایمان لایا ہی نہیں ہے، حقیقی ایمان لانا تو یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند اور ناپسند کو اپنی خواہشات اور جذبات کو، اپنے خیالات اور نظریات کو پوری طرح اسلام کے ماتحت کر دے اور ہر اس غیر اسلامی طریقہ کو رد کر دے جو دُنیا میں رائج و مقبول ہو، یا جس کی طرف نفس کا شیطان رغبت دلائے یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یوں بیان فرماتے ہیں کہ:۔

لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ

یعنی "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائیں

جسے میں لایا ہوں "

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جب تک آدمی کے نفس کا شیطان خدا کے حکم کے آگے ڈگیں ڈال نہ دے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دے اس وقت تک آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کسی شخص کے نفس کا یہ دعویٰ قائم ہے کہ زندگی میں میری خواہش کی اطاعت ہونی چاہیئے۔ اس وقت تک اس کے دل میں ایمان و اسلام نہیں ہے۔ ایمان و اسلام یہ ہے کہ آدمی کا دل کہنے لگے میں بے چون وچرا دین کی اطاعت پر راضی ہوں۔

یہی مطالبہ خواتین سے ہے

یہ بات ہمیں صرف مردوں ہی سے نہیں کہنی ہے، بلکہ عورتوں سے بھی یہی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم عورتوں سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیتوں کو مردوں کی شخصیتوں میں گم نہ کر دیں۔ اپنے دین کو مردوں کے حوالے نہ کریں۔ وہ مردوں کا ضمیمہ نہیں ہیں۔ ان کی اپنی ایک مستقل شخصیت ہے۔ عورتوں کو مردوں ہی کی طرح خدا کے روبرو پیش ہونا ہے۔ اور اپنے اعمال و افعال کا خود حساب دینا ہے۔ قیامت کے روز ہر عورت اپنی ہی قبر سے اُٹھے گی اپنے اعمال کا حساب دیتے وقت وہ یہ کہہ کر نہ چھوٹ جائے گی کہ میرا دین میرے مردوں سے پوچھو اپنے طریقِ زندگی کی وہ خود ذمہ دار ہے اور اسے خُدا کے سامنے اس بات کی جوابدہی کرنی ہوگی کہ وہ جس طریقہ پر چلتی رہی، کیا سوچ کر چلتی رہی۔ لہٰذا ہم عورتوں کا سوال مردوں کے سامنے نہیں خود عورتوں ہی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اپنی راہ زندگی کا فیصلہ تم خود کرو اور اس امر کا لحاظ کئے بغیر کرو کہ تمہارے مردوں کا فیصلہ کیا ہے۔ اسلام تمہیں اپنے دین کی حیثیت سے پسند ہے یا نہیں؟ اس کے اصول، اس کے حدود، اس کی عائد کی ہوئی پابندیاں اس کی ڈالی ہوئی ذمہ داریاں، غرض ساری ہی چیزیں دیکھ کر فیصلہ کرو کہ وہ تمہیں قبول ہیں یا نہیں؟ اگر ان سب چیزوں کے ساتھ اسلام قبول ہے تو سچے دل سے اس کی پیروی کرو، ادھورے نہیں بلکہ پورے اسلام کو اپنا دین بناؤ اور پھر جان بوجھ کر اس سے انحراف نہ کرو۔ اور اگر قبول نہیں ہے تو شرافت اور سچائی اسی میں ہے کہ صاف صاف اور علانیہ اسے چھوڑ دو اور اس کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو

گھروں کی فضا کی تطہیر

آپ کا کام یہ ہے کہ گھر کی فضا کو درست کریں۔ اس فضا میں پرانی جاہلیت کی جو رسمیں چلی آرہی ہیں ان کو بھی نکال باہر کریں اور نئے زمانہ کی جاہلیت کے جو اثرات انگریزی دور میں ہمارے گھروں میں داخل ہو گئے ہیں انہیں بھی خانہ بدر کریں، اس وقت ہمارے گھروں میں پرانے زمانہ کی جاہلیت کا ایک عجیب مرکب رائج ہے۔ ایک طرف تو وہ روشن خیالی ہے جو ہماری مسلمان خواتین کو فرنگیت زدہ شکل میں لا رہی ہے، اور دوسری طرف اسی روشن خیالی کے ساتھ ساتھ پرانے زمانہ کے جاہلانہ تخیلات، مشرکانہ عقیدے اور ہندوانہ رسمیں بھی ہماری معاشرت میں برقرار ہیں، اب جن خواتین کو اپنے ایمانی فرائض کا احساس ہو جائے، ان کا کام یہ ہے کہ پرانی جاہلیت کی رسموں اور تصورات کو بھی چن چن کر گھروں سے نکالیں اور نئے زمانہ کی جاہلیت کے ان مظاہر کا بھی خاتمہ کریں جو فرنگی تعلیم اور انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید کی بدولت گھروں میں گھس آئے ہیں۔

نئی نسل کی صحیح تربیت

آپ کا کام یہ بھی ہے کہ اپنے بچوں کو اسلامی طرز پر تربیت دیں ہماری نئی نسلیں اس لحاظ سے بڑی بد قسمت ہیں کہ گھروں کے اندر کبھی قرآن کی آواز اُن کے کانوں میں نہیں پڑتی اور نہ وہ اپنی آنکھوں سے گھر کے لوگوں کو کبھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ بچپن میں ہم اپنے گھروں میں قرآن کی آواز سنتے تھے اور اپنے بڑوں کو نماز پڑھتے دیکھتے تھے۔ ہمارے گرد و پیش بہرحال کچھ نہ کچھ آثار دین کے باقی تھے۔ لیکن موجودہ نسل کی یہ بد قسمتی انتہا کو پہنچ گئی ہے کہ گھروں کی جس فضا میں وہ پرورش پا رہی ہے اس میں نہ قرآن کی آواز کبھی گونجتی ہے نہ نماز کا منظر کبھی سامنے آتا ہے۔ اگر ہمارے گھروں کا یہی حال رہا اور یہ نسلیں اسی طرح غلط تربیت حاصل کرتی رہیں تو جب زندگی کی باگ ڈور انکے

ہاتھوں میں آئے گی، اس وقت شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکے گا۔ آپ اب اس صورت حالات کو ختم کریں۔ اور اس فکر میں لگ جائیں کہ گھروں کی معاشرت میں، روزمرہ کے رہن سہن میں، زندگی کے مختلف معمولات میں اسلام نمودار ہو، اور وہ ہمارے بچوں کو آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آئے، بچے اسے دیکھیں، اس کا مزہ چکھیں اور اس سے اثر قبول کریں، ان کے کانوں میں بار بار قرآن کی آواز پڑے، وہ دن میں پانچ مرتبہ گھروں میں نماز کا منظر دیکھیں، پھر وہ اپنی فطرت کے تحت اپنے بڑوں کی تقلید کریں اور انہیں نماز پڑھتا دیکھ کر خود بخود ان کی نقل اُتاریں، وہ توحید کا پیغام سنیں، وہ رسالت کا مدعا سمجھیں، اسلام کا نقش ان کے دلوں پر قائم ہو، ان کی عادات درست ہوں، ان کے اندر اسلامی ذوق پیدا ہو، نئی نسل کے لئے یہ سب کچھ ہمیں درکار ہے۔ پس وہ تمام عورتیں جو اسلام قبول کریں انہیں چاہیے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی گودوں اور اپنے گھروں کو مسلمان بنائیں تاکہ ان میں ایک مسلمان نسل پروان چڑھ سکے۔

مَردوں پر اثر اندازی

آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے گھر کے مَردوں پر اثر ڈالیں، اور اپنے شوہروں، باپوں، بھائیوں اور بیٹوں کو اسلام کی زندگی کی طرف بلائیں، عورتوں کو نہ معلوم یہ غلط فہمی کہاں سے لاحق ہو گئی ہے کہ وہ مَردوں کو متاثر نہیں کر سکتیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں مَردوں پر بہت گہرے اثرات ڈالتی ہیں، اور ڈال سکتی ہیں۔ مسلمان لڑکی اگر یہ کہنے لگے کہ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شکل پسند ہے۔ اور چرچل اور ٹرومین اور اسٹالن کی شکل پسند نہیں ہے، تو آپ دیکھیں گی کہ کس طرح مسلمان نوجوانوں کی شکلیں بدلنی شروع ہو جائیں گی، مسلمان عورت اگر کہنے لگے کہ اسے "کالے صاحب لوگوں" کا طرزِ زندگی مرغوب نہیں ہے بلکہ اُسے اسلامی زندگی مرغوب ہے، جس میں نماز ہو، روزہ ہو، پرہیزگاری اور حسنِ اخلاق ہو، خدا کا خوف اور اسلامی آداب و تہذیب کا لحاظ ہو تو آپ کی آنکھوں کے سامنے مَردوں کی زندگیاں بدلنے لگیں گی۔ مسلمان بیوی اگر صاف صاف کھول کر کہدے کہ اسے حرام کی کمائی سے سجائے ہوئے ڈرائنگ روم پسند نہیں ہیں، رشوت کے روپے سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا گوارا نہیں ہے، بلکہ وہ حلال کی محدود کمائی میں روکھی سوکھی کھا کر جھونپڑے میں رہنا زیادہ عزیز رکھتی ہے، تو حرام خوری کے بہت سے اسباب ختم ہو جائیں گے اور کتنی ہی رائج الوقت خرابیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

اسی طرز پر اگر وہ تمام بہنیں اصلاحِ احوال کی مہم شروع کر دیں جنہوں نے اسلام کو اپنے لئے دین تسلیم کر لیا ہے، تو وہ اپنے اعزہ و اقربا، اپنے خاندان کے لوگوں اور اپنے میل ملاپ رکھنے والے گھرانوں کو بھی بہت سی خرابیوں سے بچا سکتی ہیں اور انہیں نئی اور پرانی جاہلیتوں سے پاک کر سکتی ہیں، آپ کا فرض ہے کہ آپ شیریں طریقے سے اپنے عزیزوں اور ملنے جلنے والوں کے سامنے جاہلیت کے طریقوں پر تنقید کریں، انہیں اسلام کے احکام سمجھائیں، ان کو اسلام کے حدود سے آگاہ کریں اور خود بھی اسلامی حدود کی پابندی کر کے اپنا صحیح نمونہ ان کے سامنے پیش کریں، یوں اگر کام کیا جائے تو ہماری سوسائٹی کا پورا ڈھانچہ درست ہو سکتا ہے۔

ایک فیصلہ طلب سوال

پھر آپ نے اسلام کو فی الواقع اپنے لئے پسند کر لیا ہے تو آپ کے سامنے یہ سوال دوٹوک فیصلہ کے لئے آن کھڑا ہو گا کہ آیا آپ جاہلیت کی پیروی اور اسلام سے بغاوت میں اپنے غلط کار مَردوں کی رفاقت کرنے کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں؟ اگر آپ نے واقعی اسلام کو پسند کر لیا ہے تو پھر آپ کو اس سوال کا جواب لازماً نفی میں دینا ہو گا آپ کے لئے یہ ہرگز مناسب نہ ہو گا کہ دوسروں کی دُنیا بنانے کے لئے آپ خود اپنی عاقبت خراب کر لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

انّ شرّ الناس منزلۃ یوم القیٰمۃ عبدٌ اذھب اٰخرتہ بدنیا غیرہٖ۔

"قیامت کے روز بدترین حال اس شخص کا ہو گا جس نے دوسرے کی دُنیا بنانے کی خاطر اپنی عاقبت خراب کر لی"

لہٰذا آپ اپنے مردوں کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی عاقبت خراب کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوں مسلمان خاتون ہونے کی حیثیت سے آپ شوہر، باپ، بھائی، اور بیٹے ہر ایک پر یہ واضح کر دیں کہ ہم اسلام کے اتباع میں آپ کی رفاقت کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو اسلام کی حدود کی پابندی گوارا نہیں ہے تو آپ جانیں اور آپ کا کام۔ ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکتیں، آپ کی دنیا کے لئے اپنی آخرت بگاڑنے پر ہم تیار نہیں ہیں۔

دوسری طرف جن خواتین کے شوہر، باپ، بھائی، اور بیٹے خدا و رسول کی پیروی کرنے والے ہوں ان کا کام یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ پورا تعاون کریں اور تکلیفوں میں ان کا ساتھ دیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو شخص اسلام کی حدود کے اندر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ دولت کمانے میں ہر طرح کے مال پر ہاتھ نہیں مار سکتا، وہ حرام خوری نہیں کر سکتا، وہ حلال طریقوں سے محدود کمائی کر کے عیاشی کے سامان فراہم نہیں کر سکتا، پس مسلمان خاتون کو حلال کی تھوڑی کمائی پر قناعت کرنی چاہئے، اسلام پر چلنے والے باپوں، شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہئے، کہ وہ ان کے لئے عیش و عشرت اور لذت کے سامان فراہم کریں۔ اس طرح دین حق کی اطاعت اور اس کو قائم کرنے کی کوشش میں مردوں کو بہت سی تکلیفوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، اور مسلمان خواتین کا فرض ہے کہ ان تکالیف میں اپنے حق پرست مردوں کی سچی رفیق ثابت ہوں۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کا فرق

یہ چند امور میں نے مثال کے طور پر بیان کئے ہیں جن سے آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ اسلامی حکومت میں عورتوں کو محض گڑیا بنا کر نہیں رکھا جائے گا جیسا کہ بعض نادانوں کا گمان ہے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ ترقی کا موقع دیا جائے گا، بہر حال یہ ضرور سمجھ لیجئے کہ ہم عورت کو عورت ہی رکھ کر عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں، اسے مرد بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں فرق یہی ہے کہ مغربی تہذیب عورت کو اس وقت تک کوئی عزت اور کسی قسم کے حقوق نہیں دیتی جب تک وہ ایک مصنوعی مرد بن کر مردوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کیلئے تیار نہ ہو جائے، مگر ہماری تہذیب عورت کو ساری عزتیں اور تمام حقوق عورت ہی رکھ کر دیتی ہے اور تمدن کی انہی ذمہ داریوں کا بار اس پر ڈالتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہیں۔ اس معاملے میں ہم اپنی تہذیب کو موجودہ مغربی تہذیب سے بدرجہا زیادہ افضل اور اشرف سمجھتے ہیں اور نہایت مضبوط دلائل کی بنا پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری ہی تہذیب کے اصول صحیح اور معقول ہیں، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ صحیح اور پاکیزہ چیز کو چھوڑ کر ہم غلط اور گندی چیز کو قبول کریں۔ موجودہ زمانہ کی مخلوط سوسائٹی سے ہمارا اختلاف کسی تعصب یا اندھی مخالفت کا نتیجہ نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ اپنی اور آپ کی اور پوری انسانیت کی اور تہذیب و تمدن کی فلاح و بہبود اسی میں دیکھتے ہیں کہ اس تباہ کن طرز معاشرت سے اجتناب کیا جائے، ہمیں صرف عقلی دلائل ہی سے اس کے غلط ہونے کا یقین نہیں ہے، بلکہ تجربہ سے اس کے نتائج جو ظاہر ہو چکے ہیں، اور دنیا کی دوسری قوموں کے اخلاق و تمدن پر اس کے جو اثرات مترتب ہو چکے ہیں، ان کو ہم جانتے ہیں، اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ ہماری قوم اس تباہی کے گڑھے میں گرے جس کی طرف ہمارے فرنگیت زدہ اونچے طبقے اسے ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اخلاق کھو چکے ہیں اور اب ساری قوم کے اخلاق برباد کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری کوشش یہ ہے کہ ہماری قوم اور ہمارا ملک جو کچھ بھی ترقی کرے، اسلامی اخلاق کے دائرے میں رہ کر کرے۔ مگر اپنی اس کوشش میں ہم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں کہ جب ہمارے بھائیوں کے ساتھ ہماری بہنوں کی مجموعی طاقت بھی ہماری تائید پر ہو

پورا اسلام یا پوری فرنگیت

اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ آپ فرنگیت چاہتی ہیں یا اسلام؟ ان دونوں میں سے ایک ہی کا آپ کو انتخاب کرنا ہوگا۔ دونوں کو خلط ملط کرنے کا

آپ کو حق نہیں ہے۔ اسلام چاہتی ہوں تو پورے اسلام کو لینا ہوگا۔ اور اپنی پوری زندگی بہا سے حکمراں بنانا ہوگا کیونکہ وہ تو صاف کہتا ہے کہ ادخلوا فی السلم کافہ ۰ تم پورے کے پورے اسلام کے اندر آجاؤ۔ اپنی زندگی کا کوئی ذرا سا حصہ بھی میری اطاعت سے مستثنیٰ نہ رکھو۔ اگر یہ کلی اطاعت منظور نہ ہو اور کچھ فرنگیت ہی کی طرف میلان ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ دعویٰ اسلام کو ملتوی رکھیں اور جس راہ پر چلیں نام بھی اسی کا لیں۔ آدھا اسلام اور آدھا کفر نہ دنیا ہی میں کسی کام کی چیز ہے اور نہ آخرت ہی میں اس کے مفید ہونے کا کوئی امکان ہے۔ اور پھر اس مرکّب پر اسلام کا لیبل ایک جھوٹ بھی ہے۔

چونکہ ہمیں ہر کام مسلمان کی حیثیت سے اور مسلمان رہ کر ہی انجام دینا ہے۔ اس لئے میں آپ کو پہلی ہدایت یہ دیتا ہوں کہ جو کچھ کیجئے اُن حدود اور ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیجئے جو اسلام نے آپ کے لئے مقرر کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان عورت اپنی نقل و حرکت میں وہ آزادی نہیں برت سکتی جو ایک کافر عورت برت سکتی ہے۔ پھر جس طرح مرد سے اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ اپنے اہل و عیال اور دوسرے حق داروں کے حقوق بھی ادا کرے اور ان کے ساتھ اپنے دین اور خدا کے حقوق بھی ادا کرے، اسی طرح اسلام عورتوں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو حقوق ان پر شوہر، باپ، بھائی، اولاد اور دوسرے لوگوں کے ہیں ان کو بھی ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور ان کے ساتھ اپنے دین اور خدا کے حقوق بھی ادا کرے۔ ایک غیر مسلم کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ جس طرف جھک گیا جھک گیا اور دوسری ساری ذمہ داریوں سے مُنہ پھیر لیا، لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، یہاں نہ افراط کی گنجائش ہے نہ تفریط کی بلکہ ہر ایک کا جو حق ہے اُسے ادا کرنا ہوگا۔

ایک مسلمان عورت پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ذات کی، اس کے بال بچوں اور اس کے گھر کی اور اس کے خاندان کی ہے۔ سب سے پہلے اسے ان کی طرف توجہ کرنی چاہئے اور انہیں مسلمان بنانا چاہئے۔ آپ اسلام کو سمجھیں، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو بدلیں اپنے گھروں کو ہر قسم کی جاہلیت سے پاک کریں، اپنے بچوں کی صحیح تربیت کریں، اپنے قریبی عزیزوں کو اسلام کی طرف لائیں۔ پھر اپنی برادری کے لوگوں میں سے جن جن کے ساتھ آپ شرعی حدود کے اندر رہ کر مل سکیں ان کے اندر سے جاہلیت کے اثرات نکالیں اور انکو اسلام سے روشناس کرائیں، پھر آپ کا میل جول جن خاندانوں سے ہو، اور آپ کے ہمسائے میں جو لوگ بستے ہوں اُن کی طرف بھی توجہ کریں اور ان کی مستورات کے ذریعہ سے کوشش کریں کہ اسلام کی روشنی ان کے گھروں میں بھی پھیلے۔

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

مسلمان شاہی خاندان اور اُن کے سلسلے

مولفہ اسٹینلی لین پول ، مترجمہ مولوی عبد الرحمٰن خان، بی، ایس، سی، آنرز (لندن) سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن قیمت پانچ روپیہ ، ضخامت ۲۹۲ صفحات (معہ جلد) ملنے کا پتہ :- ادارہ ادبیات اُردو خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

یورپ نے مارگیہ کیتہ جیسے شدید متعصب تاریخ نگاروں کو جہاں جنم دیا، وہاں اسٹینلی لین پول جیسے معتدل اور انتہا پسندوں کے مقابلہ میں بہت کم متعصب مورخ بھی پیدا کئے ہیں۔ لین پول کو اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے علم و تہذیب سے خاص دلچسپی تھی، یہ کتاب اُس کے اس شوق و دلچسپی کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔

اس کتاب میں تاریخی اشاروں سے کام لیا گیا ہے، اہم سے اہم واقعات چند سطروں میں بیان کئے ہیں، اس لئے یہ تالیف "تاریخ" کی وہ صنف کہی جاسکتی ہے جو خاندانی شجروں، نسب ناموں اور تاریخی سنین پر مشتمل ہوتی ہے، کتاب عوام کے لئے جتنی زیادہ خشک ہے، اُسی قدر ریسرچ اسکالروں کے لئے مفید ہے، اس کو مسلمان شاہی خاندانوں کی ڈائرکٹری سمجھنا چاہئے۔

فاضل مترجم نے شستہ اور رواں ترجمہ کیا ہے! انگریزی کے "[illegible]" یعنی خاندانوں، انسانوں، قبیلوں اور مقاموں کے ناموں کو صحیح طور پر ترجمہ میں منتقل کرنا، مترجم کی وسعت نظر کا ثبوت ہے، سائنس کے عالم کی تاریخ وادب پر اتنی بسیط نظر اپنی جگہ خود بہت زیادہ لائق تحسین ہے۔

بنو اُمیہ، عباسی، فاطمی، سلجوقی، غزنوی، اور مرابطین سے عام طور پر ارباب علم و خبر واقف ہیں مگر اس کتاب میں شاہی خاندانوں کے ایسے نام بھی ملتے ہیں جن کو خواص بھی مشکل ہی سے جانتے ہوں گے۔ مثلاً

تمغاجی، زریعی، سلغری، مشرقی خنچاق کا سفید اُردو، اور رقیب خاندان!

مترجم کے قلم سے ترجمہ میں بھول چوک بھی ہوئی ہے، جس کا ذکر نہ کیا جائے گا تو تنقید یک رُخی رہے گی۔

صفحہ ۲۲ — خالد بن ولید کی شجاعت نے مُرتدوں اور منہ بولے[1] پیغمبروں کو فرو کر کے مذہب اسلام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ "منہ بولے" کا یہاں محل نہیں ہے "خودساختہ" یا نام نہاد ہونا چاہئے تھا اور "پیغمبروں کو فرو کرنا" تو اس سے بھی عجیب ہے، آگ فرو کی جاتی ہے، فتنے فرو کئے جاتے ہیں، انسانوں کو فرو نہیں کیا جاتا۔

صفحہ ۵۷ - عبد المومن کے بعد اس کے جانشین ہسپانوی عیسائیوں سے جہاد میں مشغول رہے لیکن اُن سے بالآخر ۱۲۳۵ء میں بُری طرح شکست کھائے " —— یہ دکنی اُردو ہے "بُری طرح شکست کھائی" لکھنا چاہئے تھا۔

صفحہ ۲۰۵ — بزرگوں کے حالات بڑھا چڑھا کر بیان کئے گئے ہیں —— "بڑھا چڑھا کر" بولا جاتا ہے — اگر یہ کتابت کی غلطی ہے تو "غلط نامہ" میں اس کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔

[1] انگریزی میں غالباً So called ہے۔

صفحہ ۲۵۴ ..... "چغتائی باقی رہ گیا تھا جس کو ماوراء النہر کا علاقہ معہ کچھ حصہ کاشغر بدخشاں، بلخ اور غزنیں دیا گیا تھا ——
یہاں "معہ" کا استعمال تکلیف دہ حد تک غلط ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اس مفید کتاب کا ترجمہ چھاپ کر اردو ادب میں یقیناً اضافہ کیا ہے، دوسرے ایڈیشن میں اگر زبان[1] وبیان کی غلطیوں کی تصحیح کردی جائے تو کتاب کا ادبی وزن بھی بڑھ جائے گا۔

دربارِ اکبر

جناب ممتاز مدراسی نے جلال الدین اکبر کے دربار کی ممتاز اور مشہور شخصیتوں کے حالات جمع کر کے "دربارِ اکبر" کے نام سے چھپوائے ہیں، اس کتابچہ کی ضخامت ۴۸ صفحات ہے، قیمت محصولڈاک کے علاوہ صرف آٹھ آنہ۔ ادب پبلشنگ ہاؤس اکبر آباد، مدراس ۱۲ سے یہ کتاب طلب کی جاسکتی ہے۔

کتاب دلچسپ ہے اور اندازِ بیان سہل وسادہ ہے، زبان کی غلطیاں کہیں کہیں ملتی ہیں مگر ایک چودہ سالہ نوجوان کی یہ کوشش لائق داد ہے۔ اب رہی بھول چوک تو اس میدان میں بڑے بڑے پختہ کار شہسواروں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، تاریخی حیثیت سے یہ کتابچہ مستند نہیں ہے، ملا عبد القادر بدایونی کے حالات میں بدایوں کا ذکر تک نہیں کیا۔

اردو زبان کی ہردلعزیزی، ہمہ گیری، اور قبول عام کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ سے دو ہزار میل کی دوری پر اردو کے انشا پرداز اور شاعر موجود ہیں۔ اردو کو کوئی کہاں کہاں مٹائے گا، دفتروں سے اسے خارج کیا جاسکتا ہے، مگر دلوں سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

سالنامہ "منزل"

ادارۂ تحریر:- خالد عرفانی، جمیلہ پروین اور شمس النساء بیگم خالد، حجم ۵۶۸ صفحات، کتابی سائز، قیمت ساڑھے تین روپے، ملنے کا پتہ:- ماہنامہ "منزل" عیدگاہ روڈ۔ کراچی (پاکستان)

جناب خالد عرفانی اردو کے خاموش اور مخلص خدمت گذار ہیں، خالد عرفانی کے اسی خلوص، مسلسل جدوجہد اور علمی وادبی دلچسپیوں کی بدولت ماہنامہ "منزل" نے اس طوفانِ صحافت میں اپنا مقام پیدا کرلیا ہے، —— زیر تنقید "سالنامہ" رسالہ نہیں ایک ضخیم مجلد ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، سرورق دلکش اور ضخامت چھ سو صفحات کے قریب! اس پر مستزاد شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں! اگر خالد عرفانی صاحب سے ہم ذاتی طور پر واقف نہ ہوتے تو اس سالنامہ کو دیکھ کر ہم یہ رائے قائم کرتے کہ اس رسالہ کے مدیر اور مالک کو یا تو کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ لگ گیا ہے یا وہ جادوگر ہیں —— مگر حقیقت یہ ہے کہ دل کی لگن اور شوقِ بے حد اپنی جگہ خود ایک زندہ کرامت ہے۔

"طنزیات کے مجموعے" سید وقار عظیم کا تنقیدی مضمون دلچسپ اور معیاری ہے، مضمون کے پہلے صفحہ پر ہی ہمیں یہ جملہ ملتا ہے "ان (کرشن چندر) کی ادبی زندگی کو شروع ہوئے مشکل سے چار سال گزرے ہیں ..... " اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ

[1] مثلاً صـ۲۵ پر "زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی" —— "زبان گدی سے گھسیٹ لی جائے" لکھا ہے —— (م)

مضمون یا تو بہت پہلے کا لکھا ہوا ہے یا مطبوعہ ہے، اگر چھپا ہوا ہے تو رسالہ یا کتاب کا حوالہ دینا چاہئے تھا۔

فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے :-

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو
کہیں دامان تر نہ ہو جائے

"اس طرح کی ادبی طنز کی مثالیں مومن کے یہاں بہت زیادہ ہیں، اور داغ و امیر کے یہاں مومن سے کہیں زیادہ! لیکن طنز" کے جس فلسفہ کو موضوع قرار دے کر یہ تنقید کی گئی ہے، اُس کی تعریف میں مومن یا دوسرے شاعروں کے "طنز آمیز" اشعار ہرگز نہیں آتے، اقبال کے یہاں طنزیہ شعروں کی کیا کمی ہے، "مجلس اقوام" پر کتنی چبھتی ہوئی طنز کی ہے :-

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے　　ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ　　ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

مگر "طنز" اقبال کی شاعری کا موضوع نہ تھا، ہاں! اکبر الہ آبادی "طنز" شاعر تھے، اور اس فن کو انہوں نے موضوع بنالیا تھا۔

حیرت ہے کہ "طنز" کے سلسلہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا تنقید نگار نے ذکر تک نہیں کیا، مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام شاید اس لئے چھوٹ گیا کہ تنقید نگار نے جب یہ مضمون لکھا تھا اُس وقت تک ممکن ہے مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا ہو، عبدالماجد طنز نگاری کے بادشاہ ہیں۔

"جدید نظم کے متعلق چند باتیں" صاف ستھرا مضمون ہے، مضمون نگار کے یہ جملے (اگر وہ کسی مغربی مفکر کے خیال کا عکس نہیں ہیں) اُردو ادب میں اضافہ کرتے ہیں :-

"شعر کی طرف ہمارا ردِعمل دو قسم کا ہو سکتا ہے، "ساکن مقبولیت"[1] جب ہم کوئی شعر پڑھ کر اُسے چپکے سے قبول کر لیتے ہیں، ایسے ہی جیسے سائنس کی کوئی حقیقت! "متحرک مقبولیت" جب کوئی شعر پڑھ کر ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روح کی گہرائیاں یک لخت اُبھر آئی ہوں، وسعتیں ہمارے سامنے پھیلتی جا رہی ہوں ..."

الطاف گوہر نے اپنے اس مضمون میں جو شعر پیش کئے ہیں، وہ سطحی بلکہ مہمل ہیں، میراجی کا شعر ہے :-

اب تو ساری دُنیا بدلی یہ صورت انجانی ہے
دل میں سب کے چھایا اندھیرا ظاہر بھی نورانی ہے

"ظاہر بھی نورانی" کو ہم نے بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی، مگر یہ اہمال کسی عنوان دُور نہ ہو سکا، جو لوگ شعر و نظم کے متعلق گفتگو کرتے ہیں، اُن کو شعر کی پرکھ ہونی چاہئے مگر اس کو کیا کیجئے کہ "نئے پن" کے شوق نے ان دنوں "اہمال" اور "لغویات" کو "ٹیک نک" کا مقام عطا کر دیا ہے۔

حصہ نظم مجموعی طور پر توقع سے زیادہ کامیاب ہے، نئے اور پرانے ہر دور اور ہر اسکول کے شعرا نظر آتے ہیں، ایک طرف ندرت میرٹھی کا یہ پرانی چال کا شعر :-

ہمیں حشر سے پہلے اٹھنا پڑے گا
سُنا ہے وہ سوئے مزار آ رہے ہیں

[1] یہ "ترکیب" البتہ ذرا کھٹکتی ہے — (م)

بھی ملتا ہے، اور دوسری طرف سیماب اکبرآبادی تنے افق کی بلندی سے آواز دیتے ہیں :۔

صحرا میں جگنوؤں سے ستاروں سے چرخ پر
قدرت ہے دور دور چراغاں کئے ہوئے

جوشش ملسیانی کے اس شعر :۔

عنایت بہت ہو چکی زخم دل پر
اُٹھا لو خدا را نمکدان اپنا

کو پڑھ کر ہمیں کسی پُرانے ہزل گو کا یہ مصرعہ بیساختہ یاد آگیا ع

تری اُلفت سے باز آئے اٹھا لے پاندان اپنا

لفظوں میں انتخاب کا خاص خیال رکھا جاتا تو اس انداز کے مصرعے :- ع

مست آنکھوں میں ہے لٹکی ہوئی نیندوں کی لچک　(صفحہ ۱۷۵)

چھٹ جاتے اور ارباب نظر کو لالہ و گل کے ساتھ خس و خاشاک کی ہم نشینی نہ کھٹکتی۔

"دانتے اور اس کا خواب" بہت خوب مضمون ہے، فضل حق قریشی کی تحریروں میں سُلجھاؤ پایا جاتا ہے جو اس "دور ابہام و اہمال" میں ہر آئینہ قابل قدر بلکہ مستحق تبریک و تحسین ہے، فاضل مضمون نگار نے چند صفحوں میں دانتے کے حالات زندگی سے لیکر اُس کی شاعری کی خصوصیات تک بیان کردی ہیں، اس مضمون کے پڑھنے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دانتے اپنی شاعرانہ عظمتوں کے باوجود دریدہ دہن، گستاخ اور نہایت متعصب شاعر تھا۔

اویس احمد ادیب نے "احتشام حسین" کے تنقیدی دعاوی اور مزعومات پر نہایت نازک اور سنجیدہ تنقید کی ہے، یہ تنقید محض طنز" نہیں ہے بلکہ حقائق کی ترجمانی اور مصوری ہے، غلام محمد بٹ نے "ادب اور کمیونزم" میں "ترقی پسندوں" کے ادبی رجحانات کے چہرے سے کہیں دھیرے دھیرے اور کسی جگہ جھٹکے کے ساتھ نقاب سرکادی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"ترقی پسند تحریک آج کل فقط اشتمالیت کے پروپیگنڈے کا نام ہے اور یہ اشتمالیت بھی رُوسی اشتمالیت ہے جس میں رُوس کی خواہشِ اقتدار اور ملکی پھیلاؤ کے تصورات واضح طور پر اُبھر رہے ہیں"

صفحہ ۱۱۲ پر کلانچوی صاحب فرماتے ہیں :۔

"بڑے بڑے حادثات ہوئے دانوں کے ساتھ گھُن بھی پسے" مگر ضرب المثل یوں ہے :۔

"گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس گیا ...."

افسانوں میں قیسی رام پوری کے افسانہ "گز بھر زمین" نے "سالنامہ منزل" کی قدر و قیمت بڑھادی ہے، پلاٹ میں اوریجنیلٹی پائی جاتی ہے اور اظہار بیان اس سے بھی زیادہ دلکش ہے۔

"آہنی مورت" ایک افسانچہ ہے، معلوم ہوتا ہے افسانہ نگار نے بہت ہی جلدی میں مضمون گھسیٹ دیا ہے، نوک پلک تک درست نہ ہوسکے، ایک جملہ ہے ____

"میں اکثر اس سے شرارت کرتا تھا، جیسے کوئی لوہے کی لاٹ پکڑ کر شعلہ ہلا کے دیکھے ..." اُس سے شرارت" غلط ہے "اُس کے ساتھ" کہنا چاہئے تھا، اور "شعلہ" تو بالکل لغو ہے۔

شاعر اور مضمون نگار خواتین نے بڑی فراخ حوصلگی کے ساتھ "سالنامہ منزل" کی قلمی اعانت فرمائی ہے، بعض نے اتنی مہربانی کی ہے کہ اپنی تصویریں بھی چھپنے کے لئے بھیج دی ہیں، ایک وہ زمانہ تھا کہ مسلم خواتین کو "مخدرات" (پردے میں رہنے والیاں) کہا جاتا تھا، مہ و مہر کی نگاہیں بھی اُن کے مقدس آنچل کو نہ دیکھ سکتی تھیں، اور آج یہ عالم ہے کہ مسلمان عورتوں کی تصویریں رسالوں اور اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ ع

نظر کی نامسلمانی سے فریاد

سالنامہ "منزل" کے مرتب کرنے والے اس قسم کی اونچ نیچ کے باوجود مبارک باد کے مستحق ہیں، ہم آخر میں صرف اتنی گزارش کرتے ہیں کہ اس فسق و فجور اور گناہ و ہوسناکی کے دور میں اخلاق کو ادب کی رنگینیوں میں زیادہ سے زیادہ سمو دینے کی ضرورت ہے۔ مانا کہ عوام چٹخاروں کے خوگر ہو گئے ہیں لیکن صحافت اگر چاہے تو یہ پست مذاقی بلند ہو سکتی ہے، معاشرت کی اصلاح اور سماج کے سدھار کی ذمہ داری ہم انشا پردازوں پر اوروں سے زیادہ عائد ہوتی ہے بشرطیکہ ہم اپنے فرض کو پہچانیں۔

قائد

ماہنامہ "قائد" ادارہ :- مولانا سید احمد سعید کاظمی امروہوی، اور مولانا سید احمد حبیب آفق کاظمی امروہوی — سالانہ چندہ پانچ روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ :- مدرسہ انوار العلوم، کچہری روڈ، ملتان شہر۔

قائد کا پہلا شمارہ ہمارے سامنے ہے، فاضل ارکانِ ادارہ کے عزائم بلند اور نیک ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی انقلاب کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہے اور اسی انداز پر مضامین جمع کئے گئے ہیں، مولانا آفق کاظمی کی قومی نظمیں اُن کے دلی جوش کا پتہ دیتی ہیں — مولانا سید احمد حبیب کاظمی نے "پیام تنظیم" کے عنوان سے ایک تنظیمی خاکہ مرتب فرمایا ہے، جس میں آپ لکھتے ہیں :-

"عرس اور درگاہوں میں شریعت و طریقت کے روح پرور مناظر، جنت نگاہ اور غلغلۂ ذکر و تسبیح فردوس گوش ہوں —"

کتاب و سنت کی بنیاد پر قوم و ملت کی تنظیم ہو اور اُس میں "عرس اور درگاہیں" بھی شامل ہوں اس "شتر گربگی" کو آخر کیا سمجھا جائے۔ اُردو زبان میں بہترین اسلامی لٹریچر "جماعت اسلامی" نے پیش کیا ہے اسی اندازِ فکر اور اسلوبِ نگارش سے لوگ متاثر ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں، قائد کے ارکانِ ادارہ زاویہ نگاہ کے اختلاف کے باوجود، اگر محض افہام و تفہیم کی خاطر اُس لٹریچر کے انداز کو اپنا لیں تو وہ قوم و ملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے —— "قائد" کے معیار کو ابھی بہت کچھ بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تنقید کے لکھے جانے کے بعد دوسرا شمارہ موصول ہوا جو پہلے شمارے سے بلند تر ہے۔

مشاعرہ، سرگودھا

سرگودھا (مغربی پنجاب) میں ۱۵ر جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک کل پاکستان مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی مفصل روداد جناب فیض لودھیانوی نے مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کی ہے، قیمت صرف دو آنہ رکھی ہے۔ ریاض بکڈپو بھلوال سے طلب کی جا سکتی ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے اُن کی روداد اختصار کے ساتھ اخباروں میں شائع ہوا کرتی تھی، سب سے پہلے بنگلور اور بمبئی کے روزناموں نے مشاعروں کا تفصیلی جائزہ لیا ——— اب جناب فیض لودھیانوی نے پاکستان میں مشاعروں کی (Commentary) کی دلچسپ راہ نکالی ہے۔

یہ روداد خاصی دلچسپ ہے، بلکہ بعض جگہ شوخ مزاج کا رنگ آگیا ہے اس ناقد بلکہ عینی شاہد نے ایک دو شاعروں کو مشکل سے بخشا ہے، ورنہ پھبتیاں سب پر کسی ہیں ——— ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے :-

"آپ جس قدر تمکنت سے مائیکروفون پر تشریف لائے تھے، اسی قدر خفت کے ساتھ واپس ہوتے" میں بیٹھ کر پڑھوں گا" آواز آتی "لیٹ کر پڑھو"

فیض صاحب بڑے نظرباز اور دیدہ ور معلوم ہوتے ہیں کہ شاعروں کی تمام ادائیں آئینہ دل ونگاہ میں اُتار لیں، اگر انہوں نے دو چار مشاعروں پر ایسی تنقیدیں اور لکھ کر چھپوا دیں تو کیا عجب ہے کہ مشاعروں میں اُن کو "رپورٹر" کی حیثیت سے مدعو کیا جایا کرے۔ اور شعراء صاحبان اُن کی خدمت میں التجا کریں کہ بھائی! خدا کے لئے ہماری آبرو کا خیال رکھنا!

ادارہ "مستقبل" کی پہلی روداد

ادب کی تعمیر پسند تحریک کے ترجمان ادارہ "مستقبل" (ملتان) کی پہلی ادبی روداد، مولانا سید ابوذر بخاری نے شائع کی ہے۔ قیمت ۸ر، حجم ۴۸ صفحے، ملنے کا پتہ :- انجمن "نادیۃ الادب" بٹی شیر خاں، ۲۳۲، ملتان شہر۔

اس روداد کے فاضل مرتب نے افتتاحیہ میں، ادارہ "مستقبل" کے مقاصد، طریق کار اور پالیسی کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ اس دورِ الحاد وگمراہی میں ادبی جہاد" کی حیثیت رکھتی ہے، اگر اسی جذبہ، عزم اور مقاصد کے ساتھ ہمارے مسلمان انشاپرداز اور شعراء ادب وصحافت کے میدان میں آجائیں تو باطل کے ہتھنڈوں کو موت کی آغوش کے سوا اور کہیں پناہ نہ ملے، اور نام نہاد "ترقی پسندی" کی "جنتِ شداد" ویران ہو کر رہ جائے۔

"دیکھ بھال" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانحِ حیات اور کردار پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے "یہ تذکرہ" "شنیدہ اور دیدہ" دونوں قسم کے واقعات پر مشتمل ہے، اس میں جہاں یہ جزئیہ تک موجود ہے کہ ابوالکلام آزاد کا تاریخی نام اُن کے والد نے "فیروز بخت" رکھا تھا وہاں مولانا آزاد کی ادبی خدمات، سیاسی زندگی، قیدِ افرنگ اور کانگرس کی صدارت کا ذکر تاریخی سنین کے حوالوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔

مضمون نگار نے اس "صحیفۂ عقیدت" کو اس دعا پر ختم کیا ہے :-

"خدا ان کو سلامت رکھے اور ان کی قیادت میں ہندوستان کا مسلمان آزادی کی حقیقی نعمتوں اور مسرتوں سے مالامال ہو ... ..."

لیکن اس نازک دورِ ابتلا میں مسلمانانِ ہند کی قیادت کے لئے وزارت کی کرسی غالباً زیادہ موزوں نہیں ہے ——— حق وصداقت کی راہ میں "حسین ابنِ علی" "احمد بن حنبل" اور "ابنِ تیمیہ" کے نقشِ قدم بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔

مولانا سید ابوذر بخاری کی نظمیں پہلی بار ہماری نظر سے گزریں، ان میں انقلاب کی گرج پائی جاتی ہے۔ اور سوزِ باطن بھی!

بیان و اظہار میں روانی اور شگفتگی بھی ہے، کہیں کہیں اُن سے بھول چوک بھی ہو گئی ہے :-

اب نہالِ تمنّا جواں ہو گیا مولا ناراض تھا مہرباں ہو گیا

مولا کا "الف" ناخوشگوار حد تک یہاں دبتا ہے ——— اور

نور مستور پھر آشکارا ہوا آدمیت نے رُخ ہے سنوارا ہوا

مصرعہ ثانی "نے" اور "سنوارا ہوا" کے ساتھ مل کر "اُردو روزمرہ" کو چیلنج دے رہا ہے

سائیکولوجی

انگلستان کے مشہور ماہنامہ "سائیکولوجی" کا اُردو ایڈیشن ——— ادارۂ تحریر :- حسن محمود عروج اور سعیدہ عروج ایم اے پی، ایڈ ——— مدیرِ عمومی :- انعام اللہ خاں بی اے، ایل ایل بی، قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ ——— زر سالانہ چھ روپیہ

ملنے کا پتہ :- دفتر سائیکولوجی ۔ ۱۴ میرٹ روڈ (پوسٹ بکس ۵۶۶) کراچی ۲

یہ ماہنامہ جب سے ان نئے ہاتھوں میں آیا ہے اس کے زمین و آسمان ہی بدل گئے، اس کا "ادارہ" ادب و اخلاق کے حدود میں رہ کر "نفسیات" پیش کرتا ہے، مضامین متنوع اور دلچسپ ہیں، باتوں باتوں میں "علم النفس" کے نازک عقدے کہیں کہیں وا ہو گئے ہیں، اس ماہنامہ میں صرف ترجمے ہی نہیں اور یجنل مقالے بھی ہوتے ہیں۔

"نفسیات" پر پچھلے اربابِ فکر نے جو کتابیں لکھی ہیں، وہ کار آمد و مفید ضرور ہیں مگر وہ "قولِ فیصل" کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتیں ان میں اضافے ہی نہیں ترمیم بھی ہو سکتی ہے۔ ذہنی کش مکش اور نفسی اُلجھنوں کو ریاضی کے مسلّمات کی طرح کسی ایک قاعدے اور اصول کے تحت لانا بہت دشوار ہے، "نفسیات" اتھاہ سمندر اور ایک لق و دق صحرا ہے جس کا اور چھور ملنا مشکل ہے ——— مگر "سائیکولوجی" کے مضامین میں اس کا اتا پتا ملتا ہے۔

جناب عروج کے خود نوشتہ مضامین میں شگفتگی پائی جاتی ہے وہ سچ مچ نثر میں شعر کہتے ہیں ——— محترمہ سعیدہ عروج کے ترجمے سلیس اور کافی جاندار ہیں۔

اگست کے شمارے میں (صفحہ ۱۶) عروج کا ایک شعر ہے :-

گدائے رسمِ محبت عروج ہے مت بھول
نوازشاتِ سلام و پیام پیدا کر

"رسم" زائد اور بھرتی کا لفظ ہے "گدائے محبت" کافی تھا ——— اور نوازش کی جمع "نوازشات" غلط ہے ——— "الف" اور "ت" کے ساتھ عربی لفظوں کی جمع بنائی جاتی ہے (مثلاً کمال سے کمالات اور اثر سے اثرات) فارسی اور اُردو لفظوں کی جمع "الف، ت" کے ساتھ درست نہیں ——— "جنگلات" دفتری اصطلاح کے طور پر زبان اُردو میں داخل ہو گیا ہے اور اسی طرح "خواہشات" بھی روزمرہ بن چکا ہے مگر اس "غلط العام" کے انداز پر دوسری جمع "بنانا (مثلاً فرمودات، نوازشات، فرمائشات) درست نہیں یہ بناء فاسد علی الفاسد ہو گی۔ ان لغزشوں سے بچنا چاہیے۔

صفحہ ۲۱ پر "دوشیزگی" کو "دوشیزیت" لکھا ہے اور صفحہ ۲۲ پر رسم پرستی کی جگہ "رسومائیت" پڑھ کر تو ہمیں اندیشہ ہو گیا کہ ماہنامہ "سائیکولوجی" شاید اس طرح زبان میں ناروا جدت اور غلط اجتہاد کی داغ بیل ڈال رہا ہے ——— ماہنامہ "سائیکولوجی" کا مستقبل یقیناً تابناک ہے اور علمی طبقہ اس سے بلند توقعات رکھتا ہے ——— !

مطبع عثمانی بصیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری

حاجی اختر سعید اینڈ کمپنی - سول ایجنٹ
بیڑی کے علاوہ
ہمارے یہاں
ہر قسم کا بہترین
بیڑی کا پتہ
بھی ملتا ہے
HAJI AKHTAR SAYEED & Co
NAPIER ROAD KARACHI

Only Title Printed at Lion Art Press Frere Road, Karachi,
Printer and Publisher Mahir-ul-Qadri

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱) شمارہ (۷)

ماہنامہ

فاران

مدیر
ماہر القادری

اکتوبر ۱۹۴۹ء

سالانہ چندہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ آٹھ آنہ
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۰ آنہ

مقامِ اشاعت:
"فاران" کیمبل اسٹریٹ
کراچی ۱

نظم و ترتیب

حصہ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

گو بہ پروانہ کہ سوزِ من و تو یکسا نیست
کہ تو از وصل بسوزی و من از مشتاقی

" آپ بیتی " سنانے کے لئے ایک بار دِ جانے دِل کیوں تقاضا کر رہا ہے ؟ میں نے چاہا کہ دل کی آواز پر کان نہ دھروں اور اس کے مطا
کو ٹھکرا دوں مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ ہوش وخرد کی سنجیدگی کو وحشتِ دل کے آگے سپر ڈال دینی پڑی، عقل ہار گئی ' دل جیت گیا ـــــــ
اور اب کوئی سُنے یا نہ سُنے مگر میں داستانِ دِل سُنائے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ افسانہ ممکن ہے جگہ جگہ سے غیر مربوط اور پریشان نظر آئے
کیونکہ فریاد کی کوئی " لے " نہیں ہوا کرتی، اور آوازِ شکستِ دل کو نغموں کے زیر و بم کی طرح ترتیب نہیں دیا جا سکتا ـــــــ لیکن
یہ حکایت بے ربطی اور پریشان خیالی کے باوجود سُنے جانے کے قابل ضرور ہے، چاہتا ہوں کہ دل کے سب نہیں تو تھوڑے بہت کانٹے
کاغذ پر نکال کر رکھ دوں، اگرچہ سوزِ دل کو جُوں کا توں ظاہر کرنا بہت دشوار ہے :-

دِل کی چوٹیں کہیں آواز میں ڈھل سکتی ہیں
اتنی پُر سوز ہے اس پر بھی ادھوری ہے فغاں

مگر " ادھوری فغاں " اور " نامکمل فریاد " بھی کم اثر انگیز نہیں ہوتی، کیونکہ ذرا سی چنگاری اثر رکھتی ہے، اور یہ تو
بھرے دل کی آگ ہے۔

ایک دو نہیں پورے دس مہینے یوں ہی باتوں باتوں میں گزر گئے، زندگی بڑی گریزپا واقع ہوئی ہے —— خود میری ہی ایک منظوم چیخ ہے :- ؎ [1]

جو ہو سکے تو ذرا اس کو نرم رو کر دے
یہ زندگی جو بہت تیز گام ہے ساقی!

مگر زندگی کا سمندِ صبا رفتار کسی کے روکے رکتا کب ہے، سفر اور مسلسل سفر اُس کی فطرت ہے، اور وہ خود ؎

آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

اِس مدت میں "فاران" چھ بار طلوع ہوا، اس تمنا اور آرزو کے ساتھ :-

ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اب یہ ساتواں شمارہ آپ کے سامنے ہے، خود پر احتساب بہت مشکل ہے، اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں پوری طرح نظر کہاں آتی ہیں اور جو آ بھی جائیں تو نفس اُن کی سَو سَو طرح تاویلیں کر کے حقیقت کو نمایاں اور واضح نہیں ہونے دیتا، سیہ فام حبشی اور کالے کلوٹے زنگی کو بھی اُس کی اپنی آنکھیں آخر وقت تک دھوکے میں رکھتی ہیں —— "فاران" کی خدمت و کارگزاری کا جائزہ تو آپ لیں گے اور آپ ہی کا فیصلہ غیر جانبدارانہ سمجھا جائے گا —— گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں، میں کتنی ہی صداقت اور دیانت سے کام کیوں نہ لوں، پھر بھی تنقید و احتساب میں جانب داری اور خود پرستی کا رنگ آہی جائے گا۔

ہاں! تو سنئے! جب میں نے "فاران" کی اشاعت کا اعلان کیا اور یہ خبر اخباروں اور رسالوں میں چھپی تو بعض کرمفرماؤں کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی آگئی کہ یہ "جرأتِ رندانہ" بہت سے بہت ایک دو جستوں میں ختم ہو جائے گی، ابھی نیا نیا شوق ہے، راستہ میں ٹھوکر لگی بھی تو گرمیٔ آغاز اس کو سہارا دے لے گی، لیکن جب یہ نشہ اُترنے لگے گا اور راہ کی مشکلات کا ہجوم ہوگا تو "شاعروں میں جنّا کا کنارا" اور :-

دیوانے آہی جائیں گے کھنچ کر بہ جبرِ عشق
محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

ٹھیک ٹھیک کر پڑھنے والا شاعر اس منزل سے بھاگ کھڑا ہوگا —— ان لوگوں نے مجھ میں کچھ دیکھ کر ہی یہ رائے قائم کی تھی، اُن کی طنز آمیز مسکراہٹیں میری پیشانی پر ناخوشی کی ایک شکن بھی نمودار نہ کر سکیں، وہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے، کہ "جس کے فضل و کرم کے بھروسہ پر اس کام کا آغاز کیا جا رہا ہے وہ ایک شوخ فطرت کو سنجیدہ، ایک متلوّن کو مستقل مزاج اور ایک کوچہ گرد کو مسلسل بارہ بارہ گھنٹے ایک ہی جگہ جم کر کام کرنے والا بنا سکتا ہے" وہ "چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا، رائی پربت، خس و خاشاک گل و لالہ اور ذرے سورج بن سکتے ہیں —— اور بن ہی نہیں سکتے بن گئے ہیں اور بنتے رہتے ہیں" امر و خلق" اسی کے ہاتھ میں ہیں، دُعا قبول کرنے والا ہی نہیں دُعا کے لئے ہاتھ اٹھانے کی توفیق بخشنے والا بھی وہی ہے، تقدیر، تدبیر، جمع اسباب اور ظہور نتائج، سب کا وہی مالک ہے۔

پس شکر کے سجدے، حمد کے نغمے، ستائش کے زمزمے، اور کبریائی کے نعرے اُسی ذات کے لئے سزاوار ہیں —— مسکراہٹیں ہی نہیں شکر کے آنسو بھی ہوا کرتے ہیں اور آنسو شاید مسکراہٹ سے زیادہ جاندار ہوتے ہیں —— حالت یہ

---

[1] میری ایک نظم —— "م"

رہی ہے :۔ ؎

چہ خوش است بوئے عشق از نفسِ نیاز منداں
دل از انتظار خونیں، دہن از امید خنداں

کبھی ایسا بھی ہوا کہ شکر و سپاس میں شکوے کی جھلک پیدا ہونے لگی، مگر اسی وقت ضمیر نے چٹکی لی کہ :۔ ؎

عشق بازیچہ و حکایت نیست
در رہِ عاشقی شکایت نیست

بندگی صرف انقیاد و اطاعت اور صبر و رضا کا نام ہے، جان دے کر بھی بندگی کا حق ادا نہیں ہو سکتا، انسانیت کے سب سے بڑے غمخوار (ارواحنا لہم الفدا) اور انسانِ کامل پر جب بازارِ طائف میں چھوکرے پتھر برسا رہے تھے، تو "اُس" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مظلوم نگاہوں میں حمد و سپاس کی موجیں اور اس کے مجروح لبوں پر شکر و ستائش کے نغمے تھے ——— پس جس کے پیش نظر یہ مقدس "اسوۂ حسنہ" ہو اس کو ہر حال میں "عبدِ شکور" اور بندۂ سپاس گزار رہنا چاہیے۔

کشمکش

اس منزلِ دشوار گزار میں جہاں ہمت بندھانے اور مساعدت و غمخواری کرنے والے ملے وہاں "تبسم برلب اور دشنہ در آستیں" جیسی ذہنیت رکھنے والوں سے بھی سابقہ پڑا۔ ایران کا ایک بہت ہی کم مشہور بلکہ گمنام شاعر صفائی نراقی شاید اسی انداز کے محسن کش آدمیوں کے سلوک کو دیکھ کر بے اختیار چیخ اٹھا :۔

آدمیزادے کہ میگویند اگر ایں مردمند
اے خوشا جائے کہ خود آنجا نباشد آدمی

کسی بے گھر اور بے ٹھکانے آدمی کے حال پر ترس کھا کر اپنے یہاں اُسے پناہ دینا اس زمانہ میں بہت بڑا جرم ہے! اس داستانِ غم کی تفصیل پیش کر کے آپ کے سکون کو میں مکدر کرنا نہیں چاہتا، خدا دلوں کا حال جانتا ہے، کہ اپنے پر بہت کچھ جبر کر کے یہ چند سطریں لکھی ہیں ——— مقصد یہی ہے کہ غم بیان کر دینے سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا ہے، اور میں تو اس کش مکش کو بھی خدا کی رحمت ہی سمجھتا ہوں، مجاہدۂ نفس ہی سے تزکیۂ باطن کی راہ نکلتی ہے، شکستہ دلی ہی تو زندگی کی سب سے بڑی متاع ہے، ٹوٹا ہوا دل ہی سے انجمن صبر و رضا کے در و دیوار پر گلکاری کی جاتی ہے۔ ؎

تا پریشاں نہ شود کار بہ ساماں نرسد
شرطِ عشق است کہ تا ایں نشود آں نشود

حوصلہ افزائی

آپ نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ عام رسالوں کی طرح "فاران" میں نہ تو کسی کا تعریفی مکتوب چھپا اور نہ کسی رسالہ اور اخبار کا ستائش آمیز تبصرہ شائع ہوا، اس سلسلہ میں "فاران" کے اوراق سادہ ہی رہے ——— تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ دفترِ "فاران" میں تعریفی خطوط اتنی زیادہ تعداد میں آئے اور آتے رہتے ہیں کہ اگر ہم انہیں چھاپنا شروع کر دیں تو ہر شمارے کے کئی کئی صفحے اسی "شوقِ خودستائی" کی نذر ہو جائیں۔ ان خطوں کے لکھنے والوں میں صرف وہی لوگ شامل نہیں ہیں جو اس جذبہ کے ساتھ مدح کرتے ہیں کہ ہمارا خط رسالہ میں اس بہانہ چھپ جائے گا اور اُس "قصیدہ منثور" کے ساتھ اپنی ایک عدد غزل یا نظم یا مضمون بھی مہربانی فرما کر منسلک کر دیتے ہیں ——— "فاران" کے قدردانوں اور ستائش گروں میں وہ معتمد اور ممتاز شخصیتیں شامل ہیں جنکے

کارناموں پر علم و ادب کی عظمتیں ناز کرتی ہیں۔

اخباروں، رسالوں، اور جریدوں کے "تبصرے" تو خود آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں گے ـــــ احباب اور ہمدردوں نے مجھ سے کہا کہ ان تحسینی خطوں اور تبصروں کو اپنے رسالہ میں ضرور شائع کرو، یہ چیز تجارتی نقطۂ نگاہ سے فائدہ مند رہے گی، ان مشوروں پر میرا دل بھی للچانے لگا، مگر پھر ضمیر نے ڈکا کہ بہت سے ہمدردانہ مشورے غلط بھی ہوا کرتے ہیں، تم جس روش، عزم اور مقصد کے ساتھ میدانِ صحافت میں آئے ہو اس کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں، اپنی اور اپنے رسالہ کی تعریف و توصیف کے مکتوب اور تبصرے شائع کر کے، اتنے صفحوں اور " S p a c e " پرکار آمد اور مفید مضمون سے ناظرین کو محروم کر دینا چاہتے ہو ـــــ میں نے ضمیر کی بات مان لی، اور ہوس و آرزو کے اس طوفان کو پی کر رہ گیا۔

مگر میں تمام بزرگوں، کرمفرماؤں، دوستوں اور قدردانوں کا شکر گزار ہوں، کہ ان کی تحریروں نے میرے حوصلے بڑھائے میرے عزم میں رسوخ و استحکام پیدا کیا، اور مجھے منزل کی تنہاروی پر ملول اور دل برداشتہ نہ ہونے دیا، عزور نفس سے آدمی بچا رہے تو اس انداز کی حوصلہ افزائیوں سے کام کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے، بشرطیکہ تعریفیں سننے کی نفس کو چاٹ نہ پڑ جائے۔

مصروف ذمہ داریاں

میں نے بے فکری کے دن بھی دیکھے ہیں اور بہت مصروف زندگی بھی گزاری ہے لیکن "ماہنامہ" کے انتظام و ترتیب کی ذمہ داری سے وہ بھی اس طرح

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ!

میرا پہلا واسطہ ہے میں ان ذمہ داریوں کی تفصیل بیان کروں گا تو شاید مجھ سے کہا جائے گا ـــــ کہ یہ لیجئے! پھر اپنا دکھڑا لے بیٹھے، ہمیں اس سے کیا کہ آپ رسالہ کی تیاری میں خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں۔ ہمیں تو صاحب: اس معیار کا رسالہ چاہئے جس کا آپ نے پہلے شمارہ میں وعدہ کیا تھا اچھا! تو میں اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا، مگر اپنی مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کا ذکر میں نے اس لئے کیا تھا کہ وہ احباب جو میری کوتاہ قلمی کے شکوہ سنج ہیں، ان کو حالات کا علم ہو جائے کہ میں تین تین چار صفحوں کے خط کے جواب میں اتنے صفحے نہیں لکھ سکتا۔

مجھے احباب بدلا ہوا نہ سمجھیں، میں وہی ہوں جیسا کہ اب سے دو سال پہلے تھا، محبت میری سرشت اور وفا میرا خمیر ہے۔ خطوں کے لمبے اور چھوٹے ہونے پر خلوص کی کمی بیشی منحصر نہیں ہے، محبت کا ایک حرف منافقت کے ایک دفتر پر بھاری ہوتا ہے ـــــ بلکہ یہاں تک ؎

ما اگر مکتوب ننوشتیم عیب ما مکن

درمیانِ رازِ مشتاقاں قلم نامحرم است

طویل تحریریں اور لمبے چوڑے نامہ و مکتوب فرصت کے چٹخارے ہیں اور چٹخاروں میں کام کی باتیں بہت کم ہوتی ہیں، اس دنیا میں جبکہ معیشت کی ضرورتوں نے زندگیوں کو بہت زیادہ مصروف بنا دیا ہے۔ قلم اور زبان کو تفریح اور وقت گزاری کے لئے استعمال کرنا خود اپنے پر اور سوسائٹی پر ظلم کرنا ہے۔

معذرت

میں رسالوں کے مدیرانِ گرامی قدر سے بھی معذرت خواہ ہوں کہ اُن کے بار بار توجہ دلانے پر بھی تعمیل ارشاد نہ کر سکا۔ بعض رسالوں کی قلمی خدمت کرنے کے لئے خود میرا جی چاہتا

ہے، لیکن کثرتِ کار اور مصروفیت بے حد اس آرزو کو پورا نہیں ہونے دیتی ——— حالانکہ رسالہ کی ذمہ داریاں جس زمانہ میں مجھ سے متعلق نہ تھیں تو مصروفیت کے باوجود میں نے رسالوں اور اخباروں میں اتنا لکھا ہے کہ پڑھنے والے شاید تنگ آگئے ہیں، بعض احباب اس لسیار نویسی پر مجھے ٹوکتے تھے اور اُن کا یہ مشورہ یقیناً صائب اور ہمدردانہ تھا، مگر اب میں اس روش کو نہیں نباہ سکتا یہ رسمی معذرت نہیں، یک مخلص دل کی گزارشِ احوالِ واقعی" ہے جو آرزوئے پذیرائی رکھتی ہے۔

جن رسالوں اور اخباروں نے "فاران" کے مضامین کسی حوالہ کے بغیر نقل فرمائے ہیں۔ اُن سے ہم ملول اور کبیدہ خاطر نہیں ہیں، ہم نام نہیں کام چاہتے ہیں، ہمارا پیام ہمارے نام کے حوالے کے بغیر بھی پہونچتا اور پھیلتا رہے، تو یہ ہمارے مقصود کے عین مطابق ہے۔

مضامین

"فاران" کی تعریفیں سُن کر اور پڑھ کر حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ میرا دل ایک طرح کی ندامت بھی محسوس کرتا ہے، ندامت اس کی کہ "فاران" کو جس نہج اور اسلوب پر میں چلانا چاہتا تھا اُس کے لئے خاطر خواہ قلمی تعاون حاصل نہیں ہوا ——— ہندوستان کی تقسیم کے بعد اُردو کے ادیب اور شعراء بھی دونوں ملکوں میں بٹ گئے، اول تو اس انقلاب کے بعد ہر زندگی کی مصروفیتیں بڑھ گئی ہیں۔ دوسرے ہندوستان میں جو اہلِ قلم اور اربابِ فکر رہ گئے ہیں، ان کی مصلحتیں بہت زیادہ نازک ہیں، یہی نزاکتیں پاکستان سے شائع ہونے والے رسالوں کی قلمی امداد پر اثر انداز ہوتی ہیں، ہندوستان کے اردو انشاپردازوں کو محتاط بن جانا پڑا، اور ہمیں ان کی اس احتیاط پر جرح و تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا، ہم ایسا کریں گے تو ان بیچاروں کے زخموں پر گویا نمک پاشی کریں گے ——— شعر و ادب کی یہ بہت بڑی "ٹریجڈی" ہے۔

سائنس زدہ تہذیب و تمدن کی بوقلمونیوں اور آسائشوں کے ساتھ ذہن و دماغ بھی آرام طلب ہو گئے ہیں، لوگ محنت اور کاوش سے جی چُراتے ہیں، ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت شعر و ادب سے دلچسپی رکھتا ہے، مشہور ہو جانے کے خبط میں مبتلا ہے ہر نوخیز شاعر اور نومشق انشاپرداز آغاز ہی میں شہرت و ناموری کی چوٹی پر اچک کر پہونچ جانا چاہتا ہے۔

دفتر "فاران" میں کثرت سے غزلیں، نظمیں، افسانے اور مقالے آتے رہتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھ کر میں پہروں سوچتا رہتا ہوں، کہ یا اللہ! ہمارا کاروانِ ادب آخر کس سمت جا رہا ہے؟ عام طور پر سپاٹ مضامین اور غیر مربوط افسانوں کی زیارت نصیب ہوتی ہے، اور غزلوں، نظموں، قطعوں اور رباعیوں کی تو نہ پوچھئے ——— کبھی کبھی وجدان کو اُبکائی آنے لگتی ہے ——— "دامانِ افق" "خلا" "فضا" "ارے توبہ!" "غمِ مستقل" "میخانہ بدوش" "لرزش" "اندھیرا" "دھندلکا" "پرچھائیاں" "حسین گناہ" "وقت کی چاگل" "نبضِ کائنات" ——— اور اسی انداز کی ترکیبیں ہیں، جو قریب قریب ہر غزل اور نظم میں نظر آتی ہیں، میں دیکھ رہا ہوں بلکہ اس اذیت کو محسوس کر رہا ہوں کہ "ترقی پسند ادب" کی گمراہیاں رنگ لا رہی ہیں اور نئے لکھنے والوں میں "دماغی سلجھاؤ" کی بہت زیادہ کمی پائی جاتی ہے، ہماری صحافت اگر اس انداز کے شعر و ادب کی حوصلہ افزائی کرتی رہی، اور اس طوفان کا بہاؤ نہ رُک سکا، تو پھر اردو کے مستقبل کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خود ستائی کے الزام سے چاہے میں نہ بچ سکوں، لیکن بربنائے ضرورت اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا کہ ادبی تعارف، صحافت و انشاء اور نگارش و تحریر کی مختلف منزلوں سے میں گزرا ہوں ——— اس منزل کے

کچھ تجربے بھی ہیں رکھتا ہوں ؛ اس لئے مضامین پڑھ کر میں رائے دے سکتا ہوں کہ کس مضمون نگار نے کونسا مضمون کس طرح لکھا ہے ——— عجلت میں ؛ سرسری طور پر ! اُردو کی ایک آدھ کتاب پڑھ کر ! مضمون نگار چونکہ ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے اور شہرت و قبولِ عام بھی حاصل ہے ، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سطحی اور سرسری مقالہ کی ایک ایک سطر کو رسالہ والے تبرک سمجھ کر چھاپ دیں گے ! مقالہ نگار کی غرض و غایت صرف ، حصولِ شہرت ہے ! یا ایک مقصد کے تحت مضمون لکھا گیا ہے

جن حضرات کے مضامین " فاران " میں نہ چھپ سکے اُن کی دل گرفتگی ——— اور کسی کسی کی خفگی سے ——— میں معذرت چاہتا ہوں ، مجھے ان کے ساتھ ہمدردی ہے مگر ان کی ہمدردی اور دلجوئی کے لئے " فاران " ہیں دشمنی نہیں کرسکتا ۔ ناپسندیدہ مضامین نہ چھاپ کر میں ان حضرات سے سدا معافی چاہتا رہوں گا ، میں معذرت کے لئے خود جھک جاؤں گا لیکن " فاران " کو اُس کے مقام سے نیچے نہ آنے دوں گا ، یہ میں خدانخواستہ بڑا بول نہیں بول رہا ہوں ، ادارت کی ذمہ داری اور احساسِ فرض مجھ سے یہ سب کچھ کہلوا رہا ہے ۔

ہمارا معیارِ تنقید

" فاران " میں تنقیدیں خوب جانچ تول کر کی جاتی ہیں ، محاسن کے اعتراف اور معائب کے اظہار میں " فاران " نے کوئی رعایت مروت نہیں کی ، جو کچھ کہا صاف صاف اور بے ملا کہا ۔

تنقید نہ صرف " مدح " ہے اور نہ " ذم " ہے ! تنقید بڑی شدید ذمہ داری ، دیانت اور اصابتِ رائے چاہتی ہے ، ناقد اور تبصرہ نگار کو ایسی راہ سے گزرنا پڑتا ہے جو سچ مچ بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے ، کسی کی مدح و ستائش تو سوچے سمجھے بغیر بھی کی جاسکتی ہے اور ایسے آدمی کو لوگ زیادہ سے زیادہ سادہ لوح اور بے وقوف کہہ سکتے ہیں ۔ مگر کسی کی بھول چوک ، کوتاہیوں اور لغزشوں کی طرف اشارہ کرنا بہت ہی نازک ذمہ داری کا کام ہے ، اگر اس میں پوری احتیاط ، کامل غور و خوض اور انتہائی دیدہ وری سے کام نہ لیا جائے تو پھر ایسے تنقید نگار کو دنیا " بدنیت " کہنے سے نہیں چوک سکتی ، ——— اور " بدنیتی " کا الزام اپنے سر لینے سے " بے وقوف " بن جانا زیادہ اچھا ہے ۔

" فاران " میں تنقید کی نوعیت یہ نہیں رہی اور نہ انشاءاللہ رہے گی ، کہ کتاب اور رسالہ کا سرورق دیکھا ، دو چار جگہ سے تھوڑا سا مضمون پڑھا اور جھٹ سے تنقید سپردِ قلم کردی ، ہمارے یہاں کتابیں پڑھ کر تنقید کی جاتی ہے کہ یہی ذمہ داری اور دیانت کا تقاضا ہے ۔

کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی خطا اور نسیان سے محفوظ نہیں رہ سکتا ، ہر آدمی سے تھوڑی بہت بھول چوک اور اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے ، اپنی کوتاہیاں بہت کم نظر آتی ہیں ، اور وہ اس لئے کہ اپنی ذات اور صفات کے ساتھ ہر شخص کو محبت ہوتی ہے ، یہی محبت اکثر " حجاب " بن جاتی ہے ، اور آدمی کی نگاہ سے اس کی اپنی کمزوریاں چھپا دیتی ہے ——— مگر اہلِ نظر اور طالبانِ حق کا یہ دستور رہا ہے کہ کوئی اُن کی " واقعی غلطیوں " پر احتساب کرتا ہے تو وہ ناخوش نہیں ہوتے بلکہ ناقد کا احسان مانتے ہیں ۔

ہمارے کان تک اربابِ قلم کی ناخوشی کی خبریں پہونچی ہیں ——— شاید لوگوں نے اپنے کو معصوم اور منزہ عن الخطا سمجھ رکھا ہے ، یہ بہت بڑی بھول اور خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے ——— " تنزیہہ کامل " تو خدا کی صفت ہے ، انسان اس کا حامل نہیں ہوسکتا ۔ ایک بہت مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس نے ایک مشہور اہلِ قلم سے کہا ——— " کہ صاحب ! لیجئے ہم چالیس سال سے زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور آج " فاران " ہماری زبان و بیان کی غلطیاں

نکالتا ہے ———— میں کہتا ہوں کہ ایک سو سال تک زبان و ادب کی خدمت کرنے کے بعد بھی اگر کسی کے یہاں کوتاہیاں اور لغزشیں پائی جاتی ہیں تو محض اس کی انشاپردازی کے طولِ مدت کی بنا پر اُن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی ———— "فاران" میں جن لغزشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر وہ صحیح اور درست ہیں تو عالی ظرفی کے ساتھ ان کو تسلیم کر لیا جانا چاہئے۔ اور اگر خود ہم سے اس باب میں غلطی ہوتی ہے تو ہمیں اُس سے آگاہ کیا جائے، ہم نجی خط کے ذریعہ چپ چاپ نہیں رسالہ میں ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کریں گے، تاکہ جو لوگ ہمارے بیان و تنقید پر اعتماد کرتے ہیں وہ گمراہی سے بچ جائیں ———— ہم اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ جو کچھ ہم لکھ دیتے ہیں وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے اور اس میں اضافہ و ترمیم اور حک و اصلاح ممکن ہی نہیں ہے دوسرے انسانوں کی طرح ہم سے بھی غلطیاں اور لغزشیں ہوتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ہماری کوتاہیوں سے ہمیں آگاہ کیا جائے۔

بڑی شدید کشمکش کی گھڑی وہ ہوتی ہے جب ایک رسالہ ہمارے سامنے آتا ہے جس میں "فاران" پر تبصرہ شائع ہوتا ہے ———— مدح و ستائش کی ممکن رعایتوں کے ساتھ! اور پھر اُس رسالہ پر ہمیں تنقید کرنی ہوتی ہے ————. دل چاہتا ہے کہ تعریف کے جواب میں تعریف ہی کا انداز اختیار کیا جائے، اُس نے ہماری کوتاہیوں کو چھپایا، ہماری شرافت و مروت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اُس کی کمزوریوں سے نظر بچا کر گزر جائیں ———— لیکن ذمہ داری کا احساس بروقت متنبہ کرتا ہے کہ یہ شرافت نہیں ایک طرح کی خیانت اور فرض سے بغاوت ہے "من ترا حاجی بگویم ......" جیسی پست ذہنیت کا شعر و ادب میں مظاہرہ اور وہ بھی نقاد کی حیثیت سے، گمراہ کن ثابت ہوگا ———— اس تنبیہ اور احساس کے بعد مقامِ شکر و امتنان ہے کہ قلم اپنا فرض انجام دینے سے باز نہیں رہتا۔

بعض کرم فرماؤں نے یہ بھی کہا ہے کہ "فاران" کی تنقیدوں میں "لفظوں" کی بہت پکڑ کی جاتی ہے ———— یہ تہمت نہیں حقیقت ہے، لوگوں کا اعتراض درست ہے، ہم اس الزام کو قبول کرتے ہیں، "فاران" لفظ و بیان کی نزاکتوں پر بہت زیادہ گہری نظر رکھتا ہے ——— اردو ادب کو جب سے "ترقی و انقلاب" کا روگ لگا ہے، "لفظ" کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہی، الفاظ بے محل بلکہ غلط استعمال ہو رہے ہیں، "جدت و آزادی" کے نام پر یہ وبا عام ہوتی چلی جا رہی ہے ———— کوئی ٹوکتا ہے تو جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ تم لوگ تو "لفظ پرست" ہو، پرانی لکیر کے فقیر! یہ دیکھو کہ ان لفظوں سے ہمارا مفہوم ادا ہوا یا نہیں ———— میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص پاجامہ اُتار کر اپنا کوٹ یا شیروانی بدن پر لپیٹ لے اور لوگوں کی انگشت نمائی پر کہے ——— کہ تم تو قدامت پسند اور "لباس پرست" واقع ہوئے ہو، یہ دیکھو کہ تن پوشی کی ضرورت اس طرح پوری ہوتی یا نہیں؟ ———— اس "جہل مرکب" کی اشاعت ہو رہی ہے! زبان و ادب کے حقیر خدمت گزار کی حیثیت سے ان حماقتوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ حماقتیں بار بار نہ دُہرائی جائیں۔

اسی لئے "فاران" کی تنقیدوں اور تبصروں میں "لفظوں" کی قدر و قیمت، محل استعمال اور توازن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، ہمارا ایقان ہے کہ جو شخص لفظوں کے برتنے کا سلیقہ نہیں رکھتا وہ "قوال" اور "داستان گو" تو شاید بن سکتا ہے، مگر ادیب اور شاعر نہیں بن سکتا، ادب میں "لفظ" ہی کا سارا کھیل ہے، نازک سے نازک فکر اور بلند سے بلند خیال بھی ناقص اظہار بیان کے چکر میں آکر بے وزن ہو جاتا ہے، اور اپنی افادیت کھو بیٹھتا ہے اور معمولی بلکہ بعض اوقات سطحی خیال لفظوں کی خوش نمائی کے سہارے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش بن جاتا ہے۔

یہ جو ہم میرؔ، انیسؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ کے کلام پر سر دُھنتے ہیں اور شبلیؔ و حالیؔ کی تحریروں کو سراہتے، اور ان کا لو

قبول کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں ندرتِ خیال اور بلندیٔ فکر کے ساتھ اظہار و بیان کا غیر معمولی حُسن پایا جاتا ہے ـــــــ زبان و ادب میں ندرت و اجتہاد کے ہم منکر نہیں ہیں، لیکن اجتہاد کرنے والوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ہر شخص اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، دنیا کے ہر فن کا قاعدہ ہے کہ اس کے جاننے والوں میں سب کے سب مجتہد نہیں ہوا کرتے ـــــــ تو اردو زبان میں ناروا اجتہاد کا جو دروازہ کھل گیا ہے اس پر پہرہ بٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ زبانِ اُردو کی نزاکت، سادگی اور غیر معمولی کشش خاک میں مل جائے گی۔

اظہارِ حق

"ترقی پسند ادب" پر ہم نے یقیناً شدت کے ساتھ تنقید کی ہے، اور اس "شدت" پر ہم کسی معذرت کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ گروہ سخت سے سخت تنقید بلکہ زجر و توبیخ کا مستحق ہے، گمراہیوں پر ہم خاموش نہیں رہ سکتے، وہ اگر "اقدام" کے لئے آزاد ہیں، تو کیا ہم "مدافعت" کا بھی حق نہیں رکھتے؟

وہ کمزور طبیعت بزرگ جو حق و باطل میں صلح کرانا چاہتے ہیں اور جن میں مقابلہ کی سکت نہیں ہے کہتے ہیں کہ "ترقی پسند ادب" نے اپنی کمزوریوں کے باوجود اُردو ادب کو "کچھ" دیا بھی ہے! تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ "سانپ" بھی آدمیوں کو "کچھ" فائدہ پہونچاتے ہیں؟ اُن کی کھال سے "جُوتے" اور " money purse " بھی بنتے ہیں ـــــــ تو کیا، اس "کچھ" کے لئے سانپوں اور اژدہوں کو بُلبلوں اور قمریوں کا مقام دے دیا جائے، افادیت کا پیمانہ "کچھ" نہیں "کم" اور "زیادہ" ہے ـــــــ قرآن میں شراب کو اسی لئے حرام قرار دیا گیا ہے کہ اس میں مفرتیں زیادہ اور منافع کم پائے جاتے ہیں!

اظہارِ حق کے لئے ہم کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پروا نہیں کرتے، اور نہ کسی کی دلدہی کے لئے اپنی روش میں لچک پیدا کر سکتے ہیں، ہم سے اس معصیت کی توقع نہ رکھی جائے، غلطی اور بے راہ روی میں کسی کا ایک قدم بھی ہم ساتھ نہیں دے سکتے، ؎

در ضمیرِ ما نمی گنجد بغیر از دوست کس
ہر دو عالم دشمنِ ما باد و مارا دوست بس

ہم جانتے ہیں کہ سچائی کی راہ بہت کٹھن ہے، یہ فرشِ گُل نہیں خارزار ہے، لیکن:- ؎

بر سرِ خار بیادِ تو چناں خوش بروم
کہ کسے خوش برود بر سر دیبا و حریر

"فاران" نے کیا کیا؟

جب اس مضمون کا آغاز کیا ہے تو خیال تھا کہ چند اشارے کرتا ہوا گزر جاؤں گا، مگر یہ داستان دراز ہوتی ہی چلی گئی، "فاران" کے قدر دانوں سے اب تک میں "حدیثِ دیگراں" کی آڑ لے کر گفتگو کرتا رہا ہوں، آج میں نے دو دو بات چیت کی ہے اور اس طرح آپ بیتی سُنا کر خود اپنے بارِ غم کو ہلکا کیا ہے، غم خواروں اور دوستوں کے سامنے دل کی بات کہہ دینے سے قلب ایک طرح کی تسکین سی محسوس کرتا ہے۔

صحافت وانشاء کی دُنیا میں سات مہینے کی مدت ہی کیا ہوتی ہے! "کے آمدی و کے پیر شُدی" ہم یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ "فاران" نے ادب میں کوئی بڑا بھاری انقلاب پیدا کر دیا ـــــــ تو یہ ایک احمقانہ دعویٰ ہوگا

مگر ہاں اتنا ضرور عرض کریں گے کہ "فاران" نے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کو جونکا فرور دیا ہے ـــــ ـــــ جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اس کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے، چند جینیوں کی کوشش میں ماحول ساز گار نہیں بنا کرتے ؎

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر
آرے شود و لیک بہ خونِ جگر شود

خدا ناشناس ماحول اور معصیت پروردہ تمدن نے ذہن و فکر پر جو تہیں جمادی ہیں، وہ دو چار گردوں میں نہیں چھٹ سکتیں، اس کے لئے مسلسل کاوش اور پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ صداقت کی پہلی آواز پر صدیقِ اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ جیسے حق شناس ایمان لے آتے ہیں، اور تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ بدر و خندق کے معرکے جب گرم ہو لیتے ہیں ـــ ہجرت کی بے کسی اور مظلومیت کے بعد فتح مکہ کے افق سے غلبۂ حق و صداقت کا آفتاب طلوع ہو چکتا ہے، تب کہیں جا کر دلوں کا زنگ چھٹ کر قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اُس کا کھُل کر اعلان کر دیا جائے، اب رہی حالات کی ساز گاری اور ناسازگاری سو اس کا تعلق "مشیت تکوینی" سے ہے، ہمیں اپنے فرض سے غافل نہ رہنا چاہئے! حق کو مظلوم دیکھ کر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ناکامیاب ہے، سچائی کی ناکامی اور کامیابی کا یہ پیمانہ "یزیدی" ذہنیت رکھنے والوں کا تو ہو سکتا ہے مگر "فطرتِ حسینؓ" کا یہ عقیدہ ہے:- ؎

بزمِ ترا عُود و گُل خستگیِ بوتراب
سازِ ترا زیر و بم معرکۂ کربلا

کل کیا ہونے والا ہے؟ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، مستقبل کے بارے میں یقین کے ساتھ پیش گوئی کرنا ممکن نہیں، غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، تقدیر کے نوشتے کو کوئی نہیں پڑھ سکتا، اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ "فاران" کو آگے چل کر کس قسم کے حالات سے دو چار ہونا پڑے گا، لیکن خدا کی کبریائی کے سامنے سر جھکا کر ہم یہ ضرور عرض کئے دیتے ہیں، کہ "فاران" تنگ حالی اور آسودگی دونوں حالتوں میں سچائی کی راہ سے ایک انگل بھی اِدھر اُدھر نہ ہوگا۔ اسکی "آخری ہچکی" بھی زبانِ حال سے یہی پکارے گی ؎

باطل دوئی پرست ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

ماہر القادری ـــ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

ابوالاختر - اکرم خیل

....اور سچائی بولتی رہی

> "اسلام کی حریّت اور جمہوریت آج سبق لینے کے قابل ہے، مسلمان ہمیشہ بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں"
>
> "سروجنی نائیڈو"

سب جانتے ہیں اور تاریخ کا ایک ایک ورق شاہد ہے کہ مسلمان بھارت ورش میں فاتح کی حیثیت سے آئے مگر انہوں نے بھارت کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے ساتھ جس رواداری، میل ملاپ اور بھائی چارے کا برتاؤ کیا، اُس پر انسانیت ناز کرتی ہے، وہ چاہتے تو اپنے زور اور طاقت سے ہندوستان کے سماج، مذہب اور کلچر کو یا تو مٹا دیتے یا مغلوب کر لیتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا ——— مسلمانوں کی تلواروں نے زمین کو فتح کیا مگر لوگوں کے دلوں کو پیار محبت اور ہمدردی سے جیتا۔

مسلمان فاتحین نے ہندوستانی تمدن سے رشتہ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی، اسی کوشش اتحاد اور وسیع رواداری کی بدولت ہندوستان میں امن اور شانتی کے چراغ جگمگانے لگے، مسلمان بادشاہوں میں آپس میں لڑائیاں ضرور ہوتی ہیں مگر ہندوستانی رعایا کی عزت، آبرو اور جان و مال کی ہمیشہ حفاظت کی گئی اُس پر آنچ نہ آنے دی۔

مفتوح قوم میں عام طور پر کوئی اخلاقی جرأت باقی نہیں رہتی، اُسے زندگی کے ہر شعبہ میں آسانی کے ساتھ متاثر اور مغلوب کیا جا سکتا ہے ——— مگر مسلمان فاتحین نے بھارت واسیوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ——— بلکہ ان کو ہر طرح کی سہولتیں دیں اور اُن کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا، یہ ایسے بدیہی واقعات اور روشن حقائق ہیں کہ جن کی تردید تو کیا، تاویل بھی کرنی دشوار ہے۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر یہاں کے تمدن کو نکھارا، ماحول میں ستھراپن پیدا کیا، اور فکر و نظر کو آزادی اور بلندی عطا کی ——— رانا ڈے مہاراشٹر کے بہت بڑے نیتا گزرے ہیں، مسلمانوں کے بھارت ورش میں آنے سے پہلے یہاں کی کیا حالت تھی؟ اس کی تفصیل ان کی زبانی سنئے:-

" اس زمانہ کے ہندوؤں میں عملی قابلیت کا مادہ نہ تھا، ہندوؤں میں نہ تو جمہوری خیالات کا رواج تھا اور نہ

مساواتِ انسانی کا! ہندوستانی عورتیں بےکس اور بے اختیار تھیں! یہاں کے عام لوگ میلے کچیلے رہتے تھے، پاکیزگی کا نام ونشان نہ تھا ...."

مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر کیا کیا؟ اس سلسلہ میں بنگال کے مشہور ہندو رہنما بابو بپن چندر پال ارشاد فرماتے ہیں:-

"مسلمان اس ملک میں فاتح بن کر آئے مگر برطانوی روش کے برخلاف انہوں نے ہندوستان کو بہت جلد اپنا وطن بنا لیا اور مذہب کے سوا یہاں کے باشندوں میں اور کوئی چیز مابہ الامتیاز نہ رہی، یہ مسلمانوں کی انتہائی ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ ہی تھا، جس نے ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کی زندگی اور خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ...."

مسلمانوں کے انسانیت نواز کارنامے

سروجنی نائیڈو کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اپنی قوم کی وہ سب سے بڑی خاتون رہنما تھیں، آخر میں "بلبلِ ہند" گورنری کی بلند شاخ پر چہک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں ——— سروجنی نائیڈو نے لکھا ہے اور لکھا کیا ہے، حقیقت کا اظہار کیا ہے:-

" اسلام کی حُریت و جمہوریت آج سبق لینے کے قابل ہے، اسلام نے جب ہسپانیہ میں قدم رکھا تھا تو ملکی عیسائیوں کو اُن کے دماغی مذہبی اور رُوحانی ورثہ سے محجوب نہ کیا، مفتوحین کو ہر قسم کی آزادی دی، ملک گیری اور فتح وظفر اسلام کا مقصد نہیں رہا، اس کا اصل مقصد حریت و آزادی کی اشاعت اور غلامی کا استیصال تھا ——— مسلمانوں کا مطمحِ نظر ملک و زمین فتح کرنا نہ تھا بلکہ تالیفِ قلوب تھا ——— "

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کر کے آنجہانیہ سروجنی نائیڈو نے کہا ہے:-

" مسلمان بھائیو! ہمارے وہم وخواب (فلسفہ) کو حقیقت کا جامہ تمہیں نے پہنایا اور ہمارے افکار و تخیلاتِ عالیہ میں حرکت و زندگی تمہیں نے پیدا کی، آؤ! ہم ناگوار تاریخی شکوہ و شکایت کو دلوں سے محو کر دیں، تلخیاں بھلا دیں اور اُن احسانات کو یاد کریں جو اسلام نے ہماری زبان اور لٹریچر کے ساتھ کیا ہے ——————
مسلمانوں نے اشاعتِ علوم میں کبھی ہندوؤں کی طرح بخل روا نہیں رکھا، وہ (مسلمان) ہمیشہ بنی نوعِ انسان کی تعلیم و تربیت کی فکر میں رہے ہیں ......"

پنجاب بھومی کے ایک سپوت جینی لعل جی آنند ایم۔ اے نے مسلمانوں کے برتاؤ اور حُسنِ سلوک کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی اختصار کے ساتھ سُن لیجئے:-

" عربی جرنیل قاسم نے ۷۱۲ء میں صوبہ سندھ پر حملہ کیا، تو اُس کے زمانے میں کوئی مذہبی تشدد نہیں تھا، وہ ہندوؤں کی سوشل اور مذہبی رسوم واعتقادات کی عزت کرتا تھا اور ہندوؤں کو قانون کی ایسی ہی پناہ حاصل تھی، جیسی کہ مسلمانوں کو تھی ——— ہندوؤں کے لئے تمام سرکاری دفاتر کھول دیئے گئے، برہمنوں کو مالگزاری اور کلکٹری کے کاموں پر لگا دیا گیا تھا اور محمد قاسم نے وزارت کا اعلیٰ ترین عہدہ اپنے وقت کے ایک مشہور ہندو فلاسفر کا کہ کو عطا کیا تھا، اور سندھ اس کے ماتحت ایک مذہبی آزادی کی سرزمین تھی ...."

مسلمان بادشاہوں کی بے تعصّبی

پروفیسر ایشوری پرشاد صاحب کی تحریر کا اقتباس پڑھنے اور سوچنے کے قابل ہے :-

" سلاطینِ ہند کے بعض بڑے بڑے جرنیل اور وزیر ہندو ہے ہیں ...... مسلمانوں کے عہد میں مان سنگھ جسونت سنگھ، جے سنگھ ...... عظیم الشان عہدوں پر مامور کئے گئے، مذہبی رواداری جو دور اندیشی اور فیاضی پر مبنی ہوتی ہے، شاہان مغلیہ کا طریقِ حکومت تھا ——— شہنشاہِ اورنگ زیب کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں، لیکن اس کے عہدِ حکومت میں بقول الفنسٹن ایسا کہیں نہیں ہوا کہ کسی نے ہندو مذہب کی خاطر سزائے جان و مال اور قید برداشت کی ہو یا کسی شخص سے اس کے آبائی طریقِ عبادت پر باز پُرس کی گئی ——— تاریخ بتلاتی ہے کہ اُس متعصب (؟) شہنشاہ کے سب سے بڑے جرنل جسونت سنگھ اور جے سنگھ تھے۔ شیر شاہ پٹھان تھا، ہندوؤں کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا اُسے دیکھو ——— اس کا محکہ رفاہِ عام کے لئے کافی مشہور ہے ....
اس نے بے شمار سرائیں اور مسافر خانے مُلک بھر میں بنوائے تھے، ان میں ہندوؤں کے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی نہایت بہتر تھا اور ہندوؤں کے لئے کھانے کا انتظام ہندوؤں کے ہاتھ میں اور مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، تاکہ کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگے "

مسٹر پی، سی، رائے سا تنسٹ لکھتے ہیں کہ :-

" مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے کچھ ہی واقعات و اسباب کیوں نہ ہوں، موجودہ زمانے میں وہ اس ملک کے اصلی باشندے ہیں اور مادرِ وطن کے حقیقی سپوت اسی طرح ہیں جس طرح ہندو ہیں ......
یہ صحیح نہیں کہ مسلمان ہندوستان میں آکر گھس گئے اور کچھ نہیں کیا، بلکہ علاوہ فنِ تعمیر کے ہندوستان کی تربیت و تہذیب میں اسلام کی ذہانت و ذکاوت نے بہت کچھ حصہ لیا ہے، وہ زریں لباس جو مسلمانوں نے ہندوستانی دیوی کو پہنایا اگر اُتار لیا جائے تو کیسی بدنما نظر آنے لگے گی ——— اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں، اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، اور اسلامی صوبہ افغانستان تک میں راجپوت گورنر جنرل مقرر کئے ...... "

بابو سُندر لال صاحب اپنی تصنیف " بھارت میں انگریزی راج " میں تحریر فرماتے ہیں :-

" اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اُن کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانے میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے دونوں مذہبوں کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذاہب کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری کا برتاؤ نہ ہوتا تھا، ہر مسلمان بادشاہ کی طرف سے بے شمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں، آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں ......
مسلمانوں نے اپنی زبان فارسی کو چھوڑ کر ہندوستان کی زبان اختیار کی جس کا نام " اردو " ہے "

اُردو زبان

زبان کے مسئلے نے بھی ہندوستان میں عجیب صورت اختیار کر لی ہے، اُردو کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور بعض رنگوں نے جان بوجھ کر یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ "اردو" صرف مسلمانوں کی زبان ہے، عوامی زبان کے بعد کی جگہ ایک نئی زبان بنائی جا رہی ہے ——— اس پر لالہ گوبند سہائے صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے :-

"مشکل زبان رائج کرنے کی کوشش دراصل اسی ذہنیت کی آئینہ دار ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے برہمنوں کے اندر پائی جاتی تھی، یہ ذہنیت ایک قسم کی سامراجی ذہنیت ہے جس کے ذریعہ سے ایک مخصوص طبقہ کو برسرِ کار لانا مقصود ہے .... قانون کے ذریعہ سے زبان بنانے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی، زبان صدیوں میں تشکیل پاتی ہے ...."

پنڈت سندر لال جی نے مہاتما گاندھی جی کو ایک خط لکھا تھا، جس میں پنڈت جی موصوف نے تحریر فرمایا تھا :-

"اُردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے اور نہ کبھی تھی، وہ صرف اس ملک کے رہنے والوں کی جن میں ہندو، مسلمان، عیسائی، اور جین شامل ہیں، قدرتی اور مادری زبان ہے، اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے، اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اُس پر ویسا ہی فخر ہے، جیسا کہ مسلمانوں کو ہے"

مُلک کی تعمیر امن و آشتی کی بنیادوں پر ہی ہو سکتی ہے، طوفانی اور وقتی جذبات کے نتائج اچھے نہیں نکلتے، خوف اور بے اطمینانی کی فضا کسی ملک کو کبھی راس نہیں آسکتی، پریم بھائی چارے اور میل ملاپ ہی سے ملک کی ترقی کا پودا پروان چڑھ سکتا ہے دوسروں کا بُرا چاہنے والے خود اپنے ساتھ بُرائی کرتے ہیں ——— کوئی طاقت کسی پوری قوم کو نہیں مٹا سکتی! ہم چاہتے ہیں کہ یہ مضمون چشمِ محبت سے پڑھا جائے، کیا عجب ہے کہ حالات کا دھارا اپنا رُخ بدل دے، اور اضطراب کے بادل چھٹ کر شانتی کا سورج چمکنے لگے .... ؎

کہ ہم نے انقلابِ دورِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں!

حالات کا رُخ بدلتا رہتا ہے، انقلاب زمانہ کی سرشت میں داخل ہے، چھوٹے بڑے اور طاقتور کمزور ہوتے رہتے ہیں ؎

کم کُن ز کبر و ناز کہ دیداست روزگار
چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کَے

ہر واقعہ تاریخ کے اوراق پر اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے، اسی دُنیا میں رامچندر جی جیسے مہا پرش اور راون جیسے راکشش بھی پیدا ہوتے ہیں ——— پچھلے بادشاہوں اور کشور کُشاؤں میں کچھ نیکی سے اور کچھ بُرائی سے یاد کئے جاتے ہیں، تو آج کے طاقتور اربابِ اقتدار سوچ کر فیصلہ کریں، کہ تاریخ میں وہ کس گروہ کے ساتھ رہ کر کیا مقام چاہتے ہیں؟

؎

خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند!

سلیم احمد

تنقید کے جواب میں!

> "مقالہ نگار نے دلیلوں کو صیقل کر کے ایک آئینہ بنایا ہے، جس میں "ترقی پسندی" کو اپنے خد و خال نظر آ سکتے ہیں!
> سلیم احمد نے ان بُتوں کو توڑا ہے جن سے ترقی پسندوں کے ایوان سجے ہوئے ہیں۔"

'مقصدی ادب' کی بات چھڑتے ہی ترقی پسند تنقید "دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا" —— (؟) کہتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور اپنی "عقلیت" "منطقیت" اور "سائنسی تجزیہ" کی مدد سے ثابت کرتی ہے کہ ہر زمانے کا ادب مقصدی رہا ہے (؟) اس لئے آج کا ادب بھی مقصدی ہونا چاہیئے (یہ ہونا چاہیئے بھی بہت خوب ہے) پھر وہ مقصد کا تعین "تاریخی حقائق" کی روشنی میں کرتی ہے، اور دکھاتی ہے کہ کس طرح آج ادب کے معنی "اشتراکیت کا پروپیگنڈہ" ہیں۔ ہاں بس اتنی احتیاط ضرور رکھنی چاہیئے کہ یہ پروپیگنڈہ بالکل صاف اور واضح طور پر نظر نہ آئے (کیوں؟ —— اس کا جواب ترقی پسند تنقید کی تمام "حقائق پرستی" تمام "تاریخی شعور" اور تمام "سائنسی تجزیہ" نہیں دے سکتا) اگر یہ ہو سکے تو سبحان اللہ" ورنہ پارٹی کے مقاصد کو فائدہ تو بہر صورت پہونچ ہی جاتا ہے (اور آج کے ادیب کے لئے اس سے زیادہ قابل فخر اور باعث عزت بات اور کیا ہو سکتی ہے، کہ وہ پارٹی کے کام آ رہا ہے) ———— لیکن پھر بھی چند موٹی عقل رکھنے والے بزخود غلط ادیب —— جن کو نہ تو تاریخی حقائق کا شعور ہے نہ انسانی فطرت کا، نہ ادب کی ماہیت اور حقیقت کا —— ترقی پسند تنقید پر چند موٹے موٹے (بالکل اپنی عقل کی طرح کے) اعتراضات وارد کرتے ہیں، یہ اعتراضات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ ترقی پسند تنقید دعویٰ ادبی ہونے کا کرتی ہے، لیکن وہ اپنی تمام اقدار ادب سے نہیں بلکہ ایک خارجی نظریۂ زندگی سے لیتی ہے، چنانچہ نظریہ پرستی کا شکار ہو کر' وہ اپنے میدان کو محدود کر لیتی ہے، گویا وہ پہلے سے اپنے اوپر یہ فرض عائد کر لیتی ہے کہ وہ فطرت انسانی' اور اس کے مطالبات' ادب' اس کی ماہیت، اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق جو کچھ کہے گی' اس نظریے کے اندر رہ کر' اور اس کی تائید حاصل کر کے کہے گی، یہ کورانہ تقلید اور اس تقلید سے پیدا ہونے والا تعصب اس میں قدرتاً وہ سطحیت پیدا کر دیتا ہے، جو ان تنگ نظر زاہدوں کی ذہنیت کے مشابہ ہوتی ہے، جو انسانی فطرت اور اس کے مطالبات کو صرف اپنے گھڑے ہوئے اصولوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور جو رجحان ان اصولوں پر پورا نہیں اُترتا، اس کے انسانی فطرت سے متعلق

ہونے ہی سے انکار کردیتے ہیں، "ترقی پسندی" سائنس، تاریخ، حیاتیات اور نفسیات وغیرہ علوم سے اپنے مطلب اور مقصد کے مطابق چند چیزوں کا انتخاب کرلیتی ہے اور باقی کو نہایت ڈھٹائی سے بغیر کسی دلیل کے نظرانداز کرکے، ان کے متعلق من مانے فتوے صادر کرتی ہے، اور اپنے مفید مطلب اخذ کی ہوئی باتوں کی بنیاد پر ادب کو ناپنے کے لئے ایک پیمانہ بناتی ہے، اور اس پیمانہ کی کاملیت میں اتنا غلو کرتی ہے کہ جو ادبی تجربہ اس پیمانہ میں نہیں سماتا، اس پر کُفر ساز مفتیوں کی طرح 'رجعت پرستی' کا لیبل ٹانک دیتی ہے، بلکہ بعض اوقات اپنی بساط اور اپنے مقام کو بھول کر اُسے ادب تسلیم کرنے ہی سے انکار کردیتی ہے۔

ترقی پسند تنقید اپنا آغاز "ادب برائے زندگی" کے مفروضہ سے کرتی ہے، اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی پر زور دیتی ہے، لیکن جب وہ زندگی، اور اس کی حقیقتوں کی تشریح کرتی ہے تو ان کو صرف سیاسی و معاشی عوامل میں محدود کردیتی ہے، اور اس کے لئے منطقی فریب دہی سے بھی گریز نہیں کرتی۔ وہ زندگی جیسا وسیع المفہوم لفظ استعمال کرتی ہے اور اس کو محدود معنوں میں تسلیم کرانے پر ضد کرتی ہے۔ اور اس ضد کے پورا نہ ہونے کی صورت میں رجعت پسندی کا فتوےٰ صادر کرنے کی دھمکی دیتی ہے

"ادب تفسیر و تنقید حیات ہے" — ترقی پسند تنقید کا دوسرا مفروضہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ قدیم و جدید ادب میں سے اکثر پر "فراریت" کا الزام صادر کرتی ہے، اور اُن کی تفسیر و تنقید حیات سے انکار کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنے قول میں تضاد کا شکار ہوجاتی ہے۔ مزید برآں وہ ادب کی تنقید کو صرف خارجیت کی روشنی میں دیکھتی ہے اور ادب کی اس داخلی تنقید کو نہیں سمجھ سکتی، جو ہر ادب اپنے ماحول اور اپنے عہد پر کسی خارجی نظریئے کے تحت نہیں بلکہ صرف جذبات و محسوسات کے بیان کے ذریعہ کرتا ہے۔

ترقی پسند تنقید کا مکروہ ترین عمل یہ ہے کہ وہ ہر گذر جانے والے دَور کے ادب کو "آثارِ قدیمہ" میں شامل کردیتی ہے، وہ ادبی تجربات کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھ سکتی، وہ ہر عہد اور ہر دَور میں بدل جانے والی خارجی علامات کے بدل جانے سے، ادب کی رُوح کے بدل جانے کا فتوےٰ صادر کرتی ہے، اس سے اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے نظریہ کے گھٹیا پروپیگنڈہ بازوں کو ان عظیم شخصیتوں سے عظیم تر ثابت کردے، جن کے تجربات آج اس کی نظریہ پرستی میں مدد نہیں کرتے، لیکن یہاں بھی وہ نہایت ہوشیاری سے ان عظیم شخصیتوں کے عظیم ہونے کا اعتراف کرتی ہے، لیکن صرف ان کے اپنے دَور کے لئے، اور اس طرح موجودہ زمانے میں انہیں 'آثارِ قدیمہ' کی حیثیت دے کر موجودہ زمانے کے کارآمد صحافیوں اور پروپیگنڈہ بازوں کی اہمیت کو ان سے زیادہ ثابت کرتی ہے کہ زندہ، کارآمد اور مفید چیزیں بہرحال مُردہ، بے کار اور غیر مفید چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

ان اعتراضات کے جواب میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے، ایک بات تو یہی ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات اس لئے بعد از وقت ہوگئے ہیں کہ ترقی پسند تنقید نے اپنے دَورِ جدید میں صاف صاف اعلان کردیا ہے کہ

(۱) آج ادب کا سب سے پہلا فرض اشتراکیت کا پروپیگنڈہ ہے (خطبۂ کرشن چندر)

(۲) آج اشتراکی ادب کے علاوہ جو ادب ہے وہ ادب نہیں ہے (احمد ندیم قاسمی)

اس اعلان سے وہ اعتراضات تو ختم ہوگئے کہ ترقی پسند تنقید "یہ چھپاتی ہے وہ چھپاتی ہے" "اس کا صاف اعلان نہیں کرتی" "اس کا صاف اعتراف نہیں کرتی" رہ گئے بقیہ فرسودہ اعتراضات سو ترقی پسند تنقید ان کا ایک — صرف ایک مُسکت جواب دے چکی ہے — یہی کہ یہ معترضین سرمایہ داروں کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس لئے میں ترقی پسند تنقید کے دورِ رفتہ کی باتوں کو نظر انداز کرتا ہوں، چنانچہ میں فی الحال علی سردار جعفری کے اس شاہکار کو پیش نظر رکھوں گا جو شاہراہ دہلی کے پچاس صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جس میں اس عظیم المرتبت (؟) ترقی پسند نقاد اور شاعر نے اردو ادب کو "نئی ادبی اقدار" سے روشناس کرایا ہے، اس کی اہمیت اولاً تو یہی ہے کہ اس کو ادب کے متعلق "سرکاری اعلان نامہ" کی حیثیت حاصل ہے۔ ثانیاً یہ تنقیدی شاہکار انسان کے جمالیاتی شعور سے لے کر 'معاشی ضرورت' تک ہر مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے' ان کے ارتباط کو دکھاتا ہے اور ادب کی تخلیق کے محرکات اور اس کے مقصد کا اظہار کرکے آج کی زندگی میں اس کے لئے "چند فرائض" کی تخلیق کرتا ہے، ان نکات کے علاوہ اور بہت سی سخن گسترانہ باتیں ایسی ہیں، جو گو ضمنی طور پر سامنے آتی ہیں، لیکن اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہیں غرضیکہ یہ مقالہ ترقی پسند تنقید کے دورِ جدید میں نئی منزل کا حکم رکھتا ہے۔

علی سردار جعفری کا یہ شاہکار ایک خط کی شکل میں ہے، جو انہوں نے اپنے کسی ایسے حقیقی یا فرضی دوست کے نام تحریر کیا ہے جو کسی "یونیورسٹی میں ادب کا اُستاد اور خود شاعر" ہے، لیکن اس کے نظریات "انحطاط پذیر" ہیں —— اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون تعلیم یافتہ 'باشعور' اور ادبی واقفیت رکھنے والے لوگوں کے لئے لکھا گیا ہے، لیکن اس مضمون میں اتنی خطابت ہے (اور شاید اسی خطابت کی کمزوری کو چھپانے کیلئے خط کی تیکنیک استعمال کی گئی ہے) کہ کسی علمی اور تحقیقی مضمون کے شایانِ شان نہیں، علی سردار جعفری نے تو اپنے اس مضمون میں ترقی پسند تنقید کی اس منطقیت سے بھی انحراف کیا ہے۔ جو اب ترقی پسند تنقید کی روایت بن گئی تھی، اور کم از کم ظاہری طور پر ترقی پسند تنقید میں تھوڑی بہت معروضیت پیدا کر دیتی تھی (ممکن ہے یہ بھی ترقی پسند تنقید کے دورِ جدید کی کوئی نئی ادبی قدر ہو) لیکن میں صرف ان کے پیش کردہ (صرف پیش کردہ کیوں کہ یہ ان کے اپنے سوچے ہوئے مسائل نہیں ہیں) علمی تحقیق اور نظریاتی مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس لئے میں ان کی ان خامیوں کو نظر انداز کرتا ہوں جو فنی حیثیت سے ان کے مضمون کے وزن کو کم کرتی ہیں "شاعر کا لفظ شعور سے بنا ہے، اور شعور الہامی چیز نہیں ہے، بلکہ علم کی طرح اکتسابی ہے" —— یہ درست ہے اور اس سے کسی کو انکار کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، شعور، اکتسابی چیز ہے لیکن، انسانی دماغ کا وہ اعصابی نظام جو شعور کا خزانہ ہے، اکتسابی نہیں ہے۔ یعنی انسان نے اُسے اپنی انفرادی یا اجتماعی ضرورت کے تحت اپنی جدوجہد سے حاصل نہیں کیا ہے، بہر "شاعر کا لفظ شعور سے ضرور نکلا ہے" لیکن اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر باشعور شخص شاعر یا فن کار ہو سکتا ہے —— کاش کہ سردار صاحب اس مقام پر اس جملہ کے مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیتے کیوں کہ ایک ایسی بات جسے ہر اوسط درجہ کا پڑھا لکھا شخص جانتا ہے، کا اتنی شدومد سے گویا انکشاف کرنا، آخر کچھ تو معنی رکھتا ہوگا، مگر افسوس کہ اس "سرِ مخفی" کا اس مقام پر کوئی پتہ نہیں چلتا، بجز اس کے کہ شاید سردار جعفری انسانی دماغ کو بھی اکتسابی خیال کرتے ہیں۔

"تم سے یہ کس مسخرہ نے کہہ دیا کہ ہم نظریات کو نظم کرتے رہتے ہیں، یہ گناہ تو ہم سے پہلے وہ اساتذہ کر گئے ہیں جن کی شاعری ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے، (راہ نہیں مشعلِ راہ) ہم نظریات کے پرستار نہیں، ہم تو زندگی اور حقیقت کے جویا ہیں" —— حافظ غالب اور اقبال کے کچھ اشعار پیش کرنے کے بعد —— "ایسے کتنے اشعار یا مصرعے تم ترقی پسند شاعروں کے کلام سے نکال سکتے ہو، ؟ ان شعروں کے مقابلے میں انقلاب زندہ باد، کا نعرہ بھی نظریہ نہیں کیونکہ وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ جب کہ ان شعروں کا فلسفہ مُردہ اور بے جان ہے" —— ادب میں جاندار اور بے جان فلسفہ کا فتویٰ کسی خارجی علم کے ذریعہ نہیں لگایا جاتا، بلکہ اس بنا پر کہ شاعر کی شخصیت کے لئے یہ نظریہ جاندار ہے یا بے جان —— یعنی کسی خیال، یا نظریہ کی اور فلسفہ کے متعلق ادیب

کے احساسات کیسے ہیں؟ — ہو سکتا ہے کہ غالب، حافظ اور اقبال کے فلسفوں اور نظریوں کے مقابے میں (اگر واقعی انہوں نے کوئی فلسفہ یا نظریہ پیش کیا ہے) انقلاب زندہ باد کا نعرہ ایک زندہ حقیقت ہو، لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ خود شاعر کے لئے یہ نعرہ زندہ اور جاندار ہے یا نہیں؟ اور اس کا فیصلہ ادبی تخلیق کو دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے، ادب میں 'حقیقت' کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس حقیقت کو سائنس یا کسی اور تجربات علم نے تائیدی سند دے دی ہو بلکہ یہ کہ شاعر کے نزدیک وہ بات حقیقی ہے یا نہیں؟ حافظ، غالب اور دوسرے شاعروں کا پیش کردہ نظریہ اور فلسفہ بے جان ہو سکتا ہے، لیکن ان کا وہ جذباتی تجربہ بے جان نہیں ہے، جو ان کے اشعار کی قدر و قیمت کو متعین کرتا ہے۔ چنانچہ اعتراض صرف یہ ہے ترقی پسند شاعر، جس چیز کو اپنا تجربہ، اپنی زندگی کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ ادبی حیثیت سے اتنی بے جان اور کھوکھلی ہوتی ہے کہ ادب میں بجائے زندہ حقیقت کے صرف نظریہ معلوم ہوتی ہے ——————

"اردو تنقید اور طبقاتی شعور" کے عنوان سے نیا ادب ماہ مارچ ۱۹۴۹ء میں جو مضمون شائع ہوا، اس میں اسی اعتراض کو دہرایا گیا ہے، یاد رہے کہ نیا ادب احمد عباس، کرشن چندر اور سردار جعفری کے زیر ادارت نکلتا ہے، اور مضمون کا مصنف خود ترقی پسند ہے:-

" اردو شاعری کے پچھلے دس سال کے مختصر زمانے کا انقلابی ادب کا سلسلہ ارتقا ہمارے سامنے ہے جس کے ایک سرے پر وقتی اور اشتعال انگیز نظمیں ہیں اور دوسرے سرے پر سردار جعفری کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" میرا اپنا خیال ہے کہ ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء میں سردار کے قلم سے یہ نظم نہیں نکل سکتی تھی . . . . سردار عوامی تحریک میں اپنے کو تحلیل نہیں کر سکے تھے . . . . . سردار جعفری کے علاوہ بعض دوسرے انقلابی شعرا بھی ہیں، لیکن ان کے کلام میں وہ تاثیر اور دلکشی پیدا نہیں ہوئی . . . . (کیوں کہ) یہ لوگ عوامی زندگی کو اپنے تجربے کی بنا پر نہیں بلکہ کتابیں اور رسالے پڑھ کر اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ اس لئے ان کا کلام ناقص اور نکما ہوتا ہے اکثر یہ بھی ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے کہ انقلابی ادب کو پیش کرنے والے ایسے ادیب ہیں جو انقلابی تحریک سے نئے نئے وابستہ ہوئے ہیں، وہ انقلابی پارٹی کی تجویز اور اخبار میں چھپی ہوئی رپورٹ کو موزوں کر کے نظم یا افسانے کا روپ دیدیتے ہیں —

مستعار خیالات کو قابل قبول بنانے کے لئے سیاسی اعلانات وتجاویز پر ادب کا مصنوعی رنگ چڑھانے اور انہیں اس طرح مسخ کرنے سے بہتر ہے کہ وہ اپنے حقیقی تجربات اور تاثر کو، اپنے اندیشوں اور بدگمانیوں کو، اپنی حسرتوں اور خواہشوں کو، ان خارجی حالات سے ہم آہنگ کر کے پیش کریں، جو انہیں عوامی تحریک سے قریب ہونے پر مجبور کر رہے ہیں"

نظریات نظم کرنے کا الزام اس سے زیادہ اور کیا ہے؟ اور جو لوگ ایسے انقلابی ادب، کی قدر و قیمت کو تسلیم نہیں کرتے وہ اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں؟

" شعور اور جذبہ کے درمیان کوئی دیوار چین حائل نہیں ہے، کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہوتے رہتے ہیں، دماغ کے مقابلے میں دل کا لفظ استعمال کرنا ہی جیسے تم نے اپنے خیال میں جذبات اور واردات کا مرکز قرار دیا ہے، خود تمہارے نظریے کے کھوکھلے پن کا ثبوت ہے، دل بےچارہ صرف ایک عضو ہے، جس کا کام رگوں

یہ خون وہ نہ سوچ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ نہ محسوس کر سکتا ہے، یہ سارے کام دماغ ہی کرتا ہے، ایک چھوٹا سا دل کچھوے کے سینہ میں بھی دھڑکتا ہے لیکن وہ جذبات سے عاری ہے کیوں کہ اس کی ننھی سی کھوپڑی دماغ اور شعور سے خالی ہے۔“ [۱]

شاعرانہ جھوٹ

بے شک "دل اور دماغ کی یہ تقسیم شاعرانہ اور حسین جھوٹ ہے، جسے ہم تخیل اور شاعری کا طلسم باندھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، لیکن اسے بنیاد بنا کر شعر اور فن کی کسوٹی تیار نہیں کر سکتے۔“

مگر سردار صاحب یہ تو مانتے ہی ہیں کہ "تخیل اور شاعری کا طلسم باندھنے" والا ذہنی عمل اس سے قدرے مختلف ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہم "شعر اور فن کی کسوٹی" تیار کرتے ہیں "تخیل اور شاعری کا طلسم باندھنے" والے ذہنی عمل اور فلسفہ، سائنس اور "شعر اور فن کی کسوٹی" تیار کرنے والے ذہنی عمل کو محض ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے دل اور دماغ کا الگ الگ نام دے دیا جاتا ہے ورنہ کوئی تعلیم یافتہ شخص دل اور دماغ کی تفریق کا اس طرح قائل نہیں ہوتا، جس طرح جناب سردار نے اسے سمجھا ہے دل اور دماغ کی اس مفروضہ تقسیم سے مراد صرف اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شاعری کا تعلق انسان کے جذبات و محسوسات وغیرہ "دل" کہلانے والے ذہنی عمل سے ہوتا ہے، فلسفہ، سائنس، نفسیات، حیاتیات، معاشیات اور سیاسیات کے مسائل حل کرنے والے اور ان علوم میں تحقیقی تجربے کرنے والے ذہنی عوامل سے نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی فلسفہ، تنقید، سائنس وغیرہ علوم کے مسائل کو نظم کر دے تو وہ شعر نہیں بن جائیں گے؟

"بغیر شعور اور تخیل کے کسی جذبے میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جذبہ خود شعور [۲] کی شدت سے پیدا ہوا ہے" یہ دونوں فقرے یا تو متضاد ہیں، جیسا کہ پہلے فقرے میں جذبہ، کے وجود کو بغیر شعور کے مان لیا گیا ہے، خواہ اس میں گہرائی نہ پیدا ہو سکی ہو، اور دوسرے جملہ میں جذبہ کی پیدائش کو شعور کی شدت پر مبنی ہونے کا اظہار کیا گیا ہے —

یا پھر اس کا مفہوم صرف یہ ہو سکتا ہے (اور غالباً یہی مفہوم سردار صاحب کا مقصود ہے) کہ

"شعور کی شدت کا دوسرا نام جذبہ ہے، چنانچہ "شعور جتنا رچا ہوا" اور شدید ہوگا، جذبہ بھی اتنا ہی شدید ہوگا —" لیکن کبھی کبھی جذبہ غلط بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو" یہ وہ مقام ہے جہاں بغیر سوچے سمجھے ہوئے بات کہنے کی وجہ سے آدمی مہمل گوئی کرنے لگتا ہے اور اس کا شعور نہیں کر پاتا —— شعور کی شدت کا نام جذبہ ہے، چنانچہ شعور جتنا رچا ہوا اور شدید ہوگا، جذبہ بھی اتنا ہی شدید ہوگا، لیکن جذبہ غلط بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو؟"

گویا رچا ہوا شدید شعور، غلط بھی ہو سکتا ہے؟ — یعنی چہ؟ اجتماع ضدین کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس شعور کو "رچا ہوا اور شدید" کہا جائے اسے غلط اور خام بھی ثابت کیا جائے —— اور اگلا جملہ تو اور غضب کا ہے "یہ شعور کی خامی کی علامت ہے، اور آرٹ میں شعور کی یہ خامی جذبہ کی گہرائی کے نام پر معاف نہیں کی جا سکتی" — گویا سردار صاحب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "خام شعور" بھی "گہرا جذبہ" پیدا کر سکتا ہے، حالانکہ صرف چار سطریں پیشتر وہ ارشاد فرما چکے ہوتے ہیں کہ

---

[۱] ان تمام اطلاعات کے لئے ہر تعلیم یافتہ شخص کو سردار جعفری صاحب کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

[۲] "یہ شعور کی شدت" بھی خاصے کی چیز ہے۔ واضح اور غیر واضح، ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ شعور تو سنا تھا، شدید اور غیر شدید آج ہی سننے میں آیا۔

"بغیر شعور اور تخیل کے کسی جذبہ میں گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی" ـــــ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است،
"شعور، احساس، تخیل، اور جذبات ـ کائنات کی ہر چیز کی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں، نہ تو فطرتِ انسانی کوئی
ازلی و ابدی چیز ہے اور نہ شعور، احساس، تخیل اور جذبات ہی ازلی و ابدی ہیں، ان کی تبدیلی ناگزیر ہے اگر
ان میں تبدیلی واقع نہ ہو، تو اُن کا ارتقاء رُک جائے، تغیر کا یہ عمل برابر جاری ہے، اگر یہ عمل رُک جاتا تو انسان
آج بھی غاروں میں بسنے والا درندہ ہوتا" ـــــ "شعور، احساس، تخیل اور جذبات کائنات کی ہر چیز کی طرح
تبدیل ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس سے انسان کے اس مخصوص اعصابی نظام اور دماغی ساخت کی تبدیلی کا پتہ نہیں
چلتا، جو شعور، احساس، تخیل، اور جذبات کے "ملکات" کی خالق اور ان کو قائم رکھنے والی ہے، اور اگر یہ کیمیاوی
تبدیلی واقع بھی ہو رہی ہے تو اس کا تعلق سماجی جد و جہد اور معاشرتی زندگی سے نہیں ہے وہ کچھ اور قوتیں ہیں جو اس
ارتقائی عمل کو جاری رکھتی ہیں۔ چنانچہ "شعور، احساس، تخیل اور جذبات کی تبدیلی" کا مفہوم صرف اس قدر ہے
کہ ابتدائی انسان کا غیر واضح شعور، سادہ احساس، غیر تربیت یافتہ تخیل اور اَن گھڑ جذبات امتدادِ زمانہ کے ساتھ
سماجی زندگی کے پیدا کردہ مسائل سے اثرات قبول کرتے ہوئے اور ان پر اثر انداز ہوتے ہوئے 'واضح شعور،
پیچیدہ احساس، تربیت یافتہ تخیل اور ڈھلے ڈھلائے جذبات کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں، اور اسی وضاحت،
پیچیدگی، اور تربیت یافتگی کی بنا پر غاروں میں بسنے والا درندہ آج انسان ہے، چنانچہ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ سماجی
ضرورتوں کی وجہ سے بقول "برگساں" "انسانی فطرت پر جذبات و محسوسات کا ایک خارجی چھلکا عالمِ وجود میں آیا ہے"
اور وہ بدلتا رہتا ہے مگر اس سے انسانی فطرت (جو شعور، تخیل، احساس، اور جذبات کے مجموعہ کا نام ہے) کے تبدیل
ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

انسانی فطرت کے ارتقاء کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے مقتضیات و مطالبات اور اپنی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ شعور حاصل
کرتی جاتی ہے اور ان طاقتوں کو استعمال میں لانے کے زیادہ سے زیادہ قابل ہوتی جاتی ہے "غاروں میں رہنے والا درندہ انسان"
تزکیہ شعور کی بدولت شہروں میں رہنے والا مہذب ضرور بن چکا ہے لیکن اس کے شعور کی وہ قوت، جس نے اس درندہ نما انسان
کو بھی عالمِ حیوانات سے الگ کر دیا تھا، اس میں اور آج کے انسان میں قدرِ مشترک ہے، اس قدرِ مشترک کا انکار بے بصری کی
دلیل ہے ـــــ انسان بہت کچھ بدل کر بھی وہی پُرانا انسان رہتا ہے، اور جب تک انسانی کالبد کا وہ اعصابی نظام قائم ہے اس
وقت تک انسان انسان رہے گا، نیا پُرانا نہیں ہو گا ـــــ

ایک اور بات جو ان سب باتوں سے زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ 'الفاظ' جذبات کی طرح سیال نہیں ہوتے، وہ جامد ہوتے
ہیں اور ان کی ایک محدود زمانی سطح ہوتی ہے، لیکن ادیب انہیں اس طرح استعمال کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زمانی فاصلوں
تک اشارہ کرتے ہیں، یہ فاصلے جتنے طویل ہوں ادیب کا فن اتنا ہی عظیم ہوتا ہے، ادب کی ایک صفت غیر زمانی و غیر مکانی ہونا
ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ تخلیق ہر زمانے کے لئے کچھ ایسے اشارے اپنے اندر رکھتی ہے کہ وہ کبھی پُرانی نہیں ہونے پاتی
ادیب کے اسی عمل کا نام فن ہے، چنانچہ اس فن میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی ـ ادب میں ایک مخصوص عہد کی معاشرت
کا اظہار پا کر، اس پر قدیم اور مُردہ ہونے کا حکم نہیں لگایا جاتا، ادب میں 'روحِ عصر' ایک چیز ہے، لیکن ایک اور چیز بھی ہے
جو اس سے بھی بلند ہے وہ روح جو 'ماورائے عصر' ہے۔

چوں نہ دید ند حقیقت ......؟

"اسی تبدیلی سے ہمارا جمالیاتی ذوق بنتا ہے ——" درست ہے جس طرح بچہ اپنے عالمِ طفولیت میں اپنی ذات اور اپنی فطرت کے مطالبات کا شعور نہیں رکھتا، اسی طرح ابتدائی انسان کو بھی اپنی فطرت کے مطالبات و مقتضیات کا مکمل علم نہیں تھا لیکن جیسے جیسے اس کی ذہنی عمر بڑھتی گئی اس کے مقتضیات و مطالبات بھی نمایاں ہوتے گئے، اور ان کا شعور کر کے وہ ان کی تسکین کا سامان فراہم کرتا گیا۔ اس نے اپنی سماجی ضروریات کو سمجھ کر اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا ادراک کر کے حسبِ ضرورت، معاشرتی قوانین اور سماجی قدریں تخلیق کیں۔ اور اپنی فطرت کے دوسرے رجحانات کے شعور سے اور دوسرے مشاغل اختیار کئے، جمالیاتی ذوق اس کے کسی ایسے رجحان کی ارتقائی صورت ہے، جو شروع میں بالکل غیر محسوس اور غیر نمایاں تھا، چنانچہ "بھیڑیئے کے بھٹ میں پلے ہوئے آدمی" اور بندر کے لئے "حسین سے حسین گلاب بھی رنگ و بو کا لطیف احساس نہیں بلکہ کھانے کی چیز ہے ——" اس لئے کہ "بھیڑیئے کے بھٹ میں پلا ہوا انسان اپنی حیوانی ضروریات کے علاوہ اپنی فطرت کے غیر حیوانی عناصر کا شعور نہیں رکھتا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انسانی فطرت کا وہ رجحان جو ترقی پا کر اور اپنے کو نمایاں کر کے جمالیاتی ذوق کا نام پاتا ہے۔ یعنی "حسن سے محظوظ ہونے کا ملکہ —— الہامی نہیں بلکہ اکتسابی ہے ——" بالکل غلط فہمی پر مبنی ہے غالباً سردار صاحب اس ملکہ کے "الہامی" ہونے کا انکار کر کے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ملکہ، انسان میں فطری طور پر موجود نہیں تھا بلکہ انسان نے اسے اپنی سماجی اور اجتماعی ضروریات کے تحت حاصل کیا ہے، یہ خیال غلط تو خیر ہے ہی، لیکن مضحکہ خیز بھی ہے اگر انسانی فطرت میں یہ ملکہ بنفسہٖ موجود نہ ہو، تو "بھیڑیئے کے بھٹ میں پلا ہوا انسان" اسے کسی ضرورت کی وجہ سے اپنی فطرت میں پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ خارجی محرکات، اجتماعی ضروریات، انسانی فطرت کی کسی قوت یا رجحان کو تحریک تو دے سکتی ہیں اس کی تخلیق نہیں کر سکتیں، چنانچہ یہ تو درست ہے کہ بھیڑیئے کے بھٹ میں پلے ہوئے انسان کو اس ملکہ کا شعور نہیں ہوتا لیکن اس کو انسانوں میں لے آیئے، رفتہ رفتہ اس کی فطرت اپنا شعور کرتی جائے گی، لیکن بندر کو خواہ نسل در نسل انسانوں میں رکھا جائے، وہ اس کا شعور حاصل نہیں کر سکے گا، حیاتیاتی اعتبار سے انسان اور بندر کے دماغوں میں ایک فرق ہوتا ہے، یہی فرق بندر کو انسان نہیں بننے دیتا (خواہ انسان اپنے ابتدائی دور میں بندر سے مشابہ ہو) چنانچہ بھیڑیئے کے بھٹ میں پلے ہوئے انسان کی مثال سے جمالیاتی ذوق کے ملکہ کو سماجی ضروریات کی تخلیق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کی وہ ضروریات جن کی بنیاد پر سماج قائم ہے، ایک دوسرے میں یکساں ہیں، لیکن اس سے سماج کے ہر فرد کی ذہنی طاقتوں کی یکسانی پر استدلال کرنا حماقت ہے، جمالیاتی ذوق، ذہنی لحاظ سے ترقی یافتہ افراد کے ذہنی اعمال کا نتیجہ ہے، اس کی تخلیق اجتماعی ضروریات نے نہیں کی، اور نہ ہر شخص اس میں حصہ دار ہے "پھول کو کھانے کی چیز سمجھنا" "بھیڑیئے کے بھٹ میں پلے" ہوئے غیر ترقی یافتہ انسان کا فعل ہے۔ ترقی یافتہ انسان کے لئے "وہ" رنگ و بو کا لطیف احساس پیدا کرتا ہے" بھیڑیئے کے بھٹ میں پلے ہوئے انسان سے ذہنی مشابہت رکھنے والے "سماجی انسان" کے لئے بھی پھول میں وہ بات نہیں ہے جو ذہنی لحاظ سے ترقی یافتہ فرد کے لئے ہے۔

کبھی تو دکھ لے اٹھا کر چمن کلیجہ میں اور
کبھی تو نکہتِ گل سے بھی عشق تھرّائے

فراق کے نازک اور لطیف احساس کا اظہار ہے، اس کو "جنوبی امریکہ کی شورے اور نمک کی کانوں کے اندر" کام کرنے

والے مزدور کے احساسات سے کوئی نسبت نہیں۔ چنانچہ ہر حسین چیز کے مجموعہ مفاد سے وابستہ نظر آنے کا فسانہ مولا یا در ہوا ہے۔

"پھول سے انسان نے بیج حاصل کئے ہیں اور بیج سے غذا" — سردار صاحب کا یہ انکشاف ایسا ہے کہ اس پر انہیں "اسٹالن پرائز" ملنا چاہیئے، گلاب، موتیا، بیلا، چنبیلی، جوہی اور اسی قماش کے تمام پھولوں کے بیجوں سے انسان غذا حاصل کرتا ہے؟ — شاید تاریخ انسانی کا کوئی صفحہ بتا سکے کہ کبھی انسان گیہوں، چنے اور جوار کے بیجوں سے روٹی بنانے سے پہلے گلاب وغیرہ کے بیجوں سے غذا حاصل کرتا تھا!

"قوس قزح میں کمان کا لوچ ہے اور کمان کی ایجاد انسان کے تہذیبی، تمدنی اور سماجی ارتقاء میں بہت اہمیت رکھتی ہے" — کمان کی ایجاد انسان کے تہذیبی، تمدنی اور سماجی ارتقا میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور قوس قزح میں کمان کا لوچ بھی ہے، لیکن کمان کا زمانہ ختم ہو چکا اور یہ ایٹم بم کا دور ہے، لیکن ایٹم بم، بندوق اور توپ کی ان کی بھی انسان کی سماجی زندگی کے ارتقا میں بہت اہمیت ہے۔ انسان کے جمالیاتی ذوق کو تسکین نہیں دیتی، علاوہ ازیں آج کے انسان کیلئے کمان قطعی غیر دلچسپ چیز ہے، لیکن وہ قوس قزح اور اس کے لوچ اور خم سے آج اتنا محظوظ ہوتا ہے کہ غیر ترقی یافتہ انسان اس احساس کی لطافت کا اندازہ تک نہیں کر سکتا۔

جمالیاتی ذوق انسان نے بالکل اسی طرح حاصل کیا ہے، جس طرح اس نے اپنا دماغ اور اپنے ہاتھ حاصل کئے ہیں"[1] قطعی درست — جمالیاتی ذوق کا ملکہ انسان کی فطرت میں اسی طرح ودیعت ہے، جس طرح اُسے دماغ اور ہاتھ پاؤں ملے ہیں، انسان نے اپنا دماغ، اور اپنے ہاتھ پاؤں، سماجی جدوجہد اور معاشرتی زندگی سے حاصل نہیں کئے ہیں، بلکہ یہ اُسے مادہ کے اس ارتقائی عمل کے نتیجہ کے طور پہ ملے ہیں، جو عالم جمادات سے نباتات اور عالم نباتات سے عالم حیوانات میں متبدل ہوتا رہتا ہے — سماجی اقدار، اس کے قوانین، معاشی و معاشرتی مسائل انسان کی اپنی تخلیق ہیں، لیکن انسان کے ہاتھ پاؤں، دل، دماغ اور منہ، ناک اس کے جسمانی و ذہنی مطالبات اور ان کی ضروریات اس کی اپنی تخلیق نہیں ہیں۔ چنانچہ جمالیاتی ذوق کا ملکہ، شعور کی قوت، احساسات کا خزانہ اس کا اپنا پیدا کردہ نہیں ہے البتہ ان کو نمایاں کرنا، سنوارنا، اور نکھارنا، ان کا اظہار کرنا، اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کرنا، اس کے اپنے کام ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام انسان کی سماجی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں اور آج تک کی ارتقائی منازل تک پہنچے ہیں لیکن ان کے سماجی زندگی کے 'اندر' پیدا ہونے سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ سماجی زندگی اور اس کی ضروریات، ان کے ملکات، کی خالق ہیں، ان کی خالق کچھ اور قوتیں ہیں، ان قوتوں کے متعلق کوئی حکم نہ لگایا جاسکے تو بھی اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ ان کا تعلق اس جدوجہد سے نہیں ہے جو "چین کے میدانوں سے لے کر جنوبی امریکہ کے شورے اور ٹنگ کی کانوں کے اندر تک" جاری ہے اس جدوجہد کا نتیجہ سماجی انقلاب ہے، معاشی نظام کی تبدیلی ہے، لیکن انسانی نظر کی قوتوں کی تخلیق نہیں ہے۔

آرٹ اور ادب اور سائنس انسان اور اس کی جدوجہد سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے، اور الگ ہو کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتے" — لیکن "انسان کے انسان بننے کی جدوجہد" صرف معاشی اور سیاسی میدانوں میں نہیں ہو رہی ہے

---

[1] اس حقیقت کا اعتراف سردار صاحب شاید غیر شعوری طور پہ کر گئے ہیں۔

انسان اس جدوجہد میں اپنے آپ سے بھی جنگ کر رہا ہے اور ادب کا تعلق اس جنگ سے تو ہو سکتا ہے (بلکہ ہے ہی) لیکن اس جنگ سے نہیں ہے جو معاشی اور سیاسی میدانوں میں ہو رہی ہے کیوں کہ ادب معاشی اور سیاسی محرکات کی پیداوار نہیں ہے

"انسان کا شعور، احساس، اور جذبات اس جدوجہد (طبقاتی کشمکش) کے ساتھ وابستہ ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جدوجہد انسان کے شعور کو متاثر کرتی ہے اور اس سے متاثر بھی ہوتی ہے" ــــ یہ درست بھی ہو تو بھی اس سے ادب پر روشنی نہیں پڑتی۔ ادب کا تعلق احساسات وجذبات سے ضرور ہے، لیکن نہ تو صرف احساس وجذبات کی موجودگی سے کوئی فن کار بن سکتا ہے، نہ کوئی فن کار صرف احساسات وجذبات کے بل بوتے پر ادب کی تخلیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے احساسات وجذبات آدمی کو انقلابی، اشتراکی اور سیاسی آدمی تو بنا سکتے ہیں، ادیب نہیں بنا سکتے نہ ان احساسات وجذبات کے سہارے کسی گہری معنویت رکھنے والے ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ اصل سوال مارکسی یا غیر مارکسی نقطۂ نظر کو نظم کرنے کا نہ ہو، وہ سرمایہ داری کے مظالم سے بغاوت اور محنت کش طبقہ کی عملی اور جذباتی ہمدردی کے جذبات ہی سہی، لیکن ان کی بنیاد پر سستے، رقت خیز، عبرت انگیز یا باغیانہ ادب کی تخلیق تو ہو سکتی ہے، لیکن اس ادب میں کسی معنویت کا تلاش کرنا برساتی ندی نالوں میں موتیوں والی سیپی کی جستجو کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے ادب سے تو صرف مزدوروں کے سلسلے میں تالیاں پٹوائی جا سکتی ہیں۔

"سرمایہ داری زوال پذیر ہے ــــ اور وہ قوت جسے سرمایہ داری نے جنم دیا ہے آج جوان ہو چکی ہے اور آدھی دنیا پر قابض ہے، وہ ایک نئے فلسفہ، نئی سائنس، نئی تہذیب، نئے تمدن، نئے سماج اور نئے انسان کی خالق ہے" ــــ نیا فلسفہ، نیا ادب، نیا تمدن، نیا سماج تو خیر ایک بات ہوتی یہ "نئی سائنس" اور "نیا انسان" کیا چیز ہے؟ خطابت کا چسکا نقاد کو کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔ نئے نئے کی تکرار کے ساتھ نئی سائنس اور نیا انسان نری خطابت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سردار صاحب کو کوئی بتائے کہ سائنس کے تجربات "مزدور تحریک" کی فتوحات سے متاثر نہیں ہوتے، ان کو نیا یا پرانا بنانے والے وہ اپنے آپ ہوتے ہیں ــــ سائنس کے کسی تجربے کو جو چیز نیا یا پرانا بنائے گی وہ خود اس تجربہ کی نوعیت اور حقیقت ہوگی نہ کہ وہ "انقلابی قوت" جس کا نام مزدور تحریک یا اشتراکیت ہے" ــــ

> "آج کا ماحول کل کے ماحول اور زندگی سے مختلف ہے، ہمارے جذبات، میر اور غالب کے جذبات سے مختلف ہیں ہمارا شعور مختلف ہے، اور ہمارے محسوسات مختلف ہیں، ..... تم اگر کبھی غور کرو گے، تو تمہیں میر اور اقبال کے جذبات میں بہت فرق ملے گا، کبھی یہ بھی سوچا کہ فانی اور میر میں کیا فرق ہے؟ اس سے تمہیں ان کے "ادبی مقام" کے تعین میں مدد ملے گی" ــــ

میر، غالب، اقبال اور فانی کے جذبات کا اختلاف تسلیم، اس ان کے "ادبی مقام" کے تعین میں مدد ملنا بھی درست، لیکن اس سے ثابت کرنا کیا مقصود ہے؟ غالباً یہی کہ ماحول اور سماج کی تبدیلی نے ان کے جذبات میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، اگر ان کے مقصود کا یہ تعین درست ہے تو سردار صاحب کو چاہئے کہ وہ بھی میر اور سودا، غالب اور ذوق اور اقبال کے جذبات کے فرق پر کبھی فرصت میں غور کریں، جتنا فرق میر اور فانی کے محسوسات وجذبات میں ہے، اس سے کہیں زیادہ نمایاں اور قابل محسوس فرق میر اور سودا کے جذبات ومحسوسات میں ہے، "تاریخی حرکت" اور "سماجی جنبش" انسانی جذبات کے اختلاف کی ایک وجہ تو ہے، لیکن واحد وجہ نہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر یکساں (اور سرکاری) جذبات کے اظہار کا مطالبہ نہیں

کیا جا سکتا۔

خود ستائی "آج کے بیدار انسان ..... پھانسی کے پھندے میں اپنی گردن ڈال کر مسکراتے ہیں اور جدوجہد کے رُک جانے پر آنسو بہاتے ہیں" —— لیکن یہ آج کے بیدار انسان کی خصوصیت نہیں ہے یہ کام ہر زمانے کے بیدار انسان نے انجام دیا ہے۔ اس کی روایات ابراہیمؑ اور آتشِ نمرود کی روایت سے بھی زیادہ پُرانی ہیں، چنانچہ ان سے نئے انسان کی پیدائش پہ استدلال نہیں ہو سکتا۔

"ہمارا انقلابی ہیرو آنسو نہیں بہاتا، ماتم نہیں کرتا، فریاد نہیں کرتا، رحم و کرم کی درخواست نہیں کرتا، اس کو اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر اعتماد ہے اور نئے انسان کی فتح پر کامل یقین ہے" —— لیکن یہ اشتراکی مجاہدوں یا اشتراکی ادب اور شاعری کے ہیروز کی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ جذبات صرف اعتماد اور یقین کی پیداوار ہیں اور اعتماد اور یقین صرف اشتراکیت سے وابستہ نہیں ہے۔ اس اعتماد اور یقین کو دیکھنا چاہو اور اس کے پیدا کردہ جذبات پر نظر ڈالنا چاہو تو عرب شاعروں کے رجز سے لے کر خوشحال خاں خٹک تک کی شاعری پر ایک نظر ڈال جاؤ۔ مایاکوفسکی کے قصیدہ کے ہیروز کی "آتشیں زبانوں" سے "انقلاب زندہ باد" کا نکلنا، ان کے اعتماد اور یقین کے استحکام پر دلالت کرتا ہے، اشتراکیت کی عظمت پر نہیں، کیونکہ ایسا اعتماد اور یقین اور ایسے ہیرو "نازیت" بھی پیدا کر سکتی ہے، جنہوں نے مرتے وقت بھی "ہٹلر زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر انہیں کوئی ایسا انسانی عظمت کا پرستار ادیب نہ مل سکا، جو ان کے اس آخری فقرہ کو ادب کے ذریعہ دوام دیدیتا۔ ادب تو وہ چیز ہے جس نے ابلیس سے لے کر "فاؤسٹ" تک کو زندہ جاوید بنا دیا، لیکن آج کے ادیب میں اتنی بے تعصبی بلکہ جرأت نہیں ہے کہ سیاسی اور نظریاتی اختلاف کی حدود کو پھلانگ کر صرف محض انسانی فطرت کی عظمت اور پستی سے آنکھیں چار کر سکے۔ چنانچہ ادب کی اس ٹریجیڈی کو کہیں مکمل طور پر دیکھنا چاہو تو وہ جدید روس کے ادب میں نظر آئے گی، جس کا ہر مزدور ہیرو اور انسان کمزوریوں سے پاک اور معیاری انسانیت کا حامل ہے! سیاسی مقاصد اور جنگی مصلحتوں کا خیال ادیب میں کتنا خوف، کتنی جھجک اور کتنی مصلحت پرستی پیدا کر دیتا ہے۔

"شعوری طور سے وہ (آرٹسٹ) حقیقت کے بہت سے رنگوں سے اپنی شخصیت کے ذریعہ صرف چند رنگوں کو منتخب کر کے پیش کرتا ہے، اور یہ انتخاب وہ اپنے مقصد کے تحت کرتا ہے، جس کا تعین سماجی ضرورتیں کرتی ہیں"

آرٹسٹ کا بہت سے رنگوں میں سے اپنی شخصیت کے ذریعہ چند رنگوں کو منتخب کر کے پیش کرنا، بالکل درست ہے، لیکن یہ انتخاب صرف سماجی ضرورتوں کے تعین کردہ مقصد کے تحت نہیں ہوتا، عام انسان کے شعور اور فن کار کے شعور میں یہی تو فرق ہے کہ جس چیز کو عام انسان کا شعور کہا جاتا ہے وہ در اصل زندگی اور کائنات کے حقائق میں چند اُن باتوں کا شعور ہوتا ہے جن کا تعلق براہِ راست سماجی ضرورتوں سے ہوتا ہے —— سماجی ضرورتوں نے جن اقدار کی تخلیق کی ہے، انہوں نے خود انسان پر معاشرتی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک غلاف چڑھا دیا ہے، عام آدمی اس غلاف کو اصل سمجھتا ہے کیونکہ اُسے صرف سماجی ضرورتوں سے واسطہ پڑتا ہے، لیکن بقول برگساں فطرت کبھی کبھی ایسے انسان کو پیدا کر دیتی ہے جو ان غلافوں اور پردوں کو ہٹا کر فطرتِ انسانی میں جھانک کر دیکھتا ہے، اس کا شعور عام انسان کے شعور کی طرح صرف سماجی ضرورتوں میں محدود نہیں ہوتا —— یہ انسان آرٹسٹ ہوتا ہے —— سردار جعفری نے یہ بات کتنے پتہ کی کہی ہے "حقیقت کے مختلف رنگوں کے مختلف امتزاج سے حقیقت کو نئی شکلیں دی جا سکتی ہیں یہ کام فن کار کا تخیل کرتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنے تجربات، تاثرات، اور یادوں کی مختلف تصویروں کو تراش کے

ے - Heroes -

پتھروں کی طرح پینٹ دیتا ہے اور پھر نئی ترتیب سے ایک نئی، انوکھی، حسین تصویر بناتا ہے، اس طرح وہ حقیقت کا نیا طلسم باندھ کر انسانوں کے جذبات پر جادو کر دیتا ہے۔"

"آرٹ کا خام مواد زندگی اور کائنات کے حقائق ہیں ــــ اچھا آرٹ وہ ہے جس میں شعور کی گہرائی جذبات کی شدت اور تخیل کی بلندی ہو، وہ شعور جو سماج کے حقائق کا صحیح ادراک نہ کر سکتا ہو، سچے جذبات پیدا نہیں کر سکتا، اور اس لئے وہ بڑا آرٹ پیدا کرے گا" ــــ لیکن زندگی اور کائنات کے حقائق کیا ہیں؟ کیا ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ پھر ہمیں ان کا شعور کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اور ان حقائق سے ہمارے جذبات کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ کیا زمان و مکان میں کوئی ایسا آلہ (مقیاس الجذبات) موجود ہے جو ہمیں اس بات کا علم دے سکے کہ یہ حقائق انسان پر یکساں اثر ڈالتے ہیں! ــــ اور اس شعور کی گہرائی کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ ایک طرف تو آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت میں ظاہر ہوتی ہے دوسری طرف غالب کی شاعری میں نمودکرتی ہے۔ ادب میں ہم شعور کی گہرائی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ یہی سوال جذبات کی شدت کے متعلق ہے۔ میر کا ایک شعر ہے ؎

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

اور آپ کا انقلابی شاعر کہتا ہے ؎

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

ان دونوں شعروں میں جن کا لہجہ، انداز اور آہنگ بہت زیادہ مختلف بلکہ متضاد ہیں، ہم کس شعر کو جذباتی شدت کا حامل کہیں گے ــــ سماجی حقائق کے متعلق بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم ان کا صحیح ادراک کس طرح کر سکتے ہیں؟ اور صحیح ادراک اور غیر صحیح ادراک کی کسوٹی کس چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ ــــ اس سے بڑا سوال یہ ہے کہ سماجی ضرورتوں اور اجتماعی زندگی کے اثرات فن کار یا آدمی پر کیا کیا پڑتے ہیں؟ اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ زندگی اور کائنات کے حقائق میں سماجی حقائق کی جگہ کتنی ہے؟ - اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ ــــ یہ سوالات میں نے اس لئے اٹھائے ہیں کہ سردار جعفری نے اپنی تنقید کو تجزیاتی اور تحقیقی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، اور وہ مارکسیت کو حق مان کر نہیں چلے ہیں، بلکہ تجزیہ اور تحقیق سے انہوں نے مارکسیت کو حق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ یوں تو ان سوالات کے سرکاری جوابات تو دیئے ہی جا سکتے ہیں ــــ وہی جنہیں "آزاد تفکر" کی ہوا نہ لگی ہو۔

جنگی مصلحتیں اور ادب

سردار صاحب غالباً یہ تو مانتے ہی ہوں گے (یہ بات میں اُن کی حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں) کہ سماجی ضرورتوں اور اجتماعی تقاضوں کے اثرات ہر فرد پر یکساں نہیں ہوتے، اور غالباً وہ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ فرد کے لئے اجتماعی پابندیاں عموماً ناخوشگوار ہی ہوتی ہیں (ثبوت کے لئے دیکھئے دُنیا بھر کا ادب، اور انقلاب سے پہلے کا روسی ادب) ــــ اور اکثر و بیشتر وہ فرد کو شکست سے بھی دوچار کرتی ہیں، جس کا لازمی نتیجہ حسرت، یاس، اور مایوسی ہوتا ہے (فی الحال یہ سوال چھوڑ دیجئے کہ 'مرتا نہ تو کیا کرتا' کے مصداق جینے کی خواہش سے مجبور ہو کر، فرد اپنے کو سماجی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے) اور اگر یہ حقیقت ہے، تو طبقاتی جنگ سے ذرا الگ ہو کر، فرد اور جماعت کی اس کشمکش کے متعلق تو سوچئے، جس نے میر کے غم اور فانی کی قنوطیت کی تخلیق کی ہے ــــ فرد اور جماعت کی یہ کش مکش کب سے نہیں ہے اور کب نہیں رہے گی ــــ یہ اور بات ہے کہ آپ سیاسی رہنما کی حیثیت سے فرد کو یہ تلقین کریں کہ وہ طبقاتی جنگ کے درمیان محض ضرورتاً اور مصلحتاً اپنے انفرادی جذبات و خواہشات کو

نظرانداز کردے، اور اس فیصلہ کُن جنگ میں مُجاہد کی طرح حصہ لے، اور یہ تلقین آدمی کو انقلابی اور مجاہد بھی بنا سکتی ہے، اور انقلابی اور مجاہدانہ جذبات تھوڑی دیر کے لئے (جنگ کے اختتام تک ہی سہی) آدمی کو اپنے انفرادی معاملات کو نظرانداز کر دینے کے قابل بھی بنا سکتے ہیں، گو اس میں بھی اس کے اندر مجاہدانہ جذبات اور اس کے دوسرے جذبات کے اندر تصادم برپا رہے گا۔
اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک تو یہ کہ بیسویں صدی کی زندگی میں (بلکہ چالیسویں صدی میں بھی) میرؔ کے غم اور فانیؔ کی قنوطیت کا پورا مواد اور سامان موجود ہے۔ اور یہ انسان کی سماجی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی ادیب سماجی زندگی کی اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے تو جنگی مصلحتوں کے باوجود، اس کے شعور کو غلط اور اس کے جذبات کو غیر حقیقی اور بناوٹی جذبات نہیں کہا جا سکتا خواہ یہ کہا جائے کہ اس نے ایک مصلحت کو نظرانداز کر دیا ہے، لیکن جنگی مصلحتوں کا عام سماجی زندگی سے کوئی گہرا رشتہ نہیں ہوتا جنگی مصلحتیں، بہت وقتی، عارضی اور بعض اوقات عام انسان کے لئے بہت جبری ہوتی ہیں اور ادب کی تخلیق جبر سے نہیں ہو سکتی نہ تلقین سے ہو سکتی ہے، جیسا کہ خود سردارؔ صاحب فرماتے ہیں "کوئی شاعر اس وقت تک ان جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتا، جب تک یہ جذبات خود اس کے اپنے سینہ میں موجزن نہ ہوں اس لئے ضروری ہے کہ یہ اجتماعی جذبہ شاعر کا انفرادی جذبہ بن جائے"۔ اس لئے جنگی مصلحتوں کے پیش نظر جو ادب پیدا ہوتا ہے وہ بس 'مصلحتی ادب' ہی ہوتا ہے، چنانچہ ان جنگی مصلحتوں کو ادب کے لئے بُنیادی مسئلہ نہیں بن جانا چاہیے، ترقی پسند تنقید سماجی حقائق میں سے، سب سے بڑی حقیقت طبقاتی جنگ کو بتاتی ہے، اور اس جنگ کی مصلحتوں کے پیش نظر ادیب سے اپنے انفرادی معاملات کو نظرانداز کر دینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسے کسی حد تک درست بھی مانا جا سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ ان مصلحتوں کو 'ادبی اصولوں' کا نام دیتی ہے۔ علی سردار جعفری نے اُردو ادب کو جو نئی ادبی اقدار دینے کی کوشش کی ہے، اس کی بُنیاد اسی مصلحت پر ہے کہ طبقاتی جنگ میں انفرادی دُکھ سکھ کے اظہار کا موقعہ نہیں۔ چنانچہ مایا کوفسکی کہتا ہے " ایسی ویسی چیزوں کے متعلق میں پھر کبھی لکھوں گا — یہ وقت عشق محبت کا نہیں ہے "— " یہ وقت ایسی ویسی باتوں کا نہیں ہے "— بس اسی جملے کو تمام ترقی پسند نظریات ادب کی بُنیاد سمجھئے پیرس کی امن کانفرنس میں 'ایلیا اہرن برگ' نے تقریر کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ

> " ایک ادیب کی حیثیت سے میرا جی چاہتا ہے کہ ادب کے متعلق باتیں کروں الفاظ کے حُسن اور سحر کا تذکرہ کروں شاعروں اور فن کاروں کے گُن گاؤں، لیکن میں آج ایک اور موضوع پر بات چیت کروں گا۔ میں اس خطرے کے متعلق بولوں گا جو سیاہ بادلوں کی طرح دُنیا پر چھا رہا ہے .... جب سمندر کی طوفانی لہریں بند توڑ کر شہر کی طرف آنے کے قریب ہوتی ہیں، نیند کے ماتے بھی چونک کر اُٹھ بیٹھتے ہیں اور خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں ...... جب آگ کے شعلے کسی آبادی کی طرف لپک رہے ہوں تو لوگ تذبذب کے عالم میں تماشا نہیں دیکھتے، بلکہ شعلے بُجھانے کے لئے بے ساختہ ٹوٹ پڑتے ہیں " —

اور ایلیا آہرن برگ کی اس بات کی حدود ٹی، ایس، ایلیٹ کی " ادیب اور شہری " تقسیم سے جا ملتی ہیں —
مگر یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ شعلہ بُجھانے کے دَور میں جو ادب وجود میں آئے گا، اس میں سنجیدگی کم اور گھبراہٹ اور بد حواسی زیادہ ہو گی ⁂

عاصی کرنالی

مکان

حکومتوں کا انقلاب کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا، اس کی لپیٹ میں آکر بڑی بڑی تباہیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ــــــــ مگر یہ "انقلاب" جس کا ہمیں سامنا کرنا پڑا اس کے بارے میں بوتم میرٹھی کی رائے کتنی جچی تلی ہے ؏

یہ انقلاب کا باوا ہے انقلاب نہیں

اس زمانے میں (اس زمانے سے میری مراد وہ زمانہ ہے جو اگست ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے) بعض دفعہ انسان کو سب کچھ مل جاتا ہے۔ بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ فقیر شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھر جاتا ہے اور اسے ایک پیسہ نصیب نہیں ہوتا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ "ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج" کے مصداق لوگوں کو بڑی بڑی دولتیں ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ انقلاب میں اکثر یہی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسے موقعوں پر خدا چھپر پھاڑ کر خوب دیتا ہے اور بعض دفعہ تو لوگ خود ہی چھپر پھاڑ لیتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ "گر" سے واقف ہوتے ہیں اور ہمارے خیال میں انہیں "یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک" والا شعر بخوبی یاد ہوتا ہے ایک ہم جیسے توکل پسند ہیں کہ بقول غالب

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

گوشۂ قناعت میں بیٹھے غیب کے منتظر رہتے ہیں اور ایک ہمارے وہ دوست ہیں کہ "کوہِ بداماں" ہو کر بھی یہی کہتے رہتے ہیں "یہ تو سمٹ کے گوشۂ داماں میں رہ گئے!"

ہاں تو ہم اس زمانے کے سٹینڈرڈ کے مطابق سیکنڈ کلاس قسم کے آدمی ہیں، اسی لئے ایسے سنہری انقلاب میں بھی جب جھونپڑے محلوں میں، بیاباں گلستانوں میں، اور ویرانے جنتوں میں تبدیل ہو گئے۔ اُسی اندازِ کہن پر قائم ہیں، نہ ساون ہرے، نہ بھادوں سوکھے۔ کبھی کبھی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں تو بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے "ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں!" ورنہ عام حالات میں وضعداری کا یہ عالم ہے:-

ساقی بزمِ رعنا، مجھے ساغر نہ دے، نہ دے
پیاسا بھی ہے غرورِ سکندر لئے ہوئے

آج کل جس تازہ غم نے ہمیں اپنا دولت کدہ سمجھ لیا ہے وہ ہے مکان کا غم! جو مکان حُسنِ اتفاق سے ہمیں عطا ہوا ہے وہ اپنے رنگ میں کبھی دہنِ معشوق ہے کبھی کمرِ محبوب۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ تشبیہات ناقص ہیں۔ ان سے صرف مکان کی تنگی اور عدمِ گنجائش کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن مکان کی جس تازہ خصوصیت کو میں آشکارا کرنا چاہتا ہوں، ایک ایسی خصوصیت جس نے مکان کو لامکاں بنا دیا ہے، وہ ان تشبیہات سے واضح نہیں ہو سکتی۔ مجھے یہاں پر مکان کو ایک ایسا محبوب خیال کرنا پڑے گا، جس کے سبزۂ خط کا آغاز ہو چکا ہے اور کاکلِ سرکش کا قائل نہ ہوتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ رعنائیِ جوانی کی بہار

ختم ہوگئی اور حسنِ یار اس مقام پر پہنچ گیا جہاں اس سے بلند تعریف نہیں ہو سکتی کہ ؎

دندانِ تو جملہ در دہانند ؛ چشمانِ تو زیرِ ابروانند

جب ہم نے دیکھا کہ مکان زیادہ دنوں "طولِ عمرہٗ" نہیں رہ سکتا، تو ہم نے کسی نئے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

جس وقت ہم بسم اللہ کر کے نئے مکان کے ارادے سے اُٹھے ہم اپنے ارادے کا حسرتناک انجام جانتے تھے۔ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں، کہ اس زمانے میں جب بھینس صرف لاٹھی والے ہی کی ہو سکتی ہے ہم جیسے مشین سے بنے ہوئے آدمی کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن پھر بھی ہم چل ہی کھڑے ہوئے، گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی!

اس نازک وقت میں لوگوں کی نفسیات کو جانچنے کا بڑا موقع ملا۔ وہ لوگ جو ہمدردی کا بلند بانگ دعویٰ کرتے ہیں، ایسے ہی وقت سچے جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ شہری زندگی میں ہر قسم کے آدمی سے سابقہ پڑتا ہے، اور پھر اگر کسی میں کوئی جوہر ہو تو حلقۂ تعارف زیادہ وسیع ہوتا ہے، ہم بھی خیر سے اپنی شاعری کی بدولت شہر والوں کی جانی پہچانی آسامی تھے، اب ہم اپنا دردِ دل لے کر کسی مسیحا کی تلاش میں چلے۔

ایک صاحب ملے۔ یہ ایک دولتمند گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، مجھ پر جان چھڑکتے ہیں، کہتے ہیں تم سا دوست نہ ملا ہے، نہ ملے گا، ایک بہت بڑا گھر دبائے بیٹھے ہیں۔ ہم نے کہا "نصیر صاحب! گھر کی حالت مخدوش ہے۔ بس یہ عالم ہے کہ یا صبح نہیں یا شام نہیں۔ کچھ انتظام کرو نا یار!" ہنس کر فرماتے ہیں "عاشق میاں بات نہیں بنی۔ ہم ایسی خبروں کو صرف کمان کا تیر سمجھتے ہیں وہ جگر کے پار ہو تو مزا ہے" میں سب کچھ سمجھ گیا۔ کہ یہ حضرت میرے مکان کے لئے دعائے خیر فرما رہے ہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا "نصیر صاحب! کاش، آپ اس خبر کو تیرِ نیمکش ہی سمجھ لیتے!"

ایک صاحب کے گھر پہنچا۔ مجھے ان کے خلوص پر بڑا اعتماد رہا ہے۔ اثر و رسوخ کے آدمی ہیں۔ خود نہیں تو کسی سے کہہ سن کر کام کرا دیں گے۔ "دیکھئے سعید میاں! ایسا ایسا معاملہ ہے۔ آپ کو میرا ہاتھ بٹانا پڑے گا" — "عاشق صاحب! مکان بالکل نہیں ملتا۔ کوشش فضول ہے" — "ہاتھ پاؤں ماریئے" — "اجی میں نے جو کہہ دیا فضول ہے بالکل فضول!" —
"اچھا اجازت" میں نے کہا۔

"بیٹھو نا بھئی! دیکھو ریڈیو سے کیا عمدہ غزل ہو رہی ہے" — "غزل!" معاً مجھے اپنی بوڑھی والدہ کا خیال آ گیا جو اُس خطرناک مکان میں بیٹھی مرا انتظار کر رہی ہوگی — "نہیں مجھے چلنا ہے" — "بھائی ایمان سے بڑی مزیدار غزل ہے' ....."
اور میں گھر آ پڑا' — والدہ نے میرے چہرے کی مایوس شکن سے واقعات کا اندازہ کر لیا —

اگلے روز پھر گھر سے بلا ارادہ نکل پڑا۔ چلتے چلتے ایک خیال آیا۔ خوش فہمی نے دل بڑھایا۔ امید نے سبز باغ دکھائے اور تیز تیز قدموں سے حبیب الرحمٰن کے یہاں پہنچ گیا۔ یہ دوسرے احباب سے مختلف تھے۔ ان کا اخلاق نہایت بلند تھا۔ ان کا کردار نہایت قابلِ تعریف تھا۔ ان کا مزاج نہایت نرم تھا۔ ان کی تربیت نہایت ملائم تھی! — میں نے کہا "حبیب بھائی! مکان بوسیدہ ہو چکا ہے بارش نے اس کی جڑیں ہلا دی ہیں۔ دروازے گرنے کو ہیں، دیواریں بیٹھنے کو ہیں، اگر کوئی نیکی بدی ہو گئی تو کیا ہوگا۔ دنیا میں ایک والدہ کا دم ہے اگر وہ بھی ...."

میرے مخلص دوست حبیب نے کہا "عاشق صاحب! خدا کا شکر ہے۔ ہمیں اتفاق سے بڑا شاندار مکان ہاتھ لگا ہے۔ دیکھئے نا! کتنا وسیع ہے، کتنا مضبوط ہے کتنا پختہ ہے" — میرا دماغ چکرا گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے دنیا تاریک ہوگئی میں

وہ سُن رہا تھا، جس کی مجھے ضرورت نہ تھی، میری ضرورت تھی ایک مکان، اور حبیب صاحب نے اس کے لئے کوئی مشورہ نہ دیا۔

اس کے بعد ایک اور جواب سُننے میں آیا جس نے میری کمر توڑ دی، میرے قدموں کو کاٹ دیا اور میرے حوصلے کو کچل ڈالا، ایک مقامی دوست ملے، میں نے اُن سے کہا "بھائی ہندوؤں کے مکان ملنے مشکل ہیں، تم یہاں کے باشندے ہو کسی مسلمان کا مکان کرایہ پر دلادو"

وہ کہنے لگے "ایک بہترین ترکیب سمجھ میں آئی ہے" —— میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا؟" —— "آپ ہمارے مکان میں آجائیں اور ہم اپنا سامان گلی میں ڈال لیں گے" —— میں گھر آیا۔ احساس کی شدّت تیز ہو چلی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں جی بھر کر رویا۔ اور روتا ہی چلا گیا۔ جب تک ایک شفیق ماں نے اپنا مامتا بھرا ہاتھ میرے سر پر نہ رکھ دیا۔ واقعی یہ نحیف اور بوڑھی ماں اس نازک وقت میں میرا بہت بڑا سہارا تھی، ایسے نازک وقت میں جب زمانے سے کسی ہمدردی کی امید نہ رہی تھی ——

ایک شام کی بات کہ ایک شگفتہ مصرع ذہن میں آیا "خوشی تو مل نہ سکی میں نے غم خرید لیا" اور پھر فوراً ہی مطلع بن گیا

مآلِ عشرتِ اہلِ حرم خرید لیا   خوشی تو مل نہ سکی میں نے غم خرید لیا

ہم نے سوچا، چلو دو چار گھڑی کی تفریح کا سامان ہو گیا۔ نظم کہیں گے اور اس قدر ڈوب کر کہیں گے کہ ہر غمِ دوراں سے کنارہ کش ہو جائیں گے اور اس مکان والی مصیبت سے بھی کچھ وقت کے لئے نجات مل جائے گی۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ دو چار دن سے بارشیں ہو رہی ہیں خنک خنک ہوائیں طبیعت کو اور رواں کر دیں گی۔ اور کام کے شعر نکلیں گے —— ہم کمرے کے کواڑ بند کر کے تکیے پر جم کر بیٹھ گئے۔ ملازم کو تاکید کر دی۔ کہ کوئی آئے اور ہر چند کہے کہ ہے۔ لیکن تم "نہیں ہے" کا وظیفہ یاد کر لو۔ اور اگر وہ "ہمہ شاد آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم" لکھنے کے لئے کاغذ قلم مانگے تو فوراً مہیا کر دو۔ ایسے سُنہری موقعوں پر اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوستوں کی درآمد خوب ہوتی ہے شعر لکھتے لکھتے جب ذرا محویت کم ہوتی، دروازے پر سوٹی پتلی، ہلکی بھاری، بے سُری، غرض کسی نہ کسی قسم کی آواز ضرور سنائی دیتی مجھے آوازیں پہچاننے کی مشق ہو گئی ہے۔ جس آواز میں "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" کا سا ہنگامہ ہوتا ہے وہ امجد صاحب کی آواز ہوتی ہے جو رضاکاروں کے سالار ہیں اور جو اپنی ارشاد کی ہوئی نظموں کو بقول اپنے مجھ سے اصلاح کرانے اور بقول میرے کُشتی لڑوانے آتے ہیں —— جس آواز میں بانسری سے نقارے تک تقریباً تمام سُروں کا خلاصہ پایا جاتا ہے۔ میں سمجھ لیتا ہوں یہ نظیر میاں ہیں جو فنِ افسانہ نگاری میں "ہرکس بخیالِ خویش" کی حد تک ماہر ہیں۔ اور یہ اپنے نئے شاہکار سے مجھے نوازنے آئے ہیں ——

بلّی جیسی نازک اور سُریلی آواز اختر صاحب کی۔ کوّے جیسی صبر آزما آواز اسلم صاحب کی۔ اور اونٹ جیسی خنجر آزما آواز محمود صاحب کی ہوتی ہے۔ یہ سب شاعر ہیں —— اور یہ بلّی اور کوّے اور اونٹ کی آوازیں مل کر ایک اور نئی آواز کی تخلیق کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسے ادبی دوست ہیں جو اپنا قیمتی وقت زیادہ تر میرے غریب خانے پر گزارتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مجھے ان کی صحبت سے کافی استفادہ ہوا ہے —— یہ عجیب و غریب آوازیں کانوں میں آتی رہیں۔ لیکن ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر شعر کہتے رہے، آخر ایک مصرع پر طبیعت ایسی اُلجھی کہ گھنٹہ بھر ہو گیا، شعر نہ ہو سکا۔ مصرع تھا "گئے وہ بیتیں کئے اور کرم خرید لیا" یوں تو کئی مصرعے لگائے۔ مثلاً "خدائے پاک کو تاجر سمجھ لیا ہم نے۔" یا "بڑی عجیب ہیں خوش فہمیاں زمانے کی،" لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ آخر اسی کش مکش میں آنکھ لگ گئی، مگر لطف ملاحظہ ہو، خواب میں بھی یہی نظر آیا کہ غزل کہہ رہے ہیں، اور یہی مصرع زیرِ غور ہے۔ پھر ایک دم کیا دیکھتے ہیں کہ مشاعرہ ہو رہا ہے، اور ایک صاحب حاضر فیروزپوری غزل ارشاد کر رہے ہیں سکرٹری نے کہا، ان کے بعد آپ کا نمبر ہے، میں اس وقت بھی مشقِ سخن میں مصروف تھا۔ آخر خدا نے فضل کیا اور

مصرعِ اولیٰ سوجھ گیا ۔ ع

خدا سے بھی ہے تجارت کا سلسلہ قائم

میں خوشی سے اچھل پڑا ، اب ہماری باری آچکی تھی ، ہم نے بھی تازہ کلام ہدیۂ سامعین کیا ۔ جب اس شعر پر پہنچے ،

خدا سے بھی ہے تجارت کا سلسلہ قائم
گناہ پیش کئے اور کرم خرید لیا !

تو مشاعرے میں ایک قیامت برپا ہوگئی ۔ واہ وا ۔ سبحان اللہ ، اے حضرت شعر نہیں قیامت ہے ، ہائے قربان ، جزاک اللہ ایک صاحب میرے قریب کو آئے اور اس زور کے ساتھ " آہا ہا ہا خوب " کہا کہ میں ایک دم چونک گیا ، لیکن آنکھ کھلنے پر معلوم ہوا کہ ہم جس آواز کو آہا ہا ہا خوب سمجھے تھے ، وہ اُس دیوار کی آواز تھی جو " اڑا ڑا ڑا دھم " کر کے ابھی گر چکی ہے ——

رات عجب وحشت میں کٹی ، صبح ہوتے ہی اپنے محکمہ کے افسر کے پاس گیا ، بلکہ ان کی بارگاہ میں حاضر ہوا ، اور عرض کی " سرکار ایسا ماجرا ہے ، بلکہ مکان مرحوم ہونا شروع ہوگیا ہے ، کچھ کیجئے " ۔ ہمدردی سے فرمایا " پوری کوشش کروں گا ، اور ہاں دیکھو آج شام انصاری صاحب کو ایک ٹی پارٹی دینی ہے ، ان کا تبادلہ ہوگیا ہے ، ایک نظم اس موقعہ پر ضرور ہونی چاہئے " —— بہت اچھا جناب ! لیکن مکان کا ضرور خیال رکھئے " —— " ہاں ہاں ضرور ! " —— شام کو انہیں نظم پہنچادی ۔ خوب پسند کی ۔ میں نے کہا " کچھ بندوبست ہوا " —— ہاں ہاں ہوجائے گا ، میں آج ذرا مصروف ہوں "

شام کو ایک دیوار اور گری ، میری حالت عجیب سے عجیب تر ہوتی چلی گئی ۔ کیا کروں ۔ کیا نہ کروں ' نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن ، اسی عالم میں تھا کہ ملازم آیا " میاں دو آدمی کھڑے ہیں ، کہتے ہیں ضرور ملنا ہے " ——

" کہتے ہیں ضروری ملنا ہے " میں نے یہ لفظ دہراتے ۔ ہوسکتا ہے انہوں نے کوئی مکان دیکھا ہو ، آخر ہر ایک تو سنگدل نہیں ہوتا ۔ میں بھاگم بھاگ نیچے پہنچا ، یہ حبیب صاحب تھے ، وہی جن کا مکان شاندار تھا ۔ اور ایک اور کوئی ان کا دوست ۔ میں نے نہایت بے تابانہ لہجے میں پوچھا " کہئے حبیب صاحب کیسے آئے ؟ " —— " بھئی عاصی ! سینما کا ارادہ ہوا ہے " بازار " بڑی عمدہ فلم ہے ، یعقوب نے اداکاری میں کمال کیا ہے ۔ چلو چلیں ! " —— " جاؤ جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے ! " —— اور میں نے کواڑ بند کردیئے ——

اگلے روز ایک رشتہ دار آئے ۔ " بھیا تمہیں مکان کی ضرورت ہے ؟ " —— " ہاں بھائی صاحب ! " میں نے تیزی سے کہا —— " خوب ! میرا مکان حاضر ہے ۔ میں کراچی جارہا ہوں " —— جزاک اللہ بھائی صاحب ! آپ آدمی نہیں فرشتہ ہیں ۔ آپ نے مجھے بچالیا ۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ، خدا آپ کو کراچی سے واپس نہ لائے ! " —— " کیا ! " وہ ایک دم چونکے ۔ یعنی ...... میرا مطلب یہ ہے کہ وہیں آپ کا کاروبار جم جائے ، تو پھر مکان کی کنجی عطا فرمایئے ! " —— وہ میرے قریب کو سرک آئے " بھائی یہ مکان تمہیں زیادہ مہنگا نہیں پڑے گا ۔ اور پھر ضرورت کے موقعہ پر انسان مجبور ہوجاتا ہے ، کیا سستا کیا مہنگا " —— اور پھر انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا " بس سو روپے دلادیجئے ! " —— " سو روپے ۔ سو روپے ! اور بھائی میں تو آپ کا رشتہ دار ہوں " !

" دیکھو میں چار بجے تک انتظار کروں گا ۔ تم نہ آئے تو کسی اور کو دے ڈالونگا ، مجھے تمہارا خیال ہے تم رشتہ دار ہو "
—— مجھے تمہارا خیال ہے تم رشتہ دار ہو " یہ لفظ میرے دماغ میں گونجے اور گونجتے رہے ۔

میں اماں کے پاس گیا۔ "بھائی رضا علی مکان دیتے ہیں۔ لیکن سو روپے ..... سو روپے مانگتے ہیں!"
"بیٹا یہ لو میری بالیاں۔ ہمارے گھر کا آخری زیور۔ جاؤ انہیں فروخت کر آؤ"
اور مجھے مکان مل گیا،

اور ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگوں کو مکان ملنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوتی تھی، اُس وقت مکان والے لامکان بننے کی تمنا کرتے تھے۔ فانی نے بھرے گھر کے ماحول سے گھبرا کر ہی تو کہا تھا:۔

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب
درو دیوار دیئے اب انہیں ویرانی دے

"زمان ومکان" کا فلسفہ بہت دنوں سے موضوع بحث بنا ہوا ہے مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد "زمان" تو نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، اب صرف "مکان" ہی دل و دماغ پر قبضہ جمائے ہوئے ہے ــــــــ کبھی کے دِن بڑے، کبھی کی راتیں! ع زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے ــــ بے خانماں آدمی کیا کرے، کدھر جائے ... ہاں! "خانہ بدوشی" اس دُکھ کا علاج ہوسکتی ہے لیکن لاکھوں آدمی اپنے گھر دل کو اپنے کاندھوں پر لئے لئے پھریں گے، تو ہر گلی کوچہ چلتی پھرتی لبستی بن جائیگا، عاصی صاحب نے نہ جانے کس کس کی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے، یہ مضمون نگار بھی بڑی ٹھنڈی مار مارتے ہیں ــــــ کسی کو نصیحت اور کسی کے لئے عبرت! اور بے غیرت کے واسطے صرف "ایک افسانہ!" (م)

جذب و سوز

میکش اکبرآبادی

جستجو ترکِ سکوں ہے کیا سکوں کی جستجو
کیا سکوں کیا جستجو، ہے یہ بھی تو اور وہ بھی تو

ہے دلِ دیوانہ بیتابی کا خوگر ورنہ یاں
ہے تو ہی پردے کے اندر اور تو ہی روبرو

ایک آفت آرزو خود اک مصیبت آپ دِل
ایک محشر خود ہے تو ــــ پھر دل میں تیری آرزو

تو کہاں ہے اے دلِ ویراں کے مقصودِ جمیل
دَیر تیری آرزو ہے کعبہ تیری جستجو

ہے رُخِ جبریل فق اس سے دلِ ابلیس شق
تو نے دیکھی ہی نہیں ہے عشق کی اللہ ہو

یہ غبار آلودہ سر ہے ان کے پائے ناز پر
دیکھ لی اے نخوتِ دُنیا ہماری آبرو

وصل و فرقت پھر خدا جانے بہم ہوں یا نہ ہوں
کر بھی لوں اِک نالۂ آخر تمہارے روبرو

رگ و نشتر

عاصی کرنالی

نظر میں ذوقِ نظر نہیں ہے، جگر میں سوزِ جگر نہیں ہے
اور اُس پہ شاعر یہ کہہ رہے ہو تری زباں میں اثر نہیں ہے

نفاقِ ملت کو آگ سمجھو، یہاں سے دامن بچا کے گزرو
اس آگ کو تم ہوا نہ دینا، یہ فتنہ کچھ مختصر نہیں ہے

ہم اپنی جدّت سے آسماں کو ہزار حدِّ نظر بنالیں
بلند تر ہوں اگر نگاہیں تو کوئی حدِّ نظر نہیں ہے

عجب عجب! اپنے چاکِ داماں کو تم مرے پاس لا رہے ہو
خرد کی تنظیم کرنے والو! مرا جنوں بخیہ گر نہیں ہے

تمام افراد پر برابر ہے حفظِ ملت کی ذمہ داری
اُنہیں یہ کشتی نہ سونپ دینا جنہیں کچھ اپنی خبر نہیں ہے

یہ عشرتِ یک نفس کہاں تک، خیالِ فردا بھی کیجئے گا!
ہزار پھولوں میں ایک کانٹا بھی آپ کی سیج پر نہیں ہے

نہیں نہیں! آپ اپنی مجبوریوں کو خود دے رہے ہیں دعوت
میں اُس کا انجام جانتا ہوں جو ہاتھ تلوار پر نہیں ہے

تمہارے ہر چاکِ جیب و دامن سے اِک تکلف سا ہے نمایاں
اگر مری رائے پوچھتے ہو، ابھی جنوں معتبر نہیں ہے

کمالِ آدم کے راستے میں بڑے بڑے مرحلے ہیں عاصی
ہر آنکھ کو تم صدف نہ سمجھو، ہر ایک آنسو گہر نہیں ہے

نظر سہروردی

دو آتشہ

خوشی گئی تو گئی غم ملا تو کیا ہوگا
جو غم کا بھی نہ رہا آسرا تو کیا ہوگا

یہ صبر و ضبط کی کوشش ارے معاذ اللہ
زبانِ حال نے کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا

نگاہِ ناز سے ہلچل ہے بزمِ ہستی میں
نگاہِ شوق کا طوفاں اٹھا تو کیا ہوگا

تمہاری راہ میں کیوں پاؤں تھامتی ہے زمیں
کہیں جو بیٹھ کے اٹھنا پڑا تو کیا ہوگا

یہ دردِ عشق کہاں اور کہاں غمِ دنیا
میں اس بلندیٔ غم سے گرا تو کیا ہوگا

جبیں کا فرض کہیں بارِ سر نہ ہو جائے
حرم میں دیر میں سجدہ ادا تو کیا ہوگا

دل کی تڑپ کے ساتھ مری آنکھ تر بھی ہے
یہ وہ حدیثِ درد ہے جو معتبر بھی ہے

غم ہے تو غم کے بعد مسرت بھی ہے ضرور
شب ہے تو شب کے بعد نمودِ سحر بھی ہے

اے طالبانِ دید تقاضا بجا، مگر
شائستہ مذاقِ تماشا نظر بھی ہے

لازم ہے احترام کہ راہِ طلب ہے یہ
پیروں سے چلنے والے ترے پاس سر بھی ہے

بڑھتی ہوئی سی تیرگیِ شامِ غم کے ساتھ
دھندلی سی اک شعاعِ امیدِ سحر بھی ہے

اربابِ فن نظرؔ کو نوازیں تو شکر یہ
اہلِ ہنر کی صف میں یہ اک بے ہنر بھی ہے

کیا گزری؟

وحشی رحمانی (بی-اے)

نہ پوچھیے کہ مری چشمِ نم پہ کیا گزری ؟
تمام رات ستاروں کے دم پہ کیا گزری

رہِ طلب میں خبر کیا کہ ہم پہ کیا گزری ؟
کہاں اُٹھے تھے قدم ہر قدم پہ کیا گزری

تباہیاں بھی ہوئیں اور اس طرح سے ہوئیں
کہ ہم بھی کہہ نہیں سکتے کہ ہم پہ کیا گزری

سر اپنا رکھ دیا پائے صنم پہ وحشی نے
خبر نہیں دلِ اہلِ حرم پہ کیا گزری

زمیں پہ کچھ بھی نہیں، آسماں میں کچھ بھی نہیں
مکیں کا حُسن ہے سب کچھ مکاں میں کچھ بھی نہیں

ہزار رنگ کے عالم ہیں خاکِ صحرا میں
مگر گلوں کے سوا گلستاں میں کچھ بھی نہیں

تلاشِ گوہرِ مقصود ہے یہاں بے سود
کہ خار و خس کے سوا خاکداں میں کچھ بھی نہیں

ہے کہ نہیں؟

قابل اجمیری

دوزخ کی کہانی بھی سہی، جنت کے فسانے بھی برحق
لیکن کوئی واعظ سے پوچھے دُنیا بھی حقیقت ہے کہ نہیں

ہنگامِ سحر ہے ہر غنچۂ شبنم سے نکھرتا جاتا ہے
میں سوچ رہا ہوں آنکھوں میں اشکوں کی ضرورت ہے کہ نہیں

ساقی بھی ہے ابر و جام بھی ہیں اے ناصحِ مشفق تو ہی بتا
حالات کی رَو میں بہہ جانا انسان کی فطرت ہے کہ نہیں

ساغر چھوا بھی ہو تو مرے ہاتھ ٹوٹ جائیں
ناصح! میں کیا کروں وہ نظر سے پلا گئے

تراب یار جنگ سعید

ع اب وہ سکون ہے کہ طبیعت پہ بار ہے

مہر عثمانی (جوناگڑھی)

تجلّیات

ہر نفس محوِ خیالِ رُخِ جانانہ ہے
اب مرے سامنے کعبہ ہے نہ بت خانہ ہے
دل کا انداز جو ہر لحظہ حریفانہ ہے
یہ بھی اک شعبدۂ نرگسِ مستانہ ہے

ہے وہ روحِ رواں محبت کی
وہ جو اک شے تری نگاہ میں ہے

ہر شاخِ گل ہے میرے تصور کا آشیاں
بجلی نے خار و خس کو جلایا تو کیا ہوا

فقط تری نگہِ التفات کی خاطر
قبول کی ہے زمانہ کی بے رُخی میں نے

خیالِ ترکِ تمنّا سے پیار کرتا ہوں
یہ کفر ہے جسے میں اختیار کرتا ہوں

محبت باوجودِ ضبط پنہاں رہ نہیں سکتی
جگر کی چوٹ آنکھوں سے نمایاں ہو کے رہتی ہے

شبِ وعدہ اِدھر دل ہر صدا پہ چونک اٹھتا ہے
اُدھر تاروں کی محفل ہے کہ برہم ہوتی جاتی ہے

خموشی دیکھنے والوں سے شاید کچھ نہیں کہتی
مری رودادِ غم حسنِ سماعت پر گراں کیوں ہو

رُباعیاں

رعنا اکبرآبادی

دنیا سے ہنسی خوشی گزرنا اچھا
دمِ اُلفتِ احباب کا بھرنا اچھا
احباب کے جھرمٹ میں اور احباب کیساتھ
جینے کی تو کیا بات ہے مرنا اچھا

ذلت ہے کوئی اس میں نہ خواری میری
میری فطرت ہے وضعداری میری
تقسیمِ عمل پہ ہے نظامِ عالم
اور دل کا غرور، خاکساری میری

جذبات

مضطر اکبر آبادی

کچھ لطف و توجہ ہی پہ موقوف نہیں ہے
ظالم ترا اندازِ تغافل بھی حسیں ہے

اے بے خبرِ عشق ذرا دل سے خبردار
دل زیرِ نگیں ہے تو جہاں زیرِ نگیں ہے

ٹھکرانے سے پہلے یہ بتا دیجیے سرکار
ٹھکرائے ہوئے دل کا ٹھکانا بھی کہیں ہے

دُور اتنا کہ دُوری کا تصور نہیں ممکن
پاس اتنا کہ میری رگِ جاں سے بھی قریں ہے

نکھری ہوئی کلیوں پہ تو مائل ہے زمانہ
بکھرے ہوئے پھولوں کا مگر کوئی نہیں ہے

میں آپ کی خاطر کئے لیتا ہوں گوارا
ورنہ مجھے مطلوب نہ دنیا ہے نہ دیں ہے!

سیف ٹونکی

کسی کی مانتے کب ہیں کسی کے دیوانے
بہت خجل ہوئی عقل آگئی تھی سمجھانے

جنونِ عشق کا عالم کہاں تک لائیں گے
کریں گے ہوش میں کیا آکے تیرے دیوانے

عشق کی انتہا نہیں کوئی
جو جہاں کامیاب ہو جائے

بزم کی بزم محو تھی کس کو یہ امتیاز تھا
کون گرا نگاہ سے کون رہا نگاہ میں

قاری سرفراز حسین عزمی

تھم تھم کے کہہ رہی ہیں دمِ نزع ہچکیاں
کس کس کو بھولتا ہے ذرا یاد تو کرو!

ناطق لکھنوی

یہ وہ سبب ہوئے اے دل! تری تباہی کے
کہ اس نے وعدہ کیا تو نے اعتبار کیا

جواد قادری

مجھے زہر ہے ہجرِ ساقی میں پینا
یہ رکھا ہے ساغر یہ رکھا ہے مینا

صدق جائسی

اُن کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول
اور میں کم بخت لطفِ خاص کے قابل نہیں

ایک سورج ——— تین اُفق

(۱)

افسوں بھوپالی

خوشی ہوئی بھی تو دل کی خوشی نہ کی میں نے
چمن کے ساتھ لُٹا دی بہار بھی میں نے

بہشت ہی سہی میں جس طرف سے لوٹ آیا
پھر اُس طرف کبھی مُڑ کر نظر نہ کی میں نے

میں حُسن و عشق کی غارت گری سے واقف ہوں
اُنہیں خداؤں میں کی ہے پیمبری میں نے

تعلقاتِ دلی کاش! ختم کر سکتا
مٹا دیا تھا جہاں ربطِ ظاہری میں نے

کہاں تھا اے دلِ بیزار! آ گلے لگ جا
ترے زمانہ میں کی ہے سکندری میں نے

———

کوئی اُن کے جلوے کا نام تک نہیں لیتا
تہمتیں محبت کی سب مری نگاہوں پر

(۲)

رزمی جے پوری

جنون و حُسن دونوں ہم سفر ہیں ایک منزل میں
جو پردے میں تڑپتی ہیں وہی ہیں بجلیاں دل میں

یہاں دل ساتھ دیتا ہے نہ آنکھیں کام آتی ہیں
مجھے اے راہبر چھوڑا یہ کس دشوار منزل میں

وہی اک بات ہے تقدیرِ کشتی میں نہ تھا ساحل
نہ تھی کشتی بھی اپنی اے رزمیؔ تقدیرِ ساحل میں

(۳)

شفقت کاظمی

بنائے دوستی غیروں سے اس کافر نے ڈالی ہے
مرے ذوقِ وفا کوشی کا اب اللہ والی ہے

نہ جا اپنے یقینِ دلپسندی پر نہ جا ظالم
مزاجِ عشق بھی تیری طرح سے لااُبالی ہے

عبث ہیں حُسن کی دنیا سے دلجوئی کی اُمیدیں
یہ وہ دُنیا ہے جو رسمِ وفاداری سے خالی ہے

عجب کچھ لطف تھا ان کے خرامِ ناز پرور میں
دلِ مجبور کو مٹ کر بھی ذوقِ پائمالی ہے

نہیں پہنچا تو اُس بے مہر کے در تک نہیں پہنچا
مرے پائے طلب نے یوں تو دُنیا چھان ڈالی ہے

گرے جاتے ہیں شفقتؔ ہم زمانے کی نگاہوں سے
کمالِ شاعری بھی اک طرح کی بے کمالی ہے

"دریا بہ حباب اندر"

حباب ترمذی

دلِ گرفتہ نگہِ یار ہوئی جاتی ہے　　زندگی اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہے
اپنے جلووں کے حدود اور بڑھا دے کوئی　　مطلق حسرتِ دیدار ہوئی جاتی ہے
تو نہیں ساتھ تو اے جانِ چمن، روحِ چمن　　نکہتِ گل خلشِ خار ہوئی جاتی ہے
مرحبا! جذبۂ بیباک و خوشا کارِ جنوں　　متبسم نگہِ یار ہوئی جاتی ہے
جب سے ہیں فکر و خرد مائلِ شرح و تفصیل　　آگہی افتنۂ بیدار ہوئی جاتی ہے

حرمِ عشق میں اب وہ مری ہستی ہے حباب
خاکِ ساحل جسے منجدھار ہوئی جاتی ہے!

جذبۂ شوق

شوق کمنڈوی

اور دل کیا چاہتا ہے اس نگاہِ ناز سے　　یہ بھی کیا کم ہے کہ جینے کا سہارا ہو گیا

نظر نظر پہ ہے قید و بندش کلام کرتے تو کیسے کرتے　　پیام دیتے تو کس کو دیتے سلام کرتے تو کیسے کرتے
فضائے دیر و حرم سے دل کو نہیں ہے کد پہ یہ واقعہ ہے
جنوں کی فطرت نہیں ٹھہرنا قیام کرتے تو کیسے کرتے

اور یہ مصرعہ بھی ــــ ع
جھپکی تھی دل کی آنکھ کہ دُنیا بدل گئی

یارب بخانہ آمد و جامِ شراب نیست
در حیرتم کہ صبح دمید آفتاب نیست

(ایک ہندو شاعر)

آدم لکھنوی

تیرے بغیر

ہر جگہ ہر وقت گویا اک کمی تیرے بغیر
کیا ہوئی جاتی ہے میری زندگی تیرے بغیر

موت کا غم ہے نہ جینے کی خوشی تیرے بغیر
زندگی ہے احتجاجِ زندگی تیرے بغیر

آہ نکلی ہونٹ کانپے اشک آنکھوں میں بھر آئے
مسکرانے کی اگر کوشش بھی کی تیرے بغیر

لے بہ حسن و نزاکت اے مجسم رنگ و بو
دل گرفتہ ہے چمن میں ہر کلی تیرے بغیر

تیرے دم سے جس کی جنت آفرینی پر تھا ناز
اب جہنم ہے وہی دنیا مری تیرے بغیر

دیکھتے ہی دیکھتے فطرت میں آیا انقلاب
اک نمایاں تیرگی ہے روشنی تیرے بغیر

اب وہاں میں ہوں جہاں یہ بھی سمجھ سکتا نہیں
کس طرح آتی ہے دنیا میں ہنسی تیرے بغیر

سامنے تو ہو تو ہے پُر لطف دنیا بھر کا درد
خاک ہے سارے زمانہ کی خوشی تیرے بغیر

ہے امانت دارِ خاموشی مرے منہ میں زباں
ہائے رے خود اختیاری بے بسی تیرے بغیر

عشق ہے تکمیلِ حسن اور حسن سے تکمیلِ عشق
اک کمی میرے بغیر اور اک کمی تیرے بغیر

سر ہو سجدہ میں تو دل میں کون ہو تیرے سوا
اے معاذ اللہ تیری بندگی تیرے بغیر

ایک تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں کھو گیا
رات آدم نے اس طرح اک آہ کی تیرے بغیر

محسوساتِ ماہر

شاخیں جھک جھک کے کریں جب گل و ریحاں کو سلام
میری جانب سے بھی یارانِ گلستاں کو سلام

کاروانِ دلِ بے تاب ہے منزل کے قریب
اب ہمیشہ کے لئے عمرِ گریزاں کو سلام

وحشتِ عشق پہ ہنستے ہوئے چہروں کی قسم
صبح کرتی ہے مرے چاکِ گریباں کو سلام

کوچۂ عشق کے ہر خاک بسر کو سجدہ!
منزلِ شوق کے ہر بے سروساماں کو سلام

اب مجھے خود ہی بدلنی ہے زمانہ کی فضا
آخری بار مرا گردشِ دوراں کو سلام

لالہ و گل مرا مقصود ہیں لیکن ماہر
پھر بھی کانٹوں میں اُلجھتے ہوئے داماں کو سلام

اس طرح وہ خیال میں آئے
شاخ لچکی اُچٹ گئے سائے

چاکِ دل، پہلے ہولئے غنچے
جب کہیں جا کے پھول کھلائے

کچھ غموں نے بھی فتنہ سازی کی
کچھ خوشی نے بھی جال پھیلائے

وہ کہ دنیا بھی دین بھی اُن کا
ہم کہ دونوں طرف کے ٹھکرائے

تتلیاں چوم کر ہٹی بھی نہ تھیں
ورقِ گل پہ نقش اُبھر آئے٭

ہر نفس اک نئی قیامت ہے
ہم تو اس زندگی سے بھر پائے

میری آنکھوں کی خونفشانی پر
اُن لبوں نے بھی پھول برسائے

رخصتِ دوست، کیا کہوں ماہر
پھر وہ منظر خدا نہ دکھلائے

ماہر القادری

٭ دامنِ گل پہ نقش اُبھر آئے۔

ماہر القادری

واپسی

ماتادین کے باپ کلکٹری کچہری میں اہلمد تھے، ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ تھی جو اُس سستے زمانہ میں آج کے تین سو روپیہ کے برابر تھی، پھر اوپر سے بھی اچھی خاصی یافت ہو جاتی، انگریز کے زمانہ میں سب کام قانون قاعدے سے ہوتے تھے، یہاں تک کہ رشوت بھی وضعداری اور ضابطگی کے ساتھ لی جاتی تھی ——— کچہریوں میں دستِ غیب کو لوگ "حق" کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں، جو کوئی قسمت کا مارا اہلِ معاملہ اس "حق" کو نہیں دے سکتا اُسے حق سے ناحق ہونا پڑتا ہے ——— روپیہ میں بڑی کرامت ہے، انصاف سے لے کر عصمت تک ہر چیز روپیہ سے مول لی جا سکتی ہے۔

ماتادین کے باپ کشوری مہاراج خوش باش لوگوں میں تھے، گھر میں رسوئی بنانے کے لئے نوکرانی اور سودا سلف لانے کے واسطے دو روپیہ اور کھانے کپڑے پر ایک چھوکرا بھی ملازم تھا، یہ لڑکا کشوری مہاراج کی گائے کی بھی ٹہل کرتا ——— چارہ کھلانا، پانی پلانا، سانی کرنا اور دودھ دوہنا، یہ سب کام اُسی ننھی سی جان سے متعلق تھے! کشوری مہاراج کی گائے کو نہ صرف گھر والے بلکہ محلہ اور پاس پڑوس کے لوگ بھی "سُندری" کہہ کر پکارتے تھے، بڑے بڑے گیانیوں، ودوانوں اور دھرماتماؤں کا یہ کہنا تھا کہ کسی نیک منش کی آتما نے دوسرے جنم میں گائے کا روپ دھار لیا ہے ——— یہ گائے کسی کسان کے کھیت میں چلی جاتی، تو وہ اُسے دوسرے جانوروں کی طرح نہ دھتکارتا، آہستگی اور نرمی کے ساتھ کھیت سے اس کو باہر کر دیتا اور کوئی کوئی کسان تو اُس گئو کے کھیت میں آنے سے خوش ہو جاتا، کہ اس "سُندری" کے چرنوں کی برکت سے خوب غلّہ پیدا ہوگا ——— ایک تو گئو ماتا یوں ہی مقدس ہے اور جب اُس میں کسی دھرماتما اور مہاپُرش کی رُوح حلول کر جائے تو پھر اُس کی تقدیس اور پوترتا کا کیا پوچھنا؟ ——— آواگون کی جے!

کشوری مہاراج بڑے ملنسار اور ہنس مکھ تھے، ہر کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، ان کی ملنساری بناوٹی اور دکھاوے کی نہ تھی، ان میں لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا، اپنی حیثیت اور بساط کے موافق ضرورتمندوں کی وہ امداد بھی کرتے، اس برتاؤ کی بدولت کشوری مہاراج لوگوں میں ہر دلعزیز ہو گئے، ہر کوئی ان کا ادب لحاظ کرتا اور اُن کی بات مانتا۔

سرکاری نوکری اٹھاؤ چولھے کی طرح ہے، اسے ایک جگہ ٹھہراؤ نہیں، آئے دن بدلی ہوتی ہی رہتی ہے، ایک جگہ خوب دلجمعی کے ساتھ کام ہو رہا ہے، اتنے میں ایکا ایکی سرکاری سرکلر آیا کہ تمہیں فلاں مقام پر بدل دیا گیا، جلد سے جلد وہاں جا کر چارج لے لو، حکمِ حاکم مرگِ مفاجات! جانا پڑتا ہے۔ نہ جائیں اور نخرے کریں تو نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھیں ———
کشوری مہاراج کو بھی کسی ایک ضلع میں جم کر رہنا نصیب نہ ہوا، بہت سے بہت تین چار سال ایک جگہ ٹکنے پائے، ورنہ سال کے سال تبادلہ! اور کسی حاکم سے ان بن ہو گئی تو سال میں کئی کئی بار لوٹا پھیری اور ادلا بدلی!

کشوری مہاراج سب سے زیادہ مدت تک ضلع مرادنگر میں رہے، یہاں کے حکام اُن پر بہت مہربان تھے، تین سال کے بعد تبادلہ ہونے لگا تو شہر کے ایک مشہور رئیس نے حاکموں سے کہہ کر تبادلہ رُکوا دیا۔ صوبہ کی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے، رائے بہادر صاحب اس میں کھڑے ہو رہے تھے اور کشوری مہاراج سے اس سلسلہ میں مدد ملنے کی بہت کچھ اُمید تھی۔

کشوری مہاراج نے کئی مکان تبدیل کئے، پہلا مکان رنڈیوں کے محلہ کے قریب ملا۔ وہاں رات بھر طبلہ کھڑکتے اور سارنگی بجنے کی آواز آتی رہتی، پھر تماش بینوں کی قہقہہ بازی اور ہاتھا پائیاں اس پر مستزاد! دن میں امن رہتا مگر پھر بھی کسی نہ کسی کوٹھے سے "آ آ" اور "دیم تَن نا، تَن نا" کی آواز ضرور تشریف لاکر رہتی، ڈومنیوں کی تعلیم" دن ہی میں ہوا کرتی ہے۔ کسی کے کان کے پردے نازک ہوں تو کیا اُس کی خاطر یہ بیچاری اپنا دھندا چھوڑ دیں، پیٹ پالنے کے لئے ریاض کرنا ہی پڑتا ہے، جوانی کب تک کسی کا ساتھ دیتی ہے، اس چمن میں خزاں آکے ہی رہتی ہے، اس لئے گانے ناچنے کا "آرٹ" اُس زمانہ میں کام آتا ہے! حُسن اور جوانی پر بھروسا کرنے والی طوائفوں کے بڑھاپے بڑے ہی تلخ اور دردناک گزرتے ہیں، چاروں طرف حسرت سے دیکھتی ہیں اور کسی ایک نگاہ کو بھی توجہ آمیز، ملتفت اور قدر داں نہیں پاتیں۔

کشوری مہاراج اس محلہ میں تین چار مہینہ سے زیادہ نہ ٹِک سکے، برہمنوں کی ایک گلی کے مکان میں اُٹھ آئے مگر یہاں بھی ایک تکلیف دہ ماحول سے سابقہ پڑا، ان کے مکان سے ملی ہوئی ایک سیٹھ کی حویلی تھی، وہاں دن رات جوا ہوتا رہتا، دس جواری گئے اور بیس آگئے، چوبیسوں گھنٹوں "دانہ" چھنکتا رہتا۔ دُور دُور کے قمار باز اور کھیتیے یہاں آتے، ایک ایک رات میں ہزاروں کا وارا نیارا ہو جاتا، سیٹھ جی جواریوں کے چودھری تھے، جوئے کی نال میں سَو سَو روپیہ روز کی اُن کو یافت ہو جاتی، اس میں سے ایک حصہ پولس کو بھی دینا پڑتا، اور پولس کی مٹھی گرم کر دینے کے بعد جُرم، جُرم کب رہتا ہے! ——— کشوری مہاراج کو یہ مکان بھی ناپسند آیا، جواری بھنڈاریوں کے پڑوس میں ایک شریف آدمی کس طرح رہ سکتا ہے!

قمار خانہ کی اس ہمسائگی سے بھی کشوری مہاراج کو دستکش ہونا پڑا، اور ایک دوست کی مہربانی سے کم کرایہ پر خاصا آرام دہ مکان مل گیا، تین چار مہینہ یہاں خوب آرام سے گزرے، شریفوں کا محلہ تھا، پڑوسی بھی نیک تھے، مگر کشوری کی قسمت کے ستارے کی گردش ابھی پوری نہ ہوئی تھی ——— ہوا یہ کہ پڑوس میں جو آبکاری کے انسپکٹر صاحب رہتے تھے ان کا تبادلہ ہو گیا اور ان کے جانے کے بعد ایک دوسرے صاحب زنانہ سمیت وہاں آگئے ——— اور پھر! نہ پوچھئے! دن رات میاں بیوی کی لڑائی، شور و شر، کسی کسی دن مار پٹائی بھی! اس بات کا فیصلہ ہی نہ ہو سکا، کہ ان دونوں میں قصور کس کا ہے؟ اور یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ آخر یہ "جنگِ عظیم" ہوتی کس بات پر ہے! میاں ایک کہتا تو بیوی ایک درجن ملاّحیاں سنا کر دم لیتی، وہ اُس کے خاندان کو بُرا بھلا کہتا اور بیوی شوہر کے رشتہ داروں کے عیب کھود کھود کر نکالتی!

پہلا احساس

کشوری مہاراج آخر محلہ شاہ گنج کے ایک مکان میں اُٹھ آئے اور یہاں کئی سال جم کر رہے، اس محلہ میں مسلمانوں کی خالص آبادی تھی، بہت سے بہت دس پانچ گھر ہندوؤں کے ہوں گے! ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ ملنساری کا تھا، ہندوؤں کو اپنی قلتِ تعداد کا احساس تک نہ ہوتا تھا، سب لوگ بھائی بندوں کی طرح رہتے تھے! کشوری مہاراج کا لڑکا ماتا دین نو دس برس کا تھا، اس کا اُٹھنا بیٹھنا اور ملنا جُلنا مسلمان لڑکوں میں رہتا اور اُنہی کے گھروں میں آیا جایا کرتا، وہ بہت غور سے مسلمانوں کو مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھتا اور متاثر ہوتا،

پتاجی! یہ لوگ مسجدوں میں کیا کرتے ہیں؟ ——— ماتا دین نے اپنے باپ سے دریافت کیا،

ایشور کی عبادت کرتے ہیں بیٹا ! ——— کشوری مہاراج نے جواب دیا۔

ان کے سامنے مورتیاں نہیں ہوتیں! مندروں میں تو مورتیوں کے آگے سب لوگ سیس نواتے اور ان کے چرنوں کو چھوتے ہیں ——————— ماتادین نے پوچھا۔

ہر دھرم میں پوجا اپنے ڈھنگ پر ہوتی ہے! ہر مذہب کی ایک ریت اور ایک طریقہ ہے ——— کشوری نے کہا پتاجی! یہاں لوگوں کو ایشور کی پوجا کرتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل کھنچتا ہے، جی میں کئی بار یہ بات آکر رہ گئی کہ لاؤ میں بھی ہاتھ منہ دھو کر ان کے ساتھ کھڑا ہو ۔ . . . . کشوری مہاراج کے خشمگیں تیوروں کو دیکھ کر ماتادین کی بات ادھوری رہ گئی، وہ کچھ اور کہتا تو ایلدہ صاحب اُسے مار بیٹھتے، پرائے دھرم کی بڑائی اور اچھی باتوں کا ذکر سرکوئی نہیں سن سکتا، اس کے لئے بڑے دل گردے اور ظرف کی ضرورت ہے۔

مُرادپور سے ماتادین کانپور بدل کر آ گئے، یہاں آ کر وہ بیمار ہو گئے، سانس کے سدا کے مریض تھے، جوانی میں بیماری دبی رہی، بڑھاپا آیا تو مرض نے ہاتھ پاؤں نکالے، مرض بڑھتا ہی چلا گیا، کچھ دنوں کے لئے فائدہ ہوا تو کشوری مہاراج نے بے عقلمندی کی کہ دسمبر کی سردی میں صبح سویرے گنگا جی میں جا کر اشنان کر آئے، بس اس دن سے جو طبیعت بگڑنی شروع ہوئی ہے تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب کا علاج ہوا مگر بیماری کا زور نہ ٹوٹا، یہاں تک کہ جنم اشٹمی کے دن شام کے چار پانچ بجے کشوری مہاراج کا دیہانت ہو گیا۔

ماتادین خوب سیانا تھا۔ مسیں بھیگ چکی تھیں، ایف، اے، کے پہلے سال میں پڑھتا تھا، باپ کی موت ہر بیٹے کے لئے رنج والم کا باعث ہوتی ہے، اور کشوری مہاراج تو بہت ہی شفیق باپ تھے جو اولاد پر سچ مچ جان چھڑکتے تھے، ماتادین کو جتنا بھی غم ہوتا تھوڑا تھا، سب سے زیادہ غمناک وقت وہ تھا، جب اس کے باپ کی ارتھی جلتی ہوئی چتا میں دھری تھی، اور ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں، ماتادین کا بس چلتا تو وہ باپ کی لاش کو بیدرد شعلوں کی لپیٹ سے بچا لیتا، اسے رہ رہ کر مُرادگنج کے قبرستان یاد آ رہے تھے، غم شدید نہ ہوتا تو وہ "چتا" اور "قبر" کے فلسفہ پر غور کرنے لگتا۔

کشوری مہاراج نے زندگی میں جو کچھ کمایا اُس کی وطن میں جائداد خریدتے رہے، وہ کہا کرتے تھے کہ روپیہ پیسہ کا جمع کرنا ٹھیک نہیں، چور چکار کا ہر آن کھٹکا رہتا ہے، بنکوں میں روپیہ جمع کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں، آئے دن بنکوں کے بھی دوالے نکلتے رہتے ہیں، سکنی جائداد سب سے اچھی اور اطمینان بخش چیز ہے، کہ پُشت ہا پُشت تک اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

باپ کے مرنے کے بعد ماتادین کے بارے میں سب خاندان والوں نے سوچا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے، کچھ لوگوں نے پڑھائی جاری رکھنے کی رائے دی، مگر دوسروں نے فوراً تردید کی، کہ آج کل بی، اے، ایم، اے، مارے مارے پھرتے ہیں پچاس پچاس روپیہ کی نوکری کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتی، اور ہر ہر شما کی خوشامد کرنی پڑتی ہے، ماتادین ایسا جاہل بھی نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کے قابل ہو گیا ہے، گھر کی جائداد کی نگرانی کرے گا تو اُس کی زندگی عزت آبرو کے ساتھ گزر جائے گی، اور اگر توجہ اور محنت کے ساتھ جائداد بڑھانے کی لگن پیدا ہو گئی، تو پھر اس کے پھیلاؤ اور ترقی کی کوئی حد نہ رہے گی۔

ماتادین اپنی ماں اور دونوں بہنوں کو لے کر کانپور سے وطن آ گیا، اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، آٹھ دس ہزار کے لگ بھگ آبادی تھی، معمولی سا بازار تھا، جس میں ضرورت کی ساری چیزیں مل جاتی تھیں، اس قصبہ کی

سب سے مشہور صنعت مٹی کے برتن تھے، یہاں کے بنے ہوئے برتن دُور دُور جاتے، اور مٹی کی چلمیں تو لوگ تحفہ میں دوسروں کو دیتے ہے۔

ماتادین ذہین اور فرض شناس نوجوان تھا، اس نے بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ جائداد کی نگرانی کی، یار دوستوں نے اُسے اپنے رنگ پر لاکر بے راہ بھی کرنا چاہا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا، اُس کے دوست کہا کرتے تھے کہ اس ماتادین کو تو کسی سنسان جنگل میں کُٹی بناکر بیٹھ جانا چاہئے یا پھر یہ بدری ناتھ جی اور امرکنٹک کی پہاڑیوں پر چلا جائے، وہاں اس جیسے سنت سادھو بہت مل جائیں گے ـــــ پاپ کو ہم بھی اچھا نہیں سمجھتے، مگر جیون کو اتنا بھی خشک اور بے لچک نہ ہونا چاہئے۔

فکر و تلاش

کچھ دن کے بعد ماتادین کا بیاہ ہوگیا ـــــــــ ماتادین اب لڑکا نہیں ایک کنبہ کا سرپرست اور رکھوالا تھا، کالج اور اسکول کے زمانہ میں طبیعت میں تھوڑا بہت لاآبالی پن تھا، مگر اب ذمہ داری نے اُس میں سنجیدگی پیدا کردی، ذمہ داری کا احساس آدمی کی سیرت کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔

ماتادین کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، مطالعہ اس کا سب سے زیادہ محبوب شغل تھا، ریلوے ٹائم ٹیبل مل جاتا تو اُسے بھی شروع سے آخر تک پڑھ کر چھوڑتا، مرادگنج میں جب اس کے باپ اہلمد تھے تو وہاں کے ماحول نے اس میں مذہبوں کے متعلق چھان بین اور تقابل و توازن کی ایک حس پیدا کردی تھی، مذہبوں کی تحقیق کے لئے مستند اور غیر مستند کتابوں کے انتخاب کی پرکھ ماتادین میں نہ تھی، داستانِ امیر حمزہؓ اور جنگ نامہ علیؓ کو بھی وہ مذہبی اور رُوحانی کتاب سمجھ کر پڑھتا، یہ شوق بڑھتا ہی جارہا تھا، طبیعت میں ایک طرح کی کُرید پیدا ہوگئی تھی، شوقِ تحقیق روز بروز ترقی کر رہا تھا۔

قصبہ کے مسلمانوں سے بھی ماتادین کا اچھا خاصا ربط تھا، اور ان میں ہر قابلیت اور ہر استعداد کے لوگ تھے، "اہل نظر" بھی اور "تماشائی" بھی! کوئی اتنا کورا کہ اُس بیچارے کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت کیا تھی اور کہاں نازل ہوئی تھی اور کوئی اتنا فقیہی بلکہ قانونچی کہ کنز الدقائق اور ہدایہ کے صفحے کے صفحے اُسے ازبر تھے۔

آموں کی رُت تھی، برسات کی جھڑی لگی تھی، باغوں میں "نوروز" منائے جارہے تھے، شوقین مزاجوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں جاتیں، آم کھاتیں، اور چھیڑ چھاڑ کرتیں، بستی کی چہل پہل کھنچ کر باغوں میں آگئی تھی، ساری رونق آدمی کے دم کی ہے، یہ سنسان جنگل میں پہونچ جائے تو سوکھی جھاڑیاں لہلہانے لگیں، اور قصروں اور ایوانوں کو خیرباد کہہ دے تو وہاں خاک اُڑتی نظر آئے، قدرت نے اپنی نعمتوں کے خزانے آدمی کے لئے ہی بکھیر دیئے ہیں، آدمی نہ ہوتا تو قوس قزح کو بوقلمونیاں اور لالہ و گل کو رعنائیاں کاہے کو دی جاتیں۔

ماتادین بھی اپنے دوستوں کے ساتھ آموں کے باغ میں پہونچا، ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں، کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں کے نشان برسات کے پانی نے دھودیئے تھے، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی تھی، جیسے کھیتوں، باغچوں اور درختوں کو ہری بانات کی قبائیں پہنادی گئی ہیں۔ دوستوں نے باغ میں آم کھائے، اور آم کھاتے میں ہنسی مذاق بھی ہوتا جارہا تھا، رس کی پھواروں کے بعد چھلکے اور گٹھلیاں چلنے لگیں، مذاق بڑھتا ہی چلا گیا ـــــــــ اور زیادتی ہر چیز کی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

یہ کیا لغویت ہے؟ مذاق کو مذاق کی حد ہی میں رہنا چاہئے ـــــــــ ایک شخص نے جس کے کپڑے پانی اور رس میں لت پت کردیے گئے تھے، جھنجھلا کر کہا۔

بڑے بڑوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے گنگا سہائے جی! آپ تو ذرا سی بات کا بُرا مان گئے، کرشن مہاراج گوپیوں سے چھیڑ چھاڑ

کیا کرتے تھے، زندگی میں خوش فعلیاں نہ ہوں تو پھر ایسی بے کیف زندگی سے تو موت بھلی! —— دوسرے شخص نے جواب دیا۔

اپنی غلطی اور حماقت کو ٹھیک ثابت کرنے کے لئے کرشن جیسے دھرماتما پر کیوں تہمت جوڑتے ہو بھگوتی! —— تیسرے آدمی نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا —— اور لوگوں کے لئے تو اس جواب میں کوئی کشش نہ تھی، مگر ماتادین کے لئے تو ان دو لفظوں میں بہت کچھ تھا، اُس نے قاضی سلیم سے اس بارے میں بہت سے سوالات کر ڈالے قاضی جی نے ایک دو باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہاں دوستوں کی اس دھماچوکڑی میں کھُل کر بات نہیں ہو سکتی، شہر چل کر فرصت سے اس پر تبادلہ خیال کریں گے، یا تو میں تمہارے یہاں آجاؤں گا، اور تمہیں سہولت ہو تو تم میرے یہاں چلے آنا۔

ماتادین تو ان باتوں کی ٹوہ میں رہتا تھا، سچائی کی تلاش اُسے بے چین رکھتی تھی، باغ سے لوٹنے کے بعد اگر موسلا دھار بارش نہ ہوتی، تو وہ اُسی دن قاضی جی کے یہاں جاتا —— لیکن آرزو اور تمنا کے ساتھ ہی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں، جب آدمی کا کسی چیز کے لئے دل چاہتا ہے تو چیز حاصل کرنے کی راہ میں اَدبدا کر رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

دوسرے دن صبح سویرے ماتادین اپنی سائیکل پر قاضی سلیم کے یہاں پہونچا، دعا سلام، آداب بندگی اور مزاج پرسی کے بعد ہی ماتادین نے وہی ذکر چھیڑ دیا، ماتادین ہٹ دھرم اور ضدی نہ تھا، سچائی کے ڈھونڈنے والے پیشہ ور مولویوں اور پنڈتوں کی طرح مناظرے اور مباحثے نہیں کیا کرتے، وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح دل کی گرہ کھل کر شرح صدر ہو جائے اور حقیقت مبہم اور مشتبہ نہ رہنے پائے! قاضی سلیم نے ماتادین کو بتایا:-

"اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے، دُنیا میں سب سے پہلا انسان جو پیدا ہوا تھا وہ مسلمان تھا، جتنے پچھلے پیغمبر رشی منی اور ڈرانے والے گزرے ہیں، اسلام اُن سب کی تصدیق کرتا ہے، اور ان مقدس ہستیوں پر خود اُن کے ماننے والوں نے جو بڑی بڑی تہمتیں جوڑ دی ہیں، اسلام اُن کی تردید کرتا ہے۔ ان کمبخت یہودیوں نے انبیائے کرام سے طرح طرح کی غلط اور بے سروپا باتیں منسوب کر دی تھیں اسلام نے ان کو رد کیا —— کرشن جی مہاراج بہت بڑے رشی اور سجن پرش تھے، وہ یہ نہیں کر سکتے کہ جمنا جی میں عورتیں نہا رہی ہوں اور اُن عورتوں کے کپڑے لے کر درخت پر چڑھ جائیں، نیک آدمی ایسی اوچھی اور چھچھوری باتیں نہیں کیا کرتے، اگر یہ بزرگ ہستیاں بھی ان خوش فعلیوں میں مبتلا ہو جائیں، تو ان میں اور عام آدمیوں میں فرق کیا رہا دوسروں کی رہنمائی وہ کس طرح کر سکتے ہیں ......"

ماتادین کو آج کی باتیں بہت عجیب معلوم ہوئیں —— اور ساتھ ہی دلچسپ بھی! اُس نے محسوس کیا کہ حق جس قدر واضح ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی اس کے دل کی جھجاوٹ کم ہوتی جاتی ہے، اندھیرے پر اجالے کا عکس پڑنا شروع ہو گیا تھا ہر کسی کو اپنا دھرم پیارا ہوتا ہے، کوئی شخص اپنے اصول کو آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا، ماتادین بڑی کشمکش میں مبتلا تھا، وہ جو غالب نے کہا تھا ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

تو ماتا دین کی سچ مچ یہی حالت تھی، شک و شبہ اور ہٹ دھرمی کی آمیزش نہ ہو تو تلاش حق کے لئے سوچ بچار میں۔ بڑا لطف آتا ہے۔

اُجالے میں

ماتا دین کے وطن سے بیس پچیس کوس پر سنگرام پور نام کی ایک بستی تھی، اسی بستی میں ایک چھوٹے سے زمیندار کے یہاں ماتا دین کا بیاہ ہوا تھا، اس کی بیوی معمولی شکل صورت کی لڑکی تھی [illegible]ادت کی سیدھی سادی اور ع

چال ڈھال انتہا کی نستعلیق

[illegible]ندی کی دو چار کتابیں بھی اس کے باپ نے محنت کر کے پڑھا دی تھیں، ٹوٹے پھوٹے خط میں لکھ بھی لیتی تھی، سینے پرونے کا اسے [illegible] شوق تھا، گھر والے پیار کے انداز میں چھیڑنے کے لئے اُسے "درزن" کہا کرتے تھے۔

ماتا دین کا سسرال میں آنا جانا رہتا، اسی سنگرام پور میں ایک خانقاہ تھی جس میں ایک شاہ صاحب رہتے تھے شاہ صاحب [illegible]س نواح کے سب سے بڑے پیر تھے، ہزاروں مسلمان اُن کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل تھے، شاہ صاحب کی عمر ساٹھ سال [کے] لگ بھگ تھی مگر چہرۂ مبارک ارغوانی تھا ـــــ شراب سے نہیں، چوزوں کے آب جوش، بٹیروں کے شوربے اور پھلوں کے رس [سے!] [illegible] پیر کے دس ہزار سے بھی کچھ اوپر مُرید ہوں، وہ چھوٹا موٹا بادشاہ ہی تو ہوا، اور بادشاہ کو تو ہزار طرح کی فکریں لگی رہتی ہیں، اور یہاں فکر و غم نے دامنِ خاطر کو کبھی چھوا تک نہ تھا ـــــ بے فکری اور آسائش کے ماحول میں ہر آدمی فربہ ہو جاتا ہے!

ماتا دین کے دل میں قبولِ حق کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی، سنگرام پور میں بعض پڑھے لکھے اور نیک مسلمانوں سے ملنا جلنا ہوا تو یہ رنگ اور گہرا ہو گیا، یہاں تک کہ اُس نے اسلام قبول کر لیا، اُس کا اسلامی نام "بدرالدین" رکھا گیا ـــــ مگر ہم اُسے ماتا دین ہی کہیں گے کہ افسانہ کے شروع سے اُسے یہی کہتے آتے ہیں۔

سنگرام پور کی خانقاہ میں بھی ماتا دین آنے جانے لگا ـــــ اُسے جانا پڑا، لے جایا گیا اور پھر اصرار کیا گیا کہ تم شاہ صاحب قبلہ کے مُرید ہو جاؤ! ماتا دین نے کہا، بھائیو! میں مسلمان ہو گیا، اللہ کو اپنا رب اور محمدؐ رسول اللہ کو اپنا پیشوا اور رہنما مان لیا، اچھائیاں اور بُرائیاں بھی مجھے معلوم ہو گئیں ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ اسی سیدھے سادے راستہ پر سلامتی اور استقامت کے ساتھ چلا چلوں تو میری نجات کے لئے یہی کافی ہے ـــــ دوستوں نے کہا ماتا دین! ابھی کفر کی تاریکی تمہارے دل میں باقی ہے ایسے برگزیدہ اور مقدس شاہ صاحب کی مُریدی سے انکار کرتے ہو...... میاں! مسلمان ہو جانے اور نیک کام کرنے سے "رُوحانی" ترقی نہیں ہوا کرتی، اس کے لئے کسی بزرگ سے وابستگی ضروری ہے، چراغ سے چراغ جلتا ہے اور واسطہ سے واسطہ پیدا ہوتا ہے، سیڑھی اور زینہ کی مدد کے بغیر چھلانگ مار کر اوپر پہونچنا چاہتے ہو!

بیچارے ماتا دین کو مُرید ہونا پڑا، اُس کا دل اندر سے روکتا تھا مگر نئے مسلمان کو یہ پُرانے مسلمان خانقاہ کی طرف کھینچے لئے جا رہے تھے، وہ غریب کھنچتا چلا گیا، بیعت کے پہلے دن ماتا دین کے بیس روپیہ خرچ ہوئے، ان داموں یہ سودا مہنگا نہ تھا۔ کہ چار روپے کی بالوشاہیوں، دو روپیہ کی چادر، ایک روپیہ کے پھول پانوں اور گیارہ روپیہ کے نذرانہ میں اتنے صاحب کشف و کرامت پیر سے رُوحانی تعلق ہو گیا، ماتا دین کو اس بارگاہِ معرفت پناہ سے شجرہ عنایت ہوا...... جس کے آخر میں لکھا تھا:-

"غلام بارگاہِ اقدس بندۂ عاصی ارادت کیش بدرالدین چشتی صابری قلندری ابوالعلائی غفوری سدا بہاری"

ماتادین اب قبلہ شاہ عبدالغفور صاحب چشتی سجادہ نشین خانقاہ "سدا بہار" کے ارادت مندوں بلکہ کفش برداروں میں تھا، اس کو بتایا گیا بلکہ اُس کے دِل میں یہ بات اُتار دی گئی کہ یہ زاہدانِ خشک اور مُلّانے تو سدا کورے کے کورے رہتے ہیں، ایمان اور رُوحانیت کی حلاوت تو صاحبانِ وجد و حال کے یہاں ملتی ہے ـــــ شریعت، طریقت اور حقیقت، ایمان و یقین کے یہ تین درجے ہیں، شریعت ان سب میں گھٹیا درجہ ہے۔

ماتادین کو شاہ صاحب کے حضور اُٹھنے بیٹھنے بات کرتے اور ہاتھ پیر چومنے کے آداب طبعًا پسند نہ تھے، اور قبلہ شاہ صاحب کا عقیدت مند عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھنا تو اُسے بہت زیادہ ناگوار تھا۔ مگر اپنے دِل کی بات دوسرے مُریدوں سے کہتے ہوئے بھی ڈرتا تھا ـــــ اُسے یہ بتا دیا گیا تھا کہ پیر اور شیخ کی کوئی خلافِ شریعت بات بھی شُبہ کی نگاہ سے نہ دیکھنی چاہئے، نہ جانے اس میں کیا مصلحت پنہاں ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں باطنی حقائق تک نہیں پہونچ سکتیں، سالک راہ و رسمِ منزل سے بے خبر نہیں ہوا کرتا، اس لئے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید

اور "پیر مغاں" عقیدت کی اس آڑ میں، دلق و سجادہ کو نہ جانے کس کس "چیز" میں بھگو بھگو کر نچوڑتے رہتے ہیں۔

گلابی جاڑے تھے، موسم بہت زیادہ خوشگوار تھا، ماتادین نے آٹے کی چکی لگالی تھی، اور اُسی کام دھندے میں مصروف رہتا ـــــ تبدیل مذہب کے بعد کنبہ والوں نے ساتھ چھوڑ دیا، زمین جائداد کے بھی بہت سے جھگڑے کھڑے کر دیئے گئے ـــــ اتنے میں شاہ صاحب قبلہ کے یہاں سے پروانہ پہونچا، کہ فلاں تاریخ کو صاحبزادے صاحب کی جانشینی کا باضابطہ اعلان ہوگا، اُس میں تمہارا شریک ہونا ضروری ہے۔

ماتادین کو جانا پڑا، نہ جاتا تو شاہ صاحب قبلہ خفا ہو جاتے اور ان کی خفگی کا یہ معنیٰ تھے کہ اللہ کے جلال و غضب کو گویا جوش میں آنے کی دعوت دے دی! "خانقاہ عالیہ سدا بہاریہ" میں جشن ہو رہا تھا ـــــ قیمتی قالین، ریشمیں پردے، چاندی کے گلدان، چراغاں، قوالی ـــــ صاحبزادے صاحب قبلہ مسندِ زرنگار پر خرقہ شریف پہنے رونق افروز تھے:-

یہ ...... ارے یہ ...... (آنکھوں کو ملتے ہوئے) یہاں کیسے! یہ کیا ہو رہا ہے ... جی ...... !

یہ شخص ...... ماتادین نے رُک رُک کر کہا

یہ تم کیا افیونیوں اور مذاکیوں جیسی باتیں کر رہے ہو، یہ صاحبزادہ صاحب ہیں ہمارے شاہ صاحب قبلہ کے بڑے بیٹے! دو سال سے یہ سیر و سیاحت میں تھے، اب واپس آئے ہیں ... اور ... دوسرے مُرید نے جواب دیا، اور اس کے جواب کے درمیان ہی میں ماتادین بول اُٹھا۔

"بھائی! ان کو تو میں نے طوائفوں کے ساتھ بارہا آتے جاتے دیکھا ہے اور مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ گنگا اشنان پر جوا پکڑا گیا تھا تو ان میں یہ حضرت بھی تھے ...... اور ...... "

اس پر اُس مُرید نے ڈانٹ کر کہا:-

"یہ کیا "اور- اور" لگا رکھی ہے! تمہارے عقیدے میں فرق آگیا ہے، جو ایسے کُفر بک رہے ہو! تمہیں ان بزرگوں اور بزرگ زادوں کی رمز کیا معلوم! اس خانوادے کا ہر بچہ مادر زاد ولی پیدا ہوتا ہے، یہاں سینہ بہ سینہ فیض

پہونچا اور ملتا چلا آیا ہے، بڑے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں طوائفوں کا تانتا بندھا رہتا، ایک طوائف کا کام نہ چلتا تھا، حضور اقدس نے تعویذ دے دیا، اس کی برکت سے طوائف کو وہ ترقی ہوئی وہ عروج ملا کہ برس بھر کے اندر اندر شہر میں دو کوٹھیاں اُس نے خرید لیں، ضلع کیا پورے صوبہ میں اس کا نام تھا، کہاں تو وہ بد نصیبی کہ بیچاری کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا، اور کہاں یہ خوش اقبالی کہ ایک ایک مجرے کے اس نے ہزار ہزار روپیہ لئے ہیں، شاہ صاحب قبلہ کا توفیض عام ہے، اپنے پرائے، گنہگار پارسا سب کو اس در سے فیض پہونچتا ہے۔

شاہ صاحب کے کان تک بھی یہ بات پہونچی، وہ بھری محفل میں غضبناک ہو کر بولے:-

"ماما دین! معلوم ہوتا ہے کہ تو کسی "وہابی" کی صحبت میں بیٹھتا ہے، اُس کی پرچھائیں تجھ پر پڑ گئی ہے... "

"حضور! "وہابی... ؟" یہ "وہابی" کیا بلا ہے؟ میں تو آج پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں، میں تو اپنے وطن میں ایک بڑے ہی نیک اور خدا شناس مولوی صاحب کے پاس اُٹھتا بیٹھتا ہوں، وہ مجھے قرآن کا ترجمہ پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں ——— اور حضور قبلہ ...."

ماما دین کی بات ادھوری ہی تھی کہ شاہ صاحب بول اُٹھے:-

"بزرگوں کے ارشادات و اقوال کو ناقابلِ التفات سمجھ کر، کسی شیخ اور مرشد کی مدد اور فیض کے بغیر قرآن پڑھنا ہی "وہابیت" ہے! عقیدے میں یہیں سے خرابی پیدا ہوتی ہے .... یہ دیکھ! ہمارے دادا حضرت قدس سرہٗ کے ملفوظات (سنہری جزدان میں لپٹی ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہمارا "قرآن" ہے اور ؎

یہاں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

ماما دین! اس مہینہ چاند کی گیارہ تاریخ کو شاہ ولایت قبلہ کا عُرس ہے، تجھے سب کام چھوڑ کر وہاں آنا پڑے گا، تیرے دل کے آئینہ پر جلا وہاں حاضری دینے سے آئے گی، ابھی تیرے ایمان میں کھوٹ باقی ہے۔

پھر... اندھیرا

شاہ صاحب کا حکم اور اس قدر شدت اور تاکید کے ساتھ حکم! ماما دین کو شاہ ولایت صاحب کے عُرس کہیں جاتے ہی بنی، عُرس میں شریک ہونے کا یہ پہلا موقعہ تھا اس کیلئے!

عُرس ——— نمائش، میلا، فینسی شو (Fancy Show) دُور دُور تک خیموں، شامیانوں اور چھولداریوں کی قطاریں! شامیانوں کے تلے اور خیموں کے اندر، طبلوں کی کھڑک، گھنگھروؤں کی چھنک طوائفوں کا ناچ گانا، ادائیں، خوش فعلیاں، قہقہے، ہوسناک اشارے، ——— اور یہ سب عقیدت کے نام پر! طوائف نے کولھے مٹکا کر یہ مصرعہ گایا:-

؎ کس چیز کی کمی ہے داتا تری گلی میں

اور ایک صاحب "یا شاہ ولایت!" کا نعرہ لگا کر کھڑے ہو گئے اور رقص فرمانے لگے، طوائف پر روپیہ کی بارش ہونے لگی، ہوسناکی میں جب عقیدت شریک ہو جائے تو اُس کی "بے پناہی" کیا پوچھنا!

کئی جگہ جوا بھی ہو رہا تھا، جس کی جیت ہوتی وہ ہر داؤں پر کچھ رقم ایک صندوقچی میں ڈال دیتا، صندوقچی پر بخطِ جلی لکھا تھا:-

"مزارِ اقدس کی روشنی کے لئے"

یخنی بریانی کی دیگیں، مرغ مسلّم، شیرمال، باقرخانیاں، ناچ رنگ، ڈھول تاشے، بے پردہ عورتیں، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق۔ بس لطف ہی لطف، مزے ہی مزے اور عیش ہی عیش تھے! ان رنگ رلیوں اور عیش سامانیوں میں "شاہ ولایت صاحب" تو ضرور یاد آتے تھے مگر "خدا" یاد نہ آتا تھا، اس قسم کے ماحول سے خدا کی یاد دُور بھاگتی ہے اور اس میں عقیدت مندوں کا نہیں خدا کی یاد ہی کا قصور ہے!

مزار اقدس کے صدر دروازے پر نوبت اور شہنائی بج رہی تھی اور ایک ہٹا کٹا نیم برہنہ فقیر آنکھیں بند کئے ناچ رہا تھا، یہ "دھمال صاحب" تھے جن کو صاحبِ مزار کی طرف سے اس خدمت پر مامور فرمایا گیا تھا، کہ جب تک پاؤں میں دم رہے ناچتے رہو، کہ یہ بھی مجاہدہ کی ایک شکل ہے!

ماما دین عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، شاہ صاحب قبلہ نے تاکید فرمائی تھی کہ عرس میں ضرور آنا وہاں تیرے دل کا زنگ دُور ہو جائے گا اور ایمان کی کھوٹ کسر نکل جائے گی، مگر یہاں تو دل کے آئینہ پر گرد کی او تہیں جمی جاتی ہیں، وہ درگاہ کے اندر پہونچا، عقیدت مندوں کی بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ سچ مچ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

مزار مبارک کے چاروں طرف قوالیاں ہو رہی تھیں، لوگوں کو حال آ رہا تھا، اور اس انداز کے شعر ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے — جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمّد سے

اور

اپنا "اللہ میاں" نے ہند میں نام — رکھ لیا "خواجہ غریب نواز"

بہت مقبول ہو رہے تھے، "ہوحق" اور "یا پیر دستگیر" کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی، یہ درگاہ کا ہیکل تھی "نغمہ زار" تھا جہاں سچ مچ موسیقی برستی اور نغمے اُگتے تھے۔

زائرین قبہ شریف کا طواف کر رہے تھے، انتہائی ادب کے ساتھ! آنکھیں جھکائے، ڈرے، سہمے اور جھجکے ہوئے کوئی نماز میں بھی اس خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا! صاحبِ مزار سے مُرادیں مانگی جا رہی تھیں، دست بستہ ہو کر، اور سر و قد جھک کر، سلام و آداب کے بعد التجائیں پیش ہو رہی تھیں ——— اولاد عنایت ہو، روزگار مل جائے، مقدمہ جیت جاؤں، دشمنوں کو ذلّت اور ناکامی نصیب ہو، بیاہ ہو جائے ——— غرض جس کی جو تمنّا اور مُراد تھی وہ اپنے لفظوں اور اپنی اپنی زبان میں پیش کر رہا تھا ——— عقیدہ یہ تھا کہ اس علاقہ کا نظم و نسق صاحبِ مزار (شاہ ولایت صاحب) کے سپرد ہے، وہ یہاں کے صاحبِ خدمت ہیں، سپید و سیاہ کے مالک! جس کو جو چاہیں دیدیں، اور جس طرح چاہیں نواز دیں ——— اور نواز کیا دیں، نوازتے رہتے ہیں۔ اس نواح میں جو کچھ ہوتا ہے شاہ ولایت صاحب کے حُکم سے ہوتا ہے۔

قبہ کے اردگرد جو سہ دری تھی اُس کے ستونوں میں بے شمار عرضیاں لٹک رہی تھیں، امیدواروں نے اپنے غم و الم کی داستانیں اور اپنی ضرورتیں لکھ کر بارگاہ معلّیٰ میں پیش کی تھیں ——— اس تصور اور عقیدہ کے ساتھ کہ رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو شاہ ولایت صاحب قبلہ قدس سرہٗ العزیز کا دربار لگتا ہے، اور تمام امیدواروں کی درخواستیں ایک ایک کر کے آپ کے سامنے پیش ہوتی ہیں اور آپ اُن پر حکم صادر فرماتے ہیں ——— کسی کو لڑکا عطا فرما دیا، کسی کی تجارت میں ترقی ہو گئی، کسی بیمار کو اچھا کر دیا۔

درگاہ کے صحن میں مزار کے فوٹو، شجرے اور قبہ میں جلنے والے چراغوں (راکھ کے علاوہ چھ چھ آنہ آٹھ آٹھ آنہ

میں کچھ کتابیں بھی بک رہی تھیں ـــــ صاحبِ عرس کی سوانح حیات! جن کا زیادہ حصہ کراماتی افسانوں پر مشتمل تھا ان میں یہ بھی لکھا تھا کہ شاہ ولایت صاحب کی ایک بار ملک الموت سے جھڑپ ہو گئی، ملک الموت دُنیا والوں کی رُوحیں قبض کر کے جب چوتھے آسمان پر پہونچا تو اُدھر سے شاہ صاحب اپنے عصائے مبارک کو لے کر روانہ ہوئے اور موت کے فرشتہ کے ایک عدد جریب اس زور سے رسید کی کہ اُس بیچارے کی زنبیل جس میں قبض کی ہوئی رُوحیں بند تھیں چھُٹ پڑی، اور اُس دن کے تمام مُردے زندہ ہو گئے۔

ماتادین بار بار سوچتا کہ میں نے اپنا دھرم چھوڑ کر اپنے کو ناحق مصیبت میں ڈالا، یہ تمام رسمیں اور باتیں تو مندروں اور دھرم شالاؤں میں بھی موجود تھیں، وہاں بھی پروہتوں اور پنڈتوں اور پجاریوں کی کمی نہ تھی، یہاں قوالوں کی چوکیاں ہیں، اُس جگہ بھجن منڈلیاں تھیں، پتھروں کے سامنے وہاں بھی جاتری سیس نواتے تھے، چاندی کے چراغوں میں وہاں بھی گھی جلایا جاتا تھا، عود، لوبان، اگر کی بتی، مورچھل، قیمتی چادریں، پھولوں کے ہار اور گلدستے، گانا بجانا، کوُدنا مٹکنا، دسہرہ کے تیوہار پر طرح طرح کے سوانگ بھرنا ـــــ یہ سب باتیں وہاں بھی پائی جاتی تھیں، مندروں کے پجاری وہاں بھی دیویوں اور بتوں کا پرشادؔ سونے کے مول بیچتے تھے ـــــ ماتادین کے عقیدے کی بُنیاد ہلتی ہی چلی جارہی تھی۔

مزار کے اندر جاکر ماتادین نے دیکھا کہ لوگ مزار کی چادر پکڑ پکڑ کر مُرادیں مانگ رہے ہیں، کوئی کوئی رو بھی رہا ہے، قبر کی چوما چاٹی، طواف اور کسی نے اپنا ماتھا ہی قبر کی چوکھنڈی پر ٹیک رکھا ہے، مجاوروں کی چاندی ہی چاندی تھی، مزار کی چادر کی دھجی یا کلاوہ زائرین کے سر سے باندھا، چراغ کی راکھ چٹائی، ایک دو پھول مزار سے اٹھا کر دیدیئے، مور کے پنکھوں کو سر پہ ہلایا اور مٹھی گرم کر لی۔

ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص تھا، مگر اس دروازے پر مَردوں ہی کا انتظام تھا، ـــــ اور یہ مرد، خدامِ درگاہ، مجاور، غلامانِ بارگاہ! معصیت اور ہوسناکی کا بار بار تجربہ کئے ہوئے، برقعہ دیکھتے ہی تاڑ جائیں کہ اس تھیلے میں کس میل، کس درجہ اور کس قیمت کا مال ہے؟ قیافہ شناس درگاہوں پر حاضری دینے والی عورتوں کی لغفیات کے ماہر، بشرے کو دیکھ کر پہچان لیں کہ اس عورت میں کیا کیا گنجائشیں ہیں، اور پانی کہاں کہاں مرتا ہے، عورتوں کے جھرمٹ میں، دروازے کے قریب ماتادین نے ایک خوش پوشاک مجاور کا ہاتھ ایک نوجوان لڑکی کے شانوں کی طرف بڑھتا دیکھا۔ اور

ع کوئی کہہ بھی نہیں سکتا کسی کے دل پہ کیا گزری

ماتادین نئے نئے تماشے دیکھتا ہوا محفل خانہ میں پہونچا یہاں وعظ ہو رہا تھا، بیچ کے ستون کے قریب قالین بچھا تھا جس پر گاؤ تکیہ کے سہارے اس نواح کے سب سے بڑے رئیس تشریف فرما تھے، ان کا نام تھا چودھری ہرنام سنگھ، رائے بہادر بھی تھے، اور فوج میں رنگروٹ دے کر او، بی، ای، بھی بن گئے تھے، ضلع کے نامی گرامی زمینداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، یہ درگاہ انہی رائے بہادر صاحب کی زمینداری میں تھی، عُرس کے لئے ان کے یہاں سے پانسو روپیہ سالانہ کی امداد بھی ملتی تھی

واعظ صاحب نے ارشاد فرمایا:-

"ارے میاں! کُفر و اسلام تو کہنے کی باتیں ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ہر کی پُوجا کرو، اس کے بن جاؤ، اُس کے کہلاؤ، پھر چاہے سُمرن جپو یا تسبیح گھماؤ، ماتھے پر قشقہ ہو یا سجدے کا نشان، سب ایک ہی بات ہے

ع پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند

لہ تبرک۔

کسی اہل دل شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدا معلوم کس جانب نگاہِ لطف ہے تیری
یہ کعبہ اور یہ بت خانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

کعبہ کی تجلی اور بت خانہ کا اُجالا دو دو نہیں ہیں، یہ سب اعتباری حد بندیاں ہیں! ہمارے شاہ ولایت علی حضرت قدس سرّہ العزیز نے تو ایک ہندو سادھو کو خلافت عطا فرمائی تھی، وہ اپنی مرگ چھالا پر ٹھیک مسجد کے صحن میں بیٹھ کر مالا جپا کرتا تھا، کچھ ملّاؤں اور ظاہر پرستوں نے اعتراض کیا تو شاہ ولایت صاحب نے جذب میں آ کر ارشاد فرمایا کہ "تمہاری صد پریں نے اس برہمن بچہ کو ولایت عطا فرمادی ہے جو تمہارے "اسلام" سے بہتر ہے" ع

کہے کبیر سنو بھئی سادھو! ہر جیسے کو ویسا

ماتا دین کو اب اپنے پیر و مرشد سے اجازت لینے کی ضرورت نہ رہی تھی، بارہ دری سے اپنا بوریہ بستر لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا، ریل تیار تھی، ٹکٹ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا، خیالات کی متضاد کشمکش نے اس کے چہرے کو عجیب اور اس کے ردّ عمل نے عجیب تر بنادیا تھا، دن چھپ رہا تھا کہ ریل اس کے وطن پہونچی، اسٹیشن سے یکہ میں بیٹھ کر وہ اپنے گھر آیا، چراغ جل چکے تھے، اس کی بیوی چھوٹے بچے کے پالنے کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی، ——————— اُن کی گفتگو :-

"آپ تو کہہ گئے تھے کہ میں جمعہ کے دن سے پہلے نہیں آؤں گا، آج تو بدھ ہے عُرس سے اتنی جلد کیسے چلے آئے؟"

"مجھے اس سے بھی جلد آجانا چاہئے تھا"

"میں سمجھی نہیں!"

"صبح تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی، اور ہاں! دیکھو، صبح سویرے دن نکلنے سے پہلے پیتل کی تھالی اور گڑھی خوب مانجھ کر صاف کر دینا، ناریل اور سیندور ابھی نوکرانی کو بازار بھیج کر منگا رکھو، میں مندر جاؤں گا"

"مندر؟ . . . . . مندر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں!"

ماتا دین سو گیا، رات بھر خواب دیکھتا رہا۔ عُرس کا خواب، وہی مناظر اور وہی جلوے اور خوش فعلیاں ——— پھیلی رہی تھی، اور ماتا دین (جواب سے پہلے بدرالدین تھا) ماتھے پر چندن کا ٹیکا لگائے مورتی کے چرنوں کو چھو رہا تھا، مورتی چُپ چاپ کھڑی تھی، چراغوں کی لو مدھم ہوتی جا رہی تھی، اگن کنڈ میں سا مگری سُلگ رہی تھی، ——————— اتنے میں مندر کا گھنٹہ بجنے لگا، اور ماتا دین نے مورتی کے چاروں اور کچّا دھاگا لپیٹ کر، اُس کی گردن میں پھولوں کی مالا ڈال دی۔

"دیوی جی! اچھا کیجئے، صبح کا بھولا شام کو گھر آگیا . . . ." ماتا دین کے بول ناقوس کے شور میں گھل مل گئے! پجاری مسکرا رہے تھے، اور ماتا دین پاپیوں کی طرح سہما کھڑا تھا۔

رُوحِ انتخاب

مسیحؑ کی پیشگوئی

اور یسوع اپنے شاگردوں کے ساتھ اردن کے پار بیابان کو گیا۔ پس جبکہ دن ڈھلے کی نماز گزر گئی، یسوع ایک کھجور کے درخت کے پہلو میں بیٹھا اور اُس کے شاگرد کھجور کے درخت کے سایہ تلے بیٹھ گئے۔

اُس وقت یسوع نے کہا ــ" بھائیو! برگزیدگی کا سابق میں ہو جانا ایک بڑا بھاری راز ہے تا آنکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اُسے صاف طور پر نہیں جانتا مگر فقط ایک ہی انسان، اور وہی انسان ہے کہ اس کی طرف قومیں گردنیں اُٹھا کر دیکھ رہی ہیں وہ ایسا انسان ہے کہ اللہ کے راز اُس پر پوری طرح واضح و جلی ہوں گے، پس زہے نصیب! اُن لوگوں کے جو اس کے کلام پر کان لگائیں گے، جب کہ وہ دُنیا میں آئے گا، اس لئے کہ اللہ اس پر سایہ کرے گا، جیسا کہ یہ کھجور کا درخت ہم پر سایہ کر رہا ہے۔ ہاں بے شک جس طرح یہ درخت ہم کو جلانے والے آفتاب کی دھوپ سے بچاتا ہے، ویسے ہی اللہ کی رحمت ایمان والوں کو اُس نام کے ذریعہ شیطان سے بچائے گی"

شاگردوں نے جواب میں کہا ــ" اے معلّم! وہ آدمی کون ہوگا جس کی نسبت تو یہ باتیں کہہ رہا ہے؟ اور جو کہ دُنیا میں عنقریب آئے گا ــــــــ یسوع نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا " بیشک وہ " محمد رسول اللہ " ہے، اور جب وہ دُنیا میں آئے گا تو اُس اصلی رحمت کے وسیلے سے جس کو وہ لائے گا انسانوں کے مابین نیک اعمال کا ذریعہ ہوگا جس طرح کہ مینہ زمین کو پھل دینے والی بنا دیتا ہے، بارش کے عرصہ دراز تک بند رہنے کے بعد ــــــ پس وہ سفید ابر اللہ کی رحمت سے بھرا ہوا ہے، اور یہی رحمت ہے کہ اللہ ایمان والوں پر اُس کی پھوار پانی کی بوندوں کی طرح نثار کرے گا "

(انجیل برنباس [1])

مقدس کتابیں

توراۃ میں یہ پانچ کتابیں ہیں ــ (۱) پیدائش (۲) خروج (۳) احبار (۴) اعداد اور (۵) استثنا پہلی کتاب کا نام پیدائش اس لئے رکھا گیا ہے، کہ اُس میں آسمان، زمین، ساری کائنات کی پیدائش کا بیان ہے اور انسان کی ابتدائی نسلوں کے حالات ہیں، اس کتاب کو عبرانی میں برشتھ کہتے ہیں، کیونکہ اس کتاب کا پہلا لفظ برشتھ ہے جس کے معنی ہیں " شروع میں "

دوسری کتاب کا نام خروج ہے اس لئے کہ اس میں مصر سے بنی اسرائیل کے خارج ہونے کا ذکر ہے ــــ تیسری کتاب احبار میں عبادات وغیرہ کے احکام ہیں اور مذہبی رسوم کی تفصیل ہے۔

بنی اسرائیل کی مردم شماری دوبار کی گئی تھی، ایک تو خروج کے بعد اور پھر دوبارہ اُس وقت جبکہ وہ اڑتیس برس اور تین مہینے کی بیاباں گردی کے بعد دریائے یردن کے پار موآب کے میدانوں میں پہونچ کر یریحو کے سامنے خیمہ زن ہوئے تھے

---

[1] عیسائیوں نے اس انجیل کو چھپا دیا تھا اور یہ کتاب بہت دن تک عالمِ گمنامی میں رہی ــــــــ (م)

وہ تمام واقعات جو اس اثنا میں بنی اسرائیل کو پیش آئے تھے چوتھی کتاب اعداد میں مذکور ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے چالیس برس کی صحرانوردی کے اختتام پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے جو وداعی خطبہ دیا تھا وہ پانچویں کتاب میں ہے، اس خطبہ میں تقریباً وہ تمام قوانین اور قاعدے تفصیل کے ساتھ دہرائے گئے ہیں جو پہلی کتابوں میں مذکور ہیں، اس وجہ سے اس کتاب کا نام استثنار رکھا گیا ہے۔

زبور لغت میں کتاب کو کہتے ہیں اور قرآن میں فقط حضرت داؤدؑ کی زبور کہا گیا ہے، یہ کتاب تورات، انجیل یا قرآن کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک منظوم کتاب ہے جس میں ڈیڑھ سو مناجاتیں یا دعائیہ قطعے ہیں، بنی اسرائیل کے ہاں اس کتاب کے دو نام ہیں، تحیلیم اور تغیلاۃ ـــ تحیلیم کے معنی حمد ہیں اور تغیلاۃ کہتے ہیں دعاؤں کو۔

انجیل یونانی لفظ او انجیلیتن سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی بشارت کے ہیں، انجیل کے مصنف کو او انجلسٹ یعنی بشیر کہتے ہیں ـــ پہلی انجیل متی کی لکھی ہوئی ہے۔ متی حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک حواری تھے حضرت عیسیٰؑ کی رحلت کے بعد متی کی نقل و حرکت کا صحیح صحیح حال معلوم نہیں ہوتا۔

دوسری انجیل کو مارک نے لکھا تھا جو حواری برنباس کے بھانجے تھے، حواری پطرس، مارک سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان کو غایت پیار سے بیٹا کہا کرتے تھے، مارک نے وہ تمام روایتیں پطرس سے سنی تھیں، اپنی اس انجیل میں جمع کر دی ہیں، گویا مارک کی انجیل پطرس کے خیالات کا عکس ہے۔

تیسری انجیل لوقا یا لیوک کی ہے، یونانی نسل تھے، لوقا شام کے ایک شہر انتیاخ کے باشندے تھے اور نہایت لائق طبیب تھے، سینٹ پال کے وعظ سن کر عیسائی ہو گئے اور انہی کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے، لوقا کی انجیل نہ صرف سینٹ پال کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے۔ بلکہ وہ تمام تر سینٹ پال کے خیالات کا آئینہ بھی ہے۔

عہد جدید کی پہلی تین انجیلوں میں زیادہ تر واقعہ نگاری سے کام لیا گیا ہے، روحانی لحاظ سے چوتھی انجیل کو پہلی تین کتابوں پر فضیلت حاصل ہے، اس انجیل کو یوحنا نے لکھا ہے جو سب سے کم عمر حواری تھے، اور جن پر حضرت عیسیٰؑ کی خاص شفقت تھی۔

(کشاف الہدیٰ یعنی مقدمہ کتاب الہدیٰ مرتبہ یعقوب حسن (مدراس)

یہودیوں اور اتحادیوں کی سازباز

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی، تو یہودیوں نے اتحادیوں سے سازباز شروع کی، اور ان سے درخواست کی، کہ اگر فلسطین کو "یہود کا وطن" بنا دینے کا وعدہ کیا جائے تو ہم جنگ کے فنڈ میں روپیہ بھی دیں گے اور میدان میں لڑنے کے لئے آدمی بھی مہیا کریں گے، اس وقت اتحادیوں کے سامنے صرف فتح تھی، اس لئے یہودیوں کی اس پیشکش کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا گیا۔ آدمی تو یہودی زیادہ نہ دے سکے اس لئے کہ وہ جنگجو قوم نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے جنگ کے آخری سال میں برطانیہ و امریکہ کے یہودیوں کی مشترک کوشش سے صرف ایک فوجی دستہ فلسطین کے میدان میں بھیجا جا سکا، لیکن فرانسیسی یہودی تو اتنا بھی نہ کر سکے البتہ روپیہ کی یہودیوں کے پاس کیا کمی ہے، دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم اگر کوئی ہے تو وہ یہودی ہے، اس لئے روپیہ بے دریغ دیا گیا، پھر چونکہ وہ مالدار ہیں اس لئے تعلیمی اور فنی لحاظ سے بھی ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور ماہرین سائنس یہودیوں میں بہت اچھے اچھے ہیں، ان لوگوں نے بھی جنگ میں اپنی خدمات پیش کیں، انہیں میں سے ایک شخص ڈاکٹر ویزمین بھی تھا جو یہودی وطنی تحریک کا لیڈر بھی تھا اور بہت بڑا سائنٹسٹ بھی۔ جنگ کے دوران میں اسنے

لکڑی سے الکحل (شراب کا جوہر) نکالنے کا طریقہ دریافت کیا، اور برطانیہ کو بتایا کہ جنگ کے زمانہ میں الکحل بڑی ضروری چیز ہوتی ہے، لائڈ جارج نے اس ایجاد پر ویزمین کو کچھ انعام دینا چاہا، مگر ڈاکٹر نے روپیہ یا جاگیر کی شکل میں کچھ لینے سے انکار کردیا وہ خود اتنا مالدار تھا اُسے اس کی ضرورت نہ تھی، اس نے لائڈ جارج سے کہا کہ میری اس خدمت کے معاوضے میں یہودیوں کا یہ حق تسلیم کرلیا جائے کہ فلسطین ان کا وطن ہے، اور جنگ کے خاتمہ پر انہیں وہاں بسا دیا جائے گا۔ لائڈ جارج نے اس مطالبہ کو منظور کرلیا، لیکن اس وقت یہ وعدہ خفیہ تھا، جب فلسطین فتح ہوگیا تو اعلان بالفور کی شکل میں اس کا اظہار کردیا گیا۔

(تاریخ انقلابات عالم)

فلسفۂ مسرت یونان کا تیسرا فلسفہ وہ تھا جو "ایپی کورس" کے نام سے منسوب ہے اور جسے "فلسفۂ مسرت" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ایپی کورس جس چیز کو "مسرت" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے، وہ "نیکی" ہی کا دوسرا نام ہے، اس کے نزدیک مسرت کا سرچشمہ نیکی ہے، اس لئے لوگوں سے کہتا ہے، نیکی میں مسرت محسوس کرو، اور مسرت کو نیکی قرار دو، وہ اسٹوئک ازم اور سنی تسیزم کے ماننے والوں کی طرح انسانی جذبات کو نظر انداز کرکے صرف دماغ ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتا، بلکہ اخلاق کی بنیاد جذبات پر رکھتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ راحت نیکی ہے تو اس کا مطلب شراب وکباب، رقص وسرود اور عیاشی واوباشی یا عورتوں سے خلا ملا رکھنا نہیں ہے۔ بلکہ سنجیدگی کیساتھ غور کرکے اُن چیزوں کو حاصل کرنا مطلوب ہے جو مستقل طور سے "نیکی" ہیں، اور اسی کے ساتھ ان چیزوں کو چھوڑ دینا بھی مقصود ہے جو مسرت کی وقتی اور عارضی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

چنانچہ یہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے تھے، مگر رفتہ رفتہ یہ فلسفہ عیاشی و بدمعاشی کے تصورات میں ضم ہوکر رہ گیا۔ اور اس کی عملی تعبیر صرف یہ کی جانے لگی :-

ع خوش باش دمے کہ زندگانی این است

(تاریخ انقلاباتِ عالم)

ہماری نظر میں

"تاریخِ انقلاباتِ عالم"

"تاریخ انقلابات عالم" جلد اول، از :- ابوسعید بزمی ایم اے، صفحات ۷۵۴، مجلد گرد پوش، طباعت وکتابت دیدہ زیب، قیمت دس روپیہ

ملنے کا پتہ :- کتاب منزل، لاہور

اردو زبان کے مشہور اور مقتدر صحافت نگار جناب ابوسعید بزمی نے دُنیا کے انقلابات کی تاریخ دلچسپ پیرایہ میں مرتب کی ہے، انتساب، تعارف، اور عرضِ مصنف کے بعد کتاب کا آغاز مقدس توریت کے باب پیدائش کی اس آیت سے ہوتا ہے :-

"قابیل نے ہابیل سے باتیں کیں اور آخر کار ایک کھیت میں اپنے بھائی ہابیل کے خلاف بھڑک اُٹھا اور اُسے مار ڈالا"

قتلِ ہابیل کی صحیح مدت کا تعین بہت دشوار ہے، —— مگر یہ واقعہ آج سے ہزاروں برس پہلے کا ضرور ہے۔

جناب ابوسعید بزمی نے ہزاروں سال کے انقلابات کی تاریخ کو ساڑھے سات سو صفحوں میں سمیٹ کر "صحرا کو مشتِ خاک میں اور دریا کو کوزے میں سچ مچ بند کر دیا، پہلی جلد ہابیل و قابیل کے معرکے سے شروع ہو کر ہمارے زمانے کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔

"تاریخ انقلاباتِ عالم" میں صرف واقعات ہی کو اکٹھا نہیں کر دیا گیا، اُس میں فلسفہ، مذہب، اور اصولِ سیاست کے ٹھوس اور کار آمد مباحث بھی جگہ جگہ آگئے ہیں، جس نے کتاب کو علمی حیثیت دے دی ہے —— ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد کے واقعات اور انقلابات وحوادث تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور اہم واقعات کو فاضل مصنف نے کتابوں کے حوالوں کے ساتھ درج کیا ہے۔

مصنف نے واقعات وحقائق کی روشنی میں یورپ کی سیاست کو اس انداز میں بے نقاب کیا ہے، کہ اس اسٹیج پر ہر "چہرہ" مجرم اور خطا کار نظر آتا ہے، واقعات بول رہے ہیں کہ مغرب کی ساری کی ساری سیاست جھوٹ، فساد اور دھوکے پر قائم ہے —— اور اسلامی دُنیا کے ساتھ ان سب حکومتوں کا برتاؤ سدا ظالمانہ اور فریب کارانہ رہا ہے، خاص طور پر انگریزوں کے ناوکِ سیاست نے تو مسلمانوں کے دِل چھید چھید دیئے ہیں یہاں تک کہ ع تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں —— اور یہ صاحبانِ سفید فام بھروسہ اور اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔

یورپ کی تاریخ میں انقلابِ فرانس کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، مگر لائق مصنف نے اس کی اہمیت کا دوسرے مغرب زدہ مورخین اور وقائع نگاروں کی طرح اثر قبول نہیں کیا، اُس نے بتایا اور واضح کیا ہے کہ اس انقلاب کے برپا کرنے والوں میں کوئی شخص بھی "پیغمبرانہ کردار" کا مالک نہ تھا، اس لئے یہ انقلاب، اسلام کے انقلاب کی طرح دُنیا کے لئے مفید اور کار آمد ثابت نہ ہو سکا۔

خود ہمارے مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے ——— جو آزاد خیالی، وسعت نظر اور تنویر فسکر کا دعویدار ہے ——— حالانکہ نظر کی یہ وسعت اور فکر و بصیرت کی یہ روشنی اُس نے یورپ سے مستعار لی ہے، یہ گروہ "کمال اتاترک" جیسے قائدین کو اپنا امام سمجھتا ہے! جناب ابو سعید بزمی قابلِ مبارکباد ہیں، کہ اُن کی نگاہ و فکر قیادت و انقلاب کی چمک دمک کو دیکھ کر خیرہ نہیں ہوئی انہوں نے اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے پوری جرأت کے ساتھ صاف صاف لکھ دیا کہ "مصطفےٰ کمال نے ترکی کو مغربی وضع کی قومیت" میں ڈھالنے کی کوشش کی" اور اسلام سے وابستگی کا کوئی خیال نہ کیا۔

روسی انقلاب پر مصنف نے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ——— اس داستانِ انقلاب میں یہ بھی ملتا ہے کہ اشتمالیوں نے جہاں زار کی شہنشاہی کے شجرِ ملعونہ کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکا، وہاں روس کے کسانوں پر بھی بے حد مظالم کئے اور "مساوات و اشتراک" کے ان عوامی علمبرداروں کے خلاف روسی کسانوں کو دوبارہ بغاوت کرنی پڑی اور اپنی جماعت کے کارکنوں کے اس "جبر و تشدد" کو خود اسٹالن نے تسلیم کیا۔

مذہب کے بارے میں سوویٹ روس کا طرزِ عمل بلکہ قانونی برتاؤ کیا ہے؟ یہ کہ:-

"مذہب یا کلیسا کو ریاست سے کوئی تعلق نہیں، نیز عوام کی تعلیم میں بھی مذہب مداخلت نہیں کر سکتا، البتہ ذاتی طور پر مذہب کو ماننے یا مذہبی رسوم ادا کرنے کی آزادی ہر ایک کو حاصل ہے لیکن اسی کے ساتھ مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا بھی ہر شخص کو حق حاصل ہے، مگر مذہب کی حمایت میں تبلیغ کرنے یا مذہبی تعلیم دینے کا حق کسی کو نہیں ......" اور

"سمرقند کی جامع مسجد کا وہ مینارہ جہاں سے کھڑے ہو کر موذن اذان دیا کرتا تھا گرا دیا گیا، اور اس کی جگہ لینن کا ایک بہت بڑا بُت قائم کیا، اس کے نیچے جو عبارت درج ہے اُس کا مفہوم یہ ہے:-

"آج سے اس منارے سے اذان کی آواز بلند نہیں ہوگی، بلکہ مارکس اور لینن کی آواز سُنائی دے گی"۔

اشتراکیت کا مذہب کے بارے میں کیا تصور ہے، فاضل مصنف نے اس کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:-

"اشتراکی لیڈر تمام کے تمام خدا کے وجود سے منکر ہیں، اور صرف مادّے کے قائل ہیں، اشتراکیت میں مذہب روح یا خدا کے تصور کو جس قدر جلد ممکن ہو مٹا دینا چاہئے، کیونکہ اشتراکیت کی رائے میں انسانیت کی معاشی ترقی میں مذہب سنگِ گراں کی حیثیت رکھتا ہے"۔

اِس کتاب کو موضوع کے اعتبار سے خشک ہونا چاہیے تھا، مگر مصنف کی شگفتہ نگاری نے کافی دلچسپی اور شگفتگی پیدا کر دی ہے ——— اُن کے بعض جملے:-

"ہمت و جرأت شراب کے پہلے گھونٹ ہی کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے، شرابی صرف غصہ کر سکتا ہے مگر کسی پر غالب نہیں آسکتا"

"ہر سچائی ایک ابدی حقیقت ہے جو پہاڑوں سے بھی زیادہ پرانی ہے، اسی لئے کسی سچائی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُسے کسی نے "ایجاد" کیا، سچائی خدا کی صفت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی"

مصنف کے قلم سے کہیں کہیں بھول چوک بھی ہوئی ہے:-

صفحہ (۱۲۱) کی آخری سطر میں "تنور" کو "تندور" لکھا ہے جو شبلی نعمانی کی اصطلاح میں اراذل و انفار کی زبان ہے۔

صفحہ (۲۶۱) "فرانس اور برطانیہ کو بھی جرمنی سے گٹھپ ہونا پڑا" ——— "گٹھپ" کی روزمرہ اور بول چال میں حیثیت "مڈبھیڑ" جیسی ہے، اس طرح تو بولتے ہیں کہ "ان دونوں کی مڈبھیڑ ہوگئی" مگر اس طرح نہیں بولا جاتا کہ "اُن دونوں کو مڈبھیڑ ہونا پڑا......" تو یہاں "ہونا پڑا" کے ساتھ "گٹھپ" کا استعمال درست نہیں۔ پھر کتاب کی زبان اور موضوع کے اعتبار سے "گٹھپ" کا لفظ بے میل ہے، "جھڑپ" کا یہاں محل تھا۔

صفحہ (۳۲۵) ...... "عرب جو ابھی سیاست کے گرگھاٹ سے ناواقف تھے" ـــ "گرگھاٹ" غلط ہے۔ "گھرگھاٹ" لکھنا چاہیے تھا، "گر" "tact" کے معنی میں اپنی جگہ مسلم! مگر "گھاٹ" کے ساتھ "گر" نہیں "گھر" آتا ہے۔

صفحہ (۲۰۰) "بازار بھی مندھا پڑ گیا...." ـــ "مندا" ہونا چاہیے، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

صفحہ (۴۵۲) حکومتِ حجاز ہر حاجی سے اوسطاً سوا سو روپیہ مختلف ٹیکسوں کی شکل میں وصول کرتی ہے" یہ اعداد و شمار صحیح نہیں ہیں، حکومت سعودیہ میں ہر حاجی سے چار سو روپیہ کے قریب ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، مختلف اسلامی ممالک کے وفود کی گزارش اور احتجاج پر حکومتِ حجاز نے اس (۱۹۴۹ء) سال اس ٹیکس میں ضرور کمی کی ہے۔

صفحہ (۵۵۰) نادرشاہ کے قتل کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"...... ۱۹۳۳ء میں کسی دل جلے کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے، اس کے بعد ان کے بیٹے ظاہر شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی"

نہ جانے لائق مصنف نے "کسی" کہہ کر نادرشاہ کے قاتل (عبد الخالق) کا نام کیوں نہیں لکھا، "کسی" اور "کوئی" ایسے مواقع پر لکھے جاتے ہیں جب کوئی چیز مشتبہ یا نامعلوم ہو یا پھر لکھنے والا اُس کا اظہار کسی مصلحت کی بنا پر ضروری نہ سمجھتا ہو ——— اور اس کا یہاں کوئی قرینہ ہی نہ تھا۔

"تاریخِ انقلاباتِ عالم" کا مطالعہ عوام ہی نہیں خواص کے لئے بھی نفع سے خالی نہیں، اس کتاب کے پڑھنے سے سیاسی اور تاریخی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اور بعض ایسے واقعات جو ذہنوں میں مبہم اور مجمل تھے، واضح اور روشن ہو کر سامنے آجاتے ہیں، مصنف کی کوشش یقیناً سراہے جانے کے قابل ہے۔

خمخانۂ نشاط

"خمخانۂ نشاط" ——— نشاط امروہوی کے سو شعروں کا مجموعہ۔ مرتبہ حافظ محمد یونس شہباز صدیقی امروہوی، قیمت چھ آنہ، ملنے کا پتہ :- آزاد لائبریری امروہہ (یو۔پی) ہندوستان۔

جناب نشاط امروہوی جوان سال شاعر ہیں اس لئے ان کے کلام میں مستی و شباب کی چاشنی آپ ہی آپ پیدا ہوگئی ہے، وہ صرف محسوس کر کے بلکہ سمجھ کر شعر کہتے ہیں ——— وہ جو کسی اہلِ دل اور صاحبِ نظر فلسفی ناقد نے کہا ہے "عشق تحسینِ حسن کا نام ہے" تو نشاط کے کلام میں "تحسینِ حسن" کی فراوانی پائی جاتی ہے اور ان کی شاعرانہ محبت حسن کی بارگاہ میں مزے لے لے کر قصیدے سناتی ہے۔ "خمخانۂ نشاط" میں نشاط صاحب کے سو منتخب شعر درج ہیں ——— ان شعروں کو پڑھئے اور لطف لیجئے :-

میری دنیا اجاڑنے والے
کس کی دنیا بسائی جاتی ہے

؎ "مٹھ بھیڑ" بھی لکھا جاتا ہے ـــ (رقم)

ﮯ راہِ وفا میں پھول ہی اُگتے چلے گئے ۔۔۔ دُنیا ہماری راہ میں کانٹے نہ بو سکی
ﮯ بے چارگیٔ عشق کا عالم نہ پوچھئے ۔۔۔ لُٹنے کے بعد بے سروساماں نہیں رہا
ﮯ کون اس رازِ عشق کو سمجھے ۔۔۔ جو ہے منزل پہ وہ بھی راہ میں ہے

کہیں کہیں نشاط محتاط بھی نہیں رہے :-

مست ساقی کی مست نظروں سے ۔۔۔ زندگی ڈگمگاتی جاتی ہے!

"زندگی کا ڈگمگانا" عجیب سی بات ہے! اس قسم کی بے احتیاطیوں سے نشاط صاحب بچتے رہے، تو اُن کے مستقبل کو کامرانی کی ابھی سے نوید دی جاتی ہے۔

عربی زبان کے دس سبق

عربی زبان کے دس سبق ـــ مرتبہ :- مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ' قیمت ۹؍ ملنے کا پتہ :- ادارۂ تعلیماتِ اسلام ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس بلڈنگ ـــ پاکستان چوک کراچی۔

درسِ نظامی کے ذریعہ کوئی شک نہیں کہ عربی گرامر کی بنیادیں بہت مضبوط ہوجاتی ہیں، لیکن عام طور پر درسِ نظامی پڑھے ہوئے عربی زبان بولنے چالنے اور لکھنے سے قاصر ہوتے ہیں، اردو زبان میں عبدالرحمٰن امرتسری نے غالباً سب سے پہلے عربی ریڈریں (Readrs .) لکھیں ان کتابوں کی "عربیت" پر اُردو کا کافی اثر تھا۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی نے اُردو داں طبقہ کی سہولت کے لئے نہایت ہی مفید اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں جس کا پہلا حصہ یہی کتاب ہے جس پر ہم تنقید کر رہے ہیں، ـــــــ فاضل مرتب نے اردو داں طبقہ کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر اس کتابچہ کو مرتب کیا ہے۔ عربی لفظوں بلکہ جملوں کے ساتھ باتوں ہی باتوں میں نہایت ہی سہل اور سائنٹیفک انداز پر عربی کی ضروری اور کارآمد گرامر بھی درج کر دی ہے، جو لوگ عربی زبان سے مناسبت رکھتے ہیں وہ کسی اُستاد کی مدد کے بغیر ہی اس کتاب کے دس سبق پڑھ کر عربی کے چھوٹے چھوٹے جملے پڑھ سکتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں بول اور لکھ سکتے ہیں۔

اس کتاب کے قبولِ عام کا یہ عالم ہے کہ یہ تیرھواں ایڈیشن چھپ کر منظرِ عام پر آیا ہے ـــــــ جناب مولانا عبدالسلام قدوائی نے یہ سلسلہ اس غرض سے مرتب کیا ہے کہ پڑھنے والوں میں قرآنی فہم پیدا ہو، فاضل مرتب نے یہ ایک ـــ (Short cut .) نکالا ہے، جو "شرحِ جامی" اور "کافیہ" کے طولِ مسافت سے کترا کر "قرآن" تک پہنچا ہے لائق مرتب اُردو داں دُنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں اور اُن کی کوششوں سے فائدہ نہ اٹھانا تساہل نہیں بدنصیبی بھی ہے، اتنے سستے داموں اتنی تھوڑی مدت میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی کم سے کم استعداد کا پیدا ہوجانا بھی ایک ایسا سودا ہے جس میں سوفی صدی نفع ہے۔

ترجمان القرآن

ماہنامہ "ترجمان القرآن" مرتبہ :- جناب نعیم صدیقی، قیمت سالانہ پانچ روپیہ جون کے زیرِ تنقید پرچے کی قیمت ایک روپیہ ـ ملنے کا پتہ :- ۵ـ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

پاکستان اور ہندوستان کے علمی اور اسلامی طبقے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس رسالہ نے مسلمانوں میں قرآنی بصیرت اور اسلامی شعور پیدا کیا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ترجمان القرآن کے ایڈیٹر

لہ مصرعہ اولیٰ اس سے زیادہ چست ہوتا تو شعر اور زیادہ وزنی ہوجاتا ـ تم

تھے،—— اور غالباً پرنٹر اور پبلشر بھی! مولانا موصوف کی نظربندی کا اثر رسالہ پر بھی پڑا، اب کئی ماہ کے جبری التوا کے بعد "ترجمان القرآن" جناب نعیم صدیقی نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کی غیر حاضری میں ترتیب ولدارت کا حق ادا کر دیا ہے۔ لکھنے والوں میں نعیم صدیقی کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے نام نظر آتے ہیں، ہر مضمون اپنی جگہ ایک مستقل "صحیفہ فکر و بصیرت" ہے، فاضل مقالہ نگاروں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اس کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں رہنے دیا، ادب و انشاء کے اعتبار سے بھی "ترجمان القرآن" کے مضامین اعلیٰ انفرادیت کے حامل ہیں۔

"ترجمان القرآن" ہمارے دور کے اسلامی لٹریچر کا "نقیب" ہے! اس کے مضامین طالبانِ حق کو ہدایت کی راہ دکھاتے ہیں اور ان کے مطالعہ سے صحیح اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے

اس دور میں جبکہ ہنگامہ سیاست اور طوفانِ "ترقی و انقلاب" کے جلو میں "الحاد و زندقہ" بھی دوش بدوش نظر آتے ہیں، "ترجمان القرآن" محتسب، منّاد، راہ نما، اور پاسبان کے فرائض بہ یک وقت ادا کر رہا ہے، جن لوگوں نے "ترجمان القرآن" ابھی تک نہیں پڑھا، اُن کی محرومی پر ہمیں افسوس آتا ہے۔

جناب نعیم صدیقی کی کامیاب سعی کے باوجود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی غیر موجودگی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے، بیشمار درد مند دِل ان بزرگوں کی نظربندی سے ملول اور متاثر ہیں، کتاب و سُنّت اور اسلام و شریعت کے ترجمان، مُفسّر اور عامل —— قید خانہ میں!

ع اے وائے بہارے اگر این است بہارے

کوئی ہے جو ہم جیسے خاک نشینوں کی کمزور آواز فلک بوس ایوانوں تک پہونچادے —— ؟

ماہنامہ ہادی

ماہنامہ "ہادی" — مرتبہ:- جناب ابوالقاسم دلاوری، صفحات ۸۲، چندہ سالانہ دس روپے ایک پرچہ کی قیمت بارہ آنہ - ملنے کا پتہ:- دفتر "ہادی" انارکلی لاہور

ماہنامہ "ہادی" کا پہلا شمارہ ہمارے پیش نظر ہے "معروضات" میں ادارت کی جانب سے رسالہ کا مقصدِ اشاعت دو چار بیان کیا گیا ہے —— "ہادی" کا مسلک —— "امر معروف اور نہی منکر" ہے! جس کی افادیت و اہمیت ہی نہیں، بلکہ عظمت و تقدیس سے کوئی صاحبِ عزیمت انکار نہیں کر سکتا، "ہادی" اظہارِ حق میں بے باک ہے اور مصلحتوں کی پروا نہیں کرتا، اسی شمارے میں انتہائی جرأت کے ساتھ ہمارے لائق وزیر اعظم لیاقت علی خاں بالقابہم کی بیگم صاحبہ بلند اقبال کے اُن خیالات پر تنقید کی گئی ہے، جو وہ عام طور پر بے پردگی کی حمایت میں ظاہر فرماتی رہتی ہیں۔

"ہادی" موضوعات کی رنگا رنگی اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے "گلِ صد برگ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب، سیرت، فقہ، تاریخ، سیاست، سائنس اور ادب سب کچھ اس میں موجود ہے، یہاں تک کہ داغ دہلوی کا ایک خط تک اس میں ملتا ہے، "ہادی" میں دوسرے رسالوں اور کتابوں سے مضامین بھی اقتباس کئے گئے ہیں، مگر تصنیف و اقتباس اور اخذ و ترتیب میں سلیقہ پایا جاتا ہے، بعض مضامین مختصر ہونے کے سبب تشنۂ اظہار رہ گئے ہیں، تنوع میں جامعیت، اور رنگا رنگی میں "شانِ تکمیل" نہ ہو تو یہ بوقلمونیاں اہلِ نظر کو کھٹکنے لگتی ہیں۔

"ہادی" کی کتابت دیدہ زیب اور طباعت اس سے بھی بڑھ کر ستھری بلکہ نظر افروز ہے، بہترین سفید چکنا کاغذ استعمال کیا گیا ہے، جو حکومتِ پاکستان کے ادبی آرگن "ماہِ نو" تک کو نصیب نہیں، ہادی کا مستقبل ہمیں شاندار نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ اس ہونہار بروا کو نظرِ بد سے بچائے۔

بچوں کی دنیا

ہاراجواری (قیمت ۸ر) شہزادی کی تلاش (قیمت ۲ر) کراماتی تعویذ (قیمت ۳ر) چاندتارہ شہزادی (قیمت ۳ر) شہزادی گلنار (قیمت ۰۲ر) جادو کی عینک (قیمت ۰۲ر) جادو کی مالا (قیمت ۰۲ر) جادو کا غار (قیمت ۰۲ر) طلسمی محل (قیمت ۰۲ر) شہزادی افروز (قیمت ۰۲ر) طلسمی تخت (قیمت ۰۲ر) دریائی شہزادی (قیمت ۰۲ر) ملنے کا پتہ:۔ رحمٰن برادرس، فریئر روڈ، کراس طیب جی روڈ، کراچی ملا

رحمٰن برادرس نے مختلف اہلِ قلم سے بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے ننھی منی کتابیں لکھوا کر اپنے اہتمام سے شائع کی ہیں، ان کتابوں کی زبان آسان اور سلیس ہے، تصویر نما کارٹونوں نے کتابوں کی ظاہری دلچسپی کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہ کہانیاں "بچوں کا طلسم ہوشربا" ہیں، لکھنے والوں کا قلم کہیں کہیں "خیال و اظہار" کی حدود کو پھاند بھی گیا ہے، ——— رحمٰن برادرس اگر اپنی مطبوعات کا رُخ "اسلام و اخلاق" کی طرف پھیر دیں تو اُن کی تجارت "عبادت" بن جائے۔

سالنامہ "حرم"

سالنامہ "حرم" — مدیرہ:۔ ظہیرہ بدر (اگست و ستمبر کا مشترک نمبر) ضخامت ۲۰۸ صفحات، کتابت وطباعت قابلِ قبول، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (علاوہ محصولڈاک) ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "حرم" ۷۹، میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔

ماہنامہ "حرم" لاہور عورتوں کا مشہور ماہنامہ ہے، جو پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور جس کا مقصد اور پالیسی سرورق پر لکھے ہوئے اس جملے سے ظاہر ہوتی ہے:

"عورتوں کی ذہنی اور معاشرتی بیداری کا علمبردار"

محترمہ ظہیرہ بدر "حرم" کے نظامِ ادارت کو سنبھالے ہوئے ہیں ——— اور اب اس کا سالنامہ بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے، یہ سالنامہ نظموں، غزلوں، افسانوں اور علمی و معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے، ترتیبِ مضامین میں تنوع اور خوش سلیقگی پائی جاتی ہے۔

ماہنامہ "حرم" کی یہ روش مستحقِ تبریک و تحسین ہے کہ وہ عورتوں کو یورپ کی دی ہوئی "مساوات" "آزادی" اور "بے باکی" سے دُور رکھنا چاہتا ہے، سالنامہ میں بھی اس "پیام" اور "مقصد" کی جھلک موجود ہے! یورپ کی معاشرتی اور اخلاقی تباہی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے، کہ اس نے "عورت" سے "عورت پن" چھین لیا، عورت کو مغرب نے آزاد کیا مگر "مرد" بنا کر! اس طرح عورت اپنی خصوصیت اور انفرادیت کھو بیٹھی ——— عورت کے ساتھ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا تھا!

لے مگر اکتوبر کے "ماہِ نو" کا کاغذ بہت نفیس ہے۔

"احساس" اور "نیا موڑ" جن نظموں کے عنوان ہیں وہ خود "حرم" کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں ہیں، ان میں "تقلید اور کہنہ رواجوں پر شدید جھنجھلاہٹ" کی گئی ہے، ان نظموں کی روح اور مرکزی تخیل مذہب و اخلاق کی پابندیوں کے خلاف احتجاج ہے —
"ترانۂ مجاہد" اور "تحریک" جیسی نظمیں اگر شروع سے آخر تک ہوتیں تو سالنامہ "حرم" کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔
سالنامۂ "حرم" میں غزلیں بھی ہیں اور رومانی افسانے بھی! نسوانی پرچے میں حسن و عشق کے یہ چٹکے چٹخارے بھی نہ ہونے چاہئیں کہ اس دورِ ہوا و ہوس میں تھوڑی سی ڈھیل بھی بڑی قیامت آفریں ثابت ہوتی ہے۔ غیرت بڑی ہی نازک آبگینہ ہے، سانس کی گرمی سے اس میں بال پڑ جاتا ہے، اس آبگینے کے بچاؤ کے لئے شدید احتیاط، دیکھ بھال، توجہ اور ذمہ داری کی ضرورت ہے مسلمان عورت کے لئے صرف یہ "پیام" ہے

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہ و فاطمہ کے نقشِ قدم

یقین ہے کہ "حرم" کے آئندہ شماروں میں ہماری اس گزارش پر عمل کی نظر سے "بھیک" کبھی جائے گی۔

"المخدوم"

ماہنامہ "المخدوم" سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۸، سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ایک پرچہ کی قیمت ۴ر
جناب نہال مخدومی نے مدراس کے شہر جیسے غیر معروف مقام سے ماہنامہ "مخدوم" شائع کر کے بڑی جرأت اور اردو زبان سے اپنے شغف و محبت کا ثبوت دیا ہے، جس زبان نے مدراس اور دکن کے طول و عرض میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ہوں، اُسے دلی، لکھنؤ، اور اکبرآباد سے دیس نکالا دینا ہنسی کھیل نہیں ہے، دفتروں اور درسگاہوں کے دروازے اس پر بند کئے جا سکتے ہیں، مگر دلوں کے دروازوں کو بند نہیں کیا جا سکتا۔
"المخدوم" لدھیانہ کا ادبی ماہنامہ ہے، نہال صاحب نے پرچہ کو زیادہ سے زیادہ متنوع بنانے کی کوشش کی ہے، بعض چھپی ہوئی نظمیں اور غزلیں حوالے کے بغیر درج ہیں، . . . اور بعض مطبوعہ مضامین کے ساتھ حوالے بھی دیئے ہیں۔
رسالہ "کائنات" سے ایک مضمون "شاعری کا صحیح مفہوم" نقل کیا ہے، جس کا ابتدائی جملہ ہے:
"حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے . . . ." ————— حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشاداتِ گرامی کو "ناقدانہ" یا "ادیبانہ" اور "مفکرانہ" کہنا درست نہیں۔
(صفحہ ۲۶) "بہن کے آنسو" میں خود فاضل مدیر نے لکھا ہے:—
"آہ! وہ دن کتنا نامراد اور زیست شکن تھا . . . ."
"زیست شکن" ناموزوں اور غریب ترکیب ہے!
"المخدوم" سے ہم اخلاق و ادب کی مفید اور کارآمد خدمت کی توقع رکھتے ہیں۔ یقین ہے آئندہ شمارے زیادہ بہتر ہوں گے صوبہ مدراس کے اردو داں طبقہ کو خاص طور پر اس مجلّہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

گذارش ہندوستان کے سکّہ کی قیمت کم اور پاکستان کے سکّہ کی قیمت بدستور رہنے کے سبب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں وہ سب جانتے ہیں، وی پی اور منی آرڈروں کی ترسیل ہی یک قلم موقوف کر دی گئی، ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارے خریداران و ایجنٹ صاحبان اس نئی صورتِ حال میں ہم سے پورا تعاون فرمائیں گے۔ نیازمند، مینجر "فاران"

مطبع عثمانی بھیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری

K·L·M
ROYAL DUTCH AIRLINES
1919 30TH YEAR 1949

Regd. No. 1262

Only Title Printed at Lion Art Press, Frere Road, Karachi.
Printer and Publisher Mahir-ul-Qadri

فاران

جلد (۱) شمارہ (۸)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

نومبر ۱۹۴۹ء

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ آٹھ آنہ

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ آنہ

مقامِ اشاعت

کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

کتبہ: سالار "مرصع رقم"

نظم و ترتیب

حصہ نظم

" نیا افق " " نئی صبح " " نیا آفتاب " " نئی دنیا " " نیا ادب " " نئے زاویے " " نیا سنسار " ـــــــ ایک گروہ ان نعروں اور تمناؤں کے ساتھ میدانِ عمل میں مصروفِ کار ہے اور وہ وقت شاید زیادہ دُور نہیں ہے، جبکہ " نئے پن " کا یہ " مسٹیریا " زبانِ حال سے پکار پکار کر کہے گا ...... " نیا انسان " " نئی کھوپریاں " " نئے معدے " " نئی آنتیں " " نئے بال " " نئی مائیں " سر سے پَیر تک ہر چیز نئی " اس لئے کہ ہر چیز پُرانی دورِ شہنشاہی اور عہدِ مذہب و دولت کی پیداوار اور یادگار ہے، اسے مٹ جانا اور مٹا دینا چاہیئے۔

شیطان کے دھوکے اور نفس کے فریب کبھی کھلے ہوئے اور کبھی بہت زیادہ باریک اور پُرپیچ ہوا کرتے ہیں، بُرائیوں، لغزشوں، خطاکاریوں اور فتنہ پردازیوں کو طرح طرح کے حسین نام دے کر، سادہ لوحوں اور احمقوں کو زندگی کے ہر موڑ پر بہکاتا رہتا ہے، مریض زہر پیتا ہوتا ہے، اور شیطان کہتا ہے کہ پیشانی پر یہ بل کیوں آئے جا رہے ہیں، یہ زہر نہیں آبِ حیات ہے پی اور شادماں ہو کر پی! یہ جو راون، نیرو، حجاج، چنگیز، اور ہٹلر جیسے ظالم گزرے ہیں، جن کی سفاکیوں کی داستانیں سن کر آج بھی انسانیت کانپنے لگتی ہے، اپنے کرتوتوں پر پشیمان تھوڑی ہوتے تھے، شیطانِ مردود اور نفسِ لعین نے اُن کے کان میں یہ پھونک دیا تھا کہ تم تو ایک " نئے نظام " کی بُنیاد ڈال رہے ہو، یہ " ظلم " نہیں ایک " نئی برکت " کا ظہور ہے، غلبہ واقتدار کے لئے تمہیں ہر قسم کے اقدام کا حق حاصل ہے! تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظالموں، مفسدوں، لٹیروں اور جفاکاروں نے جب بھی انسانیت کو روندا اور پامال کیا ہے تو " نئے پن " کی ٹٹی کی آڑ لے کر ہی کیا ہے، ظلم و معصیت اور طغیان و فساد کی جو قوت دُنیا میں جب بھی اُبھری اس نے

بھی دعویٰ کیا کہ میں "نئی دُنیا" بنانی چاہتی ہوں۔

ان مفسدوں اور زیاں کاروں نے صراطِ مستقیم اور اللہ کے راستے کو چھوڑ کر ہمیشہ "نئی راہ" نکالنے اور "جادۂ نو" بنانے کی سعی کی ہے، یہ "نیاپن" انہیں گمراہی کی نئی نئی منزلوں میں سدا بھٹکاتا پھرا ہے، اور جب خدا پرستوں اور حق شناسوں نے اُن کو ٹوکا ـــــــ کہ

"زمین میں فساد برپا نہ کرو"

تو انتہائی بے باکی اور ڈھٹائی کے ساتھ انہوں نے جواب دیا:-

"ہم تو مصلحین Reformers ہیں۔"

ان کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آگاہ کیا:-

"خبردار رہنا! یہی لوگ (دُنیا کے) بگاڑنے والے ہیں اور یہ خود سمجھ بھی نہیں رکھتے"

تو اس عالمِ کون وفساد "دُنیائے آب وگِل" اور جہانِ کیف وکم میں تاریخِ معلوم سے آج کے دن تک "مفسدین" سدا "مصلحین" کا بھیس بدل بدل کر نمودار ہوئے ہیں۔

نمرود اور فرعون "خدا پرستی" اور "حق شناسی" کے "قدیم نظام" سے تنگ آچکے تھے، اس لئے انہوں نے اس سے بغاوت کی، یہاں تک کہ "ضربِ کلیم" اور "گلزارِ ابراہیم" کے واقعات ظہور میں آئے، فرعون اور نمرود نے یہی تو کہا تھا کہ "خدائے قدیم" کو چھوڑ کر ہم "نئے خداؤں" کو پوجو، وہاں بھی یہی "نئے پن" کا جنون کارفرما تھا۔

قدرِ مشترک پچھلے ظالموں اور حق ناشناسوں نے "الحاد وانکار" کے ہتھیاروں کے ساتھ ہی اللہ کی زمین پر فساد برپا کیا تھا، اور اب بھی مفسدین یہی اسلحہ استعمال کر رہے ہیں؛ کارل مارکس نے "معاشیات" کا ایک بُت تراشا اور اُسے خدا کی جگہ بٹھا دیا، فرعون اور نمرود کا مقام "معدے" کو مل گیا ـــــــ بات ایک ہی ہوئی! فرعون و نمرود اور کارل مارکس کے الحاد میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہے، یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے، ایک ہی پٹاری کے سانپ، ایک ہی لکیر کے فقیر اور ایک ہی منزل کے مسافر تھے ـــ

میرے اس کہنے پر یقیناً طنز کی جائے گی، کہ آپ تو عجیب سی بات کہہ رہے ہیں، فرعون اور نمرود تو شاہنشاہ تھے اور کارل مارکس شہنشاہی اور امپیریلزم کا سب سے بڑا دشمن تھا، تو ان کو "ہم خیال" کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ ـــــــ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے کب کہا تھا کہ خدا کے منکر زندگی کی ہر جہت اور ہر شعبہ میں ہم رنگ اور ہم خیال ہوتے ہیں، کہا یہ گیا تھا کہ ان "مفسدین" میں جو چیز قدرِ مشترک ہے، وہ "خدا کا انکار" ہے ان کے دعووں کی بُنیاد ہی "نفیِ ذاتِ باری" پر ہوتی ہے، اور خدا اپنے منکروں اور نہ ماننے والوں کو چاہے وہ صاحبِ تاج وتخت ہوں یا خاک نشین ایک ہی نام سے پکارتا ہے، کافروں، ملحدوں، اور منکروں میں جو کوئی معیشت و معاش کی مصلحتوں اور منفعتوں کی بنا پر فرق کرتا ہے، وہ درحقیقت خدا کی اصطلاح اور اس کے کلام کو جھٹلاتا ہے۔

انسانی معتقدات اور نظریوں کی تین شقیں ہیں:- (۱) ایمان (۲) کفر اور (۳) نفاق! پس یا تو آدمی مومن ہوگا، یا کافر یا منافق! اور پھر ان نظریوں کے رکھنے والے انسان دو گروہوں میں بانٹ دیئے گئے ہیں۔ اُن کے نام "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" ہیں! لہٰذا وہ تمام لوگ جو وجودِ باری کا انکار کرتے ہیں، اور جنہوں نے انسانی عقلوں کو اپنا رہنما بنا لیا ہے،

۱؎ قرآن پاک۔

وہ سب کے سب "حزب الشیطان" سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس صف میں نمرود، فرعون، ابوجہل، ابولہب، کارل مارکس، اور استالن دوش بدوش نظر آتے ہیں ـــــــ اور یہ وہ "یک رنگی" ہے جو ہر دور کے منکروں اور خدا ناشناسوں میں پائی جاتی ہے۔

اقبال جس نے تمام جدید نظریوں کے دفتر کھنگال ڈالے تھے، اسی لئے تو اُس نے "لادینی جمہوریت" اور "ملوکیتِ بے خدا" میں کوئی فرق نہیں کیا ؏

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

چنگیز اور ہلاکو نے فولاد کی بنی ہوئی تلواروں سے انسانوں کے جسموں کو خاک و خون میں تڑپایا اور کارل مارکس اور لینن نے اپنے خود ساختہ اور خدا ناشناس نظریہ کے خنجر سے انسانی رُوح کو ہلاک کر دیا، فساد دونوں نے برپا کیا اور فساد کے معنی لڑائی جھگڑے چھین جھپٹ، مار پیٹ، اور جور و ستم ہی کے نہیں ہیں، زندگیوں کو غلط راہ پر ڈال دینا بھی ایک طرح کا "فساد فی الارض" ہی ہے۔ اور "ایک طرح" کا ہی نہیں سب سے زیادہ "شدید فساد" ہے۔

جاہلیتِ ثانیہ

جو گروہ "نئے پن" کا نعرہ لگاتا ہے اُسے شاید نہیں معلوم کہ اُس کا یہ "نیا پن" بھی قدامت کی "صدائے بازگشت" ہے، اب سے کئی ہزار سال پہلے مزدک نے یہی نظریہ پیش کیا تھا کہ زر، زن اور زمین کو مشترک ہونا چاہئے، "آج کی اشتراکیت" صدیوں پہلے کی "مزدکیت" ہی تو ہے! زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کارل مارکس اور لینن "ترقی یافتہ مزدک" تھے! تو علمبرداران جدت و ایجاد کے نظریہ کا "نیا پن" بھی قدامت کے عیب سے پاک نہیں ہے ـــــ آہ! وہ نا آزمودہ کار تیغ زن جس کے وار خود اُسی پر اُلٹ کر پڑ رہے ہوں۔

اب رہی شعر و ادب میں فحش خیالات، گندے تصورات، اور عریاں جذبات کی عکاسی اور ترجمانی ـــــ تو یہ بھی کوئی "ایجادِ نو" اور "اختراعِ جدید" نہیں ہے، جاہلیت عرب کی شاعری میں فواحش کی کمی نہیں ہے، اس ہمارے دَور کے "ترقی پسندوں" نے اتنا ضرور کیا ہے کہ فواحش کو ایک باضابطہ "آرٹ" کی شکل دے دی ہے، اور ہوسناکی کو ادب کی ایک صنف بنا دیا ہے، مگر یہ "جدت" کہاں ہوئی "اضافہ" ہوا اور ہاں میں بھولا "ترقی" بھی!

جاہلیت کے دَور میں بھی عورتیں برہنہ اور نیم برہنہ پھرتی تھیں، غیر محرم مردوں اور عورتوں کا اختلاط اُس زمانہ میں بھی مستحسن سمجھا جاتا تھا، اور آج بھی سمجھا جارہا ہے ـــــ تو یہ "تہذیب" جس کو ترقی یافتہ بتایا جارہا ہے حقیقت میں "جاہلیت اولیٰ" کا بھیس بدل کر آئی ہے جسے ہم "جاہلیتِ ثانیہ" کہہ دیں تو واقعیت کی صحیح ترجمانی ہوگی، جاہلیتِ اولیٰ کی ایک ایک بد اخلاقی آج موجود ہے! جاہلیت ثانیہ اس اعتبار سے البتہ ضرور "ترقی یافتہ" ہے کہ بد اخلاقیوں اور بدکرداریوں کو اس نے ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے خوبصورت بنا دیا ہے، پہلے کھجوروں کے سایہ اور خس پوش کے مکانوں میں جوا کھیلا جاتا تھا، اور آج جگمگاتے کلب گھروں میں قمار بازی ہوتی ہے! یہی حال دوسرے گناہوں، فسق و فجور اور بدکاریوں کا ہے!

تقلید و قدامت

اگر "قدامت" کی حیثیت شجرِ ممنوعہ کی ہے تو پھر جدت و ترقی کے ان دعویداروں کے "نئے پن" میں بھی "قدامت" کی آمیزش ہے، جس خدا ناشناس اور بد اخلاق تہذیب کے یہ لوگ ناشر اور علمبردار ہیں، وہ ان کی ایجاد کردہ نہیں ہے، اس کے نشان بہت قدیم زمانہ میں بھی پائے جاتے ہیں، اخلاق و کردار کی اگلے "منکروں" اور "ملحدوں" کی نگاہ میں بھی کوئی وقعت نہ تھی، اور آج بھی نہیں ہے، اور اس کمزوری کو چھپانے کے لئے کہا جارہا ہے کہ اخلاق کی قدریں سدا بدلتی

رہتی ہیں ——

"خدا ناشناسی" اگر اپنی "قدامت" کے سبب معیوب نہیں ہے تو پھر "خداشناسی" پر بھی "قدامت زدہ" ہونے کی تہمت لگانا بہت بڑی ناانصافی ہے، اخلاقی گراوٹ کا یہی وہ مقام ہے جہاں اپنی آنکھ کا شہتیر آدمی کو نظر نہیں آتا اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دکھائی دیتا ہے۔

"قدامت" کی تہمت اور الزام تراشی کے بعد "اہل مذہب" پر طنز کی جاتی ہے کہ یہ لوگ نرے مقلد اور لکیر کے فقیر ہیں، قدیم سے جو رسم چلی آتی ہے، بس آنکھ بند کر کے اسی پر چلے جا رہے ہیں! کاش طنز کرنے سے پہلے خود اپنی زندگیوں کا بھی جائزہ لے لیا جاتا، اپنے دامن کی آلودگی سے قطع نظر کر کے دوسروں کے دامنوں کی چھینٹوں پر انگشت نمائی کرنا ارباب ہوش و خرد کو زیب نہیں دیتا۔

جس شخص نے دنیا میں سب سے پہلے خدا کا انکار کیا، اس وقت سے آج تک جتنے منکرین پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اسی پہلے منکر کے مقلد اور متبع ہیں —— تو تقلید و اتباع کے الزام سے آزادیٔ فکر کے یہ ڈھنڈورچی بھی نہیں بچ سکتے۔

اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لئے اس حقیقت کو نظر انداز اور فراموش کر دیا جاتا ہے کہ تمدن کا سارا کارخانہ "تقلید و اتباع" ہی کے سہارے چل رہا ہے، آدمی متاثر کرتا اور متاثر ہوتا بھی ہے، سوسائٹی میں اسی "اثر انگیزی" اور "اثر اندازی" کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، "تقلید و اتباع کے بغیر چارہ نہیں —— بہرحال "مقلد" اور "متبع" سب ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک "محمد رسول اللہ" کا اتباع کرتا ہے اور دوسرا لینن اور اسٹالن کا مقلد ہے۔ یہ کتنی بے دانشی اور شرمناک عصبیت ہے کہ لینن اور اسٹالن کے مقلد اور [illegible] کو آزاد خیال اور ترقی پسند سمجھا جاتا ہے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبع اور اطاعت کرنے والے کو قدامت زدہ، رجعت پسند اور غیر ترقی یافتہ کہا جاتا ہے اور نہ صرف معتقدات و اخلاق ہی میں بلکہ "علم و ادب" میں بھی یہ پست ذہنیت کام کر رہی ہے، قرآن ٹاک روسو کے معاہدۂ عمرانی کا مفسر آزاد خیال، منور الفکر، بلند نظر، نہ جانے اور کیا کیا..... ؟ مگر شاہ ولی اللہ کی "حجۃ اللہ البالغہ" کا ترجمان تنگ نظر، دقیانوسی، اور رجعت پرست! جو لوگ معتقدات، نظریوں اور اصولوں میں اس قدر تنگ نظری، جانب داری اور پستیٔ فکر و خیال کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان سے زندگی کے دوسرے معاملات میں عدل و انصاف کی توقع نہیں ہو سکتی، انسانی معاشرے میں اسی قسم کے متعصب اور تنگ نظر افراد اور گروہوں نے سدا بگاڑ پیدا کیا ہے اور یہ وہی "نام نہاد" اور "بزعم خود" "مصلحین" ہیں جن کو قرآن نے "مفسدین" کہہ کر ان کے دعویٔ "صلح و خیر" کی قلعی کھولی ہے۔

تغیر و انقلاب

اس ناسمجھ گروہ کی جانب سے "تغیر و انقلاب" پر بہت کچھ زور دیا جاتا ہے، یعنی یہ کہ کائنات میں انقلاب اور تغیر کا عمل ہر آن جاری ہے، زمین کے ذرہ سے لے کر اخلاقی اصول تک ہر چیز بدلتی رہتی ہے، کائنات کی اشیاء کا انقلاب اپنی جگہ مسلّم! مگر اسی عالم آب و گل میں "اخلاقی اصول" کا تو ذکر کیا، ایسی مادّی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو قدیم سے اب تک نہیں بدلیں، ہزاروں سال پہلے کا آدمی بھی پیروں اور ٹانگوں سے چلتا تھا اور آج بھی سر سے نہیں ٹانگوں اور پیروں ہی سے چلا جاتا ہے، قدیم زمانہ میں بھی آدمی کا معدہ غذا کے ہضم کرنے کا فرض انجام دیتا تھا اور آج بھی دماغ نہیں "معدہ" ہی کو یہ کام کرنا پڑتا ہے —— انسان کے پورے جسم کا یہی حال ہے، "تجدد امثال" کی انقلابی معرکہ آرائی بھی جسم کے اعضا کے مقام اور کام کو نہیں بدل سکتی، ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۳ء میں جن ذرات سے ہمارا بدن بنا تھا، ۱۹۶۹ء کے ختم ہوتے ہوتے ان ذروں کی جگہ نئے ذرے آ جائیں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ پیٹ کی آنتیں، دماغ کی رگوں کا فرض انجام دینے لگیں اور سر سے

طمانگوں کا کام لیا جانے لگے! کائنات کی انقلابی سرشت اور فطرت (Phenomena) کا مزاجِ تغیر بھی ایک قاعدے اور ضابطے کا پابند ہے ———— انقلاب "فروع" میں ہوتا ہے اصول میں نہیں ہوتا۔

جب سے انسان دنیا میں پیدا ہوا ہے ———— سوائے ان لوگوں کے جو مریض ہیں اور جن کے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا ہے، گرمی میں ٹھنڈا پانی ہر کسی کو اچھا لگتا ہے، تمام دوسری لذتوں کا بھی یہی حال ہے، "خوف و امید" اور "سود و زیاں" سے آدمی کی تمام خواہشیں، خوشی و ناخوشی، رغبتیں اور بیزاریاں وابستہ ہیں، تو "سود و زیاں" کا نفسِ اصول "آغازِ کائنات سے لے کر اب تک یکساں رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی جسے "سود" سمجھ رہا ہے دوسرا آدمی اس کو "زیاں" سمجھتا ہو لیکن "سود و زیاں" کی رغبت و بیزاری کا اصول تو پھر بھی اپنی جگہ قائم رہا۔

محکمہ اکتشافاتِ اثریہ (آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ) کی کوششوں کی بدولت ہزاروں سال پہلے کے جو کتبے برآمد ہوتے ہیں ان میں سچائی، خدا ترسی، عصمت و اخلاق کی تلقین پائی جاتی ہے، انصاف، رحمدلی، خوش اخلاقی، بھائی چارے، غمخواری، دردمندی صلح و آشتی اور نیکوکاری کی اہمیت اور افادیت سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا، اور نیکی کا اصول جنتریوں کی طرح پارینہ اور out of date کبھی نہیں ہوا، ———— انتہا یہ ہے کہ سفاکوں اور ظالموں نے بھی "انصاف" ہی کا نام لے کر ظلم کیا ہے، اور انصاف کی نہ بدلنے والی قدر و قیمت سے وہ بھی بے خبر نہ تھے۔

اخلاقی اصول کی نہ بدلنے والی روح کے ساتھ انسان کا "جمالیاتی ذوق" بھی ہمیشہ سے یکساں رہا ہے اور اس ذوق پر مادی انقلابات اور معاشی تبدیلیاں اثر انداز نہیں ہو سکیں! بہت ہی محدود پیرایہ میں عرض کرتا ہوں کہ جب سے انسان کے نظارہ و نگاہ کے ذوق اور رجحان کا پتہ چلتا ہے، پھول، ستارے، قوسِ قزح، کہکشاں، باغ و بہار، اور اسی قسم کے تمام مناظر انسان کے محبوب اور پسندیدہ رہے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ انقلابات سے ظواہر متاثر ہی نہیں ہوتے، باغ میں نئی نئی کلیاں ضرور پھوٹتی رہتی ہیں، ڈالیاں اور پتے بھی گرتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر موسمِ بہار کی روح کارفرما کبھی نہیں بدلتی، اور یہ بھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ چنبیلی کے پودوں میں گلاب کے پھول کھلنے لگیں، یا بوئیں تو دھتورے کے بیج اور ان سے اُگ آئیں شمشاد و صنوبر کے پودے!

اصولِ اخلاق تو ایک طرف رہے خود اشیاء کی روحِ ماہیت تک تبدیل نہیں ہوتی، نیشکر جب سے دنیا میں پایا جاتا ہے، میٹھا ہی ہے اور اندرائن کڑوا ہے! نیشکر اگر میٹھا نہیں ہے بلکہ تلخ اور بدمزہ ہے تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں کہ یا تو گنے کے چوسنے والے کا ذائقہ خراب ہے یا پھر نیشکر کسی خارجی یا داخلی بیماری اور ناسازگاری کے سبب ایسا ہو گیا ہے .... مگر یہ حقیقت تو اپنی جگہ ثابت اور اٹل ہے کہ نیشکر کو "میٹھا" ہی ہونا چاہئے ———— اسی طرح اگر لوگ اپنی کسی اندرونی اور بیرونی کمزوری کے سبب بداخلاق اور برے ہو جائیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اخلاق کی قدریں بدل گئیں، اور اخلاق کے پچھلے ضابطے اور اصول "تقویمِ پارینہ" بن گئے! لوگ بدل گئے ہیں مگر روحِ اخلاق نہیں بدلی ——— اگر ساری دنیا چور ہو جائے تو کیا دیانت اور امانت کا اصول ہی سرے سے بدل جائے گا! لوگ اگر اندھے ہو جائیں تو کیا وہ یہ حکم لگانے میں حق بجانب ہیں کہ دنیا میں اُجالا ہی نہیں پایا، یا ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے یا پھر یہ کہ نور و تجلی کی قدریں بدل گئی ہیں، آفتاب کے طلوع و غروب کا دستور تبدیل ہو گیا ہے۔

اسی قسم کے غلط دعوے اور بے دلیل باتیں وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو دنیا میں طغیان و فساد پھیلانا چاہتے ہیں اور جن کی خواہش ہوتی ہے کہ "آزادی" "انقلاب" اور "بغاوت" کے نام پر دنیا میں گمراہی اور لاقانونیت (انارکزم) کا دور دورہ رہے

حدود اللہ سے دشمنی

نیکی اور اخلاق کی حدیں، خالق کائنات اور ربّ السمٰوات والارض کی مقرر کی ہوئی ہیں اس لئے وہ نہ بدلنے والی ہیں، آدمی اگر صرف اپنی عقل اور فکر و فہم کی بنا پر اخلاق و نیکی کی راہ بناتا تو وہ یقیناً بدل جاتی جس طرح اس کے اپنے بنائے ہوئے اصول آئے دن بدلتے رہتے ہیں، فلسفہ سے لے کر سائنس تک ۔۔۔ کونسا اصول ایسا ہے جو بدلا نہ گیا ہو، آدمی مستقبل کے پردے میں بہت زیادہ دُور تک نہیں دیکھ سکتا، اصول و قانون بناتے وقت اُس پر خود اس کے ذاتی رجحانات اور ہنگامی واردات کا غلبہ ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔ اس لئے اُس کا وضع کیا ہوا قانون نہ تو عالمگیر بن سکتا ہے اور نہ اسکو ہمیشگی حاصل ہو سکتی ہے۔

جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں وہ اخلاق و نیکی کی مقررہ حدود کو اسی لئے قابلِ تبدیل اور انقلاب پذیر سمجھتے ہیں کہ ان کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، چونکہ اس ذہنیت رکھنے والے افراد کو خدا کی ذات سے بَیر ہے اس لئے حدود اللہ سے ان کو دشمنی ہونی ہی چاہئے خدا کے اس باغی گروہ کو انسانوں سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں ہوتا وہ تو دُنیا میں اپنے نظریہ اور اصول کی سربلندی چاہتا ہے، اور اس تمنا کے حصول کے لئے ہر "نظامِ حکومت" میں ابتری پھیلاتا ہے، اور اس ابتری اور انتشار میں ہڑتالیں ہی نہیں عوام اور بے گناہ مسافروں کی ٹرینوں کا بموں سے اڑا دینا اور پٹریوں سے اُتار دینا بھی شامل ہوتا ہے، اور چونکہ اخلاقی احساس سے ان کے دل و دماغ عاری ہوتے ہیں، اس لئے دوسروں کو پرچانے، رام کرنے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لئے رُوپیہ اور شراب ہی نہیں دوشیزاؤں کی عصمت بھی رشوت میں دی جاتی ہے۔

جھونپڑوں سے محلوں تک

سرمایہ داری یقیناً بہت بڑی لعنت ہے، کوئی ہوشمند اور صاحبِ احساس اس لعنت کی ہمنوائی، حمایت اور تائید نہیں کر سکتا ۔۔۔۔۔ مگر یہ خیال بھی اپنی جگہ غلط اور واقعہ کے خلاف ہے کہ دُنیا میں جہاں کہیں بھی ابتری اور فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہے اس کا واحد سبب "سرمایہ داری" ہے اور سرمایہ و محنت کے توازن کے بعد معاشرے کی ساری کی ساری بُرائیاں آن کی آن میں دُور ہو جائیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ امیر، غریب، آقا، غلام، مالک، مزدُور، عالم، جاہل اور چھوٹے بڑے سب کے سب بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور اسی چیز نے سوسائٹی کے نظام کو پراگندہ کر رکھا ہے، جب تک کوئی صالح نظام قائم اور نافذ نہ ہو گا اس وقت تک سماج تہ و بالا رہے گا، اور انسانیت کو سکون و اطمینان کی ایک سانس بھی میسر نہ آئے گی۔

سرمایہ دار، تجارت گاہوں، گوداموں، اسٹوروں اور کارخانوں میں دھوکا دیتا ہے، اور غریب بازاروں میں راہگیروں کی جیب کاٹتا ہے، سرمایہ دار وہسکی، شمپین، اور پورٹ کے جام نوش جان کر کے جی بہلاتا ہے اور غریب دیسی شراب سے غم غلط کرتا ہے۔ سرمایہ دار کلب گھروں اور ریس کورسوں میں جوا کھیلتا ہے اور مزدور فٹ پاتھ پر قمار بازی کے پانسے پھینکتا ہے، سرمایہ دار کے ہوسناک جذبات کی جولان گاہیں ایکٹرسوں کے شبستانِ ناز اور شریف "(؟) رنگین مزاج عورتوں کے ڈرائنگ روم ہیں اور غریب زنانِ بازاری کے تیرہ و تاریک اڈوں کو جھانکتا پھرتا ہے، اور موم کی بتی کے دھندلے اُجالے میں چہروں کو دیکھ دیکھ کر مول تول کرتا ہے۔

یہ جو سینما ہالوں کے دروازوں پر تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں ان میں بڑی تعداد غریبوں، مزدوروں اور قلیوں کی ہوتی ہے، اس پریشان حالی میں ان کے جذبات کی ہوسناکی اور شوقِ تفریح کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگ گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں، بعض اوقات پولس کے ڈنڈے بھی کھانے پڑتے ہیں اور اس شوقِ نظارگی کی خاطر خود آپس میں بڑی بڑی

لڑائیاں ہوتی ہیں ——— غریبوں اور مزدوروں کا بھی جہاں تک بس چلتا ہے لذتوں، چٹخاروں اور لطف و تفریح میں کمی نہیں کرتے۔

سرمایہ دار یقیناً ملامت بلکہ سرزنش کا سزاوار ہے کہ اسے اپنے عیش و آرام کے پیچھے غریبوں اور ضرورتمندوں کی پریشانیوں کا خیال نہیں رہتا، مگر ان غریبوں کو آخر کیا ہو گیا ہے کہ بلیک مارکیٹ میں آٹھ آٹھ آنہ کا ٹکٹ دو دو روپیہ میں خرید کر سینما دیکھتے ہیں یہ سرمایہ دار تو بے حس ہیں، اُن کی بوائی بھی نہیں پھٹی، اسلئے وہ پرائی پیر کو کیا جانیں! مگر یہ غریب تو اپنی جیسی حیثیت کے لوگوں کے دُکھ درد سے واقف ہیں، یہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنے سینما بینی کے شوق کے لئے دل کو مار کر رہ جاتیں، اور وہ رقم جو سینما پر خرچ کر سکتے ہیں کسی فاقہ کش انسان کی نذر کر دیں ——— تو یہ غریب اور مزدور بھی اپنے بھائی بند غریبوں، ضرورت مندوں اور فاقہ کشوں کی ضرورت پر اپنی تفریح اور عیش آرام کو مقدم سمجھتے ہیں، اس منزل میں سرمایہ دار اور مزدور ایک دوسرے کے "ردیف" ہیں۔

سرمایہ دار جلبِ منفعت کے لئے تجارت گاہوں میں طرح طرح کی ہیٹ پھیری، چالبازی اور خود غرضی سے کام لیتے ہیں اور عوام کی "ضرورت" سے ہر قسم کا جائز ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ——— لیکن ہم نے ریلوے اسٹیشنوں پر قلیوں کو دیکھا ہے کہ وہ بھی غریب مسافروں کی "ضرورت" سے ظالمانہ اور خود غرضانہ کھیل کھیلتے ہیں، تانگہ والا بھی ناواقف اور نووارد مسافروں کی ضرورت اور بے خبری سے فائدہ اٹھانے میں کمی نہیں کرتا۔ اور گھروں کے نوکر بھی سودا سلف لانے میں بے ایمانی کرتے ہیں۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کلب گھروں، کوٹھیوں، بنگلوں اور ایوانوں کی بُرائی تو بُرائی ہے مگر چوپالوں، بیٹھکوں اور جھونپڑوں کی بُرائی بُرائی نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو وہ نظر انداز کر دینے اور چھپا دینے کے قابل ہے، تو یہ تصوّر خود اپنی جگہ بہت بڑی ناانصافی اور بددیانتی ہے، اور اس سے ایک طبقہ کی بداخلاقیوں کو شہ ملتی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے ——— اور سرمایہ داروں کی دُشمنی میں ایسا کرنا سوسائٹی، عوام، اور خود ان مزدوروں، غریبوں اور مفلسوں کے حق میں بہت بڑا ظلم ہے، ہمدردی، غمخواری، اور دوستی کا یہ طریقہ ایک خوفناک حماقت ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور ...... !

اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ بداخلاقی اور سیاہ کاریوں کی جڑ ہی "سرمایہ داری" ہے، معاشی ناہمواری کو دُور کر دو، یہ بُرائیاں آپ ہی آپ مٹ جائیں گی ——— یقیناً سرمایہ داری نے بُرائیوں کو پروان چڑھایا ہے اور بہت سے فتنے اسی کی آغوش میں پلتے ہیں مگر کچھ ایسی بداخلاقیاں بھی ہیں جن کے وجود اور ظہور کا تعلق دولت اور افلاس سے نہیں خود انسان کے نفس کی کمزوریوں اور لذتوں سے ہے، ایک غریب مزدور جب کسی پرائی عورت کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہوتا ہے تو کیا اس کا سبب اقتصادی اور معاشی ناہمواریاں ہوتی ہیں؟ اور کیا اقتصادی اور معاشی مساوات کے بعد اُس کی یہ بُری عادت آپ ہی آپ دُور ہو جائے گی بہت سی بدکاریوں اور بداخلاقیوں کی ٹھیک یہی نوعیت ہے۔

سرمایہ داروں کی بُرائیاں اور بداخلاقیاں یقیناً زیادہ شدید اور دُوررس ہیں ——— مگر غریبوں اور مزدوروں کے دامنِ زندگی بھی بے داغ نہیں ہیں، افلاس و محنت کے نام پر اُن کی بُرائیوں سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، زہر سونے کے پیالے میں ہو یا مٹی کے سکورے میں "زہر" ہی ہے، کوئی شخص اطلس و دیبا کا لباس زیبِ تن کر کے یا پھٹے پُرانے کپڑے پہن کر کسی بدکاری کا مرتکب ہو تو کپڑوں کی ظاہری حالت نفسِ بدکاری میں کوئی تفاوت پیدا نہیں کر سکتی ——— دُنیا میں اکثریت مالداروں کی نہیں متوسط طبقوں اور غریبوں کی اور خواص کی نہیں عوام کی ہے تو سوسائٹی میں جو بداخلاقیاں اور بدکاریاں پائی جاتی ہیں، تعداد آبادی کے لحاظ سے ان میں کون فریق غالب ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ ہوش کر سکتا ہے۔

یہود نواز اشتراکیت

سرمایہ و محنت اور امیری غریبی کا ذکر آتے ہی سوویٹ روس کی طرف توجہات کا رُخ آپ ہی آپ ہوجاتا ہے، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ سوویٹ روس میں شہنشاہی نہیں رہی جاگیرداریاں ختم کردی گئیں، کارخانے قوم اور حکومت کی ملکیت میں آگئے، مزدوروں کی معاشی حالت بہتر ہوگئی —— یہ سب کچھ ہوا مگر وہ بداخلاقیاں جو روس میں پہلے پائی جاتی تھیں، وہ جُوں کی تُوں باقی رہیں اس لئے کہ روس کا انقلاب اخلاقی نہیں صرف معاشی انقلاب تھا۔ تمام اخلاقی کمزوریوں کے ساتھ لوگ آسودہ اور خوشحال ہوتے . . . . اور بداخلاقیاں آسودگی اور خوشحالی میں اور پاؤں پھیلاتی ہیں، تو معاشی انقلاب کے بعد روس میں اخلاقی بُرائیاں مٹی نہیں، بلکہ اور زیادہ عام ہوگئیں۔

روس کی حکومت جو سرمایہ داروں کی دشمن بتائی جاتی ہے اس کے کردار کا یہ حال ہے کہ فلسطین میں یہودی سرمایہ داروں کی حکومت کو تسلیم کرنے میں اس نے ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ یہی نہیں غریب عربوں کے مقابلہ میں اُن قارونوں اور ہامانوں کی پشت پناہی فرمائی گئی —— شہنشاہ زار اگر زندہ ہوتا تو فلسطین کے مسئلہ میں زیادہ سے زیادہ وہی کرتا جو اسٹالن نے کیا، اور اس ظلم میں ٹرومین، ایٹلی اور اسٹالن برابر کے شریک ہیں —— "الکفر ملت واحدۃ" کی حقیقت پورے طور پر کھل کر اب سامنے آ گئی!

مکمل انقلاب چاہیئے

معاشی اور اقتصادی ناہمواریاں یقیناً دُور ہونی چاہئیں، مال و زر کے دفینوں پر جو سرمایہ دار سانپوں کی طرح کنڈلی مارے بیٹھے ہیں، ان کے غلبہ و اقتدار کو مٹا دینا چاہئے لیکن یہ سب کچھ انقلاب کا ایک رُخ اور اصلاح کی ایک صورت ہوگی —— اسے ہم ادھورا انقلاب کہیں گے، ہونا یہ چاہئے کہ معاش و اقتصاد کے ساتھ ساتھ اخلاقی انقلاب بھی برپا ہو۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی سنوارے جائیں، بھوکے کے پیٹ کو روٹی ملے تو اس کی روح بھی بھوکی پیاسی اور دُکھی نہ رہے، کسی کی اصلاح، سنوار اور بناؤ اور ہمدردی و غمگساری کا فریضہ کھانا کھلا کر اور کپڑے پہنا کر ادا نہیں ہوجاتا، شعور و فکر اور کردار و اخلاق کی اصلاح و تربیت بھی ضروری ہے، یہی انقلاب انسانیت کے دُکھ کا علاج اور اس کے درد کا مداوا ہوسکتا ہے۔

معاشی اور اقتصادی انقلاب جب تک اخلاقی بُنیادوں پر ظہور پذیر نہ ہوگا اُس وقت تک بس زیادہ سے زیادہ اوپری بُرائیاں دُور ہوسکتی ہیں مگر اندرونی خرابیاں بدستور باقی رہیں گی۔ بلکہ شاید اور زیادہ پائدار ہوجائیں گی۔ دق کے مریض کے دانت کو درست کرکے اگر کوئی مطمئن ہوجائے کہ مرض کا ازالہ ہوگیا، تو یہ بڑی ستم پیشہ غلط فہمی ہوگی —— اور بیچارے مریض کے ساتھ بڑی دشمنی بھی!

دکھی دُنیا، پریشان حال مخلوق اور مظلوم انسانیت ایک ایسے مکمل اور صالح انقلاب کے ظہور کا انتظار کر رہی ہے، جس میں معیشت و اخلاق کا توازن پایا جائے —— - - - اور وہ انقلاب اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا میں آچکا ہے، جو انسانیت کے لئے سب سے بڑی رحمت تھا، اب کسی نئے انقلاب کے لانے اور نئی لائنوں پر فکر و عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بس اُسی انقلاب کی تجدید ہوجائے تو یہ دُنیا جو آج ہوس کاریوں اور غرض پرستیوں کے ہاتھوں جہنم بنی ہوئی ہے، خیر و سلامتی کی جنت بن جائے۔

وہ اہلِ فکر جنہوں نے معاشرت کی خرابیوں کا سبب صرف "معاشی عدم توازن" کو سمجھا ہے وہ اُن اناڑی اور کم سمجھ طبیبوں کی مانند ہیں جو مریض کی بے چینی کو دیکھ کر نسخہ لکھنے کے لئے تو بیٹھ جاتے ہیں مگر مرض کی صحیح تشخیص نہیں کرسکتے ——

واقعہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے درخت کی جڑوں میں خرابی پیدا ہو گئی ہے، جب تک جڑوں کی خرابی دُور نہ ہو گی، ڈالیوں اور پتوں پر آبِ حیات چھڑکنے سے بھی کچھ نہ ہوگا ——— ایسا کرنے سے بہت تھوڑی دیر کے لئے پتوں پر شادابی آجائے گی ...... مگر آہ! یہ وقتی شادابی اور عارضی رونق ——— !

جسموں کے ساتھ دِلوں کو بھی بدلو!

اوپر یہ بات واضح کی جا چکی ہے ——— اور یہ بات ہمارے واضح کرنے اور دلیلیں لانے سے ہی واضح اور مبرہن نہیں ہوئی بلکہ یہ پہلے ہی واضح تھی ——— یہ کہ پوری سوسائٹی بُرائیوں میں مبتلا ہے، اور اس مضمون کا لکھنے والا بھی اس میں شامل اور شریک ہے، بہت سی بداخلاقیاں اور بُرائیاں عوام و خواص اور امیر و غریب میں مشترک ہیں، اور کچھ بداخلاقیاں بعض طبقوں کے ساتھ مخصوص ہیں، تو آپ نے اخلاق و مذہب کو پس پشت ڈال کر کوئی معاشی انقلاب پیدا کر دیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ غریب اپنی تمام اخلاقی بُرائیوں کو لے کر اونچے ہوں گے، اور خوشحال اور اونچے طبقے میں جو مخصوص بُرائیاں پائی جاتی ہیں وہ بھی ان میں آجائیں گی، اسی طرح امیر لوگ نیچے آئیں گے اور اپنے طبقہ کی بُرائیوں کے ساتھ نچلے طبقہ کی بُرائیاں کو بھی قبول کر لیں گے ——— تو "بے اخلاق اور خدا ناشناس انقلاب" اخلاقی بُرائیوں میں کمی نہیں، اضافہ کر دے گا۔

مزدوروں اور غریبوں کی خوشحالی کون درد مند نہ چاہے گا، افلاس و فاقہ کی ماری ہوئی مخلوق سے کس بندۂ خدا کو ہمدردی نہ ہوگی ——— مگر دُنیا صرف افلاس و فاقہ کی ماری ہوئی نہیں ہے، بداخلاقیوں کی ستائی اور روندی ہوئی بھی ہے، اور یہی وہ دوراہا ہے جہاں سے "معیشتِ بے اخلاق" اور "اخلاق با معیشت" کے راستے پھٹتے ہیں اور دونوں کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں یہ میری کوئی سُنی سُنائی ہوائی تباہی بات نہیں کہہ رہا ہوں، یہ حقیقت تجربہ اور مشاہدے میں آچکی ہے اور یہ تجربہ اتنا پرانا بھی نہیں ہے کہ لوگ اُسے بھول جائیں ——— اب سے چند سال پہلے ہم سب آزادی کے کتنے طلبگار اور غلامی سے کس قدر بیزار تھے، جس طرح آج کہا جا رہا ہے کہ تمام بُرائیوں کی جڑ "معاشی ناہمواری" اور "اقتصادی اونچ نیچ" ہے، اسی طرح ہم اس وقت بھی یہی کہتے تھے کہ ہماری سوسائٹی کی خرابیوں کی ذمہ دار دوسروں کی غلامی ہے، کاندھے سے غلامی اور محکومی کا یہ جوا اُترتے ہی ہماری تمام داخلی اور خارجی کمزوریوں، بُرائیوں، اور ناہمواریوں کا ازالہ ہو جائے گا ——— غلامی جاتی رہی اور ہم "آزاد" ہو گئے ..... لیکن ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آزاد ہونے کے بعد بھی ہماری بداخلاقیوں، بُرائیوں اور بے چینیوں کا وہی عالم ہے بلکہ ان میں اور اضافہ ہو گیا ہے ——— بات یہ ہے کہ ہم نے اخلاق و نکوکاری کی بُنیاد پر آزادی نہیں چاہی تھی، جس طرح فرانس میں جمہوری انقلاب آیا تھا اور ترکوں نے قومی حکومت قائم کی تھی، اسی انداز پر ہم نے بھی آزادی کے لئے جدوجہد کی تھی، "آزادی" تو مل گئی مگر ہمارے فکر و نظر کی غلامی کا وہی عالم ہے، اصنامِ فرنگی ہٹ گئے لیکن ہوا و ہوس کے بتوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی :- ؎

ہم نے مانا کہ ہیں آزاد زمینوں کے حدود
نگہ و دل پہ تو غیروں کی حکومت ہے ابھی

"نئی دُنیا" "نئی زندگی" "سُرخ سویرا" "لال جھنڈا" "انقلاب زندہ باد" .... یہاں تک کہ ؏

زمیں تو زمیں آسماں کو بدل دیں

یہ سب نعرے کھوکھلے اور بے جان ہیں، اس ہنگامۂ انقلاب کی تہ میں جو رُوح کار فرما ہے وہ اخلاقی شعور سے عاری ہے "ہر انقلاب" مفید اور "ہر تبدیلی" تعمیری نہیں ہوتی وہی انقلاب انسانیت کو راس آسکتا ہے جس کے تمام عناصر صالح اور تعمیری ہوں، صرف انقلاب بپا کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا ——— ہمارے زمانہ ہی میں ہٹلر نے زمین کا جغرافیہ بدل دیا تھا ——— یہ کوئی

معمولی انقلاب تھا، مگر اس انقلاب کی رُوح غیر اخلاقی اور خدا ناشناس تھی، اس لئے دنیا کو اس انقلاب سے تباہی کے سوا کچھ اور نہ مل سکا۔

؟

ہم بھی انقلابی اور "باغیانہ" ادب چاہتے ہیں، —— مگر کیسا انقلاب؟ جو بداخلاقیوں برائیوں اور بدکاریوں کی فضا کو تہ و بالا کردے، اور کس سے بغاوت؟ ہر برائی اور اخلاقی کمزوری سے بغاوت، فسق و فجور اور گناہ و ضلالت سے بغاوت! سرمایہ داری اور سامراج بھی ایک بُرائی ہے اُس سے بھی بغاوت اور دوسری بداخلاقیاں جو معاشرت میں پائی جاتی ہیں، ان سے بھی بغاوت! قصرِ ایوان کی بدکاریوں سے ہی نہیں جھونپڑوں کی بُرائیوں سے بھی بغاوت! شراب کے اُس جامِ بلوریں سے بھی بغاوت جو سرمایہ دار کے شاداب لبوں کو چومتا ہے اور مئے خانہ ساز کے اس جامِ سفالی سے بھی بغاوت جس سے غریبوں کے مُرجھائے ہوئے ہونٹوں کو تری ملتی ہے —— اور خود اس "بغاوت" سے بھی بغاوت جو اپنی فطرت کے اعتبار سے بداخلاق ہے اور خدا اور مذہب کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہے۔

ہمیں ایسے بلند، خوددار اور صاحبِ عزیمت "باغی" اور "انقلابی" چاہئیں، جو "خدا" کے سوا اور کسی طاقت کے آگے نہ جھکیں، جو شرافت، نیکوکاری اور اخلاق کا مجسمہ ہوں، اور جن کو دیکھ کر لوگ محسوس کریں کہ اچھائیاں زمین پر چل پھر رہی ہیں! ہمیں مزدوروں اور غریبوں کے ایسے غمخوار چاہئیں جن کو مزدوروں اور غریبوں کے بھوک اور افلاس کے ساتھ اُن کی غیرت، اخلاق اور سیرت و کردار سے بھی ہمدردی ہو —— ہمیں وہ معاشرہ اور ایسے انسان درکار ہیں جو جج [illegible] اور جیل کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے صرف نہ ڈریں بلکہ وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے اور زیادہ خوف کریں، جبکہ ایک ایک سانس، ایک ایک نگاہ اور ایک ایک دل کی حرکت کا حساب لیا جائے گا۔

جو لٹریچر اس انداز کا انقلاب پیدا کر سکے، اور جس کے اثرات اس قسم کے صالح معاشرے کو وجود میں لا سکیں، ہم اُسی لٹریچر کو "ترقی پسند اور تعمیری" ادب سمجھتے ہیں اور اسی کی اشاعت چاہتے ہیں، ہم نے جس بات کو حق اور انسانیت کیلئے مفید سمجھ لیا ہے، اُسے اُس وقت تک دہرائے جائیں گے جب تک ہمارے ہاتھوں میں جنبش، ہماری زبان میں حرکت اور ہماری آنکھوں میں دم باقی ہے۔

ماہر القادری

یکم نومبر ۶۹ء

اشارات :- چند طلباء نباتات — **ترتیب :- ادارۂ "فاران"**

پھولوں کی دُنیا

> کاش ! پھولوں کو دیکھنے والی آنکھ ،
> اوراقِ گُل کو پڑھ سکتی ——— !

چیزوں کی پسند اور ناپسند میں آدمیوں کا رجحان مختلف ہے ، یہ اختلاف کچھ تو طبعی ہے اور کچھ قومی میلانات اور گرد وپیش کے حالات سے تعلق رکھتا ہے ، مثلاً مدراس اور مالابار کے علاقہ کے رہنے والے ناریل پر جان دیتے ہیں ، یہ ان کے دیس کا میوہ ہے ان کی بہت سی ضرورتیں ناریل سے پوری ہوتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پھل سے کچھ قومی اور مذہبی روایات بھی وابستہ ہو گئی ہیں ، عربوں کو کھجور پسند ہے ، ان کے شاعروں نے کھجور کی تعریف میں قصیدے کہے ہیں ، اور ہمارا محبوب پھل آم ہے ——— غالب جو سنہ ستاون کے انقلابی ہنگامہ پر خاموش رہا ، آم کی تعریف میں کہتا ہے :-

> آم کے آگے نیشکر کیا ہے
> مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے !

مگر اسی عالمِ کیف وکم اور دُنیائے آب وگِل میں کچھ ایسی چیزیں بھی پائی جاتی ہیں ، جن کو سب لوگ پسند کرتے ہیں اور قبولِ عام حاصل ہے ——— پھولوں کا بھی یہی حال ہے ، ہر طبیعت اور ہر ذوق کا آدمی پھولوں کو پسند کرتا ہے ، یونان کا ہومر عرب کا امرا القیس ، چین کا ملک الشعرا طوفو ، ایران کا فردوسی ، انگلستان کا شکسپیئر اور بھارت ورش کا مہاکوی کالیداس ، سبھی نے پھولوں کو سراہا ہے اور لالہ وگُل کی بارگاہ میں قصیدے پیش کئے ہیں ۔

خوبصورت انسانوں کی تعریف میں زیادہ تر پھولوں سے تشبیہیں مستعار لی گئی ہیں ، رکنا باد اور گلگشتِ مصلا کا شیدائی حافظ کہتا ہے ؎

> بنفشہ طرۂ مفتولِ خود گرہ می زد
> صبا حکایتِ زلفِ تو درمیاں انداخت

اپنے محبوب کے لبوں کو دیکھ کر میر کو گلاب کی پتیوں کی یاد آجاتی ہے :- ؎

> نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
> پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کیٹس (KEATS) کہتا ہے :-

I saw a lily on thy brow,
And on thy cheek a fading rose.

آنکھوں کو نرگس بیمار سے اور قد و قامت کو سرو صنوبر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اور یہ کچھ شاعروں اور ادیبوں پر ہی موقوف نہیں ہے۔ ہر آدمی چاہے وہ پرلے درجے کا جاہل اُجڈ، ورگنوار ہی کیوں نہ ہو پھولوں کو ضرور پسند کرتا ہے، جمالیات کا یہی وہ ذوق ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور یہ ذوق آدمی کو ورثہ میں ملتا ہے، ——— انسان کا ایک بچہ کسی ایسے غار یا ریگستان میں پرورش پاتا رہے، جہاں پھول تو پھول ہریالی تک کا نام و نشان نہ ہو، جب وہ پورا آدمی ہو جائے تو اُسے کسی باغ میں لے کر جاؤ، پھولوں کو دیکھ کر اُسے ممکن ہے حیرت ہو مگر اس حیرت میں جذبہ فرحت و مسرت ضرور ملا جلا ہوگا ——— پھول قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے، دُنیا میں پھول نہ ہوتے تو یہ محفل سونی سونی اور بے آب و رنگ سی نظر آتی۔

پھولوں کے بچے

علم نباتات کے ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ یہ جو پھول، پتیاں اور پودے ہم کو نظر آتے ہیں، سدا سے ایسے ہی نہیں ہیں، ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، نشو و نما اور ترقی کی مختلف منزلوں سے ان کو گزرنا پڑا ہے، بہت سے پودے جو آج ہرے بھرے دکھائی دیتے ہیں، ایک زمانہ میں یہ بالکل ننگے تھے، یعنی ڈالیاں تو تھیں مگر پتے نہ تھے، پھر ایک دور ایسا آیا کہ ان میں کونپلیں پھوٹنے لگیں، یہاں تک کہ ہم تک پہونچتے پہونچتے یہ پودے خوب سرسبز ہو گئے ——— !

آج کی دُنیا کے لئے یہ بات بالکل عجیب نہیں رہی کہ انسانوں اور حیوانوں کی طرح پھولوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں، اور توالد و تناسل کے ذریعہ پھولوں کی نسلیں بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہیں ——— لیکن یہ بات یقیناً بہت عجیب ہے کہ بہت سے پھول بہ یک وقت نر بھی ہوتے ہیں اور مادہ بھی! یعنی اُن میں نر پھول کے تمام اعضا کے ساتھ ساتھ وہ اعضا بھی پائے جاتے ہیں، جو ایک مادہ پھول کے لئے ضروری ہیں، مگر جو لوگ "حیاتیات" کا علم رکھتے ہیں، ان کے لئے اس واقعہ میں بھی کوئی عجوبہ پن نہیں ہے، وہ جانتے ہیں کہ "کینچوے" کا بھی یہی عالم ہے، کہ اُس میں "نر اور مادہ" دونوں خصوصیتیں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں۔

حیوانوں کی طرح پھولوں میں قربت اور ملاپ نہیں ہوا کرتا، قدرت نے پھولوں میں "زیرہ" پیدا کر دیا ہے! نر پھول کا زیرہ جب کسی پھول کی "مادہ نلی" تک پہونچ جاتا ہے تو اُس کے نتیجہ میں پھولوں کے بچے (کلیاں) پیدا ہوتے رہتے ہیں ——— پھولوں کا یہ جنسیاتی نظام Sexual organisation بہت زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔

نر پھولوں کا یہ زیرہ "مادہ پھولوں میں آخر منتقل کس طرح ہوتا ہے؟ ——— سُنئے! جو پودے پانی میں اُگتے ہیں ——— اُن میں پانی کی موجیں "زیرہ" کی منتقلی کا واسطہ بن جاتی ہیں اور جہاں پانی اس فرض کے انجام دینے سے قاصر رہتا ہے وہاں ہوائیں، تتلیاں، کیڑے اور شہد کی مکھیاں یہ کام کرتی ہیں۔

ہر جاندار کے ساتھ غرض لگی ہوتی ہے، بھاری بھرکم ہاتھی سے لے کر ننھی سی چیونٹی تک ہر کوئی زندہ رہنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے، اسی جد و جہد کی راہ میں اغراض اور خواہشیں بھی آتی ہیں ——— تو یہ تتلیاں اور شہد کی مکھیاں شہد کے لئے ایک پھول سے دوسرے پھول تک اُڑتی پھرتی ہیں، کوئی رنگین مزاج انسان تتلیوں کو پھولوں پر بیٹھا دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ پھولوں کے لبوں کو چوم رہی ہیں ——— مگر یہ چومنا اور لب بہ لب ہونا شہد حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

شہد کی مکھیوں، تتلیوں اور بھونروں کے پروں اور پیروں میں پھولوں کا زیرہ لگ جاتا ہے اور جب وہ دوسرے پھولوں پر جاکر بیٹھتے ہیں تو یہ "زیرہ" منتقل ہوجاتا ہے، ان بیک جانوں کو خبر تک نہیں ہوتی، کہ ان کے اس "شوقِ شہد آفرینی" کی بدولت پھولوں کی نسلیں بڑھتی رہتی ہیں ــــــ کیا تتلیوں، مکھیوں اور بھونروں کا پھولوں پر احسان ہے؟ نہیں یہ احسان نہیں "بدلہ" اور "معاوضہ" ہے! پھول اپنا خون (رس) بھی تو ان کو دیتے ہیں، "شرافت اسی کا نام ہے کہ اچھائی" کا بدلہ اچھائی سے دیا جائے۔

ہواؤں کے ذریعہ جن پھولوں میں "زیرہ" کی منتقلی کا عمل ہوتا رہتا ہے، وہ پھول نہ تو زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں اور نہ اُن میں خوشبو پائی جاتی ہے، ان پھولوں میں شہد بھی نہیں ہوتا ــــــ شہد خوشبودار اور حسین پھولوں میں ہوتا ہے، قدرت نے شہد کی مکھیوں، تتلیوں اور بھونروں میں "جمالیاتی ذوق" پیدا کر دیا ہے، خوبصورت اور خوشبودار پھولوں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے! رات کے وقت تتلیاں خوشبو ہی کے سہارے پھولوں تک پہونچتی ہیں، اسی لئے تو رات میں کھلنے والے پھول بہت زیادہ خوشبودار ہوتے ہیں ــــ مثال کے طور پر "رات کی رانی" کے پودے سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں میں ایک وہ جو موٹی قسم کی مکھی (ڈنگار) ہے جو زیادہ خوبصورت اور کم خوبصورت ہر طرح کے پھولوں پر بیٹھتی ہے، اس کا حاصل کیا ہوا شہد بھی اعلیٰ درجہ کا نہیں ہوتا، مگر شہد کی چھوٹی مکھی بڑی حسن پرست واقع ہوئی ہے یہ خوبصورت اور خوشبودار پھولوں سے لگاؤ رکھتی ہے، اس کے چھتہ کا شہد نہایت لطیف ہوتا ہے۔

شہد کی مکھیاں اور تتلیاں اپنی غرض سے پھولوں کے پاس آتی ہیں، لیکن قدرت نے بعض پھولوں کو بھی بڑا چالاک اور ہوشیار بنایا ہے کہ وہ ان خود غرض مکھیوں اور تتلیوں کو بھی اپنے دام میں لے آتے ہیں، اگر کسی پھول میں شہد نہیں ہوتا یا اسی قسم کی کوئی غذا نہیں پائی جاتی تو اس میں کوئی ایسا مادہ پیدا ہوجاتا ہے، جو شہد سے ملتا جلتا ہوتا ہے، تو مکھی شہد کے لالچ میں پھول کی پنکھڑیوں کی تہ میں گھر جاتی ہے، مکھی کے اندر جاتے ہی پھول کی پتیاں بند ہوجاتی ہیں، مکھی پنکھڑیوں کے اس قید خانہ میں اس وقت تک بند رہتی ہے جب تک پھول کے ذرات (زیرہ) اس کے پروں اور پیروں میں اچھی طرح لپٹ نہیں جاتے، جب یہ کام ہوچکتا ہے فوراً ہی پنکھڑیاں کھل جاتی ہیں اور مکھی اڑکر دوسرے پھول پر جا بیٹھتی ہے، یہاں تک کہ پہلے پھول کے ذرات دوسرے پھول تک پہنچ جاتے ہیں۔

تتلیاں عام طور پر سُرخ اور نیلے پھولوں کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے یہ پھول سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ خیال کئے جاتے ہیں، نیلے رنگ دار پھولوں میں شہد کی مقدار سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، اس لئے ہر قسم کے کیڑے ان میں آتے جاتے رہتے ہیں ــــــــــ ارسطو نے اب سے کئی ہزار سال پہلے یہ بات دیکھ کر معلوم کی تھی کہ شہد کی مکھی جس وقت بھی آتی ہے تو ہر پھول کے پاس نہیں جاتی، بلکہ اپنی نقل و حرکت مخصوص پھولوں تک محدود رکھتی ہے۔

سب سے بڑا پھول

پھول اپنی جسامت، رنگ و بو اور وضع و ہیئت کے اعتبار سے مختلف ہیں، پھولوں کی تمام قسمیں اب تک گنتی میں نہیں آسکیں، افریقہ کے بہت سے جنگل ابھی تک ناقابلِ گذر بنے ہوتے ہیں، نہ جانے ان میں کس کس رنگ اور وضع کے پھول ہوں گے، ایک گلاب کے پھول ہی کی سو سے کچھ اوپر قسمیں بتائی جاتی ہیں، ــــــ دُنیا کا سب سے بڑا پھول جزائر سماترا و جاوا میں پایا جاتا ہے اس پھول کو سب سے پہلے Reflesia نامی انگریز سیاح نے دریافت کیا تھا، اس لئے اس کا نام بھی یہی پڑ گیا ــــــ Reflesia درخت

پر چڑھنے والی ایک ایسی بیل ہے جس کا تنا نہایت باریک ہوتا ہے جو دوسرے پیڑوں کے تنوں اور شاخوں سے لپٹ کر اپنی نشو و نما کے لئے خوراک حاصل کر سکتی ہے۔

Rafflesia دُنیا کا سب سے بڑا اور وزنی پھول ہے، اس کی چوڑائی تین فٹ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور وزن دس سیر کے لگ بھگ! یہ پھول بہت زیادہ بدبودار ہوتا ہے اس لئے نازک مزاج اور لطیف طبع تتلیاں اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتیں ——— مگر ہاتھی اس کی بُو سے بہت مانوس ہے۔ اور اس پھول سے گھنٹوں کھیل کر جی بہلاتا ہے، ہاتھی کے اس بہلانے جلانے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پھول کا زیرہ "مادہ نلی" تک پہونچ جاتا ہے! قدرت تتلیوں، مکھیوں اور بھونروں کا کام ہاتھی سے لیتی ہے، ہاتھی کی خوش فعلی میں بڑی نرمی اور آہستگی پائی جاتی ہے، وہ جانور جو تناور درختوں کی جڑیں ہلا سکتا ہے "ریفلیشیا" سے اس طرح کھیلتا ہے کہ کسی پھول کو بھی گزند نہیں پہونچتی۔

جانور خور پتیاں

سب لوگ جانتے ہیں کہ پتیاں جانوروں کی خوراک ہوتی ہیں، لیکن اسی دُنیا میں کچھ ایسی پتیاں بھی پائی جاتی ہیں جو جانوروں کو کھا لیتی ہیں، اس سلسلہ میں pitcher plant اور Bladder wort اور Venus Fly Trap خاص طور پر قابل ذکر ہیں اول الذکر عام طور پر بہتے ہوئے پانی میں ہوتا ہے، اس کی پتیاں غبارہ نما ہوتی ہیں اور سطح آب سے اوپر اُٹھی رہتی ہیں، سورج اور چاندنی کی روشنی جب ان پتیوں پر پڑتی ہے تو ان میں خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی ہے، یہ چمک بھنگوں اور چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہے اور جو کوئی بھنگا پتی کے جوف میں داخل ہوتا ہے، پتی اپنا منھ بند کر لیتی ہے اور پھر بھنگا نکل کر باہر نہیں جا سکتا، یہ نازک قید خانہ بھنگے کے لئے موت کا کنواں بن جاتا ہے۔ پتیاں اس بھنگے یا کیڑے کو چوس کر اپنی غذا حاصل کرتی ہیں اور جب یہ کام ہو چکتا ہے تو پتیوں کا منھ کھل جاتا ہے، اور فضلہ باہر گر جاتا ہے۔

یہی حال Venus Fly Trap کا ہے، جب قسمت کا مارا کوئی بھنگا اس پر آبیٹھتا ہے تو پتی اس قدر آہستگی کے ساتھ بند ہو جاتی ہے کہ غریب بھنگے کو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں تک کہ پتی کا منھ بالکل بند ہو جاتا ہے، اور بھنگا اُس میں قید ہو کر رہ جاتا ہے۔

دعوتِ فکر و بصیرت

شہد کی مکھیاں اور تتلیاں ایک پھول کا زیرہ دوسرے پھول تک پہونچاتی رہتی ہیں، زیرہ پھولوں میں پیدا ہوتا ہے، پھول کو زمین اُگاتی ہے، اس سلسلہ کو اسی طرح پھیلاتے اور بڑھاتے جایئے، یہ سلسلہ یقیناً کسی نہ کسی "ذات" پر جا کر رُک جائے گا، جو تمام علتوں کی علت Final cause ہوگی، سائنس اس مقام پر پہونچ کر متحیر ہو جاتی ہے معلوم اُس "ذات" کو "نامعلوم قوت" کہہ کر چپ سادھ لیتی ہے "نامعلوم قوت" کی نقاب سائنس سے ابھی تک نہیں اُٹھ سکی ——— کسی اہلِ دل اور صاحب نظر شاعر نے پھول کو دیکھا اور بے اختیار پکار اُٹھا ——— ؏

اے گُل! بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

شاعر کا یہ "کسے" سائنس کی "نامعلوم قوت" اور فلسفہ کی "علت العلل" مذہب کی زبان میں "خدا" کہی جاتی ہے، سعدی شیرازی نے اسی لئے تو پھول کی ایک ایک پتی کو معرفتِ کردگار کا دفتر کہا تھا ——— اُردو زبان کا مشہور شاعر دیاشنکر نسیم بھی لالہ و گُل اور سبزہ و ریحان کے اس اہتمام کو دیکھ کر اس طرح نغمہ سنج ہوا ہے۔

Bladder wort ط

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے زباں کا حمدِ باری

کسی "صنعت" کی معرفت ناقص اور اس کا علم ادھورا ہے اگر اس کے "صانع" کی دریافت نہ ہو سکے! دنیا میں آپ ہی آپ کوئی چیز نہیں بن جایا کرتی ہے، چیزیں بنائی جاتی ہیں تو بنتی ہیں۔

گل و لالہ یقیناً تعریف کے سزاوار ہیں مگر ان کا پیدا کرنے والا اور زیادہ حمد و ستائش کا مستحق ہے ——— قرآن پاک میں پھولوں کی خوشبو کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :- "فَبِاَیِّ آلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَان" — یعنی تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو آخر جھٹلاؤ گے "

جو آنکھ پھول پتوں کے نقش و نگار ہی میں بس الجھ کر رہ گئی یا ساری عمر ڈالیوں کی لچک اور پھولوں کی رعنائی سے کھیلتی رہی اس کی محرومی پر افسوس آتا ہے ——— سعادتیں اس کے لئے مقدر ہیں جس کا وجدان باغ و بہار کو دیکھ کر نغمہ سنج ہو جائے کہ :- ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لا الٰہ ہے گوید

یقین و معرفت کا یہی وہ مقام ہے، جہاں انسانیت بلند تر اور زندگی "بے کنار و بے کراں" بن جاتی ہے، جس نے اس بھید کو پا لیا، کلیاں دبی زبان سے "آئینِ آداب" کہتی ہیں! ؎

دبی زباں سے کلیوں کے لب پہ ہے آداب
گلوں کی تنگ قبائیں سلام کہتی ہیں! (ماہرالقادری)

علم الاشیاء کی آخری حد اشیاء کے صانع اور بنانے والے کی پہچان ہے، فکر و تحقیق کی انتہا "اقرارِ ذاتِ باری" اور "معرفتِ الٰہی" ہی ہونا چاہئے۔

اور

جو یہ نہیں تو بابا! پھر سب کہانیاں ہیں

اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آفتاب کی حرارت پودوں کو قوتِ نمو دیتی ہے اور پانی کی ٹھنڈک اور نمی رگ و ریشہ کو سوکھنے نہیں دیتی، اشیاء میں تاثیر و انفعال کی قوت اللہ کی ہی بخشی اور پیدا کی ہوئی ہے ؎

نورم تو بر فروز و شبنم را تو نور دہ
ایں کارِ تست، کارِ مہ و آفتاب نیست

لالہ و گل کو قدر و تحسین سے دیکھنے والی نگاہ کو خالقِ کون و مکان کی ربوبیت کے آگے سرِ عجز و نیاز جھکا دینا چاہئے۔ کہ اسی کی ذات شکر و امتنان کی سزاوار ہے۔

ماہر القادری

مثنوی میر حسن ← سحر البیان

تمدن نام ہے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا ——— انفعال و تاثر کا یہ سلسلہ تاریخ کے ہر دور میں نظر آتا ہے سدا سے یہی ہوتا آیا ہے کہ دیئے سے دیئے جلا کئے ہیں، پچھلوں کے تجربے ہمارے کام آئے اور ہماری کوششیں آنے والوں کے کام آئیں گی، ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتے ہیں، کوئی حال اپنے ماضی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا؛ تمدن و تہذیب کی بورنگ آرائیاں اور ترقیاں "قدامت" کی عظمت پر گواہی دے رہی ہیں، ماضی نہ ہوتا تو حال کہاں سے پیدا ہوتا

کوئی قوم اور جماعت جب زوال آمادہ ہوتی ہے تو اس کی مت ماری جاتی ہے اور ذہن کا سانچہ بگڑ جاتا ہے، ذہن و خیال کے اس انتشار نے انسانی معاشرہ کو ہمیشہ پراگندہ کیا اور شدید نقصان پہونچایا ہے ——— آج بھی یہی ہو رہا ہے، ایک گروہ سوسائٹی میں ایسا پیدا ہو گیا ہے جو دماغ کی بجائے معدہ سے سوچتا ہے، اور اپنی اس "سوچ" پر وہ فخر کرتا ہے اور چاہتا ہے بلکہ اصرار کرتا ہے، کہ ساری دنیا اسی کے انداز پر سوچے، سمجھے اور چلے۔

جہاں کسی نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا اور "ترقی و انقلاب" کی بارگاہ سے اس پر "قدامت پرستی" کا فتویٰ صادر ہو گیا، بلکہ جڑ دیا گیا، شعر و ادب کی دنیا میں اس انداز کی تنقید نے عجیب انتشار اور گمراہی پیدا کر دی ہے، ذہن کی کسوٹی چونکہ خود اپنی ذات سے بگڑ گئی ہے، اس لئے کھوٹے کو کھرے کا مقام مل گیا ہے اور شعر و ادب کی بزم میں جو پائیتن میں بھی جگہ پانے کے قابل نہ تھے آج صدر نشین بنے بیٹھے ہیں۔

اردو زبان اور اس کا ادب جو ہم تک پہونچا ہے، یہ پچھلے شاعروں اور ادیبوں کی کوششوں کا حاصل ہے وہ نہ ہوتے یا ان کے کارنامے ہم تک نہ پہونچتے تو ہمارے پاس چند "لفظوں" کے سوا کچھ نہ ہوتا اور ہمیں یہ عمارت جو آج سر بفلک نظر آتی ہے، نئے سرے سے بنانی پڑتی، گزرے ہوئے مشاہیر کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنے خون جگر سے زبان کے پودے کو سینچ کر ہمارے حوالے کر دیا اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس پودے کی حفاظت کریں، اور اُسے پانی اور غذا دے کر پروان چڑھائیں، اس پودے کی ایک ڈالی بھی اگر ٹوٹ گئی تو یہ قومی اور ادبی گناہ بخشا نہیں جائے گا ——— یہ "ادب کا شرک" ہے اور شرک معاف نہیں کیا جاتا ———

مقصد اور پیام؟

جن بزرگوں نے اردو زبان کو سنوارا، نکھارا اور سجایا ہے، ان میں میر حسن دہلوی کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے! میرے اس جملے پر کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ میر حسن کی یہ خصوصیت تو اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انہوں نے زبان کو مانجھ کر اُجلا بنا دیا مگر ان کی شاعری کا مقصد اور خود اُن کا پیام کیا تھا؟ ——— میں پوچھتا ہوں کہ برسات میں جو یہ رنگ برنگ کی دھنک دکھائی دیتی ہے، باغوں میں نورس غنچے مسکراتے ہیں، کھیتوں میں دوب لہکتی ہے اور قمریاں اور بلبلیں چہکتی ہیں، ان کا مقصد اور پیام کیا ہے؟ کیا یہ دلکش نظارے اور سامعہ نواز چہکاریں،

بیکار ہیں؟ کیا، انسانی زندگی ان سے کوئی لطف اور اثر قبول نہیں کرتی؟

مقصد اور افادیت توپوں کی گرج ہی میں نہیں، پرندوں کی چہکاروں میں بھی ہے، جو کان صرف توپوں کی گرج سننے کے خوگر ہیں وہ احساسِ تشنگی کی لطافت کھو بیٹھتے ہیں اور یہ زندگی کا بہت بڑا نقصان ہے ——— حق پرست یک رخی بات نہیں کیا کرتے تو اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کردوں کہ جن کانوں نے چہکاروں اور نغموں کے سوا اور کچھ نہیں سنا، توپوں کی گرج ان کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوتی ہے، جلال وجمال اور رزم وبزم کے اسی توازن سے زندگی کے لئے مقصد اور پیام کی راہیں نکلتی ہیں۔

فردوسی نے جہاں رزمیہ مناظر کی بے مثال ترجمانی اور عکاسی کی ہے اور اس میں عجیب جوش، ولولہ، اور عسکری قوت پائی جاتی ہے وہاں اس نے افراسیاب کی خوش جمال لڑکی منیژہ پر جو چند شعر کہے ہیں وہ بھی شعروادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں، ؎

منیژہ منم دختِ افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

اس میں لڑکی کی نسوانی غیرت اور فطری شرم وحیا کو دکھایا ہے ——— یعنی میں ایسی غیرت مند اور باحیا ہوں کہ آفتاب کی آنکھ نے بھی میرے جسم کو برہنہ نہیں دیکھا ——— پھر اس کے جوڑا باندھنے کی کیفیت جس انداز میں مصوّر کی ہے، وہ شاعری کی معراج ہے ؎

بہم بستہ مو را بصد پیچ و تاب
گرہ داد شب را پسِ آفتاب

آج کا "ترقی زدہ" نقاد کہے گا کہ یہ شاعری "سامراجی دور" کی یادگار ہے ——— مگر ان کے اس طوفانِ طنز اور جوشِ عتاب کے باوجود ایسی "شاعرانہ یادگاریں" خواہ وہ کسی دور ہی کی کیوں نہ ہوں ادب میں باقی رہنی چاہئیں، اور باقی رہیں گی، آپ اپنے ادب کے زور سے کارخانوں میں مزدوروں سے ہڑتالیں کرا سکتے ہیں، مگر طبیعتوں سے ذوقِ شعری نہیں چھین سکتے ——— اور تو اور سعادت یار خاں رنگین کا یہ شعر ؎

میں تو پہننے کی نہیں کل کی اوڑھنی
باجی مجھے منگا دے جھلاجھل کی اوڑھنی

ایک معصوم چٹخارہ اور خاص لطف رکھتا ہے، اس لئے وہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ باغ وبہار اور گل وبلبل سے ہمیں "پیام" کیا ملتا ہے، یا مل سکتا ہے، تو پچھلے شاعروں اور ادیبوں نے اس کا بھی اتا پتا دے دیا ہے، سعدی شیرازی درختوں اور پودوں کی ایک ایک پتی کو "معرفتِ کردگار" کا دفتر سمجھتے ہیں اور پنڈت دیا شنکر نسیم باغ وبہار ہی کے مضمون کی زبان سے یہ پیام دیتے ہیں ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے زباں کا حمدِ باری

میر حسن دہلوی کی شاعری کا ذکر چھڑا تھا اور بہت سی دوسری باتیں درمیان میں آگئیں مگر یہ "دوسری باتیں" بہت ضروری تھیں، اس تمہید نے میری دشواریوں کو آسان بنا دیا اور پڑھنے والوں کے لئے آسان تر! تنقید نگار جب تک خوب کھل کر اپنے دل کی بات ظاہر نہیں کرتا اس وقت تک موضوع، مفہوم اور ان کا باہمی ربط بھنچا بھنچا اور دبا دبا سا رہتا ہے۔

غالب سے پہلے

میر حسن دہلوی اور دوسرے شاعروں نے زبان کو جو سنوارا ہے اور ترقی دی ہے، وہی زبان ہم تک پہونچی ہے اور اسی سرمایہ سے آج ہم کام لے رہے ہیں، ان بزرگوں نے صرف "الفاظ" اور "ترکیبیں" ہی نہیں "خیال" بھی ہمیں دئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اظہارِ خیال کے "گر" ڈھنگ، انداز اور طور طریقے بتائے ہیں۔

غالب یقیناً اپنے طرز کا موجد ہے مگر "ایجاد" غالب سے پہلے میر حسن کی شاعری کے اُفق سے کہیں کہیں جھانکتی اور اشارہ کرتی نظر آتی ہے، کہتے ہیں ؎

نے دُود ہوں مجمر ہوں نہ میں آہ کا شعلہ
ہیں نالۂ شبگیر ہوں اور آہِ سحر ہوں

غالب کے اس شعر میں ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کیا میر حسن کے شعر کی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی؟ میں نے "روح" کا لفظ قصداً استعمال نہیں کیا، بعض وقت تنقید میں ضرورت سے زیادہ محتاط بن جانا پڑے۔

غالب کی وہ غزلیں :-

ع   کوئی اُمید بر نہیں آتی ———— اور
ع   دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟

ذہن میں رکھ کر، میر حسن کی غزل کے اس شعر کو پڑھیئے :- ؎

نہ کسی کی کہیں نہ اپنی سنیں
نقشِ دیوارِ بوستاں ہیں ہم

غالب کی "طرز و ایجاد" کے شرف کو میں مشتبہ اور مشکوک بنانا نہیں چاہتا اور نہ ایسی گستاخی کی جرأت کرسکتا ہوں —— دکھانا یہ مقصود تھا کہ بڑے بڑوں کے فکر و خیال اور اظہار و بیان پر پچھلوں کے انداز و خیال کی پرچھائیاں پڑی ہیں اور ماضی کے شعر و ادب پر "قدامت پرستی" کی تہمت دھر کر اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ان تہمتوں اور الزاموں سے تھوڑی دیر کے لئے محفل میں گرمی تو پیدا ہوسکتی ہے مگر ایسی مصنوعی گرمی اور بناوٹی حرارت شعر و ادب کے مزاج پر مضر اثر ڈالتی ہے اور ہنسی ہنسی اور دل لگی دل لگی ہی میں ادب کو روگ لگ جاتا ہے۔

مثنوی شروع ہوتی ہے

میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان (بے نظیر و بدرِ منیر) ہمارے سامنے ہے، یہی وہ مثنوی ہے جس پر عبدالحلیم شرر اور برج نرائن چکبست میں بڑے دور کے ادبی معرکے رہے ہیں۔

یہ مثنوی اب سے پونے دو سو سال پہلے کی تصنیف ہے۔ مصحفی نے اس کی تاریخ کہی ع

یہ بُت خانۂ چین ہے بے بدل
۱۱ھ ۹۹

اور میر شیر علی افسوس نے دیباچہ لکھا، میر شیر علی نے اس مثنوی کی تعریف میں مبالغہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے مثنوی کی فصاحت و بلاغت اور قبولِ عام کی تعریف اور ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا :۔

" احیاناً اگر کسی شعر میں غلطی یا اُس کی بندش میں سستی پائی جائے تو قابلِ نام دھرنے کے اور اعتراض کرنے کے نہیں۔ اس لئے کہ جہاں ہُنر کی کثرت ہوتی ہے وہاں عیب بہ قلت شمار میں نہیں آتا . . . . "

میر حسن دہلوی آج کل کے " ترقی پسند " تو ہیں نہیں جو خدا کے نام سے چڑتے ہیں اور خدا کے نام کی جگہ " قوت و حیات " کا نام لے کر آغاز کار کرتے ہیں ــــــــــ وہ تو سچے اور پکے مسلمان ہیں، عشق و محبت کی داستان چھیڑتے ہوئے بھی اُنہیں خدا اور رسولؐ یاد آتے ہیں، پورے یقین اور کامل عقیدت کے ساتھ کہتے ہیں :۔

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم ۔۔۔ جھکا جس کے سجدے کو اول قلم
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک ۔۔۔ تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک
پرستش کے قابل ہے تو اے کریم ۔۔۔ کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

اور نعتِ رسولؐ میں :۔

نبی کون یعنی رسولؐ کریم ۔۔۔ نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیم
ہوا علم دیں اس کا جو آشکار ۔۔۔ گزشتہ ہوئے حکم تقویم[1] پار
محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں ۔۔۔ ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

اس کے بعد مناقب بیان کئے ہیں، پھر خدا کی بارگاہ میں عرضِ حال کیا ہے، یہ مناجات بہت ہی سیدھی سادی اور اثر انگیز ہے، دُعاؤں اور فریادوں میں تکلف اور بناوٹ نہیں ہوا کرتی !

پلاٹ مثنوی سحر البیان کے پلاٹ میں کوئی خاص قدرت اور قابلِ ذکر بات نہیں ہے، اُس زمانہ میں عام طور پر قصوں اور افسانوں کے ہیرو بادشاہ اور شاہزادے ہوا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں دیووں، جنوں، چھلاووں اور پری زادوں کا ذکر بھی لانا ضروری تھا، اس دور کے قریب قریب تمام قصوں کہانیوں میں الٹ بدل کر یہی پلاٹ ملتا ہے، کہ کوئی شاہزادہ کسی شاہزادی کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے، اور اُس کو کوئی دِل پھینک قسم کی پری اُڑا لے جاتی ہے، پھر بڑی تدبیروں کے بعد شاہزادہ کو اس طلسمات سے رہائی ملتی ہے ــــــــــ فسانۂ عجائب جو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کی تصنیف ہے اُس کا " خاکہ " بھی اسی انداز پر مرتب کیا گیا ہے۔

جو سوسائٹی " آرائش محفل " اور " طلسم ہوشربا " جیسی داستانیں پڑھنے کی خوگر ہو گئی ہو، ظاہر ہے کہ اُس کے ذوق کی پذیرائی اور تسکین اسی قسم کی چیزوں سے ہو سکتی تھی ! افسانوں اور کہانیوں کے خاکے یقیناً سراہے جانے کے قابل نہیں ہیں اور اس جمہوری دور میں تو یہ باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں ــــــــــ مگر لکھنے والوں نے اظہارِ خیال اس قدر پاکیزگی، اور دلکشی و سادگی کے ساتھ کیا ہے کہ پلاٹ کی کمزوری کو حسنِ بیان چھپا لیتا ہے۔

یہ قصے اور کہانیاں کیا " عوامی " تھے ؟ یقیناً تھے اگرچہ ان میں عوام کی زندگیوں کی ترجمانی نہیں ہوتی تھی، لیکن عوام ہی کی دلچسپی اور ان کے پڑھے جانے کے لئے یہ کہانیاں تصنیف نہیں کی جاتی تھیں، بادشاہ، شاہزادے اور بیگمات اگر ان قصوں

---

[1] تقویم پارینہ۔

کو پڑھتی ہوں گی تو مصنف اور شاعر کی شوخیٔ خیال پر انہیں ضرور ہنسی آتا ہوگا کہ عشق و ہوس کی منزل میں شاہزادوں اور شاہزادیوں کو ان کے مقام عزت سے بارہا نیچے اُترنا پڑا ہے اور خود اُن کے کردار کے بارے میں بُری رائے قائم ہوتی ہے۔ ان قصوں اور کہانیوں میں عوام کو بتایا گیا ہے کہ یہ تمہارے خداوندانِ نعمت "ظل اللہ" اور ان کے اہلِ حرم اس کردار کے مالک ہیں!

مثنوی سحر البیان کی زبان میں سادگی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ روزمرہ شعر کے قالب میں ڈھلتا چلا گیا ہے، الفاظ کا استعمال قرینہ کے ساتھ ہوا ہے، جگہ جگہ نگینے جڑے نظر آتے ہیں، پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ شعر کہتے وقت شاعر کی طبیعت پوری آمادہ تھی اسی "آمد" نے سادہ شعروں کو سحرِ حلال بنا دیا۔

مثنوی سحر البیان میں ایسے لفظ بھی ملتے ہیں جو اب دونوں نہ دہلی میں بولے جاتے ہیں اور نہ لکھنؤ میں! ——— مگر یو۔پی کے قصبوں اور قریوں میں یہ لفظ آج بھی استعمال ہوتے ہیں ——— مثلاً پاس (near) کو "کنے" اور "کھینچنے" کو "اینچنا" نظم کیا گیا ہے۔

شاعر نے افراد کے "کردار" بھی نفسیاتی انداز میں خوب خوب بیان کئے ہیں، روزمرہ اور بولی ٹھولی نے شعروں میں ناول کا لطف پیدا کر دیا ہے۔

شاہزادے کے لئے

بادشاہ کے بدقسمتی سے کوئی اولاد نہیں ہے، اس بات کا اُسے بہت غم رہتا ہے، یہ جاننے کے لئے بادشاہ کی قسمت میں اولاد ہے کہ نہیں ہے؟ وہ اپنے ملک کے مشہور نجومیوں، جوتشیوں اور رمالوں کو بُلاتا ہے! رمال بادشاہ کے حضور میں آ کر رمل کی شکلیں بناتے ہیں، جوتشی پوتھی اور جنم پترا دیکھتے ہیں اور نجومی زائچے تیار کرتے ہیں۔ میر حسن نے خوبصورتی کے ساتھ ان فنون کی اصطلاحیں نظم کی ہیں اور یہ چیز ان کی وسعتِ علم پر دلالت کرتی ہے۔

رمل۔ زن و زوج کی شکل میں ہے فرح	پیا کرے وصل کا تو قدح
نجوم۔ نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر	تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر
جوتش۔ جنم پترا شاہ کا دیکھ کر	تلا اور برچھیک پر کر نظر

آج کل کا ذہین طبقہ فلموں کی ٹیکنک سے واقفیت رکھتا ہے اور پچھلے لکھے پڑھے لوگ طب، نجوم، رمل، اور ہیئت جانتے تھے، ان میں سے بعض مضامین نصابِ تعلیم میں داخل تھے۔

"خوش فہمی" سے کام لیا جائے تو اس مثنوی کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر مختلف اقسام کے علوم و فنون میں اگر دستگاہ نہیں تو اُن سے واقفیت ضرور رکھتا ہے اور اگر شک و شبہ کو جگہ دی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے کسی سے پوچھ کر یا ان علوم و فنون کی ابتدائی کتابیں سرسری طور پر دیکھ کر، اصطلاحوں کو نظم کر دیا ہے ——— مگر ہم بدگمانی کیوں کریں، "تہمت"، "الزام"، "بدگمانی"، اور "سوءِ ظن" شریف آدمیوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔

سازوں کے ذکر میں، شہنائی، ترہی، جھانجھ، چنگ، مردنگ اور مرچنگ، کے ساتھ سارنگی بجانے کے گز، دکھانچے، اور مسند اور سارنگی درست کرنے کی کھونٹیوں (تربیں) تک کے نام بیان کئے ہیں۔

رقص و سرود کے سلسلہ میں بھانڈ، ڈھول، بھگتیوں، چونر بز نیول، اور کنچنیوں اور رنیت کاروں کے نام آئے ہیں ——— کپڑوں میں تمامی، دوچہ، اور مقیش اور زیوروں میں دھکدکی اور جگنو اس پتلون و فراک اور نیکلیس پہننے والی دنیا کے لئے بالکل نئے، گلے میں پہننے کا پرانا زیور۔

اجنبی ہیں۔

شاہزادہ کے پیدا ہونے پر شاہی محل میں بڑی دھوم دھام ہوتی ہے، ناچ رنگ، گانا بجانا، شادیانے، شہنائیاں، زمزمے اور تہنیتیں! ــــــ شاہزادہ بڑا ہونے لگتا ہے، اور اس کے لئے شہنشاہ کے حکم سے ایک خانہ باغ ترتیب دیا جاتا ہے، یہ خانہ باغ کیا ہے، زمین کی جنت ہے:۔

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ　　ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان　　لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار　　دروں پہ کھڑی دست بستہ بہار
دیئے ہر طرف آئینے جو لگا　　گیا چوگنا لطف اُس میں سما
کہوں کیا میں کیفیت داربست　　لگائے رہیں تاک واں مے پرست
روش کی صفائی پہ بے اختیار　　گل اشرفی نے کیا زر نثار
لیئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں　　چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں
صدا قمریوں کی بطوں کا وہ شور　　درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتش گل سے دہکا ہوا　　ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق　　کریں طوطیاں بوستاں کا سبق

سماں قمریاں دیکھ اُس آن کا
پڑھیں باب پنجم گلستان کا

تو یہ باغ جس کے دروازے پر بہار ہاتھ باندھے کھڑی ہے، اُس میں شاہزادے کی ٹہل اور خدمت کے لئے لونڈیاں خواصیں، دَدا، دائیاں، اور مغلانیاں موجود ہیں، اُن کے نام بھی دلکش اور رنگین ہیں ــــــ گلاب، چنبیلی، کیتکی، سیوتی، ماہتاب؛ ؎

رنگیلی کوئی اور کوئی شیام روپ
کوئی چت لگن اور کوئی کام روپ

شاہزادے کے ارد گرد ان شوخ مہوشوں کا جمگھٹا رہتا ہے، یہ خواصیں بڑے ٹھسّے اور بناؤ سنگھار سے رہتی ہیں ــــــ خوش رنگ لباس، ہر وقت سولہ سنگھار کئے اور پان کا لاکھا اور مسّی کی دھڑی ہونٹوں پر جمائے ہوئے! ان کی شوخیوں اور خوش فعلیوں نے خانہ باغ میں عجیب گہما گہمی پیدا کر دی ہے۔

شاہزادے نے ہوش سنبھالا تو اُس کے پڑھانے کے لئے کامل الفن اتالیق مقرر ہوئے، چند سالوں کی کوشش میں

؎ انگور کی بیل چڑھانے کی ٹٹی۔　　؎ اقبال نے اسی خیال کو ترقی دے کر عجب انداز سے بیان کیا ؎

اُڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

خانوادۂ شاہی کا چشم و چراغ معقولات و منقولات کا عالم ہو گیا، ——— ایک شعر میں شاعر نے صنعت سے شیشہ گری کی ہے :- ؎

کیئے علم نوکِ زباں حرف حرف
اسی نحو سے اُس نے کی عمر صرف

اس کے ساتھ ہی خطاطی کی مشق بھی جاری ہے، یہاں تک کہ شاہزادہ نسخ، ریحان، غبار، عروس الخطوط، ثلث، رقاع اور نستعلیق میں یدطولیٰ حاصل کر لیتا ہے، پھر اُسے موسیقی اور ساتھ ہی تیر اندازی اور شمشیر زنی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

تمدن کی جھلکیاں

یہ مثنوی میرحسن کے زمانہ کے تمدن کی بہت کچھ آئینہ دار ہے، مسلمانوں کے یہ انحطاط اور زوال کا دور تھا، رامش و رنگ کی طرف طبیعتوں کا عام طور پر میلان تھا، چنانچہ میرحسن نے بادشاہ کی محفلوں میں طوائفوں کے ناچ رنگ اور گانے بجانے کا خوب مزے لے لے کر ذکر کیا ہے۔ اس عہد میں طوائف، امیروں شریفوں اور اُجلے پوشوں کی محفلوں کا ایک جزء سمجھی جاتی تھی ——— میرحسن نے نہایت تفصیل کے ساتھ گانے والیوں کی "نرت" کا ذکر کیا ہے، اُن کے بھاؤ بتانے اور نرت کرنے کی اس انداز میں ترجمانی کی ہے کہ یہ داستان "شنیدہ" نہیں "دیدہ" معلوم ہوتی ہے، نرت دیکھے بغیر کوئی اتنی صحیح تصویر صرف سُن کر نہیں کھینچ سکتا، ——— پوری قوم کی قوم ان رنگ رلیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، میرحسن نے شاعرانہ مزاج بھی پایا تھا، تو وہ ان چٹخاروں سے کیسے بچے رہتے!

لغزشیں

رقص و سرود اور اداکاری کی اس ترجمانی اور عکاسی کو اگر گوارا بھی کر لیا جائے، مگر جہاں میرحسن "معاملات" باندھتے ہیں وہاں اُن کی شوخیٔ طبع ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے جسے اخلاق گوارا نہیں کر سکتا، ہوس کی باتوں میں ظاہر ہے کہ نفس کا چٹخارہ شریک ہوتا ہے، اس لئے شاعر اس لذت کو طول سے طویل تر بنانا چاہتا ہے، شاعری کا یہی وہ تاریک اور مضرت رساں پہلو ہے جسے انسانیت کے سب سے بڑے غمخوار اور ہمدرد انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "والشعر من ابلیس" فرما کر اس "آرٹ" کی برائیوں کو کھول دیا۔

جب سے دُنیا قائم ہے ہوسناکی اور گناہ کے معاملہ میں انسان کی فطرت کا رجحان یکساں رہا ہے، فحاشی اور بدکاریوں کے ذکر سے بھی دل لذت حاصل کرتے ہیں ——— تو وہ رنگینی، شوخی اور برہنہ گوئی جس سے ہوس کو سہارا ملتا ہو، انسانوں کی زندگیوں کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح مضر ہے، یہ زہر کی گولیاں جن پر شکر لپٹی ہوتی ہے، تھوڑی دیر کے لئے کام و دہن کو حلاوت بخش ہو سکتی ہیں، مگر یہ لذت بڑی مہنگی پڑتی ہے۔

شاعری کی افادیت کے ہم منکر نہیں ہیں، لیکن شاعری کا یہ ہوس آمیز رُخ ہمیشہ تاریک رہا ہے۔ اس انداز کے شعروں نے دُنیا کو چٹخارے ضرور دیئے ہیں، اور جذبات کے لئے لذتیں بھی فراہم کی ہیں ——— مگر ان لذتوں اور چٹخاروں نے انسانی معاشرہ کو نقصان بھی پہنچایا ہے، اس حمام میں پہونچ کر نہ جانے کیا سوجھتی ہے کہ قریب قریب ہر شاعر برہنہ ہو جاتا ہے ——— یہی سبب ہے کہ "اسلام" نے جو انسانی سوسائٹی کے لئے زیادہ سے زیادہ افادیت اور ترقی کے ذرائع اور اسباب مہیا کرتا ہے، فنونِ لطیفہ میں مصوری اور موسیقی کو ناپسند کیا، اور شاعری کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

لے نحو قاعدے کو اور صرف خرچ کرنے کو کہتے ہیں اور یہ دونوں علم کے نام بھی ہیں۔

وہ شاعر جو یقیناً شاعرانہ عظمت کے مالک ہیں جب ان کی عریاں اور ہوس کارانہ شاعری پر ہم حرف گیری کرتے ہیں تو وہ لوگ جن کے دل و دماغ شاعرانہ لطافتوں سے بھی عاری ہیں اور جو اظہار ہوس کا بھی سلیقہ نہیں رکھتے، ان کی فحش شاعری ہمارے احتساب سے کس طرح بچ سکتی ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس انداز کی عریاں نگاری تو سودا سے ہوتی آئی ہے، ہمیں تنہا اس جرم کے مرتکب نہیں ہیں ــــ تو کسی برائی کا ہمیشہ سے ہوتے آنا اس کے جواز کی دلیل نہیں ہوسکتی، برائی اپنی قدامت کے سبب اچھائی نہیں بن سکتی، ــــ اور پھر جن شاعروں کو یہ "فحاش گروہ" اپنا ہم نوا سمجھتا ہے تو وہ اس باب میں بھی غلط اندیشی کا شکار ہے، قدیم شاعروں نے عریاں نگاری کو "آرٹ" نہیں سمجھا۔

ایک شخص اتفاق سے برہنہ ہو جاتا ہے ــــ صرف خوش فعلی اور شوخی کے لئے! دوسرا آدمی سربازار ننگا پھرتا ہے اور کوئی ٹوکتا ہے تو وہ اس برہنگی کو "آرٹ" بتاتا ہے اور اس کے جواز کے لئے دلیلیں تراشتا ہے ــــ ان دونوں کے زاویہ نگاہ میں زمین آسمان کا فرق ہے! ایک آدمی سے کبھی کبھار چوری کا گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور دوسرا آدمی چور بھی ہے اور ساتھ ہی "چوری" کو آرٹ کا نام دے کر اس کی تبلیغ بھی کرتا ہے۔

بہر حال جس شاعر نے بھی عریاں نگاری اور فحش گوئی سے کام لیا ہے اس کے کارنامہ کا وہ سیاہ ورق ہے۔ میر حسن دہلوی کے دامن پر بھی یہ چھینٹیں دکھائی دیتی ہیں، ہم بہت سے بہت یہ کر سکتے ہیں، کہ اُن سے چشم پوشی کر جائیں، مگر اُن کو سراہ نہیں سکتے!

مناظر میر حسن نے مثنوی سحرالبیان میں جہاں جہاں مناظر کی عکاسی کی ہے، وہاں اُن کا "آرٹ" نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے، اس فن کے وہ بادشاہ ہیں، منظر، ماحول اور گرد و پیش کو اس قدر واقعاتی انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کی نگاہ کے سامنے منظر ہو بہو مجسم ہو کر آجاتا ہے۔

ماحول اور منظر کی مناسبت سے وہ لفظ اور ترکیبیں بھی لاتے ہیں یہاں تک کہ لہجہ میں بھی اس کی رعایت پائی جاتی ہے۔ اپنے اس کمال کا اُنہیں خود بھی احساس تھا، اُن کی "خودی" اُنہی کی زبان سے بول اُٹھی:-

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہوگیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی ہے یہ، اک پھلجھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام — کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

ہر اک بات پر دل کو بٹ خوں کیا[1]
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا

اقبال نے اسی لئے تو کہا تھا:-

یا مُردہ ہے یا نزع کے عالم میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

[1] بعض میں "نے خوں کیا"

میرحسن کی شاعری کی امتیازی خوبی صفائی اور سادگی ہے ـــــــ لیکن صفائی اور سادگی کی خوبی تو ہر شاعر کے شعروں سے منسوب کی جاتی ہے، اس میں میرحسن کی کیا خصوصیت ہے ـــــــ تو سنئے! ہم عام طور پر ہر آدمی کو نیک کہہ دیا کرتے ہیں حالانکہ ہزاروں میں سے ایک آدمی بھی مشکل سے "نیک" ہوتا ہے، یہی شعروں کی صفائی اور سادگی کا عالم ہے، کہ یہی انداز میں عام طور پر صفائی اور سادگی ہر شعر سے منسوب کی جاتی ہے مگر ان میں سے کتنے شعر واقعی صاف اور سادہ ہوتے ہیں ـــــ تو میں نے میرحسن کے شعروں کی تعریف رسماً نہیں واقعی طور پر کی ہے کہ ان کے یہاں صفائی اور سادگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے! اور زبان کی گھلاوٹ کا تو جواب نہیں! ان کے بعض شعروں کی حلاوت کا یہ عالم ہے کہ پڑھتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ نہیں بلکہ مصری کی ڈلیاں منہ میں آپ ہی آپ گھلی جارہی ہیں -

محفل رقص و سرود :-

لگے بجنے قانون و بین و رباب ۔۔۔ بہا ہر طرف جوئے عشرت کا آب
لگی تھاپ طبلوں کی مردنگ کی ۔۔۔ صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے ۔۔۔ وہ پاؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوئے

بادشاہ کی داد و دہش :-

دیئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں ۔۔۔ مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر، لشکر کو زر ۔۔۔ وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو خوجوں کو جوڑے دیئے ۔۔۔ پیادے جو تھے اُن کو گھوڑے دیئے

شاہزادہ بے نظیر، بدرِ منیر کے باغ میں :-

جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر ۔۔۔ کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اتر
کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو ۔۔۔ ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ ۔۔۔ نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ
الگ کھولی ہاتھوں سے واں کے کواڑ ۔۔۔ چلا سایہ سایہ درختوں کی آڑ
نظر آئی واں چاندنی کی بہار ۔۔۔ کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
در و بام یک لخت سارے سپید ۔۔۔ ہر اک طاقِ محراب صبحِ اُمید
مغرّق[1] زمیں پر تمامی[2] کا فرش ۔۔۔ جھلک جس کی لے فرش سے تا بہ عرش
زمیں کا طبق آسماں کا طبق
سنہرے دو پہلے ہوں جیسے ورق

---

[1] جگمگاتا ہوا [2] ایک کپڑے کا نام

نظر تا زمیں کی جو اُس پر پڑی
ہوئی جا درختوں کے اوٹ جل کھڑی
کیا چھپ کے عالم پہ جو اُس کے دھیان
تو دیکھا عجب رنگ ہے وہ جوان
کہ دھانی پہ جوڑا گلے میں پڑا
چھپا سبزے میں چاند سا ہے کھڑا
کہے تو کہ شب چاندنے آن کے
نکالا ہے منہ کھیت سے دھان کے

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
وہ لالے کا عالم ہزارے کا رنگ
وہ آنکھوں کے ڈورے نشہ کی ترنگ

ضرب المثل :-

مسافر سے کوئی بھی کرتا ہے پیت
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

جنگل کا منظر :-

وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت
اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے
خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
ہوا بندھ گئی اس گھڑی اس اصول
بسیرا گئے جا نور ایسے بھول
درختوں سے لگ لگ کے باد صبا
لگی وجد میں بولنے واہ وا

بارات کا سماں :-

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز
چڑھا بیاہنے وہ مہ دل فروز
کروں اُس تجمل کا کیوں کر بیاں
کہ باہر ہے تقریر سے وہ سماں
وہ دولہا کے اُٹھتے ہی اک غل پڑا
لگا دیکھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑے کو لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
نکورشے وہ نوبت کے اور اُن کے بعد
گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دُھنیں
جنہیں گوشِ زہرہ مفصل سُنیں
وہ طبلوں کا بجنا وہ اُن کی صدا
وہ گانا کہ "اچھا بنا لاڈلا"
وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار
وہ موتی کا سہرا ہوا عذر نگار

---

[1] پیڑوں کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی　[2] ڈھول اور نوبت کی آواز

دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے — پتنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے
کڑکنا وہ نوبت کا باجوں کے ساتھ — گرجنا وہ دھونسوں کا دھول دھول کیساتھ
وہ ابرک کی ٹٹی وہ بیلنے کے جھاڑ — کہے تو کہ تنکے کی اوجھل پہاڑ
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار — ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
دھواں چھپ گیا نور میں نور ہو — سیاہی اُڑی شب کی کافور ہو

کہے تو کہ نزدیک اور دور سے
زمین و زماں بھر گیا نور سے

آخر بادشاہ کے دورِ حکومت کی تعریف کی ہے ؎

رعیت تھی آسودہ و بے خطر
نہ غم مفلسی کا نہ چوری کا ڈر

ان دو مصرعوں میں عوام کے امن و آسائش اور Public safety کی رُوح کو شاعر نے سچ مچ بند کر دیا ہے، عوام کی آسائش کے لئے آج بھی اس "معیار" پر اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

خدا کی حمد اور نبیؐ کی نعت سے یہ داستان شروع کی تھی اور آخر میں ختم بھی اسی پر کی ہے کہ اول بہ آخر نسبتے دارد

ہوا شہر پر فضلِ پروردگار — وہی شاہزادہ وہی شہر یار
وہی بلبلیں اور وہی بوستاں — شگفتہ گل و جمعِ دوستاں
انہوں کے جہاں میں پھرے جیسے دن — ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن

یوں سب کے بچھڑے الٰہی تمام
بحقِ محمد علیہ السّلام

نفیس چغتائی

بدیہہ گوئی

"مراویہ" اور "بداہت" شاعری کی دو قسمیں ہیں، غور و فکر کے بعد شعر کہنے کو "مراویہ" کہتے ہیں اور غور و فکر کئے بغیر شعر گوئی کا نام "بداہت" ہے، ہر شاعر اور موزوں طبع "بدیہہ گو" نہیں ہوتا، بدیہہ گوئی کے لئے بہت زیادہ مشاقی، ذہانت اور شعر سے غیر معمولی مناسبت درکار ہے۔

ناقدین کی رائے ہے کہ جو شعر بے ساختہ زبان یا قلم سے نکلے وہ اس شعر سے لطیف ہوتا ہے، جو غور و فکر کے بعد زبان یا قلم سے ادا ہو۔ فنِ شعر و ادب کی اصطلاح میں پہلی صورت کو آمد کہتے ہیں اور دوسری کو آورد۔

عربی شاعری میں بدیہہ گوئی کی مثالیں بیشمار ملتی ہیں۔ اکثر شعراء نے تو بڑے بڑے قصیدے چند لمحوں میں نظم کر دیئے۔ فارسی اور اردو میں بھی بدیہہ گوئی کی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن عربی شاعری کا پلّہ اس صنف میں بہت بھاری ہے، عرب شعراء بداہتاً اور ارتجالاً شعر کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

جب شعراء زبان اور شعر پر مکمل قادر ہو جاتے ہیں تو ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ وزن پر بالکل صحیح اترتے ہیں۔ اور یہی چیز بدیہہ گوئی کہلاتی ہے۔

ابو نواس خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں عرب کا ایک مشہور و معروف شاعر گزرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ایک سیاہ فام خالصہ نامی کنیز کو بہت عزیز رکھتا تھا، ایک دن خالصہ خلیفہ کے پاس بیٹھی تھی، اور اس کے گلے میں بہت قیمتی جواہرات کا ہار تھا، ہارون رشید اُس سے باتیں کر رہا تھا اتنے میں ابو نواس اپنی نظم لے کر آیا، اور خلیفہ کو سنانی شروع کی، مگر خلیفہ نے بالکل توجہ نہ کی اور بدستور کنیز سے گفتگو میں مشغول رہا، ابو نواس خلیفہ کے اس طرزِ تغافل پر بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور وہاں سے چلا آیا، آتے ہوئے دروازے پر ایک فی البدیہہ شعر اس نے لکھ دیا :۔

لقد ضاع شعری علی بابکم   کما ضاع عقد علی خالصه

"میرا شعر تمہارے دروازے پر اس طرح ضائع ہوا   جیسے موتیوں کا ہار خالصہ کے گلے میں"

بادشاہوں کے یہاں لگانے بجھانے والے لگے رہتے ہی ہیں، ہارون الرشید کے علم میں یہ بات لائی گئی۔ خلیفہ کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں، اس نے حکم دیا کہ ابو نواس کو فوراً حاضر کیا جائے، ابو نواس کے پاس جب شاہی چوبدار پہونچا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ میرے اس "شعر" کے سلسلہ میں یہ طلبی ہوئی ہے۔ ابو نواس خلیفہ کے حضور میں جاتے جاتے دروازے پر لکھے ہوئے شعر کے لفظ "ضاع" سے عین مٹاتا گیا، اور صرف ہمزہ کی (ء) چھوڑ دی۔ خلیفہ نے شعر کے بارے میں ابو نواس سے دریافت کیا، ابو نواس بولا کہ امیر المومنین میں نے تو یہ شعر کہا ہے :۔

لقد ضاء شعری علی بابکم   کما ضاء عقد علی خالصه

"میرا شعر آپ کے دروازے پر اس طرح روشن ہوا، جس طرح موتیوں کا ہار خالصہ کے گلے میں چمک رہا ہے"
ہارون الرشید بے ساختہ مسکرا دیا اور شاعر کو ایک ہزار درہم عطا کئے۔

عربی کا مشہور شاعر ابو العتاہیہ رات کے وقت بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھا تھا، پھٹ پٹے کا وقت تھا، ابو العتاہیہ نے دریافت کیا:-

هل رایت الصبح لاحا
کیا صبح کی روشنی ہو گئی؟

دوست نے جواب میں "نعم" (ہاں) کہا ——— ابو العتاہیہ نے پھر پوچھا۔

وسمعت الدیك صاحا
کیا تو نے مرغے کی بانگ سنی؟

اس کے دوست نے پھر سر ہلایا ——— اس پر ابو العتاہیہ بولا:-

انما بکی علی المغتر بالدنیا وناحا
اس نے اہل دنیا کی غفلت پہ چیخ ماری اور نوحہ کیا

اب اس کے دوست کو احساس ہوا کہ ابو العتاہیہ باتیں نہیں کر رہا تھا، شعر کہہ رہا تھا۔

امراء میں نظام الملک طوسی کے بعد خواجہ شمس الدین غیر معمولی قابلیت کا انسان گزرا ہے، علم و فضل کے ساتھ سخی اور شریف طبع بھی تھا، ۶۸۳ھ ہجری میں ارغوان خان کے حکم سے تبریز میں اسے قتل کر دیا گیا۔ ملک الشعراء مجد ہمگر نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ———

در ماتم شمس از شفق خوں بچکید
مہ چہرہ بکند و زہرہ گیسو بُرید
شب جامہ سیاہ کرد در ماتم و صبح
بر زد نفس سرد و گریباں بدرید

خواجہ شمس الدین محمد کے ماتم میں شفق سے خون ٹپکا۔ چاند نے اپنا چہرہ نوچا۔ زہرہ نے اپنی زلفیں کاٹ ڈالیں۔ رات نے ماتم میں سیاہ کپڑے پہنے۔ اور صبح نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے گریباں کو چاک کر دیا۔

شیخ سعدی نے جب اس رباعی کو سنا تو خوب روئے اور ان شعروں کی بہت تعریف کی۔

فردوسی طوسی اپنے زمانے کا بے مثال شاعر تھا۔ شاہنامہ اس کی لیاقت اور کمال کا روشن ثبوت ہے۔ کہتے ہیں طوس کے حاکم نے اس پر ظلم کیا۔ وہ انصاف چاہنے کے لئے غزنی گیا، وہاں سے عنصری کی مدد سے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہونچا۔

پہلے دن جب وہ غزنی پہنچا، بادشاہ کی درگاہ کے سامنے پھر رہا تھا، بادشاہ کے دربار میں جانے کے لئے "تقریب" کی تلاش میں تھا، ایک جگہ اس نے لوگوں کا مجمع دیکھا، اور کسی سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اسے جواب دیا گیا کہ ملک الشعراء عنصری اپنے دوشاگردوں فرخی اور عسجدی کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ یہ بھی آگے بڑھا، سلام کیا اور بیٹھ گیا۔

عنصری نے پوچھا۔ تو کون ہے؟ جواب دیا کہ ایک شاعر ہوں۔ طوس سے آیا ہوں۔

عنصری نے کہا کہ آؤ کچھ طبع آزمائی کریں۔ فردوسی ذرا آگے سرک گیا۔ عنصری نے کہا کہ ہم چار شاعر ہیں۔ ایک رباعی مل کر کہیں، عنصری نے آغاز کیا:-

چوں طلعتِ تو ماہ نباشد روشن
" تیرے چہرہ کی مانند چاند بھی روشن نہیں ہوتا "

دوسرا مصرعہ فرخی نے کہا :-

چوں قامت تو سرو نخیزد زچمن
" تیرے قد جیسا تو چمن میں سرو بھی نہیں اُگتا "

عسجدی نے کہا :-

مژگانت ہمی گذر کند از جوشن
" تیری پلکیں زرہ بکتر بھی چیر کر گزر جاتی ہیں "

فردوسی نے چوتھا مصرعہ بے ساختہ کہہ کر تینوں شاعروں کو حیران کر دیا :-

مانندِ سنانِ گیو در جنگِ پشن
" جس طرح گیو پہلوان کا نیزہ پشن کی جنگ میں "

مشہور ہے کہ نواب محبوب علی خاں والیٔ دکن نے سرکشن پرشاد کو ایک تلوار عطا کی۔ آپ نے فی البدیہہ ایک قطعہ شکریہ کے طور پر کہا :-

چو تیغ عدو کش ز شاہم رسید		ازاں شد ہزیت بہ دشمن رسید
ندائے بمن شاد ہاتف بداد		کہ نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب

آزاد مرحوم نے آبِ حیات میں بہت سے واقعات بدیہہ گوئی کے متعلق لکھے ہیں۔ سید انشاء اللہ کے متعلق لکھتے ہیں :-
بب شاعر فائق نامی نے انشاؔ کی ہجو کہہ کر خود آن کو سنائی۔ انہوں نے تعریف کی اور پانچ روپے معاوضہ بھی دیا۔ جب وہ جانے لگا تو کہا کہ حضرت ذرا ٹھہریئے گا۔ ابھی آپ کا حق باقی ہے۔ قلم اُٹھایا اور یہ قطعہ کہہ کر حوالے کیا :-

فائقِ بے حیا چو ہجوم گفت		دلِ من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم		دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

غالب اپنے ایک خط میں مرزا حاتم علی بیگ کو لکھتے ہیں :-
" میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ، بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھے کہا، کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے، میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی لے لی "

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلےٰ کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجئے فرض
نافۂ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے!
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدہ میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے!

انشاء اللہ خاں انشاؔ انتہائی ذہین اور خوش طبع شاعر تھے، طبیعت میں روانی اور جودت بھی قیامت کی پائی تھی، آزادؔ نے آبِ حیات میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انشاؔ ایک دن جراؔت سے ملنے کے لئے اُن کے گھر گئے، جراؔت آنکھوں سے معذور تھے۔ انشاؔ نے دیکھا کہ جراؔت کسی سے بات چیت ہی نہیں کرتے، کسی گہرے سوچ میں ڈوبے ہوتے ہیں، انہوں نے پُوچھا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ جراؔت نے کوئی جواب نہیں دیا، اس پر انشاؔ نے پھر دریافت کیا ——— انشاؔ کے بار بار اصرار پر جراؔت نے مصرعہ پڑھا کہ فکرِ سخن کر رہا ہوں، اس مصرعہ پر مصرعہ نہیں لگتا ع

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی

انشاؔ نے برجستہ کہا :- ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

ناسخؔ کے کسی دوست کا لڑکا فوت ہوگیا، انہوں نے فوراً تاریخ کہی " داغِ جگر " اتفاق کی بات کہ دوسرے سال اس بیچارے کا دوسرا لڑکا بھی چل بسا، ناسخؔ نے اس حادثہ کی خبر سُنتے ہی دوسری تاریخ نکالی " بَغ دگر "
صفدر مرزاپوری نے سبحان اللہ خاں رئیس گورکھپور کے طرحی مصرعہ پر اُسی وقت ایک مطلع پڑھا اور انعام حاصل کیا

آئینہ ہے کہ ہے قاتل کے مقابل قاتل
مجھ کو ڈر ہے کہیں لڑ جائیں نہ قاتل قاتل

مولانا عبدالمجید فضل جے پوری

آوازِ حق

جس نے قصرِ شہنشاہی کو ہلا دیا

حال اُس عہد کا کچھ تم کو سنانا ہے کہ جب
متمکن تھا خلافت کے وسادے پہ ہشام

حج کعبہ کو وہ اس شان سے اک بار گیا
جیسے ہو وادیٔ نملہ میں سلیمانؑ کا خرام

یاد آئے اُسے طاؤسِ یمانی جو وہاں
بات کی بات میں لے آیا اُنھیں ایک غلام

پہنے نعلین لبِ فرش تک آئے طاؤسؒ
بیٹھے پہلوئے خلیفہ میں پس از رسم سلام

پھر خلیفہ سے کہا "کیوں ترا کیا ہے مزاج"
یہ تخاطب سرِ دربار تھا بالفظِ "ہشام"

سخت برہم ہوا یہ سن کے ہشام اور کہا
"ہے یہ کیا بے ادبی، اور یہ کیا طرزِ کلام"

کُنیت طرزِ تخاطب کے لئے زیبا تھی
میں خلیفہ بھی ہوں اس نام سے کرتے اقدام

اور پھر ان کے سوا تیری یہ گستاخی
دست بوسی بھی نہ کی میری کہ ہے مذہبِ عام

ہوگیا مردِ خود آگاہ یہ سن کر بے تاب
اور للکار کے بولا کہ "خبردار! ہشام"

چومنا ہاتھوں کا جائز نہیں کہتے تھے علیؓ
"زن و بچہ کے سوا کوئی بھی ہو خاص کہ عام"

تو خلیفہ ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے ضرور
متفق تجھ پہ نہیں آج مسلمان تمام

کُنیت سے نہ کیا میں نے مخاطب جو تجھے
ہے نظر میں مری قرآن کا ایک ایک مقام

آدمؑ و نوحؑ و براہیمؑ کے ہیں نام لئے
تو لہب کہتا ہے کافر کو اللہُ العلّام

اب ذرا غور کرا ے عبدِ ملک کے فرزند
کتنا محتاط و مناسب ہے مرا طرزِ کلام

چونکہ طاؤسؒ کی تقریر تھی آزادانہ
قلبِ سلطاں میں کیا تیر کی مانند مقام

مُنہ سے بے ساختہ جاری ہوا "عظنی طاؤس"
تاکہ یاد آئیں رسولؐ اور خدا کے احکام

بولے بے واسطہ راوی ہیں علیؓ خود مجھ سے
کہ "جہنم میں سوا سب سے عذاب و آلام"

مستحق ہیں سلاطینِ ستمگر کے لئے
اور اُن کے لئے ظالم ہوں جو اُن کے حکام"

کہہ کے یہ ہوگیا وہ عالمِ قدآن کھڑا
اور باصد عظمت چل دیا کر کے سلام

علماء جس مراتِ حق پھر وہی پیدا تو کریں
آج دے سکتے ہیں شبدیزِ زمانہ کو لگام

دیکھو! تاریخ گزشتہ کے سفیروں نے کبھی
اُس کے بندوں کو سنایا بھی ہے یزداں کا پیام؟

صرف اللہ کے بندوں نے کہی ہے حق بات
بر سرِ دار گئے، گاہ بزیرِ صمصام

عاصیؔ کرنالی

مزدور کے دشمن

تجویز ہے کہ عشرتِ کردار دیجیے ... مزدور کو بھی خواہشِ بیدار دیجیے
ہے لالہ زارِ داغِ تمنّا جو اس کا دِل ... نظروں کو جنّتِ گُل و گلزار دیجیے
ساغر کی قیمتیں نہ اگر ہو سکیں وصول ... ترغیبِ مستیٔ نگہِ یار دیجیے
صرف اس نگاہ سے کہ بڑھے آرزو کا دِل ... ہر جستجو کو دعوتِ دیدار دیجیے
تخلیق کرکے منزل و جادہ نئے نئے ... رفتار، بلکہ تیزیٔ رفتار دیجیے
لگ جائے جس سے گلشنِ فکر و نظر کو آگ ... جذبات کو وہ گرمیٔ افکار دیجیے
ایجاد کرکے محنت و سرمایہ کا فریب ... طبقوں کو خوب دعوتِ پیکار دیجیے
افلاس و زرگری کے بنا کر مجسّمے ... ہاتھوں میں انتقام کی تلوار دیجیے
اخلاق کی وہ قدر بدلیے کہ واہ وا! ... عصمت کو اک مزاجِ ہوسکار دیجیے
کر دیجیے وقارِ حرم کے چراغ گُل ... عصمت کدوں کو رونقِ بازار دیجیے
ذوقِ جمال، حسنِ ادا، مستیٔ شباب ... سب کچھ بقدرِ لذّتِ دیدار دیجیے

مزدور سے تقدّسِ کردار چھین کر
قلب و نظر کی موت اسے مار دیجیے!

غربت ہے، بیکسی ہے، غمِ روزگار ہے ... مفلس ہے اور گردشِ لیل و نہار ہے
لیکن نہیں، سیاستِ ابلیس زندہ باد! ... مفلس کا ذہن گلشنِ عیش و بہار ہے
مزدور اگرچہ بندۂ افلاس ہے مگر ... مزدور پھر بھی عیش کا پروردگار ہے

"مزدوریت" کا ہاتھ اگر تنگ ہے تو کیا
"مزدوریت" کا ذہن تو سرمایہ دار ہے

لسان العصر اکبر الہ آبادی

فکر و حکمت

پیام

حضرت اکبر الہ آبادی اردو زبان کے سب سے بڑے طنّاز شاعر گزرے ہیں، مغربی تہذیب پر اکبر نے اُس وقت طنز کی جبکہ ہندوستان کے بڑے بڑے اہلِ فکر یورپ سے متاثر ہی نہیں بُری طرح مرعوب بھی تھے۔

اکبر کی شوخیٔ فکر کا کمال ہے کہ اُس نے "طنز" میں "حکمت" کو سمو دیا ہے، اکبر کا زاویۂ نگاہ خالص اسلامی ہے، اس لئے اپنے "پیام" کے اعتبار سے آفاق گیر ہے، آج کل کے کمزور دِل نوجوانوں کی طرح اکبر خدا کا نام لینے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے، اظہارِ حق میں کسی کی خوشی اور ناخوشی کی اُنہیں ذرا بھی پروا نہیں ہوتی، کس قدر یقین اور عزمِ محکم کے ساتھ کہتے ہیں:- ؎

خدا کی پاکی پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بُتوں کی
مری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

اس دورِ "الحاد و انکار" میں ضرورت ہے کہ خدا پرستانہ شعر و ادب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، "گرانیٔ محمل" کو دیکھتے ہوئے "حدی" کا تیز تر کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

ان شعروں میں حکمت ہے، زندگی ہے، پیام ہے! اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ شاعرانہ زورِ بیان، ندرتِ فکر اور حُسنِ خیال بھی پایا جاتا ہے۔ "م م"

تکبیر ہی اچھی تھی، اسپیچ میں تھے جھگڑے
دُنیا کی یہ زینت ہے عقبیٰ کے ہیں وہ وعدے
اس عہد میں اے اکبر! میں اسکو ولی سمجھا
صد شکر مری نظریں بہکی نہیں اے اکبر

ترک اس کو کیا ہم نے جس شور میں شر دیکھا
غافل نے اِدھر دیکھا عاقل نے اُدھر دیکھا
تھوڑا سا بھی کچھ جس دلمیں اللہ کا ڈر دیکھا
دُنیا بھی بہت چمکی، بُت نے بھی سنور دیکھا

آپ کیا پوچھتے ہیں مجھ سے خدا ہے کہ نہیں
علم بالفعل کا مجھ کو نہیں سابق میں تو تھا

طرزِ مغربی کو جو ہم نے دل کا مالک کر دیا
نور افشاں قوتوں نے اسٹرائیک کر دیا

کوئی ڈارون کا مرید ہے کوئی تجربوں کا شہید ہے
وہ خیالِ سرِّ ازل کہاں وہ سرورِ یادِ خدا کہاں

باطن کا جمال تکے بھی نظر اور رازِ دروں ظاہر بھی نہ ہو
آسان نہیں ہے اے اکبرؔ عاشق بھی بنے کافر بھی نہ ہو

اللہ کو جگہ دو تم اپنے دل میں اکبرؔ
اللہ خود ہی دے گا تم کو جگہ دلوں میں

اللہ ہی کو سمجھو مقصودِ علم و دانش
اللہ ہی کو ڈھونڈو ہستی کی منزلوں میں

رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ پر رکھو نظر ہمیشہ
ہر چند یہ طریقہ ہے سخت مشکلوں میں

قوتِ سیر جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن
قبضۂ غیر میں رہنا ہو تو تلوار نہ بن

دل کے جو دشمن ہیں اُنکے شوق میں رہتی ہے آنکھ
جان کا مالک ہے جو اُس سے نظر ملتی نہیں

خدا کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم
خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

عجیب معنیٔ نازک ہیں اس مقولہ میں
نظر وسیع جو ہو بندگی میں شاہی ہے

آنکھ مجبور نہیں بت کو اگر تکتی ہے
ہو خدا پر جو نظر بند بھی ہو سکتی ہے

کروں کیا غم کہ دنیا سے ملا کیا
کسی کو کیا ملا، دنیا میں تھا کیا؟

یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل
نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا؟

(مرتبہ پروفیسر سلیم چشتی)

عبدالمجید حیرت شملوی

آبگینے

اس طرح جس کی سزا دی جائے
وہ خطا بھی تو بتا دی جائے
کام آئے گا کسی کے کوئی
یہ توقع ہی اٹھا دی جائے

آج بھی جو وفا پہ قائم ہیں
وہ بھی ہیں لوگ کس زمانے کے

کاٹنا جس کا سخت مشکل تھا
وہ بھی آخر گھڑی گزر ہی گئی

جنوں کا ہے یہی عالم تو کب تک
گریباں کا تعلق آستیں سے
کسی کا کچھ نہیں دل کی خطا ہے
لگی ہے آگ سینہ میں یہیں سے

کوئی انصاف بھی ہے دنیا میں
بڑھ گئی جرم سے سزا میری

تم نے پوچھا ہمیں تو کب پوچھا
دل میں جب ایک قطرہ خوں نہ رہا
یہ ہمیں جانتے ہیں ہم حیرت
مہرباں کوئی ہم پہ کیوں نہ رہا

اس شب و روز کی مصیبت سے
دیکھئے کب نجات ہوتی ہے

اُنہیں دیکھا مگر حسرت تو یہ ہے
کہ جتنا چاہیے اُتنا نہ دیکھا

فاروق محشر بدایونی

محشرِ خیال

مسلسل دعوتِ جلوہ فروشی حسنِ جاناں کو
یہ محتاج وگدا کو دیکھتی ہے اور نہ سلطاں کو
ہوس نے دولتِ کونین رکھ دی میرے قدموں پر
ہم اہلِ دشتِ وحشت کا تماشا کیا، انہیں دیکھو
رہے شانِ کرم کے ساتھ تو قیرِ گدائی بھی
رہا ہوگا کبھی آلودۂ صہبا مرا داماں
غلط ہے یہ کہ گلشن میں بہاراں ہی بہاراں ہے

دل اپنے ظرف کو دیکھے نگاہیں اپنے داماں کو
محبت اِک نظر میں فتح کر لیتی ہے انساں کو
وقارِ عشق نے ٹھکرا دیا ہر ساز وساماں کو
جو گلشن میں گئے اور چاک کر لائے گریباں کو
کچھ اپنا ہاتھ تم لاؤ، بڑھاؤں کچھ میں داماں کو
میں اب تو آنسوؤں سے تر کئے بیٹھا ہوں داماں کو
کچھ ایسے بھی ہیں گوشے جو ترستے ہیں بہاراں کو

یہ اپنی فکر اور اپنی نظر کی بات ہے محشرؔ
کوئی ساحل کو تکتا ہے کوئی امواجِ طوفاں کو

باسط بھوپالی

ہنگامۂ شوق

وہ تو کچھ ان کی نگاہِ لطف کی تائید ہے
ان کی محفل میں بھی دل اکثر تڑپتا ہی رہا
ہر خوشی اک وقفۂ تیاریٔ سامانِ غم

ورنہ دِل اور حالِ بارِ گرانِ اضطراب
ہجر ہی تنہا نہ تھا شایانِ شانِ اضطراب
ہر سکوں مہلت برائے امتحانِ اضطراب

اس خطا پہ ہنگامے ہر طرف ہیں گلشن میں
دیکھ کر انہیں باسطؔ ہم کسی کو کیا دیکھیں

شاخِ گل پہ کیوں باندھا ہم نے آشیاں اپنا
اب کہاں کسی کے ہم اب کوئی کہاں اپنا

ان کا ہر بارِ کرم کہنے کے قابل ہو گیا
بارہا دیکھا ہے دل نے او مرے محشر خرام!

دل حقیقت میں جہاں ٹوٹا وہیں دل ہو گیا
حشر اُٹھا اور ترے قدموں میں شامل ہو گیا

بے خبر رہنا ہی اچھا اس جہانِ غیر میں
مٹ گیا جو واقفِ آدابِ محفل ہو گیا

ماہر القادری

ٹھوکر اور پھر سنبھل گئی

سردی یوں ہی شباب پر تھی، بوندا باندی کے ساتھ اولے جو پڑے تو جاڑے کے اور پر لگ گئے، فضائیں یخ بستہ اور ہوائیں برفانی ہوگئیں ـــــ جیسے قدرت نے اولوں کے پانی میں ہواؤں کو جب اچھی طرح بھگو لیا ہے، تب کہیں جاکر انکو حکمِ روانی دیا ہے کہ جاؤ اور جاکر جسموں میں تھرتھری پیدا کردو، آدمیوں کے دانت سے دانت بجا دو! جاندار تو جاندار لوہے کے کھمبے اور دروازوں کی کواڑیں تک سکڑی اور ٹھٹھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں، سردی کی شدت کے ساتھ آگ کی محبوبیت اور ہردلعزیزی بھی بڑھتی جارہی تھی، یار لوگ طنز اور ہنسی مذاق کے انداز میں کہتے تھے کہ اگر جاڑا اسی رفتار سے بڑھتا رہا تو ڈر ہے کہ کہیں لوگ آگ کو نہ پوجنے لگیں، ہر گھر آتشکدہ بن گیا تھا، کہیں کہیں تو چوبیسوں گھنٹے آگ جلتی رہتی ـــ قدرت نے آگ کے دن پھیر دیئے تھے، دہکتے ہوئے کوئلہ کے چٹخنے کی آواز کانوں کو بھلی لگتی، جیسے کسی نے دیپک راگ چھیڑ دیا۔

صالحہ اور رفیعہ انگیٹھی پر تاپ رہی تھیں ـــــ دونوں میں مشکل سے دو ڈھائی سال کی چھوٹائی بڑائی تھی، سہیلیاں رشتہ کی بہنیں، بچپن سے ساتھ کی کھیلی ہوئیں! اتنے بہت سے رابطوں نے دونوں میں آپ ہی آپ بے تکلفی پیدا کردی تھی صالحہ بہت زیادہ شرمیلی تھی اور ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی، نیا آدمی اس کی سنجیدگی کو دیکھ کر یہی سمجھتا کہ صالحہ کسی گہرے سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے" اور اس کمسنی میں بیچاری کو دنیا جہان کی فکروں نے گھیر لیا ہے ـــــ اور رفیعہ ہنسوڑ! بے تکلف، چرب زبان جہاں بیٹھتی لوگوں کو ہنسا کر اٹھتی، باتونی اس بلا کی کہ بھری محفل میں کسی کو بولنے نہ دیتی، اس کے گھر والے کہا کرتے تھے کہ رفیعہ اگر مرد ہوتی تو وکالت کے پیشہ میں نام پیدا کرتی، خاموش رہنا اسے آتا ہی نہ تھا، تنہائی میں اس کی زبان میں کھجلی ہونے لگتی۔ اُسے آپ ہی آپ باتیں اور اشارے کرتے بھی دیکھا گیا۔

صالحہ کا رنگ خوب کھلتا ہوا تھا، درمیانہ قد، شربتی آنکھیں، ناک نقشہ دیدہ زیب! بچپن میں پالنے سے گرنے کے سبب ٹھوڑی میں چوٹ لگ گئی تھی جس کا نشان باقی رہ گیا تھا، صالحہ جامہ زیب بھی تھی، ہر لباس اس کے سڈول جسم پر بہار دیتا، مگر دوپٹہ اور غرارے میں وہ شاعر کا "حسنِ خیال" نظر آتی ـــــ رفیعہ کی سانولی رنگت تھی، آنکھیں قدرتی طور پر سرگیں، ستواں ناک، چھریرا بدن، البتہ سر کے بال چھوٹے اور چھدرے چھدرے سے تھے ـــــ دنیا میں ہر عورت قلوپطرہ، اور شکنتلا نہیں ہوا کرتی، قدرت بہت فیاض ہے مگر خوبصورتی عطا کرنے میں نہ جانے وہ کیوں احتیاط سے کام لیتی ہے ناسمجھ اور اوچھی طبیعت کے لوگ قدرت کی اس "احتیاط" کو "بخل" سے تعبیر کرتے ہیں ـــــ ہاں! تو یہ دونوں انگیٹھی پر تاپ رہی تھیں، کمرہ بند تھا، جاڑے کے جارحانہ اقدام سے بچنے کے لئے یہاں ہر طرح کا مدافعانہ سازوسامان موجود تھا، کوٹ مفلر، اونی چادر، روئی کی فرد، کوئلے اور آگ بھی!

آج کا جاڑا بھی بس یادرہے گا، رفیعہ! آگ تک میں گرمی نہیں رہی ـــ صالحہ نے انگیٹھی کریدتے ہوئے کہا۔

مگر جس کے دل میں آگ سُلگ رہی ہو اُس پر تمہاری ان برفانی ہواؤں کا کیا اثر ہے ـــ رفیعہ نے جواب دیا۔

میں سمجھی نہیں! بعض وقت ..... تم ..... کچھ ..... صالحہ کی بات کاٹ کر رفیعہ نے کہا:-

یعنی یہ کہ میں مجذوبوں کی مانند بڑ ہانکنے لگتی ہوں۔ مجھ سے بات کرنی نہیں آتی، میری باتیں چیستاں ہوتی ہیں ..... تم یہی تو کہنا چاہتی تھیں صالحہ!

صالحہ نے آگ پر گرم کئے ہوئے ہاتھوں کو مُنہ پر پھیرتے ہوئے جواب دیا:-

معلوم ہوتا ہے آج تم گرم مسالہ پھانک کر اور لال مرچوں کا پانی پی کر آئی ہو، جبھی تو طبیعت چڑچڑی اور تیز ہوگئی ہے اچھا صاحب! ہم کچھ نہیں پوچھتے، ایک لفظ بھی زبان سے نکل جائے تو ان دہکتے کوئلوں سے میرے ہونٹ داغ دینا۔

دونوں میں تھوڑی دیر نوک جھونک رہی۔ دوستی اور میل جول میں کبھی کبھار خفگی اور گرما گرمی بڑا لطف دیتی ہے ـــ کبیدہ خاطری دونوں کو منظور نہ تھی، تند وتیز باتوں ہی میں نرمی اور آشتی کی راہ نکل آئی ـــ رفیعہ نے کہا:-

صالحہ رات ہمارے کالج میں مشاعرہ تھا، دُور دُور کے نامی گرامی شاعر آئے تھے ـــ وہ بھی جن کی شاعری کی ابھی مسیں بھیگ رہی ہیں اور ایسے بھی جن کی شاعری کا آفتاب لب بام آچکا ہے اور جو ..... ع

چراغ سحر ہیں بجھا چاہتے ہیں

مشاعرہ ہر حیثیت سے کامیاب رہا۔ بس دو ایک بار لڑکوں نے البتہ "ہوٹنگ" کی مگر صدر نے مجمع پر قابو پالیا ـــ ہاں! تو اُس مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر جس کا تخلص شہید تھا سب سے زیادہ کامیاب رہا، وہ وہ غزلیں اور ایسی ایسی نظمیں سنائی ہیں، اس شاعر نے کہ سننے والے تڑپ تڑپ اُٹھے۔ کلام بھی اچھا اور ترنم بھی اچھا! پڑھنے کا انداز ساحرانہ! شعر پڑھتے میں اس کی انگلی کا اشارہ ..... جیسے جادوگر نے اپنی چھڑی گھمادی ـــ بکھرے ہوئے بال، رسیلی آواز، جوان شاعری اور طرز ادا سب سے زیادہ دلچسپ! مشاعرہ اُسی کے ہاتھ رہا، میرے کانوں میں اب تک اس کی آواز گونج رہی ہے۔ یہ دیکھو صالحہ! (کوٹ کی جیب سے کاغذ نکالتے ہوئے) تمہارے سُنانے کے لئے شہید صاحب کے کچھ شعر نوٹ کرلئے تھے، سنو! اور لطف اٹھاؤ، ظالم کہتا ہے:-

سلامت تری نیچی نیچی نگاہیں — مجھے تو کوئی بدگمانی نہیں ہے

شوخی سے میرا ہاتھ دبا کر چلے گئے — میں یہ سمجھ رہا ہوں بُلا کر چلے گئے

محبت کو جو دیکھا ہے پریشاں — جوانی اور چنچل ہوگئی ہے

اور یہ شعر شہید صاحب نے پڑھتے میں دُہرایا نہیں، بس ایک ہی مصرعہ لکھ سکی، فرماتے ہیں:-

ع معصیت بھی ثواب ہوتی ہے

صالحہ! تمہارے سر کی قسم، تم مشاعرے میں بار بار یاد آرہی تھیں، ـــ مگر تم ..... تم اُس طائر بدنصیب کی مانند ہو جس نے آنکھ ہی قفس کی فضاؤں میں کھولی ہے۔ گھر کی چار دیواری سے سیر وتفریح کے لئے اگر تم نے پاؤں نکالا تو غیرت پانی پانی ہوجائے گی اور عصمت وحیا سر پیٹ پیٹ کر فریاد کریں گی کہ ہمارے نادان دوستوں سے ہمیں بچاؤ۔

صالحہ اب تک چپ بیٹھی تھی، اُس نے ایک دو بار کچھ کہنا بھی چاہا مگر رفیعہ کی زبان تالو سے کب لگتی تھی، وہ بولے چلی جاتی تھی دخل در معقولات صالحہ کی متانت کو پسند نہ تھا، اب رفیعہ کی بات ختم ہوئی تو صالحہ نے کہا:-

رفیعہ! میں اس "لے" کو بڑھانا نہ چاہتی تھی مگر تم نے زبان کھولنے پر مجھے مجبور کر دیا، اور یہ وہ موقع ہے جہاں چپ رہنا گناہ ہو جاتا ہے، بہن تم نے اپنے پسندیدہ شاعر کے جو شعر سنائے ہیں، خدا کی قسم انہیں سن کر غیرت کے مارے مجھے تو پسینہ آ گیا، یہ شاعری نہیں کھلی ہوئی بے حیائی ہے!

(تو ہم بے حیا ہیں، بے غیرت ہیں، بے شرم ہیں! غیرت کا اجارہ تو شیخ افضل حسین کی دختر نیک اختر صالحہ خاتون نے لے رکھا ہے ......) رفیعہ نے صالحہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ دیکھو رفیعہ تم جب تک بولتی رہیں، میں نے سانس بھی نہیں لی، اب میں بول رہی ہوں تو تمہیں صبر و ضبط کے ساتھ مجھ ناچیز کم سمجھ اور جاہل کی بات سننی چاہئے (ہاں! ہاں! بیگم صاحبہ! کہئے فرمایئے! ارشادِ گرامی! فرمانِ مبارک! اور لگے ہاتھوں "قل اعوذی" قسم کا کوئی وعظ بھی ہو جاتے! ہم بھٹکے ہوؤں کو آپ جیسے مولانا اور بزرگ ہی راہِ راست پر لا سکتے ہیں —— رفیعہ کی زبان پھر قینچی کی طرح چلنے لگی ....) سنو! اپنے کالج کے جس مشاعرے کی تعریف میں تم نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں اگر اس میں اسی انداز کے شعر پڑھے گئے تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ خود کالجوں اور درسگاہوں میں بے حیائی کا پرچار ہوتا ہے اور "شعر و ادب" کے نام پر بداخلاقی رواج پاتی ہے، اول تو نامحرم مردوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، بولنا چالنا، اور خلاملا رکھنا ہی خطرے سے خالی نہیں! پھر یہ پک نک پارٹیاں شعر و سخن کی محفلیں، ڈرامے، موسیقی کے جلسے، تو اور زیادہ اس آگ کو ہوا دیتے ہیں —— مشاعرے میں لڑکیوں کا جانا ایسا ہی ناگزیر ہو گیا تھا تو پھر اس قسم کے بیہودہ شعروں پر طالبات کو وہاں سے اٹھ آنا چاہیے تھا۔

رفیعہ نے اس پر جھنجلا کر کہا:۔

تم تو کسی سدا سہاگ فقیر کی چیلی ہو جاؤ، خانقاہ میں بیٹھی ہوئی دن رات تسبیح پڑھا کرنا، اس ترقی یافتہ اور مہذب دنیا میں تم جیسے فرسودہ اور قدامت پرستوں کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی! گانا حرام، ڈرامے ناجائز، رنگین شاعری گمراہ کن، ذرا کسی عورت کے چہرے سے نقاب سرکی اور ہنگامہ بپا ہو گیا، کہ یہ بے غیرتی ہے، عصمت پر حرف آ رہا ہے نگاہوں پہ پہرے، لبوں پر مہریں، بدگمانیاں، تہمت تراشیاں —— اگر اسی قید و بند اور غلامی کا نام "اخلاق" ہے تو ہم جیسے بے حیاؤں کا تمہارے اس "مولانا اخلاق مدظلہ" کو دونوں ہاتھوں سے سلام! تم پردے میں رہ کر یہ سمجھتی ہو صالحہ! کہ تمام بے پردہ عورتیں بری اور بداخلاق ہوتی ہیں، بس ساری غیرت تم پردہ نشینوں کے حصہ میں آ گئی ہے —— یہ خود فریبی ہے، کم اندیشی ہے، بڑا بول ہے اور معاف کرنا اوچھاپن بھی!

دونوں طرف سے لہجہ میں گرمی آ گئی، بات بڑھنے لگی، دو جوانیوں کی ٹکر تھی، برابر کا جوڑ تھا، صالحہ کی ماں کمرے میں نہ آ جاتی تو بات اور طول پکڑ جاتی، بڑی بی کے آ جانے سے یہ ہنگامہ رک گیا، بڑی بی نے آ کر انگیٹھی پر بے تابانہ ہاتھ پھیلا دیئے ٹھٹھری ہوئی جھریوں میں گرمی پا کر تناؤ پیدا ہو گیا —— پانی اور آگ دونوں میں زندگی ہے!

گراوٹ

رفیعہ کے باپ محکمہ آبکاری کے سپرنٹنڈنٹ تھے، صالحہ جس حویلی میں رہتی تھی، وہاں سے تھوڑی دور پر سول لائن میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کا بنگلہ تھا، صوفے، قالین، موٹر، ٹیلیفون، نوکر چاکر ہر چیز رفیعہ کو میسر تھی، بنگلہ میں چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا، رفیعہ کے باپ کو کروٹن اور پام بہت پسند تھے، بنگلہ کے برآمدوں اور زینہ کی سیڑھیوں پر بھی ان پودوں کے گملے رکھے تھے۔

رفیعہ نے شریفانہ ماحول میں پرورش پائی تھی، یہ آزادی تو اب چند دن سے دوسروں کی دیکھا دیکھی اس کے یہاں آ گئی

تھی، کلکٹر، ڈپٹی، کپتان، سول سرجن اور دوسرے افسروں کی لڑکیاں بے پردہ تھیں تو آبکاری کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گھرانا اس وبا سے بھلا کیسے بچا رہتا، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے، سوسائٹی کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں، کاجل کی کوٹھری میں جا کر کس کا دامن اچھوتا اور بے داغ رہ سکتا ہے، ماحول کی برائیوں سے جہاد کرنے کی جرأت ہر کسی میں نہیں ہوتی شریفانہ تربیت ہی کا یہ اثر تھا کہ رفیعہ کی جوانی ابھی تک ڈانوا ڈول نہیں ہوئی۔ کالج میں لڑکوں سے بات چیت ہوتی ہنسی مذاق کی نوبت بھی آ جاتی، مگر اس ہنسنے بولنے میں جذبات کچھ یوں ہی سے شریک تھے، نہ ہونے کے برابر! گھر والوں نے اُسے طوفان کی موجوں سے کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا، لیکن وہ ابھی تک دامن بچاتی رہی —— مگر کب تک؟ جوانی کی ذراسی ڈھیل بھی خطروں کو نہ جانے کہاں کہاں سے سمیٹ لاتی ہے اور یہاں تو آنے جانے اور ملنے جلنے کی پوری آزادی حاصل تھی، شروع شروع میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کچھ روک ٹوک کی مگر آہستہ آہستہ احتساب اور نگرانی کا ایک ایک بند ڈھیلا ہو گیا اور کوئی کوئی تو ٹوٹ بھی گیا۔

ڈگری کالج میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ملی جلی تعلیم ہوتی تھی، ایک تہائی سے کچھ اوپر ہی طالبات کی تعداد تھی بہت سی جوانیاں جہاں اکٹھی ہو جائیں وہاں جو کچھ بھی ظہور میں آ جائے تھوڑا ہے، جوان اور گرم جذبات آزاد فضا اور بے باک ماحول میں نچلے رہ ہی نہیں سکتے، ان معاملات میں خوش فہمی اور نیک اندیشی بے خبری ہے۔ دہکتی ہوئی بھٹی میں گیلی سے گیلی لکڑی بھی چاہے دیر ہی میں سہی مگر آگ پکڑا کر رہتی ہے۔

کالج کے لڑکوں نے رفیعہ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر رفیعہ نے ان کی تمناؤں کو ذرا سا بھی سہارا نہ دیا، بات چیت اور تھوڑے بہت ہنسی مذاق سے آگے بات نہ بڑھنے پائی، عورت اپنی جگہ مضبوط بنی رہے تو مرد کا ہر ہوسناک اقدام پسپا کیا جا سکتا ہے۔

محسن بی۔ اے کے تیسرے سال میں پڑھتا تھا، صورت شکل معمولی، پست قد! مگر اپنی دوسری صفات کے سبب کالج میں غیر معمولی مقبول! کرکٹ کا سب سے اچھا کھلاڑی، پنگ پانگ کا چیمپین، شعر بھی کہہ لیتا تھا اور خوش گلوئی نے اس کی موزونی طبع کو چار چاند لگا دیئے تھے، نہایت ہی معمولی شعر اس قدر دل نشیں انداز میں پڑھتا کہ سننے والے بے اختیار "واہ وا" کرنے لگتے، شاعری ہی نہیں گانا بھی جادو ہے اور یہاں شعبدہ اور جادو ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔

کالج میں ایک بار ایٹ ہوم تھا، مہمانوں کی تواضع (Entertainment) کے لئے محسن کی شعر خوانی کا بھی پروگرام رکھا گیا، اُس نے کئی غزلیں سنائیں اور اس قدر میٹھے سُروں میں سنائیں کہ ساری محفل جھوم جھوم گئی، غزل ختم ہوتی تو تالیوں کی گونج میں "ایک اور —— ایک اور" کی آوازیں بلند ہونے لگتیں، لڑکیوں کی تالیوں نے آج لڑکوں کے شورِ تصفیق کو دبا لیا، جذبات جتنے زیادہ شدید ہوں گے تالیوں کی آوازیں اتنا ہی زور اور پھیلاؤ ہو گا، محسن کے چہرے پر سُرخی جھلک رہی تھی، شراب پی کر بھی کسی کا چہرہ اتنی جلد اس قدر ارغوانی نہیں ہو سکتا۔ تعریف کا نشہ شراب سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔

رفیعہ کو شعر و موسیقی سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، اور شاعر کو تو وہ "دیوتا" سمجھتی تھی، اُس نے محسن کے سامنے اپنی "آٹو گراف بک" پیش کی، محسن نے دستخط کرنا چاہے، رفیعہ نے لجاجت آمیز انداز میں کہا —— "کوئی شعر" محسن نے بالوں میں گرہ لگاتے ہوئے کچھ دیر سوچا، اور رفیعہ کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شعر لکھ دیا، تنہائی ہوتی تو یہ دزدیدہ نگاہیں

شاید نگاہ التجا اور چشم شوق و طلب بن جاتیں ـــــــ اُسے اپنی تمام کی تمام غزلیں حفظ تھیں، پھر اُس نے سوچا کیوں ؟ اس لئے کہ حُسن اور جوانی کی طرف سے پہل ہو رہی تھی، اس کے جواب میں کوئی سیدھا سادہ شعر لکھ دیتا تو یہ سلسلہ آگے کس طرح بڑھتا، یہ بھول چوک اور بے پروائی کا نہیں بڑے غور و فکر اور دُور اندیشی کا موقع تھا، ایسے ہی نقطوں سے "رومان" کا آغاز ہوا کرتا ہے اور اسی بنیاد پر عشقبازی کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں، جس طرح بدحواسی سے کام بگڑ جاتا ہے، اسی طرح غیر معمولی سنجیدگی اور وقار و متانت بھی کھنڈت ڈال دیتی ہے۔

چند دن کے بعد کالج میں پھر جلسہ ہوا، محسن کالج کے جلسوں، محفلوں اور پارٹیوں کی جان تھا، وہ جس پارٹی میں نہ ہوتا سب لوگ کمی محسوس کرتے، محسن نے نظم سُنائی، جس کا عنوان تھا :-

"اوٹوگراف کی فرمائش پر"

اس نظم میں محسن نے رفیعہ کے حُسن و جمال کی خوب خوب تعریفیں کیں، ایک ایک ادا کو سراہا، شاعری کی زبان میں سب کچھ کہہ دیا بلکہ اپنا دِل کھول کر سامنے رکھ دیا، رفیعہ متضاد جذبات کی کشمکش میں گرفتار تھی، تحسینِ حسن کا احساس رُخساروں کو گلنار بنا دیتا اور غیرت کا جذبہ اُبھرتا تو تیوروں سے ناخوشی سی برسنے لگتی، اس عجیب کشمکش سے اس کا پہلا سابقہ تھا، اس نے کئی بار ماتھے سے پسینہ پونچھا، اور خشک لبوں پر زبان پھیری ـــــ نظم ختم ہوئی، تالیاں اور مسلسل تالیاں ! رفیعہ کے دونوں ہاتھ اُٹھ کر رہ گئے ہتھیلیاں مل کر ہٹ گئیں، ہوس نے بڑھاوے دیئے، غیرت نے روکا اور پہلی بار غیرت ہی کی جیت ہوئی، ـــــ مگر ہوس مسکرائی کہ غیرت کی یہ آخری فتح ہے، جنگ کا نقشہ آج ہی سے بدل گیا۔

رفیعہ کالج سے فٹن میں سوار ہو کر اپنے بنگلہ پہونچی، محسن کی نظم اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، رات کی تنہائی میں اس خیال نے اور پاؤں پھیلائے ـــــــ نفس اور ضمیر کی کشمکش !

کیا کر رہی ہے نادان لڑکی، شرم ! احتیاط ! کائی کی اس تہ کے نیچے اتھاہ سمندر ہے۔

اور وہ جو داغ نے کہا ہے ؎ گر چہ بحرِ عاشقی ذخار ہے ؛ ڈوبنے والے کا بیڑا پار ہے

آج کل کی عشق عاشقی خطرناک دھوکا ہے، نفس کا فریب ! ہوس کی انجمن آرائیاں !

خود یہ دُنیا دھوکا ہے! حقیقت ہے کہاں ! ہر طرف پرچھائیاں ہی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں

یہ میٹھا زہر رُوح کو ہلاک کر دے گا، ذرا سے چٹخارے کے لئے اپنی دُنیا اور دین کو برباد نہ کر۔

اس دُنیا میں برباد کون نہیں ہوتا ؏ کوئی ہلاکِ محبت کوئی شہیدِ جمال۔

خوفِ خدا، خاندان کا وقار، سوسائٹی کی بدنامی .....

رفیعہ کچھ سوچ میں پڑ گئی، مگر ہوس نے اس کے تصورات کے سامنے کالج کے اُس جلسہ کو لا کر کھڑا کر دیا جس میں محسن نے نظم پڑھی تھی، یہ شعر اُس کے کانوں میں گونجنے لگا :- ؎

ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ لہرایا ہوا سا
کونین کی ہر شئے کو ہے وجد آیا ہوا سا

دیوار پر کالج کی ایک پارٹی کا فوٹو گروپ آویزاں تھا، وہ اس کے دیکھنے میں محو ہو گئی، محسن بھی تیسری صف میں کھڑا تھا، رفیعہ نے تصویر کو دیکھا اور اپنے چہرے کو بھی! قدِ آدم آئینہ میں! لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ سی آ گئی اور کچھ حیا بھی

مگر اب یہ حیا! ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دوسرے دن کالج کی چھٹی تھی، سہ پہر کے وقت رفیعہ بنگلے کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تصویروں کا اخبار دیکھ رہی تھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی، ٹیلیفون کے قریب کوئی دوسرا آدمی نہ تھا، اُس نے ریسیور اُٹھایا ـــ اور باتیں ہونے لگیں۔

جی! یہ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی کا بنگلہ ہے، مگر صاحب! باہر گئے ہیں (.. دَورے پر! دوسری طرف سے دریافت کیا گیا) نہیں دورے پر نہیں شہر ہی میں کسی کام سے تشریف لے گئے ہیں۔

ـــ بہت ضروری کام تھا، کالج میں بہت بڑا function کرنے کا ہم طلباء نے ارادہ کیا ہے، اُسی سلسلہ میں ایک وفد صاحب سے ملنے کے لئے آنے والا ہے۔

ـــ کالج ـــ کونسا کالج (ڈفرن کالج ..... جواب ملا) تو آپ ڈفرن کالج میں پڑھتے ہیں۔

ـــ جی! میں اُسی کالج کا اسٹوڈنٹ ہوں، مجھے محسن کہتے ہیں (رفیعہ جس ہاتھ سے ریسیور پکڑے ہوئے تھی ہلنے لگتا ہے اور تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہتی ہے....) جی.. ہلو! ہلو!

ـــ آپ محسن صاحب ہیں..... (جی! ناچیز کو محسن ہی کہتے ہیں) ایک تکلیف (آواز پھر بھینچ کر رہ گئی)

ـــ آپ بولتے ہی بولتے رُک کیوں جاتی ہیں،..... تکلیف.... تکلیف.. خدا نخواستہ آپ کو کوئی تکلیف ہے! میرے مکان کے قریب ہی ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں (رفیعہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے ـــ)

ـــ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ کل کے جلسہ میں آپ نے نظم پڑھی تھی اُس کی نقل درکار ہے۔

ـــ صاحب! ایک نہیں ہزار نقلیں..... اس میں تکلیف کی کیا بات ہے! شعر و ادب کے صحیح قدردان ہیں کہاں ہیں۔ میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں..... اگر تکلیف نہ ہو......

..... جی ..... میرا نام..... (ایک ہلکی مگر ذرا گہرے قسم کی سانس! اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا! ریسیور[1] رکھ دیا گیا...) ـــ اس کا سبب فرطِ غیرت بھی تھی اور اک ادائے دلبری اور نازِ معشوقانہ بھی! شوق کو تشنہ ہی رہنا چاہیئے۔

تعلقِ خاطر دونوں طرف سے پیدا ہوگیا تھا، زمان و مکان کے فاصلہ کو کم کرنے کے لئے موٹر، اور ٹیلیفون موجود تھا ـــ اُٹھنے بیٹھنے، آنے جانے، ملنے جلنے، اور تنہائیوں کے واسطے ہر قسم کی سہولتیں مُہیا تھیں۔ بے تکلفی بڑھتی ہی چلی گئی، ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا، نہ ہوتا تو اچنبھے کی بات تھی، کالج کے پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کے لئے یہ کوئی نیا واقعہ نہ تھا، وہاں ایسے گھروندے شاید روزانہ بنتے اور بگڑتے رہتے تھے۔

ابتدا شعر و شاعری سے ہوئی پھر ہنسی مذاق، بعد میں چھیڑ چھاڑ! ہوس زینہ بہ زینہ چڑھتی چلی جا رہی تھی، نہ کوئی احتساب تھا اور نہ روک ٹوک! جذبات کی اس منزل میں دونوں ساتھی خراماں خراماں بڑھ رہے تھے، دوش بدوش اور شانہ بہ شانہ! ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے ـــ محسن کی شاعری کا رُخ ہی بدل گیا! اُس کے شعروں سے گویا جذبات کی بھڑک آتی تھی

بے حجابانہ توجہ، بے تکلف التفات
اُس نے رسمِ نازِ تمکیں توڑ دی میرے لئے

[1] Receiver

اُس کی تازہ ترین چند نظموں کے عنوان ——— "پہلی ملاقات" — "ان کے ساتھ" — "خط کے جواب میں" "رنگین تنہائیاں" — "دو مٹھی میں میری عالمِ امکاں ہے آج کل"

غلط راستہ پر

رفیعہ کا صالحہ کے یہاں آنا جانا رہتا، وہ جب بھی جاتی عاشقانہ شعر، فلم کے پلاٹ اور رنگین افسانے سناتی، تنہائی میں گھنٹوں اسی موضوع پر بات چیت ہوتی رہتی ——— ہوسناکی اپنی جھینپ مٹانے کے لئے ہر کسی کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے، مٹی کے گھڑے کی رگڑ سے پتھر میں گڑھا پڑ جاتا ہے۔ اور صالحہ تو بچر گوشت پوست کی بنی تھی، جوانی، حسن اور گرم جذبات! ہوسکار باتوں کا جادو آسانی سے چل گیا، صالحہ کے تصورات کو رفیعہ کی باتوں نے بے چین بنا دیا، پہلے اُس کا یہ عالم تھا کہ تکیہ پر سر رکھا اور نیند آگئی ——— اور اب بہت بہت دیر تک کروٹیں بدلتی، بعض وقت سوچنے لگتی کہ اس کی تمام حسین ادائیں بیکار جا رہی ہیں! اُس کی تنہائیوں کی مونس رنگین نظمیں اور رومانی ناول تھے، حسن و عشق کے قصوں میں اُسے لطف آنے لگا، فکر و خیال کی دوشیزگی دبی زبان سے رخصت ہونے کی اجازت چاہنے لگی۔

رفیعہ کی یہ کوشش تھی کہ جیسی میں ہوں ویسی ہی یہ صالحہ بھی ہو جائے۔ انسان کا فریب، شیطان کے مکر و فریب سے بہت زیادہ نازک اور پُر پیچ ہوتا ہے، شیطان بیچارے کو تو وہ ترکیبیں سوجھ بھی نہیں سکتیں، جو یہ "حضرتِ انسان" تراشتے رہتے ہیں۔

انہی دنوں صالحہ کے ایک رشتہ دار کے یہاں سے شادی کا بلاوا آیا، اور بلانے والوں نے اصرار کیا کہ شیخ صادق حسین کے گھر کے تمام چھوٹوں بڑوں کو شریک ہونا پڑے گا، صالحہ اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ خوب بن سنور کر اپنے عزیز کے یہاں پہونچی دھانی دوپٹہ، جالی کی قمیص اور سفید ساٹن کی شلوار! صالحہ یوں ہی خوبصورت تھی، اس لباس نے اسے حافظ شیرازی کی "غزل" اور قاآنی کے بہاریہ قصیدے کی "تشبیب" بنا دیا، بعض عورتیں اُسے دیکھ کر جی ہی جی میں رشک کرتیں، کہ ہائے! ہم ایسے نہ ہوئے۔

جس گھر میں بیاہ تھا، وہ درمیانہ درجہ کا مکان تھا، ایک دالان، تین کمرے، دو کوٹھریاں اور آنگن نہ زیادہ کشادہ اور نہ تنگ! صحن کے آخری حصہ میں صدر دروازے سے ملی ہوئی مختصر سی بیٹھک بھی تھی ——— صالحہ اپنی ماں بہنوں اور چند دوسری عورتوں کے ساتھ اندر کے کوٹھے میں بیٹھی تھی، دروازے پر چق پڑی تھی، صحن میں گھر کے مرد ضرورت کی چیزیں لینے اور دینے کے لئے آجا رہے تھے ——— صالحہ جس کمرے میں تھی، اس کی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا، چق کی تیلیاں بھی بہت چھدری تھیں اندر بیٹھے ہوئے لوگ صاف نظر آرہے تھے۔

میزبان بہت سلیقے کا آدمی تھا، گھر کے تمام لوگوں پر مختلف کام بانٹ دیئے تھے، صاحب مکان کے بھانجے ——— گوہر سے پانوں کا انتظام متعلق تھا اور یہ سب سے زیادہ مصروفیت اور ذمہ داری کا کام تھا، زنانہ میں عورتوں کی پان خوری کا یہ عالم کہ ادھر بازار سے ڈھولی آئی اور اُدھر ختم ہوگئی، جو اپنے گھر پان کی چھوٹی چھوٹی کترنیں کھاتی تھیں، یہاں دو دو ثابت پانوں کا بیڑا بنا کر چباتیں، باہر سے خبر آتی کہ پان بھیجو، اندر سے پانوں کی تھالی بھیجی جاتی، مگر پھر بھی آدمی دوڑا ہوا آتا کہ دس بارہ آدمیوں ہی میں پان ختم ہوگئے، پوری محفل کی محفل پانوں کا انتظار کر رہی ہے، دریافت اور تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ راستہ ہی میں پان بچوں کے ہتھے چڑھ گئے، وہ پان چبا چبا کر ایک دوسرے کو اپنی زبان کی سُرخی دکھا رہے ہیں۔

گوہر زنانہ مکان کے صحن میں آیا، کمرے کی کھڑکی سے صالحہ نظر آئی، دونوں کی آنکھیں ملیں، گوہر الائچیوں کا طباق لے کر باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد پھر آیا، صالحہ کو اسی جگہ کھڑا پایا، ابکی بار اس نے خوب گھور کر دیکھا، صالحہ شرما کر ایک طرف کو

ہوگئی، لیکن اس ادا میں بھی دیکھنے والے کے لئے تھوڑا بہت سہارا ضرور تھا ——— پہلی بار جب آمنا سامنا ہوا تھا اُسی وقت وہ ہٹ جاتی اور گوہر کو نظارہ بازی کا موقعہ نہ دیتی، تو یہ قصہ ہی ختم ہوجاتا، یہ بیل منڈھے ہی نہ چڑھتی، خرابی کی جڑ تو یہ خاموش نظارہ بازی ہے ——— شیطان پہلے آنکھوں پر جال بچھاتا ہے، آنکھیں شکار ہوجانے کے بعد 'حضرتِ دل' تو آپ ہی آپ پھنس جاتے ہیں۔

گوہر نے اب ذرا ذرا دیر سے زنانہ میں آنا شروع کیا۔ دونوں طرف سے نظر بازی، آنکھوں آنکھوں میں پیام سلام! ایسے موقعوں پر نگاہیں زبان کا فرض بڑی ذمہ داری اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیتی ہیں، ——— رفیعہ کا پڑھایا ہوا سبق آج پہلی بار دُہرایا گیا، کہ "صالحہ! زندگی کا لطف چاہتی ہو تو مرکزِ نگاہ تلاش کرو" ——— اور بیاہ کی اس تقریب میں مرکزِ نگاہ بڑی آسانی سے مل گیا۔

گوہر صالحہ سے عمر میں کچھ چھوٹا تھا، مگر تجربہ میں اس سے بڑھا ہوا تھا، اس نے صالحہ کو سلام کیا، پہلے اشارہ پر وہ خاموش رہی مگر دوسرے سلام پر اُس نے بھی کھجانے کے بہانے سے ماتھے پر انگلیاں رکھ دیں، اِدھر کی بجلی اُدھر اثر کر رہی تھی۔

بیاہ کے دوسرے دن صالحہ کو اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں سے واپس آنا پڑا، اس کا بس چلتا تو رک جاتی، وہ دل گرفتہ سی تھی، اُدھر گوہر بھی ملول اور متاثر تھا، صالحہ کے جاتے ہی اُس نے اپنے ماموں سے کہا کہ صاحب! میں تو پاؤں کے انتظام سے باز آیا، خدا کی قسم دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑگئے ہیں اور پھر بھی ہر طرف سے شکایتیں ہی آتی رہتی ہیں ——— مجھے اس کی بجائے چاہے براتیوں کے ہاتھ دُھلانے کا کام دیدیجئے، میں خوشی سے قبول کروں گا، ——— ماموں نے کہا گوہر! تیرا باپ بھی کام چور ہے باپ کی پرچھائیں پڑگئی ہے تجھ پر! اس جوانی میں آپ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ زنانہ مکان میں دو چار پھیرے کرنے میں نواب صاحب کے پاؤں میں چھالے پڑگئے ——— مسلمانوں کو اُن کی تن آسانی نے ڈبویا، یہ ہے ہماری قوم کے نوجوانوں کا حال ——— اور ع

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم!

اور وہ پھر سنبھل گئی

دونوں طرف قریب قریب آگ برابر لگی تھی، صالحہ بالکل مجبور اور پابند تھی، گوہر اتنا پابند نہ تھا اُس نے اپنی آزادی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی ——— لیکن اس راہ میں "پردہ" سب سے بڑا سنگِ گراں تھا جس کا ہٹانا اُن دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی، ٹیلیفون، موٹر، بے پردگی، اور آزادانہ نشست و برخاست کی سہولتیں ہوتیں تو اب تک نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہوتا۔

رفیعہ پر صالحہ نے اپنا بھید ظاہر کر دیا تھا، اُسی کے ذریعہ سے گوہر کے پاس ایک دو بار خط بھی آئے گئے ——— مگر رفیعہ خود بڑی اُلجھنوں میں پھنس گئی تھی، اپنی ہی گتھی اُس سے نہ سلجھ پاتی تھی دوسرے کی پیچاک کو کیا سلجھاتی! محسن اب اُس سے بے اتفاقی برتنے لگا تھا، ایک دوسری لڑکی سے اس کی دوستی ہوگئی، کالج میں رفیعہ کے واقعات کی تحقیقات بھی ہو چکی تھی، اس پر ایک نہیں بیسیوں الزام تھے ...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے لیڈی ڈاکٹروں سے مشورے کی ضرورت پیش آرہی تھی ——— وہاں رہتی تو رسوا ہوتی، ماں باپ تک بیزار ہوجاتے، عزت آبرو پر اولاد کی محبت بھی قربان کردی جاتی ہے۔

اُس نے صالحہ کے گھر ہی کیا، دوسرے جاننے والوں اور عزیز رشتہ داروں کے یہاں بھی آنا جانا بند کر دیا تھا، ایسا نہ کرتی

تو اُسے اور ذلیل ہونا پڑتا ـــــــــ ایک دن معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے سے رفیعہ اور موٹر ڈرائیور دونوں غائب ہیں، اس کی میز پر ایک پرچہ لکھا ہوا ملا :-

"مجھے تلاش نہ کیا جائے ـــــــ"

اس حادثہ نے صالحہ کو بہت زیادہ متاثر کیا، اس کی زندگی اور کردار کی تعمیر میں رفیعہ کی ہم نشینی کا بہت کچھ ہاتھ تھا ـــــ اس واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں جیسے کسی نے نگاہوں سے یکبارگی پردے اُٹھا دیئے اور اس کے دل کو اُنگلیوں میں دبا کر دوسری طرف پھیر دیا، دوسری تنبیہ یہ ہوئی کہ اس کے جوان صحت مند اور خوبصورت بھاوج کے کلیجہ میں درد اٹھا، اور دو ڈھائی گھنٹہ کے اندر ماندر دُنیا سے چل بسی، اس حادثہ نے دل کی رہی سہی کھوٹ کسر بھی نکال دی، گوہر کے خیال سے اُسے نفرت ہو گئی تھی، پچھلی باتوں کا غم اسے کھائے جاتا تھا، .... وہ دِل ہی دل میں اپنی آنکھوں کو کوستی، ...... کاش! میں اندھی ہوتی اندھے بہت سی بُرائیوں سے بچے رہتے ہیں۔

گھر بار کی عورتیں دالان میں قرآن پڑھ رہی تھیں، صالحہ بھی ان میں شامل تھی، خدا سے ڈرنے اور دوزخ میں عذاب دیئے جانے کی آیت کو اس نے ترجمہ کے ساتھ پڑھا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے، وہ اقراری مجرم کی طرح کانپنے لگی ـــــــ عورتوں نے سمجھا کہ بھاوج کے غم میں تند رو رہی ہے۔

قرآن کا ورق بھیگتا چلا گیا

اور

وہ روتی رہی

رُوحِ انتخاب

ان لوگوں کے لئے جو تجربہ و شہود کے مدعی ہیں — عقلِ عمومی کی روشنی میں دعوتِ فکر و نظر! گزارش پیام بلاوا اور چیلنج بھی! دُنیائے اسلام کے سب سے بڑے مُفکّر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (اسیر پاکستان) کا یہ گرانقدر مقالہ زیادہ سے زیادہ اشاعت کا مستحق ہے!

(م)

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سینکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں، ریلیں اور ٹرام گاڑیاں رواں دواں ہیں، شام کے وقت دفعتہً ہزاروں قمقمے روشن ہوجاتے ہیں، گرمی کے زمانہ میں گھر گھر پنکھے چلتے ہیں، مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استعجاب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کی روشن یا متحرک ہونے کی علت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ان قمقموں کا تعلق جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ان تاروں کا تعلق جس بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو معلوم ہے اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے ان کام کرنے والوں پر جو انجنیئر نگرانی کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں، ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجنیئر بجلی بنانے کے کام سے واقف ہے۔ اس کے پاس بہت سی کلیں ہیں اور ان کلوں کو حرکت دے کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوے ہم کو قمقموں کی روشنی، پنکھوں کی گردش، ریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں کی حرکت میں نظر آتے ہیں پس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے اسباب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف رائے واقع نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اسباب کا پورا سلسلہ ہمارے محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کو مشاہدہ کر چکے ہیں۔

فرض کیجئے کہ یہی قمقمے روشن ہوتے، اسی طرح پنکھے گردش کرتے، یونہی ریلیں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں پہنچی ہے، ہماری نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجنیئر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے اس کو چلا رہا ہے، کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے؟ کیا اس وقت بھی ہم اسی طرح ان مظاہر کی علتوں میں اختلاف نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں؟

اسلئے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علتیں غیر معلوم ہوں تو دلوں میں حیرت کے ساتھ بے اطمینانی کا پیدا ہونا اور اس راز سربستہ کی جستجو میں لگ جانا اور اس راز کے متعلق قیاسات و آراء کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے

اب ذرا اسی مفروضہ پر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایئے، مان لیجئے کہ یہ جو کچھ فرض کیا گیا ہے، درحقیقت عالم واقعہ میں موجود ہے ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہیں، لاکھوں پنکھے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، کہ ان میں کونسی قوت کام کر رہی ہے، اور وہ کہاں سے آتی ہے، لوگ ان مظاہر و آثار کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں، ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن یا متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اس عالم مادہ سے ماوراء چند دیوتا ہیں، جن میں سے کوئی قمقمے روشن کرتا ہے۔ کوئی ٹرام اور ریلیں چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے، اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا محرک ہے، بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے تھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لئے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس و ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے، اس ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب قمقموں، پنکھوں، گاڑیوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے، جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے، اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم الشان کلیں ہیں جنہیں بے شمار اشخاص چلا رہے ہیں، یہ سب اشخاص ایک بڑے انجینیئر کے تابع ہیں اور وہی انجینیئر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے، اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ سب کام ہو رہے ہیں۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے دعوے کو پیش کرتا ہے، لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں، مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مصیبتوں کے باوجود اپنے دعوے پر قائم رہتا ہے، کسی خوف یا لالچ سے اپنے قول میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کرتا، کسی مصیبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی، اس کی ہر ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہٖ یہی قول اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پھر تیسرا، چوتھا پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیش رو کہہ چکے تھے، اس کے بعد آنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز ہو جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں، زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا، سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے، سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا

جاتا ہے، ہر طریقہ سے اُسے مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آجائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دُنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی، اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم، اور حرام خور نہیں ہے، ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں اور حسنِ خلق میں یہ اپنے دوسرے ابنائے نوع سے ممتاز ہیں پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ تہذیب، اخلاق، تزکیۂ نفس، اور دنیوی معاملات کی اصلاح کے لئے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار بڑے بڑے علماء وعقلاء کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی پڑتی ہیں۔

ایک طرف وہ مختلف الخیال مکذبین ہیں اور دوسری طرف یہ متحد الخیال مدعی۔ دونوں کا معاملہ عقلِ سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ جج کی حیثیت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے۔ پھر فریقین کی پوزیشن کو سمجھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابلِ ترجیح ہے۔

جج کی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امرِ واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، وہ حقیقت کا علم نہیں رکھتا، اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و قرائن ہیں، انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اغلب ہے، مگر اغلبیت سے بڑھ کر بھی وہ کوئی حکم نہیں لگا سکتا، کیونکہ مسل پر جو کچھ مواد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لئے مشکل ہے کہ امرِ واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترجیح دے سکتا ہے۔ لیکن قطعیت اور یقین کے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے :-

۱۔ حقیقت کے متعلق ان کے نظریے مختلف ہیں اور کسی ایک نکتہ میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے، کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ وزنی ہیں، مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳۔ اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہونچا ہے۔ ان میں تبدیلِ رائے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریہ کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریہ کی تردید کر دی، اور ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا۔ عمر، عقل، علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریات بدلتے رہے ہیں۔

۴۔ مدعیوں کی تکذیب کے لئے ان کے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا، انہوں نے وہ مخفی تار ہم کو نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ قمقموں اور پنکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے نہ انہوں نے بجلی کا وجود تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی۔ نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معائنہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجینئر سے ہم کو ملایا۔ پھر ہم کیسے مان لیں، کہ یہ

بسب کچھ حقائق ہیں ؟

مدعیوں کی پوزیشن یہ ہے :-

(۱) وہ سب آپس میں متفق القول ہیں، دعوے کے جتنے بُنیادی نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے

(۲) ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

(۳) ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجینئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں، اس کے کارندے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں، ظن و تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

(۴) ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی، کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی تغیر و تبدل کیا ہو۔ ایک ہی بات ہے جوان میں کا ہر شخص دعوے کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔

(۵) ان کی سیرتیں انتہا درجہ کی پاکیزہ ہیں۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے، اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں راست اور صادق القول ہوں وہ خاص اسی معاملہ میں بالاتفاق کیوں جھوٹ بولیں۔

(۶) اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہا درجہ کے مصائب برداشت کئے ہیں، جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کئے گئے مارے اور پیٹے گئے، جلاوطن کئے گئے، بعض قتل کر دئے گئے۔ حتیٰ کہ بعض کو آرے سے چیر ڈالا گیا، اور چند کے سوا کسی کو بھی خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی میسر نہ ہوئی، لہٰذا کسی ذاتی غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ ان کا ایسے حالات میں اپنے دعوے پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اپنی صداقت پر انتہا درجہ کا یقین تھا۔ ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لئے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے سے باز نہ آیا۔

(۷) ان کے متعلق مجنون یا فاتر العقل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، زندگی کے تمام معاملات میں وہ سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور سلیم العقل پائے گئے ہیں، ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دانشمندی کا لوہا مانا ہے، پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ان سب کو اسی خاص معاملہ میں جنون لاحق ہو گیا ہو؟ اور وہ معاملہ بھی کیسا؟ جو ان کے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو جس کے لئے انہوں نے دُنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو، جس کی خاطر وہ سالہا سال دُنیا سے لڑتے رہے ہوں۔ جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا (جن کے عاقلانہ ہونے کا بہت سے مکذبین کو بھی اعتراف ہے) اصل الاصول ہو۔

(۸) انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینئر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کرا سکتے ہیں، یا اس کا مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں وہ خود ان تمام امور کو "غیب" سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اُسے مان لو۔

عقل کا فیصلہ

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد عقل کی عدالت اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے وہ کہتی ہے کہ چند مظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و علل کی جستجو دونوں فریقوں نے کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نظریات پیش کئے ہیں، بادی النظر میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اولاً ان میں سے کسی میں استحالۂ عقلی نہیں ہے، یعنی قوانین عقلی کے لحاظ سے کسی نظریہ کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہے،

ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جا سکتی۔ نہ فریق اول میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹیفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے اور نہ فریق ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی۔ لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فریق ثانی کا نظریہ قابل ترجیح قرار پاتا ہے۔

اولاً کسی دوسرے نظریہ کی تائید اتنے کثیر التعداد عاقل، پاک سیرت، صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر اتنی قوت اور اتنے یقین و ایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

ثانیاً ایسے پاکیزہ کیرکٹر اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعوے پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعۂ علم ہے، اور ان سب نے اس ذریعہ سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کیا ہے ہم کو اس دعوے کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے اور نہ یہ بات قوانین عقلی کی بنا پر محال قرار دی جا سکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثالثاً خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے بھی اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی کا نظریہ صحیح ہو، اس لئے کہ قمقمے پنکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ متحرک اور روشن ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، نہ ان کی روشنی و حرکت ان کے مادۂ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیر اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات جب قمقموں میں روشنی نہیں ہوتی تو پنکھے بند ہوتے ہیں، ٹرام کاریں بھی موقوف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے، لہٰذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فریق اول کی طرف سے جتنے نظریات پیش کئے گئے ہیں وہ سب بعید از عقل و قیاس ہیں، زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سررشتہ کسی ایسے حکیم و دانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا مشککین کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آتے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حاکم عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا، کیونکہ کسی واقعہ کا ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کی سمجھ میں بھی آ جائے، اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لئے معتبر اور متواتر شہادت کافی ہے، اگر ہم سے چند معتبر آدمی آ کر کہیں کہ ہم نے زمین مغرب میں آدمیوں کو لوہے کی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہوا پر اڑتے دیکھا ہے اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آئے ہیں تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرے تو نہیں ہیں؟ ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے؟ ان کے دماغ میں کوئی فتور تو نہیں ہے؟ اگر ثابت ہو گیا کہ وہ نہ جھوٹے ہیں، نہ مسخرے، نہ دیوانے، نہ ان کا کوئی مفاد اس روایت سے وابستہ ہے اور اگر ہم نے دیکھا کہ اس کو بلا اختلاف بہت سے سچے اور عقلمند لوگ پوری سنجیدگی کے ساتھ بیان کر رہے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے، خواہ لوہے کی گاڑیوں کا ہوا پر اڑنا اور کسی مادی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گانا کئی ہزار میل کے فاصلہ پر سنائی دینا کسی طرح ہماری سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معاملہ میں عقل کا فیصلہ ہے، مگر تصدیق و یقین کی کیفیت جس کا نام "ایمان" ہے اس سے پیدا نہیں ہوتی، اس کے لئے وجدان کی ضرورت ہے، اس کے لئے دل کے ٹھک جانے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے

جو تکذیب، شک، اور تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کر دے، اور صاف کہہ دے کہ لوگوں کی قیاس آرائیاں باطل ہیں۔ سچ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی رُو سے بیان کیا ہے۔ (تفہیمات)

پاکیزگی کے علمبردار

جب قرونِ وسطیٰ کے عیسائیوں نے نہانے دھونے اور پاک وصاف رہنے کو کافروں کی رسم سمجھ کر مردود قرار دے دیا تھا اور جب پادری اور پادرنیں اپنی گندگی کی فخریہ نشر و اشاعت کرتی پھرتی تھیں، یہاں تک کہ ایک عیسائی راہبہ نے نہایت فخر کے ساتھ یہ واقعہ قلمبند کیا ہے کہ اُس نے ساٹھ سال کی عمر میں ایک مرتبہ بھی غسل نہ کیا اور سوائے مذہبی ضرورت کے انگلیوں پر پانی چھڑکنے کے پانی کے قریب تک نہ گئی، جس زمانہ میں میلا کچیلا رہنا عیسائی تقدس کا تمغہ تھا، اُس زمانہ میں مسلمان صفائی اور پاکیزگی کے سب سے بڑے علمبردار تھے ——— (لین پول)

روشنی

جب ہمارے سیکسن آبا و اجداد چوبی مکانات میں رہتے اور گندی پیالوں پر سوتے تھے، جب ہماری زبان بھی نہ بنی تھی اور جب لکھنا پڑھنا صرف معدودے چند پادریوں کا اجارہ بنا ہوا تھا، ہمیں اس زمانہ کے اندلسی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تعریف کئے بغیر چارہ نہیں اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تمام یورپ جہالت اور درندگی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا تو اندلس کے دارالحکومت قرطبہ کے علوم و فنون کی روشنی سے ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہونے لگتی ہے (لین پول)

عربوں کی معارف پروری

بر نہارٹ اور ای ایم وبیشا لکھتے ہیں :-

سائنس، آرٹ، ادب اس عہد میں جیسے کہ مسلمانوں کے عہد اسپین میں مروج رہتے ویسے یورپ میں اس وقت کہیں بھی نہ تھے، سوسائٹی میں مسلمان عورتوں کو وہ مرتبہ اور عزت حاصل تھی، جو اس وقت یورپ میں عیسائی عورت کو کہیں نصیب نہ تھی، اور نہ صدیوں بعد تک حاصل ہو سکی، صنعت و حرفت اور زراعت میں بلکہ علوم و فنون، فلسفہ و سائنس کے ہر شعبہ میں عربوں نے اس قدر ترقی کی اور اُن کی ترقی سے دُنیا کو اس قدر فائدہ پہونچا کہ اُس کی شکر گزاری کسی طرح ممکن نہیں ———

صنعت و تجارت

ملک کی بیرونی تجارت اور سواحلِ اُندلس کی حفاظت کے لئے ایک نہایت ہی طاقتور بحری بیڑہ تھا اور لوگ بحری سفر کے اس قدر شائق ہو گئے تھے کہ جو مقامات یا علاقے دریاؤں کے کنارے نہیں تھے ان کو مضبوط اور پختہ سڑکوں اور نہروں کے ذریعہ دریاؤں سے ملا دیا گیا تھا، چنانچہ اکثر شہر دریا سے صرف ایک دن سے زیادہ مسافت پر نہ تھے۔ تجارتی بیڑہ کی بدولت اندلس کے تجارتی تعلقات نہایت وسیع تھے اور یورپ، ایشیاء اور افریقہ کی نادر اشیاء اندلس کے شہروں میں نہایت آسانی اور فراوانی سے ملتی تھیں، جو خام پیداوار غیر ممالک سے آتی تھیں اس کو اہل اسپین تیار کر کے باہر بھیجتے تھے، اس وقت پارچہ بافی، فنِ شیشہ گری، مرصّع طلائی زیورات بنانے، چاندی پیتل کے برتن ڈھالنے میں کوئی ملک اسپین کا ہمسر نہ تھا، قرطبہ میں تقریباً دو تین لاکھ گھر تھے جن میں سے تین چوتھائی گھران صناعوں و کاریگروں کے تھے جو پارچہ بافی اور دیگر فنون کے کامل اُستاد تھے مگر صناعی کے لحاظ سے المیریا اور اشبیلیہ کو قرطبہ پر بھی فوقیت حاصل تھی، اور صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کی بحالی اور ترقی کا یہ نتیجہ تھا کہ تکلیف دہ ٹیکس کی معافی اور محاصل میں کمی کر دینے کے باوجود خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کی آمدنی عبدالرحمٰن اول سے بیس گنی اور عبدالرحمٰن دوم سے پانچ گنا زیادہ تھی۔

مُلک میں امن و امان کا دَورہ تھا، خلیفہ ہر ایک کے ساتھ یکساں انصاف و عمل کا حامی و خواہاں تھا، ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمیوں کے

ہماری نظر میں

"جب خون بہہ رہا تھا"

"جب خون بہہ رہا تھا" — از ابوسعید بزمی ایم۔ اے۔ صفحات ۲۵۵۔ طباعت وکتابت دیدہ زیب، مجلد، خوشنما گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ

ملنے کا پتہ :- کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور

اس کتاب میں کیا ہے، خود مصنف کی زبان سے اس کی تفصیل سنیئے :-

" اس دلچسپ اور دلگداز دور کی مختصر تاریخ جب آپ پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے، جب اس خواب کی تعبیر نظر آ رہی تھی اور جب یہ خواب حقیقت بن چکا تھا — کاروانِ آزادی کی وہ تین منزلیں جب حوصلے بلند تھے، جب حوصلے ٹوٹنے لگے تھے اور جب حوصلے پھر سنبھلنا شروع ہوئے ......"

اس موضوع پر یہ کتاب بہت زیادہ دلچسپ، پُراز معلومات اور کامیاب ہے، فاضل مصنف نے انقلاب ۱۹۴۷ء کے بکھرے ہوئے واقعات کو سلیقہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے، یہ کتاب جناب ابوسعید بزمی کی سیاسی بصیرت پر ایک "دستاویز" کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے ساحل پر کھڑے ہو کر بھی مدوجزر کا مشاہدہ کیا ہے اور خود طوفان میں اُتر کر بھی ہولناک موجوں سے وہ دست وگریباں ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے مسلم لیگ نے ہندوستان کی دو قوموں میں نفرت، بیزاری، اور دشمنی کی آگ بھڑکا دی، اس سے پہلے ہندوستان کے رہنے والوں میں بھائی چارہ اور بہت کچھ میل ملاپ تھا — مگر ابوسعید بزمی نے "گریٹ مین آف انڈیا۔ ہوم لائبریری کلب" کے حوالہ سے لوکمانیہ تلک کی اُس تقریر کا ایک حصہ نقل کیا ہے جو تلک مہاراج نے سیواجی کی پہلی یادگار کے جلسہ پر کی تھی —

" لوگ کہتے ہیں، افضل خاں کو صلح کے بہانے سے اپنا مہمان بنا کر شیر کے پنجہ سے ہلاک کر دینا سیواجی کی غداری تھی، لیکن میں کہتا ہوں کہ ایسا کہنے والے غلط کہتے ہیں، یہ سیواجی کا جرم نہ تھا بلکہ بہت بڑا قومی کارنامہ تھا، کیونکہ وہ اپنے دیس کو ظالم مسلمانوں سے نجات دلانا چاہتا تھا، اور بھگوت گیتا میں صاف لکھا ہے کہ کسی بڑے مقصد کی خاطر اخلاق و دیانت کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو قربان کیا جا سکتا ہے ...."

ان جملوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نفرت وعداوت کے آتشکدے کس طرف سے بھڑکائے گئے اور بیزاری کی پہل کس نے کی ؟

اس کتاب میں لالہ لاجپت رائے جی کے اُس مضمون کا اقتباس بھی موجود ہے، جس میں لالہ جی نے "تقسیم" کی طرف اُس وقت ذہنوں کو متوجہ کیا تھا جبکہ مسلم لیگ بالکل بے اثر جماعت تھی، اور حصولِ "پاکستان" اس کی کوششوں کا مقصود بھی

نقد و تبصرہ ــــــــ

"میری تجویز یہ ہے کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ایک مشرقی پنجاب اور دوسرا مغربی پنجاب، میری یہی تجویز بنگال کے بارے میں ہے۔ لیکن اگر وہاں کے ہندو سی، آر، داس کے ہندو مسلم سمجھوتہ کو ماننے پر تیار ہوں (جس کی مجھے توقع نہیں ہے) تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ مسلمان اپنی زبردست اکثریت کے علاقے میں حکومت کریں اور ہندو اپنی اکثریت کے علاقے میں! اس کے علاوہ ہندو مسلم سوال کا حل ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا ....." (۱۹۲۵ء)

جناب ابو سعید بزمی نے مسلمان لیڈروں کی کوتاہیوں اور لغزشوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں:-

"ہم نے خطیب، مقرر، بیان باز، انشاپرداز، وزارت کے طالب، اور عہدوں کے لالچی تو بکثرت پیدا کر دیئے مگر بے غرض، ایثار پیشہ، اور خاموش کارکنوں کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی نہ بنایا ـــ"

صفحہ ۱۸۲ پر مصنف کے قلم سے غالباً کسی ذاتی جذبہ اور شخصی تعلق کی بناء پر یہ جملہ نکل گیا ہے:-

"یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ چونکہ پنجاب کی حکومت خضر حیات کے ہاتھ میں تھی اور ہم کو اپنے جائز حقوق سے محروم بنا دیا گیا تھا، اس لئے ہم کچھ نہ کر سکے ....."

خضر حیات کی وزارت کی رحمتیں (؟) بیچارے مسلمانوں پر مسلّم! مگر اس حقیقت کے چہرے پر تو ہلکی سی نقاب بھی باقی نہیں رہی کہ تقسیم پنجاب پر "خضر وزارت" کے اثرات اور اس کی پالیسی کے نتائج یقیناً اثر انداز ہوئے۔

صفحہ ۲۲۲، اور ۲۲۳ پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے "اسلامی حکومت کے نظریہ" پر لائق مصنف نے جو تنقید کی ہے وہ کتاب کا سب سے کمزور حصہ ہے، اس پر ہم بحث کا آغاز کریں گے تو یہ "تنقید" ایک طویل مضمون بن جائے گی ـــــــ ہم بزمی صاحب کی خدمت میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ مولٰنا مودودی کے اس موضوع پر مضامین ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں، اگر دل کو پہلے سے شکوک و بدگمانی کے لئے تیار نہ کر لیا گیا تو مودودی صاحب کے مضامین پڑھ کر انشاءاللہ "حق" واضح ہو جائیگا۔

کتاب کی زبان سلیس و سادہ ہے اور اظہار بیان میں سلجھاؤ پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں خطابت کا انداز بھی آگیا ہے ـــ اور ان تمام خوبیوں کے باوجود بزمی صاحب سے "آدم زاد" ہونے کے سبب کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوئی ہیں ـــــــ مثلاً ایک جگہ انہوں نے "پرائے شگون پر ناک کٹوانا" لکھا ہے، حالانکہ ضرب المثل یوں واقع ہوتی ہے:-

"پرائے شگون کے لئے اپنی ناک کٹوانا"

صفحہ (۱۳) پر لکھا ہے ـــ "مگر، ار اگست کو ریڈ کلف کے ثالثی فیصلہ نے ان توقعات پر جو دھکا لگایا" ـــ "پر" یہاں غلط ہے "کو" ہونا چاہئے ـــــ صفحہ ۲۴۳ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"کسی شخص کے پاس اتنی دولت ہی نہ ہونے پائے کہ وہ عیاشی کی لت میں پڑ سکے ـــ"

"لت میں پڑنا" خلاف روزمرہ ہے ـــ "اُسے عیاشی کی لت پڑ سکے" لکھنا چاہئے تھا۔

یہ کتاب عوام ہی نہیں خواص کے لئے بھی افادیت سے خالی نہیں! اس کے پڑھنے سے "علم و اطلاع" میں اضافہ اور پرانی معلومات پر صیقل ہوتی ہے۔

"اُردو" انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کا سہ ماہی رسالہ 'اردو' سائز متناسب۔ صفحات ۱۶۰، لکھائی چھپائی اور کاغذ خوبصورت اور نظر نواز۔ ایڈٹ کرنے والے، جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی۔
ملنے کا پتہ :- دفتر کل پاکستان انجمن ترقی اُردو، اسپتال روڈ، کراچی ۱

انجمن ترقی اُردو کا یہ رسالہ جو اٹھائیس سال سے مسلسل زبان وادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے، تقسیم ہند کے بعد اُس ہولناک انقلاب کی زد میں آگیا جس نے آبادیوں کو ویرانوں میں اور بستیوں کو مقتل میں تبدیل کر دیا، جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اُردو جاننے والی دنیا کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انقلابات وحوادث کے یہ خوفناک زلزلے بھی اُن کے عزائم کو جنبش نہ دے سکے اور انہوں نے ناساعد حالات میں بھی " ترقی اُردو " کے کام کو جاری رکھا، زیر تنقید رسالہ اس جدوجہد کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔

پہلا مضمون ـــــ " اردو میں دخیل الفاظ " ـــــ مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں کا حاصل ہے، مولوی صاحب موصوف کی تحریروں میں سادگی، بے ساختگی اور سلجھاؤ پایا جاتا ہے اپنے وقت کے وہ " حالی " ہیں! اس فنی اور تحقیقی مقالہ میں بھی فاضل مضمون نگار نے اس خصوصیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

" بابائے اُردو " نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ کوئی اچھوتا اور جدید موضوع نہیں ہے، آب حیات میں آزاد نے اس کی پہل کی اور اُس کے بعد وقتاً فوقتاً اس عنوان پر کچھ نہ کچھ لکھا جاتا رہا، اب سے تقریباً چھ سات سال پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے نہایت جامع مضمون اس سلسلہ میں لکھا ـــــ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا مقالہ معلومات اور matter کے اعتبار سے سب پر فوقیت لے گیا، " ایجاد واختراع " ہی کوئی سب سے بڑا شرف نہیں ہے کسی چیز میں[1] " اضافہ " بھی بہت بڑی خوبی کی بات ہے۔

اس مقالہ کو پڑھ کر بعض لفظوں کے بارے میں اچھے خاصے لکھے پڑھے اصحاب کو اپنی بے خبری کا احساس ہوگا " تام جھام " کو ہم اب تک ہندی بلکہ بھاشا سمجھتے تھے، مگر مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق نے ہماری اس غلط اطلاع کی صحت کی یہ چینی (زبان) کا اصل لفظ تان جاہ (Tan ja h) ہے، جس کے معنی سواری اور گاڑی کے ہیں ـــــ اسی طرح سے چابی، بالٹی، گوبھی، نیلام، تولیا، گرجا، کمرہ، پیپا، اناناس، کارتوس، ڈوریا، کاجو وغیرہ الفاظ پرتگالی ہیں، جن میں سے بعض اُردو میں آکر قدرے تبدیل ہوگئے ہیں اور بعض بدستور اور " بجرفہ " موجود ہیں۔

لفظی تحقیق میں مضمون نگار کا لطف بیان دیکھئے :-

" آکا کا لفظ دلی کے بعض خاندانوں میں رہ گیا ہے، ورنہ اس کا رواج اُٹھ گیا ہے، آتون بھی گئیں اب دیکھئے " خاتون " کب تک رہتی ہیں "

انگریزی تعلیم نے ہم پر کیا اثر ڈالا؟ یہ " مرثیہ " مولوی عبدالحق کی زبان سے سُنئے :-

" انگریزی ذریعہ تعلیم ہونے سے اور انگریزوں اور یورپینوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے سے یہ ہوا کہ جدت اور جودت مفقود ہوگئی اور نقالی غالب آگئی، اور طلبہ اپنے اخلاق وآداب اور اپنی روایات وتاریخ سے بیگانہ ہوگئے "

فاضل مضمون نگار نے (صفحہ ۵ ـ سطر ۱۲) پر لکھا ہے ـــ " دُنیا کی کوئی زبان اچھوتی نہیں رہتی " ـــ یہاں لفظ

---

[1] " پر " بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

"اچھوتی" وجدان کو کھٹکتا ہے "خالص" زیادہ موزوں تھا ــــ صفحہ ۲۵ پر یہ جملہ :-

" اگر زبان کی قدر و منزلت کا اندازہ اُن مقاصد کو پورا کرنے میں ہے جن کے لئے زبان بنی ہے "

غالباً کتابت کی خراد پر چڑھ کر کچھ سے کچھ ہوگیا، یہ مضمون جب دوبارہ چھپے تو اس جھول کو نکل جانا چاہیئے۔

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار فرمایا ہے :-

" وہ زندہ زبان ہے جو ہر عہد میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہتی ہے اور جب تک یہ بولی جائے گی بدلتی رہے گی یہ زندہ زبان کی خصوصیت ہے، نصرتی کی جو زبان تھی وہ ولی کی نہ تھی، اور جو ولی کی تھی وہ میر تقی میر کی نہ تھی، اور جو میر صاحب کے زمانے میں تھی وہ اب نہیں اور جواب ہے وہ پچاس برس بعد یا ایک صدی کے بعد کچھ اور ہو جائے گی "

ولی اور میر کی زبان میں یقیناً بہت فرق ہے، مگر میر کی جو زبان تھی اور آج کل جو اردو بولی جاتی ہے اُن دونوں میں بس ایسا ہی تفاوت ہے، جیسے اُردو پر سفیدی ــــ "فرق و تفاوت" کی وہ نسبت ہرگز نہیں ہے جو ولی اور میر کی زبان میں تھی، اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس رہے سہے فرق میں بھی کمی ہوتی جائے گی ــــــــ واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان ترقی کر کے "معیاری" بن جاتی ہے اور یہ "معیار" پھر باقی رہتا ہے، اس میں برائے نام تبدیلی ہوتی ہے، ہاں! اسلوب (Style) اور انداز نگارش ضرور بدلتا رہتا ہے تو وہ شعرا اور ادیب جو "معیاری" زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں، ان کے کارناموں کو گردش روزگار چھو بھی نہیں سکتی، وہ زندہ بلکہ شگفتہ رہتے ہیں ــــ ہمارے زمانہ میں اُردو زبان "معیاری" بن گئی ہے، اور یہ باقی رہے گی۔

دوسرا مضمون "اقبال کا نظریۂ فن" جناب عزیز احمد صاحب سابق پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کا ہے۔ عزیز احمد صاحب نے یہ مقالہ بڑی کاوش، جستجو اور کافی مطالعہ کے بعد لکھا ہے! اور جگہ جگہ علمی مباحث آگئے ہیں اور فنی نزاکتیں پیدا ہوگئی ہیں۔

عزیز احمد اُن لوگوں میں سے ہیں جو مغربی فکر و ادب کی دارو پی کر، مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ بلکہ "[illegible]" یہ ہوتی ہے کہ مغربی مفکرین کے ناموں، حوالوں اور ان کے مضامین کے اقتباسات کے انبار لگا دیں، اس مقالہ میں بھی اس "جذبہ و شوق" کی فراوانی ہے۔

شبلی و حالی ــــ اور ان کے بعد عزیز احمد جیسے تنقید نگاروں کے تنقیدی مضامین ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے، ایک طرف سلجھاؤ، شگفتگی، بیساختگی، اور سمجھ میں آنے والا استدلال ہے اور دوسری طرف "تک نیک" کی بھول بھلیاں ہیں جہاں قدم قدم پر دماغ ٹھوکریں کھاتا ہے ــــ

(صفحہ ۲۹) " اس بے انتہا انفرادیت کی وجہ سے اقبال کے نظریۂ فن میں کہیں کہیں کڑیاں مضبوط نہیں اور کئی جگہ تعصبات داخل ہو گئے ہیں، مگر ان کمزوریوں سے کوئی بڑا نظریہ نگار فنون مستثنیٰ نہیں "

" بے انتہا انفرادیت " کے سبب اقبال کے نظریہ فن میں کہیں کہیں کڑیوں کا مضبوط نہ رہنا " ایک عجیب دریافت ہے اور "ہجو ملیح" بھی! ــ اور "اقبال کے یہاں کئی جگہ تعصبات کا داخل ہو جانا . . . . " یورپ کے اُن "مستشرقین" کی صدائے بازگشت ہے جو "اسلام" پر عصبیت کا الزام لگاتے رہتے ہیں ــــ اور ہاں! تعصب کی جمع "تعصبات" گوارا بھی کر لی جائے مگر اس "نظریہ نگار فنون" کی "ایجاد بندہ . . . . " کو کیا کریں؟

(صفحہ ۲۸) "اقبال کو یوں تو فلسفہ اور اس کے تمام متعلقہ علوم سے بہت دلچسپی تھی، لیکن جمالیات کی طرف انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی، وہ برگساں سے بہت قریب رہے لیکن اپنے دوسرے بہت بڑے ہم عصر کروچے سے قریب قریب غافل ــــ"

اس نظریہ سے شاعر کے "الہامی وجدان" کی نفی ہوتی ہے . . . . جمالیاتی ذوق تو ہر شخص کو اور خاص طور سے شاعر کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، یہ اکتسابی چیز نہیں ہے۔ پچھلے شاعروں نے جن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ "جمالیاتی" ہے بجز کس کروچے کے "فلسفہ جمال" کو پڑھا تھا، اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر گل ولالہ، باغ وبہار، صنوبر و شمشاد اور سبزہ وگیاہ پر شعر کہنے سے پہلے شاعروں کو "علم نباتات" پڑھ لینا چاہیے۔

تیسرا مضمون "اردو تنقید کے جدید رجحانات" ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے جو اپنے خیال و فکر کے اعتبار سے نام نہاد "ترقی پسندوں" کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ــــ مضمون کی پہلی سطر ہی میں عبادت صاحب نے اپنے کو بے نقاب کر دیا ہے ــ "ادب میں جدید رجحانات، سماجی اور اقتصادی حالات کے مختلف تغیرات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ــ!" بہت ارشاد ہوا، جزاک اللہ! "زندہ باد! ایں کار از تو آید . . . . . . !" فردوسی کا شاہنامہ، اور سعدی کی گلستاں، بوستاں ــ یہ سب معاشی اور اقتصادی انقلابات ہی کے تو نتائج تھے! "اخلاق و مذہب" کی اہمیت اور ان کے اثرات کو "تغیرات" کی اس فہرست سے یک قلم خارج کر دیا گیا ــــ لیکن آگے چل کر خود عبادت صاحب کے بیان سے اُن کے اس "مارکسی" نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے ــــ فرماتے ہیں:-

"جدید رجحانات کی ابتدا، غدر کے بعد سے شروع ہوئی۔"

سنہ ستاون کے غدر کو اقتصادی اور معاشی حالات کے تغیرات کا نتیجہ قرار دینا، تاریخی حقائق کو جھٹلانا نہیں تو اور کیا ہے۔ اور یہ "بتا کا شروع ہونا" بھی اپنی جگہ خوب ہے! "شب لیلۃ القدر کی رات" کہنے والوں کو مژدہ کہ اس زمانہ کے "پی، ایچ، ڈی" بھی ان کی ہمنوائی کے لئے موجود ہیں۔

اخلاق و مذہب کو رد کر کے اقتصاد و معاش ہی کو سب کچھ سمجھنے کا نتیجہ "دہریت" اور "لامذہبیت" ہوتا ہے ــــ مضمون نگار نے ایک جگہ (صفحہ[1]) لکھا ہے:-

"شعور مادے کے اندر موجود ہے اور اس کی ازلی اور ابدی خصوصیت ہے"

غنیمت ہے کہ ان "مادیت پرستانہ" تصورات کے اندھیرے میں "ازلیت و ابدیت" کی دھندلی سی شعاع کسی نہ کسی روپ میں پائی تو جاتی ہے ــــ ع یہاں تک تو پہنچے، یہاں تک تو آئے!

(صفحہ ۸۹) "بہرحال اس قسم کی لایعنی باتوں کو وہ اُلٹ پھیر کر منفی انداز میں نئے خیالات و نظریات کی مخالفت میں پیش کرتے۔ ان لوگوں میں جعفر علی خاں اثر، ماہر القادری، اور مولانا اختر علی تلہری وغیرہ وغیرہ پیش پیش تھے . . . . ان سب نے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا، لیکن ان لوگوں کی باتوں میں وزن نہیں تھا . . . ."

بجا ارشاد ہوا! "وزن" اور "معقولیت" تو ساری کی ساری ان "ترقی پسندوں" کے حصہ میں آگئی ہے ــــ کون کہتا ہے کہ دنیا میں "پاپائیت" باقی نہیں رہی، "ملا" اور "مولوی" چاہیں بھی تو اتنے تنگ نظر نہیں بن سکتے! پورا مضمون اسی جانب داری اور یک طرفہ تنقید کا ترجمان ہے۔

[1] استعارے اور تشبیہ کے ضمن میں۔

"میر تقی میر کا رنگ طبیعت" اور "ترک اور لاطینی رسم الخط" اچھے مضمون ہیں، تبصروں میں "ریاض الانشاء" پر جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ خود ایک اچھے مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسی قسم کی عالمانہ اور مبصرانہ تنقیدوں سے پڑھنے والوں کو بہت کچھ ملتا ہے۔ تنقید نگار۔ (ق۔ا۔ غالباً قاضی آختر جوناگڈھی اس سے مراد ہیں) تبریک و تحسین بلکہ شکریہ کا مستحق ہے۔

پہلی کرن

"پہلی کرن" — ناول — از۔ رشید آختر ندوی — صفحات ۴۱۶، مجلد گرد پوش اور مصنف کی تصویر کے ساتھ۔ کاغذ چکنا اور سفید، کتابت و طباعت اوسط درجہ کی، قیمت پانچ روپیہ (پاکستانی)

سول ایجنٹ :- تاج آفس، کراچی

جناب رشید آختر ندوی اردو دنیا کے جانے پہچانے ناول نگار ہیں، ان کے متعدد ناول چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں اور کسی مصنف کی نئی نئی کتابوں کا جلد جلد چھپنا اس بات کی دلیل ہے کہ اُس کی تصانیف دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ پبلشر اسی قلم کار کی کتابیں چھاپتے ہیں، جس کی کتابوں کی بازار میں مانگ ہوتی ہے۔

"پہلی کرن" ایک الم انگیز اور دردناک ناول ہے! ۱۹۴۷ء میں دلّی کو قتل و غارت گری کی جن آتشیں منزلوں اور خوفناک وادیوں سے گزرنا پڑا، یہ کتاب اس کا ایک خونیں مرقع ہے۔ رشید آختر ندوی نے پورے خلوص اور جوش کے ساتھ ان لرزہ براندام واقعات اور دلدوز حوادث کو ناول کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اُن کے قلم نے بعض مقامات پر روشنائی کی جگہ لہو ٹپکایا ہے۔

رشید آختر ندوی کو "المیہ نگاری" سے خاص مناسبت ہے، اس میدان میں ان کی طبیعت کے جوہر خوب کھلتے ہیں مگر جہاں "بزم" کا ذکر آتا ہے اور وہ "طربیہ مضامین" لاتے ہیں تو اس جگہ ان کا قلم کاواک ہو جاتا ہے اور یہ تصویر پوری طرح بن نہیں پاتی، اسی طرح جب وہ تمدن و عمرانیت، تہذیب و سیاست اور مذہب و قومیت کا فلسفہ بیان کرتے ہیں تو ان کے خیالات کا اُتھلا پن ایک دو سطروں ہی میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

رشید آختر "سرمایہ و محنت" کی موجودہ کشمکش سے کافی متاثر ہیں، یہ تاثر ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، — اور کبھی کبھی ایسا بھی نظر آتا ہے کہ وہ اشتراکیت اور مذہب و اخلاق میں شاید کوئی سمجھوتا کرانا چاہتے ہیں یا ان کے بیچ بیچ کوئی پگڈنڈی نکالنا چاہتے ہیں۔

"پہلی کرن" دلچسپ ناول ہے، بعض مکالمے پُر لطف بھی ہیں اور اثر انگیز بھی — لیکن مصنف کی تحریر میں یکسانی نہیں ہے، کہیں اظہار و بیان میں شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے اور کہیں اندازِ نگارش گنجلک اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے، پوری کتاب میں اس قسم کی ناہمواریاں نظر آتی ہیں — ناول کے نویں باب کا ابتدائی حصہ اور کہیں کہیں سے بعض ٹکڑے بہت دلچسپ ہیں اگر تمام کتاب اسی انداز پر لکھی جاتی اور مصنف اس روش کو نباہ سکتا تو "پہلی کرن" کی ادبی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا۔

"پہلی کرن" میں زبان و بیان کی اتنی بہت سی غلطیاں اور لغزشیں ہیں کہ ان سب کا ذکر کیا جائے تو یہ تفصیل خود ایک "کتابچہ" اور اچھا خاصہ ضخیم "غلط نامہ" بن جائے گی۔

صفحہ ۲۰، "اور آپ چشم بددور ایک معرکہ مار چکی ہیں" "میدان مار چکی ہیں" لکھنا چاہئے تھا، معرکہ کے لئے "سر کرنا" بولتے ہیں، — صفحہ ۲۳ "مشتعل سکھ حواس کھو گئے" مصنف نے کئی جگہ یہی غلطی کی ہے نہ جانے یہ کس خطہ کی زبان ہے۔ صفحہ ۴۴، "شاہدہ نے اُسے کندھوں سے پکڑ لیا" — کندھوں سے تو کوئی چیز نہیں پکڑی جا سکتی، ناول نگار غالباً یہ کہنا چاہتا ہے "شاہدہ نے اس کے کندھے پکڑ لئے" "بیٹھ" اور وہ کچھ اس طرح بڑبڑا رہی تھی جیسے دماغی توازن کھو گئی ہو" — یہ بھی

"مشتعل ہیکہ حواس کھو گئے" کی طرح غلط جملہ ہے ــــــ صفحہ (۵۵) "مگر مشین گنوں کے آتشیں منہوں کا رُخ ان کی طرف تھا" ــــــ "منہ" لکھنا کافی تھا اس کی جمع بنا کر مصنف نے اپنے ادبی ذوق کو مشتبہ بنا دیا ــــــ (صفحہ ۷۲) "تانگہ والے نے پے در پے گھوڑے کو کئی چابک دیئے" "چابک مارنا" "چابک لگانا" یا "چابک رسید کرنا" بولتے ہیں "چابک دینا" نہ مسموع ہے اور نہ مقبول ــــــ صفحہ ۷۴ "بابو جی کیا ٹھیک ہے، مجھے تو بھی کچھ کہتے" "مجھ سے بھی تو کچھ کہئے" یا "مجھے بھی تو کچھ بتائیے" لکھنا چاہیے تھا! (صفحہ ۷۵) "یہ کیا بیہودگی ہے آرام سے کیوں نہیں چلتے" "آہستہ کیوں نہیں چلتے" یا "ٹھیک طرح کیوں نہیں چلتے" لکھنا تھا ــــ صفحہ ۷۷ "دفعتاً اس کا وہم بھبڑکا" "وہم کا بھڑکنا" رشید اختر صاحب کی زبان سے پہلی بار سننے میں آیا ــــ "اس نے ایک بار قلم پھر پٹخ دیا، شراب کی الماری پر توجہ کی" "وحشی مترجم اخباروں میں اس انداز کا ترجمہ کیا کرتے ہیں ــــ صفحہ ۱۳۹) "ایسے ایسے منتر پڑھ جاتے ہیں کہ ایک دفعہ تو ساری دہلی ان کے زور میں بندھ جائے گی۔ مہمل اندازِ بیان ــــ صفحہ (۱۴۷) "میرے ہاتھ میں پڑا خنجر تمہاری پشت کی ہڈیاں توڑتا تمہارے سینہ میں تیر جائے گا" ــ اس "مختصر نویسی" کو آخر کیا کہیں، اضافہ، جدت یا بیچاری اُردو زبان کے زخموں پر نمک پاشی ــــ "مگر دلجمعیت جیسے جگر گردے کے لوگ ذرا نہیں ڈگمگاتے" ــ "دل گردے" بولا جاتا ہے۔ صفحہ (۱۵۹) "انہیں ایک ساتھ بستر پر ڈالا اور رضائی اوندھا دی" توبہ! "اُڑھا دی" لکھنا چاہیے تھا، یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے، مگر مصنف جس قسم کی زبان لکھنے کا عادی ہے، اس کے لحاظ سے اُڑھادی کو "اوندھا دی" لکھ دینا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ــــ کتنی جگہ "سہارا" اور "گوارا" "ہ" کے ساتھ لکھا ہے۔

صفحہ (۱۶۸) "حضرت ہوش کیجیے" ــ "ہوش کرنا" روزمرہ ہے ہی نہیں! "ہوش میں آئیے" ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے صفحہ (۱۸۱) "یار واس بار نیٹ پیو، اس میں نیا مزہ ہوگا، نئی دھن ہوگی" شراب میں مزہ تو ہوتا ہے مگر اس میں "دھن" بھی ہوتی ہے اس کا انکشاف "پہلی کرن" کے مصنف کی معرفت پہلی بار ہوا ــــ صفحہ (۲۸۰) "اپنی لال شعائیں اس طرح پھینک رہا تھا" ــ اول تو شعاعوں کے ساتھ "ڈالنا" بولتے ہیں "پھینکنا" نہیں بولتے، اس جدت کو گوارا بھی کر لیا جاتے مگر "شعائیں" (بجائے "ع" کی جگہ "ہمزہ") اس "املا" کی آخر کیا توجیہ اور تاویل کی جائے گی؟

اس قسم کی زبان، بیان، محاورے، اصطلاح اور روزمرہ کی غلطیاں جس مصنف سے بے ساختہ سرزد ہوتی ہوں ــــ اس کے بارے میں ہم آخر کیا رائے قائم کریں، اور ان لوگوں کو کیا کہیں جو سنا ہے کہ اس انداز کی نئی نئی کتابوں کے انتظار میں رہتے ہیں ــــ!

خاتون نمبر (برکِط)

خاتون نمبر ماہنامہ برکِط، صفحات ۱۸۶، مصور اور رنگین سرورق، قیمت فی کاپی ۲ روپے
ملنے کا پتہ:ــ ماہنامہ برکِط، تیرتھ داس روڈ۔ کراچی۔

کراچی کے مشہور ماہنامہ برکِط نے بڑی آب وتاب کے ساتھ خاتون نمبر شائع کیا ہے! اس رسالہ کی ادارت سے مختلف شعبوں کا کام جن اصحاب سے متعلق ہے، ظاہر ہے کہ جہاں اتنے بہت سے دماغوں کی کاوشیں شریکِ کار ہوں وہاں نظم و ترتیب میں خوش سلیقگی ہونی ہی چاہیے۔

اس شمارے میں بعض اصلاحی، اخلاقی، اور مذہبی مضامین بھی ہیں جو یقیناً ہونے ہی چاہیے تھے کہ یہ "خاتون نمبر" ہے یہ مضامین اپنی اسپرٹ کے اعتبار سے سراہے جانے کے مستحق ہیں ــــ مگر جہاں "رومان" کی شوخیاں اور حسن و عشق کے چٹخارے ہیں وہ حصہ "خاتون نمبر" کے نام اور انتساب کے لحاظ سے بیگانہ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے۔

اسی "خاتون نمبر" میں ایک تصویر نظر سے گزری جسے دیکھ کر ہم سمجھے کہ یہ کوئی "فلم اسٹار" صاحبہ اپنے پورے اداکارانہ انداز کے ساتھ جلوہ پاش ہیں، مگر تصویر کے نیچے ہی یہ عبارت دکھائی دی ہے۔

"پاکستان کی لائق افتخار محتاط ناقد اور صاحب طرز افسانہ نگار خاتون"

جس پاکستان کی "لائق افتخار" اور "محتاط" خاتونوں کا یہ عالم ہو وہاں کی "کم لائق" اور "غیر محتاط" خواتین نہ جانے کیا ہوں گی ــــــ چند تصویریں اسی "خاتون نمبر" میں اور بھی اسی انداز کی ہیں، جن کو دیکھ کر قوم کی حالت پر خون کے آنسو رونے کو جی چاہا ــــــ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ اس ہنگامۂ ہوا و ہوس کو قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے ورنہ پاکستان جو صرف "اسلام" کے نام پر بنا ہے، اسی سطح پر آجائے گا، جس سطح پر آج یورپ کی معاشرت شرم و غیرت کی لاشوں پر رقص کر رہی ہے۔

صحافت کو اپنا فرض پہچاننا چاہیئے اور ابھی تلافیٔ مافات کا وقت باقی ہے!

کاش!

ہماری مخلصانہ گزارش شرف پذیرائی حاصل کر سکے!

مغربی پاکستان کا

مشہور و معروف ـــ سب سے پرانا ـــ سب سے بڑا

لائلپور کاٹن ملز۔ لائلپور

کا

تیار شدہ ـــ عمدہ ـــ وضعدار ـــ اور ـــ پائیدار ـــ کپڑا

صوبہ پنجاب مغربی

کے بڑے بڑے شہروں مثلاً لاہور (انارکلی، کرشن نگر) گوجرانوالہ، شیخوپورہ۔ لائلپور، ملتان۔ منٹگمری۔ سیالکوٹ۔ جھنگ، گجرات، جہلم، راولپنڈی، کیمبلپور، سرگودھا، بہاولپور، میانوالی میں دہلی کلاتھ مل اسٹورز سے حکومت کے منظور شدہ سستے نرخوں پر مل سکتا ہے اسکے علاوہ کپڑے کے تاجروں کو دہلی کلاتھ مل ڈپو کے تھوک ڈیپارٹمنٹ سے بھی بآسانی مل سکتا ہے۔

لائلپور کاٹن ملز۔ لائلپور کے

تولئے اور ڈسٹر اچھے اور عمدہ تیار کئے جاتے ہیں جو ہمارے دہلی کلاتھ ملز اسٹورز سے نہایت مناسب قیمت پر مل سکتے ہیں۔

اسکی معلومات

پی۔ ایم۔ او صاحب لائلپور کاٹن ملز

سے

حاصل کی جاسکتی ہیں

مطبع عثمانی بھیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری

پاکستان میں پہلی بین الاقوامی صنعتی و تجارتی

نمائش

۲۵ ر نومبر لغایت ۳۱ ر دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

ہز ایکسی لنسی الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان اس کا افتتاح فرمائیں گے

اسٹال حاصل کرنے کا ابھی موقعہ باقی ہے

سیزن ٹکٹوں پر پچاس ہزار روپیہ کے انعامات دیئے جائینگے

پہلا انعام —— دوسرا انعام —— اور دوسرے

جیپسٹر —— آسٹن اے ۴۰ —— ۲۹۸ انعامات

ٹکٹ کراچی کے سینماؤں اور دوسرے مشہور مقامات سے مل سکتے ہیں

بین الاقوامی اسلامی اقتصادی

کانفرنس

۲۵ ر نومبر لغایت ۱۰ ر دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

میں

ایسے ذرائع پر غور کیا جائے گا جن سے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے

کیا آپ مجلسِ استقبالیہ کے رکن بن چکے ہیں ؟

تفصیل کے لئے :- سیکریٹری بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس سکریٹریٹ بلانڈا اسکول بندر روڈ ایکسٹنشن کراچی سے ربط پیدا کیجیے ۔ فون ۷۲۱۸

WE ARE AUTHORISED DEALERS FOR

CHEVROLET CARS & TRUCKS — **BUICK** CARS — **CADILLAC** CARS

Also

Our newly organized Service Station under expert Supervision offers wide facilities

لاہور اوٹوز — **KARACHI AUTOS** — کراچی اوٹوز

GARDEN ROAD — KARACHI Phones 7215 - 7216

(Distributors for Karachi, Sind & Khairpur State)

دی مال۔ لاہور — **LAHORE AUTOS** — گارڈن روڈ۔ کراچی

THE MALL LAHORE Phone 2223

(Distributors for W. Punjab, Jhelum & Rawalpindi)

Only Title Printed at the Lion Art Press, Frere Road, Karachi

ماہنامہ
فاران
ماہرالقادری

جلد (۱) — نمبر (۹)

ماہنامہ

فاران

مدیر

ماہر القادری

دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء

چندۂ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) — فی پرچہ آٹھ آنہ

آٹھ روپے (ہندوستانی) — فی پرچہ ۱۱ ر آنہ

مقامِ اشاعت

کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

حصۂ نظم

ادب کی محفلوں، معیشت کے بازاروں اور سیاست کے ایوانوں میں ایک ہنگامہ بپا ہے —— "زندگی — زندگی! سماج کو زندگی کے قریب لاؤ، لٹریچر کو زندگی کا ترجمان بناؤ، زندگی کی قدروں کو اُبھارو، ہر تصور اور ہر عمل کو زندگی کے سانچے میں ڈھال دو ——" مگر واقعات اپنی زبان سے بول رہے ہیں کہ جب سے "زندگی" کے پُر شور اور انقلابی نعرے لگائے جا رہے ہیں، اُس وقت سے دُنیا "زندگی" سے نزدیک ہونے کے بجائے اور دُور ہو گئی ہے، اور ہوتی جا رہی ہے، زندگی کے نام پر خود زندگی سے گُریز و فرار ہو رہا ہے، یہاں تک کہ زندگی ایک خوابِ بے تعبیر، ایک جسدِ بے رُوح اور ایک لفظِ بے معنی بن کر رہ گئی ہے۔

عزم اور دعوے یہ کہ دُنیا کی بے چینی، سوسائٹی کے انتشار اور معاشرت کے بحران کو دُور کر دو اور ہو یہ رہا ہے کہ ہر غروب ہونے والی شام اور ہر طلوع ہونے والی صبح دُنیا کی بے چینی میں اور اضافہ کر دیتی ہے، انتشار بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ آج کی برابر شاید انسانیت کبھی دُکھی اور مظلوم نہیں رہی، دلوں کا اطمینان جاتا رہا، دماغوں کا سکون مفقود ہو گیا، راتوں کی نیندیں اُڑ گئیں، —— اور "دن"! زخمیوں، قیدیوں اور غلاموں کے سے دن! ہر متنفس اپنی جگہ غیر مطمئن کہ نہ جانے کس لمحہ کیا ہو جائے اور کس وقت کیا اُفتاد آن پڑے، کلیساؤں کے گھنٹے اور مندروں کے ناقوس ہی

نہیں، مسجد کے میناروں سے بلند ہونے والی اذانیں بھی سہمی سہمی، بجھی بجھی اور گلوگیر سی ہیں۔

اشتراکیت نے روس میں "زاریت" کا تختہ الٹ دیا، اور جابرانہ شہنشاہی کی بنیادیں کھود کر پھینک دیں یقیناً یہ دنیا کا بہت بڑا انقلاب تھا، لیکن پھر کیا ہوا؟ وہ گولیاں جو شہنشاہ زار (Tsar) کے حکم سے چلتی تھیں اب عوام کے نمائندے لینن کے حکم اور اشارے سے چلنے لگیں اور جو کام دورِ ملوکیت کا جبروت انجام دیتا تھا وہی فریضہ عہدِ جمہوریت کا اقتدار بھی انجام دینے لگا، اپنے مخالفوں کو نہ زار برداشت کرسکتا تھا اور نہ لینن برداشت کرسکا، طرزِ حکومت اور اندازِ فرمانروائی ضرور بدل گیا، مگر "روحِ عمل" نہیں بدلی، روس کے مظلوم اور پریشان حال کسانوں کو سوویٹ روس کے خلاف کئی بار بغاوت کرنی پڑی ——— اور مزدوروں کی اس حکومت نے روسی کسانوں کے اس احتجاج کو دبانے کے لیے جو ظلم و ستم روا رکھے اس نے زار کی روح کو مژدہ دیا کہ "خداوندِ نعمت! آپ کا کام روس میں بند نہیں ہوا، انسانوں کے لہو سے آج بھی روس کی زمین پر اقتدار و جبروت کے فرامین لکھے جارہے ہیں" ——— یہ تو کارل مارکسیوں کا سلوک غریب اور مظلوم کسانوں کیساتھ تھا جن کا احتجاج یقیناً کسی مذہبی تصور کی بنیاد پر نہ تھا ——— اور اہلِ مذہب پر جو زیادتیاں کی گئیں، اور مسجد و کلیسا کو تباہیوں اور ذلتوں کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا ان کا ذکر تاریخِ انسانیت کا دردناک مرثیہ ہے۔

یہ واقعات کا اخفا اور حقائق سے چشم پوشی ہے جو یہ کہتا ہے کہ روس کے طول و عرض میں عوام چین کی بنسی بجاتے ہیں اور ان کی زندگیاں مطمئن اور آسودہ ہیں، ——— خوف و احتساب کی حکومت زبانوں میں تالے تو ڈال سکتی ہے، مگر دلوں کی بے چینی کو دور نہیں کرسکتی، روس میں بے چینی اور اضطراب کا مادہ اندر ہی اندر پک رہا ہے اور وہ ساعت زیادہ دور نہیں ہے جبکہ یہ کوہِ آتش فشاں ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے گا اور آج جن آنکھوں پر خوش فہمی کی عینکیں چڑھی ہوئی ہیں کل ان کو اپنی بے دانشی، کم نگہی، اور غلط اندیشی پر تاسف ہی نہیں ندامت بھی ہوگی۔

آلِ عثمان کی شہنشاہی کے جھنڈے کبھی کے سرنگوں ہو چکے اور قصرِ یلدز پر آج ترکی قومیت کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ فرانس تو بہت دنوں پہلے ملوکیت کے صنمِ سنگدل کو پارہ پارہ کرچکا، امریکہ میں جمہوریت کا دور دورہ ہے، انگلستان کا شہنشاہ "شاہِ شطرنج" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، برطانوی قلمرو میں حکومت و اقتدار کے جو تار بچھے ہوئے ہیں ان کا مرکز قصرِ بکنگھم نہیں دارالعوام ہے، جہاں عوام کے نمائندوں کی انگلیاں ان تاروں کو جنبش دیتی ہیں ——— ہندوستان اور پاکستان بھی آزاد ہوگئے، اور انگریز نے آزادی کا منشور اس قدر پُراسرار اور حیرت انگیز طریقہ پر عطا کیا کہ اگلی پچھلی تاریخوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی، یعنی اس نے ہندوستان سے اپنا بوریا بستر باندھ کر چلے جانے کی ایک تاریخ مقرر کی اور ٹھیک اس تاریخ کو وہ جاتا ہوا دکھائی دیا! اٹلی، اسپین اور جرمنی میں بھی امپیریلزم نے دم توڑ دیا، ایک جاپان کی شہنشاہی رہ گئی تھی، شاہنشاہی نہیں ——— خدائی! تو جاپان کا یہ فرعونِ بے ساماں جس کا نسب نامہ آفتابِ عالمتاب سے جاکر ملتا تھا، اپنے اقتدار کے تابوت میں خود اپنے ہاتھ سے آخری کیل ٹھونک چکا، چین کا جاگیرداری نظام بھی ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا۔

جائزہ

ملوکیت، شخصی اقتدار اور خانوادوں کی موروثی حکومت سے سب نالاں تھے، اور واقعی ملوکیت نفرت ہی کے قابل ہے، اس شجرِ ملعونہ کی ذرا سی جڑ بھی اللہ کی زمین پر باقی نہ رہنی چاہیے ——— آہ ملوکیت ختم ہو چکی، اس کی جگہ جمہوریت آگئی، جو عوام کے جذبات اور تصورات کی نمائندگی کرتی ہے ——— مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس تبدیلی کے بعد کیا انسانیت کے سینہ سے وہ کانٹا نکل گیا جس کی کھٹک سے انسانیت تڑپ رہی تھی۔ کیا بے چین زندگیوں

کو اطمینان میسر آ گیا اور مضطرب قلوب سکون آشنا ہو گئے۔

سائنس کی ایجادوں نے زمان و مکان کے فاصلوں کو کم کر دیا ہے، جمشید کے پیالے میں چاہے دنیا نظر آتی ہو یا نہ آتی ہو مگر اخباروں میں آج ایک عامی اور بازاری آدمی بھی دنیا کے حالات کا واقفی طور پر مشاہدہ کر سکتا ہے ——— سب جانتے ہیں اور نہ صرف جانتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں کہ ان انقلابات کے بعد بھی دنیا سُکھی نہیں ہے، بے چینیاں، پریشانیاں، بے اطمینانیاں، برائیاں اور تباہ حالیاں گھٹی نہیں اور بڑھ گئی ہیں، ساری دنیا سچ مچ جہنم بن رہی ہے اور جنگلوں کی لکڑیاں نہیں خود آدمی اس میں ایندھن کی طرح جل رہے ہیں، ——— کیا یہ وہی "زندگی" ہے جس کے لئے تقریباً نصف صدی سے سیاست داں، ادیب، شاعر، اقتصاد و معاش کے ماہر اور صحافتی ادارے چیخ رہے ہیں،

ہو یہ رہا ہے کہ ایک "جنگ عظیم" ختم ہوتی ہے اور دوسری "عظیم تر جنگ" کی داغ بیل پڑنی شروع ہو جاتی ہے، کبھی "تین بڑوں" کی کبھی "چار بڑوں" کی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، ساری دنیا میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک شور مچ جاتا ہے کہ امن و صلح کے لئے ایک بار کوئی نہ کوئی نقطۂ اتحاد اور جادۂ اشتراک ضرور تلاش کر لیا جائے گا، لیکن ایکا ایکی اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ خبر شائع ہوتی ہے کہ "مفاہمت کی گفتگو ناکام رہی" ان صلح کانفرنسوں اور امن کمیٹیوں کی ناکامی کے بعد اختلافات میں اور شدت بلکہ طرح طرح کی نزاکتیں اور پیچیدگیاں ہو جاتی ہیں۔

ملکوں اور حکومتوں کے درمیان خوشگوار روابط قائم رکھنے کے لئے ہر جگہ سفارت خانے قائم ہیں، اس رابطہ کو اور زیادہ مستحکم بنانے کے لئے آئے دن Good will mission آتے جاتے رہتے ہیں، پُر تکلف دعوتوں اور شاندار پارٹیوں میں خلوص و اتحاد کے کیسے کیسے پُر جوش مظاہرے ہوتے ہیں، اور کیا کیا معرکۃ الآرا تقریریں کی جاتی ہیں ——— مگر جب منظر کے سامنے سے جب پردہ اُٹھتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ سب "ایکٹنگ" ہو رہی تھی، ایک فلم دکھائی جا رہی تھی اور فلموں میں صرف نقالی اور صنعت گری ہی ہوا کرتی ہے۔

ڈیلیگیشن اور وفود ملکوں میں بجائے خود بھاگے پھر رہے ہیں ——— "تجارتی وفد" "سیاسی ڈیلیگیشن" "غذا، صحت، معدنیات، لاسلکی، مزدوروں کی حالت" اور اسی قسم کے بہت سے مسائل پر غور کرنے اور کسی مفید نتیجہ پر پہنچنے کے لئے! مگر کوئی گتھی بھی ٹھیک طرح سلجھنے نہیں پاتی بلکہ اس میں اور پیچ پڑ جاتے ہیں ——— نظیری نے شاعرانہ انداز میں کہا تھا:- ؎

دیدنش بر دیدنِ من حسرتِ دیگر فزود
خواستم پیکاں بر آرم از جگر، نشتر شکست

مگر سیاست و معیشت کی دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے کہ پاؤں کے کانٹے نکلنے نہیں پاتے کہ دل و جگر میں نشتر ٹوٹ جاتے ہیں ——— !

آگ، ہوا، پانی، اور دوسرے عناصر کو آدمی نے مسخر کر لیا ہے مگر یہ تسخیر "تخریب کیلئے استعمال ہو رہی ہے" "ہیروشیما" میں تباہی کا جو ہولناک حادثہ پیش آیا، وہ سائنس کی معجز نمائی ہے، ——— جس پر فخر کرتے کرتے تہذیب کے سر سے کلاہِ افتخار نہ جانے کتنی بار نیچے گر چکی ہے ——— "ایٹم بم" کا یہ خوفناک دور، اُس پُر امن زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب کہ آدمی پتھروں کو رگڑ رگڑ کر آگ نکالتا تھا، کاش! آدمی ترقی نہ کرتا!

سینکڑوں من فولاد کو لے کر آدمی ہواؤں میں پرواز کر رہا ہے، فضائے آسمانی میں سڑکیں سی بنا دی گئی ہیں ——— مگر ستاروں کی گزرگاہوں سے گزرنے والا

اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اجسامِ آسمانی فضاؤں میں اُڑ رہے ہیں لیکن "انسانیت" رینگتی ہوئی چل رہی ہے، بجلی کی روشنی نے رات کی تاریکیوں کو بھی دن بنا دیا ہے، مگر دلوں کی دنیا پہلے سے زیادہ تاریک ہوگئی ہے ——— سائنس کی ترقیوں اور تمام سہولتوں آسانیوں اور عیش سامانیوں کے باوجود "زندگی" آج بھی بے قرار و مضطرب ہے آدمی کو کسی کل چین نہیں پڑتا اور انسانیت انگاروں پر لوٹ لوٹ کر زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔

دفتروں، بنکوں، تجارت گاہوں اور سیاسی ایوانوں میں کس قدر سلیقہ اور نظم و ترتیب نظر آتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر "بلیٹن" شائع ہوتے ہیں، رپورٹیں چھپتی ہیں، رائے شماری ہوتی ہے، پارلیمنٹوں کی تقریروں اور تجویزوں تک ایک ایک جز میں ربط پایا جاتا ہے، شوکت و طمطراق، ڈسپلن، احساسِ ذمہ داری ——— دستور سازی ایک مکمل فن بن گئی ہے اس کا فلسفہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مرعوب کن بھی ہے ——— ہر رپورٹ کے بعد دوسری تردیدی رپورٹ مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور ہر بعد کا دستور پہلے دستور کی نفی کرتا ہے دستور اور قوانین بنتے ہیں عوام کی بہبود اور آسائش کے لئے! مگر عوام ہیں کہ کسی طرح آسودہ نہیں ہونے پاتے، لاکھوں صفحوں کے قوانین، دساتیر، لاز اور بائی لاز، موجود ہیں، مگر فکر و نگاہ اور خود روحِ انسانیت پراگندہ و منتشر ہے اور قانون سازوں کو بالآخر قانون شکن بننا پڑتا ہے۔

تہذیب، تمدن، عمرانیت اور سائنس کے ساتھ ساتھ "لٹریچر" نے بھی معاشرے کے سدھارنے اور ترقی دینے کے لئے کیا کیا نہیں کیا؟ ناول، افسانے، نظمیں، ڈرامے، تشبیہے، مقالے، اخبار، رسالے . . . دس ہزار سال میں اتنی کتابیں نہ لکھی گئی ہوں گی، جتنی اس نصف صدی میں لکھی اور چھپ کر ریکٹ میں آگئیں، بلکہ خبروں میں ہو گئیں، ہندوستان کو جانے دیجئے وہ تو غلامی کے بوجھ سے بُری طرح دبا ہوا تھا، اس کی خودی کو ابھرنے کا موقعہ نہ ملا، مگر میکسیم گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی، برنارڈ شا، ایچ جی ویلز، چرچل، رڈیارڈ کپلنگ، اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے قلم اور دماغ کے ذریعہ سوسائٹی کو سدھارنے کی کیا کچھ کوشش نہیں کی ——— لیکن سماج میں سدھار کی جگہ اور بگاڑ پیدا ہوگیا اور یہ طوفان ابھی تھما نہیں ہے اس کی فتنہ سامانیاں ابھی تک جاری ہیں۔

تعلیم کی یہ فراوانی کہ ایک ایک محلّہ میں اسکول، کالج، تربیت گدے، اور دانش گاہیں! اسکول کا کمسن طالب علم بات کرنے میں ارسطو، افلاطون، ڈیکارٹ، اور ہیوم کا نام لیتا ہے، علوم و فنون پر ریسرچ پر ریسرچ ہوتی چلی جارہی ہیں، کوئی مچھروں اور کھٹملوں پر تحقیقات کر رہا ہے، کسی کی ساری عمر سکندر ذوالقرنین کی ماں کا نسب نامہ معلوم کرنے میں صرف ہوگئی، کوئی اس میں سر کھپا رہا ہے کہ یہ جو شیخ سعدی نے گلستاں میں سرائے اغلمش کا ذکر کیا ہے یہ آخر تھی کہاں؟ کسی کا موضوعِ تحقیق ہیروڈوٹس ہے اور کسی کا بطلیموس ——— ان تمام عرق ریزیوں اور کاوشوں کے باوجود "علم" اپنے فریضہ کی تکمیل سے قاصر ہے، زمین کی تہوں، دریاؤں کی کائی، سمندروں کے تہ کوں، درختوں کی شاخوں، اور پتیوں کی تحقیق ہو جاتی ہے، مگر آدمی خود اپنی زندگی کی تحقیق نہیں کر سکتا، تعلیم و تدریس کا اُجالا گھر سے باہر ہی باہر دکھائی دیتا ہے "درونِ خانہ" تاریک ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

آخر بات کیا ہے کہ تہذیب، تمدّن، سائنس اور علوم و فنون کی اس قدر ترقی، فراوانی اور جلوہ آرائیوں کے ہوتے ہوئے بھی اندھیرا ہے، اضطراب ہے، جہل و نادانی اور تشکیک و بے یقینی ہے، بننے کی جتنی زیادہ کوشش کی جاتی ہے، اُتنا ہی آدمی اور زیادہ بگڑتا اور خراب ہوتا چلا جاتا ہے، پوری انسانی سوسائٹی مدقوق اور مفلوج سی نظر آتی ہے، ملوکیت کے بعد دُنیا نے جمہوریت اور عوامی حکومت کا بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا "زندگی" اور "انسانیت" کو کسی نظام و دستور میں بھی عافیت میسر نہ آئی۔

صورتِ حال یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا پورا کارخانہ ایک بے اخلاق اور خدا ناشناس نظام کے تحت چل رہا ہے، ہر حکومت کے اربابِ اقتدار اور اہلِ فکر نے اپنی اپنی فہم و دانش کے مطابق قانون اور دستور بنا لئے ہیں، وہ "آدمی" جسے "تابعِ قانون" بننا تھا، "واضعِ قانون" بن گیا ہے، تسلیم و رضا اور انقیاد و اطاعت کی براہیمی فطرت کی جگہ نمرود اور فرعون کی ذہنیت کار فرما ہے زندگی کے ہر شعبہ میں "آدمی" "خود اپنا" "رب" اور "الٰہ" بن گیا ہے، کچھ "خدا" سیاست کے ایوانوں میں جلوہ گر ہیں، کچھ "معبود" تجارت کی منڈیوں پر قابض ہیں اور کچھ "الٰہ" علم و ادب کی مسندوں پر متمکن ہیں، جس دُنیا میں اتنے بہت سے "خدا" ہوں وہاں ابتری پھیلنی اور انتشار پیدا ہی ہونا چاہئے۔

آدمی آج اپنے مقصدِ زندگی اور غایتِ آفرینش سے غافل ہے اس لئے وہ "زندگی — زندگی" چلائے چلا جاتا ہے مگر "زندگی" سے کسی طرح قریب نہیں ہو پاتا، ہر کسی نے اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو "معبود" بنا لیا ہے، خواہشوں کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لئے ایک ایک آدمی نہ جانے کتنے "خداؤں" کی پرستش کرتا ہے —— اس چیز نے قول و فعل میں سچائی اور خلوص باقی نہیں رکھا، آدمی انتہا سے زیادہ خود غرض ہو گئے ہیں، اور اسی خود غرضی اور نفس پرستی نے سماج کو تہ و بالا کر رکھا ہے، زندگی جسے بیحد و بیکراں ہونا چاہئے تھا ذلیل خواہشوں کے ہجوم میں دب کر اور گھُٹ کر رہ گئی ہے، یہ تصور عام طور پر کام کر رہا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، اس مختصر زندگی میں جتنی لذتیں مل سکیں انہیں سمیٹ لو خواہشوں کی سیرابی جس جگہ بھی ممکن ہو اور اُس کے لئے جو طریقے اور ذریعے بھی اختیار کئے جا سکیں، ان سے غافل نہ رہنا چاہئے بادشاہوں کے درباروں میں قصیدہ خوانی کر کے بھی اس لذت کو حاصل کر و اور ہوا کا رُخ بدل رہا ہو تو پھر غریبوں اور مزدوروں کی حمایت و ہمدردی کی آڑ میں بھی خواہشوں اور لذتوں کی صید افگنی کرنے سے نہ چُوکو —— "انسان" نے جب بادشاہتوں جاگیرداریوں، بنکوں، امارتوں، اور شخصی جاہ و اقتدار کی پوجا کی اُس وقت بھی وہ "خدا شناسی" سے دُور تھا، اور آج جب کہ زمین کے ایک ایک چپہ اور کارخانوں اور مشینوں کے ایک ایک پیچ اور ایک ایک اسکریو (Screw) کو قومی (nationalise) بنانے کا جذبہ کار فرما ہے تو اب بھی وہ "خدا ناشناس" ہی ہے۔

خدائے قادر و مطلق اور ربّ السمٰوات والارض کو حاکم، شہنشاہ، مالک اور رب نہ ماننے کا یہ نتیجہ ہوا ہے، کہ زندگی بے قید اور بے اصولی بن کر رہ گئی، اخلاقی ضابطے نظر انداز کر دیئے گئے۔ دلوں سے روزِ جزا کے احتساب کا خوف جاتا رہا۔ خیالات کی وحدت اور مرکزیت پارہ پارہ ہو گئی، وہ انسان جن کو "ایک کلمہ" پر جمع ہونے کی دعوت دی گئی تھی، آج بالکل متفرق اور منتشر نظر آتے ہیں۔ بیشمار خود ساختہ نظریوں کے ظہور اور ان گنت اصولِ حیات کی نمود نے سماج کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور دُنیا کے ہر گوشہ میں پراگندگی کے آثار نمایاں ہیں۔

لوٹ پیچھے کی طرف گردشِ ایام کچھ اور!

آج سے ساڑھے تیرہ سَو سال قبل انسانی معاشرے کے سدھار نے اور زندگی سے قریب تر ہونے کے لئے جدوجہد کی گئی، مگر یہ کوشش یک رُخی اور نا تمام نہ تھی اس میں "ہمہ گیری" تھی، زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر نہ تھا، یہ تحریک ایسی نہ تھی کہ ایک آدمی یا چند آدمیوں اور کسی قوم نے خود ہی سوچ کر اپنے ظن وتخمین سے اس کے اصول مرتب کر لئے ہوں اس "تحریک" کو اُس خدائے واحد کی ہدایت حاصل تھی جو کائنات کا خالق ہے اور جس کے حکم کے بغیر گھانس کا ایک ریشہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔

اسلام نے روٹی اور معدے کے نام پر دُنیا کو جمع نہیں کیا، اُس نے یقین وایمان، نیکوکاری اور پاکبازی کے نقطہ پر خدا کی مخلوق کو اکٹھا ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ سب مِل جُل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی کیساتھ تھام لو اس ہدایت، دعوت، دستورِ حیات اور نظامِ زندگی نے لوگوں کی سیرتوں، زندگیوں، اور کرداروں میں اس قدر عظیم الشان انقلاب پیدا کیا کہ انسانیت کی پوری تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، اس ہدایت اور نظامِ حیات کی بدولت چور، خائن، اور لٹیرے، انتہا درجہ کے دیانت دار، پاکباز، حقوقِ انسانی کے محافظ اور نگہبان بن گئے، اطاعتِ حق کے لئے ان میں اس قدر صلاحیت اور استعداد پیدا ہو گئی تھی کہ ادھر شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا اور اُدھر مدینہ کی گلیوں میں شراب بکھیر دی گئی، عورتوں کو "حجاب" کا حکم ملا اور کھلے ہوئے جسموں پر چادریں اور جلباب ڈال دئے گئے، وہ جو بے حیائی اور فحاشی پر ناز کرتے تھے اس قدر باحیا، شرمیلے اور غیرت مند ہو گئے کہ کبھی اچانک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ غیر عورت پر نہ پڑنے پاتی! اُن کے دولت مند خدا ترس اور مخلوقِ خدا کے غمگسار تھے، وہ غریبوں کا حق پہچانتے تھے اور جو نادار اور فلاکت زدہ تھے اُن میں یقیناً نادار بھی تھے اور غریب بھی تھے، ایسے بھی تھے جن کے سَو سَو اونٹ تجارتی مال لے لد کر شام اور یمن سے آتے تھے، اور انہی میں ایسے مفلس بھی پائے جاتے تھے جو کھجوروں کی گٹھلیاں چُوس چُوس کر خدا کا ذکر کرتے تھے، انہوں نے صرف روٹی اور معدے کی پرورش کے لئے سچائی کو قبول نہیں کیا تھا، ان کے تصورات کا محور اور معتقدات کا مرکز "تن پروری" نہ تھا، زندگی کی ضرورتیں یقیناً ان کے ساتھ بھی لگی تھیں، مگر ان ضرورتوں کو اُن سراپا خیر اور مجسم برکت افراد نے مقصودِ حیات کبھی نہیں سمجھا، اس لئے معاشی ناہمواری کے باوجود اُن کی معاشرت میں مساوات اور یکرنگی پائی جاتی تھی —— —— اُن میں ایثار اور مخلوقِ خدا کی خدمت کا اس قدر بے پناہ جذبہ موجود تھا، کہ وہ اپنے قیدیوں تک کو خود بھوکا رہ کر کھانا کھلاتے اور مسافروں کو نوازتے۔

اسلام نے ان میں غیر معمولی وسعتِ ظرف، بلندیٔ نگاہ اور پاکیزگیٔ قلب وضمیر پیدا کر دی تھی، اُن کا جینا اور مرنا صرف خدا کے لئے تھا، اس لئے خدا کے سوا کسی سے وہ ڈرتے نہ تھے، بادشاہوں کے درباروں میں بھی وہ پہنچے تو کلمۂ حق کہنے سے نہ رُکے، شاہی جاہ وجلال ان بادیہ نشینوں کو مرعوب نہ کر سکا، ان کی ذات حق کا معیار تھی، اُن کی زندگیاں سچائی پھیلانے اور بُرائی مٹانے کے لئے وقف تھیں، اُن کی تلوار نے معاشرے کے فاسد مادّے کے ساتھ وہی سلوک کیا، جو سول سرجن کا نشتر کرتا ہے، تلوار رفعِ نزاع کا فرض انجام دیتی اور قرآن کی روشنی میں وہ نفوسِ قدسیہ امن پھیلاتے، ان کی پُرخلوص جنگ آج کل کی منافقانہ صلح سے بہتر تھی، جس سرزمین پر وہ پہونچے اقبال مندی اور فتح وکامرانی نے آن کا بڑھ کر استقبال کیا، اور ہر مفتوحہ علاقہ کا ایک ایک ذرہ زبانِ حال سے پکارا:- ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

یہ ایسے بے غرض، بلند نگاہ، پاکیزہ نفس اور انسانیت کے سچے غمخوار اور ہمدرد تھے کہ دنیا کا کوئی لالچ انہیں اپنی طرف مائل نہ کرسکا اور کوئی طاقت اُنہیں نہ جھکا سکی، پھٹے ہوئے کپڑے اور ٹوٹے ہوئے جوتے پہن کر بادشاہوں اور حاکموں کے درباروں میں وہ بے باکی کے ساتھ قالینوں کو روندتے ہوئے پہونچے اور سچائی کا اظہار اس قدر بے خوفی کے انداز میں کیا کہ قصر و ایوان کانپ کانپ اٹھے۔

خدا کی ہدایت، اسلام کی تعلیم، قرآن کی رہنمائی اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیض تربیت نے ان میں عجیب وغریب جوش، حوصلہ مندی، تہذیبِ نفس، اور سیرت و کردار کی تقدیس پیدا کردی تھی ـــــ وہ بادیہ نشین اور دشت نورد تھے، تمدن و تہذیب کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی تھی، مگر جب زمامِ حکومت ان کے ہاتھ میں آئی اور عنانِ فرمانروائی کو انہوں نے سنبھالا تو دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ان کے عادلانہ طرزِ حکومت نے نوشیروان کے کارناموں کو گرد کردیا! ان کی حکومت تالیفِ قلب، محبت، صلح و امن اور سلامتی کی حکومت تھی، تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ جب انہیں کسی علاقہ کو چھوڑنا پڑا ہے تو وہاں کی غیر مسلم رعایا رو رو کر دُعا مانگتی تھی کہ خدا تمہیں جلد واپس لائے۔

ان نیک نفس، راست باز اور روشن ضمیر لوگوں نے نہ "زندگی ..... زندگی" کے نعرے لگائے نہ روٹی اور معدے کے نام پر لوگوں کو جمع کیا، نہ دولت مندوں اور غریبوں، افسروں اور مزدوروں، زمینداروں اور کسانوں کی اقتصادی منفعت اور معاشی سود و زیاں کی بنیاد پر پارٹیاں بنائیں، اُن کا متحدہ محاذ "کلمہ توحید" تھا ـــــ یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی حاکمیت کو مان کر اسی کے تحت زندگی بسر کرنا! اس عقیدے نے عملی زندگی کے تمام شعبوں کو درست کردیا، اُن کے خلیفہ اور حکام عام لوگوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرتے، نہ اُن کے یہاں قصر و ایوان تھے اور نہ حاجب و دربان! وہ کسی باڈی گارڈ اور محافظ دستہ کے بغیر ایک غلام کو ساتھ لے کر سینکڑوں میلوں کا سفر کرتے، قحط کے زمانہ میں وہ پیٹ بھر کر روٹی نہ کھاتے، ایک بڑھیا سرِ دربار ان کو ٹوک سکتی تھی، اور ایک اعرابی اُن کا گریبان پکڑ کر اپنا حق طلب کرسکتا تھا، راتوں کو جاگ جاگ کر اور گلیوں میں گھوم گھوم کر رعایا کے حالات معلوم کرتے۔ ان کی پیٹھ پر آٹے کی بوری بھی دیکھی گئی جسے ایک بھوکے گھرانے تک لے جایا گیا۔

وہ تاجر تھے مگر انتہائی راست باز تاجر، مال بیچتے وقت اپنی چیز کا عیب تک لینے والے پر ظاہر کردیتے بات کے پکے اور قول کے سچے! ان کے امیر خدا ترس اور پریشان حالوں کے ہمدرد تھے اور اُن کے غریب بلند نگاہ اور عالی ظرف! نہ ان کو دولت کا نشہ سرشار کرتا اور نہ افلاس اور غربت ان کو "خود فروش" بناتی۔

وہ نیکی اور رفاہ عام کے کام اس لئے نہ کرتے تھے کہ لوگوں میں اُن کی شہرت ہو اور کتابوں میں ان کی تصویریں شائع ہوں، وہ اپنے کاموں کا بدلہ اپنے اللہ سے چاہتے تھے، دنیا والوں کی داد و تحسین کی اُنہیں پروا نہ تھی، اللہ کی خوشی کے لئے وہ سارے زمانہ کی ناخوشی بلکہ دشمنی مول لے سکتے تھے، وہ راتوں کے زاہد اور عابد اور دن کے شہسوار تھے۔ اس قدر پاکیزگی اور نیکوکاری کے باوجود اپنے خدا کے سامنے عاجزی اور افتادگی پیش کرتے، اُن کی آنکھوں کو خوفِ خدا سے اشکبار دیکھا گیا، اُن کی دعائے نیم شبی میں سوزِ دل شریک تھا، ـــــ وہ سوزِ دل جس سے زندگی میں حرکت اور نمو پیدا ہوتی ہے۔

ان کا ادب "اخلاق و انسانیت" کا ترجمان تھا، اُن میں عمر فاروق رض اور علی مرتضیٰ رض جیسے بے مثل خطیب اور مقرر تھے جن کی زبانیں اعلاءِ حق کے لئے وقف تھیں۔ اُن کے شاعر اللہ کی بڑائی، رسول کی منقبت اور نیکی کی تعریف بیان کرتے، اور اخلاق و پاکیزگی کا درس دیتے، ان کا ادبی ماحول بھی "قال اللہ" اور "قال الرسول" کے نغموں سے گونجتا تھا، ان میں کوئی

شخص بے تکلفی اور ہنسی مذاق میں بھی "برہنہ گوئی" اور "فحش کلامی" کو روا نہ رکھتا، اُن کی جلوتیں ہی نہیں خلوتیں بھی مقدس اور پاکیزہ تھیں۔

ان کے پاس فوجی جھنڈے تھے مگر ان کو سلامی نہ دی جاتی تھی، ان کے یہاں خود ان کے مقدس نبیؐ کی قبر تک موجود تھی مگر اس پر اظہار عقیدت و وفاداری کے لئے پھولوں کے ہار نہ چڑھائے جاتے تھے، ان کے یہاں نہ "مینا بازار" لگتے تھے اور کاک ٹیل پارٹیاں ہوتی تھیں، ان کے یہاں نامحرم مرد اور عورتوں کے اختلاط کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی، خدا کے وہ نیک بندے صرف ضرورتاً کے لئے بازاروں میں جاتے تھے کیونکہ ان کے رسولؐ نے فرما دیا تھا کہ "شہروں کے بدترین حصے اُن کے بازار ہوتے ہیں" ان کی مریم صفت عورتیں میلوں، ٹھیلوں، نمائشوں اور بازاروں میں جانا اپنے لئے باعث ننگ سمجھتی تھیں۔ ان کا "رقص" اور بناؤ سنگار غیر مردوں کے دکھانے کے لئے نہ ہوتا تھا، اور نہ وہ ایسا لباس پہنتی تھیں کہ دیکھنے والے کلیجہ تھام کر رہ جائیں۔

بزم سوگ ہو یا جشن مسرت ـــ خدا کے ذکر اور عبادت سے کوئی جلسہ خالی نہ ہوتا، بڑی سے بڑی خوشی کا اظہار ان کے نزدیک خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے سجدے تھے! یرموک، قادسیہ اور ایران و مصر کی فتح کی خبریں جب دارالخلافہ میں پہونچیں تو کسی ایک طاق میں خوشی کا ایک چراغ بھی روشن نہ ہوا، خلیفہ نے اظہار مسرت کے لئے اللہ کے حضور سر نیاز جھکا دیا۔

دعوت عمل

جب تک دنیا میں یہ مقدس نظام برپا نہ ہوگا، انسانیت کو ایک لمحہ کے لئے بھی امن و عافیت میسر نہیں آسکتی ـــ یہی اور صرف یہی نظام فطری، اصلح، متوازن، معتدل اور مفید ترین نظام ہے۔ اس کے علاوہ جتنے نظام بھی پائے جاتے ہیں یا وجود میں آنے والے ہیں، وہ سب کے سب غیر صالح اور ناقص ہیں ـــ جگنو کی چمک چراغ کی لو نہیں ہو سکتی، سراب کو رخشندہ ستاروں کا ہجوم نہیں کہہ سکتے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ع

ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

لوگ اس پر نہ جائیں کہ فلاں نظام کو چونکہ کامیابی ہو رہی ہے اس لئے وہ تسلیم کئے جانے کا مستحق ہے ـــ اس دنیا میں ظالموں اور بیدادگروں کو بھی عروج دیا جاتا ہے اور اس سے اہل ایمان کی آزمائش مقصود ہوتی ہے، خواہشوں کے پجاری ہر بڑھنے والے قدم کا ساتھ دیتے ہیں چاہے وہ قدم جہنم ہی کی طرف کیوں نہ دوڑ رہا ہو اور اہل حق، حق کی ہمنوائی کرتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی مظلوم اور درماندہ کیوں نہ ہو۔

آؤ! ہم سب غریب، امیر، جاہل، عالم، افسر، مزدور، شرقی، غربی، گورے، کالے، چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، سپاہی، کسان، تاجر، ادیب، شاعر اور سیاست داں، اسی صالح نظام کے احیا اور تجدید کے لئے کوشش کریں ـــ یہاں تک کہ کائنات امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے، اس جد و جہد میں اگر جان بھی چلی جائے تو کامیابی ہے اور اگر اس "جہاد اکبر" سے الگ تھلگ رہ کر ہمیں "عمر نوحؑ" بھی نصیب ہو جائے تو وہ ناکام اور رائگاں زندگی ہے، آؤ! اپنی اور تمام انسانوں کی زندگیوں کو کامیاب بنانے کی سعی کریں ؎

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

ماہر القادری
۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء

الیاس عشقی بجے پوری
ایم۔اے

مستعار خیالات

> جہاں شاعروں کے افکار ایک ہی جھروکے سے جھانکتے رہیں ——— !

ذوقؔ دہلوی کی قبر پر خدا کی رحمت کے سدا پھول برستے رہیں، کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ! اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

لیکن اس "اختلاف" کے باوجود گلشنِ ہستی کے سبزہ و گیاہ، برگ و گل اور شاخ و شجر میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں، جن میں عمومیت یک رنگی، اتحاد اور ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے ——— شعر و سخن کی اصطلاح میں خیال و اظہار کا یہ تشابہ، اشتراک و اتحاد "توارد" کہلاتا ہے اگر دُنیا کی مختلف زبانوں کے شعراء کے کلام کا پورے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت آپ ہی واضح ہو جائیگی کہ زبان، قومیت، ملک، آب و ہوا اور ماحول کے اختلافات کے باوجُود، بعض خیالات میں حیرت انگیز "توارد" پایا جاتا ہے۔

غالبؔ نے "عالمِ شہود" کو جس کا دوسرا نام زندگی ہے ایک ایسے خواب سے تعبیر کیا ہے جو خواب میں دیکھا جا رہا ہو اور اسی تشبیہ کا سہارا لے کر وہ شہود کو "غیب، غیب" کہتے ہیں :- ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

زندگی کی خواب سے تعبیر ایک عامۃ الورود خیال ہے، لانگ فیلو (Long fellow) نے بھی کہا ہے :-

Life is but an empty dream.

ای اے پوپ (E. A. Pope) نے بھی وہی بات کہی ہے جو غالبؔ کے شعر میں پائی جاتی ہے ——— لیکن غالبؔ سے زیادہ صاف اور سلجھی ہوئی :-

All that we see or seen
Is but a dream with out a dream.

توارد کی مختلف صورتیں اور قسمیں ہیں جن میں سے ایک قسم اوپر بیان کر دی گئی! کسی شاعر کے خیال کو لے کر آسے ترقی

دینا اور زیادہ حسین و اثرانگیز بنانا بھی "توارد" ہی ہے، — بعض اوقات اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کا شعر "ترجمہ" کے قالب میں ڈھل کر "متاعِ غیر" سے "متاعِ خویش" بن جاتی ہے — اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ صرف چند الفاظ کی تبدیلی سے مفہوم ہی سرے سے بدل جاتا ہے — رابرٹ اوون (Robert Owen) نے ڈاکٹر (Doctor) کے لئے کہا تھا۔

God and the Doctor we alike adore
But only when in danger not before
The danger o'er both are alike requited
God is forgotten & the Doctor slighted.

ذرا سی ترمیم سے کوارلس (Quarles) نے اس مفہوم کو سپاہی (Soldier) پر منطبق کر دیا:-

Our God and soldier we alike adore
when at the brink of ruin not before
After deliverance both alike requited,
Our ...... God forgotten & our soldier slighted.

بعض وقت ایک خیال کے جواب میں دوسرا خیال پیش کیا جاتا ہے، کسی شاعر کی یہ رباعی شہنشاہِ اکبر کے دربار میں پہونچی:-

رومی زستان و تیغ و خنجر نازد | زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد
اکبر بہ خزینہ پر از زر نازد | عباس بہ ذوالفقارِ حیدر نازد

چونکہ اس میں جلال الدین اکبر کا موازنہ شاہ عباس صفوی سے کیا گیا تھا، اس لئے فیضی نے فوراً اس کا جواب لکھا:-

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد | دریا بہ گہر فلک از اختر نازد
عباس بہ ذوالفقارِ حیدر نازد | کونین بہ ذاتِ پاکِ اکبر نازد

فیضی کا کمال یہ ہے کہ پہلی رباعی کا تمام زور جس دعویٰ پر تھا وہ دعویٰ برقرار رکھا گیا ہے اور پھر اپنے ممدوح کو جس انداز میں عباس صفوی پر ترجیح دی ہے وہ اس کے کمالِ مشاقی اور معراجِ پختگی کی روشن دلیل ہے۔

ترجمہ اور ترقی

اردو شاعری میں "مستعار خیالات" دیکھ کر بعض لوگ جھٹ سے یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں، کہ اردو زبان میں خیالات کی ابھی کمی ہے اس لئے اردو شاعروں کو دوسروں سے خیالات مانگ تانگ کر کام چلانا پڑتا ہے اور بعض نافہموں نے ان "مستعار خیالات" کو "سرقہ" سے تعبیر کیا ہے۔

انگریزی شعراء نے عموماً اور ملٹن نے خصوصاً یونان و روما کے شعراء سے خیالات مستعار لئے ہیں اور انہیں بڑے سلیقہ سے اپنے کلام میں کھپایا ہے اور یہ کچھ انگریزی شعراء پر ہی موقوف نہیں ہے، ہر زبان کے شاعر نے دوسروں سے خیالات مستعار لے کر اپنے کلام کو زینت دی ہے۔

انگلستان کے مشہور شاعر تھامس مور (Thomas moore) نے اپنی مشہور مثنوی لالہ رخ میں فارسی شعراء کے انداز میں اظہار خیال کیا ہے، یہاں تک کہ فارسی کی تشبیہیں، استعارے اور تلمیحیں بے تکلف استعمال کی ہیں ـــــ فارسی کے مشہور شعر ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

کو ہو بہو انگریزی میں منتقل کردیا ہے :-

And oh! if there be any elysium on earth
It is this It is this!

جس طرح اعلیٰ درجہ کے شعراء کے کلام میں شاعری کی دوسری خوبیاں اپنے اوجِ کمال پر نظر آتی ہیں اسی طرح "مستعار خیالات" میں بھی ان کی شاعرانہ صلاحیتیں "فن کارانہ" سلیقہ کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہیں ـــــ مثال کے طور پر علامہ اقبال ہی کو لیجئے، انہوں نے دوسرے شعراء سے بعض خیالات مستعار لے کر اضافہ و ترمیم اور ترقی و ندرت کے ساتھ اس انداز میں پیش کئے ہیں کہ اصلیت کی طرف اشارہ کرنے کے باوجود وہ خیالات بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں، اور کسی طرح وہ ان کے ذاتی خیالات سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔

گلستاں میں شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

اقبال نے سعدی کے ان شعروں کا آزاد ترجمہ کرکے 'قدرتِ کلام اور سلیقۂ بیان سے مستعار مضمون میں نئی روح پھونک دی'

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ رفعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسی طرح گلستاں کا یہ مشہور فقرہ ـــــ "دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" اقبال نے سعدی سے مستعار لے کر اسے یوں ترقی دی :-

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجند
عجب ایں کہ می نگنجد بہ دو عالمے فقیرے

سعدی کے اس شعر سے :-

بشاداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

اقبال نے یہ طنزیہ مضمون پیدا کیا ہے :-

فرنگ آدابِ رزاقی بداند
بایں بخشد ازو وامی ستاند

بہ شیطاں آں چناں روزی رساند | کہ یزداں اندراں حیران بماند

طالب آملی کے اس شعر سے

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اقبال نے "ضرب کلیم" کے ہدیہ کے لئے مضمون تراشا ہے، نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کی خدمت میں تازہ ترین اشعار کی نذر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

زمانہ با اُمم ایشیا چہ کرد و کند | کسے نبود کہ ایں داستاں فرو خواند
تو صاحب نظری آنچہ در ضمیرِ من است | دلِ تو بیند و اندیشۂ تو می داند
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من | "کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند"

بھاشا کے ایک شاعر "ساگر" کا ایک دوہا ہے :-

نیک سی کانکری آنکھ پرے جا ہے پیر کے مارے دھیرے دھرے نا
ہے ری سکھی! کل کیسے پرے جب آنکھ میں آنکھ پرے نکرے نا

ایک مبتلائے محبت حسینہ اپنی سہیلی سے کہتی ہے کہ اگر آنکھ میں ایک ذراسی کنکری پڑجاتی ہے تو کسی پہلو چین نہیں آتا، تو پھر اگر آنکھ میں آنکھ سما جائے تو کیونکر قرار آسکتا ہے۔ — صاحبِ "روحِ ادب" (جوش) کی نظم "حقیقتِ دل" میں یہ شعر بہ شکلِ ترجمہ نظر آتا ہے شیخ سعدی کا مشہور قطعہ ہے :-

سگ بدریائے ہفتگانہ بشوئے | چونکہ ترشد پلید تر باشد
خرِ عیسےٰ[1] اگر بہ مکہ برند | چوں بیاید ہنوز خر باشد

پہلا شعر عربی کا کامیاب ترجمہ ہے، اور دوسرا خیال شیخ نے اپنی طباعی اور جودت سے تراش کر عربی تخیل پر اضافہ کیا ہے۔
بھارت ورش کے مایۂ ناز شاعر سورداس نے ان خیالات پر تمثیلات کا ایک محل کھڑا کر دیا — کہتے ہیں :-
"اے دل! تو منکرانِ خدا کی صحبت ترک کر دے، جس کے گھر میں وہ پیدا ہو جاتے ہیں، اس کے رہنے والوں کی عقل خراب ہو جاتی ہے اور عبادت میں کھنڈت پڑجاتی ہے (یہ خیال غلط ہے کہ ایسے لوگ نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں گے، نااہل کی تربیت[2] کے لئے سعی کرنا بے سود ہے۔) اس کے لئے سورداس کا تمثیلی انداز کس قدر دلنشیں ہے :-

(۱) دودھ پلانے سے سانپ اپنا زہر ترک نہیں کر دیتا۔
(۲) گدھے کو خوشبودار اُبٹنے میں نہلانا اور بندر کو گہنا پہنانا فضول ہے۔
(۳) ہاتھی کو دریا میں نہلانا بیکار ہے کیونکہ وہ پھر دھول میں لوٹ کر غبار آلود ہو جائے گا۔
(۴) پتھر کو تیر نہیں چھید سکتا اس بے نتیجہ کوشش میں اپنا ترکش خالی نہ کر۔

---

[1] ہمارے "ترقی پسند" دوست اس پر سورداس کو نہ جانے کیا کیا کہیں گے — "م"
[2] تربیت نااہل را چوں گردگاں بر گنبد است (سعدی)

(۵) سورداس : (بدطینت لوگوں کی مثال) کالے کمبل کی طرح ہے جس پر کوئی اور رنگ نہیں چڑھ سکتا۔

ان شعروں کی تمام مثالیں سورداس کی قوتِ تخلیق کا شاہکار ہیں ـــ مگر "پتھر میں تیر کو نہیں چھیدا جاسکتا" یہ مثال شیخ سعدی کے اس شعر سے متوارد ہے :-

باسیہ دل چہ سود گفتن وعظ — نرود میخ آہنی در سنگ

توارد میں انفرادیت

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مختلف زبانوں کے شاعر ایک ہی خیال کو نظم کرتے ہیں مگر ملک وقوم کا تمدن اور ماحول کے اثرات "اظہارِ خیال" میں "یک رنگی" باقی نہیں رہنے دیتے، اور اسی نقطہ سے دونوں شاعروں کی "انفرادیت" کے راستے الگ الگ پھٹتے ہیں۔

مغرب ہوا و ہوس اور شہوانی جذبات کی منزل کا امیرِ کارواں ہے، وہ نفس کی آسودگی کے لئے چٹخارے چاہتا ہے، چاہے اس کے لئے ماں باپ کی مقدس محبت ہی کو کیوں نہ ٹھکرانا پڑے، برنس (Burns) کس بے حیائی کے ساتھ کہتا ہے :-

Oh. Whistle and I will come to you my lad;
Though father + mother and all should go mad.

(میرے دوست! سیٹی دے کر مجھے بلاؤ! میں فوراً آجاؤں گی! چاہے ماں باپ اور ساری دُنیا پاگل ہی کیوں نہ ہو جائے")

ایران جدید کے مشہور شاعر ایرج میرزا جلال الملک مرحوم نے بھی "قلبِ مادر" کے عنوان سے اسی خیال کو نظم کیا ہے جس میں ماں کی مامتا کا محبوبہ کے عشق سے ہی مقابلہ کیا گیا ہے ـــ پہلا شعر ہے :-

داد معشوقہ بہ عاشق پیغام — کہ کند مادر تو با من جنگ

اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اولاد عشق و ہوس کے وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر ماں باپ کی فطری محبت کو چاہے بھلا دے لیکن ماں کے دل سے اولاد کی محبت کسی عالم میں بھی جدا نہیں ہو سکتی، ماں، نالائق بیٹے کی بدسلوکی دیکھ کر بھی دُعائیں دیتی رہتی ہے ــــــ مشرق اور خاص طور سے "تہذیب و اخلاق" کی نگاہ میں ہوس پرست اولاد کا ماں باپ کے ساتھ اس قسم کا سلوک انتہائی شرمناک اور قابلِ افسوس ہے ..... مگر یورپ کا مقولہ یہ ہے :-

There is no sin in love + politics.

"سیاست اور عشق و محبت میں گناہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا"

دوسری زبان کے وہی خیالات "مستعار" لئے جاتے ہیں جو اپنی زبان کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں، یا پھر انکی ترجمانی ایسے انداز میں کی جاتی ہے کہ عوام وخواص کے وجدان پر وہ گراں نہیں گزرتے، جو شاعر اپنی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہے، وہ دوسری زبانوں کے خیالات کو بہتر انداز میں منتقل نہیں کر سکتا، وہ "حاطب اللیل" ہے، "رات میں لکڑی چننے والا کہ لکڑیوں کے ساتھ کوئی سانپ بھی پلے پڑ گیا تو لکڑی کے گٹھے میں باندھ دیا۔

توارد کی سب سے زیادہ سادہ اور معصوم صورت یہ ہے کہ نادانستہ طور پر، ترجمہ، اضافہ، اور ترقی کے ارادے اور تصور کے بغیر کسی دوسرے شاعر کا خیال اڑ جائے یہی وہ فیضِ توارد ہے جس کی پرچھائیں سنسکرت کے مہاکوی اور عربی کے ملک الشعراء

اداریہ

جب ـــــ اور اب

دو منظر

یہ کوئی خود تراشیدہ افسانہ اور کہانی نہیں، ایک واقعہ ہے ـــــ گزرا ہوا! آج کی "تہذیب زدہ" دنیا شاید اسے افسانہ ہی سمجھے کہ کسی فن کار ادیب نے تخیل کے زور سے خوبصورت لفظوں کو سلیقہ سے تراش کر ایک پیکر تیار کیا، اور اس میں "خیالی روح" پھونک دی! بات یہ ہے کہ آج کل یہی ہوتا رہتا ہے، حقائق کی جگہ پرچھائیوں اور دھندلکوں نے لے لی ہے، ہر زندگی ایک "افسانہ" بن کر رہ گئی ہے ـــــ مگر لوگوں کی "بداندیشی" ہونی بات کو ان ہونی تو نہیں کر سکتی۔ تاریخ اور سچے واقعات کو تو نہیں مٹایا جا سکتا، یرقان کے مریض کو ہر چیز اگر پیلی دکھائی دے تو اس کی اس کمزوری اور نقصِ بصر کے سبب چیزوں کی رنگتیں تو نہیں بدل جائیں گی۔

یہ واقعہ امام فخرالدین رازی کے شہر کی عدالت کا ہے! علامہ عبدالقاہر جرجانی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "اسرار البلاغہ" میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ واقعہ ایک شاہد اور چشم دید حقیقت سے عبارت ہے اس کے راوی اور ناقل نیک اور پاکیزہ سیرتوں کے بزرگ ہیں، جو بڑے سے بڑے لالچ کے لئے بھی خلافِ واقعہ بات نہیں کہہ سکتے۔

قاضی موسیٰ ابن اسحٰق حاکم عدالت رے کے یہاں ایک مقدمہ پیش ہوا، قاضی عبداللہ ابن احمد جو اس واقعہ کے چشم دید راوی ہیں بذاتِ خود اس وقت عدالت میں موجود تھے۔

ایک برقعہ پوش خاتون عدالت میں حاضر ہوئی، خاتون کا ولی (guardian) بھی ساتھ تھا، خاتون کے ولی نے عورت کے شوہر پر پانسو دینار (تقریباً دس ہزار روپیہ) کا دعویٰ کیا، شوہر پہلے سے وہاں حاضر تھا اس نے عدالت کے سامنے عذر پیش کئے جن سے "انکار" مترشح ہوتا تھا ـــــ قاضی نے مدعی سے کہا کہ اپنے دعوے پر گواہ لاؤ، مدعی نے جواب دیا "متعدد گواہ حاضر ہیں"

"ان گواہوں میں سے ایک شخص کو پہلے میرے سامنے حاضر کیا جائے تاکہ خاتون کو وہ شناخت کر لے" ـــــ قاضی کے حکم پر مدعی کا گواہ اپنی قبا کا دامن سنبھالتا ہوا عدالت میں حاضر ہو گیا۔

گواہ۔ (برقعہ پوش خاتون سے مخاطب ہو کر) ذرا آپ سامنے آجائیے۔

شوہر۔ (تلملا کر) یہ کیا کہہ رہے ہو تم! شناخت کے لئے اشارہ بہت کافی ہے۔

وکیل۔ (شوہر کی طرف مخاطب ہو کر) برقعہ پوش خاتون کا چہرہ بے نقاب دیکھ کر شناخت کی جائے گی، کیونکہ شہادت

کے معتبر اور مکمل ہونے کے لئے ایسا ہونا ضروری ہے، تم کو اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

وکیل کی اس قانونی موشگافی اور شرح و تعبیر پر شوہر کے چہرے کا رنگ بدل گیا، فرطِ غیرت نے اُس کے رخساروں کو شہابی بنا دیا اُس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے جھلک آئے، قاضی کا سامنا نہ ہوتا تو وہ وکیل کو شاید مار بیٹھتا، اس نے قاضی کیطرف متوجہ ہو کر کہا:-

"جناب والا! میں آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ اس عورت نے جس قدر مہر کا دعویٰ کیا ہے وہ مجھ پر واجب الاداء ہے مگر میری صرف ایک شرط ہے (سب لوگ اس کے چہرے کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں) وہ یہ کہ میری بیوی اپنا چہرہ عدالت میں بے نقاب نہیں کرے گی۔"

قاضی عدالت نے بُرقعہ پوش خاتون کو شوہر کے اقرارِ مہر اور شرط سے مطلع کیا، اس پر وہ غیرت مند خاتون بولی:-

"قاضی صاحب، جس غیور شوہر کو میرے شرف و عزت کا اتنا خیال ہے اور جو اب بھی میری آبرو اور ناموس کا اتنا بڑا پاسبان ہے، شرعاً ایک مباح امر کو بھی اپنے شرف اور میری آبرو کے منافی سمجھتا ہے اس غیرت مند شوہر کے حق میں آپکو گواہ بنا کر اعلان کرتی ہوں کہ میں نے مہر معاف کر دیا، نہ دُنیا میں مہر کا مطالبہ کروں گی، اور نہ آخرت میں! دونوں جگہ وہ میرے مطالبہ سے سبکدوش ہے۔

دوسرا منظر

اس واقعہ کے بعد جمہوریہ امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین کی میڈم کی وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے، جو بانوئے محترم نے "امریکہ میں اخلاقی پستی" کے عنوان پر کی تھی:-

"یہ لڑکیاں نہ بازاری ہیں اور نہ حُسن فروش، پندرہ بیس برس کے درمیان کی کمسن اور بھولی بھالی لڑکیاں ہیں اکثر یونیورسٹی، کالج، اور ہائی اسکول کی طالبات ہیں، . . . . . اس وقت حکومت امریکہ اور امریکن قوم کے سامنے نامعلوم باپ کے بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا اہم مسئلہ ہے۔ **کنواری ماؤں** کے ان بچوں کی تعداد گزشتہ سال سوا لاکھ سے زیادہ تھی، ان میں سے ایک لاکھ بچوں کی مائیں یونیورسٹی کی طالبات ہیں —— نیز تربیت و تعلیم کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ ان بچوں کے باپ کالج ہی کے ہونہار طلبا ہیں!"

"امریکہ میں حرامی بچوں کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے، سنہ ۱۹۴۶ء میں پچاس ہزار تھی، سنہ ۱۹۴۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر نوے ہزار ہوئی اور سنہ ۱۹۵۷ء میں یہ تعداد سوا لاکھ تک پہونچ گئی، واشنگٹن کے محکمہ اعداد و شمار کی تحقیق کی بنا پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یونیورسٹی کی طالبات بیچاری مظلوم ہیں، ان میں سے اکثر لڑکیاں والدین کی نگرانی، شفقت اور احتساب سے محروم ہیں، اصل یہ ہے کہ امریکہ میں تمام خاندانوں نے اپنی لڑکیوں کو کامل آزادی دے رکھی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نوجوان لڑکی جو اپنی گھریلو زندگی میں محبت و شفقت سے محروم رہتی ہے، کالج میں قدم رکھتے ہی کسی طالب علم سے مل کر عشق و محبت کے تجربہ کا شکار ہو جاتی ہے"

کیا یہ واقعات، شواہد اور اعداد و شمار لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ہیں، یورپ نے آزادی کے نام پر "عورت" کو جتنا رُسوا اور ذلیل کیا ہے، عورت کی اتنی رسوائی تو "دورِ جاہلیت" میں بھی نہ ہوئی تھی، یورپ اپنی دی ہوئی آزادی سے خود تنگ آگیا ہے، جن عورتوں کو اس نے معیشت و اقتصاد کی دُنیا میں بھیج دیا تھا، اب اُنہیں پھر گھروں کی طرف واپس لانا چاہتا ہے مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے، مَردوں اور عورتوں کی ہوسناکیاں اس "رجعت" کے لئے تیار نظر نہیں آتیں

نامحرم عورتوں، مردوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط اور میل جول کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے۔ جو یورپ میں ظاہر ہو رہا ہے! عصمت و عفت کی قیمت کوئی چیز نہیں ہو سکتی، علوم و فنون کی ہزاروں ڈگریاں عصمت پر بے دریغ قربان کی جا سکتی ہیں جہالت بُری چیز ہے۔ مگر "بے عصمتی" اُس سے زیادہ بُری ہے جہاں عصمت پر ذرا سی آنچ آنے کا بھی امکان ہو وہاں "علم کی روشنی" کے مقابلہ میں "جہالت کا اندھیرا" گوارا کیا جا سکتا ہے، جس تعلیمی فضا اور علمی ماحول میں "اخلاق" اور "کردار" جا کر بگڑ جائیں اُس کو جاہلانہ ماحول ہی کہنا چاہئے۔ حقیقی علم تو "نیکو کاری" کا ضامن ہوتا ہے ——— جہاں نیکی نہیں وہاں علم نہیں!

علم کی غایت اور تعلیم کا مقصود نیکی، و بدی کی تمیز ہے، جو علم یہ تمیز پیدا نہ کر سکے وہ علم ہی نہیں جہالت ہے ——— نِدا نکھری ہوئی قسم کی جہالت! غیرت انسانیت کا بہت بڑا شرف ہے۔ یہ شرف اگر جاتا رہا تو انسانیت پستی کے سب سے نچلے طبقہ میں پہونچ گئی ——— اس ذہنیت کے آدمیوں سے انسانیت پناہ مانگتی ہے، اسی سبب سے عورتوں اور مردوں دونوں کے حقوق کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے اسلام نے مَرد کی "قوامیت" کو ضروری سمجھا، اور "حجاب" کی احتیاط کے ساتھ نامحرم مردوں اور عورتوں میں حدِ فاصل قائم کر دی۔

ایک نگاہ

اِدھر بھی

زبان و ادب کی رُوح (معنویت) کی ہی نہیں جسم (حرف و لفظ) کی بھی حفاظت بہت ضروری ہے، جسم نہ ہوگا تو روح کی نمود کس طرح ہوگی، اور صورت نہ ہوگی، تو معنیٰ کا اظہار کہاں ہوگا؟ ——— "مضطر" کے معنیٰ ہیں "مجبور" یعنی جو شخص حالتِ اضطرار میں ہو اُسے "مضطر" کہتے ہیں مگر اُردو میں یہ لفظ "مضطرب" کے معنیٰ میں بعض لوگ استعمال کرتے ہیں اور خاص طور سے شاعروں کے یہاں تو مضطر اور مضطرب میں کوئی فرق ہی نہیں ملحوظ رکھا جاتا، اس غلطی کا ازالہ ہونا چاہئے! اضطراب اور اضطرار ہم معنیٰ نہیں ہیں۔

اسی طرح بعض الفاظ ان دنوں غلط املا کے ساتھ لکھے جا رہے ہیں، ان لفظوں کو "توتے" Parrot ہے اور "طوطے" یا "تیار" اور "طیار" پر ہرگز قیاس نہ کرنا چاہئے ——— یہ غلطی بے خبری اور جہالت کے سبب ہو رہی ہے جس کی تکرار نہ ہونی چاہئے۔

غلط	صحیح
طلاطم	تلاطم
شعائیں	شعاعیں
غیض	غیظ
گوارہ	گوارا

"م" ———

یکے از علمائے ندوہ

گھڑی کی تاریخ

ایجاد، آغاز ——— ہزاروں سال پہلے! اور پھر ترقی ہوتی گئی! آدمی کے ذہنِ جدت طراز کی انجمن آرائیاں! خدا کی دی ہوئی عقل کا مفید کام میں استعمال! دانش و خرد کا نیک اور صحیح مصرف! ———

ابتدائے آفرینش سے انسان ہاتھ پاؤں ہلانے اور بھوک پیاس دُور کرنے کے لئے کام کرنے پر مجبور ہوتا رہا ہے، کام کرتے کرتے جب تھک جاتا تھا، تو اُسے اس کا تو احساس ہوتا تھا کہ اس نے بہت کام کیا یا تھوڑا کام کیا، مگر اُسے یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کتنی دیر تک کام کرتا رہا یا دوسرے کے مقابلہ میں اس نے زیادہ وقت صرف کیا یا کم! کیونکہ اُس کے پاس تعینِ وقت کا صحیح پیمانہ نہ تھا۔

ضرورت کے اس احساس نے انسان کو تعیین وقت کے طریقہ پر غور کرنے پر مجبور کیا، اس نے دیکھا کہ آفتاب کی حرکت کے ساتھ سایہ بھی گھٹتا بڑھتا ہے، اس نے درخت، پہاڑ، مکان اور خود اپنے سایہ کو گھٹتے بڑھتے ہوئے دیکھا، اسے محسوس ہوا کہ آفتاب جب سر کی سیدھ میں آتا ہے تو ہر شے کا سایہ مختصر ہو جاتا ہے، پھر جیسے جیسے آفتاب پچھم کی طرف جاتا ہے سایہ بھی پورب کی سمت لانبا ہونے لگتا ہے، اسی مشاہدہ نے زوالِ وقت کا نشان متعین کیا، یہ گھڑی سازی کی طرف پہلا قدم تھا ——

اب انسان سایہ ڈھلنے کے بعد سے غروب آفتاب تک ہموار سطح پر نشان لگا لگا کر وقت معلوم کرنے لگا، اس کا نام عربوں نے مزولہ یعنی دھوپ گھڑی رکھا، دھوپ گھڑی کے ذریعہ دن کے اوقات متعین کئے، پھر ستاروں کی رفتار سے رات کے اوقات کا تعین کیا، نیز مُرغ کے بانگ دینے اور دوسرے طبعی علامات سے رات کی گھڑیاں متعین کی گئیں؛ دھوپ گھڑی کا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، سایہ کی زیادتی و کمی پر دار و مدار ہے۔

دھوپ گھڑی کا ۲۰۰۰ء قبل مسیح میں عام رواج تھا، کلدانی مورخ ہیرو ڈوٹس نے اس کا ذکر کیا ہے، پھر سب سے قدیم وقت پیما "پانی گھڑی" ہے، کسی ظرف میں ایک خاص مقدار پانی کی رکھتے تھے، اور ظرف کے پیندے میں باریک سوراخ کر دیتے تھے، جس سے پانی رفتہ رفتہ رستا رہتا، برتن میں مساوی خطوط تھے جن سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا

اس قسم کی "پانی گھڑی" مصری، فینقی، کلدانی، اور یونانی ریاضی دان بناتے تھے، اس "پانی گھڑی" میں اصلاح و ترمیم کا سہرا اسکندری ریاضی دان کیتیبیوس کے سر ہے جو تقریباً ۲۴۵ قبل مسیح گزرا ہے اس گھڑی کا ذکر یونان کے مشہور خطیب دیموستھین نے کیا ہے، یہ گھڑی روم میں ۱۵۸ قبل مسیح میں لائی گئی، اس "پانی گھڑی" کے آلات بہت وزنی تھے، جب ۶۲ قدم میں بومپی نامی رومی کمانڈر ایشیا سے روم آیا تو مالِ غنیمت کے ساتھ اپنے ہمراہ ایک گھڑی بھی لایا، جسے دیکھ کر اہلِ روم حیران رہ گئے۔

مصریوں کو "بالو گھڑی" اور دائرہ شمسیہ بنانے کا علم تھا، اسے اہل اسکندریہ استعمال کرتے تھے، مصر سے رومی اپنے ملک میں لے گئے اور روم سے سارے یورپ میں بالو گھڑی اور دائرہ شمسیہ (دھوپ گھڑی) کا رواج ہوا۔

"بالو گھڑی" سے وقت کا اندازہ اسی طرح ہوتا تھا کہ ایک طرف ظرف میں باریک باریک متعدد سوراخ کر دیتے تھے، جن سے بالو کے باریک ذرات مقدار معین میں گرتے رہتے تھے۔

مورخین کا خیال ہے کہ لنگر والی گھڑی کا موجد بتھیوس (سنہ عیسوی) ہے۔ لیکن لکڑی کی گھنٹی بجانے والی گھڑی جسے اسکندریہ کے مہندس اکتازینوس نے (۱۳۵ قبل مسیح) میں بنایا تھا، تمام گھڑیوں سے مختلف اور عجیب صناعی کا نمونہ تھی، عرب مہندسوں نے عہدِ عباسی میں ایک گھڑی بنائی تھی اور ہارون الرشید نے اسی قسم کی ایک گھڑی کرلوس کبیر (شارلمان) کو سنہ عیسوی میں ہدیۃً بھیجی تھی، پیتل کی گولیاں تانبے کے تھال پر گر کر آواز پیدا کرتیں اور انہیں گولیوں کی آوازسے وقت معلوم کیا جاتا تھا، جتنی گولیاں گرتی تھیں اتنی ہی بار تھال بجتا تھا، اس گھڑی میں بارہ گھوڑے سواروں کے چھوٹے مجسمے تھے، ہر ایک سوار اپنا دروازہ کھولتا اور آواز کے اختتام پر دروازہ بند کر دیتا، اس میں چاند کے برج اور جمعہ کے دن معلوم کرنے کی بھی علامتیں تھیں۔

دمشق کے مشہور جیرون نامی دروازہ پر اسی قسم کی ایک گھڑی آویزاں تھی، جس میں ایک باز اپنی چونچ سے گولی تانبے کی پلیٹ پر چھوڑ دیتا تھا، اور اس کی آواز سے وقت معلوم ہو جاتا تھا، رات کے وقت اس کے متعدد چراغ روشن کئے جاتے تھے، اور پانی کے ذریعہ انہیں گردش دی جاتی تھی ——— اہل عرب بنکامہ اور اہلِ مراکش اسے المنجانہ کہتے تھے، اسی قسم کی ایک گھڑی بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں بھی تھی، جس کا ذکر ابن جوزی نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔

۱۲۳۲ء میں شاہ کامل ایوبی نے شاہنشاہ فریڈریک دوم کو ایک لنگر والی گھڑی بطور ہدیہ بھیجی تھی، یہ گھڑی بڑی مصنوع تھی اس میں آفتاب ماہتاب اور سیارے بنے ہوئے تھے۔

لنگر والی گھڑی کا ابتدائی استعمال ۱۱۲۰ء میں ہوا ہے۔ عرب کا مشہور سیاح ابن بطوطہ، انطاکیہ میں اس قسم کی گھڑی کا پتہ بتاتا ہے، مورخ قزوینی نے قسطنطنیہ کی اسی قسم کی گھڑی کا ذکر کیا ہے ——— تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے گرجا کے برجوں پر گھڑیاں نصب تھیں جو فولادی چرخیوں کے ذریعہ گردش کرتی تھیں، ۱۲۹۵ء میں یورپ میں آواز دینے والی گھڑی کا سراغ ملتا ہے، ۱۳۷۰ء میں ہنری رووبک نے فرانسیسی شاہ کارلوس پنجم کے لئے ایک خوبصورت گھڑی بنائی تھی، جس کی مشین کا وزن تقریباً ۲۰ سیر تھا۔

لہ میں نے حیدر آباد دکن میں نواب سالار جنگ کے قصر میں ایک گھڑی دیکھی تھی، جس میں دھات کا بنا ہوا ایک آدمی نکل کر گھنٹہ بجاتا تھا ——— ماہر

سنہ ۱۳۵۲ء میں اٹلی میں ایسی گھڑیاں بنائی گئی تھیں جس سے فلک کے محل وقوع اور ان کے تغیرات معلوم ہوتے تھے۔ اور سوئٹزرلینڈ میں اب تک اس عہد کی ایک گھڑی موجود ہے جس کے تمام پرزے لکڑی کے ہیں، اس میں صرف بڑی سوئی ہے رفتہ رفتہ ماہرین نے گھڑیال کی مختلف شکلیں ایجاد کیں، اور اس طرح مختلف صورتوں کی گھڑیاں وجود میں آگئیں۔ میونیخ اسٹراسبرگ وگسلورڈ پراگ اور جرمنی میں دنیا کی مشہور بڑی گھڑیالیں پائی جاتی ہیں۔

اور ترقی ہوتی گئی

جیبی گھڑی کی ایجاد کا شرف نورمبرگ کے جرمن سائنسدان پطرس ہیل کو حاصل ہے، شروع شروع میں یہ جیبی گھڑیاں پائدار نہیں تھیں، بلکہ وزنی ہونے کے سبب ان کو پاس رکھنا باعث زحمت تھا، ان میں صرف ایک سوئی تھی، اور ایک روز میں دو تین بار انہیں کوکنا پڑتا تھا، اس کا ڈھکن لوہے کا ہوتا تھا، اس وقت تک شیشہ جیبی گھڑی میں استعمال نہیں ہوسکا تھا، ڈھکن کا قطر تقریباً ۲ انچ تھا، اندر کی حرکت دینے والی مشین کے سرے پر تانگا لپٹا ہوتا تھا، جس کے ایک سرے میں کوئی وزنی چیز ہوتی جو اسے متحرک کرتی۔ اسی زمانہ سے گھڑی میں ترمیم واصلاح ہونے لگی، سنہ ۱۵۳۰ء میں لوہے کے بجائے پیتل کا ڈھکن استعمال ہونے لگا۔ اور پھر سنہ ۱۶۱۵ء میں شیشہ کا ڈھکن استعمال ہوا، پھر سنہ ۱۶۳۵ء میں ڈائل کی ایجاد ہوئی اس کے بعد سنہ ۱۶۵۸ء میں زنجیرک کی ایجاد ظہور میں آئی۔ پھر آخری شخص جس نے گھڑی کی اس ساخت کو درجہ کمال تک پہنچایا وہ ہالینڈ کا مشہور فلکی کلیپو ہے جس نے بال کمانی کی ایجاد کرکے گھڑی کا نقص دور کردیا اب ہر سائز کی گھڑیاں بننے لگیں اور اتنی سبک اور ہلکی گھڑیوں کی ساخت عمل میں آئی کہ جن کا جیب میں رکھنا بہت آسان ہوگیا اور پہلی دشواری اور زحمت دور ہوگئی۔

سنہ ۱۶۸۷ء میں منٹ کی سوئی کا اضافہ ہوا۔ سنہ ۱۷۰۰ء میں جو کہ قیمتی پتھر پرزوں کے سروں پر جوڑے گئے۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں سیکنڈ کی سوئی کا اضافہ ہوا، اور اس طرح گھڑی میں اصلاح وترمیم ہوتی رہی یہاں تک کہ گھڑی کے چھوٹے بڑے تمام پرزے اور کیلوں کی تعداد ۲۰۹ تک پہنچ گئی، جن کے جوڑنے اور بنانے میں دو ہزار سے زیادہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

"ٹائم پیس" پہلے ہاتھ میں باندھ دی جاتی تھی، وقت معین پر سونے والے کے ہاتھ میں ایک کیل چبھ جاتی تھی اور اس کی تکلیف سے وہ بیدار ہوجاتا تھا، اس کے بعد گھنٹی بجانے کی ترکیب سوچی گئی۔

"فلکی گھڑیوں" کی ایجاد سنہ ۱۳۶۴ء میں ہوئی، سنہ ۱۸۳۰ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔

لیسیبک میں بجلی سے چلنے والی گھڑی کی ایجاد ہوئی۔ اس ایجاد کا سہرا جرمن کے مشہور میکانک مہندس موسیکسٹو ڈہ کے سر ہے۔

دنیا کی سب سے محیر العقول فلکی کلاک فرانس میں بنائی گئی، اس کے بنانے میں سات سال کی مدت صرف ہوئی اور بیس ہزار فرانک (فرانسیسی سکہ) خرچ ہوئے۔

("الجامعۃ الاسلامیہ" مصر سے براہ راست ترجمہ)

Alarm

ڈاکٹر مسعود حسین خان ایم اے، پی ایچ، ڈی

پریم چند کی مرقّع نگاری

پریم چند کا شمار اردو کے سب سے بڑے مرقع نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس چیز میں ان کا پایہ سرشار اور نذیر احمد کے برابر ہے۔ ان کی فکر گہری ہے، تخیل بلند، نگاہ تیز، اور روشن ہے۔ وہ عام زندگی کو دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، اور اس میں کوئی نہ کوئی بات ایسا ڈھونڈ کر نکال لیتے ہیں، جو ان کے لئے افسانہ کا مواد فراہم کرتا ہے۔ انہیں قصہ کا پلاٹ ڈھونڈھنے کے لئے دور نہیں جانا پڑتا۔ وہ ہر روز دیہاتیوں کو گمنام اندھیرے، اپنے جھونپڑوں کو جاتے، ان کی عورتوں کو گھر کے کام دھندے میں مصروف، کمزور اعصاب کلرکوں کو اپنے اپنے دفتروں کی طرف دوڑتے ہوئے، مزدوروں کو گھروں سے کارخانوں کی طرف اور کارخانوں سے گھروں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے، ان سب کے چہروں، آنکھوں سے لاتعداد کہانیاں ظہور میں آنے کے لئے بیتاب جھانکتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ پریم چند کے افسانوں کا خام مواد یہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمارے سماج کے نچلے اور متوسط طبقہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے زندگی کو "شہر کے تنگ گلی کوچوں" میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جاکر دیکھا"۔ وہ دیہات دکھاتے ہیں، اس کے بسنے والوں کو دکھاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ افسانوں میں جزئیات نگاری کے ذریعے دیہاتی فضا تک پیدا کر دیتے ہیں۔ دیہات کی یہ مصوری اردو ادب میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہے، اس اعتبار سے پریم چند اردو کے ہارڈی ہیں۔

چونکہ پریم چند نے خود دیہات کی کھلی فضا میں پرورش پائی تھی اس لئے وہ دیہاتیوں کے رہنے سہنے کے طریقوں، ان کے جذبات اور ان کے مذہب و روایات سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، ان چیزوں کی مصوری وہ کامیابی سے کرتے ہیں۔ افسانے میں ناول کے برعکس جزئیات نگاری کو بہت کم دخل ہے۔ پریم چند اپنی مصوری صرف چند اشاروں اور کنایوں سے کرتے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی کبھی دیہات کا ایک آدھ چکر لگوا دیتے ہیں، اس دوران میں کبھی کبھی دیہاتیوں کے مکانات میں جھانک لیا، اور ایک آدھ چھپ دیکھ لی، بعض اوقات وہ ہمیں ان کے شادی اور بیاہ کے رسوم، غمی کی تقریبوں، اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب کی بھی جھلکیاں دکھاتے ہیں، وہ اپنے تخیل کی آمیزش سے دیہات کی روکھی پھیکی زندگی کو دلکش بنا دیتے ہیں اور یہاں تک کہ جھونپڑوں میں محلوں کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔

دیہاتیوں کے جذبات کی مصوری میں پریم چند کو غضب کا کمال حاصل ہے۔ سب سے پہلے ہمیں پریم چند ہی نے اس حقیقت سے روشناس کیا کہ وہ زندگی جسے ہم بظاہر مشین کی طرح کام کرتے دیکھتے ہیں، در اصل بڑے لطیف جذبات اور نازک احساسات کی مالک ہے۔ تلخیوں کے باوجود اس میں رس شادابی ہے۔ "گھاس والی" منیا کی چھبیں کون بھول سکتا ہے۔ یہ دیہاتی خوشی اور غم دونوں سے برابر متاثر ہوتے ہیں، ان کے یہاں محبت ہے اور عشق کا طوفان ہے۔ "مزار آتشیں" میں "رلیا" اور

پیاگ، کی محبت لازوال ہے، ان کے یہاں ہمدردی اور انصاف بھی ہم سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ "پنچایت" میں شیخ جمن اور چودھری الگو باوجود گہرے دوست ہونے کے انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، یہ دیہاتی بھولے بھالے ہیں، مفلس وقلاش، قرض کے بوجھ سے دبے ہوتے، رسم ورواج کے پابند، دھرم اور دین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے، مگر آن کی خاطر مٹنے والے ہیں۔ وہ گناہ بھی کرتے، مگر ایسے حسین نہیں کہتے۔ ان کا گناہ پریم چند کے خیال میں' مجبوری کا دوسرا نام ہے اس میں مہذب اور ترقی زدہ انسانوں کی ہوسِ گناہ اور ذوقِ معصیت کی تلخی اور بہا بھی نہیں پائی جاتی۔

غرضکہ پریم چند کے افسانوں میں وہ سب کچھ ملتا ہے جو دیہات اور دیہاتی زندگی سے متعلق ہے، انہوں نے کسانوں کی محبت ونفرت، خوف، وفاداری، خلوص، امید، ناامیدی، غرور، انکسار، خود غرضی، ایثار، بیکسی، مجبوری، زمینداروں کی سختی سودخواروں کی بیدردی، بارش کی تمنا، قہر الٰہی کا خوف، رسوم وتوہمات کی قیدیں، ان سب کو اپنی مختلف، نوع درنوع بوقلمونیوں کے ساتھ اپنے ادب پارہ دل میں منعکس کیا ہے، دیہاتی زندگی کی سیرت، شخصیت اور ماحول کی عظمت سے ان کے افسانے بھرے پڑے ہیں، پریم چند انہیں پیش کر کے کچھ دکھاتے بھی ہیں اور سکھاتے بھی ہیں۔

بحیثیت ایک ہندو کے پریم چند کو اپنے مذہب اور اس کی گوناگوں شکلوں سے پوری واقفیت ہے۔ مذہب سے زیادہ انہیں اُن معتقدات اور روایات کا علم ہے جو اصل ہندو دھرم سے زیادہ اس کے ماننے والوں کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک چمار یا ایک مہتر کن کن چیزوں پر ایمان رکھتا ہے، ان کے معتقدات ہی پر اپنے افسانوں کے بنیاد رکھتے ہیں، پریم چند یہ بحث کہیں نہیں چھیڑتے کہ آیا یہ معتقدات اچھے ہیں یا برے، سچا عقیدہ، چاہے وہ سراسر توہم پر مبنی ہو، پریم چند کے نزدیک قابلِ احترام ہے۔

پریم چند کی ادبیت کے ضامن اگرچہ ان کے دیہاتی مرقعے ہیں، لیکن انہوں نے شہری زندگی کے متوسط طبقہ کے متعلق بھی بہت سے افسانے لکھے ہیں، اور اس طبقہ کی مصوری بھی سدرشن کی طرح پوری پوری کامیابی سے کی ہے۔ لیکن ان مرقعوں کے نقش ونگار تمام کے تمام ہندو متوسط طبقے کے کردار اور ماحول سے بنے ہیں۔

مرقع نگاری میں وفاشعاری (fidelity) ایک ضروری عنصر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول یا جس موضوع یا جس کردار کی مصوری اپنے افسانے میں کر رہا ہے اس سے اچھی طرح واقف ہے یا نہیں۔ پریم چند نے جس ماحول کی مصوری کی ہے، اس سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ غریب کسانوں اور مزدوروں کے رہنے سہنے کے طریقے، ان کی اخلاقی قدریں، ان کے رسوم وروایات کو وہ تفصیل کے ساتھ جانتے ہیں۔ ملوں اور کارخانوں کی زندگی کو بھی انہوں نے بغور دیکھا ہے، اسی لئے وہ مرقع نگاری میں جزئیات تک میں لغزش نہیں کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک انڈسٹریل بنک (جو ابھی حال ہی میں ایک مہاراجہ کو کئی لاکھ روپے قرض دے چکا ہے) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پہلے سال کا منافع آنے پر منیجر اخراجات کی مد میں ٹیلیفون کا اضافہ کرتا ہے، لکھنؤ کا ایک اتنا بڑا انڈسٹریل بنک اور بغیر ٹیلیفون کے!

حُسنِ فطرت

پریم چند کے افسانوں میں حُسنِ فطرت اس کثرت سے جھلکتا ہے کہ ہم اس پر ایک علیحدہ عنوان کے تحت بحث کر سکتے ہیں، وہ ناظرین کو صرف انسانی دماغ کی بھول بھلیوں میں نہیں گھماتے دیر تک اُس میں رہنے سے خود ان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ فوراً تڑپ کر فطرت کی لبیط فضا میں نکل آتے ہیں۔ پریم چند کی طبیعت کا میلان خارجیت کی طرف تھا۔ وہ مناظر فطرت سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں، یہ بچپن کے نقوشِ تاثر تھے

بنارس سے پانڈے پور تک ۴ میل کی دوڑ ...... ندی نالے، لہلہاتے کھیت، بسیط فضا جن کے درمیان سے ایک بارہ پندرہ برس کا لڑکا تعلیم کے شوق میں مست، دندناتا چلا جاتا ہے۔ ہرے بھرے کھیت، چمکدار سورج، اور رنگین شفق اس کے لوحِ تخیل پر حسین عکاسی کرتے ہیں، وہ کبھی خود کو اس حسین فطرت کا جز دیکھتا۔ کبھی اس کے نظاروں میں کھو جاتا، اور کبھی اپنی سمٹی ہوئی زندگی کو فطرت کے پھیلاؤ میں دیکھتا ہے۔

انہیں نقوش تاثر کو پریم چند نے کاغذ کے اوپر ایک بار پھر زندہ کیا، انسانی زندگی اور فطرت کے نازک تعلق کو لطیف اشاروں اور کنایوں میں ادا کیا۔ "تریا چرتر" میں لکھتے ہیں۔

"پُرفضا صحرا میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، وہ چاندنی جس میں نشہ ہے، آرزو ہے اور کشش ہے۔"

چاندنی میں نہ نشہ ہے نہ آرزو، اور نہ کشش! پھر یہ کہاں ہیں؟ کیا قلب انسان میں؟ شاید وہاں بھی نہیں۔ یہ شے وہاں ہو سکتے ہیں جہاں چاندنی بھی ہو اور دل بھی!

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ رومانی افسانوں کی فنی ترتیب میں مناظر فطرت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ افسانہ نگار اس کے ذریعے شاید فطرتِ انسانی کے حُسن، گہرائی اور حقیقت کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے، مصنف دریا کے نظارہ میں محو ہے دفعۃً وہ انسانی جذبات کو دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے:۔

"ندی کی طرح اس کے دل میں بھی لہریں اُٹھتیں جو کبھی کبھی ضبط اور ہمت کے کناروں پر چڑھ کر آنکھوں سے بہہ نکلتیں۔"

پریم چند حیاتِ انسانی اور فطرت کے نازک تعلق کی موشگافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ اپنے اکثر استعارے اور تشبیہیں بھی فطرت سے اخذ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جو عظمت دریا سے پیدا کی ہے، اس کی نظیر اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں دریا ہے، دریا کی لہریں ہیں اور اس کا طوفان! گنگا جمنا اور ان کے حسین مناظر کو شاید ابھی تک کسی نے دیکھا ہی نہ تھا اگر دیکھا تھا تو اردو ادب میں اس کی ایک تصویر ہی نکال دیجئے۔ پریم چند نے سب سے پہلے ان کے حُسن کو دیکھا اور دوسروں کو دکھایا ان کا زور دیکھا اور طوفان بھی اور پھر یہ بھی دیکھا کہ:۔

"لڑکیاں ہیں کہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں"۔

پریم چند نے اپنے ابتدائی افسانوں میں مناظر فطرت سے بہت کام لیا ہے، شاید حد سے زیادہ۔ انہوں نے اپنے اولین افسانوں میں مناظر فطرت کی عکاسی پر اتنی توجہ صرف کی ہے کہ گمان ہوتا ہے مصنف کا مقصد صرف منظر نگاری ہے۔" پریم پچیسی" حصہ دوم میں "مرہم" اس کی بہترین مثال ہے۔ جہاں کثرت مناظر سے چمن جنگل معلوم ہونے لگا ہے۔

کسی افسانے میں مناظر فطرت کو کتنا دخل ہونا چاہئے؟ یہ امر تنقیح طلب ہے۔ چیخوف کا خیال ہے کہ فطرت سے اپنی تصویریں لینے کی ضرورت نہیں اور نہ حد سے زیادہ استعاروں کی، ایک خط میں گورکی کو لکھتا ہے :۔

"اس قسم کے استعارے مثلاً سمندر سانس لینے لگا، آسمان گھور رہا ہے، فطرت کانا پھوسی کر رہی ہے، یا بول رہی ہے، یا رو رہی ہے، وغیرہ واقعات کو بعض اوقات اُکتا دینے والے، بعض اوقات بے معنیٰ اور مبہم سا بنا دیتے ہیں، حُسنِ فطرت سادہ طریقے سے بھی بیان ہو سکتا ہے ـــــ اس قسم کے آسان فقروں سے "سورج غروب ہوا، رات آئی، بارش شروع ہو گئی وغیرہ"۔

پریم چند کا فن جوں جوں ترقی کرتا گیا معلوم ہوتا ہے، وہ چیخوف کے اس نظریے کے قائل ہوتے گئے، "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے بعد اگر آپ 'واردات' اور 'زادِ راہ' پڑھیں تو حیرت ہوگی، کہ وہ ظرافت جو پہلے دو مجموعوں میں اس کثرت سے جھلکتی ہے، آخری دو سے بالکل غائب ہے، اس عنصر کی کمی کی وجہ سے ایک دوسری چیز جس کی کمی لازمی طور سے واقع ہوتی تھی، رنگینیٔ خیال ہے جو درحقیقت لطیف تشبیہات و استعارات کی مرہونِ منت ہے، ان آخری دو مجموعوں میں دریا ہیں، دریا کی لہریں نہیں، چنانچہ جذبات میں بھی لہروں جیسا تلاطم نہیں۔

محویؔ صدیقی لکھنوی

"لاشئے"

قدیم فلسفہ ——— جدید اسلوب

دنیا میں جس قدر عقلی علوم ہیں، ان میں سے کسی ایک کی بھی اتنی شاخیں اور شعبے نہیں، جتنے فلسفے کے ہیں یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ قدیم عہد فلسفہ سے لے کر اب تک جاری ہے اور خدا ہی جانے کب تک جاری رہے گا۔ ہر ملک اور ہر دور میں ہی فلسفہ کی نئی نئی شاخیں پھوٹتی اور پھیلتی رہی ہیں اور ہر ایک نے کوئی نہ کوئی خاص شکل یا خاص رفتار پیدا کر لی ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ جس طرح دُنیا کے دوسرے علوم نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے اور وہ پھیلتے اور بڑھتے گئے ہیں اسی طرح فلسفہ نے بھی نشو وارتقا کی منزلیں گزاری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اعتبارات اور خارجی اثرات حتیٰ کہ جغرافی عوامل تک علوم فلسفہ کی رفتار پر اور جس منزل پر وہ آج پہنچا ہے اس منزل پر پہنچانے میں اثر انداز رہے ہیں اور یہ انہیں عوامل و اثرات کا نتیجہ ہے جو فلسفہ آج اپنی اس معراج پر نظر آرہا ہے۔

اس وقت ہمارا مقصد فلسفہ کے نشو و ارتقا پر بحث کرنا نہیں ہے، نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اب تک اس نے کتنی شاخیں پیدا کر لی ہیں، نہ ہم اس کے مبادی اور فروعات کی تفصیل میں جانا چاہتے ہیں " مذہب لاشئے " سے متعلق ضروری چیزیں بیان کر کے ہم قلم روک لیں گے کہ فلسفیانہ طول بیانی سے بات اور اُلجھ جاتی ہے۔

لاشیئة کیا ہے؟

لاشیئتی، یا مذہب لاشیئة وجود مادہ کے انکار کا نام ہے اور آج دُنیا میں بہت کم لوگ اس مذہب کے قائل ہیں، یہاں تک کہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے البتہ یہ فلسفہ گزشتہ زمانوں میں بہت زیادہ شائع اور رائج تھا، لیکن آہستہ آہستہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بھی دنیا سے ناپید ہوتا چلا گیا۔

اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اس کائنات اور دُنیا کی زندگی میں پائی جاتی ہے، وہ محض ایک خیال ہے اسکی کوئی حقیقت نہیں اور نہ واقعی طور پر کہیں پائی جاتی ہے، اور زندگی کے تمام حوادث ان حالات سے زیادہ فرق نہیں رکھتے جنہیں آدمی سوتے میں دیکھتا ہے اور خواب سے تعبیر کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ صرف اتنا فرق سمجھ لیجئے کہ زندگی کے یہ ظاہرے عالمِ خواب کے مظاہروں سے زیادہ واضح اور روشن تر ہوتے ہیں۔ اس فرق کے علاوہ یہ تمام واقعات بالکل خواب ہیں۔ اگر آپ اس مذہب کے پیرو سے یہ سوال کریں کہ تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سُنتے اور اپنے ہاتھوں سے ان کو چھوتے ہو تو جواب دیتا ہے کہ کیا یہ حرکتیں آپ خواب میں نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کا وجود بیداری یا حقیقت کی دلیل نہیں

ہوسکتا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نظریہ کے قائل عجیب مرد خیال کے لوگ ہیں، کسی دلیل سے انہیں قائل کرنا آسان نہیں بلکہ بہت دشوار ہے اس وجہ سے کہ ہر چیز کا وہ جھٹ سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ دلیل و برہان بھی ان کے نزدیک بجائے خود بکواس یا ہذیان ہے، ویسی ہی بکواس جیسی انسان خواب میں بکتا ہے۔

ان لوگوں کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لوگ جب اس عالم کائنات میں کسی حقیقت کے وجود کو نہیں مانتے اور نہ اسے واقعی جانتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس بزم حیات میں جو کچھ بھی ہے وہ ایک خواب در خواب ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لہذا ان کا کلام بھی خواب ہے اور ہمارے لئے غیر ممکن ہے کہ ہم اس کو حقیقت سے تعبیر کریں یہاں پہنچ کر ان کا دعوے ساقط ہوجائے گا اور کوئی اصول ایسا باقی نہ رہے گا جس پر وہ اپنی اس عمارت کو قائم رکھ سکیں۔

ان کے گروہ میں ایک ایسا فریق بھی ہے جو ان سے ذرا کم طرفدار ہے۔ یہ لوگ مادہ کے وجود سے انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ عالم کائنات میں فکر و خیال کے سوا حقیقت کچھ نہیں ہے پس وہ تمام محسوس ہونے والی چیزیں جو ہمارے حواس میں آتی ہیں ان کا وجود اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض فکر کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور جب فکر غائب ہوجاتی ہے تو یہ بھی غائب ہوجاتی ہیں۔ اس جماعت کے سب سے زبردست حامی برکلے ہیں۔ یورپ کا یہ مشہور فلسفی اٹھارویں صدی عیسوی میں کمال شہرت پر پہنچا، وہ اس صدی کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے۔ اس کی رائیں مکالمات برکلے کے نام سے تمام دنیا میں شائع ہوچکی ہیں۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ یہ بات چیت (مکالمہ) دو شخصوں میں ہوتی ہے ایک کا نام ہیلاس ہے اور دوسرا فیلو نوس ہے۔ ان مکالموں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں کوئی شئے ایسی نہیں جسے تم مادہ کے نام سے یاد کرتے ہو، اور یہ دنیا محض مجموعۂ افکار ہے

ایک مشکل حقیقت

ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرتے ہیں، کہ ہمارے سامنے سیاہ لکڑی کا میز ہے وہ رنگ میں سیاہ اور شکل میں مستطیل (لمبی)۔ اس کی سطح پالش کی ہوئی ہے اور اس کا مادہ سخت لکڑی کا ہے، اس کے چار پائے ہیں جن کی بلندی مساوی ہے۔ جو شخص بھی اسے دیکھے گا انہیں اوصاف سے اسے متصف اور ان اوصاف کو میز پر منطبق پائے گا، یہاں تک کہ دو شخص بھی ان اوصاف میں اختلاف نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر ہم ذرا باریک بینی سے کام لیں تو ہم کو بہت سے وجوہ اختلاف نظر آئیں گے، اس لئے کہ اگر میز کا رنگ سیاہ ہوگا مگر یہ سیاہی میز کے تمام حصول میں یکساں پھیلی ہوئی نہ ہوگی، اس لئے کہ ان میں سے بعض حصے نہایت تیز روشنی میں ہوں گے اور کچھ حصے کم تیز روشنی میں۔ اسی وجہ سے سطحی حصے کی سیاہی زیادہ ہلکی نظر آئے گی۔ ان حصوں سے جو زیادہ تیز روشنی کے موقعہ پر نہیں ہیں، پس چند لوگ جب میز کو بیک وقت دیکھیں گے دماغوں میں رنگ کی جو صورتیں حاصل ہوں گی، وہ ہر ایک کے دماغ میں مختلف ہوں گی، یہ اختلاف میز سے مسافتِ قیام اور مقام روشنی کے اختلاف کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ ہوگا، اور ضرور ہوگا، اسی طرح دوسرے اعتبارات سے بھی کچھ اختلاف ہوگا، ان اختلافات کا ادراک کرنے میں، مصوروں اور نقاشوں سے زیادہ کوئی ماہر نہیں، اس لئے کہ وہ پورے طور پر اس کے عادی ہیں کہ صورتوں کو دیکھ کر ہوبہو ان کی تصویریں اتار دیں اس طرح کہ نقل نقل ہی نہ رہے بلکہ اصل سے قریب تر ہوجائے، اور جو بات میز کے رنگ پر صادق آتی ہے وہی میز کی شکل و صورت پر بھی صادق آئے گی، اور جس مرکز پر دیکھنے والا کھڑا دیکھ رہا ہے اس مرکز کے لحاظ سے شکل میں بھی اختلاف ہوگا۔ یہی اختلاف میز کی بلندی، سختی، سطح کی ہمواری، چکناہٹ اور صفائی کے لئے بھی تم مان سکتے ہو، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میز کی یہ تمام صفتیں اور صفات جنہیں فلاسفر لفظ محسوسات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سب محض نسبتی اعتبارات ہیں جو حالات اور اشخاص کے اختلافات کے ساتھ بدلتے رہتے

ہیں لہٰذا ان میں کسی ایک کو حقیقی سمجھنا اور باقی کو محض وہمی خیال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، بلکہ ان کل اعتبارات میں سے ہر ایک اعتبار کو اپنے حقیقی ہونے کا وہی حق ہے جو دوسرے کو ہے، کہ وہ اپنے کو اعتبار حقیقت سمجھے اور چونکہ ان اعتبارات کی کوئی حد و نہایت نہیں اور یہ باہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بلکہ ممکن ہے کہ ایک دوسرے کے نقیض ہوں، لہٰذا حسب صحت غالب اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان تمام اعتبارات میں کسی ایک اعتبار کا بھی حقیقی وجود نہیں بلکہ یہ سب کے سب مجرد تصور ہی ہیں یا وہ عرض ہیں جو فکر و خیال میں پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ کسی عرض کا اپنے جوہر سے خالی ہونا ممکن نہیں اس لئے یہ عقلی نکلا کہ اس کا کوئی وجود کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جوہر اور عرض دونوں متحد اور لازم و ملزوم ہوتے ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا پایا جانا ممکن ہی نہیں، اور جب عرض محض اوہام ٹھہرے تو جوہروں کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہئے۔

اس شکل کی دوسری صورت

ہم نے جو کچھ کہا ہے جب وہ ثابت ہوگیا تو یہ بات طے شدہ نتیجہ ہے کہ جس قدر بھی اعراض یعنی محسوسات اور جواہر ہیں ان میں سے کسی کا وجود بھی فکر و خیال کے سوا کچھ نہیں، مثلاً جب ہم کسی عمارت کو دیکھیں گے تو یہ حکم لگائیں گے کہ اس کا وجود حقیقی خیال کے سوا اور کہیں نہیں اور وہ بھی اس طرح پر کہ جب خیال غائب ہوگیا، یہ عمارت بھی غائب ہو جائے گی اور اسی پر ہم ذیل کے قیاس کی بنیاد رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہر موجود کا وجود وہی ہے، ضروری ہے کہ وہ فکر و خیال میں ہو، اور اگر وہ فکر و خیال میں نہیں ہے تو مطلقاً موجود ہی نہیں ہے، مزید وضاحت کے لئے ہم یوں کہتے ہیں کہ مثلاً درخت وہ وجود پایا جاتا ہے اس لئے کہ وہ زید کے فکر و خیال میں موجود ہے تو یہ اس لئے کہ زید کے علاوہ کسی اور شخص کے فکر و خیال میں اس کا وجود ہے اور اگر ہر فکر و خیال اس سے خالی ہے تو مطلقاً اس کا وجود نہیں۔

بعض فلسفیوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اس اصول میں کچھ کمزوری اور الجھن ہے۔ انہوں نے اپنے خیال کو اور زیادہ وسعت دی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ جو چیز خدا اور انسان کی قدرت ما سوا ہے اس کا حقیقت میں وجود نہیں۔ یہ قول صحت اور اصابت رائے سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی غلطی

مگر یہ نظریہ ایک غلطی پر مبنی نظر آتا ہے۔ برکلے جیسے وسیع النظر فلسفی سے بھی بھول ہوتی ہے۔ اور اس کے پیرو فلاسفر سے بھی یہ لغزش ہوئی ہے کہ انہوں نے فکر و خیال میں کسی چیز کے وجود وہمی وجود تسبیق اور وجود تصوری میں کوئی فرق و امتیاز قائم نہ رکھا، کیونکہ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ درخت زید کے خیال میں موجود ہے، یعنی اپنی جڑوں، تنوں، شاخوں اور پھل پتوں سمیت، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی صورت زید کے خیال میں متمثل ہے پس یہ باطل جائز ہوگا کہ ایک شئے کا وجود وہمی ہو، بغیر اس کے کہ کسی خیال میں بھی ہو، ہاں البتہ مذہبی اعتقاد ایک مومن کے دل میں وجود الٰہی کا یقین پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ مادی کائنات میں کوئی چیز خدا کے خیال و فکر سے باہر نہیں۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل اعتبار ہے وہ یہ کہ ہم جواہر سے انکار کرتے ہیں لیکن اعراض کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہ اعراض وہ محسوسات ہیں جن کا ادراک ہم حواس کے ذریعے کرتے ہیں۔ لیکن جواہر کا ادراک اس طریقے پر بہت دشوار ہے اس لئے کہ مثلاً زید میز کے وجود کا انکار کرتا ہے، اور کر سکتا ہے لیکن وہ یہ نہیں کر سکتا وہ ان اعراض یعنی محسوسات سے انکار کرے جو میز سے متلازم ہیں، جیسے رنگ، شکل، بلندی، سختی وغیرہ۔ ہاں ان اعراض کی حقیقت کے بارے میں انسان کو وہم ہو سکتا ہے، لیکن خیال میں اس کا نقش وجود اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا وجود کسی نہ کسی صورت میں حقیقی ہوگا اس لئے کہ ہر

علّت کے لئے ایک موجود کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ لاشئے سے محسوسات پیدا ہوسکیں۔ اس لئے کہ لاشئے سے شئے کا پیدا ہونا ناممکن ہے لہٰذا ضروری ہوا کہ صفات یا عوارض کسی ایسی حقیقت کے ساتھ بھی ہوں جسے ہم نہ جانتے ہوں کہ وہ کیا ہیں۔ گو ہم ایک باطنی اعتقاد کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ وہ حقیقت مادّہ ہے۔ مثلاً اگر ہم عرض کریں کہ ہم نے میز پر ایک پردہ ڈال دیا ہے جو میز کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دے، تو گو اس حالت میں اس کے اعراض بھی جاتے رہیں گے، لیکن کیا خود میز بھی جاتی رہے گی۔ اگر نفس الامر میں ایسا ہے تو گویا پردہ فضا میں ایک عجیب و غریب طریقے سے معلق ہوگا، یہ ایک محض صریح وہم ہے اور فلسفہ میں ایسے بہت سے اوہام ہیں، اور بھی وجوہ ہیں جو اس مسئلے کی صحت تسلیم کرنے میں سدِّ راہ ہیں مگر انہیں یہاں چھیڑنا طول کلام ہے۔

اکبر الہ آبادی نے بہت خوب کہا ہے:۔

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

سو وہ تمام حقیقتوں کی آخری حقیقت خدا کی ذات ہے۔

کانپتی ہے اجل!

شوق کھنڈوی

بہ نامِ جوششِ جنوں دامِ این و آں سے نکل — کہ اہلِ عقل بناتے رہیں گے رنگِ محل
تو اس کے سجدوں کے اندازِ سادگی پہ نہ جا — نگاہِ مردِ مسلماں سے کانپتی ہے اجل
وہیں وہیں دلِ مومن نے مات کھائی ہے — جہاں جہاں بھی ہوئے ہیں عمل کے بازو شل
یہ کس نے چھیڑ دیا ذکرِ حضرتِ فاروقؓ — حریمِ قیصر و کسریٰ میں پڑ گئی ہلچل

نکل سکے تو نکل جا فریبِ ہستی سے
کہ ایک سانس کی مہلت نہ دے سکے گی اجل

آہِ صبح گاہی کیلئے

انور اعظمی

عذر کچھ لایا ہے دل بھی بے گناہی کے لئے — خوں ہوا ہے ایک آہِ صبح گاہی کے لئے
جب مرے نغموں سے رونق تھی حریمِ راز کی — کیوں چُنا مجھ کو جہانِ مرغ و ماہی کیلئے

اپنی غیرت کو کسی احساں سے مت رسوا کرو
چھوڑ دو ٹوٹے سفینہ کو تباہی کے لئے

نہیں ہے!

ترے جلووں میں تابانی نہیں ہے — تری تخلیق فارانی نہیں ہے

زمانے کو بدل سکتا نہیں تُو
کہ تجھ میں جوشِ طوفانی نہیں ہے

ماہر القادری

جذب و سوز

مجذوب (مرحوم)

سنبھل کر ذرا تیز گامِ محبت
مقامِ ادب ہے مقامِ محبت

ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے
نہ صبحِ محبت نہ شامِ محبت

نکلنے کی کوشش ہیں دونے پھنسو گے
یہ اے حضرتِ دل ہے دامِ محبت

سرِ دار آیا سرِ طور ہو کر
ترے پاس آیا بڑی دور ہو کر

حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم
کبھی پاس آکر کبھی دور ہو کر

بھلاتا ہوں پھر بھی وہ یاد آرہے ہیں
وہی چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں

بات کیا منہ سے نکالی جائے گی
اک نظر بھی تو نہ ڈالی جائے گی

کیا نظر مجھ پر نہ ڈالی جائے گی
کیا مری فریاد خالی جائے گی

اب بھی مجذوب جو محرومِ پذیرائی ہے
کیا جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے

دِل ازل ہی سے ترے حسن کا شیدائی ہے
وہ جو اک چوٹ پرانی تھی ابھر آئی ہے

درد یہ اور کو ملتا تو وہ مر ہی جاتا
نالے کر کے بھی مجھے نازِ شکیبائی ہے

دو نشتر

تسنیم مینائی

شکستِ دل پہ ہوں اندوہگیں ہم
اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم

کریں کیا اپنی ہستی کا یقیں ہم
ابھی سب کچھ ابھی کچھ بھی نہیں!

نسیم و نکہت

حسرت ترمذی

اب ہم نہ سہیں گے کبھی بیداد کسی کی　　　اب تم نہ سنو گے کبھی فریاد کسی کی

وہی اک اشارا وہی کچھ کنایہ　　　یہی گفتگو ہے یہی بے زبانی

مزاجِ حسن برہم ہے تو کیا ہے　　　مزاجِ عشق برہم ہو تو کیا ہو!
میں اپنے غم پہ اکثر سوچتا ہوں　　　تمہارا بھی یہ عالم ہو تو کیا ہو!
جسے جنت سمجھتی ہے یہ دنیا　　　کہیں وہ بھی جہنم ہو تو کیا ہو!

مرے نالوں میں لطافت ہے وہی نغموں میں　　　یہ حقیقت ہے جو کھلتی ہے کہیں برسوں میں

ہم یاد کریں تم آجاؤ، تم یاد کرو ہم آجائیں　　　اللہ! وہ دن بھی کیا ہوں گے جب ہم یہ زمانہ دیکھیں گے

دل ہو مایوس تو ہنگامۂ محفل ہو کہاں　　　ساز ہی چپ ہوں تو آواز کہاں سے آئے

ہٹا لے ہاں! ہٹا لے مست نظریں　　　میں رفتہ رفتہ پینا چاہتا ہوں

ترے ستم کی شکایت سہی مجھے اے دوست　　　ترے کرم بھی کبھی میں بھلا نہیں سکتا

زباں چپ تھی محبت میں تو کیا تھا　　　خموشی نے دیئے پیغام کیا کیا
نہ دیکھا حسن کا عالم کسی نے　　　محبت کی گئی بدنام کیا کیا

نگاہِ حسن میں پنہاں ہے حسرت
ادائے خاص و لطفِ عام کیا کیا

روحِ تغزّل

عبد المجید حیرت شملوی

تماشا یہ بھی گزرا ہے نظر سے
گھٹا اُٹھی مگر بادل نہ برسے
دکھا کر زخمِ دل یہ دیکھنا تھا
کہ اُس کی داد ملتی ہے کدھر سے

کوئی صورت تو یکسوئی کی نکلے
جو ہونا ہے وہ ہو جائے بلا سے

نہیں ہے اک سکونِ دل نہیں ہے
وگرنہ کیا مجھے حاصل نہیں ہے

جب اور نظر سے دیکھتا تھا
اب اور نظر سے دیکھتا ہوں
کہتا ہوں وہی زبانِ غم سے
جو دیدۂ تر سے دیکھتا ہوں
تھوڑی سی وہ گھر کی عافیت بھی
جاتی ہوئی گھر سے دیکھتا ہوں

رہ گئے پاؤں چلنے والوں کے
اور منزل ابھی قریب نہیں

اُن سے امید چارہ سازی کی
ایک سودائے خام یہ بھی ہے

ہر کسی کی سمجھ میں آجائیں
دل کے ایسے معاملات نہیں

کچھ بھی اُن سے کہا نہ حیرت نے
جب یہ دیکھا کہ التفات نہیں

دو شعر

سید آلِ رضا لکھنوی

کہتے ہیں لوگ آپ سے مجھ کو ہے اک لگاؤ
یہ واقعہ بھی خوب ہے تہمت بھی خوب ہے

واہ! ذکرِ حبیب کیا کہنا
آہ! کس بے وفا کا نام لیا

ماہر القادری

کراچی میں محرّم کا جلوس دیکھ کر

ناچنا، گانا، تھرکنا، شوخیاں، خوش فعلیاں
یہ عزاداری ہے یا ہے رام لیلا کا سماں

ہر سڑک پر عورتوں کے جمگھٹے ہی جمگھٹے
ہر گلی میں ہو رہی ہیں انجمن آرائیاں

کتنے اہلِ دل فقط برقعوں کے نظاروں میں غرق
کتنی آنکھیں چھو رہی ہیں چلمنوں کی تیلیاں

اپنے مرکز کی طرف آرائشیں اُڑتی ہوئیں
یہ عَلَم کی ڈوریاں یہ تعزیوں کی برجیاں

چند شہدے اس طرف ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
کچھ لفنگوں کی اُدھر ہیں رقص کرتی ٹولیاں

چند کمسن چھوکرے جن کی مسیں بھیگی نہیں
نوحہ خوانی کرتے جاتے ہیں بجا کر تالیاں

دودھ پیتے لاڈلوں کو لے کے اپنی گود میں
چل رہی ہیں عورتیں دو تعزیوں کے درمیاں

جیسے آئے ہیں کسی مندر میں بُت کو پوج کر
کچھ سروں پر ہیں کلاوے کچھ گلوں میں بدھیاں

یہ محرم کے ہیں تماشے بند ہو سکتے نہیں!
آ رہی ہے پاس کی مسجد سے آوازِ اذاں

ناچتے ہیں ڈھول کی تانوں پہ کہہ کر "یا حسینؑ"
بڑھتی جاتی ہیں یہ ہر لحظہ دلوں کی گرمیاں

کیا یہی ہیں سوگوارانِ شہیدِ کربلا
قہقہوں کی چھوٹ رہی ہیں ہر طرف پچکاریاں

میرا دل رونے لگا ناموسِ حیدرؓ کی قسم!
دین و ملت کی سرِ بازار یہ رسوائیاں

یہ تماشا تا بکے آخر دکھایا جائے گا
کربلا کا مضحکہ کب تک اڑایا جائے گا

علی ؟

ماہر القادری

زندگی کے ساتھ بہت سی ضرورتیں اور فکریں لگی ہوتی ہیں، "غمِ عشق" چاہے ہو یا نہ ہو مگر "غمِ روزگار" میں ہر کوئی مبتلا ہے غریب کے جھونپڑے سے لے کر بادشاہ کے قصر و ایوان تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے، کوئی دُنیا سے کتنا ہی بے تعلق رہنا چاہے مگر دُنیا اسے الگ تھلگ رہنے کب دیتی ہے! زندگی نام ہی کشمکش اور اُلجھنوں کا ہے، مرنا آسان ہے جینا مشکل، کتنے قہقہوں میں ماتم و فریاد کی چیخیں ملی جلی ہوتی ہیں اور کتنی مُسکراہٹوں میں آنسو جھلملاتے ہیں ؎

یہ تو اک پردہ ہے دردِ غم چھپانے کے لئے
تم کو میری مسکراہٹ پر نہ جانا چاہیئے

زندگی ـــــ آتشِ نمرود بھی اور گلشنِ ابراہیم بھی! ع یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانہ ـــــ دُنیا کی حقیقت پُراسرار کے پردے پڑے ہیں، حکمت کے ناخن آج تک اس گتھی کو سُلجھا نہ سکے! یہ "شہود" بھی ایک طرح کا "غیب" ہی ہے۔ حوادث کا طوفان کسی کے روکے رُک نہیں سکتا، جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہتا ہے۔

اس دُنیائے حوادث اور عالمِ کون و فساد میں کسی کا دامنِ زندگی بھی ثابت نہیں رہ سکتا، یہاں غموں کی خراش سے بچنا ممکن نہیں! تلخی ہر جامِ حیات میں پائی جاتی ہے، بس فرق اتنا ہے کہ کسی پیالہ میں نری تلخی ہی تلخی ہوتی ہے اور کسی میں تلخی کے ساتھ مٹھاس بھی! پھولوں کی سیجوں پر بھی لوگوں کو غم کی کروٹیں بدلتے دیکھا گیا ہے! سونے چاندی کے ڈھیر بھی غم کا مداوا نہیں کر سکتے ـــــ اسی قسم کے خیالات میرے دل و دماغ کو جھولا جھلا رہے تھے یہاں تک کہ میں سو گیا، آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیسی فکر تھی کس قسم کا غم تھا کہ نیند آگئی! مگر نیند تو سُولی پر بھی آجاتی ہے، غموں کی شدّت اور فکروں کے ہجوم میں بھی زندگی کے کام رُکتے کب ہیں! غموں کی گرانی کو جگانا ہی نہیں سُلانا بھی آتا ہے۔

تیسرا پہر ہو چکا تھا، دن ڈھل رہا تھا، سورج کی کرنیں مضمحل مضمحل سی تھیں، جیسے کوئی مسافر چلتے چلتے تھک گیا ہو میری آنکھ کھل گئی، طبیعت اور دنوں کی طرح چاق چوبند نہ تھی، جسم گرا گرا سا اور طبیعت اُداس اُداس سی! پیر میں ٹیس ہو رہی تھی! ـــــ دو دن پہلے گلاس کا شیشہ پیر میں چُبھ گیا تھا، میں سمجھا کہ ذرا سی خراش ہے آپ ہی اچھی ہو جائے گی، ایسی معمولی خراشوں اور خفیف چوٹوں کی دوا دارو کرنا مردانگی کی توہین ہے، ہر خراش اور ہر چبھن کا علاج نہیں کیا جاتا۔ اُس کھرسٹ کو میں نے پہلی بار کھجایا تو لطف آنے لگا، انگلیوں نے پیش دستی کی اور بار بار! وقتی لذت کے لئے آدمی سب کچھ کر بیٹھتا ہے، یہ اس کی بہت بڑی کمزوری ہے، اور نفس اس کی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے ـــــ یہ خراش زخم سا بن گئی، چلنے پھرنے میں تکلیف ہونے لگی۔

مجھے آرام کرنا چاہئے تھا، زخمی پیر کا بنا چلنا ٹھیک نہیں، یہ احتیاط کے خلاف ہے، بد پرہیزی ہے اور عاقبت نااندیشی

بھی! مگر زندگی کی ضرورتوں کے لئے بیمار اور زخمی آدمی کو بھی آنا جانا ہی پڑتا ہے، جینے کے ساتھ بہت سے دُکھڑے اور سینکڑوں غم لگے ہیں، بے آرامی کے بعد ہی آرام ملتا ہے، کسی خوشی کے لئے ہی غم گوارا کرنا پڑتا ہے

میں گھر سے روانہ ہوا، مجھے جمشید روڈ جانا تھا، بس اسٹینڈ مکان سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر تھا، اتنی تھوڑی دور کیلئے رکشا پر جانا "اسراف" تھا! بہت سے لنگڑے اور اپاہج آدمی فٹ پاتھ پہ گھسٹتے ہوئے کیا چلتے نہیں ہیں! میرے پاؤں میں تو ذراسی خراش تھی، آدمی اتنی سی بے آرامی اور خلش بھی گوارا نہ کر سکے تو وہ آدمی نہیں چھوئی موئی ہے اور مرد کو تو یہ بات کچھ زیب نہیں دیتا! اسے زیادہ سے زیادہ جفاکش اور سخت جان ہونا چاہئے۔

میں زینہ کی سیڑھیوں سے اُترا، آہستہ آہستہ، دیوار کا سہارا لیتے ہوئے، ایک دو منزلہ پار کرنے پر ہی طبیعت میں تھوڑی سی جھنجلاہٹ پیدا ہونے لگی۔ ـــــ اس ظالم مکان دار نے پانچ منزلیں کھڑی کردی ہیں اور "لفٹ" کا انتظام نہیں! لگا دی ہوتی تو یہی نہ ہوتی! دس بیس نہیں کچھ کم سو سیڑھیوں کا اُترنا چڑھنا کوئی آسان کام ہے! اونچی بلڈنگوں میں ہر وقت ہجوم بھی تو نہیں رہتا! بادلوں کو چھونے والی بلڈنگ بنائی تھی، تو اُترنے چڑھنے کے لئے جھولے کا بھی انتظام کرنا تھا۔ مکھی چوس کہیں کا! سرمایہ دارانہ ذہنیت! ـــــ اسی جھنجلاہٹ اور ذہنی کشمکش کے ساتھ زینہ پر ہی تھا، پیر کی چوٹ کو بھول گیا! درد دل اور زخم جگر ہوتا تو جانے میری کیا حالت ہو جاتی، یہ تو تلوے کی ذراسی خراش تھی ـــــ مگر اس دورِ تہذیب و عہدِ ترقی میں "درد دل" اور "زخم جگر" نہیں پائے جاتے، یہ تو پُرانے زمانہ کی باتیں ہیں، جب "صاحبِ دل" ہوا کرتے تھے، اب تو دل والے چراغ لے کر بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتے۔

چند قدم چلا ہوں گا کہ ایک صاحب جن سے زندگی میں شاید ایک دو بار صاحب سلامت ہوئی ہوگی راستہ میں ملے، انہوں نے سلام میں اقدام کیا، بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور فرمانے لگے ـــــ "ماہر صاحب! آپ کا رسالہ! اللہ سبحان اللہ! جزاک اللہ! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! ایک ایک مضمون کو کئی کئی بار پڑھا ہے، اور آپ کا "نقشِ اول" تو خدا کی قسم دل پہ نقش ہو گیا، کیا زورِ بیان اور قوتِ استدلال ہے!" غرض تعریف کے پُل توڑ دیئے اُس مردِ قدرشناس نے! اس کی باتوں سے جتنی خوشی ہوئی، اس سے زیادہ میں جھینپ گیا، میں نے انکسار آمیز لہجہ میں جواب دیا! "ارے صاحب! آپ میرا دل بڑھا رہے ہیں، یہ صرف آپ کی عنایت، حسنِ ظن اور قدر افزائی ہے ورنہ میں کیا اور میرا رسالہ کیا!" اس شخص نے کہنا شروع کیا۔

"ماہر صاحب! اس مہینہ کا رسالہ نہیں ملا، میں کیا میرے سب گھر والے بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں!"

"اس مہینہ کا رسالہ تو کبھی کا نکل چکا، آج تو تیرہ تاریخ ہے" میں نے زخمی پیر کی پنڈلی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں یہ اطلاع تو مجھے مل چکی ہے اور ..." اس نے قدرے دبی زبان سے کہا۔

"تو پھر بک اسٹال سے آپ رسالہ خرید سکتے تھے" ـــــ میں بولا

"مجھے تو جناب والا! آپ کے دستِ خاص کی عنایت (اعزازی رسالہ) چاہئے! بک اسٹال سے تو ہر کوئی رسالہ لے سکتا ہے، میں تو آپ کا دوست ہوں اور دوستوں کے ساتھ خصوصیت برتی جاتی ہے ورنہ پھر اپنے پرائے اور آشنا ناآشنا میں فرق کیا ہوا ـــــ اس اپنے قدرشناس دوست اور "فاران" کے شیدائی کے اس جواب پر میرے منہ کی [illegible] گئیں، میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا، لیکن جناب غضب اور خفگی و ناخوشی کے اس طوفان کو پی کر رہ گیا ـــــ یہ مصلحت کا بھی تقاضا تھا، پھر اس دُنیا میں آخر آدمی کس کس سے لڑے! یہاں تو دن رات ایسے ہی آدمیوں سے پالا پڑتا رہتا ہے۔

[illegible]

تھوڑی دُور چل کر ایک دوسرے صاحب کا آمنا سامنا ہوگیا، سائیکل پر تشریف لے جارہے تھے، مجھے دیکھ کر از راہِ نوازش سائیکل سے اُتر پڑے، اُترتے ہی جیب سے سگرٹ کی ڈبیہ نکالی اور سگرٹ پیش کی، — "میں سگرٹ نہیں پیتا" — میں نے کہا۔ اس پر حیرت انگیز لہجہ میں بولے "آپ سگرٹ نہیں پیتے! مجھ سے تو میرے ایک نہایت گاڑھے اور عزیز دوست جو بہت اچھے شاعر ہیں، فرماتے تھے کہ سگرٹ پئے بغیر میں ایک مصرعہ نہیں کہہ سکتا" — میں نے عرض کیا۔ "ان کی یہی عادت ہوگی، مگر میں تو شعر گوئی کے لئے سگرٹ اور پان کا سہارا نہیں ڈھونڈتا —" اب ہم دونوں چلنے لگے، ان کے ہاتھ میں سائیکل تھی اور میں لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

آپ کو میرا دعوت نامہ تو مل گیا ہوگا، (میں نے "اثبات" میں سر ہلا دیا) آپ کا آنا ضروری ہے، آپ کے بغیر مشاعرہ پھیکا رہے گا، آپ نہ آئے تو ساری عمر شکایت رہے گی، دیکھئے بھول نہ جایئے (میرے پیر کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کے پیر میں کچھ تکلیف ہوگئی ہے، چلنے میں تکلّف ہو رہا ہے، (میرے منہ سے "جی ہاں" نکلا) مگر مشاعرہ تو بیس تاریخ کو ہے، ابھی سات دن باقی ہیں، اُس وقت تک آپ کی چوٹ اچھی ہو جائے گی — اور ہاں ماہر صاحب! ارتو میں مکان کا پتہ مفصل لکھ دیا ہے، یہ جو کھارادر میں ایک ہوٹل پر "عربی چائے اور ایرانی فالودہ" لکھا ہے اس سے ذرا دُور پر ایک مندر آتا ہے، اُس مندر سے سیدھے ہاتھ کو ایک گلی جاتی ہے سیٹھ ہوتل اسٹریٹ! بس اُس پر ناک کی سیدھ میں چلے جایئے! آخر میں جاکر پیپل کا ایک درخت آئے گا وہاں پانچ بلڈنگیں ایک ہی وضع کی ہیں، ان میں بیچ کی عمارت پر لکڑی کا زینہ ملے گا، چوتھی منزل پر خاکسار کا مکان ہے! آپ کو مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی، میں نے ایسا ٹھیک پتہ بتا دیا ہے کہ آپ تو پھر صاحبِ نظر شاعر ہیں، اندھا آدمی آسانی سے وہاں پہونچ سکتا ہے — بھائی! کشمیری چائے کا میں نے انتظام کیا ہے اور — (میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے) "ذوقِ نظر" کا بھی سامان ہوگا، شاعروں کے مزاج اور طبیعت کو بندہ جانتا ہے — ہاں! تو جناب! آپ کو آنا پڑے گا۔ ہم آپ کو تکلیف نہ ہونے دیں گے، واپسی میں آپ کے گھر بھجوانے کا انتظام کر دیا جائے گا! اور ماہر صاحب! یہ خصوصیت صرف آپ کے لئے ہے، باقی شعراء صاحبان تو اپنے پاؤں آئیں گے اور اپنے پاؤں جائیں گے۔

اس معقول گفت گو کا جواب "خوشی" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، میرے تیوروں سے ناخوشی برس رہی تھی مگر ہونٹ مُسکرا رہے تھے۔ ایسی مسکراہٹیں بڑی تکلیف دہ اور اذیت کوش ہوتی ہیں — ہائے! زہر کے یہ گھونٹ!

دیکھتا چلا گیا

میں گلی سے نکل کر نکڑ پر آگیا، بندر روڈ پر سواریاں آجا رہی تھیں، فٹ پاتھ پر بھی راہگیروں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی، تھوڑی دُور چل کر کیا دیکھتا ہوں کہ چوراہے کے قریب ہنگلہ کی دیوار کے نیچے بہت سے لوگ جمع ہیں اور ایک پیر خضر صورت دھواں دھار تقریر کر رہا ہے — یہ دوا فروش تھا، بالوں کی لٹوں کو جھٹکا دے کر بولا:-

"بھائیو! پاکستان اُس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتا جب تک پاکستانیوں کی تندرستی ٹھیک نہ ہو جائے، اور جب تک کھجلی کی بیماری دُور نہ ہوگی، پاکستانیوں کی صحت ٹھیک نہیں رہ سکتی، اس لئے کھجلی کا دُور کرنا اور مٹانا پاکستان کی بہت بڑی خدمت ہے، اور مجھے میرے پیر و مرشد قبلہ نے جن کی عمر ایک سو سات سال ہے اور جو عرصہ چھ سال سے چلّہ میں بیٹھے ہیں: مجھے اس خدمت کے لئے مامور فرمایا ہے . . . . . . اور یاد رکھنا! تمہارے اس کراچی شہر میں پانچ دن اور رہوں گا، اس سے زیادہ ایک گھنٹہ بھی یہاں رہنا فقیر پر حرام ہے، پیر و مرشد کی دُعا سے خاک کی چٹکی میں اکسیر کی تاثیر آگئی ہے —"

میں دو فروش کو تقریر کرتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ پیلز سینما کے آگے تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ آج کسی نئے کھیل کا افتتاح تھا۔ موٹروں، رکشاؤں اور گھوڑا گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا ــــ ان میں عورتیں بھی تھیں، سیاہ برقعوں میں ایک بھاری بھرکم خوب فربہ قسم کی عورت نظر آئی جس کے آج کل گھر میں بیٹھنے اور آرام کرنے کے دن تھے۔ اسے دیکھ کر بیچاری کے شوقِ سینما بینی پر ترس آرہا تھا، کہ خدانخواستہ سینما ہال کے زینہ پر اس کا پاؤں رپٹ گیا تو تھوڑی دیر کے لئے سینما ہاؤس "زچہ خانہ" بن جائے گا ــــ اس دنیا میں حساس آدمی کو نہ جانے کس کس پر ترس اور کس کس پر غصہ آتا ہے! اور کون کون بے بسی کے عالم میں دل مسوس مسوس کر رہ جاتا ہے! میں کہتا ہوں دنیا میں آدمی کو بھیجنا تھا تو پتھر کی طرح بے حس اور جانوروں کی طرح بے تعلق اور بے شعور بنا کر بھیجنا تھا۔ دل کے ہاتھوں زندگی سچ مچ "کارگہ شیشہ گراں" بن کر رہ گئی ہے ــــ آہ، دل کی نزاکتیں! کاش! سینے دلوں سے خالی ہوتے!

سینما ہاؤس کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب پولیس کا سپاہی ایک خوانچے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔ سپاہی کا لہجہ کافی تلخ تھا، ترشروئی اور درشتی اس کے تند تیوروں سے نمایاں تھی ــــ مگر خوانچے والے نے نہ جانے کیا چیز چپکے سے سپاہی کی مٹھی میں پکڑا دی کہ سپاہی وہاں سے چلتا ہی بنا ــــ ؎

حسابِ دوستاں در دل

اور ــــ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

خوانچہ فروش اور سپاہی، دونوں کو پیٹ پوجا کے لئے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ اس دنیا نے اسباب و اغراض میں ہر بات قانون قاعدے کو دیکھ کر نہیں کی جاتی اور حکومت ــــ تو وہ کہاں کہاں تجسس کرے اور کس کس بات کی دیکھ بھال کرے۔

اور میں یہ سب کچھ دیکھتا چلا گیا ــــ لوگ "زندہ فلموں" کو چھوڑ کر نہ جانے کاغذی تصویریں کیوں دیکھتے ہیں! دنیا کو اصلیت سے زیادہ نقل اور بناوٹ ہی میں نہ جانے کیوں لطف آتا ہے۔ یہ دنیا اسٹوڈیو تو ہے جہاں دن رات "ایکٹنگ" ہوتی رہتی ہے، یہاں سنجیدہ اور مسخرے ہر طرح کے اداکار پائے جاتے ہیں کوئی عبرت لینا اور سبق حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی سب کچھ موجود ہے، اور کسی کو صرف چٹخاروں کی خواہش ہو تو اس کی مدارات اور تواضع کے لئے بھی دنیا کے اسٹیج پر کسی چیز کی کمی نہیں ہے، ــــ ہائے! یہ بناوٹ کے پجاری اور نقالی کے شیدائی!

بس اسٹینڈ اب زیادہ دور نہیں تھا، بہت سے بہت بیس پچیس قدم کا فاصلہ ہوگا۔ میرے پیر میں تکلیف نہ ہوتی تو ڈیڑھ دو منٹ کی بات تھی، مگر ذرا سی خراش نے مجھے پابستہ سا بنا دیا ــــ آگے چل کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ایک جاننے والے نیلی بش شرٹ اور سفید پتلون پہنے تشریف لا رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت سیاہ برقعہ میں ہے اور برقعہ کی نقاب پٹی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی گورا چٹا چہرہ بے نقاب ہو تو لچھروں کی اور بدنگاہ نگاہیں پڑتی ہیں اور بہت سے تو اس بری طرح گھورتے ہیں کہ یہ عورت پر سچ مچ مٹتے ہیں اور بس کچھ جا کر زہر کھا لیں گے، یا سمجھ لیں ڈوب مریں گے کیونکہ محبت اندھی اور بہری ہوتی ہے اور عاقبت نااندیش بھی! ــــ بے نقاب عورت کبھی آنکھیں بند کر کے نہیں چلتی وہ بھی بہر حال آنے جانے والوں کو دیکھتی ہے یا اس کی نگاہ پڑ جاتی ہے۔ تو یہ ہمارے دوست کی بیوی بھی آزادی کے ساتھ چاروں طرف نگاہیں ڈالتی چلی آرہی تھی، دوست نے مجھے دیکھ کر کترانا چاہا، مگر فاصلہ اتنا کم تھا کہ کتراتے کتراتے بھی اور آنکھیں چراتے چراتے نگاہیں چار ہو گئیں۔ فوجی ٹرک اگر وہاں سے نہ گزرتا ہوتا تو شاید وہ راستہ کاٹ کر دوسری طرف بھی جا ــــ اس نے قدرے ہٹ کر

...ور گھبرا کر سلام کیا، ہاتھ ملایا اور عورت نے جھٹ سے نقاب چہرے پر ڈال لی۔ اس پوری سڑک پر گویا کہ میں ہی ایک "نامحرم" تھا —— ! اس آدمی سے میری پہچان نہ ہوتی تو غزل اور نظم نہ سہی ایک آدھ مزیدار شعر کا مسالہ تو مل ہی جاتا۔

پھر بس اسٹینڈ آگیا، یہاں مسافروں کی کافی بھیڑ تھی۔ ایک بس آئی مسافروں سے بھری ہوئی! دُور سے آتا دیکھ کر ہی لوگ لپکے، مگر وہ نہ رُکی۔ اور لوگ سچ مچ ناکام عاشقوں کی طرح کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ دوسری بس صاحبہ تشریف لائیں تو وہ بس اسٹینڈ سے کچھ دُور پہ جا کر رُکیں، یہاں سے دو تین مسافر بے تحاشا بھاگے مگر اُن کے پہونچتے پہونچتے بس یہ جا وہ جا! ان میں سے دو مسافر تو سرم کے مارے لوٹ کر نہیں آئے اور ایک مسافر واپس آگیا، مگر ملاحیاں سُناتا اور اول فول بکتا ہوا۔

" کیا اندھیر ہے! یہ بس والے من مانی باتیں کرتے ہیں، انسپکٹر، کنڈکٹر، ڈرائیور —— یہ سالے سب کے سب ملے ہوئے ہیں، بس کے ملازم اپنے کو ملکی لاٹ سمجھتے ہیں، دو کوڑی کے آدمیوں کے یہ دماغ ہو گئے ہیں!"

تیسری بس مسافروں کے پاس ہی آکر رُکی اور اُس کے رُکنے سے پہلے دو تین ڈنڈا پکڑ کر لٹک گئے اور دو مسافر دروازہ گھیر کر کھڑے ہو گئے، بڑی مشکل سے اندر کے مسافر باہر آئے میں نے بھی بس میں بیٹھنے کی کوشش کی، لیکن پیر کی چوٹ نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا، چوٹ نہ ہوتی تو بس پر چڑھنے والوں میں سب سے پہلا مسافر شاید میں ہوتا، اس دُنیا میں معذوری اور کمزوری ایک جُرم ہے، جسے سوسائٹی معاف نہیں کرتی۔ طاقت، زور، اقدام، بھاگ دوڑ اور چھینا جھپٹی کی ہر جگہ جیت ہوتی ہے، کوتاہ دست سدا محروم رہتے ہیں، جو بڑھ کر اُٹھانے کی ہمت کرے، جام و مینا اُسی کے حصہ میں آتے ہیں —— میں اور ایک بوڑھا ہم دو آدمی بس میں چڑھنے سے رہ گئے۔

رکشا والے کے ساتھ

ایک گھنٹے کے قریب بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑا، زخمی پیر کی نسوں میں درد ہونے لگا۔ پہلے میٹھا میٹھا درد پھر تکلیف دہ! جی میں آیا کہ گھر لوٹ چلوں پھر سوچا کہ جس کام کو جا رہے ہو اس کے لئے کل پھر آنا پڑے گا، آج کا کام کل پر اُٹھا رکھنا ٹھیک نہیں —— میں نے ایک خالی رکشا دیکھ کر آواز دی، رکشا والا رُک گیا۔

" افغان قونصل کے قریب ایک بنگلہ میں جانا ہے، کیا لوگے!" —— میں نے کہا۔

" جی —— وہاں کا —— (اور اتنے میں رکشا والے کی نگاہ میرے پاؤں کی پٹی پر پڑی، اور اس نے کہتے کہتے زبان پھیر لی) سوا روپیہ ہوگا ——" رکشا والے نے جواب دیا۔

" ارے بھائی میل سوا میل ہوگی وہ جگہ بہت سے بہت! اور تم وہاں کا مانگتے ہو سوا روپیہ! میں تو جمشید روڈ کے آخری حصہ میں آٹھ آٹھ آنہ کی رکشا کر کے اکثر گیا ہوں ——" میں بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر بولا۔

" بابوجی! یہ میری فسٹ کلاس نیو ڈیٹ رکشا ہے! اور لوگ تو چھکڑا لئے پھرتے ہیں، منٹوں میں پہونچاؤں گا آپ کو وہاں! بڑے آرام کے ساتھ لے چلوں گا، چیز چیز میں فرق ہوتا ہے، گا ہے، گھوڑے ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکے جاتے ——"

رکشا والے کے جواب پر میں خاموش ہو گیا، یہ انکار کی خاموشی تھی، وہ چلا گیا اور اُس نے کئی بار مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھا، مگر میری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا —— میرا پاؤں اچھا ہوتا تو میں پیدل چلا جاتا، مجبوریوں کے ہاتھوں ہر کوئی بے بس ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ایک خالی رکشا دکھائی دی، میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا، رکشا والا آن کی آن میں

آگیا! — "کہاں جائیے گا" اُس نے دریافت کیا۔ " افغانی قونصل کے پاس ایک بنگلہ میں جانا ہے، کیا لوگے وہاں تک کاکرایہ؟ —— میں نے جواب دیا۔ " جو جی چاہے دے دیجئے گا " رکشا والا بولا —— " نہیں! بھئی! یہ جھگڑے کی بات ہے، معاملہ صاف ہوجانا چاہئے وہاں پہونچ کر میں نے کچھ دیا تم نے کچھ مانگا، بلاوجہ کی حُجت مجھے اچھی نہیں لگتی، میرے کہنے پر رکشا والا رکشا سے اُتر پڑا اور کہنے لگا۔

" آٹھ آنہ دیدیجئے! پر یہ کہہ دوں کہ میری رکشا کا ایک پہیہ خراب ہے، میں تیز نہیں چلا سکوں گا رکھنا؛ چال مندی رہے گی، میں پہلے سے بات صاف کئے دیتا ہوں آپ پھر کہیں کہ رکشا والے نے دھوکہ کیا! "

میں رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس کی صاف گوئی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر بھولا پن اور نیکی برس رہی تھی، سانولا رنگ، معمولی ناک نقشہ، چہرے پر کہیں کہیں چیچک کے نشان بھی تھے، چھوٹی چھوٹی گول ڈاڑھی، دوپلی ٹوپی، دھاری [illegible] قمیص اور اونچا پائجامہ، ننگے پاؤں، اس سے نہ جانے کیوں باتیں کرنے کو میرا جی چاہنے لگا۔

نشاط سینما کے سامنے سے چند بے پردہ لڑکیاں گزریں، بکھرے ہوئے بال، گلے میں دوپٹے پڑے ہوئے، سینہ تانے، پنجوں کے بل اُچکتی اور پھدکتی ہوئیں، بے باک نگاہیں، شوخ ادائیں! اس کمسنی میں اُن کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے تجربے غلطاں تھے، اُن کی محشر خرامی دھرتی کو دہلائے دیتی تھی، اس انداز سے اُچک رہی تھیں، کہ اب کی بار پنجوں اور چکیلی پنڈلیوں نے سہارا دیا تو یہ آسمان کو چھو لیں گی سہ اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن! —— لڑکیاں نہیں ہرنیاں اور ہرنیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہرن رہتا ہے یہاں تو ان میں سے ہر کوئی اپنے قافلہ کی خود ہی امیر اور اپنی کشتی کی آپ ہی ناخدا تھی! حسن اور جوانی اس آزادی کے بعد بیحد و بے کراں ہو جاتے ہیں —— اگر یہ شادی شدہ تھیں تو ان کے شوہر اور بن بیاہی تھیں تو ان کے ماں باپ بڑے دل گردے کے لوگ تھے، ہاتھ ہاتھ بھر کا کلیجہ ہو گا ان کا! لڑکیوں اور بیویوں اور بہنوں کو اس طرح طوفان میں بھیج دینا ہر کسی کا کام نہیں، اس کے لئے چیتے کا کلیجہ اور فولاد کا دل چاہئے، یہاں غیرت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا پڑتا ہے، اور ننگ و ناموس کے ہمالیہ بھی راستے میں آتے ہیں تو ٹھوکروں سے ان کو پارہ پارہ کر دیا جاتا ہے۔

رکشا والے نے میری طرف مڑ کر دیکھا! مستفسرانہ نگاہوں سے! جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہتے ہوئے جھجکتا ہے یا پھر اس کی یہ تمنا ہے کہ میں اپنے خیال کا اظہار کروں —— اس پر جو ابھی ابھی دیکھا تھا —— ہنگامہ جوانی، محشر خرام قیامتِ جمال —— ! سہ

اسی راستے سے گیا ہے بتِ خود کام ابھی
میں نے دیکھی تھی یہیں گردشِ ایام ابھی

اور یہ " گردشِ ایام " شرم و حیا کو کچلتی ہوئی گزری تھی!

" دیکھا! میاں رکشا والے! یہ ہو رہا ہے دنیا میں! تمہارے گھر کے لوگ پردہ کرتے ہوں گے —" میں نے پوچھا۔

ہجور! ہم گریب ہیں پر عزت آبرو رکھتے ہیں، ہماری گھر کی کوئی عورت ایسی باتیں کرے تو اُسے جیتا دھرتی میں گاڑ دیں، وہ مرد ہی کیا ہوا جس نے اپنی بہن بیٹی، اور بیوی پر قابو نہ رکھا، جانوروں اور ڈھوروں کی طرح عورتوں کو کھلے بندوں چھوڑ دینا بڑی بے غیرتی ہے! اور ہجور! میں مجور (مزدور) ہوں، پر خاک چاٹ کر کہتا ہوں کہ یہ جو موٹروں اور بگھیوں میں بڑے بڑے آدمی اپنی بہو بیٹیوں کو بے پردہ لئے پھرتے ہیں ان کی میری نگاہ میں کوئی عزت نہیں ہے —— اور —— کچھ ——

رکشا والا کہتے کہتے رک گیا، میں نے کہا، تم نے بات اُدھوری کیوں چھوڑ دی، جو کچھ کہنا ہے بے جھجک کہو، میں ہجور دجوڑ

نہیں ہوں تمہاری طرح ایک مزدور ہوں، میرے لباس پر نہ جاؤ بہت سے مزدور خوش پوشش بھی ہوتے ہیں ——
رکھشا والے نے بولنا شروع کیا:-

ان آنکھوں نے کیا کیا تماشے اور کیسے کیسے رنگ دیکھے ہیں، یہ نہ پوچھئے! یہ ایک لمبی کہانی ہے! پر میں جب کہنے پر آیا ہوں تو ایک آدھ آپ بیتی تو سنا کر ہی رہوں گا، آپ جیسے مسافر روز روز نہیں ملتے —— آج سے کوئی ڈیڑھ مہینہ اُدھر کی بات ہے، میں وکٹوریہ روڈ سے خالی رکھشا لئے ہوئے گزر رہا تھا، دن کے دو ڈیڑھ بجے تھے اُس وقت! ایک نوجوان لڑکی نے جس کے ہاتھ میں کتابیں لگی تھیں، ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور رکھشا میں بیٹھ گئی —— "کہاں چلئے گا؟" میں نے اس سے پوچھا، "اسی سڑک پر —— مگر ذرا تیز چلو —" لڑکی کہنے پر میں چل دیا، فریئر ہال کے پاس پہونچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک لڑکا کوٹ پتلون پہنے چوراہے کے پاس کھڑا ہوا کسی کی راہ دیکھ رہا ہے ۔۔۔ "رکھشا روک دو" لڑکی نے کہا، میں نے رکھشا روک دی، اور وہ لڑکا اس میں سوار ہو گیا، میں سمجھا یہ دونوں بھائی بہن ہوں گے، یا کوئی اور رشتہ ہوگا —— پر ہجور! وہ تو نہ جانے کیا نکلے! ان کی حرکتوں کا ذکر کرتے ہوئے میرے تو شرم کے مارے پسینے چھوٹتے ہیں کوئی بیسوا اور اس کا ملنے والا بھی ایسی بیچ باتیں نہ کرتا ہوگا، کوئی میل ڈیڑھ میل تک تو میں برداشت کرتا رہا —— پھر میں نے سوچا اور میں نے ٹھیک سوچا میں کس جوگا ہوں اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ عبداللہ! تو بھی ان دونوں کے گناہ میں ساجھی ہے، تو پاپ کو سڑکوں پر لئے لئے ڈول رہا ہے، ایسی مجبوری (مزدوری) سے تو بھیک مانگنا اور فاقے کر کے مرجانا اچھا!

میں نے رکھشا روک لی اور اتر پڑا، وہ دونوں مجھے غصہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے، رکھشا رک گئی، نوجوان نے مجھے ڈانٹا کہ یہ کیا کیا؟ ایکا ایکی رکھشا کس لئے روک دی! میں نے کہا کہ یہاں تک کا جتنا کرایہ آپ کے مجاج (مزاج) میں آتے مجھے دیدیں، میں آپ کو لے کر اور آگے نہیں جاؤں گا۔

پاگل ہو گئے ہو تم! ہمیں ادھ بیچ میں چھوڑ کر بھاگے جاتے ہو، عجیب آدمی سے پالا پڑا ہے، ارے بھائی! جتنا کرایہ تم مانگو گے دے دیا جائے گا —— نوجوان نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

مجھ گریب کو ماف (معاف) کیجئے بابوجی! آپ مجھے سونے میں تول دیں گے تو بھی میں آپ کو نہیں لے جاؤں گا، اور آپ کی مرجی (مرضی) نہ ہو تو یہاں تک کا کرایہ بھی نہ دیجئے —— میں نے جواب دیا۔

بات بڑھنے لگی، کئی راہ گیر جمع ہو گئے، ایک موٹر بھی وہاں آ کر رک گئی، وہ لوگ اصرار کر رہے تھے کہ تمہیں چلنا ہوگا، میں کہہ رہا تھا، میں نہیں جاؤں گا، دوسرے آدمیوں نے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ تمہاری رکھشا میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے، تم بیمار ہو، تمہیں کوئی تکلیف ہے، کوئی وجہ تو بتاؤ! میں نے کہا کہ میں اس طرح کی سواریوں کو رکھشا میں بٹھانا گناہ سمجھتا ہوں ——
اس پر نوجوان سر کھجانے لگا، لڑکی نے اپنی عینک کی کمانی کو سہلایا اور ایک اٹھنی زمین پر پھینک کر دونوں چلتے بنے "

رکھشا کی رفتار بہت دھیمی تھی، کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو رکھشا والے کی اس سست رفتاری پر جھنجلا جاتا مگر میں چاہتا تھا کہ اس کی چال اس سے بھی زیادہ دھیمی ہو جائے، رکھشا والے کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں، آدھا راستہ طے ہو چکا تھا، سڑک کے کنارے چائے والے کی دکان تھی —— ریاست آگرہ کے کسی غریب اور پریشان روزگار مہاجر نے آڑی ترچھی لکڑیاں کھڑی کر کے اور ان پر ٹاٹ ڈال کر اپنی روزی کا سہارا پیدا کر لیا تھا، دوکان بہت سے بہت ڈھائی تین گز لمبی اور اس سے آدھی چوڑی ہوگی، اور اس میں دکاندار نے چائے کی پیالیاں، بسکٹ، دال، سیو، چنے، مرمرے، لالٹین کی چمنیاں، کپڑے

دھونے کا صابن اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں رکھی تھوڑی تھیں ـــــ اور بچوں کے کھلونے بھی! ایک طرف تختے پر میلی سی دری بچھی گدّا اور تکیے بھی پیٹے رکھے تھے، یہ دوکان کی دوکان اور قیام گاہ کی قیام گاہ تھی۔

میں نے رکشا والے سے کہا کہ بھیا! یہاں چائے پی کر آگے چلیں گے اور جتنی دیر یہاں بیٹھیں گے اس کا ہرجانہ بھی تم کو دیا جائے گا، رکشا رک گئی، ہم دونوں لکڑی کی بنچ پر جس کے تختے ہلتے تھے بیٹھ گئے چائے خانہ والا ایک دوسرے گاہک کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا...... "بڑی مشکل میں جان ہے ہماری! میونسپلٹی سے پروانے پر پروانے آئے چلے جا رہے ہیں کہ دوکان اٹھا دو نہیں تو ہم پولس کی مدد سے زبردستی کیبن تڑوا دیں گے، یہی دوکان میری روزی کا ٹھیکرا ہے یہ بھی ٹوٹی تو میں دربدر بھیک مانگتا پھروں گا، اور مجھ سے تو بھیک مانگی بھی نہیں آتی ـــــ کاش! اوروں کے دوسرے مسلمانوں کی طرح کسی جاٹ کے بلّم نے مجھے بھی ٹھکانے لگا دیا ہوتا ـــــ اور صاحب! میونسپلٹی والوں کو یہ سامنے کے بنگلے اور کوٹھیوں والے بہکاتے ہیں کہ اس دوکان نے ہماری بلڈنگوں کی خوبصورتی کو بگاڑ دیا ـــــ اللہ مالک ہے، تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا، پولس والے کیبن توڑنے کے لئے خدانخواستہ آئے تو ان سے کہوں گا کہ اس دوکان کے ساتھ میری زندگی کے گھروندے کو بھی توڑتے جاؤ!

میں اور رکشا والا دونوں چائے پینے لگے، چائے خاصی مزیدار تھی، میٹھا البتہ ذرا کم تھا مگر رنگت کی شوخی اور لذت اس کمی کو پورا کر رہی تھی۔

یہ رکشا تمہاری اپنی ہے کیا؟ ـــــ میں نے دریافت کیا۔

نہیں بابوجی! یہ میری رکشا نہیں ہے، دلّی کے ایک پنجابی سوداگر نے بیس تیس رکشتیں بنا رکھی ہیں، یہ انہی کی رکشا ہے ـــــ رکشا والے نے جواب دیا۔

میں نے ایک سانس میں رکشا والے سے کئی سوالات کر ڈالے، مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، میرا دل نہ جانے کیوں اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا ـــــ میرے سوالوں کے جواب میں اپنے انگوچھے سے ہونٹ پوچھتے ہوئے بولا:۔

تین روپیہ روز دینا پڑتا ہے رکشا کے مالک کو! ٹوٹ پھوٹ اس کی! ہم گھر میں پانچ آدمی ہیں، ڈھائی تین روپیہ کا کھرچ (خرچ) ہے! اتنا اللہ دے ہی دیتا ہے، کسی کسی دن آمدنی کم ہوتی ہے تو کھرچ میں تھوڑی بہت کمی کر دیتے ہیں، تنگی ترشی سے وقت گزر ہی جاتا ہے، اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا، پیسہ کی کمتائی (کمی) ہوتی ہے، وہ بہت سی ضرورتوں کے لئے دل مارنا پڑتا ہے تو سوچتا ہوں کہ ہمارے پیغمبروں پر کیسی کیسی مصیبتیں (مصیبتیں) آ کر پڑی ہیں پر وہ خدا کے نیک بندے سدا شکر ہی کیجئے رہے، اس خیال سے بڑی ڈھارس ہوتی ہے! میں کہتا ہوں چاہے فاقے ہوں، پر ایمان ثابوت (ثابت) رہے! (مہینہ میں ایک آدھ بار سینما بھی تو دیکھتے ہوگے ـــــ میں نے چائے کی طشتری اٹھاتے ہوئے کہا) اس پر وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا ـــــ اور ـــــ!

"بابوجی! اس تباہی سے پہلے میں سینما دیکھتا تھا، سوانگوں میں جاتا تھا، دیوالی پر جوا تک کھیلا ہے میں نے! پر جب سے ہم مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، بری باتوں سے توبہ کر لی ہے! اللہ تعالیٰ کسی پر جاستی (زیادتی) نہیں کرتا بابوجی! آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں! ہمارے برے اعمالوں[1] کے سبب ہی تو یہ تباہی آئی اور ایسے برے دن دیکھنے نصیب ہوئے (اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں) اتنا کچھ دکھ اٹھانے پر بھی ہم نے اپنے کو نہ بدلا اور پہلے کی طرح ہی رہے تو ہمارا کہاں ٹھکانا رہے گا ٹھوکر کھا کر آدمی کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (موٹر لاری اور موٹر کار کے ہارن کی آوازیں آتی ہیں اور رکشا والا تھوڑی دیر کیلئے رک جاتا ہے)

[1] رکشا والے کی زبان

پاکستان بنا ہی اس لئے ہے کہ یہاں اسلام کا بول بالا ہو اور بھلائیوں کا چلن عام ہو! باوجی میرا تو ایمان ہے کہ پاکستان کو مضبوط بنانے والی چیز صرف اسلام ہے اور جو کوئی بُرے کام کرتا ہے اور اسلام کے بتائے ہوئے رستے پر نہیں چلتا، وہ اپنی حرکتوں سے پاکستان کو کمزور بناتا ہے، پاکستان کے ساتھ یہ بہت بڑی دسمنائی (دشمنی) ہے۔

تم بڑے اچھے آدمی ہو عبداللہ! تمہارے مُنہ سے سچائی کی خوشبو آتی ہے! تمہاری سمجھ نیک آدمیوں کی سی سمجھ ہے! میں کتنی مبارک گھڑی میں گھر سے نکلا تھا کہ تم جیسے نیک آدمی سے ملاقات ہوگئی ——— میں نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا — اتنے میں ہمارے پاس سے کچھ عورتیں گزریں! نہایت ہی شوخ اور بھڑکیلا لباس، کچھ بے نقاب کچھ نیم نقاب! کریم پاؤڈر اور سینٹ میں معطر! آرائش و زینت کی یہ پتلیاں قائدِ اعظم کے مزار کی طرف جارہی تھیں، دو سائیکل والے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، ہاتھ سائیکلوں پر مگر نگاہیں حسین چہروں کے نظارے میں ڈوبی ہوئیں ——— اگلے نیک لوگ قبروں پر اس لئے جاتے تھے کہ وہاں جاکر عبرت ہوتی ہے، موت یاد آتی ہے اور اللہ کا خوف دِل میں پیدا ہوتا ہے ———

اور آج کل ——— نہ پوچھئے ع

نہ سُنا جائے گا تم سے یہ فسانا ھرگز

اور یہ بھی ——— ع　　تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

جہاں سے چلا تھا

میں رکشا میں سوار ہوگیا، عبداللہ نے رکشا چلانی شروع کی، تھوڑی دور جاکر زنجیر اُتر گئی، رکشا رُک گئی، دو تین منٹ میں جاکر زنجیر چڑھی! جب اس نے پیڈل پر پیر مارا تو قریب سے ایک موٹر اس قدر تیزی کے ساتھ گزری کہ آس پاس کی زمین دہل گئی، کوئی اس کی لپیٹ میں آجاتا تو زندہ بچ ہی نہ سکتا تھا، موت کا فرشتہ اس موٹر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ جہاں کسی سے ٹکر ہوا اور میں فوراً ہی اس کی جان قبض کرلوں میرے طنز آمیز جملوں پر رکشا والا بولا:۔

مولنا صاحب! (پہلے ہجور، پھر باوجی، اور اب وہ مجھے مولانا صاحب کہنے لگا) ایسی آندھیوں سے تو ہم رکشا والوں کا ہر روز واسطہ پڑتا ہے، ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں یہ موٹر والے! ہم غریب رکشا والوں سے آنے جانے میں ذرا سی بھی اونچ نیچ اور بے احتیاطی ہوجائے تو پولس والے بُری طرح پیش آتے ہیں، گالیاں، دھکے اور کبھی کبھی چالان بھی ہوجاتا ہے، پر ان بڑے آدمیوں کو جو اندھا دُھند موٹریں دوڑائے پھرتے ہیں، کوئی کچھ نہیں کہتا! کوئی آٹھ دس دن کی بات ہے ہمارے گورنر جرنیل (جنرل) صاحب کی سواری کہیں جارہی تھی، راستے بند تھے، کھڑے کھڑے بہت دیر ہوگئی، میں نے سڑک کو پار کرنا چاہا تو سپاہی نے اس زور سے دھکا دیا کہ میں گرتے گرتے رہ گیا، بھلمنساہت تو لوگوں میں رہی ہی نہیں۔

منزلِ مقصود میرے سامنے تھی، میرے اشارہ کرنے پر رکشا والے نے رکشا روک لی۔ اور وہ اتر پڑا، اس کی جدائی مجھ پر شاق گزر رہی تھی، مگر جدائی بہر حال لازمی تھی، ہم دونوں آخر ساتھ ساتھ کب تک رہتے — میں نے ایک روپیہ کا نوٹ جیب سے نکال کر اُسے دیا وہ انٹی سے پیسے نکالنے لگا میں چل دیا — "صاحب! اپنے باقی پیسے تو لیتے جایئے!" اس نے کہا — "تم بہت دیر سے میرے ساتھ ہو، یہ پورا ایک روپیہ تمہارے کرایہ کا ہے —" میں کہتا ہوا بڑھا چلا گیا۔

ایک دوست سے مل کر اُلٹے پاؤں واپس ہوا، شام ہوچلی تھی، دھندلکا پھیلتا جارہا تھا، کراچی میں مسجدوں کی کثرت ہوتی تو مغرب کی اذان کی آوازیں بھی سُنائی دیتیں، چوراہے کے قریب کھلی جگہ پر جماعت کے ساتھ نماز ہورہی تھی، سیمنٹ

کے فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں، فرش کے کنارے پر صراحیاں، گھڑے اور مٹی کے لوٹے دھرے تھے، کچھ آدمی وضو کر رہے تھے، میں نے ذرا تیزی کے ساتھ سڑک کو پار کیا، ایک رکعت جا چکی تھی ـــــ تیسری صف میں مجھے جگہ ملی، میرے قریب ہی وہی رکشا والا نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا تھا :-

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ؎

اور "ایاز" تو میں تھا، محمود تو وہی رکشا والا تھا، جس کے فقر سے بُوئے اسد اللّٰہی آ رہی تھی، اور جس کی غریبی شاہی کو دبا رہی تھی، ـــــ وہ جو اقبال نے کہا ہے :- ؎

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

تو رکشا والا یقیناً فقر کے اسی مقام پر فائز تھا، جہاں شاہی بہت نیچے رہ جاتی ہے۔

نماز پڑھ کر میں تھوڑی دور پہنچا ہوں گا کہ ایک فیئٹ کار میرے قریب آ کر رُکی، میں نے مُڑ کر دیکھا ـــــ "آیئے، آیئے ماہر صاحب! کہاں کا ارادہ ہے حضور کا! یہ گاڑی حاضر ہے ..." ایک آواز آئی، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک میرے جانے والے صاحب اپنے پورے تن و توش کے ساتھ موٹر میں براجمان ہیں، اب سے پندرہ بیس دن پہلے میں خود ان کے دفتر میں گیا تھا اور عرض کیا تھا کہ سنا ہے آپ، پی کمپنی کے اشتہارات دے رہے ہیں، میرے پرچے کو آپ پسند فرمائیں تو ایک آدھ صفحہ مجھے بھی مل جائے، انہوں نے فرمایا تھا، کہ بھائی! رسالوں میں اشتہار دینا کچھ منفعت بخش ثابت نہیں ہوتا، ہم تو روزناموں میں اشتہار چھپواتے ہیں، بُرا نہ مانئے گا ماہر صاحب! یہ تجارت ہے ... تجارت ـــــ بزنس (business is business)

آج اُن کو ملتفت دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ آج گنگا کیوں بہہ رہی ہے، خیال آیا کہ شاید اُنہیں اُس دن کے رُوکھے پن کا اُن کو احساس ہوا ہو اور اُسی کی تلافی منظور ہو! ان کے اصرار پر میں موٹر میں بیٹھ گیا، پہلے میری تعریف فرمائی، ماہر صاحب پرسوں ایک دعوت میں قوالی تھی آپ کی غزل سُنی تھی :- ؎

ہر ذرہ دل بن جاتا ہے ہر چیز نظر ہو جاتی ہے

بس سُبحان اللہ! ساری محفل جھوم اٹھی اور میں تو لوگوں کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو ناچنے لگتا ـــــ ہاں تو بھائی! اب کے اتوار کو تمہارے بچے لطیف میاں کی ختنوں کا دن مقرر کر دیا ہے، شام کو ایٹ ہوم ہے اور شب میں خاص خاص دوستوں کا کھانا ہے، آپ کو آنا پڑے گا ـــــ ایک آدھ سہرا یا کوئی موقعہ کی نظم ہو جائے ـــــ میں جانتا ہوں، کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں، مگر آپ دل پر رکھ لیں گے تو چند منٹوں کی بات ہے ـــــ دیکھیے! بھول نہ جایئے! دعوتی کارڈ ختم ہو گئے ہیں، مگر اپنے خاص دوستوں میں تکلف کی کیا ضرورت ہے: میں خود دعوت دے رہا ہوں ـــــ سواری اس دن میں آپ کے یہاں بھیج دوں گا، اور بھائی! پرسوں تک آپ کرم فرما دیں تو نظم چھپوا لی جائے گی ... وزیر صاحب بھی ہمارے یہاں آ رہے ہیں آپ کا اس طرح تعارف بھی ہو جائے گا ..."

میرے کان میں اب تک اس مُنگسر دوست کے وہ لفظ گونج رہے تھے کہ "یہ تجارت ہے ... " جی میں آیا کہ اس کی موٹر سے کُود پڑوں مگر ارادہ کرتے کرتے پارا سینما آ گیا، اپنے مکان کے قریب موٹر سے اتر گیا، سامنے ہوٹل تھا، ایک طرف کباب والا سیخوں کو پنکھا جھل کر خستگی پیدا کر رہا تھا، اوپر کے کسی فلیٹ سے آواز آئی :-

"دوکوپ چائے ——— ہوٹل والے"
اور میں اُس زینہ پر چڑھتا چلا گیا، جس نے کراچی میں دِلّی کے قطب مینار کی یاد کو "زندہ کر رکھا ہے ———!

رُوحِ انتخاب

> "جہاد" کیا ہے؟ مولنٰا ابوالاعلیٰ مودُودی اس سوال کا جواب دیتے ہیں - اب آپ متمدن دُنیا کے سامنے "جہاد" کا نام لیتے ہوئے نہ شرمائیے!
>
> فاضل مضمون نگار نے بہت سی غلط فہمیوں کے پردے چاک کر دئیے ـــــ اللہ کی دی ہوئی بصیرت اور آگہی شمعِ صداقت لے کر میدان میں آ گئی ـــــ
>
> "م"

عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy War) "مقدس جنگ" کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوشِ جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے، اس کو سُنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے، ڈاڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آ رہا ہے، جہاں کسی کافر کو پاتا ہے، پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الٰہ الا اللہ ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلمکاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ (un holy war) میں مشغول ہیں۔ ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ دولت و اقتدار کے بھوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح ساری دُنیا پر پل پڑے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں، خام پیداوار کے ذخیرے، نوآبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنی حرص کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کیلئے ایندھن فراہم کریں، ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے، نفس امارہ کی راہ میں ہے، ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اس کی زمین میں کانیں ہیں، اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں، یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جا سکتا ہے، یا اپنی زائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جا سکتا ہے یا کچھ اور نہیں تو اس قوم کا

یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستے میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کر چکے ہیں، یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں ہم نے تو جو کچھ کیا وہ زمانہ ماضی کا قصہ ہے اور اُن کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دُنیا کی آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں، ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ، غرض کرۂ زمین کا کونسا حصہ ایسا بچارہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہوچکا؟ مگر ان کی مہارت قابلِ داد ہے، انہوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی کہ خود کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی، اور ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے، جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی، تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا، اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں، ہم تو جیکسنوں اور پادریوں کی طرح پُرامن مبلغ لوگ ہیں۔ چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا، بس یہ ہمارا کام ہے۔ ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا، سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں، حضور کی طمانیت کے لئے "تلوار والے جہاد کو" سرکاری طور پر" منسوخ کر دیا گیا ہے، اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے، توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان و قلم چلانا ہمارا کام!

جہاد کے متعلق غلط فہمی کے اسباب

خیر یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے۔ مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جن کی وجہ سے "جہاد فی سبیل اللہ" کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں اور خود مسلمانوں کے لئے دشوار ہو گیا ہے، تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے :-

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو اُن معنوں میں ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے، جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُن معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلہ کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشہ کو بدل ڈالا ہے، اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

"مذہب" کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہی ہونا چاہیے، آپ کو اختیار ہے کہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں، اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو اس کو جس طرح چاہیں پکاریں، زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کے لئے موجود ہے تو آپ دُنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھریئے اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجئے، اس کے لئے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کون سا موقع ہے، کیا آپ لوگوں کو مار مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک "مذہب" قرار دے لیں اور یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لئے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح "قوم" کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہ اشخاص Homogeneous group of men کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہو۔ اس معنی میں جو گروہ ایک

قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے، یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کے لئے کوئی اس پر حملہ کرے، یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لئے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لئے کچھ نہ کچھ اخلاقی جواز موجود بھی ہے اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے، لیکن دوسری صورت کو تو بعض ڈکٹیٹروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی اس کو جائز کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

جہاد کی حقیقت

پس اگر اسلام ایک "مذہب" اور مسلمان ایک "قوم" ہے تو جہاد کی ساری معنویت جس کی بنا پر اسے افضل العبادات کہا گیا ہے، سرے سے ختم ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی "مذہب" کا اور مسلمان کسی "قوم" کا نام نہیں ہے، بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم (Social order) کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور مسلمان اس بین الاقوامی انقلابی جماعت (International Revolutionary Party) کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے منظم کرتا ہے اور جہاد اس انقلابی جدوجہد (Revolutionary Struggle) کا اُس انتہائی صرف طاقت کا نام ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے عمل میں لائی جائے۔

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروّج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی زبان (Terminology) اختیار کرتا ہے، تاکہ اس کے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں، لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے، اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ (war) کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں قصداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ "جہاد" کا لفظ استعمال کیا جو (struggle) کا ہم معنی ہے بلکہ اس سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے، انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

'To exert one's utmost endeavour in promoting a cause'

"اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا"

سوال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ "جنگ" کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی اُن لڑائیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے، جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کے لئے کی جاتی ہیں، ان لڑائیوں کے مقاصد محض ایسے شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں، جن کے اندر کسی نظریہ اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں ہے، اس لئے وہ سرے سے اس لفظ کو ہی ترک کر دیتا ہے، اس کے پیش نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا نقصان نہیں ہے، وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے، یا دوسری سلطنت کا، اس کی دلچسپی جس چیز سے ہے وہ انسانیت کی فلاح ہے، اس فلاح کے لئے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے۔ اس نظریہ اور مسلک کے خلاف جہاں جس چیز کی حکومت بھی ہے، اسلام اُسے مٹانا چاہتا ہے قطع نظر

اس سے کہ وہ کوئی قوم ہو اور کوئی ملک ہو، اس کا مدعا اپنے نظریہ اور مسلک کی حکومت قائم کرنا ہے بلالحاظ اس کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اُٹھتا ہے۔ اور کس کی حکمرانی پر اس کی ضرب پڑتی ہے، وہ زمین مانگتا ہے، ــــ زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ کرۂ زمین اس لئے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر زمین کی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آجائے، بلکہ صرف اس لئے کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے، اس سے تمام نوعِ انسانی متمتع ہو، اس غرض کے لئے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لئے کارگر ہوسکتی ہیں اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام "جہاد" رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے تلوار کے زور سے پُرانے ظالمانہ نظامِ زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے۔ اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

"فی سبیل اللہ" کی لازمی قید

لیکن اسلام کا جہاد نرا "جہاد" نہیں ہے بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے اور "فی سبیل اللہ" کی قید اس کے ساتھ ایک لازمی قید ہے، یہ "فی سبیل اللہ" کا لفظ بھی اسلام کی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کی طرف ابھی میں اشارہ کرچکا ہوں، اس کا لفظی ترجمہ ہے "راہِ خدا میں" اس ترجمہ سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں "راہِ خدا" کا کوئی مفہوم اس کے سوا نہیں سما سکتا، مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے، ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے کیا جائے، اور جس کے کرنے والے کا مقصد اس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو، بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو، اسلام ایسے کام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیتا ہے، مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں، اس نیت سے کہ اسی دنیا میں مادی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ آپ کی طرف پلٹ کر آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے، اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کرکے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے، پس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے کاموں کے لئے جو کامل خلوص کے ساتھ ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر اس نظریہ پر کئے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے اور انسان کی زندگی کا نصب العین مالکِ کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

"جہاد" کے لئے بھی "فی سبیل اللہ" کی قید اسی غرض کے لئے لگائی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظامِ حکومت میں انقلاب برپا کرنے اور اسلامی نظریہ کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لئے جدوجہد کرلے اٹھے، تو اس قیام اور اس سر بازی و جان نثاری میں اس کی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہونی چاہئے، کہ قیصر کو ہٹا کر خود قیصر بن جائے، اپنی ذات کے لئے مال و دولت یا شہرت و ناموری، عزت و جاہ حاصل کرلے کا شائبہ تک اس کی جدوجہد کے مقاصد میں نہ ہونا چاہئے، اس کی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہونا چاہئے کہ بندگانِ خدا کے درمیان ایک عادلانہ نظامِ زندگی قائم کیا جائے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کچھ مطلوب نہ ہو، قرآن کہتا ہے:-

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ — ایمان دار لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء)

کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ (النساء)

"طاغوت" کا مصدر "طغیان" ہے جس کے معنی حد سے گذر جانے کے ہیں دریا جب اپنی حد سے گذر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں طغیانی آگئی ہے، اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گذر کر اس غرض کے لئے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصے سے زائد فوائد حاصل کرے، تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے، اور اس کے مقابلہ میں راہِ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانونِ عدل دُنیا میں قائم ہو، لڑنے والا خود بھی اس کی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرائے، چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (القصص-۹)

آخرت میں عزت کا مقام ہم نے ان لوگوں کے لئے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے اور عاقبت کی کامیابی تو خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "راہِ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لئے جنگ کرتا ہے، دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اس لئے جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "کسی کی بھی نہیں، فی سبیل اللہ تو صرف اس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسّی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہو گیا"۔ — اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اس کی خوشنودی کے لئے ہو اور کوئی شخصی یا جماعتی غرض نہ ہو، پس جہاد کے لئے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے، مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جاندار کرتے ہیں، ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے لیکن "مسلمان" جس انقلابی جماعت کا نام ہے اس کے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان مال کھپاؤ دُنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو، اپنے جسم و رُوح کی ساری طاقتیں خرچ کر دو، اس لئے کہ دُوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم اُن کی جگہ لے لو، بلکہ صرف اس لئے کہ دُنیا سے سرکشی و طغیان مٹ جائے اور خدا کا قانون دُنیا میں نافذ ہو۔

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد میں اس دعوتِ انقلاب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لئے جہاد کی حاجت کیا ہے، اور اس کی غایت (Objective) کیا ہے۔

اسلام کی دعوتِ انقلاب

اسلام کی دعوتِ انقلاب کا خلاصہ یہ ہے :-

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ۔

اے انسانو! صرف اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

اسلام مزدوروں یا زمینداروں یا کاشت کاروں یا کارخانہ داروں کو نہیں پکارتا، بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے اور وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی اطاعت، فرمانبرداری کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی نکال دو کہ دوسروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنی چاہئے، اور اس بندگی میں سب کو ایک سطح پر آجانا چاہئے۔

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (آل عمران - ۷)

آؤ ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اور خداوندی میں کسی کو خدا کا شریک بھی نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امرونہی کا مالک بھی نہ بنائے۔

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی، اس نے پکار کر کہا کہ "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ" حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے "کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمراں بن جائے، اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے، کسی انسان کو بالذات امرونہی کا مالک سمجھنا دراصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور یہی بنائے فساد ہے، اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جائیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کردیں، اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لے کر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بندہ بنالیتے ہیں، اور دوسری طرف اسی خدا فراموشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ طاقتوروں کی خداوندی مان لیتا ہے اور ان کے اس حق کو تسلیم کرلیتا ہے کہ یہ حکم کریں اور وہ اس حکم کے آگے سر جھکادیں، یہی دنیا میں ظلم وفساد اور ناجائز انتفاع (Exploitation) کی بنیاد ہے۔ اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:۔

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء - ۸)

ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی حد جائز سے گذر گئے ہیں، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے،

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا۔ (الکهف - ۴)

اس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور جو اپنی خواہشات نفس کا بندہ بن گیا ہے اور جس کا کام افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا۔ (ہود - ۲)

خدا کی لعنت ہو ان ظالموں پر جو خدا کے بنائے ہوئے زندگی کے سیدھے راستہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؟ یہ بہت سے چھوٹے

بڑے خدا جن کی بندگی میں تم پسے جا رہے ہو ان کی بندگی قبول ہے یا اس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کروگے تو ان چھوٹے اور چھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پائیں گے، اور فساد برپا کرتے رہیں گے:۔

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۔ (النمل - ۳)

یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظام کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں، اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی وتیرہ ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۔ (بقرہ - ۲۵)

اور جب وہ اقتدار پا لیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے کھیتوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

یوں پوری تفصیل کا موقع نہیں، مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوتِ توحید و خدا پرستی محض اس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی جس میں اور دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ یہ حقیقۃً ایک اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کی دعوت تھی، اس کی ضرب بلاواسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی، جنہوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بن کر، یا سیاسی رنگ میں بادشاہ اور رئیس اور حکمران گروہ بن کر یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا، یہ کہیں علانیہ اربابٌ من دون اللہ بنے ہوئے تھے، دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے، اور صاف کہتے تھے کہ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي۔ اور أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ اور أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ اور مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۔ اور کسی جگہ انہوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استحصال (Exploit) کرنے کے لئے معنوی خداؤں اور ہیکلوں کی شکل میں بنا رکھے تھے، جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی کے حقوق بندگانِ خدا سے تسلیم کراتے تھے، پس کفر و شرک و بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت اور خدائے واحد کی بندگی و عبودیت کے لئے اسلام کی تبلیغ براہِ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی، اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبیؑ نے يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ کی صدا بلند کی، حکومتِ وقت فوراً اس کے مقابلہ میں آن کھڑی ہوئی، اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ (Metaphysical proposition) کا بیان نہ تھا، بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا، اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی۔

(جہاد فی سبیل اللہ)

ہماری نظر میں

حضرت امام ابُو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی

"حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" —— از علامہ سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) ضخامت ۲۹۹ صفحات، بڑا سائز، قیمت مجلد آٹھ روپیہ بارہ آنہ - قیمت مجلد چرمی بارہ روپیہ

ملنے کا پتہ :- نفیس اکیڈیمی بلاسس اسٹریٹ - کراچی ۳

مولانا مناظر احسن گیلانی کی علمی شہرت تعارف کی محتاج نہیں! اسلامی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے مولانائے موصوف کے علمی کارناموں کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں بلکہ اُن سے استفادہ کر چکے ہیں، مولانا گیلانی کی ذات علمی تبحر کے ساتھ اس جذب وسوز کا بھی مظہر ہے جسے اقبال نے "قلندری" سے تعبیر کیا ہے، دل کے اسی سوز و گداز نے اُن کی تحریروں کو بہت زیادہ اثر انگیز بنا دیا ہے، اور جگہ جگہ لکھنے والے کا خونِ دل جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی جتنے اچھے انشا پرداز ہیں، اُتنے ہی اچھے خطیب بھی ہیں، قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم جن کے نطق گہربار پر خود خطابت کو ناز تھا، فرماتے تھے :-

"میں نے تقریر کرنا مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھا ہے، ربیع الاول کے مہینہ میں سیرۃ النبیؐ کے جب جلسے ہوتے تھے تو میں ان کے پیچھے موٹر لئے لئے پھرتا تھا۔۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحریروں میں (خاص طور سے النبی الخاتم میں) "انجیل" کا انداز جھلکتا ہے، اس طرزِ نگارش سے اُردو دُنیا زیادہ مانوس نہیں ہے، مگر اس میں نُدرت اور دلکشی ضرور پائی جاتی ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ مولانا موصوف جب کسی ذکر کو چھیڑتے ہیں، تو اس میں بہت سے دُور دُور کے تذکرے نکل آتے ہیں، اور معلومات کا دریا اور جذبات کا طوفان موضوع کی حدود کا پابند نہیں رہتا —— مگر "حضرت ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" میں مولانا گیلانی نے انتہائی سادہ طرز اختیار کیا ہے، کتاب شروع سے آخر تک مربوط اور منظم ہے، نازک سے نازک مسئلوں کو فاضل مصنف نے ہاتوں باتوں میں بیان کر دیا ہے۔

سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی نے "سیرۃ النعمان" لکھ کر حقیقت میں اُردو ادب کے وقار کو بڑھا دیا اور شاید خود عربی زبان میں بھی امام ابو حنیفہؒ کی زندگی پر اتنی مبسوط، جامع اور مستند کتاب موجود نہیں ہے —— مولانا گیلانی نے امام ابو حنیفہؒ کی زندگی کے سیاسی پہلو کو لے کر "سیرۃ النعمان" پر اضافہ کر دیا، شبلی آج زندہ ہوتے تو گیلانی کی علمی کاوشوں اور تحقیقی کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتے کہ ان کے جلائے ہوئے چراغ کی لو سے صوبہ بہار کے ایک صاحب ہوش و خبر مرد قلندر نے فانوس روشن کر دیا۔

اسلامی تاریخ میں حضرتِ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت خاص امتیاز اور منفرد مجد و شرف کی حامل ہے،

ایک طرف ان کا کردار تقدیس و پاکیزگی کا آئینہ دار تھا، اور دوسری طرف آپ کا ذہن نکتہ رس اور آپ کی فکر معنی تنی تھی، اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہ کو دینی بصیرت عطا فرمائی تھی، یہی وہ "ملکہ تفقہ" ہے جہاں سولن جیسے ایک ہزار مقنن بھی اپنی تمام قانونی موشگافیوں کے باوجود پست قامت اور بونے نظر آتے ہیں۔ ابو حنیفہؒ نے شریعت کے مزاج کو پہچانا اور احکام و اوامر، حدود اللہ کی روح کو سمجھا، اور پھر حق شناسی کا یہ عالم کہ اگر کوئی ایسی حدیث مل گئی جو ان کے اجتہاد سے متصادم نظر آئی تو اپنے قول سے رجوع کر لیا، یہی وہ آزادیٔ فکر اور حق شناسی کا احساس تھا جس نے شاگرد (امام ابو یوسفؒ) میں اُستاد (امام ابو حنیفہؒ) کے بعض اجتہادات سے مخالفت کرنے کی جرأت پیدا کر دی، اس لئے کہ حق شخصیتوں سے بلند ہوتا ہے ——— مگر اس کو کیا کیجئے کہ بعض حنفی جامد تقلید کے سہارے یہاں تک اُتر آئے کہ "ما از حدیث چہ کار، قول ابو حنیفہ بیار" پیشواؤں اور اماموں کی تعلیمات کو خود ان کے ماننے والوں کی مبالغہ آمیز عقیدت اور غلط، وہیوں نے ہی مجروح اور مشتبہ بنایا ہے ——— علم و صداقت کی یہ بہت بڑی "ٹریجڈی" ہے۔

یہ کتاب "ابو حنیفہؒ" کی سیاسی زندگی کی ترجمان ہے مگر اس میں اُس دور کی بہت سی مشہور اسلامی شخصیتیں بھی اپنے علمی، سیاسی اور اخلاقی کارناموں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اور کتاب پڑھنے والا امام اعظمؒ کے طفیل میں بہت سے دوسرے مشاہیر اور نامور شخصیتوں سے واقف ہو جاتا ہے، اس موضوع پر نہ صرف اُردو زبان میں بلکہ اسلامی ادب میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس قدر شرح و بسط اور تاریخی حوالوں کے ساتھ لکھی گئی ہے، فاضل مصنف نے نہ جانے اس کوزے کے لئے کتنے دریاؤں کو کھنگالا ہے، اور اس ایک گلدستہ کے لئے کتنے باغوں سے پھول چنے ہیں۔

اس معلومات آفریں اور گرانقدر تصنیف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام اعظمؒ اُن تمام داعیانِ حق کے مؤید تھے، جنہوں نے مسلمان بادشاہوں (خلفاء) کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، آپ گو کہ اس جہاد میں شریک نہ ہو سکے، لیکن دل، دماغ، اور مادی تدبیروں اور فکری مشورت کے ساتھ اُن کے ہمنوا اور طرفدار تھے ——— اور یہ بھی کہ جاہ و منزلت کا بڑے سے بڑا لالچ بھی آپ کو رام نہ کر سکا، شہنشاہوں نے جب بھی آپ پر اکرام و نوازش کی بارش کرنی چاہی، آپ کی فطرت نے زبانِ حال سے یہی جواب دیا:-

بر و ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس حق گوئی، جرأت و بے باکی اور شاہی درباروں سے الگ تھلگ رہنے کے سبب آپ کو جسمانی سزائیں بھی بھگتنی پڑیں مگر مجال کیا یہ کوہِ گراں بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر ہوا، شانِ تفقہ اور دینی بصیرت کے ساتھ اس بلند کرداری نے نعمان بن ثابتؒ کو "امامِ اعظم" بنا دیا۔

اس کتاب میں سیاسی تذکرے ہی نہیں، علمی مباحث بھی جگہ جگہ آ گئے ہیں، اور بعض مقامات پر تو مصنف نے خطابت کے زور سے ادب اور انشا کے قلعے کھڑے کر دیتے ہیں ——— اس کی چند جھلکیاں :-

"امام صاحب کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا، جس وقت عمر ابن عبد العزیزؒ نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، پہلی تقریر منبر پر پہونچ کر انہوں نے جو کی تھی اس کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ:-

"لا طاعة فی معصیة اللہ" (ابن سعد) اللہ کی نافرمانی میں ہماری فرماں برداری کوئی نہ کرے!

آزادی کا یہ پہلا منشور تھا جس کا بنی آمیہ کے عہد میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی جانب سے پہلی دفعہ اعلان کیا گیا، تمام ظالم گورنر جن کے حالات سے وہ بخوبی واقف تھے ایک ایک کر کے ہٹا دیئے گئے، ہر شخص کو حکم دیا گیا کہ "اسلامی نظام" میں جہاں جہاں جس جس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور پوری قوت سے کی جائے، اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ ساری زبانیں جن پر تلوار کے تملے چڑھائے گئے تھے کھل پڑیں اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اظہارِ حق کے جذبہ کا جو چراغ قریب تھا کہ بجھ جائے پھر سینوں میں روشن ہو گیا، مشہور مدنی امام حضرت قاسم محمد بن آبی بکر کا مشہور تاریخی فقرہ:-

" الیوم ینطق من کان لاینطق "

اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے (صفحہ ۱۲)

اسلامی فقہ کے لئے کس طرح کی فکر، دماغ، تجربہ اور سمجھ درکار ہے، اس پر مصنف کا فاضلانہ فیصلہ ملاحظہ ہو:-

" واقعہ یہ ہے کہ اور کسی دینی علم میں ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن "فقہ" ایک ایسا دینی علم ہے جس میں حذاقت اور مہارت اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ دین کے ساتھ دُنیا اور "معاد" کے ساتھ "معاش" کے سمجھنے اور برتنے کا بھی سلیقہ آدمی میں نہ ہو " (صفحہ ۲۲۳)

"حضرت علیؓ اور غلطیہائے مضامین" کے عنوان پر مولانا گیلانی نے کتنی دل نشیں باتیں کہی ہیں:-

" حضرت علیؓ پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے اس قسم کی باتیں جب میرے کانوں میں پہونچتی ہیں تو ہمیشہ دل میں یہ خیال آیا کہ علیؓ کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کی ابتدائی خدمات سے اپنے آپ کو کیوں اندھا بنا لیتے ہیں، وہ اسلامی اطلس میں ایران و مصر، شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادسیہ میں جو کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوئی کیا بدر کی فیصلہ کن کامیابی کے بغیر نصیب ہو سکتی تھی؟ وہ خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے ساحل پر عبرت ناک شکست دشمنوں کو اُٹھانا پڑی، لیکن یرموک کی فتح پر خوشی کے شادیانے بجانے والوں سے کون ..... پوچھے کہ ارے محسن کُشو! یرموک تک تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا ـــــ حافظے کمزور ہو سکتے ہیں، لیکن کیا اتنے کمزور کہ ہر دوسرے قدم کو اٹھانے کے بعد دماغ سے یہ بات نکل جائے کہ دوسرا قدم اُٹھ ہی نہیں سکتا اگر پہلا قدم نہ اُٹھتا ـــــ " (صفحہ ۲۵۴)

" خطائے بزرگاں گرفتن خطاست "، کی مصلحت اور نزاکت کا ہمیں احساس ہے، مگر بزرگوں ہی نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہمارے قول و فعل میں جھول، لغزش، اور اونچ نیچ نظر آئے تو اس کی پیروی ہرگز ہرگز نہ کرو، اس لئے کہ ہم انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں، اور انسان سے سہو و نسیان ہو ہی جاتا ہے، ـــــ تحریروں میں لفظ و بیان کی غلطیوں کی " فاران " میں خاص طور سے اس لئے گرفت کی جاتی ہے کہ اس دَور میں عموماً زبان اور روزمرہ سے لوگ بے پروائی برتتے ہیں اور مزاج داں طبیب کا فرض ہے کہ جس زمانہ میں جس مرض کی عمومیت ہو، اُس کے ازالہ کی خاص طور پر کوشش کرے۔

لفظ و بیان کی اس گرفت، احتساب، اور نشاندہی کی ایک غرض یہ بھی ہے، کہ احتیاط نہ برتنے والے محتاط اور محتاط، اور زیادہ احتیاط پسند ہو جائیں، تنقید نگار اگر اس فرض کو انجام نہ دیں گے، تو کیا ان غلطیوں کی تصحیح کے لئے آسمان سے وحی نازل ہوگی، یہ کام بڑی دیدہ ریزی اور کاوش و محنت چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے

اس عرقریزی کی ہمیں توفیق دی ہے۔

(صفحہ ۲۳) "ہر کرہ پر قفل توڑا لگا دیا جاتا تھا"۔ "مہر توڑا" لکھنا چاہئے تھا یہ sealed کا فنی اور اصطلاحی ترجمہ ہے۔ (صفحہ ۴۱) "زر بر سنگ نہی نرم شود"۔ ضرب المثل اس طرح واقع ہوئی ہے "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" ضرب المثل کے الفاظ میں ردو بدل درست نہیں الّا یہ کہ اس ردو بدل سے کوئی خاص ندرت اور نکتہ آفرینی یا کسی خاص واقعہ کا اظہار مقصود ہو۔ (صفحہ ۴۵) "امام صاحب کے عقب میں ایک شخص نے خز ہی کا تھان ایک ہزار درم میں بیچ دیا"۔ یہاں "عقب" کا نہیں "غیاب" یا "غیر موجودگی" کا محل تھا۔ (صفحہ ۱۲۰) " دخل وقت العصر" اس کا ترجمہ "عصر کا وقت داخل ہوچکا تھا" کیا ہے، اور اسی طرح دوجگہ "دخل" کا یہی ترجمہ کیا گیا ہے، اردو میں اس طرح نہیں بولتے، "عصر کا وقت ہوچکا تھا یا آچکا تھا" لکھنا چاہئے تھا یہی فصیح اور موزوں ترجمہ ہے۔

(صفحہ ۱۴۰) "امام کی جوابی قسم اُس کی رفعت کے مینارے کی کلہاڑی تھی" اول تو اس جملہ میں ضرورت سے زیادہ تکلف پیدا ہوگیا پھر یہاں "کی" ٹھیک نہیں "کیلئے" کہنا چاہئے تھا، یعنی "رفعت کے مینارے کے لئے کلہاڑی تھی"!
(صفحہ ۲۶۲) "خوشامد بر آمد کرکے"۔ "خوشامد درآمد کرکے" بولتے ہیں۔ (صفحہ ۲۹۶) "یہ حنبلی حضرات ہیں اور حنفیوں سے چٹکی لینے کی عادت ان کی پرانی ہے" یہاں "سے" کا استعمال کھٹکتا ہے ـــــ "دھر پکڑ" کسی جگہ نظر آیا جو غالباً صوبہ بہار میں بولا جاتا ہے اور "ہے کہ" کو ہر جگہ "ہیکہ" لکھا گیا ہے یہ املا کی وہ غلطی ہے جسے "اذیت کوش" کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں صرف علمی مباحث اور سیاسی تذکرے ہی نہیں عبرتیں اور نصیحتیں بھی ہیں، عُلما، حکام اور عوام سب کے لئے! صرف یہ دو واقعے کس قدر افسوسناک اور عبرت خیز ہیں:۔

(۱) یزید بن عبد الملک جو حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد خلیفہ ہوا تھا اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہم عصر تھا، لکھا ہے کہ اسی یزید کے زمانہ میں

فاتوہ اربعین شیخا شھد واللہ ان الخلفا لاحساب علیھم ولا عذاب۔

چالیس شیخ پیش ہوئے اور انہوں نے اس بات کی شہادت دی کہ خلفاء سے قیامت کے دن نہ حساب لیا جائے گا، اور نہ اُن کے جرائم کی سزا ملے گی۔

(۲) ہارون الرشید بغداد میں کبوتر اُڑا رہا تھا، اتنے میں قاضی وہب بھی آگئے، ہارون نے پوچھا کہئے "کبوتر بازی کے متعلق بھی کوئی روایت آپ کے علم میں ہے" بے محابا اس شخص نے کہنا شروع کیا کہ:۔

"مجھ سے ہشام بن عروہ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہشام سے ان کے والد عروہ نے روایت کرتے تھے، کہ عائشہ صدیقہ نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبوتر بازی فرماتے تھے"

ہارون آپے سے باہر ہوگیا اور کہا:۔

"نکل جا میرے سامنے سے اگر تیرا خاندانی تعلق قریش سے نہ ہوتا تو تجھے معزول کردیتا"

ان دونوں واقعوں سے جاہ پرست اور دُنیا دار مشائخ اور علمائی پست ذہنیت کی قلعی کھلتی ہے کہ یہ گروہ سدا سے ایمان فروش اور مصلحت پرست رہا ہے ـــــ اور یہ واقعات اس چیز کو بھی ظاہر کرتے ہیں، کہ احادیث کے پرکھنے والوں نے صحیح اور

غیر صحیح حدیثوں کو جانچ کر کس محنت کے ساتھ کانٹوں سے پھول چنے ہیں۔ (فجزاہم اللہ خیرالجزاء ورحمہم اللہ تعالیٰ)

"حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" اردو ادب میں یقیناً گرانقدر اضافہ ہے، مصنف کے ساتھ کتاب کے ناشر چودھری محمد اقبال سلیم گاہندری بھی مستحق تبریک ہیں کہ انہوں نے اپنے اہتمام سے اتنی اچھی کتاب چھاپ کر منظرِ عام پر علم و ادب کی روشنی بکھیر دی، توقع ہے کہ نفیس اکیڈمی جس کا حیدرآباد دکن مرکز تھا اب پاکستان میں اسلام و اخلاق اور علم و ادب کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دے گی ——— ہم ناظرینِ "فاران" کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس کتاب کو جیسے بھی بنے ایک بار ضرور پڑھیں۔

رودِ کوثر

رودِ کوثر ——— مصنف شیخ محمد اکرام ایم، اے، ایم، آر، سی، ایس، آئی، سی، ایس، ضخامت ۴۴۲ صفحات، پائیدار جلد، خوبصورت گرد پوش کے ساتھ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

ملنے کا پتہ:۔ تاج آفس، بندر روڈ، کراچی

جناب شیخ محمد اکرام (آئی سی ایس) "غالب نامہ" لکھ کر کسی پروپیگنڈے کے بغیر ایکا ایکی منظرِ تعارف پر نمودار ہو گئے "رودِ کوثر" بھی شیخ صاحب موصوف کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ جسے "تاج آفس" نے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے "رودِ کوثر" کے سرنامہ پر "اسلامی ہند اور پاکستان کی مذہبی اور روحانی تاریخ" (عہدِ مغلیہ) درج ہے، اس موضوع کو شروع سے آخر تک لائق مصنف نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے، اور اس کوشش میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوتی ہے! مصنف نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ واقعات فراہم کئے ہیں اور پھر ان واقعات کو قرینہ کے ساتھ مرتب کر کے نتائج نکالے ہیں اور کہیں کہیں موازنہ کر کے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔

کتابوں کا مطالعہ آسان ہے مگر کسی خاص موضوع اور عنوان کے لئے کتابوں سے مفید موضوع مواد کا مہیا کرنا ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لئے فکرِ سلیم، نگاہِ عمیق اور وجدانِ صحیح درکار ہے، رطب و یابس کا جمع کر دینا بہت سہل ہے یہ کام ہر آدمی کر سکتا ہے، لیکن کتابوں سے کار آمد مسالہ اور مواد کا انتخاب اور اقتباس دشوار کام ہے، دریا اور تالاب سے پانی ہر کوئی لے سکتا ہے، لیکن پانی کی ایک ایک بوند کو مقطر کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے فن کارانہ مہارت کی ضرورت ہے۔

شیخ محمد اکرام کو قدرت نے کتابوں سے اخذ و اقتباس کا سلیقہ اور علمی مواد کو کام میں لانے کی خاص صلاحیت عطا فرمائی ہے "رودِ کوثر" میں شیخ صاحب کی یہ صلاحیت پورے طور پر نمایاں ہے، اس ایک کتاب کو مصنف نے بہت سی کتابیں پڑھ کر مرتب کیا ہے، جگہ جگہ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، کہیں اصل عبارت درج کی ہے، اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں متن کا ترجمہ دیدیا ہے اور شرح بھی فرما دی ہے۔

شیخ محمد اکرام کے اندازِ نگارش اور اسلوبِ تحریر میں تکلف نہیں پایا جاتا، شوخی اور رنگینی کی جگہ اُن کے یہاں سنجیدگی کی فراوانی ہے مگر یہ سنجیدگی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، بے مزہ اور سپاٹ سنجیدگی بیان و انشا کی بہت بڑی کمزوری ہے، شیخ صاحب یہ بھی نہیں کرتے کہ بات تو ہو ذرا سی اور اسے پھیلا کر افسانہ بنا دیں، وہ عام طور پر زیادہ سے زیادہ مفہوم کیلئے کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس لئے ان کی تحریروں میں چھلکے (قشر) کم اور مغز زیادہ ہوتا ہے۔

"رودِ کوثر" ہندوستان کے بہت سے مشہور اولیائے کرام اور معروف علماء کے تذکروں سے عبارت ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مغل بادشاہوں اور امیروں نے علم و رُوحانیت کا کیا اثر قبول کیا اس سلسلہ میں جہاں جاہ پرست اور دنیا دار عالموں اور صوفیوں کا ذکر آگیا ہے وہاں اُن مقدس ہستیوں کے کارنامے بھی بیان کئے گئے ہیں جو اللہ کے لئے جاہ و دولت کی بڑی سے بڑی پیشکش کو ٹھکرا دیا کرتے تھے۔

شہنشاہ اکبر کے مذہبی رجحانات کیا تھے! اُسے کس نے بگاڑا؛ علماء کی روش کیا تھی؟ ابوالفضل اور فیضی نے کس حد تک اکبر کو متاثر کیا؛ حضرت مجدد الف ثانی کا تصوّف کس انداز کا تھا؟ اس قسم کے مباحث کے ضمن میں فاضل مصنف نے مخالف اور موافق راتیں اور حوالے درج کرکے خوب خوب تنقید کی ہے، مگر اس خرابی کے باوجود اس کی قوتِ فیصلہ کمزور ہے، کہیں کہیں اُس نے استدلال کی کشتی کو ادھ بھر میں چھوڑ دیا ہے، اب یہ اُس سفینہ کے مسافروں کے ظرف و ہمت پر منحصر ہے کہ وہ یا تو منجدھار ہی میں جھکولے کھاتے رہیں، یا ہمت کرکے پار اُتر جائیں۔

حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے، اور یہ مقدس ہستیاں اس کی مستحق بھی تھیں، حضرت مجدد صاحبؒ کے اُس مسلک (وحدت الشہود) کو خاص طور پر بیان کیا ہے جو "وحدت الوجود" کے نظریہ تصوف کی ضد ہے —— اس موضوع پر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیف سے اگر فائدہ اٹھایا جاتا تو یہ بحث اور زیادہ وزنی اور مدلّل ہو جاتی!

حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور اُن کے مریدوں کے اجمالی ذکر پر کتاب ختم ہو جاتی ہے، اگر اس سلسلہ کو بڑھا دیا جاتا اور حضرت حاجی وارث علی شاہ (دیوہ) حضرت محمد شیر میاں (پیلی بھیت) مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ شاہ امداد اللہ مہاجرؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ارشاد حسین (رام پور) اور مولانا برکات احمد ٹونکی، کا بھی ذکر آجاتا، تو پچھلی تمام کڑیاں ملتی چلی جاتیں اور یہ تذکرہ زیادہ مفصل ہو جاتا۔

"رودِ کوثر" کے پڑھنے سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوا کہ پشتو کا ملک الشعراء خوشحال خاں (خٹک) ایک انقلابی قسم کا شاعر تھا، اُس نے آفریدیوں کو اپنے آتشیں شعروں سے بھڑکا کر، اورنگ زیب کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرا دیا، خوشحال خاں کی بعض نظموں کے ترجمے بھی مصنف نے درج کر دیے ہیں۔

صفحہ ۱۶ پر لکھا ہے:۔ "حیدر آباد دکن کے نواب بہادر یار جنگ جو بڑے کامیاب مقرر تھے مہدوی عقائد کے تھے" نواب بہادر یار جنگ مرحوم مہدوی گھرانے میں پیدا ہوئے اور ابتداء میں اُن کے یہی عقائد تھے، مگر اپنی ذاتی تحقیق اور فکر و مطالعہ کے بعد وہ "مہدوی" نہیں رہے، ان کی ڈیوڑھی کا نام "مہدوی منزل" تھا، جس کا نام انہوں نے بدل کر "بیت الامت" کر دیا، نواب صاحب مرحوم کی وفات سے تقریباً بیس دن قبل کا واقعہ ہے کہ حیدر آباد دکن کے ایک جاگیردار کی دعوت[1] میں انہوں نے اپنے اس عقیدے کا اظہار فرمایا۔

"مجھ میں اور مہدویوں میں یہ چیز مابہ الاختلاف ہے —— کہ میں محمد مہدی صاحب جون پوری کی مہدویت کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتا"

(صفحہ ۳۶) "اور کرتے جاڑوں میں ایک پیراہن کے سوا کچھ نہ پہنتے" "کرتا کے کے جاڑوں" لکھنا چاہیے تھا۔

(صفحہ ۶۴) "اور اسلامی حکومت کو جس طرح اُس نے (اکبر نے) مستحکم کیا، کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا"

[1] میں اس دعوت میں شریک تھا —— ماہر

آخری جملہ موجودہ صورت میں ٹھیک نہیں "کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے یہ کام نہیں ہوا" یا اسی انداز پر لفظوں کی تبدیلی اور اضافہ سے اس جملہ کو درست بنایا جا سکتا ہے ـــــ معنوی اور واقعاتی غلطی یہ ہے کہ مغلیہ حکومت کو مصنف نے اسلامی حکومت کہا ہے! ہمارے مسلمان مورخین اس باب میں یورپ کے اہل قلم کی غلط اندیشی کی تقلید کرتے ہیں جو قصر الحمراء اور تاج محل ہی کو نہیں بلکہ مصوری، موسیقی اور طرح طرح کے آلاتِ طرب اور سازوں کو بھی "اسلامی تمدن" کا ایک جزو سمجھتے ہیں اور مسلمان بادشاہوں کی شخصی حکومتوں کو اسلامی حکومتوں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی دور میں بھی کوئی حکومت پورے طور پر اسلامی منہاج پر قائم نہیں ہوئی، وہ حکومتیں مسلمانوں کی حکومتیں تو بے شک تھیں مگر "اسلامی حکومتیں" نہ تھیں۔

(صفحہ ۱۱۵) "اکبر نے یہ عمارت شیخ فرید کو عطا کی ہوئی تھی" پورا جملہ "نے" "اور کی ہوئی تھی" کے چکر میں آکر اردو روزمرہ کا منہ چڑا رہا ہے ـــــ (صفحہ ۱۵۹) "دوسرے مخالفوں نے نمک مرچ بھی لگائی ہوگی" ـ "نمک مرچ لگایا ہوگا" لکھنا چاہئے تھا، "نمک مرچ" کو "آب و ہوا" پر قیاس نہ کرنا چاہئے، کہ اس میں "واؤ" عطف ہے اس لئے وہاں "ہوا" کی لفظی حیثیت جملہ کی ساخت پر اثر انداز ہوگی (آب و ہوا اچھی ہے) یہاں بھی اگر "نمک و مرچ" ہوتا تو "نمک اور مرچ لگائی ہوگی" کہنا درست تھا مگر "نمک مرچ" مذکر بولا جاتا ہے۔

(صفحہ ۱۹۶) "نواب سر احمد حسین نظام جنگ بہادر" ـــــ نواب سر احمد حسین کا خطاب "نظام جنگ" نہیں "امین جنگ" ہے ـــــ (صفحہ ۳۱۰) "سب سے زیادہ فروغ علمائے پورب کو حاصل تھا" ـ "پوربی علماء" لکھنا تھا، "پورب" ہندی لفظ ہے، اس کے ساتھ عربی یا فارسی کی اضافت نادرست ہے ـــــ

(صفحہ ۳۲۷) پر اس قطعہ کو:

گر تو راہِ حق بخواہی اے پسر ۔۔۔ خاطرِ کس را مرنجاں الحذر

در طریقت رکنِ اعظم رحمت است ۔۔۔ ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

جو مثنوی مولانا روم کی بحر میں ہے "رباعی" لکھا ہے ـــــ علامہ اقبالؒ نے بعض قطعوں کو جو رباعی کی بحر میں نہیں ہیں "رباعی" سے منسوب فرمایا ہے، اس کی تقلید نہ کی جائے تو اچھا ہے۔

(صفحہ ۳۴۴) "دماغی قابلیت، مجتہدانہ نظر، سلیم الخیالی" ـــــ وسیع الخیالی کے انداز پر سلیم الخیالی بنایا گیا ہے مگر یہ "جدت" وجدان کو بھلی نہیں لگتی، ممکن ہے کہ کثرتِ استعمال کے بعد یہ غرابت جاتی رہے ـــــ (صفحہ ۳۴۷) "مولانا نذیر احمد لکھتے ہیں" غالباً اس سے "ڈپٹی نذیر احمد" مراد ہیں، ڈپٹی نذیر احمد کو "مولانا" کہا جا سکتا ہے مگر "ڈپٹی" اُن کے نام کا جزو بن گیا ہے، جسے علیحدہ کرکے کوئی اور لقب یا نسبت لگائیں گے، تو التباس اور غلط فہمی کا امکان ہے۔

"کئی" کا استعمال مصنف نے بہت سے مقامات پر غلط کیا ہے اور کہیں کہیں یہ غلطی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔

(صفحہ ۴۰۷) "درسِ نظامی کی نسبت مولانا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں" ـــــ نیاز فتحپوری اردو کے اچھے انشاپرداز ہیں، مگر شیخ اکرام صاحب جیسے بالغ نظر کا، انہیں "مولانا" لکھنا صد درجہ حیرت انگیز ہے۔ اسی "مرعوبیت" کا نتیجہ ہے کہ درسِ نظامی پر نیاز فتحپوری کی رائے کے اقتباس کو پیش کیا گیا ہے۔ درسِ نظامی پر مولانا شبلی نعمانی نے بہت مفصل تنقید کی ہے، اس کے اقتباسات درج کر دئے جاتے تو مصنف کا منشا پورا ہو جاتا۔

"رود کوثر" اُردو ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے، مصنف کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر کتاب کی ادبی اور علمی اہمیت سے انکار نہیں۔

آبگینۂ شعر

آبگینۂ شعر —— بشیر النساء بیگم کے کلام کا پہلا مجموعہ —— اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت، کاغذ دبیز، جلد خوشنما اور پائدار۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن

محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر دکن کی مشہور شاعرہ ہیں، جن کا کلام ایک زمانے سے رسالوں میں چھپ رہا ہے۔ بشیر صاحبہ کے مجموعہ کلام کو اب تک کبھی کا منظرِ عام پر آ جانا چاہئے تھا، مگر قدرت نے ہر چیز کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے، اور مقررہ وقت سے پہلے یا بعد میں کوئی چیز ظہور میں نہیں آ سکتی —— ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اُن کے کلام کا یہ پہلا مجموعہ نہایت خوبی و اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے —— "آبگینۂ شعر" میں کیا ہے؟ خود شاعرہ کی زبان سے اس کا جواب سُنئے:-

مرا ضمیر ہے بے تاب جستجو اس میں — جھلک رہی ہے مرے دل کی آرزو اس میں

بشیر کیا کہوں کیا شے ہے آبگینہ میں — مری سرشت ہے خود میرے روبرو اس میں

بعض شہرت پسند مرد اور عورتیں ہمارے علم میں ہیں، جو اپنی دولت سے "متاعِ غیر" خرید کر، اپنے نام سے پیش کرتی ہیں، اور اُن کی شہرت کے طلسم دوسروں ہی کے "فکر و کاوش" کے سہارے قائم ہیں، —— مگر محترمہ بشیر صاحبہ کو ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں، وہ خود شعر کہتی ہیں اور ملک و قوم کے سامنے انہوں نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ اُن کے اپنے افکار ہیں۔

دکن میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کی ذات چھوٹے پیمانہ پر برمکی وزراء، عبدالرحیم خان خاناں اور دوسرے علم پرور اور اہلِ سخاوت امیروں کی زندہ یادگار تھی، ان کے دربار سے بے شمار اربابِ ہنر اور اہلِ کمال نے فیض پایا ہے، تصوف کی مسندوں اور سجادوں پر بھی ان کے ابرِ کرم کے چھینٹے پڑے ہیں، منشی صادق حسین غبارؔ غالباً لکھنوی تھے، جن سے پہلے پہل محترمہ بشیر النساء بیگم بشیرؔ نے اپنے کلام پر اصلاح لی ہے، مہاراجہ کشن پرشاد (آنجہانی) کے دربار سے متعلق تھے، آخری میں مہاراجہ کے گرانقدر کتب خانہ کی نگرانی اُن کے متعلق تھی۔ غبار صاحب شاعر اور اُستاد قسم کے شاعر ہونے کے علاوہ بہت اچھے خطاط بھی تھے، عدالت العالیہ (High court) حیدرآباد دکن پر جو قطعاتِ تاریخ کندہ ہیں، وہ اُنہی کی قلم کاری کی یادگار ہیں —— غبار کے علاوہ بشیر صاحبہ نے نواب حیدر جنگ نظم طباطبائی سے بھی مشورۂ سخن کیا ہے نظم طباطبائی جیسا فاضل اُستاد قسمت والوں ہی کو میسر آ سکتا ہے۔

بشیر کی شاعری روایتی اور رسمی نہیں ہے، اُن کا مطمحِ نظر "ادب برائے زندگی" ہے اور زندگی سے اُن کی مُراد وہ صالح اور پاکیزہ زندگی ہے جس میں معیشت کے ساتھ اخلاق بھی شریک ہے، بشیر کے پہلو میں ایک حساس دل ہے، جو قوم اور انسانیت کے انتشار اور اضطراب کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے، یہی سوزِ دل اور شدتِ احساس شعر کے سانچے میں ڈھل کر اثر انگیزی کا آتشکدہ بن گیا ہے، بشیر کی شاعری میں "پیام" ہے، قوم و مُلک اور انسانیت کے لئے! کہیں کہیں اُن کی فکر نے اقبال کے حدودِ کمال کو چھو لیا ہے، اقبال سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں اُن کے افکار پر "حکیم مشرق" کے تصورات کی پرچھائیاں جھلمل کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

"اُمید و بیم" جس نظم کا عنوان ہے، اُس کا پہلا بند شاعرہ کے شدتِ احساس اور فکرِ دُور بیں کا ترجمان ہے:-

کیا خبر صورتِ امروز کا کیا ہو انجام — "کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام"

لیکن اتنا تو سمجھ سکتے ہیں اربابِ نظر　　زندگی عین دوراہے پہ کھڑی ہے ششدر
ایک جانب وہی دریوزہ گری کے پیماں　　دوسری سمت ہیں خونریز تباہی کے نشاں
گرچہ آفاق سے پیدا ہیں سحر کے آثار　　پر فضاؤں میں ہے شمشیر و سناں کی جھنکار
صبحِ نو زندگیِ نو کی پیامی ہو گی!
یا تو پھر اور بھی مضبوط غلامی ہو گی!

بنیاد کی پائیداری ہی پر کسی عمارت کی بقا کا دارومدار ہے، اس نظریہ کو بشیر نے کس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

آہ! مضبوط اگر بندشِ بنیاد نہیں　　کام کیا آئے گی پھر قوتِ فنِ معمار

ظاہر بیں اور مادہ پرست "عہدِ جدید" اور "عصرِ حاضر" کی چمک دمک اور سیمیائی نمود کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں مگر بشیر نے نگاہِ حقیقت شناس پائی ہے، کہتی ہیں :-

بخشی گئی نگاہ وہ عہدِ جدید کو
پہچانتی نہیں جو سیاہ و سپید کو

مغرب زدہ گروہ "عورت" کو "مرد" بنا کر آزادی دینا چاہتا ہے ـــــ بے قید آزادی جو اخلاقی حدود کی پابند نہ ہو البشیر بھی "صنفِ نازک" کے لئے جائز اور فطری آزادی کا مطالبہ کرتی ہیں مگر اس انداز میں ع

آزاد ہم رہیں مگر اپنی حدود میں

"اپنی حدود" میں کہہ کر شاعرہ نے "آزادیٔ نسواں" کے مقصد، منشا اور اس کی کارگاہِ عمل کو متعین کر دیا۔

دُنیا کی بے ثباتی اور زوال آمادگی پر بشیر کا شاعرانہ بلکہ مفکرانہ تبصرہ ملاحظہ کیجئے :-

پھول کھلتے ہیں چمن میں سوکھ جانے کے لئے　　موسمِ گل کو خزاں کا خوف دامنگیر ہے
ہے زوال آمادہ یہ سارا نظامِ کائنات　　موت کے اجزا سے موجودات کی تعمیر ہے
بستیاں بستی ہیں دُنیا میں اجڑنے کے لئے
صورتیں بنتی ہیں عالم میں بگڑنے کے لئے

"ورقِ غم" (تاریخی مادہ ۱۳۳۶ھ) (والدہ مرحومہ کی رحلت پر) اثر انگیز نظم ہے، جس کے ایک بند میں شاعرہ نے آنسوؤں کا طوفان، سسکیوں کی قیامتیں اور درد و غم کا آتشکدہ بند کر دیا ہے :-

دیکھنا وہ یاس سے دیوار و در جاتے ہوئے　　بے ثباتیِ جہاں کا راز سمجھاتے ہوئے
وہ محبت سے مجھے نزدیک بلواتے ہوئے　　ناتواں ہاتھوں سے میرے بال سلجھاتے ہوئے
سو تمناؤں کا مظہر، آہ وہ اک پیار تھا
یعنی ماں کی مامتا کا آخری اظہار تھا

اس تصویر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بشیر صاحبہ کا کلام پڑھ کر وجدان ایسا محسوس کرتا ہے کہ شاعرہ کی فکر ابھی "بلوغ و رسیدگی" کی راہ دیکھ رہی ہے، اور اس کشتہ کے اکسیر بننے کے لئے چند آنچوں کی کسر باقی ہے! اوپر کہا جا چکا ہے کہ علامہ اقبال سے وہ بہت زیادہ متاثر ہیں اور اقبال کی تقلید میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے مگر یہ تقلید ہر جگہ نبھ نہیں سکی۔

(صہ ۲۷) نصابِ علم سے قرآں بڑھایا جاتا ہے کلامِ حق پسِ مُردوں پڑھایا جاتا ہے

شاعرہ کہنا یہ چاہتی ہیں کہ نصابِ تعلیم سے قرآن خارج کیا جاتا ہے ـــــ اس کے لئے انہوں نے "بڑھایا جاتا ہے"، استعمال کیا ہے جو کنی اُردو ہے مگر معیاری زبان میں اس طرح نہیں بولا جاتا۔ مصرعہ ثانی بھی بہت سپاٹ اور بے مزہ ہے، یہ "خیال" نہایت پُرزور "اظہار" چاہتا تھا۔

(صفحہ ۳۵) سرِ رشتۂ آب و گل پہ تو سمجھا مدارِ زندگی محرمِ راز کے لئے مرگ ہے زینۂ حیات

"سمجھا" کا الف" اس بُری طرح دبتا ہے کہ شعر پڑھنے میں زبان کو ٹھوکر سی لگتی ہے۔

(صفحہ ۵۲) جو اُٹھ نہ سکا ہرگز ارباب ملائک سے وہ بارِ گراں دیکھو رکھا ہے مرے دل میں

"ارباب ملائک" مہمل ترکیب ہے۔ "اربابِ فلک" کہا جاتا تو کوئی بات بھی ہوتی! دوسرے مصرعہ کی بندش بہت سُست ہے، اور "بارگراں" کے ساتھ "پر" بولا جاتا ہے، "میں" (حرفِ جار) بھلا نہیں لگتا۔

(صفحہ ۵۳) جو طور کا حاصل تھا جو ضرب سے بالا تھا معبودِ کلیم اللہ رہتا ہے مرے دل میں

اس میں "ضرب" کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتا، شاید ضرب سے "ضربِ کلیم" یہاں مُراد ہے مگر پھر بھی مفہوم گنجلک ہی رہا۔

(صفحہ ۵۴) "آمتا رنگ" میں ٹیپ کا بند:۔ جس دیس میں آنی راج نہیں
اس دیس میں چل سنسار کریں

ہر چار مصرعوں کے بعد دُہرایا گیا ہے، اس نظم میں بیباختگی اور روانی پائی جاتی ہے مگر یہ شعر عجیب و غریب ہے! "آنی" سے شاید عارضی (Transitory) مُراد ہے۔ جو یہاں "راج" کے ساتھ بالکل بے جوڑ ہے، اور سامع کا ذہن اس لفظ کو سُن کر بڑی تشویش میں پڑ جاتا ہے ـــــ اور "سنسار کرنا" تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی شاعرہ کہنا یہ چاہتی ہیں کہ:۔ "چلو اُس دیس میں جا کر رہیں اور وہاں بستی بسائیں جہاں عارضی اور فانی نظامِ زندگی اور ناپائدار دستورِ حیات نہ ہو" مگر اس مفہوم کا اظہار جن لفظوں سے کیا گیا ہے، وہ مفہوم کو واضح نہیں کرتے!

ایک تو وہ دَور تھا جب ڈپٹی نذیر احمد، مولٰنا حالی اور علامہ شبلی نعمانی کو "شمس العلما" کا خطاب دیا گیا، اور پھر آخری دَور میں انگریز کی فیاضی کا یہ عالم ہو گیا کہ "خواجہ حسن نظامی" صاحب بھی "شمس العلما" بنا دیئے گئے۔

احمق پھپھوندوی نے برطانوی خطابات کی فہرست شائع ہونے پر بہت خوب کہا تھا:۔

؎ سمجھیں اس کو غنیمت اہلِ وفا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے

بشیر صاحبہ نے "خواجہ صاحب" کے "شمس العلما" بن جانے پر ایک مدحیہ نظم (صفحہ ۷۱، ۷۲) کہی ہے جس کے دو شعر ہیں:

درویش بھی، غنی بھی ہیں، روشن ضمیر بھی تاجر بھی اور طبیب بھی قابل مدیر بھی
مُرشد بھی مجتہد بھی مفکر ادیب بھی خود دار بھی خلیق بھی اور خوش نصیب بھی

خواجہ صاحب یقیناً قابل مدیر ہیں اور تاجر تو بدرجہ اولیٰ ہیں، مگر طبیب بھی ہیں! اس کا پہلی بار انکشاف اس نظم کو پڑھ کر ہوا! غالباً فاسفورس کے تیل" کا اشتہار شاعرہ کی نظر سے گزرا ہوگا ـــــ خواجہ حسن نظامی کو "مجتہد" کہنا مبالغہ کی وہ صفت ہے جو خلافِ واقعہ ہوتی ہے۔

(صفحہ ۱۸۰) اے ادیبِ پاک طینت اے حکیمِ دادرس کتنے موزوں وقت پر تو نے بجایا ہے جرس

"دادرسی" ادیبوں، حکیموں اور دانشوروں کی نہیں بادشاہوں اور حاکموں کی صفت ہے، "حکیم نکتہ رس" کہنا چاہئے تھا! ـــــ صفحہ ۱۸۱، اور ۱۸۲، پر بعض شعروں کے مصرعے بحر سے خارج ہیں، خدا کرے یہ کتابت کی غلطیاں ہوں ہم توقع کرتے ہیں کہ محترمہ بشیر صاحبہ کے آئندہ چھپنے والے مجموعہ ہائے کلام میں اس قسم کی کمزوریاں نہ پائی جائیں گی اور "آبگینہ شعر" میں جو کہیں کہیں بال پڑگئے ہیں "نقش ثانی" میں باقی نہ رہیں گے!

اس کتاب میں شاعرۂ دکن نے اپنے محبوب وطن (دکن) پر بہت سی نظمیں کہی ہیں ـــــ آہ! دکن مرحوم!

اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے! ہائے

ان نظموں میں شہریار دکن، ان کے جشن سیمیں، سالگرہ مبارک" اور شاہزادگان والاتبار کے تذکرے ہیں جن سے خلوص و وفا کی بو آتی ہے، مگر اب یہ حقیقتیں افسانہ بن کر رہ گئی ہیں، انقلاب کی ایک ہی گردش میں بلندیاں کچھ سے کچھ ہوگئیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان حوادث کے بعد بھی فلک کے دل کا غبار پوری طرح نکلا بھی یا نہیں۔

بشیر النساء بیگم بشیر تبریک و ستائش کی مستحق ہیں، کہ ان کی شاعری حدود اخلاق کی پابند ہے اور کسی ایک مصرعہ میں بھی ان کا توسن خیال جادۂ اعتدال سے ایک قدم باہر نہیں گیا! ان کی غزلیں تک پاکیزہ ہیں! جس ہوسناکی کو آج کل "آرٹ" اور "رومان" کہا جا رہا ہے، اس سے بشیر نے اپنا دامن بچانے کی قابل رشک کامیاب کوشش کی ہے ـــــ آج کل تو عورتیں عریاں افسانے لکھ کر چھپوا رہی ہیں اور اس قسم کے شعر ع

کسی کو گود میں اپنی بٹھا کے بیٹھی ہوں

صنف نازک کی زبان سے سن کر غیرت کو پسینہ آجاتا ہے، اس ماحول میں بشیر کی اخلاقی شاعری ایک روشن مینارہ کی حیثیت رکھتی ہے، انہوں نے سچ مچ الحاد و معصیت کے بت کدے میں صداقت و پاکیزگی کی اذان دے کر گونج پیدا کی ہے، اس سعادت اور سلامت روی پر ہم شاعرۂ دکن کو مبارکباد دیتے ہیں، اللہ کرے! دوسری اہل قلم خواتین کو بھی اس سعادت کی توفیق نصیب ہو۔

مطبع عثمانی بھیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

جلد (۱۱)　　نمبر (۱)

ماہنامہ

فاران

جنوری ۱۹۵۵ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی)　　فی پرچہ آٹھ آنے

آٹھ روپے (ہندوستانی)　　فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

کیمبل اسٹریٹ

کراچی

نظم و ترتیب

حصہ نظم

ایک مقام سے دو آدمی روانہ ہوتے ہیں ایک مظلوموں کو ظلم و ستم کے آہنیں پنجہ سے چھڑانے کیلئے اور دوسرا مال لوٹنے کی نیت سے! یہ دونوں اپنے مقصد سے خلوص اور محبت رکھتے ہیں، ان کے ارادے اٹل اور حوصلے انتہائی بلند ہیں، سعی و طلب کا بے پناہ جذبہ ان میں پایا جاتا ہے ان کا سمندِ عزم تیز گام ہی نہیں جری اور بے باک بھی ہے! پہلا آدمی مظلوموں کی حفاظت میں جان سے مارا جاتا ہے، ظالم اور سفاک اُس پر غلبہ پاکر بیچارے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں، اُس کی لاش تک کو بے دردی کے ساتھ روند دیا جاتا ہے —— ظلم قہقہہ لگاتا ہے، فاتحانہ قہقہہ —— !

دوسرا شخص دو تین آدمیوں کو زخمی کرکے اور ایک راہگیر کو ٹھکانے لگاکر اپنی قیامگاہ کو واپس آتا ہے، اشرفیوں کی تھیلیاں اُس کے ساتھ ہیں، فتح کے نشہ میں چور ہے، اس کے پاؤں اتراتے اتراتے اور لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے پڑ رہے ہیں، ——————

ان دونوں میں کامیابی کسے نصیب ہوئی! —— دوسرے آدمی کو —— یہ جواب اگر ٹھیک ہے تو پھر دنیا کے سب سے زیادہ کامیاب انسان یزید، نیرو، حجاج اور چنگیز ہی ہوسکتے ہیں، تحسین و ستائش کے تمام سپاسنامے انہی کی بارگاہوں میں پیش ہونے چاہئیں، ضرورت ہے کہ ان کے مجسموں سے زمین کو جگمگا دیا جائے، اور اُن کے نام کے خطبے پڑھے جائیں۔

مگر . . . . . .

واقعات اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں، حقیقت اس جواب کی تردید کرتی ہے، ہر شخص کا دل بول اُٹھتا ہے کہ میرے اندر ان ظالموں اور جفاکاروں کے لئے ذرا سی بھی گنجایش نہیں ہے، ان رسوائے عالم شخصیتوں کا نام سنتے ہی نفرت کا طوفان سینوں میں ہچکولے لینے لگتا ہے ——— یہ وہ نفسیاتی کیفیت اور واقعیت ہے کہ جو اپنے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی محتاج نہیں ——— بالکل اس طرح جس طرح آگ اپنی ذات سے گرمی کا اور سورج اپنے وجود سے روشنی کا ثبوت ہے۔

تاریخ میں ظالموں اور جفاکاروں کے لئے نفرت اور بیزاری کے لفظ لکھے ہوئے ملتے ہیں، قبولِ عام اور حقیقی قدر و منزلت کی ایک رمق بھی اُن کے حصہ میں نہ آسکی، اُن کی شہرت کے ستاروں کو لعنتوں کی سیاہی نے دُھندلا دیا اور اُن کا نام آتے ہی آج بھی طبیعتیں مکدّر ہو جاتی ہیں ——— بخیل سے بخیل آدمی بھی اپنے کو "قارون" کہلوانا پسند نہیں کرتا، اور ظالم سے ظالم آدمی کو بھی چنگیز اور ہلاکو سے نسبت گوارا نہیں، بخیل چاہتے ہیں کہ انہیں "حاتمِ زمانہ" اور ظالموں کی تمنا ہوتی ہے کہ اُن کو "نوشیروانِ وقت" کہا جائے ———

اس دیباچہ کا ماحصل اور اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ افادیت، اہمیت، اور بلندی حصولِ مقصد کی تیز گامی، طلب کی گرمی اور عزم کی استقامت میں نہیں بلکہ "مقصد کی نیکی" میں ہے، اگر مقصد پاکیزہ اور نیک ہے تو اس کے حصول کی کوشش کا پورا سلسلہ نیک اور مقدس ہے اور اگر مقصد بُرا اور ناپاک ہے تو اس کے حاصل کرنے کی جد و جہد کا سارا ہنگامہ غلط اور ناپاک ہے ——— کسی کو راستہ میں رواں دواں دیکھ کر اس کی تیز گامی سے دھوکا نہ کھانا چاہئے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ قدم آخر کس منزل کی طرف اُٹھ رہے ہیں! جو نگاہ کسی کی تیز گامی میں اُلجھ کر رہ گئی، وہ کسی صحیح فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتی، ہر اُڑنے والا بگولا اور ہر بہنے والا دھارا اُسے اپنی طرف کھینچ سکتا ہے، چاہے یہ طوفان کسی غریب کی جھونپڑی ہی کو کیوں نہ بہا کر لئے جا رہا ہو!

سورج کی آنکھ نے مجاہدوں اور سچائی کی راہ میں دوڑ دھوپ کرنے والوں کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ تیز رو، ڈاکوؤں اور لٹیروں کو دیکھا ہے، سرفروش، مجاہد اور جاں باز حق شناس ہی نہیں سفاک قاتل بھی پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے مسکرائے ہیں۔

حضرت علیؓ اسلام کے جتنے مخلص تھے، ابوجہل کو بھی کفر کے ساتھ اس سے کم خلوص نہ تھا، بدر کے میدان میں اس نے اپنے مقصد کی حفاظت اور حصول کے لئے کسی مجاہد صحابی سے کم جرأت و بے باکی کا ثبوت نہیں دیا، وہ آخر وقت تک لات و ہبل کی جے پکارتا رہا اور مرتے دم تک اپنے اصول پر قائم رہا ——— تو کیا صرف خلوص، جوش اور عزم و ہمت کی بنا پر قریش کے سردار ابوجہل اور علی شیرِ خدا کو (معاذ اللہ) شخصیت و ناموری کا ایک ہی مقام دیا جائے! نہیں یہ نہیں ہو سکتا، اس قسم کا تصوّر بھی فراست و دانائی کی کھلی ہوئی توہین ہے، حضرت مولا علیؓ اور ابوجہل کے مقاصد جُدا جُدا تھے، ان کے راستے الگ الگ تھے، اور اُن کی جد و جہد اور سرفروشی کا مقصود و منتہا ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد تھا ——— جد و جہد اور کشمکش حیات کی راہ میں اعتبار سعی و طلب کی گرمجوشی کا نہیں بلکہ "منزلِ مقصود" کا ہے۔

جو لوگ منزلِ مقصود سے بے پروا ہو کر چلنے والوں کے قدموں کے زیر و بم کو دیکھتے ہیں، سعی و طلب اور سفر و رہروی کے بارے میں اُن کے فیصلے اکثر نادرست اور غیر منصفانہ ہوتے ہیں، ایک سفاک کسی مظلوم کی ناحق گردن کاٹ رہا ہے تو اگر کوئی آنکھوں

کا اندھا اور دل کا گندا قاتل کے ہاتھ کی صفائی اور تلوار کی تیزی کو سراہنے لگے اور جس ناپاک غرض کے لئے دستِ قاتل کی مہارت اور تلوار کی روانی صرف ہو رہی ہے اس سے بے پروا ہو جائے ـــــــ تو اس کے اِس رویّہ کو سفاکانہ ہی کہا جائے گا۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ فعل و قوت کس غرض کے لئے استعمال ہو رہی ہے، غرض نیک ہے تو اس راہ میں جو سعی بھی کی جائے گی، اپنی جگہ نیک ہوگی ـــــــ چاہے کوشش کی رفتار کتنی دھیمی ہی کیوں نہ ہو! اور اگر غرض ناپاک ہے تو اس منزل کی ہر تگ و دو کو ناپاک ہی کہا جائے گا ـــــــ خواہ اس میں کتنا ہی جوش اور گرما گرمی کیوں نہ پائی جائے۔

دیکھنا کیا چاہیے؟

کسی کام کی جد و جہد کی تمام نوعیتوں کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے، کسی کام تحریک، جماعت، گروہ اور ادارے کا ڈسپلن اور تنظیم بھی اس کام کی افادیت کی ضامن نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ خود "کام" نیک اور مفید نہ ہو، محکمہ سراغرسانی کی رپورٹیں اور وقائع شاہد ہیں کہ ڈاکوؤں کی ٹولیوں میں غیر معمولی تنظیم اور ڈسپلن پایا جاتا ہے، اپنے سردار کے حکم سے وہ ذرہ برابر سرتابی نہیں کرتے اور لوٹے ہوئے مال کو پوری دیانت اور امانت کے ساتھ سردار کے سامنے لاکر رکھ دیتے ہیں، اُن میں رازداری کا بھی جوہر ہوتا ہے، اور سرفروشی کا تو یہ عالم ہے کہ برستی ہوئی گولیوں میں اس اطمینان کے ساتھ بڑھے چلے جاتے ہیں جیسے ساون کی پھواروں میں مشقِ خرام ہو رہا ہے ـــــــ تو کیا ان کی اس تنظیم، سرفروشانہ جد و جہد اور ڈکیتی کی مہارت کے سبب ڈاکہ کے فن کو شریف اور مفید، اور ڈاکوؤں کو معزز سمجھ لیا جائے۔

ہٹلر کی فوج دلیری، سرفروشی اور جیوٹ ہونے میں اپنی آپ نظیر تھی، المانوی سپاہیوں نے جرأت و بیباکی میں نپولین کی فوج کے کارناموں پر پانی پھیر دیا، یہ ایسے واقعات ہیں جن کی سیاہی بھی ابھی کاغذ پر خشک نہیں ہوئی، اس لئے ان کو مبالغہ آمیز بھی نہیں کہا جا سکتا، ہزاروں فیٹ کی بلندی سے کپڑے کی چھتریوں کے سہارے کود پڑنا کوئی معمولی بات تھی ـــــــ جرمن سپاہی سچ مچ موت سے کھیلے ہیں ـــــــ مگر چونکہ ان کا مقصد پاکیزہ اور نیک نہ تھا اس لئے چشمِ حق شناس میں یہ سرفروشیاں، قربانیاں اور جاں بازیاں ذرہ برابر وقعت نہیں رکھتیں۔

یہ بڑی ہی کم نظری، کوتہ اندیشی، ذہن و فکر کی بے مائگی اور غلط مرعوبیت ہے کہ کسی گروہ، جماعت، ادارے، اور پارٹی کی عملی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس پارٹی کے کام کرنے والوں میں غیر معمولی جوش اور خلوص پایا جاتا ہے اس لئے ان کا مقصد بھی مفید اور نیک ہوگا ـــــــ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے اس نظریہ کی کمزوری اور غلطی ثابت کی جا چکی ہے ـــــــ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اس غلط اندیشی میں ایک دُنیا مبتلا ہے، کوئی اشتراکیوں کے جوش، عزم، اور تنظیم و ایثار کو دیکھ کر اُن کے نظام سے مرعوب ہے، کوئی امریکہ اور انگلستان کی ترقیوں اور وہاں کے بسنے والوں کے ڈسپلن اور باقاعدگی سے متاثر ہو کر ان کی طرف مائل ہے ـــــــ اور وہ تو بخت و اتفاق کی بات تھی کہ جرمنی اور جاپان ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئے، ورنہ جب ان مُلکوں کا ستارہ عروج پر تھا اور دُنیا میں ان کا طوطی بول رہا تھا تو لوگ ان کی خدائی کا کلمہ پڑھنے تھے۔

یہی وہ پست ذہنیت ہے جو حق و باطل میں تمیز نہیں ہونے دیتی، ذرا کوئی طاقت اُبھرتی ہوئی دکھائی دی، اور لوگ سمجھنے لگے کہ سماج کی بھلائی بس اسی سے وابستہ ہے، وہ طاقت کسی اپنی داخلی کمزوری کے سبب فنا ہوئی اور اُس کی جگہ دوسری قوت منظرِ عام پر آگئی تو لوگ اب اس کے ساتھ ہولئے ـــــــ یوں سمجھئے کہ لوگوں کو کسی "مقصد" سے لگاؤ، عقیدت، وابستگی

اور محبت نہیں ہوتی وہ تو ہر چلنے والی تحریک کے پجاری ہوتے ہیں، نیکی و بدی اور سود و زیاں کا معیار ان کی نگاہ میں بس کسی "تحریک کا چل جانا" ہوتا ہے ــــ اور یہ سب جانتے ہیں کہ اس دنیا میں جھوٹ کو بھی فروغ ہو جاتا ہے، برائی بھی پھلتی پھولتی ہے، بناوٹ کو بھی لفٹ (.lift) مل جاتی ہے اور جعلی سکے بھی بازار میں چل نکلتے ہیں ــــ تو یہ پست "ابن الوقت" قسم کی ذہنیت انسانوں کی غلامی کے چکر سے نہیں نکل پاتی، سوسائٹی کولھو کے بیل کی طرح اسی دائرے میں گھومتی رہتی ہے، یہاں تک کہ آدمی اپنے ہی جیسے انسانوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے، اور اس کی فکر اور قوتِ عمل میں نہ تو پرواز کی طاقت رہتی ہے اور نہ بڑھنے کا حوصلہ!

زندگی کے بنیادی مسائل اور فطری تقاضوں کو لوگوں کی چلائی ہوئی تحریکوں اور بنائے ہوئے قوانین سے وابستہ کر دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ "زندگی" بچوں کا کھیل بن کر رہ گئی ہے، جو نئی تحریک بھی ابھرتی نظر آتی ہے لوگ سمجھتے ہیں یہ زمانہ کی آواز اور زندگی کی ترجمان ہے ــــ اور یہ بناوٹی آوازیں اور جھوٹی ترجمانیاں بہت بہت جلد ادلتی بدلتی رہتی ہیں یہاں تک کہ زندگی کا کوئی یقینی خاکہ نہیں بن پاتا، پوری انسانی معاشرت عجب دُگدا کی حالت میں ہے کہ کس کا ساتھ دے، کس کا ساتھ نہ دے اور نہ جانے کب کاروانِ زندگی کا رُخ ایکا ایکی بدل جائے۔ یہی بے یقینی اور عدم اعتماد کی کیفیت ہے، جس نے فکر و خیال کو ڈانواڈول کر رکھا ہے اور سماج میں پراگندگی اور انتشار کے آثار نمایاں ہیں۔

سماج کی ناہمواری، معاشرت کا بحران اور سوسائٹی کی افراتفری اسی وقت دور ہو سکتی ہے جب کہ تمام انسانیت اختلافِ نسل و رنگ کے باوجود وحدتِ فکر سے وابستہ ہو، فکر و تصور میں یکرنگی ہوگی تو معاشرہ لازمی طور پر ہموار اور متوازن ہوگا۔۔۔ مگر یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جبکہ فکر خود اپنی جگہ صالح ہو اور فساد و تخریب کا شائبہ بھی اس میں نہ پایا جائے۔

انسان کو بلاشبہ غیر معمولی طاقتیں اور توانائیاں ودیعت کی گئی ہیں مگر ان توانائیوں کے باوجود وہ ایک محدود وسعتِ فکر و عمل رکھتا ہے، مستقبل کے کہرے میں اس کی نگاہ بہت دور تک نہیں دیکھ سکتی، حوادث اور واقعات کے ظہور اور عدم ظہور پر اسے دسترس نہیں ہے، اس کے ارادے ٹوٹتے رہتے ہیں اور اس کے تجربوں کو یقین و قطعیت حاصل نہیں ہے، کبھی کامیاب کبھی ناکام! وہ انسان جس کے بنائے ہوئے جہاز سمندروں کے سینے چیر سکتے ہیں ایک ذرا سے گھونگے اور چھوٹی سی سیپی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں ہے، وہ خود اپنی تدبیر سے اپنے جسم پر ایک بال بھی نہیں اگا سکتا، روزانہ کی زندگی اور روزمرہ کے کاموں میں بھی اس سے بھول چوک ہوتی رہتی ہے ــــ ظاہر ہے یہ "صفات" جس شخصیت میں پائی جاتی ہوں، وہ خود اپنی رہنما نہیں ہو سکتی اور انسانیت کی قیادت کی زمام اس کو نہیں سونپی جا سکتی ــــ جب تک اپنے سے بلند تر ہستی کی ہدایت اسے حاصل نہ ہو، اور وہ "بلند تر" ہستی چاند، سورج، اور ستاروں کی بھی نہیں ہو سکتی کہ جو اس قدر بلندی اور روشنی کے باوجود انسان کے مقابلہ میں بہت زیادہ مجبور ہیں ــــ "ہدایت" کا سرچشمہ یقیناً خالق رب السموٰت والارض ہی کی ذات ہے، "وہ خدا" جس نے انسان کو پیدا کیا اور جذبات، محسوسات، تصورات اور فکر و ذہن کی صلاحیتیں عطا فرمائیں، جس نے آدمی کی جبلت اور سرشت کو خلق فرمایا، جو جانتا ہے کہ آدمی کی صلاحیتیں کن حدود میں رہ کر ترقی کر سکتی ہیں اور اس کی "خودی" کے ابھرنے کے لئے کس قسم کے حالات کی سازگاری ضروری ہے۔

اسلام اسی وحدتِ فکر کا مظہر ہے ــــ اور "فکر" سے مراد بیٹھے ہوئے سوچتے رہنا اور تدبیروں کے ہوائی قلعے بنانا نہیں ہے، اسلامی وحدتِ فکر میں "عمل" (action) لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے دائرے

میں رکوع وسجود، تکبیر وتہلیل کے ساتھ کسبِ معیشت بھی شامل ہے، مخلوق کی خدمت اور غمگساری بھی عبادت ہے، اسی لئے تو "الخلق عیال اللہ" (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کہا گیا ہے۔

انسانی معاشرت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے ـــــ پچھلی بھی اور آج کی تاریخ بھی! کچھ لوگوں پر عبادت اور خدارسی کا اتنا شدید غلبہ ہوا کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کو انہوں نے اپنا مقصودِ حیات بنا لیا، دنیا اور اس کے رہنے والوں سے رابطہ اور تعلق رکھنے کو انہوں نے بندگی کے راستہ کا "سنگِ گراں" سمجھا اور وہ سوزِ دل جسے مخلوق کی غمخواری میں صرف ہونا چاہئے تھا اسے روحانیت کے برف خانہ میں دبا کر بے روح بنا دیا ـــــ دوسرے گروہ نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھا اور دنیا کی لذتوں اور عیش سامانیوں پر اس قدر مائل ہوا کہ زندگی کے ہنگاموں میں خالقِ کائنات کو بھلا دیا گیا، دانستہ بھی اور نادانستہ بھی! اسلام ان دونوں انتہاؤں کے درمیان جادۂ اعتدال، خطِ متوازن اور نقطۂ وسطی کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں "حق اللہ" اور "حق العباد" کے وہ تمام داعیات اور محرکات موجود ہیں جن کے سہارے انسانی زندگی زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکتی ہے۔

اسلام ہر طرح مکمل ہے

اب ہم اوپر کہی ہوئی بات کی طرف پھر لوٹتے ہیں ـــــ یہ کہ اس چیز سے مرعوب ہونا بڑی خطرناک اور گمراہ کن غلطی ہے کہ فلاں تحریک کیونکہ آج کی دنیا میں بڑے زور شور کے ساتھ چل رہی ہے اس لئے اُس کی ہمنوائی ضروری ہے، مکتبہ ہائے خیال، اداروں، تحریکوں اور مذہبوں کو پہلے اچھی طرح پرکھ لینا چاہئے کہ ان میں کون انسانی معاشرت کے لئے مفید ترین ہے اور کس کے عناصر اور اجزا صالح، پاکیزہ، اور بہتر ہیں ـــــ صرف کسی تحریک کا "چل جانا" اس کی افادیت کا سبب نہیں ہو سکتا ـــــ دنیا میں جھوٹ کا رواج عام ہو جائے اور ایک زبان بھی سچ بولنے والی نہ رہے تو کیا جھوٹ کے چل جانے پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ "سچائی" ایک بے وزن اور بے حقیقت چیز ہے! اگر کسی شفاخانہ میں مریض زہر گھول گھول کر پی رہے ہوں اور زہر کی شیشیوں کی ہر طرف مانگ ہو تو کیا آبِ حیات اور تریاق کی افادیت کو صرف اس لئے رائگاں سمجھ لیا جائے کہ آبِ حیات اور تریاق کی مانگ اور چلن نہیں ہے۔

بس جن لوگوں نے "اسلام" کو حق سمجھ کر قبول کیا ہے اُن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی سربلندی اور اشاعت کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں، اسلام اپنی جگہ خود ایک کامل اور مکمل نظام ہے، اس میں کسی دوسرے دستور اور نظامِ زندگی کی آمیزش گوارا نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح یہ آبِ حیات گدلا اور مکدر ہو جائے گا ـــــ "مکمل" اور "کامل" کہتے ہی اس کو ہیں جس میں کسی اضافہ کی گنجائش اور ترمیم کی ضرورت نہ ہو، اگر کوئی چیز "اضافہ" کی محتاج ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنی ذات سے ناقص اور ادھوری ہے ـــــ حالانکہ دینِ اسلام مکمل کیا جا چکا، اور تمام نعمتوں کا اتمام ہو چکا، دین اور دنیا کی جتنی بھی نعمتیں، مسرتیں اور بھلائیاں ہیں وہ سب کی سب اسلام میں موجود ہیں ـــــ کسی چلتے ہوئے نظامِ معیشت وسیاست کو "اسلام" ثابت کرنے کی کوشش کرنا اسلام کی توہین اور اس کے "کامل" ہونے کی نفی ہے ـــــ اور دنیا میں تو آئے دن نظام، دستور، قانون اور تحریکیں پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں اس صورت میں اسلام کے قامتِ موزوں پر آخر کس کس پیراہن کو منڈھا جائے گا اور اس سلسلۂ عمل کے بعد خود اسلام کی ہیئت کیا رہ جائے گی؟

کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں "اسلام" کی طرف لوگوں کا اگلا سا رجحان نہیں ہے! زمانہ کے انقلاب نے اخلاق وتہذیب کی پچھلی قدروں کو بدل دیا ہے ـــــ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے، یہ غور کرنا ہے کہ اسلام انسانیت کے لئے مفید ہے بھی یا نہیں: اگر "اسلام" انسانیت اور انسانوں کے لئے مفید ہے تو پھر لوگوں کا اس کی طرف رجحان نہ ہونا اسلام کی کمزوری نہیں

بلکہ خود لوگوں کی کمزوری، غلط اندیشی اور کم نظری کی دلیل ہے ــــ بات یہ ہے کہ آجکل قریب قریب تمام انسانی معاشرہ بداخلاقی کا مریض ہے اور مریض کا خاصہ ہے کہ وہ دوا اور پرہیز دونوں سے جی چُراتا ہے مگر مریض کے اس جی چرانے سے دوا کی افادیت پر تو حرف نہیں آسکتا، ایک نسخہ جس کے اجزاء صالح اور صحت بخش ہیں، اگر مریضوں کی غفلت کے سبب دس ہزار سال تک بھی استعمال میں نہ آسکے تو بھی نسخہ کی افادیت اپنی جگہ جُوں کی تُوں رہے گی۔

فاسق، فاجر، بدکار، بددیانت، خیانت کرنے والے، بادشاہ، جاگیردار، اور سرمایہ دار ہی نہیں خود "مزدوروں کے غمخوار" بھی اسلام سے کتراتے ہیں اور وہ اس لئے کہ معیشت میں حقوق کی عادلانہ تقسیم کے بعد اسلام کچھ اخلاقی پابندیاں بھی عائد کرتا ہے اور ان لوگوں کا ذوقِ ہوس اخلاقی پابندیوں کو گوارا نہیں کرسکتا، پس اسلام سے دُوری، بیگانگی اور بیزاری خود دُنیا والوں کی اپنی داخلی اور طبعی کمزوریوں کا سبب ہے، کوئی نجس اور گرد آلود شخص اپنی فطری نجاست اور خباثت کے سبب پاک ہونا ہی نہ چاہے تو پانی خود بڑھ کر تو اُس کے ہاتھ مُنہ دُھلانے سے رہا اور اس کے یہ معنیٰ بھی نہیں ہو سکتے کہ پانی اپنی فطرت سے فعال (active) نہیں ہے۔

ہمارا فرض

مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت "کچھ نہ کرنے" کے لئے سدا سے بہانے ڈھونڈتی اور حیلے تراشتی آئی ہے ـــــ یہ کہ اشاعتِ حق کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں، وقت کا دھارا کسی اور رُخ پہ بہ رہا ہے، نقار خانہ میں طوطی کی آواز چاہے کتنی ہی پُرسوز اور دلگداز کیوں نہ ہو سُنی نہیں جائے گی ـــــ یہ مصلحت شناسی رفتہ رفتہ قوتِ عمل کو بے حسی کی نیند سُلا دیتی ہے یہاں تک کہ یہ "خوابِ گراں" "خوابِ شیریں" بن جاتا ہے۔

اگر یہی "زمانہ ساز" ذہنیت سدا کارفرما رہتی تو پھر دُنیا کسی انقلاب ہی سے آشنا نہ ہوتی، بُرائیاں بڑھتی اور پھیلتی رہتیں، مفسدوں اور ظالموں کی اصلاح کے لئے کوئی اقدام ہی نہ کیا جاتا، ـــــ جب طاعون اور ہیضہ کا زور ہوتا ہے تو کیا ڈاکٹر اور طبیب ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دوا دارو کے لئے فضا سازگار نہیں ہے، جب وبا کا زور کم ہوگا اُس وقت علاج کی تدبیریں کریں گے ــــ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ بیماری اور وبا کی جتنی شدت ہوتی ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ سرگرمی، تیزی اور قوت کے ساتھ مرض کے ازالہ کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔

انتہائی ناسازگار فضا اور نامساعد حالات ہی میں اصلاح و انقلاب کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے، کسی گھر میں آگ لگتی ہے تو دردمند اور غمخوار آگ بجھانے کے لئے مینہ برسنے کا انتظار نہیں کرتے، جو جس کے بس میں ہوتا ہے اُس کے کرنے سے دریغ نہیں کرتا، کوئی دو چار چُلّو پانی ہی شعلوں کی طرف پھینک دیتا ہے۔

نتیجہ کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، ہمارا کام تو آوازِ حق کا بلند کرنا ہے اگر ہماری کوشش کے بغیر ہی حق پھیل گیا اور باطل کو شکست ہوگئی تو بھی ہمیں اپنی غفلت کی جوابدہی کرنی ہوگی، اور ہماری سعی امکانی کے باوجود سچائی کی اشاعت کم اور اس کا اثر و نفوذ اور محدود ہوگیا، تو ہم کامیاب سمجھے جائیں گے کہ ہم نے تو اپنا فرض ادا کردیا، "مشیتِ تکوینی" کے تقاضوں کو بدل دینا ہمارا کام نہیں ہے نہ اُس کے لئے ہم مکلف ہیں، اور نہ اُس کی ہم سے بازپُرس ہوگی۔ اشاعتِ حق کی جو ذمہ داری ہمیں سونپی گئی ہے، اس کو پورا کرتے رہنا ہمارا فرض ہے، اس فرض میں کوتاہی ہوئی تو ہمیں اس کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔

ناکامی اور کامیابی پر ہمیں دسترس نہیں ہے مگر ہاں! سعی و تدبیر کی ہمیں توفیق بخشی گئی ہے اس سے غافل نہ رہنا

چاہئے ـــــــ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ سچائی بہت دن تک مظلوم نہیں رہ سکتی، اُبھرنا اور چھا جانا حق کی فطرت ہے، جو "اسلام" مکہ میں مظلوم اور مجبور تھا وہ "مدینہ" میں پہونچ کر غالب اور فتحمند ہوا، حق ناشناسوں کے طمانچے اور ٹھوکریں کھانے والوں نے بدر میں کفر کو شکست دی اور خیبر کے دروازے کھول دئے، قریش کے چھوکرے جن کے پیچھے تالیاں بجاتے تھے اور جن کی ٹوپیاں اچھالتے تھے انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کو روند ڈالا اور دُنیا میں بس وہ ہی وہ نظر آتے تھے۔

ماسکو سے چاہے سُرخ آندھیاں آرہی ہوں، لندن سے کوئی نیلا طوفان اُٹھ رہا ہو، یا واشنگٹن سے سفید زلزلے آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہوں ـــــــ ہمیں ان سے مرعوب نہ ہونا چاہئے، ہمارا یہی کام ہے کہ ان طوفانوں میں بھی اللہ کی رسّی کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھامے رہیں اور آندھیوں میں بھی سچائی کے چراغ کو روشن رکھیں، بہت سے بہت یہ ہوگا کہ ہم اس کوشش میں مٹ جائیں گے مگر یہ تو بہت بڑی کامیابی ہوگی، خدا کے راستہ میں موت ہر کسی کو کہاں میسّر آتی ہے

ع یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

آج جتنے نظام دُنیا میں کارفرما ہیں یہ سب تجربہ کے دَور سے گزر رہے ہیں اور "اسلام" آزمایا جا چکا ہے، ایک آزمائے اور تجربہ کئے ہوئے کامیاب ترین نظام کو چھوڑ کر ہم ان نظاموں کی طرف کیوں دیکھیں جو تجربہ کی بھٹی میں ابھی تک تپائے جا رہے ہیں "کامل" کو چھوڑ کر ادھورے اور "نارسیدہ" کی سمت دوڑنا خطرناک قسم کی حماقت ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ حالات ادلتے بدلتے رہتے ہیں، زمانہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا، حوادث کا روکنا بھی دشوار ہے ـــــــ مگر ہم نے جس چیز کو حق سمجھ کر قبول کیا ہے، اس کی اشاعت ہمارا فرض ہے، صدیقؓ و علیؓ کی خلافت ہو تو "تعاون" سے اور 'یزید' و 'حجاج' کی حکومت ہو تو "بغاوت" اور "سعیٔ اصلاح" کے ساتھ تبلیغِ صداقت اور قیامِ حق کا فرض ہمیں ادا کرنا ہے ـــــــ میں نے اوپر کہا تھا کہ حوادث دُنیا میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں ـــــــ مگر آسمان سے بجلی گرے تو ہم شراب ہی پیتے ہوئے کیوں ہوں، نماز کی حالت میں کیوں نہ ہوں، موت سوادِ کُنشت کی بجائے دیوارِ حرم کے سایہ میں کیوں نہ آئے؟

ہماری منزل ہی نہیں مقصد بھی متعین ہے، کاروانِ حیات کہاں کہاں سے گزرے گا اس کے لئے خطوط بھی کھینچ دئے گئے ہیں، "میرِ کارواں" کا "اُسوۂ حسنہ" رہنمائی اور قیادت کا چراغ دکھا رہا ہے ـــــــ بس اب ہمیں کسی نئی منزل کی تلاش کی ضرورت نہیں رہی، اور یہ بھی ہمارا کام نہیں ہے کہ دوسری پگڈنڈیوں (Short Cuts) کو "صراطِ مستقیم" سے ملانے کی سعی کریں یہ ہمارے اصول اور مقصد کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔

ماہر القادری

کراچی ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء

الحاج پروفیسر یوسف سلیم چشتی (دہلوی)

عربوں کی تہذیب اور شاعری زمانۂ جاہلیت میں

> آبگینے .... اور چٹانیں بھی! شعلہ و شبنم کی یکجائی! فاضل مقالہ نگار نے سنگِ خارا تراش تراش کر صورتیں بنائی ہیں اور ایک ایک ہیرے کے لئے نہ جانے کتنے پہاڑوں کے جگر چیرے ہیں ——— "م"

عرب میں ظہورِ اسلام سے پہلے کا زمانہ ہماری ادبیات میں دورِ جاہلیۃ کے نام سے مشہور ہے، اس لئے کہ قرآن حکیم نے اس کی طرف اسی لفظ سے اشارہ کیا ہے، اور یہ لفظ کتاب اللہ العزیز میں چار مقامات پر استعمال ہوا ہے:-

(ا) وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ط (آل عمران ع ۱۶ آیت ۱۵۳)

اور بعض منافق تھے جنکو اس وقت بھی اپنی جانوں کی پڑی تھی، اللہ تعالیٰ کی جناب میں ناحق ناروا جاہلیت کے وقت کی سی بدگمانیاں کر رہے تھے۔

(ب) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؟ (المائدہ ع ۷ آیت ۵۰)

(اور بیشک بہت سے لوگ البتہ نافرمان ہیں) کیا یہ لوگ اس وقت میں بھی زمانۂ جاہلیت کا سا حکم (طور طریقہ) چاہتے ہیں؟ (اور جو لوگ مومن ہیں ان کے لئے اللہ سے بہتر حکم دینے والا اور کون ہو سکتا ہے)

(ج) وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (سورۃ احزاب، ع ۴، آیت ۳۳) اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو۔

(د) اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاہِلِیَّۃِ (سورہ فتح ع ۳ آیت ۲۶) (یہ اس وقت کا ذکر ہے) جب کافروں نے اپنے دل میں ضد ٹھان لی اور ضد بھی زمانۂ جاہلیت کی سی ضد۔

میں نے یہ چاروں آیات اس لئے نقل کر دی ہیں کہ ان کے معانی پر تدبر کرنے سے ناظرین کو جاہلیّۃ کے قرآنی مفہوم سے بخوبی واقفیت ہو سکتی ہے، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ شیوع اسلام سے پہلے عربوں کو اللہ کی ذات وصفات کا صحیح علم حاصل نہ تھا اور وہ غلط عقائد میں گرفتار تھے۔

(ب) اُس زمانہ میں، ان لوگوں میں کوئی معقول ضابطۂ حیات رائج نہ تھا، بلکہ سارا ملک بدنظمی اور انتشار کی حالت میں مبتلا تھا۔

(ج) عورتیں فحاشی اور عریانی کی لعنت میں گرفتار تھیں۔

تبرّج کے معنیٰ ہیں عورت کا بناؤ سنگار کر کے اس غرض سے باہر نکلنا کہ غیر مرد اس کے جسمانی حسن وجمال کو دیکھ کر اس کی طرف مائل ہو۔

(د) اس زمانہ میں عرب کے لوگ معقولیت پسند نہیں تھے، یعنی اپنے مزعومات باطلہ کے مقابلہ میں حق وصداقت کی پروا نہیں کرتے تھے۔

غور سے دیکھئے تو اللہ تعالیٰ نے ان چار لفظوں میں ـــــ ظن جاہلیت، حکم جاہلیت، تبرّج جاہلیت اور حمیّۃ جاہلیت ـــــ ظہور اسلام سے پہلے، عربوں کی معاشرت اور قومی سیرت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے چونکہ ان آیات کی تشریح اس وقت میرے موضوع میں داخل نہیں ہے اس لئے صرف اس فقرہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ چار لفظوں میں جاہلیت کے زمانہ کی تصویر کھینچ دینا قرآن حکیم کا وہ اعجاز ہے جس کی تحسین بھی حدِ بشری سے خارج ہے۔ بلاغت کا اس سے بڑھ کر کمال، تصوّر میں نہیں آسکتا۔

اس تاریک زمانہ کو مورخوں نے عموماً دو حصوں میں منقسم کیا ہے جاہلیتِ اولیٰ (جس کی طرف قرآن مجید نے تبرّج والی آیت میں اشارہ کیا ہے) اور جاہلیتِ ثانیہ۔

عـلہ پاکستان کے مسلمان اگر ان آیات پر غور کریں گے تو انہیں بڑی ندامت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ چاروں عیوب جو دورِ جاہلیت کے عربوں کی امتیازی خصوصیات تھے، آج ان میں بھی موجود ہیں۔ وہی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق غلط خیالات، وہی بدنظمی اور انتشار، وہی عورتوں کا شوقِ عُریانی، اور مینا بازاروں کی طرف میلان، اور وہی جاہلیت کی سی ناحق کوشی اور قبولِ حق سے اعراض!

کاش! ہماری حکومت کے ذمہ دار ارکان اس حقیقت کا احساس کر سکیں کہ پاکستان کا استحکام اور استقلال، اسلامی سیرت کی تشکیل میں مضمر ہے، نہ کہ ان سطحی نمائشی باتوں میں جن کی طرف توجہ کی جارہی ہے ـــــ!

چونکہ جاہلیتِ اولیٰ کے زمانہ کی عربی زبان مدون نہیں ہو سکی اس لئے یہ دَور ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ جاہلیتِ ثانیہ کا دَور سنہ ۵۰۰ء سے شروع ہو کر ظہور اسلام پر ختم ہوتا ہے۔ اگرچہ مذہبی اور اخلاقی زاویۂ نگاہ سے یہ بدترین تاریکی اور جہالت کا دور ہے، لیکن شعر و شاعری کے لحاظ سے بہت مشہور ہے اور ہم اسی دَور کی کچھ کیفیت اس مضمون میں ہدیۂ ناظرین کرنی چاہتے ہیں۔

واضح ہو کہ قدیم زمانہ (دورِ جاہلیت) میں عرب میں بہترین شاعر پیدا ہوئے اس دَور کی نظمیں اور قصیدے عربی لٹریچر کا گرانقدر سرمایہ ہے، ہمارے پاس قدیم عربی شاعری کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ اسی دَور کی پیداوار ہے اور اگرچہ یہ زمانہ بہت مختصر تھا یعنی سوا سو ۱۲۵ سال، لیکن اس زمانہ کی شاعری کا اثر آج بھی عربی ادب میں نمایاں ہے۔

اسی زمانہ میں وہ شاعری پیدا ہوئی جو تمام عربی بولنے والوں کی نظر میں، عربی ادبیات کا گنج گرانمایہ ہے۔ اسی زمانہ کی شاعری سے ہم کو عربوں کی سیرت اور معاشرت کا حال معلوم ہوتا ہے۔

دَورِ جاہلیت میں شاعری کے علاوہ اور کئی علوم بھی موجود تھے، مثلاً علم کہانت و عرافت، علم قیافہ و فراست، تعبیر خواب، علم نجوم، علم توقیت، علم الاصنام، علم طب (چنانچہ عربی میں یہ مقولہ آج بھی معروف ہے آخرُ الدوا الکیُّ) علم بیطاری، علم لغت و امثال، علم الانساب، وغیرہ وغیرہ، لیکن جو اہمیت شعر و شاعری کو حاصل ہے وہ کسی اور علم کو حاصل نہیں ہے۔

عربی شاعری فصاحت و بلاغت میں، اور جذباتِ انسانی کی تصویر کشی میں بے مثال ہے۔ شاعری عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ نہایت قوی الاحساس، زکی الحس اور تیز فہم تھے۔ اور ان کی خوش نصیبی سے عربی زبان شعر و شاعری کے لئے بہت موزوں ہے کیونکہ سلاست، روانی، فصاحت و بلاغت، کثرتِ مرادفات، عربی زبان کی خصوصیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہم تک صرف سوا سو سال کا کلام پہونچا ہے، لیکن اس کی تعداد بھی اتنی ہے کہ یورپ کی کوئی قوم اس کے مقابلہ میں اس قدر ذخیرہ پیش نہیں کر سکتی۔

ابو تمام، حماد، اصمعی اور ابو منضم جو عربی کے مشہور ادیب گذرے ہیں، ان کو ہزاروں اشعار حفظ تھے۔

عرب کے لوگ ہر اس کلام کو جو فصیح ہو، مسجع ہو اور جس کا اسلوب دلکش ہو، شعر کہدیا کرتے تھے، چنانچہ مشرکینِ عرب اسی بنا پر قرآن حکیم کو شعر اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے، لیکن اربابِ بیان و معانی کی اصطلاح میں شعر وہ ہے جس میں مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ وزن اور قافیہ بھی ہو۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، کہ شعر و شاعری سے عربوں کو فطری مناسبت تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ

(ا) وہ بدوی (صحرانشین) لوگ ہیں اور ان کی زندگی کے ماحول اور تربیت دونوں کا اقتضاء یہ ہے کہ ان میں شاعری کا ذوق فطری طور پر نشو و نما پائے۔

(ب) وہ آزاد زندگی بسر کرتے تھے حُرّیت ان کی زندگی کا طُغرائے امتیاز تھی اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ حُرّیت کی حالت میں انسان کی ذہنی قوتیں پوری طرح نشو و نما پاتی ہیں اور رفتہ رفتہ انتہائی قوی ہو جاتی ہیں اور اس طرح شاعری کو تحریک اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مثلاً ایامِ جاہلیت کا مشہور شاعر، عنترہ ابن شداد العبسی جس کا ایک قصیدہ سبعہ معلقہ میں بھی شامل ہے،

ایک حبشی کنیز ذبیبہ کے بطن سے تھا، اس لئے اس کی حیثیت بھی ایک غلام کی سی تھی، چنانچہ وہ شعر و شاعری سے بالکل بیگانہ تھا۔ ایک دن اس کے قبیلہ پر دوسرے قبیلہ کے لوگوں نے حملہ کیا۔ عنترہ اس وقت اونٹ چرا رہا تھا۔ باپ نے اُسے جنگ میں شرکت کے لئے پکارا۔ اُس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ میں تو ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ مجھے کیا ضرورت کہ اپنی جان خطرہ میں ڈالوں۔ اب آپ کا غلام ہوں۔ اگر آپ مغلوب ہوگئے۔ تو دوسروں کا غلام ہوجاؤں گا۔ باپ نے اس طنز کا مطلب سمجھ کر کہا اَنْتَ حُرٌّ یعنی تو غلام نہیں بلکہ اس وقت سے آزاد ہے۔ جب یہ مژدۂ جانفزا عنترہ کے کانوں میں پہونچا تو وہ تلوار سونت کر دشمنوں پر حملہ آور ہوا اور ایسی بے جگری کے ساتھ لڑا کہ دشمنوں کو شکست دیدی، اس کا باپ آزاد تو اسے کرہی چکا تھا اب جو اس کی شجاعت دیکھی تو سینہ سے لگا لیا، اور فرزندوں میں شامل کرلیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی ذہنی قوتیں بیدار ہوگئیں اور اس نے شعر کہنا شروع کردیا؛ اور کچھ دنوں کے بعد اتنا نامور شاعر ہوگیا کہ اس کا ایک قصیدہ سبعۂ معلقہ میں شامل ہے جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

أَعْيَاكَ رَسْمُ الدَّارِ لَمْ يَتَكَلَّمِ	حَتَّى تَكَلَّمَ كَالْأَصَمِّ الْأَعْجَمِ
هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ	أَمْ هَلْ عَرَفْتَ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ
دَارٌ لِآنِسَةٍ غَضِيضٍ طَرْفُهَا	طَوْعِ الْعِنَاقِ لَذِيذَةِ الْمُتَبَسَّمِ

ان اشعار کی شرح کروں گا تو مضمون بہت طولانی ہوجائے گا اسلئے ذیل میں مطلب لکھے دیتا ہوں، محبوبہ کے گھر کے نشانات نے تیری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا یہاں تک تو سوال کرتے کرتے عاجز آگیا۔ اور جب بہت التجاؤں کے بعد بات بھی کی تو بہرے گونگوں کی طرح۔ کیا شعرائے قدیم نے کوئی مضمون چھوڑ دیا ہے جس پر طبع آزمائی کی جائے؛ لیکن اس کے باوجود جو تو شعر کہہ رہا ہے تو کیا تو نے بہت غور و فکر کے بعد اپنی محبوبہ کے گھر کو پہچان لیا جو اُسے پہچان کر تیرے اندر آتشِ شوق بھڑک اٹھی اور تو شعر کہنے لگا؛

ہاں یہ ایک ایسی دوشیزہ عفیفہ کا گھر ہے جو غایتِ حیا کی وجہ سے اپنی نظر نیچی رکھتی ہے اور اس کا معانقہ سہل الحصول ہے اور اس کے ہونٹ نہایت شیریں ہیں۔

(ج) چونکہ ان لوگوں کے رات دن صحراؤں اور جنگلوں میں بسر ہوتے تھے اور مناظرِ فطرت مثلاً آسمان، تارے، آفتاب و ماہتاب، دریا، پہاڑ، میدان، وحوش و طیور، ریگستان، نخلستان وغیرہ ہر وقت پیشِ نظر رہتے تھے، اس لئے یہ سب باتیں ان کی قوتِ متخیلہ کو تیز کرتی تھیں اور ان کی طبیعت خود بخود شعر گوئی کی طرف مائل ہوتی تھی۔

(د) چونکہ عربی زبان میں ہر خیال کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ کی کثرت ہے اور اس لحاظ سے دُنیا کی کوئی زبان عربی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اس لئے عربوں کے لئے شعر کہنا یعنی اپنے جذبات کو لفظوں میں ادا کرنا نسبتاً بہت آسان تھا۔

اس جگہ میں نے عربی زبان کی ایک خصوصیت بیان کی ہے جو محتاجِ شواہد ہے ورنہ ممکن ہے بعض لوگ اسے محض ادعا ہی قرار دیں اس لئے میں ذیل میں چند شواہد پیش کرتا ہوں تاکہ میرے دعویٰ پر دلیل بن سکیں۔

(۱) اگر عمدہ صحت اور مزاج میں اعتدال کی بدولت کسی عورت کا جسم گداز اور گول گول ہو، تو اُسے رَبَحْلَة کہتے ہیں۔

اب اگر وہ موٹی ہوجائے لیکن اس کے حُسن میں کمی نہ ہو تو سِبَحْلَة کہتے ہیں۔

اگر وہ زیادہ موٹی ہوجائے اور دلکشی جاتی رہے تو مُفَاضَة

اگر وہ زیادہ موٹی اور بھدی ہو جائے تو عِفْضَاج

(۲) خوبصورتی اور حُسن اگر چہرہ میں ہو تو اُسے صَبَاحَة کہتے ہیں۔
اگر بَشَرہ میں ہو تو اسے وَضَاءَة کہتے ہیں۔
اگر ناک میں ہو (یعنی اگر ناک خوبصورت ہو) تو اُسے جَمَال کہتے ہیں۔
اگر آنکھوں میں ہو تو حَلَاوَة
اگر ہونٹ اور منہ خوبصورت ہو تو مَلَاحَة
اگر زبان میں ہو تو ظَرَافَة
اگر قد و قامت میں ہو تو رَشَاقَة
اگر خصائل و عادات میں ہو تو اسے لَبَاقَة کہتے ہیں۔
اگر بالوں کے سبب وہ خوبصورت ہو تو اُسے کَمَال الحُسن کہتے ہیں۔

(۳) بہادر آدمی کو شجاع کہتے ہیں، اس سے بڑھ کر آدمی کو بَطَل، اس سے بڑھ کر صِمّہ، اس سے بڑھ کر بُہمَة اس سے بڑھ کر ذِمْر، اس سے بڑھ کر حَلْبَس، اس سے بڑھ کر نِکَل، اس سے بڑھ کر مِحْرَب اور اس سے بھی بڑھ کر بہادر آدمی کو غَشَمْشَم کہتے ہیں۔

(۴) مرد سفید ہو تو اَزْہَر، عورت سفید رنگ کی ہو تو اُسے رَعْبُوبَہ، بال سفید ہو تو اَشْمَط۔ گھوڑا سفید ہو تو اشہب، اونٹ سفید ہو تو اَعْیَس، بیل سفید ہو تو لَہَق، گائے سفید ہو تو لِیَاح۔ گدھا سفید ہو تو اَقْمَر، ہرن سفید ہو تو اَدَم، کپڑا سفید ہو تو ابیض، چاندی سفید ہو تو یَقَق، روئی سفید ہو تو حُوّاری، انگور سفید ہو تو مُلّاحِی شہد سفید ہو تو مَاذِی، پانی سفید ہو تو صاف یا خالص کہتے ہیں۔

(۵) دیوار پر نقش و نگار ہوں تو نَقْش کاغذ پر ہوں، تو رَقْش کپڑے پر ہوں تو وَشی، جلدِ انسانی میں ہوں تو وَشْم، گیہوں یا جَو کے دانہ پر ہوں تو رَشْم مٹی یا موم پر ہوں تو طَبْع اور تلوار کے پھل پر ہوں تو اَثَر کہتے ہیں۔

(۶) عورت، جب وہ گود میں ہو تو صَغِیرَہ، جب چلنے لگے تو وَلِیدَہ، جب آثارِ شباب نمایاں ہونے لگیں، تو کاعِب، اور جب اچھی طرح نمایاں ہو جائیں تو ناہِد، جب اس کا عالم شباب ہو تو مُعْصِر، جب پورا شباب ہو تو عانِس، جب شباب ڈھلنے لگے تو خَوْد، جب چالیس سال کے قریب ہو تو مُسْلِف، جب پچاس سال کی ہو تو نَصَف، پھر شَہْلَہ پھر کہلہ پھر شَہْبَرہ، پھر حَیْزَبُون، پھر قَلْعَم، پھر لِطْلِط کہتے ہیں۔

(۷) جس عورت کی جسمانی ساخت بہت دلکش ہو اُسے خَوْد، جس کا چہرہ دلکش ہو اُسے بَہْکَنَہ، جس کی آنکھ ناک بہت دلکش ہوں اُسے مَمْکُورَہ، جس کا قد دلکش ہو اُسے خَرْعَبَہ جو سڈول ہو اُسے مُبَتَّلَہ جس کی پشت اور دونوں پہلو حسین ہوں اسے هَضِیم جس کی کمر پتلی اور قد دراز ہو اُسے مَمْشُوقَة جس کی گردن طویل ہو اُسے عُطْبُول، جس کی پنڈلیاں گداز ہوں اسے خَدَلَّجَہ، اگر چربی زیادہ ہو تو مِرْمَارَہ، بہت نرم و نازک ہو اور بوجہ نزاکت دوہری ہوئی جاتی ہو تو بَرَهْرَهَة، جس کی جلد نرم ہو، اُسے بَضَّہ، اگر جسم بھاری ہو تو وَهْنَانَہ اگر اس کے بدن سے خوشبو آتی ہو تو بَہْنَانَہ، اگر بہت نازک اور لچکیلی ہو تو اُسے غَيْدَاء کہتے ہیں۔

صرف عورتوں کے جسمانی محاسن اور معائب کے لئے عربی میں صدہا الفاظ ہیں، اسی طرح تلوار، اونٹ اور شیر کیلئے کئی کئی سو الفاظ ہیں۔ تفصیل بخوفِ طوالت نظر انداز کی جاتی ہے لیکن ان چند مثالوں سے میرا دعویٰ بخوبی ثابت ہو سکتا ہے عربی زبان کی وسعت کا اعتراف دبی زبان سے ہٹی (Hitti) نکلسن (Nicholson) مارگولیتھ (Margoliouth) گولڈزیہر (Gold Zehir) نولڈیکی (Noldeker) اور دوسرے مستشرقین نے بھی کیا ہے، لیکن حق بات کہنے کی ان میں سے کسی کو بھی توفیق نہ ہوسکی کیونکہ یہ سب بڑے متعصب گزرے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی کوئی زبان اس اعتبار سے عربی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انشاء اللہ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھ کر پیش کروں گا۔

عربوں میں شاعری کی ابتدا

چونکہ ہمارے پاس قدیم ترین زمانہ کی تاریخ موجود نہیں اسلئے ہم نہ تو یہ بتا سکتے ہیں کہ شاعری کی ابتداء کیونکر ہوئی اور نہ یہ کہ پہلا شاعر کون تھا، لیکن ظہور اسلام سے ڈیڑھ صدی پہلے کے حالات ہم تک پہونچ گئے ہیں۔ چنانچہ قرن ثانی قبل الہجرۃ سے شعر و شاعری کی مستند تاریخ شروع ہوتی ہے، اور مطولات یعنی طویل قصائد نگاری کے لحاظ سے ہم مہلہل بن ربیعہ کو پہلا شاعر قرار دے سکتے ہیں جس نے اپنے بھائی کلیب بن ربیعہ کے قتل پر تیس شعر کا مرثیہ کہا تھا (امرء القیس اور دوسرے شعراء نے قصائد میں اسی کا تتبع کیا ہے) اس کے علاوہ عنتر بن عمرو بن تمیم، دُوَید بن زید، اعصر بن سعد، زُہیر بن خباب الکلبی، الافوہ الاودی اور ابی دُواد الایادی، قطعہ گو شاعر گزرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداء میں عرب کے شعراء اپنے خیالات قطعات یا چند اشعار میں ظاہر کرتے تھے، طویل قصائد کا رواج بعد میں ہوا، ابتداء میں شاعروں کا کلام بہت سادہ ہوتا تھا، صنائع بدائع لفظی و معنوی کا رواج امرء القیس، علقمہ، عبید ابن الابرص اور ابن خذام کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، اِن شعراء نے شاعری میں اصلاحات نافذ کیں، اور تنوع الاوزان، طول القوافی، اختلاف الاسالیب، براعۃ الاستعارہ، روعۃ التشبیہ، دقۃ الکنایہ، تہذیب و ترقیق اور تجوید و تسہیل سے اپنے کلام کو آراستہ کیا۔ چنانچہ امرء القیس کہتا ہے :-

عُوجا علی الطَّلَلِ المُحِیلِ لِاَنَّنا — نبکی الدیارَ کما بکی ابن خذام

اے میرے دوستو! قیام کرو، محبوبہ کے ان آثار دیار پر جو متغیر ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ہم (بھی) دیار حبیب کی یاد میں روتے ہیں جیسے ہم سے پہلے ابن خذام رو چکا ہے۔

اور عنترہ کہتا ہے :-

هل غادرَ الشعراءُ من مُتَرَدَّمِ — اَمْ هل عرفتَ الدارَ بعد توهُّمِ

نیز زہیر کہتا ہے :-

ما أرانا نقولُ إلّا معاراً — أو مُعاداً من لفظنا مکرورا

نہیں دیکھتے ہم اپنے آپ کو مگر یہ کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ مستعار ہے یا یہ کہ ہم بھی اگلے شعراء کے الفاظ کو دہراتے ہیں۔

اگرچہ ظہور اسلام کے بعد، جاہلی شعراء کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا، تاہم جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ بھی بہت ہے

اس کی کثرت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈیڑھ صدی کا کلام اس قدر ہے کہ کسی قوم کا اسی مدت کا سرمایہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کثرتِ کلام کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے لوگ اُمّی تھے اور شعر گوئی کے علاوہ اظہارِ خیالات یا تدوینِ حکمت کا اور کوئی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا۔ چنانچہ مشہور ادیب الجمحی کہتا ہے:-

دیوان علمہم و منتہی حکمتہم بہ یأخذون والیہ یصیرون۔

عرب کے لوگ شعر و شاعری کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ بعض اوقات، قبیلہ کا قبیلہ، صرف ایک شعر کی بدولت بلند اور نامور ہو جاتا تھا اور ایک ہی شعر کی بدولت ذلیل ہو جاتا تھا۔ مثلاً ابوالولید حسان ابن ثابت رض نے ایک دفعہ بنو عبدالمدان کی ہجو میں یہ شعر کہا:-

لا بأس بالقوم من طولٍ و من غلظٍ   جسمُ البغال و احلامُ العصافیر

ایسی قوم کی درازیِ قد و قامت اور مُٹاپے کا کوئی ڈر نہیں جو خچروں کا جسم اور چڑیوں جیسی عقل رکھتی ہے۔

جب اس قبیلہ کے لوگوں نے یہ شعر سُنا تو حسان سے کہا کہ اب تو ہمیں اپنے قد و قامت کے اظہار سے شرم محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس شعر سے پہلے ہم اس صفت پر فخر کیا کرتے تھے، یہ سُن کر حسان نے یہ دو شعر کہہ کر تلافیٔ مافات کردی۔

وَقَد کُنّا نقولُ اِذا اُناسا   لِذی جسمٍ یُعَدُّ وَ ذی بیان

کانّکَ اَیّہا المُعطیٰ لِسانا   وجسمًا من بنی عبدالمدان

جب ہم کسی قابلِ اعتبار جسم والے کو اور صاحب بیان کو دیکھتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ تو اپنی خداداد زبان اور جسم کے اعتبار سے قبیلۂ بنو عبدالمدان سے معلوم ہوتا ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دورِ جاہلیت میں شعر و شاعری کو لوگوں کے دِل و دماغ پر کس قدر اقتدار حاصل تھا۔

عربوں نے ہر اُس بات کو شعر میں نظم کر دیا ہے جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہو سکتی ہے یا جو ان کے ذہن یا خیال میں آسکی۔ ان کی شاعری کی مشہور اصناف حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) النسیب۔ اس کو تشبیب اور غزل بھی کہتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں عرب شعرا اپنے قصیدوں میں عورتوں کے حُسن و جمال کا تذکرہ کرتے تھے مثلاً ان کا سراپا، اُن کے حالاتِ زندگی ——— ان کا لباس اُن کا ناقہ، اور ہودج ان کے سفر اور صحرا میں عارضی اقامت کے حالات، ان کے خیمے، اُن کے چُولھوں کے نشانات، ان کا پانی لینے چشموں پر جانا، نیز اپنی محبت یا تعلقات کا اظہار۔

(۲) الفخر والحماسہ۔ حماست کے لغوی معنی ہیں سختی برداشت کرنے کی قوت۔ شعراء عرب اپنے بزرگوں اور قبیلوں کی بہادری کے حالات بہت ذوق و شوق کے ساتھ بیان کرتے تھے اور اُن کے کارناموں پر فخر کرتے تھے۔

(۳) المدح۔ وہ لوگ اپنے کلام میں مکارمِ اخلاق یعنی شجاعت، سخاوت، عدل و انصاف، عقل و فہم، اور عفت و عصمت وغیرہ کی تعریف بیان کرتے تھے، اور شاعری کی اس صنف کے لحاظ سے زہیر، نابغہ اور اعشٰی کا کلام ممتاز ہے۔

(۴) الرثاء۔ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تھا تو اس کی یاد میں مرثیہ کہنے کا رواج تھا جس میں متوفی کے کمالات اور خصائصِ زندگی بیان کیے جاتے تھے۔

(۵) الہجاء ۔ یعنی ہجوگوئی جس میں شاعر اپنے دشمنوں کی برائیاں بیان کرتا تھا، تاکہ وہ قوم میں ذلیل ہو جائیں

(۶) الاعتذار ۔ جسے انگریزی میں (Apology) کہہ سکتے ہیں، اس میں شاعر بعض اوقات اپنے قصور کا اعتراف کرتا تھا، جس طرح نابغہ نے ایک مرتبہ نعمان ابن منذر کے سامنے ایک بلند پایہ قصیدہ اعتذاریہ پیش کیا تھا جس کے بعض اشعار ضرب المثل ہو چکے ہیں۔

(۷) الوصف ۔ یعنی کسی شے کی ایسی تشریح و توضیح کرنا کہ اس کی تمام خوبیاں پڑھنے والے کی نگاہ میں جلوہ گر ہو جائیں یہ شاعری کی مشہور صنف ہے اور ایرانی شعراء اس میں بہت ممتاز ہیں۔

عرب شعراء عورتوں کے علاوہ دوسری چیزوں کا وصف بھی بیان کرتے تھے۔ مثلاً عنترہ اپنے قصیدۂ معلقہ میں لکھتا ہے

هَلْ تُبلِغَنِّیْ دَارَهَا شَدَنِیَّةٌ　　لُعِنَتْ بِمَحْرُومِ الشَّرَابِ مُصَرَّمِ

خَطَّارَةٌ غِبَّ السُّرَیٰ زَیَّافَةٌ　　تَطِسُ الإِکَامَ بِذَاتِ خُفٍّ مِیْثَمِ

وَکَأَنَّمَا تَطِسُ الإِکَامَ عَشِیَّةً　　بِقَرِیْبِ بَیْنَ الْمَنْسِمَیْنِ مُصَلَّمِ

کاش مجھ کو محبوبہ کے گھر تک موضع شدن کی اونٹنی پہونچادے جس کے حق میں دُودھ نہ دینے کی بددعا کی گئی ہے اور اس لئے وہ کبھی حاملہ نہیں ہوتی یعنی ہمیشہ طاقتور رہتی ہے (ولادت باعث ضعف ہوتی ہے)

اس قسم کی اونٹنی کہ ساری رات چلنے کے بعد بھی (بوقت صبح) خوشی میں آکر اپنی دُم کا چنور بنا کر ہلاتی ہے اور بڑے ناز و انداز سے چلتی ہے اور ریت کے ٹیلوں کو اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے توڑتی چلی جاتی ہے اور اس کی رفتار کا یہ عالم ہو کہ وہ ریت کے ٹیلوں کو توڑتی چلی جائے جیسے قوی شُترمرغ جس کے دونوں پاؤں میں کم فاصلہ ہو اور کن کٹا ہو[1]

اونٹ کے علاوہ عرب کے شعراء اپنے کلام میں گھوڑوں کی تعریف بھی کرتے تھے، اونٹ کا وصف طرفہ کے کلام میں اور گھوڑے کا وصف امرا القیس کے کلام میں بہت نمایاں ہے۔

شعر گوئی سے شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو موزوں طریق سے بیان کرے اور اپنے مافی الضمیر کو عمدہ الفاظ میں اور دلکش انداز میں ظاہر کرے۔ اس اعتبار سے شہری اور بدوی، عربی اور عجمی سب شاعر یکساں ہیں۔ لیکن اسلوب بیان کے لحاظ سے شعر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو بالکل سادہ شعر جس میں سلاست اور سادگی ہوتی ہے اور اس کے سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی، دوسری قسم وہ ہے جس میں شاعر یا تو لفظی اور معنوی خوبیاں پیدا کرتا ہے یا کوئی ندرت پیدا کرتا ہے یا تخیل کی رفعت کا نمونہ پیش کرتا ہے یا انداز بیان ایسا مغلق اختیار کرتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے یا بلند فلسفیانہ نکتہ نظم کرتا ہے جس تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ کلام "عام فہم" نہیں ہوتا۔ دوسری قسم کو اصطلاح میں مضمون آفرینی کہتے ہیں چنانچہ غالب کا قول ہے کہ "شاعری در اصل مضمون آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا" اس دوسری قسم کی مثالیں ہمیں خصوصاً عرفی، بیدل، غالب اور اقبال کے کلام میں مل سکتی ہیں۔

عربی شاعری میں، مضمون آفرینی، دقت پسندی، اور مشکل گوئی کی مثالیں بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ کے شعراء

---

[1] میں نے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا ہے ورنہ محاسن کلام کی تشریح کرنے بیٹھوں تو اس کیلئے شاید چند صفحے بھی کافی نہ ہوں۔

ہیں تو بہت مل سکتی ہیں، لیکن دورِ جاہلیت کی شاعری میں سادگی اور سلاست کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کی خصوصیات شاعری حسب ذیل ہیں :۔

(۱) جلاء المعانی وظهورها ومطابقتها للواقع - یعنی جاہلی شعراء کے کلام کے معانی واضح ہوتے ہیں اور ان کا کلام واقع کے مطابق ہے۔

(۲) قلة المبالغة والغلوّ فيها بما يخرجها عن حد العقل ومألوف الطبع یعنی انکے کلام میں مبالغہ اور غلو بہت کم پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے کلام حدِ عقل سے نکل جاتا ہے اور غیر مانوس ہوجاتا ہے

(۳) قلة المعاني الغريبة المنزع، الدقيقة المأخذ یعنی اُن کے کلام میں غیر مانوس معانی اور بعید از قیاس تشبیہات اور دُور از کار استعارات وکنایات بہت کم پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے کلام کا سمجھنا دشوار ہوجاتا ہے۔

(۴) قلة تأنقهم في ترتيب المعاني والافكار على النظام الذي يقتضيه الطبع او العقل بل يرسلونها على ما خيلت نفوسهم۔ یعنی وہ اپنے کلام میں آرائشِ ظاہری کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے اور تکلف کے بجائے طبعی اور فطری تقاضوں کا اتباع کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تاثیر کا عنصر مقابلۃً زیادہ پایا جاتا ہے۔

اہل عرب پر بدویت غالب تھی تمدن و تأنق اور تہذیب وتکلف سے ان کو بہت کم علاقہ تھا، وہ لوگ زیادہ تر خیموں میں زندگی بسر کرتے تھے یعنی خانہ بدوش تھے اور تصنع ان کی زندگی میں بالکل نہیں تھا وہ عموماً وہی کہتے تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ پالیسی ڈپلومیسی اور مصلحت شناسی سے قطعاً آگاہ نہ تھے، ایرپھیر سے باتیں کرنا انہیں نہ آتا تھا جس طرح انکی گفتگو سادہ ہوتی تھی اسی طرح ان کی شاعری بھی تصنع اور آورد سے پاک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک شعر کی خوبی کا معیار یہ تھا کہ اُسے سن کر، سامع بے اختیار کہہ اُٹھے کہ "کس قدر سچی بات کہی"۔ چنانچہ زہیر ابن ابی سلمہ کہتا ہے :۔

وان اشعر بيت انت قائله	بيت يقال اذا انشدته صدقا

عشقیہ شاعری

وہ اپنی عشقیہ شاعری میں بھی، مبالغہ اور تکلف کو داخل نہیں کرتے تھے بس جو ان پر گذرتی تھی وہی بے کم وکاست بیان کردیتے تھے۔ مثلاً مشہور جاہلی شاعر عنترہ کہتا ہے :۔

تُمسِي وتُصبِحُ فَوقَ ظَهرِ حَشِيَّةٍ	وَأَبِيتُ فَوقَ سَرَاةِ أَدهَمَ مُلجَمِ

یعنی میری محبوبہ عبلہ تو نرم بستر پر اپنی زندگی بسر کرتی ہے لیکن میں (دن میں آرام تو کہاں) رات بھی ادہم گھوڑے کی پشت پر گذارتا ہوں جس کے منہ میں لگام ہوتی ہے۔

وَحَشِيَّتِي سَرجٌ عَلَى عَبلِ الشَّوَى	نَهدٍ مَرَاكِلُهُ نَبِيلِ المَحزِمِ

اور میرا نرم بستر تو زین ہے وہ زین جو مضبوط ہاتھ پاؤں والے گھوڑے کی پشت پر کسی ہوتی ہے اور اس کی ایڑ لگانے کی جگہ اُبھری ہوئی اور تنگ کھینچنے کی جگہ اونچی ہے۔

إِن تُغدِفِي دُونِي القِنَاعَ فَإِنَّنِي	طَبٌّ بِأَخذِ الفَارِسِ المُستَلئِمِ

اگر تو برقعہ میں اپنا منہ مجھ سے چھپائے گی (تو اس سے کیا فائدہ ہے) میں تو زرہ پوش شہسواروں کو زندہ گرفتار کرسکتا

ہوں (تیری تو کیا ہستی ہے)

اثنی علیّ بما علمت فانّنی سھلٌ مخالقتی اذا لم اُظلم

اے میری محبوبہ میرے جو اوصاف حمیدہ تو جانتی ہے ان کی بناء پر میری تعریف کر کیونکہ جب تک مجھ پر کوئی شخص ظلم نہ کرے اس وقت تک میں بہت نرم خو ہوں

ناظرین اگر ان اشعار کو غور سے پڑھیں گے تو انہیں حسب ذیل خصوصیات نظر آسکتی ہیں:-

(ا) عاشق نے اپنی اور اپنی معشوقہ کی زندگی کا سچا نقشہ کھینچا ہے۔

(ب) عاشق نے اپنی معشوقہ سے زیادہ اپنے گھوڑے اور اپنی بہادری کی تعریف کی ہے۔

(ج) عاشق اپنی معشوقہ سے مطلق مرعوب یا خوفزدہ نہیں ہے اور اس کی خوشامد نہیں کرتا۔ بلکہ اسے یہ بتاتا ہے کہ میں جب چاہوں تجھ پر قابو پا سکتا ہوں۔

(د) وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی محبوبہ بھی اس کی سچی تعریف کرے اور مبالغہ سے کام نہ لے۔

اسی طرح جاہلی شعراء جب کسی کا مرثیہ کہتے تھے تو اس میں مرنے والے کی وہی خوبیاں بیان کرتے تھے جو اس میں فی الواقع موجود تھیں۔ اور جب وہ کسی کی مدح کرتے تھے تو اس میں بھی صداقت کو مدنظر رکھتے تھے، چنانچہ حضرت حسان ابن ثابت رضہ کا یہ شعر اس کی بہترین مثال ہے:-

یغشون حتّٰی ما تھرّ کلابھم لا یسئلون عن السواد المقبل

یعنی ممدوح کے افراد خاندان اس قدر مہمان نواز ہیں چونکہ رات کے وقت ان کے یہاں ہمیشہ مہمان آتے رہتے ہیں اسلئے ان کے کتے بھی کسی اجنبی پر نہیں بھونکتے اور نہ کسی آنے والے سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کون ہے اور کیوں آیا ہے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سلاست کے باوجود جاہلی شعراء کا کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہوتا تھا اور اس کا ایجاز سہل ممتنع کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جاہلیت کا کلام خصوصاً قصائد سبعہ معلقہ ہمیں بہت دشوار اور مغلق معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پاکستان اور ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو عربیت پر عبور حاصل ہو۔ نیز ہم عربی زبان کے الفاظ مترادفہ کے باریک فرق کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ہمیں جاہلی اشعار میں غرابت محسوس ہوتی ہے لیکن آج بھی جو لوگ عربی ادب کا ذوق رکھتے ہیں اُن کی نظر میں ان کا کلام نہایت دلکش اور بلیغ ہے

(۵) شعرائے جاہلیت کا ایک خاص اسلوب یہ تھا کہ وہ اپنے قصائد کو ان مقامات کی یاد سے شروع کرتے تھے، جہاں کسی وقت ان کی معشوقہ نے قیام کیا تھا۔ چنانچہ امرؤ القیس کا مشہور قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:-

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ بِسِقْطِ اللِّوَىٰ بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھیرو تاکہ ہم محبوبہ اور اس کے اس گھر کی یاد میں دو آنسو بہا لیں جو ریت کے ٹیلہ کے آخر سرے پر دخول اور حومل کے مابین واقع ہے۔

تَرَىٰ بَعَرَ الْآرَامِ فِي عَرَصَاتِهَا وَقِيعَانِهَا كَأَنَّهُ حَبُّ فُلْفُلِ

تو سفید ہرنوں کی مینگنیاں اُس مکان کے میدانوں اور ہموار زمینوں میں ایسی پڑی ہوئی دیکھے گا جیسے سیاہ مرچوں کے دانے۔

طرفہ بن العبد بکری کا قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

لِخَولَۃَ اَطلَالٌ بِبُرقَۃِ ثَہمَدِ تَلُوحُ کَبَاقِی الوَشمِ فِی ظَاہِرِ الیَدِ

ثہمد کی پتھریلی زمین میں خولہ کے گھر کے نشانات ہیں جو پشت دست پر گودنے کے نشاناتِ باقی ماندہ کی طرح چمک رہے ہیں۔

وُقُوفًا بِہَا صَحبِی عَلَیَّ مَطِیَّہُم یَقُولُونَ لَا تَہلِک اَسًی وَ تَجَلَّدِ

(وہ نشانات اس حال میں چمک رہے تھے کہ) میرے دوست احباب میری وجہ سے ان کھنڈروں میں اپنی سواریوں کو تھامے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ غم فراق میں اپنے کو ہلاک نہ کر اور صبر سے کام لے۔

زہیر ابن ابی سلمیٰ کا قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :-

اَمِن اُمِّ اَوفٰی دِمنَۃٌ لَم تَکَلَّمِ بِحَومَانَۃِ الدَّرَّاجِ فَالمُتَثَلَّمِ

کیا یہ کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ جس نے مجھ سے بات نہیں کی میری محبوبہ اُم اوفی کے گھر کی ہے جو درّاج اور متثلّم کی پتھریلی زمین میں واقع ہے؟

وَدَارٌ لَہَا بِالرَّقمَتَینِ کَاَنَّہَا مَرَاجِیعُ وَشمٍ فِی نَوَاشِرِ مِعصَمِ

اور میری محبوبہ کا ایک گھر (صمّان کے) دو باغوں کے درمیان ہے جس کے نشانات پہونچے کے ظاہری حصہ پر گودنے کے نشانات کی طرح ہیں۔

حضرت لبیدؓ بن ربیعہ عامری رضؓ کا قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :-

عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّہَا فَمُقَامُہَا بِمِنًی تَاَبَّدَ غَولُہَا فَرِجَامُہَا

منیٰ کے وہ گھر جن میں چند روزہ اور زیادہ دِنوں تک قیام رہا سب مٹ مٹا گئے اور اس کے مواضع غول اور رجام بھی اُجاڑ ہوگئے۔

(۶) جاہلیت کی شاعری کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ کے شعراء، شاعری کو ذریعۂ معاش نہیں بناتے تھے جیسا کہ ہمیں ایران اور ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ مثلاً انوری، خاقانی، عرفی، نظیری، انشا، مصحفی، داغ، اور امیر بلکہ وہ لوگ یا تو اپنی خاندانی شرافت و شجاعت و سخاوت کے اظہار کی خاطر فخریہ شاعری کرتے تھے یا کسی کی جدائی یا موت سے متاثر ہوکر نوحہ خوانی کرتے تھے اور اگر وہ کسی کی تعریف کرتے تھے تو محض اس لئے کہ وہ شخص ان کی نظر میں لائق ستائش ہوتا تھا جاہلی شاعری کا دامن، تملق اور خوشامد سے پاک رہا ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک بادشاہ

سلہ یہ اُن خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہوں نے حضور انور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کے روئے مبارک کی زیارت کی، اور مشرف باسلام ہوئے، آنحضرت ؐ نے انہی کے متعلق فرمایا تھا کہ راست ترین کلمہ جو کسی شاعر کی زبان سے نکلا وہ لبید کا یہ شعر ہے:-

اَلَا کُلُّ شَیءٍ مَا خَلَا اللہَ بَاطِلٌ وَکُلُّ نَعِیمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل اور مٹ جانے والی ہے - اور ہر نعمت یقینی طور پر زائل ہوجانے والی ہے

نے ایک شاعر سے کہا کہ میری تعریف میں کوئی قصیدہ لکھو تو اس نے برجستہ جواب دیا:۔

افعل حتیٰ اقول "یعنی تو تعریف کے لائق کوئی کام کر تو میں کچھ لکھوں"

البتہ آخری دور میں چند حریص شاعر ضرور پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے شاعری کو باقاعدہ ذریعۂ معاش بنا لیا تھا مثلاً اعشیٰ، نابغہ، متنخل، ربیع ابن زیاد، اور حطیہ ان لوگوں نے بادشاہوں کی مدح سرائی سے خوب روپیہ کمایا، اور نابغہ تو اس قدر دولتمند ہو گیا تھا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا، لیکن عربوں میں اس کی کچھ عزت باقی نہیں رہی تھی شاعری چونکہ عربوں کا تمام تر سرمایۂ افتخار تھی اس لئے جب کسی قبیلہ میں کوئی نوجوان شاعر کی حیثیت سے ظاہر ہوتا تھا تو اس قبیلہ کے لوگ بہت خوشی مناتے تھے، بڑی شاندار ضیافتیں ہوتی تھیں، دور دور سے لوگ مبارکباد دینے آتے تھے اسکی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات صرف ایک شعر کی بدولت اُس قبیلہ کا نام مشہور ہو جاتا تھا اور ممدوح کا نام شہرت جاویدہ حاصل کر لیتا تھا۔

جب شماخ بن ضرار نے عرابہ اوسی کی شان میں یہ شعر کہا:۔

اِذَا مَا رَایَۃٌ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ تَلَقَّاہَا عَرَابَۃُ بِالْیَمِیْن

جب عظمت اور بزرگی کا جھنڈا بلند کیا جاتا ہے، تو عرابہ اُسے داہنے ہاتھ سے تھام لیتا ہے، تو عرابہ کا نام تمام ملک میں مشہور ہو گیا۔

دوسری مثال سُنئے:۔ دورِ جاہلیت میں محلق ایک غریب اور گمنام شخص تھا اور اس کی تین جوان بیٹیاں تھیں جن کو مفلسی کی بناء پر شوہر نہیں ملتے تھے، اتفاق سے اعشیٰ ادھر آ نکلا۔ محلق کی بیوی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ یہ وہ شخص ہے کہ جس کی مدح میں ایک شعر بھی کہدے وہ سارے عرب میں مشہور ہو جاتا ہے لہٰذا جس طرح ہوسکے اس کی دعوت کا انتظام کرو۔ بات معقول تھی اس لئے محلق نے اپنے دوست سے کچھ روپیہ قرض لیا اور اعشیٰ کی دعوت کی، بہترین کھانے کھلائے اور بہترین شراب پلائی، اور بڑی مدارات کی، جب اعشیٰ پر حالتِ سرور طاری ہوئی تو اُس نے محلق سے اس کے خانگی حالات دریافت کئے، جیسا کہ دُنیا کا دستور ہے، مثلاً آپ کے کتنے لڑکی لڑکے ہیں، کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے کہا میری تین جوان لڑکیاں شادی کے لائق ہیں، صورت سیرت دونوں کے اعتبار سے بہت اچھی ہیں لیکن افسوس کہ بر نہیں ملتے ـــــ اعشیٰ نے کہا تم بالکل فکر نہ کرو، میں بہت جلد اس کی تدبیر کروں گا۔

کچھ دنوں کے بعد عرب کا مشہور میلہ لگا جسے سوق عکاظ کہتے تھے جس میں تمام ملک کے لوگ جمع ہوتے تھے، اعشیٰ نے ایک دن مجمعِ عام میں محلق کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:۔

اَرِقْتُ وَمَا ھٰذَا السُّھَادُ الْمُؤَرِّقُ وَمَا لِیْ مِنْ سُقْمٍ وَمَا لِیْ مَعْشَقُ

میری نیند اڑ گئی، اور بیدار خوابی پیدا کرنے والے روگ کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی دراں حالیکہ نہ تو مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ کسی قسم کا عشق ہی ہے۔

اس قصیدہ نے محلق کو عربوں کی نظر میں اس قدر معزز کر دیا کہ بڑے بڑے آدمیوں نے اس کی لڑکیوں سے شادی کے پیغام دئے اور وہ بہت جلد معزز گھرانوں میں بیاہی گئیں، اور یہ سب اعشیٰ کی شاعری کا کرشمہ تھا۔

ایک دفعہ اعشیٰ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک قصیدہ لکھا اور حضورؐ کو سنانے کے لئے

اپنے مستقر سے روانہ ہوا۔ چونکہ اس کی شہرت کی لین ڈوری اُس سے بہت آگے چلتی تھی اس لئے وہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ کفار مکہ کو اس کی آمد کی خبر پہنچ گئی۔ چنانچہ ابو سفیان نے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، قریش سے یہ کہا کہ اگر اعشیٰ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہونچ گیا، اور اسلام لے آیا تو اپنے اشعار کے ذریعہ سے سارے ملک میں آگ لگا دے گا اس لئے جس طرح ہو سکے اُسے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کا موقع نہ دو۔ یہ سُن کر سب نے اتفاق رائے ظاہر کیا اور فوراً سو اونٹ جمع کئے جن کو ابو سفیان نے اس کے پاس بھجوا دیا اور اعشیٰ حضورؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

(۷) جاہلی شاعری کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اُس سے ہم کو عرب کے تمدن تہذیب، معاشرت، اکل و شرب، لباس، بود و ماند، امور خانہ داری، اخلاق و عادات، رسوم و اوضاع، ملک کی طبعی، جغرافیائی اور معاشی حالت پیداوار اور حیوانات کی اقسام غرضکہ تمام باتوں کی ایسی تفصیل مل سکتی ہے، جو تاریخ سے بھی نہیں معلوم ہو سکتی۔ اسی لئے کہا گیا ہے الشعرُ دیوان العرب یعنی جاہلیت کے زمانہ کی شاعری گویا عرب کی تاریخ ہے۔ چنانچہ ہمکو دورِ جاہلیت کے جس قدر حالات معلوم ہو سکے ہیں، ان سب کا مآخذ اس زمانہ کی شاعری ہی ہے۔ بہت سے لوگوں نے جاہلیت کے اشعار سے مختلف قسم کا مواد لے کر مختلف کتابیں مرتب کر دیں۔ مثلاً ابن قتیبہ کی کتاب الشعر والشعراء، ابن جاحظ کی کتاب الحیوان، ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات اور سجستانی کی کتاب المعمرین وغیرہ۔

اب ہم ذیل میں اس زمانہ کی شاعری کی مدد سے جاہلیت کا تمدن، پیش ناظرین کرتے ہیں :۔

(۱) اس زمانہ کے عرب شراب کے بہت شوقین تھے اور اس کی انہیں ایسی بُری لت پڑ گئی تھی کہ اس میں مخمور بلکہ غرق رہنا باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے، چنانچہ طرفہ کہتا ہے :۔

وَاِن تبغنی فی حلقۃِ القوم تلقنی — وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد
متیٰ تاتنی اصبحکَ کاساً رویۃً — وان کنتَ عنہا ذاغنی فاغن وازدد

اور اگر تو مجھ کو قوم کی محفل میں تلاش کریگا تو وہاں پائے گا اور اگر تو مجھے شراب کی دکانوں میں شکار کرنا چاہے گا تو شکار کر لے گا جب تو میرے پاس آئے گا تو میں تجھے چھلکتا ہوا جام شراب پلاؤں گا اور اگر تو شراب سے بے پروا ہے تو ایسا ہی رہ بلکہ اور بے پروا ہو جا۔

عنترہ اپنی مے خواری کی تعریف اس طرح کرتا ہے :۔

وَلَقَدْ شَرِبْتُ مِنَ المُدامۃِ بَعدَ ما — رَکَدَ الہواجرُ بالمَشُوفِ المعلم
بِزُجَاجَۃٍ صفراءَ ذاتِ اَسِرّۃٍ — قُرِنَتْ بِاَزْہَرَ فی الشِّمَالِ مقدَّم
فَاِذَا شَرِبتُ فَاِنَّنِی مُستہلکٌ — مالی وعِرضی وَافِرٌ لم یُکلم

بلاشک میں نے بعد دوپہر چکتی ہوئی اشرفی خرچ کر کے شراب پی۔ اس زرد رنگ کے دھاری دار پیالے سے جو میرے داہنے

سلہ میری رائے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے پسند نہ کیا کہ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع مل سکے، کہ حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کو جو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوتی اس میں ایک جادو بیان شاعر کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

ہاتھ میں تھا اور میں نے سفید صراحی سے شراب انڈیلی جو میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور اس کے منہ پر صافی بندھی ہوئی تھی۔ پس جب میں شراب پیتا ہوں تو اپنے مال کو لٹاتا ہوں مگر میری آبرو بڑھتی رہتی ہے اور اُسے کوئی زخم نہیں لگتا، یعنی حالتِ مستی میں بھی مجھ سے کوئی امر خلاف شرافت صادر نہیں ہوتا۔

(۱) جب کسی کے گھر محفل جمتی تھی تو شراب کا دور بھی چلتا تھا:-

اِنا محیوکِ یا سلمٰی فحیّینا وَ اِن سقیتَ کرامَ الناسِ فاسقینا

اے سلمیٰ ہم تجھے سلام کہتے ہیں تو بھی ہمیں سلام کہہ اور اگر تو قوم کے شریفوں کو شراب پلاتی ہے تو ہمیں بھی پلا۔

(۲) عموماً شراب میں پانی ملاکر پیتے تھے:-

اِنّی ابیٰ اللّٰہ ان اموتَ وَ فی صدری ھمٌّ کانّہٗ جبلٌ
یمنعنی لذۃ الشراب و ان کان قطاباً کانّہٗ العسلُ

میں ایسا ہوں کہ خدا کو یہ پسند نہیں کہ میں مروں تو مرے سینہ میں کوئی غم پہاڑ کی طرح ایسا ہو جو مجھے لذتِ شراب سے روکے اگرچہ اس کے ساتھ پانی ملا ہوا ہو گویا وہ شہد ہے۔

اَلا ھُبّی بصحنکِ فاصبحینا وَلاتُبقی خمورَ الاندرینا
مُشَعشَعۃً کانّ الحُصّ فیھا اذا مَا الماءُ خالطھا سخینا

اے محبوبہ بیدار ہو اور اپنے بڑے پیالہ میں ہمیں صبوحی پلا اور اتنی پلاکر قریہ اندرے آئی ہوئی شراب دوسروں کے لئے باقی رکھ، سب ہمیں پلادے، ایسی شراب پلاکر جب اس میں گرم پانی ملایا جائے تو یہ معلوم ہو گویا اس میں زعفران ملایا گیا ہے

(۳) اس زمانہ کے عربوں کا معیارِ حسن حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوسکتا ہے۔ چنانچہ امرؤ القیس کہتا ہے:-

مُھفھفۃٌ بیضاءُ غیرُ مُفاضۃٍ ترائبُھا مَصقولۃٌ کالسَّجنجلِ

وہ محبوبہ باریک یا نازک کمر، شکم کی کَسی ہوئی، گورے رنگ کی، ہلکے بدن کی ہے اور اس کا سینہ آئینہ کی طرح چمکدار ہے۔

کَبِکرِ المُقاناۃِ البیاضِ بِصُفرۃٍ غذاھا نمیرُ الماءِ غیرَ مُحلّلِ

اس کا رنگ اُس موتی کی طرح ہے جس کی سفیدی میں زردی جھلکتی ہو (عرب میں عورتوں کا یہی رنگ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے) اور اسے ایسے پانی سے پرورش کیا ہے جو لوگوں کی آمدورفت سے مکدر نہیں ہوا ہے۔

تَصُدُّ وَتُبدی عن اَسیلٍ وتتّقی بناظرۃٍ مِن وحشِ وَجرۃَ مُطفِلِ

وہ حسینہ ہم سے ازراہِ ناز اعراض کرتی ہے، لیکن اپنا دراز رخسار، لگاوٹ کے رنگ میں ہمیں دکھاتی ہے اور اپنی آنکھ کو جو موضع وجرہ کی بچوں والی ہرنی کی ہر طرح دلکش ہے میرے اور اپنے درمیان آڑ بناتی ہے یعنی میں اس کی چشم میگوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہوں اور اس طرح وہ میری نظر بازی سے محفوظ رہتی ہے (بچوں والی ہرنی کی تخصیص اس لئے ہے کہ جب ہرنی اپنے بچوں کو دیکھتی ہے تو اس کی آنکھ بہت زیادہ دلکش ہو جاتی ہے۔)

وَجیدٍ کجیدِ الرِیمِ لیسَ بفاحشٍ اِذا ھِیَ نَصّتہٗ وَلا بِمُعطّلِ

، اور اس کی گردن، آہو کی گردن کی طرح ہے، جبکہ وہ اسے بلند کرے، لیکن اس کی گردن (اگرچہ طویل ہے) لمبی بے ڈول

نہیں ہے اور نہ بے زیور ہے۔

وَفَرْعٍ یَزِیْنُ المَتْنَ اَسْوَدَ فَاحِمٍ — اَثِیْثٍ کَقِنْوِ النَّخْلَةِ المُتَعَثْکِلِ

اور اس کے بال درازی کے سبب سے اس کی کمر کی زینت ہیں اور کوئلہ کی طرح سیاہ ہیں اور کثرت ہیں، بہت گھنے جیسے پھل والی کھجور کے خوشے کے خوشے۔

غَدَائِرُہَا مُسْتَشْزِرَاتٌ اِلَی العُلیٰ — تَضِلُّ العِقَاصُ فِی مُثَنًّی وَّ مُرْسَلِ

اس کے گیسو اونچے کر کے گوندھے گئے ہیں (اس کی مینڈھیاں اوپر کو چڑھی ہوتی ہیں) اور اس کا جوڑا گندھے ہوئے اور بے گندھے ہوئے بالوں میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

وَکَشْحٍ لَطِیْفٍ کَالجَدِیْلِ مُخَصَّرٍ — وَسَاقٍ کَاَنْبُوْبِ السَّقِیِّ المُذَلَّلِ

اور اس کی کمر ایسی نازک ہے جیسے اونٹ کی باریک مہار اور اس کی پنڈلی ایسی حسین ہے جیسے نرسل کی ہری بھری پوری جسے پانی نے نرم اور گداز کر دیا ہو۔

وَتَعْطُوْ بِرَخْصٍ غَیْرِ شَثْنٍ کَاَنَّہٗ — اَسَارِیْعُ ظَبْیٍ اَوْ مَسَاوِیْکُ اِسْحِلِ

اور وہ چیزوں کو ایسی نرم و نازک اور ملایم انگلیوں سے پکڑتی ہے گویا وہ سفید رنگ سرخ سر والے کیچوے ہیں جو موضع ظبی میں پائے جاتے ہیں یا درخت اسحل کی بنی ہوئی مسواکیں ہیں جو باریک خوبصورت اور سیدھی ہوتی ہیں۔

رزم

۳- یہ لوگ شہسواری، شمشیرزنی، تیراندازی اور نیزہ بازی میں شہرۂ آفاق تھے، اور عموماً سوار ہو کر لڑتے تھے۔

رُوَیْدَ بَنِیْ شَیْبَانَ بَعْضَ وَعِیْدِکُمْ — تُلَاقُوْا غَدًا خَیْلِیْ عَلٰی سَفْوَانِ

تُلَاقُوْا جِیَادًا لَا تَحِیْدُ عَنِ الوَغٰی — اِذَا مَا غَدَتْ فِی المَازِقِ المُتَدَانِیْ

اے بنی شیبان! ذرا ٹھیرو اور اپنی دھمکیاں کم کرو۔ کل سفوان پر تم میرے گھوڑوں سے ملو گے ایسے گھوڑوں سے جو ازدحام اور تنگ جگہ میں بھی لڑائی سے نہیں ہٹتے۔

(۴) یہ لوگ عموماً لڑائی میں اپنے جسموں کو ہتھیاروں سے ڈھانک لیتے تھے:-

عَلَیْہَا الکُمَاةُ الغُرُّ مِنْ آلِ مَازِنٍ — لُیُوْثُ طِعَانٍ عِنْدَ کُلِّ طِعَانِ

ان گھوڑوں پر بنی مازن کے نامدار مشہور بہادر ہتھیاروں سے ڈھکے ہوئے سوار ہیں، جو نیزہ زنی کے وقت نیزہ زنی کے شیر معلوم ہوتے ہیں۔

اِذَا الکُمَاةُ تَنَحَّوْا اَنْ تُصِیْبَہُمْ — حَدُّ الظُّبَاةِ وَصَلْنَاہَا بِاَیْدِیْنَا

جب کہ ہتھیاروں سے ڈھکے ہوئے بہادر اس بات سے پرہیز کریں، کہ تلواروں کی دھاریں ان پر پڑیں، اس وقت ہم ان تلواروں کو ہاتھ سے پکڑ لیتے ہیں۔

(۵) مختلف قبیلے کبھی کبھی شرط بدکر گھوڑے دوڑاتے تھے:-

اِنَّ الرِّبَاطَ النُّکْدَ مِنْ آلِ دَاحِسٍ — اَبَیْنَ فَمَا یُفْلِحْنَ یَوْمَ رِہَانِ

بے شک نسل داحس کے منحوس گھوڑوں نے گھوڑ دوڑ میں کامیابی سے انکار کیا اور گھٹ گئے۔

إن تبتدر غاية يوماً لمكرمة ... تلق السوابق منا والمصلينا

اگر کسی امرِ خیر کی طرف لوگ ہم سے پہلے دوڑاتے جائیں تو اول اور دوم گھوڑے ہمارے ہی ہوں گے۔

(۶) عرب کے لوگ سوار ہوکر یا پیدل کسی صحرا کو قطع کرنا بڑی دلیری کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ امرء القیس اپنے متعلق کہتا ہے:-

وَوَادٍ کجوفِ العیر قفرٍ قطعتہ ... بہ الذئب یعوی کالخلیع المعیّل

اور بہت سی وادیاں مثل وادی عیر کے میں نے قطع کیں، جن میں بھوکا بھیڑیا ہارے ہوئے کثیر العیال قمار باز کی طرح رو رہا تھا (بوجہ گرسنگی)

تأبط شرا، اپنی تعریف اس طرح کرتا ہے:-

یبیتُ بمغنی الوحش حتی ألفنہ ... ویصبحُ لا یحمی لہا الدہر مرتعا

وہ وحشی جانوروں کے رہنے کی جگہ میں رات بسر کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اُس سے مانوس ہو گئے ہیں اور وہ ایسے حال میں صبح کرتا ہے کہ انہیں چرنے سے نہیں روکتا۔

متنبی اپنی شجاعت کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:-

فالخیلُ واللیلُ والبیداءُ تعرفنی ... والضربُ والطعن والقرطاسُ والقلم

گھوڑے اور رات اور بیابان اور شمشیر زنی اور نیزہ بازی اور کاغذ اور قلم یہ سب مجھے پہچانتے ہیں۔

صحبتُ فی الفلواتِ الوحش منفرداً ... حتّی تعجّب منی القورُ والاکمُ

میں جنگلوں میں جانوروں کے ساتھ تنہا رہا ہوں، یہاں تک کہ پہاڑیاں اور ٹیلے مجھ پر تعجب کرتے تھے۔

تأبط شرا اپنے ساتھی کی تعریف کرتا ہے:-

یظلُّ بموماۃٍ ویُمسی بغیرہا ... جحیشاً ویعرَوری ظہورَ المہالکِ

وہ دن چڑھے ایک جنگل میں ہوتا ہے اور شام کو استقلال کے ساتھ دوسرے میں۔ اور وہ خطرناک امور کی برہنہ پشت پر سوار ہوتا ہے۔

یری الوحشۃَ الإنسَ الانیسَ ویہتدی ... بحیثُ اہتدت اُمّ النجوم الشوابکِ

وہ وحشت کو اپنا دلی دوست سمجھتا ہے اور وہاں راہ پاتا ہے جہاں کہکشاں راہ پاتی ہے۔

(۷) عربوں کو اپنے نسب پر بڑا ناز تھا اور وہ مجہول النسب اشخاص کو بہت فرومایہ سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شاعر اپنے متعلق کہتا ہے:-

إنّا بنی نہشلٍ لا ندّعی لأبٍ ... عنہ ولا ہو بالابناء یشرینا

ہم نہشل کی اولاد ہیں اور اُس سے دوسرا باپ نہیں بدلتے اور نہ وہ ہم کو دوسروں کے بیٹوں کے بدلے بیچتا ہے۔

علَت بنا إلی خیرِ الظہورِ وحطّنا ... لوقتٍ إلی خیرِ البطونِ نزولُ

ہم باپوں کی اچھی پشتوں میں بلند ہوئے اور پھر نزولِ مقدر نے ہمیں ایک وقت معین تک ماؤں کے اچھے شکموں میں اتارا۔

لَعَمْرُكَ مَا أُخْزَى إِذَا مَا نَسَبْتَنِي ۔ إِذَا لَمْ تَقُلْ بُطْلاً عَلَيَّ وَمَيْنَا

تیری جان کی قسم ہے جب تو میرا نسب بیان کرے گا میں رسوا نہ ہوں گا، بشرطیکہ تو میرے بارے میں جھوٹ سے کام نہ لے۔

(۷) یہ لوگ اپنی اولاد سے خصوصاً بیٹوں سے بہت محبت کرتے تھے کیونکہ اس لوٹ مار کے زمانہ میں بیٹوں سے خاندان کی حفاظت کی توقع ہوتی تھی۔ جس شخص کے زیادہ بیٹے ہوتے تھے وہ بہت خوش نصیب سمجھا جاتا تھا۔

إِنَّمَا أَوْلَادُنَا بَيْنَنَا ۔ أَكْبَادُنَا تَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ

لَوْ هَبَّتِ الرِّيحُ عَلَى بَعْضِهِمْ ۔ لَامْتَنَعَتْ عَيْنِي مِنَ الْغَمْضِ

بیشک ہماری اولاد ہمارے درمیان، ہمارے جگر کے ٹکڑے ہیں جو زمین پر چلتے ہیں اگر ان میں سے کسی پر ہوا بھی چلتی ہے تو میری آنکھ کو نیند حرام ہو جاتی ہے۔

اسحاق بن خلف اپنی بیٹی کی محبت میں کہتا ہے:-

لَوْلَا أُمَيْمَةُ لَمْ أَجْزَعْ مِنَ الْعَدَمِ ۔ وَلَمْ أُقَاسِ الدُّجَى فِي حِنْدِسِ الظُّلَمِ

اگر میری بیٹی امیمہ نہ ہوتی تو میں افلاس سے مطلق نہ ڈرتا اور نہ میرے کی سختیاں، تاریک راتوں میں برداشت کرتا

وَزَادَنِي رَغْبَةً فِي الْعَيْشِ مَعْرِفَتِي ۔ ذُلَّ الْيَتِيمَةِ يَجْفُوهَا ذَوُو الرَّحِمِ

یتیمہ کی خواری کے خیال نے کہ (میرے بعد) اس کے رشتہ دار اس کو ذلیل کریں گے، مجھ کو زندگی کا زیادہ خواہش مند کر دیا ہے۔

أُحَاذِرُ الْفَقْرَ يَوْمًا أَنْ يُلِمَّ بِهَا ۔ فَيَهْتِكَ السِّتْرَ عَنْ لَحْمٍ عَلَى وَضَمِ

میں ڈرتا ہوں کہ کسی روز اس کو افلاس نہ آ دبائے اور اس ضعیف اور بے کس (لڑکی) کی پردہ دری کر دے۔

حطّان بن المعلّٰی کہتا ہے:-

لَوْلَا بُنَيَّاتٌ كَزُغْبِ الْقَطَا ۔ رُدِدْنَ مِنْ بَعْضٍ إِلَى بَعْضِ

لَكَانَ لِي مُضْطَرَبٌ وَاسِعٌ ۔ فِي الْأَرْضِ ذَاتِ الطُّولِ وَالْعَرْضِ

اگر میرے پاس قطا کے چھوٹے بچوں کی مانند لڑکیاں نہ ہوتیں جن کے بارے میں مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے بعد وہ ادھر سے ادھر لوٹائی جائیں گی تو البتہ میرے لئے زمین پر جو بہت لمبی چوڑی ہے کہیں چلے جانے کو بہت فراخ میدان ہوتا۔

(۸) اس زمانہ کے لوگ موٹے فربہ اور بڑے پیٹ والے آدمیوں کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ موٹا آدمی نہ دوڑ سکتا ہے نہ میدانِ جنگ میں کوئی کام کر سکتا ہے اور ان لوگوں کی معاشرت اس بات کی مقتضی تھی کہ ہر شخص چست و چالاک اور چاق چوبند ہو اور ہر وقت لڑنے مرنے کے لئے تیار ہے۔

چنانچہ ایک عورت اپنے بھائی کی تعریف میں کہتی ہے:-

فَتًى قُدَّ قَدَّ السَّيْفِ لَا مُتَضَائِلٌ ۔ وَلَا رَهِلٌ لَبَّاتُهُ وَأَبَادِلُهُ

وہ جوان وہ دھاری تلوار کی طرح مستقیم القامت تھا اور اس کا سینہ، بن پستان اور بغلوں کا گوشت خوب ٹھکا ہوا تھا یعنی اس کا بدن گٹھا ہوا تھا۔

طرفہ اپنے متعلق لکھتا ہے:-

أنا الرجلُ الضّربُ الذی تعرفونَهُ خشاشٌ کرأسِ الحیّۃِ المتوقّدِ
میں چھریرے بدن کا پھرتیلا آدمی ہوں، جسے تم اچھی طرح جانتے ہو اور ارادہ کا پکا جیسے سانپ کا چمکتا ہوا سر کہ جہاں چاہتا ہے گھس جاتا ہے۔

(۹) یہ لوگ چوکنا رہنے اور کم سونے کو مردوں کی صفاتِ محمودہ میں سے شمار کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام سے پہلے عرب میں نہ کوئی قانون تھا نہ ضابطہ، نہ داد تھی نہ فریاد، نہ کوئی بادشاہ نہ حکومت، نہ فوج نہ پولس، اندریں حالات یہ لوگ آئے دن قتل و غارت کے سلسلہ میں اپنے گھروں سے دور دراز مقامات پر جاتے رہتے تھے پس ہوشیاری، بیداری اور چوکنا رہنا ان کے لئے اتنا ہی ضروری تھا جتنا کھانا پینا۔ چنانچہ ابوکبیر الہذلی اپنے سوتیلے بیٹے تأبّط شرّا کے متعلق لکھتا ہے:-

فَاِذَا نَبَذْتَ لَهُ الحصاۃَ رَأَیْتَهُ یَنْزُو لِوَقْعَتِهَا طُمُورَ الْاَخْیَلِ
پس اے مخاطب! جب تو اس کی جانب کنکریاں پھینکے تو وہ ان کی آہٹ سے یعنی گرنے کی آواز سے، شکرے کی طرح جست کرتا ہے۔

(۱۰) چونکہ ان لوگوں کا ذریعۂ معاش لوٹ مار تھا اس لئے یہ لوگ بلا تکلف جب موقع پاتے دوسروں کے اونٹ زبردستی چھین کر لے جاتے تھے، چنانچہ قریظ ایک شاعر تھا اس کے اونٹ بنی لقیطہ کے لوگ زبردستی لے گئے، اس نے اپنی قوم سے امداد طلب کی لیکن کسی نے ان کی مدد نہ کی، ناچار شاعر نے بنی مازن سے حسب ذیل اشعار میں امداد طلب کی:-

لَوْ کُنْتُ مِنْ مَازِنٍ لَمْ تَسْتَبِحْ اِبِلِی بنو اللّقیطۃِ مِنْ ذُهْلِ بْنِ شَیْبَانَا
اگر میں قبیلۂ بنی مازن میں سے ہوتا تو بنی لقیطہ جو آلِ ذہل بن شیبان ہیں، یوں آسانی کے ساتھ میرے اونٹ لوٹ کر نہ لے جاتے۔

اِذًا لَقَامَ بِنَصْرِی مَعْشَرٌ خُشُنٌ عِنْدَ الحَفِیظَۃِ اِنْ ذُو لُوثَۃٍ لَانَا
بیشک میری مدد کے لئے بہادر آدمیوں کا ایک گروہ جو بہت سخت مزاج ہیں، مستعد ہو جاتا گو سست ارادہ لوگ بمقتضائے طبع یا قوی لوگ خوف کی وجہ سے نرمی اختیار کرتے۔

قَوْمٌ اِذَا الشَّرُّ اَبْدَی نَاجِذَیْهِ لَهُمْ طَارُوا اِلَیْهِ زَرَافَاتٍ وَوُحْدَانَا
وہ ایسی قوم ہیں کہ جب لڑائی کسی درندہ کی طرح اپنی کچلیاں ظاہر کر دیتی ہے (یعنی تیز ہو جاتی ہے) تو وہ لوگ اس پر اکٹھے اور تنہا ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ عربوں کی شاعری میں جوش ہے، ولولہ ہے، خطابت ہے، طوفان ہے! اس طوفان میں کہیں ٹھہراؤ نظر نہیں آتا ——— اور یہ چیز دلالت کرتی ہے عربوں کے جرأت و بے باک ہونے پر! صاف گوئی بےباکی اور غیرت و حمیت کا یہ وصف اسلام میں آکر اور نکھر گیا۔ اسلام نے عربوں کی برائیوں کو مٹا دیا، اور شریفانہ خصائل کو چمکا دیا۔

"مادہ پرستوں" سے چند علمی سوالات

ہمارے فاضل دوست جناب پروفیسر سلیم چشتی نے چند سوالات مرتب کرکے بھیجے ہیں، جن کو ہم اس توقع کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں کہ ان پر علمی انداز میں گفتگو کی جائے گی، اہلِ علم اگر نیک نیتی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کسی مسئلہ کی تحقیق کریں اور مقصد مناظرہ اور مجادلہ نہ ہو تو حق واضح ہوسکتا ہے۔

علم و بصیرت اور دانش و آگہی کی روشنی میں ہدایت کی راہ مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ قبولِ حق کے لئے اندر سے آمادگی بھی ہو، عقل سوچنے اور غور کرنے کے لئے ہی دی گئی ہے، صحت مند عقل کا یہی کام ہے کہ کھوٹے اور کھرے کو پرکھے اور حق و باطل میں تمیز کرے ان سوالات میں فہم و فراست کو کام میں لانے کے لئے باریکیوں سے زیادہ گنجائشیں موجود ہیں یہ موضوع دورِ حاضر کا سب سے زیادہ اہم علمی موضوع ہے اس پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو ہونی چاہئے ——— "م"

۱۔ مادّہ (matter) کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا مصداق کیا ہے؟

۲۔ مادّہ میں صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں؟

اگر پائی جاتی ہیں تو مادہ سے ان کا علاقہ کیا ہے؟ یعنی وہ صفات عین مادہ ہیں یا غیر مادہ؟ اور وہ کون کون سی ہیں؟

۳۔ مادّہ، مادّی اور مجرّد، ان تینوں میں آپکے زاویۂ نگاہ اور مسلک کی رُو سے کچھ فرق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس پر دلیل کیا ہے؟ اور اگر فرق ہے تو مادہ کیا ہے؟ منسوب الی المادہ کیا ہے؟ مجرد کیا ہے؟ ان تینوں کے لوازم اور عوارض کی تفصیل بیان کیجئے

اگر یہ تینوں متحد ہیں تو اس پر کیا دلیل ہے؟

اگر مغایر ہیں تو اس کی کیا دلیل ہے؟

۴۔ حواسِ خمسۂ ظاہری و باطنی کے علاوہ حصولِ علم کا کوئی اور ذریعہ ہے یا نہیں؟

۵۔ عقلِ انسانی کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟ ——— اور عقل کی صحت یا غلطی کا معیار کیا ہے؟

۶۔ حصولِ علم کے ذرائع کیا ہیں؟

اور علم، عالم اور معلوم میں کیا رشتہ ہے؟

۷۔ عقل، علم اور شعور میں کیا رشتہ ہے؟

۸۔ آپ کی رائے میں علم، حاضر عند المدرک کا نام ہے یا مابہ الانکشاف کا نام ہے؟

۹۔ علم، عالم کی صفت انضمامیہ ہے یا کوئی امر انتزاعی ہے؟

۱۰۔ کیا آپ کسی ایسی شئے کے وجود کو تسلیم کرسکتے ہیں جو حواس خمسہ سے محسوس نہ ہو۔

براہِ کرم جوابات مفصل اور نہایت واضح طور پر دیجیے اور ان کتابوں کے نام بھی لکھیے جو آپ کے نزدیک مسلّم ہیں اور جن میں مادیت کی مستند تشریح موجود ہو۔

۔۔۔۔ اور چراغ نہیں بجھا!

ذرا سی کنکری پانی میں ڈوبتی ہے تو سطحِ آب میں بھنور سا پڑجاتا ہے، ہلکے پھلکے تنکے ہوا میں منتشر ہوتے ہیں تو فضا بے چین ہوجاتی ہے ـــــ علم وعمل کا آفتاب جب غروب ہو تو افق روشن وتابناک کیسے رہ سکتی ہے اُسے دُھندلا اور تاریک ہوجانا ہی چاہئے، مبالغہ نہیں حقیقت اور واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی شخصیت دُنیائے اسلام کے افق پر سورج بن کر چمک رہی تھی جس کے ڈوبتے ہی افق پر اندھیرا سا چھا گیا، جہاں روشنی تھی وہاں تاریکی دیکھی اور محسوس کی گئی ـــــ المیہ، حزنیہ، ٹریجڈی، جب آنکھیں خشک ہوتی ہیں اور دل غم کی شبنم افشانی کرتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ سورج ڈوب گیا، فضا تاریک ہوگئی اور علم وحکمت کا چراغ بجھ گیا ـــ مگر اب کہتا ہوں اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ سورج چمک رہا ہے، چراغ جل رہا ہے، شمع روشن ہے اور اُجالا پھیلا ہوا ہے، "شبیر احمد" گوشت پوست کے ایک مجسمہ اور ایک پیکر کا نہیں ایک اصولِ حیات ایک زاویہ فکر اور ایک پیامِ زندگی کا نام تھا، جسدِ خاکی ہمارے درمیان سے اُٹھ لیا گیا کہ یہ قانونِ فطرت ہے مگر جانے والے کا پیام زندہ اور پائندہ ہے، زندگی کی شاہراہ میں اس کے نقشِ پا صاف نظر آرہے ہیں اُس کے فکر وعمل کی شمع بدستور روشن ہے ـــــ یہ پیام، یہ شاہراہ، یہ شمع ..... کیا تھی؟ ـــــ "اسلام"! اور یہ وہ شمع ہے جسے افراد کیا قوموں کی موت کے سانحے بھی گل نہیں کرسکتے، یہ چراغ جو صبحِ ازل میں روشن ہوا تھا شامِ ابد تک جلتا رہے گا۔

آج کی دُنیا میں عالموں کی کمی نہیں ہے، کالجوں، درسگاہوں، دار العلوموں اور یونیورسٹیوں نے "علاماؤں" اور "ڈاکٹروں" کی جنسِ گرانمایہ کو بہت ارزاں کردیا ہے مگر ان میں کتنے ہیں جو ڈگریوں اور لقب وخطاب کی اضافتوں کے ساتھ علمی بصیرت بھی رکھتے ہیں، اور پھر اُن کا عمل اُن کے علم سے ہم آہنگ بھی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی سعادت سے نوازا تھا اور یہ سعادت ان کے کردار اور زندگی کی زبان سے بولتی سُنی گئی۔

شیخ الاسلام علم وفضیلت کے اُس بلند مقام پر فائز تھے جہاں امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی عباؤں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، انہوں نے کم وبیش چالیس سال بوریے پر بیٹھ کر علمِ دین کا درس دیا اور سینکڑوں تشنگانِ علم وادب کو نہ صرف سیراب کیا بلکہ اس قابل بنادیا کہ وہ خود دوسروں کی پیاس بجھا سکیں، قرآنِ مقدس کے ترجمہ پر شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے حواشی اور فوائد پڑھ کر علامہ ابنِ کثیر کی قرآنی بصیرت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ صحیح مسلم شریف کی شرح (عربی) میں امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے فہمِ حدیث کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور "العقل والنقل" سے امام غزالی کی اسلامی فلسفیانہ فکر کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے ـــــ علامہ مرحوم نے نہایت قوی حافظہ پایا تھا، اس پیرانہ سالی میں بھی تمام علوم مستحضر تھے کوئی علمی تذکرہ چھڑ جاتا تو گفتگو میں کتابوں کا حوالہ دیتے جاتے، اس تمام علم وفضل کے باوجود طبیعت میں بیحد انکسار تھا

جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز جگہ پر بیٹھتے تو فرطِ تواضع سے گردن جھکا لیتے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کا اندازِ تقریر بے حد دل نشین اور اثر انگیز تھا، "از دل خیزد بر دل ریزد" کی کیفیت اُن کی تقریر میں ہر سننے والے کو محسوس ہوتی، سادہ سادہ باتیں، بناوٹ، تکلف اور آورد سے دُور! داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے سامعین کے جذبات سے وہ نہ کھیلتے، شروع سے آخر تک تقریر میں وقار و متانت کا سلسلہ قائم رہتا، اکبر الہ آبادی کے اشعار نہایت سلیقہ کے ساتھ استعمال فرماتے، اور اُن کی باریکیوں اور حکیمانہ نکتوں کی شرح بھی کرتے جاتے، علامہ کی تقریریں اگر منضبط کر لی جاتیں تو علم و ادب کا یہ بہت بڑا سرمایہ ہوتا ——— حکومتِ آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم کے اعزاز میں موتمر عالمِ اسلامی نے نہایت شاندار پارٹی کا اہتمام کیا، حضرت علامہ سے بھی حاضرین نے تقریر کے لئے کہا، آپ نے کھڑے ہو کر مختصری تقریر کی ——— مگر نہایت جامع اور کارآمد۔ فرمایا:۔

"ہم کشمیر کی گتھی کو پُر امن طریقہ پر سلجھانا چاہتے ہیں مگر یہ بھی یاد رہے کہ جب گرہ کسی طرح کھُل ہی نہیں پاتی تو پھر اُسے کاٹ دینا پڑتا ہے ———"

آرام باغ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے یہ جملے اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:۔

"اگر حکومت مجھ پر زر و جواہر کی بارش کر دے تو بھی میں کسی خلافِ اسلام فعل میں اُس کی ذرہ برابر تائید نہ کروں گا اور اگر پبلک میرا مُنہ کالا کر کے اور گدھے پر چڑھا کر شہر کی گلیوں میں میری تشہیر کرے تو اُس وقت بھی حق و صداقت کی راہ سے نہ ہٹوں گا ———"

آخری ملاقات

علامہ مرحوم کے رہنے سہنے کا انداز سادہ اور تکلفات سے دُور تھا، معمولی لباس پہنتے، اُن کی سج دھج میں کوئی امتیازی شان نہ پائی جاتی تھی، طبیعت متواضع تھی، فراستِ مومن بھی اللہ نے اُن کو بخشی تھی اور ساتھ ہی حرمِ کعبہ کے کبوتر کی طرح بھولے بھالے بھی تھے، اس بھولے پن سے بعض اہلِ غرض جا و بیجا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے، اُن کی ذات سے لوگوں کو دین ہی کا نہیں دُنیا کا فائدہ بھی پہونچتا رہا، کوئی اپنی پریشانی ظاہر کرتا تو اُس کی داستانِ غم سُن کر ہر ممکنہ امداد کے لئے تیار ہو جاتے ——— اپنے ذاتی معاملات اور ضرورتوں کے لئے محتاط اور انتہائی غیور و خود دار مگر دوسرں کی امداد و اعانت کے واسطے کُشادہ دست، یہاں تک کہ عہدیداروں کے یہاں جا کر سفارش کرنے سے بھی گریز نہ فرماتے۔

بہاولپور کا سفر علامہ مرحوم کا آخری سفر تھا، بہاولپور تشریف لے جانے سے دو تین دن پہلے میں علامہ عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت امیر مینائی کے پوتے تسنیم مینائی میرے ساتھ تھے، صبح کے کوئی نو بجے ہوں گے، حسبِ دستور بڑے تپاک اور محبت کے ساتھ ملے، تسنیم صاحب سے نواب اختر یار جنگ بہادر مرحوم (سابق ناظم امورِ مذہبی حکومت دکن) کے بعض اعزا، کا حال پوچھتے رہے، اور مجھ سے دریافت فرمایا ——— "آپ کے رسالے "فاران" کا کیا حال ہے؟" میں نے دبے دبے لفظوں میں سرسری کیفیت بیان کی، قدرے متاثر ہو کر بولے ——— "آج کل تو تصویروں والے پرچوں کی مانگ ہے۔" بات کرتے میں زبان لڑکھڑاتی رہی، فالج کا اثر زبان اور تیوروں سے نمایاں تھا، مگر ہونٹوں پر بار بار مسکراہٹ بکھر بکھر جاتی، چہرہ شاداب تھا لیکن اس شادابی کے جھروکے سے پژمردگی بھی جھانک رہی تھی۔

علامہ عثمانی سے مجھ گنہگار کی یہ آخری ملاقات تھی، جو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی، آہ! چلتے وقت گرمجوشی کے ساتھ وہ مصافحہ! جیسے کوئی کسی کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہا ہو، اُس وقت اس کا سان گمان بھی نہ تھا، مگر اب سوچتا ہوں تو وہ

سماں ایک ہونے والے واقعہ کی پیش گوئی کی صورت میں نظر آتا ہے —— جسے چند دن پہلے چلتا پھرتا اور بولتا چالتا دیکھا تھا پھر اُس کے جنازے کو ہزاروں آدمیوں کے ہجوم میں دیکھا، تابوت کو کاندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لئے لوگ پروانہ وار ٹوٹے پڑتے تھے اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد قبولِ عام، عقیدت، وابستگی اور ہر دلعزیزی کو اور بڑھا دیا، اسی نسبت سے آخرت میں بھی درجات میں ترقی اور بلندی نصیب ہوگی، اور شہیدوں کی طرح قربِ حق کے باغوں اور آبشاروں سے رزق دیا جائے گا اور سیراب کیا جائے گا۔

شیخ الاسلام مرحوم جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی اسیری سے بہت ملول اور متاثر تھے، مولانا مودودی کی گرفتاری پر علامہ عثمانی نے اخبارات کو بیان بھی دیا تھا، مولانا مودودی کے دینی کارناموں کے وہ بہت مداح تھے، علامہ مرحوم جناب مودودی کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے تاکہ دینِ حق کی وہ کھُل کر خدمت کر سکیں، اور "سچائی کی تلوار نیام میں نہ رہے" —— شیخ الاسلام کی یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی،

اگر حکومتِ پاکستان اپنے فرائض کو پہچانے اور مولانا مودودی اور اُن کے رفقاء کو رہا کردے تو اس کا یہ فعل یقیناً شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کی رُوح کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

وہ کیا چاہتے تھے

علامہ عثمانی کی دینی اور قومی خدمات جلیل القدر ہیں، پاکستان کی تعمیر میں وہ قائدِ اعظم مرحوم کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو "قرار دادِ مقاصد" کی منظوری کا جو شرف اور سعادت حاصل ہوئی اُس میں علامہ مرحوم کے فکر و عمل کی بہت کچھ کار فرمائی تھی، پاکستان کو قرآن و سنت کی بنیاد اور منہاج پر "اسلامی حکومت" بنانا، علامہ عثمانی کا مقصدِ حیات تھا، وہ اسی مقصد کے لئے جی رہے تھے کہ اتنے میں جان آفریں کے یہاں سے بلاوا آن پہنچا "اے میرے نیک بندے، اپنا کام دوسروں کو سونپ کر ہمارے یہاں چلا آ"

اب یہ ہم سب کا فرض ہے کہ علامہ مرحوم کے مقصد کے حصول کے لئے جو حقیقت میں اسلام کا مقصد ہے جدوجہد کریں، حکومتِ پاکستان کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر اللہ کے مطیع اور فرماں بردار بندے بن جائیں، اربابِ حکومت کے اعمال پر ہمیں نکتہ چینی کرنے کا یقیناً حق حاصل ہے لیکن ہمیں دوسروں کے دامنوں کے دھبے دیکھنے سے پہلے اپنے گریبانوں پر بھی تو ایک نظر ڈال لینی چاہئے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسیحا نفسی کے دعوے دار خود ہی بیماری میں مبتلا ہوں۔

بعض لوگ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام اربابِ حکومت کو ٹوکتے رہتے تھے اور اُن کی ذات سیاست اور مذہب کے درمیان "مرکزِ ثقل" کی حیثیت رکھتی تھی، اُن کے بعد ڈھیل اور بے پروائی پیدا ہو جائے گی، —— ہماری تمنا ہے کہ اہلِ اقتدار لوگوں کے اس اندیشہ کو اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیں اور بتا دیں کہ شیخ الاسلام کے سانحۂ وفات نے اُن کے دلوں میں خدا کا خوف اور ذمہ داری کا احساس پہلے سے بہت زیادہ کر دیا اور حکومتِ پاکستان کو دنیا کے اس اندھیرے میں "شمعِ ہدایت" بن کر جلوہ آرا ہونا ہے یہاں تک کہ لندن اور واشنگٹن کے فلک بوس قصر اور ماسکو

لہ علامہ عثمانی کے اخباری بیان کے الفاظ۔

کے ایوانِ حکومت سچائی کے نور سے جگمگانے لگیں، اور پریشان حال مخلوق کو امن و عافیت کی زندگی میسر آسکے ——— اسلام اور صرف اسلام ہی کی وحدت دُنیا کے انتشار اور پراگندگی کو دُور کر سکتی ہے۔

شیخ الاسلام اس دُنیا سے چلے گئے، فنا جو ہر "جان" (نفس) کے لئے مقدر کر دی گئی ہے اُس کی دستبرد سے وہ بھی نہ بچ سکے، ہم جو آج جی رہے ہیں ہم پر بھی یہی گھڑی آنے والی ہے، شہرتیں، ناموریاں اور مال و زر کے انبار سب اسی دُنیا میں رہ جاتے ہیں، ساتھ جو چیز جاتی ہے وہ صرف "اعمال" ہیں! یہی زادِ راہ اور توشۂ منزل ہے، ——— آؤ! اس منزل کے لئے کچھ کر رکھیں ——— والعاقبۃ للمتقین!

علی اختر

عصرِ حاضر

علی اختر کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اسلامی فکر کے سانچے میں ڈھلنے کی توفیق بلکہ سعادت میسّر آئی، یہی سبب ہے کہ پروازِ خیال کی جن بھول بھلیوں میں بڑے بڑے "شاعرانِ انقلاب" گم کردہ راہ ہوگئے وہاں علی اختر نے سوزِ باطن سے چراغ جلائے۔

آج کچھ احباب جن سے ہے پرانی رسم و راہ / کہہ رہے تھے، سطح بیں ہے کس قدر میری نگاہ
کر چکا شرحِ حقائق عصرِ حاضر کا نظام / اور میں اب بھی روایاتِ کہن کا ہوں غلام
جس کی ہستی ہے سراسر عقل و دانش کے خلاف / میری نااہلی کو ہے ایسے خدا کا اعتراف
کس کو فرصت ہے کہ ان اوہام کی ہو جستجو / میں کیے جاتا ہوں مذہب پر ابھی تک گفتگو
صرف ویرانوں میں ہیں اب جس تمدن کے نشاں / میں ابھی دُہراتے جاتا ہوں اُسی کی داستاں
وہ فریبِ روح باقی ہے نہ وہ خوابِ ضمیر / میری نظریں ہیں مگر بوڑھے رواجوں میں اسیر
جس نے انساں کو دیا تھا جہل و باطل کا نظام / ہے اُسی تہذیب کی مدّاح میری طبعِ خام
عرصۂ ہستی میں جس کا مدعا کچھ بھی نہ تھا / دین و بے دینی کے جھگڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

جس نے آسائش کا شیرازہ پریشاں کر دیا
عقلِ انسانی کے خال و خد کو ویراں کر دیا

(۲)

میں خدا کو مانتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں / بے تکلف ہے مجھے مذہب کی صحت کا یقیں
میرا ایماں ہے خدا کا بھید پا سکتی نہیں / عقل تنہا ان حجابوں کو اُٹھا سکتی نہیں
مجھ کو "تہذیبِ کہن" سے بھی نہیں کوئی عناد / مشرقی آئین پر ہے دل سے میرا اعتماد
سرمدی ہے میری نظروں میں یہ دستورِ حیات / میں سمجھتا ہوں اسی میں ہے زمانے کی نجات

ہاں مگر اب عہدِ حاضر کی روش کچھ اور ہے / نوعِ انسانی کے سینہ کی خلش کچھ اور ہے

اس زمانے میں تمدن ہو کہ تہذیبِ قدیم
پھول ہیں ایسے نہ رنگ ان میں نہ باقی ہے شمیم

وہ ادائے حُرّیت اس میں نہیں ملتی، مگر
قسمتِ اقوام پر ہوتا ہے یاں جس کا اثر

کاش یوں ہوتا مری سیرت کی خامی دیکھتے
نکتہ چیں اپنے گریباں کی طرف بھی دیکھتے

میں نے مانا میرے دن تاریک ہیں مانندِ شب
میں مقلد ہوں تو وہ تقلید سے خالی ہیں کب

گر مجھے جکڑے ہوئے ہیں عہدِ ماضی کے اصول
بیڑیاں کی ہیں انہوں نے عصرِ حاضر کی قبول

دل اسیر، آنکھیں اسیر و مبتلا، روحوں پہ قید
زد سے مشرق کی جو بچ نکلے ہوئے مغرب میں صید

(۳)

یہ تو سمجھائے گی مستقبل کی تنقیدی نگاہ
کون تھا منزل شناس اور کون تھا گُم کردہ راہ

لیکن اتنا آج سُن رکھے 'یہ دستورِ کہن'
اس دھندلکے میں بھی پیشانی ہے جس کی ضو فگن

یونہی صدیوں سے ہے جاری باوجودِ اختلاف
سینکڑوں اربابِ دانش کو ہے اس کا اعتراف

اور اس عصرِ حقائق کا وہ تمہیدی نظام
سطح کی ہمواریوں کا اِک اصولِ ناتمام

خامیاں اُس کی ابھی سے ہو رہی ہیں یوں عیاں
چند دن میں لے رہا ہے نزع کی سی ہچکیاں

دیکھئے اب یہ جہاں پاتا ہے کیا، کھوتا ہے کیا
دانشِ گمراہ پر اس کا اثر ہوتا ہے کیا

اس قدر تہذیبِ حاضر سے محبت ہے جنہیں
اپنی ہر شئے کو بُرا کہنے کی عادت ہے جنہیں

اُن کی یہ طوفاں خرامی سُست گامی تو نہیں
غور سے دیکھیں یہ انجام غلامی تو نہیں

فکر و نظر

عاصی کرنالی

نہ وہ ذوقِ جادہ پیما، نہ وہ دل، نہ وہ نگاہیں
ابھی اپنی منزلوں سے تجھے دیکھتی ہیں راہیں

یہ بہارِ لالہ و گُل، یہ چمن کی جلوہ گاہیں
کہیں عصمتوں کا دامن نہ بچا سکیں نگاہیں

نہ یہ پُر سکوں مساجد، نہ یہ سرد خانقاہیں
کہیں اور دیکھتی ہیں مری منتظر نگاہیں

انہیں آزمائشوں نے مجھے حوصلے دیئے ہیں
کہ جو آ گئی ہے منزل تو پلٹ گئی ہیں راہیں

تو زمیں کو فتح کر لے، میں فلک پہ تیر ماروں
ترے پاس چند آنسو، مرے پاس چند آہیں

گُل و گلستاں سے بڑھ جا، مہ و مہر سے گزر جا
کہ نظر تراشتی ہے یہی چند سیر گاہیں

میں وہ عشق چاہتا ہوں جو حدوں سے ماورا ہو
نہ جنوں کا آستانہ، نہ خرد کی بارگاہیں

شفیق صدیقی جونپوری

سُلطان ناصر الدّین

ناصر الدین سے اک روز یہ ملکہ نے کہا
ایک لونڈی مجھے درکار ہے خدمت کیلئے

روٹی رکھتی ہوں توے پر تو جھُلس جاتے ہیں ہاتھ
وقف ہے زیست مری رنج و مصیبت کیلئے

آپ ہوں بارگہِ تخت و عَلَم کی رونق
اور خاتونِ محل رنج و مشقت کیلئے

ناصر الدین نے ہنس کر ملکہ سے یہ کہا
تخت ہے میرے لئے میں ہوں رعیت کیلئے

لشکر و مال ہو یا خیمہ و دیہیم و علم
ہیں یہ سامان رعایا کی حفاظت کیلئے

دولت و تاج و حکومت ہے برائے سلطاں
اور سلطان ہے مخلوق کی خدمت کیلئے

ایک پیسہ بھی خزانے سے اگر لے سلطاں
ایک دھبّہ ہے وہ دامانِ عدالت کیلئے

مُلک کی آمدنی مُلک پہ کی جاتی ہے خرچ
کب خزانے ہیں سلاطین کی عشرت کیلئے

تاجِ شاہی اسے زیبا ہے جو ہو خادمِ قوم
تاج ہوتا نہیں آرائش و زینت کیلئے

میں تو قرآں کی کتابت سے بسر کرتا ہُوں
ایک تدبیر ہے یہ اپنی کفالت کیلئے

رزق جب صرف کتابت پہ ہے موقوف اپنا
خادمہ لاؤں کہاں سے تری راحت کیلئے

صبر کر ہاتھ جُھلسنے پہ کہ اے محرمِ راز!
عورتیں ہوتی ہیں شوہر کی رفاقت کیلئے

زندگی میں جو غم و رنج تجھے پیش آئیں
کر گوارا اُسے عقبےٰ کی مسرت کیلئے

اسد ملتانی

عصمتِ خیال

بسکہ بیتاب ہوں پُر شور ہے زنداں مجھ سے
میں نہیں، حلقۂ زنجیر ہے نالاں مجھ سے

دل میں کیا ولولۂ شوق نے بجلی بھر دی
خوف لرزاں ہے، غم و یاس ہراساں مجھ سے

ترکِ اُلفت کا بہانہ مری حالت سے ملا
مشکل اربابِ ہوس کی ہوئی آساں مجھ سے

فقرِ ہمت کا نتیجہ ہے کہ مجبوری کا
میں ہوں دُنیا سے کہ دُنیا ہے گریزاں مجھ سے

اس فقیری میں بھی شاہوں سے ہے چشمک میری
زندہ ہے کشمکشِ مور و سلیماں مجھ سے

میری رندی سے کسی کی بھی تسلی نہ ہوئی
کفر مایوس ہے، اسلام پشیماں مجھ سے

زاہدوں کو مری باتوں کی ضرورت نہ سہی
تازہ ہے اہلِ خرابات کا ایماں مجھ سے

اس سے کیونکر متاثر نہ ہو دُنیائے عمل
ہے بپا عالمِ افکار میں طوفاں مجھ سے

عکس پڑتا ہے مرے خونِ جگر کا اس میں
شبنمِ شعر و غزل ہے شرر افشاں مجھ سے

کبھی اس شہر کی شہرت تھی بزرگوں کے سبب
اے اسد آج ہے رسوائی ملتاں مجھ سے

دو غزلیں

عبدالمجید حیرت شملوی

ہے حکم کہ کوئی کچھ نہ بولے
دل دے کے زباں تک نہ کھولے

دیکھا جو مزاجِ یار برہم
پھر کس کی مجال تھی کہ بولے

کیا قابلِ سرزنش ہمیں ہیں
اپنا بھی تو دل کوئی ٹٹولے

اب یہ بھی نہیں کسی کی قسمت
دم بھر تو ذرا سکوں سے سولے

ہے دل میں عجیب ایک الجھن
ہے کون جو اس گرہ کو کھولے

ہوتا نہیں دل بھی کام کا دل
جب تک کہ اسیرِ غم نہ ہولے

کٹنے ہی کٹے گی ہجر کی شب
رونے کو ہزار کوئی رولے

پھر اور بھی کچھ کریں گے حیرت
اک کام تو پہلے ہم سے ہولے

نذیر بنارسی

اب چمن میں مرا اک ٹھکانا تو ہے
چار تنکے سہی آشیانا تو ہے

جل بھی جائے نشیمن تو پروا نہیں
بجلیوں سے مرا دوستانا تو ہے

اُن لبوں کی خوشی نہیں بے سبب
ناشنیدہ ہے لیکن فسانا تو ہے

ایک ہم ہی کو ٹھکرایئے گا تو کیا!
آپ کی ٹھوکروں میں زمانا تو ہے

مجھ کو اپنی شکستوں کا کچھ غم نہیں
آپ کی ہر نظر فاتحانہ تو ہے

دِل مرا رو رہا ہے یہ دل کی خوشی
اُن کی خاطر مجھے مسکرانا تو ہے!

صبحِ سعادت

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی انساں سے انساں ٹکرائے

پامال کیا برباد کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم و ستم حد سے گزرے تشریف محمدؐ لے آئے

رحمت کی گھٹائیں لہرائیں، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام و عطا کی بارش کی، اخلاق کے موتی برسائے

تہذیب کی شمعیں روشن کیں اونٹوں کے چرانے والوں میں
کانٹوں کو گلوں کی قیمت دی، ذروں کے مقدر چمکائے

کچھ کیف دیا کچھ ہشیاری، کچھ سوز دیا کچھ ساز دیا
میخانۂ علم و عرفاں میں توحید کے ساغر چھلکائے

ہر چیز کو رعنائی دے کر دنیا کو حیاتِ نو بخشی
صبحوں کے بھی چہروں کو دھویا، راتوں کے بھی گیسو سلجھائے

اللہ سے رشتہ کو جوڑا، باطل کے طلسموں کو توڑا
خود وقت کے دھارے کو موڑا، طوفاں میں سفینے تیرائے

تلوار بھی دی قرآں بھی دیا، دنیا بھی عطا کی عقبیٰ بھی
مرنے کو شہادت فرمایا، جینے کے طریقے سمجھائے

مکہ کی زمیں اور عرش کہاں دم بھر میں یہاں پل بھر میں وہاں
پتھر کو عطا گویائی کی اور چاند کے ٹکڑے فرمائے

مظلوموں کی فریاد سنی مجبوروں کی غم خواری کی
زخموں پہ خنک مرہم رکھے، بے چین دلوں کے کام آئے

عورت کو حیا کی چادر دی، غیرت کا غازہ بھی بخشا
شیشوں میں نزاکت پیدا کی، کردار کے جوہر چمکائے

توحید کا دھارا رک نہ سکا، اسلام کا پرچم جھک نہ سکا
کفار بہت کچھ جھنجھلائے شیطان نے ہزاروں بل کھائے

اے نامِ محمدؐ صلِّ علیٰ! ماہرؔ کیلئے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا، آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

ماہر القادری

ماہر القادری

عرب کی گرمی ..... جیسے آفتاب سوا نیزے پر آگیا، کھجور کے پیڑ جھلسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں گویا رات کو ان پر اوس کی جگہ گرم ببول برستی ہے، سورج کی کرنیں انتہائی بے رحم ہو چکی ہیں، ریت کے ذرے، کنکریاں اور خشک پہاڑیوں کے پتھر تمازت کے اثر سے دہک رہے ہیں، بگولوں کی رنگت سرخی مائل ہے جیسے ہوا میں شعلے اُڑ رہے ہیں، جنگلوں میں دُور دُور تک آدمی تو آدمی کوئی پرندہ تک دکھائی نہیں دیتا، چاروں طرف آتش خاموش کی حکمرانی! ریت کے ٹیلے نہیں آتش کدے یا کم سے کم الاؤ جنکو سورج کی کرنوں نے شعلہ فشاں بنا دیا ہے ــــــ مگر برف پڑ رہی ہو یا آگ برس رہی ہو زندگی کے کام بند کب رہتے ہیں، آدمی کو اللہ نے بڑی ہمت اور قیامت کا حوصلہ دیا ہے، لالہ و گل کی نرمی سے لطف اندوز ہونے والا، آگ کے شعلوں، کانٹوں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں سے بھی کھیل سکتا ہے۔

جھربیری کی سوکھی ہوئی جھاڑیوں کے جھنڈ جس ٹیلے پر نظر آتے ہیں اُس کی اوٹ سے دو شتر سوار آتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، جس جنگل میں پرندے کو پر مارنے کی ہمت نہ ہوتی ہو وہاں ان دونوں سواروں کا سفر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی اہم کام اور شدید ضرورت نے اُن کو اس جان لیوا گرمی میں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے، آگ برستے میں کوئی ہوشمند انسان سیر و سیاحت اور تفریح کے لئے گھر سے پاؤں بھی نہیں نکالتا، اپنی زندگی ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی شخص کسی ضرورت کے بغیر آرام کو چھوڑ کر بے آرام نہیں ہوا کرتا۔

یہ لو! وہ بالکل قریب آگئے، پیاس کے مارے اونٹوں کی زبانیں باہر لٹک آئی ہیں، منہ سے نکلے ہوئے جھاگ تکسے کہ گئے ہیں، مرکب بُری طرح ہانپ رہے ہیں، .... مگر چال بلا کی تیز ہے ..... یہ عرب کے اونٹ ہیں! جفاکش، محنتی اور وفاشعار، ان کو لوگ ریگستان کا جہاز کہتے ہیں، یہ جب چل پڑتے ہیں تو منزل سے اِدھر ٹھہرنا جانتے ہی نہیں، اپنے فرض کو اچھی طرح پہچانتے ہیں ــــ ایک سوار کا عمامہ ببول کی ڈالیوں میں اُلجھتے اُلجھتے رہ گیا، نکیل کے ذرا سے جھٹکے پر اونٹ نے کنوتیاں بدل کر راستہ کاٹ دیا، وہ نہ مُڑتا تو ببول کے کانٹے سوار کی اچھی طرح تواضع کرتے، اونٹوں پر کجاوے کسے ہیں، جن کی ڈوریوں میں پانی کی چھاگلیں اور ستو کی تھیلیاں لٹک رہی ہیں، ایک سوار ادھیڑ عمر کا ہے، گندمی رنگت، چھدری داڑھی موٹے خط و خال، خوب جٹی بھویں! پیشانی پر ایک گہرا سا نشان ہے! شاید بچپن میں کھیلتے اور دوڑتے ہوئے چوٹ آئی ہو اور یہ اُسی چوٹ کی نشانی ہو مگر یہ تو تلوار کے زخم کا نشان معلوم ہوتا ہے، شتر سوار کے تیور بول رہے ہیں کہ "تلوار کا زخم مرد کے جسم کا زیور ہے" ــــــ اور دوسرا آدمی قریب قریب بوڑھا! ڈاڑھی کے بال کالے کم اور سفید زیادہ، سانولی رنگت جس میں کچھ سپیدی بھی جھلک رہی ہے جوانی میں شاید کھلتا ہوا رنگ ہو! لانبا قد، چھریرا بدن، گردن میں تلوار

حمائل، چہرے کو سفر کی تکان نے پھیکا پھیکا سا بنا دیا ہے ـــــ اُن کی گفت گو :۔
ـــ عمی! عکرمہ جس دستہ کی کمان کر رہے ہیں وہ ابھی تک دکھائی نہیں دیا، کہیں خلیفہ کے حکم کا انتظار کرتے کرتے شام کی سرحد کو پار کر کے دشمن کی فوج سے نبرد آزما نہ ہو گیا ہو۔
ـــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، خلیفہ کے حکم کے بغیر اسلامی فوج کا کمانڈر لڑائی نہیں چھیڑ سکتا۔
ـــ ہم ربذہ کی وادی سے بھی آگے نکل آئے، بنو قحطان کے نخلستان بھی گزر چکے، اور یافعہ کے تالاب پر تو ہم نے کل منزل ہی کی تھی، شام کی سرحد کے نشان اب کوئی دم میں نظر آنے والے ہیں، مگر ہماری فوج ....
ـــ (بات کاٹ کر) اتنے بے صبر نہ ہو میرے بھتیجے! ہماری فوج اسی جنگل میں کسی ٹیلہ کے قریب مورچہ جمائے ہوئے ملے گی، ہو سکتا ہے کہ ہمیں راستہ بھٹک گئے ہوں ....
ـــ تو پھر ہمیں ہوشیاری کے ساتھ چلنا چاہئے، کہیں دشمن کے سپاہی گھات میں نہ بیٹھے ہوں .... اور ....
ـــ (بیچ میں بول پڑا) اور .... اور کیا؟ اور یہی ہو گا کہ دشمن کے سپاہیوں سے مقابلہ ہو گا، ہم دو ہوں گے اور وہ بہت سے! مگر اللہ پر بھروسہ کرنے والے قلت و کثرت کی پرواہ نہیں کیا کرتے، جنگ کے میدان گواہ ہیں کہ ہم مٹھی بھر مسلمانوں نے کافروں کی بڑی بڑی جمیعتوں کو شکستیں دی ہیں، بدر و خیبر کے واقعات کیا تمہارے ذہن میں محفوظ نہیں رہے!
ـــ (خوش ہو کر) وہ دیکھئے! ببولوں کے جھنڈوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا ہے ....
اونٹوں کی رفتار تیز کر دی گئی، بوڑھے سوار نے نکیل کو زور سے جھٹکا دیا، اور دوسرے نے خوب کس کر ایڑ لگائی سواریاں فراٹے بھرنے لگیں، دھوئیں کی طرف اس قافلہ کا رُخ تھا، تھوڑی دُور جا کر راہگیروں کے نشان پا بھی دکھائی دینے لگے اور پھر کمبل کی تنی ہوئی چادریں بھی! منزل مقصود آ چکی تھی ..... بلکہ آ ہی گئی! خوشی کا اظہار تکبیروں کے نعروں سے کیا گیا "اہلاً و سہلاً مرحباً" کے لفظے بھی بلند ہوئے ـــــ آنے والوں نے خلیفہ کا فرمان جو اونٹ کی کھال پر لکھا ہوا تھا فوج کے کمانڈر کے ہاتھ میں دے دیا، سپہ سالار کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہونے لگی، وہ جوش میں آ کر کہنے لگا :۔
"مجاہدو! مبارک ہو تمہیں کہ لڑائی کا حکم مل گیا، دشمن کی چھیڑ چھاڑ اور دست درازی پر اب ہم صبر نہیں کر سکتے، ہم اب تک لڑائی کو ٹالتے رہے، خلیفہ کے حکم کے انتظار میں! دشمن نے سمجھا کہ ہم کمزور ہیں، اسی لئے ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ہمت نہیں پڑتی، اب جنگ کا میدان اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ کمزور اور کم ہمت کون ہے؟" (اس پر سپاہیوں نے اس جوش کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ آس پاس کی خشک پہاڑیاں گونجنے لگیں)
سپاہی، آنے والوں سے اپنے گھر والوں کی خیریت اور حال پوچھنے لگے :۔
ـــ میں اپنی بوڑھی ماں کو بیمار چھوڑ آیا تھا، وہ اب کیسی ہے!
ـــ تمہاری ماں پہلے سے اب اچھی ہے، اُس نے مجھ سے کہا تھا میرے بیٹے عکاشہ سے کہہ دینا کہ اللہ کی راہ میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو میرا بڑھاپا تجھے بددعائیں دے گا!
ـــ اور عمی! میری دُلھن .... سعید کی جوان بیٹی! منادی کی "صدائے جہاد" سُن کر میں شادی کے تیسرے دن ہی چل پڑا تھا۔
ـــ اُس نے پردے کی آڑ سے مجھ سے کہا "میرے شوہر کو میری طرف سے پیغام پہونچانا کہ میری محبت پر خدا اور رسول کی محبت

کو ترجیح دینا، اسلام کی خاطر مجھے بیوہ ہونا قبول ہے!

گھروالوں کی طرف سے یہ ہمت افزا پیام سُن کر، مجاہدوں کے حوصلے اور بڑھ گئے، کسی اور مسلک اور دیس کے لوگ ہوتے تو اپنے رشتہ دار سپاہیوں کے پاس خبریں بھیجتے کہ تمہاری بوڑھی ماں روتے روتے مری جارہی ہے، تمہاری بہن کا بُرا حال ہے، تمہارے باپ نے اس دن سے کہ تم یہاں سے سدھارے ہو پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور تمہاری جوان بیوی چند دن کی جُدائی میں بوڑھی بوڑھی سی دکھائی دیتی ہے ـــــ مگر یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی جانیں اپنے اللہ کے ہاتھ بیچ دی تھیں۔ خُدا کی راہ میں اپنے بیٹوں، عزیزوں، دوستوں اور جگر گوشوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر بھی خدا کا شکر ادا کرتے، انہوں نے اپنے اللہ سے پیمانِ وفا باندھا تھا جسے کوئی خوف اور کسی قسم کا لالچ توڑ نہیں سکتا تھا۔

شام ہو چلی تھی، سورج کی کرنیں کھجوروں کی ڈالیوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں کو "الوداع" کہہ رہی تھیں کہ اب کل صبح تک سے آکر ملیں گے، خیموں کے آس پاس چولھوں میں آگ جل رہی تھی، دھوئیں نے شام کے دھندلکے کو اور سیاہ بنا دیا تھا جنگل میں خموشی پھیلتی جارہی تھی، کبھی کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے اور گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سکوت کو توڑ دیتی، اتنے میں ایک گھوڑے سوار دوڑتا ہوا آیا اور گھوڑے سے اُترتے ہی چلانے لگا:۔

"کافروں نے بدعہدی کی، ہمارے سفیروں کو قتل کردیا، میں بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہونچا ہوں، چند بے خبر اور نہتے آدمیوں کو قتل کر کے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑی بہادری اور جواں مردی کا ثبوت دیا، اس دھوکے اور دغابازی کو وہ "فتح" سمجھے ہوئے ہیں، ہمیں چوکنّا اور ہوشیار رہنا چاہیئے، کیا عجب ہے کہ رات کو ہم پر بے خبری میں حملہ کردیں، بدعہد، وعدہ شکن اور خدا ناترس لوگوں سے ہر بُرائی اور کمینگی کی توقع کی جاسکتی ہے"

اس خبر نے سب کو دلگیر اور ساتھ ہی پُرجوش بنا دیا، تلواریں نیاموں میں تڑپنے لگیں کہ بدعہدوں کے خون میں تیر کر ہی دم لیں گی، مجاہدوں نے کمانیں چلّہ پر چڑھالیں، نیزے ہلنے لگے، اتنے میں مؤذن نے پوری قوت اور انتہائی جوش کے ساتھ اذان دی، جنگل گونجنے لگا، وہ جن کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اللہ کے حضور اس قدر عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوگئے جیسے ان میں جان ہی نہیں رہی اور اب سجدے میں سر جھکا کر یہ اُٹھیں گے نہیں، فوج کے ایک دستہ نے نماز پڑھی، دوسرا پاسبانی کرتا رہا کہ کہیں دشمن ایسے میں ہلّہ نہ بول دے، جب ایک جماعت نماز ادا کرچکی تو اس کی جگہ باقی فوج آگئی، قیام، رکوع، سجود، قعود: ایک ایک سپاہی خشیت کی تصویر اور تضرّع وزاری کا پیکر!

یہ کوئی قیصر و کسریٰ کی فوج تھوڑی تھی جس کے یہاں راشن کی بہتات تھی اور ایک ایک سپاہی کو کھجور، پنیر، ستّو اور خشک میوے کے علاوہ حلوائے طنطنانی اور شرابِ خلّر بھی سپلائی کی جاتی تھی، یہ تو بے سروسامان مجاہدوں کی جمعیت تھی جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور سچائی پھیلانے کے لئے گھروں سے نکل کھڑی ہوئی تھی ـــــ کسی نے اونٹ کا دودھ پیا، کسی نے ستّو پھانک لئے، کوئی دو چار کھجور کھا کر ہی خدا کا شکر ادا کرنے لگا، کوئی شکار کا آدھا کچا اور آدھا پکا گوشت کھا کر ہی سو گیا، یہ سب خدا کے پُجاری تھے، پیٹ کے پُجاری نہ تھے ـــــ روٹی کی کمی بیشی پر احتجاج کرنا انہیں نہ آتا تھا، ان کا مقصد پیٹ اور روٹی کی سطح سے بلند تھا۔

کالی اور بھیانک رات، جنگل بیابان، پردیس، ہر آن دشمن کی یلغار کا خطرہ! کچھ سپاہی دیکھ بھال کرتے رہے، کوئی کوئی سو بھی گیا، اور فوج کی بڑی تعداد شب بیداری کرتی رہی، یہ شب بیداری سجدوں اور دُعاؤں سے معمور تھی، کسی

کسی مجاہد کی ڈاڑھی آنسوؤں میں بھیگ گئی —— اس لئے نہیں کہ جان جانے کا خطرہ تھا! یہ جوشِ مسرت اور خشیتِ الٰہی کے آنسو تھے، کہ مالک! ہمیں ثابت قدم رکھنا، جان بلا سے چلی جائے مگر فرض کی راہ سے بال برابر بھی قدم نہ ہٹیں —— دشمن کی فوج بھی رات بھر جاگتی رہی، کس لئے؟ لطف و تفریح اور عیش سامانیوں کے لئے! شراب، ناچ رنگ، قہقہے، گانا بجانا، اپنی فتحمندیوں کی آپ ہی تعریفیں کہ ہم یہ ہیں، ہم وہ ہیں! یہ اونٹ چرانے والے ہمارے مقابلہ کی بھلا تاب لا بھی سکیں گے، ہماری جرار فوج کے ایک ہی ریلے میں سُرمے کی طرح پس کر رہ جائیں گے، صحرانشین شہنشاہوں سے ٹکر لینے کے لئے آئے ہیں نادان اور بدبخت کہیں کے! تلواریں بھی تو ثابت نہیں ہیں ان کے پاس! ان کے نیزے، آہاہا! جیسے سُوت کاتنے والی بڑھیا کے تکلے! ہم کہ ہمارا سپاہی لوہے میں غرق ہے، چار آئینہ، زرہ بکتر، جوشن، خود، تلوار، نیزہ، تیر کمان، ڈھال، یہاں تک کہ گوپھن بھی اس کے پاس موجود ہے اور وہ کہ سروں پر لپیٹنے کے لئے چادریں بھی جن کو میسر نہیں ہیں، قطرے طوفانوں کے مُنہ آتے ہیں، تنکے آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے ہیں ..... ہمارے سپہ سالار کے اشہبِ تیز گام اور فرسِ صبا رفتار کی گردن میں سنہری ہیکل جھم جھم کرتی ہے، اور ان کا امیر العسکر ...... ہائے! بیچارے کے کُرتے میں پیوند ہی پیوند نظر آتے ہیں، معمولی سپاہی اس کے بے تکلف دوست کی طرح باتیں کرتا ہے، ذرا دن نکل آئے اہلِ عجم عربوں کے دُھوئیں اڑا دیں گے، ان میں کا ایک آدمی بھی یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

کارزار

سورج پہاڑیوں کی اوٹ سے نمودار ہوا، دونوں طرف کی فوجیں حرکت میں آگئیں، کچھ یہ بڑھے، کچھ وہ آگے آئے یہاں تک کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں، بڑے گھمسان کا رن پڑا، تلواروں کی جھنجھناہٹ موت کے فرشتہ کی زبان بنی ہوئی تھی، ہاتھ پاؤں، سر اور دھڑ کٹ کٹ کر زمین پر گر رہے تھے۔ کوئی سپاہی فرشِ زمین پر ادھر گرا اور ادھر گھوڑے نے اُسے روند ڈالا، کسی کے سینہ میں تیر پیوست تھے اور وہ زخموں سے کراہ رہا تھا، کسی کے سر میں خود کی کڑیاں گھسی ہوئی تھیں اور چہرہ خون آلود تھا، موت یہاں سے اتنی قریب تھی کہ موت اور لڑنے والوں کے درمیان ایک قدم کا بھی فاصلہ نہ تھا۔

سسکیاں، ہچکیاں، فریاد و فغاں، کسی کی زبان پر بُتوں اور دیویوں کی دُہائی اور کسی کے لبوں پر تکبیر کے نغمے! جنگ اپنے شباب پر تھی، موت کا فرشتہ شاید اتنا مصروف کبھی نہ رہا ہو، دشمنوں کی فوج نے مسلمانوں کے میمنہ پر دباؤ ڈالا، اور مسلمان پیچھے ہٹتے چلے گئے، یہاں تک کہ ریت کا ٹیلہ اُن سے کچھ ہی دُور رہ گیا، اسلامی فوج کے میسرہ نے یہ حالت دیکھ کر دشمنوں پر اس جوش و خروش سے حملہ کیا کہ آگے بڑھنے والوں کے پاؤں اُکھڑ گئے، اور چند مجاہد تو قلبِ فوج میں گھس کر اعداء کو جہنم کی راہ دکھانے لگے، دوپہر بھی ڈھل چکی تھی، اور لڑائی جاری تھی، دونوں لشکر جمے ہوئے تھے، اتنے میں اسلامی فوج کے طلیعہ کے چند سپاہیوں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، اور سامنے والوں کو نیزوں پر اُٹھا لیا، یہ لوگ صفِ اعداء میں گھستے ہی چلے گئے، کئی مارے بھی گئے، بعض زخمی ہوئے مگر جوشِ اقدام میں کمی نہ آئی، عجمی فوج کا سپہ سالار اب ان کی زد میں تھا سپہ سالار نے ایک نوجوان مجاہد پر تلوار کا وار کیا، اس نے کاوا کاٹ کر جواب میں تلوار چلائی تو تیغ جوہر دار زرہ کو کاٹتی ہوئی سینہ میں در آئی، سپہ سالار خاک پر گر پڑا، اور دشمنوں کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔

بعض منچلے سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کو للکارا اور غیرت دلائی کہ کم بختو! مٹھی بھر انسانوں کے مقابلہ میں بھاگ کھڑے ہوئے، رُوم و عجم کی سطوت کا تابناک ورق آج کی تاریخ سے سیاہ ہو جائے گا، بُزدل نہ بنو، جمے رہو، تم نے

جرأت اور پامردی سے کام لیا تو آن کی آن میں لڑائی کا نقشہ بدل سکتا ہے . ـــــ مگر وہاں جان کے لالے پڑے تھے موت سروں پر منڈلاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جرأت و غیرت کے تمام لفظ بیکار گئے، کسی کسی نے تو سُنا بھی نہیں اور جس نے سُنا اُس نے سُنی کو ان سُنی کر دیا، ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں، حوصلے جواب دے چکے تھے، جو بھاگا بس پھر وہ بھاگتا ہی چلا گیا، اُس خدا کے بندے نے پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا . میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا، غازیوں نے ظہر کی نماز کارزار میں ادا کی ۔

اس علاقہ کا صدر مقام " رزمگاہ " سے ایک منزل کے فاصلہ پر تھا، دوسرے دن اسلامی لشکر وہاں پورے جلال و منزلت کے ساتھ داخل ہوا، شہر والوں نے امان طلب کی، امان دیدی گئی، شہریوں پر ہول طاری تھا، کہ فاتح سپاہی نہ جانے ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ کریں گے، کس کس طرح ہمیں ستایا اور تباہ کیا جائے گا، کیسی کیسی غارت گری ہوگی! ان بیچاروں کے اندیشے غلط نہ تھے، دُنیا میں فاتح سدا سے یہی کرتے آئے تھے، لوٹ مار، تباہی، ویرانی، عورتوں کی بے عزتی اور وہ سب کچھ جو مفتوح قوم کو ذلیل کرنے کے لئے کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کی فتح ہوتے تین دن ہو چکے ہیں، شہر کے مشرقی حصہ میں ایک مشہور حمام ہے، وہاں کچھ لوگ جمع ہیں، آپس میں باتیں ہو رہی ہیں :-

ـــ یمن کے حاکم نے جب اس شہر کو فتح کیا تھا تو کیسی لوٹ مار ہوئی تھی، کھیتیاں اُجاڑ دی گئیں، مکانوں میں آگ لگا دی گئی، راہ چلتوں کو تہ تیغ کر دیا، داد نہ فریاد جس کو چاہا خاک و خون میں تڑپا دیا اور . . . .

ـــ (دوسرا آدمی کہنے والے کی بات کاٹ کر) اور ہماری بہو بیٹیوں کی بے عزتی اور بے آبروئی ! وہ زخم آج تک ہرے ہیں، حاکم یمن کی خلوت میں دس دس کنواری لڑکیاں لے جائی گئی ہیں ایک ایک رات میں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

ـــ (تیسرا آدمی کرتہ کا دامن سمیٹتے ہوئے) مگر یہ مسلمان تو نیکی کے فرشتے نکلے اور ان کی فوج نے کھیت کے ایک پتّہ کو بھی تو ہاتھ نہیں لگایا، نہ کسی کے گھر کو لوٹا، شہر پر اس طرح قبضہ ہو گیا ان کا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہیں،

ـــ (چوتھا آدمی) صاحبو! کل شام کے وقت ان کے چند سپاہی بازار سے گزر رہے تھے، دوکانوں پر جا بجا لڑکیاں کھڑی تھیں، یہ سپاہی نیچی نگاہیں کئے ہوئے اس طرح گزر گئے جیسے ان کے سینوں میں یا تو دل ہی نہیں ہیں اور ہیں تو جذبات سے خالی ہیں ـــ اور تو اور آتشکدۂ ازمیر کے مغ اعظم کی پری جمال لڑکی رخمہ آنہ کی انگڑائیاں تک انہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔

ـــ (ایک بوڑھا) ایسے نیک آدمی تو دیکھے نہ سُنے ! انصاف اور اقبالمندی تو ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، ان کی اور تو سب باتیں اچھی ہیں، بس ایک ہی بات بُری لگتی ہے وہ یہ جو کہتے ہیں کہ آگ، سورج اور چاند ستاروں میں کوئی طاقت نہیں ہے، ان کے پُوجنے سے کوئی فائدہ نہیں، بس ایک خدا کی ذات پُوجنے کے قابل ہے۔

اتنے میں ایک نوجوان بانسری بجاتا ہوا حمام میں آ گیا، اور لوگوں کی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا، بانسری کے نغمے کچھ ہوتے ہی اثر انگیز ہیں جیسے بانسری کے سوراخوں سے دل کی دھڑکنیں بول رہی ہیں۔

اسیری اور پھر . . . .

شام اور ایران کی آخری سرحد سے عربوں کا ایک قافلہ مالِ تجارت لے کر آ رہا تھا، مسلمانوں کی تمندی کی خبر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ چکی تھی، جذبات میں انتقام کی

آگ سُلگنے لگی، قادسیہ سے تین منزل مغرب کی جانب ایک تجارتی منڈی تھی، جہاں ضلع کا حاکم رہا کرتا تھا، اس بستی کے پاس سے عربوں کا کاروانِ تجارت جو گزرا تو لوگوں نے قافلہ والوں پر دھاوا بول دیا، عربوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا، مگر آٹھ دس آدمی اپنے سے سو گنے مسلح آدمیوں کا کہاں تک مقابلہ کرتے، دو تین تو ان میں سے اپنے اونٹوں کو لے کر بھاگ گئے، چھ مارے گئے اور ایک نوجوان جو رہ گیا اُسے گرفتار کرلیا گیا۔

اس نوجوان کا نام تھا سالم! مسیں اچھی طرح بھیگ چکی تھیں، خوب اونچا قد، کھلتی ہوئی رنگت، گھونگر یالے بال، وجاہت اور شرافت اُس کے چہرے سے ٹپکتی تھی! اُس کی تلوار ٹوٹ نہ جاتی تو نہ جانے کتنوں کو خاک و خون میں تڑپا کر دم لیتا، ضلع کے حاکم کے سامنے اسے لایا گیا، حاکم کے رہنے کا مکان چھوٹے موٹے فرمانروا کے قصر کی برابری کر رہا تھا، قالینوں کا فرش! قاقم و سنجاب کے پردے، خوب صورت انگیٹھیوں میں عود و عنبر سُلگتا ہوا، تخت کی جگہ قیمتی کرسی شہ نشین پر دھری تھی۔

— میں تمہارا نام معلوم کرنا چاہتا ہوں ——— مہران (حاکم کا نام) نے دریافت کیا

— میرا نام — جی! سالم! . . . . سالم ابن عبداللہ ——— سالم نے جواب دیا۔

— تم نے تو دوسرے نادان اور سادہ لوح عربوں کی طرح اپنے آبائی دین کو خیر باد نہیں کہہ دیا ——— مہران نے پوچھا

— الحمدللہ! کہ میں مسلمان ہوں! نادان تو وہ ہیں جو رب واحد کو چھوڑ کر جھوٹے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں، خدا پر ایمان لانا سب سے بڑی دانائی ہے ——— سالم نے گریبان کو چھوتے ہوئے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

— رسی جل گئی پر بل نہیں گیا . . . . . . او نادان چھوکرے! جانتا ہے تو کس کے دربار میں کھڑا ہے، یہ مہران کا دربار ہے، میرے ایک اشارے پر تیری زندگی کا خاتمہ ہو سکتا ہے ——— مہران غضب ناک ہو کر بولا۔

— زندگی اور موت تو خدا کے اختیار میں ہے، وقت سے پہلے آپ مجھے مار نہیں سکتے ——— اس پر مہران نے تلوار ہاتھ میں اُٹھالی اور زخمی بھیڑیے کی طرح غرّاتے ہوئے بولا:-

"اسے قید میں ڈال دو، میرے سامنے سے لے جاؤ، چند دن قید میں رہ کر اس کا دماغ ٹھکانے آجائے گا"

مہران کی گرج دار آواز سُن کر اُس کی نوجوان لڑکی مرجانہ حرم سرا سے باہر نکل آئی، اُس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت اور شمشاد قامت عرب نوجوان کو سپاہی کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں، باپ کی خفگی حائل نہ ہوتی تو وہ سالم کو شاید سپاہیوں کے ہاتھ سے چھڑا لیتی ——— یہ تصور جما، بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا گیا۔

سالم کو چند دن قید میں رکھا گیا، مرجانہ کئی بار بہانہ کرکے اور کام نکال کر قید خانہ میں پہونچی، سالم کو اس نے ملتجی نگاہوں سے دیکھا، مگر سالم مجسّم کی طرح بے حس بنا بیٹھا رہا' مرجانہ کی ایک نگاہ شوق کو بھی اس نے قبول نہ کیا، مرجانہ اپنی خوابگاہ میں پہونچی، دل گرفتہ اور ملول، حُسن اپنی پسپائی اور شکست پر جھنجلا سا گیا، اُس نے قدِ آدم آئینہ میں اپنے چہرے کو دیکھا . . . . اور . . . . آپ ہی آپ سوال کرنے اور جواب دینے لگی:-

— میری مخمور آنکھوں میں شاداب خمار باقی نہیں رہا ویران ہو گئیں میری آنکھیں!

— نہیں ان میں خمار بھی ہے، نشہ بھی ہے اور دلکشی بھی ہے۔

— اور میری زلفِ عنبر فام کے یہ دلکش خم و پیچ کیا بے رونق ہو گئے؟

— ذراسی ناکامی پر یہ غلط اندیشیاں!

— اور میرے گلابی رخساروں کی دل آویزی . . . . کیا ہوئی! جس کے لئے شاہزادوں کی آنکھوں میں شوقِ محبت کا رس اُتر آتا ہے، وہ ایک قیدی کو بھی متاثر نہ کر سکی۔

— قید کی سختیوں میں آدمی ہر لطف کو بھول جاتا ہے، کیف و خمار، رعنائیاں، حُسن و عشق اور ناز و نیاز تو عیش و راحت کی باتیں ہیں، بلبل جب باغ میں پکڑی جاتی ہے تو اپنی گرفتاری کے وقت گلاب کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی، تو اس کے نہ دیکھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ گلاب میں دلکشی ہی باقی نہیں رہی ———— عقل کے ایک ایک مشورے کو ہوسناک دل نے ٹھکرا ٹھکرا دیا، ہوس تصورات کے دام سے آدمی کو نکلنے کب دیتی ہے!

مہران کا غصہ ٹھنڈا پڑا تو سالم کو قید سے رہائی ملی، اُسے پائیں باغ میں مزدوروں اور مالیوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا، اس تبدیلی میں مرجانہ کی کوششوں کا بھی ہاتھ تھا، سالم درخت لگاتا، کنوئیں سے پانی کھینچتا، سوکھی ڈالیوں اور مرجھائی ہوئی پتیوں کو پودوں سے جدا کرتا، زمین بھی اُسے کھودنی پڑتی، کام سخت تھا اور اُسے کافی مشقت سے دوچار ہونا پڑتا، مگر قید خانہ کے مقابلہ میں یہاں پھر آسانیاں اور سہولتیں تھیں، وہاں بے رونق دیواریں، دھوئیں میں رچی ہوئی چھت اور لوہے کی سلاخیں ہر دم آنکھوں کے سامنے رہتیں، پھر کہیں آنے کے نہ جانے کے! اور یہاں ہر دم ہریالی اور پھولوں کا نظارہ! جب تکان ہوئی کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر ستا لئے!

جب سے سالم باغ میں آیا تھا، مرجانہ کو اس سے بات چیت کرنے کا موقعہ مل جاتا، مگر یہ باتیں سیدھی سادی اور خشک قسم کی تھیں، سالم نے اس لے کو بڑھنے ہی نہ دیا، مرجانہ کی تمام مسکراہٹیں اور شوخ ادائیں رائگاں گئیں، اپنی شکست پر بعض وقت اُسے غصہ آتا کہ میں کس پتھر اور بے حس انسان کو چاہ رہی ہوں لیکن ہوس کہتی کہ دل کو دل سے راہ دھیرے دھیرے ہی ہوتی ہے، غریب قیدی ضلع کے خود مختار حاکم کی بیٹی سے کھل کر بات چیت کرنے کی جرأت بھی تو نہیں کر سکتا، یہ حجاب اور جھجک آہستہ آہستہ دور ہوگی۔

بستی سے باہر ایک تالاب تھا وہاں بہار کے موسم میں بدکر اور شرط لگا کر گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی، یہ ایک طرح کا میلہ تھا، سارا شہر ڈھل کر وہاں پہنچ جاتا ———— وہی گھوڑ دوڑ کا دن تھا، باغ کے مالی تک وہاں چلے گئے تھے، سالم نے وہاں جانے کی خود بھی کوشش نہیں کی اور قیدی کو سیر و تفریح کی آزادی دینے کا خیال بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوا، مرجانہ بیماری کا بہانہ بنا کر محل سرا میں رہ گئی۔

دوپہر اچھی طرح ڈھل چکی تھی، تیسرا پہر تھا، سالم سبزہ پر عصر کی نماز پڑھ رہا تھا، مرجانہ موقعہ پا کر وہاں آئی، سالم نماز پڑھ چکا تو مرجانہ نے پُرشوق نگاہوں سے اُسے دیکھا . . . . مگر سالم نیچی نگاہ کئے ہوئے زمین کریدتا رہا۔

— آج تنہائی ہے سالم! دونوں اکیلے ہیں ———— مرجانہ نے رک رک کر کہا۔

— ہم دونوں اکیلے نہیں ہیں، خدا بھی ہمارے درمیان موجود ہے ——— سالم نے جواب دیا۔

— سالم! زیادہ دل نہ دکھاؤ، ایسے تنہائی کے موقعے روز روز نہیں ملتے، اس سے فائدہ اٹھاؤ، تمہارے لئے آج میں سب سے زیادہ قیمتی لباس پہن کر آئی ہوں، میں نے آج زندگی میں پہلی بار رخساروں پر صندل لگایا ہے ———— مرجانہ نے سالم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، اُس کی آنکھوں کے ڈورے بیربہوٹی کی طرح لال ہو گئے تھے، سالم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا وہ خشونت کے ساتھ بولا :۔

— میرا مذہب ان باتوں سے مجھے روکتا ہے، یہ بہت بڑا گناہ ہے، خدا کی قسم میرا دل کانپ رہا ہے، مرجانہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔

مرجانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ شدت جذبات کے سبب کچھ بول نہ سکی۔ اُس نے جھنجلا کر اپنے کرتہ کے دامن کو چبا ڈالا — ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر — اتنے میں مہران گھوڑدوڑ سے واپس آگیا۔ آج خلاف معمول وقت سے بہت پہلے گھوڑدوڑ ختم ہوگئی، یہودی زمیندار اور عیسائی سردار میں جھگڑا نہ ہوجاتا، تو یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

مہران نے دیکھا کہ مرجانہ زرق برق لباس میں دُلھن بنی ہوئی سالم کے پاس کھڑی ہے، اُس کی پلکیں نم آلود ہیں اور چہرے پر رودگی کے آثار نمایاں ہیں، ذہن نے ذراسی دیر میں تمام کڑیاں آپ ہی آپ جوڑ کر ملادیں۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، نوروز کے متبرک دن نہ ہوتے تو وہ اپنی تلوار سے اُس کا وہیں ڈھیر کردیتا، مرجانہ کو محل سرا کی کوٹھری میں اور سالم کو قید خانہ میں بند کردیا گیا۔

تین دن گزرنے کا انتظار تھا کہ ان ایام نوروز میں کسی مجرم کو قتل کرنا حکومت کے قانون اور مذہب کی رُو سے جائز نہ تھا' مہران جی ہی جی میں کہتا تا کہ ہائیں! میں نے عرب نوجوان کو اُسی دن قتل کیوں نہ کردیا، یہ بے عزتی تو دیکھنے میں نہ آتی! خود کردہ را علاجے نیست! کیسی بھول ہوگئی مجھ سے!

سالم سے قید خانہ کے پہریداروں نے کہہ دیا تھا کہ تیسری صبح طلوع ہوتے ہی تم قتل کردیے جاؤ گے، مہران کا فیصلہ ٹلا نہیں کرتا، دوسرے دن کی شام ہوئی، پھر رات، یہاں تک کہ سپیدۂ صبح نمودار ہوگیا، سالم نے تمام رات عبادت میں گزاری، سجدے، دعائیں اور آنسو بھی! پہریدار سلاخوں سے جھانکنے لگتے کہ یہ نوجوان آخر اکیلا کس سے اپنا دُکھ درد کہہ رہا ہے — پہریداروں نے ادھر دروازہ کھولا اور اُدھر فصیلوں سے "اللہ اکبر" کی صدائیں آنے لگیں، سالم نے بھی تکبیر کا نعرہ بلند کیا، قید خانہ کی دیواریں ہلنے لگیں، مہران شہر پناہ کے چور دروازے سے نکل کر بھاگ گیا، سالم اب آزاد تھا، اور مرجانہ بھی آزاد تھی — اور پھر چند دن بعد ایک محمل مدینہ کی طرف جاتا ہوا دیکھا گیا، اونٹ کے گلے کی گھنٹی خوشی کے گیت گا رہی تھی، اور ساربان کی حُدی خوانی:-

"محبت قید اور آزادی کے درمیان ایک پُل ہے" (وہ اس کو دُہرا تا رہا)

مرجانہ اور سالم مُسکرانے لگتے ہیں، اور ناقۂ محمل بڑھا چلا جاتا ہے!
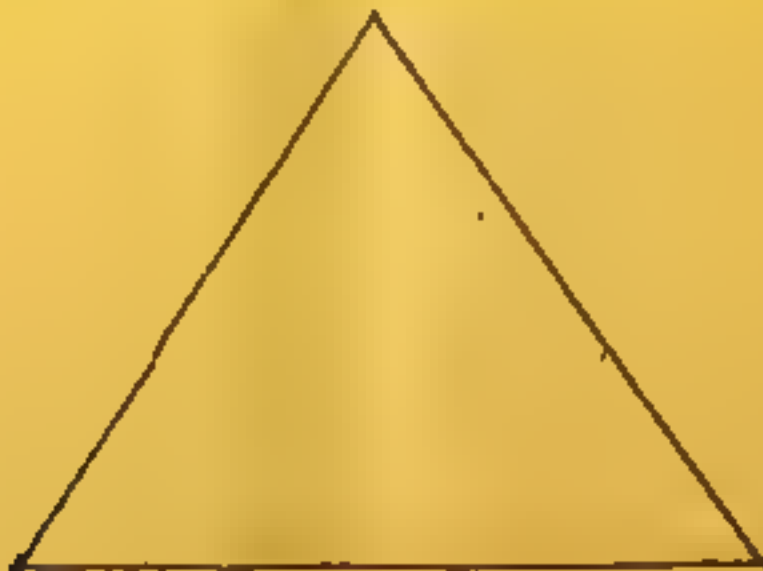
روحِ انتخاب

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْئًا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ م اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ ع

(الانعام)

(تارے اور چاند کے بعد) پھر جب سورج کو دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیم پکار اٹھا: اے میری قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں“ اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے کہا، کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے اور میں تمہارے ٹھیراتے ہوتے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھیراتے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن ان ہی

کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لاتے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔[۳]
(سورۃ الانعام۔ رکوع ۹)

---

[۱] یہاں حضرت ابراہیمؑ کے اُس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لئے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک صحیح الدماغ اور سلیم النظر انسان جس نے سراسر شرک کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جسے توحید کی تعلیم کہیں سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، کس طرح آثار کائنات کا مشاہدہ کر کے اور ان پر غور و فکر اور ان سے صحیح استدلال کر کے امر حق معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا، اوپر قوم ابراہیمؑ کے جو حالات بیان کئے گئے ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گرد و پیش ہر طرف چاند سورج اور تاروں کی خدائی کے ڈنکے بج رہے تھے، اس لئے قدرتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہئے تھا، کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی رب ہو سکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انہوں نے غور و فکر کیا، اور آخر کار اپنی قوم کے سارے خداؤں کو ایک اٹل قانون کے تحت غلاموں کی طرح گردش کرتے دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے، کہ جن جن کے رب ہونے کا دعوٰے کیا جاتا ہے ان میں سے کسی کے اندر بھی ربوبیت کا شائبہ تک نہیں ہے، رب صرف وہی ایک ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور بندگی پر مجبور کیا۔

اس قصہ کے الفاظ سے عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا کہ جب رات طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، اور جب وہ ڈوب گیا، تو یہ کہا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہ کہا، اس پر ایک عام ناظر کے ذہن میں فوراً یہ سوال کھٹکتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ کھولتے ہی روزانہ حضرت ابراہیمؑ پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند تاروں اور سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ غور و فکر تو انہوں نے سن رشد کو پہنچنے کے بعد ہی کیا ہوگا، پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا ہے کہ جب رات ہوئی تو یہ دیکھا اور دن نکلا تو یہ دیکھا؟ گویا اس خاص واقعہ سے پہلے انہیں یہ چیزیں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، حالانکہ ایسا ہونا صریحاً مستبعد ہے۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے لئے اس قدر ناقابل حل بن گیا کہ اسے دفع کرنے کی کوئی صورت انہیں اس کے سوا نظر نہ آئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش اور پرورش کے متعلق ایک غیر معمولی قصہ تصنیف کریں اور اس سے یہ ثابت کریں کہ آنجناب کو قصداً ایک تاریک غار میں پرورش کیا گیا تھا جہاں سن رشد کو پہنچنے تک وہ چاند تاروں اور سورج کے مشاہدے سے محروم رکھے گئے تھے، حالانکہ بات بالکل صاف ہے اور اسکو سمجھنے کے لئے اس نوعیت کی کسی داستان کی ضرورت نہیں ہے۔ نیوٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اس سے اُس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا، کہ اشیاء آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں، یہاں تک کہ غور کرتے کرتے وہ قانون جذب و کشش کے استنباط تک پہنچ گیا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟ ظاہر ہے کہ ضرور دیکھی ہوگی، اور بارہا دیکھی ہوگی، پھر کیا وجہ ہے کہ اسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مشاہدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روزمرّہ کے ایسے سینکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟ اس کا جواب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متاثر نہیں ہوا کرتا، بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی حرکت

پیدا نہیں ہوتی، مگر ایک وقت اُسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، جس سے فکری قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں، یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن اُلجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرہ ہی کے مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا وہ سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے اُلجھنیں سلجھتی چلی جاتی ہیں، ایسا ہی معاملہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ راتیں روز آتی تھیں اور گذر جاتی تھیں سورج اور چاند اور تارے سب ہی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے تھے، لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے ان کے ذہن کو اس راہ پر ڈال دیا جس سے بالآخر وہ توحید الٰہ کی مرکزی حیثیت تک پہنچ کر رہے۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا ذہن پہلے سے اس سوال پر غور کر رہا ہو کہ جن عقائد پر ساری قوم کا نظام زندگی چل رہا ہے ان میں کس حد تک صداقت ہے، اور پھر ایک تارا یکایک سامنے آ کر کشودِ کار کیلئے کلید بن گیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تارے کے مشاہدے ہی سے ذہنی حرکت کی ابتدا ہوئی ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے تارے کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انہیں اپنا رب کہا، تو کیا وہ اس وقت عارضی طور پر ہی سہی، شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لئے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار ان کا نہیں ہوتا بلکہ اصل اعتبار اُس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے اور اُس آخری منزل کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر جویائے حق کے لئے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلۂ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ بصورتِ فیصلہ۔ اصلاً یہ ٹھیراؤ سوالی و استفہامی ہوا کرتا ہے نہ حکمی۔ طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ "ایسا ہے" تو دراصل یہ اُس کی اختتامی رائے نہیں ہوتی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ایسا ہے؟" اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں پاکر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ اثنائے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا وہاں وہ عارضی طور پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔ اس کو حج کی مثال پر قیاس کرنا چاہئے، کہ آدمی جب حج کی نیت سے نکل کھڑا ہوا تو وہ سبیل رب میں ہے، اگرچہ وہ راستہ میں کعبہ سے ورے جگہ جگہ ٹھیرتا ہی جاتے گا۔ حتیٰ کہ اس راہ میں اگر وہ کسی جگہ مر جائے تب بھی وہ حج کے ثواب سے محروم نہ رہے گا۔

۲ اصل میں لفظ تَذَكَّرُ استعمال ہوا ہے۔ جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص جو غفلت اور بھلاوے میں پڑا ہوا ہو وہ چونک کر اس چیز کو یاد کرلے جس سے وہ غافل تھا، اسی لئے ہم نے اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ کا یہ ترجمہ کیا ہے حضرت ابراہیمؑ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، تمہارا اصلی و حقیقی رب اس سے بے خبر نہیں ہے، اس کا علم ساری چیزوں پر وسیع ہے، پھر کیا اس حقیقت سے واقف ہو کر بھی تمہیں ہوش نہ آئے گا؟

۳ یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ وہ قوم اللہ فاطر السمٰوٰت والارض کی ہستی کی منکر نہ تھی بلکہ اس کا اصلی جُرم اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور خداوندانہ حقوق میں شریک قرار دینا تھا۔ اول تو حضرت ابراہیمؑ خود ہی فرما رہے ہیں کہ تم اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک کرتے ہو دوسرے وہ جس طرح ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں، یہ اندازِ بیان صرف ان ہی لوگوں کے مقابلہ میں اختیار کیا جا سکتا ہے، جو اللہ کے نفسِ وجود کے منکر نہ ہوں۔ لہٰذا ان مفسرین کی رائے درست نہیں ہے جنہوں نے اس مقام پر اور حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دوسرے مقامات پر قرآن کے بیانات کی تفسیر اس مفروضہ پر کی ہے کہ قوم ابراہیمؑ اللہ کی منکر یا اس سے ناواقف تھی، اور صرف اپنے معبودوں ہی کو خدائی کا

بالکلیہ مالک سمجھتی تھی۔

آخری آیت میں یہ جو فقرہ ہے کہ "جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا" اس میں لفظ ظلم سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس سے مراد معصیت ہے۔ لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمادی کہ دراصل یہاں ظلم سے مراد شرک ہے، لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو اللہ کو مانیں اور اپنے اس ماننے کو کسی مشرکانہ عقیدہ وعمل سے آلودہ نہ کریں امن صرف ان ہی کے لئے ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

وجودِ باری

وجودِ باری پر قدما کا طریقۂ استدلال

خدا کے اثبات پر قدما اس طرح استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں ہے وہ کسی علت کی محتاج ہے اور یہی علت خدا ہے، اس استدلال کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہے، پہلے مقدمے پر یہ استدلال کیا جاتا تھا، کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے۔ یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا اور اس لئے اکی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی لیکن وہ فی الواقع صحیح نہ تھا، تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں، دو چیزوں کا مجموعہ ہیں، مادّہ اور ایک خاص صورت۔ جو چیز بدلتی رہتی اور تغیر پذیر ہے، وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کوئی چیز جب فنا ہوتی ہے تو صرف اس کی صورت فنا ہوتی ہے اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے، ایک کاغذ کو جلا دو کاغذ جل کر راکھ ہوجائے گا، اب کاغذ فنا ہوگیا لیکن راکھ موجود ہے جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہے، راکھ کو برباد کرو، کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم رہے گی، جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہے۔ اصل مادہ کے حادث ہونے پر نہ کوئی تجربہ پیش کیا جاسکتا ہے نہ کوئی استدلال قائم کیا جاسکتا ہے۔

اس بنا پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں، اور جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں، ارسطو نے اس اعتراض کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا یعنی یہ کہ عالم کے تمام اجزا میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے، کیونکہ تمام اجسام یا بڑھتے رہتے ہیں یا گھٹتے ہیں اور بڑھنا یا گھٹنا حرکت ہی کی ایک قسم ہے، جن چیزوں کو ہم بحال خود قائم دیکھتے ہیں ان کے اجزا بھی بدلتے رہتے ہیں یعنی پرانے اجزا فنا ہوتے جاتے اور ان کے بجائے نئے آتے جاتے ہیں، اجزا کا بدلتا رہنا بھی ایک قسم کی حرکت ہے، اس لئے تمام عالم متحرک ہے، اور جو چیز متحرک ہے ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی محرک ہو، اب دو صورتیں ہیں، یا یہ سلسلہ کسی حد تک جاکر ٹھہر جائے گا یعنی اخیر میں ایک ایسی چیز ثابت ہوگی جو بالذات یا بالواسطہ تمام اشیاء کی محرک ہے اور خود متحرک نہیں یہی خدا ہے۔ یا یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوگا اس صورت

بیں غیر تناہی کا وجود لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

ارسطو کا اصل مذہب یہ ہے کہ عالم قدیم ہے اور وہ بذاتِ خود پیدا ہوا، لیکن اس کی حرکت حادث ہے اور خدا اسی حرکت کا خالق ہے، اس بنا پر ارسطو نے خدا کے ثبوت میں حرکت سے استدلال کیا۔ حکمائے اسلام میں سے ابن رشد کا بھی یہی مذہب ہے۔

بوعلی سینا کا طریقہ

بوعلی سینا بھی عالم کے قدیم ہونے کا قائل ہے لیکن اسلام کے اثر سے اس بات کا قائل نہ ہو سکا کہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں، اس لئے اس نے یہ رائے اختیار کی کہ عالم قدیم بھی ہے اور خدا کا مخلوق بھی ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا تھا کہ جب عالم اور خدا دونوں قدیم اور ازلی ہیں تو ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کیونکر کہا جا سکتا ہے، کیونکہ علت و معلول میں زمانہ کا تقدم و تاخر ضرور ہے۔ بوعلی سینا نے اس کا جواب دیا کہ علت کے لئے صرف تقدم بالذات کافی ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے مقدم ہونا ضرور نہیں، مثلاً کنجی کی حرکت، قفل کے کھل جانے کی علت ہے لیکن کنجی کی حرکت اور قفل کے کھلنے میں ایک لحظہ اور ایک آن کا بھی آگا پیچھا نہیں۔

متکلمین کا استدلال

متکلمین کے نزدیک چونکہ خدا کے سوا کسی چیز کا قدیم ہونا خدا کی یکتائی میں خلل انداز تھا اس لئے انہوں نے عالم کے حدوث کا دعویٰ کیا، اور حدوث ہی سے خدا کے وجود پر دلیل قائم کی، عالم کے حادث ہونے پر متکلمین کا جو استدلال ہے اُس کے سمجھنے کے لئے پہلے مقدماتِ ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہئے

(۱) عالم میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں - عرض یعنی جو چیزیں بذاتِ خود نہیں، بلکہ جب پائی جاتی ہیں تو کسی دوسری چیز میں ہو کر پائی جاتی ہیں، مثلاً بو، رنگ، مزہ، رنج، خوشی، جوش —— جوہر، یعنی وہ چیزیں جو بذاتِ خود قائم ہیں مثلاً پتھر، مٹی، پانی۔

(۲) کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس قدر جواہر ہیں کسی نہ کسی صورت اور ہیئت میں ہوتے ہیں، اور صورت و ہیئت عرض ہیں، تمام جواہر میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے اور حرکت عرض ہے۔ غرض جوہر کے جس قدر افراد ہیں ان میں کسی نہ کسی عرض کا پایا جانا ضرور ہے، اور اس بنا پر کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) عرض حادث ہے یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

(۴) جو چیز عرض سے کبھی خالی نہ ہو سکتی ہو، ضرور ہے کہ حادث ہو، کیونکہ اگر وہ قدیم ہو تو لازم آئے گا کہ عرض بھی قدیم ہو کیونکہ دو چیزیں جو لازم و ملزوم ہوں ان میں سے ایک چیز اگر قدیم ہوگی تو ضرور ہے کہ دوسری چیز بھی قدیم ہو، ورنہ لازم و ملزوم میں فصل زمانی لازم آئے گا، اور یہ محال ہے۔

اب عالم کے حادث ہونے پر اس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے کہ عالم دو صورت سے خالی نہیں، جوہر ہو گا یا عرض، اور جوہر و عرض دونوں حادث ہیں - عرض کا حادث ہونا تو ظاہر ہے۔ جوہر اس لئے حادث ہے کہ کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہو سکتا، اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو چیز عرض سے خالی نہ ہو سکتی ہو وہ حادث ہے۔

اور جب یہ ثابت ہوا کہ عالم حادث ہے تو ضرور ہے کہ اس کے لئے کوئی علت ہو، اب اگر علت بھی حادث ہو تو اس کیلئے بھی کوئی علت درکار ہوگی، اس صورت میں اگر یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم ہوگا تو وہی خدا ہے، اور نہ ختم ہوگا تو دور و تسلسل لازم آئے گا اور دور و تسلسل محال ہے۔

متکلمین کا یہ استدلال فرفوریوس (پارفریس) سے ماخوذ ہے جیساکہ ہم نے تاریخ علم الکلام میں نقل کیا ہے۔ لیکن یہ استدلال اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ زمانہ غیر متناہی کا وجود نہیں ہو سکتا، ورنہ یہ استدلال محض مغالطہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ جوہر عرض سے خالی نہیں ہوسکتا کسی خاص عرض کا ہونا ضروری نہیں بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی عرض کا وجود چاہئے۔ اور جب زمانہ غیر متناہی ہے تو یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ عالم قدیم ہے، اور علی سبیل البدلیۃ کسی نہ کسی عرض کے ساتھ متصف رہتا ہے یہ اعراض الگ الگ تو حادث ہیں لیکن ان کا سلسلہ جو علی سبیل البدلیۃ ہے غیر متناہی اور قدیم ہے، عالم کے حادث ہونے پر استدلال یہ تھا کہ اگر عالم قدیم ہو تو اعراض کا بھی قدیم ہونا لازم آئے گا، ہم کہتے ہیں کہ اعراض کے ہر ہر فرد کا قدیم ہونا لازم آتا ہے اور جب زمانہ غیر متناہی ہے تو سلسلہ کا قدیم ہونا بھی ممکن ہے۔ متکلمین نے اور بھی بہت سی دلیلیں قائم کی ہیں لیکن سب کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ سلسلہ غیر متناہی کا محال ہونا ثابت کیا جائے۔ غیر متناہی کے محال ہونے پر حکماء اور متکلمین نے بہت سے دلائل قائم کئے ہیں لیکن وہ تمام دلائل اس صورت میں جاری ہوتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ یہ سلسلہ مرتب موجود ہے، لیکن منکرین خدا علل کا سلسلہ اس طرح مانتے ہیں کہ ہر علت فنا ہوکر اس کے بجائے دوسری علت آجاتی ہے۔ محقق دوانی نے رسالہ زوراء کی شرح میں دعویٰ کیا ہے، کہ اس صورت میں بھی دلیل جاری ہوسکتی ہے کیونکہ گو علتیں فنا ہوتی جاتی ہیں، لیکن ان کا مجتمع و مرتب ہونا فرض کیا جاسکتا ہے، کیونکہ علل کا مجتمع ہونا محال عقلی نہیں اور جو چیز محال نہیں وہ فرض بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن محقق موصوف کا یہ قول صحیح نہیں، علتوں کا اجتماع گو محال بالذات نہیں لیکن محال بالغیر ہوسکتا ہے اور محال بالغیر کے فرض کرلینے سے بھی محال آتا ہے۔ گو یہ محال محال بالغیر ہوگا۔

ان دلائل میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان سے اگر خدا کا وجود ثابت بھی ہوتا ہے، تو اس کا فاعل بااختیار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ان دلائل سے صرف ایک علۃ العلل Cause of the causes کا وجود ثابت ہوتا ہے لیکن علت کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اس سے معلول بہ ارادہ اور بہ اختیار صادر ہو، آفتاب روشنی کی علت ہے لیکن آفتاب کو نہ علم ہے نہ ارادہ، بلکہ روشنی اس سے خود بخود بلا علم و ارادہ صادر ہوتی ہے، اسی بنا پر بہت سے حکماء کا مذہب ہے کہ خدا نے عالم کو بہ اختیار نہیں پیدا کیا، اور تعجب ہے کہ شیخ بوعلی سینا بھی انہی کا ہمزبان ہے۔

ان تمام تقریروں سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ افلاطون اور ارسطو اس مسئلہ کو حل نہ کرسکے، اور متکلمین بھی چونکہ انہی کے نقش قدم پہ چلے تھے اس لئے وہ بھی ناکام رہے۔

اب دیکھو قرآن مجید نے اس عقدہ کو کیونکر حل کیا۔

وجودِ باری پر قرآن مجید کا طریقہ استدلال

خدا کا خیال انسان کی فطرت میں داخل ہے

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اعتراف انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے علم الانسان کے ماہروں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری حالت میں تھا یعنی علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کا بالکل وجود نہیں ہوا تھا، اس وقت اس نے سب سے پہلے اصنام کی پرستش کی تھی یا خدا کی؟ مادیین (Materialists) کے سوا اور تمام محققین نے فیصلہ کیا ہے،

کہ انسان نے پہلے خدا کی پرستش اختیار کی تھی، مشہور محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔
"ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکایا تھا جب وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے، جسمانی خدا (بت) اس حالت کے بعد اس طرح پیدا ہوئے کہ فطرتِ اصلی مثالی صورت کے پردہ میں چھپ گئی"
یہی وجہ ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے، دنیا کے ہر حصہ میں، خدا کا اعتقاد موجود تھا، آثوری، مصری، کلدانی، یہود، اہل فنشیہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔
پلوٹارک کہتا ہے:۔
"اگر تم دنیا پر نظر ڈالو گے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں، نہ سیاست، نہ علم، نہ صناعت نہ حرفہ، نہ دولت، لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو"
والٹیر جو فرانس کا مشہور فاضل اور وحی و الہام کا منکر تھا، کہتا ہے کہ
"زرواستر، منو، سولن، سقراط، سسرو، سب کے سب ایک سردار، ایک منصف ایک باپ کی پرستش کرتے تھے" [1]
یہی فطرت ہے جس کو قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا۔

اور جب کہ خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو نکالا اور خود ان کو انہی پر گواہ کیا، کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں سب بول اٹھے کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔ [2]

لیکن چونکہ خارجی اسباب سے اکثر یہ فطری احساس دب جاتا ہے، اس لئے خدا نے جا بجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے
اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "کیا خدا کی نسبت بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان و زمین کا موجد ہے"
اور چونکہ خارجی اسباب کی وجہ سے بعض اوقات یہ فطری احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض اشارہ اور تنبیہ کافی نہیں ہوتی اس لئے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تجربی اور حسّی مقدمات کے ذریعہ سے استدلال بھی کیا۔
انسان کو آغاز تمیز میں جن بدیہی اور حسّی مقدمات کا علم ہوتا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو مرتب، باقاعدہ اور منتظم دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ کسی دانشمند نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے، اگر کسی جگہ ہم چیزیں بے ترتیب رکھی دیکھیں تو خیال ہو سکتا ہے کہ آپ سے آپ یہ چیزیں اکٹھی ہو گئی ہوں گی۔ لیکن جب وہ اس ترتیب اور سلیقہ سے چنی گئی ہوں کہ ایک ہوشیار صناع بھی بمشکل اس طرح چن سکتا ہے تو یہ خیال کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ سے آپ یہ ترتیب پیدا ہو گئی ہوگی، اس کو ایک اور واضح مثال میں سمجھو۔ خواجہ حافظ یا نظامی کا کوئی شعر لو۔ اس کے الفاظ الٹ پلٹ کر کسی معمولی آدمی کو دو اور اس سے کہو کہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے، وہ سو سو طرح الٹ پلٹ کرے گا، لیکن اتفاقیہ طور سے

---

[1] دیکھو مانسیو بوتحیر کی کتاب الفلسفہ ترجمہ عربی مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۷، یہ مصنف فرانس یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔
[2] محققین اور ارباب نظر نے اس آیت کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ خدا نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ خواہ مخواہ اس کو خدا کی خدائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ دیکھو تفسیر کبیر

بھی کبھی یہ ہوگا کہ حافظ اور نظامی کا شعر نکل آئے، حالانکہ وہی الفاظ ہیں، وہی حروف ہیں، وہی جملے ہیں، صرف ذراسی ترتیب کا پھیر ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ نظامِ عالم جو اس قدر باقاعدہ مرتب اور موزون ہے، وہ خود بخود قائم ہوگیا، قرآن مجید میں خدا کے وجود پر اسی سے استدلال کیا ہے:۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ۔ یہ خدا کی کارگیری ہے جس نے ہرشے کو خوب پختہ طور سے بنایا

مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۔ خدا کی کارگیری میں تم کو کہیں فرق نظر نہ آئے گا، پھر دوبارہ دیکھو کہیں کوئی دراڑ دکھائی دیتی ہے۔

خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔ خدا نے ہرشے کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔

لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ خدا کی بناوٹ میں ردوبدل ممکن نہیں۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا۔ خدا کے طریقہ میں تم ردوبدل نہیں پا سکتے۔

ان آیتوں میں عالم کی نسبت تین اوصاف بیان کئے ہیں، کامل اور بے نقص ہے۔ موزوں اور مرتب ہے۔ ایسے اصول اور ضوابط کا پابند ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے، یہ دلیل کا صغریٰ ہے۔ کبریٰ خود ظاہر ہے یعنی جو چیز کامل، مرتب اور مستمر النظام ہوگی، وہ خود بخود پیدا نہیں ہوئی ہوگی، بلکہ کسی صاحبِ قدرت اور صاحبِ اختیار نے اُس کو پیدا کیا ہوگا۔

آج جبکہ تحقیقات و تدقیقات کی انتہا ہوگئی ہے، جبکہ کائنات کے سینکڑوں اسرار فاش ہوگئے ہیں، جبکہ حقائق اشیا نے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا ہے، بڑے بڑے فلاسفر اور حکما انتہائے غور و فکر کے بعد خدا کے ثبوت میں، یہی استدلال پیش کرسکے، جو قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے نہایت قریب الفہم اور صاف طریقہ میں ادا کیا تھا۔

آیزک نیوٹن کہتا ہے:۔

"کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلاباتِ زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جاسکے جو سب سے اول ہے اور صاحبِ علم اور صاحبِ اختیار ہے۔"

اس زمانہ کا سب سے بڑا حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے:۔

"ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور کرتے ہیں اُسی قدر وہ اور غامض ہوتے جاتے ہیں اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیا صادر ہوتی ہیں"

کیمل فلامریان[1] کہتا ہے:۔

"تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر ہوا۔ اور یہ کیونکر برابر چلا جاتا ہے، اسی بنا پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔"

پروفیسر لینی لکھتا ہے:۔

"خدائے قادر و دانا اپنی عجیب و غریب کارگیریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں، ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی ہو اس کی کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔"

---

[1] فرانس کا ایک مشہور فاضل ہے۔

فرنسل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے :-

"علوم طبعیات کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہماری عقل کی پیاس بجھاتے بلکہ اس کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی نظر خالق کائنات کی طرف اٹھائیں اور اس کے جلال و عظمت پر فریفتہ ہو جائیں۔"

(الکلام حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی)

اخلاق و سیاست کی معراج

جناب عمر فاروقؓ نے مسجد نبویؐ میں عام مسلمانوں کا ایک کھلا اجتماع طلب کر کے سب کے سامنے اس سوال کو پیش کیا، گویا اس اصول پر عمل کیا جسے آجکل کی سیاسی اصطلاح میں "ریفرنڈم" کہتے ہیں، آپ نے اس اجتماع میں جو تقریر کی، اس میں فرمایا :-

"میں نے آپ لوگوں کو اسلئے زحمت دی ہے کہ آپ میری اُن ذمہ داریوں میں میرا ہاتھ بٹائیں جن کو آپ ہی نے مجھے سونپا ہے میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک انسان ہوں، آپ جس بات کو حق سمجھیں اُسے ظاہر کریں، جس کسی کو میری رائے سے اختلاف ہو وہ اُسے کھل کر کہے اور جسے اتفاق ہو وہ اپنے اتفاق کا اعلان کرے، میں یہ خواہش قطعاً نہیں رکھتا کہ آپ میں سے کوئی بھی بے سوچے سمجھے میری ہاں میں ہاں ملاتے۔"

اسی طرح خلیفہ اول جناب ابوبکرؓ نے ایک اجتماعِ عام کو خطاب کرتے ہوتے فرمایا "اگر میں ٹھیک کام کروں تو آپ لوگ میرے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کریں لیکن میں سیدھی راہ سے بھٹکنے لگوں تو پھر آپ اپنی طاقت استعمال کریں اور میرے کس بل نکال دیں۔"

ہماری نظر میں

مکاتیب امام غزالی

مکاتیب امام غزالی — مترجمہ :- عبدالوہاب ظہوری - حجم ۲۴۰ صفحات - کاغذ چکنا سفید، لکھائی چھپائی دیدہ زیب - پائدار جلد، خوبصورت گرد پوش قیمت تین روپیہ
ملنے کا پتہ :- نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۱

حجۃ الاسلام امام احمد غزالی قدس سرہ العزیز کی شخصیت علم واخلاق کے گلکدے کا سدا بہار پھول ہے جس کا رنگ نہ تو گردشِ ایام کے ہاتھوں پھیکا ہو سکا اور نہ انقلاباتِ زمانہ اُس کی خوشبو کو دبا سکے، حضرت امام غزالی سیرت وکردار کی بلندی اور پاکیزگی کے ساتھ بہت بڑے مفکر اور بلند پایہ ادیب بھی تھے، اُن کی تصنیف "احیاء العلوم" اسلامی لٹریچر کی اُن چند گراں قدر کتابوں میں شمار ہوتی ہے جن پر خود علم وفضل کو ناز ہے۔

امام غزآلی معاشرت، احوال ومقام اور فکر ونظر کی بہت سی منزلوں اور تجربوں سے گزرے ہیں، اسی لئے ان کی تصانیف میں نفسیات کی نزاکتیں پائی جاتی ہیں، وہ اُس حاذق طبیب کی طرح ہیں جس نے امراض کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر اور ٹٹول کر معلوم کر لیا ہو — حجۃ الاسلام امام غزآلی بہت بڑے فلسفی تھے، مگر بوعلی سینا اور ابنِ رُشد کی طرح یونان زدہ نہیں ان کی فلسفیانہ فکر اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔

یہ کتاب امام غزآلی کے مکاتیب کا ترجمہ ہے، جس پر مقدمہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے مخصوص عالمانہ اور والہانہ انداز میں لکھا ہے، یہ مقدمہ اپنی جگہ خود ایک مبسوط مقالہ ہے، صفحہ (۱۹) کے اس ایک جملہ میں :- " بلکہ اعجازیت کا یہ رنگ اُس وقت اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے " — "اعجازیت" کانوں اور آنکھوں کو بھلا نہیں لگتا، مولانا موصوف کا مقدمہ ایک " مفید تعارف " کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترجمہ شستہ اور رواں ہے کتاب پڑھتے میں محسوس ہوتا ہے کہ مترجم امام غزآلی کے اندازِ نگارش اور مافی الضمیر سے بڑی حد تک واقف ہے، مفہوم شاید کہیں بھی گنجلک ہونے نہیں پایا، عبارت سادہ اور سہل ہے۔

حضرت امام غزآلی کے یہ خطوط بڑے کام کی چیز ہیں، ان میں بادشاہوں، وزیروں، اعیانِ حکومت امیروں اور خود عالموں اور فقیہوں کے لئے نصیحتیں اور ہدایتیں ہیں، حجۃ الاسلام نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ بادشاہوں اور حاکموں اور امیروں کو مخاطب فرمایا ہے، اصلاح کی دعوت دی ہے اور اس کے طریقے بتائے ہیں۔

صفحہ ۱۶۲، اور ۱۶۳ پر یہ جملے کتنی دل نشین حقیقت کے حامل ہیں :-

" مستقل اور پائدار شرف وہ ہے جس کی بنیاد اساسِ معرفت وحریت ہو، یہی باقیاتِ صالحات میں سے ہے معرفت سے مُراد یہ ہے کہ انسان دُنیا کے غرور اور اس کے فریب کی گہرائی، اور آخرت کی بلندی تک پہنچ کر

جائزہ لے، حریت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی خواہشاتِ نفس کی غلامی سے رہائی پائے۔"

حضرت امام غزالی نے ہماری زندگیوں کو آئینہ دکھایا ہے کہ اے آزادی کے جشن منانے والو! تم ابھی تک اپنی خواہشوں کے غلام ہو اور جب تک نفس کی بندگی تم کر رہے ہو، آزادی کا دعویٰ تمہیں زیب نہیں دیتا۔

"مکاتیب امام غزالی" افادیت سے لبریز ہیں، ان کا پڑھ لینا بھی فائدے اور ثواب سے خالی نہیں، اور جس کو عمل کی توفیق نصیب ہو گئی، تو اُس کی سعادت قابلِ رشک ہے۔

شگون

شگون (افسانوں کا مجموعہ) از: یحییٰ صدیقی، حجم ۱۴۴ صفحات، مطبوعہ جمہور پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن، قیمت دو روپیہ (مجلد)

جناب یحییٰ صدیقی گمنام افسانہ نگار ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ اُن کو زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے مگر اس بوالعجبی کو کیا کہیے کہ بعض غیر مستحق افسانہ نویس اور ناول نگار آج شہرت کے مزے لوٹ رہے ہیں اور یحییٰ صدیقی جیسا باکمال افسانہ نگار گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے، کیا غضب ہے کہ ہیرے خاک کے ڈھیر میں دبے پڑے ہیں اور خزف ریزوں سے بازار سج رہے ہیں۔

اس کتاب میں بارہ افسانے ہیں جن میں سے دو افسانے "اعتراف" اور "کھوکھلا" تو انگریزی تخیل سے ماخوذ ہیں، باقی افسانے خود مصنف کے فکر و دماغ کی تخلیق ہیں، ہم نے اُن ادیبوں کے مختصر افسانے بھی پڑھے ہیں، جن کی شہرت کے آج جھنڈے گڑے ہوتے ہیں ــــــ مگر یحییٰ صدیقی کی اپنے طرزِ فکر اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک نیا اسلوب رکھتی ہیں، ان میں دلچسپی ہے، سماج پر طنز ہے، نصیحت ہے اور نفسیات کی دقیق و نازک ترجمانیاں بھی، پھر زبان سادہ اور دلنشین! بانگی کے لیے "پاگل" کا ایک صفحہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"لوگ سمجھتے ہیں میں پاگل ہوں، محض اس لئے کہ میرے مُنہ میں جو آتا ہے بک دیتا ہوں، ساری دُنیا کو گالیاں دیتا ہوں، ہر شئے کا مذاق اُڑاتا ہوں، کبھی روتا ہوں، کبھی قہقہے لگاتا ہوں، بڑے بوڑھے میرے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں، جوان میرا مذاق اُڑاتے ہیں، بچے مجھے دق کرتے ہیں، یہ دیکھیے! ابھی ابھی کسی شریر لونڈے نے ایک بڑا سا پتھر مار دیا، پتھر میری پیشانی پر لگا گرم گرم خون کی دھار مجھے اندھا کرتی ہوئی گالوں پر سے گزرتی ہوئی میرے کپڑوں میں جذب ہو گئی، میری قمیص کا دامن زخم پونچھتے پونچھتے خون میں تر ہو گیا، کوئی ان کو کیوں نہیں سمجھاتا، کیوں منع نہیں کرتا، کیوں ان سے نہیں کہہ دیتا کہ میں پاگل نہیں ہوں، مجھے نہ ستائیں نہ ماریں، مجھے جینے دیں ...... جینے دیں کہ میں جی بھر کر گالیاں دے لوں، جی بھر کر ہر شئے کا مذاق اُڑا لوں، ...... ارے آپ تو ہنس رہے ہیں، کیا آپ بھی مجھے پاگل سمجھتے ہیں، سوچیئے تو سہی کیا پاگل ایسی معقول اور سنجیدہ گفتگو کرسکتے ہیں، آپ تو ہنسے ہی جا رہے ہیں ...... خیر جانے دیجئے ...... میں تو آیا تھا کہ آج کچھ اپنا حال آپ کو سناؤں گا، شاید آپ سمجھ سکیں، میرے ساتھ ہمدردی کرسکیں، میں آپ سے روپیہ پیسہ نہیں مانگتا، مجھے ضرورت نہیں ہے صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے، مجھے ستایا نہ جائے، مارا نہ جائے، مگر آپ تو سننا ہی نہیں چاہتے ...... سنیں گے آپ ...... مگر دیکھئے ہنسنے کی شرط نہیں ...... اچھا سنیئے ..!

اس مجموعے کے ایک دو افسانوں کا انداز شوخ ہو گیا ہے باقی سب سنجیدہ ہیں ــــ جناب یحییٰ صدیقی حیدرآباد دکن

سے پاکستان آگئے ہیں اور آ کیا گئے ہیں آنا پڑا ہے، اُن کی ادبی صلاحیتوں کی قدر ہونی چاہئے، قدر افزائیوں سے جوہر قابل پر اور آب آجاتی ہے۔

پیام نو "پیام نو" مرتبہ :- وفا راشدی، حجم ۲۱۲ صفحے، طباعت و کتابت، اوسط درجہ کی، قیمت دو روپیہ۔ ناشر:- مکتبہ اشاعت اردو کلکتہ، ڈھاکہ۔ ملنے کا پتہ :- مکتبہ اشاعت اردو نمبر ۱/۲۳ ڈبر برائٹ اسٹریٹ کلکتہ نمبر ۱۷۔

جناب وفا راشدی نے اردو زبان کے دس نہیں چھتیس شاعروں کا منتخب کلام (ایک غزل ایک نظم یا چند قطعے) اُن کے حالات کے ساتھ شائع کیا ہے، وفا صاحب کو شعراء کا کلام اور سوانح حیات حاصل کرنے میں یقیناً بڑی محنت کرنی پڑی ہے جب کہیں جاکر یہ گلدستہ مرتب ہوا ہے، ان شاعروں میں بعض مشاہیر، بعض کم مشہور اور دو چار گمنام شاعر بھی ہیں کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے تحریر فرمایا ہے ـــــ عندلیب صاحب جو چند دن سے حجلہ نشین ہوگئے ہیں: "پیام نو" کے منظر پر دکھائی تو دیئے ـــ

"پیام نو" کی بعض نظمیں بہت خوب ہیں، اور بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں اگر انتخاب میں زیادہ احتیاط برتی جاتی تو پست و بلند کی ناہمواری نہ رہتی۔ ــــ صفحہ ۲۶، آٹھواں شعر ہے

میں نغمہ ہوں بہتے ہوئے پانی کا
ترنم ہیں جس کے ہو کو شہ گھلا

حیرت ہے جعفر علی خاں اثر لکھنوی جیسے قادر الکلام اور فن داں شاعر کی نگاہ سے "پانی" کی "ی" کیسے چھوٹ گئی یہاں "ی" کا گرنا بہت ناگوار گزرتا ہے ـــــ صفحہ (۸۲) ساغر نظامی فرماتے ہیں:-

آئی وہ آئی روایات میں لپٹی ہوئی عید
سرد و بے روح مسرات میں لپٹی ہوئی عید

مسرت کی جمع "مسرات" پہلی بار نگاہ سے گزری اور بخدا آنکھوں میں کھٹک ہونے لگی۔ (صفحہ ۱۱۰) یونس احمر کی نظم "چل" کے بعض مصرعے مختلف بحروں میں ہیں :-

(۱) فضاؤں میں چھانے لگا ہے شباب
(۲) بیاباں کو گلشن بناتا ہوا چل

اور یہ مصرعہ ارادوں کے نغمات گاتا ہوا چل ...... ساغر کے "سرد و بے روح مسرات میں لپٹی ہوئی عید" مصرعے سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہے۔

مولانا حکیم علی لکھنوی کو اس مجموعہ میں دیکھ کر مسرت ہوتی، یہ وفا راشدی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، ورنہ ناطق صاحب نمود و شہرت سے بھاگتے ہیں!

عمر خیام "عمر خیام" ـــــ از عبدالوہاب خاں عاصم ایم، اے۔ ایم، او، ایل، ۱۶۰ صفحے، کتابت و طباعت نظر افروز۔ قیمت، ایک روپیہ۔ غالباً مصنف کے پتہ پر جے پور (راجستھان) سے مل سکے گی ـــ!

جناب عاصم جے پوری نے عمر خیام کی زندگی کو ڈرامہ کے انداز میں پیش کیا ہے، اس کتاب پر پیش لفظ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو (آنجہانی) کے داماد رائے بہادر پنڈت امرناتھ اٹل سابق فینانس منسٹر ریاست جے پور نے لکھا ہے پیش لفظ کے آخر میں ۵ نومبر ۱۹۴۰ء تاریخ درج ہے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب اردو "سب کی زبان" سمجھی جاتی تھی۔

کتاب کا دیباچہ خود مصنف نے لکھا ہے، صفحہ (۱) پر فرماتے ہیں ——— "عمر خیام شراب پیتا تھا" ——— اردو زبان میں مولانا سید سلیمان ندوی نے نہایت جامع کتاب لکھی ہے اور اردو کیا شاید فارسی اور انگریزی میں بھی خیام پر اتنی مستند اور بسیط کتاب نہیں لکھی گئی، مولانا موصوف کی وہ کتاب اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے، لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا نے خاص طور پر خیام کی شراب نوشی کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کے تذکرہ نگار اور ہم عصر اس کی شراب نوشی کا ذکر نہیں کرتے۔

سب جانتے ہیں کہ شراب خیام کا موضوع شاعری تھا، مگر شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جس نے شراب پر شعر کہے ہیں تو اس نے شراب بھی پی ہے، خود ہمارے زمانہ میں ریاض خیرآبادی ہی کو لے لیجئے کہ ساری عمر شراب ہی پر شعر کہے مگر شراب کو انہوں نے چھوا تک نہیں۔

اس ڈرامہ کے کیرکٹر ——— ملک شاہ، نظام الملک، تاج الملک، حکیم مظفر اسفزاری جامع فراش اور جعفر مسخرہ۔ تمام تاریخی شخصیتیں ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:-

"عمر خیام کی زبان سے جو خیالات ادا کئے گئے ہیں، بیشتر اسی کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں ......"

اس ڈرامہ کا شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور ایک ہی آہنگ Tempo ہے، زبان، انداز اور طرز ادا کافی دلچسپ ہے۔ بعض مقامات پر Dramatic climaxes بھی خوب ہیں چونکہ یہ ڈرامہ فلمانے جانے کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے بیچارے خیام کو زیادہ سے زیادہ رنگین دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ظاہر ہے اس کوشش اور ارادے کے ساتھ ڈرامہ نگار واقعیت کے حدود سے یقیناً متجاوز ہوگیا ہے۔

دخترانِ حرم

"دخترانِ حرم" ——— از:- ایم شفیق۔ ضخامت ۱۲۵ صفحات۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (مجلد، گرد پوش اور متعدد تصویروں کے ساتھ)

ملنے کا پتہ:- پاکستان اکیڈیمی۔ پوسٹ بکس ۵۰ کراچی

"خاتونِ پاکستان" کے لائق ایڈیٹر جناب ایم شفیق نے پاکستان اور ہندوستان کی مشہور مسلم خواتین کی سوانح حیات مرتب کر کے شائع فرمائی ہیں اور اس کا نام "دخترانِ حرم" رکھا ہے۔ شفیق صاحب کے قلم میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے جو اس کتاب میں بھی جگہ جگہ نمایاں ہے، زبان بھی کافی منجھی ہوئی ہے، کہیں کہیں بھول چوک بھی ہوگئی ہے، مثلاً صفحہ (۴۳) پر دو جگہ "گل و بوٹے" لکھا ہے، "گل بوٹے"، کسی "عطف" کے بغیر ہی لکھتے اور بولتے ہیں ؎

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی بیگم اکرام اللہ نے کتاب پر "تعارف" لکھا ہے، محترمہ شائستہ اختر اردو کی اچھی مضمون نگار ہیں، تقسیم ہند سے پہلے ان کے مضامین رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے، لیکن جب سے وہ "سیاسیات" کے میدان آئی ہیں ان سوچوں کی روانی ہی رک گئی ——— اب اس کا فیصلہ ارباب نظر ہی کریں گے کہ خاتون محترم

ادب کے ذریعہ ملک و قوم کی زیادہ خدمت انجام دے سکتی تھیں یا سیاست کے واسطہ سے!

ڈاکٹر شائستہ اختر تحریر فرماتی ہیں ——— " بدقسمتی سے ابھی تک عورتیں لاکھوں کی تعداد میں جاہل ہیں اور ہزاروں کو پردے نے عضوِ معطل بنا رکھا ہے ———" (صفحہ ۴۲)

گویا پردے میں ہر عورت "عضوِ معطل" اور بیکار ہو جاتی ہے۔ تدبیرِ منزل اور امورِ خانہ داری کی معاشرت میں کوئی اہمیت ہے ہی نہیں! عورت کی ساری فعالیت اور activeness کا اظہار پردے سے باہر ہی ہوتا ہے یعنی وہ جب تک "چراغِ خانہ" ہے بیکار اور نکمی ہے اور "شمعِ انجمن" ہوتے ہی اس کے پر لگ جاتے ہیں ——— خوب!

صفحہ (۴۵) پر رعنا بیگم لیاقت علی خاں کا ان الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے:-

" وہ مغربی موسیقی کی ماہر ہیں اور ہندوستانی سنگیت سے بہت اچھی واقفیت رکھتی ہیں ———"

ہماری آنکھیں تو یہ پڑھنا چاہتی تھیں کہ دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کے وزیر اعظم کی شریکِ حیات کو قرآن اور حدیث سے شغف ہے، اور اسلامیات کے مطالعہ میں اپنا وقتِ عزیز صرف کرتی ہیں، مگر "موسیقی میں مہارت" اور "سنگیت سے واقفیت" ——— یا اللہ یہ ہم کیا سن رہے ہیں!

"دخترانِ حرم" میں مسلمان خواتین کی تصویریں بھی ہیں اور ظاہر ہے جب کسی کی تصویر چھپتی ہے تو صاحبِ تصویر اپنے اچھے سے اچھے pose ہی کو منظرِ عام پر لانا چاہتا ہے اور "تصویر" کا فتنہ آج کل جو قیامت ڈھا رہا ہے اس پر اگر کوئی بےخبر ہے تو وہ ہوش و حواس سے عاری ہے اور اگر باخبر ہے تو اس کی غیرت پر ہمیں ترس آتا ہے۔

ہم صاف لفظوں میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے، یہاں لوگوں کے ذاتی ذوق شوق اور چیزوں کے لئے گنجائش نہیں رکھی جائے گی، عورتوں کی آزادی میں ترکی اور مصر کی ہم ہرگز پیروی نہ کریں گے، کہ اس منزل میں وہ یورپ کے دوش بدوش ہیں، عورت کے لئے صرف ایک پیام ہے

وہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم

گلِ خنداں

ماہنامہ گلِ خنداں' ایڈیٹر فرخ امرتسری۔ ضخامت ۸۰ صفحات، چندہ سالانہ چھ روپیہ، قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے
ملنے کا پتہ:- ماہنامہ گلِ خنداں" کشمیری بازار۔ لاہور۔

ماہنامہ گلِ خنداں" کا مشترک نمبر (نومبر و دسمبر) ہمارے پیشِ نظر ہے، جو سراج کمپنی (لاہور) کے اہتمام سے حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے، جناب فرخ امرتسری نے رسالہ کو متنوع اور دلچسپ بنانے کی بہت کوشش کی ہے، رسالہ کی طباعت و کتابت بھی دیدہ زیب ہے، اور سرورق دلکش ہے ——— یعنی " مصورّ گلِ خنداں" ! ——— اس رسالہ میں اخلاقی اور اسلامی مضامین کی بھی چاشنی پائی جاتی ہے، اور علمی و معلوماتی مقالے بھی موجود ہیں، "ترتیب میں تنوع" کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے!

اس ہمہ گیری کے باوجود بعض چیزیں کھٹکتی ہیں ——— صفحہ (۵) پر ابوسفیان کو " ابوصفیان" لکھا گیا ہے اور ایک نہیں دو جگہ! مگر ہم اسے کتابت ہی کی غلطی پر محمول کریں گے ——— ایک مقالہ جس کا عنوان " عہدِ حاضر کا ایک قلندر شاعر" ہے اس کے ابتدائی جملے ہیں:-

" حضرت علامہ اقبال " کا شمار عہدِ حاضر کی اُن مقدس ہستیوں میں ہوتا ہے جو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور جن کا کوئی سانس بغیر یادِ اللہ کے بسر نہیں ہوتا ـــــ ان مقدس ہستیوں کو بالفاظِ دیگر فقراء، قلندر، ابدال، اوتار[1]، نجبا، نقبا، ولی، غوث، قطب کے نام سے پکارا جاتا ہے "

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور اسلامی فکر و بصیرت اپنی جگہ مُسلّم اور اُس کا انکار بہت بڑی جہالت اور بے خبری ... مگر اُن کو " غوث و قطب " اور " ابدال و اوتاد " کا درجہ دے کر بایزید بسطامیؒ، معروف کرخیؒ، اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی صف میں لے آنا، ایک طرح کی " ہجو ملیح " ہے، ایسے بے جا مبالغوں سے شخصیتیں اُبھرنے کی بجائے مجروح ہو جاتی ہیں ـــ

صفحہ (۳۲) ـــ بابو صاحب آپ جنازے پر چلیں گے " ـــ " جنازے میں چلیں گے " یا " جنازے میں شریک ہوں گے " لکھنا چاہیے تھا ـــــ خواجہ دِل محمد صاحب ایم اے کی نظم " شاعر کا لوحِ مزار " میں بہت سے مصرعے کمزور اور پھُس پھُسے ہیں، آخری شعر ہے :-

اے کہ واقف دردِ عالم سے ہے تیری چشمِ نم
میرے تعویذِ لحد پر ڈال جب نقشِ قدم

" نقشِ قدم کا ڈالنا "، پہلی بار دیکھنے میں آیا ہے، یہ خواجہ دِل محمد صاحب اگر وہی بزرگ ہیں جن کی بہت سی ریاضی کی کتابیں پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں تو ہم عرض کریں گے کہ خواجہ صاحب ریاضیات ہی کی طرف پوری توجہ فرمائیں، تو علم و فن کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں گے۔

مقامِ مسرت ہے، کہ " گلِ خنداں " پر نام نہاد " ترقی پسندی " کی پرچھائیں تک نہیں پڑی، اور اس پُر آشوب زمانہ میں ان چلتی پھرتی اور بولتی چالتی لغویتوں سے دامن بچانا ہی بہت بڑا کام ہے ! یقین ہے کہ " گلِ خنداں " کے آنے والے پرچے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گے۔

ماہنامہ " کائنات "

ماہنامہ " کائنات " ـــ ایڈیٹر :- غلام محمد، سالانہ چندہ پانچ روپے ۔ فی پرچہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ :- ماہنامہ " کائنات " سوہا بازار، لاہور۔

ماہنامہ " کائنات "، تقریباً بارہ سال سے شائع ہو رہا ہے، بیچ میں ناسازگاری حالات کے سبب اس کی اشاعت ملتوی ہو گئی تھی، اب جنوری سنہ ۱۹۴۹ء سے یہ ماہنامہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ـــــ جناب غلام محمد صاحب " کائنات " کی ترتیب و تزئین میں بڑی کاوش سے کام لیتے ہیں، اور ان کی کوشش رہتی ہے کہ " ہر نقشِ ثانی " ـــ " بہتر کشد ز اول " کا مصداق بن جائے۔

" کائنات " کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشہور ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے خودنوشت حالات شائع ہوتے ہیں، اس چیز کی آج شاید زیادہ قدر نہ ہو، مگر آئندہ اس کی تاریخی اہمیت محسوس کی جائے گی، ـــــ مضامین کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، خاص طور سے افسانوں کی " صحتِ زبان " کی طرف ہم لائق مدیر کی توجہ کا رُخ پھیر دینا چاہتے ہیں، ایک دو اسلامی اور اصلاحی مقالے بھی شائع ہوتے رہیں تو رسالہ کی افادیت میں چار چاند لگ جائیں گے۔

[1] " اوتار " لکھا ہے، یہ کتابت کا سہو معلوم ہوتا ہے " اوتاد " ہوگا ـــ " م "

اِس کا ذائقہ
اِس کی اچھائی کا ثبوت ہے

اصفہانی چائے

خوبی نام سے ظاہر ہے

ایم۔ ایم اصفہانی لمیٹڈ

اصفہانی بلڈنگ میکلوڈ روڈ۔ کراچی

(پاک ایڈس)

مطبع عثمانی جسیم پورہ کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری

ماہنامہ
فاران
ماہر القادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اگر کوئی بھلا چنگا آدمی جس کے ہوش و حواس بھی صحیح ہیں، چاقو لے کر اُس سے اپنی انگلیاں کاٹ لیتا ہے تو دیکھنے والے یہی کہیں گے۔ کہ اس شخص نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔ لوگ ہمدردی اور چارہ سازی کم کریں گے اور اُس کی اس خوفناک نادانی اور حماقت کا مذاق زیادہ اڑائیں گے ـــــ اُس آدمی نے آخر کیا کیا؟ جسے دیکھنے والے "ظلم" اور "خطرناک نادانی" سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہی کہ چاقو جو ترکاری چھیلنے کاغذ کاٹنے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کیلئے بنایا گیا ہے اُس کا غلط طور پر استعمال کیا گیا۔ ہاں! کاغذ اور ترکاری کاٹتے میں نادانستہ طور پر کسی انگلی پر خراش آجاتی تو وہ دوسری بات تھی۔ اور اس کو بے احتیاطی سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہ "بے احتیاطی" نہیں چاقو کا "غلط استعمال" ہے۔ جس کو اگر دیکھنے والے نظر انداز بھی کر دیں تو وہ زخم، جو اس کی انگلیوں پر لگ چکے ہیں، ان کی اذیت سے تو وہ نہیں بچ سکتا۔

آگ سے کھانا پکانے پانی گرم کرنے اور اسی نوعیت کے دوسرے کام لئے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی اپنے کپڑوں میں آگ لگا لے۔ تو نتیجہ یہ ہے کہ آگ کے اس غلط استعمال سے اس کے کپڑے جل جائیں گے۔ اور آگ بجھانے کی فوری تدبیر نہ کی گئی۔ تو اس کا بدن بھی جھلس کر رہ جائے گا۔ اور ممکن ہے اس کی موت واقع ہو جائے ـــــ دنیا کی تمام چیزوں کا ٹھیک یہی حال ہے کہ ان کو غلط اور بے محل استعمال کرنے سے مضرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کے نقصانات ظہور میں آتے ہیں۔ افادیت اشیاء کے صحیح اور برمحل استعمال

ہی کا نام ہے۔ جہاں اور جب بھی جس کسی چیز کے استعمال میں اونچ نیچ ہوئی اور افادیت کی جگہ نقصانات نے لے لی ——— اور یہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ مابعد الطبیعات کا نازک مسئلہ یا کوئی فلسفیانہ نکتہ نہیں ہے جس کے سمجھنے میں بہت زیادہ کاوش کی ضرورت پیش آئے، یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا ہم سب روزانہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ اور کسی غبی سے غبی اور جاہل سے جاہل آدمی کو بھی اس کی صحت میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

آج دنیا کے ایک ایک گوشہ میں یہ جو بلا کی برہمی اور قیامت کا انتشار نظر آتا ہے۔ اور مشرق و مغرب میں ہر جگہ طرح طرح کے فتنے پائے جاتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ لوگ چیزوں کو غلط طور پر برت رہے ہیں۔ انسانوں کی تمام صلاحیتیں بے محل صرف ہو رہی ہیں، جس چیز سے جو کام لیا جانا چاہیئے، اس سے وہ کام نہیں لیا جا رہا ہے۔

اس زمانہ میں چیزوں، صلاحیتوں اور طاقتوں کے غلط استعمال کا کام بہت زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ وہ صلاحیتیں جو انسان کو قدرت نے ودیعت کی ہیں اور وہ چیزیں جو انسان نے خود بنایا ہے اور سائنس کے بنانے میں عقل، خرد کی تمام زیرکتیں اور توانائیاں صرف کر دی ہیں ——— وہ سب کی سب غلط اور بے جا استعمال ہو رہی ہیں۔ اس مشق اور مسلسل مشق کی بدولت آدمی غلط اندیش ہی نہیں غلط کار بھی ہو گیا ہے۔ انسان کی ان غلط کاریوں نے فتنوں کی صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ کہیں سرمایہ داری اور ملوکیت کا فتنہ کالے ناگ کی طرح پھنکار رہا ہے۔ تو کہیں معدے اور پیٹ کی تحریک انسانیت کیلئے مستقل عذاب بن گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو "قوت غضب" عطا فرمائی ہے۔ جو اپنی بچاؤ (DEFENCE) ظلم و بدی کے مٹانے اور فتنوں کے دور کرنے میں صرف ہونی چاہیئے۔ مگر آج اس قوت کو دوسروں کے جائز حقوق غصب کرنے، نسلی اور تفرق جتانے اور اپنی قومی برتری کا لوہا منوانے میں صرف کیا جا رہا ہے، تو قوت غضب کے اس غلط استعمال سے فتنے دور نہیں ہو رہے ہیں بلکہ اور پھیل رہے ہیں۔ برائیاں مٹ نہیں رہی ہیں بلکہ ان کی جڑیں مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ہر جنگ ایک نئے فتنے کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ جنگ کرتے کرتے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے کاٹتے جب لوگ تھک جاتے ہیں۔ تو "امن امن" کی پکاریں سننے میں آتی ہیں اور صلح کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں مگر ان امن بچاؤں اور صلح کانفرنسوں PEACE CONFERENCE'S کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ اس بہانہ سے سستایا یا دم لیا جا رہا ہے ——— یعنی آگے چلیں گے دم لے کر ——— تکان دور ہوتے ہی پہلی جنگ سے زیادہ خوفناک جنگ کیلئے بگل بجا دیا جاتا ہے اور وہ جو صلح و آشتی کی کانفرنسوں کے مندوب ہوتے ہیں اب ایک دوسرے کے حریف بن کر کارزار میں اتر آتے ہیں، یہاں تک کہ آدمیوں کے جسم تنکوں اور ذروں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہواؤں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر ان لڑائیوں میں ایسی ایسی شرمناک، ذلیل اور وحشیانہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں کہ ریچھ اور بھیڑیئے انہیں دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپاہجوں اور بوڑھوں کے گلے، دودھ پیتے بچوں کے کلیجے اور عورتوں کی عصمتیں تک محفوظ نہیں رہتیں۔

عقل اس لئے دی گئی تھی۔ کہ وہ برے بھلے میں تمیز کرے گی کھوٹے اور کھرے کی اس کے ذریعہ پہچان ہو گی۔ مگر آج "عقل" دھوکوں، فریبوں اور دسیسوں میں صرف کی جا رہی ہے جو شخص زیادہ سے زیادہ چھل فریب اور حیلہ سازی کے ساتھ اپنا الو سیدھا کرتا ہے، اسی کو دنیا عقلمند مانتی ہے۔ سیاست کا خوفناک کھیل آج دنیا میں عقل ہی کے ہاتھوں کھیلا جا رہا ہے برائیوں، بدکاریوں اور فحاشیوں میں "آرٹ" کی مدد سے جو نزاکتیں، جدتیں اور باریکیاں پیدا کی ہیں یہ سب عقل ہی کی تو فسوں کاری اور شعبدہ بازی ہے دور حاضر میں عقل نے شیطان اینڈ کو کی "سول ایجنسی" لے رکھی ہے۔ اس کمپنی کے تمام کام عقل ہی کے واسطہ سے انجام پاتے ہیں۔ یہ بنکوں کا سودی کاروبار، گھوڑ دوڑ اور کلب گھروں کی قمار بازیاں، فلموں کی بوقلمونیاں، سیاست کے منافقانہ داؤں پیچ یعنی

اس تماش کے تمام ناپاک ہنگامے "عقل ہی کے بنائے اور بچھائے ہوئے جال ہیں" اور یہ دام اس قدر "ہم رنگِ زمین" واقع ہوئے ہیں کہ طائرانِ بلند بام تک ان میں بڑی آسانی کے ساتھ پھنس جاتے ہیں ـــــ عقل جس کا کام رہ نمائی تھا۔ وہ رہزنی کا فرض انجام دے رہی ہے۔ مسیحا کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ ہے اور چرواہے اور رکھوالے کے ہونٹوں سے گوسفندوں کا لہو ٹپک رہا ہے۔

مال وزر اور زمین کی تمام زرخیزیاں اس لئے تھیں کہ ان کو جائز حدود میں رہ کر صرف کیا جائے۔ عیش سامانیاں، رنگ رلیاں اور نفس کی بے جا ناز برداریاں ان حدود سے باہر ہیں ـــــ مگر آج یہ تمام ذرائع اور وسائل فضول خرچیوں اور تعیش کے ہنگاموں کے کام آ رہے ہیں۔ جہاں دولت کی "منصفانہ تقسیم" کے ڈھنڈورے پیٹے جا رہے وہاں بھی دولت "قومی ملکیت" کی خوش فریب چادر اوڑھ کر، ان برائیوں اور نفس کی لذتوں میں صرف ہو رہی ہے۔ جس کے ڈانڈے گناہ و بدکاری سے جا کر مل جاتے ہیں، ملوکیت اور سرمایہ داری جن برے کاموں پہ دولت صرف کرتی ہے "قومی حکومتیں" بھی مال وزر کا استعمال انہی کاموں پر کرتی ہیں، بس زیادہ سے زیادہ قالب بدل جاتا ہے۔ مگر روح تبدیل نہیں ہوتی۔ خدا ناشناس قومی حکومتوں میں ہوتا یہ ہے۔ کہ وہ دولت جو ملوکیت اور سرمایہ دارانہ نظام میں چند افراد کی ہوس کارانہ لذتوں پر صرف ہوا کرتی تھی اب وہ قومی تنظیم کے ساتھ عوام کے کام اس طریقہ پر آتی ہے کہ نفس کی لذتوں کو "قومی اور عوامی" سند عطا کر دی جاتی ہے اور ہوس ناکیوں کی سہولتوں اور آسانیوں میں مزدور اور کسان بھی شریک ہو جاتے ہیں۔

"آنکھیں" "آفاق" کی وسعتوں اور ان کی بوقلمونیوں کو دیکھنے اور ان کے ذریعہ "ہدایت" حاصل کرنے کیلئے دی گئی تھیں مگر آج وہ عریاں نظاروں میں صرف کی جا رہی ہیں۔ یہ "میلے" "ٹھیلے" "نمائشیں" "سیر و تفریح" کے ہنگامے اسی ذوقِ نظارگی کی تسکین و پذیرائی کے لئے برپا ہوتے ہیں۔ نگاہیں ضائع ہو رہی ہیں۔ آنکھیں بیکار جا رہی ہیں اور طاقتِ دید کا انتہائی غلط استعمال ہو رہا ہے اخلاق و سیرت تو ایک طرف رہے، لوگوں کو شاید اس کا بھی پتہ نہیں ہے کہ طاقت آنکھوں کی راہ سے بھی ضائع ہوتی ہے۔

آدمی نے سائنس کے زور سے زمان و مکان کے فاصلوں کو کم کر دیا ہے۔ ہوا کی موجوں، پانی کی لہروں اور بجلی کی سبک خرامی پر وہ قابو پا چکا ہے۔ ایسی ایسی نادر اور عجیب ایجادیں اس نے کی ہیں۔ کہ سو سال پہلے کے انسان اگر زندہ ہو جائیں تو سائنس کے کرشموں کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ جائیں۔ کہ دنیا کا کارخانہ جادو کے زور سے چل رہا ہے اور جادوگری لوگوں کا پیشہ ہو گیا ہے۔ سائنس کی ان معجز نما ایجادوں نے معیشت اور زندگی کے لئے جو سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ ان سہولتوں کو معصیتوں اور نفس آلودگیوں میں صرف کیا جا رہا ہے۔ گناہوں کی رفتار سائنس کی رفتارِ ترقی کے اوسط سے بہت تیز ہو گئی ہے۔

ایک وہ بھی دورِ انسانیت پر گذرا ہے۔ کہ آدمی لکھنا ہی نہ جانتا تھا۔ اور جب اسے لکیریں بنانا اور حرف لکھنا آیا۔ تو اس کے پاس نوشت و خواند کیلئے کوئلہ، سیلکری، پتھروں کی تختیوں، درختوں کے پتوں، جانوروں کی کھالوں اور کھردرے کاغذوں کی کل کائنات تھی ـــــ اور آج قرطاس و قلم، اور طباعت و کتابت کی جو سہولتیں میسر آئی ہیں وہ اگلے لوگوں کیلئے شاید "معجزے" کی حیثیت رکھتی ہیں! مگر چھاپہ خانوں کا آج یہی کام ہے کہ وہ ایسا لٹریچر چھاپ چھاپ کر دنیا کے سامنے لائیں۔ جن سے نفس کے چٹخاروں کو زیادہ سے زیادہ بھڑکایا جا سکے، یا پھر جھوٹی اور بے سروپا باتوں کی اشاعت ہوتی ہو، یا پھر لکھنے والوں کے فخر و غرور میں اضافہ ہوتا رہے۔

استعمال کی یہ غلط کاریاں، چیزوں اور قوتوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ آج کی دنیا میں اشخاص کو غلط مقام دے دیئے گئے ہیں۔ خیانت کرنے والوں کو امانتیں سونپ دی گئی ہیں۔ رہزنوں کو رہنمائی کا منصب جلیلہ تفویض کر دیا گیا ہے بھیڑیے رکھوالی اور پاسبانی کر رہے ہیں، گم کردہ راہ قائد بنے ہوئے ہیں۔ اور بدکردار لوگوں کو نئی نسلوں کی تربیت سپرد کر دی گئی ہے۔

ان حالات میں دنیا کو فتنہ و فساد سے بھر جانا ہی چاہیئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ طوفان کسی مقام سے گذرے اور وہاں کی زمین سوکھی کی سوکھی ہی رہے۔ انگیٹھی گرم ہوگی تو آس پاس کی زمین ٹھنڈی نہیں رہ سکتی ـــ جب تک قوتوں، چیزوں اور انسانوں کے "غلط استعمال" کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کو سکون کی ایک ساعت بھی میسر نہیں آسکتی۔ دنیا میں انقلاب آئیں گے مگر بناؤ کے لئے نہیں بگاڑ کیلئے! ہر غالب قوت سعی کرے گی کہ دنیا کے مادی وسائل اور ذرائع پر اسے دسترس ہو۔ اور انہیں زیادہ سے زیادہ غلط طور پر استعمال کرے۔ اس لئے کہ اگلی قوتوں اور پچھلے لوگوں نے بھی اسی طریقہ سے زندگی کے مزے لوٹے تھے اور ان کی ہوس اقتدار کو عروج حاصل ہوا تھا۔

یہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے انسانوں کی اس غلط کاری کی نشاندہی کی اور اسے متنبہ کیا، ٹوکا اور بتایا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے۔ اس کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور خالق کائنات نے کائنات خلق کر کے اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ کہ آدمی جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے، اس نے طاقتوں، قابلیتوں اور چیزوں کے صحیح استعمال کے طریقے بتائے اور حدود کھینچ دیئے۔ کہ ان میں رہ کر اللہ کی دی ہوئی طاقتیں استعمال کی جائیں، ان سے باہر ہوتے ہی طاقتوں اور چیزوں کا غلط استعمال شروع ہو جاتا ہے اور اسی نقطہ سے معاشرت میں انتشار اور برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت جبکہ دنیا "سرمایہ و افلاس" کی اقتصادی پیچیدگیوں سے آج کی طرح واقف بھی نہ تھی۔ اسلام نے "سود" کو حرام قرار دیکر سرمایہ داری کے بت پر شاہ ضرب MASTER STROKE لگائی۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں اعتدال اور توازن ہے۔ افراط و تفریط نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے "ذاتی ملکیت" کیلئے اپنے اقتصادی اور معاشرتی نظام میں گنجائش رکھی، مگر اس پر "زکوٰۃ" کی قید لگا کر اور "ایثار و احسان" کی راہیں دکھا کر انسانی معاشرت کیلئے رحمت بنا دیا۔

اسلام نے عورت سے کہا کہ وہ غیر مردوں کے سامنے بے حجابانہ نکلے۔ جاہلیت کے "شوق تبرج" کو چھوڑ دے۔ زینت کی چیزوں کو چھپائے اور چہروں پر "جلباب" ڈال لیا کرے۔ دوسری طرف مردوں کو نیچی نگاہیں رکھنے کا حکم دیا گیا ـــ مرد اور عورت میں سے جو کوئی بھی ان حدود سے تجاوز کرے گا۔ وہ حقیقت میں گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور اس فعل کو نگاہ کا غلط استعمال کہا جائے گا۔

اسلام درحقیقت اللہ تعالیٰ سے ایک معاہدہ ہے ـــ ناقابل شکست معاہدہ! اس بات کا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی بندگی کی جائے گی، اس لئے انسان کی تمام قوتیں اور توانائیاں اللہ کی بندگی ہی میں صرف ہونی چاہئیں۔ انسان کی کوئی قوت جب اللہ کی بندگی کی بجائے اللہ سے بغاوت اور نافرمانی میں خرچ ہوگی تو قوت کا یہ غلط استعمال ہوگا، اور اسی جگہ سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

اسلام نے آدمی کی عزت اور بڑائی کا معیار "تقویٰ" مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص حسن و جمال میں غیرت "آفتاب" شہ زوری میں رستم سے بڑھ کر، مال داری میں قارون، علم و آگہی میں رشک سقراط اور دولت و سطوت میں نمرود و فرعون کو بھی شرما دینے والا کیوں نہ ہو ـــ اگر وہ متقی، خدا ترس اور پاکباز نہیں ہے تو اسلام اسے عزت کا کوئی مقام دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ کہ اس ذہنیت کا آدمی اپنی تمام قوتوں کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اور "رحمتیں" اس کی غلط کاریوں کے سبب "زحمتیں" بن جاتی ہیں۔

جب تک دنیا کی چیزوں کی قدروں (VALUE) کا معیار "اسلام" نہ ہوگا۔ اور ان کا استعمال اسلام کے بتائے ہوئے طریقوں پر نہ کیا جائے گا۔ دنیا کی موجودہ بے چینی دور نہیں ہو سکتی، فتنے اسی طرح اٹھتے رہیں گے اور ظلم و ستم کی یونہی گرم بازاری رہے گی ـــ کاش! دنیا والوں کے پاس "صحیح قبول" ہوتا اور ساتھ ہی متاثر ہونے والے قلوب بھی!

ماہر القادری

یکم فروری سنہ ء

پروفیسر سلیم چشتی

صحرا نشین شعر و ادب کے میدان میں

جب جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، جب موت آس پاس پھر رہی تھی، جب بہادر دشمنوں سے برابر کی ٹکر ہو رہی تھی، جب خوں بہا اور قصاص کی کشمکش تھی، جب نازنینانِ حرم جنگ میں لڑنے والوں کی غیرت کو اُبھار رہی تھیں، جب سخاوت، مروّت اور مظلوموں کی دستگیری زبانِ حال سے بول رہی تھی .... اور عرب شعراء ....

اہل عرب شجاعت اور جواں مردی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ یہی وصف ان کی شاعری کا شاندار بلکہ گراں قدر موضوع ہے۔ عربوں کی شاعری پڑھ کر ان کی بہادری اور مردانگی کے کارنامے معلوم ہوتے ہیں۔ عرب شعرا کی رجزیہ اور رزمیہ شاعری طوفان کی طرح پُرجوش اور شعلوں کی طرح شدید ہے۔ لڑائی کے وقت دشمنوں کی صفوں میں گھُس جانا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اور کسی کی جان لینا اور اپنی جان دینا ان کے نزدیک ایک معمولی بات تھی۔ ہنگامۂ جنگ میں شیروں کی طرح قتال پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

مقادیمُ وصّالونَ فی الرَّوعِ خَطْوَهُم ٭ بکلِّ رقیقِ الشَّفرتینِ یمانی

"وہ لوگ لڑائی میں سب سے آگے رہنے والے ہیں اور خوف کی جگہ اپنے قدم دودھاری تلوار سے ملانے والے ہیں۔"

فلمّا صرّحَ الشرُّ ٭ فأمسیٰ وھو عُریانُ

ولم یبقَ سوی العدوان ٭ دِنّاھُم کما دانوا

مشینا مشیةَ اللیثِ ٭ غدا واللیثُ غضبانُ

"پس جب لڑائی کھلم کھلا ہونے لگی اور سوائے ظلم و انتقام کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ تو ہم نے ان سے ویسا ہی معاملہ کیا جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ پس ہم ان کو سزا دینے کے لئے ایسے شیر کی چال چلے۔ جو غضب ناک ہو!"

عنترہ مشہور جاہلی شاعر اور شہسوار اپنی تعریف میں کہتا ہے:-

وحلیلِ غانیةٍ ترکتُ مجدّلاً ٭ تمکو فریصتُه کشدقِ الاعلمِ

"اور بہت سی خوبصورت عورتوں کے شوہروں کو میں نے ایسے حال میں زمین پر گرا دیا۔ کہ خوف کی وجہ سے ان کے شانوں کے گوشت پھڑکتے تھے اور ان کے زخموں سے خون ایسے زور سے نکلتا تھا کہ جیسے ہونٹ بند کئے ہوئے آدمی کی سانس کی آواز نکلتی ہے!"

ومُدَجّجٍ کَرِہَ الکُماةُ نِزالَهُ ٭ لا مُمعِنٍ ھرَباً ولا مُستسلِمِ

اور بہت سے ایسے مسلح آدمیوں کو (زمین پر گرا دیا) جن سے بہادر آدمی بھی لڑتے ہوئے خوف کھائیں اور جو نہ لڑائی سے کبھی بھاگیں، نہ

دشمن کی اطاعت قبول کریں:

جادت لہ کفی بعاجلِ طعنۃٍ • بمثقفٍ صدقِ الکعوبِ مقوّمِ

"ایسے بہادروں کو میرے ہاتھ نے بہت جلد سیدھے اور گٹھیلے پوروں کے نیزہ کا زخم عطا کیا۔"

فشککتُ بالرمح الاصمِّ ثیابہٗ • لیس الکریمُ علی القنا بمحرّمِ

"پس میں نے ان کو مضبوط نیزہ سے بیندھ لیا اور بہادر آدمی نیزوں کیلئے حرام نہیں ہیں (یعنی بہادر آدمی ہی نیزہ کا زخم کھاتا ہے)"

فترکتہٗ جزرَ السباعِ ینشنہٗ • یقضمنَ حسنَ بنانہٖ والمعصمِ

"پس میں نے ایسے بہادروں کو درندوں کی خوراک بنا دیا۔ چنانچہ وہ ان کی نعشوں کو جھنجوڑتے تھے اور ان کی نازک انگلیوں اور کلائیوں کو اپنے اگلے دانتوں سے کاٹتے تھے۔"

۲۔ چونکہ عرب کی عورتیں اپنے شوہروں کی شجاعت پر فخر کرتی تھیں اور ان کی بزدلی کو سخت معیوب جانتی تھیں۔ اس لئے اکثر شعراء جب اپنی شجاعت کا ذکر کرتے تھے تو اپنی بیویوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور جاہلی شاعر عامر ابن طفیل اپنی بیوی سے یوں خطاب کرتا ہے:۔

طُلِّقتِ ان لم تسألی ایُّ فارسٍ • حلیلُکِ اذ لاقی صُداءَ وخثعما

"تجھ پر طلاق ہو اگر تو حاضرینِ معرکہ سے یہ نہ پوچھے کہ تیرا شوہر کیا عمدہ شہسوار تھا۔ جب وہ قبیلۂ صُدا اور قبیلۂ خثعم سے لڑا۔"

اکرُّ علیہم دعلجاً ولبانہٗ • اذا ما اشتکی وقع الرماحِ تحمحما

میں نے اپنے گھوڑے کو (جس کا نام دعلج تھا) اور اس کے سینہ کو ان کے اوپر لوٹا دیا تھا۔ اور جب دشمن تکلیف محسوس کرتا تھا۔ تیروں کی ضرب لگائی تو اس کے منہ سے ہنہنانے کی آواز نکلتی تھی۔

سیار ابن قصیر الطائی لکھتا ہے ؎

لو شہدت امُّ القُدیدِ طعاننا • بمرعشَ خیلَ الارمنیِّ ارنّتْ

اگر میری بیوی امّ قدید مرعش کے معرکہ میں موجود ہوتی جبکہ ہم ارمنی سواروں سے نیزہ بازی کر رہے تھے تو وہ شدتِ خوف سے چیخ پڑتی

عشیۃَ ارمی جمعہم بلبانہٖ • ونفسی وقد وطّنتہا فاطمأنّتْ

(وہ چیخ پڑتی) اُس شام کے وقت جبکہ میں تیر اندازی کر رہا تھا۔ اور دشمنوں کو اپنی جان اور اپنے گھوڑے کے سینہ کی مدد سے دفع کر رہا تھا۔ اور میں نے اس وقت اپنی جان کو مصائب کیلئے مستعد کر دیا تھا۔ اور وہ مستعد ہو گئی تھی۔

۳۔ یہ لوگ جنگ سے منہ موڑنے کو سخت بزدلی اور اپنے لئے باعثِ شرم خیال کرتے تھے۔ اور یہ بات فقط زمانۂ جاہلیت سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ زمانۂ اسلام میں بھی ان لوگوں کے یہی خیالات تھے۔ چنانچہ حصین بن حمام المرّی جو مخضرم ہیں۔ یعنی پہلے کافر تھے۔ پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ کہتے ہیں:۔

تأخّرتُ استبقی الحیاۃَ فلم اجد • لنفسی حیاۃً مثلَ ان اتقدّما

"میں بقائے حیات کی امید میں میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹا مگر اپنے لئے کوئی زندگی، پیش قدمی کرنے سے بہتر نہ پائی۔"

فلسنا علی الاعقابِ تدمی کلومُنا • ولکن علی اقدامنا تقطرُ الدماء

پس ہمارے زخموں کا خون ہماری ایڑیوں پر نہیں گرتا۔ بلکہ ہمارے قدموں پر گرتا ہے۔ یعنی ہم میدان جنگ سے منہ نہیں موڑتے بھاگتے

والوں کی طرح پشت پر زخم نہیں کھاتے، جو ہماری ایڑیاں خون آلود ہوں۔

ایک اور شاعر لکھتا ہے:۔

فلستُ بمبتاعِ الحیوٰۃِ بذلّۃٍ ٭ ولا مُرتقٍ من خشیۃِ الموتِ سُلّما

"میں ذلّت کے ساتھ اپنی زندگی کا سودا نہیں کرتا۔ اور نہ میں موت کے خوف سے سیڑھی پر چڑھنے والا ہوں!"

۴۔ کثرتِ قتال اور جنگ و جدال میں مصروف رہنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے:۔

وأیّامُنا مشہورۃٌ فی عدوّنا ٭ لہا غُرَرٌ معلومۃٌ وحُجولُ

"اور ہمارے معرکے ہمارے دشمنوں میں مشہور ہیں۔ اور ان کے چہروں اور پیروں کے نشاناتِ درخشندہ معلوم ہیں۔"

وأسیافُنا فی کلِّ غربٍ ومشرقٍ ٭ بہا من قراعِ الدارعینَ فلولُ

"اور ہماری تلواریں مغرب اور مشرق میں مشہور ہیں۔ اور زرہ پوش بہادروں کے ساتھ کھٹا کھٹی سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔"

مُعوّدۃٌ ألّا تُسلَّ نصالُہا ٭ فتُغمدَ حتّی یُستباحَ قبیلُ

"ہماری تلواریں اس بات کی خوگر ہیں، کہ جب نیام سے باہر کھینچی جائیں تو جبتک کوئی قبیلہ قتل نہ ہو جائے نیام میں واپس نہیں جاتیں"

۵۔ یہ لوگ لڑائی میں جان دینی باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے مرنے والے کی بہادری ثابت ہوتی ہے۔

سموئیل بن عادیا ایک یہودی شاعر لکھتا ہے:۔

وإنّا لقومٌ ما نری القتلَ سُبّۃً ٭ إذا ما رأتہُ عامرٌ وسلولُ

یُقرّبُ حبُّ الموتِ آجالَنا لنا ٭ وتکرہُہُ آجالُہم فتطولُ

وما ماتَ منّا سیّدٌ حتفَ أنفِہِ ٭ ولا طُلَّ منّا حیثُ کانَ قتیلُ

تسیلُ علی حدِّ الظُباتِ نفوسُنا ٭ ولیست علی غیرِ الظُباتِ تسیلُ

"ہم ایسی قوم ہیں کہ لڑائی میں مارے جانے کو ننگ و عار (بُری بات) نہیں سمجھتے جبکہ بنی عامر اور بنی سلول اس کو عار جانتے ہیں —— موت کا دوست رکھنا ہمارے آخری اوقات کو ہم سے قریب کر دیتا ہے اور ان کے آخری اوقات موت سے ڈرتے ہیں، اس لئے وہ طویل العمر ہو جاتے ہیں —— ہمارا کوئی سردار بستر پر نہیں مرا۔ بلکہ جو مرا لڑائی میں مرا۔ اور ہمارا کوئی مقتول ایسا نہیں ہے جس کا قصاص نہ لیا گیا ہو —— ہمارے خون ہماری تلواروں کی دھاروں پر بہتے ہیں اور تلواروں کی دھاروں کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں بہتے ——"

۶۔ یہ لوگ طولِ عمر اور بڑھاپے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا، کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ لہٰذا انسان کو میدانِ جنگ سے جان چرانی زیبا نہیں ہے۔ چنانچہ قطری بن الفجاءۃ کہتا ہے:۔

فإنّکَ لو سألتَ بقاءَ یومٍ ٭ علی الأجلِ الذی لکَ لم تُطاعِ

"کیونکہ اگر تو اپنے وقتِ مقررہ سے ایک دن کی زندگی بھی زیادہ مانگے گا۔ تو تیرا کہا نہیں مانا جائے گا۔"

سبیلُ الموتِ غایۃُ کلِّ حیٍّ ٭ فداعیہِ لأہلِ الأرضِ داعِ

"ہر زندہ آدمی کو یہی راہ چلنی ہے۔ کیونکہ موت زمین کے تمام بسنے والوں کو انجام کار اپنی طرف بلاتی ہے۔"

ومن لا یُعتبط یسأمْ ویہرمْ ٭ وتُسلمہُ المنونُ إلی انقطاعِ

"اور جو شخص جوان ہلاک نہیں کیا جاتا۔ وہ بڑھا اور زندگی سے تنگدل ہو جاتا ہے اور زمانہ اس کو فنا اور ہلاکت کے سپرد کر دیتا ہے۔"

وما للمرء خیر من حیاة ۔ اذا ما عُدّ من سقط المتاع

"اور مرد کیلئے جیتے رہنے میں کوئی بھلائی نہیں ہے جبکہ وہ بڑھاپے کے سبب سے نکمّا اور ناکارہ سمجھا جائے"

۸۔ یہ لوگ کبھی کبھی مصلحتاً میدان جنگ سے کنارہ کش بھی ہو جاتے تھے۔ اس بنا پر کہ آئندہ موقع پر دشمن سے بہتر طریق پر انتقام لے سکیں گے چنانچہ عمرو بن معدیکرب مخضرمی جو مشہور شمشیر زن گذرا ہے اپنے متعلق کہتا ہے:-

ولقد اجمع رجلیّ بها ۔ حذر الموت وانی لفرورا

بخدا میں موت کے خوف سے اپنے دونوں پاؤں گھوڑے پر خوب جما لیتا ہوں اور وقت پڑے تو بڑا بھاگ جانے والا بھی ہوں۔

ولقد اعطفها کارهة ۔ حین للنفس من الموت هریر

اور میں اپنے گھوڑے کو زبردستی میدان جنگ سے موڑتا ہوں۔ میرا نفس بے موقع موت کو پسند نہیں کرتا۔

کل ما ذلک منی خلق ۔ وبکلٍّ انا فی الروع جدیر

لڑنا اور بھاگ جانا یہ دونوں میری عادت میں داخل ہیں اور لڑائی میں یہ دونوں باتیں مجھے زیبا ہیں!

۔ اور یہ لوگ مصائب و آلام اور شدائد روزگار پر صبر کو ترجیح دیتے تھے۔

ولما رأینا الصبر قد حیل دونه ۔ وان کان یوماً ذا کواکب مظلما

اور جب ہم نے دیکھا کہ صبر جنگ کے درمیان حائل ہے اور یہ کہ وہ جنگ کا دن اتنا تاریک ہے کہ اس میں تارے نظر آتے ہیں

صبرنا وکان الصبر منا سجیة ۔ باسیافنا یقطعن کفا ومعصما

تو ہم نے صبر کیا اپنی تلواروں کے ساتھ جو دشمنوں کی ہتھیلی اور کلائی کو کاٹتی ہیں۔ اور صبر تو ہماری عادت میں داخل ہے۔

وفارقت حتی ما ابالی من النوی ۔ وان بان جیران علی کرام

"اور میں اپنے پیاروں سے جدا ہو گیا۔ اور اب کسی کی جدائی کی پروا نہیں کرتا۔ چاہے پیارے عزیز اور محترم ہمسائے مجھ سے جدا ہو جائیں!"

فقد جعلت نفسی علی النای تنطوی ۔ وعینی علی فقد الحبیب تنام

پس میں نے اپنے نفس کو فراق سے مانوس کر دیا ہے اور میری آنکھ دولت کے گم ہو جانے پر بھی لگ جاتی ہے (یعنی مجھے نیند آجاتی ہے)

۹۔ یہ لوگ قصاص لینے کے بعد یا جنگ کے خاتمہ پر فخریہ اشعار کہتے تھے جن میں اپنی شجاعت کا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ قیس ابن حطیم کہتا ہے:-

طعنت ابن عبد القیس طعنة ثائر ۔ لها نفذ لولا الشعاع اضاءها

میں نے ابن عبد القیس کے ایسا برچھا مارا جیسا بدلہ لینے والا مارتا ہے۔ اگر خون نہ نکلتا تو اس کا سوراخ اس زخم کو اچھی طرح نمایاں کر دیتا۔

ملکت بها کفی فانهرت فتقها ۔ یری قائم من دونها ما وراءها

میں نے تول کر نیزہ مارا اور شگاف زخم کو اس قدر چوڑا کر دیا کہ ایک شخص کھڑے ہو کر آگے سے پیچھے کا حال معلوم کر سکے

یهون علی ان ترد جراحها ۔ عیون الاواسی اذ حمدت بلاءها

میرے لئے آسان ہے کہ (ایسا زخم لگاؤں) وہ زخم (گہرائی اور وسعت کی وجہ سے) علاج کرنے والی عورت کی آنکھوں کو اس کے دیکھنے سے باز رکھے۔ جبکہ میں زخم لگانے کا حق (پورے طور سے، تعریف کے قابل) ادا کر دوں

فإنّي في الحروب الضاريات موكّلٌ ❊ بإقدام نفسٍ ما أريدُ بقاءها

اور یہ کارنمایاں میں اس وجہ سے انجام دیتا ہوں۔ کہ سخت لڑائی میں سب سے آگے رہتا ہوں، اور میں اس وقت اپنی زندگی باقی نہیں چاہتا۔

ایک اور جاہلی شاعر کہتا ہے :-

لقد علمَ القبائلُ أنّ قومی ❊ ذوو جِدٍّ إذا لبسَ الحديدُ

سب قبائل جانتے ہیں کہ میری قوم جب لڑائی میں ہتھیار سجالے، تو پھر جان لڑ دیتی ہے"

وَأنّا نِعمَ أحلاسُ القوافی ❊ إذا استعرَ التّنافرُ والنّشیدُ

اور یہ کہ ہم بہت اچھے شاعر ہیں، جب فخر و مباہات اور شعر خوانی کی آگ بھڑکے۔

وَأنّا نضربُ الملحاءَ حتّی ❊ تولّی والسّیوفُ لنا شهودُ

اور ہم ایسے لشکر کو جو سلاح آہنی کی وجہ سے سیاہ اور سفید ہو تلواروں پر رکھ لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اس پر ہماری تلواریں (خود) گواہ ہیں۔

(۱۰) چونکہ وہ لوگ حقیقی معنوں میں شجاع تھے۔ اس لئے اپنے دشمنوں کی بہادری کی بھی تعریف کرتے تھے اور اس حقیقت نگاری سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ ان کی شاعری میں سچائی کا عنصر غالب تھا۔ چنانچہ زفر بن الحارث الکلابی (یہ ایک بڑے تابعی گذرے ہیں اور مشہور بہادر) کہتے ہیں :-

وکنّا حسبنا کلَّ بیضاءَ شحمةً ❊ لیالیَ لاقینا جذامَ وحمیرا

اور ہم نے ہر سفید رنگ کو چربی کی طرح ضعیف اور نرم گمان کیا۔ ان راتوں میں جبکہ ہم لڑے قبیلۂ جذام اور حمیر سے (مرج راہط میں)

فلمّا قرعنا النّبعَ بالنّبعِ بعضَهُ ❊ ببعضٍ أبت عیدانُه أن تکسّرا

اور جب کھٹکھٹایا ہم نے کمانوں سے کمانوں کو تو ان کی لکڑیاں نہیں ٹوٹیں (یعنی تیروں کے ختم ہو جانے کے بعد ہم کمانیوں کی لاٹھیاں بنا کر لڑے)

ولمّا لقینا عصبةً تغلبیةً ❊ یقودونَ جُرداً للمنیّةِ ضُمّرا

اور جب مڈبھیڑ ہو گئی ہماری جماعت کی بنی تغلب سے جو بہترین قسم کے گھوڑوں کو موت کی طرف ہنکاتے تھے!

(اجرد کے لغوی معنی ایسا گھوڑا جس کے جسم پر بہت کم بال ہوں۔ ضامر ایسا گھوڑا جس کی کمر پتلی ہو۔ اور لاغر یا چھریرا ہو۔ اور شریف النسل تیز رفتار گھوڑوں میں یہ سب صفات پائی جاتی ہیں۔)

سقیناهم کأساً سقونا بمثلها ❊ ولکنّهم کانوا علی الموتِ أصبرا

جیسا پیالہ ہم نے ان کو پلایا ویسا ہی انہوں نے ہم کو پلایا۔ مگر وہ لوگ موت پر بہت ثابت قدم نکلے (اس لئے ہمیں راہ فرار اختیار کرنی پڑی)

ؔ عربی میں ایک ضرب المثل ہے کہ ہر سفید چیز چربی (ضعیف) نہیں ہوتی جس طرح انگریزی کی ضرب المثل ہے

EVERY THING THAK GLITHERS IS NOT GOLD

اسی طرح ایک اور جاہلی شاعر اپنی قوم اور اپنے دشمنوں کی تعریف میں کہتا ہے :-

فجاؤا عارضاً برداً وجئنا ✦ کمثل السیل نرکب وازعینا

پس وہ پہلے ہوئے اولے برسانے والے بادل کی طرح آئے اور ہم سیلاب کی طرح آئے اور ہم دونوں اپنی اپنی فوجوں کا اہتمام کرتے تھے۔

فنادوا یا آل بہثۃ اذ رأونا ✦ فقلنا احسنی ملاءً جہینا

جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو پکارا یا آل بہثہ! تو ہم نے کہا یا آل جہینہ! تم طعن اور ضرب سے اپنے اخلاق درست کرو!

فلما ان تواقفنا قلیلاً ✦ اتخنا للکلاکل فارتمینا

پس جب ہم کچھ قریب آئے ایک دوسرے کے، تو ہم نے اپنے اونٹ سینہ کے بل بٹھا دیئے۔ اور تیر اندازی شروع کی

فآبوا بالرماح مکسرات ✦ وأبنا بالسیوف قد انحنینا

پس (جب تیر اندازی ہو چکی تو) وہ ٹوٹے ہوئے نیزے لے کر لوٹے، اور ہم ایسی تلواریں لے کر لوٹے جن میں کثرت خونریزی سے بل پڑے ہوئے تھے!

فباتوا بالصعید لهم احاح ✦ ولو خفت لنا الکلمی سرینا

پس انہوں نے صعید میں بحالت تشنگی رات گذاری اس حال میں کہ وہ پیاسے تھے اور ہم زخموں سے چور ہو کر میدان جنگ ہی میں پڑے رہے۔

۱۱۔ یہ لوگ بڑے حوصلہ مند اور دل کے قوی تھے۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلتے تھے۔ لیکن اُف نہیں کرتے تھے۔ محبت اور عداوت دونوں میں انتہا پسند تھے۔ لڑائی کے وقت ان کے دل فولاد کی طرح سخت ہو جاتے تھے۔

ولا تراهم وان جلت مصیبتهم ✦ مع البکاة علی من مات یبکونا

باوجود مصیبت کی شدت کے، تو انہیں رونے والوں کے ساتھ مردوں پر آہ و بکا کرتا ہوا نہیں دیکھے گا

چونکہ ان کے اندر آدمیت بھی تھی، اس لئے جب ان کا غصہ فرو ہو جاتا تھا، تو پھر انہیں ندامت بھی ہوتی تھی۔ اور بعض اوقات روتے بھی تھے۔

ونبکی حین نقتلکم ، علیکم ✦ ونقتلکم کانا لا نبالی

جب ہم تمہیں قتل کر چکتے ہیں، تو پھر روتے ہیں، اور قتل اس طرح کرتے ہیں، گویا ہم کو کچھ پروا نہیں ہے

ایک شاعر اپنی محبوبہ کے بھائی کو قتل کرنے کے بعد یوں اظہار ندامت کرتا ہے :-

فلما رأیت انه غیر منته ✦ املت له کفی بلدن مقوم

ولما رأیت انني قد قتلته ✦ ندمت علیه ای ساعة مندم

پس جب میں نے دیکھا، کہ وہ باز نہیں آتا۔ تو میں نے (اُسے قتل کرنے کیلئے) ایک سیدھے نیزہ کو مضبوطی کے ساتھ تھاما ـــــ اور جب میں نے اسے قتل کر دیا، تو مجھے ندامت ہوئی۔ لیکن افسوس! میں نادم بھی ہوا تو کس وقت؟

۱۲۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ، اس خیال سے مقتولوں پر نوحہ نہیں کرتے تھے، کہ لوگ یہ کہیں گے کہ ان میں صبر و تحمل نہیں ہے! چنانچہ عمرو ابن کلثوم کہتا ہے :-

معاذ الالٰہ ان تنوح نساؤنا ؛ علی ہالکٍ او ان نضج من القتل

خدا کی پناہ، اگر ہماری عورتیں کسی مردہ پر نوحہ کریں یا کسی کے قتل پر چیخیں مار کر روئیں!

۱۳۔ یہ لوگ کسی کو قتل کر دیتے تھے، تو مقتول کے عوض خون بہا دینے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ قاتل کے قبیلہ والے ایسے زبردست ہیں، کہ کوئی شخص ان سے قصاص نہیں لے سکتا۔

انا لنرخص یوم الروع انفسنا ؛ ولو نسام بہا فی الامن اغلینا

بیشک ہم لڑائی کے دن اپنی جانیں ارزاں کر دیتے ہیں، اور اگر کوئی شخص امن کے زمانہ میں خریدے تو بیحد گراں قیمت ہو جاتی ہیں

بیض مفارقنا تغلی مراجلنا ؛ نأسو باموالنا آثار ایدینا

ہمارے سر سفید ہیں (مطلب یہ کہ دولت مند عرب اپنی مانگ میں مشک لگاتے تھے اور مشک بالوں کو سفید کر دیتا ہے) اور ہماری دیگیں جوش کھا رہی ہیں۔ (یعنی ہم بڑے مہمان نواز ہیں) اور ہم اپنے ہاتھوں کے زخموں کا علاج اپنے مال سے کرتے ہیں۔ یعنی ہمارے ہاتھ جو زخم دشمنوں کے زخم پر لگاتے ہیں، تو ہم قصاص کے بجائے خون بہا دے دیتے ہیں، ہم سے کوئی شخص قصاص طلب نہیں کر سکتا۔

۱۴۔ لیکن دیت یا خون بہا قبول کرنا چونکہ ضعف اور بزدلی کی نشانی ہے اس لئے بعض قبیلے کوشش کے باوجود خون بہا رد کر دیتے تھے اور قصاص طلب کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

فلو ان حیا یقبل المال فدیۃ ؛ لسقنا لھم سیلا من المال مفعما

اگر ان کا قبیلہ، مقتول کے بدلے مال قبول کر لیتا، تو ہم بلاشک ان کی طرف اونٹوں کا ایک سیلاب روانہ کر دیتے۔

ولکن ابی قومٌ اصیب اخوھم ؛ رضا العار فاختاروا علی اللبن الدماء

لیکن اس قوم نے جس کا بھائی مارا گیا تھا، فرط غیرت کے سبب خون بہا قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دودھ پر خون کو ترجیح دی

قبیلہ بنی فقعس کا ایک آدمی دشمنوں کے ہاتھ میں قید تھا۔ اس نے اپنے چچازاد بھائیوں کو یہ پیغام بھیجا۔

فلا تأخذوا عقلاً من القوم انّنی ؛ اری العار یبقی والمعاقل تذھب

(اگر وہ مجھے قتل کر دیں تو) اس قوم سے میرا خون بہا مت لینا۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ عار (غیرت) باقی رہتا ہے، لیکن دیت فنا ہو جاتی ہے۔

ایک اور شاعر کس قدر پرجوش انداز میں قصاص لینے کی ترغیب دیتا ہے۔

وان نزلوک مبرکاً غیر طائل ؛ غلیظاً فلا تنزل بہ وتحوّل

اگر وہ تجھے فرودگاہ غیر مفید میں اتاریں تو مت اترنا اور لوٹ آنا۔ یعنی خون بہا قبول مت کرنا۔

ولا تطعمن ما یعلفونک انّھم ؛ اتوک علی قربانھم بالمثمّل

جو چیز وہ تجھے کھلانا چاہتے ہیں۔ اس کی طمع مت کر۔ کیونکہ باوجود قرابت وہ تیرے پاس ایک زہر دوسرے زہر سے ملا ہوا لائے ہیں

۱۵۔ قصاص لینا ان لوگوں کے نزدیک اس قدر محبوب تھا، کہ اکثر اوقات عورتیں اپنے مردوں کو اس کی ترغیب دیتی تھیں، چنانچہ بنو مازن نے عمرو بن معدیکرب کے بھائی عبداللہ کو قتل کر کے اس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ خون بہا قبول کر لو، تو اس کی بہن کبشہ نے شعر کہے۔

ارسل عبد اللہ اذ حان یومہ ؛ الی قومہ لا تعقلوا لھم دمی

عبداللہ نے جب اس کا آخری وقت تھا، اپنی قوم کو یہ پیغام دیا، کہ میرے بدلہ خون بہا لے کر قصاص ترک نہ کرنا۔

فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُمْ إِفَالًا وَأَبْكُرًا ٭ وَأُتْرَكُ فِي بَيْتٍ بِصَعْدَةَ مُظْلِمِ

اور نہ تم قاتلوں سے شتر بچے اور جوان اونٹ لینا۔ کیونکہ اس صورت میں میری قبر جو موضع صعدہ میں ہے تاریک رہے گی۔

بعض اوقات یہ لوگ ایک شخص مقتول کے بدلہ میں بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے بھائی وائل بن حیہم کے قصاص میں، قاتل کے قبیلہ کے اسی (۸۰) آدمیوں کو قتل کیا۔ اور ان کی نعشیں ایک کنوئیں میں پھینک دیں حتی کہ پانی سرخ ہو گیا۔

سَلْ أُسَيِّدًا هَلْ ثَأَرْتُ بِوَائِلٍ ٭ أَمْ هَلْ شَفَيْتُ النَّفْسَ مِنْ بَلْبَالِهَا

اے مخاطب! بنی اُسیّد سے پوچھ، کیا میں نے اپنے بھائی وائل کا تم سے بدلہ لے لیا؟ کیا میں نے اپنے نفس کو اس کے غم سے شفا دے دی؟

إِذْ أَرْسَلُونِي مَاتِحًا بِدِلَائِهِمْ ٭ فَمَلَأْتُهَا عَلَقًا إِلَى أَسْبَالِهَا

جب انہوں نے مجھے بلایا، کہ میں کنوئیں میں اتر کر ان کے ڈول بھروں، تو میں نے ان کے ڈولوں کو ان کے خون سے کناروں تک بھر دیا۔!

متلمس ایک مشہور شاعر اپنی قوم کو اس طرح قصاص کی ترغیب دیتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْمَرْءَ رَهْنُ مَنِيَّةٍ ٭ صَرِيعًا لِعَافِي الطَّيْرِ أَوْ سَوْفَ يُرْمَسُ

"کیا تو نہیں دیکھتا کہ مرد موت کا مرہون ہے، اور گوشت خوار پرندوں کے لئے بچھاڑا ہوا ہے۔ یا کچھ عرصہ کے بعد مدفون ہو جائے گا۔"

فَلَا تَقْبَلَنْ ضَيْمًا مَخَافَةَ مِيتَةٍ ٭ وَمُوتَنْ بِهَا حُرًّا وَجِلْدُكَ أَمْلَسُ

پس تو ایک دفعہ مرنے کے خوف سے ذلت اختیار نہ کرنا۔ البتہ تو کریم اور بے عار و ننگ ہو کر موت کو اختیار کر!

فَمَنْ طَلَبَ الْأَوْتَارَ مَا حَزَّ أَنْفَهُ ٭ قَصِيرٌ وَخَاضَ الْمَوْتَ بِالسَّيْفِ بَيْهَسُ

قصاص اس قدر ضروری چیز ہے۔ کہ اس کی خاطر قصیر نے اپنی ناک خود اپنے ہاتھ سے کاٹ ڈالی۔ اور بیہس تلوار لے کر موت کے اندر گھس گیا۔

متلمس نے اس شعر میں ایک مشہور عربی ضرب المثل استعمال کی ہے! جو اس طرح ہے لِأَمْرٍ مَا جَدَعَ قَصِيرٌ أَنْفَهُ یعنی ایک بات کی خاطر قصیر نے اپنی ناک کاٹ ڈالی۔ اس ضرب المثل کا قصہ یہ ہے۔ کہ ایک لڑائی میں شاہ غسان کو جس کا نام زبّان تھا۔ شام کے بادشاہ جذیمہ ابرش نے قتل کر دیا۔ مقتول بادشاہ کی بیٹی زباء نے اپنے باپ کا انتقام لینا چاہا۔ اور اپنی بہن کے مشورہ کے مطابق مکر و فریب سے کام لے کر جذیمہ کو پیغام بھیجا۔ کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میرے دار الحکومت میں تشریف لائیے۔ جب جذیمہ کو یہ پیغام ملا، تو اس وقت وہ بقہ میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے معتمدین سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا، کہ اس سے بڑھ کر کیا بات ہے۔ کہ حکومت، دولت اور ایک حسین شہزادی تینوں چیزیں آپ کو مفت مل رہی ہیں۔ لہٰذا اس پیغام کو منظور کر لینا چاہیے۔ لیکن ایک ندیم خاص نے جس کا نام قصیر تھا، یہ کہا۔ "رأيٌ فاترٌ وعدوٌ حاضرٌ" یعنی یہ مشورہ خلاف عقل ہے۔ اور دشمن سر پر مسلط ہو جائے گا۔ مناسب یہ ہے۔ کہ آپ زباء کو یہ لکھیں۔ کہ تم خود یہاں آ جاؤ۔ لیکن جذیمہ نے جو زباء کے حسن کا شہرہ سن چکا تھا اور یہ پیغام سنتے ہی از خود رفتہ ہو چکا تھا۔ قصیر کے مشورہ پر عمل نہ کیا۔ اور اسی وقت اپنے بھانجے عمرو بن عدی کو اپنا نائب بنا کر حریف کے دار الحکومت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب نصف مسافت طے ہو چکی تو جذیمہ نے قصیر سے دریافت کیا۔ کہ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا۔ کہ تركتُ الرأيَ ببقة

یعنی میں اپنی رائے تو بقہ میں چھوڑ آیا۔ اس کے بعد زبّا کے ایلچی تحائف لے کر وارد ہوئے۔ جزیمہ نے پوچھا۔ اب کیا کہتے ہو؟ قصیر نے کہا خطرہ کم بھی ہے اور زیادہ بھی! ابھی زبّا کے سوار پہونچنے والے ہیں۔ اگر وہ آپ کے آگے آگے چلیں تو سمجھ لینا۔ کہ عورت وفادار ہے لیکن اگر آپ کے دائیں بائیں چلیں یعنی محاصرہ کر لیں۔ تو سمجھ لینا۔ کہ عورت بے وفا ہے۔ اور اس صورت میں فوراً عصا (جزیمہ کے گھوڑے کا نام تھا) پر سوار ہو کر راہِ فرار اختیار کرنا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ سوار آ پہنچے۔ اور اس پھرتی سے سر پر آ گئے۔ کہ جزیمہ عصا پر سوار نہ ہو سکا۔ لیکن قصیر کو موقع مل گیا اور وہ فوراً بھاگ کھڑا ہو گیا۔ جزیمہ نے مڑ کر دیکھا تو بول اٹھا۔

اریٰ حزماً علیٰ متنِ العصاءِ ۞ ما ضلَّ مَن تجری بہ العصاءُ

یعنی میں دانش وری کو عصا کی پشت پر سوار دیکھتا ہوں۔ اور جسے عصا لے اڑا وہ گمراہ نہیں ہو سکتا۔

قصہ مختصر سواروں نے جزیمہ کو زبّا کے محل میں پہونچا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کی ملاقات ہوئی۔ تو زبّا نے اسے دیکھ کر اپنے کپڑے اتار دیئے۔ اور بالکل برہنہ ہو کر بولی "یا جزیمۃ أداب عروس تری؟" اے جزیمہ تو نے دلہن کی حالت دیکھی؟ جزیمہ نے جب یہ منظر دیکھا۔ تو آن واحد میں ساری حقیقت اس پر واضح ہو گئی۔ اس لئے اس نے جواب دیا۔ "بلغ المدیٰ وجفّ الثریٰ وأمرُ غدرٍ أریٰ" (میرا آخری وقت آن پہونچا تیری) عداوت ظاہر ہو گئی اور غداری سامنے آ گئی۔ یہ جواب سن کر زبّا اپنے کمرہ میں چلی گئی اور اس کی کنیزوں نے جزیمہ کو خوب شراب پلائی اور جب وہ بدمست ہو گیا۔ تو جلادوں نے اس کی دونوں شہ رگیں کاٹ دیں۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے بعد مر گیا۔

ادھر قصیر نے عمرو بن عدی کو جزیمہ کی گرفتاری کی خبر سنائی۔ اور اسے اپنے ماموں کے قصاص پر آمادہ کیا۔ لیکن عمرو نے کہا۔ کہ زبّاء کی فوج میری فوج سے بہت زیادہ ہے۔ اس پر قصیر نے ایک عجیب وغریب حیلہ تراشا۔ اور کہا کہ آپ میری ناک کاٹ دیجئے اور مجھے زبّا کے پاس جانے دیجئے۔ میں سب کام کر لوں گا۔

چنانچہ اپنی ناک کٹوا کر قصیر زبّا کے دربار میں پہونچا۔ اور عمرو کی بدسلوکی کی داستان سنائی اور فریاد کا طالب ہوا۔ زبّا نے اس کی بڑی توقیر کی۔ اور اپنے محل میں مہمان بنا کر رکھا۔ قصیر نے اپنی قابلیت سے زبّا کے دل میں گھر بنا لیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ زبّا کو کامل اعتماد ہو گیا ہے۔ تو ایک دن بولا۔ کہ عراق میں میری بہت سی دولت میرے گھر میں دفن ہے۔ اگر اجازت ہو تو جا کر لے آؤں اور آپ کی نذر کر دوں۔ زبّا نے اجازت دے دی۔

قصیر سیدھا عمرو کے پاس پہونچا۔ اور اس کے مشورہ سے عمرو نے چیدہ چیدہ بہادروں کی فوج اس طرح تیار کی کہ سینکڑوں اونٹوں پر صندوقوں میں مسلح سپاہی بٹھائے اور قصیر کو ساتھ لے کر زبّا کے دار الحکومت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب یہ کارواں زبّا کے محل کے پاس پہونچا۔ تو قصیر نے عمرو کو چور دروازہ سے محل کے اندر داخل کر دیا۔ اور مسلح جوانوں نے صندوقوں میں سے نکل کر محل میں قتل عام شروع کر دیا۔ جب اس حادثہ کی خبر زبّا کو ہوئی۔ تو وہ جان بچانے کیلئے چور دروازہ کی طرف بھاگی۔ لیکن وہاں اس نے عمرو کو کھڑا پایا۔ یہ دیکھ کر اس نے ہیرے کی کنی نگل لی۔ اور کہنے لگی "بیدی لا بید عمرو" یعنی میں عمرو کے ہاتھوں قتل ہونے کے بجائے خود مر جاؤں گی۔ اتنا کہنے پائی تھی۔ کہ عمرو اور قصیر نے اس پر حملہ کیا۔ جب اس نے قصیر کو دیکھا۔ تو اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ "لِأمرٍ ما جدع قصیرٌ أنفَہ"۔ وہ تو فنا ہو گئی۔ لیکن اس کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ ہمیشہ کے لئے عربی زبان میں ضرب المثل بن گیا۔ (۱۴)

۱۶۔ بعض اوقات یہ لوگ قصاص لینے کی قسم کھا لیتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

وَبِالبیداءِ لمّا أن تلاقت ۞ بہا کلبٌ وحلّ بہا النذورُ

"اور مقام بیدا میں جب بنو کلب اور بنو عمیر کی مڈبھیڑ ہوئی۔ تو وہاں لوگوں کی قسمیں انتقام لینے کے بعد پوری ہوگئیں"
نیز تأبّط شرًا کا بھانجا اپنے ماموں کا قصاص لینے کے بعد کہتا ہے

حلّتِ الخمرُ وکانت حراماً ◆ وبلأیٍ ما المّت تحلّ

"اور شراب نوشی جو قسم کی وجہ سے حرام ہوگئی تھی۔ اب حلال ہوگئی۔ اور شراب بہت دنوں کے بعد حلال ہو کر میرے پاس آئی"

فاسقنیها یا سوادَ بنَ عمرٍو ◆ انّ جسمی بعدَ خالی لخلّ

"پس اے سواد ابن عمرو مجھے شراب پلا۔ کیونکہ ماموں (کی وفات) کے بعد میرا جسم ضعیف اور ناتواں ہو گیا ہے"

تضحکُ الضبعُ لقتلی ھذیلٍ ◆ وترَی الذئبَ لھا یستھلّ

"بنو ہذیل کے مقتولوں پر بجّو (کفتار) ہنستا ہے اور بھیڑیا خوشی کے مارے شور مچاتا ہے"

وعتاقُ الطیرِ تغدُو بطاناً ◆ تتخطّاھم فما تستقلّ

"اور مردار خور پرندے ایسے حال میں صبح کرتے ہیں۔ کہ ان کے پیٹ بھر جاتے ہیں اور وہ نعشوں کے گرد قدم قدم پھرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اڑ نہیں سکتے۔

۱۷۔ اگرچہ یہ لوگ بہت سخت دل اور کینہ پرور تھے۔ لیکن کبھی کبھی قاتل کو معاف بھی کر دیتے تھے خصوصاً جبکہ وہ مقتول کا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک اعرابی کے بھائی نے اپنے بھتیجے کو قتل کر دیا۔ جب قاتل کو قصاص کیلئے اس اعرابی کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے یہ شعر پڑھے اور قاتل کو معاف کر دیا۔

اقولُ للنفسِ تاساءً وتعزیۃً ◆ احدیٰ یدیّ اصابتنی ولم ترِدِ

"میں اپنے جی سے کہتا ہوں کہ صبر کر۔ کیونکہ مجھے میرے ایک ہاتھ کا صدمہ بے ارادہ پہنچا ہے:"

۱۸۔ یہ لوگ عموماً طلوعِ آفتاب کے وقت غارت گری کیا کرتے تھے

فلم أرَ مثلَ الحیِّ حیًّا مُصبَّحاً ◆ ولا مثلنا یومَ التقینا فوارسا

"میں نے اس قبیلہ کی مانند صبح کے وقت لٹتا ہوا کوئی قبیلہ نہیں دیکھا۔ اور نہ اپنی مانند سوار دیکھے جس دن کہ ہم دشمنوں سے لڑے"
عمرو بن معدیکرب اپنی ایک نظم میں کہتا ہے۔

وابنُ صُبحٍ سادرًا یوعدُنی ما ◆ لہٗ فی الناسِ ما عشتُ مُجیرٗ

"اور ایک ضعیف بزدل اور غافل آدمی مجھ کو دھمکاتا ہے حالانکہ میری زندگی بھر اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے"
شاعر نے اپنے دشمن کو تحقیراً ابن صبح کہا ہے کیونکہ اس کی ماں علی الصباح غارت گروں سے حاملہ ہو گئی تھی، اور ابن صبح سے ضعیف اور بزدل اس لئے مراد لی جاتی ہے کہ عربوں کا یہ خیال تھا۔ کہ جس بچہ کی ماں صبح کے وقت حاملہ ہو وہ بچہ بیوقوف ہوتا ہے

۱۹۔ عرب کے قبیلے جنگ کے وقت اکثر اپنی عورتوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ عورتیں فوج کے پیچھے پیچھے چلتی تھیں اور لڑائی کے وقت رجز خوانی اور کلماتِ غیرت آفرین سے مردوں کا دل بڑھاتی تھیں۔ ان کا ساتھ ہونا لڑنے والوں کیلئے فائدہ بخش ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ اس حال میں وہ ان کی حفاظت اور آبرو کے لئے دل کھول کر لڑتے تھے۔ یہ عورتیں جنگ سے پہلے عموماً اپنے اپنے شوہروں سے قسم لے لیتی تھیں۔ کہ میدانِ جنگ میں بزدلی کا اظہار نہ کرنا ___ چنانچہ عمرو ابن کلثوم تغلبی (جس کا یہ قصیدہ سبعہ معلقہ میں شامل ہے) اپنے قبیلہ کی عورتوں کا ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

عَلٰی آثارِنا بِیضٌ حِسَانٌ * نُحاذِرُ اَنْ تُقَسَّمَ اَوْ تَهُونا

(میدان جنگ میں) ہمارے پیچھے گوری خوبصورت نیک سیرت عورتیں ہوتی ہیں۔ تاکہ ہمیں یہ خوف رہے کہ (ہماری شکست کے بعد) دشمن انہیں قید کرکے آپس میں تقسیم نہ کرلیں۔ یا کنیزیں بنا کر انہیں ذلیل نہ کریں۔

اَخَذْنَ عَلٰی بُعُولَتِهِنَّ عَهْدًا * اِذا لاقَوْا کَتائِبَ مُعْلِمِینا

لَیَسْتَلِبُنَّ اَبْدانًا وَبِیضًا * وَاَسْرٰی فی الحَدیدِ مُقَرَّنِینا

وہ اپنے شوہروں سے عہد لیتی ہیں جب وہ ہماری لشکروں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کہ البتہ زرہوں اور صیقل کی ہوئی تلواروں اور قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی لائیں (تاکہ یہ عورتیں انہیں اپنا غلام بنائیں)

اِذا ما رُحْنَ یَمْشِینَ الهُوَینا * کَما اضْطَرَبَتْ مُتُونُ الشّارِبِینا

جب وہ شام کے وقت سیر و تفریح یا ہوا خوری کے لئے نکلتی ہیں۔ تو خراماں خراماں چلتی ہیں۔ ایسی لچک کے ساتھ (جو حسن و امارت کا لازمہ ہے) جیسے مے خواروں کی کمریں (یعنی متوالی چال چلتی ہیں)

ظَعائِنُ مِنْ بَنی جُشَمَ بْنِ بَکْرٍ * خَلَطْنَ بِمِیسَمٍ حَسَبًا وَدِینا

وہ شریف پردہ نشین عورتیں جشم ابن بکر کی اولاد سے ہیں۔ اور انہوں نے حسن ظاہری کے ساتھ شرافت اور دینداری کو بھی جمع کیا ہے (ظعینہ ہودج نشین عورت کو کہتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ خاندان کی عورت جو پیدل نہ چلے۔ اسلئے میں نے پردہ نشین ترجمہ کیا ہے)

یَقُتْنَ جِیادَنا وَیَقُلْنَ لَسْتُمْ * بُعُولَتَنا اِذا لَمْ تَمْنَعُونا

وہ ہمارے گھوڑوں کو خوراک دیتی ہیں۔ اور کہتی ہیں۔ کہ اگر تم نے دشمنوں سے ہماری حفاظت نہ کی تو تم ہمارے شوہر نہیں ہو۔

۲۰۔ ان لوگوں میں ایک بڑا وصف یہ تھا۔ کہ مظلوم کی حمایت پر فوراً کمربستہ ہوجاتے تھے۔ اور جان و مال دونوں سے اس کی مدد کرتے تھے۔ اور اس بات کو اپنے لئے باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:۔

اِذا اسْتُنْجِدُوا لَمْ یَسْاَلُوا مَنْ دَعاهُمُ * لِاَیَّةِ حَرْبٍ اَمْ بِاَیِّ مَکانِ

جب ان سے مدد طلب کی جاتی ہے تو اپنے بلانے والے سے یہ نہیں پوچھتے کہ کس لڑائی کے لئے یا کس جگہ جانے کیلئے بلایا گیا ہے؟

مشہور جاہلی شاعر طرفہ کہتا ہے:۔

اِذا القَوْمُ قالُوا مَنْ فَتًی خِلْتُ اَنَّنی * عُنِیتُ فَلَمْ اَکْسَلْ وَلَمْ اَتَبَلَّدِ

جب قوم یہ دریافت کرتی ہے۔ کہ جوانمرد کون ہے؟ تو میں خیال کرتا ہوں۔ کہ ان کی مراد میری ذات سے ہے۔ پس نہ تو میں سستی کرتا ہوں اور نہ مطلب سمجھنے سے قاصر رہتا ہوں۔

وَلَسْتُ بِحَلّالِ التِّلاعِ مَخافَةً * وَلٰکِنْ مَتٰی یَسْتَرْفِدِ القَوْمُ اَرْفِدِ

اور میں کسی کے خوف سے ٹیلوں پر فروکش ہونے والا نہیں ہوں لیکن (بات یہ ہے کہ) جب میری قوم مجھ سے طالب امداد ہوتی ہے، تو میں بخوشی امداد کرتا ہوں۔

وَکَرِّی اِذا نادَی المُضافُ مُحَنَّبًا * کَسِیدِ الغَضا نَبَّهْتَهُ المُتَوَرِّدِ

اور دوسرا امر پسندیدہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی مظلوم مجھے مدد کے لئے پکارے تو میں ایک فراخ گام گھوڑے کو اس کی جانب پھیر دیتا ہوں۔ جو اس بھیڑیے کی طرح تیز رفتار ہے جو درخت غضا کے نیچے رہتا ہو اور پیاس کی شدت کے وقت پانی پینے کے لئے گھاٹ

پر اترنے والا ہو۔

۲۱۔ ایک اور خوبی ان لوگوں میں یہ تھی کہ اپنے ہمسایہ کی حفاظت کو اپنے اوپر لازم جانتے تھے۔ اور جو شخص اپنے ہمسایہ کی مدد نہیں کرتا تھا۔ اسے ذلیل سمجھتے تھے۔ سموأل بن عادیہ کہتا ہے :-

وَمَا ضَرَّنَا أَنَّا قَلِيلٌ وَجَارُنَا ٭ عَزِيزٌ وَجَارُ الْأَكْثَرِينَ ذَلِيلُ

اور ہماری قلت تعداد نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ کیونکہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہمسائے محترم ہیں اور اکثرت والوں کے پڑوسی ذلیل ہیں۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

نَحْنُ الَّذِينَ لَا يُرَوَّعُ جَارُنَا ٭ وَبَعْضُهُمُ لِلْغَدْرِ صُمٌّ مَسَامِعُهُ

اور ہم وہ لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ہمسایوں کو خوفزدہ نہیں کر سکتا۔ حالانکہ بعض لوگ عہد شکنی اختیار کرنے کی وجہ سے بہرے بن جاتے ہیں (یعنی اپنے ہمسایوں کی فریاد نہیں سنتے)

ابو صمامہ کہتا ہے :-

فَجَارُكَ عِنْدَ بَيْتِكَ لَحْمُ ظَبْيٍ ٭ وَجَارِي عِنْدَ بَيْتِي لَا يُرَامُ

تیرا ہمسایہ تیرے گھر کے پاس ایسا ضعیف اور غیر محفوظ ہے۔ جیسے ہرن کا گوشت اور میرا ہمسایہ میرے گھر کے پاس ایسا محفوظ ہے کہ کوئی اس کی جانب قصد نہیں کر سکتا۔

۲۲۔ شجاعت کے بعد جو وصف ہمیں ایام جاہلیت کے عربوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ ان کی سخاوت ہے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی شخص مجھ سے عربوں کی امتیازی صفات دریافت کرے۔ تو میں یہ کہوں گا۔ کہ اول شجاعت اور اس کے بعد سخاوت اگر اس زمانہ میں امریکہ کے لوگ سخاوت کا اظہار کرتے ہیں تو یہ چنداں تعجب خیز بات نہیں۔ اس لئے کہ وہاں دولت کی افراط ہے۔ لیکن عرب لوگوں کا اس زمانہ میں دولت مند اقوام میں شمار نہیں تھا۔ ان کی دولت صرف اونٹ گھوڑے اور بھیڑ بکریاں تھیں۔ خصوصاً اونٹ، لیکن یہ لوگ کسی حاجت مند کو سو پچاس اونٹ دے دینا ایک معمولی بات سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

وَإِنْ أَجْزِ عَلْقَمَةَ بْنَ سَيْفٍ سَعْيَهُ ٭ لَا أَجْزِهِ بِبَلَاءِ يَوْمٍ وَاحِدِ

اگر میں علقمہ بن سیف کو اس کی کوشش کا عوض دوں جو اس نے میرے معاملہ میں کی ہے تو میں اس کے ایک روز کے احسان کا بھی بدل نہیں کر سکتا۔

لَأَحَبَّنِي حُبَّ الصَّبِيِّ وَرَمَّنِي ٭ رَمَّ الْهَدِيِّ إِلَى الْغَنِيِّ الْوَاجِدِ

اس نے مجھ کو ایسا دوست رکھا جیسے بچے کے ماں باپ بچہ کو عزیز رکھتے ہیں۔ اور میرے حال کی ایسی درستی کی۔ جیسے دلہن والے بوقت رخصت کرتے ہیں۔ جبکہ وہ کسی خوش حال شخص کے پاس بھیجی جاتی ہے۔

وَأَجَابَنِي يَوْمَ الصُّرَاخِ بِمِائَةٍ ٭ مِائَةٍ تَشُقُّ عَلَى عِصِيِّ الذَّائِدِ

اور داد خواہی کے روز اس نے مجھے ایسے سو اونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔ جو حوض سے روکنے والے کی چوبدستیوں پر اپنی قوت کے سبب سے غالب آجائیں۔

طرفہ کہتا ہے :-

رأیتُ بنی غبراءَ لا ینکروننی ◆ ولا أهلُ هذاکَ الطرافِ الممدّدِ

میں دیکھتا ہوں کہ فقراء اور مساکین مجھ کو اجنبی نہیں سمجھتے (کیونکہ میں ان پر ہمیشہ احسان کرتا رہتا ہوں) اور نہ دولت مند بڑے خیموں کے رہنے والے (میری صحبت کو غنیمت جانتے ہیں) مجھے اوپرا سمجھتے ہیں۔

لیلیٰ اخیلیہ[1] اپنے قبیلہ کی شجاعت اور سخاوت کا ذکر اس طرح کرتی ہے:۔

نحنُ الأخایلُ لا یزالُ غلامُنا ◆ حتّى یدبَّ على العصا مذکورا

ہم بنو اخیل ہیں اور ہماری شان یہ ہے کہ ہماری قوم کا ہر لڑکا محفلوں میں مشہور رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو کر عصا کے سہارے چلنے لگے۔

تبکی السیوفُ إذا فقدنَ أکفَّنا ◆ جزعاً وتعلمُنا الرفاقُ بحورا

جب تلواریں ہماری ہتھیلیوں کو گم کر دیں گی (جب ہمارے جیسے بہادر نہ ہوں گے) تو گھبرا کر رونے لگیں گی۔ اور ہمارے رفیق ہم کو سخاوت کی وجہ سے دریا سمجھتے ہیں۔

ولنحنُ أوثقُ فی صدورِ نسائکم ◆ منکم إذا بکرَ الصراخُ بکورا

اور بخدا ہم تمہاری عورتوں کے سینوں میں تم سے زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، جبکہ مستغیث کی آواز صبح کے وقت آئے (صبح کی خصوصیت اس وجہ سے کہ عموماً غارت گری صبح کے وقت ہوا کرتی تھی)

قحط کے زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ لوگ فقراء اور مساکین کی امداد کرتے تھے اور دولت مند لوگ تو روزانہ لنگر جاری کر دیتے تھے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:۔

نُهدّقُ بضعَ اللحمِ للباعِ والندى ◆ وبعضُهمُ تغلی بذمٍّ مناقعُهُ

ہم سخاوت کیلئے گوشت کے ٹکڑے کاٹتے اور ہڈیوں کو توڑتے ہیں۔ حالانکہ بعض لوگوں کی پتھر کی چھوٹی ہانڈیوں میں مذمت جوش کھاتی ہے
سلمیٰ بن ربیعہ لکھتا ہے:۔

وإذا العذارى بالدخانِ تقنّعت ◆ واستعجلت نصبَ القدورِ فملّتِ
دارت بأرزاقِ العفاةِ مغالقٌ ◆ بیدیَّ من قمعِ العشارِ الجلّةِ

جب کنواری لڑکیاں دھوئیں کو اپنی اوڑھنی بنائیں اور ہنڈیا چڑھانے کے بجائے جلدی جلدی کچے گوشت کے ٹکڑے آگ میں بھوننے لگیں ——— ایسے وقت میں سائلوں کے رزق کے تیر قمار جو دس ماہ کی حاملہ اونٹنی کے کوہان میں ہیں، میرے ہاتھوں میں ہیں گے۔

حضرت لبید بن ربیعۃ العامری رضؓ اپنی سخاوت کے باب میں فرماتے ہیں:۔

وغداةِ ریحٍ قد وزعتُ وقرّةٍ ◆ قد أصبحت بیدِ الشمالِ زمامُها

اور بہت سی تیز ہوا اور سردی کی صبح کے وقت جن کی باگ ہوائے سرد بادِ شمالی کے ہاتھ میں تھی، میں نے مسکینوں کی تکالیف کو روکا۔

تأوی إلى الأطنابِ کلُّ رذیّةٍ ◆ مثلُ البلیّةِ قالصٌ أهدامُها

ہمارے ڈیروں کی رسیوں کے ساتھ ہر محتاج عورت پناہ لیتی ہے، جس کے پرانے کپڑے بھی اس کے بدن پر کوتاہ ہیں۔ اور

---

[1] یہ قیس کی محبوبہ نہیں ہے۔ اس کا نام لیلیٰ عامریہ تھا۔

جس کا حال اس ناقہ کی طرح ہے جسے کسی مرنے والے کی قبر کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ اور وہ وہاں ہی بھوک پیاس سے مر جاتی ہے۔

یہ لوگ جس قدر سخی تھے۔ اسی قدر مہمان نواز اور مسافر پرور بھی تھے اور اس باب میں ان کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے فی الحقیقت ان کے یہ اوصاف دُور دُور کے ملکوں میں ضرب المثل ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی یہ لوگ مہمانوں کی مدارات میں اپنا سارا اندوختہ خرچ کر دیتے تھے۔ اور ان کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ جب تک مہمان ان کے خیمہ میں رہتا تھا۔ اسکی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرتے رہتے۔ اگر کوئی مسافر ان کے خیمہ کے سامنے سے گذرتا تو کھانا کھلائے بغیر کبھی جانے نہ دیتے اور بعض اوقات چلتے وقت زادِ راہ بھی ساتھ کر دیتے۔ مہمان نوازی اور مسافر پروری میں عورتیں بھی مردوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ اونٹ جو عرب میں نہایت قیمتی چیز ہے۔ اسے یہ لوگ مہمانوں کے لئے بلا تامل ذبح کر دیتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات کئی کئی اونٹ ذبح کر دیتے تھے۔

امرؤالقیس اپنے مشہور قصیدہ میں کہتا ہے :-

أَلَا رُبَّ يَوْمٍ لَكَ مِنْهُنَّ صَالِحٍ ٭ وَلَا سِيَّمَا يَوْمٌ بِدَارَةِ جُلْجُلِ

سنو! بہت سے دن ان حسین عورتوں کی جانب سے بہت اچھے دیکھے۔ خصوصاً وہ دن جو میں نے ان کے ساتھ دارہ جلجل میں گذارا۔

وَيَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارَى مَطِيَّتِي ٭ فَيَا عَجَبًا مِنْ كُورِهَا الْمُتَحَمَّلِ

اور وہ دن تھا جب میں نے (اپنی محبوبہ کے ساتھ والی) کنواری لڑکیوں کیلئے اپنی سواری کی اونٹنی ذبح کر دی تھی۔ تو اے لوگو میری حیرت کو دیکھو جو اس ناقہ کے اس کجاوے سے پیدا ہوئی۔ جو دوسری ناقہ پر لدا ہوا تھا۔

اس کا قصہ یہ ہے۔ کہ امرؤالقیس اپنی چچازاد بہن عنیزہ پر عاشق تھا۔ ایک دن اسے خبر لگی کہ وہ کسی چشمہ پر نہانے گئی ہے تو یہ بھی وہاں جا پہنچا۔ اور محبوبہ کی ملاقات سے لطف اندوز ہوا۔ چونکہ اس نے سب لڑکیوں کو بڑی مدت تک روکے رکھا اور انہیں بھوک لگنے لگی تھی۔ تو اس نے ان کی خاطر اپنی ایک اونٹنی ذبح کر دی اور سب کو کھانا کھلایا۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

وَسَوْدَاءُ لَا تَشْكُو الرِّقَاعَ بُنَيَّةٍ ٭ لَهَا عِنْدَ حَرَّاتِ الْعَشِيَّاتِ أَزْمَلُ

إِذَا مَا تَهَمَّنَا قِرَاهَا تَضَمَّنَتْ ٭ قِرَا مَنْ عَرَانَا أَوْ تَزِيدُ فَتَفْضُلُ

اور بہت سی سیاہ اور کالی دیگیں ہیں۔ جن پر کبھی صافی نہیں ڈالی جاتی اور شام کی سردی کے وقت ان سے کھد کھد (جوش) کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

جب ہم ان میں پکانے کی چیزیں ڈالتے ہیں۔ تو وہ ہمارے مہمانوں کی ضیافت کرتی ہیں۔ اور زیادتی کی وجہ سے فاضل کھانا بچ رہتا ہے۔

یہ لوگ رات کے وقت ٹیلوں یا کسی اونچی جگہ پر آگ روشن کر دیتے تھے۔ تاکہ دُور سے راہ گیر آگ کی روشنی دیکھ کر ان کے خیموں کی طرف آئیں۔

لَهُ نَارٌ تُشَبُّ عَلَى يَفَاعٍ ٭ إِذَا النِّيرَانُ أُلْبِسَتِ الْقِنَاعَا

ممدوح کی آگ اونچی جگہ پر جلائی جاتی ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں کی آگ پوشیدہ ہوتی ہے (تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے)

وَاِنِّی لَاَدْعُوالضَّیْفَ بِالضَّوْءِ بَعْدَ مَا ✽ کَسَا الْاَرْضَ نَضَّاحُ الْجَلِیْدِ وَجَامِدُہ

"جب شبنم گرتی ہے اور زمین کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اس وقت میں آگ روشن کر کے مہمان کو بلاتا ہوں"

یہ لوگ رات کے وقت اپنے کتوں کو کھول دیتے تھے، تاکہ ان کے بھونکنے کی آواز سن کر بھولا بھٹکا مسافر یہ سمجھ جائے کہ یہاں نزدیک کچھ لوگ رہتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ مسافر خود بھی رات کے وقت کتے کی طرح آواز نکالتا تھا، تاکہ اگر نزدیک کچھ لوگ ہوں تو ان کے کتے اس آواز کو سن کر جواب میں بھونکنے لگیں۔ اسی کو عربی زبان میں "استنباح" کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:۔

وَمُسْتَنْبِحٍ بَاتَ الصَّدٰی یَسْتَتِیْہُہٗ ✽ اِلٰی کُلِّ صَوْتٍ فَہُوَ فِی الرَّحْلِ جَانِحٗ

اور بہت سے سفر رات کو کرنے والے اور کتوں کی طرح بھونک کر کتوں کو بھونکانے والے ہیں۔ کہ آواز کی گونج اس (مسافر) کو ہر آواز کی طرف حیران کرتی ہے۔ پس وہ میری فرودگاہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔

فَقُلْتُ لِاَہْلِیْ مَا بُغَامُ مَطِیَّۃٍ ✽ وَسَارٍ اَضَافَتْہُ الْکِلَابُ النَّوَابِحُ

میں نے اپنے گھر والوں سے کہا، کہ یہ اونٹنی کے بلبلانے کی اور اس مسافر کی آواز کیسی ہے جس کی ضیافت بھونکنے والے کتوں نے کر رکھی ہے۔

فَقَالُوْا غَرِیْبٌ طَارِقٌ طَوَّحَتْ بِہٖ ✽ مُتُوْنُ الْفَیَافِیْ وَالْخُطُوْبُ الطَّوَارِحُ

پس انہوں نے کہا، کہ ایک رات کو آنے والا مسافر ہے کہ اس کو جنگلوں کی سخت زمین اور حوادث روزگار نے ہماری طرف پھینک دیا،

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

فَجَاوَبَہٗ مُسْتَسْمِعُ الصَّوْتِ لِلْقِرٰی ✽ لَہٗ عِنْدَ اِتْیَانِ الْمُہِبِّیْنَ مَطْعَمُ

پس اس آواز کے سننے والے (یعنی میرے کتے) نے اس (مسافر) کو دعوت کیلئے جواب دیا۔ اور طلب کیا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مہمانوں کی وجہ سے اس کو بھی وافر کھانا ملتا ہے۔

یَکَادُ اِذَا مَا اَبْصَرَ الضَّیْفَ مُقْبِلًا ✽ یُکَلِّمُہٗ مِنْ حُبِّہٖ وَہُوَ اَعْجَمُ

جب وہ کتا مہمانوں کو آتا دیکھتا ہے تو قریب ہے کہ اپنی محبت کے سبب اس سے بول پڑے حالانکہ وہ گونگا ہے۔ یعنی میرا کتا بھی مہمان نواز ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

اَلَا تَرَیْنَ وَقَدْ قَطَّعْتِنِیْ عَذَلًا ✽ مَاذَا مِنَ الْبُعْدِ بَیْنَ الْبُخْلِ وَالْجُوْدِ

اِلَّا یَکُنْ وَرَقٌ یَوْمًا اَرُوْحُ بِہٖ ✽ لِلْمُعْتَفِیْنَ فَاِنِّیْ لَیِّنُ الْعُوْدِ

(اے میری زوجہ) کیا تو نہیں دیکھتی، کہ بخل اور سخاوت میں کس قدر فاصلہ ہے۔ حالانکہ تو نے سخاوت کی مذمت کر کے میرے دل کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

اگر میرا مال سائلوں کیلئے تیار نہ ہو، جس کو فقیروں کو دے کر راحت پاؤں تو اس صورت میں بیشک میں ذلیل اور ضعیف ہوں۔

۲۴۔ یہ لوگ جود و سخا کو جس قدر محمود جانتے تھے اسی قدر بخل کو مذموم سمجھتے تھے۔ چنانچہ حجر بن خالد اپنی زوجہ کو خطاب کرتا ہے

وَاِذَا ہَلَکْتُ فَلَا تُرِیْدِیْ عَاجِزًا ✽ غُسًّا وَلَا بَرَمًا وَلَا مِعْزَالًا

اور جب میں مرجاؤں۔ تو کسی اپاہج، ذلیل، تاکس یا بخیل اور بدخو سے نکاح مت کرنا

فَاستبدلی ختناً لاهلكِ مثلهُ * يُعطي الجزيلَ وَيقتلُ الابطالَا

اور میری جگہ اپنے کنبہ کا داماد ایسا بدل کرنا جو بہت فیاض ہو اور بہادروں کو قتل کرنے والا ہو

غَيرَ الذين بانْ تكُونَ كفوءَهمُ * ما أبو عليهِ ولا الفصيلُ عيالا

وہ داماد اس لائق نہ ہو، کہ اس کی دودھ دینے والی اونٹنی اس کی پرورش کرنے والی ہو اور نہ اونٹنی کا بچہ اس کا کنبہ ہو

سموئل عادیا کہتا ہے :۔

فنحنُ كماءِ المُزنِ مَا فِي نصابنا * كهامٌ ولا فينا يُعدُّ بخيلُ

ہم بارش کے پانی کی طرح صاف ہیں اور ہماری نسل میں کوئی کند ذہن نہیں ہے اور نہ ہم میں کوئی بخیل ہے

وَمَا أُخمِدَتْ نارٌ لنا دونَ طارقٍ * وَلا ذمّنا في النازلين نزيلُ

اور ہماری آگ رات کے آنے والے مہمان کے ڈر سے کبھی نہیں بجھائی جاتی اور نہ مہمانوں میں سے کسی نے کبھی ہماری مذمت کی

۲۵- ان لوگوں میں ایک عجیب دستور یہ تھا کہ جب قحط پڑتا اور شدتِ گرسنگی سے یہ لوگ قریب الموت ہو جاتے تو سب مل کر ایک جگہ بیٹھ جاتے اور اپنے چاروں طرف باڑہ باندھ لیتے اور باڑہ کا دروازہ پتھروں سے بند کر دیتے۔ تاکہ مرنے کے بعد ان کی لاشیں بھیڑیوں اور دوسرے مردار خور جانوروں سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ عروہ بن الورد العبسی کہتا ہے :۔

قُلتُ لقومٍ في الكنيفِ تروّحوا * عَشيّةَ بتنا عندَ ماوانَ رزحِ

مقام ماوان کے پاس جب ہم شب باش ہوئے، تو میں نے اس قوم سے جو شدتِ گرسنگی کی وجہ سے ایک باڑہ میں پڑی تھی، یہ کہا کہ شام ہوتے ہی سفر کرو (سستی مت کرو)

تنالوا الغنى أو تبلغوا بنفوسكم * إلى مُستراحٍ من حِمامٍ مُبرّحِ

(ایسا کرنے سے) یا تو تم تونگری کو پہونچ جاؤ گے یا اپنی جانوں کو ستانے والی موت سے رہائی دیکر راحت میں پہونچا دو گے

۲۶- دورِ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ بڑے آدمی پیشہ ور نوحہ گر عورتوں کو اپنے مردوں پر رونے کیلئے بلایا کرتے تھے چنانچہ شبیب بن عوانہ ایک شعر میں ان نوحہ گر عورتوں کا ذکر کرتا ہے۔

لتبكِ النساءُ المعولاتُ بعولةٍ * أبا حجرٍ قامتْ عليهِ النوائحُ

مناسب ہے کہ ماتم کرنے والی عورتیں ابو حجر پر جس کے لئے نوحہ گر عورتیں رونے کیلئے کھڑی ہوئی ہیں، بلند آواز سے روئیں،

ایک اور شاعر کہتا ہے :۔

مِن مثلهِ تُمسي النساءُ حواسراً * وتقومُ مُعولةً مَعَ الاسحارِ

ایسی ہی خبریں کہ عورتیں سر اور چہرہ برہنہ کر کے رونے کے لئے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ صبح کے وقت!

خنساء اپنے بھائی صخر کے مرثیہ میں کہتی ہے :۔

يُذكّرني طلوعُ الشمسِ صخراً * وَأذكرهُ لِكلِّ غروبِ شمسِ

طلوعِ شمس مجھے اپنے بھائی صخر کی یاد دلاتا ہے اور غروبِ آفتاب کے وقت بھی میں اسے یاد کر کے روتی ہوں۔

واضح ہو کہ دورِ جاہلیت میں عورتیں اپنے مردوں کو صبح اور شام یاد کر کے رویا کرتی تھیں۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :۔

الا ان عینا لم تجد یوم واسط ٭ علیک بجاری دمعها لجمود

دیکھو! جس آنکھ نے تجھ پر جنگ واسط کے دن آنسو نہیں برسائے وہ اشک بستہ اور بخیل ہے۔

عشیة قام النائحات وشققت ٭ جیوب بایدی ماتم وخدود

جس شام کو زنانِ نوحہ گر تجھ پر رونے کھڑی ہوئیں اور ان عورتوں کے ہاتھوں سے بہت سے گریبان چاک ہوئے اور رخسار (منہ) پیٹے گئے۔

۲۷۔ ایک دستور ان لوگوں میں یہ تھا۔ کہ جب کسی بہادر اور سخی آدمی کی قبر کے پاس سے گذرتے، تو اس کی یاد میں اونٹ ذبح کرتے اور مساکین کو کھلاتے تھے۔ ربیعہ بن مکدم ایک بہادر اور سخی آدمی تھا اس کی وفات کے بعد ایک شاعر حفص بن الاحنف جو اس کا دوست تھا۔ اس کی قبر کے پاس سے گذرا۔ دستور کے مطابق اسے اپنے ناقہ کو ذبح کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اسے بہت عزیز جانا تھا۔ اس لئے اس نے ناقہ ذبح کرنے کے بجائے ایک مرثیہ کہا۔

لا یبعدن ربیعة بن مکدم ٭ وسقی الغوادی قبرہ بذنوب

خدا ربیعہ بن مکدم کو ہلاک نہ کرے اور صبح کا ابرِ باراں اس کی قبر کو بڑے ڈول سے سیراب کرے۔

نفرت قلوصی من حجارة حرة ٭ بنیت علی طلق الیدین وھوب

میری اونٹنی ایک ایسے سخی دست کشادہ کی قبر کے پتھروں سے بھگی، جو بڑا فیاض تھا!

لا تنفری یا ناق منه فانه ٭ شراب خمر مسعر لحروب

اے ناقہ! تو اس سے گریز نہ کر۔ کیونکہ وہ بہت مے نوش اور لڑائی کی آگ بھڑکانے والا تھا

۲۸۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ جب مُردے کی ہڈیاں گل جاتی ہیں۔ تو اس کی قبر سے ایک پرندہ پیدا ہوتا ہے جس کو وہ صدیٰ کہتے تھے۔ بعض کا یہ گمان تھا۔ کہ یہ پرندہ مقتول کے سر کی ہڈیوں سے نکلتا ہے۔ اور جب تک اس کا قصاص نہ لیا جائے "اِسقُونِی اِسقُونِی" پکارتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس کو ھامہ بھی کہتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:۔

اُقیم علی قبریکما لست بارحا ٭ طوال اللیالی او یجیب صداکما

میں تم دونوں کی قبروں پر پڑا رہوں گا۔ اور رات دن وہیں رہوں گا۔ جب تک تمہاری قبروں کا پرندہ مجھے جواب نہ دے

ایک شاعر اپنے بیٹے سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

الا لیت شعری ما یقولن مخارق ٭ اذا جاوب الهام المصیح هامتی

کاش مجھے علم ہوتا۔ کہ میرا بیٹا مخارق کیا کہے گا۔ جب میری قبر کا پرندہ اُن غل مچانے والے پرندوں کو جواب دے گا۔ جو دوسروں کی قبروں سے نکل کر بولیں گے؟

توبة ابن الحمیر اپنے جوش عشق کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔

ولو ان لیلی الاخیلیة سلمت ٭ علی ودونی تربة وصفائح

لسلمت تسلیم البشاشة او زقا ٭ الیها صدی من جانب القبر صائح

اور اگر میری محبوبہ لیلیٰ اخیلیہ مجھے سلام کرے، ایسے حال میں۔ کہ میں مٹی اور پتھر کی سلوں کے نیچے مدفون ہوں، تو بیشک میں سبکدوشی اس کے سلام کا جواب دوں گا۔ یا میرے بجائے ہامہ جواب دے گا۔ جو میری قبر سے نکلے گا۔

اس لیلیٰ کا قصہ بڑا اندوہناک ہے۔ یہ خاتون حسن و جمال کے علاوہ شعر و سخن میں بھی بلند مرتبہ رکھتی تھی۔ اور عورتوں میں خنساء کے بعد اس سے بہتر کوئی شاعرہ نہیں ہوئی۔ اس کو توبہ سے محبت تھی۔ لیکن توبہ غریب تھا۔ اس لئے ناکام رہا۔ اور آتش فراق میں گھل گھل کر مرگیا۔ اس کی وفات کا لیلیٰ کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس بدقسمت خاتون نے اپنے عاشق صادق کی یاد میں کئی درد انگیز مرثیے لکھے۔

توبہ کی وفات کے بعد لیلیٰ کے والدین نے اس کی شادی ایک دولت مند شخص سے کر دی۔ جو بہت سنگدل تھا۔ اور اس بات کو فراموش نہ کرسکا۔ کہ میری بیوی کسی سے محبت کرتی تھی۔ یک دن اتفاق سے لیلیٰ اپنے شوہر کے ہمراہ توبہ کی قبر کے پاس سے گذری شوہر کو توبہ کے یہ اشعار یاد آگئے۔ اس لئے اس نے قبر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ کہ یہ توبۃ الکذاب کی قبر ہے۔ تو اب اسے سلام کرتا کہ میں دیکھوں کہ اس کی قبر کا پرندہ تجھے جواب دیتا ہے یا نہیں؟ لیلیٰ نے کہا۔ کہ توبہ میرا سچا عاشق تھا۔ تجھے بھی اس کی محبت کا احترام کرنا چاہئے۔ لیکن شوہر نہ مانا۔ اور اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ مجبوراً لیلیٰ نے اپنے دل پر جبر کرکے کہا۔ "السّلامُ علیکَ یا توبۃ!" اتنا کہنا تھا۔ کہ ایک جھاڑی سے جو قبر کے پاس تھی ایک پرندہ اڑا اور لیلیٰ کے ناقہ کے منہ سے آکر ٹکرایا۔ اونٹنی خوفزدہ ہوکر شور کرتی ہوئی بھاگی اور لیلیٰ بے اختیار ہوکر نیچے آپڑی اور فوراً جاں بحق ہوگئی اور اپنے عاشق کے پہلو میں مدفون ہوئی۔

٢٩۔ یہ لوگ تقدیر کے بھی معتقد تھے۔ یعنی ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب تخلیق عالم سے پہلے معین ہوچکا ہے۔ اور اس میں ذرّہ بھر فرق نہیں ہوسکتا۔ قسّام ازل نے ہر شخص کے نصیب میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہی اس کے سامنے آئے گا۔ انسان لاکھ کوشش کرے۔ نہ تقدیر کے خلاف کچھ کرسکتا ہے اور نہ اپنے مقدّر سے زیادہ کوئی چیز حاصل کرسکتا ہے۔ کوئی طاقت نوشتۂ تقدیر کو نہیں بدل سکتی۔ دنیا پر انسان کی حکومت نہیں بلکہ مشیتِ ایزدی حکمران ہے۔ انسانوں کی زندگی کے جملہ امور اسی کے دستِ قدرت میں ہیں۔ مرنا جینا، ترقی، تنزل، افلاس، تونگری، راحت، کلفت، صحت، مرض، شادی، غمی، غرضیکہ ہر چیز خدا کی مرضی سے ظہور میں آتی ہے۔

زاہر ابو کرام التمیمی کہتا ہے :-

فکأنّما کانت یدیّ من حتفہٖ ۔ لمّا انثنیتُ لہٗ علیٰ میعادِ

پس گویا میرا ہاتھ سبب میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی موت کے وقت موجود پر تھا یعنی وہ اسی وقت مرا جبکہ اس کی موت آگئی تھی

قطری بن الفجاءۃ کہتا ہے :-

اَقُولُ لَھا وَقَدْ طارتْ شَعاعاً ۔ مِنَ الاَبطالِ وَیحکِ لَن تُراعِی

میں اپنے دل (نفس) سے کہتا ہوں، جبکہ وہ بہادروں کے خوف سے پریشان ہوگیا۔ کہ افسوس ہے تجھ پر! موت سے مت ڈر

فانّکِ لو سألتِ بقاءَ یومٍ ۔ علی الاجلِ الّذی لکِ لم تُطاعِی

اور اس لئے کہ اگر تو ایک روز کی زندگی بھی اپنے وقت مقررہ سے زیادہ مانگے گا۔ تو تیرا کہا نہیں مانا جائے گا!

اَقیموا صُدورَ الخیلِ اِنَّ نفوسکُم ۔ لمیقاتِ یومٍ مَا لھُنَّ خُلُوفٌ

تم اپنے گھوڑوں کے سینے دشمنوں کے سامنے کردو۔ کیونکہ تمہاری جانوں کیلئے ایک وقت مقرر ہے جس کے خلاف وہ ہرگز نہیں کرسکتیں

ایک اور شاعر اپنے دوست کے مرثیہ میں کہتا ہے :-

وَقَد کُنتُ اَرجُو اَن اُملّاکَ حِقبۃً ۔ فَحالَ قضاءُ اللّٰہِ دُونَ رجائیا

اور میں تو یہ توقع کرتا تھا کہ ایک مدت دراز تک تجھ سے متمتع ہوں گا۔ لیکن قضائے الٰہی میری امید سے ورے آڑے ہوگئی (یعنی میری امید پوری نہ ہوئی)

تأبط شرًّا کی ماں اپنے بیٹے کی وفات پر کہتی ہے:-

وَالْمَنَايَا رَصَدٌ ٭ يَلْقَى الْحَيُّ سَلَكْ

اور موتیں جوان کے لئے گھات میں بیٹھی ہیں۔ جہاں بھی وہ جائے

كُلُّ شَيْءٍ قَاتِلٌ ٭ حِينَ تَلْقَى أَجَلَكْ

اے مخاطب! ہر شئے تیری قاتل بن سکتی ہے۔ جبکہ تو اپنی اجل سے ملاقات کرے

۳۰۔ یہ لوگ اگرچہ بُت پرست تھے۔ لیکن خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے تھے اور اس کی قسم کھاتے تھے۔ چنانچہ زہیر ابن ابی سلمیٰ لکھتا ہے:-

فَأَقْسَمْتُ بِالْبَيْتِ الَّذِي طَافَ حَوْلَهُ ٭ رِجَالٌ بَنَوْهُ مِنْ قُرَيْشٍ وَجُرْهُمِ

میں اس گھر کی قسم کھاتا ہوں۔ جس کے گرد اس کے تعمیر کرنے والوں یعنی قریش، اور جرہم نے طواف کیا۔

نیز بعض لوگ یہود اور نصاریٰ کی تعلیمات مذہبی سے متاثر ہوگئے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا شاعر کہتا ہے:-

فَلَا تَكْتُمُنَّ اللهَ مَا فِي صُدُورِكُمْ ٭ لِيَخْفَى وَمَهْمَا يُكْتَمِ اللهُ يَعْلَمِ

اور خدا سے ہرگز اپنے دلوں کی بات اس لئے نہ چھپاؤ۔ کہ وہ چھپی رہے گی۔ کیونکہ جب بھی کوئی بات اللہ سے چھپائی جاتی ہے وہ جان لیتا ہے۔

يُؤَخَّرْ فَيُوضَعْ فِي كِتَابٍ فَيُدَّخَرْ ٭ لِيَوْمِ الْحِسَابِ أَوْ يُعَجَّلْ فَيُنْقَمِ

نافرمانی کی سزا مؤخر کی جائے گی اور نامۂ اعمال میں لکھ دی جائے گی۔ پھر قیامت کے دن کیلئے ذخیرہ کی جائے گی۔ یا جلدی کی جائے گی تو دنیا ہی میں سزا مل جائے گی۔

۴۰۔ ان لوگوں کی شاعری میں عاشقانہ جذبات بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے، کہ عشق و محبت کے جذبات ان کے خمیر میں داخل تھے۔ لیکن جو بات ان کو موجودہ زمانہ کے شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ان کی محبت عاجزی اور درماندگی کی مظہر نہیں ہے۔ جس طرح یہ لوگ طبعاً حریت پسند تھے اور غلامی سے متنفر تھے اسی طرح ان کی عاشقی بھی غلامانہ ذہنیت سے پاک تھی۔ ان کی محبت میں گراوٹ نہیں بلندی ہے۔

ایرانی اور ہندی عاشق اپنے محبوب کی خوشامد کرتا ہے اور نگاہ لطف کا طالب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی گدا کسی تونگر سے بھیک مانگے۔ لیکن جاہلی شعراء کا طریقہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ عنترہ بن شداد عبسی اپنی معشوقہ سے یوں خطاب کرتا ہے:-

إِنْ تُغْدِفِي دُونِي الْقِنَاعَ فَإِنَّنِي ٭ طَبٌّ بِأَخْذِ الْفَارِسِ الْمُسْتَلْئِمِ

اے محبوبہ! اگر تو برقع میں مجھ سے پوشیدہ ہوگی تو تیرا یہ فعل بے فائدہ ہے۔ کیونکہ میں تو زرہ پوش شہسواروں کو بھی گرفتار کر لیتا ہوں۔ اس لئے تو مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتی ہے؟

ہندی عاشق کے دماغ میں بھی یہ خیال نہیں آسکتا۔ کہ وہ اپنی محبوبہ کو اس انداز سے دھمکائے۔

أَثْنِي عَلَيَّ بِمَا عَلِمْتِ فَإِنَّنِي ٭ سَمْحٌ مُخَالَقَتِي إِذَا لَمْ أُظْلَمِ

تو میری مدح اور ثنا کر ان خوبیوں کیلئے جو تجھے معلوم ہیں۔ کیونکہ اگر مجھ پر ظلم نہ کیا جائے، تو میرا حسنِ سلوک نہایت اچھا ہے۔

اب میں حماسہ سے چند نمونے تغزل کے پیش کرتا ہوں — ایک شاعر لکھتا ہے:۔

هَوايَ مَعَ الرَّكبِ اليَمانينَ مُصعِدٌ ۞ جَنيبٌ وَجُثماني بِمَكَّةَ مُوثَقُ

میری محبوبہ کا ناقہ یمن کے سواروں کے پیچھے راستہ کے کنارے کنارے جانے والا ہے۔ اور میرا جسم مکہ میں مقید ہے یعنی نہ اس کو روک سکتا ہوں، نہ اس کے ساتھ جا سکتا ہوں۔

عَجِبتُ لِمَسراها وَأَنّى تَخَلَّصَت ۞ إِلَيَّ وَبابُ السِّجنِ دوني مُغلَقُ

مجھ کو سخت تعجب ہے کہ محبوبہ میرے پاس کیسے آگئی، جبکہ حبس کا دروازہ بند ہے!

أَلَمَّت فَحَيَّت ثُمَّ قامَت فَوَدَّعَت ۞ فَلَمّا تَوَلَّت كادَتِ النَّفسُ تَزهَقُ

محبوبہ (عالمِ خیال میں) آئی اور مجھے سلام کیا (کچھ دیر بیٹھی) پھر کھڑی ہوگئی اور مجھے رخصت کیا۔ اور جب اس نے منہ پھیرا تو شدتِ غم سے قریب تھا کہ میری جان نکل جائے۔

فَلا تَحسَبي أَنّي تَخَشَّعتُ بَعدَكُم ۞ لِشَيءٍ وَلا أَنّي مِنَ المَوتِ أَفرَقُ

اے محبوبہ! تو یہ گمان نہ کرنا کہ میں تیرے فراق کے بعد بزدل ہو گیا ہوں یا یہ کہ میں موت سے ڈرتا ہوں

وَلَكِنْ عَرَتني مِن هَواكِ صَبابَةٌ ۞ كَما كُنتُ أَلقى مِنكِ إِذ أَنا مُطلَقُ

لیکن فقرہ یہ ہے کہ میں تیری محبت میں رقیق القلب ہو گیا ہوں۔ ویسا ہی جیسے کہ اس قید سے پہلے تھا

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

لَقَد كُنتُ جَلداً قَبلَ أَن توقِدَ النَّوى ۞ عَلى كَبِدي جَمراً بَطيئاً خُمودُها

بیشک میں ایک طاقتور شخص تھا قبل ازیں کہ فراق میرے جگر میں ایسی آگ روشن کرے جو بہت دیر میں بجھتی ہے

وَقَد كُنتُ أَرجو أَن تَموتَ صَبابَتي ۞ إِذا قَدُمَت أَيّامُها وَعُهودُها

اور میں یہ امید کرتا تھا کہ میرا عشق زائل ہو جائے گا، جبکہ اس پر مدتِ دراز گزرے گی (لیکن افسوس کہ یہ امید پوری نہ ہوئی)

فَقَد جَعَلَت في حَبَّةِ القَلبِ وَالحَشا ۞ عِهادُ الهَوى تُولى بِشَوقٍ يُعيدُها

پس اس عشق نے میرے سویدائے قلب اور اعضائے باطنی پر محبت کا مینہہ برسایا۔ جو بسبب شوقِ عظیم کے دوبارہ برسایا جاتا ہے

بِسودٍ نَواصيها وَحُمرٍ أَكُفُّها ۞ وَصُفرٍ تَراقيها وَبيضٍ خُدودُها

میرے دل میں محبت کا مینہہ برسا دیا۔ ان معشوقوں کی بدولت جن کے بال سیاہ ہیں اور ہتھیلیاں حنائی ہیں اور ان کے سینے (زیورات کی وجہ سے) پیلے ہیں، اور رخسار گورے ہیں۔

مُخَصَّرَةُ الأَوساطِ زانَت عُقودَها ۞ بِأَحسَنَ مِمّا زَيَّنَتها عُقودُها

وہ عورتیں نازک کمر والیاں ہیں، جنہوں نے اپنے ہاروں کو اس سے زیادہ زینت دی ہے جتنی کہ ان ہاروں نے انکو زینت دی ہو

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

هَلِ الوَجدُ إِلّا أَنَّ قَلبي لَو دَنا ۞ مِنَ الجَمرِ قيدَ الرُّمحِ لَاحتَرَقَ الجَمرُ

عشق اس کے سوا اور کچھ نہیں، کہ اگر میرا دلِ آتش سوزاں سے بقدر ایک نیزے کے نزدیک ہو جائے تو اس کی حدت سے آگ خود جل جائے

فِي الحَقِّ إِنِّي مُغْرَمٌ بِكِ هَائِمٌ ✽ وَإِنَّكِ لَا خَلٌّ لَدَيَّ وَلَا خَمْرٌ

کیا یہی انصاف ہے کہ میں تو تیری محبت میں دیوانہ اور سرگشتہ ہوں، اور تو میرے حق میں نہ ضرر رساں ہے، نہ مفید ہے

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

تَشَكَّى المُحِبُّونَ الصَّبَابَةَ لَيْتَنِي ✽ تَحَمَّلْتُ مَا يَلْقَوْنَ مِنْ بَيْنِهِمْ وَحْدِي

عشاق مصائب کی شکایات کرتے ہیں، لیکن میری آرزو یہ ہے، کہ کاش وہ تمام مصائب جو وہ سب اٹھاتے ہیں میں تنہا اٹھاتا

فَكَانَتْ لِنَفْسِي لَذَّةُ الحُبِّ كُلُّهَا ✽ فَلَمْ يَلْقَهَا قَبْلِي مُحِبٌّ وَلَا بَعْدِي

پس اس صورت میں میری جان کو محبت کا سارا مزا حاصل ہوجاتا، کہ اس مزہ سے کوئی عاشق نہ مجھ سے پہلے ملاقات کرتا نہ بعد میں!

عرب شعرا میں غیرت کا جوش اور رشک و رقابت کا جذبہ بھی موجود تھا۔ مرزا غالب کی طرح اُن کا یہ مسلک نہ تھا۔ کہ

سے تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ✽ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

وَإِذَا الرِّيَاحُ مَعَ العَشِيِّ تَنَاوَحَتْ ✽ نَبَّهْنَ حَاسِدَةً وَهِجْنَ غَيُورَا

اور جب مختلف ہوائیں شام کے وقت چلتی ہیں۔ اور اُن کی وجہ سے ان کے کرتے اُن کی کمر اور شکم سے لگ جاتے ہیں اور اس طرح جسم کی خوبصورتی ظاہر ہوجاتی ہے۔ تو وہ ہوائیں گویا نفوسِ حاسدہ کو بیدار اور غیرت مند عاشق کی غیرت کو برانگیختہ کرتی ہیں، کہ کیوں اُن کے جسم کی خوبصورتی اوروں پر ظاہر ہوئی۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

مَيْنَاءُ تَسْحَبُ مِنْ قِيَامٍ فَرْعَهَا ✽ وَتَغِيبُ فِيهِ وَهُوَ وَحْفٌ أَسْحَمُ

وہ گوری سینہ، کھڑے ہونے پر اپنے بالوں کو بسبب ان کی درازی کے کھینچتی چلتی ہے اور اُن بالوں میں کہ وہ کوئلہ کی طرح کالے ہیں، خود ان کی کثرت کی وجہ سے چھپ جاتی ہے

فَكَأَنَّهَا فِيهِ نَهَارٌ سَاطِعٌ ✽ وَكَأَنَّهُ لَيْلٌ عَلَيْهَا مُظْلِمُ

وہ عورت ان سیاہ بالوں میں گویا روز روشن ہے اور وہ بال، گویا شب دیجور ہیں!

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

أُحِبُّكِ حُبًّا عَلَى حُبٍّ وَأَنْتِ بَخِيلَةٌ ✽ وَقَدْ زَعَمُوا أَلَّا يُحَبَّ بَخِيلُ

کیا میں تجھ سے محبت پر محبت کروں، جبکہ تو وصل کے باب میں اس قدر بخل کرتی ہے؟ لوگ (سچ) کہتے ہیں کہ بخیل محبوب نہیں ہوتا

بَلَى وَالَّذِي حَجَّ المُلَبُّونَ بَيْتَهُ ✽ وَيَشْفِي الهَوَى بِالنَّيْلِ وَهُوَ قَلِيلُ

بیشک (میں تجھ کو دوست رکھتا ہوں) قسم ہے اس ذات (پاک) کی جس کے گھر کا لبیک کہنے والے قصد کرتے ہیں، میرے مرض کو تیرے پاس پہنچنے سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات مجھے بہت کم نصیب ہوتی ہے!

وَإِنَّ بِنَا لَوْ تَعْلَمِينَ لَغُلَّةً ✽ إِلَيْكِ كَمَا بِالحَائِمَاتِ غَلِيلُ

اور بیشک ہم کو تیرے دیدار کی تشنگی ہے، جیسے پرندوں کو تشنگی ہوتی ہے جو پانی کے گرد گھومتے ہیں (کاش تجھے یہ بات معلوم ہوجائے)

قیس عامری کہتا ہے:۔

فَاِن تَمْنَعُوا لیلیٰ وَحُسنَ حَدیثِها ÷ فَلَنْ تَمْنَعُوا مِنّی البُکاءَ والقوافیا

اگر تم لوگ لیلیٰ اور اس کی اچھی باتوں کو مجھ سے روک سکتے ہو تو روک لو لیکن تم میرے رونے اور شعر خوانی کو مجھ سے نہیں روک سکتے۔

فَهَلّا مَنَعْتُمْ اِذْ مَنَعْتُمْ حَدِیثَها ÷ خیالاً یُوافِینی عَلَی النَّأیِ هادِیا

جبکہ تم نے اس سے میری بات کرنے کو روک دیا، تو کیوں نہیں روکا اس کے خیال کو جو باوجود اس قدر دوری کے سیدھا میرے پاس آتا ہے۔!

~~~~~~~~ ♦ ~~~~~~~~

جب قیس عامری کو یہ معلوم ہوا کہ لیلیٰ کی شادی بنی ثقیف کے ایک شخص کے ساتھ ہو گئی ہے اور کل وہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی جائے گی تو اس نے یہ اشعار کہے :-

کَاَنَّ القَلبَ لیلَةَ قِیلَ یُغدیٰ ÷ بِلَیلَی العامِرِیَّةِ اَو یُراحُ

قَطاةٌ عَزَّها شَرَكٌ فَباتَتْ ÷ تُجاذِبُهُ وَقَد عَلِقَ الجَناحُ

گویا میرا دل، اس رات کو جس میں کہا گیا کہ لیلیٰ عامری صبح کو یا شام کو روانہ کر دی جائے گی۔ اس مادہ کونج کی طرح تھا جو کسی جال میں پھنس گئی ہو جس سے نکلنا ناممکن ہو۔

لَهَا فَرْخانِ قَدْ تُرِکا بِوَکْرٍ ÷ فَعُشُّهُما تُصَفِّقُهُ الرِّیاحُ

اور اس کے دو بچے ہوں، جو گھونسلے میں چھوڑ دیے گئے ہوں اور ان کے گھونسلے کو ہوائیں جنبش دیتی ہوں

اِذا سَمِعا هُبُوبَ الرِّیحِ نَصّا ÷ وَقَدْ اَودیٰ بِهَا القَدَرُ المُتاحُ

اور جب وہ بچے ہوا کے چلنے کی آواز سنتے ہوں، تو اپنی گردنیں اٹھا کر دیکھتے ہوں کہ شاید ماں ان کے لئے چگا لائی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کو تقدیر نے ہلاک کر دیا۔

فَلا فِی اللَّیلِ نالَتْ ما تُرَجّی ÷ وَلا فِی الصُّبحِ کانَ لَها بَراحُ

پس وہ مادہ (کونج) نہ تو رات کو اپنی امید کو پہنچے گی اور نہ صبح کو اسے رہائی ملے گی!

حاصل کلام یہ کہ میری حالت اس بیکس کونج کی مادہ کی مانند ہے ۔

ایک شاعر اپنی محبوبہ کے اعضائے جسمانی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے :-

فَوَاللّٰهِ لا اَدری اَزِیدَتْ مَلاحَةً ÷ وَحُسْناً عَلَی النِّسوانِ اَمْ لَیسَ لی عَقلُ

پس خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ وہ سب عورتوں پر حسن و ملاحت میں فضیلت دی گئی ہے، یا میری عقل زائل ہو گئی ہے کہ میں اسے لاثانی سمجھتا ہوں۔

ایک اور شاعر کے شعر ہیں :-

وَفِی الحِیرَةِ الغادِینَ مِن بَطنِ وَجرَةٍ ÷ غَزالٌ اَحَمُّ المُقلَتَینِ رَبِیبُ

اور ان ہمسایوں میں جو موضع بطن وجرہ سے علی الصباح روانہ ہوئے ہیں ایک معشوقہ بھی ہے جو سرمگیں چشم مانوس ہرن کی مانند ہے

فَلا تَحسَبِی اَنَّ الغَرِیبَ الَّذی نَأیٰ ÷ وَلٰکِنَّ مَن تَنأَینَ عَنهُ غَرِیبُ
~~~~~~~~

پس اے محبوبہ! تو یہ گمان نہ کر کہ غریب الدیار وہ ہے جو اپنے اقارب یا وطن سے جدا ہو جائے۔ بلکہ وہ شخص پکا غریب الدیار ہے جس سے تو جُدا ہو جائے۔

اسی خیال کو کسی فارسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے :-

ع سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

ابن میادہ کہتا ہے :-

وَمَا أَنسَ مِن أَشيَاءَ لَا أَنسَ قَولَهَا ؛ وَأَدمُعُهَا يُذرِينَ حَشوَ المَكَاحِلِ

میں دوسری باتوں میں سے کوئی کوئی بات بھول جاؤں تو یہ ممکن ہے۔ لیکن اس کے قول کو جبکہ وہ چشم سرمگیں سے آنسو بہاتی تھی۔ نہیں بھول سکتا۔

تَمَتَّع بِذَا اليَومِ القَصِيرِ فَإِنَّهُ ؛ رَهِينٌ بِأَيَّامِ الشُّهُورِ الأَطَاوِلِ

وہ مجھ سے یہ کہتی تھی۔ کہ اس یوم وصال سے جو بہت مختصر ہے۔ اچھی طرح فائدہ حاصل کر لے۔ کیونکہ یہ دن جُدائی کے مہینوں کے طویل ایام کے بہاں گرو ہے۔ یعنی ایسا دن مدتوں کے بعد کبھی نصیب ہوگا۔

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

بَيضَاءُ آنِسَةُ الحَدِيثِ كَأَنَّهَا ؛ قَمَرٌ تَوَسَّطَ جُنحَ لَيلٍ مُبرِدِ

وہ معشوقہ گورے رنگ کی ہے اور اس کی باتیں دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ گویا وہ ایک چاند ہے جو سردیوں کی رات میں (جبکہ غبار نہیں ہوتا) چمک رہا ہے۔

مَوسُومَةٌ بِالحُسنِ ذَاتُ حَوَاسِدٍ ؛ إِنَّ الحِسَانَ مَظِنَّةٌ لِلحُسَّدِ

وہ حُسن میں مشہور ہے جس پر بہت سی عورتیں حسد کرتی ہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ حسین عورتوں کے بہت سے حاسد ہوتے ہیں

خَودٌ إِذَا كَثُرَ الحَدِيثُ تَعَوَّذَت ؛ بِحِمَى الحَيَاءِ وَإِن تَكَلَّمَ تَقصِدِ

وہ بہت نازک اندام ہے اور اگر اس کے سامنے زیادہ باتیں کی جاتی ہیں۔ تو وہ شرم وحیا کی پناہ لیتی ہے اور اگر خود بات کرتی ہے۔ تو اعتدال کرتی ہے

ایک اور شاعر کہتا ہے :-

نَظَرتُ كَأَنِّي مِن وَرَاءِ زُجَاجَةٍ ؛ إِلَى الدَّارِ مِن فَرطِ الصَّبَابَةِ أَنظُرُ

میں نے جوش عشق میں بحالت گریہ محبوبہ کے گھر کو دیکھا۔ تو اس وقت آنسوؤں کی وجہ سے مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں شیشہ کے پیچھے سے دیکھ رہا ہوں۔

فَعَينَايَ طَوراً تَغرَقَانِ مِنَ البُكَا ؛ فَأَعشَى وَطَوراً تَحسِرَانِ فَأُبصِرُ

پس میری دونوں آنکھیں کبھی تو کثرتِ گریہ کی وجہ سے آنسوؤں میں ڈوب جاتی ہیں اور میں چندھا ہو جاتا ہوں اور کبھی صاف ہو جاتی ہیں۔ تو میں صاف دیکھنے لگتا ہوں۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

أَلمِم عَلَى دِمَنٍ تَقَادَمَ عَهدُهَا ؛ بِالجِزعِ وَاستَلَبَ الزَّمَانُ جَمَالَهَا

بمقام جزع محبوبہ کے مکان کے آثار پر جن پر بہت زمانہ گذر گیا۔ اور زمانہ نے اس کی رونق چھین لی۔ برائے چندے قیام کر۔

سَمِّمُ یقاتلتہ الغرانق مابہٖ ۔ اِلّا الوحوشُ خلتْ لہٗ وخلا لہا

یہ آثار اس محبوبہ کے مکان کے ہیں جو نوجوانوں کو اپنے ناز و انداز سے قتل کرتی تھی۔ لیکن اب یہاں وحشی جانوروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

ظلّتْ تسائلُ بالمتیم اھلہٗ ۔ وھی التی فعلتْ بہٖ افعالہا

وہ محبوبہ عاشق کا حال اس کے کنبہ والوں سے پوچھتی ہے کہ اُسے کس نے ہلاک کیا، حالانکہ اُس نے یہ کام خود ہی کئے ہیں۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:۔

دعا داعیاً بینٍ فمن کان باکیا ۔ معی من فراق الحیّ فلیاتنی غدا

محبوبہ کو فراق کے دو پکارنے والوں نے پکارا۔ سو وہ مجھ سے ضرور جدا ہوگی۔ تو اب فراقِ محبوبہ میں جو میرے ساتھ رونا چاہے وہ کل صبح میرے پاس آجائے۔

فلیتَ غداً یومٌ سواہٗ وما بقی ۔ من الدھر لیلٌ یحبسُ الناسَ سرمدٌ

جب محبوبہ کا سفر کل صبح کو مقرر ہے تو کاش وہ کل کوئی اور دن ہو جائے۔ اور کاش جو زمانہ سے باقی رہا ہے وہ سب مل کر ایک رات ہو جائے (تاکہ وہ صبح نہ ہو) وہ رات محبوبہ کے قبیلہ کو ہمیشہ روکے رکھے۔ (یعنی کبھی صبح نہ ہو)

خزاں

موج و ساحل

منزل سے دور راہگذاروں کے باوجود
دنیا بھٹک رہی ہے ستاروں کے باوجود

اک موج اعتبار پہ جیتی ہے کائنات
ساحل ہے ایک خواب کناروں کے باوجود

کہیں جو مجھ کو محبت نظر نہیں آتی
تو زندگی کی ضرورت نظر نہیں آتی

نظر فریب تبسم فریب اشک فریب
مجھے تو کوئی حقیقت نظر نہیں آتی

میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تلخیوں کے سوا
اس انقلاب کی دنیا میں اور بھی کچھ ہے

زمانہ دیکھ رہا ہے کہ ڈھل رہی ہے شراب
میں دیکھتا ہوں کہ مینا میں اور بھی کچھ ہے

عبدالکریم شمشی

فکر و عمل

ربابِ ہستی ہے نغمہ پیرا نگاہیں دل کی پیام بر ہیں
حقیقتیں بن گئیں فسانہ مجاز اپنے شباب پر ہیں !!

ضمیرِ امواجِ بحرِ ہستی ہے سنگریزوں سے خود گریزاں
وگرنہ تارے ہیں مات جن سے صدف کے قالب میں وہ گہر ہیں

شعورِ انساں پہ منحصر ہیں شعور و انسانیت کی قدریں
رموزِ کونین کے معلم رموزِ فطرت سے بے خبر ہیں

حریمِ ارض و سما کے دل پر کری جو اسرار فاش تیرے
اُسی کے ہم گام ہیں فرشتے، اُسی کے جبریل ہمسفر ہیں

جہاں — شاعری — عمل اور انقلاب چاہتی ہے

بشیر منذر

چھا گیا ہر طرف مہیب سکوت ‏ آہ یہ انقلاب کیسا ہے!
ہائے یہ صبح زندگی، توبہ! ‏ خشک ذرّے وہی سراب وہی
(۱) صُور کی پھونک بھی نہ کام آئی ‏ (۲) میری کوشش کا ماحصل دیکھو
جینے والوں کی بے بسی، توبہ! ‏ نئے ساغر، مگر شراب وہی

(۱)......
(۲) پا بسیں گرچہ اجنبی رُوحیں
ان کا سکن فسوں نہیں ٹوٹا

رباعیاں

حکیم راغب مُراد آبادی

قطرہ دُرِ آب دار ہو سکتا ہے ؞ کانٹا گل نوبہار ہو سکتا ہے
ہے سعیِ مسلسل کی ضرورت راغب ؞ ذرّہ بھی شہریار ہو سکتا ہے

ضیا سنبھلادی

بوسیدہ کہانیوں کا بھی تیرہ بن ؞ رستے میں جو لُٹ جائے وہ رہگیر نہ بن
پھونکوں سے اُڑا دیں جسے وہ خاک نہ بن ؞ سونا نہ بنے جس سے وہ اکسیر نہ بن!

گلزار میں مدفون بہاروں کو بھی پڑھ ؞ ظلمات میں ڈوبے ہوئے تاروں کو بھی پڑھ
کہتے تو مزاروں کے سبھی پڑھتے ہیں ؞ تو غور سے ویران مزاروں کو بھی پڑھ

ظلمت میں چمکتے ہوئے اختر کو پرکھ ؞ سیپی میں دمکتے ہوئے گوہر کو پرکھ
ہنساری غربت پہ ہے قدرت کی مذاق ؞ غربت پہ نہ جا تو مرے جوہر کو پرکھ

طوفان کی موجوں میں نکھرنا سیکھو ؞ تلوار کی دھاروں پہ گزرنا سیکھو
ڈرتے ہیں کہیں موت سے جینے والے ؞ زندہ تمہیں رہنا ہے تو مرنا سیکھو

آتا ہے وہ اک مردِ مجاہد ہشیار ؞ انگارے نگاہوں میں ہیں دل میں انوار
قوت بھی ہے رحمت بھی ہے انصاف بھی ہے ؞ ہے ہاتھ میں قرآن، کمر میں تلوار

عبدالحمید حیرت شملوی

آئینۂ حیرت

ہیں دل کے لئے آزار بہت — آلام بہت، افکار بہت
چھیڑے نہ کوئی بیدردی سے — نازک ہیں نفس کے تار بہت
اِک دن وہ ذرا سی بے لطفی — ہے آج بھی دل پہ بار بہت
دعویٰ ہے زباں پہ اُلفت کا — ہے پست مگر معیار بہت
اس طولِ عمل سے کیا حاصل — بس دیکھ لیا سرکار! بہت

❀

عاشقی کی حکایتیں ہیں اور — عام لیکن روایتیں ہیں، اور

❀

ہم یہی دیکھتے رہے اب تک — کہ نگاہِ کرم اِدھر بھی ہو!
ہم تو یوں بھی گزار دیں لیکن — زندگی اس طرح بسر بھی ہو
نغمۂ شوق ہو کہ نوحۂ غم! — دل سے نکلے تو کچھ اثر بھی ہو
وائے قسمت کہ بے بصر ہی نہیں — دوستو! تم تو بے خبر بھی ہو

ہو گئے!

نذیر بنارسی

کیا ان آنکھوں کی قسمت میں دامن نہیں ✽ کتنے آنسو یونہی رائیگاں ہو گئے!
انقلاب، اور اتنا بڑا انقلاب! ✽ کارواں والے بے کارواں ہو گئے
پھر شکستیں ہمیں اپنی یاد آ گئیں
پھر ارادے ہمارے جواں ہو گئے

عبد الحمید عدم

پیمانے

دل نظر کا جواب ہو جائے   آبگینہ شراب ہو جائے
زندگی نام ہے خرابی کا   کاش یکسر خراب ہو جائے
غمِ دوراں سے معذرت کیسی   یہ بھی غرقِ شراب ہو جائے

پہلا ورق کھلا تھا کہ دل دھک سے رہ گیا   کیا دلفریب شام و سحر کی کتاب تھی
جب تک تیری نظر میں مروّت تھی موجزن   ہر رات زندگی کی شبِ ماہتاب تھی
میں آج اعتدال کی حد سے گزر گیا   ساقی خطا معاف! طبیعت خراب تھی
فردِ عمل میں جس کا حوالہ تھا اے عدم   وہ میں نہیں تھا مستیِ عہدِ شباب تھی

قطعات

گردشِ جامِ جم تمام ہوئی ✤ گردشِ روزگار باقی ہے
بادشاہوں کے جام ٹوٹ گئے ✤ میکدے کا وقار باقی ہے

چل خرابات میں کہ زہرہ جبیں ✤ دولتِ کیف ڈھال دیتے ہیں
مست آنکھوں کی نرم جنبش سے ✤ دل کے کانٹے نکال دیتے ہیں

عارف دہلوی

تین نشتر

ملتفت کب نگاہِ ناز نہیں ✤ دل ہی خود نشتر نواز نہیں!
اب یہ عالم ہے تیرے حسن کی خیر ✤ ہوش و مستی میں امتیاز نہیں!

واقفِ رازِ ہر دو عالم ہوں
کیا کروں؟ حکمِ شرحِ راز نہیں

بسمل سعیدی (ٹونکی)

دو غزلیں

جو نظر کہ زینتِ گل پہ ہے وہ نظر ہے زحمتِ خار پر
کہ سوادِ شامِ خزاں بھی تو ہے فروغِ صبحِ بہار پر

وہ دوامِ منزلِ عشق اب ہے تمام اُن کے شعار پر
جو نہ چل سکے کبھی دو قدم بھی وفا کی راہ گذار پر

وہ نظر ہی اصل میں ہے نظر جو نظر ہے جلوۂ یار پر
نہ وہ دَیر کے در و بام پر نہ حرم کے نقش و نگار پر

وہ کریں جو معذرتِ ستم تو خوشا نصیب وہ ہے کرم
نہ بھلا سکیں گے مگر وہ ہم جو گذر گئی دلِ زار پر

یہ مری جبینِ حیات پر مری سرنوشتِ ازل نہیں
یہ وہ کتبۂ غمِ مرگ ہے، جو لکھا ہے لوحِ مزار پر

کہیں انقلابِ جہاں نہ ہو کہیں رنگ و بو کا زیاں نہ ہو
کہیں باغ نذرِ خزاں نہ ہو، نہ کر غرور بہار پر

مری صبح ہے تو تمہیں سے ہے مری شام ہی تو تمہیں سے ہے
مہ و مہر کا تو اثر ہی کچھ نہیں میرے لیل و نہار پر

جو ہوا میں کیفِ نفس نفس تو فضا میں رنگ نظر نظر
ترا حُسن ہے یہ شباب پر کہ بہشت اپنی بہار پر

نہ وہ رنگ حُسن و جمال کا نہ وہ ڈھنگ عشق کے حال کا
نہ کشش ہے اب درِ یار میں نہ جبیں ہے اب درِ یار پر

وہ جو ارضِ پاکِ حجاز ہے مری آرزو ہے کہ بسمل اب
ہو نصیب سجدۂ آخری اُسی خاکِ عرش وقار پر

نہیں معلوم پائیں گے سکوں اہلِ جہاں کب تک
خدا جانے رہیگا اس زمیں پر آسماں کب تک

قفس میں تو مجھے جب تک بھی رہنا ہو مگر یارب!
نظر میں میرے جلتا رہے گا آشیاں کب تک

ضمیر آلودۂ باطل، زباں آلودۂ ناحق!
تری محفل میں ہم رہ کر ملائیں ہاں میں ہاں کب تک

غضب ہے ٹھیس لگتی عشق کی خوددار فطرت کو
بس اے چشمِ کرم اب التفاتِ رائیگاں کب تک

دلِ مایوس میں کچھ خارِ حسرت بھی کھٹکتے ہیں
خدا جانے رہیں گی راکھ میں چنگاریاں کب تک

نہیں جب پاسِ وعدہ تو مکر بھی جاؤ گے اک دن
بدل جائے گا جب دل تو نہ بدلے گی زباں کب تک

کبھی اُمید کی نظروں سے دیکھ اپنی طرف بسمل
نگاہِ یاس سے دیکھے گا سوئے آسماں کب تک

ماہر القادری

چلو!

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہوئے چلو! ایقان کے چراغ جلاتے ہوئے چلو!
جن کو مٹا سکے نہ کوئی دورِ انقلاب کچھ ایسے نقش بھی تو بناتے ہوئے چلو!
جاگے ہوؤں کو گرمیٔ گفتار بخش دو سوتے مسافروں کو جگاتے ہوئے چلو!
انکار نے دلوں کو بہت سرد کر دیا سوزِ یقیں سے آگ لگاتے ہوئے چلو!
ضامن ہے عافیت کی سلامت روی کی چال کہتا ہے کون حشر اٹھاتے ہوئے چلو!
دل میں خدا کا خوف نہیں ہے تو کچھ نہیں یہ بات ہر کسی کو بتاتے ہوئے چلو!
شایانِ التفات فقط پھول ہی نہیں کانٹوں کی تشنگی بھی بجھاتے ہوئے چلو!

اب وقت ہے کہ شعر و ادب کی زبان سے
مفہومِ لا الٰہ بتاتے ہوئے چلو!

آج بھی!

فتنے اسی طرح سے ہیں بیدار آج بھی! میں دیکھتا ہوں حشر کے آثار آج بھی!
اقرار پہ ہے سایۂ انکار آج بھی! تسبیح میں ہے رشتۂ زنّار آج بھی!
سرمایہ خود پسند ہے افلاس خود فروش باقی نہیں ہے عظمتِ کردار آج بھی!
دل میں اسی طرح سے ہیں تالے پڑے ہوئے کھلتے نہیں ہیں ذہن پہ اسرار آج بھی!
انساں ہی کے سعیٔ مسلسل کے باوجود انساں ہے بندِ غم میں گرفتار آج بھی!
اہلِ ہوس کی سازشیں ہیں بروئے کار ہیں! رسوا ہیں اہلِ دل سرِ بازار آج بھی!
کچھ پاسِ احتیاط ہے، کچھ خوفِ دار و گیر ہیں بند بند سے لبِ اظہار آج بھی!
صحنِ زمیں ہے تنگ غریبوں کے واسطے ملتا نہیں ہے سایۂ دیوار آج بھی!
اللہ! یہ تمدّن و تہذیب کا فروغ انسانیت ہے خستہ و بیمار آج بھی!
آنکھوں میں شرم ہے نہ دلوں میں خدا کا خوف سڑکوں پہ ہے نمائشِ رخسار آج بھی!
زردار کے حضور جبینیں جھکی ہوئیں دنیا ہے ظالموں کی طرفدار آج بھی!

مٹ جائیگا جہاں سے وہ ہو فرد یا کہ قوم
اسلام سے ہے جو کوئی بیزار آج بھی!

ترجمہ: یحییٰ صدیقی

"ایک رات"

جنگِ عظیم کی تاریخ کا ایک پُراسرار ورق ــــ رُوح (نسمہ) خیال اور تصوّر کی معجز نمایاں ــــ جہاں ڈیلوٹیسی اور ٹینکوں کی قوتیں شل ہوجاتی ہیں ــــ دورِ حاضر کی "طلسمِ ہوش ربا" جس کے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں ــــ اس مادّی دَور میں بھی آدمی کی باطنی قوتوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا! کاش......

DENNIS WHEATLEY کا ناول STRANGE CONFLICT (انوکھی جنگ) دوسری جنگِ عظیم سے متعلق ہے حکومت برطانیہ کے صاحب اقتدار افراد پریشان ہیں، کہ جو بحری بیڑے انگلستان سے امریکہ اور امریکہ سے انگلستان آتے جاتے ہیں۔ گو ہر بار ان کا راستہ بدل دیا جاتا ہے پھر بھی کسی نہ کسی طرح نازیوں کو ان کا پتہ چل جاتا ہے، اور بیڑے غرق کر دیئے جاتے ہیں۔ ڈی رشلو نامی ایک ڈیوک اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب نظریہ پیش کرتا ہے۔ کہ کالے جادو کے ذریعہ نازی راستہ معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم سو جاتے ہیں۔ ہماری روحیں جسم سے نکل جاتی ہیں۔ اور طویل مسافتیں طے کر کے پھر واپس لوٹ آتی ہیں۔ اس سفر میں جو کچھ روحیں دیکھتی ہیں اسی کو خواب کہتے ہیں۔ مشق سے یہ ممکن ہے کہ ہم جو کچھ دیکھیں اسے حرف بحرف یاد رکھیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قوتِ ارادی بہت زبردست ہو۔ خواب کو پوری طرح یاد رکھنے کی صلاحیت پیدا کر لینے کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ ارادہ کے مطابق خواب دیکھے جائیں۔ نازیوں نے کسی ایسے شخص کی خدمات حاصل کی ہیں۔ جو ارادہ کے مطابق خواب دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا "نسمہ" کسی نہ کسی طرح اس دستاویز کو پڑھ لیتا ہے جس میں بحری بیڑے کے راستہ کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اور اس کی اطلاع نازیوں کو کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بحری بیڑے مسلسل غرق ہو رہے ہیں۔

ڈی رشلو اپنے چار ساتھیوں کی مدد سے عامل اور اس کی سکونت کا پتہ چلاتا ہے۔ دونوں فریقوں کا "نجمی دُنیا" میں مقابلہ ہوتا ہے، نازیوں کے نمائندہ کو شکست ہوتی ہے اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد سے بحری بیڑوں کے غرق ہونے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ (یحییٰ صدیقی)

رچرڈ نے جو چیز دیکھی وہ بذاتہ بالکل دہشتناک نہیں تھی۔ عام حالات میں اس کے متعلق بھی قیاس ہو سکتا تھا کہ کوئی تابندہ کیڑا ہے اس لئے کہ وہ جگنو کی دمک کے برابر قرمزی سرخ روشنی کا صرف ایک نقطہ ہی تو تھا۔ لیکن اس وقت اس کو وہ انتہائی ہیبت ناک چیز معلوم ہوئی۔

جب سے ڈیوک نے مخفی عمل شروع کیے تھے رچرڈ کو اندازہ ہو گیا تھا۔ کہ ان کو خبیث ہستیوں کے حملہ کا شکار ہونا پڑے گا گذشتہ چند دنوں میں ان کو تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ کہ خود ان ہی کے محاذ پر ان کے خلاف جنگ ہو رہی ہے۔ شریر روحوں کی طرح جو باوجود بے قید ہونے کے ان کو مسلسل تنگ کر رہی تھیں۔ روشنی کا وہ نقطہ کسی فضائی ہیولیٰ کا پست مظہر بھی ہو سکتا تھا۔ اور ماورائی حلقے کے کسی خطرناک SOOTI کا مظہر بھی۔ جو اپنے دونوں ساتھیوں کی مدد کے لئے پہنچ گیا ہو۔ ایسی صورت میں اس کا اور ریکس کا جن کے پاس مدافعت کے لئے کوئی مخفی حربہ نہیں تھا مغلوب ہو جانا لازمی تھا۔

رچرڈ قیدی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹتے ہوئے چلایا "ریکس ہٹ جاؤ، دور ہٹ جاؤ، جلدی" ریکس جیسے ہی گھوما۔ اس کی نظر بھی اس پر پڑی۔ روشنی کا وہ نقطہ لیمو کے برابر ہو گیا تھا روشنی بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اور موم کی شمعوں کی لو بُری طرح بھڑک رہی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی شمعیں بجھ گئیں۔ لیکن تہ خانہ میں اندھیرا نہیں ہوا۔ بلکہ اس روشنی میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ روشنی کا حجم بھی پہلے سے بڑھ کر سیب کے برابر ہو گیا تھا مارے دہشت کے دونوں پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور بھاگنے لگے۔ لیکن ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ان کو پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ ان کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ تاریکی میں لپٹا ہوا بیس گز کا راستہ سو گز لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی قوتِ ارادی کا سارا زور لگا کر وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن بمشکل آدھا راستہ طے کر سکے ہوں گے کہ ریکس لڑکھڑایا اور چیخ مار کر گر پڑا۔

ریکس کو اٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے رچرڈ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وقت کی روانی رک گئی ہے۔ اس کے وزنی اور بے حرکت جسم کو اٹھاتے ہوئے وہ بدی کی طاقتوں کے خلاف استعمال کئے جانے والے منتر کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے وہ منتر کئی بار ڈی رشتو سے سنا تھا۔ لیکن اس کا دماغ جیسے ماؤف ہو چکا تھا۔ اور انتہائی کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی اس کو یاد نہیں آ رہا تھا۔

بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "خداوندا ہماری مدد فرما، خداوندا ہماری مدد فرما" اس کی دعا قبول ہو گئی اور اس کو ڈی رشتو کی یہ ہدایت یاد آ گئی کہ بدی کی طاقتوں سے بچنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ نیلے تموج کا تصور باندھا جائے۔ یہ تصور کہ نیلی روشنی کا بیضوی تموج احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور پیشانی کے اوپر ٹرنج والے نعل میں لگی ہوئی صلیب ہے۔ نعل اور صلیب دونوں آنکھوں سے ذرا اوپر تیز نیلی روشنی سے چمک رہی ہیں۔

نعل کا خیال آتے ہی اس میں نئی طاقت آ گئی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے ریکس کو کھڑا کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کہتا بھی گیا "نیلا تموج ریکس، نعل اور صلیب نیلے رنگ میں ان کا تصور باندھو"

"ہاں" ریکس نے بدقت سانس لیتے ہوئے کہا "ہاں" اور دونوں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن تعاقب کرنے والی طاقت اس آسانی سے اپنا شکار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی وہ ان کو واپس لے جانے کیلئے سارا زور صرف کئے دے رہی تھی۔

رفتہ رفتہ نیلی روشنی مدہم پڑنے لگی اور ان کے سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے مقناطیسی قرمزی سرخ روشنی اس پر پوری طرح غالب آ گئی۔ ان کو ایسا معلوم ہوا کہ سیڑھیاں اوپر ہی اوپر لامحدود فضا تک چلی گئی ہیں۔ اور پیر اتنے وزنی ہو گئے ہیں کہ ایک سیڑھی بھی چڑھنا ناممکن ہے۔ ایک نئی آفت یہ آئی۔ کہ ان کو اپنے شانوں پر بھی دباؤ محسوس ہونے لگا۔ ان کی کمر دوہری ہو گئی اور چند سیڑھیوں کے سوا ان کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"خداوندا ہماری مدد فرما، خداوندا ہماری مدد فرما" رچرڈ نے پھر دعا مانگی۔ انھوں نے اپنے جسم میں پھر کچھ طاقت محسوس کی۔ تین سیڑھیاں وہ چڑھ بھی گئے۔ مگر چوتھی سیڑھی پر وہ دونوں کے دونوں گر پڑے۔

قرمزی سرخ روشنی ان کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ان پر چھا گئی۔ ان کے دل کی دھڑکن بے ربط ہو کر آہستہ آہستہ مدہم پڑنے لگی۔ یکایک روشنی قرمزی سیاہ ہو گئی اور دونوں کو محسوس ہونے لگا کہ کوئی دم میں ان کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ یکایک ان کے جامد حواس نے سائمن کی آواز سنی۔ وہ اوپر کی سیڑھی سے پکار رہا تھا — "رچرڈ — رکس!"

اور پھر رچرڈ نے وہ الفاظ سنے جن کو یاد کرنے کی وہ نہ جانے کتنی کوشش کر چکا تھا — فوراً ہی روشنی دھندلی پڑ گئی۔ ان کے اعضا اس کے دباؤ سے آزاد ہو گئے اور دوسرے لمحہ سائمن ان کو اوپر کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے خوف سے سرد جسم لئے لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے کمرے سے گذر کر لائبریری میں داخل ہوئے۔

ڈی رشلو حصار کے اندر سو رہا تھا۔ میری لو سونے کیلئے تیار اس کے قریب بیٹھی تھی۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے، اس نے خشمگیں انداز میں ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یکایک اس کی نظر ان کے دہشت زدہ سفید چہروں پر پڑی اور اس نے تند لہجہ میں پوچھا "کیا ہوا؟" جلدی سے دروازہ بند کر کے اور اس پر صلیب کا نشان بنا کر سائمن نے جواب دیا۔ "جب رکس اور رچرڈ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی۔ تو مجھے خیال آیا کہ کچھ گڑبڑ تو نہیں ہو گئی ہے۔ اس لئے نیچے گیا۔ اور ان کو بڑی پریشان کن ابتری میں پایا۔"

رچرڈ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "قیدیوں نے چپ سادھ لی تھی۔ اس لئے ہم نے طے کیا کہ ان کو ننگا کر کے رات بھر سردی اور نمی میں اکڑنے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ جاپانی کے کپڑے ہم اتار چکے تھے۔ دوسرے کے کپڑے اتارنے والے ہی تھے۔ کہ اس خبیث نے جس سے ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے۔ غالباً ہمارا ارادہ بھانپ لیا۔ اور یا تو بذات خود اور یا اپنے کسی معمول کے ذریعہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا —— میں زندگی بھر کبھی اتنا خوفزدہ نہیں ہوا۔"

"میرا بھی یہی حال ہے" — اور رکس سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ "اگر سائمن نے اس گھناؤنی قرمزی روشنی سے ہم کو نہ نکالا ہوتا۔ تو نہ جانے ہماری کیا گت اب تک بن گئی ہوتی۔"

"سائمن اللہ تم کو اچھا رکھے" میری لو نے کہا۔ "میں تم سے کہہ نہیں سکتی کہ اس معاملہ سے مجھے کتنی نفرت ہے، صرف یہ ایک خیال ہی کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر دشمن نہ جانے کیا کر دے۔ مجھے اس قدر دہشت زدہ کئے ہوئے ہے کہ بیان نہیں کر سکتی لیکن اب پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے ہم کو اس مرحلہ سے گذرنا ہی ہو گا۔"

"یقیناً" رکس نے کہا۔ "قصور ہمارا ہی تھا۔ ایک ایسے معرکہ میں تہ خانہ میں جانا ہی ہماری بیوقوفی کا بیّن ثبوت ہے، رات کا تو ذکر ہی کیا۔ دن میں بھی وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ آئندہ ہم کو خود ہی پہرے کی نگرانی رکھنا پڑے گی۔"

"بہتر یہ ہے کہ تم دونوں یہیں کپڑے بدل لو۔ میں کپڑے لائے دیتا ہوں۔ پھر ہم حصار کے اندر چلے جائیں گے۔" سائمن نے کہا لیکن انھوں نے اس کو تنہا کمرہ کے باہر جانے نہیں دیا۔ بلکہ تینوں مل کر گئے۔ جب رچرڈ اپنے کپڑے اتار رہا تھا۔ تو اس کو احساس ہوا۔ کہ اس وقفہ میں قیدی کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھما ہوا رہا۔

کوٹ پلنگ پر ڈال کر اس نے جیبیں ٹٹولیں۔ اوپر کی جیب سے کاغذات کا ایک پلندہ نکلا۔ ان کاغذات کو لئے ہوئے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ لائبریری میں واپس ہوا۔

ڈی رشلو کے سونے سے پہلے ہی سائمن اور میری لو نے حصار تیار کر لیا تھا۔ صرف دروازوں اور کھڑکیوں کو مہر لگانا تھی جو

عرصہ میں رچرڈ اور ریکس نے کپڑے بدلے سائمن نے یہ عمل بھی مکمل کر دیا۔ اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے سب کے سب اپنے بستروں میں جو پانچ کنارے والے تارے کی شکل میں اس طرح بچھائے گئے تھے، کہ سر وسط میں رہیں، اور پیر باہر کی طرف، گھس گئے بستروں پر بیٹھ کر انہوں نے قیدی کی جیب سے نکلے ہوئے کاغذات کا معائنہ شروع کیا۔

آزاد فرانس کی فوج کے سپاہی رووڈن کے نام کا ایک پاسپورٹ تھا۔ اور اس کے علاوہ چند خطوط، جو تین مختلف عورتوں نے اس کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں محبت اور دوسری کاروباری باتوں کی ایسی آمیزش تھی، کہ میری لو جو فرانسیسی زبان کی ماہر ہونے کی وجہ سے وہ خطوط پڑھ رہی تھی۔ ان کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکی۔ ان کا ترجمہ سننے کے بعد رچرڈ نے کہا۔

"معاملہ بالکل صاف ہے۔ یہ خطوط فرانسیسی زنان بازاری نے جو لندن کے ویسٹ اینڈ میں اپنا کاروبار چلا رہی ہیں لکھے ہیں۔ یہ شخص ان افراد میں سے ہے جو ایسی عورتوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ ان کے لئے رہائش اور لباس کا انتظام کر کے باقی ساری آمدنی پر قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ ان کے فائدہ کیلئے خود کو بیچتی رہتی ہیں۔ محبت اور کاروبار کا یہ انوکھا امتزاج، اسی وجہ سے ہے۔"

"اوہ! اچھا یہ بات ہے۔ جب ہی ایک خط میں تیس شلنگ جرمانہ کا بھی ذکر ہے" سائمن نے کہا۔ "مگر جرمانہ کی وجہ نہیں دی گئی ہے غالباً کسی کو مخاطب کرنے کی علت میں پولیس نے پکڑا ہو گا۔"

"حرام زادہ، بدمعاش" ریکس نے کہا۔ "اگر مجھے پہلے سے اس کے کاروبار کا علم ہوتا۔ تو اس کا ایسا چہرہ بگاڑتا، کہ کوئی کھوسٹ بڑھیا بھی اس کی مرضی کے مطابق ذرا سا بھی کام کرنے کیلئے تیار نہ ہوتی ـــــ لیکن ان خطوط سے ہمیں مدد کیا ملی؟"

"کچھ بھی نہیں! اس لئے ان کو اٹھا کر رکھ دو، اور تھوڑی دیر سو لو، پہلی باری کس کی رہے گی؟" میری لو نے کہا۔

"میری" ریکس اور سائمن نے ایک ساتھ کہا۔

"پہلی باری سائمن کی رہی" میری لو نے کہا "آج کے نامعقول تجربہ کے بعد رچرڈ اور ریکس کو اچھی طرح سو لینا چاہیئے، اگر ایک بجے تک سائمن کی باری ہو اور ایک سے تین تک میری، تو دونوں کو پانچ گھنٹے سونے کا موقع مل جائے گا۔ پھر تین سے پانچ تک ریکس کی باری ہوگی اور پانچ سے سات تک رچرڈ کی۔"

اس تصفیہ کو سب نے مان لیا اور سائمن کے سوا باقی لوگ سو گئے۔

اپنی ڈیوٹی کے دوران میں سائمن بڑی دیر تک حصار کے اندر بیٹھا پیشنس کھیلتا رہا۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ سر اٹھا کر پُر سکوت کمرہ کا جائزہ لے لیتا۔ مکان کے کسی حصہ میں کواڑوں کی بیزار کن "چوں چوں" کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مرتبہ باورچی خانہ میں کسی چینی کے برتن کے ٹوٹنے کی آواز بھی آئی۔ اس کے سوا اس کے پہرہ میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ایک بجے اس نے میری لو کو جگا دیا۔

اس نے سائمن کو شب بخیر کہا، شمعیں ٹھیک کیں، عمل کئے ہوئے پانی کے برتنوں، نعل اور جڑی بوٹیوں کو دیکھ کر اطمینان کر لیا۔ کہ سب ٹھیک ہیں۔ اور کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ بہت سی بڑی اور خوبصورت آنکھوں والی عورتوں کی طرح اسکی نگاہ بھی کمزور تھی۔ اور وہ پڑھتے وقت چشمہ استعمال کرتی تھی۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔ کہ وہ چشمہ ساتھ رکھنا بھول گئی تھی۔ چونکہ کتاب کا ٹائپ جلی تھا۔ اس لئے کچھ دیر تک تو وہ بغیر چشمہ کے پڑھتی رہی لیکن پھر اسے بار محسوس ہونے لگا۔ اور مجبوراً اس نے کتاب رکھ دی۔

بیکاری کی وجہ سے اسے اکتاہٹ ہونے لگی اور وہ سوچنے لگی۔ کہ پیشنس کھیل کر وقت گذارے۔ لیکن مشکل یہ تھی، کہ تاش لینے کے لئے۔ اس کو سائمن کے اوپر سے جانا پڑتا تھا۔ اور ممکن تھا، کہ اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اس لئے یہ ارادہ اس نے ترک کر دیا۔

دروازے کی "دھڑ پھڑ" (کواڑوں کے بلنے جلنے کی آواز) بند ہو چکی تھی۔ اور سارے گھر پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ آتشدان میں آگ

روشن تھی۔ اور شمع کی لو ساکن تھی۔ کمرہ گرم اور آرام دہ تھا۔ اور اس حصار میں بیٹھی ہوئی نہ صرف وہ خود کو بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی محفوظ کر رہی تھی۔

اس کو معلوم تھا کہ وہ جسمانی طور پر سو رہے تھے۔ لیکن ان کے "نسمے" بیدار تھے۔ اور جسموں کے قریب ہی منڈلا رہے تھے۔ کیونکہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر ان کے "نسمے" بھی حصار کے باہر جانے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

ہٹلر کے خلاف اپنی بے ہتھیار جنگ کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا بغیر چشمہ کے پڑھنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں یونہی بوجھل ہو رہی تھیں۔ سوچ بچار نے اسے اور تھکا دیا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُسے بڑا سکون محسوس ہوا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ پہلا سا سناٹا بدستور چھایا ہوا تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ اس لئے اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنے ہاتھوں سے دونوں گھٹنے تھامے، سر سینہ پر جھکائے وہ تقریباً سو گئی۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ کمرے کا ٹمپریچر آہستہ آہستہ خوشگوار گرمی سے بے آرام خنکی میں بدل رہا ہے۔ اور وہ خنکی اس کے ہر ہر عضو میں سرایت کرتی جا رہی ہے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ لیکن چونکہ آگ بجھ چکی تھی۔ اور شمعوں کی سیدھی روشنی مدھم پڑ چکی تھی۔ اس لئے کمرہ میں اندھیرا سا ہو گیا تھا۔ اور اس کو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جب اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں۔ تو اس نے دیکھا کہ ڈی رشلو کے سینے سے ایک بہت بڑی چمگادڑ چمٹی ہوئی ہے۔ اور اس کے دانت ڈیوک کی گردن میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اس منظر نے اس پر سکتہ سا طاری کر دیا۔ اور خوف کے مارے اس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ بہ دقت تمام اس نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ اور ایک چیخ ماری۔ سائمن۔ رچرڈ۔ اور ریکس اٹھ بیٹھے۔ لیکن ڈی رشلو کراہ کر رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بیدار ہونے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجبوراً ریکس نے اس گندے جانور کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ چمگادڑ نے ڈیوک کی گردن چھوڑ دی اور ریکس کے ہاتھوں سے نکل کر اپنے پر پھیلائے اور میری لو پر جھپٹا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ رچرڈ نے اپنی پوری طاقت سے اپنا ہاتھ مارا۔ چمگادڑ سینہ پر چوٹ کھا کر نیچے گر پڑا۔ اور چند سیکنڈ تک پھڑ پھڑانے کے بعد سات پھن والا سانپ بن گیا۔

سائمن ڈیوک کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر حصار سے باہر نکلتے ہوئے چلایا "حصار کے باہر آ جاؤ" تم سب کے سب، نکل آؤ حصار کے باہر"

سانپ نے کنڈلی ماری اور پھنکار مار مار کر اپنے ساتوں پھنوں سے بیک وقت ہر طرف حملہ کرنے لگا۔ میری لو لوٹتی ہوئی اس کی زد سے باہر ہو گئی۔ ریکس کود کر حصار کے باہر نکل آیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ سنبھل سکے، سانپ نے ایک پھن سے اس کو ڈھانپ لیا۔ لیکن حملہ نہیں کیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ کس پھن سے حملہ کرنا مناسب ہوگا۔

"میرے اللہ بچا!" اس کے منہ سے نکلا اور اسی لمحہ اس نے محسوس کیا کہ اس کا ایک ہاتھ جمع کئے ہوئے پانی کے برتن کو چھو رہا ہے۔ اپنی انگلیاں پانی میں ڈبو کر اس نے سانپ کی طرف اپنا ہاتھ جھٹکا۔ چند قطرے سانپ پر گرے اور بالکل ویسی ہی آواز آئی جیسی گرم دھات پر پانی گرنے سے آتی ہے۔ سانپ نے جلدی سے اپنا پھیلا ہوا پھن سمیٹ لیا اور رچرڈ لوٹ کر حصار کے باہر آ گیا۔

اب پانچوں حصار کے باہر تھے۔ لیکن ریکس رچرڈ اور میری لو مارے دہشت کے کانپ رہے تھے۔ صرف سائمن مطمئن تھا۔ اس لئے کہ جادو سے تھوڑا بہت واقف تھا۔ اور اس وجہ سے اسے معلوم تھا۔ کہ وقتی طور پر وہ محفوظ تھے۔ کیونکہ حصار کے ذریعہ خبیث

روحوں کو اندر داخل ہونے اور داخل ہونے کے بعد باہر آنے سے روکا جا سکتا تھا۔ جونہی سائمن ڈی رشتو کو حصار کے باہر لایا، وہ جاگ اٹھا اور ایک ہی نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ کیسے خطرہ سے وہ بچ نکلے تھے۔ اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے عمل کئے ہوئے پانی کی ایک پوری بوتل نکالی اور حصار کے اندر پانی پھینکنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ لاطینی زبان میں کوئی عمل بھی پڑھتا گیا۔

کچھ دیر تک تو وہ ادھر ادھر ہٹ کر پانی سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بالآخر ایک غضبناک پھنکار مار کر سبز بھاپ بن کر غائب ہو گیا۔۔۔ ان کو اپنی حالت پر قابو پانے میں کافی وقت لگا۔ آخر کار ڈی رشتو نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ تھا کیا ہوا؟"

میری لو نے کہا۔ "کمبخت زبردست چمگادڑ بن کر تمہارے سینے سے چمٹ گیا تھا۔ اور اپنے دانت تمہاری گردن میں گاڑ دیئے تھے"

"تمہاری گردن پر دو سوراخ بھی تو نظر آ رہے ہیں" سائمن نے کہا۔

ڈی رشتو نے ہاتھ لگا کر دیکھا اور کہا "ہاں محسوس تو ہو رہے ہیں۔ اس کو ٹھیک کرنے کا عمل اسی وقت کر دینا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ شیطان حصار میں داخل کیسے ہوا۔ رات کو بھی بچاؤ تیار کرتے وقت کوئی لغزش تو نہیں ہو گئی؟"

"نہیں تو۔ میں نے اور سائمن نے حصار تیار کیا تھا۔ اور پوری پوری احتیاط برتی تھی" میری لو نے کہا

"ممکن ہے کہ حصار میں کوئی نجس چیز آ گئی ہو" ڈیرک نے کہا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوا" رچرڈ نے جواب دیا۔ "اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ ایک قیدی کے پاس سے کچھ کاغذات نکلے جو ہم ساتھ لے آئے اور دیر تک ان کی جانچ پڑتال کرتے رہے۔۔۔ میں بہت شرمندہ ہوں"

"ایک حد تک میری بھی غلطی تھی" میری لو نے کہا۔ "میں اپنا چشمہ ساتھ رکھنا بھول گئی اس لئے زیادہ دیر تک پڑھ نہیں سکی۔ اور کوئی مصروفیت نہ ہونے کی وجہ سے میری آنکھ لگ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبل اس کے کہ میں تم لوگوں کو متنبہ کر سکتی، اس نے شکل اختیار کر لی۔۔۔ مجھے بھی بڑی ندامت ہے"

"بلاوجہ تم اور رچرڈ خود کو الزامات دے رہے ہو؟" ڈیرک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سارا قصور دراصل میرا ہے۔ میں نے کہا تھا باہر نہ جاؤں گا۔ گر میں اپنے وعدہ پر قائم رہتا۔ تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور قبل اس کے کہ ملعون مجھ پر حسد کرتا میں اپنے جسم میں داخل ہو جاتا۔ لیکن سو جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں"

"بڑی بے احتیاطی کی تم نے" سائمن نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اور اگر میری لو نے وقت پر نہ جگا دیا ہوتا۔ تو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا۔۔۔ لیکن بحالت موجودہ کامیابی میری رہی۔ اس لئے کہ جس چیز کی تلاش میں میں گیا تھا۔ وہ مجھے مل گئی۔۔۔ میں نے اس جگہ کا پتہ لگا لیا جہاں سے ہمارا دشمن عمل کر رہا ہے۔۔۔ ہاں اس مقام کا محل وقوع مجھ کو معلوم ہو گیا جس کو میرے اور میری لو کے نسمون نے دیکھا تھا۔ جزائر غرب الہند کا ایک جزیرہ ہے جس کا نام ہے "ہیٹی" وہیں ہمارا دشمن رہتا ہے۔ اور غالباً "ووڈو" کا کوئی بڑا پجاری ہے۔ اگر ہم اس خطرہ سے واقعی چھٹکارا پانا چاہتے ہیں تو ہم کو وہاں جانا پڑے گا۔"

روحِ انتخاب

۱۔ **فقہ**:۔ بلکہ اسلام کی سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا' امام ابویوسف انصاری (۱۸۲ھ ہجری) نے لکھی' یہ فقہ حنفی کے دوسرے بازو تھے۔ یہ کتاب "اماَلی" کہلاتی تھی۔ کیونکہ امام موصوف نے اس کو املا کرایا تھا۔ یہ اماَلی تین سو سے زیادہ جلدوں میں قلم بند ہوئے تھے۔

۲۔ **مضامین مختلفہ**:۔ یہ عام انسائیکلوپیڈیا میں ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی اس قسم کی کتاب نضر بن شمیل (۲۰۴ھ ہجری) نے لکھی۔ اس کا نام "کتاب الصفات" تھا۔ اس کے سات حصے تھے۔ یہ اسلام میں دوسری انسائیکلوپیڈیا تھی۔ اس کے بعد ابن قتیبہ دینوری (۲۷۶ھ) کی "عیون الاخبار" ہے جو دس کتابوں یا بابوں میں ہے اور چھپ چکی ہے۔ اس کے بعد احمد بن ابان اندلسی (۳۸۲ھ) کی "العالم والمتعلم" تھی۔ یہ سو جلدوں میں تھی۔ اور اجناس پر مرتب تھی۔ آسمان سے لے کر ذرہ تک ہر چیز کا بیان تھا۔ اس کے بعد راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) کی "محاضرات" تھی۔ اس میں اخلاقی اور اجتماعی مباحث تھے۔ اس کے بعد میدانی (۵۱۸ھ) ... کی "اسامی فی الاسامی" تھی۔ جس میں شرعیات' حیوانات' علویات اور سفلیات کے تحت مذاہب عالم' آسمان' فضا' زمین کا جغرافیہ طبعی اور جانوروں کی غذاؤں پر مفید معلومات جمع تھے۔

۳۔ **شاعری**:۔ سب سے پہلے شاعری کی انسائیکلوپیڈیا ابو عمرو شیبانی (۲۰۶ھ) نے مرتب کی۔ اس نے تمام قبائل کے دور دیں اشعار جمع کئے۔ ان قبائل کی تعداد ۸۰ کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ اس لئے کتاب کی جلدیں بھی اسی قدر تھیں۔

۴۔ **انساب**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا محمد بن حبیب نے لکھی۔ جو ابن الاعرابی اور قطرب وغیرہ کا شاگرد تھا۔ اس کا سنہ وفات ۲۴۵ھ ہجری ہے۔ اس نے فتح بن خاقان کے لئے "القبائل الکبیر والایام" کے نام سے متعدد جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی جو اسلام میں چوتھی انسائیکلوپیڈیا تھی۔ اس کا اب پتہ نہیں ہے۔ ندیم مصنف فہرست نے اس کا ناقص نسخہ دیکھا تھا۔ جو تقریباً بیس جلدوں میں تھا۔ ہر جلد ۲۰۰ سے زیادہ صفحات کی تھی اور ۲۰ صفحات میں فہرست تھی۔ ندیم نے لکھا ہے کہ پوری کتاب تقریباً ۴۰ جلدوں میں ہوگی۔ احمد بن جابر بلاذری (۲۷۹ھ) نے "المستقصیٰ فی الانساب والاخبار" چالیس جلدوں میں لکھی تھی۔ لیکن ان کی وفات کی وجہ سے تمام نہ ہو سکی۔

۵۔ **جغرافیہ**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ابن رستہ نے "الاعلاق النفیسہ" کے نام سے لکھی۔ یہ ۲۹۰ھ کی تالیف ہے۔ اور اسلام میں پانچویں انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی ساتویں جلد "تقویم البلدان" چھپی۔ اور پوری کتاب برٹش میوزیم میں موجود ہے ......!

۶۔ **علوم و فنون**:۔ کی سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا حکیم ابونصر فارابی (۳۳۹ھ) نے لکھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارابی ایک خاص قسم کی انسائیکلوپیڈیا کا موجد تھا۔ فارابی کی اس کتاب کا نام فہرست ندیم میں "مراتب العلوم" لکھا ہے — فارابی کے بعد ابوعبداللہ محمد بن احمد خوارزمی (۳۸۷ھ) نے "مفاتیح العلوم" لکھی۔ اس کتاب میں دو مقالے ہیں۔ جن میں ۱۵ باب اور ۹۲ فصلیں ہیں۔ پہلے مقالہ میں ۶ باب اور ۵۲ فصلیں ہیں۔ ان میں فقہ' کلام' نحو' کتابت' شعر' اخبار کا تذکرہ ہے۔ دوسرے مقالہ میں ۹ باب اور

اہم فصلیں ہیں۔ ان میں فلسفہ، منطق، طب، عدد، ہندسہ، نجوم، موسیقی، حیل (MECHANIC'S) اور کیمیا کا ذکر ہے، یہ نادر کتاب سنہ ۱۸۹۵ء میں لیڈن میں چھپی۔ دلاٹن (G. von. Vloten) نے تہذیب کی خدمت انجام دی ہے۔

خوارزمی کے بعد ایک بڑی ضخیم کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ اس کے مصنفین میں دو شخصوں کے نام موسوم ہیں، (۱) علی بن عقیل بغدادوی (۲) ابو الوفا حنبلی (۵۱۳ھ) اس کتاب کا نام "کتاب الفنون" تھا۔ اور چار سو ستر جلدوں میں تمام ہوئی تھی۔ جلدوں کی ضخامت کچھ بھی ہو تاہم تعداد تعجب انگیز ہے۔ اس کے بعد نجم الدین احمد بن حمدان بن شبیب حرانی (۶۹۵ھ) نے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی جس کا نام "جامع الفنون" تھا۔ کشف الظنون میں اس کا نام جامع العلوم لکھا ہے۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے —— حرانی کے بعد جمال الدین وطواط نے "مباہج الفکر" کے نام سے ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی۔ مصنف کا سال وفات (۷۱۸ھ) ہے اس کے چار حصے ہیں، پہلے میں علم ہیئت، دوسرے میں جغرافیہ، تیسرے میں حیوانات اور چوتھے میں نباتات کا ذکر ہے۔ اس کے مختلف اجزاء برلن، مصر اور حلب میں ہیں۔ وطواط کے بعد شرف الدین اسمٰعیل یمنی (۸۳۷ھ) نے "عنوان اشرف" کے نام سے فقہ، نحو، تاریخ، عروض اور قوافی کی ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کی۔ اس کے متعدد نسخے برٹش میوزیم، وانا، لندن اور مصر میں موجود ہیں۔ (ان کے علاوہ بھی اور چند انسائیکلوپیڈیا ئیں لکھی گئیں)

۷۔ **فلسفہ**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا چوتھی صدی کے وسط میں ایک جماعت نے مرتب کی۔ اس کا نام "رسائل اخوان الصفا" ہے اخوان الصفا کے بعد فلسفہ کی دوسری انسائیکلوپیڈیا بو علی سینا (۴۲۸ھ) نے ۱۸ جلدوں میں لکھی جس کا دوسرا حصہ طبعیات "کتاب الشفا" کے نام سے موسوم ہے اور عام طور پر متداول ہے۔ یہ پوری کتاب مصر کے کتب خانہ خدیوی میں موجود ہے۔

۸۔ **ادب**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا اسحاق بن ابراہیم فارابی (تقریباً ۳۵۰ھ) نے دیوان الادب کے نام سے ۲ جلدوں میں لکھی، یہ لندن اور آکسفورڈ وغیرہ میں موجود ہے۔ پہلے اسماء میں بحر اخیال اور سب کا اشعار سے ثبوت دیا ہے۔ ابو سعید محمد بن جعفر نے اسی نام سے دس جلدوں میں اس پر اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد نشوان بن سعید حمیری (۵۷۳ھ) نے اٹھارہ جلدوں میں "شمس العلوم" تصنیف کی —— ان کے علاوہ صلاح الدین صفدی (۷۶۴ھ) نے "تذکرہ صلاحیہ" ۳۰ جلدوں میں، محمد بن احمد شیبانی نے "مستطرف" اور شہاب الدین قلقشندی (۸۲۱ھ) نے "صبح الاعشیٰ" لکھیں۔

۹۔ **موسیقی**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ابو الفرج بن حسین اصفہانی نے "کتاب الاغانی" کے نام سے لکھی۔ مصنف کا سال وفات فہرست ندیم میں ۳۶۰ہجری لکھا ہے۔ اور ابن خلکان میں ۳۵۶ہجری کی تصریح ہے۔ یہ کتاب تقریباً پچاس برس میں مکمل ہوئی ابن ندیم کے بیان کے مطابق دس ہزار صفحات میں تھی۔ اس وقت اس کے ۲۱ حصے تقریباً چار ہزار صفحات میں شائع ہو چکے ہیں —— اس کتاب میں بیسیوں خلفاء، شاعروں، مغنیوں، عاشقوں، سپہ سالاروں اور عرب کی اکثر عرب قبائلوں، قبیلوں اور ناموروں کا تذکرہ ہے جاہلیت اور اسلام کے بہترین اشعار درج ہیں۔ رہنے سہنے، نکاح، طلاق اور جنگ کے طریقے اور ہر قسم کے حالات فراہم کئے ہیں مصنف صرف مؤرخ ہی نہیں بلکہ ناقد بھی ہے۔

۱۰۔ **تجارت**:۔ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ابو الفضل جعفر بن علی دمشقی نے "الاشارہ الی محاسن التجارہ" کے نام سے لکھی۔ مصنف خلافت عباسیہ کے تیسرے دور (۳۳۴ھ سے ۴۴۷ھ) کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اس نے اچھے برے سامان، اقسام، متاع واضح قیمتی پتھر، کپڑے، فرش، موسمی پیداوار، زیتون، آٹا، گھوڑے، خچر، سواریاں، چوب، زبانی یا ترکیب سے روپیہ لینا، مختلف قسم کے تاجروں کو مختلف نصیحتیں، یہ اور اسی قسم کے عنوانات پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۳۱۸ھ میں مصر میں چھپا ہے۔

۱۱۔ **اعراب**:۔ یعنی قرآن مجید کے اعراب کی پہلی انسائیکلو پیڈیا ابوطاہر صقلی ([illegible] ہجری) نے نو جلدوں میں لکھی۔ اس کے بعد ابوالحسن بن ابراہیم غزنوی ([illegible]) نے دس جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی پھر شہاب الدین احمد بن یوسف حلبی ([illegible]) نے ایک جامع کتاب تیار کی اس میں پانچ علوم، اعراب، حرف، لغت، معانی و بیان جمع تھے۔

۱۲۔ **اسلام**:۔ کی انسائیکلو پیڈیا "مفید العلوم" کے نام سے چھٹی صدی کے نصف اول میں لکھی گئی، یہ ایک جلد میں ہے۔ اور ۲۳ کتابوں (بابوں) پر منقسم ہے، قوانین، ممالک، عقائد، حقوق، اخلاق، تاریخ، سیاست، عجائب فطرت، خواص جلاد، مناظرہ، لڑائیاں جہاد، سب کو لیا ہے۔

۱۳۔ **تفسیر**:۔ کی انسائیکلو پیڈیا امام فخر الدین رازی ([illegible]) نے مفاتیح الغیب کے نام سے لکھی۔ یہ تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے ابن خلکان کی تحریر کے مطابق یہ ناتمام ہے۔ تاہم اس میں اکثر علوم آگئے ہیں۔ اس کی ترتیب خاص امام صاحب کا اختراع ہے، یہ طرز پہلے نہ تھا ۸ ضخیم جلدوں میں یہ کتاب چھپی ہے۔

۱۴۔ **سیاسیات و آداب**:۔ کی مخطوط انسائیکلو پیڈیا۔ ابن فضل اللہ دمشقی ([illegible]) نے لکھی۔ اس کا نام "التعریف بالمصطلح الشریف" ہے۔ کاتبات کے مراتب، عہد ناموں، خزانوں وغیرہ کا دستور، ہر سلطنت کے حدود اور آبادیاں، ڈاک خانے، نامہ بر کبوتر، جہاز مینارے اور اسی قسم کے تمام علومات ۲۷۴ صفحات میں جمع کئے ہیں۔ مصر میں اس کا ایک نسخہ ہے۔ قاضی حسین سمرقندی نے [illegible] میں اسی طرح کی ایک انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی۔ اس کا نام "لطائف الافکار" ہے۔ اس کے پانچ باب ہیں۔ پہلے میں سیاسیات، دوسرے میں تاریخ اکابر رجال، تیسرے میں ادبیات، چوتھے میں اخلاق حسنہ، پانچویں میں عجائب المخلوقات کا بیان ہے اس کا ایک نسخہ وائنا میں ہے۔

۱۵۔ **یورپ کی انسائیکلو پیڈیا**:۔ آج یورپ میں اسلام کی انسائیکلو پیڈیا لکھی جاتی ہے۔ لیکن اب سے چھ سو برس پیشتر ابن فضل اللہ دمشقی نے یورپ کی انسائیکلو پیڈیا لکھی تھی۔ جس کا نام "ممالک عباد الصلیب" تھا۔ اٹلی کے ایک "بندہ صلیب" لاماری نے اس کا اٹالین میں ترجمہ کر کے [illegible] میں مع اصل کے چھپوایا۔

۱۶۔ **تعریفات و مصطلحات**:۔ TECHNICAL TERMS کی انسائیکلو پیڈیا "مقالید العلوم فی الحدود والرسوم" کے نام سے غالباً سید شریف علی جرجانی ([illegible]) نے ابوالفوارس شاہ شجاع کیلئے لکھی۔ یہ جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ کہ سیوطی کی تصنیف نہیں ہے۔ سیوطی اس مصنف سے ایک صدی بعد پیدا ہوئے۔

۱۷۔ **تصوف**:۔ کی انسائیکلو پیڈیا "الناموس الاعظم" کے نام سے قطب الدین عبدالکریم گیلانی نے لکھی۔ اس کی چالیس جلدیں ہیں۔ متفرق حصے یورپ کے کتب خانوں میں اور چند مصر میں ہیں۔

۱۸۔ **علوم اسلامیہ**:۔ کی انسائیکلو پیڈیا "شیخ الاسلام" احمد بن یحییٰ تفتازانی حفید نے [illegible] میں لکھی۔ اس مجموعہ کا نام تفتیہ ہے، مصنف کے پردادا علامہ سعد الدین تفتازانی تھے۔ اس لئے وہ حفید کہلاتا تھا۔ اس کتاب کا جلپی نے "موضوعات العلوم" میں ضمناً تذکرہ کیا ہے۔

۱۹۔ **طب**:۔ کی انسائیکلو پیڈیا داؤد بن عمر انطاکی نے لکھی، یہ نابینا تھا [illegible] میں وفات پائی۔ اس کتاب کو "تذکرہ انطاکی" بھی کہتے ہیں۔ اس میں ایک مقدمہ اور ۴ باب ہیں۔ مقدمہ میں علوم طب کی تعداد پہلے باب میں کلیات، دوسرے میں دواسازی کے قوانین تیسرے میں جڑی بوٹیوں کے خواص چوتھے میں امراض کا بیان ہے یہ کتاب مصر میں بار ہا چھپی ہے۔ تین جلدیں ہیں، کشف ظنون سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری باب حرف ظاء تک تک، ایک تاجر سے ہندوستان میں ضائع ہو گیا اور اب کتاب ناتمام ہے

(مولینا سعید انصاری۔ "ارمغان ادارہ معارف اسلامیہ لاہور")

ہماری نظر میں

اشتراکیت اور اسلام

"اشتراکیت اور اسلام" از:۔ مولانا مسعود عالم ندوی ——— حجم ۱۹۰ صفحات طباعت و کتابت دیدہ زیب ——— قیمت دو روپے آٹھ آنے ——— ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ چراغ راہ، لوٹیا بلڈنگ کراچی۔

علمی دنیا مولانا مسعود عالم ندوی سے اچھی طرح متعارف ہے۔ موصوف ندوۃ العلماء کے ان چند فاضل شاگردوں میں سے ہیں جن پر ندوہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ مولینا مسعود عالم صفِ اوّل کے عربی انشا پرداز ہیں، مصر و شام کے جریدوں اور مجلّوں میں آپ کے مضامین شائع ہو کر عرب ممالک میں قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ عربی زبان دانی اور انشا پردازی میں وہ "ہندوستان اور پاکستان کے شکیب ارسلان" ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں کسی شخص کا محض عالم و فاضل ہونا کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا جب تک علم و فضل اور دانش و آگہی کے ساتھ تقویٰ اور نیکوکاری بھی شامل نہ ہو، یوں ہونے کو مصر میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین بہت بڑے عالم ہیں۔ اور عربی زبان کے سب سے بڑے انشا پرداز! اور اب تو نحاس پاشا کی حکومت میں اُن کو وزارتِ معارف کا قلمدان بھی مل گیا ہے۔ مگر اس نابینا انشا پرداز اور فاضل (اعمیٰ فی الدنیا اعمیٰ فی الآخرۃ) کا زورِ قلم الحاد اور دہریت کی حمایت میں ہی صرف ہوتا رہتا ہے ——— مولینا مسعود عالم ندوی کو اللہ تعالیٰ نے علمی تبحر کے ساتھ نیکوکاری اور خدمتِ دین کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے۔ وہ کئی برس سے جماعتِ اسلامی کے پُرجوش مبلغ اور مخلص کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اور حق واضح ہونے کے بعد اس کے اعلان اور تبلیغ میں انہوں نے اپنے فاضل دوستوں اور بزرگ استادوں کی ناخوشی اور کبیدہ خاطری کی بھی پروا نہیں کی۔

"اشتراکیت اور اسلام" مولینا مسعود عالم ندوی کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔ جو اب سے کئی سال پہلے شائع ہوئی تھی اور چند مہینوں میں کسی خاص پروپیگنڈے کے بغیر ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اہتمام اور تصحیح کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

فاضل مصنف نے اس مختصر سی کتاب کی ترتیب میں بڑی کدو کاوش، جستجو، مطالعہ اور غور و فکر سے کام لیا ہے۔ اردو عربی کے علاوہ انگریزی کی ایک دو نہیں، ستائیس کتابیں پڑھی ہیں، جب کہیں جا کر یہ بلند پایہ تصنیف وجود میں آئی ہے۔ اس ایک کوزے کے لئے مصنف نے بلاشبہ بہت سے دریاؤں کی تہوں میں اُتر اُتر کر حقیقت حال کا جائزہ لیا ہے۔

مولینا مسعود عالم ندوی نے بعض شدید قسم کی غلط فہمیوں کو بھی دُور کیا ہے، جن میں عوام ہی نہیں خواص تک مبتلا ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ:۔

"اسلام صرف چند ظاہری رسموں اور اُٹھنے بیٹھنے کے مخصوص طریقوں کا نام نہیں۔ بلکہ عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم اخلاق و معاملات کو بھی شامل ہے۔ اس کا اپنا اچھوتا نظام معیشت ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی افراط و تفریط سے الگ

یہ اپنا عادلانہ نظامِ معیشت بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک مستقل تہذیب اور زندگی کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ جس کے دائرے سے نظامِ کائنات، سیاسیات اور معاشیات کا کوئی گوشہ باہر نہیں" عـه

اس کے بعد فاضل مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اشتراکیت بھی صرف معاشی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ یہ ایک مربوط نظامِ زندگی ہے۔ اور یہ قطعی "مہمل" غلط، ناقابلِ عمل، ساتھ ہی گمراہ کن اور خطرناک بھی ہے۔ کہ ایک آدمی ایک ہی وقت میں "اشتراکی" بھی ہو اور "مسلمان" بھی۔ زندگی کے ایک ہی نظام اور دستور پر ایک وقت میں عمل ہو سکتا ہے۔ دو کشتیاں جن کی سمت بھی مختلف ہو ان پر پیر رکھ کر کوئی شخص بھی پار نہیں اتر سکتا ـــــ یا تو وہ ڈوب جائے گا۔ یا پھر دوسرا پاؤں بھی کسی ایک کشتی پر رکھنا پڑے گا۔

فاضل مصنف کے یہ جملے آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں:-

"مگر بہت سے عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام رکھنے والے ایسے بھی ہیں۔ (اور آج کی صحبت میں روئے سخن زیادہ تر ان ہی کی طرف ہے) جنہوں نے ظاہر میں یہ دیکھ کر کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں سرمایہ داری اور سامراج (امپیریلزم) کے خلاف ہیں، دونوں مساوات کے داعی، رنگ و نسل کے دشمن، اور غریب طبقوں کی بھلائی چاہتے ہیں۔ یہ نتیجہ نکال لیا ہے۔ کہ دونوں ایک ہیں۔ اور مسلمان بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور اشتراکی بھی، اس کا قبلہ مکۂ مکرّمہ بھی ہو سکتا ہے ـــ اور سیاسی و معاشی دشواریوں کے حل کیلئے وہ ماسکو کا رُخ بھی کر سکتا ہے۔ وہ رسولِ عربی (اللہ کا آپ پر ہزار ہزار بار درود و سلام) کی پیروی بھی کر سکتا ہے، اور مارکس کو بھی اپنا معاشی و سیاسی رہنما تسلیم کر سکتا ہے ـــــ اشتراکیت اور اس کے نظام کی سرسری واقفیت بھی دو اور دو چار کی صورت میں یہ حقیقت نمایاں کرتی ہے کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی نقیض (CONTRARY) اور ضد ہیں۔ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ رسولِ کریم (اللہ کی آپ پر رحمت اور سلام) کا ماننے والا مارکس اور اس کی تعلیم پر نفریں بھیجنے پر مجبور ہو گا۔ اور مارکس کا ماننے والا رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہیں لا سکتا۔۔۔" (صفحہ ۸، ۹)

لوگوں کو دھوکا دینے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کیلئے اشتراکی یہ غلط فہمی پھیلاتے رہتے ہیں۔ کہ "مذہب" سرمایہ داری کا حامی ہے۔ حالانکہ

"اللہ اور مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے بے دخل کرنے کی ابتدا سرمایہ دار طبقہ ہی نے کی۔ اس طرح جہاں تک مذہب کے ساتھ بے اعتنائی بلکہ دشمنی کا تعلق ہے، سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ایک ہیں" (صفحہ ۱۶)

اسلام اور اشتراکیت کے تضاد پر لائق مصنف کا تبصرہ ملاحظہ ہو:-

"جہاں تک بنیادی تعلیم اور فلسفۂ حیات کا تعلق ہے۔ اشتراکیت اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں۔ اسلام کا آغازِ فکر خالقِ کائنات کے تصور سے ہوتا ہے۔ پہلے خالق کا تصوّر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور۔ اشتراکیت کا نقطۂ آغاز روٹی، اور مادہ ہے، پھر دونوں کہاں مل سکتے ہیں؟ اشتراکیت کی بنیاد نِری مادیت ہے، جو کبھی انسان کو تشفی نہیں دے سکتی۔ مادّیت کا لازمی نتیجہ "لذتیت" ہے۔ جس پر نظامِ اجتماعی کو کسی طرح استوار نہیں کیا جا سکتا۔ مادیت کا یہ طوفان سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جو اس وقت انسانیت کو درپیش ہے۔ اسلام اس کا سخت ترین مخالف ہے۔ وہ انسان کو حیوان نہیں دیکھنا چاہتا۔ خالقِ کائنات کا تصور انسانیت کی سب سے اعلیٰ قدر ہے اور اس کے تحت وہ تمام کائنات کی زندگی کو منظم کرنا چاہتا ہے ....." (صفحہ ۲۲، ۲۳)

عـه صفحہ ۵

کارل مارکس کے مختصر حالات زندگی کے علاوہ اس کتاب کو پڑھ کر سین سیمون (SIN SIMON) فوری اے (FARIER) رابرٹ اوون (ROBERT OWEN) اور لوئی بلان (LOVIS BLANEE) جیسی اہم شخصیتوں سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہو جاتی ہے جو اشتراکیت کے نقیب اور علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔

فاضل مصنف نے تحریر میں جذباتی انداز اختیار نہیں کیا، بلکہ دلیلوں، مثالوں اور تحریری شواہد اور حوالوں کے ذریعہ اشتراکیت کے سب سے زیادہ روشن پہلوؤں سے بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ یہ نظام انسانی معاشرت کے فطری تقاضوں سے مطابقت نہیں کرتا۔ اس کے دعوے کتنے کھوکھلے اور بے جان ہیں ــــ یہی سبب ہے کہ اشتراکی نظام نصف صدی بھی دنیا کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور خود اس کے علمبرداروں اور معتقدین نے اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی، کاٹ چھانٹ، کتر بیونت، ترمیم و اضافہ اور ردّ و بدل کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اور اشتراکی خود اپنے نظام سے منحرف ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔۔ "ذاتی ملکیت" وغیرہ جو چیزیں کل ان کے یہاں حرام، بلکہ جرم سمجھی جاتی تھیں، آج ان کو سند جواز عطا کر دی گئی ہے!

قدرِ زائد (SURPLUS VALUE) کے نظریہ کو مارکس کی معاشی تعلیم میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے اور اس کی مشہور کتاب "سرمایہ" کا موضوع ہی یہ "قدرِ زائد" کا نظریہ ہے۔ مولینا مسعود عالم ندوی نے وزنی دلیلوں سے مارکس کے اس شہرۂ آفاق تصور اور نظریہ کی کمزوری ظاہر کی ہے اور بتایا ہے، کہ یہ نظریہ واقعیت اور فطرت سے کتنی دُور ہے۔

مذہب کے ساتھ اشتراکیت کا کیا برتاؤ رہا۔ اس سلسلہ میں صاحب تحقیق مصنف نے انور پاشا کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا ہے جو غازی مرحوم نے بخارا کے کمیونسٹوں (یعنی مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے کمیونسٹ) کے نام لکھا تھا۔

"کیا یہ آپ ہی لوگ نہ تھے جنہوں نے بالشویکوں کی مدد سے بخارا کو تاراج کیا۔ بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہادیں اور ان کا بچا کھچا اثاثہ بھی لوٹ لیا۔ کیا یہ آپ ہی نہ تھے جنہوں نے مسجدیں اور مدرسے تباہ کئے۔ ہمارے غریب اور متوسط الحال طبقوں کو بورژوا اور جاگیردار کہہ کر ان کی زندگیاں تباہ کیں اور ان کی جائدادیں لوٹ لیں! محض روٹی کے ٹکڑوں کے لئے تم نے ملعون روسیوں کے ہاتھوں اپنا دین، ایمان اور اپنا ضمیر فروخت کر دیا۔۔۔" (صفحہ ۸۵)

لائق مصنف عربی زبان کا بہت بڑا انشا پرداز ہے۔ مگر اس کے باوجود اردو کی اس کتاب میں اُس کا انداز تحریر انتہائی سلیس اور سادہ ہے ـــ اس سادگی میں "پُرکاری" کا بھی کہیں کہیں رنگ آگیا ہے، مثلاً کارل مارکس نے ہیگل کے "جدلیاتی تصوّر" کو جس میں روحانی اور مابعد الطبیعاتی جھلک پائی جاتی ہے، بالکل معاشی سانچے میں ڈھال دیا۔ اس پر مصنف نے کس قدر دلنشیں اور حقیقت آفرین طنز کی ہے۔

"یہ تو مارکسیت کی کار فرما روح تھی، اسے مسلح کرنے کیلئے اس نے ہیگل کے اسلحہ خانہ سے جدلیت کی تلوار چرائی مگر اُس کی دھار اُلٹ دی۔"

"ACTION" کا صحیح ترجمہ عمل نہیں فعل ہے۔ صاحب نظر مصنف نے "RE ACTION" کا ترجمہ روش عام کے خلاف "ردِ فعل" ہی کیا ہے۔ اور "PROCESS" کو "عمل" لکھا ہے۔

آخر میں فاضل مصنف نے اسلام کے معاشی نظام سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ "سرمایہ داری اور اشتراکیت کی بے اعتدالیوں کے درمیان اسلامی نظام معیشت ایک اعتدال اور بیچ کی راہ ہے۔۔۔۔ ــــ اور۔۔۔۔ "اسلام ایک ایسا معاشی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے، کہ جہاں شخصی ملکیت بالکل تباہ نہ ہو اور سرمایہ داری بھی پیدا نہ ہوسکے۔ وہ معیشت میں

انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی خوبیاں جمع کرنا چاہتا ہے ......" (صفحہ ۱۸۵)
اس کتاب کے بعض گوشے زیادہ پھیلاؤ چاہتے ہیں۔ مصنف نے دیباچہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ "کاموں کی زیادتی اور صحت کی خرابی کے باعث تلاش اور جستجو کا حق ادا نہ کر سکا ۔۔۔ آئندہ اشاعت میں تشنہ بحثوں کی مزید تفصیل کر دی جائے گی"
"اشتراکیت اور اسلام" وقت کی بہت ہی اہم اور کارآمد کتاب ہے۔ موافق اور مخالف سب کے ہر کام کی چیز ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ اور بہت سی ذہنی الجھنیں دور ہو جائیں گی ۔۔۔ "فاران" کے قدر دانوں سے ہم اس کتاب کے پڑھنے کی پُرزور سفارش کرتے ہیں اور مصنف کی خدمت میں تبریک و تحسین کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

؎ چہ کند بے نوا ہمیں دارد

چُبھے ہوئے کانٹے

"چبھے ہوئے کانٹے" از حکیم ابو النظر امروہوی ۔۔۔ صفحات چوالیس (۴۴) صفحات۔ قیمت بارہ آنے ۔۔۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکیڈمی، ایبک روڈ، لاہور

جناب مولانا حکیم ابو النظر امروہوی صاحب فکر انشا پرداز ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے، دماغ نکتہ رس اور ذہن دقیقہ سنج پایا ہے ۔۔۔ پھر طبیعت میں جوش ہے، جولانی ہے اور معتاد سے زیادہ پھیلاؤ ہے۔ زیر تنقید کتابچہ حکیم صاحب موصوف کی موجودہ ذہنی کشمکش، حالیہ رجحانات اور قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔

یہ "چبھے ہوئے کانٹے" جو حکیم ابو النظر صاحب کے ذہنی شبہات ہیں، حقیقت میں "چبھنے ہوئے اور بہت تیز کانٹے" ہیں، جو یقین و ایمان کی رگ میں اگر مسلسل چبھتے رہیں اور اس چبھن اور کھٹک کا بروقت مداوا نہ ہو، تو پھر رفتہ رفتہ "انکار و بے یقینی" ۔۔۔ یا کم سے کم خطرناک قسم کے تذبذب اور تشکیک پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے ۔۔۔ استدلال، استنتاج اور فکر و تنقید کے اس فن میں ترقی کر کے ایک ذہین آدمی ڈیکارٹ، ہیوم اور کارل مارکس ۔۔۔ یا زیادہ سے زیادہ بوعلی سینا اور ابن رشد تو بن سکتا ہے مگر صدیق و بلال کے ذوقِ یقین سے محروم ہو جاتا ہے۔

جناب حکیم ابو النظر صاحب نے علماء اور اربابِ فکر کے سامنے کچھ شبہات پیش فرمائے ہیں۔ چند سوالات کئے ہیں، مذہب اور زندگی کی بعض ناہمواریوں کی نشاندہی کی ہے اور اپنی روحی تشنگی بجھانے کیلئے ان کے "آبِ حیوان" سے چند بوندیں مانگی ہیں ۔۔۔ مگر یہ "استفتا" اور "استفہام" آگے چل کر قیادت کے سجادے اور اجتہاد و رہنمائی کی مسند پر خود ہی بیٹھ گیا ہے۔ اور مریض نے طبیب حاذق بن کر گفتگو کی ہے۔

ان چند صفحوں میں متعدد نظریئے، تبصرے اور اتنے بہت سے سوالات پیش کئے گئے ہیں کہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب پریشاں ہو کر رہ گیا ہے، ہر سوال خود ایک مستقل "فلسفہ" اور "عقدے" کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر مسائل کے ذہن میں متضاد خیالات کا دریا موجزن ہے۔ ایک طرف یہ شور اشوری کہ "ایک چیز اور بھی سمجھ لیجئے۔ کہ میں ایک مذہب کی حیثیت سے اسلام کو نہیں سمجھنا چاہتا۔" (صفحہ ۳۰) اور دوسری طرف یہ بے نمکی کہ :- "قرآن نے کس جگہ بتایا تھا۔ کہ اخلاقی قدروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر سیاسیات میں الجھ سکنے کی اجازت ہے[1]۔"

کہیں قرآن کی طرف لوٹنے کی ضرورت کا احساس، اور کہیں ہوش نشینی کے بعد سیتی کا یہ عالم! کہا جاتا ہے "قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے ۔۔۔ حالانکہ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ صدیوں سے ان کا سلسلہ ہی بند ہو چکا۔۔ (صفحہ ۳۲) ۔۔۔ اور

[1] صفحہ (۳۱)

..... "قرآن وحدیث کی ترکیبی ساخت سے بھی اسلام کو قانونِ مکمل ثابت کرنا ممکن نہیں (صفحہ ۳۴) اسی قسم کا "تضاد" پوری کتاب میں بکھرا ہوا ہے، کتاب پڑھ کر اسی لئے کوئی خاکہ ذہن سے ٹھیک طور پر بن نہیں پاتا، کہ آخر مصنف چاہتا کیا ہے۔ شاید اس کا یہ سبب ہے کہ بعض دقیق اور نازک باتیں چند لفظوں میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لئے مفہوم گھٹ کر اور تشنہ ہو کر رہ گیا، یہ بھی ممکن ہے، کہ ہماری ناقص عقل اِن باریکیوں اور نکتوں کا احاطہ نہ کر سکی۔

مصنف نے بعض جگہ اس انداز میں شبہات پیش فرمائے اور سوالات کئے ہیں، کہ جیسے یہ خود اس کے افکار اور معتقدات ہیں۔۔۔ (خدا کرے ہمارا یہ خیال غلط ہو) یا کم سے کم طرزِ تحریر سے اس کے ذاتی رجحان کی تراوش ہوتی ہے ـــ فرماتے ہیں:-

"قرآن نے مختلف آیات میں طرح طرح سے روشنی ڈالی ہے، آخر ان گوشوں کو نمایاں کیوں نہیں کیا جاتا، اور کیوں "تقویٰ" "احسان" اور "خیر" وغیرہ کے صوفیانہ تخیل ہی کو اسلام کی روح قرار دے دیا گیا ہے۔ اور سایہ کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے..... " (صفحہ ۱۴، ۱۵)

مصنف جو ہم سے زیادہ تاریخ اسلام سے واقف ہے اس سے ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں، کہ صدیقؓ فاروقؓ عثمانؓ علیؓ حسینؓ (رضی اللہ عنہم) عمر بن عبدالعزیزؒ ابوحنیفہؒ امام مالکؒ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہؒ (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا "تقویٰ" "احسان" اور "خیر" کا تخیل کیا صوفیانہ تخیل تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو پھر ہم اس موضوع پر ایک حرف بھی زبان سے نکالنا نہیں چاہتے اور مخاطب کو سلام کرتے ہوئے گذر جائیں گے، اور اگر جواب "نفی" میں ہے تو پھر اس "شبہ" کو پیش کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی جبکہ اس دور گناہ و معصیت میں "اخلاق" کی اہمیت باقی نہیں رہی، اس انداز کے سوالوں اور شبہوں سے ان لوگوں کی جسارتوں کو کیا تقویت نہ پہونچے گی جو "تقویٰ" "نیکوکاری" اور "پاکبازی" کو عہد قدامت کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اور جن کا یہ خیال ہے، کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کو بس "روح" سے سروکار رکھنا چاہیئے۔ نماز میں یہ اٹھنا، بیٹھنا، رکوع و سجود، تسبیح و تہلیل، ماہ رمضان میں صبح سے شام تک بھوکا رہنا ـــ طواف کعبہ، دعائے ملتزم، وقوفِ عرفات، اور سعی بین الصفا والمروہ، اور رمی جمار، یہ سب ظاہری رسمیں ہیں!

ایک طرف یہ مطالبہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے اگر کسی آیت کی ایک تفسیر کی تھی تو ہمیں اس کی تفسیر کا پابند کر دینے کی کیا ضرورت ہے اور دوسری طرف حضرت سعدیؒ کے اس شعر سے

ابر و باد و مہ و خورشید فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

سے یہ مفہوم اخذ کیا گیا ہے کہ "عبادت کو نہیں" علامہ سعدیؒ نے "کائناتی گردشوں کا سب سے پہلا نتیجہ معاشی ارتقاء" قرار دیا..... " (صفحہ ۲۱) اب تک لوگ کہتے آرہے تھے، کہ کارل مارکس، ہیگل کے تصورات کا خوشہ چین ہے، مگر حکیم ابوالنظر کی اس تشریح کے بعد اس حقیقت کا انکشاف ہوا، کہ سعدیؒ صدیوں پہلے معاشی نظام کی فکری طور پر داغ بیل ڈال چکے تھے ـــ اسی ذہانت اور اپج کے انداز کی ایک بات ہے، جو کسی نے داغؔ کے اس مصرعہ "مئی کی بھی لے تو رو اے شباب میں" کے بارے میں کہی تھی، کہ داغؔ نے اس مصرعہ میں تیمم کا مسئلہ بیان کیا ہے ـــ عبادت کے بارے میں تو سعدیؒ کا یہ مسلک ہے "وامش مدہ آں کہ بے نماز است" فرماتے ہیں، اور مشورہ دیتے ہیں، کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا (یہی نماز جو ظاہری ارکان کے ساتھ پڑھی جاتی ہے) اسے قرض نہ دینا چاہیئے کیونکہ جب اس کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔ تو اسے اپنے وعدے کا پاس کیا ہوگا۔ بے نمازی بھروسہ کے قابل ہی نہیں ہے!

حکیم صاحب صفحہ (۳۰) پر لکھتے ہیں:- "حضرت ابن عباسؓ نے اگر کسی آیت کی ایک تفسیر کی تھی۔ تو ہمیں اس تفسیر کا پابند

کر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں ہمارے دماغوں پر قفل لگا دیئے جائیں اور اس چیز کا کیونکر اندازہ کیا جائے کہ ان حضرات نے جو کچھ تفسیر کی تھی اس میں خود ان کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا.....

یہ کون کہتا ہے، کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر سے سرمو انحراف معصیت ہے اور ان کی تفسیر کا حرف حرف منزل من اللہ اور قرآن کے متن کی طرح واجب التسلیم ہے، خود بعد کے مفسروں نے بعض باتوں میں ابن عباس سے اختلاف کیا ہے ـــــ مگر یہ بھی ضروری نہیں ہے، کہ حضرت ابن عباس کی تفسیر کو محض اس بنا پر شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کہ "اس میں خود ان کا ذہن کام کر رہا تھا" اس لئے ہمیں کوشش کر کے اختلافات کیلئے گنجائشیں پیدا کرنی چاہئیں۔ تاکہ ذہنی غلام کے الزام سے ہم بچ جائیں اور ہماری آزادی رائے اور حریت فکر کا اعلان ہو سکے' اس اصول کے تحت تو دنیا کی کوئی کتاب اور اس کی تفسیر و تشریح قابل اعتبار قرار نہیں پا سکتی کہ ہر تفسیر میں مفسر کا اور ہر تشریح میں شارح کا ذہن کارفرما ہوتا ہے ـــــ ہم جانتے ہیں کہ حکیم ابوالنظر صاحب نے سادہ دلی کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔ ان کی نیت پر ہمیں شبہ نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی تفسیر کے بارے میں اس نظریہ نے "طلوع اسلام" کے ایڈیٹر پرویز صاحب جیسے مفسر بھی پیدا کر دیئے ہیں، جنہوں نے حدیث کے بعد قرآن پاک پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور جو عید الاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی کو محض عبث اور ایک رائیگاں رسم سمجھتے ہیں ـــــ قاعدہ ہے کہ دنیا کے ہر فن میں چند لوگ "مستند" (authority) سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور ان سے استناد کیا جاتا ہے۔ تو حضرت عبداللہ ابن عباس، ابو قتادہ اور ابن کثیر وغیرہ مفسر بھی یہی درجہ اور مقام رکھتے ہیں، جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو اور خود قرآن اور صاحب قرآن کے منشا اور عمل سے ٹکراؤ بھی نہ ہوتا ہو، تو ان کی تفسیر سے محض اس مفروضہ کے تحت کہ "تفسیر میں ان کا اپنا ذہن کام کر رہا تھا"... اختلاف علمی حیثیت سے بھی غلط ہے۔ اب رہیں نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں تو اس کیلئے نفس کی لذتیں ہمیشہ چشم براہ اور آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا قضیہ جن ذہنوں نے تراشا تھا۔ آج اسی قسم کے ذہن قرآن کو "روح عصر" "کا نئاتی قوانین" اور "انقلاب و حرکت" کے خود تراشیدہ قوانین کی خراد پر چڑھا کر کلام اللہ کو "زندہ پائندہ" بنائے دے رہے ہیں۔

بات بہت طول پکڑ گئی۔ اس لئے نہیں کہ ؎ لذیذ بود حکایت' دراز تر کردم' بلکہ ہمارے قلب نے بھی چند کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور اس کے اظہار پر ہم مجبور ہو گئے۔ یہ "تلخ نوائی" نہیں اعلان حق ہے۔ بہ حیثیت ناقد کے ہم پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ ہم دو ٹوک بات کہہ دیں۔ تاکہ سچائی کھل کر سامنے آجائے۔

ہمارا کشمیر

"ہمارا کشمیر" از :- حکیم راغب مراد آبادی' ضخامت ۱۱۲ صفحات' خوبصورت جلد' قیمت ڈیڑھ روپیہ
ملنے کا پتہ :- پاک پبلسٹی' پوسٹ بکس ۷۵۵ کراچی

یہ کتاب جناب حکیم راغب مراد آبادی کی نظموں' قطعوں' اور رباعیوں کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے "کشمیر" کے موضوع پر کہی ہیں! دیباچہ جس کا عنوان "اشارے" ہے جناب اسلم فرخی ایم' اے نے لکھا ہے۔ اور بہت خوب لکھا ہے۔ اسلم صاحب اپنی اس صلاحیت کو پوری قوت اور انہماک کے ساتھ کام میں لائیں۔ تو وہ علم و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں ـــــ پیش لفظ عزت مآب خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر امور داخلہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس قسم کے "ادبی سرٹیفکیٹوں" کی رسم تعجب ہے کہ اب تک جاری ہے۔ مقدمہ جناب سید علی حسنین زیبا ردولوی ایم' اے نے لکھا ہے جو ضرورت سے زیادہ مختصر ہے۔ اس کے بعد حضرت رفیق امروہوی کی دلکش اور بلند پایہ نظم ہے جس کا ہر شعر شاعر کے کمال فن کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔ ایک شعر میں البتہ معمولی چوک ہو گئی ہے:-

؎ یا کسی عابد اور زاہد وفا کی تسبیح ؛ یا کسی خامۂ تحریر حقیقت کی مہر

"عابد اوراد وفا" درست نہیں "صاحب اوراد وفا" یا اسی انداز کی کوئی مناسب ترکیب لانی چاہیے تھی۔"عابد اوراد" کے معنی ہیں "اوراد کی عبادت کرنے والا" حالانکہ اوراد وظائف کی کوئی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ ورد و وظیفہ کا "فعل" اپنی جگہ خود عبادت ہے۔ پھر یہاں "وفا" بھی زائد ہے ـــ دوسرے مصرعہ میں خانہ تحریر حقیقت" میں تحریر کی "ر" کو اگر اضافت ہے تو یہ ترکیب نامانوس اور عجیب ہے اور اگر اضافت نہیں ہے تو پھر "خانۂ حقیقت تحریر" کہنا چاہیئے تھا۔

حکیم راغب صاحب نے پورے خلوص اور جوش کے ساتھ اپنے واردات اور تاثرات شعر کے قالب میں ڈھال دیئے ہیں ـ جو یقیناً اثر سے خالی نہیں ہیں۔ حضرت راغب فن داں شاعر ہیں۔ اس لئے جہاں تک فن کا تعلق ہے ان کے کلام میں حرف گیری کی گنجائش نہیں ہے ـــ بعض نظمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عجلت میں کہی گئی ہیں۔ مصرعوں کا دروبست اور لفظوں کی نشست اس کی غمازی کر رہی ہے۔

"امتحان" جس نظم کا عنوان ہے (صفحہ ۲۰) اس کا ایک شعر ہے :-

اُٹھ کہ آمادۂ پیکار ہیں بھارت کے سپوت ؛ بخدا وقت نہیں ہے یہ بلانوشی کا۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ عیش و راحت میں ایک لمحہ صرف کرنے کا بھی وقت نہیں ہے مگر مصرعہ سے مترشح یہ ہوتا ہے کہ بس "بلانوشی" کا وقت نہیں ہے۔ ہاں "کم نوشی" یعنی تھوڑی بہت پی لینے کی اجازت ہے ـــ قافیہ کی مجبوری کے سبب غالباً ایسا کرنا پڑا۔

"اے مسلماں ہوشیار" اچھی نظم ہے۔ لیکن "شیر غرّاں" کی ترکیب اور پھر اس کی تکرار اور بھی بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح صفحہ ۵۲ پر "شہزادۂ پیکار" پر وجدان کھٹک سی محسوس کرتا ہے۔

راغب صاحب کی ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت اسلامی درد اور جوش ایمانی ہے ـــ چاہے دنیا میں تحسین ہو یا نہ ہو مگر اللہ تعالٰی کے یہاں اس کا اجر ضرور ملے گا۔ اس بند (دعوت ایثار و عمل صفحہ ۹) کا طمطراق دیکھیئے :-

اَنتم الاعلون کی قندیل حجت کیلئے اُٹھ ؛ اِنَّ حزب اللہ کی شمع بشارت کیلئے اُٹھ

لاتخف کی ذوالفقار دست نصرت کیلئے اُٹھ ؛ اِنَّ وعد اللہ حق کی اعانت کیلئے اُٹھ

اے مسلماں نور ایماں جوش ہمت کیلئے اُٹھ

یہ رباعی کتنی پاکیزہ اور ساتھ ہی ولولہ انگیز ہے :-

آتا ہے نظر رعیٔ کا گلا کشمیر ؛ بے مثل حسیں بلند و بالا کشمیر

اغیار بگوش ہوش سن لیں راغب ؛ زنہار نہیں ہے تُرنوالا کشمیر

کتاب کا نام "ہمارا کشمیر" بھی خوب ہے۔ بلکہ غیبی اشارہ ہے اور ہونے والی بات شاعر کے آئینہ ادراک پر الہامی طور پر منعکس ہو گئی ہے (انشاء اللہ العزیز)

شعور و لاشعور

"شعور و لاشعور" مصنفہ سلامہ موسیٰ مصری، مترجم :- عبدالوہاب ظہوری، ضخامت ۲۶۰ صفحے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب، مجلد گردپوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپے ملنے کا پتہ :نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ، کراچی۔

مصر کے مشہور عالم سلامہ موسیٰ نے شعور و لاشعور پر "العقل والباطن" نام کی ایک معرکۃ آرا کتاب لکھی تھی۔ جو زیادہ تر جرمن اور فرانسیسی کتابوں سے ماخوذ تھی۔ جناب عبدالوہاب ظہوری نے شستہ اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ اور "نفیس اکیڈمی" اسے منظرِ عام پر سے

آتی۔ عبدالوہاب ظہوری کو عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی مشق ہی نہیں بلکہ دستگاہ حاصل ہے۔ اس کتاب میں علم النفس کی بعض دقیق باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مگر ترجمہ میں کہیں جھول پیدا نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ دس پانچ جگہ مترجم سے تسامح اور تھوڑی بہت بھول چوک ہو گئی ہے۔

(صفحہ ۱۸) جواری یا قمار باز " GAMBLER " کو "جوا باز" لکھا ہے۔ جو محاورے "نہ معقول! (صفحہ ۱۲۵) "عاطفۂ جنسی کا کتمان" یہ بہت ثقیل ترجمہ ہے۔ اردو بیچاری اس بارِ گراں کو برداشت نہ کر سکے گی۔ (صفحہ ۹۹) "چھت ابھی مجھ پر گر پڑے گا" — "چھت" بالاتفاق مؤنث ہے۔

کتاب یقیناً دلچسپ ہے اور مصنف نے بعض مقامات پر نفسیات کی نازک گرہیں کھول دی ہیں اور کہیں اس فدمے میں سلجھنے کی بجائے اور پیچ بھی پڑ گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ "نفسیات" کے اصول ریاضی کی طرح قطعی تو ہیں نہیں، ہر شخص اپنے تجربے اور قلبی واردات کی اساس پر گفتگو کرتا ہے۔

لاشعور اور شعور میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب مصنف کی زبان سے سنیئے۔

"لاشعور ہمارے شعور کی بہ نسبت ہمارے ارادوں کو زیادہ واضح اور نمایاں کر دیتا ہے۔ اس لئے بسا اوقات زبان کی لغزش بچی تلی گفتگو کے مقابلہ میں ارادے اور نیت بہت جلد ظاہر کر دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موزوں کلام شعور سے صادر ہوتا ہے۔ یہ اپنے ارادے کو ناپ تول کر لغزش سے بچتے ہوئے اور حالات کا اندازہ لگاتے ہوئے ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے ارادہ صاف اور واضح نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے لاشعور ان ارادوں کو وضاحت سے پیش کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ کسی چیز کا شمار کرتا ہے نہ اندازہ لگاتا ہے" (صفحہ ۱۱۰)

لغزشِ قلم یا سہوِ کتابت کی مصنف نے کتنی دل نشین توجیہ کی ہے۔

"بجائے اس کے کہ میں "العقل الباطن" "لعون" "الحقاطن" لکھ دیتا ہوں۔ اس لغزش کا سبب یہ ہے کہ میرے دل میں باب (chapter) کو تیزی کے ساتھ ختم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس پر لاشعور اپنی لغزیت سے یہ گمان کر لیتا ہے۔ کہ جس طرح کسی انسان کو کہیں جانے کی عجلت ہوتی ہے تو وہ اپنے قدم تیزی سے اٹھاتا ہے۔ اسی طرح میں ایک لفظ سے دوسرے لفظ پر چھلانگ لگاتا جاؤں۔ تاکہ یہ باب تیزی کیساتھ ختم ہو جائے" (صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲)

بعض ذہین انسانوں میں جسمانی نقص کی کمی پوری کرنے کیلئے مسابقت کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو نقص کی تلافی کسبِ کمال سے کر دیتا ہے ا۔

"اڈلر کہتا ہے۔ کہ اس نے سینکڑوں ذہین اشخاص کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ اور ان کی ذہانت کا کھوج لگایا تو دیکھا کہ ان سبھوں میں کوئی نہ کوئی نقص اور کمزوری ضرور موجود تھی۔ مثلاً بائرن انگلستانی شاعر لنگڑا تھا۔ باوجود اس لنگ کے وہ اپنی تمام عمر حسن و جمال کا دلدادہ اور عاشق تھا۔ گوئٹے کو آنکھوں کی تکلیف تھی۔ اس نے اپنی تمام زندگی کتابیں پڑھنے اور لکھنے میں گزار دی۔ نطشے بیمار تھا۔ دماغی تکالیف و آلام سے ہمیشہ چیخ اٹھتا تھا۔ اس نے متعدد کتابیں قوت پر لکھیں جو شہرۂ آفاق حیثیت رکھتی ہیں — دور کیوں جائیے۔ خود ہمارے سامنے ایک بہت بڑے ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی مثال موجود ہے۔ بچپن میں یہ اندھے ہو گئے اور آجکل یہ مصر کے بہت بڑے مفکر اور ادیب ہو گئے ہیں" (صفحہ ۱۹۷)

اس کے ساتھ ہی مصنف نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ "مرکب نقص" ہمیشہ تفوق کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

والدین بچہ کو کسی خاص فن کی تعلیم دلانا چاہتے ہیں، بچے کو اس فن سے رغبت نہیں ہے، اس کی تدبیر مصنف نے یہ بتائی ہے ؎ "اگر کوئی لڑکا لاطینی زبان سیکھنے سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کے سیکھنے کی اس کے اندر تاب و ہمت پیدا نہیں ہوتی، تو اس کا آسان علاج یہ ہے، کہ اس لڑکے کے نفس میں خواہش پھونک دی جائے، کہ وہ طبیب ہوگا، پھر اس کے بعد اسے سمجھایا جائے کہ لاطینی کے بغیر طب کا سیکھنا ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ مردہ زبان پر توجہ کرے گا" (صفحہ ۱۰۵)

مصنف فرائیڈ زدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے یہ خیالات بالکل لغو اور بیہودہ ہیں، کہ "ہر جوان آدمی ایسی لڑکی کی خواہش رکھتا ہے جو اس کی ماں کی صورت کی ہو یا اس سے ملتی جلتی ہو..... اس طرح لڑکی کی نظر میں اپنے باپ کی سی شکل و صورت والا شخص بھلا معلوم ہوتا ہے......" جنسی استلذاذ کا یہ وہ درجہ ہے جہاں حیوانیت دل و دماغ میں رچ جاتی ہے، اور آدمی کی آنکھوں میں حیا اور دل میں غیرت کی ایک رتی بھی باقی نہیں رہتی۔

مصنف کا یہ خیال بھی غلط ہے، کہ خواب میں آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اس میں مستقبل کے واقعات کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ہوتا ـــ ان غلط اندیشیوں کے ساتھ بعض بہتر کی باتیں بھی ملتی ہیں، مثلاً یہ کہ آدمی ناگوار حادثات کو بھلا دینے کی کوشش کرے اگر پچھلی ناخوش گواریاں اور کمزوریاں ہر دم یاد آتی رہیں، تو آدمی میں کام کرنے کی ہمت ہی پیدا نہ ہو۔ بچہ چلتے ہوئے شروع شروع میں جو گر گر پڑتا ہے، اگر گرنے کے تمام واقعات اسے یاد رہیں، تو پھر وہ چلنے کی ہمت ہی نہ کرے۔

جو لوگ علم النفس سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کیلئے یہ کتاب بہت کام کی ہے، عام مطالعہ کرنے والے بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ طبیعت کو اس قسم کے نازک اور خشک مسئلوں سے لگاؤ بھی ہو اور پڑھنے والے نفسی مسائل کی صحت اور غلطی میں امتیاز بھی کر سکیں۔

مشرق وسطیٰ کا معاشی جائزہ

"مشرق وسطیٰ کا معاشی جائزہ" ـــ ترتیب: بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس۔ ادارت: محمد عبدالکریم بی اے ایل ٹی ـــ ترجمہ: علی یزدانی بی اے (معاشیات)، کتابت وطباعت دیدہ زیب، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت مجلد (رنگین گرد پوش کے ساتھ) تین روپے ـــ ملنے کا پتہ: مکتبہ خدام ملت اے ایم/۷ فریئر روڈ، کراچی۔

کراچی میں جو بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی تھی، جس میں اسلامی ممالک کے مندوبین نے شرکت فرمائی تھی، یہ کتاب اسی کانفرنس کی طرف سے انگریزی میں مرتب ہو کر شائع ہوئی جس کا اردو ترجمہ ہمارے سامنے ہے

اس کتاب میں مصر، ایران، عراق، فلسطین، سعودی عرب، شام، لبنان، مشرق اردن، ترکی، یمن، افغانستان، بحرین، مسقط عمان اور پاکستان ـــ پندرہ ملکوں کا معاشی جائزہ لیا گیا ہے، اور مماثل خصوصیات کی بنا پر انڈونیشیا کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے یہ کتاب ایک کارآمد ڈائرکٹری کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں ہر ملک کی زراعت، تجارت، صنعت، درآمد، برآمد، مالیات اور ضروری معاشی تفصیلات درج ہیں، اس دور میں جبکہ "معاشیات" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، کتاب مذکور کا مطالعہ اختصار و اجمال کے باوجود فائدے سے خالی نہیں، جس کے پڑھنے سے ان ملکوں سے معاشی تعارف ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے ـــ "مشرق وسطیٰ کے ممالک کی ستر فی صد آبادی زراعت پر گذر بسر کرتی ہے، اور شرح اموات کی زیادتی کے باوجود آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور معاشی ترقی کی رفتار دوش بدوش نہیں ہے، اس کا لازمی اثر یہی ہوا کہ موجودہ وسائل پر بار زیادہ بڑھ گیا ہے، اور معیار زندگی گرتا جا رہا ہے" (صفحہ ۹)

کتاب ترتیب دینے والوں نے شروع میں ان ممالک کے عام معاشی حالات پر روشنی ڈالی ہے جن کے پڑھنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ "جنگ" کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی زراعت، تجارت اور صنعت پر جنگِ عظیم کا بہت بڑا اثر پڑا جس کے صدمہ سے ابھی تک یہ ملک پنپ نہیں سکے۔ صنعت میں یہ ممالک دنیا کے دوسرے ملکوں سے ابھی پیچھے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے، کہ جہاں تک غذائی ضروریات کا تعلق ہے مجموعی طور پر یہ ممالک خود مکتفی (SELF SUPPORTING) ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں زراعت قدیم انداز پر کی جاتی ہے، مشینوں سے کام نہیں لیا جا رہا ہے۔ بہت سی زمین جو قابلِ کاشت ہے، افتادہ اور ناکارہ پڑی رہتی ہے۔ اس نے جسمانی اور مالی لحاظ سے معیارِ پیداوار پست ہے۔ "ان علاقوں میں صنعتی ترقی بھی بہت کچھ ہو سکتی ہے۔ اس کے امکانات موجود ہیں بشرطیکہ عوام کی قوتِ خرید میں اتنا اضافہ کیا جائے کہ ان علاقوں کی صنعتی پیداوار کیلئے اچھا بازار مہیا ہو جائے" ——— یہ تمام مسلمان ممالک جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی اخوت کے رشتہ میں باندھ دیا ہے، اگر یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، مساعدت اور اشتراک کریں تو صنعت کو بہت کچھ فروغ ہو سکتا ہے۔

صنعت، زراعت، خام پیداوار اور دوسری معاشی تفصیلات کے ساتھ تمام ملکوں کی آبادی اور آمدنی بھی درج کر دی ہے مگر سعودی عرب کا ورق "آمدنی" کے ذکر سے خالی ہے، معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلطان ابن سعود کی حکومت میں بجٹ دمیزانیہ، تو مرتب نہیں ہوتا۔ اور "جلالۃ الملک" ملک کی آمدنی کے سپید و سیاہ کے مالک ہیں۔

مترجم نے بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ کتاب کا براہِ راست انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ ناولوں کے ترجمے آسان ہیں، مگر وہ کتابیں جن میں فنی اصطلاحات بھی ہوں، ان کا ترجمہ وہی شخص کر سکتا ہے جو ان اصطلاحات کی معنویت سے خبردار ہو اور ان کے ترجمہ میں زبان کی خصوصیت اور مزاج کا بھی خیال رکھے ——— ترجمہ میں کہیں کہیں کوئی کوئی بات کھٹکتی بھی ہے، صفحہ (۵۹) پر مویشیوں اور چوپایوں کو "بہائم" لکھا ہے۔ جو بہاں ثقالت سے خالی نہیں۔ اسی طرح صفحہ (۷۷) پر "موسمی خرابی کی وجہ سے بیشتر فصول پر مضر اثرات مترتب ہوئے" یہاں "فصلوں" لکھنا چاہئے تھا، زراعت کے ساتھ "فصلیں" روز مرہ ہے "زراعت کی فصول" میں غرابت پائی جاتی ہے ——— "چاول" کو ہر جگہ "چانول" لکھا ہے۔ زمین کی جمع "زمینات" بھی محلِ نظر ہے۔

پاکستان کا معاشی جائزہ

"پاکستان کا معاشی جائزہ"۔ مرتبہ:۔ بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس ——— ادارت احمد عبداللہ المدوسی بی، اے، ایل، ایل، بی۔ ترجمہ:۔ محمد بن علی (بی، اے، معاشیات) ——— لکھائی چھپائی نظر نواز، خوبصورت جلد اور رنگین گرد پوش۔ ضخامت تین سو صفحوں کے قریب ——— قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ خدام ملت اے ایم، ۴ فریئر روڈ، کراچی۔

یہ کتاب بھی بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس نے انگریزی زبان میں مرتب کی ہے، جس کو اردو زبان میں ——— جناب احمد عبداللہ المسدوسی نے ایڈٹ کیا۔ اور جناب محمد بن علی نے ترجمہ فرمایا۔ یہ بڑے کام کی کتاب ہے۔ پاکستان کا رقبہ، آبادی، قدرتی وسائل، زراعت، صنعت، مواصلات، مزدور و روزگار، تجارتی تعلقات، زر، بنک اور مالیاتِ عامہ پر ضروری تفصیلات اور کار آمد معلومات اس میں درج ہیں، جو لوگ معاشیات کے فن سے ناواقف ہیں وہ بھی اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب ترتیب دینے والوں نے اس حقیقت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے کہ ؎

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی!

انگریز نے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی کا چارٹر عطا کیا، تو اس کے ساتھ قتل و غارت گری کا منشور بھی منسلک کر دیا۔

اگر یہ دونوں ملک انگریزوں سے جنگ کرکے آزادی حاصل کرتے تو بھی اس سے زیادہ خونریزی اور تباہی نہ ہوتی۔ مسلمانوں کو تباہ کرنے اور مٹانے کا پوری ہوشیاری اور کامل عیاری کے ساتھ پلان مرتب کیا گیا جس میں برطانیہ کے شاہی نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھ بھی کلمہ گویوں کے ہو سے رنگین نظر آتے ہیں ـــــ پھر آزادی اور تقسیم کا فیصلہ اس قدر جلدی میں کیا گیا۔ کہ مستقبل کے عواقب صورتِ حال کی نزاکتوں اور پیش آنے والی مشکلوں پر پوری طرح سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا گیا۔ جس "پاکستان" کیلئے مسلمانوں نے جدوجہد کی تھی، بنگال اور پنجاب ٹکڑے کرکے اس "عظیم تر پاکستان" کے بازو ہی کاٹ دیئے گئے۔ تنہا شہر کلکتہ صوبہ سندھ سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ اس پر دوسری قیامت ریڈ کلف کے ہاتھوں نازل کی گئی۔ دونوں حکومتوں کی حد بندی کی قسمت اس فرنگی شعبدہ باز کو سونپ دی گئی۔ اور اس حق ناشناس نے ناشنقی، جانبداری اور کینہ پروری کی حد کر دی۔ قائد اعظم مرحوم انگریز کی عیاری سے واقف تھے۔ مگر ریڈ کلف کی بے انصافی کو دیکھ کر "بابائے پاکستان" بھی انگشت بدندان رہ گئے۔ تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا، ہیرے کی اس کنی کو گوارا کئے بغیر اور چارہ کار ہی کیا تھا ـــــ ان حالات میں پاکستان وجود میں آیا۔ کہ عہدیداروں کے بیٹھنے کے لئے دفتروں میں ٹوٹی کرسیاں بھی نہ تھیں۔ اغیار مطمئن تھے۔ کہ یہ بچہ جس کو پیدا ہوتے ہی زخمی کر دیا گیا ہے۔ زیادہ دن تک زمانے کے گرم و سرد کا مقابلہ نہ کر سکے گا ـــــ مگر "پاکستان کا معاشی جائزہ" پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے اس فضل پر ایمان بالغیب نہیں "ایمان بالشہود" لانا پڑتا ہے۔ کہ سیاسی اور دفاعی استحکام کے ساتھ پاکستان کے معاشی حالات بھی "غیروں" کے مقابلہ میں بہت اچھے ہیں۔ اور مستقبل کی بہتری کی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔

کتاب کا ترجمہ آتنا شستہ اور رواں ہے کہ پڑھنے والا اُکتانے نہیں پاتا ـــــ بعض لفظ محلِ نظر بھی ہیں، مثلاً "بیٹری" کو "بیاٹری" اور "گیلن" کو "گیان" لکھا گیا ہے۔ یہ حیدر آباد دکن اور مدراس کا اردو املا ہے۔ جس سے اردو والی دنیا مانوس نہیں ہے اسی طرح ٹھیکہ Contract کا "گتہ" اور "Log" (لٹھا) کا ترجمہ "لاٹ" بھی دکنی اردو ہے ـــــ بر پیمانہ کبیر کی مصنوعات اور رسد کی جمع "رسدات" بھی وجدان کو کھٹکتی ہیں ـــــ کتاب کے آخر میں انگریزی اصطلاحات کی جو اردو فرہنگ لگا دی ہے اس نے کتاب کی علمی حیثیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

دستور و اعلان

"دستور و اعلان" "الهیئة الاقتصادیه للعالم الاسلامی"

"INTERNATIONAL ISLAMIC ECONOMIC ORGANISATION"

ترجمہ۔ احمد عبداللہ المسدوسی بی اے، ایل ایل بی، چکنا سفید کاغذ، ضخامت ۱۶ صفحے ـــ قیمت چار آنے

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ خدام ملت اے ایم، ۳ فریئر روڈ، کراچی۔

کراچی میں جو بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس دو ماہ قبل شاندار پیمانہ پر منعقد ہوئی تھی جس میں انیس (۱۹) اسلامی ملکوں کے نمائندوں نے حصہ لیا۔ اس کے کھلے اجلاس بھی منعقد ہوئے۔ جن میں عوام نے پوری دلچسپی کے ساتھ شرکت کی۔ ۰۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو اس کانفرنس کا آخری اور اختتامی جلسہ ہوا۔ اس اجلاس میں ایک تنظیمی قرارداد منظور ہوئی اور قرارداد اور تنظیم کے دستور کا خاکہ کانفرنس کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ جناب احمد عبداللہ المسدوسی نے اس دستور اور اعلان نامہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو لیس سادہ اور عام فہم ہے۔

ممالک اسلامیہ کے نمائندوں نے ہم آواز ہو کر ہزاروں انسانوں کی موجودگی میں اس ایقان کا اعلان فرمایا۔

"ہم اسلام کے شاندار ورثہ سے مربوط ہیں۔ یہ ایسا ورثہ ہے۔ جو انسانی زندگی کو مفتخر بناتا ہے۔ کیونکہ اس (اسلام)

> کی رہنمائی، انصاف، رواداری اور اخوت کے اصول کرتے ہیں۔ یہ ترقی اور معاشرتی تعلقات کی ہمواری کا راستہ دکھلاتا ہے، تاکہ عام آدمی کیلئے مسرت، اطمینان اور عزت کی زندگی مہیا ہو......"

مقامِ مسرت ہے۔ کہ مسلمان زعماء اور اربابِ فکر و اقتدار کو اس کا احساس ہو چلا ہے۔ کہ صرف اسلام ہی سے وابستگی ان کو دنیا میں عزت و شرف کا مقام بخش سکتی ہے۔ خدا کرے "زبان" "عمل" کے سانچے میں ڈھل جائے اور جس دن یہ ہو جائے گا اس دن انصاف و صداقت سے دنیا معمور ہو جائے گی۔

یہ تینوں کتابیں جن پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ "مکتبۂ خدامِ ملت" نے شائع کی ہیں۔ ترجمہ میں زبان و بیان کی جن لغزشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کتابوں کی مجموعی افادیت کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہر اہلِ قلم سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے ــــ "مکتبۂ خدامِ ملت" پاکستانی دنیا کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے چند دنوں میں اتنی اچھی کتابوں کا اردو لٹریچر میں اضافہ کر دیا۔ یہ مکتبہ عوام اور حکومت کے تعاون کا بیش از بیش مستحق ہے۔

پاکستان کی قومی اور دفتری زبان "اردو" ہے۔ حیدر آباد دکن کی قومی، تعلیمی اور دفتری زبان بھی اردو ہی تھی۔ اس انقلاب کے بعد دکن کے بہت سے ہونہار، تجربہ کار، قابل اور آزمودہ اہلِ قلم پاکستان میں آچکے ہیں۔ حکومت پاکستان کو ان کے تجربوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے ــــ جامعہ عثمانیہ دکن کے سپوتوں اور ہونہار فرزندوں کی علمی اور ادبی خدمات بہت شاندار ہیں۔ انہوں نے اردو کو مثالی زبان بنانے میں مدد دی ہے۔ پاکستان میں بھی ان کے تجربوں اور علمی و عملی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقعہ ملنا چاہیے، کہ یہ اس اجڑے ہوئے چمن کی بہار ہیں۔ جہاں بہت سے خوشنما طائروں نے بولنا سیکھا تھا

نیا قرآنی قاعدہ

"نیا قرآنی قاعدہ" مرتبہ:- ابو محمد مصلح، ضخامت ۳۲ صفحے، قیمت دو آنے ــــ شائع کردہ:- ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدر آباد دکن۔

پچھلے زمانہ میں "بغدادی قاعدہ" مسلمانوں کے مکتبوں اور گھرانوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ ہزاروں اور لاکھوں نہیں، بلا مبالغہ کروڑوں طلباء نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ پھر اس کے بعد نئے نئے انداز پر اور جدید اسلوب پر اہلِ علم نے "قاعدے" مرتب کئے۔ اور تسہیل و تیسیر کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

"نیا قرآنی قاعدہ" جناب مولانا ابو محمد مصلح صاحب نے پچھلے "قاعدوں" سے ہٹ کر بالکل جدید نہج پر مرتب فرمایا ہے۔ اس قاعدے کی تدوین و ترتیب کی غرض و غایت یہ ہے، کہ اُستاد اور استانیاں اس میں دی ہوئی ہدایتوں کے تحت طلبا کو قرآن پڑھائیں، قاعدے کی بنیاد حرفوں کے "مخارج" ہیں..... مرتب نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ

> "فقط ایک گھنٹہ روزانہ کی ٹریننگ میں آٹھ دن کے اندر ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی اس قابل ہو جائے گا۔ کہ محض ایک چلّے (چالیس دن) میں پورے تیس پارے قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھا دے سکے....."

"نیا قرآنی قاعدہ" کام کی چیز ہے۔ اور پڑھانے والوں کو کم سے کم تجربہ کے طور پر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اب تک "قرآن" کو ہم سب محض تبرک کے طور پر پڑھتے رہے ہیں۔ یہ بتایا ہی نہیں جاتا، کہ قرآن پر جب تک عمل نہ ہوگا۔ اس کی تنزیل کا منشأ پورا نہیں ہو سکتا۔

اس قاعدے میں مرتب نے "عمل" کی طرف بھی مفید اشارے کئے ہیں۔ کاش! علم کے ساتھ عملی رنگ بھی قرآن پڑھنے والوں کے ذہنوں، دلوں اور طبیعتوں میں رچ جائے۔

شہرود

"شہرود" از:- اختر شیرانی (مرحوم) کتابت و طباعت نظر افروز، کاغذ چکنا، عمدہ خوبصورت، رنگین دستور گرد پوش ضخامت ۲۷۲ صفحے، قیمت تین روپے آٹھ آنے — ملنے کا پتہ:- بیگم اختر شیرانی، شیرانی برادرس لاڑکانہ سندھ

اختر شیرانی اردو زبان میں یقیناً "رومانی شاعری" کی طرز خاص کے موجد ہیں، زندگی میں بے چارے کی قدر نہیں ہوئی "مردہ پرست" قوم اب اُسے "اردو کا امراء القیس" کہہ رہی ہے۔ اور "یوم اختر" بھی منایا جا چکا ہے۔

"شہرود" اختر شیرانی کے کلام کا آخری مجموعہ ہے اور بیگم اختر شیرانی اس کی ناشرہ ہیں۔ جناب حکیم نیر واسطی نے جو اختر شیرانی کے خاص قدردانوں میں ہیں، اس مجموعہ کا مقدمہ لکھا ہے، یہ مقدمہ شاعر کی مختصر سوانح حیات پر مشتمل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہمایوں"، "خیالستان"، اور "رومان" ماہناموں کی ادارت کے علاوہ اختر مرحوم نے "مجمع البحرین"، "مطلع السعدین" — اور "جامع اللغات" کی ترتیب و تدوین میں بڑا حصہ لیا، اور عوفی یزدی کی جامع الحکایات کا دو جلدوں میں ترجمہ اور خلاصہ لکھا۔ اردو نثر میں چند اور تالیفات اور تصنیفات بھی اختر نے یادگار چھوڑی ہیں — اور نظم میں بھولوں کے گیت، نغمۂ حرم، صبح نوبہار، اخترستان، لالۂ طور، طیور آوارہ، شہناز، اور شہرود، ان کے مجموعے ہیں۔

یہ بات بہت سوں کو معلوم نہ ہوگی جس کا مقدمہ میں اظہار کیا گیا ہے کہ اختر شیرانی نے ابتدا میں شمس العلماء تاجور نجیب آبادی سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور مسعود خسرو ان کا تاریخی نام تھا۔

اختر شیرانی رندی و سرمستی کے باوجود بہرحال مسلمان شاعر تھے، ہمارے بہت سے "شاعران انقلاب" کارل مارکس و راشاؤں کے حضور میں عقیدت کے قصیدے پیش کرتے ہیں، اور اختر کو زندگی کی آخری ساعتوں میں "نعت رسول" لکھنے کی سعادت میسر آئی:-

لٹائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسول پاکؐ کا ہے آستاں مدینے میں

اور —————— قدم اٹھائے ادب سے ذرا نسیم سحر
ہیں محو خواب شہ دو جہاںؐ مدینے میں

یہی وہ بارگاہ اقدس ہے جہاں ؎ نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

نعتیہ قطعہ جس کا عنوان "خدا کی آزمائش" ہے۔ اس کے آخری شعر میں:-

ذہانت بے خبر ہے بعثت نبویؐ کے مقصد سے
خدا نے بن کے انساں آزمایا تھا 'خدائی' کو!

شاعر نے عقیدت کے جوش میں "فرق مراتب" کا لحاظ نہیں رکھا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشنوں میں اس قطعہ کا نہ چھاپنا ہی مناسب ہے — نعت کے بعد نظمیں شروع ہوتی ہیں۔ پہلی نظم "بہاریہ" ہی بہت خوب ہے! رومان نواز اختر نے پھول برسائے ہیں۔ جام چھلکائے ہیں اور رسیلے نغمے گائے ہیں۔

کس کے گوش و گردن و گیسو کی زینت کیلئے
رات بھر بیٹھی ہوئی گجرے بناتی ہے بہار

نظم "ساقی سے" کا شروع سے آخر تک ایک ہی آہنگ ہے:-

؎ ادب سے ماہ نو ساغر کی کشتی لے کے آیا ہے ؛ تری محفل فرشتوں کیلئے دربار ہے ساقی!

کشمیر کی تعریف میں جو نظم ہے اس کا عنوان "چناروں کی چھاؤں میں" ہے۔ اس نظم میں نسیم و نشاط کے سرو و گل و ریحان اور چناروں کے سائے انگڑائی لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

"تنہا مہمان" —— ایک عجیب نظم ہے۔ "عجیب" اس لئے کہ ہم نے اس انوکھے احساس کا اظہار آج تک کسی شاعر کے یہاں نہیں دیکھا۔ اختر شیرانی کے یہاں بچہ (لڑکا) پیدا ہوتا ہے، اس کی پیدائش جہاں شاعر کے لئے موجب مسرت ہے، وہاں نومولود سے شکایت بھی پیدا ہو گئی ہے :-

تو نے آکر میری بیوی کی محبت چھین لی
اس کا دل چھینا، مرے دل کی مسرت چھین لی

یہاں تک کہ گھر کے نوکروں کو بھی پہلے کی طرح اختر شیرانی کی راحت و آرام کا خیال نہیں رہا..... اور

؎ تو نے آکر غاصبانہ قبضہ گھر پر کر لیا
گھر پہ قبضہ کیا کیا، ہر دل مسخر کر لیا

"ایک عزیزہ کی شادی پر" دعائیہ نظم ہے۔ اور بہت اثر انگیز ہے، اسلامی روح نصیحت کرتے وقت بے اختیار بول اٹھتی ہے :- ؎ جہاں میں عصمت و عفت مدار دین کے رہو

اور یہی حقیقت میں صنف نازک کی معراج ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر ایک "لکھ" نول پرائز" بھی پرکاہ کی برابر وقعت نہیں رکھتے

اختر شیرانی کی قومی اور سیاسی نظمیں بھی جاندار ہیں :-

ایک آزاد نفس، عمر قفس سے بہتر
یہ صدا آتی ہے میسور کے کہساروں سے

"امیر و غریب" —— کے چند شعر :-

دنیا کا ہر آرام امیروں کیلئے ہے ؛ پھر کونسی شے ہے، جو فقیروں کیلئے ہے
بدبخت مریدوں پہ بھی یارب نگہ لطف ؛ مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کیلئے ہے
اک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف بیاں کی ؛ کھانے کیلئے کب ہے ذخیروں کیلئے ہے
اب تیسرے درجے بھی محروم ہیں مفلس ؛ اوّل ہے تو اوّل سے امیروں کیلئے ہے

غزلیں بھی نظموں سے کم دل کش نہیں ہیں —— چند منتخب اشعار :-

تیرے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا ؛ میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی
کیوں شکوہ حسن کے شوخ نگاہیں بدل گئیں ؛ کیوں رنگ اڑ چلا ترے پھولوں کے ہار سے
میں اپنے شوق کی دھن میں دعا بھی بھول گیا ؛ وہ پاس آئے تو نام خدا بھی بھول گیا
امید کیا ہو کسی سے وفا شعاری کی ؛ وفا کہاں کہ زمانہ جفا بھی بھول گیا
رخ رنگیں پہ پریشاں ہیں سنہری زلفیں ؛ جیسے ہو اک گل شاداب غبار آلودہ
لاکھ بہلائیں طبیعت کو بہلتی ہی نہیں ؛ دل میں اک پھانس چبھی ہے کہ نکلتی ہی نہیں

قاعدہ ہے کہ جو گرتا ہے سنبھل جاتا ہے ٭ دل کی حالت وہ گری ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے، کہ اختر شیرانی کی بہت کچھ ذہانت افسوس ہے کہ جام و مینا کی نذر ہو گئی، شعر و ادب کی یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے ـــ اور دوسرے نوجوانوں کیلئے آئینۂ عبرت! ان کی بعض نظموں میں انحطاط پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا ہے (صفحہ ۵۰) ـــ "جہاں کا ذرہ ذرہ درس آزادی سکھاتا ہے" ـــ "درس دینا" ـــ بولتے ہیں ـــ (صفحہ ۱۲) "گھلانے لگی پیا قمر کی ـــ روشنی کا گھلانا[ا] پہلی بار نظر سے گذرا ـــ "سکار" جس نظم کا عنوان ہے وہ بہت کمزور ہے، اختر شیرانی مجموعہ خود مرتب کرتے تو اسے شاید چھانٹ دیتے۔

اختر شیرانی نے مزاحیہ اشعار بھی کہے ہیں، مگر یہ ان کا میدان نہ تھا۔ علامہ اقبال اس وادی میں دو چار گام چل کر رہ گئے سرِ ظرافت تو اکبر الہ آبادی کا حصہ تھی ـــ کتاب "ترتیب" دینے والے نے لکھا ہے:-

(۵) مصرعہ جو موت سے چند لمحات پہلے ہونٹوں پر جاری تھا۔

ـــ ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش

"اختر شیرانی کی "صدائے ہائے وہو" کی بازگشت نہ جانے کب تک دلوں سے ٹکراتی رہے گی"

"عارف"

ماہنامہ "عارف" - ادارۂ تحریر:- عبدالرحمٰن شوق، حمید انور، عبدالرحمٰن طارق ـــ ضخامت ۴۸ صفحات۔ سرورق سہ رنگا اور دیدہ زیب! سالانہ چندہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ:- اشاعت منزل، بل روڈ، لاہور

یہ دنیا ہے، یہاں یہ بھی ہوتا رہتا ہے، کہ کام چلتے چلتے رُک جاتے ہیں، زندگیوں، کاموں اور حالات و معاملات میں شروع سے لے کر آخر تک پوری ہم آہنگی اور کامل یک رنگی بہت دشوار ہے، دنیا آثار چڑھاؤ ہی کا نام ہے ـــ رسالہ "عارف" اگرچہ اپنی پشت پر طباعت و کتابت کی سہولتیں اور پریس کی قوت رکھتا تھا، مگر اسے بھی بند ہو جانا پڑا! اب وہ جنوری ۱۹۵۵ء سے پھر نکلنا شروع ہوا ہے، اور ہر اعتبار سے اس کی "نشاۃ ثانیہ" پہلے دور کے مقابلہ میں امید افزا اور ترقی یافتہ ہے۔

"عارف" ایک اسلامی پرچہ ہے، خدمتِ دین کی توفیق و سعادت اس کو میسّر آئی ہے، اور اس دورِ الحاد و معصیت میں جبکہ ساری دنیا جنبہ داروں کی رو میں بہی جا رہی ہے، کسی ادارے، جماعت، یا فرد کا اخلاق و ادب کی خدمت کرنا بہت بڑی بات ہے، ایسا کرنے میں ممکن ہے کہ دنیا میں گھاٹا رہے مگر آخرت میں تو نفع ہی نفع ہے اور آخرت ہی کے نفع اور خوشی کو شہرا بھی ہے ـــ "عارف" کے کارکنوں کی خدمت میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ رسالہ کے معیار کو ابھی بلند کرنے کی ضرورت ہے "ترجمان القرآن" (لاہور) اور "چراغِ راہ" (کراچی) کو اس راہ کا سنگِ میل سمجھنا چاہیئے ـــ جنوری کے شمارے میں (صفحہ ۳۹، ۴۰) "شہادتِ امام حسینؓ" جس مضمون کا عنوان ہے، وہ بہت مختصر اور تشنہ ہے، مختصر مضامین کو بہت زیادہ جامع اور دل نشین ہونا چاہیئے ـــ اگر کتابوں اور رسالوں سے چھپے ہوئے مضامین لے کر رسالہ میں درج کئے جائیں تو ان کا حوالہ بھی دے دینا ضروری ہے۔

"ارمغان"

ہفت روزہ "ارمغان" - ایڈیٹر:- حکیم محمد یحییٰ خاں (حاذق العصر) چندہ سالانہ دس روپے۔ فی پرچہ ۴ آنہ ملنے کا پتہ:- دفتر مرکزیہ دائرۂ طبیہ 126 E / R راولپنڈی ـــ اردو زبان میں ماہنامے اور علمی پرچے تو نکلتے رہتے ہیں، مگر ہفت روزہ یہ پہلا اخبار ہے جو "طبِ یونانی" پر چند ماہ سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ـــ "ارمغان" کے مضامین پُر از معلومات ہوتے ہیں اور طب کے طالب علموں کے علاوہ عام لکھے پڑھے بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ـــ ۳ فروری

[ا] "گھلانا" کا املا "گلانا" بھی محلِ نظر ہے۔

کے شمارے میں حکیم کبیر الدین صاحب کا مکتوب درج ہے۔ حکیم صاحب موصوف کا اردو زبان اور طب یونانی پر بڑا احسان ہے کہ ان کی کوششوں نے عربی کی بیسیوں کتابوں کو اردو میں منتقل کر دیا۔ حکیم صاحب کے اس خط کے پڑھنے سے یہ معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا، کہ دہلی کے خونیں ہنگاموں میں ان کا بہت بڑا علمی سرمایہ برباد ہو گیا۔

"ارمغان" میں طب یونانی کے علاوہ ڈاکٹری (ایلوپیتھی) پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں، اور اس اجتماع نے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے —— "ارمغان" کی اشاعت کا مقصد پاکستان میں طبِ یونانی کا احیا ہے اور یہ مقصد سراسر حکومت اور عوام کے تعاون کا مستحق ہے۔ طبِّ یونانی کا "علم الادویہ" سائنس کی گوناگوں ترقیوں کے باوجود آج بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے طب یونانی کو خاطر خواہ سرپرستی حاصل ہو تو اسی پاکستان کی خاک سے بہت سے جالینوس اور بوعلی سینا پیدا ہو سکتے ہیں۔

پاکستان میں "طبیہ یونیورسٹی" کے قیام کی شدید ضرورت ہے۔ پاکستان کی ترقیوں کے پروگرام میں حکومت کو یہ چیز بھی شامل کر لینی چاہیئے۔

اقبال

"اقبال" — ترتیب :- محمد کمال الدین اکبر کمالؔ - کتابت و طباعت نظر افروز، ضخامت ۱۴۰ صفحات، قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- بزم اردو دائرہ شاہ مکان، پرمبو بارکس، مدراس

"اقبال" بزمِ اردو مدراس کی دوسری سالانہ ادبی پیش کش ہے جسے بہت سلیقہ اور قرینہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس مجموعہ کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اراکانِ بزم کے اس حسنِ انتخاب کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے اردو کے سب سے بڑے شاعر —— علامہ اقبال —— کے نام کو اپنی ادبی پیش کش کا عنوان قرار دیا۔ اور یہ دلیل ہے اردو زبان کی اقبال مندی کی!

جس زبان نے لکھنؤ اور دلی سے ہزاروں کوس دور جا کر قبولِ عام اور ہر دلعزیزی کے نہ جھکنے والے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں وہ بھلا کہیں مٹ سکتی ہے۔ کالے بادل بہت سے بہت چند دن سورج کو اپنی اوٹ میں چھپا سکتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا، کہ سورج کا اجالا سدا ہی چھپا رہے۔ وقت آتا ہے کہ سورج کی کرنیں بادلوں کے سینوں کو چیرتی ہوئی روشنی بکھیرنے لگتی ہیں —— اردو نہیں مٹ سکتی، یہ "سب" کی زبان ہے۔ جسے ہم بلاشبہ "عوامی زبان" کہہ سکتے ہیں۔

"اقبال" —— کے شروع میں بعض مشاہیر کے پیغام درج ہیں اور حیرت ہے کہ ڈاکٹر عبد الحق اور مولینا عبد الماجد دریابادی کے دوش بدوش سیدہ سردار اختر کا نام بھی نظر آتا ہے —— اس مجموعہ میں —— مذہب و اخلاق —— تاریخ و تذکرہ —— ادبیات افسانے، سائنس، نظمیں اور غزلیں، غرض سبھی کچھ شامل ہے۔ پورا رسالہ اسی رنگارنگی کا مرقع اور تنوع کا آئینہ دار ہے۔ اس میں مشاق، نیم مشاق، اور نومشق سبھوں نے حصہ لیا ہے۔ پختگی کے ساتھ خامیاں بھی ہیں اور گہرائیوں کے آس پاس اُتھلا پن بھی پایا جاتا ہے —— اس قسم کے شعر :-

وہ ان کا دیکھنا ترچھی نظر سے ؛ وہ میرا لوٹنا دردِ جگر سے — (صفحہ ۱۰۵)

اگر انتخاب میں نہ آتے تو اچھا تھا —— بہر حال بزمِ اردو مدراس اس مجموعہ کی پیشکش پر مبارکباد کی مستحق ہے یقین ہے کہ اس کی آئندہ کوششیں اور زیادہ کامیاب ہوں گی —— اردو زبان پر ہندوستان میں بڑی نازک گھڑی آگئی ہے جس سے جو کچھ بھی ہو سکے اس سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

مطبع عثمانی بہیم پورہ کراچی — پرنٹر پبلشر ماہر القادری

فاران
ماہر القادری

جلد ۱، شمارہ ۱۲،

ماہنامہ

فاران

مُدیر

ماہر القادری

مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

چندہ سالانہ

چھ روپے پاکستانی، فی پرچہ آٹھ آنے

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ گیارہ آنے

مُقامِ اشاعت

کیمبل اسٹریٹ — کراچی — (پاکستان)

نظم و ترتیب

حصہ نظم

مسلم صاحب کے افکار و معتقدات سے بہت کچھ متاثر ہو گئے۔ مولانا اسلم صاحب جیراج پوری "اہل قرآن" میں سے ہیں، "احادیث نبوی" کو وہ "تاریخ" سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، یعنی اُن کی نگاہ میں ابن خلدون، لین پول، مارگولیتھ، جسٹس امیر علی اور ایشوری پرشاد کی طرح امام مالک، مسلم، بخاری اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ بھی مورخ (Historian) ہی تھے۔ مولانا جیراج پوری نے اپنے مضامین کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی ہے اور اُن کا یہ مشن رہا ہے کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو رسول اللہ کی احادیث سے جو عقیدت ہے وہ کسی طرح مجروح ہو جائے۔ احادیث کی صحت کے روشن پہلو اور دین میں اُن کی اہمیت اور ضرورت کے علمی رُخ کو نظر انداز کر کے مولانا موصوف نے کمزور باتوں اور شبہ میں ڈالنے والی چیزوں ہی کو بار بار دہرایا ہے تاکہ رسول اللہ کی سیرت کی کتابوں اور احادیث کے مجموعوں کی حیثیت مسلمانوں کی نگاہ میں "خزانہ عامرہ"، "گلشن بے خار" اور "آبِ حیات" جیسے تذکروں سے زیادہ نہ رہے۔ یہ کام انھوں نے اس دعوے اور اعتقاد کے ساتھ کیا ہے کہ گویا وہ اس طرح اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

احادیث نبوی کی مخالفت کی تحریک (Anti Hadith movement) ہندوستان میں سب سے پہلے عبداللہ چکڑالوی نے شروع کی، چکڑالوی صاحب علیہ ما علیہ کے بعد مولانا حافظ محمد اسلم جیراج پوری نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اب اُن کے اس مشن کی تبلیغ اور توسیع کا کام پرویز صاحب انجام دے رہے ہیں۔

پرویز صاحب کی "حدیث دشمنی" کا جذبہ رفتہ رفتہ ابھار ہوا ہے، پہلے انھوں نے اشاروں اشاروں میں گفتگو کی، پھر یہ اشارے اور کنایے زیادہ واضح ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ اجمال نے تفصیل کی صورت اختیار کر لی، اور اب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس احادیث کو مجروح و مشتبہ ناقابلِ اعتبار بلکہ دین کے لئے مضرت رساں اور مضحکہ انگیز ثابت کرنے کے لئے ڈنکے کی چوٹ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، یہ فتنہ تیز تر ہو رہا ہے اور یہ بڑی تیزی سے چل رہی ہے —— اور گفتگو کا انداز اس قدر "مجتہدانہ" بلکہ "آزادانہ" ہے کہ تیرہ سو سال (اور پرویز صاحب کے مزعومہ اور مفروضہ نظریہ کے اعتبار سے گیارہ سو سال) کی مدت میں تمام مفسرین، محدثین، فقہا اور صلحا شدید غلطی میں مبتلا رہے —— بس چند معتزلی مفکرین کے بعد ہندوستان میں چکڑالوی صاحب کو سب سے پہلے شرحِ صدر ہوا، پھر مولانا جیراج پوری کے سینہ میں اس حقیقت کو ڈالا گیا اور جناب جیراج پوری نے پرویز صاحب کے کان میں جو پھونکا جاتا تھا پھونک دیا۔ —— اور اب حق و صداقت اگر کہیں ہے تو وہ ماہنامہ "طلوع اسلام" کے صفحوں یا "صاحب معارف القرآن" کے قلم اور زبان میں ہے "جو" بروایت جیراج پوری "فرادیس" وہ "صحیفۂ فطرت" "مشاہدۂ قدرت" اور "الہامِ جبریل" —— اور باقی سب اگلے پچھلوں کی روایتیں اور عقائد یکسر غلط اور ناقابلِ اعتبار!

ہماری جرأت

"حدیث" کا موضوع بہت وسیع اور پھیلا ہوا ہے، اس پر ایک مجلّہ اور تھوڑی سی فرصت میں سیر حاصل بحث نہیں ہو سکتی، پھر یہ ہمارا منصب بھی نہیں ہے —— ایاز قدرِ خود بشناس —— لیکن حق کی مدافعت کے جذبہ نے اس جرأت، جسارت اور اقدام کے لئے مجبور کر دیا، یہ کام "اہل ذکر" اور "راسخون فی العلم" کے کرنے کا تھا۔ مگر صداقت اور حق کو رسوا ہوتے دیکھ کر منبر اور محراب خاموش ہوں تو کیا "مدعیے" بھی چپ پڑے رہیں گے۔ آخر خاک نشین کب تک اہل منبر کی حرکت و عمل کا انتظار دیکھتے رہیں، یہاں ترکش پر ترکش خالی ہوتے جا رہے ہیں اور یہاں اب تک نہ سپر کا انتظام ہے اور نہ زرہ کا کوئی بندوبست ہے! ہم نے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اللہ کا نام لے کر نگارش کی ابتدا کر دی ہے، اسی کا کرم اس قافلہ کو منزل تک پہنچائے گا، سچائی کی تاریخ گواہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے کمزوروں اور ضعیفوں سے بڑے بڑے معرکے سر کرائے ہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی چڑیوں میں اس بلا کی طاقت اور جرأت پیدا کر دی ہے کہ اُن کے سامنے ہاتھیوں کے لشکر غبار بن کر اڑ گئے ہیں۔

پرویز صاحب "حدیث دشمنی" میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ اُن کی واپسی دشوار اور مراجعت قریب قریب ناممکن نظر آتی ہے۔ ارباب حق اور طالبِ صداقت کی ہر مرحلہ میں اصلاحِ حال ممکن ہے۔ مگر جس شخص نے یہ سمجھ لیا کہ میں خود اپنی جگہ "حقیقت" "حق" ہوں، "ہمہ دانی" کا غرور ایسے قلب کو سخت بنا کر گداز سے محروم کر دیتا ہے —— اور حق واضح ہو بھی جائے تو بھی اس کی شخصیت اس راہ کا سنگِ گراں اور حجابِ اکبر بن جاتی ہے، نفس پکارتا ہے "کہ لوگ کیا کہیں گے"؟ اور پھر سچائی کی آواز اتنی دب جاتی ہے کہ اُبھرنے نہیں پاتی، اپنی شخصیت اور شہرت و ناموری کے مجروح ہو جانے کے ڈر سے

یہ صاحبِ معارف القرآن کی تحریر ہے یا رباعیاتِ خیام کی شرح کا کوئی ورق ہے۔ بابر کے اس رنگین مصرعہ سے
(بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست) کی روح پرویز صاحب کی عبارت میں انگڑائیاں لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور قص خانوں، کلب گھروں، سینما ہالوں اور آرٹ گیلریوں کو مژدہ کہ اُن کی عظمت اور اہمیت کے مضمون پر دین اور قرآن کی مہرِ ثبت کرنے کے لئے ایک دانائے راز پیدا ہو گیا ہے! دین اور اسلام کی روح سے بیگانہ ہیں وہ لوگ جو عورتوں کے حسن کے انعامی مقابلوں پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، یہ تو عین دین کی خدمت ہے۔ اس لئے کہ: —

"دین کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے آتا ہے ... (صفحہ ۱۰۵ ... طلوعِ اسلام)

کراچی میں جو پارسا عورتوں نے "مینا بازار" لگایا تھا اور جس میں رخسار کی سرخی، گوری پنڈلیوں کی چمک گداز بانہوں کی لچک "عزاروں کی زیبائش اور چہروں کی آرائش" سے حسن میں جو نت نئے اضافے کئے تھے وہ دین کی سب سے بڑی خدمت تھی۔ اس لئے کہ "دین کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے کا نام ہے ......"

دل کی چوری کوئی لاکھ چھپانا چاہے مگر نہیں چھپ سکتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کس "کے خوش کرنے کے لئے دین و قرآن کے نام پر فقہ اور حدیث کی مخالفت کر کے "حسن آرٹ اور موسیقی اور شگفتہ اسبابِ آرائش" کی پرزور حمایت کی جا رہی ہے! اقبال نے کہا تھا۔

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں ۔ لرز اٹھتا ہے آوازِ اذاں سے

مگر پرویز صاحب کی چالوں کی باریکی سے بیچارے واعظ اور ملا کی سمجھ میں کہاں آسکتی ہیں اور یہ وہ صاحب ہیں جو محدثین اور فقہاء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے بادشاہوں کے ساتھ تعاون کیا تھا!

"مذہب" نے (بالقول پرویز) "موسیقی" کو حرام قرار دے کر "دین" کی بہت بڑی ضرورت کو غارت کر دیا۔ قوالوں، گویوں، نرت کاروں، سازندوں، جنبیٹا، میراثیوں، ڈوموں، معازفوں، کنچنیوں اور گانے والیوں کو مبارکباد دو ان کا "فن" "دین اسلام" کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ "طلوعِ اسلام" کا یہ شمارہ جس کا حوالہ دیا جا رہا ہے "انہیں خرید کر اپنے عشرت کدے میں سجا کے رکھ لینا چاہئے۔ تاکہ کوئی "مذہب زدہ" اور حدیث و فقہ کا مارا ہوا ملا حرف گیری کرے تو وہ اسے دکھا سکیں کہ ہمیں "صاحب معارف القرآن" کی بارگاہ سے یہ سرٹیفکٹ عطا ہو چکا ہے۔ تم کو ملا اور فقیہ کے مسائل میں الجھے ہوئے ہو دین کو کیا جانو! "دین" یہ ہے اور صرف یہ ہے جو "طلوعِ اسلام" کے صفحات میں پیش کیا گیا ہے —— اور اس دور میں "دین" کی سب سے بڑی خدمت گزار ام کلثوم (مصر) ملکہ پکھراج (پاکستان) اور روشن آرا (ہندوستان) ہیں جو موسیقی کے ذریعہ حسن و شگفتگی کے اسباب میں نت نئے اضافے کر رہی ہیں۔

جہاں نفس کے پجاریوں کی یہ رنگین آرزوئیں اور ایسی لطف انگیز خواہشیں دل بہر کر رہی ہوں —— وہاں ظاہر ہے کہ "حدیث اور فقہ" سے بیزاری نہ ہو تو کیا ہو جب کہ یہ حقیقت ہو کہ اس کے حدیث میں تو پہلی اچانک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ کے ڈالنے سے روک دیا گیا ہے اور غیر محرم مردوں اور عورتوں کی نظارہ بازی کو "نگاہ کا زنا" بتایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ "بازاروں کو شہر کا بدترین حصہ" فرمایا گیا ہے۔

پرویز صاحب کے اس بہاریہ قصیدہ کا ٹیپ کا بند یہ ہے:

"اس حسن (و لاونیت) کے بہم رسانی کے لئے اور تو اور، بلیئرڈ کی بھی اپنے مقام پر ضرورت پڑتی ہے: (صفحہ ۱۰۵)

اور یہ وہ صاحب ہیں جو "صوفیوں" کے "شطحیات" کو کفر اور بے دینی قرار دیتے ہیں اور جو خود اپنی ہرزہ سرائیوں اور شاعرانہ خوش فکریوں کو "دین" سمجھتے ہیں۔

فقہ اور حدیث سے جس کا نام مضمون نگار نے مذہب رکھا ہے بیزاری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ؎ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے، وہ بچہ کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد تک) ایک ایک قدم پر اپنا

؎ یعنی مذہب

ختم نامہ کرتا ہے، دایاں قدم اٹھاؤ تو یہ کرو، بایاں قدم اٹھاؤ تو یہ پڑھو، پانی پیو تو یوں کرو، روٹی کھاؤ تو یہ کرو ۔ ۔ ۔ (صفحہ ۱۰۶)

جو چیز "مذہب" کے مناقب میں لکھی جانی چاہئے تھی، پرویز صاحب کی نگاہ میں وہ اُن کے معائب میں شامل ہے، سچ تو یہ ہے کہ حد سے زیادہ دشمنی اور مخالفت آدمی کو عیب جو، کج نگاہ اور غلط اندیش بنا دیتی ہے! دینِ اسلام ایک ایسا مکمل نظام اور ضابطہ ہے کہ جو زندگی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے، اسلام زندگی کے ہر کام میں نظم، خوش سلیقگی اور حسنِ ترتیب چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ابھی ابھی پرویز صاحب نے حسن و راستی کی موزونیت کے قیام اور اس کی افزائش پر زور دیا تھا اور حیرت ہے کہ چند سطروں کے بعد ہی حافظے نے جواب دے دیا، ہم مضمون نگار سے پوچھتے ہیں جانوروں کی طرح غٹ غٹ پانی پینے میں موزونیت پائی جاتی ہے یا صبر و وقار کے ساتھ سیدھے ہاتھ میں برتن تھام کر تین بار گھونٹ گھونٹ کرکے پانی پینا اچھا دکھائی دیتا ہے۔

پرویز صاحب کے دفتر کا کوئی کلرک اگر ایسی فائل لے کر اُن کے سامنے آئے جس کے ورق پھٹے اور بکھرے ہوئے ہوں اور جب اُسے ٹوکا جائے کہ میاں! مسل کو سلیقہ کے ساتھ مرتب کرنا چاہئے اور وہ اس کے جواب میں کہے کہ صاحب! یہ قدم قدم پر پابندیاں مجھ سے برداشت نہ ہوں گی کہ خوش خط لکھو، حاشیہ چھوڑ دیا کرو، کاغذ کے کونے نہ مڑ جائیں، آپ تو یہ دیکھئے کہ میں نے نوٹ کس محنت اور دیانت کے ساتھ مرتب کیا ہے، صورت اور ظاہر کی پابندی میں کیا رکھا ہے کام کی اسپرٹ کو دیکھئے! تو کیا کلرک کے اس جواب کو اطمینان بخش سمجھ لیا جائے گا؟ نہیں ہرگز نہیں! کلرک کو بتایا جائے گا کہ فائل کے اوراق کی ظاہری خوش سلیقگی اور قرینے سے ترتیب بھی تمہارے فرائض میں داخل ہے۔

یہ تو اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری کی دلیل ہے کہ اس نے انسانی زندگی کی جزئیات تک میں خطا و صواب، سلیقہ اور بے سلیقگی کے دونوں پہلوؤں کی نشان دہی کر دی ہے ــــــــ اب رہا پانی پیتے، روٹی کھاتے اور چلتے پھرتے ہوئے دعا پڑھنا اور اللہ کا نام لینا تو یہ بھلائی کا مشورہ جو حکم کی نہیں استحباب کی حیثیت رکھتا ہے، آخر پرویز صاحب کی طبع نازک پر گراں کیوں ہے؟ کیا قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کو اٹھتے بیٹھتے یاد کرنے اور اس کی تسبیح و تہلیل اور تحمید و تذکیر کے اشارے نہیں ملتے ــــــــ اور اس دور میں تو کھانا کھاتے وقت اللہ کا نام لینا اور بھی ضروری ہے، شیطان نے نفس کے چٹخاروں میں سوسائٹی کو اس قدر الجھا دیا ہے کہ کھانے کے دوران میں پیانو اور بینڈ ہی نہیں بجتے، بلکہ ناچ بھی ہوتا ہے، اخباروں میں اعلانات چھپتے ہیں کہ فلاں فلاں ہوٹل اور کلب گھر میں "ڈنر کے وقت" یہ یہ ناچ ہوگا ــــــــ لیکن پرویز صاحب کی نگاہ میں حسن و زیبائش "اور" آرٹ" کے یہ مظاہرے "تو دین" کے منشا کو پورا کرتے ہیں، اس لئے کہ قرآن شریف میں رقص و رنگ کے بارے میں کچھ کہا نہیں گیا" اور احادیث نبوی جن میں اس قسم کے فواحش کی ممانعت آئی ہے، وہ پرویز صاحب کے "خود ساختہ دین" میں قبول نہیں کی جاتیں۔

اسی "منشورِ ہدایت" اور "صحیفہ قدس" میں (صفحہ ۱۲۴) پر ارشاد ہوتا ہے :-

"اگر مسلمان مزید ذلت و خواری سے بچنا چاہتا ہے تو اسے بہرحال مذہب کو چھوڑنا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔" اور "مذہب" سے مضمون نگار صاحب کی مراد وہ نظامِ شریعت ہے جو "حدیث اور فقہ" سے ماخوذ ہے، وہ "قرآن" پر غور و فکر اور تحقیق و تفقہ کی دعوت بڑی شد و مد کے ساتھ دیتے ہیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ قرآن کو اُس طرح نہ سمجھا جائے، جس طرح اُسے رسول اللہ اور صحابہ کرام نے سمجھا اور عمل کرکے دکھایا ہے۔ وہ قرآن اور فکر و فہم کے درمیان سے "اسوۂ رسول" کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ اُن کا "خود ساختہ دین" نام ہی اس کا ہے کہ قرآن اور انسانوں کے درمیان صحابہ کرام کے تعامل اور رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کا واسطہ نہ رہے۔ احادیث اور تفاسیر کی مدد سے گر قرآن کو سمجھا گیا تو آزادی فکر مجروح ہو جائے گی اور ذہن و فکر آبا پرستی اور تقلید کے غلام بن کر رہ جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں! "معارف القرآن"[1] سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس سے استفادہ نہ کرنا بہت بڑی بدبختی اور دین کی عظیم الشان سعادت سے محرومی ہے! دینی بصیرت حاصل کرنے اور قرآن سمجھنے کے سلسلہ میں مجدد وقت مولانا چودھری اور علامہ زماں حضرت پرویز مدظلہ کے ارشادات گرامی اور ملفوظاتِ مقدس کو دلیل راہ بنایا جا سکتا ہے بلکہ بنانا چاہئے۔ لیکن اگر کہیں غلطی سے عبداللہ ابن عباس، ابو قتادہ، سدی اور ابن کثیر کا حوالہ درمیان میں آگیا تو بس، آپ جب سے منکر و گمراہ ہو جائیں گے (معاذ اللہ)

پورا مضمون اسی افسانوی انداز میں لکھا گیا ہے، جگہ جگہ شاعری فرمائی ہے کوئی ورق فسانۂ عجائب ہے تو کسی صفحہ پر "مثنوی زہر عشق" کا سماں

[1] پرویز صاحب کی تصنیف

نظر آتا ہے۔ وہ شعر و افسانے کی اس "دفتر رنگین و رقیق" کو حدیث رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ نہ کوئی ایسی ذمہ داری ہے اور نہ اپنے منصب کا احساس۔ بس افسانہ نگار کی طرح "پلاٹ" سوچا اور قلم چلنے لگا اور اس خاکہ کو نباہنے اور افسانہ کی "ٹیک ٹاک" کو درست رکھنے کے خیال سے جس کی تائید میں جو جی چاہا پیش کر دیا۔ جس شخص کے دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف ہے وہ دین کے ساتھ اس قسم کا مذاق کر ہی نہیں سکتا۔

اور سنیے یہ ہے ایک [illegible] زندگی اور ذوق کے بعد پرویز صاحب کے تاش (Playing cards) میں بڑھیا سے [illegible] پتّے بچھے آتے تھے۔

"قرآن نے اس دین کے نظام کی عملی اور محسوس صورت کو نظام صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے (حاشیہ) مذہب میں یہی "نظام صلوٰۃ" "نماز" کے لفظ میں تبدیل ہو گیا ..... (صفحہ ۱۰۲)

یعنی یہ جو صبح و شام اور قیام و قعود کے ارکان کے ساتھ جو "نماز" پڑھی جاتی ہے اُسے محدثین اور فقیہوں کے بنائے ہوئے "مذہب" نے [illegible] تراش لیا، خواہ مخواہ مسلمانوں پر مسلط کر دیا ہے اور نظام صلوٰۃ کی جامعیت میں اس "نماز" کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ کیا اس مضحکہ خیز اور خود ساختہ نظریہ اور گمراہ کن تفسیر کی زد اُس ذاتِ مقدس کے "طرزِ عمل" پر براہِ راست جا کر نہیں پڑتی جس کو اللہ تعالیٰ نے۔

یا ایہا المزمل قم اللیل الا قلیلاً

کہہ کر مخاطب فرمایا ہے۔ کیا راتوں کی تہجد میں "المزمل" (فداہ ابی و امی) کا "قیام" "نظام صلوٰۃ" کی جامعیت سے علیحدہ کوئی چیز ہے ــــ آخر یہ کیا ہو رہا ہے! قرآن کے نام پر لوگوں کو الکتاب [illegible] کی دعوت اور پھر قرآن اور صاحب قرآن سے اس قدر دوری، بیزاری اور تحریف و التباس کی یہ سرگرم کوششیں ہو رہی ہیں۔ قرآن کی [illegible] بڑا پُر اسرار، باریک، پُر پیچ اور دھوکہ میں ڈال دینے والا ہے یہ ایک نئے "دین" کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ یہ کفر و زندقہ کی طرف مزید ایک قدم ہے ——— اور اس لذت پرست دور اور عہد فسق و فجور میں جان کر بلکہ اُس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تحریک شروع کی گئی ہے کہ لوگ اپنے نفس کے تقاضوں کے جواز کے لئے کچھ رخصتیں، بہانے اور دلیلیں چاہتے ہیں۔ سو اُن کے لئے "دین" کی ترقی کے نام پر حسن، آرٹ، موسیقی اور شگفتہ اسباب و آرائش کی آڑ لے کر خود "قرآن" سے کچھ دلیلیں اور جواز و اباحت ہی نہیں بلکہ استحباب اور افادیت کی کچھ سندیں فراہم کر دو ——— اور نماز روزہ کی پابندیوں سے لوگ پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں اُن کے واسطے قرآن ہی کا حوالہ دے کر بتاؤ، سمجھاؤ اور اُن کے دل میں اُتار دو کہ قرآن نے صلوٰۃ کا جو جامع نظام پیش کیا تھا اُس کو مذہب نے خواہ مخواہ کھینچ تان کر "نماز" میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسی انداز پر روزے، حج، زکوٰۃ اور تمام فرائض و واجبات کی یہی تعبیر کرتے چلے جاؤ، پھر کیا ہے ہوس پرستوں، تن آسانوں اور تکلیفات شرعی سے پیچھا چھڑانے والوں کی ایک جماعت آسانی کے ساتھ جمع ہو جائے گی اور قیادت و امامت کی مسند پر تم آپ ہی آپ (automatically) براجمان ہو جاؤ گے۔

[illegible] اس طرف کیوں جانے لگے جہاں پانچ وقت کی نماز پڑھنی ضروری ہو، جہاں سال کے تیس اُنتیس دنوں میں بھوکا پیاسا اور عبادت کی لذت سے دور رہنا پڑے، جہاں شراب و سرود کی ممانعت ہو، جہاں غیر محرم عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ اختلاط کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، جہاں نائٹ کلبوں، رقص کی محفلوں اور کلب گھر کی قمار بازی کو ناجائز بتایا جائے ——— اور یہ سب پابندیاں خدا کی طرف سے بھی نہ لگائی گئی ہوں بلکہ متشدد ملّاؤں، ظاہر پرست مولویوں اور دین کی روح اور قرآن کے پیش کئے ہوئے نظام جامع سے ناآشنا فقیہوں نے اپنی "سیادت اور پاپائیت" برقرار رکھنے اور "ملوکیت" کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے "مذہب" کے نام پر ایجاد کر دی ہوں، جن سے نہ حالؔ (دنیا) میں کوئی نفع ہو اور نہ مستقبل (آخرت) میں اُس کا کوئی اندیشہ ——— لوگوں کو تو اُس "دین" کی طرف فوج در فوج جانا چاہیے جہاں نماز، روزہ، حج اور دوسرے واجبات کی پابندیاں، وقتوں، جھمیلوں اور ذمہ داریوں سے نجات مل جائے، جہاں [illegible] کی مصداق ہی "الصلوٰۃ" کو ناقابل توجہ بلکہ بے نتیجہ اور غیر ضروری سمجھ کر انفس و آفاق پر غور کرتے رہنا زیادہ ضروری ہو، جہاں نہ گناہ پر کوئی حساب ہو اور نہ دست و پا پر کوئی پابندی! آدمی اپنی عقلِ آزاد اور فکرِ بے قید کے ذریعہ اپنے ذوق، حالات اور مزاج کے مطابق جو جی چاہے کرے اور صلاحیتوں سے کام لینے کی راہ خود متعین کرے، دل چاہے تو تھوڑی دیر پری جمالوں کے ساتھ ناچ بھی لیا

غالباً [illegible] آخرت سے حال اور مستقبل کی اصطلاحیں پرویز صاحب کی ایجاد کردہ ہیں۔

میں گرفتار ہیں، پرویز صاحب کو سب سے پہلے تقلید کی زنجیریں توڑنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے، ان کی جو کوئی بات مانے گا وہ تو "آ" و منکر ہے اور جو کوئی ابو حنیفہ اور شافعی کے اقوال کو تسلیم کرے گا وہ "تقلید" کے عظیم الشان جرم کا مرتکب ہوگا۔

اس متمدن دنیا میں تقلید سے بچنا کسی عنوان ممکن نہیں، تقلید کے بغیر انسانوں کی معاشرت کا کارخانہ چل نہیں سکتا اور چلے گا بھی تو اس مشین کی طرح چلے گا جس کے تمام کل پرزے ڈھیلے ہوگئے ہوں۔ تقلید انسان کی فطرت کا طبعی تقاضا ہے، بچہ اگر اپنے گھر والوں کی حرکتوں اور باتوں کی تقلید اور نقل نہ کرے تو اسے نہ بولنا آئے اور نہ چلنا آئے۔ سورۂ فاتحہ جس کے پڑھے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی، اس میں ہم اللہ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں "بارالٰہا! ہمیں سیدھی راہ دکھا ------ وہ راہ جو صراط الذین انعمت علیہم، اُن لوگوں کی ہے جن پر تو نے انعام فرمایا۔" تو فلاح و ہدایت اور سعادت کی راہیں "الذی" یا "الذین" کی تقلید سے آدمی بچ کس طرح سکتا ہے، صراط مستقیم کوئی لکیر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے زمین پر کھینچ دی ہے، یہ عبارت ہے اس راستہ سے جس کے حدود اللہ تعالیٰ نے بتا دیئے ہیں اور اس راستہ میں انبیاء اور صلحاء کے نقش پا نظر آتے ہیں ------ اب کوئی سیدھے راستہ پر چلنے سے اس لئے انکار کردے کہ دوسروں کے چلے ہوئے راستہ پر قدم بڑھاتے ہوئے مجھے تو عار آتا ہے، میں "تقلید" کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتا ------ تو پھر ایسے آدمی کو صراط مستقیم سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ نکالنی پڑے گی اور اس جنون آزادی میں وہ سیدھے راستہ سے یقیناً دور ہو جائے گا ------ اگر کہیں لوگ صدیوں سے سچ بولتے آرہے ہوں تو "تقلید" کے الزام سے بچنے کے لئے کیا سچ بولنا چھوڑ دینا چاہئے؟

ہاں اندھی اور جامد تقلید بری چیز ہے ------ یعنی ایک طرف "حق" ہو اور دوسری جانب کسی کی تقلید، تو حق کے مقابلہ میں کوئی تقلید کو ترجیح دے تو وہ تقلید یقیناً لائق مذمت ہے اور اس ذہنیت کا مقلد واقعی گمراہ ہے اور حق ناشناس بھی، تاریخ اسلام میں بعض فقہا تقلید کی شدت کے لئے بدنام ہیں ------ لیکن خود فقہا نے جامد تقلید کے بت کو توڑا ہے، امام ابو یوسف نے اپنے استاد امام اعظم ابو حنیفہ کے بعض اجتہادات سے اختلاف کیا ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ فقہ جامد تقلید کے مخالف تھے اور حق واضح ہو جانے کے بعد کسی کی "تقلید" پر جمے نہ رہتے تھے۔

دنیا کے کسی فن میں سب کے سب مجتہد نہیں ہوا کرتے، اجتہاد و قیادت کا منصب چند ہی کو ملتا ہے اور وہ لوگ جو Authority سمجھے جاتے ہیں اُن کے قول و عمل، رائے اور اجتہاد کو حجت مانا جاتا ہے۔ زندگی میں آدمی ذرا سی دیر کے لئے بھی "غیر مقلد" بن کر رہ نہیں سکتا۔

پرویز صاحب نے قرآن کی اُن آیتوں کو بھی بار بار پیش کیا ہے جن میں تعقل و تفکر سے کام لینا، سوچنے اور غور کرنے کی تاکید کی گئی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے "لعلکم تعقلون" اور "لعلکم تتفکرون" جو فرمایا ہے اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ہدایت کے اصولوں سے ہٹ کر اُن کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کیا جائے، عقل کی آزادی نہیں مانگی ہے، منشا تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اُس کی نشانیوں اور انفس و آفاق میں "مومن" "مسلم" اور بندہ کا زیادہ سے زیادہ فرماں بردار بننے کے لئے غور کیا جائے۔ اگر عقل کو شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دینا اللہ کا منشا ہوتا تو پھر ہدایت کے بھیجنے بھیجنے اور فلاح و سعادت کے طریقے بتانے کی کیا ضرورت تھی، آدمی خود اپنی عقل کے زور سے اپنے لئے کوئی اصول زندگی اور طریق حیات متعین کرلیتا، اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے طریقے اور اصول بتا کر عقل کو پابند فرمادیا کہ عقل کا کام ان اصولوں کو توڑنا نہیں بلکہ اُن اصولوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے اور مضبوط کرنا ہے۔

اگر کسی کی عقل قرآن کی آیات میں غور و تدبر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو جو حرام قرار دیا ہے تو یہ حکم گرم ملکوں کے رہنے والوں کے لئے ہے کہ وہاں شراب پینے سے صحت برا اثر قبول کرتی ہے، سرد ممالک میں تو جسموں میں توانائی پیدا کرنے کے لئے اس کا استعمال ضروری ہے ------ یا یہ کہ قرآن میں "صلوٰۃ" جو بار بار آیا ہے تو اس سے رکوع و سجود، قیام و قعود اور سجدوں کے ملانے کی "نماز" ہرگز مراد نہیں ہے۔ یہ تو ایک "نظام جامع" ہے جس سے انسانی معاشرت میں تنظیم، ترتیب، ہم آہنگی اور عسکری حرکت و قوت پیدا کرنا مقصود ہے ------ یا یہ کہ قرآن میں جانوروں کی قربانی کا جس آیت میں ذکر ہے اُس کی تعمیل اس طرح کرنا کہ عید الاضحیٰ پر لاکھوں جانور ذبح کرکے کروڑوں روپیہ کو برباد کر دیا جائے لوگوں کی نادانی اور اُس حکم کی روح سے بے خبری کی دلیل ہے ------ اسی انداز پر اگر کوئی "قرآن" پر غور و تدبر کرکے نتائج

علہ اور اس لئے نماز پڑھنا غیر ضروری ہے۔

نکالتا ہے۔ اور جس کو یہ بھی دعویٰ ہو کہ میں نے جس طرح قرآن کو سمجھا ہے بس وہی حق ہے، اب تک سب لوگ قرآن کو غلط سمجھتے آئے ہیں وہ سب کے سب تقلید اور آباپرستی کے مرض میں مبتلا تھے ——— تو یہ "غور و فکر" اور "عقل و بصیرت" نہیں، کھلی ہوئی جہالت اور بہت بڑی نادانی ہے۔ اگر "عقل" "مطاع"، امام اور رہبر بن سکتی تو پھر "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بس یہ کہہ دیا جاتا کہ عقل کی اطاعت کرو، جو وہ کہے اُسے مانو ——— "اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی"، یہ حکم اس بات کی دلیل ہے کہ "عقل" کو اطاعت کا پابند بنا دیا ہے اور وہ اس "اطاعت" کے حدود ہی میں رہ کر اپنی جولانیاں دکھا سکتی ہے ——— عقل یہ تو کہہ سکتی ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے بیت المقدس، دہلی اور آیا صوفیہ کی مسجدوں سے زیادہ خوشنما اور آرام دہ مسجدیں بنا کر کھڑی کر دے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتی کہ "صلوٰۃ" سے مراد فوجی پریڈ ہے، اور جو مسلمان فوجی پریڈ کرتا ہے اُسے "نماز" پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، بہرحال خود ہی نگراں "صلوٰۃ" سے اور پریڈ کرنے والا "متقی"! اور یہ بھی کہ مذہب سے "صلوٰۃ" جیسے نظام جامع کو "نمازیں" بدل کر دیا وہ قرآن کا منشا نہیں ہے رفعتوں پابندیاں — اس انداز کا تعقل، تفکر، تدبر اور تعمق ——— قرآن، اسلام، دین اور خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق ہے اور یہ وہ جہل مرکب ہے جس سے خدا ہر دانش پناہ مانگتی ہیں۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی! ——— یہ بات کافروں کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی اور چونکہ اُن کی عقل اس حقیقت کے ماننے اور سمجھنے سے قاصر تھی، لہٰذا اس تصور کا وہ مذاق اڑاتے تھے، اور نبی کے بارے میں اُن کی عقل نے یہ معیار مقرر کیا تھا کہ نبی کے ساتھ فرشتوں کی فوج اور سونے چاندی کے خزانے ہونے چاہئیں، زمین و آسمان میں ہر طرح کے تصرف کرنے کی قدرت کا اُس میں پایا جانا ضروری ہے، وہ اشارہ کرے تو مکہ کی آبادی کو جو پہاڑ گھیرے ہوئے ہیں، آن کی آن میں ہٹ جائیں اور ہمارے باپ دادا اُس کی دعا سے زندہ ہو جائیں ——— یہ کیسا نبی ہے جو اپنی ضرورتوں کے لئے بازاروں میں آتا جاتا اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے، عقل کی یہی نکتہ آفرینیاں اور "چناں چنیں" اُن کے حق میں حجاب اکبر بن گئی۔ ——— وحی، ہدایت، فطرت اور دین کے اصول عقل کے پابند نہیں ہوتے، بلکہ عقل اُن کی پابند اور محتاج ہوتی ہے اور اُن کی کنہ، غایت اور مصلحت کسی کی سمجھ میں نہ بھی آئے تو بھی اُن کا مان لینا ضروری ہوتا ہے۔

احادیث

صاحب "معارف القرآن" اور اُن کے اُستاد محترم مولانا جیراجپوری رسول اللہ کی احادیث کو "تاریخ" سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں ——— کیا حدیث اور تاریخ ایک ہی چیز ہے؟ یہ نقادوں نہیں خالص علمی سوال ہے۔ ہر قوم اور ملک کی تاریخیں موجود ہیں اُن کو پڑھئے اور پھر احادیث پر نگاہ ڈالئے۔ احادیث میں جس طرح راویوں کی ثقاہت، پاکبازی، فہم و حافظہ اور دوسری خوبیوں اور صفتوں کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے، کیا تاریخ بھی اپنے روایت کرنے والوں کو اسی معیار پر جانچتی ہے؟ حدیث میں جس طرح اسناد کے اعتبار سے روایتوں کی اقسام موجود ہیں تاکہ اُن سے استفادہ کرنے والے بحث پڑھنے میں لوگ دھوکا نہ کھا سکیں کیا "تاریخ" کے ذخائر میں بھی اس قسم کی ترتیب، تقسیم اور امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں؟ کیا تاریخ علم حدیث کی طرح اپنے راویوں کا "اسماء الرجال" پیش کرتی ہے؟ اصل لفظ "تاریخ" سے کوئی چڑ نہیں ہے، رسول اللہ کی سیرت کے واقعات کو "مستند ترین تاریخ" بھی کہا جا سکتا ہے، مگر جو لوگ احادیث نبوی کو "تاریخ" کے درجہ میں رکھنا چاہتے ہیں اُن کی اس کوشش کی بنیاد یہ تصور ہے کہ رسول اللہ کی احادیث کی اس طرح شرعی حیثیت (Legal position) باقی نہ رہے گی اور دینی احکام اور معاملات میں اُن کو حجت اور سند نہ بنایا جا سکے گا ——— یہی جذبہ حدیث کو بار بار "تاریخ" کے نام سے پکارتا ہے!

تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا جائے کہ احادیث کی تاریخ سے زیادہ حیثیت نہیں ہے، ہمارے سامنے رسول اللہ کی حیات مقدسہ کی تاریخ ہے اور دوسری طرف دوسرے مشاہیر کی تاریخیں ہیں اور یہ دونوں تاریخیں مستند اور معتبر بھی ہیں، زرتشت، سیزر، قسطنطین، اشوک، بدھ، مزدک، کنفوشیس، افلاطون، سکندر، شارلیمین، امرء القیس، کالیداس، اکبر، جہانگیر، چنگیز اور شنکر کی زندگی کے تاریخی واقعات اور رسول اللہ کی تاریخ سیرت میں مسلمانوں کو کسی قسم کا فرق اور امتیاز کرنا چاہئے یا نہیں؟ حضور کی زندگی کا تاریخی واقعہ جو مستند تاریخ سے ثابت ہے کیا وہ اسی قابل ہے کہ تاریخی افسانوں کی طرح

محدثین انسان تھے فرشتے نہیں تھے، اُن سے بھول چوک بھی ہوئی ہے مگر اس کبھی کبھی کی بھول چوک کے سبب، جو انسان کی فطرت ہے اُن بزرگوں کے تمام کارنامے تو بے اعتبار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ ان نفوسِ قدسیہ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ مشہور محدث امام وکیعؒ اپنے باپ کی روایت کو اُس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دوسرا راوی اُن کے باپ کی تائید نہ کر دے۔

بلاشبہ بعض جھوٹے راوی غلط بے اصل اور موضوع حدیثیں بھی اپنی طبیعت سے جوڑ جوڑ کر بیان کرتے تھے اور وہ احادیث کے مجموعوں میں شامل ہیں مگر ناقدینِ حدیث نے اس جنسِ بازار کی نشان دہی ایک بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں مال ناقص اور بناوٹی ہے۔ "موضوعات" پر کتابیں موجود ہیں ــــــــ یہ کتنی بے عقلی کی بات ہے کہ پھولوں کے ڈھیر میں اگر کسی نے کانٹے بھی ڈال دیے ہوں، تو کیا اُن کانٹوں کے سبب پھولوں کا چھونا بھی گوارا نہ کریں اور یہ سمجھ لیں کہ اس ڈھیر میں سارے کانٹے ہی کانٹے ہیں ــــــــ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ کانٹوں کو الگ نکال کر رکھ دیں۔ اور پھولوں کے رنگ و بو سے فائدہ اٹھائیں۔

محدثین کی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ دینی کو ہزار آفریں کہ انھوں نے ضرورت اور افادیت کے اعتبار سے پوری جرح و تعدیل کے بعد احادیث اور اُن کے مجموعوں کے کم مستند، مستند، مستند تر اور مستند ترین (most authentic) ہونے کو ظاہر کر دیا ہے یہی سبب ہے کہ رسول اللہ کے عہد مبارک کی سند میں جن کا شریعت کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بخاری، مسلم اور ترمذی کے علاوہ خصائص اور لغوآہب تک کی روایتیں قبول کر لی جاتی ہیں۔

منصبِ نبوت

اُسوۂ رسولؐ اور احادیثِ نبویؐ سے اس بے اعتنائی اور اُنھیں دین میں حجت، مستند اور قابلِ اتباع نہ سمجھنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ منکرینِ حدیث، نبی کے منصب اور اُس کی حیثیت سے یا تو قطعاً بے خبر ہیں یا پھر جان کر وہ اعراض برتتے ہیں ــــــ ـــ ـ ـ حیرت ہے کہ تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کے یہ لوگ مدعی ہیں اور "قرآن، قرآن" پکارتے پکارتے اُن کی زبانیں خشک ہوئی جاتی ہیں۔ مگر خود قرآن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کہتا ہے، اُسے نہیں پڑھتے اور جو پڑھتے ہیں تو اُسے سمجھ نہیں سکتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں تو پھر یقیناً وہ کسی شدید روحانی بیماری میں مبتلا ہیں جو قبولِ حق سے انھیں روکتی ہے ـ ـ ــــــ

نبی اور رسول کی حیثیت معاذاللہ ڈاک کے ہرکارے کی طرح نہیں ہے جس کی بس اتنی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ بھیجنے والے کی چٹھی مکتوب الیہ تک پہنچا دے، اُس خط کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا کہ اس میں آخر لکھا کیا ہے؟ اور بھیجنے والے نے یہ مکتوب کس غرض سے بھیجا ہے؟ اور اگر وہ کچھ جانتا بھی ہے تو اس کی کوئی تشریح نہیں کرتا۔ نبی تقیناً مرسِل (اللہ تعالےٰ) اور مرسل الیہ (مخلوق) کے درمیان مُرسَل، قاصد اور پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ کا پیام بندوں تک وہ پہنچاتا ہے، مگر پیام پہنچانے اور وحی کے الفاظ کی قرأت اور تلاوت کرنے کے بعد اُس کا کام ختم نہیں ہو جاتا ــــــــ ـــــ بلکہ:-

لقد من اللہ علے المومنین اذ بعث فیہم رسولاً من انفسہم یتلو علیہم اٰیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ	بے شک اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن میں ایک پیغمبر انھیں میں سے بھیجا، جو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اُن کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

وہ لوگ جو عقل و دانش کا اپنے کو ٹھیکیدار سمجھے ہوئے ہیں، جن کے ناخنِ فکر نے انفس و آفاق کی الجھنوں کو سلجھایا ہے، اور جو اس کے دعوے دار ہیں کہ قرآن کی روشنی میں عقل و بصیرت کے ذریعے "دین" کو جس طرح انھوں نے سمجھا ہے، کم سے ایک ہزار سال سے تو اس طرح دین کو سمجھنے کی کسی بیچارے کو توفیق نہیں ہوئی ــــــــ تو ان کی عقل جہاں "احادیث" کی کمزوریاں دکھانے اور حدیث و فقہ پر طعن و طنز کرنے کا موقع تاکتی ہے، اُس وقت انتہائی چالاک، نکتہ سنج اور تیز بن جاتی ہے مگر قرآن کی جن آیات میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور حیثیت کو متعین فرماتا اور بتاتا ہے کہ ہم نے نبی کو اس اس کام کے لئے بھیجا ہے، وہ آیتیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں، اور جو سمجھ میں آتی ہیں۔ تو

کے جلو میں کعبہ میں اس شان سے داخل ہوتے ہیں کہ عاجزی و مسکنت کو دیکھ کر ابوسفیان کا دل دہل گیا ——— اُس وقت بھی آپ نبی تھے —
خندق میں پتھر ڈھوتے ہوئے، اُحد میں زخمی ہوتے وقت حدیبیہ میں صلح کی گفتگو فرماتے ہوئے، تبوک میں فوج کی کمان کرتے ہوئے ———
اور جب "معراج" میں "سدرۃ المنتہٰی" کی بلندیوں سے سرفراز ہو رہے تھے، جب آپ کو کئی کئی وقت فاقہ تھا، جب ضرورت مندوں کو مالِ
غنیمت بانٹ رہے تھے، "جب حسنؓ اور حسینؓ حضور کے دوشِ مبارک پر سوار تھے، جب ابراہیم کی موت پر آنکھیں اشکبار تھیں، جب سیدہ
فاطمہؓ کو دیکھ کر فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، جب عائشہؓ کی غمگساری اور دلدہی کرتے ہوتے، جب حجۃ الوداع میں خطبہ ارشاد فرما
رہے تھے، جب بیماری میں ابوبکر صدیقؓ کو نماز کی امامت کرنے کا حکم دیا تھا ——— ان تمام حالتوں میں آپ "نبی" ہی تھے اور
حضور کی زندگی کے انہی واقعات سے "اُسوۂ حسنہ" عبارت ہے جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور رسول اللہ کی مقدس زندگی
حدیث کی کتابوں میں ہی ملتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم و تزکیہ اور کتاب و حکمت کے معلم تو تھے ہی ...اور.........

فان تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہ والرسول — اگر کسی چیز میں تم جھگڑنے لگو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ (یعنی حکم مانو)

اگر متنازعہ امور میں "قرآن" کے علاوہ اور کوئی چیز حجت ہی نہیں ہو سکتی تھی تو صرف "فردوہ الی اللہ" کہنا کافی تھا "والرسول"
سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب کے بعد رسول اللہ کی "سنت" بھی دلیلِ راہ اور حکم بن سکتی ہے اور بنی چاہئے اور اس کی ضرورت پڑتی
رہتی ہے کہ جس اللہ نے قرآن کو ہدایت و جامع دستور بنا کر نازل کیا ہے وہی اللہ اطاعتِ رسول اور اُسوۂ حسنہ کے اتباع کا حکم دیتا ہے۔

قرآن آخری دستورِ حیات اور صحیفۂ ہدایت ہے، توریت، انجیل، زبور اور صحفِ ابراہیم کی طرح یہ کبھی کسی کے اثرات قبول نہیں کر سکتا، اُس کا پیام
ہر وقت نیا اور اس کی روح تر و تازہ ہے ——— قرآن لکھ کر لایا نہیں بھیج دیا گیا اور نہ اس کا ایک حرف رسول اللہ کے سوا اور کسی پر نازل
ہوا ——— رسول اللہ جن آیتوں کے بارے میں فرماتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے کہ یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے اتاری اور
وحی فرمائی ہیں وہی قرآن اور کتاب اللہ ہے ——— اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم اور تفہیم کا کام رسول اللہ کے سپرد فرمایا تھا، رسول اللہ
اپنے قول و عمل سے قرآن کی تعلیم دیتے تھے، اسی لئے آپ کا "اُسوۂ حسنہ" لائقِ اتباع قرار دیا گیا، تو جس طرح صحابہ کرام قرآن کے سمجھنے میں
رسول اللہ کی تعلیم کے محتاج تھے اسی طرح قرآن کا کوئی پڑھنے والا بھی رسول اللہ کی تعلیم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی روح
اور معانی تک پہنچنے کے لئے آپ کی ذات کو ذریعہ بنایا ہے۔ ——— پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اسی طرح
ضرورت تھی کہ رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کا ایک ایک نقش تک محفوظ کر لیا جائے تاکہ قرآن پڑھنے والے اپنی عقل سے تیر تکے لڑا کر بھٹکنے نہ پائیں
قرآن کے ساتھ معلمِ قرآن کی تعلیمات کا محفوظ رہنا بھی بہت ضروری تھا ——— ——— تاکہ اس طرح تزکیۂ نفس اور تعلیمِ حکمت کی ضرورت
بھی پوری ہوتی رہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے اور اُس نے بندوں کے لئے بڑی سہولت مہیا فرما دی ہے کہ "کتاب" نازل فرمائی
تو اُس کے ساتھ کتاب کے معلم رسول کو بھی بھیج دیا، اس احسان کا اظہار اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے، تاکہ بندے اس کی قدر کو پہچانیں،
قرآن کے ساتھ رسول اللہ کی تعلیمات اور آپ کے اُسوۂ حسنہ کا انتہائی گہرا ربط ہے اور جو کوئی اس سلسلہ اور اس ربط کو بے وقعت اور مشتبہ بنانے
کی سعی کرتا ہے وہ قرآن کی حمایت کی آڑ میں درحقیقت رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کے خلاف محاذ بنا رہا ہے!

مثالیں

قرآن کی تفسیر میں احادیث کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے، اس کی چند مثالیں پیش کر کے ہم مضمون ختم کر دیں گے۔

(۱) قرآن میں آیا ہے:- ولقد اٰتیناک سبعًا من المثانی والقراٰن العظیم "(ہم
نے دی تم کو سبع مثانی اور قرآن عظیم دیا) سبع مثانی کیا ہے؟ اس کا جواب رسول اللہ کی حدیث دیتی ہے کہ یہ "سورۃ فاتحہ" ہے!

(۲) وانزلنا من السماء ماءً طهورًا " (اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اُتارا) قرآن پاک نے بارش

بات ـــــ اب یہ نہیں معلوم کہ کوئی وحشتناک بات مگر ـــــ میرے ساتھ ہونے والی ضرور ہے۔ یہ کیفیت کبھی چند گھنٹے اور کبھی چند ہفتوں تک قائم رہتی ہے اور کبھی کبھی یہ مصیبت بلا کسی ظاہری سبب کے نازل ہو جاتی ہے اور کئی کئی دنوں تک رہتی ہے۔ بلکہ اس حالت میں مجھے مختلف قسم کے لوگوں کا خیال آنے لگتا ہے۔ ان کی بزدلانہ حرکتیں اور دھوکہ بازیاں سامنے آنے لگتی ہیں۔ اور میرا ظاہری و باطنی توازن بالکل درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے کوئی دماغی عارضہ لاحق ہو جانے والا ہے؟

اجی نہیں! میں نے دوست کو خود تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔ ایسا نہیں ہے میرے بھائی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا بھی دماغی عارضہ تمہیں لاحق ہونے والا نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مخدوش یا وحشتناک بات ہے۔ یہ ایک قسم کی "خانہ جنگی" یا باطنی کشمکش ہے۔ ہزاروں بوڑھے اور جوان تمہاری طرح ہر روز محسوس کرتے ہیں۔ بعضوں پر تو ایسی کیفیت باضابطہ وقفوں سے طاری ہوا کرتی ہے اور بعضوں پر کبھی کبھی اتفاقاً ایسا اثر ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن مردوں کی بہ نسبت عورتیں ان کیفیات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ اور سبب اس کا صرف یہ ہے کہ وہ زیادہ جذباتی اور زیادہ ہیجان پذیر ہوا کرتی ہیں۔

کسی شخص کے باطن میں جو کشمکش یا خانہ جنگی برپا رہتی ہے اس کو بے چینی اور وحشت کی حالت سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ حالت اگر زیادتی پر ہو اور اس قدر مزمن ہو کہ تقریباً اکثر اوقات یہی کیفیت طاری رہتی ہو تو پھر "Psychoneurosis" سے فوراً رجوع کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ اعصابی نظام میں بگاڑ پیدا ہونے کا آغاز ہے۔ اس قسم کی حسیاتی گڑبڑ کو مزاج اور طبیعت کے نقص کا مسئلہ سمجھا جانا چاہئے۔

بہرکیف اس قسم کی کیفیات پر قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ تمہارے باطن میں جہاں اور جس گہرائی میں یہ کیفیات جب ہو رہی ہوں ان میں مداخلت کی جائے۔ تمہیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اندر ہی اندر وہ کونسی متصادم ہونے والی چیزیں ہیں۔ اس ضمن کا مطلب یہ ہے جب تم اپنے باطن کو خوب اچھی طرح جان لوگے تو پھر دیکھنا تمہیں حیرت ہوگی کہ کتنی جلد تمہارے باطن کی خانہ جنگی ختم ہو جاتی ہے۔ اصل میں خارج کوئی شے کی "کشمکش اور کشاکش پیدا کرے" یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے کی یعنی ہموار کر کے توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ (بالعموم ان چیزوں میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے جو ذہنی انتشار اور احساسات کے ہیجان سے تعلق رکھتی ہیں۔)

۳۰ سال کی ایک جوان عورت کا ایسا ہی ایک واقعہ پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔ وہ ایک مشہور کارخانے کی مجلس انتظامیہ کے نائب صدر کے ہاں سکریٹری کے عہدے پر تھی۔ مس ڈیلیو اس کا نام تھا۔ وہ بڑی محنت و مشقت اور ایمانداری کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اپنی ان جانفشانیوں اور عرق ریزیوں اور ایماندارانہ خدمات کی بدولت ترقی کر کے اس بلند مقام پر پہنچ گئی تھی جس کو وہ اپنے لئے سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

بحیثیت سکریٹری نہ صرف یہ کہ اس کو بڑی تنخواہ ملتی تھی بلکہ کمپنی میں ہر شخص اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا اور کارخانے کے معاملات میں بھی اس کو "بڑا دخل" حاصل تھا۔ وہ کہتی ہے کہ "میری اس سرفرازی و سربلندی کی وجہ سے وہاں کام کرنے والی دوسری عام لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ بہت جلتی اور حسد کرتی تھیں۔"

ایک سال تک بڑی عمدگی سے کام ہوتا رہا۔ مس ڈیلیو کو اپنے کام سے عشق تھا۔ وہ ایک جگہ چین سے نہ بیٹھتی تھی۔ وہ وقت متحرک اور ہر گھڑی مصروف۔ ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں ہے۔ وہ متحرک رہنے اور کام کرنے سے کبھی نہ تھکتی تھی۔ نہ پریشان کرنے والے مزدوروں سے اکتاتی تھی۔ دفتر کا وقت ختم ہو چکنے کے بعد بھی دیر دیر تک کام کرتی رہتی تھی اور کبھی کھانے کے بعد باقی ماندہ کام کو ختم کرنے کے لئے یا مزید احکام وصول کرنے کے لئے پھر دفتر آجاتی تھی۔

ایک سال کے اندر اندر مس ڈیلیو زرد رو اور تھکی ہاری سی نظر آنے لگی۔ اس کا جسمانی وزن گھٹ گیا چہرہ مرجھا گیا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ اور اگر

نیند آتی بھی تو ڈراؤنے خواب نظر آنے لگتے طرح طرح سے طبیعت میں انحطاط اور اضمحلال شروع ہو گیا، مرض "کام کی زیادتی" تجویز ہوا۔ معالج نے مشورہ دیا کہ چھٹی لے لو اور آرام کرو چنانچہ مس ڈبلیو چھٹی لے کر دو ہفتے کے لئے پر سکون ایک جگہ چلی گئی، لیکن واپس آئی تو پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور پریشان تھی۔

حقیقی مصیبت مس ڈبلیو کی نہ تو "کام کی زیادتی تھی" نہ اسے آرام کی "ضرورت تھی"، اصل میں وہ اندر ہی اندر ——— اپنے باطن میں ۔ مصروف کشاکش تھی، ایک شدید تصادم اس کے اندر برپا تھا اور تصادم بھی وہ جو ایک قسم کے "جرم" سے وابستہ تھا، وہ اپنے مالک کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی ——— واقعہ یہی تھا مگر وہ اس کا اعتراف اپنے ضمیر سے بھی کرنا نہ چاہتی تھی"

وہ کشاکشیں جو اس سے کم اہمیت کی ہیں اور جو بعض وقت صرف کھوکھلے طور پر محسوس ہوتی ہیں، اکثر جذباتی و حسیاتی حدود میں پیدا ہوا کرتی ہیں، ان کا اثر ہمارے تخیلات و تصورات اور ذہن و فکر پر اور عادات و اطوار پر پڑتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، مثال کے طور پر، بعض وقت تم اس حد تک پستی محسوس کرنے ہو گے کہ تمہاری گردن کے پچھلے حصہ پر جو اعصاب (رگ پٹھے) ہیں وہ کھنچاؤ کی وجہ سے دکھنے لگتے ہوں گے۔ اور ایسا غالباً اس لئے ہو گا کہ اگرچہ تم اعتراف نہ کرو لیکن ضرورت سے زیادہ امنگیں اور تمنائیں تمہارے اندر ہوں گی اور تم اپنے مقاصد کو جلد سے جلد حاصل کر لینے کی دھن میں ہو گے۔

احتساب

ہو سکتا ہے کہ تمہیں کبھی یہ محسوس ہو کہ شک و شبہ اور کسی فیصلہ پر نہ پہونچنے کی عادت پڑ گئی ہے یا پڑتی جا رہی ہے تم قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہر چیز کے لئے ثبوت اور دلیل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہو اور بالآخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کام ہی کو چھوڑ دیتے ہو اور پھر کچھ بھی نہیں کرتے، پس و پیش اور حیص بیص میں مبتلا ہو جانے کا سبب یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے کہ تمہیں خبر ہی نہ ہو کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ (خصوصاً محبت کے معاملہ میں) یہ پتہ ہی نہ ہو کہ آیا کافی گہری محبت تمہارے دل میں موجود ہے اور تم شادی کر لوگے، یا اگر شادی شدہ ہو تو شریک حیات کے ساتھ تمہاری محبت خالص اور مخلصانہ ہے، یا ہو سکتا ہے کہ تم اب بھی کسی دوسرے ہی کے سہارے پر ہو، باپ کے یا ماں کے سہارے پر ہو، کہ وہی کوئی فیصلہ تمہارے لئے کریں ——— سبب جو بھی ہو، اس کا اندازہ لگانا تو دشوار ہے کیونکہ حالات کے ساتھ ساتھ واقعات و نتائج میں بھی رد و بدل ہوا کرتا ہے لیکن ایک سبب یقینی ہے اور وہ ہمیشہ موجود ہو گا کہ تم اندر ہی اندر اپنے خلاف مصروف جنگ اور مبتلائے کشاکش ضرور ہو ——— تو بس اس کی دریافت تمہارا اہم فرض ہے۔

جنسی خیالات اور اعمال بھی تمہارے باطن میں "اعصابی جنگ" برپا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں، اور بنتے ہیں۔ اس سلسلہ میں تم جو کچھ سوچو یا محسوس کروگے وہ بلاشبہ فطری ہو گا یہ انسانی دلی بات تو ہے ہی، لیکن بچپن میں تمہاری تربیت فرض کرو غلط ہوئی، تم جذبات کے ناول پڑھتے رہے ہو یا بلڈیو کی کہانیاں سنتے رہے ہو، اپنے دوستوں سے پوشیدہ اور راز کے سوالات کرتے رہے ہو یا بعض اوقات نہایت درجہ زیادہ گندے قسم کے خیالات تمہارے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، ——— تو اس قسم کا انتشار اور بگاڑ، خوف پیدا کر دینے کا موجب ہو گا"

لیکن خوف بھی جیسا کہ تم سمجھتے ہو، خارجی دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ خود تمہارے اندر کی چیز ہے، اس لئے وہیں اس کی گرفت کرنی چاہئے اور وہیں سے اس کی جڑ اکھاڑنی چاہئے۔ زندگی کے حقائق کو سائنٹفک طور پر سیکھو، سچائی حاصل ہو جائیگی۔ اگر اس کے بعد بھی ناکام رہو تو پھر ...... Psychiatrist کا مشورہ حاصل کرو اشیاء و امور کا ٹھیک ٹھیک علم اور سچائی ہی تمہیں اپنے باطن کی کشاکش پر قابو پانے میں مدد دے سکتی ہے اور دیرپا نجات تمہیں اسی طرح مل سکتی ہے۔

یقین کرو میری یہ پختہ رائے ہے کہ مذہب کے بارے میں تمہیں اپنے آپ کو مستقیم رہنا چاہئے۔ اپنے تئیں انتشار میں کبھی مبتلا نہ ہونے دو، ذات و صفات کے بارے میں طرح طرح کے نظریات اگر موجود ہیں تب بھی تمہیں اپنی جگہ پست حوصلہ نہ ہونا چاہئے اور متزلزل صورت اختیار نہ کرنا چاہئے، جو کچھ تم کہتے ہو اس کو صرف اس وجہ سے کہ متصادم و متضاد نظریات اس کی نسبت تمہارے سامنے رکھے ہیں، اکتا کر چھوڑ نہ دو۔ کسی ایک فلسفہ کو قبول کر لو اور اس پر قائم رہو، وہی تمہارے کام آئے گا۔ بقول ولیم جیمس یہی آلی (Pragmatic) ...... سب سے بہتر تمہاری روحانیت کی ضروریات کو تشفی بخشے گا

تمھیں زیادہ شفیق و رحیم، زیادہ صاحب غور و فکر، زیادہ ایماندار، پہلے کی بہ نسبت کم سے کم مادی، کم سے کم خود غرض فرد بنادے گا۔

"تمام پست حوصلگی اپنے اندر پیدا نہ ہونے دو۔ ناموافق خیالات و احساسات سے بھی الگ تھلگ رہنے کی اور دامن بچانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ طریقہ ان سے نجات پانے کا نہیں ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوگی جیسے کسی جنگی جہاز پر سے بیٹھے بیٹھے Depth Bomb پھینک دیا ہو۔ ایسی صورت میں یہ سمجھ لو کہ تم اب بھی خطرے میں ہو۔ بم تمھارے ساتھ ہی ساتھ چل رہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت پھٹ پڑے گا اور غیر متوقع طور پر ہی پھٹے گا۔ پس تمھیں اس قسم کا کوئی احساس ہرگز پیدا نہ کرنا چاہیے جیسے تم حسیاتی و جذباتی ڈائنامیٹ اپنے دل و دماغ کے اندر لیے پھر رہے ہو۔"

اپنی غلطیوں اور خامیوں سے خبردار رہو۔ اپنی کمزوریوں سے واقف رہو۔ کسی بات سے کتراؤ نہیں یا کسی معقول اور حقیقی سبب کے بدلے کوئی دلخوش کن بات پیش کر کے اپنے ضمیر کو تسلی دے لینے کی کوشش نہ کرو۔ عقلیت پسندی (جیسی کہ ماہرین نفسیات نے اصطلاح قائم کی ہے) آسان تو ضرور ہے لیکن سخت گمراہ کن ہے۔ اپنے لیے عقلمندانہ اور منطقی بہانہ تلاش کر لینا تمھیں تھوڑی دیر کے لیے سمندر کی موجوں کی طرح اونچا ضرور کردیگا کیونکہ یہ بھی ایک طرح کی خود پسندی ہے اور اپنی چاپلوسی آپ کر لینے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن یہ کشاکش اور وہ جرم جو تمھارے اندر موجود ہے ابھرے گا ضرور، اور اس سے پہلے کہ تم اس کو سمجھ سکو تمھاری ذات کے اندر ایک شدید کش مکش اور جنگ شروع ہو چکی ہوگی۔

دوست پیدا کرنے کی کوشش کرو، اور اپنے تئیں یہ یقین دلاؤ کہ جو کچھ تم میں ہے وہ مقبول و منظور و پسندیدہ ہے۔ لیکن تمھاری دوستی خود غرضانہ اور یک طرفہ نہ ہونی چاہیے۔ اس میں زندگی کا اگر "لین" ہے تو "دین" بھی ہے۔ تعلقات ہمیشہ باہمی ہوا کرتے ہیں۔ دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی" اس سے تمھارے کردار کو تقویت پہونچے گی۔

تم جان بوجھ کر کسی نقصان نہ پہونچاؤ۔ اگر تم ظلم وایذا رسانی کے ذریعہ لطف اندوز ہونے کی (Sadism) ذہنیت رکھتے ہو تو اس کی روک تھام کرنی چاہیے۔ تمھارے اندر جو خوبیاں ہیں ان سے ہمیشہ دوسروں کو فیض پانے کا موقع ملنا چاہیے۔ اگر ایسا ہو تو تمھیں دوست رکھنے یا نئے احباب پیدا کرنے میں کسی فکرمندی کی ضرورت نہ ہوگی۔ تمھاری صفات اور صلاحیتوں کی قدر و منزلت محسوس کرکے دوسرے لوگ خود ہی تمھیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہی عمل اور یہی کردار ہے جس میں تمھاری سماجی زندگی کی کامیابیوں اور ترقیوں کا راز مضمر ہے۔ اسی کی بدولت تمھیں ذہنی تسکین اور قلبی اطمینان میسر آئے گا۔ ایمرسن نے کتنی عمدہ بات کہی ہے "دوست پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ پہلے تم خود دوست بنو۔"

ان طریقوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھو جن میں تم دوسروں سے "اتفاق" کرو لیکن اس سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ تمھیں ان طریقوں پر بھی غور کرتے رہنا چاہیے جن میں تم دوسرے لوگوں سے "اختلاف" کرتے ہو۔ بعض طریقوں میں تم چاہوگے کہ کچھ ترمیم کرلو، بعضوں کو بالکل ختم کردینے پر آمادہ ہوجاؤ اور اس کے بعد بھی کچھ باقی ہوں تو وہ ایسی باتیں ہوں گی جن کو صرف باقی ہی رکھنا نہ چاہوگے بلکہ محسوس کروگے کہ ان کو اور ترقی دی جانی چاہیے۔

بہرکیف الگ تھلگ رہنے کی خواہش اگر ہو تب بھی ایک جگہ پر قائم رہو، اور صرف اس لیے مت بھٹکو کہ رائج طریقے اور نقطۂ نظر تمھیں ناپسند ہیں۔ "بڑے لوگ" کبھی غیر مستقل مزاج اور بہکے ہوئے نہیں ہوتے۔ یہ لوگ ہمیشہ متوازن قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ تو فقط "مستقبل کے ہوشمند" اور دوسرے درجے کے لوگ ہی ہیں جو زنانے ڈھنگ پن اور بے پروایانہ بود و باش کو پسند کرتے ہیں تاکہ اس طرح لوگوں کی توجہ اپنی طرف جذب کریں۔

غیر جو کچھ بھی تم کرو اس میں مخلص نہ انداز رہنا چاہیے۔ ہمیشہ اپنے بارے میں بھی سوچ کرو۔ کسی ایماندارانہ اور قابل قدر بات کے لیے کمر باندھ کے اٹھو اور دیکھو۔ اگر تم یہ کرسکو تو جلد یا بدیر تمھیں اپنی بابت اندازہ مل جائے گا اور تاسف کے ساتھ اندازہ ہو جائے گا کہ تم واقعی کیا ہو — ایک واہیات اور بیکار قسم کی چیز — یہیں سے گویا آغاز جنگ ہو جائے گا۔ اپنے آپ سے جنگ اور اندرونی کش کش، جس کو درست کرتے کرتے اور سکون حاصل کرتے کرتے مدتیں صرف ہوجائیں گی، عرصہ گذر جائے گا۔

تمھارے باطن میں جو کشاکش سی برپا ہو اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ اگر تم اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرو یا اپنے آپ پر ہمیشہ متاسف نظر آؤ، اگر نمایاں طور پر اپنے آپ کو فکرمند پاؤ کہ نہ جانے لوگ کیا خیال کرتے ہیں، اگر تم لوگوں سے ملنے جلنے میں شرم محسوس کرو، اگر تمھیں اپنا خیال بہت زیادہ رہا کرے، اگر تم اپنے لیے حیلے بہانے تلاش کرتے کرتے تھک سے جاؤ، اگر تم شکوک و شبہات میں مبتلا رہا کرو یا بغیر کسی معقول سبب

کے غیر مطمئن رہ کر دو، اگر تم میں احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہوتا جا رہا ہو اگر طنز اور "[illegible]" کی طرف رجحان بڑھتا جا رہا ہو، اگر فردہ گیری، ورنہ وقت سے زیادہ غذا کی عادت پیدا ہوتی جا رہی ہو، اگر تم اپنے آپ کو اکیلا اور تنہا، تباہ و برباد اور دل کا بوجھ (Heart [illegible]) محسوس کرنے لگو، اور آخری چیز یہ کہ اگر تم کو اپنے کاموں سے، اپنے گھر انے سے، دوستوں سے اور روزمرہ کے حوادث و حالات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی ہو ——— تو یہ ساری علامتیں اس کی ہیں کہ تمہارے باطن میں ایک جنگ سی، کش مکش سی، کشاکش سی برپا ہو چکی ہے، تم کبھی مطمئن، قابل، صالح اور خوشحال جیسا کہ تمہیں ہونا چاہئے نہ ہو سکو گے تاوقتیکہ تم اپنے اندرون اور باطن میں امن و سکون نہ پیدا کر لو، باطن کا سکون ہی اصل چیز ہے۔

(حسن مثنیٰ ندوی نے آردو کا لباس موزوں عطا کیا)

مولانا مسعود عالم ندوی

فرض[1] اور محبت کے دوراہے پر!

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

اور وہاں حاضر ہوکر مشتاقِ دید نے جوشِ محبت کے باوجود قدم قدم پر ادب و احترام کا لحاظ رکھا —— وہ جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں'

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

لیکن کتاب و سنت کا منشا اور توحید و نبوت کا "فرقِ مراتب" پیشِ نظر رہا! بارگاہِ اقدس میں حاضر ہونے والا اس نزاکت سے واقف تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے "عقیدت" "عبادت" بن جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے —— نبیؐ کی تعلیم اور صحابہ کرام کی سنت اس کے لئے دلیلِ راہ تھی۔ اس لئے نہ جبینِ شوق میں سجدے مچلے اور نہ لبوں میں تمنائے آستاں بوسی پیدا ہوئی —— اور ایسا ہوا بھی ہو تو "رمز آشنائے توحید" اس طوفان کو پی کر رہ گیا —— یہ توفیق ہر کسی کو کہاں میسر آتی ہے!

(مدینہ منورہ)

جمعرات: ۵/۱/۱۳۶۹ھ = ۲۶/۱۰/۴۹ء

صبح ہوئی - قافلہ روانہ ہوا - اور مدینہ منورہ کی قربت طبیعت کو اکسانے لگی - ابھی تین چار گھنٹے کی مسافت باقی ہے - لیکن دل ابھی سے لرزنے لگا ہے - مدتیں گذریں - زمانہ بیت گیا - مدینہ کی حاضری کا شوق دل میں چٹکیاں لیتا رہا - بارہا فرطِ شوق میں آسی غازی پوری کا پرکیف مطلع پڑھتا رہا ہوں:-

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
تمھارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ کیا ساعت ہوگی جب یہ گنہگار خود حاضر ہو کر حضرت عالی میں سلام عرض کرے گا جب کبھی یہ خیال آیا آنکھیں پرنم ہوگئیں - درود پڑھتا

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی کے سفرنامہ "دیارِ عرب میں" کے چند ورق —— جو عنقریب کتابی صورت میں منظرِ عام پر آنے والا ہے -

اور عربی اردو کے مناسب حال شعر زبان پر جاری ہو جاتے۔

کچھ دیر کے لئے مسجد کے اسٹیشن پر موٹر رکی۔ راستے میں حجازی لاسلکی کے اسٹیشن ہیں۔ اور موٹروں کے لئے پٹرول کا ذخیرہ بھی وہاں رہتا ہے یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ ہم موٹر سے اتر پڑے۔ اور کچھ دیر چہل قدمی کی۔ قریب ہی ایک مدرسہ کی عمارت نظر آئی۔ لیکن اتنا وقت نہیں تھا۔ کہ اندر جاکر دیکھتا۔

مسجد سے بھی قافلہ آگے کو روانہ ہوا۔ اب یہ گنہگار ہمہ تن شوق ہے۔ مادیت کی خشکی کے باوجود دل پرپیچ رہا ہے۔ ان راستوں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی گذر ہوا ہو۔ موٹر نہ ہوتی تو گرد راہ سے پوچھتا۔ شاید نقش پا کے کھوئے ہوئے اثرات کا سراغ لگے۔ شاعر کی زبان میں محبوب کے گذرنے سے تمام وادیٔ نعمان معطر ہو گئی تھی۔[1] تو کیا سرور عالم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی گذرگاہ میں ہوائیں مشک آفریں عنبر بیز پسینے کی خوشبو سے خالی ہو گئی ہوں گی؟ —— مدینہ کی پاک سرزمین قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اور (فاسد کھانسی کے حملوں سے چور ہوا جا رہا ہوں) اور درود پڑھتا چلا جا رہا ہے۔ موٹر میں تیس پینتیس مسافر ہیں سب کے سب حج سے فارغ ہو کر مدینۃ الرسول کی زیارت کو جا رہے ہیں لیکن کہیں گداز و شوق کا نام نہیں۔ وہی باتیں وہی خوش گپیاں۔ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ مگر کون کہے کیا؟ اپنے دل کا جائزہ لیا۔ وہ بھی پتھر نظر آیا۔ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت کے دعوے خالی خولی معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے متعلق تو بد ظنی کی جا سکتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ بدگمانی سے کام کیوں لیا جائے؟

اتنے میں شور ہوا۔ ذو الحلیفہ (جسے آبار علی بھی کہتے ہیں) آگیا۔ یہ سن کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ اہل مدینہ کی میقات ہے یہاں سے مدینہ چار پانچ میل سے زیادہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہماری جانیں نثار) یہیں سے حج کا احرام باندھا ہوگا۔ جی چاہا غسل کرکے کپڑے بدل لئے جائیں۔ اور یہاں سے پیدل چلیں۔ مگر کھانسی اور اس پر حرارت نیز کمزوری حد سے بڑھی ہوئی ہمت نہ پڑی۔ عرصے سے تمنا تھی کہ مدینہ پا پیادہ داخل ہوں امام مالک مدینہ منورہ میں سواری استعمال نہیں کرتے تھے کہتے تھے "جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے۔ اس زمین کو کسی جانور کی ٹاپوں سے روندنا حرام سمجھتا ہوں"۔ عربی کا یہ شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

واذا بلغن بنا المطی محمدا
فظہورھن علی الرجال حرام

(جب سواریاں ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب لے کر پہنچیں گی۔ تو اس وقت سواریوں کی پیٹھ مردوں کے لئے حرام ہو جائیگی)

مگر جب اس تمنا کے پورے ہونے کا وقت آیا تو مرض نے بے بس کر دیا۔ دوسرے نکالی عالم صاحب سے رائے طلب کی صرف کپڑے ہی بدل لئے جائیں۔ لیکن گرد و غبار کی وجہ سے ان کی رائے نہ ہوئی —— آخر صبر کرکے بیٹھ رہا لیکن دل کے اندر سے ایک آواز آ رہی تھی۔

؎ نگاہیں فرش راہ ہوں امیدؔ سر کے بل چلو
ادب! ادب!! یہ کوچۂ حبیب کردگار ہے

گنے کون؟ مسعود بے نوا! تو کھانسی سے چور قہوہ خانے میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایک قہوہ خانے میں چائے پی۔ اور پہلی دفعہ مدینے کے انگور کھائے۔ انگور، چھوٹے اور لذیذ تھے۔ شوق محبت نے انھیں اور لذیذ بنا دیا۔ عجب سوء اتفاق کہ اس بدبخت قافلے میں کسی نے غسل کیا۔ نہ کپڑے بدلے نہ پیدل ہی چلنے کی ہمت کی۔

ذو الحلیفہ سے قافلہ آگے بڑھا۔ ڈرائیور نے کچھ دیر کے بعد پکارا "وہ دیکھو......" نگاہیں اٹھیں اور دیدۂ پرنم نے دھندلی عمارتوں کو سلام کیا۔ جوں جوں منزل قریب ہوتی گئی۔ تحیر اور ذہول کی حالت طاری ہونا شروع ہوئی۔ درود و سلام کے علاوہ ابن جبیر اندلسی کے مشہور قصیدے کے اشعار وردِ زبان بنے۔ (ابن جبیر طول و طویل سیاحت کے بعد جب وہ مدینے سے قریب ہوا ہے۔ تو اس کی درد بھری طبیعت گدگدائی اور زبان

[1] تضوّع مسکاً بطن نعمان اذ مشت بہا زینب فی نسوۃ عطرات

رات کو عشا کی نماز کے بعد شرقی صاحب اور اسرار محمد خاں صاحب وغیرہ کے ساتھ خوب لطف صحبت رہا ۔ شرقی صاحب خاندانی پیرزادے اور ایک عاشق رسول کے بیٹے ہیں ۔ کراچی ہی سے ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہے ۔ حج اور زیارت کے سلسلہ میں ، انھوں نے سنت کی سختی سے التزام کیا ، اور ہر قدم پر عزیمت کی راہ اختیار کی ۔ مدینے میں یہ رنگ اور نکھر گیا ہے ۔ مکہ مکرمہ ہی میں اس کیفیت کے کچھ شعر انھوں نے سنائے تھے ۔ راقم کی طبیعت صبح سے گرمی سخن کی تلاش میں تھی ۔ اس وقت موقع غنیمت پاکر شرقی صاحب کو چھیڑا اور اپنا حال بھی عرض کر دیا ۔ طبیعت سوز سے سیر ہونا چاہتی ہے لیکن عربی شاعری کا دامن نعت سے بالکل خالی ہے ۔ اور جو ذخیرہ ہے ، اس میں درد و سوز نہیں ۔ اور تو اور حضرت حسان بن ثابت کا دیوان بھی خاطر خواہ پیش نہیں ملا ۔ حضرت کعب بن زہیر کا مشہور قصیدہ بانت سعاد عربی شاعری میں جو بھی درجہ رکھتا ہو لیکن قلب تپیدہ اس میں تشنگی محسوس کرتا ہے ۔ رہ گیا ایک بوصیری کا مشہور قصیدہ بردہ تو ہے ۔ بلاشبہ اس میں کہیں کہیں مقام نبوت سے تجاوز ہو گیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز سے بھرا ہوا ہے ۔ راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا ہے ۔ اور لطف اندوز ہوتا ہے ۔ عبد الرحمن برقوقی نے دیوان حسان کی شرح میں لکھا ہے "اب تک عربی شاعری میں بوصیری اور شوقی کے سوا کوئی نعت میں کامیاب نہیں ہوا" ان کی یہ رائے بڑی صائب معلوم ہوتی ہے ۔ البتہ شوقی کے متعلق راقم اس وقت قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا ۔ ——— اس عرض حال کے بعد اردو شاعری میں نعت گوئی کا ذکر آیا ۔ خاص طور پر مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں کا مجموعہ پڑھا گیا ۔ ترپ ۔ بس پھر کیا تھا ذکر جمیل نے راہوار شوق کے لئے مہمیز کا کام دیا ۔ اور شرقی صاحب نے جھوم جھوم کر خوب نعتیں سنائیں ۔ اپنے تازہ کلام سے بھی قلب و روح کو مسرور کیا ۔ خلاصہ یہ کہ بڑی پرکیف صحبت رہی ۔

یکشنبہ : ۸/۱/۶۹ھ : ۳۰/۱۰/۴۹ء

صبح کو طبیعت بحال معلوم ہوئی ۔ جی چاہا حرم کو چلوں ۔ شباک نبوی کے پاس مؤدبانہ حاضر ہوا ۔ لوگ سلام پیش کرتے ہیں "سلام پڑھتے ہیں" ۔ نماز کی ہیئت میں ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے ہیں ۔ عوام (اور دین کے باب میں پوری قوم "عوام" معلوم ہوتی ہے) ہر نماز کے بعد زور زور سے سلام پڑھتے ہیں ۔ محبت و عقیدت کے لباس میں یہ بے ادبی ، معاذ اللہ یہاں نہ حکومت کا شعبہ "الامر بالمعروف" دخل دیتا ہے ، ورنہ علماء ہی ، ہر کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے ۔ راقم کا حال دوسرا ہے ۔ امام مالک ، مدینہ منورہ کے رہنے والے اور آداب محبت و عقیدت کے خاص ادا شناس تھے ۔ کہتے ہیں "اس بارگاہ کی حاضری سے رعب اور وقار کم ہو جاتا ہے" ۔ آج راقم کی دوسری حاضری تھی ۔ اور نسبتاً پرسکون اور اطمینان بخش تھی ۔ ہاں دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے ۔ آنکھیں کبھی کبھی غمازی کر جاتی ہیں ۔ لیکن محبت کے آئین نرالے ہیں طبیعتوں اور مزاجوں کے اختلاف سے اثر بھی مختلف ہوتا ہے ۔ ابن قتیبہ نے اپنی کیفیت جن الفاظ میں بیان کی ہے ، وہ ایک باادب اور سچے عاشق رسول کے تاثر کا آئینہ ہیں ۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد سلام کے لئے حاضر ہوتا ہے

وحين دونا من رض السلام　　قصرنا الخطو ورفعنا الوقارا

جب ہم "سلام" ادا کرنے کو قریب پہنچے　　تو رفتار دھیمی کر دی ، اور وقار و ادب کا دامن تھام لیا

فما نرسل الطرف الا اختلاسا　　ولا نرجع الطرف الا انكسارا

اب آنکھیں زمین پر گڑی ہیں ۔ کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ لیں تو اور بات ہے (ادب اور رعب سے) نگاہ اوپر کو نہیں اٹھتی

ولا نظهر الوجد الا اكتتاما　　ولا نقلب القول الا اسرارا

وجد و شوق کا اظہار ، یہاں زبان خاموشی ہی سے بہتر ہے ۔ اس مقام میں ہم جو کچھ کہتے ، دبی زبان ہی سے کہتے

سوى ان نام نطق اعينا　　بادمعها غلبتها انفجارا

ہاں ، البتہ آنکھوں پر ہمارا قابو نہیں چل سکا اور سیلاب اشک ہمارے ادب و سکینت پر بھی غالب ہو کر رہا ۔

ظہر کی نماز حرم میں پڑھی ، جی چاہتا تھا کچھ دیر بیٹھوں اور مسجد کے نقش و نگار پر جو ترکوں کے دور کی یادگار ہیں ، ایک نظر ڈالوں ۔ مگر ابھی ہم سنتوں سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ "سلام" کا شور و غوغا بلند ہوا ۔ طبیعت سخت مکدر ہوئی ۔ اور حرم سے باہر نکل جانے ہی میں امان محسوس ہوا ۔

[illegible] ہو۔ ورنہ بھی محسوس ہو۔ لیکن کیا ہو سکے؟

مغرب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا حال سنا کر نئی دوا لی۔ مغرب کے بعد کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ رات بھر کھانسی آتی رہی۔ ورزش سے بالکل مجبور ہوں۔

دوشنبہ: ۹/۱/۶۹ھ = ۳۱/۱۰/۴۹ء

نئی دوا نے کچھ اثر کیا۔ مگر اب تک حالت قابل اطمینان نہیں۔ سید محمد عطار صاحب، شرقی صاحب اور اسرار محمد خاں صاحب برابر حال پوچھتے رہے۔ سید محمد عطار کی کرم فرمائیاں ناقابل فراموش ہیں۔

مدینہ منورہ میں چار دن ہوگئے۔ لیکن تعارف اور ملنے ملانے کا سلسلہ اب تک شروع نہ ہوسکا۔ عاصم صاحب کو مختلف لوگوں کے پاس بھیجا۔ یہ بھی اور مکہ مکرمہ میں جن حضرات سے تعارف کے خطوط حاصل تھے کہ دے دیئے جائیں۔ تو سلسلہ جنبانی ہو۔ اسی طرح نمنگانی صاحب تاجر کتب سے بھی واقفیت کرنا ضروری تھی۔ ہماری کتابیں انھوں نے منگوائی ہیں۔ اگر انھیں دعوت سے ہمدردی بھی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ نرے تاجروں سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ دوپہر سے پہلے عاصم اسی سلسلہ میں رہے۔

آج حرم میں نمازیں پڑھیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی ملے۔ مغرب کے بعد استاذ محمد الحافظ تشریف لائے۔ یہ عاصم صاحب کے مشن کی پہلی کامیابی تھی۔ سید محمد سعد نے ان کے نام خط دیا تھا۔ اب اسعد کے استاد اور مدرسہ شرعیہ میں مدرس ہیں۔ آدمی باخبر اور مطالعہ کے شائق معلوم ہوئے۔ دینی مزاج ہیں۔ چار ہفتے پڑھ چکے ہیں۔ تحریری ہفت بھی نظر سے گزرے۔ جماعت اسلامی اور اس کی دعوت سے اجمالی طور پر واقف تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کے بعد مزید ملاقاتوں کے وعدہ پر رخصت ہوئے۔

ان کے علاوہ مدرسہ شرعیہ کے شیخ حبیب احمد صاحب (مولانا حسین احمد کے بھتیجے) اور جریدہ المدینۃ المنورہ کے ایڈیٹروں کے نام خطوط تھے وہ [illegible] پہنچا دیئے گئے۔ عاصم صاحب سے دو حضرات نے ملاقات کے وعدے کئے۔ راقم کی طرف سے علالت کی معذرت انھوں نے پہلے ہی عرض کر دی تھی۔

سہ شنبہ: ۱۰/۱/۶۹ھ = ۱/۱۱/۴۹ء

صبح کو شیخ الاسلام عارف حکمت کے مشہور کتب خانہ کی زیارت کی۔ تقریباً سو برس سے یہ کتب خانہ قائم ہے۔ اس کے بانی عارف حکمت شیخ الاسلام تھے۔ مملکت عربیہ سعودیہ میں نوادر اور قلمی کتابوں کا اس سے بڑا کوئی کتب خانہ نہیں۔ شیخ الاسلام نے خود ہی اس کی شاندار عمارت بنوائی۔ اور متعلقین وابستگان کو جو یہ ہیں، اس کے لئے کافی جائدادیں وقف کر دیں۔ مگر جنگ عظیم سے پہلے ہی بعض کی جائدادیں نکل گئیں۔ اور باقی جائدادیں ترکی انقلاب کے بعد ضبط ہوگئیں۔ پہلے اس کا خاصہ اشاعت تھا۔ اب صرف کتب خانہ کے مہتمم شیخ ابراہیم حمدی ہیں۔ یہ عہدہ ان کے اجداد کے وقت سے اسی خاندان میں ہے۔ دس بارہ سال پہلے کتاب خانہ کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ تو ابراہیم حمدی ہندوستان تشریف لائے تھے جن کا مشہور کتب خانہ [illegible] انھیں ہم غریبوں کے وطن میں بھی لے دیا تھا۔ حیدرآباد اور بھوپال سے معقول ماہانہ امدادیں مقرر کرا کے واپس ہوئے تھے۔ وہ امدادیں اب تک جاری تھیں۔ نئے انقلاب کے بعد غالباً بند ہوگئیں۔ دوسری طرف جدید ترکی کے اوقاف واگذاشت ہو جانے کی کچھ توقع ہوگئی ہے۔ حکومت سعودیہ کی امداد انھوں نے قبول نہیں کی۔

یہ کتاب خانے کی مختصر تاریخ ہے۔ نام تو عرصہ سے سن رکھا تھا۔ اب دیکھنے کا موقع ملا۔ عمارت اچھی، مستحکم اور شاندار ہے۔ کتابیں سلیقہ اور ترتیب

کے ستون رکھی گئی ہیں۔ قدیم طرز پر فن و ہنر بھی ہیں۔ مگر بڑے [illegible] اور [illegible] کہاں [illegible] راقم [illegible] سفر میں [illegible] جناب [illegible]
گویا چھوڑ چکا ہے۔ لکھنا پڑھنا سکون چاہتا ہے۔ دعوت کا تعاقب اور ملنا ملانا حرکت و دوڑ دھوپ کے طالب ہیں۔ [illegible]
ڈال کر دل کو تسکین دے لی۔ شیخ ابراہیم حمدی جو عام طور پر ابراہیم الخربوطلی کے نام سے مشہور ہیں۔ حسب عادت بڑے اخلاق اور محبت سے [illegible]
حضرت سیف صاحب قبلہ کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔ برادر مکرم سید ہاشم صاحب ندوی کی خیریت دریافت کی۔ مگر ان کا حال [illegible]
خاکسار کو بھی معلوم نہیں۔

شام کو دار الحدیث حاضر ہوا۔ یہ ایک دینی مدرسہ ہندوستانی اہل حدیث حضرات کا قائم کردہ [illegible] زیادہ تر نجدیوں کی امداد سے چل رہا ہے۔ اس کے موجودہ صدر مدرس شیخ عبدالرحمٰن افریقی نیک اور صالح آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ حرم میں بھی درس دیتے ہیں۔ پچھلے سال ہمارے دو پمفلٹ پڑھ چکے ہیں۔ ایک براہ راست مدرسے کے کتب خانہ کے لئے نذر کیا۔ کچھ باتیں بھی ہوئیں۔ ہماری باتیں سن کر ایک حاضر مجلس نے دریافت کیا "کیا تم رئیس المحاکم الشرعیہ (یعنی مدینہ کے رئیس القضاۃ) سے ملنا پسند کرو گے؟" عرض کیا "ضرور، جب فرمائیے حاضر ہوں"۔ کل صبح ۲ بجے (ہمارے ہاں کے آٹھ بجے) وقت طے ہوا۔ دار الحدیث سے شیخ عبدالرحمٰن کی رفاقت ہو جائے گی۔ واپسی میں ڈاک ملی۔ مکہ مکرمہ سے مولانا عبدالوہاب دہلوی نے پانچ چھ روز کی ڈاک جمع کر کے بھیج دی ہے۔

صبح شام کی دوڑ دھوپ اور گفتگو رنگ لا کر رہی۔ عشاء کے بعد کھانسی پھر تیز ہو گئی۔ دوسری رات آنکھوں میں کٹی۔ ابھی چلنے پھرنے کی طاقت نہیں مگر کیا کیا جائے۔ صبر بھی نہیں ہوتا ——— !

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کہیں سمندر مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائیں

اس کی حفاظت کیلئے حکومتوں کے معاہدے!

ریاست ماساچوسٹس (امریکہ) میں ایک جھیل ہے جو شہر نیویارک سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اس جھیل کا نام ۴۵ حرفوں سے بنا ہے اور اس کی تاریخ اس زمانے کی یاد دلاتی ہے جب اس کے کنارے پر ہند امریکیوں (American Indians) کے قبیلے آباد تھے۔ اس کے نام کا تلفظ اتنا مشکل ہے کہ ایک سانس میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال قارئین کی دلچسپی کے لئے اس مشکل کو بھی آسان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ نام یہ ہے چارگوگاگوگ مانشوگاگوگ چوبونا گنگا موگ۔ یہ نام کیا ہے پورا ایک فقرہ ہے۔ اور اس کے معنی ہیں میں اپنی طرف شکار کروں گا۔ تم اپنی طرف، درمیان میں کوئی شکار نہ کرے گا۔

جیسا کہ نام یا اس کے معنوں سے ظاہر ہے اس نام سے اس معاہدہ کا اظہار ہوتا ہے جو سینکڑوں برس پہلے ان ہند امریکیوں کے درمیان ایسے سیدھے سادھے طریقے پر مکمل ہوا تھا۔

اب صدیوں کے بعد اس طریقہ کی تجدید آج کل کی ساحلی قوموں کے مابین ہو رہی ہے جو دنیا کے سمندروں میں باقاعدہ ماہی گیری کے لئے آپس میں معاہدے کر رہی ہیں کیونکہ ان اقوام نے تجربات اور علمی تحقیقات و مطالعہ کے بعد یہ معلوم کر لیا ہے کہ یہی سمندر جنھیں عہد گزشتہ میں غذا اور خوراک کا غیر فانی سرچشمہ سمجھا جاتا تھا ان پر بھی افلاس طاری ہونے کا اندیشہ لاحق ہے اس کا بھی احتمال ہے کہ سمندر مچھلیوں سے بالکل خالی رہ جائیں اس لئے یہ سب احتیاطیں برتی جا رہی ہیں تاکہ اس افسوسناک انجام کی نوبت نہ آئے۔

گذشتہ تیس برس کے اندر ساحلی اقوام نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں معاہدے کئے ہیں کہ ماہی گیری میں رقابت اور مسابقت کو ترک کر دیں گے اور بین الاقوامی عہد و پیمان کے ذریعے اس کا انتظام کریں گے کہ تمام قومیں مچھلیوں کے شکار میں ممکنہ طور پر زیادہ سے زیادہ حصہ پا سکیں۔

ماہی گیری کے ان معاہدوں میں تازہ ترین معاہدہ واشنگٹن کا ہے جو بحر اطلانتک کے شمال مغربی منطقے میں مچھلیوں کے شکار کی تنظیم کے لئے کیا گیا ہے۔ اس معاہدے میں یورپ اور شمالی امریکہ کی گیارہ قوموں نے حصہ لیا ہے جن کے نام یہ ہیں۔ کناڈا، ڈنمارک، برطانیہ، آئس لینڈ، اٹالیہ، فرانس، نیو فاؤنڈ لینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین اور ریاست ہائے متحدہ۔

اس سلسلہ میں بحری حیوانات کے سائنس داں ماہرین نے مچھلی کے شکار کے نتائج بچشم خود دیکھنے کے لئے ساحلی اقوام کے بحری بیڑوں میں سفر کیا انھوں نے خاص شیڈوں پر بیٹھ بیٹھ کر سمندر کی پیداواروں کی جستجو کی اور بحری تجربہ خانوں میں تحقیقات اور جانچ میں مصروف رہے ... مچھلیوں پر ایک طول طویل تحقیقات کے بعد انھیں مچھلیوں کی پیداوار بڑھانے کا ایک طریقہ ہاتھ آگیا، اور وہ یہ کہ ماہی گیری عارضی طور پر روک دی جائے تو مچھلیوں کی مقدار حسب سابق برقرار رکھی جا سکتی ہے پھر اس مدت کے گذرنے پر بہت زیادہ مقدار میں بلکہ بے حد اندازہ مچھلیوں کا شکار کیا جا سکتا ہے

ماہر شماریات نے ... سے لیکر عہد حاضر کے معاہدوں تک جو ... اور سیاستدانوں نے مرتب کئے ہیں سب کا ماحصل یہی ہے کہ ماہی گیری کا ایک ایسا مثالی معیار قائم ہو جائے کہ بغیر کسی خوف و خطر کے زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیداوار حاصل ہو سکے

پچیس برس سے زیادہ مدت سے ریاست ہائے متحدہ ماہی گیری کے معاہدات میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۲۳ء سے ریاست ہائے متحدہ اور کناڈا ایک معاہدہ کے تحت شمال مشرقی بحر الکاہل میں ہالی بٹ مچھلی کا شکار کر رہی ہیں ۱۹۳۰ء میں ان دونوں ملکوں نے مشرقی بحر الکاہل میں سالمن مچھلی کے شکار کا معاہدہ کیا جو اس سمندر میں ہوتی ہے اور سوکے ای کے نام سے مشہور ہے یہ مچھلی دریائے فریزر میں انڈے دیتی ہے جو کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ کے مابین مشترک ہے

دسمبر ۱۹۴۶ء میں واشنگٹن میں ایک معاہدہ وہیل مچھلی کے شکار پر طے پایا جس میں ۲۱ قوموں نے شرکت کی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۸ء سے اس معاہدہ پر عملدرآمد شروع ہوا اس معاہدہ کے تحت بین الاقوامی کمیشن دنیا کے تمام سمندروں میں وہیل کے شکار کے قواعد وضع کیا کرتا ہے ۱۹۴۶ء کے موسم بہار میں ایک معاہدہ پر بارہ یورپین ممالک نے دستخط کئے جس کی رو سے بحر اٹلانٹک کے شمال مشرقی حصے میں اور بحر شمالی میں تمام اقسام کی مچھلیاں پکڑنے کے اصول طے پا چکے ہیں۔

یہ ہے اس مختصر جائزہ کی ضروری تفصیل جو امریکہ میں ماہی گیری کو ترقی دینے اور اسے باقاعدہ بنانے کے لئے کی جا رہی ہے چونکہ ہماری خداداد مملکت بھی سمندر کے کئی اہم حصوں پر قابض ہے جہاں ماہی گیری سے بیش از بیش فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں اس لئے ایک غیر ملکی متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت کی ان ترقیوں کا ذکر ہمارے لئے فائدہ سے خالی نہیں ہو سکتا

امید ہے کہ ہمارا محکمہ ماہی گیری بھی اس سمت میں ضروری اقدامات سے غافل نہ رہے گا۔

(ماخوذ از عربی)

ادارہ

ہماری کمزوریاں

"فاران" کا یہ بارھواں شمارہ حاضر ہے ـــــ باتوں ہی باتوں میں پورا ایک سال بیت گیا، ایک سال ـــــ جس میں تین سو ساٹھ صبحیں طلوع ہوئیں اور اتنی ہی شاموں کو غروب ہونا پڑا، کاش! وقت اس قدر تیز گام اور زمانہ اتنا سبک رو نہ ہوتا۔

"فاران" نے اس ایک سال میں (۱۲۰۹۴) سات سو اڑسٹھ (۷۶۸) صفحے پیش کئے ہیں، یہ مجموعی تعداد پورے ایک دفتر کے برابر ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ کی میزانِ عدل میں، ان میں سے کتنے ورق ذی قدر نکل سکیں گے!

اللہ کے فضل و کرم اور اس کی ہدایت کے سبب ہم اس خود فریبی میں مبتلا نہیں ہیں کہ ہماری ایک ایک سطر ادب و انشاء کا شاہکار ہوتی ہے، یا ہمارا لفظ لفظ جریدۂ عالم پر نقشِ دوام بن کر رہ جائے گا! ہم سے بلاشبہ کوتاہیاں ہوتی ہیں ـــــ کہ انسان سے کامل احتیاط کے باوجود بھول چوک ہو ہی جاتی ہے، مگر اللہ دلوں کا حال جانتا ہے کہ ہماری نیت بخیر رہی ہے اور رہے گی، اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ہمیں خود احساس ہے، اور جو کوئی ہماری غلطیوں پر ہمیں مطلع کرتا ہے تو ہماری پیشانی پر ناخوشی کی ایک شکن بھی نمودار نہیں ہوتی، ہم اعتراض و احتساب سے نہیں گھبراتے، مدح و ستائش کے ہجوم میں اگر تنقید کرنے والے نہ ہوں تو نفس کے مغرور ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور غرورِ نفس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے! جہاں بہت سے مرہم رکھنے والے ہوں وہاں کچھ نشتر زن بھی ضرور ہونے چاہئیں، ہمدرد ناصح اور غمخوار محتسب ہر شخص کو نہیں ملتے۔

رسالہ کی ترتیب و تدوین کی منزل ہمارے لئے بالکل نئی تھی، اس کوچہ سے ہم قطعاً نابلد تھے، شروع شروع میں طبیعت ہچکچائی کہ معلوم نہیں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں اور کن کن منزلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے؛ ہمارا اندیشہ غلط نہ تھا اس راہ میں پیچ و خم بھی ملے، دو نشیب و فراز کا بھی سامنا ہوا، ناسازگاریوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، اور خلافِ طبیعت حالات بھی راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، مگر اللہ کے فضل نے ہم میں جو عزیمت پیدا کر دی تھی اس نے ہر دشواری کو آسان بنا دیا، اس راہ میں ہمارے پاؤں زخمی تو ہو گئے مگر چلنے سے رکے نہیں، سنبھلے، ڈگمگائے اور جل اور گرانبار ہو گئے مگر ہم نے سستانے کے لئے دم نہیں لیا، اس لئے کہ شوق و طلب کی راہ میں ایک لمحہ کی غفلت مسافر کو منزل سے ہزاروں فرسنگ دور کر دیتی ہے، ہم بڑھتے ہی چلے گئے، اور انشاء اللہ جب تک پائے شوق میں حرکت باقی ہے چلتے ہی رہیں گے، ہم نے آرام کے خیال سے سفر کا آغاز نہیں کیا تھا، آسودگی کے لئے دوسرے بہت سے راستے موجود تھے اور آسائیوں اور فراغتوں کے لئے کتنی منزلیں ہمارے پیش نظر تھیں ـــــ ہم نے جان کر حق و صداقت کی اس وادیٔ پرخار اور جادۂ دشوار کو اختیار کیا تھا، پھر مشکلوں، پریشانیوں اور دشواریوں کا شکوہ کرتے تو کس منہ سے کرتے!

شکوہ بجائے کفرانِ نعمت ہے، راہِ وفا اور منزلِ صبر و رضا میں ہر نفس شکر ہی نہیں سجدۂ شکر کی ضرورت ہے، بڑھنے کی قوت، کام کرنے کا حوصلہ، حق گوئی کی جرأت اور تبلیغِ صداقت کا جوش، ہم میں آپ ہی آپ پیدا نہیں ہو گیا ہے، قدم یونہی نہیں بڑھ جایا کرتے، اٹھائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو گھاس کی ایک پتی بھی جنبش نہیں کر سکتی، ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ یہ جو کچھ ہوا، اسی کے فضل و کرم کی جلوہ نمائیاں ہیں، اس کی رحمت نے قدم قدم پر ہمیں سہارا دیا اور منزل کے ہر موڑ پر ہمیں تھامے رکھا، زمانہ فرصت دے تو اس کی بارگاہ میں شکر کے سجدے ہی کئے جائیں اور حمد کبریائی کے زمزمے ہی سنائے جائیں ـــــ مگر یہ ہم کیا کہہ رہے ہیں! سب سے زیادہ سپاس گزاری

تو ہمارے دل میں مدت سے کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔

البتہ فخر کے لئے نہیں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ بارہ مہینے تک کی ایک غیر حاضری کے بغیر رسالہ کا مسلسل نکلتے رہنا معمولی بات نہیں ہے "اللہ تعالیٰ کے کرم نے ہمیں" فاران" کے خریداروں اور پڑھنے والوں کے سامنے معذرت کی ندامت اور تکلیف سے بچا لیا، معیاری یا پست، بُرا بھلا جیسا بھی ہی رسالہ نکلتا ہی رہا، ہم اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کو دیکھتے ہیں تو ایک "معجزہ" سا نظر آتا ہے مگر اس قادرِ مطلق کی شانِ کریمی اور فیضِ ربوبیت کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ ہے، وہ چاہے تو خاک کی چٹکی میں اکسیر کی تاثیر آجاتی ہے اور ذرے دوشِ آفتاب پر کمندیں ڈالنے کے قابل بن جاتے ہیں۔

غمِ روزگار بھی

اس دنیا میں کوئی ہوا کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا، ہر شخص کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں لگی ہوئی ہیں، ہم بھی دوسروں کی طرح "غمِ روزگار" میں مبتلا ہیں، اور آذوقۂ حیات کی کشاکش سے دست و گریباں! ہم نے رسالہ یقیناً ایک مقصد کے لئے نکالا ہے مگر یہ مقصد "غمِ روزگار" کے تصور سے بھی خالی نہیں ہے" یہ اشارہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ دل کی بات زبان تک آجائے تو اچھا ہے، اس طرح ایک تو دل کا بار ہلکا ہو جاتا ہے دوسرے منافقت کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

اس پیسہ پرست دور میں صحافت کی دوسری راہوں کی طرح تجارت بھی صحافت کو وہ ہوگئی ہے، جھوٹ اور دعوے کا تقارت کا تانا بانا بن کر وہ گیا ہے، سادہ دلوں کو کاروبار کی منڈی میں کامیابی نہیں ہو سکتی ہیں تو ایسا آدمی چاہیے جس نے سچ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہو، وہ مکر و سازش کی تیز قینچیوں سے لوگوں کی جیبیں تراشنا جانتا ہو، یہاں ہاتھ کی صفائی کا کام ہے — ہم فخر اور شکر کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ اس منزل میں ہم ابھی تک ناکام ہی رہے، یہ ناکامی ہمارے لئے غیر متوقع نہ تھی، اس آزمائش کا پہلے دن سے ہمیں یقین تھا مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس پر بھی ہماری کوئی ضرورت رکی نہیں رہی۔

صرف تن پروری مقصود ہوتی تو اس صحافت کی دنیا میں بہت سی منفعت بخش راہیں بھی موجود تھیں، بلکہ کھلی ہوئی تھیں، ہمارے بعض دوستوں نے ہمدردانہ مشورہ بھی دیا کہ میاں! دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو تھوڑی بہت دنیا سازی بھی کرنی پڑے گی، دیکھتے نہیں ہو فلاں فلاں پرچے کی اتنے اتنے ہزار اشاعت ہے اور اشتہاروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں، ہر دوسطر کے بعد ایک اشتہار۔ اسے کہتے ہیں کامیاب تجارت! اور تم خودکشی کر رہے ہو — ہم نے جواب دیا کہ جب ساری ہی کرنی بھری تو تھوڑی دنیا سازی کیوں کریں! یہ کیا کہ گنہگار بھی ہوئے، بادہ نوش بھی کہلائے اور پیاسے کے پیاسے رہے۔ — عجیب زمانہ آگیا ہے کہ کوئی حق کا بندہ سچائی اور بھلائی کی راہ پر چلنا چاہے تو ساتھ اور رفاقت کرنا تو درکنار یہ لوگ بے چارے کا الٹا مذاق اڑاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے اور اپنے سفر کی سمت کو بدل دے۔

نفس کب چاہتا ہے کہ اس داستان کو اور طول دو مگر صبر روکتا ہے یہ جو چند سطریں لکھ دی ہیں یہ بھی نہ لکھنی چاہیے تھیں، اس موضوع پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ بہت کافی ہے، کسی بھلائی کا اعلان کرنے سے اس کا ثواب جاتا رہتا ہے۔۔ — ضمیر کے اس مشورے کی نفس نے بغاوت شروع کر دی، مگر ہم اس بات کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھے جاتے ہیں۔

تنقیدیں

کس کس نے ہماری کس کس انداز میں تحسین و ستائش کی، کیا کیا کہا، اس سلسلہ میں ہم ایک حرف بھی کہنا نہیں چاہتے — ہم نے آج تک کسی مکتوب، تنقید اور تبصرے کا ذرا سا اقتباس بھی "فاران" میں شائع نہیں کیا۔

ہمارے پاس ایسے خطوط بھی آتے ہیں، جن میں ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، ہماری کمزوریوں کو بتایا اور ہماری غلطیوں پر محاسبہ کیا گیا ہے، بعض کرم فرماؤں نے ہمدردانہ مشورے بھی دیئے ہیں، ان اعتراضات میں عجیب تضاد اور اختلافات پائے جاتے ہیں، ذوق تنہا کا نہیں فکر و نظر کا بھی — مثلاً ایک صاحب نے لکھا کہ آپ جو کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ

ہماری نظر میں گزرتے ہیں، اس میں بہت کام کی باتیں ہوتی ہیں، میں بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ ـــ دوسرے صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس شمارے میں آپ نے کتابوں اور رسالوں پر تنقید کا حصہ بہت طولانی کر دیا، لوگ شکایت کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ "فاران" کو اتنا خشک بنا کر "راہِ نجات" بنائے دے رہے ہیں ـــ ایک دوسرے کرم فرما نے تحریر کیا کہ آپ کے رسالہ میں رنگین غزلیں شائع ہوتی ہیں، نفس کے چٹخارے کب تک؟ خدا کو آپ ان چٹخاروں کا کیا جواب دیں گے؟ ـــ ایک صاحب نے شکوہ کیا کہ آپ کے رسالہ میں آپ ہی کے لکھے ہوئے مضامین زیادہ رہتے ہیں۔ دوسرے صاحب نے شکایت کی کہ کیا آپ مضامین لکھتے لکھتے تھک گئے ہیں، اس تازہ شمارے میں آپ کے اپنے لکھے ہوئے مضامین بہت ہی کم ہیں، ہم تشنگی محسوس کر رہے ہیں۔ ـــ ایک بزرگوار نے لکھا کہ شعر و ادب پر ایک تنقیدی مضمون ضرور ہونا چاہئے ـــ دوسرے صاحب نے ٹوکا کہ میر حسن کی مثنوی پر جو آپ نے مضمون لکھا ہے اس سے آخر دین کی کون ضرورت پوری ہوتی ہے ـــ بعض قدر دانوں نے فاران کے سرورق کی تعریف کی کہ یہ سادہ و پُرکار ہے۔ ـــ بعض کرم فرماؤں نے رائے دی کہ سرورق کے لئے کوئی اچھا سا ڈیزائن کسی آرٹسٹ سے بنوائیے ـــ ایک شہر کے ایجنٹ نے لکھا کہ آپ آئندہ اپنا پرچہ ہرگز نہ بھیجئے، یہاں پسند نہیں کیا گیا ـــ دوسرے مقام کے ایجنٹ نے تحریر کیا آپ کا رسالہ آتے ہی بک گیا، آئندہ سے پرچے زیادہ بھیجئے، اس تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا!

لوگوں کی طبیعتیں بھی عجیب مختلف واقع ہوتی ہیں کہ ایک چیز جو ایک صاحب کو پسند ہے دوسرے کو ناپسند، ایک صاحب کی نظر میں جو سادہ ورق کا رنگین مرقع ہے، دوسرے کی نظر میں معائب کا سیاہ ورق! شاید یہ اس لئے ہو کہ ذوق اور پسند کا اختلاف ہے۔ سب کا ذوق ایک سا ہوتا تو تہذیب و تمدن کی رنگ آرائیاں کس طرح وجود میں آتیں!

ہمارے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہے، ایک ذوق کا لحاظ رکھتے ہیں تو دوسرے کی طبیعت مکدر ہوتی جاتی ہے، ایک صاحب کی شکایت دور کرتے ہیں تو دوسرے صاحب کی شکوہ سنجی کا پارہ اور اونچا ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں سب کو خوش رکھنا ناممکن ہے، ایک ایک آدمی کو کوئی مطمئن کر ہی نہیں سکتا، ہماری تو بساط ہی کیا ہے، اولیاء اور نبی پیغمبر تک سب کو خوش نہ کر سکے، ہر شخص کے ذوق اور رجحان کا ساتھ دینا ممکن نہیں۔

ان اعتراضات اور شکایتوں کی نوعیت میں ضرور اختلاف ہے مگر قدرِ مشترک یہ ہے کہ ہم میں کوتاہیاں ضرور ہیں، ان کو دور کرنے کی جانب ہمیں توجہ دلائی گئی ہے، یہ تمام حضرات یقیناً شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ ہمارے اچھے کے لئے ہی ہمیں ٹوکتے ہیں، ورنہ اس خود غرض دنیا میں کسی کی اصلاح اور درستی کے لئے کون ایک حرف لکھنے کی بھی زحمت اٹھانا چاہتا ہے۔

"فاران" کا دوسرا سال شروع ہو رہا ہے، جس منزل سے ہم آغاز میں ناآشنا تھے اس سے اب شناسائی ہو چکی ہے، پہلی سی حیثیت نہیں رہی، اگرچہ سب سے بڑا سفر تو باہر نا پختہ تجربہ ہی ہے، اتنا سیار سفر کے بعد بھی خامیاں پوری طرح کہاں دور ہو پاتی ہیں۔ ـــ بہرحال اللہ نے چاہا تو ہمارا جوشِ عمل اور زیادہ گرم رو ہو جائے گا، سفر کی تکان اگر ہوئی بھی تو ہم اسے ظاہر نہ ہونے دیں گے، گزشتہ تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا اور یہی تجربے بھی کام آئیں گی۔

یہ احمقانہ دعوی اور چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ فاران نے شعر و ادب کی فضا میں انقلاب پیدا کر دیا، دنیائے صحافت میں ہلچل مچا دی، ریاکاریوں کے تمام پردوں کو چاک چاک کر دیا ـــ مگر جس طرح بڑا بول بولنا نامردی کی نشانی اور اوچھے پن کی دلیل ہے، اسی طرح ضرورت سے زیادہ انکسار بھی ٹھیک نہیں ـــ اس معاملہ میں صرف ایک بات اور وہ یہ کہ فاران کی آواز بے اثر نہیں رہی ـــ؟ کاش، اس آواز کی بازگشت پھیلتی اور بلند ہوتی چلی جائے، حسن جس کے لب و لہجہ میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے، وہ خوب کھل کر حق کی حمایت کرنے لگے۔ اللہ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ اس منزل میں بہت سے رفیق اور ساتھی بھی مل گئے، کچھ پرانے اور کچھ نئے بھی! اور بعض تو اس راستہ میں ہم سے بہت آگے ہیں، ان کی گرم رفتاری کو دیکھ کر ہمیں خود شرم آتی ہے، خدا چاہے گا تو ہم بھی بہت جلد

محمد امین زبیری

سر شیخ عبدالقادر مرحوم

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

[بابائے پاکستان قائد اعظم مرحوم کے سانحۂ رحلت کے بعد پاکستان کو متعدد شخصیتوں کی وفات کے صدمے پے درپے اٹھانے پڑے، طبعی موت سے لیکر ہوائی جہاز کے اچانک حادثے تک اس حکایتِ غم اور داستانِ الم کے خونیں عنوان ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہیں جن کی شجاعت اور جنگی فراست کے نقوش رزمگاہوں کی پیشانیوں پر ابھی تک اُبھرے ہوئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو دین کے ستون اور علم کے روشن مینارے تھے ـــــ پاکستان کی جگہ اور کوئی ملک ہوتا تو ان غموں کے پہاڑوں سے اس کی نہ جانے کیا حالت ہو جاتی مگر پاکستانیوں کو اللہ تعالےٰ نے غم سہنے کی توفیق اور صدمے اٹھانے کی ہمت بخشی ہے، وہ قضائے قدر کی ہر ضرب کو سہہ گئے اور اُف بھی نہ کی، پاکستانی صبر و عزیمت کے مقام اور اس کے اسرار سے باخبر معلوم ہوتے ہیں، وہ اس راز سے آشنا ہیں کہ افراد اٹھ جاتے ہیں مگر قومیں باقی رہتی ہیں، اس دنیا میں جو آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن ضرور چلا جانا ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے، ہمیشگی اور دوام اللہ کی ذات کو ہے۔

سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی وفات زبان و ادب ہی کا نہیں اخلاق و شرافت کا بھی حادثہ ہے، مرحوم اُردو کے خاموش خدمت گزار تھے، پنجاب میں اُردو ادب کی جنہوں نے داغ بیل ڈالی ہے، سر عبدالقادر مرحوم کا نام اس فہرست میں نمایاں نظر آتا ہے، انھوں نے بہتوں کو صحیح اُردو لکھنا اور بولنا سکھایا، بعض شاعروں اور ادیبوں کے بنانے اور چمکانے میں بھی سر عبدالقادر مرحوم کی کوششوں کا ہاتھ تھا ـــــ علامہ اقبال کے وہ خاص دوستوں میں تھے، شاعروں کے وہ خاص محبت شناس تھے وہ اس بازار میں گوہر الماس ہی کی نہیں اُن پتھروں اور خزف ریزوں کی بھی قدر کرتے تھے جن میں تھوڑی بہت بھی چمک پائی جاتی تھی۔

ہائی کورٹ کی ججی سے لیکر صوبہ اور مرکزی حکومت کی وزارت، انڈیا کونسل کی رکنیت اور آخر میں ریاست بھاولپور کی چیف جسٹس کے عہدے پر بھی فائز رہے، سیاسیات میں معتدل روش تھی، مولانا ظفر علی خاں کی طرح نہ تو جیل میں گئے اور نہ سکندر حیات اور خضر حیات کی طرح حکومت کی کاسہ لیسی کی ـــــ طبیعت میں شگفتگی بلا کی تھی، اس بڑھاپے میں بھی جس محفل میں چلے جاتے، محفل میں گرمی سی آجاتی، نوجوانوں کو ان کی موجودگی بار نہیں گزرتی تھی، وہ اپنی ذات سے سچ مچ ایک انجمن تھے ـــــ اللہ تعالےٰ ان کی قبر کو اپنی رحمت کے سدا بہار پھولوں میں چھپا دے۔

جناب مولوی محمد امین صاحب زبیری سابق مہتمم "تاریخ" ریاست بھوپال نے سر عبدالقادر مرحوم کی سوانح حیات نہایت سادہ انداز میں قلم بند کی ہیں، اس اختصار میں جامعیت بھی پائی جاتی ہے۔ مضمون نگار کا قلم سچے واقعات کی لکیریں صفحہ قرطاس پر کھینچتا چلا گیا ہے اور واقعات کو ادب و انشاء کی رنگ آمیزی کے بغیر جوں کا توں منتقل کر دیا ہے۔ (م)]

سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی زندگی میں نوجوانوں کے لئے بہت سے نشانِ راہ ہیں، ان کے دل و دماغ کو جو بھی صلاحیتیں حاصل تھیں، ان کو اکتساب نے اور مجلّیٰ کر دیا — مرحوم نے فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد بزرگوار سے پائی، آپ کے والد کو فارسی ادب سے خاص شغف تھا، ابھی شیخ عبدالقادر مرحوم کی عمر پورے سولہ سال کی بھی نہ ہونی تھی کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے یہی عمر انسان کے بننے اور بگڑنے کی ہوتی ہے۔

مرحوم فورمین کرسچین کالج (لاہور) کے بہترین طالب علم تھے، کالج میں جو بحث مباحثے اور تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے ان میں مرحوم نے ہمیشہ دلچسپی لی اور اسی زمانے سے انہیں اردو ادب اور شاعری سے لگاؤ پیدا ہو گیا جو مرتے دم تک زندگی کے ساتھ ساتھ رہا، گریجویٹ ہونے سے پہلے ہی ان کی خوش بیانی اور خطابت کی شہرت ہو گئی، انہوں نے مشہور اردو مصنفین کے ادبی کارناموں پر انگریزی میں متعدد لیکچر دیئے، اور ان کا مجموعہ سنہ ۱۸۹۸ء میں "اسکول آف اردو لٹریچر" کے نام سے شائع ہوا، اس زمانہ میں سر عبدالقادر مرحوم کی عمر چوبیس سال کی تھی، اور وہ پہلے ایسے مسلمان ہوں گے جو انگریزی میں مصنف کی حیثیت سے منظر عام پر آئے ہوں۔

شیخ عبدالقادر مرحوم کے اس مجموعہ کو قبولیت عام حاصل ہوئی، انگریزی زبان میں یہ ایک اچھوتا موضوع تھا، سنہ ۱۹۲۱ء میں یہ مجموعہ دوسری بار شائع ہوا — سنہ ۱۸۹۴ء میں مرحوم نے بی۔ اے کی ڈگری لی تھی، ایک مسلمان گریجویٹ کیلئے بڑی بڑی امیدوں کا زمانہ تھا، معیشت کی بہت سی راہیں کھلی ہوئی تھیں مگر شیخ نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا، اخبار "آبزرور" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے، غالباً پہلا مسلمان گریجویٹ تھا جو صحافت کے افق پر نمودار ہوا، سنہ ۱۸۹۸ء میں اسی اخبار کے چیف ایڈیٹر ہو گئے، اور سنہ ۱۹۰۴ء تک کامل دس برس ان فرائض کو ادا کرتے رہے — "آبزرور" اس زمانہ میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی کا ترجمان تھا۔

انگریزی ادب کے ساتھ اردو ادب کا شاہکار مخزن تھا جو مرحوم نے سنہ ۱۹۰۱ء میں جاری کیا مخزن نے اردو کی جو خدمت کی وہ ایسی نہیں ہے کہ دو چار سطروں میں اس کا ذکر سما سکے، وہ تو اپنی جگہ خود ایک جامع موضوع ہے، مختصر یہ کہ اردو کا کوئی رسالہ اس کے پلّے کا نہ تھا، اس نے بہت سے نوخیز مصنف، مقالہ نویس اور مضمون نگار پیدا کئے، اس کے قلمی معاونین میں ڈاکٹر اقبال، چودھری خوشی محمد خاں ناظر، جسٹس شاہ دین مرحوم، سید سجاد حیدر یلدرم، مولانا حسرت موہانی، میر غلام بھیک نیرنگ، ابوالکلام آزاد مولانا ظفر علی خاں اور منشی دیا نرائن نگم وغیرہ جیسے ادیب تھے — مخزن کے مضامین — حصوں میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے ہیں اور عرصہ تک سرکار انگریزی اور حکومت حیدرآباد دکن کے اسکولوں کے نصاب میں یہ مجموعہ شامل رہا ہے۔

کلکتہ میں بھی ایک اور مجموعہ کلام اردو کے نام سے شائع ہوا جس کو بورڈ آف اگزامنرز کلکتہ نے سول اور ملٹری افسروں کے کورس میں داخل کیا — سنہ ۱۹۰۴ء میں سر عبدالقادر مرحوم انگلستان گئے اور سنہ ۱۹۰۷ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کر کے واپس آئے، لندن میں وہ تمام علمی ادبی اور سیاسی سوسائٹیوں میں حصہ لیتے رہے، لندن کے مشاہیر سے ملاقاتیں کیں اور وہاں کی مختلف انجمنوں میں ایک مقرر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، فرانسیسی زبان بھی سیکھی اور اس کے ادب پر عبور حاصل کیا، مغربی ممالک کے علاوہ قسطنطنیہ اور شام کی بھی سیاحت کی، واپس آکر ترکی کے متعلق ایک کتاب "مقام خلافت" کے نام سے شائع کی، جس سے ان قوت مشاہدہ اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب پر تعریفی تبصرے شائع ہوئے اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے انعام دیا۔

پہلے انھوں نے دہلی میں پریکٹس کی پھر لائل پور میں گورنمنٹ پلیڈر مقرر ہوئے، سنہ ۱۹۲۰ء میں مستعفی ہو گئے، سنہ ۱۹۲۱ء چیف کورٹ کے عارضی جج منتخب ہوئے، اس کے بعد بہت سے سرکاری اعزازات حاصل کئے، سنہ ۱۹۲۶ء میں "انجمن اقوام عالم" میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

سر شیخ ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کے صدر منتخب ہوئے یہ سال ہر حیثیت سے بہت سخت تھا اور بڑے اہم سیاسی مسائل اور مشکلوں سے مسلمانوں کی جماعت دوچار تھی۔ سر شیخ کے خطبہ صدارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی نظر کتنی وسیع اور ان کی سیاسی قوت فکر کس قدر بلند تھی۔ لیگ کے صدارتی خطبوں میں اس خطبہ کا ایک خاص مقام ہے۔

۱۹۲۶ء میں وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مدراس کے صدر منتخب ہوئے اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد کیا جو ان کی بصیرت و مہارت کا آئینہ ہے یہ تعلیمی و سیاسی خطبات مرحوم کے مجموعہ مضامین میں شامل کئے جانے کے قابل ہیں۔

علاوہ ازیں ۱۹۳۰ء میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں سر سید راس مسعود کی دعوت پر لیکچر بھی دیئے جو طلباء نے نہایت شوق سے سنے اور ان سے استفادہ کیا۔ اسی موقع پر سید راس مسعود مرحوم نے (راقم کی موجودگی میں) ان سے اصرار کیا تھا کہ کانفرنس کی معتمدی منظور کرلیں تاکہ اس کے جسم میں ساعی پیدا ہو اور علی گڑھ کا قیام طلباء میں ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کا سبب بنے، مگر بعض مجبوریوں سے وہ اس پیش کش کو قبول نہ کرسکے، وہ ایم اے او کالج کے ٹرسٹی اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔

مرحوم نے رسالہ "مخزن" میں مختلف اساتذہ کے منتخب اشعار کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے تعلق دربار دہلی کے موقعہ پر جبکہ مولانا شبلی اور چند احباب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جلوس دیکھنے کے لئے جمع تھے تبادلہ خیالات بھی ہوا تھا، یہ اشعار انتخاب کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہونے کا مستحق ہے۔

سر عبدالقادر مرحوم نے اپنی کوشش، ہمت اور خلوص عمل سے یہ مقام حاصل کیا، ان کی زندگی خوداعتمادی اور ذاتی جدوجہد اور ترقی و کامرانی کی مسلسل تاریخ ہے۔

نقشِ دوام

عبدالکریم ثمر

مری فطرت سے تابندہ مری ہستی ہے پائندہ — کہ میں ہوں شاعرِ فطرت مرا پیغام ہے زندہ

مری شیریں بیانی پر فرشتے وجد کرتے ہیں — خجل ہے سازِ زہرہ، نغمۂ ناہید شرمندہ

مرا نقشِ کفِ پا ہے چراغِ جادۂ منزل — ستاروں کی طرح ہیں خاک کے ذرے درخشندہ

میں اس انداز سے گزرا ہوں دنیائے حوادث سے — رہیں گے حشر تک تاریخ کے اوراق تابندہ

ہے میرے دوشِ ہمت پر خلافت بھی نیابت بھی — براہِ راست ہوں میں عزمِ فطرت کا نمائندہ

مرے آئینۂ امروز میں فردا جھلکتا ہے — مرے ماضی سے ہوگا میرا مستقبل درخشندہ

مرے نغمات گونجیں گے دو عالم کی فضاؤں میں — یقیناً میرے ہی ہاتھوں میں ہوگا سازِ آئندہ

قیادت مدتوں کرتا رہے گا نسلِ انساں کی — مرا پیغام صدیوں تک رہے گا اے ثمر زندہ

فکر و نظر

عاصی کرنالی

حرم سے تشنہ لب جاتا ہوں ساقی! کیا قیامت ہے — ترے کعبے کے دربان توڑ دیتے ہیں سبو میرا

مجھے گم خارزارِ رنگ و مستی میں نہ ہونے دے — وہاں مجروح ہو جائے گا ذوقِ جستجو میرا

ترے گلشن کے پھولوں نے کیا صد چاک جب دل کو — ترے کانٹوں نے اکثر کر دیا دامن رفو میرا

ہوئی ہے موجۂ فقر و غنا میں پرورش میری — خدا کا شکر ہے گوہر نہیں بے آبرو میرا

اے ادراکِ ظاہری صورت کے جلوے دیکھنے والے — بہاروں کا امیں ہے غنچۂ بے رنگ و بو میرا

مجھے یارب ہلاکِ جلوۂ نقشِ ازل کر دے — یہ مضموں خشک ہے کچھ رنگ بھر دے گا لہو میرا

مرے فکر و نظر کے زاویے مخصوص ہیں عاصی — مرا ہر شعر ہے آئینہ دارِ آرزو میرا

عزیز نے دیکھا

عزیز حاصل پوری

انقلابِ روزگار اُس کو سازگار ہے
جسے تمہاری گردشِ نظر پہ اعتبار ہے

مری نظر کے سامنے جہاں لُٹے یہ رہے
مری فضائے شوق میں بہار ہی بہار ہے

ہرا فروغِ حسن تو جہاں میں آشکار ہے
مری نگاہ ناشناس ہی قصور وار ہے

جہانِ آرزو نئے دل کو مدتیں گزر چکیں
مگر نگاہ آپ کی ہنوز شرمسار ہے

اک زمانہ ہے گوش بر آواز
کہیں ذکرِ حبیب ہوتا ہے

غمِ محبوب ہو نصیب جسے
بس وہی خوش نصیب ہوتا ہے

ہم سالکِ راہِ اُلفت ہیں ہر چند یہ ہمارا کامل ہے
اندیشۂ منزل کیا ہم کو ہر گام پہ اپنی منزل ہے

دریائے محبت میں کشتی مدت سے ہچکولے کھاتی ہے
مفقود کنارِ مقصد ہے، معدوم نشانِ ساحل ہے

نیّر نے محسوس کیا

نیّر جہنمی

سوال یہ ہے کہ اب جاؤں میں کہاں اے دوست
زمانہ چھوڑ کے ملا تیرا آستاں اے دوست

اک زمانہ تھا کہ ہم تھے اور ان کی خلوتیں
اب تو اُن کی یاد آئے بھی زمانہ ہو گیا

زندگی کیا ہے ازل سے آج تک اک راز ہے
سامنے جو پردہ آ جائے اُٹھاتے جائیے

عادت نہیں کہ دب کے رہیں باغباں سے ہم
اونچے اُڑیں گے جب بھی اُڑے آشیاں سے ہم

جس کو دُنیا کے حوادث سے بچالایا تھا میں
ایک وہ آنسو سرِ محشر مرے کام آ گیا

ہم نشینو! تم مری قسمت بدل سکتے نہیں،
ہو رہے ہو کس لئے اندوہگیں میرے لئے

سنتے سنتے آپ کیا اُکتا گئے
لیجئے بس ختم افسانہ ہوا

آہ کی ظالم نے اب ترکِ جفا
غم کی خوگر جب طبیعت ہو گئی

یاس اور اُمید نیّر جیتے جی کا روگ ہیں
کچھ نہ ہوگا ختم جس دن زندگی ہو جائے گی

جذبات

شفقت کاظمی

ہر مرض کا علاج تھا وہ نام — کیوں مرے درد کی دوا نہ ہوا
اُن سے چھٹ کر بھی اُن کی چاہ رہی — جذبۂ عاشقی فنا نہ ہوا
عمر بیم و رجا میں بیت گئی — میری قسمت کا فیصلہ نہ ہوا
مایۂ جاں ہے اُن کی یاد ابھی — جن سے چھوٹے ہوئے زمانہ ہوا

آہ وہ حرفِ آرزو شفقت
جو لبِ شوق سے ادا نہ ہوا

واردات

حبابؔ ترمذی

وہ لبِ نازک پہ پیمانِ وفا ہے باربار — حُسن کی ان معتبر باتوں میں لے دل کون
جام و مینا لالہ و گل ساقیٔ کوثر فروش — جب یہ عالم ہے تو پینی نہ سے باز آئے کون
بے نیازی حُسن کی خودداریوں کی شان ہے — آپ یاد آتے ہیں سب کو آپکو یاد آئے کون

محسوسات

قمر جلالوی

روکتا تھا ناخدا کشتی کہ طوفاں آگیا — تم جہاں پر ہو بس اتنی دور تھے ساحل سے ہم

ہوشؔ

پکاروں ناخدا کو یا خدا کو — سفینہ تہ نشیں سا ہو چلا ہے

آغا شاعر

اپنی خوشی کے ساتھ مرا غم نباہ دو — اتنے ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑیں

تابش دہلوی

دشت میں ہو رہی ہیں کانٹوں سے — دامنِ تار تار کی باتیں

اور

اگر ہے احساسِ جیب و داماں تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے — (رمضان بیدل)

"ہم نے کچھ کلیاں چنی ہیں
اُن کے دامن کیلئے"!!

نواب فصاحت جنگ بہادر (جلیل مانک پوری) کے منتخب اشعار
تاج سخن اور جان سخن سے ان کا اقتباس کیا گیا —— م

رسوائیوں کے خوف سے آفت میں جان تھی اچھا کیا جو آپ نے دیوانہ کر دیا!

پیام ان کا جو آیا کہ ہم نہیں آتے تو اٹھ کے دردِ جگر نے مجھے سلام کیا

دیر میں آیا تو کیا قاصد شتاب آیا تو کیا اُن کو آنا چاہیے خط کا جواب آیا تو کیا

جُدا ہوتے تو ہو لیکن یہی انجام ہوتا ہے تمہارا دل نہ بہلے گا ہمارا دل نہ ٹھہریگا

فکر کی لاکھ مگر وہ بتِ کافر نہ ملا اتنی کوشش کوئی کرتا تو خدا مل جاتا

تو نکل جائیگی غنچے سے تو ہوگی برباد دیکھ اے نکہتِ گل اپنے نشیمن کو نہ چھوڑ

شوقِ وصلِ یار کم ہوتا نہیں پیری کو پیاس دونی ہو گئی بوڑھا جو میں سال کے

لب پہ آئے نہ ترا ذکر یہ ہو سکتا ہے دل میں آئے نہ تری یاد یہ امکاں میں نہیں

ادھر الفت اُدھر غفلت ذرا انصاف کرنا یہ کیا برتاؤ ہوتا ہے جہاں یارانہ ہوتا ہے

میں بھی ہوں کشتۂ اندازِ تغافل تیرا — او مرے بھولنے والے یہ ہے یاد تجھے!

بُرے ہیں یا بھلے پھر بھی ہمارا دم غنیمت ہے — کہ اب دنیا وفاداروں سے خالی ہوتی جاتی ہے

یار تک پہنچا دیا بیتابیٔ دل نے ہمیں — اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنے چاہئیں — کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا

ایک دن پھولوں کو ہنس کر ہم بلا میں پڑ گئے — کیا خبر تھی یہی سارا چمن ہو جائے گا

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو! — جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

نہیں جواب تو سونا حرام ہو جائے — تمام رات گذرتی ہے جن خیالوں میں

جسے ادا تری تیغِ نگاہِ ناز نے مارا — خدا گنتی کہیں گے ہم بھی ایک ان مرنے والوں میں

نہ خوشی اچھی ہے اے دل نہ ملال اچھا ہے — یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

مدارِ زندگی ٹھہرا نفس کی آمد و شد پر — ہوا کے زور سے روشن چراغِ ہستی ہے

ہم ایسے ناتواں وہ ایسے نازک — اٹھائے کون پردہ درمیاں سے

شام ہوتے ہی کبھی بن سی آ جاتی تھی — اب وہی شب ہے کہ مر مر کے بسر ہوتی ہے

میکدے کا راز پردہ ہی میں رہنا خوب تھا — دیکھ ساقی شیشہ کچھ کہتا ہے جھک کر جام سے

سچ ہے احسان کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے — یار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری

نمازیوں میں تمہیں کو امام بننا تھا — جلیلؔ! تم کو خدا سے حیا نہیں آتی

حسن البنّا ــــ شہیدِ ملت

اخوان المسلمون کے قائد حضرت حسن البنّا کا نام اسلامی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ـــــ مرحوم مصر میں اسلامی انقلاب چاہتے تھے، مصر کے خدا پرست نوجوانوں میں انھوں نے اسلامی روح پھونک دی تھی، وہ لوگ جو تہذیب مغرب سے مانوس اور غیر اسلامی زندگی کے خوگر ہو گئے ہیں، حسن البنّا کی اس دینی تحریک سے خطرہ محسوس کرنے لگے! ایک سال ہوا کہ ایک قوم پرست مصری نوجوان نے حق و صداقت کے اس پیکر کو گولی کا نشانہ بنا دیا ـــ جو حسن البنّا کو شہید کر کے اگر باطل سمجھتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے، حسن البنّا کی تحریک فنا نہیں ہو سکتی، وقت آنے کو ہے کہ مصر کے طول و عرض میں اسلامی نظام حکومت نافذ ہوگا، اور ... شخصیتوں کے قصر پارہ پارہ ہو جائیں گے سے زمانہ اور بھی پہنچے گا ایک بار ابھی!

دمشق، الجزائر کی بہاریں یاد کرتی ہیں ۔۔۔ ابھی تک قاہرہ کی رہگزاریں یاد کرتی ہیں
ترے اخوان اب تک منتظر ہیں تیری آمد کے ۔۔۔ کہ تجھ کو تیری زندہ یادگاریں یاد کرتی ہیں

عراقی مرغزاروں کی فضائیں یاد کرتی ہیں ۔۔۔ فلسطیں کے افق کی بھی گھٹائیں یاد کرتی ہیں
ترا سینہ تھا اک آتشکدہ تھی سوز ملت کا ۔۔۔ تجھے لبناں کی ٹھنڈی ہوائیں یاد کرتی ہیں

کہیں تھا آتش افشانی کی، کہیں آئینہ سازی بھی ۔۔۔ کہ تو میداں کا غازی بھی تھا مسجد کا نمازی بھی
ترے کردار میں تھا امتزاج شعلہ و شبنم ۔۔۔ سراپا سعیِ پیہم بھی، مجسم پاکبازی بھی

یقیں کی آتش خاموش کو بھڑکا دیا تو نے ۔۔۔ کہ مصری نوجوانوں کا لہو گرما دیا تو نے
خرد کہتی رہی ٹھہرو! بہت نازک زمانہ ہے ۔۔۔ سفینہ کو مگر طوفان سے ٹکرا دیا تو نے

اگر یہ واقعہ ہے مذہب اسلام زندہ ہے
تو پھر کیا ڈر ہے تو زندہ ترا پیغام زندہ ہے

ماہر القادری

اور داد کی بدولت شاعر بن جاتا۔

احمد یار خاں آس پاس کی بستیوں کے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ استاد کو تو خوشی ہوتی کہ میرا شاگرد نام پا رہا ہے اور اس طرح میری شہرت میں چار چاند لگ رہے ہیں۔ مشاعروں میں احمد یار خاں رنجور کو "تلمیذ حضرت خاکی رسنگ پوری" کہہ کر پکارا جاتا۔ مگر یہ تصور رشک بن کر کھٹکتا کہ لوگ مجھ بڑھے استاد کو نہیں بلاتے جس کو چالیس سال سے کچھ اوپر زمانہ شعر کہتے کہتے ہو گیا اور کم از کم سو سوا سو شاگردوں کی استادی کا فخر حاصل ہے — اور یہ کل کا لونڈا جس کی شاعری کی پوری طرح مسیں بھی نہیں بھیگیں ہر جگہ خوشامدیں کر کر کے بلایا جاتا ہے۔

شہرت کا نشہ بڑا مرد افگن ہوتا ہے — شراب کی ہزار بوتلیں اور اس کی ایک ذرا سی بوند! احمد یار خاں اب اپنی غزل پر استاد خاکی کی اصلاح خاموشی سے قبول نہ کرتا۔ وہ کہتا تو کتنا جھگڑتا اور بحث کرتا — کہ یہ لفظ صوتی اعتبار سے کانوں کو بھلا نہیں لگتا۔ فلاں مصرعہ اب بھی نرمی کا محتاج ہے۔ اس شعر میں آپ کی اصلاح سے اور جھول پیدا ہو گیا اس سے تو خود میرا ہی شعر زیادہ اچھا تھا — اور صاحب! میں ضلع جگت کی شاعری کا قائل نہیں ہوں —!

استاد اور شاگردوں میں بدمزگی پیدا ہو گئی — — — یہ ابتدا تھی بات بڑھتی ہی چلی گئی دلوں میں صفائی اور گنجائش نہ رہی تھی۔ استاد کو یہ غصہ کہ میں نے اس ممولے کو بولنا سکھایا ہے۔ اس کی ساری شہرت میری محنت، تعلیم اور تربیت کی زیر بار احسان ہے اور شاگرد کو یہ زعم کہ دو ڈھائی سال ہی میں استاد کو میں منزلوں پیچھے چھوڑ گیا، ان کے بڑھے غرے اور میری شاعری کے حوان تیور! میں کہ خود اپنے لئے راہ نکال چکا ہوں۔ پرانی لکیر کا فقیر آخر کیوں بنا رہوں اور انہوں نے مجھے سکھایا ہی کیا تھا یہ سب میری طبیعت جدت طراز کا ظہور ہے آخر دوسرے شاگردوں کو کسی قابل کیوں نہ بنا دیا۔

ایک مشاعرے میں احمد یار خاں نے استاد کی غزل پڑھنے سے انکار کر دیا اور اس دن سے جو دو رخی پیدا ہوئی ہے تو بات یہاں تک پہنچ گئی کہ تعلقات بالکل منقطع ہو گئے قسمہ بھی نہ رہا جیسے نہ یہ ان کے استاد تھے اور نہ وہ ان کا شاگرد! احمد یار خاں نے تخلص بدل دیا۔ اب وہ رنجور نہیں نجمی تھا اس نے رسالوں اور اخباروں میں چھپوا دیا کہ میں نے اپنی جہالت اور اس دور کی شاعری جبکہ پوری طرح شعور بیدار نہ ہوا تھا غرق آب کر دی، وہ اب مجھ سے منسوب نہ کی جائے — اور میں فطرت کو اپنا استاد مانتا ہوں — روح القدس ہم صفیر ہوں۔

نجمی کے استاد بھائیوں نے اپنے باغی بھائی کی ہجو کہیں طرح طرح سے بیچارے کو مطعون کیا۔ دو چار مقامی مشاعروں میں اسے ذلیل کرنے کی کوشش کی، سب لوگ ایکا کر بیٹھے کہ نجمی کے شعروں کا یا تو مذاق اڑائیں گے ورنہ خاموش رہیں گے، مگر عوام کو کیسے روکتے وہاں تو سطح ہی پر داد و ستائش کا چشمہ ابل پڑا ان کی کوششیں ناکام ہوئیں اور سب داستاں گئی۔ پھول کی خوشبو باغ کی دیواروں کے روکے رکتی کب ہے، یہ ٹھیک یہی حال شہرت کا ہے اس کی حد بندی بہت دشوار ہے۔

آدمی کی طبیعت یک ہی طرف کی ہو کر رہ سکتی ہے۔ نجمی نے نویں درجے سے پڑھنا چھوڑ دیا تین سال تک تو آٹھویں کلاس میں فیل ہوتا رہا غبی اور کند ذہن نہیں تھا مگر ذہانت کی ساری توجہ شاعری میں صرف ہو رہی تھی۔ تعلیم بھی آخر تھوڑا بہت وقت، توجہ اور مصروفیت چاہتی تھی — مشاعروں کی چاٹ، داد و تحسین کا چسکا شہرت کی ہوس شعر خوانی کی بدولت کہیں پارٹی کسی جگہ دعوت، ہر مجلس میں آؤ بھگت ان میں کچھ ادھورے رومان Romance بھی شامل تھے جہاں نرتوں اور ٹھکانوں کے لئے بہت سے قافلوں کا ساتھ ہو وہاں آدمی کسی اور کام اور راہ کا رہتا کب ہے!

پورے آٹھ سال اسی عالم میں گذر گئے، نجمی کافی مشہور ہو چکا تھا رسالوں اور اخباروں کے صفحوں سے لیکر مشاعروں کے اسٹیجوں تک اس کی شہرت تھی — اور اس شہرت میں کلام سے زیادہ ادا کی کرامت شریک تھی، اس کے انتہائی معمولی شعر پر مشاعروں میں چھتیں اڑ جاتیں، نجمی دھن کیلئے غزل کہتا۔ اور یہ دھن اس کی مشق کی ہوئی اور منجھی ہوئی ہوتی — گمبھیر، انگڑائی، جوانی، نکھار، سرمستی شباب، دھڑکنیں، شہابی فضا، نور کا چھ

اس قسم کے لفظ اس کی ہر نظم اور غزل میں ضرور ہوتے. لفظوں کی اس شیشہ گری پر اس کی شاعری کا مدار تھا وہ جان جان کر ایسے لفظ استعارے اور تشبیہیں لاتا جو جذبات میں ہیجان پیدا کر دیں. شاعروں کی داد و تحسین اور لوگوں کی واہ واہ اس کی شاعری کا مقصود تھی. اس نے مشاعروں میں یہ بات کو بھی محسوس کیا کہ سرمایہ داروں کو گالیاں دیکر اور مزدوروں کی تعریفیں کر کے بعض شاعر بہت زیادہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس نے بھی اسی انداز کی دو چار نظمیں کہہ کر رکھ لیں. کہ "داشتہ بکار آید" جب دیکھتا کہ کسی مشاعرے میں سیاسی فضا پیدا ہو چلی ہے اور رومان آمیز نظموں اور رنگین غزلوں کا رنگ نہیں جم رہا ہے. تو وہ سماج پر برس پڑتا، سرمایہ داروں کو صلواتیں سناتا اور مزدوروں کی حمایت میں اپنا دل کھول کر سب کے سامنے رکھ دیتا ـــ کہ صرف مزدوروں کیلئے ؎ من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم ـــ ہر طرح کا مال اس کے اسٹاک میں موجود تھا جیسا گاہک دیکھتا اسی طرح کا مال پیش کرتا، وہ تاجر تھا سچے نگ اور جھوٹے موتی اس کے یہاں سے بکتے رہتے اس کا روزگار اسی کے سہارے چل رہا تھا.

گلابی جاڑے پڑ رہے تھے کھیتوں میں سرسوں پھول رہی تھی بسنت کی رت تھی. جنگل میں چاروں اور ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی تھی قدرت نے ہری بانات کا فرش بچھا رکھا تھا... عالم یہ تھا: سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی ؎ بن گیا روئے آب پر کائی

ہوائیں روح افزا تھیں کہ انگیٹھیوں میں انگارے سرد ہوتے جا رہے تھے. خوش فعلیوں کا موسم اور رنگ رلیوں کی رت تھی ضلع کے خوش باش اور اہل ذوق کے دلوں میں ترنگ جو اٹھی تو بڑے پیمانہ پر ایک مشاعرے کے انعقاد کی تجویزیں ہونے لگیں. دل کی بات: زبان پر آئی پھر کاغذ پر اور کاغذی پروگرام عمل کے سانچے میں ڈھلنے لگا مجلس استقبالیہ بنی انتظامیہ کمیٹی کی تشکیل ہوئی صدر منتخب ہوا تاریخ کا اعلان کیا گیا شاعروں کے پاس دعوت نامے بھیجے گئے اور پوری سرگرمی کے ساتھ تیاریاں شروع ہو گئیں.

مشاعرے کے ٹکٹ بھی کافی فروخت ہوئے، مالداروں سے عطیے بھی لئے گئے ـــ اور ان عطیوں میں سرکاری افسروں کا ایما شریک تھا، روپیہ کی ہر طرح بہتات تھی شاندار پنڈال تیار ہوا اور شاعروں سے معاملات طے کرنے میں زیادہ وقت اور جرأت پیش نہ آئی قریب قریب سب کے مطالبات منظور کر لئے گئے ـــ اخباروں اور پوسٹروں میں، اعلان چھپا کہ خواتین کے لئے مشاعرے میں خاص انتظامات کئے گئے ہیں یہ مشاعرہ ضلع کی تاریخ میں یادگار رہے گا، اس میں وہ تمام مشہور شعراء شرکت فرما رہے ہیں جو آسمانِ شعر و ادب کے آفتاب ماہتاب اور درخشندہ ستارے ہیں.

آدمی کرنے پر آئے تو سب کچھ کر سکتا ہے، دریاؤں کا رخ بدلا جا سکتا ہے جھیلیں پایاب ہو سکتی ہیں اور پہاڑوں کی چٹانیں توڑ کر ریزہ ریزہ کی جا سکتی ہیں ـــ ایک مہینہ کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی، پھر کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی. مشاعرے کے انتظامات پوری سرگرمی کے ساتھ ہو رہے تھے یہاں تک کہ مشاعرے کی وہ ساعت منتظرہ بھی آ پہونچی جس کے لئے بیسیوں نوجوانوں نے دن رات ایک کر دئے تھے ـــ!

پنڈال وقت سے پہلے بھر گیا، پھر شاعر آنا شروع ہو گئے، کارکنوں نے ہر شاعر کو اس کے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق ڈائس پر پہنچا کر بٹھا دیا، تجویز اور تائید کے بعد صدر مشاعرہ زریں مسند پر تشریف لائے. پھولوں کا خوشنما ہار انہیں پہنایا گیا اور مجمع نے تالیاں بجائیں مبارکباد اور خوشی کی تالیاں ـــــ کسی کی تالی طنز آمیز بھی تھی مگر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے.

صدر صاحب شہر کے ایک دولت مند خان بہادر تھے، چوڑا چکلا دھڑ، خوب بھاری بھرکم اور مسند صدارت پر بیٹھ کر ہار پہن کر اور مبارکباد کی تالیوں کی گونج سنکر تو اور فربہ ہو گئے؛ اس لئے کہ ؎

آدمی فربہ شود از راہِ گوش

اور فربہی کے اسباب کی یہاں کیا کمی تھی.

شعر اور نغمہ کا عورت بہت زیادہ شدید اثر قبول کرتی ہے جسے قدرت نے منفعل جبلت دے کر دنیا میں بھیجا ہے، نجمی مشاعرے کا ہیرو تھا میدان اسی کے ہاتھ رہا پورا مشاعرہ اس کی مٹھی میں تھا آج اس کی آواز اور زیادہ دلکش اور مشاعرہ گیر ہوگئی تھی آس پاس کے دوچار شاعر البتہ داد دے رہے تھے باقی کے چہروں پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا کہ اب ان کے بعد ہم پڑھیں تو کیا پڑھیں مشاعرہ تو اس غزل پر ختم ہو گیا اور طوطی شکر خائی کر رہا تھا لوگوں میں واہ واہ اور تالیاں بجانے کی سکت اب کہاں رہی تھی بڑے بڑوں کی یہ حالت تھی کہ لمبی لمبی غزلیں سوچ کر آئے تھے کہ غزل اس انداز سے پڑھیں گے، فلاں فلاں شعر کی مشاعرہ میں دھوم مچ جائے گی مگر نجمی نے بہت سے ہوائی قلعوں کو ڈھا دیا اور خیالی محلوں کو توڑ دیا تھا ـــــ نجمی جب شعر پڑھ رہا تھا تو اساتذہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے ـــــ "صنعت تالیف سے اس سے عیب! کھلا ہوا ذم: لاحول ولاقوۃ۔ یہ زلف آشکار کیا بات ہوئی، ردیف بھٹکا چلی گئی، ایطائے خفی، تنافر، بیان، حشو، کاملیں، ترجمہ کا عمل دخل، ترکیب نجمی کے کلام میں یقیناً بہت سے اسقام پائے جاتے تھے مگر شہاگن وہ جسے پیا چاہے" ۔ مشاعرے میں جو شاعر کامیاب رہے، بس وہی اس معرکے کا ہیرو ہے ـــــ زنانے سے عورتوں نے صدر مشاعرہ کے پاس پرچے بھیجے جن میں نجمی سے خاص خاص نظمیں پڑھوانے کی فرمائش کی گئی ـــــ یہ نظمیں زیادہ تر رومانی اور رنگین تھیں۔

نجمی نے پے در پے کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں، اس محفل کو تڑپا تڑپا اور گرما گرما دیا ـــــ اور وہ بیٹھ گیا، مشاعرہ جاری تھا دوسرے شعرا کلام سنانے لگے محفل میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا زنانے سے ایک لڑکی آئی تو دس سال کی عمر ہوگی اس کی، وہ ایک آٹوگراف بک نجمی کے ہاتھ میں پکڑا دی کہ اس میں کوئی شعر لکھ دیجئے نجمی نے آٹوگراف بک کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے تو کتاب میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا شعر موجود تھا پار سال یہاں کے مشاعرہ میں آیا تھا۔

یہ زمانہ کی ستم ظریفی تھی، نجمی نے کتاب واپس کرتے ہوئے لڑکی سے کہا کہ میں تمہاری اس کتاب میں گزشتہ سال اپنا شعر لکھ چکا ہوں لڑکی زنانہ درجہ میں جا کر پھر واپس آئی اور بولی، آپا نے کہا ہے کہ آپ کسی نئی غزل کا کوئی شعر لکھ دیجئے نجمی نے زلفوں میں پیچ دے کر تھوڑی دیر سوچا اور شعر لکھ دیا۔

مشاعرہ صبح کے تین بجے کہیں جا کر ختم ہوا۔ نجمی واقعتاً اندازیں مشاعرہ گاہ سے نکلا سیکڑوں آنکھیں اس کی راہ میں بچھی ہوئی تھیں اس کی طرف لوگوں کی انگلیاں اٹھ رہی تھیں ستائش آمیز انگلیاں۔ قیام گاہ پر پہنچ کر وہ سو گیا مگر صبح تک بھی خواب میں دیکھتا اور سنتا رہا۔ نجمی صاحب کر رہا ارشاد، غضب کی نظم کہی ہے، سبحان اللہ! زندہ باد!! اور ادب میں اضافہ ہے نجمی صاحب آپ کا یہ شعر ـــــ !!

صبح کو دیر سے جاگا تو آنکھوں میں رات کا خمار جھلک رہے تھے زیادہ رات گئے تک جاگنے کا اور دوسرا کامیابی کا خمار، نہا دھو کر کپڑے بدلے ناشتہ کیا، تھوڑی ہی دیر میں بہت سے لوگ ملنے کے لئے آ گئے، وہی مشاعرہ کا تذکرہ، نجمی کی تعریفیں کہ آپ نہ آتے تو مشاعرہ قطعاً فیل ہو جاتا، سارے شہر میں آپ ہی کے چرچے ہو رہے ہیں نجمی کو شہر میں کئی دن رکنا پڑا دعوتوں اور پارٹیوں کے پروگرام تھے ـــــ دوسرے دن دو نوجوان نجمی کے پاس آئے کہ آپ کو جس دن فرصت ہو شام کی چائے یہاں پیجئے، نجمی نے مسلسل مصروفیتوں کا عذر کیا مگر وہ اصرار کرکے بولے کہ آپ کو تھوڑا بہت وقت انہیں مصروفیتوں میں سے نکالنا ہوگا، اور باتوں ہی باتوں میں اپنے گھر کی عورتوں کے ذوق شاعرانہ کا بھی ذکر کر دیا، کہ اردو کے نئے اور پرانے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کا مجموعہ کلام ہمارے یہاں نہ ہو ـــــ نجمی نے چائے پینے کی حامی بھر لی، نوجوانوں کے آخری جملے قدر اندازی کے تیر کی طرح ٹھیک نشانہ پر بیٹھے۔

وہ لوگ چوتھے دن تیسرے پہر کے وقت سواری لے کر آ گئے اور نجمی ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچا اوسط درجہ کا مکان تھا مگر سلیقہ اور قرینہ کا یہ عالم کہ ایک ایک چیز پر نگاہ جم کر رہ جاتی دروازوں کے پائدانوں سے لے کر چھت کے قمقموں تک ہر چیز بنی سنوری اور نکھری ہوئی نہ جانے کتنے دن سے ان کی دعوت کے لئے یہ صفائی ہو رہی تھی۔

بیوی نے خالو کے دیئے ہوئے تحفے جب بجی کو دکھائے تو آٹوگراف بک کو دیکھ کر بجی تن کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی نے اس کے شانہ جھنجھوڑا۔ شمیم (بجی کی دلہن کا نام) اس آٹوگراف بک کو تم اپنے خالو کو واپس کر دو ۔۔۔ شمیم نے کہا خالو جان نے محبت کے ساتھ تحفے دیئے ہیں ان کی کوئی چیز واپس کی جائے گی تو وہ محسوس کریں گے اور پھر تمام تحفوں کو چھوڑ کر اس آٹوگراف بک میں آخر کیا برائی ہے کتنی خوبصورت ہے اس کتاب کی جلد ۔۔۔ اس پر بجی نے آٹوگراف بک اٹھا کر زمین پر پٹک دی اور غصہ میں آ کر بولا کہ یہ کتاب میرے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہ سکتی ۔ بیوی نے کہا آخر بتایئے بھی کہ اس کتاب میں برائی کیا ہے؟ آپ تو آج عجیب سی باتیں کر رہے ہیں ۔ بجی نے کتاب ہاتھ میں اٹھالی اور دیوانہ وار اس کے ورق پھاڑنے لگا ۔ اس میں کیا برائی ہے اس میں کی بڑی برائی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی ۔ یہ بہت بری چیز ہے یہ ایک راز ہے ، خطرناک راز ، دیکھو شمیم ! ہر بات کی نزاکت نہیں بتائی جاتی ـــــ اتنے میں کچھ رشتہ دار عورتیں وہاں آگئیں انہوں نے دیکھا کہ شمیم سہمی ہوئی بیٹھی ہے اور بجی ایک خوبصورت سی کتاب کے ورق پھاڑ رہا ہے ۔

— یہ کیا... ایں! یہ کیا ہو رہا ہے بجی؟ ـــــ اس کی پھوپھی زاد بہن نے دریافت کیا۔

— یہی ہو رہا ہے جو تم دیکھ رہی ہو ـــــ بجی نے جواب دیا۔

— یہ کتاب آخر اس بیدردی کے ساتھ کیوں چاک کی جا رہی ہے ـــــ بہن نے کہا!

— یہ کتاب چاک کئے جانے کے ہی قابل ہے یہ کسی شریف گھر میں نہیں رہ سکتی ۔ نہیں رہ سکتی ـــــ میں نہیں رہنے دوں گا ۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے ۔ مجھ سے اس کا سبب نہ پوچھو میری زبان نہ کھلواؤ بہت سی باتیں ہر کسی کے سامنے نہیں کی جاتیں میرے بے کو کچھ پوچھے بغیر مان لو ۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے! ..... میں بہت کچھ جانتا ہوں ...... یہ کہتے ہوئے اور آٹوگراف بک کے ورق پھاڑتے ہوئے بجی باہر چلا گیا ـــــ عورتیں ایک دوسرے کا منہ حیرت کے ساتھ دیکھنے لگیں ...... ورق ادھر ادھر فرش پر بکھرے پڑے تھے ۔ کچھ ہوا سے اڑ رہے تھے اور کمرے میں خاموشی طاری تھی ۔ !!!

روحِ انتخاب

امیر مینائی کا مکتوب داغ دہلوی کے نام

بندہ نواز، سلام و نیاز۔ اس وقت نوازش نامہ آیا۔ ممنون فرمایا۔ اگرچہ جواب طلب نہیں مگر باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اس لئے کچھ لکھنا ضرور ہے۔ میری افسردہ دلی کی نسبت جو آپ نے افسوس ظاہر کیا میں اس کا شکرگزار ہوں اور اس پر افسوس بھی کرتا ہوں اس وجہ سے کہ آپ بڑھاپے میں بھی دنیا سے افسردہ دلی کو پسند نہیں کرتے حالانکہ یہ عمر اس قابل ہے کہ دنیا سے دل اٹھ جائے اور آخرت کا خیال پیدا ہو۔ بغیر معرفت علی وجہ الکمال اور بغیر درستیِ احوال و حسنِ اعمال محض رحمت پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی کسان جوتے بوئے کچھ نہیں اور اس کی رحمت پر بھروسہ کرکے سمجھے کہ وقت پر میں بھی کھیت کاٹ لوں گا اور جوتنے بونے والوں کی طرح متمتع ہوں گا۔ اگرچہ قدرتِ الٰہی میں ضرور یہ بات ہے کہ بے جوتے بوئے کھیت کو سرسبز کردے مگر اتنی عمر گزری کبھی دیکھا بھی ہے کہ ایسا ہوا ہو، اور جب نہیں دیکھا تو کیونکر اعتماد کیا جائے کہ اس دنیا میں جو مزرعۂ آخرت ہے جوتے بوئے کچھ نہیں۔ اور محض رحمتِ الٰہی پر بھروسہ کرکے آخرت میں اپنا متمتع ہونا ہے۔ توبہ و استغفار کر لینا بیشک گزشتہ معاصی کے بخشوانے کو میں بھی کافی سمجھتا ہوں مگر بھائی وہ توبہ اور وہ استغفار بھی تو ہو جس کی نسبت قرآن شریف میں إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ آیا ہے، کیا محبوبِ الٰہی ہو جانا اس توبہ سے ہو سکتا ہے جو دنیا دار دل کے غافل دل کیا کرتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔

سلوک میں کوئی کتاب اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ توبہ و استغفار کیسی کڑی منزل ہے۔ یہ نماز پڑھ لینا بیشک افضل عبادت ہے اور سب جرائمِ صغیرہ اس سے معاف ہو جاتے ہیں مگر وہ نماز بھی جب نصیب ہو، غافل دل جو نماز پڑھا کرتے ہیں وہ نماز کی صورت ہے اور حقیقت نماز کی اس کے ورا ہے، یہاں صورت سے کیا کام نکل سکتا ہے، بھائی اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ نمازِ صوری چھوڑ دی جائے بلکہ آرزو یہ ہے کہ مجھ کو اور میرے سب عزیزوں دوستوں بلکہ جملہ مومنوں کو وہ نماز نصیب ہو جس کے لئے قرآن شریف میں آیا ہے کہ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔ آخر میں عذر کرتا ہوں کہ ان مضامین کے لکھنے کو یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کیونکہ جو خود فضیحت ہوگا وہ کسی کو کیا نصیحت کرے گا، البتہ ایک عمر کا تم سے یارانہ ہے، اس نے جیسی اپنے لئے آرزو کرتا ہوں ویسی تمہارے لئے بھی دعا مانگتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ تمہاری فارغ البالی کو اپنی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ کردے و ارحم الراحمین بتصدق حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین مجھ کو بھی اور قرض اور فکرِ معیشتِ متعلقین سے سبکسار کرکے اپنی طرف بلائے۔ میاں تسنیم کی زار نالی نے دل و جگر کو پانی پانی کر رکھا ہے۔

منشی نثار حسین اپنی طرف دیکھے بیٹھے ہیں مگر کیا کروں کہ جب شعر کہا ہی جائے تو کیا خاک کہوں۔

یار تمہاری تنہائی بیشک قابلِ افسوس ہے اور اس تنہائی کی حالت میں ایسے شعر کہنا جیسے تم کہتے ہو تمہارا ہی کام ہے، تنہائی مٹانے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ اچھی کتابوں سے صحبت رکھو۔ اگر تم متوجہ ہوگے تو ایسی کتابیں مختصر و مطول جن کا مطالعہ آسان ہو اور رفتہ رفتہ ایسا جی لگے کہ ان کے دیکھنے سے جی بھرے ہی نہیں میں بتلاؤں گا بلکہ کسی مطبع سے منگوا کر دو ایک کتابیں بھیج بھی دوں گا بشرطیکہ مطالعہ میں کہنے کا وعدہ بھی کرو، یار اگر پوری کتاب ایک دفعہ دیکھ جاؤ اور پھر جو کچھ سمجھے لکھا ہے لکھو تو جانوں۔

آخر میں پھر تمہاری دردمندانہ نوازی کا شکرگزار ہوں بندہ نے یہاں تک لکھ کر آپ کے خط کو پھر دیکھا تو نصیبِ دشمناں آپ کی ناچاقیِ طبیعت کی کیفیت پر نظر پڑی اگرچہ یہ مرض سوءِ ہضم کا آپ کا قدیمی ہے اور علت اس کی عمدہ کھانوں کی طرف مزید رغبت ہے مگر نصیبِ دشمناں جب عارض ہوتا ہے تو جی ڈرتا ہے اور اس مرتبہ دردِ نفخ غریب حد سے ہے اب وجہ کم اٹھوایا کیجئے، اللہ تعالیٰ درگاہ آپ کا بال بیکا نہ کرے، میں تو آنکھ کھول کر جو دیکھتا ہوں تو یارانِ گزشتہ میں اب سوائے تمہارے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے، امید ہے کہ اپنی صحت کاملہ سے جلد جلد مطلع کرتے رہو اور مجھ کو اپنا دلی خیر خواہ سمجھ کر

تنقید کا فن درحقیقت بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ "فاران" میں پوری ذمہ داری اور انتہائی غور و فکر کے ساتھ کتابوں اور رسالوں پر تنقید کی جاتی ہے سراہنے کے قابل چیز ہوتی ہے تو ہم اسے کھل کر سراہتے ہیں، اور جہاں جہاں کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، تو اس کے اظہار میں بھی ہم کسی کی ناخوشی کی پروا نہیں کرتے ——— ہمیں شکوہ ہے کہ بعض لوگ "فاران" کی تنقید اس طرح چھاپتے ہیں کہ ستائش آمیز جملوں کو چن لیتے ہیں اور وہ عبارت جس میں ان کی کتابوں اور رسالوں کی کمزوریوں کا ذکر ہوتا ہے، حذف کر دیتے ہیں، یہ طریقہ کسی بھی اہل قلم کو زیب نہیں دیتا، تنقید اور تبصرے میں اگر صرف حسن قبح ہی پیش نظر رہیں تو یہ انصاف کہاں ہوا، یک رخی اور جانب داری بات ہوئی، ادبی ذوق کو اس طرح تاریکی میں رکھنا مناسب نہیں، کاش! ذمہ داری کو محسوس کیا جائے۔ "م"

آخرت نمبر

"آخرت نمبر" مرتبہ:- ابو سلیم محمد عبدالحیٔ، حجم ۲۰۸ صفحے، کتابت و طباعت دیدہ زیب، سہ رنگی سرورق، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی۔ ہندوستان) اُردو زبان کے مشہور دینی اور اخلاقی رسالہ الحسنات" نے "آخرت نمبر" نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے! ادارہ "الحسنات" نے حقیقت میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، ہماری تمام محرومیوں، کوتاہیوں اور غلط اندیشیوں کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ "آخرت" پر ہمارا اس طرح یقین نہیں ہے جس طرح ہونا چاہیے تھا، صحابہ کرام جو آخرت پر کامل یقین رکھتے تھے ان نفوسِ قدسیہ کا یہ عالم تھا کہ اپنی تمام نیکیوں اور پاکبازیوں کے باوجود خدا کے خوف سے مجرموں کی طرح کانپتے رہتے تھے، اس چیز نے اُن کی زندگیوں کو عالمِ انسانیت کے لئے رحمت بنا دیا تھا اور دُنیا کی اقبال مندیاں اُن کی ٹھوکروں میں لگی تھیں۔

"آخرت نمبر" کے مضامین، افسانے، کہانیاں اور نظمیں سب کی سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں، سلیس زبان سادہ اور شگفتہ اسلوب، دل نشین مثالیں، ایک ایک لفظ دل میں اُترتا اور گھر کرتا چلا جاتا ہے، ان میں نفسیات کی نزاکتیں اور سیرت و کردار کی کمزوریاں بھی اجاگر کی گئی ہیں، قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ کو جس دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس سے پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا ——— پھر لطف یہ ہے کہ زبان، ادب، انشا، اور طرزِ بیان کی خوبیوں کا جہاں تک تعلق ہے کوئی مضمون کہیں سے اُترنے نہیں پایا، "آخرت نمبر" اپنے موضوع پر کامیاب ترین پیشکش ہے، رسالہ کے مضمون نگاروں اور مرتب کرنے والوں نے اپنے لئے حقیقت میں توشۂ آخرت مہیا کیا ہے۔

"آخرت نمبر" کی نظموں[عہ] میں گھلاوٹ اور دلچسپی پائی جاتی ہے خاص طور سے مولانا سید حامد علی صاحب کی نظم "خدا غافل نہیں ہے"!

عہ (صفحہ ۹۶) سے محمود کل صبح کو وہ اسکول جا رہا تھا ۔۔۔ ہر چند کہ یہ نظم بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، پھر بھی "صبح" کی جگہ "سحر" کر دیا جائے تو یہ سقم جاتا رہے گا ——— صفحہ (۱۵۱) "میں نے کے جیب خرچ کو اپنے تم کر دیا" ——— "اپنے" کے اپنے کا موقع نہیں ہے "اپنے لئے سے خرچ کر دیا کرتا" لکھنا چاہیے تھا۔

ایک شاہکار نظم ہے اور تحقیقی خصوصیت کی حامل ! ــــــ "آخرت نمبر" کے مضامین زیادہ سے زیادہ اشاعت کے مستحق ہیں، چھوٹے، بڑے، بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد سب کیلئے اس میں کام کی چیزیں موجود ہیں۔

رسالہ "الحسنات" ادب و اخلاق کا روشن مینارہ ہے، افسوس اُس پر جو اس روشنی سے اب تک محروم ہے ــــ سالانہ چندہ چھ روپیے، پاکستان میں جو صاحبان "الحسنات" کے خریدار بننے کی سعادت حاصل کرنا چاہیں وہ ہفتہ وار "کوثر" نزد بھاٹی گول منڈی (لاہور) کو اپنا چندہ ارسال فرمائیں۔

قومی ملکیت

"قومی ملکیت" از :- نعیم صدیقی، ضخامت ۵۶ صفحے، چکنا سفید کاغذ لکھائی چھپائی بہت اچھی، قیمت بارہ آنہ، ملنے کا پتہ :- مکتبہ چراغ راہ، لونیا بلڈنگ، آرام باغ کراچی ۱

جناب نعیم صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے معاش و اقتصاد کے نازک اور فنی مسائل میں بھی اسلامی بصیرت اور دینی فہم عطا فرمایا ہے، یہ کتابچہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے، فاضل مصنف نے بڑے دل نشین اور قابل فہم انداز میں بتایا ہے کہ "قومی ملکیت کا اصول" ایک غیر فطری اصول ہے اور اسلام جو دین فطرت ہے اس اصول سے لفظاً لفظاً اتفاق نہیں کر سکتا ــــ فرماتے ہیں۔ــ

اوپر کی گذارشوں کو پیش نظر رکھ کر آپ نیشنلائزیشن کے اصول اور مفاد اور اس کے مفاسد کو عدل کی ترازو میں تول کر دیکھ لیں کہ کونسا پلڑا بھاری رہتا ہے، پھر سچا سمجھا ہوا فیصلہ دیں کہ یہ قابل قبول ہے یا نہیں ــــــ اور محض قومی ملکیت کا ہوائی چرچا سُن کر اور اس اصطلاح سے مرعوب ہو کر اپنے فکری قویٰ کو معطل کر کے بیٹھ نہ جائیے ــــــ ایک بات اور ملحوظ خاطر رہے کہ قومی ملکیت کے اصول سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی محافظت (Defence) مطلوب ہے، یا اس کے اصول اشتراکی نظام کے اصولوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہیں، نہیں ان سطور کا لکھنے والا مسلمانوں کی اس نرالی قسم سے تعلق نہیں رکھتا جو اپنی کوئی فکری کیمپ نہیں رکھتی، بلکہ یہی موقع دیکھتی رہتی ہے کہ دنیا میں سرمایہ داری اور کمیونزم کے جو دو کیمپ بنے ہوئے ہیں اُن میں سے کسی ایک کو خدمات پیش کر دے، بخلاف اس کے ہم اپنا مستقل (اسلامی) فکری کیمپ الگ قائم کر کے اپنی قوتیں اسی سے وابستہ کئے ہوئے ہیں، اور کسی دوسرے کیمپ کو ان قوتوں میں سے کوئی حصہ مستعار یا کرایہ پر دینے کے لئے تیار نہیں ہیں (صفحہ ۴۷)

جناب نعیم صدیقی کے یہ جملے کتنے سچے اور بچے تلے ہیں ــــــ

"آج کل مختلف مسائل میں یہی غلطی کی جا رہی ہے کہ اسلام کے کلیات کو درکنار رکھ کر ان مستثنیات کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے جو ہر کلیہ کیساتھ پائی جاتی ہیں ــ پھر ان مستثنیات کو جمع کر کے خود ایک کلیہ بنا دیا جاتا ہے، جو اسلام کے اصول اور کلیہ سے کھلا تضاد رکھتا ہے، اس طرح اسلام اپنی تردید آپ کرنے لگتا ہے ــــــ مثلاً پردے کے اسلامی قانون کو لیجئے جس کا اصل مدعا صنفی اختلاط کو روکنا ہے اس قانون کے اندر اسی قانون میں کچھ گنجائشیں بھی رکھی ہیں کہ تمدنی غیر معمولی ضروریات کے لئے عورتیں گھروں سے نکل سکیں، پردے کی بندشوں کو بحالتِ اضطرار کسی قدر کم کر سکیں یا بضرورت مردوں کے ساتھ اشتراک کر سکیں، اب بے پردگی کے "مجاہدین" نے اس ترتیب کو الٹ دیا اور مستثنیٰ صورتوں کو جمع کر کے "آزادیٔ نسواں" اور "مساواتِ مرد و زن" اسلام کا اصولی پروگرام قرار دیا اور جو چیز اصولی تھی وہ سرے سے خست و نابود ہو گئی ــــ" (صفحہ ۲۱)

"قومی ملکیت" وقت کے بہت بڑے مسئلہ پر دینی اور علمی تنقید ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ پڑھے جانے کے قابل ہے، جناب نعیم صدیقی اس موضوع کو اور زیادہ پھیلا کر لکھیں تو شکوک و شبہات کی رہی سہی گرہیں بھی کھل جائیں گی اور اس خدا ناشناس و مادیت پرست دور میں انسانیت کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی کیونکہ "نیشنلائزیشن" کے نام پر ایک مخلوق ہے کہ بے راہ ہوئی جا رہی ہے اور حالات کی نزاکتوں سے یہ فتنہ پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

مطبع شوکت پرنٹنگ پریس کراچی۔ پرنٹر پبلشر ماہر القادری